۱۹۵۵ء شمارہ نمبر ۲

باہراہ

ولٹ نمبر

حصہ اول

تراجم کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

مرتب

محمد یوسف (باقی)

قیمت :- ستات رہ

دفتر

اردو بازار دہلی ۶

محمد یوسف جید برقی پریس۔ دہلی

غیر ملکی ادب کے ناولٹ

ہندوستانی ادب کے ناولٹ

غیر ملکی ادب کے ناولٹ

اس انجمن گل میں

اُردو ادب میں آج [illegible] ناول کو وہ فروغ حاصل نہیں جو ناول کو ہے — یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے یہاں ناول پر ابھی کمی کا عالم ہے۔ ناول نگاری [illegible] منزل میں ہے۔ یوں تو اُردو میں جاسوسی اور تاریخی ناول کثرت سے لکھے جارہے ہیں، لیکن ابھی تک ایک بھی ایسا ناول تخلیق [illegible] ہے جسے ہم دوسری زبانوں کے مقابلے میں اپنے فخریہ پیش کرسکیں۔ نظم و افسانے کے میدان میں اُردو اتنی آگے نکل چکی ہے کہ بعض ملکی [illegible] زبانوں کی ادبی تقلید ہو رہی ہے۔ اور اس میدان میں بنگالی کو چھوڑ کر اُردو ابھی تک میر کارواں ہے۔ جس زبان کی نظم اور افسانہ اتنی [illegible] ہو اس سے ناول کے میدان میں بھی یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ کچھ ایسے چراغ جلائے گی جن سے دوسروں کے یہاں بھی اُجالا ہوگا [illegible] شدید مجروح ہوتی ہے۔ اور یہ وادیٔ سینا اُس کلیم کی منتظر ہے جو عالم تاب تجلیوں کو پردے سے نکلنے پر مجبور کردے۔

اُردو ناول نگاری کے میدان میں کچھ کوششیں قابلِ تحسین تو ہیں مگر وہ محض کوششیں ہی تو ہیں۔ کامرانیاں نہیں۔ دنیا تو ترجمے [illegible] کو پورے [illegible] دکھاتا ہے۔ اُردو کو اپنے زبان دانی توانائی اور اپنے پھیلاؤ کے اعتبار سے ہند کی دوسری زبانوں میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ جبھی قائم رہ سکتا ہے۔ اگر اس کا ناول بھی ایک امتیازی تزک و احتشام کا حامل ہو۔ اُردو میں اچھے ادیبوں کا ایک بہت بڑا لشکر ہے جسے اپنی خوابیدہ قوتوں کا علم بھی ہے لیکن نہ جانے کیوں وہ اس طرف متوجہ نہیں ہو رہا ہے ہمارے بعض اُردو ناول نگار اپنی صلاحیتوں کو بیکار اور بے سود راستوں میں صرف کر رہے ہیں۔

ایک بڑا ادیب دور بیں، منزل شناس اور ژرف نگاہ ہوتا ہے۔ لیکن وہی جب اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے آپ سے آنکھ مچولی کھیلنے لگے تو یہ نہ صرف اس کی اپنی بلکہ اُس کی قوم کی بھی بدنصیبی ہوتی ہے۔

'شاہراہ' اگر قوتوں کو تولنے کا مزہ ابھی تک محسوس کر رہا ہے۔ اگرچہ منزل منزل راہگیروں کو سہارا دیتے ہوئے اس کے اپنے کندھے شل ہو چکے ہیں۔ شاہراہ کا ناولٹ نمبر اُردو میں ناول کو فروغ دینے کی طرف ایک قدم ہے۔ ملکی اور غیر ملکی ادب کے شہ پارے جمع کئے گئے ہیں۔ ناولٹوں کے انتخاب میں دِقتِ نظر اور صلاح و مشورے سے کام لیا گیا ہے۔ شاہراہ کے ناولٹ نمبر کے دو واضح مقاصد ہیں۔ اِن دنوں اُردو میں اچھے ادب کی تخلیق کی رفتار ذرا سست پڑ چکی ہے۔ لہٰذا اس ناولٹ نمبر کے ذریعہ قارئین کے لئے ادبِ عالیہ کے مطالعہ کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ اور ادیبوں کے لئے ایک مشعلِ راہ تلاش کی ہے۔ کہ لکھنے والے یوں لکھتے ہیں۔ آپ بھی ہمارے آسمانِ ادب پر ایسے ہی مہر و ماہ فروزاں کیجئے۔

روس میں حقیقت افروز ناول نگاری کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ روس میں تورگنیف، گوگل، دستووسکی، ٹالسٹائی اور گورکی نے حیات آموز فنی ناول نگاری کو بامِ عروج پہنچایا۔ ٹالسٹائی کے سوا ہم روس کے چار عظیم ادیبوں تورگنیف، دستووسکی، گوگل اور گورکی کے ناولٹ آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ روسی زبان کے یہ چاروں ناولٹ روس کی جاندار اور قابلِ تقلید روایات کے آئینہ دار ہیں۔ سومرسیٹ، پرل ایس بک اور جان اشٹین بک انگریزی کے تین ہمعصر ادیب ہیں۔ اور اپنے ناولوں کے لئے دوامی شہرت کے

مالک ہیں۔ ان کے تینوں ناولٹ جدید فنِ ناول نگاری کے حامل ہیں۔

شاہراہ کے ناولٹ نمبر کی خصوصیت بنگالی، ہندی، پنجابی، سندھی، تامل [illegible] کے ناولٹ ہیں۔ یہ سب [illegible] ناولٹ ہماری کڑی دھوپ اور مسلسل تلاش و جستجو کا نتیجہ ہیں۔ یہ ناولٹ [illegible] ہماری ملکی زبانیں ناول کے میدان میں کہاں تک ترقی کر چکی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ناولٹ نمبر ایک تاریخی د[illegible]

اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان تمام مصنفوں اور مترجموں کی تصاو[یر] [illegible] یاب ہو سکیں اُن کی تصانیف کے سامنے اصلی آرٹ پیپر پر چودہ اوراق میں ملیں گی۔ تیرہ ورق ملکی اور غیر ملکی ناولٹ [illegible]وں کے بھی ہوں گے اور یہ پورے ۴۲ صفحات ان ۴۸۰ صفحات میں شامل نہیں ہیں یعنی کہ یہ ناولٹ نمبر کل ۲[illegible] کا ہے۔ چند قارئین کے اصرار [illegible] شاہراہ کے منیجر اور آرٹسٹ کے فوٹو بھی بطور روشناسی پیش کئے جا رہے ہیں۔

ہم نے جب ناولٹ نمبر کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کیا تھا تو اس وقت [illegible]ی نہیں تھا کہ وہ اتنی پھیل جائے گی۔ اس عظیم کام کا اب آغاز کرنے کے بعد اُسے ادھورا چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ار[اد]ہ تو یہ تھا کہ ناولٹ نمبر کو دو حصوں میں ختم کر دیا جائے لیکن اب یہ کام تین حصوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ غیر ملکی ادیب[وں] کے بہترین ناولٹ جنھیں ہم پیش نہیں کر پائے اور ہند کی باقی آئینی زبانوں کے ناولٹ تیسرے حصے میں پیش کئے جائیں گے۔

دوسرا حصہ اُردو کے طبعزاد ناولٹوں پر مشتمل ہوگا۔ ناولٹ نمبر کا دوسرا حصہ جون کے پہلے ہفتہ میں پیش کیا جائے گا۔ ناولٹ نمبر کے دوسرے حصے میں کیونکہ طبعزاد ناولٹ ہوں گے اس لئے ہم اُسے معیارِ طباعت کے اعتبار سے ایک بے مثال صحیفہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کم و بیش بیس ناولٹ قارئین کی نذر کئے جائیں گے [illegible]ں کی ضخامت بھی موجودہ ناولٹ نمبر سے زیادہ ہوگی۔ اُردو کے سب ہی نامور ادیب تعاون کا یقین دلا چکے ہیں۔ ہم اُن سے التماس کرتے ہیں کہ [و]ہ اپنی تخلیقات ہمیں جلد بھجوانے کا کرم فرمائیں۔

آخر میں ہمیں اپنے قارئین سے ایک درخواست کرنی ہے۔ جو اصحاب شاہراہ کے خریدار ہیں یا اب بننا چاہیں گے انھیں شاہراہ کے ناولٹ نمبر کا پہلا حصہ مفت دیا جائے گا۔ اگر وہ شاہراہ کے طبعزاد ناولٹ نمبر بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہ مزید چھ روپے بھجوانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

ناولٹ نمبر کا تیسرا حصہ جنوری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوگا۔

محمد یوسف (جامی)

عالمی ادب کے ناولٹ

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

دستوئیفسکی

مترجم: من موہن تلخ

غریب لوگ

میری پیاری واروارا۔

کل رات میں بہت خوش تھا۔ میں تصور میں بھی اتنا خوش نہ ہو سکتا تھا کیونکہ اے میری ہتھیلی ہاروارا ڈلی تم نے اپنی زندگی میں پہلی بار وہ کیا جیسا میں نے کہا تھا جب میری آنکھ کھلی تو اس وقت شام کے آٹھ بج رہے تھے۔ (اور جان من یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ کام کے بعد ذرا سستا لینے کا مجھے بے حد شوق ہے۔) میں نے موم بتی جلائی، کاغذات کو ترتیب دی اور ابھی قلم کی نوک درست ہی کر رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ اٹھی۔ اور میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ آخر میرے دل کی بات تم نے جان ہی لی۔ یعنی جیسا میں نے کہا تھا تم نے بالکل اسی طرح پردے کا ایک کونہ مرتبان کے ساتھ باندھ رکھا تھا مجھے یہاں تک محسوس ہوا کہ تم کھڑکی میں کھڑی ہو اور تمہارا اگر یا ایسا چہرہ دمک رہا ہے۔ تم کھڑکی سے باہر جب تکتی تھیں اور تمہارے دل میں میرا خیال چٹکیاں لے رہا تھا۔ میری ننھی سی فاختہ مجھے اس بات سے دکھ ہو رہا تھا کہ مجھے تمہارا دل نشیں چہرہ اچھی طرح نظر نہ آتا تھا کیا دن تھے کہ جب میری بینائی کمزور نہ پڑی تھی۔ میں بھی سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ میری لاڈلی ـــ بڑھاپا لعنت نہیں ہے۔ سب کچھ دھندلا پڑ جاتا ہے۔ اور شام کے اندھیرے میں ذرا سا لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کے بعد صبح کو آنکھیں اس طرح دکھنے لگتی ہیں اور ان سے پانی یوں بہنے لگتا ہے کہ لوگوں کو منہ دکھاتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن اے میرے ننھے سے فرشتے تمہاری اس مسکراہٹ سے میرا دل جگمگا اٹھا تھا وہ مسکراہٹ کتنی نرم اور شیریں تھی۔ اور مجھے خواہ مخواہ محسوس ہونے لگا کہ اس دن کی طرح آج بھی میں نے تمہیں بوسہ دیا ہے۔ یاد ہے نا؟ اور جان من مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ تم اپنی ننھی ننھی پیاری انگلیوں سے میرا گھر ایک طرف ہٹا رہی ہو اور مجھے ڈانٹ بھی رہی ہو۔ سچ سچ بتانا۔ کیا تم نے واقعی ڈانٹا تھا۔ اگلے خط میں مجھے اس واقعے کے بارے میں پوری تفصیل سے لکھنا۔

اور ہاں ـــ ہم نے پردے کی آڑ لینے کی جو چالاکی دکھائی ہے اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ کمال کر دیا ہے ـــ ہے نا؟ کام کرتے وقت یا سونے جاگتے وقت میں فوراً سمجھ جاتا کہ تم ادھر بیٹھی میرے بارے میں سوچ رہی ہو۔ تم مجھے یاد کر رہی ہو ـــ اور تم خوش ہو ـــ اچھی ہو۔ پردہ گرا دینے کا مطلب ہوتا تھا ـــ ماکار ـــ شب بخیر۔ اور پردہ اٹھانے سے مراد تھی ـــ ماکار ـــ صبح بخیر۔ امید ہے کہ رات تم اچھی طرح سوئے؟ یا اس کا یہ بھی مطلب ہو سکتا تھا ـــ ماکار ـــ مزاج کیسا ہے۔ میں تو خدا کے فضل سے اچھی ہوں۔ خوش ہوں ـــ دعا ہے:

لیکن میری جان تم یہ دیکھو کہ ہم نے کیا ترکیب ڈھونڈ نکالی۔ اب تو خط بھی بے معنی نظر آتے ہیں۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ اور یہ سب کچھ میں نے ہی سوچا تھا ـــ مجھے ایسی باتیں خوب سوجھتی ہیں۔ مانتی ہو نا!

میری ننھی واروارا۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کل رات میں جی بھر سویا اور مجھے اس کی توقع نہ تھی کہ اتنی اچھی نیند آئے گی۔ اور یہ بات بہت تسکین دہ ہے۔ کیونکہ عام طور پر شروع شروع میں نئی جگہوں پر اچھی طرح نیند آتی نہیں۔ ایسی کوئی نہ کوئی بات ہو ہی جاتی ہے کہ آدمی کی نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔ آج صبح میں بلبل کی طرح ہشاش بشاش اٹھا تھا۔ اور جان من صبح بھی کتنی حسین اور خوشگوار تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ باہر سورج چمک رہا تھا۔ چرند پرند چہچہا رہے تھے۔ ہوائیں موسم بہار کی مہک گھلی ہوئی تھی۔ ذرے ذرے سے زندگی پھوٹ رہی تھی۔ ہر چیز میں ہم آہنگی تھی۔ ہر شے پہ بہار آئی ہوئی تھی۔ میں نے کچھ خیالی گھوڑے بھی دوڑائے اور فقط تمہارے بارے میں سوچا۔ ـ میں نے من ہی من میں تمہیں آکاش کا وہ پرند کہا جسے خدا نے اس لئے بنایا ہے کہ وہ قدرت کو حسن اور انسان کو راحت عطا کرے۔ اور وارنیکا یہاں مجھے خیال آیا کہ پریشانی اور مصیبت میں جینے والے ہم مشغول

کی کاوش کے آزاد اور معصوم پرندوں سے رشک ہونا لازمی ہے۔ اور اسی رو میں بہتے ہوئے میں نے کئی مبہم اور خوشگوار رابطے بھی قائم کئے۔ وارنیکا۔ میرے پاس ایک کتاب ہے اور تمہیں اس کتاب میں ایسی بہت سی باتیں نظر آئیں گی جیسی میں یہاں لکھ رہا ہوں۔ اگر سچی بات پوچھو تو میں نے یہ سب کچھ اسی کتاب سے پایا ہے۔ یوں نظر آتا ہے جیسے کتاب کے مصنف کو بھی بالکل میری طرح تمنائیں اور حسرتیں ہیں۔ اور ان کا اظہار اُس نے شاعری میں یوں کیا ہے۔

• کاوش میں اک پنچھی ہوتا جو تسکار کے تجسس میں بلندیوں کو چیرتا جاتا۔۔۔

اور یہ نظم اسی طرح چلتی جاتی ہے۔ اس میں اور بھی بہت سی نازک خیالیاں ہیں۔ لیکن تم اسے چھوڑو۔۔۔ یہ بتاؤ کہ آج صبح تم گئی کہاں تھیں۔ جب تم اپنے کمرے سے نکلتی ہوئی نکلی تھیں تو میں ابھی کام پر جانے کو تیار نہ ہوا تھا۔ تمہیں ایک نظر دیکھ کر دلی خوشی ہوتی۔ لیکن وارنیکا۔۔۔ دکھی ہونے سے بھی کچھ نہیں بنتا۔ آنسو کسی دکھ کی تلافی نہیں کر سکتے۔ یقین مانو میری لاڈلی۔۔۔ میں نے تجربات سے یہ سیکھا ہے۔۔۔ ہاں وہ فیڈورا کیسی ہے۔ وہ بہت نیک عورت ہے۔ وارنیکا جواب دیتے وقت میری سب باتوں کا جواب لکھنا اور یہ بتانا کہ تم دونوں مل کر کیسے دن گذار رہی ہو۔ ویسے سب کچھ ٹھیک ہے نا؟ فیڈورا کو بات بات پر منہ بنا لینے کی عادت ہے لیکن تم بُرا نہ ماننا۔ وہ بہت ہی اچھی عورت ہے۔ خدا اُسے سُکھی رکھے۔

میں تھریسیا کے بارے میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ وہ بہت ایماندار اور نیک عورت ہے۔ مجھے تو بے حد فکر لگ گئی تھی کہ ہم اپنے خط ایک دوسرے تک کیسے پہنچائیں گے! اور ہماری خوش قسمتی سے خدا نے تھریسیا کو ہمارے لئے یہاں بھیج دیا۔ وہ نیک دل ہے۔ بے حد سلجھی ہوئی اور کام آنے والی عورت ہے۔ لیکن ہماری مکان مالکن بہت ہی بے رحم اور سنگ دل ہے۔ وہ اس بیچاری سے بہت زیادہ کام لیتی ہے اور بہت ظلم کرتی ہے۔ بڑی سخت عورت ہے۔

وارووارا میں کس جگہ آ گیا ہوں۔ یہ تو صریحاً گندگی ہے۔ کمرے بہت ہی گندے اور تاریک ہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ میں گوشہ نشین انسان ہوں۔ جہاں پہلے رہا کرتا تھا وہاں اتنا سکون اور سکوت ہوتا تھا کہ اگر مکھی بھی بھنبھنائے تو اُس کی آواز بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ اور یہاں یہاں شور ہے۔ ہلڑ مچا رہتا ہے۔ لیکن میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ یہ جگہ ہے کیسی؟

قیاس کرو کہ ایک لمبا سا برآمدہ ہے جو بہت ہی تاریک اور گندہ ہے۔ دائیں طرف دیواریں ہیں جن پہ نہ رنگ نہ روغن بلکہ صرف ننگی دیواریں۔ بائیں طرف کسی ہوٹل کی طرح قطار در قطار دروازے ہی دروازے نظر آتے ہیں۔ اور ہر کمرہ ایک ایک یا دو دو آدمی رہتے ہیں کچھ کمروں میں تو تین تین آدمی بھی رہتے ہیں۔ ایک عجیب دھاچوکڑی ہے۔ یہ جگہ واقعی حضرت نوحؑ کی حقیقی کشتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سب لوگ بظاہر اچھے ہی نظر آتے ہیں۔ جیسے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور اچھے پڑھے لکھے لوگ ہوں۔ آگے اندر کی بات خدا جانے۔ ان میں ایک صاحب کلرک ہیں (ویسے ان کا کام ادبی نوعیت کا ہے) بہت وسیع المطالعہ شخص ہے۔ اُسے ہومر یا برمبونز کے بارے میں بھی بہت علم ہے اور دیگر ادبی تصنیفات کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہے۔ دنیا بھر کا ادب پڑھا ہے۔ اُسے ہر چیز کے بارے میں علم ہے یعنی ذہین آدمی ہے۔ دو فوجی افسران ہیں۔ وہ تو ہمیشہ تاش ہی کھیلتے رہتے ہیں۔ ایک بحری فوج کے افسر ہیں اور ایک صاحب انگریزی کے مدرس ہیں۔ لیکن تم میرے دوسرے خط کا انتظار کرو۔ تمہاری دل لگی کے لئے میں طنز سے بھرے میں ایک ایک کا ذکر کروں گا۔ بالکل ویسا ہی لکھوں گا جیسے وہ ہیں اور پوری تفصیل سے لکھوں گا۔ مکان مالکن ٹھگنے قد کی، پھوہڑ، اور بوڑھی عورت ہے۔ وہ سارا دن سلیپر پہنے اور ڈریسنگ گاؤن پہنے گھومتی رہتی اور تھریسیا کو ڈانٹتی رہتی ہے۔ میں رسوئی میں رہتا ہوں۔ بلکہ صحیح نقشہ یوں ہے کہ رسوئی کی عین دائیں نکڑ پہ ایک کمرہ ہے (اور یہ ماننا پڑے گا کہ ہماری رسوئی بہت اچھی ہے، صاف اور ستھری ہے) لیکن وہ کمرہ کوئی خاص بڑا نہیں ہے۔ ایک چوکور غار ہے...... بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ رسوئی اس سے بڑی ہے۔ اس میں تین کھڑکیاں ہیں اور درمیان میں دیوار کھڑی کر کے اسی رسوئی سے ایک اور کمرہ بھی بنا دیا گیا ہے اور اس کا علیحدہ کرایہ وصول کیا جا رہا ہے۔ ہوادار جگہ ہے اور آرام دہ کمرہ ہے۔ اُس میں ایک کھڑکی ہے۔ بس اسی میں رہتا ہوں۔ المختصر اس جگہ سے مجھے پوری تسلی ہے۔ اب اس سے یہ مطلب نہ نکال لینا کہ ان باتوں کے پس پردہ کوئی راز بھی ہے۔ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ یہ کمرہ رسوئی کا ایک حصہ ہے۔ میں اس میں رہتا ہوں اور اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ یہ ہر لحاظ سے خلوت گاہ ہے۔ میں اپنی ہر بات کو اپنے تک محدود

نگ سکتا ہوں اور آرام سے تنہا رہتا ہوں۔ جہاں تک سامان کا تعلق
ہے تو یہ بہت کچھ ہے۔ ایک میز، الماری اور دو کرسیاں
ہیں [illegible] بھی رکھ سکتا ہے۔ ایک تنہا انسان کے لئے
یہ [illegible] اور پھر کمرہ سستا بھی ہے۔ اس مکان میں
سب سے چھوٹے کمرے کا کرایہ ۵۰ روبل ہے اور میرا لباس سا پر
ہے۔ اس وقت میں اس کمرے کے ۲۰ روبل دے رہا ہوں اور پھر ساتھ
کھانا بھی مل رہا ہے۔ اس سے پہلے مجھے پورے تیس روبل ادا کرنا پڑتے
تھے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو کئی چیزوں سے محروم رکھنا پڑتا تھا۔
اس سے پہلے چائے پینے کی سوچ تک نہ سکتا تھا اور اب چائے اور کافی
کے لئے میں کچھ رقم بچانے کے قابل ہوجاتا ہوں۔ جانِ من مجھے بڑی شرم
آتی ہے کہ چائے تک بھی نہ پی سکوں۔ یہاں ہر شخص صاحب عزّ و وقار
ہے اور یہ کافی تکلیف دہ بات ہے۔ میں کھوکھلی شان کا قائل نہیں
ہوں اور مجھے یہ جھیلا اچھا بھی نہیں لگتا۔ اور پھر اگر ضروریاتِ زندگی
جوتوں اور کچھ کپڑوں کے لئے پیسے علیحدہ کرنے چاہئیں تو باقی رہ ہی کیا
جاتا ہے۔ اور بس میری ساری تنخواہ یہیں ختم ہوجاتی ہے۔ یہ بات نہیں
ہے کہ میں شکایت کر رہا ہوں ــ بالکل نہیں ــ یہی تنخواہ برسوں سے
میری ضروریات کے مطابق ہے اور کبھی کبھی مجھے بونس بھی مل جاتا ہے
اچھا ــ آرامِ جاں ــ خدا حافظ ــ میں نے تمہارے
لئے پھولوں کے کچھ گلدستے خریدے ہیں۔ سستے مل گئے ہیں۔ اور
شاید تم خوشبودار پھولوں کی دلدادہ ہو۔ دوکاندار کے پاس ایسے پھول
بھی ہیں۔ تم صرف مجھے لکھ بھیجو کہ تمہیں درکار ہیں یا نہیں لیکن خدارا ہر بات
تفصیل سے لکھنا۔ اور ہاں دیکھو اس وجہ سے میرے حساب کتاب
کے بارے میں کوئی شبہ یا خیال دل میں نہ لانا۔ میں اپنا گھر بسانے
کے لئے روپیہ بچا رہا ہوں۔ میں اس مکھی کی مانند بھی نظر آسکتا ہوں جو
اپنے پہلو پر پٹا کھا جاتی ہے لیکن اگر ذرا سا بھی غور کرو تو میں ایسا
بھی نہیں۔ میں اپنے متعلق سمجھتی جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔ میں ایک
مضبوط اور پاک روح کا مالک ہوں ــ اچھا خدا حافظ۔ اپنی ننھی
ننھی پیاری پیاری انگلیوں پر میرا بوسہ قبول کرو۔

تمہارا سچا اور وفادار دوست

ماکار دیوشکن

نوٹ۔ ہاں مجھے تم سے ایک التجا کرنی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ
جانِ حیات جس قدر طویل خط تم کو لکھ رہا ہوں۔ میں تمہارے لئے ایک
پونڈ مٹھائی بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم پسند کرو گی۔ اور خدا کے لئے میرے
بارے میں سوچ کر پریشان مت ہونا۔ اچھا تو خدا حافظ۔

۸ اپریل۔

میرے پیارے ماکار

مجھے اندیشہ ہے کہ آخر کار مجھے تم سے جھگڑا کرنا پڑے گا۔
یقین مانو میرے اچھے ماکار کہ تمہارے بھیجے تحفے قبول کرنا میرے لئے بہت
مشکل ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم نے ان پر کتنی رقم خرچ کی ہوگی۔ تم نے
اپنے اوپر کتنا جبر کیا ہوگا کن نعمتوں سے اپنے آپ کو محروم رکھا ہوگا۔ اور میں
نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ بالکل کچھ نہیں چاہیئے۔ اور تم
جانتے ہو کہ میں اس فیاضی کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔ تم نے وہ پھول بھیجے کیوں؟
چلو گلاب کی ایک ٹہنی تو سمجھ میں آسکتی ہے لیکن موتیا اور گیندے کے پھول
کیوں بھیجے؟ بس ذرا سی کسی نے اپنی پسند ظاہر کی جیسے میں نے گیندے
کے بارے میں ذکر کیا اور تم لپکے بازار کی طرف۔ اور وہ بہت مہنگے آئے
ہوں گے۔ لیکن ہیں وہ خوبصورت۔ تمہارے خط سے مجھے معلوم پڑتا ہے
کہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ ذرا ضرورت سے زیادہ ہی جنت بہار خوشبو
اور چہچہاتے ہوئے پرندوں کا ذکر ہے۔ میں سمجھ گئی تھی کہ شاعری بھی ضرور
ہوگی۔ ماکار تمہیں کچھ اشعار کہنے چاہئیں تھے باقی تو ہر چیز موجود تھی۔ نازک
احساسات، دلربا تصورات اور نہ جانے کیا کیا کچھ! رہا پردے کا سوال تو
میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔ شاید جب میں نے پردوں کو کھینچا
تھا تو وہ پردہ اپنے آپ ان میں اٹک گیا ہوگا۔ اور تم نے کیا کچھ نہ سمجھ لیا۔
دیکھو ماکار! تم مجھے یقین دلانے کے لئے چاہے کچھ بھی کہو کہ تمہارا
سب روپیہ تمہاری اپنی ضروریات پر خرچ ہوتا ہے لیکن تم مجھ سے کچھ نہیں
چھپا سکتے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم میری خاطر اپنے آپ کو لازمی ضروریات
سے بھی محروم کر رہے ہو۔ تمہیں ایسا کمرہ لینے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی
جہاں تمہیں ہر وقت پریشانی رہتی ہو اور تم دکھی ہوتے رہتے ہو۔ جہاں تمہیں
آرام میسر نہیں اور ویسے رہتے ہو۔ تمہیں گوشہ نشینی پسند ہے اور یہ چیز تمہیں
اس جگہ نہیں مل سکتی۔ اور اگر تمہاری آمدنی کو دیکھا جائے تو تم بہت اچھی طرح
رہ سکتے ہو۔ فیڈورا کہتی ہے کہ تم بہت آرام سے رہا کرتے تھے۔ کہیں ایسا
تو نہیں کہ تم نے اپنی زندگی تنہائیوں میں گذار دی ہو۔ ساری عمر یاس اور تنہائی
میں گذار دی ہو۔ کبھی کسی نے تمہیں پیار بھرے لفظ سے مخاطب ہی نہ کیا ہو اور

اجنبیوں کے کمرے کرائے پہ لے کر عجیب عجیب جگہوں پر رہتے ہو۔ میرے مہربان میرا دل تمہارے لئے کتنا دکھی ہوتا ہے۔ خوش اور ٹھیک رہنے کی کوشش کرتے رہو ماکارا۔ تم لکھتے ہو کر موم بتی کی روشنی میں لکھنے سے تمہاری آنکھوں کو نقصان پہنچ چکا ہے۔ تو پھر تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ یقینی بات ہے کہ تمہارے افسر جانتے ہیں کہ تم کتنے محنتی انسان ہو۔

میں تمہیں ایک بار پھر تاکید کرتی ہوں کہ میرے لئے اتنی رقم نہ خرچ کیا کرو۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے لیکن تم امیر نہیں ہو۔ آج صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں نے بھی اپنے آپ کو بہت شگفتہ اور تر و تازہ محسوس کیا تھا۔ میں بے حد خوش تھی۔ فیڈورا بہت دیر سے کام پر گئی ہوئی تھی۔ وہ میرے لئے بھی کام لے آئی۔ اور بس میں اس سے بے حد خوش ہوئی۔ میں تھوڑا سا ریشم خریدنے کے لئے بازار گئی تھی اور پھر واپس آ کر میں نے کام شروع کر دیا تھا۔ پوری صبح میں نے اپنے آپ کو بہت ہشاش بشاش محسوس کیا۔ لیکن اب میں پھر اداس ہو گئی ہوں اور میرا دل غمگین ہے۔

آخر میرا بنے گا کیا؟ میرا مستقبل کیا ہے! اور غیر یقینی کا عالم کس قدر مایوس کن ہوتا ہے۔ آدمی کو احساس تک نہ ہو بلکہ ذرا بھی پتہ نہ چل سکے کہ اب کیا ہو گا تو مایوسیاں ابھر آتی ہیں۔ اور پھر ماضی اس قدر اذیت ناک تھا کہ اس کا خیال آتے ہی دل دھک سے بیٹھ جاتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں میں اُن لوگوں کی جان کو روؤں گی جنہوں نے میری زندگی تباہ کر دی ہے۔

اس وقت تاریکی بڑھ رہی ہے اور مجھے پھر اپنا کام شروع کر دینا چاہیئے۔ جی تو بہت چاہتا ہے کہ اور لکھوں لیکن وقت نہیں ہے۔ کام بہت ضروری ہے لہٰذا مجھے دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ خط لکھنے میں جی بہت لگتا ہے۔ آدمی اپنے آپ کو اس قدر تنہا نہیں محسوس کرتا۔ لیکن تم کبھی ہم لوگوں سے ملنے کیوں نہیں چلے آتے؟ ماکارا! آخر ایسا کیوں؟ اب تمہیں زیادہ دور بھی نہیں جانا پڑے گا اور یقیناً تم ملاقات کیلئے وقت نکال سکتے ہو۔ خدارا ضرور آؤ۔ میں حال ہی میں تمہاری تھریسا سے ملی ہوں بیچاری بہت بیمار نظر آ رہی تھی۔ مجھے اس پر اتنا ترس آیا کہ میں نے اُسے بیس ہوپیکس دے دیئے۔ ارے بابا۔ دیکھو میں بالکل بھول ہی چلی تھی۔ ہاں سنو تم جس طرح بھی رہ رہے ہو اس کی ایک ایک پائی کا حساب مجھے بتاؤ۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کون کون لوگ رہ رہے ہیں اور تمہاری اُن سے کیسی نبھ رہی ہے۔ میں یہ بات جاننا چاہتی ہوں۔ اور دھیان رکھے کہ تم یہ سب کچھ لکھ بھیجو گے۔ آج رات میں خاص مقصد سے اپنے پردے کے کونے کو تمہاری خاطر ڈھیلا چھوڑ دوں گی۔ تم جلد سونے کا عادی بنو۔ کل رات میں دیکھ رہی تھی کہ تمہارے کمرے میں آدھی رات تک بتی جلتی رہی تھی۔ اچھا خدا حافظ۔ اس وقت میں بہت اُداس ہوں۔ تھکی ہوئی ہوں اور اکیلی ہوں۔ زندگی میں کیا دن دیکھنے کو ملے ہیں۔ خدا حافظ۔

تمہاری دوست

وارورا

۸ اپریل۔

میری پیاری وارورا۔

ٹھیک کہتی ہو میری وارورا۔ میری جانِ حیات۔ ہاں اپنی بدبختی کے ہاتھوں میں بھی ایسے ہی دن دیکھ رہا ہوں۔ وارورا۔ تم نے مجھ بوڑھے آدمی کے ساتھ خوب مذاق کیا۔ لیکن یہ میرا قصور ہے سراسر میرا قصور۔ ایک بوڑھا شخص جس کے سر پر گنتی کے بال رہ گئے ہیں وہ جذبات اور تصوریا رومان سے جی بہلائے۔ ہاں جانِ من مجھے کہنا پڑتا ہے کہ آدمی بعض لمحات میں عجیب حرکات کرتا ہے۔ بلکہ عجیب شخصیت بن جاتا ہے۔ وہ خیالی پلاؤ پکاتا ہوا بے مہار بہکے جائے گا۔ اور پھر کن حدوں تک پہنچ جاتا ہے۔ خدا کی پناہ! اور پھر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے! بات پہنچی کہاں ہے؟ کچھ بھی نہیں مطلقاً کچھ نہیں ہاں انسان گندگی کے اُس ڈھیر پہ جا گرتا ہے جہاں سے صرف خداوند تعالیٰ ہی ہمیں بچاتا ہے۔ لیکن میری پیاری یہ نہ سوچنا کہ میں خفتے ہوں مجھے تو یہ سوچ سوچ کر رنج ہوتا ہے کہ میں نے کس احمقانہ اور رومانی انداز میں تمہیں خط لکھا تھا۔ آج جب میں اپنے کام پر گیا تھا تو ایک شہنشاہ کی طرح خوش تھا۔ میرے دل میں خوشی موجزن تھی اور میری روح اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہی تھی۔ المختصر مجھے اپنا یہ عالم بہت ہی اچھا لگا تھا۔ لیکن آج شام گھر آتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں چل نہیں رہا تھا بلکہ بہ دقت تمام اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔ علاوہ ازیں نہ جانے کیوں میرا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسری مصیبت نمودار ہوتی ہی رہتی ہے۔ شاید ہوا کی وجہ سے میری پیٹھ کو سردی لگ گئی تھی۔ بہار کو دیکھ کر میں بے وقوف اس قدر آپے سے باہر ہو گیا تھا کہ صرف پتلے سے کوٹ میں باہر نکل گیا تھا۔

میں یہ ضرور کہوں گا کہ تم نے میرے جذبات کو غلط سمجھا ہے۔ تم بالکل غلط سمجھی ہو۔ وارورا یہ تو صرف پدرانہ شفقت تھی۔ فقط ایک پدرانہ

محبت صرف باقی تھی تمہاری تنہائی اور یتیمی کے عالم میں میں نے تمہارے باپ کی جگہ لے لی۔ یہ وہ سب کچھ تم ملنے کر رہا ہوں۔ بالکل جیسے ایک سچے رشتہ دار کا کام ہے۔ آخر کار میں قریب ہی تمہارا دور کا رشتہ دار تو ہوں۔ نہیں ہوں گا؟ بہت دور کا ناطہ ہے میرا تمہارا۔ لیکن کچھ بھی ہو رشتہ دار تو ہیں۔ شکر ہے اور اب خدا کے فضل سے میں تمہارا سب سے قریبی رشتہ دار اور محافظ ہوں۔ کیونکہ جہاں کہیں تمہیں حفاظت اور سرپرستی چاہیے تھی وہیں تم نے دھوکہ کھایا اور تمہیں ذلت ملی۔ رہا سوال شاعری کا اور وہ بھی میری اپنی شاعری کا تو اب میری وہ عمر نہیں رہی کہ میں شعر کہتا پھروں۔ شاعری بکواس ہے۔ جانِ من یہ ہماری قریبی رائے ہے۔

والدہ تم آرام، چین اور ایسی باتوں کے بارے میں کیوں لکھتی ہو؟ میں ملنگ نہیں ہوں اور میری ضروریات بہت کم ہیں۔ میں جتنا سکھی اب ہوں اتنا پہلے کبھی نہ تھا۔ اس بڑھاپے میں مجھے اس قدر اپنا خیال رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے پاس کھانے کو بہت ہے۔ کچھ کپڑے اور جوتے بھی ہیں۔ پھر فضول چیزوں کے بارے میں فکر کرنے کی کیا مصیبت پڑی ہے۔ شاہی خاندان سے تو میں تعلق رکھتا نہیں۔ اور یہ بھی بات نہیں کہ میرے آبا جان نوابوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے گزر اوقات اس آمدنی میں کیا تھا جو کہ میری آمدنی سے بھی کم تھی۔ اور نہ میں بزدل ہوں۔ لیکن پھر بھی اگر سچی بات پوچھی جائے تو میرا پرانا گھر کہیں بہتر تھا۔ عزیزم وہاں مجھے گھر کا احساس ہوتا تھا۔ میرا یہ کمرہ کافی اچھا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی لحاظ سے زیادہ خوشنما ہے اور اگر تم چاہو تو اسے زیادہ دل آویز کہہ لو۔ کمرہ کیا ہے منہ سے بولتا ہے۔ میں اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اب تو وہ چیزیں بھی جو ان دنوں بہت بری لگتی تھیں اور مجھے بے حد چڑچڑا کر دیتی تھیں اب وہ بھی اچھی لگنے لگی ہیں۔ ہم دو کتنے آرام سے رہا کرتے تھے۔ ہم۔ یعنی میں اور وہ بوڑھی عورت جو اب وفات پا چکی ہے۔ اس کی یاد بھی مجھے اداس کر دیتی ہے۔ وہ بہت اچھی عورت تھی اور اپنے کمروں کا زیادہ کرایہ بھی وصول نہ کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ لمبی لمبی سوئیوں سے لحاف مرمت کرتی رہتی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی موم بتی کی روشنی میں کام کرتے تھے لہٰذا دونوں ایک میز پہ کام کرتے تھے۔ اس کی ننھی سی پوتی ماشا اب تیرہ برس کی ہو چکی ہو گی لیکن مجھے ابھی تک اس کا بچپن یاد ہے بہت شوخ تھی وہ۔ ہر وقت کسی نہ کسی شرارت پر تلی رہتی تھی۔ اور وہ اپنی پیاری پیاری حرکتوں سے ہمیں خوب ہنسایا کرتی تھی۔ ہم ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ بس ان حالات میں ہم تینوں اکٹھے رہا کرتے تھے۔ سردیوں کی لمبی راتوں میں ہم سب گول میز کے گرد بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے اور پھر کام میں مست ہو جایا کرتے تھے۔ بچی کو خوش کرنے کیلئے اور اسے شرارت سے باز رکھنے کی غرض سے وہ بیچاری بوڑھی عورت اسے کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ اور کیا کہتے ہیں ان کہانیوں کے۔ صرف بچہ ہی کیا ایک جوان اور ذہین شخص بھی ان کو سنتے سنتے اپنے آپ کو بھول جاتا تھا۔ حتیٰ کہ میں بھی اپنا پائپ سلگا کر بیٹھا انہیں سنتا رہتا اور اتنا محو ہو جاتا کہ اپنا کام تک بھول جاتا۔ اور وہ بچی وہ شرارت کی پتلی اپنے گلاب جیسے چہرے کو اس عورت کے ہاتھوں پر ٹیک دیتی اور اس کا معصوم اور خوبصورت سا منہ آدھا کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ اور اگر کہانی ڈراؤنی ہوتی تو وہ بچی سرک کر اپنی دادی سے چمٹ جاتی تھی۔ اسے اس عالم میں ڈرا ہوا دیکھ کر ہم دونوں کو اس پہ بے ساختہ پیار آ جاتا تھا۔ اور ہم وہاں ایک عجیب کیفیت میں ڈوبے ہوئے بیٹھے رہتے اور موم بتی کی بلکتی اور بھڑکتی ہوئی لو کو بھی بھول جاتے۔ ہمیں نہ صحن میں تیز ہوا کا شور سنائی دیتا نہ برف گرنے کی صدا۔ کتنی اچھی زندگی گزرتی تھی۔ اور یقین مانو کہ ہم اسی عالم میں بیس برس تک اکٹھے رہے تھے۔ لیکن دیکھا نا کہ میں جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ بھلا تمہیں اس واقعے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اور اس وقت کی یاد سے میں بھی کچھ سکھی نہیں ہوتا اور خاص کر اس عالم میں تو وہ یاد میرے لئے اور دکھ کا باعث ہو گی۔ تاریکی پھیلتی جا رہی ہے۔ تقریباً نہ جانے کس سے بک بک جھک جھک کر رہا ہے۔ میرا سر دکھ رہا ہے۔ اور میری پیٹھ میں بھی ٹیس اٹھ رہی ہے۔ اور میرے خیالات اتنے الجھے ہوئے اور بھٹکے ہوئے جیسے سوچنے سے بھی دکھ ہوتا ہو جیسے میرے خیالات بھی آزار میں مبتلا ہوں۔ آج میں بہت اداس ہوں۔

لیکن ہاں عزیزم تم نے یہ لکھا تھا۔ میں تم سے ملنے کیسے چلا آؤں؟ لوگ کیا کہیں گے۔ لوگ غلط باتیں بنائیں گے۔ نہیں میرے ننھے سے فرشتے۔ بہتر یہی ہو گا کہ میں تمہیں کل ویسپرز پہ مل لوں یہی اچھا رہے گا اور ہم دونوں کو نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ دیکھو ایسا خط لکھنے کی بنا پر مجھے معاف کر دینا۔ میں نے خود اسے دوبارہ پڑھ کر دیکھا کہ بے سر و پا اور بے مہار باتیں لکھ گیا ہوں۔ میں ایک بوڑھا شخص ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ چیزوں کو بیان کرنے میں مجھے کوئی مہارت حاصل نہیں ہے۔ نہ کسی کو مجھے یہ بتلانے کی ضرورت ہے اور نہ کسی کو ہنسنے کی لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ میں نے جب کبھی اپنے خیالات قرینے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہیں میں نے اپنی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ آج صبح میں نے تمہیں کھڑکی میں دیکھا تھا۔ تم چق لگا رہی تھیں۔ اچھا

خدا حافظ اور یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تمہارا نگہبان رہے۔

تمہارا مخلص دوست

ماکار۔

ہاں ایک اور بات کہنی ہے کہ میں کسی سے متعلق طنزیہ پیرائے میں کچھ لکھنے سے قاصر ہوں۔ دادا ارا اب میری یہ عمر نہیں رہی کہ مذاق کروں اور پھبتیاں کسوں۔ لوگ مجھ پر ہنسیں گے اور پرانی روسی کہاوت تازہ ہو جائے گی کہ جو اپنے پڑوسی کے لئے کنواں کھودتا ہے وہ خود اس میں جا گرتا ہے۔

۹ر اپریل

میرے پیارے ماکار

ایسے خیالات دل میں لاتے ہوئے کیا تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم تو میرے دوست ہو اور میری بھلائی کرنے والے ہو۔ کیا میں تمہیں چوٹ پہنچا سکتی ہوں؟ میں جانتی ہوں کہ اکثر و بیشتر میں بے دھیان رہتی ہوں لیکن میں سوچ تک نہیں سکتی تھی کہ میرے اُن فقروں کا مطلب تم یہ نکالو گے کہ میں نے تمہیں تمسخر کا ہدف بنایا ہے۔ سچ میں تمہاری عمر یا چال چلن کا کبھی مذاق نہیں اُڑا سکتی۔ یہ تو فقط میں بے دھیانی میں کہہ گئی تھی اور پھر سچ بات تو یہ ہے کہ میں اکتا چکی ہوں۔ اور انسان اکتاہٹ کے عالم میں کیا کچھ نہیں کر گذرتا۔ اگر میں اپنے دِل کی بات کہہ دوں تو میں سمجھی تھی کہ تم اپنے خط میں سوانگ رچا رہے ہو۔ اور جب میں نے یہ جانا کہ تم میرے خط سے اس قدر دکھی ہوئے ہو تو میرا دل بھر آیا۔ سُنو میرے مخلص دوست، اگر تم مجھ پر ناشکر گذاری اور بے حسی کی تہمت دو تو تم مجھے قطعاً غلط سمجھو گے۔ میرے دشمنوں سے، اُن کی نفرت اور انتقام کے جذبے سے مجھے بچانے کے لئے تم نے جو کچھ کیا ہے میں اُسے اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے لئے دُعائیں مانگوں گی اور اگر خدا نے میری دعائیں سن لیں تو تمہیں ضرور خوشی نصیب ہو گی۔

آج میری طبیعت بہت خراب ہے۔ میں ٹھٹھر اٹھتی ہوں اور میرا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے۔ فیڈورا بہت گھبرا رہی ہے۔ مجھ سے آکر ملنے میں اور میرا حال پوچھنے میں تمہیں شرم محسوس نہ کرنی چاہیئے۔ لوگ بکتے ہیں بکنے دو۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں نا؟ اچھا ماکار خدا حافظ۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا ہے اور اب کچھ اور مجھے نہیں لکھنا۔ اچھا دیکھو — مجھ پہ خفا مت ہونا اور میری دائمی عزت اور وابستگی پر بھروسہ رکھو۔

تمہاری مخلص اور مؤدب دوست

واروارا۔

۱۲ر اپریل

میری پیاری واروارا

کیا ہو گیا؟ یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم ہمیشہ مجھے ڈراتی رہتی ہو۔ میں ہر خط میں لکھتا ہوں منت کرتا ہوں کہ تم اپنا دھیان رکھا کرو۔ گرم کپڑے پہنا کرو۔ خراب موسم میں گھر پر رہا کرو اور ہر بات سوچ سمجھ کر کیا کرو۔ لیکن تم میرا کہا مانتی کب ہو۔ میرے ننھے سے فرشتے ایک بچے کی طرح تم ہمیشہ میری نصیحت کے خلاف عمل کرتی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم گھاس کی پتی کی طرح نرم و نازک ہو۔ تم ذرا زور سے سانس لینے پر زکام کا شکار ہو جاتی ہو۔ عزیزم اپنا پورا پورا خیال رکھو۔

تم میری روزمرہ زندگی اور ماحول کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں۔ اس سے بڑھ کر مجھے اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ لیکن دیکھو میں الف سے لیکر یے تک لکھوں گا۔ گھر کے سامنے والی سیڑھیاں شاندار ہیں اور خاص کر بڑی سیڑھیاں تو لاجواب ہیں۔ سیڑھیاں صاف شفاف اور کشادہ ہیں اور جنگلہ مہاگنی کی لکڑی اور دھات کا بنا ہوا ہے۔ لیکن پچھلے زینے کے بارے میں جتنا کم کہا جائے اتنا بہتر ہے۔ اوّل تو وہ گول چکر لگاتا ہے۔ پھر وہ ہر وقت گیلا اور میلا رہتا ہے۔ اور زینے کی جو سیڑھیاں ہیں وہ نہایت شکستہ حالت میں ہیں اور دیواریں اس قدر لیس دار ہیں کہ اگر اُن پر انگلی جا پڑے تو وہیں چپک جائے۔ اور زینے کے ہر موڑ پر صندوقوں کے انبار لگے رہتے ہیں۔ کرسیاں پرانی الماریاں اور صفائی کرنے والی چیزوں کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ اکثر و بیشتر کھڑکیاں ٹوٹی پڑی ہیں۔ اور جگہ جگہ گندگی سے بھرے ہوئے ٹب پڑے ہیں۔ اُن میں کوڑا کرکٹ، انڈوں کے چھلکے اور مچھلیوں کا گوشت پڑا سڑتا رہتا ہے۔ اس کی بدبو تو بس ناقابل برداشت ہے۔ المختصر یہ حصہ بالکل اچھا نہیں۔

اب کمروں کے بارے میں بھی سُن لو۔ میں نے تمہیں بتایا ہی تھا کہ کمروں کی ترتیب کیسی ہے۔ اچھے کدام وہ ہیں۔ لیکن۔ کچھ بھرے رہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُن سے بدبو آتی رہتی ہے لیکن اُن سے ایک خاص قسم کی بو ضرور آتی ہے۔

گھر میں پہنچتے ہی گہما گہمی شروع ہو جاتی ہے۔ ہر شخص جاگ چکا ہوتا ہے۔ اور لوگ بھاگ اِدھر اُدھر چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو تو کام پر جانا ہوتا ہے اور جو اس وقت نہیں جاگتے اُن کا بھی ویسا ہی عالم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو ہم سب لوگ چائے پیتے ہیں۔ اور چونکہ چائے دانیاں

زیادہ تر [illegible] کی جیا ہے پھر وہ بھی ضرورت کے مطابق نہیں ہیں لہذا ہر
شخص کو [illegible] اشتہا سکنا پڑتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی کیتلی لے کر
[illegible] کسے تو باقی کے لوگ اس مجرم پر ٹوٹ پڑتے ہیں
[illegible] ساتھ [illegible] کچھ ہوا تھا لیکن وہ واقعہ بیان کرنے کے قابل نہیں
ہے۔ میں اُسی دن سب لوگوں سے واقف ہو گیا تھا۔ اور سب سے پہلا
واقف وہ [illegible] کا افسر بنا تھا۔ وہ ایک راز دان قسم کا شخص ہے۔ اس
نے مجھے اپنے باپ، اپنی ماں اور اپنی بہن کے بارے میں سب کچھ بتلا دیا
تھا۔ (اس کی بہن کی شادی ضلع تولا میں کسی افسر کے ساتھ ہوئی ہے) اس
نے مجھے کرد لیسنڈ شہر کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔ اُس نے مجھے
ہر شخص سے ملاقات کروا دیا اور پھر وہیں اُسی وقت مجھے چائے پر بھی مدعو کیا تھا
میں نے اُسے ایک ایسے کمرے میں پایا جہاں تاش کی بازی کبھی ختم نہیں
ہوتی۔ جب سے پہلا ان سب نے بہت اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ
مل کر تاش کھیلوں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ لوگ اس معاملے میں واقعی
سنجیدہ تھے یا نہیں۔ وہ ساری مدت تاش کھیلتے رہے تھے اور جب میں
کمرے میں داخل ہوا تھا تو تب بھی اسی انہماک سے کھیل رہے تھے۔
تاش چھانٹی جا رہی تھی اور چاک کو پھیلا جا رہا تھا۔ کمرے میں تمباکو کی
بو پھیلی ہوئی تھی۔ جب میں نے جُوا کھیلنے سے انکار کر دیا تو مجھ سے کہہ
دیا گیا تھا کہ فلسفہ مت بگھارو۔ اُس کے بعد مجھ سے کسی نے کوئی بات
نہیں کی۔ اصل میں تو یہ ہے کہ میں نے پروا بھی نہیں کی۔ میں اب دوبارہ کبھی
وہاں جاؤں گا بھی نہیں۔ وہ لوگ جوئے باز ہی تو ہیں۔ جوئے باز ہونے
کے علاوہ اور وہ ہیں کیا! ہمارے درمیان ایک ادیب بھی رہتا ہے۔
وہ بھی اپنے کمرے میں لوگوں کو مدعو کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہاں کی ہر چیز
میں ایک معصومیت ہے، وقار ہے، نزاکت ہے اور ہر چیز بہت بلند
معیار پہ کی جاتی ہے۔

وارنیکا ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ
ہماری مالکن بڑی جابر قسم کی بوڑھی عورت ہے۔ وہ تو چڑیل ہے۔
تم تھریسا سے ملی ہو اور جانتی ہی ہو کہ وہ کتنی دُبلی پتلی ہے۔ بالکل مرغی کی
مانند ہے۔ اور یہاں نوکر صرف دو ہیں۔ تھریسا اور فالڈونی۔ فالڈونی
کا شاید کوئی اور نام ہے لیکن اُسے فالڈونی کہہ کر پکارو تو وہ جواب دیتا ہے
اور اسی لئے ہر شخص اسے فالڈونی کے نام سے پکارتا ہے۔ وہ سڑی قسم کا
شخص ہے اور پہلے درجے کا کمینہ ہے۔ بندر جیسی تو اس کی ناک ہے۔ وہ
ہر وقت تھریسا کے ساتھ ہاتھا پائی کرتا رہتا ہے۔ اکثر اوقات تو نوبت
گھونسہ بازی تک آ پہنچتی ہے۔ یہ سب کچھ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی
یہاں اتنی خوشگوار نہیں ہے۔ یہاں لوگ کبھی ایک خاص مقررہ وقت پر نہیں
سوتے۔ ہمیشہ کچھ لوگ تاش کھیلتے رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسی باتیں بھی ہو
گذرتی ہیں۔ جن کا ذکر کرتے ہوئے بھی مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اب تو
میں ان باتوں کا عادی ہو چکا ہوں لیکن حیران ہوئے بغیر نہیں سکتا کہ ایک
گرہستی آدمی اس گندے ماحول میں رہنا گوارا کیسے کر سکتا ہے۔ ہال سے
پرے ایک کمرہ ہے اس میں ایک غریب کنبہ رہتا ہے۔ وہ کمرہ باقی کمروں
سے الگ تھلگ ایک کونے کا کمرہ ہے۔ وہ خاموش طبع کنبہ ہے۔ وہ لوگ
زیادہ نظر بھی نہیں آتے اور اپنی کوٹھڑی میں چپ چاپ دن گذار
رہے ہیں۔ اُس کنبے کے باپ کا نام گرشکوف ہے۔ اور وہ بیچارہ بیکار
ہے۔ سات سال پہلے اُسے کسی وجہ سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ وہ چھوٹے
سے قد کا آدمی ہے اور اُس کے سر کے بال بھورے رنگ کے ہیں۔ اور
بیچارہ اس طرح گھسٹتا ہوا چلتا ہے کہ اُسے دیکھ کر دل پر ٹھیس پہنچتی ہے
اُس کی واسکٹ میری واسکٹ سے بھی زیادہ خستہ حال ہے۔ وہ بدقسمت
بے حد اداس رہتا ہے۔ (ہم کبھی کبھی برآمدے میں ایک دوسرے سے
مل جاتے ہیں) اُس کے گھٹنے بے جان نظر آتے ہیں اور یوں تو اُس کے
ہاتھ اور سر میں لرزہ طاری رہتا ہے۔ کسی بیماری یا خدا جانے کس وجہ
سے اُس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ وہ بہت ہی ڈرپوک قسم کا شخص ہے۔ ہر شخص
سے جھینپ جاتا ہے اور صرف اپنے آپ تک محدود رہتا ہے۔ کئی موقعوں
پر میں بھی ہر شخص سے جھجکتا ہوا نظر آتا ہوں لیکن اُس کا حال تو مجھ سے بھی
بُرا ہے۔ اُس کی ایک بیوی اور تین بچے ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا بالکل اپنے
باپ کی مانند ہے۔ اُس کی بیوی کو ایک نظر دیکھنے سے احساس ہوتا ہے
کہ کسی وقت وہ ضرور حسین ہو گی کیونکہ اب بھی اُس میں ایک کشش ہے۔
لیکن وہ بیچاری چیتھڑوں میں لپٹی رہتی ہے۔ اُن کے سر پر کرایہ بھی بہت
چڑھ گیا ہے۔ کم از کم میں نے ایسا ہی سُنا ہے۔ اور مکان مالکن اُن کے
ساتھ کسی صورت بھی اچھی طرح پیش نہیں آتی۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ کسی
جھگڑے کی بنا پر گرشکوف کو نوکری سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ لیکن میں یقین
سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کی تفتیش ہوئی تھی یا مقدمہ چلا تھا۔ لیکن خدا کی
پناہ وہ تو بالکل کنگال ہیں۔ اُن کے کمرے سے کبھی کوئی آواز تک نہیں
سُنائی دیتی۔ ایسا سناٹا چھایا رہتا ہے جیسے اس کمرے میں کوئی بھی نہ

رہتا ہو۔ بچوں تک کی آواز نہیں سُنائی دیتی۔ میں نے کبھی اُنھیں اِدھر اُدھر
نکلتے یا کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بہت بڑی بات ہے۔ ایک شام جب
میں اُن کے کمرے کے سامنے سے گذرتا تو اندر سے مجھے سسکیاں لے لیکر
رونے کی آواز سُنائی دی۔ اُس وقت باقی گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔
سسکی کے بعد مجھے سرگوشی کی آواز سُنائی دی اور پھر کسی کے سسکنے کی آواز۔
معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص اس قدر ڈر کر اور دُکھ درد سے رو رہا تھا کہ
مَیں دل مسوس کر رہ گیا۔ میں ساری رات اُن کے بارے میں سوچتا رہا
اور ایک پل کے لئے بھی نہ سو سکا تھا۔

اچھا میری وارنیکا ۔ میری ننھی سی نایاب گڑیا۔ خدا حافظ۔
میں جس طرح خط لکھتا ہوں اس سے خفا نہ ہونا۔ میں صاحب اسلوب
نہیں ہوں۔ بالکل نہیں۔ کاش میرا کوئی اسلوب ہوتا۔ تمہیں خوش کرنے کی
غرض سے جو کچھ مجھے سوجھتا ہے میں وہی کچھ لکھ دیتا ہوں۔ اگر مجھے عُمدہ
تعلیم ملی ہوتی تو بات کچھ مختلف ہوتی۔ لیکن مجھے تعلیم ملی کیسی! ایک دمڑی
کے برابر۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔

تمہارا مستقل اور مخلص دوست

ماکار

۲۵ ۔ اپریل۔

مائی ڈیر ماکار

آج مجھ سے میری چچازاد بہن ساشا ملی تھی۔ اُس کی
حالت دیکھی نہ جاتی تھی وہ تو برباد ہو جائے گی۔ ہاں مجھ تک افواہ پہنچی
ہے کہ اینا فیوڈورانا میرے بارے میں اطلاعات حاصل کرتی رہی ہو۔
کیا وہ مجھے زندگی میں کبھی اکیلے جینے دے گی؟۔ وہ مجھے معاف کر دینا
چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ گزرے مُردے نہ اکھاڑے جائیں۔ اور کچھ ہی
دنوں میں مجھ سے ملنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تم میرے دُور کے
بھی رشتہ دار نہیں ہو۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ وہ میرے بہت زیادہ نزدیک
ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تمہیں ہمارے گھریلو معاملات میں دخل دینے کا
کوئی حق نہیں ہے۔ اور وہ تو یہ بھی کہتی ہے کہ تمہاری خیرات اور مدد
لے کر زندہ رہتے ہوئے مجھے شرم آنی چاہیئے۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے اُسکی
میزبانی کے احسانات کو بھلا دیا ہے۔ نیز اس کا دعوے ہے کہ اسی نے میری ماں
کو اور مجھے بھوک کے ہاتھوں مرنے نہیں دیا تھا۔ اور وہ جو ڈھائی برس اس
نے ہمیں کھانا کھلایا تھا اس سے بیچاری کا بہت خرچ بڑھ گیا تھا۔ لیکن جو کچھ
ہُوا سو ہُوا وہ سب سے بڑا احسان یہ کر رہی ہے کہ وہ ہمارے پورے گذشتہ
قرضے کو بخش دے گی۔ ہائے اس نے جو میری غریب ماں کو بھی نہیں بخشا تھا۔
کاش اتی جان کو یہ پتہ چل جاتے کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا
ہے۔ لیکن خدا تو سب کچھ دیکھ رہا ہے نا۔ اینا فیڈورونا کا تو یہ کہنا ہے کہ
یہ سب قصور میرا اپنا ہے جو میں اپنی خوشیاں کھو بیٹھی ہوں۔ وہ تو کہتی ہے
کہ اس نے مجھے راستہ بتایا تھا اور یہ اُس کا قصور نہیں ہے جو میں اپنی عزت
نہ بچا سکی اور نہ شاید بچا سکوں گی۔ اوہ میرے خدا پھر یہ سب قصور کس کا ہے۔
اینا کہتی ہے کہ مسٹر بائیکوف غلطی پر نہیں ہے اور پھر کسی آدمی سے توقع نہیں
کی جا سکتی کہ اس عورت سے شادی کر لے جو.......... خیر یہ سب کچھ
لکھنے سے کیا حاصل؟ ماکار ایسی ناانصافی برداشت کرنا بہت مشکل ہے
مجھے خبر تک نہیں کہ میرے ساتھ کیا بیت رہا ہے۔ میں یہاں بیٹھی کانپتی
رہتی ہوں سسکیاں لے لیکر روتی ہوں۔ اس خط کو لکھنے میں مجھے دو گھنٹے
لگے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ آخر کار وہ سمجھ جائے گی اور تسلیم کرے گی کہ اُس نے
مجھے کس غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ لیکن انجام سب پر واضح ہے۔ پھر بھی تم
فکر مت کرو تم میرے واحد مددگار ہو۔ فیڈورا ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بتاتی
ہے مجھے بخار نہیں ہے۔ کل میں ذرا دیر کے لئے والکوو چرچ تک گئی تھی اور
بس اسی آنے جانے میں ذرا سردی لگ گئی۔ لیکن تم میرے ساتھ کیوں نہیں
گئے؟ میں نے التجا کی تھی منت مانگی تھی گڑگڑائی تھی کہ میرے ساتھ چلنا۔
ہائے میری اتی جان۔ کاش آپ ایک بار قبر سے اٹھ سکیں اور دیکھ سکیں کہ
لوگوں نے میرا حال کیا کر دیا ہے۔

وی۔ ڈی۔

۲۰ مئی۔

میری فاختہ وارنیکا۔

میں تمہارے لئے کچھ انگور بھیج رہا ہوں۔ انگور صحت
کے لئے اچھے ہوتے ہیں۔ پیاس بجھانے کیلئے ڈاکٹر لوگ بھی انگور کی ہدایت
کرتے ہیں۔ بس یہی سوچ کر میں نے انگور بھیج دئے ہیں۔ صرف پیاس کا مقابلہ
کرنے کیلئے۔ کل تم نے کچھ سیب کھانے کی خواہش ظاہر کی تھی میں تمہارے
لئے کچھ سیب بھیج رہا ہوں۔ عزیزم بیتاؤ اب تمہاری بھوک کیسی ہے۔
سب سے بڑی بات تو یہی ہے کہ خوب بھوک لگنی چاہیئے۔ خدا کا لاکھ
لاکھ شکر ہے کہ یہ بپتا کٹ گئی اور اب ہماری مصیبتوں کا خاتمہ ہونیوالا ہے۔
ہمیں خدا کے حضور میں سجدہ کرنا چاہیئے۔ اب رہی کتابوں کی بات تو ابھی میں

انہیں حاصل نہیں کر پایا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان دنوں ایک بہت ہی اچھی کتاب شائع ہوئی ہے۔ سُننے میں آیا ہے کہ بہت عمدہ کتاب ہے۔ میں نے ابھی تو وہ کتاب کو نہیں پڑھا لیکن جس سے بات کرو وہی اس کی تعریف کرتا ہے اور کچھ لوگوں نے وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ مجھے کتاب مستعار دید یں گے پھر تم پڑھنا ہوگی۔ تم اتنی نازک مزاج ہو کر بڑی مشکل سے تمہیں کچھ پسند آتا ہے۔ دیکھو میں تمہارے ذوق سے بخوبی واقف ہوں۔ غالباً تمہیں ایسی چیز زیادہ پسند آتی ہے جس میں شعریت ہو جیسی آہیں بھر بھر کے داستانِ محبت بیان کی گئی ہو۔ بے فکر رہو میں تمہارے لئے ایسی کتاب بھی حاصل کر لوں گا۔ ان لوگوں کے پاس مجموعۂ شعری بھی ہے۔

رہا میرا سوال تو یہاں سب خیریت ہے۔ او عزیزم تم میرے بارے میں فکر کرنا۔ اور فیڈورا جو کچھ بھی کہتی ہے اُس پر زیادہ دھیان نہ دیا کرو اُس سے کہو کہ ادھر اُدھر کی باتیں اُڑانا اُس کی پرانی عادت ہے۔ انہی الفاظ میں اُس سے یہ بات کہہ دو۔ میں نے اپنی نئی وردی نہیں بیچی۔ اور میں کیوں بیچنے لگا۔ آخر کس لئے؟ میں نے اُڑتی سی خبر سُنی ہے کہ مجھے تنخواہ میں مزید چالیس روبل ملنے والے ہیں۔ پھر وہ وردی مجھے بیچنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ جانِ من ایسی باتوں پہ گھبرایا نہ کرو اور تم تو جانتی ہو کہ فیڈورا بات کا جھگڑا بنا دیتی ہے اور خواہ مخواہ گھبراتی رہتی ہے۔ اچھے دن بھی آنے والے ہیں۔ میرے فرشتے بس تم ٹھیک ہو جاؤ۔ خدا کی محبت کے ناطے پر تندرست ہو جاؤ اور ایک بوڑھے شخص کو نا اُمید مت کرو۔ ہاں تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں دُبلا ہو گیا ہوں۔ یہ بھی محض افواہ ہے بالکل بے پر کی اُڑائی ہے کسی نے مجھے جتنا تندرست ہونا چاہیئے میں اتنا تندرست ہوں بلکہ اس قدر صحت مند ہو گیا ہوں کہ — اب کیا کہوں مجھے خود شرم آتی ہے۔ میں تو عیش کر رہا ہوں۔ بس تم اچھی ہو جاؤ۔ اچھا خدا حافظ۔ اپنی ننھی سی انگلیوں پر میرا بوسہ قبول کرو۔

تمہارا ابدی دوست

ماکار۔

ایک بات اور جانِ من یہ تم کیا لکھتی رہتی ہو؟ کچھ سمجھ دار بنو! میں آئے گئے تم سے ملنے کیسے آسکتا ہوں۔ میں ایسی بات کیسے کر سکتا ہوں۔ سوائے تاریکی کی آڑ لینے کے اور کسی وقت میں تمہارے پاس آسکتا ہوں! اور اس موسم میں راتوں کو بھی نام کی تاریکی ہوتی ہے۔ اور جب تم اس قدر بیمار تھیں اور تمہارا من بھٹک گیا تھا اس وقت کیا ایک پل کیلئے بھی میں تمہارے سرہانے سے اُٹھا تھا۔ اب مجھے خود سمجھ نہیں آتا کہ میں وہ سب کچھ کیسے کر پایا تھا لیکن افواہیں اور لوگوں کی باتیں سن کر مجھے جانا پڑا تھا۔ اب بھی لوگ کچھ نہ کچھ بکتے ہی رہتے ہیں مجھے تم پر یا پہ پورا اعتقاد ہے۔ وہ باتونی نہیں ہے لیکن ذرا غور کرو کہ اگر لوگوں کو ہمارے بارے میں زیادہ علم ہو گیا تو کیا کیا باتیں بنیں گی۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے اور کیا کچھ کہتے پھریں گے صبر کرو۔ اور صحت یاب ہونے تک انتظار کرو پھر ہماری تمہاری ملاقات انشاء اللہ رہے گی۔

ارجون۔

میرے محترم ماکار۔

میں نے بہت چاہا کہ ایسی کوئی بات کروں جو تمہیں بہت پسند آئے۔ تم نے مجھ پر جس طرح پیار نچھاور کیا ہے میں اس کے لئے تمہیں کسی طرح بھی خوش کرنا چاہتی ہوں۔ اور میرے دل میں یہ جذبہ اتنا شدید ہے کہ آخر کار میں نے اپنی میز کا ہر خانہ چھان ڈالا اور یہ پرانی کتاب میرے ہاتھ لگی ہے۔ میں یہ تمہیں بھیج رہی ہوں۔ میں نے اس کتاب کو فارغ البالی کے ایام میں پڑھنا شروع کیا تھا۔ اور پھر وقفے ڈال ڈال کر اسے پڑھتی رہی تھی۔ تم نے کئی بار میرے ماضی کے بارے میں پوچھا ہے۔ تم نے میری امی جان، پوکروسکی، انا فیڈورونا کے ساتھ میرے تعلقات کے بارے میں اور موجودہ مشکلات کے بارے میں کچھ جاننا چاہا ہے۔ یہ حالات جاننے کا تمہیں بے حد اشتیاق تھا اور میں نے اس کتاب میں خدا جانے کیوں بہت سی باتیں لکھ رکھی ہیں۔ جب کبھی مجھے وقت ملا میں نے اپنے ماضی کے بارے میں اس کتاب میں سب کچھ لکھ دیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کو پڑھ کر تمہیں خوشی ہوگی۔ میں تو جب انہیں پڑھتی ہوں اور زیادہ اداس ہو جاتی ہوں۔ یوں نظر آتا ہے کہ اس کتاب کی آخری سطر لکھتے وقت میری جتنی عمر تھی اب میری عمر اُس سے دوگنی ہو گئی ہے۔ ماکار — خدا حافظ! میں بہت زیادہ تھکن محسوس کر رہی ہوں میں تنہا ہوں اور راتوں کو جاگنے کی مریض ہو چکی ہوں۔

دی۔ ڈی۔

(۱)

جب میرے ابا جان نے وفات پائی تو میں چودہ برس کی تھی۔ میرا بچپن خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ شہزادہ پی کی جاگیر میں میرے ابا جان ناظم کی حیثیت سے ملازم تھے اور ہم لوگ وہاں خوشی سے اور آرام سے رہا کرتے

تھے۔ اور شہزادے کے ایک گاؤں میں کوئی ہمیں جانتا تک نہ تھا۔ وہ گاؤں یہاں سے سینکڑوں میل دور ہے۔ میں بچپن میں کبھی نہ بیٹھتی تھی اور ہمیشہ باغاتِ سیب اگائے ہوں اور جنگلات میں اچھلتی کودتی رہتی تھی۔ ابا جان کو جاگیر کی دیکھ بھال سے فرصت نہ ہوتی تھی اور امی جان کو گھر کے کام کاج سے فراغت نہ نصیب ہوتی تھی۔ لہٰذا میں آزاد ہوتی تھی۔ مجھے پڑھانے لکھانے والا کوئی نہ تھا اور مجھے اس بات کی بہت خوشی تھی۔ میں علی الصبح تالاب کے کنارے جا بیٹھتی تھی، گھنے درختوں کے جھنڈ میں جا پہنچتی تھی وہاں سے چوکڑیاں بھرتا گھاس اور فصل کاٹنے والوں کے درمیان جا کھڑی ہوتی۔ میں نے اس بات کی کبھی پروا نہ کی تھی کہ دھوپ بہت تیز ہے یا میں گھر سے بہت دور نکل آئی ہوں۔ مجھے اس بات کا کبھی خیال نہ رہتا تھا کہ جھاڑیوں میں اُچھلنے کودنے سے میرے ہاتھ یا منہ پر خراشیں آگئی ہیں یا میرا لباس تار تار ہو گیا ہے۔ اور پھر اگر گھر پہنچ کر ڈانٹ بھی پڑ جائے تو کیا فرق پڑتا تھا۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر میری ساری عمر اس گاؤں میں کٹ جاتی تو میں بےحد خوش رہتی۔ لیکن نصیبوں میں کچھ اور لکھا ہوا تھا۔ میں ابھی بارہ برس کی بچی ہی تھی کہ ہم لوگوں کی تبدیلی سینٹ پیٹرس برگ میں ہو گئی۔ اُس روانگی کی یاد سے اب بھی میرے دل پہ چوٹ لگتی ہے۔ مجھے وہاں کی جو چیز عزیز تھی میں نے اُس سے رو رو کر الوداع مانگی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں کیسے سسکیاں بھرتی ہوئی اپنے ابا جان کی گردن سے لپٹ گئی تھی اور اُن سے بلک بلک کر التجا کی تھی کہ ذرا دیر اور رُک جائیں۔ ابا جان خفا ہو گئے تھے اور انھوں نے مجھے ڈانٹ دیا تھا۔ امی جان نے روتے ہوئے مجھے بتایا کہ تیرے ابا کا کام ہی ایسا ہے بیٹی اس لئے ہمیں جانا ہی پڑے گا۔ شہزادہ پی کی وفات ہو گئی تھی۔ اور اس کے جانشینوں نے میرے ابا جان کو برخاست کر دیا تھا۔ میرے ابا جان نے سینٹ پیٹرس برگ میں کچھ تاجروں کے ساتھ حصہ داری کر لی تھی اور ان کا خیال تھا کہ دارالخلافہ میں رہنے سے ہماری حالت سُدھر جائے گی۔ یہ بات مجھے امی جان نے بعد میں بتائی تھی۔ پیٹرس برگ میں پہنچ کر ہم لوگ پیٹرس برگ سٹور دنا میں ٹھہرے تھے اور ابا جان کی وفات تک وہیں رہے تھے۔

نئے ماحول سے آشنا ہونا میرے لئے کس قدر دشوار تھا یہ میں بتا نہیں سکتی۔ ہم بہار کے موسم میں پیٹرس برگ پہنچے تھے۔ لیکن جب ہم اُس گاؤں سے روانہ ہوئے تھے تو اُس دن بڑی پیاری دھوپ تھی۔ فضا میں حدت اور رونق تھی۔ کھیتوں کا کام قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ زمین پر چاروں طرف گندم بکھری پڑی تھی۔ اور اوپر آسمان میں چہچہاتے ہوئے پرندے اڑتے پھر رہے تھے۔ ہر شے پہ ایک حُسن سا چھایا تھا۔ اور جب ہم شہر میں پہنچے تھے تو وہاں سوائے بادلوں کے اور کچھ نہ تھا۔ میرا کسی کو خیال تک نہ رہا تھا۔ اور پہلے ہی دن کتنا دُکھ ہوا تھا کھڑکی کے سامنے تاروں کی باڑ تھی اور نیچے گلی میں زمین کا کوئی حصہ خشک نہ تھا اور پھر بہت کم لوگ گلی سے گذرتے تھے اور جو گذرتے تھے وہ ٹھنڈی ہوا سے بچنے کیلئے لمبے لمبے کوٹوں میں لپٹے رہتے تھے۔

ہمارا گھر بھی نہایت بدنما اور بے رونق تھا۔ ہمارا نہ کوئی رشتہ دار تھا نہ دوست۔ اینا فیڈورنا سے ابا جان کے تعلقات اچھے نہ تھے — (ابا جان کو اُس کا کچھ قرض چکانا تھا) اور گھر میں اکثر و بیشتر ابا جان کے حصہ دار سوداگر آیا کرتے تھے۔ اور وہ بات بات پر جھگڑتے تھے اور بحث کرتے وقت زور زور سے چلایا کرتے تھے۔ ایسے لوگ ہمیشہ ابا جان کو دُکھی کر جایا کرتے تھے اور وہ چڑچڑے سے ہو گئے تھے۔ اُن لوگوں کے جانے کے بعد ابا جان لگاتار کئی پہروں فرش پہ اِدھر سے اُدھر گھومتے رہتے۔ اُس عالم میں ان سے بات کرنے کی ہمت امی جان میں بھی نہ ہوتی تھی اور میں بھی ایک کونے میں کتاب پکڑے چوہے کی طرح دبک کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ سینٹ پیٹرس برگ میں آنے کے تین مہینے بعد مجھے ایک سکول میں بھیج دیا گیا۔ اُن توبہ۔ ان اجنبی چہروں کے درمیان جا کر میرا دل بُجھ کے رہ گیا تھا۔ کوئی بھی تو دوست نظر نہ آتا تھا۔ ماسٹر ہمیشہ مجھے ڈانٹتے رہتے اور لڑکیاں میرا مذاق اُڑایا کرتیں۔ اس قدر پابندی اور سختی تھی کہ بس ہر کام کے لئے مقررہ اوقات ہوتے تھے یہاں تک کہ کھانا کھانے کا وقت مقرر تھا۔ اور ہمارے سبق تو نہایت ہی صبر آزما ہوتے تھے۔ ہر چیز دل شکن اور دُکھ دینے والی تھی۔ شروع شروع میں، تو میری نیند غائب ہو گئی تھی۔ اور میں تمام رات بستر پر لیٹی آنسو بہاتی رہتی۔ وہاں کی ہر چیز سے میرے دل کو دُکھ پہنچتا اور اپنے گاؤں کی معمولی سے معمولی چیز کی یاد سے بھی دل خوش ہو جاتا تھا۔ اور میں ہمیشہ یہ تمنا کیا کرتی تھی کہ کاش میں وہاں پہنچ جاؤں۔ کاش میں اُس چھوٹے سے کمرے میں جا پہنچوں جہاں آشنا چہرے نظر آئیں، ہر چیز آشنا ہو، راحت افزا ہو جاں بخش ہو۔ کیا میں میں خوشی کے مارے والہانہ طور پر اپنی امی جان کے گلے سے لپٹ جاتی۔ میں وہاں بیٹھی یہ سب باتیں سوچا کرتی اور اتنا روتی کہ مجھے پورا سبق بھول جاتا اور تمام رات میں اپنے اُستادوں، سکول کی

[illegible] بہت دلچسپی کے بارے میں خواب دیکھا کرتی اور
[illegible] اپنے سبق اچھی طرح یاد کر لیتی ہوں لیکن [illegible] پہلے ہی
[illegible] ہی پاتی۔ وہ مجھے سر سے لے کر پیر تک غصے سے
[illegible] اور صرف بات کا کھانا دیا کرتے۔ میں ہمیشہ اداس
[illegible] تو لڑکیاں میرا مذاق اُڑایا کرتی تھیں۔ مجھے بدتمیز
[illegible] میں اپنے استاد کے کسی سوال کا جواب دیا کرتی تو
[illegible] کرتی [illegible] بات کرہ یاد رہتیں کہ مجھے سب بھول جاتا تھا۔ کھانے
[illegible] کے وقت جب ہم لڑکیاں بنا کر سکول سے باہر نکلتیں تو وہ سب مجھے
سے دور ستاتی تھیں اور پھر بعد میں خود ہی ہیڈ مسٹرس کے پاس میری شکایت
کرتی تھیں۔ لیکن جب ہر چھوٹی بات کو میں اُن سے ملنے کیلئے آیا کرتی تھی
تو مجھے کتنا اچھا لگتا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح اُن سے لپٹ جاتی اور اُن
کا منہ چوم لیا کرتی۔ وہ مجھے کپڑوں میں اچھی طرح لپیٹ دیا کرتی۔ اور پھر
ہم [illegible] گھر سے نکل جاتیں لیکن جب ہم واپس گھر کی طرف چلتیں تو مجھے
چلتے میں میرا سلام نہ دے سکتی۔ اور میں گھر پہنچنے تک کسی نہ کسی بات پر بولتی
رہتی۔ اور جب میں گھر پہنچتی تھی تو اپنے آپ کو بالکل تازہ دم اور بجید
خوش محسوس کیا کرتی۔ میں اس طرح گھر کے ہر شخص سے لپٹ جاتی اور
اُسے چوم لیا کرتی تھی جیسے میں دس برسوں بعد گھر واپس آئی ہوں۔ اور
پھر گھر میں کیا غل غپاڑہ مچ جاتا تھا۔ ہر شخص ایک دم اپنی بات شروع
کر دیتا اور عجیب و غریب کہانیاں سُننے میں آتیں۔ میں ہر شخص سے لپک کر
ملتی تھی۔ میں زور زور سے ہنستی، شور مچاتی اور اُدھم مچا دیتی تھی۔ پھر
اپنی پڑھائی کے بارے میں ابا جان کے ساتھ بڑی سنجیدہ گفتگو ہوا کرتی
فرانسیسی گرامر، مونڈ کی گرامر اور دو استادوں کے بارے میں
بات چیت ہوتی اور ہر کوئی خوش اور مطمئن نظر آتا تھا۔ اب بھی وہ باتیں
یاد کر کے میں مسکرا اُٹھتی ہوں۔ میں نے اپنے ابا جان کی خاطر سبق یاد
کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ میں جانتی تھی کہ میری پڑھائی پر وہ اپنے
خون پسینے کی گاڑھی کمائی کی آخری پائی تک خرچ کر رہے ہیں۔ اور
خدا جانے وہ کیسے گزارہ کر رہے ہیں۔ وہ دن بدن اُداس، بے چین
اور چڑچڑے ہوتے گئے۔ اُن کے ساتھ نباہ کرنا مشکل ہو گیا۔ اُن کا کاروبار
دن بدن خراب ہوتا گیا۔ اور اُن کے سر پر بھاری قرضہ چڑھ گیا۔ اُن کا بال
بال قرضے میں جکڑ گیا۔ اور قیامت یہ تھی کہ قرضہ اُتارنے کی کوئی صورت
نظر نہ آتی تھی۔ جب میں سکول سے واپس آیا کرتی تو گھر میں ہر شخص کو
اُداس پایا کرتی۔ ابا جان کو الگ تھلگ دیکھا کرتی اور امی جان کی آنکھوں
سے میں صاف بھانپ گئی کہ انہوں نے کوئی اندر کا روگ لگا لیا ہے۔ گھر میں
تُرش اور سخت سست باتیں ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ ابا جان گلہ کیا
کرتے کہ میں انہیں کوئی خوشی نہیں پہنچا رہی کوئی آرام نہیں دے رہی
شکوہ کرتے کہ انہوں نے میری پڑھائی پر آخری پائی تک خرچ کر دی ہے
اور میں فرانسیسی زبان بولنا تک نہیں سیکھ پائی۔ الغرض تمام ناکامیوں
اور مایوسیوں کا الزام مجھ پر اور امی جان پر تھوپ دیا گیا۔ اور اُف!
ابا جان میری امی کو کس طرح اذیتیں دیا کرتے تھے امی جان کو ایک نظر
دیکھتے ہی یہ بدل تمام کر رہ جاتی۔ اُن کے گالوں میں گڑھے، اور اُن کی
آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے اور اُن کا رنگ زرد پڑ گیا تھا لیکن
سب سے بڑی قسمت تو میری تھی۔ ہمیشہ کوئی معمولی سی بات چھڑ جایا کرتی تھی
اور پھر خدا جانتا ہے کہ وہ کیا شکل اختیار کر لیتی۔ اکثر و بیشتر میں یہ بھی بھول جایا
کرتی کہ یہ سب فساد کس لئے ہوا ہے۔ میرے خلاف ہر قسم کا الزام عاید
کر دیا جاتا۔ میں گرامر اور سبق یاد کرنے کی لاکھ کوشش کرتی لیکن تہمت پھر
بھی مجھ پر دھر دی جاتی۔ اور یہ بات بھی نہیں تھی کہ ابا جان کو مجھ سے پیار نہ تھا۔
بلکہ وہ امی جان اور مجھ پر فریفتہ تھے۔ بس یہ اُن کی خوبی تھی۔

اپنی مصیبتوں اور ناکامیوں میں گھِر کر اور اُن سے گھبرا کر میرے ابا جان
جذباتی اور شکی مزاج کے ہو گئے تھے۔ کئی بار یوں ہوا کہ انتہائی مایوسی کے
عالم میں وہ اپنی صحت کا بھی خیال نہ رکھا کرتے اور آخر کار اُنھیں سردی لگ گئی
اور مختصر سی علالت کے بعد چل بسے۔ اُن کی موت اس قدر جلد اور غیر متوقع
طور پر ہوئی تھی کہ کچھ دن تک تو ہم لوگ گُم سُم پاگل سے بنے بیٹھے رہے ہمیں یقین
تک نہ آیا کہ وہ ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے ہیں۔ امی جان کو دورے پڑنے لگے
اور اب مجھے اُن کی فکر لاحق ہوئی۔ میں اُن کے بارے میں سوچ سوچ کر کانپ
اٹھتی تھی۔ ادھر ابا جان کے مرنے کی دیر تھی اُدھر قرض خواہ ہم پر بھیڑیوں کی طرح
جھپٹ پڑے۔ انہوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایک منظم جماعت
بن کر آدھمکے۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی تھا ہمیں سب کچھ دینا پڑا۔ چیئرس برگ
پہنچنے کے چھ مہینے بعد جو چھوٹا سا گھر ابا جان نے خریدا تھا اُسے بیچنا پڑا۔ مجھے
کوئی علم نہیں کہ آخر کار یہ معاملہ کیسے سلجھا تھا لیکن ہم اُس کے بعد بے گھر رہے
اور دو وقت پیٹ پالنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ تب وہ بھی امی جان کو اندر
ہی اندر سے کھائے جا رہی تھی۔ گھر میں نام کو اناج نہ تھا، پیسہ نہ تھا اور
اُس پر ستم یہ تھا کہ کوئی اُمید نہ تھی۔ اُس وقت میری عمر صرف چودہ برس کی تھی

اور یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ اینا فیڈورنا ہم سے پہلی بار ملنے آئی تھی۔ اُس نے یہ بات بار بار جتائی کہ وہ کوئی غیر نہیں تھی اور ہماری رشتہ دار بھی تھی۔ امی جان بھی کہتی تھیں کہ وہ ہمارے رشتہ دار تو ضرور ہے لیکن بہت دُور کی رشتہ دار ہے۔ اباجان کے جیتے جی وہ ہم لوگوں سے ملنے کبھی نہ آئی تھی۔ اب وہ ہمدردی دکھانے کیلئے آنسو بہاتی ہمارے پاس آئی۔ اس نے ہمارے نقصان اور حالات کا حال سُن کر بڑی ہمدردی کی باتیں بنائیں لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ سب قصور اباجان کا تھا۔ وہ اپنی بساط سے باہر پیسہ خرچ کرتے رہے اور وہ ضرورت سے زیادہ شاندار سے رہتے تھے اور ان میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی تھی۔

اُس نے کھلے لفظوں میں یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ہماری دوست بننا چاہتی ہے اور اُس نے امی جان سے کہا کہ ماضی میں جو کچھ ہوا اُسے بھول جانا ہی اچھا ہے۔ اور جب امی جان نے اُسے بتایا کہ اُن کے دل میں کبھی کوئی رنجش یا دشمنی نہ تھی تو اینا خوب روئی بھی تھی۔ وہ امی جان کو گرجے لے گئی اور وہاں اُس نے مرحوم اباجان کی روح کو شانتی پہنچانے کیلئے عبادت کا انتظام کرایا۔ بس اس طرح ہم آپس میں گھل مل گئے۔

اُس کے بعد اُس نے کئی موقعوں پر ہمارے بُرے دنوں، ہماری انتہائی بے کسی اور بے بسی کا ذکر کر کے تجویز پیش کی کہ اُس کا جو چھوٹا سا گھر ہے ہم وہیں جا بسیں۔ امی جان اس پیشکش کیلئے شکرگذار تو بہت ہوئیں لیکن ایک عرصے تک وہ اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر پائیں۔ لیکن اور کوئی راستہ بھی نہ تھا اور ہم کچھ اور کر بھی نہ سکتے تھے۔ آخرکار امی جان نے اینا کو بازراہِ عاجزی اطلاع دے دی کہ اُس کی پیشکش ہمیں قبول ہے۔ بس صبح ہم پیٹرس برگ سے ویلیسکی جزیرے میں جا پہنچے تھے مجھے وہ صبح آج بھی بخوبی یاد ہے۔ مطلع صاف تھا اور صبح خوشگوار تھی۔ امی بالکل رو رہی تھیں اور میں بہت غمگین تھی۔ مستقبل کے دھندلے تصور دل پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ کتنی مصیبت کے دن تھے۔..........

(۲)

اینا کی جاگیر سکتو ریلوے لائن پر واقع تھی۔ اور جب تک ہم گھر کے دستور اور رواج سے آشنا نہ ہوئے تھے تب تک زندگی کا ایک ایک لمحہ پُرخوف اور عجیب انداز سے گذرتا تھا۔ گھر میں پانچ کمرے تھے۔ تین کمرے اینا اور ساشا کے پاس تھے۔ ان کے ساتھ ایک یتیم عورت بھی رہتی ہے۔ اس عورت کو اینا نے اپنایا ہوا تھا۔ چوتھا کمرہ مجھے اور امی جان کو دے دیا گیا تھا اور پانچواں کمرہ کسی غریب طالب علم نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ اُس کا نام مسٹر پوکروفسکی تھا

اینا فیڈورنا جتنی امیر تھی اتنی دیکھنے میں نظر نہ آتی تھی بلکہ اُس کی آمدنی بھی اتنا ہی پُراسرار تھا جتنا اس کا ہر کام۔ وہ کبھی آرام سے نہ بیٹھتی تھی ہمیشہ مصروف رہتی تھی اور کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی تھی۔ اسے ایک بات پوچھی تھی کہ دن میں کئی بار وہ گھر سے باہر جایا کرتی تھی۔ لیکن وہ کرتی کیا تھی یہ تو سوچنے کی طاقت سے باہر تھا۔ اُس کی جان پہچان کے بےشمار لوگ گھر میں آتے ہی رہتے تھے۔ وہ لوگ کون تھے یہ خدا ہی جانے۔ وہ ہمیشہ کسی کام کے سلسلے میں ملتے تھے اور گھر پر بمشکل ایک منٹ کیلئے ٹھہرتے تھے۔ جب بھی باہر دروازے کی گھنٹی بجتی تو امی جان مجھے کمرے کے اندر بُلا لیا کرتیں اور اینا امی جان کی اس حرکت پر بے حد خفا ہوتی تھی۔ وہ امی جان پر برس پڑتی کہ ہم لوگ بہت مغرور ہیں اتنے مغرور جتنی ہماری اوقات نہیں ہے اور وہ کہا کرتی تھی کہ اتنا مغرور ہونے سے ہمارا مطلب کیا ہے۔ اور وہ پہروں ایسی باتیں کہتی رہتی جو اُس وقت اس لعن طعن کا مطلب میں نہ سمجھ سکتی تھی لیکن اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ امی جان اینا کے گھر جانے سے کیوں ہچکچاتی تھیں۔ وہ بدمزاج عورت تھی اور ہمارے لئے وہ مستقل عذاب بن گئی تھی۔ لیکن یہ بات میرے لئے ابھی بھی ایک راز ہے کہ اُس نے ہمیں وہاں آنے کو کہا کیوں تھا۔ پہلے پہل تو وہ کافی رحمدلی سے پیش آئی تھی اور بڑی دیر کے بعد اُس کی اصل فطرت ہم پر کھل سکی تھی لیکن اُس کے رویئے میں فرق تب آیا تھا جب وہ جان گئی تھی کہ ہم بالکل بے بس اور بے یار و مددگار ہیں اور حقیقتاً ہم کہیں اور نہیں جا سکتے۔ بعد ازاں میرے ساتھ اُس کا سلوک پھر اچھا ہو گیا تھا۔ اچانک وہ میرے ساتھ گھل مل بھی گئی تھی اور میری چاپلوسی بھی کیا کرتی تھی۔ لیکن میں نے اُس کے ہاتھوں امی جان سے کم اذیت برداشت نہیں کی۔ وہ بار بار اپنی سخاوت کا ذکر چھیڑ دیتی بلکہ اس کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہ کیا کرتی تھی۔ وہ ہمیں اجنبی لوگوں سے اس طرح متعارف کراتی جیسے ہم اُس کے یتیم رشتہ دار تھے جنہیں اُس نے عیسائی خیرات کے ناطے پناہ دی ہو۔ کھانا کھاتے وقت وہ حسد بھری نظروں سے ہمارا ایک ایک لقمہ دیکھا کرتی اور اگر ہم لوگ کم کھانا کھاتے تو پھر ڈانٹ پھٹکار شروع ہو جاتی: ہم لوگ نازک اور حساس طبیعت کے تھے۔ اُس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا ہمیں راس نہ آتا تھا۔ وہ طنز کیا کرتی کہ کیا کبھی ہم نے اس سے اچھی کوئی چیز دیکھی بھی ہے۔ اباجان کو بُرا بھلا کہنے سے وہ کبھی باز نہ آتی تھی۔ کہا کرتی تھی کہ ہمارے اباجان نے دوسرے لوگوں سے اچھی زندگی گذارنے کی کوشش کی۔ لیکن انجام کتنا بُرا ہوا؟ اپنے بال بچوں کو بھکاری بنا کر رکھ دیا ہے اور اگر وہ فراخ دل اور نیک دل رشتہ دار نہ ہوتی تو کون جانے کہ ہم لوگ سڑکوں پر بھوکوں مر رہے ہوتے۔ اُس نے کیا نہیں کہا۔ اُس کی باتیں

سُن سُن کر بکنا کم ہوتا تھا اصل میں بغاوت کا جذبہ زیادہ پیدا ہوتا تھا۔ امی جان تو بابا کی باتیں سُن سُن کر رو دیتی تھیں۔ اور اُن کی صحت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ واضح نظر آتا تھا کہ وہ قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ صبح سے لیکر رات تک کام کرتی رہتیں اور اکثر و بیشتر ہم کپڑے سینے کا کام کیا کرتی تھیں۔ اینا اس پر بھی خفا ہوتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ اس کا گھر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ماں تو اپنے کپڑے خریدنے اور آئے دن کے اخراجات پورے کرنے کیلئے کام کرنا تھا۔ علاوہ ازیں ہم اس کوشش میں بھی تھیں کہ کچھ پیسہ جمع کرکے کہیں اور چلے جاتے۔ لیکن اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ امی جان کی رہی سہی صحت بھی جواب دے گئی۔ بیماری اُن کی جان کو بن آئی اور جوں جوں ہفتے گذرتے گئے میں امی جان کو موت کے مُنہ میں جاتی دیکھتی رہی۔ ہم دونوں یہاں چُپ چاپ رہا کرتی تھیں۔ بالکل جیسے دیہات میں رہ رہی ہوں۔ اور جیسے جیسے اینا کو احساس ہوتا گیا کہ ہم دونوں کبھی قصہ اس کے بس میں ہیں تو وہ بھی اکڑتی گئی۔ کبھی کوئی سوچ تک نہ سکتا تھا کہ اُس کی مرضی کے خلاف کچھ کیا جائے۔ ہمارے اور اُس کے کمرے کے درمیان ایک برآمدہ پڑتا تھا اور ہمارے ساتھ والا کمرہ پوکروفسکی کا تھا۔ وہ بیچارہ ساشا کو فرانسیسی، جرمن، تواریخ، جغرافیہ وغیرہ جیساکہ اینا نے کہا تھا۔ سائنس کی بھی کتابیں پڑھاتا تھا اور اُس کے معاوضے میں اُسے کمرہ اور دو وقت کی روٹی ملتی تھی۔ ساشا کی عمر اس وقت تیرہ (۱۳) برس کی تھی اور وہ بہت حاضر جواب تھی لیکن اس میں ایک گنوارپن بھی تھا۔ ایک بار اینا نے کہا کہ ساشا کے ساتھ میں بھی پڑھ لیا کروں کیونکہ سکول میں میری تعلیم ادھوری رہ گئی تھی تو امی جان نے بخوشی اس پیشکش کو قبول کرلیا۔ میں بھی ساشا کے ساتھ پڑھنے لگی اور پوکروفسکی نے ایک سال تک ہم دونوں کو تعلیم دی۔

پوکروفسکی بہت ہی مفلس نوجوان تھا۔ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت اس کی صحت نہ دیتی تھی۔ اور اُسے محض عادت کی بنا پر طالب علم کہا جاتا تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے وہاں رہتا تھا کہ ہمیں اس کے کمرے سے آواز تک نہ سُنائی دیتی تھی۔ اور اُس کی شکل و صورت بھی عجیب و غریب تھی۔ اُسکے چلنے کا انداز بہت ہی بے ڈھنگا تھا۔ اُس کے آداب کرنے کا انداز بہت بھدا تھا۔ اور اُس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ پہلے دن تو میں اپنی ہنسی نہ ضبط کرسکی تھی۔ ساشا اس کے ساتھ ہمیشہ اٹکھیلیاں کیا کرتی تھی اور خاصکر پڑھائی کے دوران میں تو اُسے ضرور اُلّو بنایا کرتی تھی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ بدمزاج تھا اور ذرا سی بات پر اُس کا پارہ چڑھ جاتا تھا۔ پھر وہ غصے میں آکر چلایا کرتا اور شکایتیں کیا کرتا اور کبھی کبھی تو سبق ادھورا چھوڑ کر ہی کمرے سے باہر نکل جاتا تھا۔ اور بس پھر وہ کئی کئی دن اکیلا کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اور اپنی کتابوں میں کھو جاتا۔ اُس کے کمرے میں کئی کتابیں تھیں۔ سب کی سب نایاب اور قیمتی۔ دراصل تو وہ پیسہ بھی کمایا کرتا تھا کیونکہ وہ اور جگہوں پر بھی پڑھانے جاتا تھا۔ اور جونہی اُسے کہیں سے تنخواہ ملتی تھی وہ مزید کتابیں خرید لیتا تھا۔ جیسے جیسے میری اُس کی جان پہچان بڑھتی گئی تو میں محسوس کرنے لگی کہ میں نے اتنا اچھا اور نیک دل شخص کبھی نہیں دیکھا۔ امی جان اس کی بہت عزت کرتی تھیں۔ اور بعد ازاں تو امی جان کے بعد وہ میرا بہترین دوست تھا۔ لیکن پہلے پہل میں بھی ساشا کے ساتھ مل کر اُس پر پھبتیاں کس دیتی تھی۔ ایک بار جب ہم نے اُسے اتنا ستایا کہ اُس کے آنسو نکل پڑے تو میں نے اُسے یہ کہتے ہوئے سُنا تھا "کتنے ظالم بچے ہیں" اور ایک دم مجھ میں تبدیلی آگئی۔ مجھے بڑی شرم آرہی تھی اور اپنے سلوک پر افسوس ہو رہا تھا۔ میں بُری طرح شرما رہی تھی اور میری آنکھیں قریب قریب بھیگ گئی تھیں۔ میں نے اُس سے معافی مانگی اور کہا کہ ہماری احمقانہ حرکتوں کا بُرا نہ مانے۔ لیکن اُس نے کتاب بند کردی اور سبق ختم کرائے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں سارا دن روحانی اذیت میں مبتلا رہی اور یہ سوچ سوچ کر اپنے آپ کو کوستی کہ ہم نے اُس غریب کو رُلا دیا۔ کیا ہم توقع نہ کرتی تھیں کہ وہ رو دے گا؟ کیا ہم چاہتی تھیں کہ وہ رو دے؟ اور بس اسی جذبے کے تحت ہم نے اُس مغموم اور مفلس شخص کی حالت پر طعنے دیے کر اُسے اپنی بے بسی کا احساس دلا دیا۔ اُس رات میں ایک پل کیلئے نہ سو سکی تھی۔ میں اپنے آپ کو رہ رہ کر بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ میں بہت غمگین تھی بہت دکھی تھی۔ کہاوت ہے کہ تاسف سے دل کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کہاوت کتنی جھوٹی ہے۔ اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ میرے رنج کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی جذبہ چھپا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے بچہ سمجھے اور میرے ساتھ بچوں جیسا سلوک کرے۔ میں پندرہ برس کی ہو چکی تھی۔

اس دن سے میرے دماغ نے ہزار ترکیبیں سوچیں کہ میرے متعلق پوکروفسکی کا رویہ کیسے بدلا جائے اور ہر ترکیب میرے لئے اذیت دہ تھی مجھے سوچتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی۔ لیکن میں شرمیلی تھی اور پھر ڈرپوک بھی اور مبہم خواب لینے کے سوائے کسی صحیح فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔ (اور خواب بھی کتنے بے معنی تھے) میں فقط اتنا ہی کرسکی کہ اس کے ساتھ مذاق کرنے میں ساشا کا ساتھ نہ دیا کرتی تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے ہم سے بگڑنا چھوڑ دیا۔ لیکن اس سے میرے غرور کی تسکین نہ ہوئی۔

اسی مکان میں ایک سب سے عجیب، دلچسپ اور قابل رحم شخص

کے بارے میں ضرور کچھ کہوں گی۔ میں اس موقع پر اس کا ذکر اس لئے کر رہی ہوں کہ اس سے پہلے میں نے اُس پر کبھی توجہ نہ کی تھی اور توجہ بھی صرف تبھی دینی شروع کی تھی جب اُس کے متعلق یہ واقعہ اہم ہو گیا۔

کبھی کبھار ایک پست قد بوڑھا شخص اس گھر میں آیا کرتا تھا۔ اُس کا لباس تار تار ہوتا، سر کے بال بھورے رنگ کے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے عجیب و غریب شخصیت تھا۔ یوں جان پڑتا تھا کہ وہ ہمیشہ کسی چیز سے شرمایا کرتا تھا۔ اُس کو اپنے آپ سے شرم آتی تھی۔ اس جذبہ کے تحت وہ اندر ہی اندر سکڑتا رہتا اور ایسی ایسی حرکات کر بیٹھتا کہ دیکھنے والے کو خواہ مخواہ گمان ہونے لگتا کہ آیا یہ شخص اپنے ہوش و حواس میں تو ہے۔ گھر تک پہنچتے ہی وہ شیشے والے دروازے کے باہر کھڑا ہو جاتا اور اندر آنے سے ڈرتا رہتا جب کوئی وہاں سے گزرتا مثلاً میں یا ساشا یا اینا کوئی رحمدل نوکر تو وہ وہیں سے کھڑے کھڑے ہمیں عجیب و غریب اشاروں سے کچھ پوچھا کرتا۔ اور جب ہمارے جواب سے اُسے تسلی ہو جاتی کہ گھر میں اس وقت کوئی اجنبی نہیں ہے اور وہ بخوشی اندر آ سکتا ہے تو وہ کپکپاتا ہوا دروازے کو کھولتا اور عجیب حسرت بھرے انداز میں اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے پنجوں کے بل پوکروفسکی کے کمرے تک جا پہنچتا۔ یہ شخص پوکروفسکی کا باپ تھا۔

مجھے اُس کے بارے میں پوری کہانی بعد میں معلوم ہوئی تھی۔ بہت پہلے وہ کسی جگہ کلرک کی حیثیت سے ملازم تھا۔ لیکن اُس نے کام میں کوئی ذہانت نہ دکھائی لہٰذا اُسے ایک واجبی سا کام دے دیا گیا تھا۔ جب اُس کی پہلی بیوی یعنی پوکروفسکی کی ماں وفات پا گئی تو اُس نے نئی شادی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بس اُس کی نئی بیوی آنے کی دیر تھی کہ اُس کے بُرے دِن آ گئے۔ وہ جو بھی قدم اُٹھاتا وہی غلط پڑتا۔ وہ عورت کسی کو بھی اکیلا نہ رہنے دیتی تھی اور اُس نے ہر شخص کو اپنے بس میں کر لیا۔ اُس وقت پوکروفسکی کی عمر دس برس کی تھی۔ اُس کی سوتیلی ماں اس سے سخت نفرت کرنے لگی لیکن قسمت نے پوکروفسکی کا ساتھ دیا۔ بائیکوف نام کا ایک زمیندار اس کے باپ کو جانتا تھا۔ اس نے پوکروفسکی کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور اُسے تعلیم حاصل کرنے کیلئے سکول میں داخل کرا دیا۔ اُس نے پوکروفسکی میں اس وجہ سے بھی خاص دلچسپی دکھائی کیونکہ وہ اس کی مرحومہ والدہ سے متعارف تھا۔ اس کی والدہ اس وقت نوجوان تھی جب وہ بائیکوف سے متعارف ہوئی تھی۔ اس کا تعارف اینا فیدوروونا کی معرفت ہوا تھا۔ بعد ازاں اس کی شادی پوکروفسکی کے باپ سے ہو گئی تھی۔ بائیکوف اینا کا بہت ہی قریبی اور گہرا دوست تھا۔ اس نے پوکروفسکی کی ماں کی شادی پر اتنی سخاوت سے کام لیا تھا کہ اُس نے جہیز کے طور پر 5000 روبل دئیے تھے۔ یہ راز کسی کو معلوم نہیں کہ اُس رقم کا کیا بنا۔ اینا سے مجھے یہیں تک معلوم ہو سکا تھا۔ نوجوان پوکروفسکی شاذونادر ہی اپنے خاندان کے بارے میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ سُننے میں آیا ہے کہ اُس کی ماں بہت حسین تھی اور میرے خیال میں اس سے زیادہ عجیب بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ اُس نے پوکروفسکی کے باپ سے شادی کر لی۔ لیکن وہ نوجوانی ہی میں چل بسی۔ یعنی شادی کے صرف چار سال بعد اُس کی وفات ہو گئی تھی۔ سکول کی تعلیم مکمل کر کے پوکروفسکی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ مسٹر بائیکوف نے یونیورسٹی کے اخراجات کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر لے لیا۔ مسٹر بائیکوف اکثر و بیشتر سینٹ پیٹرس برگ آتے جاتے تھے۔ جب خراب صحت کی بنا پر نوجوان پوکروفسکی کو یونیورسٹی چھوڑنی پڑی تو بائیکوف نے اینا کو سفارش کر دی کہ اُسے اپنے پاس بُلا لے۔ اور اینا نے اس کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ساشا کو تعلیم دے گا اور اینا اسے رہنے کی جگہ اور دو وقت کا کھانا دے گی۔ اُدھر پوکروفسکی کے باپ کو اس کی نئی بیوی نے اس قدر دکھی کر دیا کہ اُس نے شراب نوشی شروع کر کے اور رفتہ رفتہ سب بُرے کام کرنے شروع کر دئیے۔ اُس کی بیوی اُس کو پیٹا بھی کرتی تھی۔ اُس سے رسوئی کا سارا کام کرایا کرتی تھی اور اس عورت نے اس کو ذِلت سہنے کا اس قدر عادی بنا دیا کہ اب وہ ذلیل ترین سلوک کا شاکی نہ ہوتا تھا اور مار پیٹ سے نہ اُسے جسمانی تکلیف پہنچتی تھی نہ وہ مار پیٹ کی شکایت کیا کرتا تھا۔ حالانکہ یہ شخص عمر کے لحاظ سے ابھی بوڑھا نہ ہوا۔ لیکن کثرت سے مے نوشی کرنے کی بنا پر اس کی صحت بگڑنے لگی۔ اب اُس شخص میں انسانی نفاست کا ایک ہی جذبہ باقی رہ گیا تھا اور وہ تھا پوکروفسکی سے گہرا لگاؤ۔ اس کی ایک یہ بھی وجہ تھی کہ نوجوان پوکروفسکی اُس کی پہلی بیوی کی ہوبہو تصویر تھا۔ ممکن ہے کہ اُس کی پہلی بیوی کی محبت اور اُس عورت کی رحمدلی اور عقیدت اس جذبے میں کارفرما ہو کر یہ دل شکستہ بوڑھا شخص پوکروفسکی سے اس قدر پیار کرتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے علاوہ کوئی اور بات سوچ سکتا تھا نہ کہہ سکتا تھا۔ وہ ہفتے میں دو بار پوکروفسکی سے ملنے کیلئے آیا کرتا تھا لیکن اس سے زیادہ بار وہ نہ آ سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے بیٹے سے ملتے ہوئے بھی ڈرتا رہتا تھا۔ اور پھر نوجوان پوکروفسکی کو یہ دو بار کا ملنا بھی ناگوار گذرتا تھا۔ نوجوان پوکروفسکی میں جتنے بھی عیب تھے سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ اپنے باپ کی مطلق عزت نہ کرتا تھا لیکن جو کچھ ہو وہ بوڑھا شخص دنیا کے

ہر شخص سے زیادہ دکھی تھا۔ اُس کے دُکھوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔

بوڑھا باپ اپنے بیٹے کو پیار سے پینکا پکارا کرتا تھا اور پینکا کی تعریف کرتے کبھی نہ تھکتا تھا۔ وہ جب کبھی اپنے بیٹے سے ملنے آتا تو اُس کے چہرے پر عجیب آثار ہوتے جیسے وہ ڈرا ڈرا اور سہما ہوا کمرے میں جانا چاہتا ہو کیونکہ اس شخص کو کبھی یہ علم نہ ہو سکتا تھا کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کا سواگت کس انداز میں کیا جائے گا۔ وہ دروازے کے باہر کھڑا ہچکچاتا رہے گا اور اگر کوئی اُس طرف سے گزر رہا ہو جائے تو پورے بیس منٹ مجھ سے سوالات کرتا رہتا۔ پینکا کیسا ہے۔ اُس کی صحت کا کیا حال ہے اور اس وقت اُس کے مزاج کیسے ہیں۔ کیا وہ کسی بہت ہی ضروری کام میں مصروف تو نہیں اور اگر کسی ضروری کام میں مصروف ہے تو وہ کیا کام ہے۔ کس نوعیت کا ہے۔ کچھ لکھ رہا ہے یا صرف اپنے دھیان میں گم بیٹھا ہے؟ اور جب میں اُس بوڑھے شخص کو اچھی طرح ڈھارس بندھا دیتی اور اُسے بار بار یقین دلاتی تو وہ کچھ جھجکتے ہوئے دروازے کو آہستہ سے کھولتا تھا لیکن دروازہ کھولتے وقت اُس کے چہرے پر عجیب کھسیانی مسکراہٹ اُبھر آتی تھی۔ پھر وہ ذرا سا اندر جھانکتا تھا۔ جب اُس کی تسلی ہو جاتی تھی کہ اُس کا بیٹا غصے میں نہیں ہے بلکہ اُس نے سر ہلا کر اندر آنے کو بھی کہہ دیا ہے تو وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو جاتا تھا۔ اپنا اوورکوٹ اور ہیٹ اور تار تار کوٹ اُتار انہیں بڑی احتیاط سے کھونٹی پر لٹکا دیتا تھا۔ اور پھر بڑی احتیاط سے خود ایک کرسی میں دھنس جاتا تھا۔ اُس کی نظریں اپنے بیٹے کے چہرے سے ایک پل کے لئے نہ ہٹتی تھیں جیسے وہ پینکا کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر رہا ہو۔ اور اگر کہیں پینکا کے چہرے پر ذرا سے بھی برہمی کے آثار پیدا ہوتے تو وہ بوڑھا شخص ایک دم بھانپ جاتا تھا۔ اور منہ میں بڑبڑاتا ہوا کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوتا تھا کہ میں تو یونہی بس ایک منٹ کے لئے آیا تھا۔ ادھر سے گزر رہا تھا تو تمہیں دیکھنے کیلئے چلا آیا۔" پھر نہایت کھسیانہ انداز میں اپنا کوٹ اور ہیٹ کھونٹی سے اُتارتا۔ آہستہ سے دروازہ کھولتا اور پنجوں کے بل باہر نکل جاتا۔ اپنی مایوسی اور شرمندگی کو چھپانے کیلئے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کر لیتا۔

لیکن جب اُس کا سواگت اچھی طرح ہوتا تو وہ بوڑھا شخص خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ اُس کے چہرے کی ایک ایک جھُرّی سے اُس کی ایک ایک حرکت سے تسلی اور مسرت جھلکتی تھی۔ اگر پینکا اُس سے کہیں بات شروع کر دیتا تو بوڑھا باپ نہایت عاجزی اور ادب سے کرسی سے کھڑا ہو کر اُس کی بات کا نہایت ہی سہمے ہوئے، مؤدب انداز میں جواب دیا کرتا۔ لیکن اُس کا ہر جواب احمقانہ ہوا کرتا تھا۔ اُس کے بولنے اور کرسی سے اُٹھنے کے انداز میں ایک چھپی ہوئی دہشت صاف نمایاں تھی۔ بیچارہ کہاں ٹھیک گفتگو کرنے کے قابل تھا۔ وہ تو بے حد اُلجھا ہوا اور سہما ہوا کردار تھا۔ اُس کو یہ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں کا کیا کرے۔ وہ اپنے آپ سے لگا کسمساتا اور وہ دقت یوں بڑبڑاتا رہتا تھا جیسے اپنی ہر بات کی تصحیح کر رہا ہو۔ لیکن کہیں اُس سے ٹھیک جواب بن جاتے تو پھر وہ اپنے کندھوں کو سیدھا کر لیتا تھا۔ اپنی واسکٹ، نکٹائی اور قمیض کو از سر نو درست کرنا شروع کر دیتا تھا۔ اس کے چہرے سے وقار جھلکنے لگتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اتنا دلیر ہو جاتا تھا کہ کرسی سے اُٹھ کر کتابوں کی میز تک چلا جاتا تھا۔ کسی کتاب کو اُٹھا لیتا تھا۔ اور اُس کے ہر ورق پر ایک اُچٹتی سی نظر بھی ڈال لیتا تھا۔ ایسے شاذ و نادر موقعوں پر وہ اس قدر چست اور شگفتہ دل و دماغ کا شخص نظر آتا تھا جیسے اپنے بیٹے کی کتابوں کی دیکھ بھال سے بخوبی واقف ہو جیسے پینکا سے اتنا اچھا سلوک تو متوقع ہی تھا۔ لیکن ایک بار جب اُس کے بیٹے نے اُسے ڈانٹ دیا تھا کہ کتابوں کو وہیں رہنے دے تو اُس وقت میں وہیں موجود تھی۔ خوف کے مارے وہ سہم کر رہ گیا تھا۔ وہ ڈانٹ سے اس قدر گھبرایا اور اتنا ڈرا کہ اُس نے کتاب کو اُلٹا رکھ دیا۔ پھر اُس کی گھبراہٹ اور بڑھی اور اُسے سیدھا کرنے کے رکھنے کی غرض سے اُس نے کتاب کو ٹیڑھا کر کے کھڑا کر دیا۔ لیکن اس دوران میں اپنی خفت کو چھپانے کیلئے وہ برابر مسکراتا رہا۔ اپنی حرکات سے اُس نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ واقعہ نہایت ہی معمولی اور غیر اہم نظر آئے۔

اپنے باپ کی عادات بدلنے کی غرض سے پوکروفسکی اُسے کبھی کبھی کچھ رقم دیتا رہتا تھا۔ لیکن عام طور پر اُسے ۵۰ کوپیکس ہی ملتے تھے ہاں اگر وہ مسلسل تین موقعوں پر کوئی غلطی نہ کرے تو اُسے پچاس یا اُس سے بھی زیادہ کوپیکس مل جاتے تھے۔ یا پوکروفسکی اُسے جوتے خرید دیتا تھا، نکٹائی یا واسکٹ لے دیتا تھا۔ اور اپنے بیٹے سے یہ تحفہ پا کر بوڑھا باپ فخر سے مور کی طرح تن جاتا تھا۔ کبھی کبھار وہ ہم لوگوں سے ملنے بھی چلا آتا تھا۔ وہ ساشا اور میرے لئے سیب اور مٹھائی لے آتا تھا اور پھر پینکا کے بارے میں جی بھر کے گفتگو کیا کرتا تھا۔ وہ نصیحت کرنے کے انداز میں ہم سے کہا کرتا تھا کہ سبق اچھی طرح یاد کیا کرو اور اس بات کو تو سو بار دُہرایا کرتا تھا کہ پینکا فرمانبردار بیٹا ہے بلکہ فرمانبرداری کا نمونہ ہے اور پھر یہی نہیں بلکہ عالم و فاضل ہے۔ اتنا کہہ کر وہ اس طرح آنکھیں مٹکاتا تھا اور ایسی ایسی حرکات کرتا تھا کہ ہنستے ہنستے میری اور ساشا کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔ امی جان بھی اس بوڑھے شخص کو بہت پسند کرتی تھیں۔ لیکن انا ایسے اُس کو سخت

نفرت تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اپنا کی موجودگی میں وہ چوہے کی طرح دبک کر بیٹھا رہتا تھا۔

میری تعلیم اگرچہ قریب قریب مکمل ہونے والی تھی لیکن پیٹنکا اب بھی مجھے ایک بچی سے زیادہ اور کچھ نہ سمجھتا تھا۔ وہ مجھے بھی سادہ سی الھڑ لڑکی سمجھتا تھا اُس کے اس رویئے سے مجھے چوٹ پہنچتی تھی کیونکہ میں اپنی گذشتہ حرکات کی تلافی کرنے کیلئے اپنے آپ کو بہت حد تک بدل چکی تھی۔ لیکن اس کا اُس پر مطلق اثر نہ پڑتا تھا اور اُس کی اس بات سے مجھے اور زیادہ دُکھ ہوتا تھا۔ سبق پڑھنے کے بعد میں نے شاذ و نادر ہی کبھی اُس سے گفتگو کی تھی۔ حالانکہ اگر کبھی موقع بھی ملا تو میری زبان سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا تھا۔ میں شرما جاتی تھی اور میری زبان پر تالا پڑ جاتا تھا۔ پھر میں تنہائی میں چھپ چھپ کر خوب جی بھر کے آنسو بہاتی تھی۔ اور اگر ایک خاص موقع رونما نہ ہوتا تو کون جانے کہ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا۔ ایک شام امی جان تو اپنا کے کمرے میں گئی ہوئی تھیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور پوکروفسکی کے کمرے میں گھس گئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ لیکن اُس کے کمرے میں جانے کا جذبہ اور حوصلہ مجھے کیسے ہوا یہ میں نہیں کہہ سکتی۔ اس سے پہلے میں اُس کے کمرے میں کبھی نہ گئی تھی۔ حالانکہ وہ ایک برس سے زائد عرصے سے میرا پڑوسی تھا۔ میرا دل بڑی طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلے تو میں نے ڈرتے ڈرتے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ اُس وقت میرے دل میں ایک عجیب اشتیاق چٹکیاں لے رہا تھا۔ کمرے کے رکھ رکھاؤ میں کوئی سلیقہ یا قرینہ نہ تھا۔ کرسیاں اور میزیں اوّل تو گنتی کی تھیں اور پھر وہ بھی ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ساتھ کتابوں کی پانچ قطاریں تھیں۔ کرسیاں اور میزیں کاغذات سے لدی پڑی تھیں۔ ہر جگہ کتابیں اور کاغذ ہی کاغذ تھے۔ اور عین اُس وقت میرے دماغ میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا۔ اُس جذبے نے میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل پیدا کر دی کہ وہ شخص میری دوستی اور میرے خلوص کی کیوں پروا کرنے لگا۔ وہ ایک عالم شخص ہے اور میں ایک بیوقوف اور ان پڑھ لڑکی ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ میں نے کچھ نہیں پڑھا۔ ایک بھی کتاب نہیں پڑھی۔ میں نے حسد بھری نظروں سے اُن کتابوں کے بلندے کو دیکھا۔ مجھے اس قدر دُکھ ہوا اور غصہ آیا کہ جی میں آیا میں یہ تمام کتابیں ایک ہی سانس میں پڑھ جاؤں۔ عین ممکن ہے میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر میں بھی اُس جیسی عالم بن جاؤں تو شاید وہ میری دوستی کی قدر کرنے لگے۔ جلد جلدی میں نے ایک پرانی لیکن ضخیم کتاب اُٹھائی۔ کتاب کی جلد پر گرد کی گہری تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں نے اُس کتاب کو سینے سے بھینچ کے لگا لیا اور ہانپتی ہوئی اُس کے کمرے سے

بھاگ آئی۔ میں شدتِ ہیجان کے مارے سر سے لیکر پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ میں اس قدر شرما رہی تھی کہ میرا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ رات لیمپ کی روشنی میں ساری کتاب پڑھ ڈالوں گی۔ امی جان تو سو جائیں گی لہذا میرا کسی پر فاش نہ ہو گا۔ لیکن جب میں نے اپنے کمرے میں جا کر کتاب کھولی تو میری مایوسی کی انتہا نہ رہی۔ اُس کتاب کے ورقوں کو دیمک لگی ہوئی تھی۔ ورق ورق خستہ تھا اور سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ کتاب لاطینی زبان میں لکھی تھی۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور پلٹ کر واپس اُس کے کمرے میں جا پہنچی ابھی میں کتاب کو اصل جگہ پہ رکھنے ہی والی تھی کہ باہر قدموں کی آواز سُنائی دی۔ میں نے اُس مردود کو سنبھالنے کی لاکھ کوشش کی۔ اور پھر اُدھر یہ مصیبت بھی تھی کہ میز پر کتابیں اس طرح اَٹی پڑی تھیں کہ مجھے اُس کی اصل جگہ بھی نہ سمجھ میں آئی۔ میں اُس کتاب کو اُس کی اصل جگہ پہ دوبارہ نہ رکھ سکی۔ میں باقی کتابوں کو جلدی جلدی اور پوری طاقت سے اِدھر اُدھر کر رہی تھی تاکہ کسی طرح اُس کے لئے جگہ ہو جائے۔ میرا خیال جن کیل پر کتابوں کی وہ کھونٹی ٹنگی ہوئی تھی وہ شاید اسی لمحے کا منتظر تھیں۔ اور پورے کا پورا کتابوں سے بھرا ہوا تختہ نیچے زمین پر آ رہا۔ کیا کتابیں کیا کاغذ اور کیا باقی چیزیں زمین پر ایک انبار لگ گیا۔ اُدھر دروازہ کھلا اور پوکروفسکی کمرے میں داخل ہوا۔

یہاں میں یہ لکھ دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ اُس نے یہ کبھی برداشت نہ کیا تھا کہ کوئی شخص اس کی کتابوں کو ہاتھ لگائے۔ اور اگر کوئی ہاتھ لگا بیٹھے تو اُسکو خدا ہی بچائے۔ اب اس واقعے اور اس حقیقت کو جاننے کے بعد ذرا میری حالت کا اندازہ لگایئے۔ ضخیم، چھوٹے حجم کی، درمیانے حجم کی، پتلی پتلی، موٹی موٹی کتابیں چاروں طرف فرش پر بکھری پڑی تھیں۔ کرسیوں اور میزوں کے نیچے جا پڑی تھیں۔ میں نے بہت چاہا کہ بھاگ نکلوں لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ بس یہ خاتمہ ہے۔ ہر چیز کا خاتمہ ہے۔ میری تمام عزت ختم ہے، میرا سب کیا دھرا مٹی میں مل گیا۔ دس برس کی جاہل اور بے وقوف لڑکی کی طرح میں یہ حرکت کرتی ہوئی پکڑی گئی ہوں۔ کس قدر بے وقوف ہوں میں۔ پوکروفسکی غصے کے مارے پاگل ہو اُٹھا تھا۔ اور وہ چلایا۔ "اب اور کیا کرنے والی ہو؟ ایسی واہیات حرکتیں کرتے ہوئے تمہیں کیا شرم نہیں آتی۔ تم کب سمجھدار ہو گی؟" اور وہ میرے ساتھ کتابیں اُٹھانے کیلئے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کی مدد کرنے کیلئے جھکی تو جھڑک کر بولا۔ "آپ مہربانی کرو۔ جب تمہیں کسی نے بلایا نہیں تھا تو عقلمندی اسی میں تھی کہ یہاں تشریف نہ لاتیں۔" لیکن وہ میری نادم نگاہوں اور عاجزی سے بھرے ہوئے انداز سے سب کچھ سمجھ گیا اور

[illegible] آگئی۔ اب اس کی آواز میں سی [illegible] تھی جیسے وہ
[illegible] رہا ہو۔ آخر میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں تمہیں عقل کب آئے گی۔ خدا کے لیے
[illegible] نہیں ہوں کہ سن نہیں ہے تم نیند سے جوگی ہوتے اور پھر جیسے
[illegible] بیمار رہو گی۔ اس نے نظریں اوپر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر
کچھ شروع ہو گیا۔ میں کچھ نہ کر سکی۔ میں گھر سے اسے تکر تکر دیکھتی
رہی۔ ایک دم وہ ہوا تو یوں نظر آتا تھا جیسے وہ کچھ گھبرایا ہوا
تھا اور جب اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے
اسے مناسب الفاظ دل سے ہی بھول گئے۔ نہ جانے وہ کس بات کی معافی
مانگ رہا تھا۔ شاید اسے ایک دم خیال آگیا تھا کہ میں ایک جوان لڑکی ہوں
اور لیٹی ہوں سب کچھ کر گئی۔ اس وقت نے کیا کیا، مجھے کچھ نہیں پتا۔ مجھے
صرف اتنا پتا ہے کہ میں اس طرح لجائی کہ سمٹ کر گٹھڑی سی ہو گئی۔ میں اپنی
شرم سے بھول گئی تھی۔ میں نے اپنا منہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا اور کمرے سے
بھاگ کھڑی ہوئی۔

مجھے شرمندگی کا احساس اتنا شدید ہو رہا تھا کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا
کیا کروں۔ میں بار بار سوچتی کہ مجھے اپنے کمرے میں پا کر وہ کیا سوچتا ہوگا۔
اس نے اپنی غیر موجودگی میں تن تنہا مجھے وہاں پایا تھا۔ تین دن تک میری ہمت
نہ پڑتی تھی کہ اس کے سامنے آ سکوں یا اس کی آنکھ سے آنکھ ملا سکوں۔ میں اس قدر
نادم تھی کہ آخر ایک دن میرے آنسو بہہ نکلے۔ میرے دل میں عجیب غریب
اور الجھے الجھے خیالات امڈ کے چلے آتے تھے۔ اور سب سے عجیب خیال
یہ تھا کہ سیدھی اس کے پاس چلی جاؤں اور ساری بات اسے صاف صاف
بتا دوں اور اسے یقین دلا دوں کہ میں ایک جاہل اور بے حد بے وقوف لڑکی نہیں
ہوں۔ لیکن میں نے کچھ ایسی بات سوچی تھی۔ میرا ارادہ برا نہ تھا۔ میں نے اس
سے ملنے کا فیصلہ کر لیا لیکن ہمت نہ پڑی۔ اور میرا خیال ہے خدا کا لاکھ
لاکھ شکر ہے کہ میں اس سے ملنے نہیں چلی گئی۔ میں اچھی طرح اندازہ کر سکتی
ہوں کہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے میں کس قدر بے حد بے وقوف نظر آتی۔ اب بھی اس
بات کا خیال میرے دل میں آتا ہے تو میں شرمندہ سی ہو جاتی ہوں۔

میری امی جان سخت بیمار پڑ گئیں۔ وہ اتنی سخت بیمار ہو گئیں کہ
تیسری رات ان کا بخار بہت تیز ہو چکا تھا اور وہ بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے
بھی لگیں۔ میں ایک منٹ کیلئے بھی امی کے بستر سے نہ ہلی۔ میں انہیں وقت
پر دوا اور پانی دیتی رہی۔ لیکن دوسری رات میں تھکن سے چور ہو چکی تھی۔
اور اپنی نیند پر بمشکل قابو پا سکی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے ہرے ہرے
دھبے تیرنے لگے اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرے ارد گرد ہر چیز جھوم
رہی ہے۔ اگر امی جان کی نحیف اور کمزور ہائے ہائے میرے دل کو چیرتی
نہ رہتی تو میں کب کی سو گئی ہوتی۔ میں بار بار سنبھل کر بیٹھتی لیکن نیند کا خمار
پھر مجھ پر غلبہ پا لیتا۔ واقعی میں ایک عذاب سہہ رہی تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں
لیکن ایک لمحے کے بعد جب میں کچھ کچھ نیم خوابی کے عالم میں تھی تو ایک عجیب
غریب سپنے نے بلکہ ایک ایسے بھیانک منظر نے میرے منتشر دل و دماغ کو
جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ صرف موم بتی
کی لو ٹمٹما رہی تھی۔ اور اس کی روشنی سے دیواروں پر کچھ کچھ ہلکی سی روشنی
پڑ رہی تھی۔ میرے احساس پر ایک دہشت طاری ہو گئی۔ میں نے خوفناک
سپنا دیکھ رہی تھی اور جاگنے پر بھی اسے اپنے دل سے جھٹک نہ سکی تھی۔ میرا
دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ میں ڈرتی ہوئی اور سہمی ہوئی چیخ کر کرسی سے اچھل
پڑی۔ میری چیخ سے صاف ظاہر تھا کہ مجھ سے اور زیادہ عذاب برداشت
نہیں ہو سکتا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور پوکرووسکی کمرے میں داخل ہوا۔
مجھے اتنا یاد ہے کہ جب میں ہوش میں آئی تھی تو اس کی باہوں میں تھی۔
اس نے سہارا دے کر بڑے آرام سے مجھے کرسی میں بٹھا دیا۔ پھر وہ اٹھا
اور میرے لئے پانی کا گلاس لے آیا۔ اس کے بعد اس نے مجھ پر سوالات کی
بوچھاڑ کر دی۔ میں نے جواب میں کچھ کہا ضرور تھا لیکن مجھے کچھ یاد نہیں کہ
میں کیا کہہ گئی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "تم تو بیمار ہو۔
بہت سخت بیمار ہو۔ تمہارا جسم تپ رہا ہے۔ کیوں اپنی صحت برباد کر رہی
ہو۔ لیٹ جاؤ اور سو جاؤ۔ میں دو گھنٹے بعد پھر آ جاؤں گا۔ اچھا لیٹ جاؤ"
وہ میری کوئی بات سنے بغیر اپنی کہتا رہا۔ میں محض تھکاوٹ کے مارے گری
جا رہی تھی۔ میری آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ میں سستانے کی غرض سے کرسی
ہی میں ٹیڑھی سیدھی ہو کر لیٹ گئی لیکن میں صبح تک سوتی رہی۔ اور وہ بھی
پوکرووسکی نے آ کر مجھے جگایا کیونکہ امی جان کو دوا دینے کا وقت ہو گیا تھا۔
اگلی رات میں امی جان کے بستر پر بیٹھ گئی اور میں نے من ہی من میں تہیہ کر لیا
تھا کہ سوؤں گی نہیں۔ گیارہ بجے پوکرووسکی نے دروازے پر دستک دی۔
میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا "لیلا
اکیلی بیٹھی بیٹھی کیا تنہائی نہ محسوس کرو گی۔ لو یہ کتاب پڑھتی رہو۔ اس سے
وقت کٹنے میں مدد مل جائے گی۔" میں نے کتاب لے لی اور اس کا جی کڑا کر
شکریہ ادا۔ میں ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتی کہ وہ کتاب کونسی تھی یا میں نے وہ
کتاب کھولی بھی تھی یا نہیں لیکن ایک بات ضرور ہے کہ میں اس رات ایک

ملی کیلئے نہ سوئی تھی ایک عجیب جذبے نے مجھے ساری رات جگائے رکھا۔ میں بے چین ہو اٹھی۔ میرے لئے دو گھڑی کرسی پہ بیٹھنا محال ہو گیا اور میں بار بار اُٹھ کر کمرے کے چکر لگاتی رہی۔ مجھے ایک عجیب مسرت اور گرمجوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی اس توجہ اور فکر پر میں خوش بھی تھی اور فخر بھی محسوس کر رہی تھی۔ میں ساری رات کچھ سوچتی رہی اور خیالات کا طومار باندھتی رہی۔ وہ دوبارہ نہیں آیا اور میں جانتی تھی کہ وہ آئے گا بھی نہیں۔ پر میں بار بار یہی سوچتی رہی کہ کیا وہ کل رات پھر آئے گا۔

اگلی شام جب اندھیرے بڑھ رہے تھے اور ہر شخص سونے کی تیاری کر رہا تھا تو پوکرونسکی نے اپنا دروازہ کھولا اور دہلیز پہ کھڑا مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ ہم نے ایک دوسرے سے کیا کچھ کہا تھا۔ بس مجھے تو اتنا یاد ہے کہ میں شرما رہی تھی، بات کرتے وقت میرے خیالات الجھ رہے تھے اور مجھے رہ رہ کر خود پر غصہ آ رہا تھا۔ میں اس وقت اس بات کی منتظر تھی کہ اب یہ گفتگو ختم ہونی چاہیئے حالانکہ میں نے اس کے ساتھ بات کرنے کیلئے ہزار بار دُعائیں مانگی تھیں، خواب دیکھے تھے اور دل ہی دل میں سوال و جواب کی خوب تیاری کی تھی۔ اُسی شام سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ پھر جب تک امّی جان بیمار رہیں، ہم دونوں ہر رات کئی کئی گھنٹے اکٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنی جھجک پہ قابو پا لیا۔ ہاں یہ بات اور تھی کہ جب بھی ہماری گفتگو ختم ہوتی تو میں اپنے آپ سے خفا نظر آتی۔ میں دل ہی دل میں اس بات پر بہت خوش تھی کہ پوکرونسکی کتاب والا واقعہ بھول چکا ہے۔ لیکن ایک دن بات سے بات نکل آئی اور کتابوں کا تختہ گرانے کا تذکرہ چھڑ گیا۔ میں اُس وقت عجیب عالم میں تھی اور میں سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہتی تھی۔ میں جذبات کی رَو میں بہہ گئی اور سب کچھ کہہ سنایا کہ میں علم حاصل کرنا چاہتی تھی اور مجھے اس بات سے بڑا رنج ہوتا تھا کہ مجھے بچّہ سمجھ لیا جائے۔ میری ہر بات میں اُس وقت ایک عجیب نرمی عود آئی تھی اور میری آنکھیں چھلک آئی تھیں۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ کہ میرے دل میں اُس کے لئے دوستی کا جذبہ تھا۔ میں اس کی ہر بات کی پروا کیا کرتی تھی میں اُس کے ساتھ گھل مل جانا چاہتی تھی۔ میں اُسے آرام پہنچانا چاہتی تھی اُسے تسکین دینا چاہتی تھی۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اُن سے حیرت اور گھبراہٹ صاف نمایاں تھی لیکن اُس نے کچھ نہ کہا۔ اور بس اُس کی اس چپ سے میرے جذبات کو گہری ٹھیس لگی جیسے میرے دل پہ زخم لگ گیا ہو۔ میں مایوس ہو گئی۔ وہ شاید میرا مطلب نہ سمجھ سکا ہو اور ممکن ہے کہ دل ہی دل میں مجھ پہ ہنس بھی رہا ہو۔ میں بچّوں کی طرح بلک بلک کے رو اٹھی۔ میں اپنی سسکیاں نہ روک سکی۔ اُس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ میرے ہاتھوں کو والہانہ طور پہ چوما۔ میرے ہاتھوں کو کس کے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور مجھے تسلّی دینے لگا شفقت سے وہ کچھ کہہ رہا تھا اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کیا کہا تھا مجھے یاد نہیں۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں کبھی روتی تھی کبھی ہنس پڑتی تھی اور پھر خوشی کے مارے میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے تھے۔ میرے رُخسار جل رہے تھے۔ تمتما رہے تھے۔ خوشی کے مارے میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلتا تھا۔ میں اتنا ہی محسوس کر سکی کہ وہ بھی کچھ بے چین تھا۔ ممکن ہے میرے اس اچانک اظہار پہ وہ ابھی تک سنبھل نہ سکا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ محض حیرت میں ڈوب کے رہ گیا ہو۔ لیکن اُس دن کے بعد اُس نے میرے خلوص کو قبول کیا تھا، میری گرمجوشی میرے محبت بھرے الفاظ، میرا التفات اُسے منظور تھا۔ وہ اب مجھے اپنے برابر کا سمجھ کر اُسی طرح خلوص سے پیش آتا تھا۔ وہ بھی التفات دکھاتا تھا، وہ بھی میرے ساتھ نرمی اور پیار سے پیش آتا تھا جیسے وہ میرا دوست ہو بلکہ جیسے وہ میرا بھائی ہو۔

مجھے یہ سب کچھ کتنا اچھا لگتا تھا مجھے کتنا چین ملتا تھا۔ اب کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بھی اب اسے بخوبی سمجھتا تھا اور دن بدن میرے قریب آتا گیا۔

اُن دِنوں میں ایسی کونسی بات تھی جو ہم دونوں نے ایک دوسرے سے نہ کی ہو۔ وہ پیارے پیارے فکرمند ایّام کتنے خوشگوار تھے۔ جب میرا دل بہت اُداس ہو جاتا ہے تو وہی یادیں اس طرح تازہ دم اور مسرور کن نظر آتی ہیں جیسے دوپہری گرمی کا مرجھایا ہوا پھول شام کو شبنم سے نکھر اُٹھتا ہے۔

امّی جان کی صحت اب اچھی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن میں پھر بھی ایک منٹ کے لئے اُنھیں چھوڑ کر نہیں جاتی تھی۔ پوکرونسکی میرے لئے اکثر و بیشتر کتابیں لایا کرتا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ کتابیں صرف اس لئے لاتا تھا کہ میں رات کو سو نہ جاؤں لیکن رفتہ رفتہ میں نے اُنہیں زیادہ توجہ اور غور سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور پھر انہیں پڑھنے کیلئے میرا اشتیاق بڑھ گیا۔ کتابیں کیا تھیں میرے لئے نئے خیالات کا ایک خزانہ تھا جس میں تصوّر تک نہ کر سکتی تھی۔ میرے دل میں نئے نئے خیالات پیدا ہونے لگے۔ اور اُن کتابوں کو سمجھنا جتنا مشکل تھا اُتنی ہی وہ مجھے عزیز تھیں وہ مجھے جان سے بھی

پیاری تھیں۔ وہ ایک الوٹ کرامی کی طرح میرے دل میں اُتر جاتیں اور مجھے عالم حیرت میں غرق کر دیتیں۔ میری خوش قسمتی یہ رہی کہ اس رُوحانی سیلاب سے میرے قدم نہیں اُکھڑے۔ میں ایسی باتوں کو سمجھنے سے ذرا قاصر رہی تھی جب امی جان ٹھیک ہو گئیں تو ہمارا شاموں کو اکٹھے مل بیٹھنا بھی ختم ہو گیا پھر ملاقات کئے بغیر بھی کئی کئی دن گذر جاتے تھے۔ ہم کبھی کبھار مختصر اور معمولی لفظوں میں کچھ کہہ جاتے تھے۔ لیکن ان لفظوں میں کیا کیا جذبات پنہاں ہوتے تھے وہ ہم کیا کچھ نہ کہہ جاتے تھے۔ میں خوش تھی۔ بہت خوش اور کئی ہفتوں تک مجھ پہ خوشی کا نشہ سا چھایا رہا۔

ایک دن پوکرو فسکی کا بوڑھا باپ ہم سے ملنے کیلئے آیا۔ باتونی تو خیر وہ تھا ہی لیکن اُس دن وہ غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ خوشی کے مارے اُس سے کوئی بات مکمل نہ ہو رہی تھی۔ وہ بہت دیر لطیفے سُناتا رہا اور ہنستا رہا اور آخر کار اُس نے اپنی مُسرت کی وجہ ہم سب کو بھی بتا دی کہ اگلے ہفتے پیٹیا کا جنم دن ہے۔ اور وہ اس مُبارک موقعے پر اپنے بیٹے سے ملنے آئے گا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس روز وہ نئی واسکٹ پہنے گا اور اُس کی بیوی نے جو نئے جوتے خرید کر دینے کا وعدہ کیا ہے وہ اُن جوتوں کو بھی پہن کر آئے گا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ اُس کی کوئی بات ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔

پوکرو فسکی کا جنم دن! میں دن رات اس پر غور کرتی رہی۔ میں بھی دوستی کے ناطے اُسے کوئی تحفہ تو دوں گی۔ لیکن وہ تحفہ کیسا ہونا چاہیئے۔ سوچ سوچ کر آخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں تحفے کے طور پر کچھ کتابیں پیش کروں گی۔ میں جانتی تھی کہ وہ اپنی لائبریری میں پُشکن کے تازہ ایڈیشن شامل کرنا چاہتا ہے۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پُشکن کی ساری کتابیں خرید کر اُسے پیش کروں گی۔ میں نے کپڑے سی سی کر کوئی تیس روبل جمع کر لئے تھے۔ لہٰذا میں نے باورچن کو بھیجا کہ پُشکن کی تمام کتابوں کی کل قیمت معلوم کر آئے۔ اور میرے خدا اس نے بتایا کہ گیارہ کتابوں کی قیمت کم از کم ساٹھ رُوبل ہو گی۔ میں اتنی رقم کہاں سے لاؤں گی۔ میں اس سوال پر جتنا غور کرتی اتنا ہی اور اُلجھ جاتی۔ امی جان سے پیسہ مانگنے کا مجھے حوصلہ نہ ہوا۔ وہ تو ضرور میری مدد کر دیتیں لیکن پھر سارے گھر میں سب کو پتہ چل جاتا اور بات بن جاتی کہ پوکرو فسکی کی تعلیم کا معاوضہ چکایا جا رہا ہے۔ اور پھر میں یہ بھی چاہتی تھی کہ تحفہ صرف میرا ہو۔ اس میں کسی اور کا ہاتھ نہ ہو۔ جہاں تک اس بات کا تعلق تھا کہ اُس نے میرے لئے بہت تکلیفیں اُٹھائی ہیں تو صاف بات ہے کہ میں ساری عمر اُس کے اس قرضے تلے دبی رہنا چاہتی تھی۔ میں اس کے بدلے صرف اپنی دوستی پیش کرنا چاہتی تھی۔ اور آخر کار مجھے حل سوجھ ہی گیا۔

میں جانتی تھی کہ گوسٹنی دیور پر دوکاندار کبھی کبھی پُرانی کتابیں سستی بیچتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص اُن سے سودا کر سکے تو وہ لوگ نصف قیمت پر کتابیں دے دیتے ہیں۔ میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے وہاں جانے کا اگلے ہی دن موقع مل گیا ہمیں گھر کی کچھ چیزیں درکار تھیں اور چونکہ امی جان کی طبیعت ابھی ناساز تھی اور انا پر سستی کا دورہ پڑا ہوا تھا لہٰذا اُن کی خرید فروخت میرے ذمے آ پڑی۔

میں میٹرو ئینا کے ہمراہ چل دی اور بہت جلد مجھے پُشکن کی کچھ کتابیں نظر آئیں۔ کتابیں بیچنے والا پہلے تو اُس دوکان سے بھی زیادہ دام مانگتا تھا لیکن بحث و تکرار کرنے کے بعد اور کئی بار وہاں سے چل دینے کی دھمکی سے وہ شخص چاندی کے دس رُوبل تک اُتر آیا۔ مجھے یوں سودا کرنے میں بڑا لُطف آیا۔ بیچاری میٹرو ئینا کچھ نہ سمجھ سکی کہ میں اس قدر خوش کیوں ہوں یا مجھے اتنی کتابیں کیوں درکار ہیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ میری جیب میں فقط تیس رُوبل تھے اور وہ بھی بنک نوٹوں کی شکل میں۔ اور اب وہ شخص ایک پائی بھی کم کرنے کو تیار نہ تھا۔ میں نے منت کی۔ اُسے اپنی ضرورت اور مجبوری کا واسطہ دیا اور آخر جب میں کئی بار وہاں سے آگے بڑھ چکی تھی اور واپس آ چکی تھی تو وہ کچھ مان گیا اور اُس نے قیمت دو رُوبل اور کم کر دی۔ اور اُس نے خدا کی قسم اُٹھائی تھی کہ وہ قیمت محض اس لئے کم کر رہا ہے کیونکہ میں اتنی حسین و جوان ہوں ورنہ وہ دنیا کے کسی شخص کے لئے بھی قیمت کم نہ کرتا۔ اب میرے لئے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ میرے پاس جتنے پیسے ہیں یہ شخص اب بھی اُن سے اڑھائی رُوبل زیادہ مانگتا ہے۔ اور اسی احساس سے کہ اب فقط اڑھائی رُوبل کی کسر رہ گئی ہے میں قریب قریب رونے ہی والی تھی کہ ایک غیر متوقع بات نے مجھے مصیبت سے نکلنے میں مدد دی۔

میں نے دیکھا کہ دو قدم پرے ایک اور دوکان پر بوڑھا پوکرو فسکی چار یا پانچ کتب فروشوں کے درمیان گھرا ہُوا ہے اور وہ اُسے بہت پریشان کر رہے ہیں۔ ہر شخص اپنی کتابیں اُس کے ہاتھوں میں تھما رہا تھا۔ اور جانے وہ کیا کتابیں تھیں لیکن بوڑھا پوکرو فسکی اور زیادہ کتابیں خریدنا چاہتا تھا۔ وہ تو تمام کتابیں خریدنا چاہتا تھا۔ وہ بیچارہ اپنی پسند کی کتابیں

نہ جُھن پار ہا تھا۔ جب میں نے اُس کے قریب جا کر پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُس کو مجھ سے بھی بہت پیار تھا۔ شاید وہ مجھے پیٹیکا سے کم پیار نہ کرتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "دارودارا میں کتابیں خرید رہا ہوں۔ پیٹیکا کے لئے کچھ کتابیں خرید رہا ہوں اس کا جنم دن آ رہا ہے اور اُسے کتابیں پسند ہیں لہذا میں کتابیں خرید رہا ہوں۔ یہ دیکھو کتنی عمدہ کتابیں ہیں۔" آخری لفظ اُس نے یوں رُک رُک کے کہا کہ مجھے یوں نظر آیا جیسے وہ ابھی رو دے گا کیونکہ وہ کتابیں قیمتی تھیں۔ میں صاف دیکھ رہی تھی کہ آنسو کے دو موٹے موٹے قطرے اُس کی آنکھوں سے چھلک کر اُس کے رخسار پر بہنے والے تھے۔ میں نے فوراً پوچھا کہ اُس کے پاس کُل پیسے کتنے ہیں۔ وہ میری بات سُنتے ہی زیرِ لب بولا۔ "اوہ۔ میرے پاس۔" اور یہ کہہ کر اُس غریب نے اپنی ساری پونجی مجھے دکھا دی۔ "یہ دیکھو۔ ایک تو آدھا رُوبل ہے۔ بس کوپک ہیں اور دو تانبے کے پیسے ہیں۔" میں اُسے ایک طرف کو لے گئی اور اُسے اپنے دوکاندار کے پاس لے آئی۔ "اس کے پاس گیارہ کتابیں ہیں ساری کی قیمت ساڑھے تینتیس رُوبل ہے۔ میرے پاس تیس رُوبل ہیں۔ آپ اپنے اڑھائی رُوبل بھی مجھے دے دیجئے۔ ہم یہ کتابیں اکٹھے خرید لیں گے اور انھیں دونوں کی طرف سے پیش کر دیں گے۔" وہ تو خوشی کے مارے ناچ اُٹھا۔ اُس نے اپنے پیسے دوکاندار کے ہاتھ میں تھما دئے اور دوکاندار نے کتابوں کا سارا بوجھ اُس پر لاد دیا۔ اُس نے کتابیں اپنی جیب میں ٹھونس لیں۔ اپنی بغل میں داب لیں اور مجھ سے وعدہ کر گیا کہ اگلے دن چُپکے چُپکے وہ کتابیں میرے پاس لے آئے گا۔ اپنے گھر چلا گیا۔ دوسرے دن وہ اپنے بیٹے سے ملنے کیلئے آیا۔ اور حسبِ معمول ایک گھنٹہ بھر وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم سے ملنے چلا آیا۔ وہ عجیب مضحکہ انگیز اور پُراسرار انداز میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے سے مُسکراہٹ بکھری پڑتی تھی اور وہ یوں اپنے ہاتھوں کو پُر اشتیاق انداز میں مل رہا تھا جیسے اُس کے ہاتھوں میں کوئی راز ہو۔ آخر اُس نے بتایا کہ کتابیں خفیہ طور پر ہمارے کمرے میں لائی جا چکی ہیں اور میٹرینا کی زیرِ نگرانی انھیں رسوئی میں باحفاظت پہنچا دیا گیا ہے۔ پوکروفسکی کے جنم دن کے بارے میں بات چیت ہونے لگی۔ اور وہ ہمیں بتانے لگا کہ تحفہ کیسے پیش کیا جائے۔ لیکن وہ جتنا زیادہ بول رہا تھا اتنا ہی مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ کچھ ایسی بات جسے زبان پر لانے کی اُسے ہمت نہیں ہو رہی۔ جسے زبان پر لاتے ہوئے وہ ڈر رہا ہے۔ میں کچھ نہ بولی لیکن میں دیکھ رہی کہ اُس کا جوش و خروش اُس کی آنکھوں میں چمک اور اُس کے چہرے کی دمک، سب کچھ ختم ہو رہا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ زیادہ گھبرایا ہوا اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

آخرکار وہ بول اُٹھا۔ "بار برا۔" اس کی آواز میں ایک عجیب ڈر اور گھبراہٹ تھی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "وارودارا۔ کیا تم جانتی ہو میں کیا سوچ رہا ہوں۔" وہ اور زیادہ پریشان نظر آنے لگا۔ "بات یہ ہے کہ اگر دس کتابیں تم اُسے دے دو اور گیارہویں میں خود دے دوں تو کوئی ہرج ہے کیا؟ یعنی وہ دس کتابیں تمہاری طرف سے تحفہ ہوں گی گیارہویں میری طرف سے۔ سمجھیں میرا مطلب۔ یعنی تم بھی اُسے تحفہ پیش کر دو گی۔ میرے پاس بھی پیش کرنے کیلئے کچھ ہو گا۔ دونوں اپنا اپنا تحفہ دے دیں گے۔" وہ اس قدر جذباتی ہوا کہ مزید کچھ نہ کہہ سکا اور ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگا جیسے میرے جواب کا منتظر ہو۔ میں نے متحمل آواز میں پوچھا۔ "لیکن آپ یہ کیوں نہیں چاہتے کہ ہم دونوں اکٹھے تحفہ پیش کریں۔" "بات یہ ہے وار دارا۔ میرا مطلب ہے کہ دراصل...... اُس کی زبان میں لکنت آ چکی تھی۔ اُسے بات کرنے کے لئے لفظ نہ مل رہے تھے اور اُس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا لیکن اُسے جو کچھ کہنا تھا وہ سب کچھ کہہ گیا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ میں وقتاً فوقتاً شراب نوشی کرتا ہوں وارودارا میں رُک نہیں سکتا۔ اور جیسا مجھے ہونا چاہیئے میں ویسا ہوں نہیں۔ دیکھو نا۔ مثلاً سردی ہی لگ گئی ہے یا ایسے..... کوئی جھگڑا ہی ہو جائے یا ویسے ہی جی اُداس ہو جاتے یا کچھ دِل کو چوٹ پہنچے تو تم جانتی ہو کہ آدمی گھونٹ دو گھونٹ پی ہی لیتا ہے۔ اور پیٹینکا اس بات کو پسند نہیں کرتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ خفا ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے ڈانٹتا ہے، لیکچر پلا دیتا ہے سو اگر میں اُسے علیحدہ تحفہ پیش کروں گا تو اُس سے یہ ثابت ہو جائیگا کہ میں اپنے طور طریقے ٹھیک کر رہا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ذرا اچھا رہتا ہے۔ وہ جان جائے گا کہ میں مُدت سے پیسہ جمع کر رہا تھا کیونکہ پیٹیکا جانتا ہے کہ جب تک وہ مجھے کوئی پیسہ نہ دے تب تک میرے پاس اور کہیں سے نہیں آتا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے......... اور وہ یہ جان کر بہت خوش ہو گا کہ میں نے اس مقصد کیلئے روپیہ خرچ کیا ہے یعنی میں نے فقط اُس کیلئے اتنی دیر پیسہ بچائے رکھا۔"

سلما اپنی بات ختم کر کے جس طرح اُس بوڑھے شخص نے مجھے دیکھا مقروضِ تھا مجھے اس پر بہت ترس آیا اور میں نے من ہی من میں فوراً فیصلہ کر لیا

"لیکن آپ ہی تمام کتابیں کیوں نہیں پیش کر دیتے۔؟"

"تمام؟ تمہارا مطلب ہے پُوری گیارہ کی گیارہ؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں"

"یعنی وہ سب کتابیں میں بطور تحفہ پیش کر دوں؟"

"ہاں ۔"

"یعنی بالکل اپنی طرف سے۔"

"ہاں ہاں جیسے وہ آپ نے تحفے میں دینے کے لئے خریدی ہیں ۔" بہت دیر تک وہ یوں بیٹھا رہا جیسے اُس کے پلے کچھ نہ پڑا ہو پھر وہ کچھ کھویا کھویا زیرِ لب بڑبڑایا۔ "اچھا یونہی سہی ۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہو گی۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن ۔ میرا مطلب ہے۔ تم کیا کرو گی دارفارا ۔ ؟"

"اتنی سی بات ہے ناکہ میری طرف سے کوئی تحفہ نہیں ہو گا۔ سو کیا فرق پڑتا ہے؟"

"کچھ نہیں ۔" اُس نے اس طرح کہا جیسے وہ خوفزدہ ہو ۔ "تمہاری طرف سے کوئی تحفہ نہیں ہو گا ۔ یعنی تم کچھ نہ دے سکو گی ۔"

وہ کچھ اتنا مایوس ہو گیا کہ مجھے یوں نظر آیا گویا وہ اپنا پہلا ارادہ بھی ترک کر دے گا۔ تاکہ میں بھی اُس کے بیٹے کو تحفے میں کچھ دے سکوں۔ وہ بہت نیک دل شخص تھا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ اُس کے بیٹے کو یہ تحفہ پیش کر کے مجھے بے حد خوشی ہوتی لیکن میں اُس کی خوشیاں ختم نہیں کرنا چاہتی ۔میں نے کہا۔ "اگر آپ کا بیٹا اور آپ خوش ہوں تو پھر میں اپنے آپ خوش ہو گئی۔ اور مجھے واقعی ایسی ہی خوشی ہو گی جیسے وہ تحفہ میں نے خود دیا ہو۔" اب اُسے کچھ تسلی ہوئی اور اُسے میری بات کا یقین آیا ۔اس کے بعد وہ قریب قریب دو گھنٹے ہمارے پاس بیٹھا رہا لیکن ایک پل کیلئے بھی چین سے نہ بیٹھ سکا۔ وہ بات بات پہ اُچھل پڑتا۔ زور زور سے بولتا رہا ہنستا رہا۔ ساشا کے ساتھ اُچھل کود کرتا رہا۔ میرے بوسے لیتا رہا اور جب اُس کا ہاتھ پہنچ سکتا تو میرے بازو پر چٹکی بھی کاٹ لیتا اور اپنا کا مُنہ جب کسی اور طرف کو ہوتا تو اُس کی طرف دیکھ کر مُنہ بھی بنا دیتا۔ اور اپینا نے آخر تنگ آ کر اُسے چلے جانے کو کہہ دیا۔ اس سے پہلے وہ اتنا خوش کبھی نظر نہ آیا تھا۔

جب وہ مُبارک دن طلوع ہوا تو وہ ٹھیک گیارہ بجے چرچ سے سیدھا دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ اُس نے کپڑے بڑی احتیاط سے پہنے ہوئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کی واسکٹ اور اُس کے جوتے بالکل نئے تھے۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں کتابوں کے بنڈل تھے ہم سب اپنا کے کمرے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے (یہاں یہ اتوار کا دن تھا) اُس نے آتے ہی پہلا فیصلہ تو یہ صادر فرمایا کہ پُشکن بہت اچھا شاعر ہے لیکن دوسرے ہی لمحے گھبرا گیا اور کچھ ایسی باتیں کرتا رہا کہ آدمی کو ٹھیک ڈھنگ سے بات چیت کرنی چاہیئے اور اگر کوئی اس بات کی پروا نہیں کرے گا تو پھر وہ قدم قدم پہ غلطی کرے گا اور پھر اُس کی بُرائیاں اُس کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیں گی۔ اور یہ نکتہ تو اُس نے کئی مثالیں پیش کر کے واضح کیا اور بار بار کہا کہ گذشتہ کئی ماہ سے وہ اپنے اطوار ٹھیک کرتا چلا آ رہا ہے اور ہر ممکن کوشش کرتا رہا کہ اُس کے ہر کام میں ایک سلیقہ ہو۔ اُس نے اپنے بیٹے سے یہ بھی کہا کہ اُس کی کسی بات کے حق بجانب ہونے پر اُس نے کبھی شبہ نہ کیا تھا۔ اُس کی ہر بات اس نے گوشِ دل سے سُنی تھی لیکن اُس نے اپنے آپ کو سیدھے راستہ پہ لانا ابھی ابھی شروع کیا ہے۔ اور اس کے ثبوت میں اُس نے اپنے بیٹے سے التجا کی کہ وہ یہ سب کتابیں قبول کرے جو اُس نے ایک مدت کی بچائی ہوئی رقم سے خریدی ہیں۔

جب وہ مجھے یہ سب باتیں بتا رہا تھا تو میرا ایک تو ہنسی کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا دوسرے میں جی کھول کے رونا بھی چاہتی تھی۔ کم از کم وہ یہ جانتا تھا کہ کس موقعہ پر کونسی بات کی جانی چاہیئے۔ کتابیں پُشنکا کے کمرے میں تھیں اور اُس کی میز کی زینت بن چکی تھیں۔ اب یہ بات اور تھی کہ پوکرونسکی ایک دم سچائی کی تہہ تک پہنچ گیا تھا اور وہ کتابوں کے بارے میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کو کھانے پر مدعو کیا تھا اور کیا خوب دن گذارا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم تاش کھیلتے رہے ساشا شرارت کی پتلی بنی ہوئی تھی اور میں بھی اُس سے کچھ کم نہ تھی جب میں اکیلی ہوتی تو پوکرونسکی اپنی تمام تر توجہ کا مرکز مجھے بنا لیتا اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن میں نے اُسے موقع نہ دیا۔ گذشتہ چار برسوں میں اتنا زیادہ خوش کبھی نہ ہوئی تھی۔

لیکن اب اُداس اور درد انگیز یادوں اور مصیبت کے دنوں کا

ذکر بھی لازم ہے۔ اور شائد یہی وجہ ہے کہ میرا قلم بہت آہستہ آہستہ لکھ رہا ہے۔ قلم شائد کچھ اور لکھنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ لیکن شائد ایک یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ میں نے اسی لمحے کے انتظار میں اپنی خوشیوں کے ایام کو پوری تفصیل میں بیان کر دیا ہے۔ میری خوشیاں اس قدر کم تھیں کہ اُن کے بعد میری زندگی پر غم کے اتنے گہرے بادل چھا گئے ہیں کہ خدا ہی جانتا ہے یہ پاپ کب کٹے گا۔

دراصل میری مصیبتوں کا آغاز پوکروفسکی کی بیماری اور موت سے ہوتا ہے۔ جو واقعہ میں ابھی ابھی اوپر لکھ چکی ہوں اس کے ٹھیک دو ماہ بعد پوکروفسکی بیمار پڑ گیا۔ کیونکہ ان دو مہینوں میں روزی کمانے کے لئے پوکروفسکی نے بہت زیادہ محنت کی تھی۔ کیونکہ اُس کی زندگی کی کوئی ٹھوس بُنیاد تو تھی نہیں۔ ہر تپ دق کے مریض کی طرح پوکروفسکی بھی آخری لمحے تک اس اُمید کا دامن نہ چھوڑا تھا کہ ابھی اُسے بہت جینا ہے اگر وہ اس طرز کی ملازمت سے نفرت نہ کرتا تو وہ بہ آسانی سکول ماسٹر بن سکتا تھا۔ جہاں تک سرکاری ملازمت کا تعلق تھا تو اُس کی صحت اتنی خراب تھی کہ اُسے سرکاری ملازمت کبھی نہ مل سکتی تھی۔ علاوہ ازیں اُسے اپنی پہلی تنخواہ کیلئے بہت دیر انتظار کرنا پڑتا۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ اُسے ہر بات میں فقط دُکھ کا پہلو نظر آتا تھا آخر کار اُس کا کردار یاسیت زدہ ہو کر رہ گیا اور اُسکی صحت بھی دن بدن تباہ ہوتی گئی اور ستم یہ تھا کہ وہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے بارے میں مطلق آگاہ نہ تھا۔ موسم بہار میں اکثر و بیشتر وہ نوکری کی تلاش کرنے کیلئے ایک پتلا کوٹ پہن کر نکل جاتا تھا اور جس جگہ جاتا تھا اپنی خستہ حالت کی بنا پر کافی ذلت اٹھاتا تھا اسی طرح وہ کئی بار بارش میں بھیگ چکا تھا اور گیلے پاؤں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایسا بستر پہ پڑا کہ پھر نہ اُٹھ سکا۔ بہار اپنے پورے جوبن پر تھی کہ وہ اس دُنیائے فانی سے اُٹھ گیا۔ یہ ماہ اکتوبر کے آخری دن تھے۔

اُس کی بیماری کے دَوران میں میں شاذونادر ہی کبھی اُسکے کمرے سے باہر گئی ہوں گی۔ میں نے ہر ممکن طرح سے اُس کی دیکھ بھال کی۔

پوکروفسکی کبھی کبھی آنکھ کھولتا تھا تو مجھے پہچان لیتا تھا۔ لیکن ایسا موقع بہت کم آتا تھا۔ زیادہ تر وہ غش کھاتے رہتا تھا۔ اور تمام رات کسی بحث میں اُلجھا رہتا تھا۔ اُس کی زبان سے طویل، مُبہم اور اُلجھے ہوئے فقرے سُننے میں آتے۔ اُس چھوٹے سے کمرے میں اُس کی بیٹھی ہوئی آواز عجیب طرح گونجتی تھی۔ بالکل ایسے جیسے گنبد میں صدا گونجتی ہو اور میں ڈر جایا کرتی تھی۔ خاصکر آخری رات تو اُس پہ شدت کی بے ہوشی طاری تھی۔ یوں نظر آتا تھا جیسے وہ شدید کرب میں مبتلا ہے۔ وہ رہ رہ کر کراہتا اور آہیں بھرتا۔ ہر شخص ڈر گیا تھا اینا نے خدا سے دُعا مانگی کہ اُسے جلد اپنے پاس بُلا لے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ صبح تک خاتمہ ضرور ہو جائے گا۔

اُس کے بوڑھے باپ نے وہ تمام رات دروازے کے باہر بیٹھ کر گذاری۔ وہاں اُس کے لئے ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ وہ بار بار کمرے میں آتا لیکن ایک خوف کے تحت بغیر کچھ دیکھے واپس لوٹ جاتا۔ اُس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ رنج و یاس نے اُس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب کر دی تھیں۔ وہ بے وقوفوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔ کسی خوف کے زیر اثر اُس کا سر ہلتا ہی رہا۔ بلکہ وہ سر سے لیکر پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے ہی کچھ کہتا رہا کبھی انکار کرنے کے انداز میں سر ہلا دیتا کبھی مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ پو پھٹنے سے پہلے وہ اس قدر تھک ٹوٹ چکا تھا کہ گہری نیند میں سو گیا۔

ابھی صبح کے سات بجے تھے کہ میں نے دیکھا موت اب پوکروفسکی کے سرہانے کھڑی ہے۔ میں نے اُس کے باپ کو جگا دیا۔ پوکروفسکی عین آخری لمحے پر اپنے مکمل ہوش و حواس میں تھا۔ اُس نے ہم سب کو الوداع کہی اور پچھلی باتوں کی معافی مانگی حالانکہ میرا دل پاش پاش ہو چکا تھا لیکن میری آنکھوں سے ایک بُوند آنسو نہ گرا۔

پوکروفسکی کا آخری وقت پتھر کو بھی لہو رلا سکتا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز اور ڈوبتی ہوئی سانسوں میں کوئی التجا کر رہا تھا لیکن میں کچھ نہ سمجھ پائی۔ بلکہ وہ موت کا ناچ میری برداشت سے باہر تھا۔ وہ پورا ایک گھنٹہ تڑپتا رہا۔ اور رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا وہ ہاتھ کے اشارے سے کچھ مطلب ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی نحیف اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کوئی التجا کرنے کی کوشش کی لیکن میں اس بار پھر کچھ نہ سمجھ سکی۔ باری باری میں نے سب کو اس کے بستر کے قریب لا کر کھڑا کر دیا۔ اُسے پانی پلایا۔ لیکن اُس نے پُر یاس انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔ آخر کار میں جان گئی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سامنے والی کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا جائے تاکہ آخری بار سورج کی روشنی کو دیکھ لے۔ وہ دن کے نور کو دیکھنے کا متمنی تھا۔ وہ خدا کی کائنات کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے پردہ ہٹا دیا۔ لیکن باہر بھی فضا اُسی طرح دُھندلی اور ماتمی تھی جیسے اُس کی

دم توڑ رہی تھی زندگی۔ سورج کی روشنی کبھی پڑتی اور آسمان دُھندلا اور کہر میں چھپا ہوا فضا آسمان تھی۔ اُداسی کا پیکر نظر آتا تھا اور لیلی جان پڑتا تھا جیسے یہ بے ستون و دوش ابھی گلے پڑنے کا۔ کھڑکی کے تختوں پر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو جاتی۔ اور اس بارش اور کہر بھری فضا کو دیکھ کر یوں جان پڑتا جیسے آدمی سیال بن گیا ہو گویا بہتا ہوں۔ اندر تیل کے دئیے کی ہلکی ہلکی کرنیں دم توڑتی ہوئی لَو کے ساتھ جد و جہد کر رہی تھیں۔ مرنے والے نے پُرحسرت نظروں سے مجھے دیکھا اور مایوسی کے انداز میں سر ہلا دیا۔ یہ اُس کی زندگی کی آخری رمق تھی۔ وہ موت کی نیند سو گیا۔ وہ اس جہان سے دوسری دُنیا میں جا چکا تھا۔

انیا نے جنازے کا انتظام کرایا تھا۔ ایک سادہ سا کفن خرید اگیا اور ایک معمولی سی بیل گاڑی کرائے پر لے لی گئی۔ اور اُن اخراجات کو پورا کرنے کیلئے انیا نے مرحوم کی کتابوں اور باقی ملکیت پر قبضہ کر لیا۔ مرحوم کا بوڑھا باپ اپنی پوری طاقت کے ساتھ انیا سے زور آزما ہوا۔ جتنا اُس سے بن پڑا اتنی کتابیں اُس نے انیا سے واپس حاصل کر لیں۔ اُن کتابوں کو اُس نے اپنی جیبوں، اپنے ہیٹ میں ٹھونس لیا۔ اُن کتابوں کو اُس نے تین روز تک اپنے سے علیحدہ نہ کیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ چرچ میں بھی اُنھیں اُٹھائے اُٹھائے پھرتا رہا۔ لیکن وہ اپنی سُدھ بُدھ بھول چکا تھا۔ وہ کچھ عرصے تک سوچنے سمجھنے اور بولنے کے ناقابل ہو چکا تھا۔ وہ تابوت کے اردگرد پاگلوں کی طرح چکر لگاتا۔ اُسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا اور بار بار اپنے مرحوم بیٹے کی گردن کو ٹھیک کرتا تھا۔ کبھی موم بتی جلا دیتا کبھی بجھا دیتا۔ اُس کے خیالات کسی بات پر پل بھر کے لئے نہ جم سکتے تھے۔ مرحوم کی روح کی شانتی کے لئے چرچ میں جو عبادت کی گئی اُس میں نہ امّی جان نہ انیا شامل ہو سکی تھیں۔ امّی جان کی طبیعت تو ٹھیک نہ تھی اور انیا جانے کو تیار ہی تھی کہ پھر اُس بوڑھے شخص سے اُلجھ پڑی اور اُس نے عبادت میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اُس کا بوڑھا باپ اور صرف میں وہاں موجود تھے۔ عبادت کے دوران میں میرے دل و دماغ پر ایک عجیب خوف طاری ہوا۔ جیسے مجھے اپنا مستقبل یاد آگیا ہو۔ میں عبادت پوری ہونے تک کا بھی انتظار نہ کر سکتی تھی۔ آخر کار جنازہ اُٹھایا گیا اور اُس بیل گاڑی پر رکھ دیا گیا اور بیل گاڑی چل دی۔ میں گلی کے سرے تک تو اُس بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ گئی وہاں پہنچ کر کوچوان نے گھوڑے کو زور سے چابک مارا اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اُس کا بوڑھا باپ سسکیاں بھرتا ہوا ہانپتا ہوا گرتا پڑتا اُس بیل گاڑی کے پیچھے پیچھے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کا ہیٹ گر گیا لیکن وہ اُسے اُٹھانے کیلئے نہ رُکا۔ بارش سے اُس کے بال اور اُس کا جسم بھیگ چکا تھا۔ سرد اور تند ہوا اُس کے چہرے پر چابک کی طرح آکر لگتی تھی۔ لیکن اُسے کسی بات کی پروا نہیں تھی اور وہ اُس ٹھیلے کے کبھی اِس طرف سے ہو کر آگے نکلنے کی کوشش کرتا کبھی اُس طرف سے۔ اُس کے کوٹ کے سرے ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ اُس کے کوٹ کی جیبوں سے پوکر و فسکی کی کتابیں لڑھک لڑھک کر زمین پر گر رہی تھیں۔ جو سب سے بڑی کتاب تھی اُسے اُس کے بوڑھے باپ نے اپنے سینے سے بھینچ کر لگا رکھا تھا۔ راہگیر جنازے کو دیکھتے تو اپنے سر کو کپڑے سے ڈھانپ لیتے اور عبادت کرنے کے انداز میں جھک جاتے۔ کچھ لوگ اس دیوانے کو دیکھنے کیلئے بھی رُک جاتے۔ کتابیں اس کی جیب سے نکل نکل کر نیچے کیچڑ میں گرتی رہیں۔ اگر کوئی اُسے روک کر گری ہوئی کتاب دکھاتا تو وہ لپک کر کتاب اُٹھا لیتا اور پھر بیل گاڑی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتا۔ گلی کے آخری موڑ پر اُس کے ہمراہ ایک پھٹے کپڑوں والی بھکارن بھی ہو لی تھی۔ جب بیل گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں گھر چلی آئی اور امّی جان کے سینے سے لپٹ گئی ہچکیاں لیتے لیتے میری گھگھی بندھ گئی۔ میں نے کئی بار امّی جان کو چوما اُنہیں اپنی باہوں میں لپیٹ لیا۔ جیسے میں موت کے ہاتھوں سے اپنے آخری دوست کو بچانا چاہتی تھی۔ لیکن موت تو پہلے ہی اُن کے سر پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ . . . .

. . . .

۱۱ جون۔

ان کا جزیرے تک کی سیر و تفریح کے لئے میں بے حد شکر گزار ہوں۔ جزیرے کتنے حسین تھے۔ کس قدر شاداب اور ہرے بھرے نظر آتے تھے۔ میں نے ایک مدت سے گھاس اور درخت نہیں دیکھے تھے۔ جب میں بیمار پڑ گئی تھی تو مجھے گمان گزرا تھا کہ اب میں اُنہیں دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکونگی۔ میرے خیال میں اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکوں گی۔ لہٰذا اب تم خود اندازہ کرو کہ اس مایوسی کے بعد کل وہی کچھ دیکھنے سے میں کتنی خوش ہوں گی۔ دیکھو کل میں کیونکہ اُداس اُداس نظر آ رہی تھی اس لئے خفا نہ ہو جانا۔ میں واقعی بہت خوش تھی اور میرے دل کو بہت چین تھا۔ لیکن یہ ہمیشہ ہوا ہے کہ جب مجھے بہت زیادہ خوشی نصیب ہوتی تو میں ہمیشہ اُداس ہو جاتی ہوں۔ اور اگر میں رو بھی پڑی تھی تو اس سے تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔ میں اکثر و بیشتر بغیر وجہ جانے رو پڑتی ہوں۔ میرے خیال میں اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ مجھے کچھ چیزیں بہت آسانی سے چوٹ پہنچا جاتی ہیں میرے تاثرات ہمیشہ

دردانگیز ہوا کرتے ہیں۔

ماکار — تم کتنے اچھے ہو۔ جب کل تم مجھے بغور دیکھ رہے تھے تو میں جان گئی تھی کہ تم میرے دل کا حال جاننا چاہتے تھے۔ تم میری خوشیوں کی تہہ میں پہنچنا چاہتے تھے۔ نظر کے سامنے کوئی جھاڑی تھی یا پھولوں کی بہار تھی یا درختوں کا جھنڈ تھا یا کوئی چشمہ تھا لیکن تم مجھے دیکھ رہے تھے اور تمہاری آنکھوں میں ایک فخر جھلک رہا تھا کچھ ایسا فخر جیسے وہ ساری جگہ تمہاری اپنی جائیداد ہو۔ ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم رحمدل اور نیکدل انسان ہو۔ اور میرے اچھے ماکار تمہاری اس خوبی کی بنا پر مجھے تم سے محبت ہے۔ اچھا خدا حافظ میرے اچھے ماکار — آج پھر میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آج صبح میرے پاؤں بہت دیر تک بھیگے رہے اور مجھے سردی لگ گئی ہے۔ فیڈورا بھی بستر پہ پڑ گئی ہے اور ہم دونوں بیکار سی ہو کے رہ گئی ہیں۔ ہمیں بھول نہ جانا اور جب ممکن ہو سکے تب ملنے چلے آؤ۔

تمہاری

وی۔ ڈی۔

۱۲ / جون۔

میری پیاری واروارا۔

کیا تم جانتی ہو کہ میں کیا اُمید کر رہا تھا کہ تم مجھے منظوم خط لکھو گی۔ اور اس کی بجائے تم نے ایک چھوٹے سے صفحے کا خط لکھ بھیجا۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم نے بہت تھوڑا لکھا ہے لیکن خوب لکھا ہے اور طرزِ تحریر پر تو میں سو جان سے فدا۔ تم نے جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ کے رکھ دی ہے۔ رہا میں تو مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے اگر میں ایک درجن صفحے بھی لکھ دوں تو ایسی کوئی بات پیدا نہیں ہو گی۔ تم کہتی ہو کہ میں رحمدل اور نیک دل انسان ہوں اور خدا کا فرشتہ ہوں اور نہ جانے کن کن الفاظ میں تم نے میری تعریف کی ہے۔ جانِ من یہ سب سچ ہے میں بالکل ایسا ہوں جیسا تم نے بیان کیا ہے۔ لیکن تم نے جو کچھ لکھ دیا ہے اُسے پڑھ کر دل پگھل جاتا ہے اور دماغ میں اُداس خیالات آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ سنو میری ننھی سی جان اب میں تمہیں اپنی زندگی کے متعلق کچھ بتاتا ہوں۔

میں نے تیرہ برس کی عمر میں ملازمت شروع کی تھی۔ یعنی یہ تیس سال پہلے کی بات ہے اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُن دنوں میں نے کئی سردس کوٹ پہنے ہوں گے۔ لیکن اب عمر کے ساتھ ساتھ میری سوجھ بوجھ بھی تو بڑھی ہے۔ اور آخر کار میں نے دنیا دیکھی ہے۔ یقین مانو میں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ ثبوت چاہتی ہو! تو سنو کہ ایک ایسا بھی وقت آیا تھا جب میری خدمات کے صلے میں مجھے تمغہ عطا کرنے کی سفارش کر دی گئی تھی۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن خدا شاہد ہے۔ بدقسمتی سے بُرے لوگ زندگی میں ہر مقام پہ آملتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میں بیوقوف اور جاہل ہوں گا لیکن میرے سینے میں بھی ویسا ہی دھڑکتا ہوا دل ہے جیسا کسی اور انسان کے سینے میں ہو سکتا ہے۔ اور وارنیکا کیا تم سوچ سکتی ہو کہ اس بدخواہ نے میرے ساتھ کیا کیا تھا مجھے بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تم یہ نہ پوچھو اُس نے کیا کیا تھا۔ تم یہ پوچھو اُس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کیونکہ میں شرمیلا شخص ہوں وہ کیونکہ میں خاموش طبع ہوں، کیونکہ میرے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا نازک دل ہے۔ اصل بات تو یہ تھی کہ میں اُسے پسند نہ تھا بس ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے یہ سب فساد کھڑا ہو گیا تھا۔ "ماکار ایسا ہے ماکار ویسا ہے پھر نوبت یہاں تک آپہنچی کہ "ماکار سے کیا توقع کی جا سکتی ہے بیکار آدمی ہے جی —" اور آخر کار یہ بات بھی سننے میں آئی —" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر خطا کس کی ہے: ظاہر ہے ماکار کا قصور ہے —"

سو اب تم خود جان سکتی ہو کہ ہمیشہ اور ہر بات غریب ماکار ہی کی خطا ہوتی ہے۔ بس اس شخص نے اس سے زیادہ اور کچھ نہ کیا تھا۔ لیکن یہی ضرب بڑی کاری ثابت ہوئی تھی۔ اُس نے وزارت کے ہر محکمے میں ماکار کو بدنام کر دیا اور سب کی نظروں سے نیچے گرا دیا۔ لیکن پھر یہ سلسلہ یہیں تک ختم نہ ہوا۔ انہیں میرے جوتوں پر اعتراض ہونے لگا۔ میرے کوٹ، میرے بال حتیٰ کہ میرے وجود تک پر اعتراض ہونے لگے۔ یہ بات غلط تھی اور اس کا کفارہ لازمی تھا۔ اور یہ سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کوئی دن ایسا نہ گذرتا تھا جب مجھے ذلیل نہ کیا جاتا تھا۔ اب میں اس سلوک کا عادی ہو چکا ہوں۔ پھر میں تو ہر بات کا عادی ہو سکتا ہوں۔ آخر ایک معمولی رتبے کا انسان جس کو کسی شمار میں نہیں لایا جا سکتا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں یہ سب کچھ کیوں برداشت کروں۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟ کیا میں نے کسی دوسرے شخص کی ترقی روک دی ہے؟ افسران کے سامنے میں نے کسی شخص کی چغلی کھائی ہے؟ کوئی بھی ایک ثبوت پیش کر سکتا ہے؟ یہ بھی چھوڑو۔ کیا میں نے کبھی خود اپنی ترقی کیلئے زبان سے ایک لفظ تک نکالا ہے؟ کیا میں نے کسی کے ساتھ کبھی کوئی ساز باز کی ہے؟ ایسی بات سوچتے ہوئے بھی شرم آنی چاہیئے؟ اور مجھے کیا ضرورت پڑی

حق کہ سب کچھ کرتا ہوتا؟ اور پھر اتنا تو سوچا جائے کہ کیا میں بلند آواز سے
اور دم پیدا کرنے کے قابل ہوں بھی؟ لیکن خدا کی پناہ میں اس سزا کا حقدار
کیسے ٹھہرایا گیا...... تمہاری نظروں میں تو میں ایک اچھا شخص ہوں۔
ہے نا؟ اور جان من تم دنیا کے باقی ہر شخص سے اچھی ہو۔ اور آخر کار
ایک مہذب شہری کی سب سے بڑی خوبی ہے کیا؟ آئیو تودک نے کل ایک
پرائیویٹ جلسے میں کہا تھا کہ سب سے خوبی یہ ہے کہ تجوریاں بھر بھر کے
پیسہ کمایا۔ (یوں تو دک مزاق کر رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ آئیو تودک
نے اخلاقی بات کہی ہوگی) لیکن اس فقرے کا اصل مطلب یہ ہے
کہ کوئی بھی شخص کسی پر بوجھ نہ بنے اور میں کسی شخص پر بوجھ نہیں بنا میں نے
روکھی سوکھی یا باسی روٹی کھائی ہے لیکن وہ روٹی خون پسینے کی کمائی سے
حاصل کی ہے اور شرافت سے پیسہ کمایا ہے۔ آخر ایک انسان کو کیا
کرنا چاہیئے۔ کاغذات کی نقل کرنے میں کوئی خاص ذہانت نہیں درکار
لیکن مجھے اس کام پر بھی فخر ہے کیونکہ میں اسی کام میں اپنا پسینہ بہا دیتا
ہوں۔ اور پھر نقل اتارنے میں کیا برائی ہے؟ کیا یہ گناہ ہے؟" وہاں
بیٹھا کوئی یہ کہتا ہے ۔۔۔ "سالا دفتری چوہا ہٹتا ہی نہیں ۔۔۔
آخر ان فقروں کا مطلب کیا ہے۔ آخر اس کام میں بے ایمانی کہاں
سے آگئی؟ میرا دستخط بہت اچھا ہے دیکھنے میں صاف اور واضح ہے
اور حضور والا ہمیشہ خوش ہوتے ہیں ۔۔۔ اور حضور والا کے بہت ہی ضروری
کاغذات کی دوسری کاپی تو میں ہی تیار کرتا ہوں۔ رہی اسلوب کی بات
تو خواہ مخواہ مغز کھپاتا رہوں میں صاحبِ اسلوب نہیں ہوں ۔۔۔ اور میں بھی
اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں ملازمت میں
کبھی ترقی نہیں پا سکا۔ وارنیکا ۔۔۔ میں تو تمہیں بھی خط لکھتے ہوئے بالکل
اسی طرح لکھتا ہوں۔ میں فنکارانہ جذبات اور انداز بیاں کہاں سے
لاؤں۔ بس جو کچھ دماغ میں جس پیرائے اور انداز سے آتا ہے اسی طرح
اسے کاغذ پر اتار دیتا ہوں۔ میں ایک سوال پوچھتا ہوں حالانکہ میں اس
کا جواب بخوبی جانتا ہوں لیکن پوچھنے میں کیا حرج ہے۔ اگر ہر شخص نئی
بات کہنے لگ جائے تو پھر اس بات کو دہرائے گا کون؟ تم اس سوال
کا جواب خیر کیا دو گی لیکن اس سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ ان
لوگوں کو میرے ساتھ ایسے ظالمانہ مذاق نہیں کرنے چاہیئں۔ وہ مجھے
بعد شوق دفتری چوہا کہیں کیا وہ لوگ یہ نہیں محسوس کر سکتے کہ اسی
چوہے کی اشد ضرورت ہے، یہی چوہا ان کے لئے فائدہ مند ثابت
ہوتا ہے۔ چلو میں چوہا ہی سہی لیکن میری قدر کی جاتی ہے میں وہ چوہا
ہوں جو کام آتا ہے لیکن جان من لعنت ان سب باتوں پر تمہیں یہ سب
کچھ بتلانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ محض جذبات کی رو میں بہہ گیا اور سب
کچھ لکھ گیا۔ کبھی کبھی اچھا ہوتا ہے کہ کھری کھری کہہ دی جائے خدا حافظ
جانِ من۔

میرے آرام جاں۔ میرے ننھے فرشتے میں جلد ہی تم سے ملنے آؤں گا
تب تک اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنا۔ میں اپنے ساتھ ایک کتاب بھی لاؤں
گا۔ اچھا۔ خدا حافظ وارنیکا۔

تمہارا مخلص اور خیر خواہ
ماکار

۳۰ جون

مائی ڈیر ماکا۔

مجھے دفتری کام ختم کرنے کی بہت جلدی ہے اور اسی جلدی
میں میں یہ خط لکھ رہی ہوں ۔۔۔ سنو ۔۔۔ تم ایک بہت اچھا سودا کر سکتی
ہو۔ فیڈورا کہتی ہے کہ کوئی صاحب اپنی بالکل نئی وردی بیچنا چاہتے
ہیں۔ وردی کے ساتھ پتلون، واسکٹ اور ٹوپی بھی ملے گی۔ بالکل
نئی اور سستی ہے۔ خرید لو نا! اب تو تمہارے پاس پیسے بھی ہیں
اور تم خود کہتے ہو کہ تمہاری مالی حالت ان دنوں اچھی ہے دیکھو
اب مت کہہ دینا کہ تمہارے پاس پیسہ نہیں ہے۔ ایسی چیزیں بہت
کارآمد ہوتی ہیں۔ ایک نظر خود پر ڈال لو ۔۔۔ جو کپڑے پہنے پھرتے
ہو ذرا انہیں دیکھو تو سہی۔ کتنی بری حالت میں ہے تمہارے کپڑے
بڑی شرم کی بات ہے اور تمہارے پاس نئی وردی تو ہے ہی نہیں۔
میں اچھی طرح جانتی ہوں تم لاکھ کہو کہ تمہارے پاس نئے کپڑے ہیں
لیکن میں نہ مانوں گی۔ خدا جانے تمہاری نئی وردی کیا ہوئی۔ تم
نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ دیکھو خدارا اس کے متعلق فیصلہ
کر لو۔ میری خاطر ہی سہی لیکن یہ دکھانے کے لئے کہ تمہیں مجھ
سے محبت ہے تم یہ وردی ضرور خرید لو۔

تم نے میرے لئے کچھ ریشمی کپڑا بھیجا ہے لیکن تم اپنے آپ کو تباہ
کر رہے ہو۔ غضب خدا کا تم اپنا پیسہ خرچ کیسے کر رہے ہو۔ تم
عجب فضول خرچ ہو ۔۔۔ یہ چیزیں بالکل غیر ضروری ہوتی ہیں۔
مجھے پورا یقین ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ تحفے بھیج بھیج کر

مجھے اس محبت سے آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں اور خاص کر ان تحفوں کو قبول کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس پر تمہارا کتنا پیسہ خرچ آیا ہوگا۔ دیکھو آج کے بعد دوبارہ کبھی ایسی بات نہ کرنا۔ میں پاؤں پڑتی ہوں۔ وعدہ کرو کہ تم دوبارہ کبھی یوں پیسہ ضائع نہیں کروگے۔ وعدہ کرتے ہونا؟

مالا! تم نے کہا ہے کہ میں اپنی زندگی کے باقی واقعات بھی تمہیں بتاؤں اور چاہتے ہو کہ میں اس ڈائری کو مکمل کر دوں۔ اگر سچی سچی بات جاننا چاہتے ہو تو سنو کہ مجھے خود یہ یقین نہیں آتا کہ میں نے یہ کچھ بھی کیسے لکھ دیا تھا۔ میں اپنے ماضی کے بارے میں لکھنا تو درکنار کچھ سوچنا نہیں چاہتی۔ میں یاد ماضی سے گھبرا اٹھتی ہوں۔ اور پھر اپنی ماں کے بارے میں کچھ بھی لکھنا میرے لئے قطعاً ناممکن ہے۔ میری ماں جس نے اپنی بچی کو شیطانوں کے ہاتھ میں سونپ دیا اور خود جنت کو سدھار گئی۔ اس یاد سے اب بھی میرے دل کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ وہ یاد اس قدر تازہ رہتی ہے کہ میں ابھی تک سنبھل نہیں سکی۔ چین پانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ واقعہ فی الحال ایک ہی برس تو پرانا ہے۔ لیکن تم تو اچھی طرح آشنا ہو۔

میں نے تمہیں بتلایا ہے کہ اینا اب کیا کہتی پھرتی ہے۔ وہ مجھے ناشکرا اور نہ جانے کیا کیا کہتی ہے اور صاف انکار کرتی ہے کہ مسٹر پاتیکوف کے فیصلے میں اس کا ہاتھ تھا۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کے پاس واپس لوٹ جاؤں اور کہہ رہی ہے کہ میں خیرات پر پل رہی ہوں اور اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلے گا۔ وہ کہتی ہے کہ اگر میں لوٹ جاؤں تو وہ کسی نہ کسی طرح مسٹر پاتیکوف کو رضامند کرے گی کہ وہ اپنے پچھلی حرکتوں کی تلافی کرے اور مجھے جہیز پیش کرے۔ خدا ایسے لوگوں کو بخشے! میں یہاں پر تمہارے ساتھ رہ کر اور مہربان فیڈورا کے ساتھ رہ کر بے حد خوش ہوں۔ فیڈورا کو دیکھ کر مجھے میری بوڑھی نینی کی یاد آجاتی ہے۔ تم حالانکہ دور کے رشتہ دار ہو لیکن محض تمہارا نام ہی بہت تسلی پہنچاتا ہے۔ مجھے پوری حفاظت کا احساس ہوتا ہے۔ رہا ان کا سوال تو میں ان لوگوں کو جاننا تک نہیں چاہتی ہے اور اگر مجھ سے بن پڑا تو میں ان سب کو بھلا دوں گی۔ اب وہ اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ فیڈورا کہتی ہے کہ یہ سب محض افواہیں ہیں اور وہ لوگ مجھے یونہی اکیلا رہنے دیں گے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

دی۔ ڈی

۲۱۔ جون

میری جان۔ میری ننھی سی فاختہ

سمجھ میں نہیں آتا خط شروع کیسے کروں۔ جانِ من کس قدر عجیب بات ہے کہ ہم اس دنیا میں اس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میری زندگی میں اتنے اچھے دن کبھی نہ آئے تھے، یوں نظر آتا ہے جیسے خداوند کریم نے مجھے ایک گھر اور ایک چھوٹا سا کنبہ عطا کر رکھا ہو۔ میری پیاری بچی ——— وہ جو چار جمپر میں نے تمہیں بھیجے تھے ان پر کیوں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتی ہو۔ کس لئے اپنے نازک مزاج کو دکھ دیتی ہو۔ فیڈورا نے مجھے بتلایا تھا کہ تمہیں ان کی ضرورت تھی۔ مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں تمہیں کچھ دے پایا ہوں۔ تمہیں کیا دے پایا ہوں یہ تو میں نے خود خوشی پائی ہے۔ اپنی خوشی حاصل کی ہے۔ مجھے اس خوشی سے محروم نہ کرو عزیزم ——— مجھے کیوں دکھ پہنچاتی ہو! کس لئے مجھ سے خفا ہوتی ہے! میری زندگی کی سبھی خلائیں بھر گئی ہیں۔ میں اب دو انسانوں کے لئے زندہ ہوں۔ ایک تمہارے لئے ایک اپنے لئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب میں سماجی زندگی میں قدم رکھنے والا ہوں۔ راتازیف نے مجھے آج شام چائے پر بلایا ہے ——— یہ وہی شخص ہے جو مجھے ادبی محفلوں میں بلایا کرتا ہے اور سرکاری افسر ہے۔ ہمیں آج کسی ادبی موضوع پر گفتگو کرنی ہے۔ بھئی ہم تو اسی قسم کے لوگ ہیں۔ اچھا جانِ من خدا حافظ ہے۔ میں نے یہ چند سطریں کسی خاص مقصد کے لئے نہیں لکھیں فقط تمہیں یہی بتانا تھا کہ میں خیر و عافیت سے ہوں۔ تم نے تو اینا کے ذریعے کہلا بھیجا ہے کہ تمہیں سلائی کڑھائی کے لئے کچھ رنگین ریشمی کپڑا چاہیئے ——— میں خرید دوں گا۔ جانِ من میں ضرور بھیج دوں گا۔ اور تمہاری یہ خواہش کل تک پوری ہو سکے گی۔ میں یہاں تک جانتا ہوں کہ یہ چیزیں کہاں سے مل سکتی ہیں

تمہارا مخلص دوست
ماکار

۲۲ جون۔

میری پیاری واروارا

میں بڑے دکھ سے تمہیں ایک بہت بڑی خبر سنا رہا ہوں۔ ہمارے مکان میں ایک بہت برا واقعہ ہو گذرا ہے۔ آج صبح گارشکوف کا چھوٹا لڑکا مر گیا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی وفات کیسے ہو گئی۔ تیز بخار کی بنا پر یا کسی اور روگ کی وجہ سے چل بسا لیکن یہ بہت بری بات ہوئی۔ میں ان لوگوں کو تسلی دینے گیا تھا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ غریبی کے ہاتھوں وہ تو اپنے دن کاٹ رہے ہیں۔ ان کا کمرہ بہت ہی خراب حالت میں تھا۔ اور کون جانے کہ وہ پورا کنبہ محض اسی ایک کمرے میں رہتا ہو اور صرف شرافت کی خاطر کمرے میں چادریں لٹکا کر وقت کاٹ رہے ہوں۔ جنازہ تیار تھا۔ تابوت سیدھا سادہ تھا لیکن صاف ستھرا تھا۔ ان لوگوں نے بنا بنایا ہی خرید لیا تھا۔ بچے کی عمر نو برس تھی اور ان کا کہنا ہے کہ بڑا ہونہار بچہ تھا۔ وارنیکا ان لوگوں کو دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ بچے کی ماں کا یہ حال تھا کہ روئی بھی نہیں لیکن اسے ایک عجیب چپ لگ گئی تھی۔ ممکن ہے کہ ایک بچے کی موت سے ان کا کچھ بوجھ ہی کم ہوا ہو۔ ایک آدمی کی روٹی کا خرچ بچا ہو۔ دو بچے اور ہیں۔ ایک تو نوزائیدہ ہے اور ایک چھ یا سات برس کی لڑکی ہے۔ بچوں کو دکھی ہوتے نہیں دیکھا جا سکتا اور خاص کر جب وہ اپنے ہوں تو ان کے لئے کچھ کیا نہ جا سکے۔ ان کا باپ اپنا پرانا کوٹ پہنے ایک شکستہ کرسی پہ بیٹھا تھا۔ اس کے گال سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ رہی تھی شاید یہ آنسو رنج کی بنا پر نہ امنڈ آئے تھے شاید انہیں رونے کی عادت پڑ چکی ہے۔ اس کی آنکھیں کچھ خراب ضرور ہیں۔ وہ عجیب وضع کا انسان ہے۔ جب کوئی اس سے بات کرے تو شرما جاتا ہے۔ گھبرا اٹھتا ہے اور اس کی زبان ہی نہیں کھلتی۔ اس کی چھ برس کی ننھی سی بیٹی جنازے کے قریب گم سم کھڑی تھی۔ جیسے گہری فکر میں ڈوب گئی ہو۔ وارنیکا کسی بھی بچے کو اس انداز میں گم سم دیکھنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ مجھے کچھ ہونے لگتا ہے۔ اس کی پرانی اور خستہ حال گڑیا فرش پر ایک طرف پڑی تھی۔ اس کی انگلیاں اس کے ہونٹوں پر پڑی تھیں اور وہ کھوئی کھوئی وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ بالکل ساکت و منجمد۔ مکان کی مالکن نے اسے ٹافی کی ٹکڑی دی۔ اس لڑکی نے وہ ٹکڑی لے تو لی لیکن اس نے کھائی نہیں۔ وارنیکا۔ یہ ہوتا ہے رنج۔ ٹھیک کہتا ہوں نا؟

ماکار۔

۲۵ جون

میرے پیارے ماکار۔

میں نے تمہاری کتاب واپس بھیج دی ہے۔ کیا واہیات کتاب تھی پڑھ کر سخت کوفت ہوئی۔ ایسا نایاب نسخہ تمہارے ہاتھ لگا کہاں سے؟ ماکار۔ یہ تو خیر مذاق کی بات تھی سچ سچ بتاؤ کیا واقعی تمہیں اچھی لگی ہیں۔ پرسوں تم نے وعدہ کیا تھا کہ میرے پڑھنے کے لئے کوئی چیز بھیجو گے۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ انہیں پڑھ لیں گے۔ اچھا زیادہ لکھنے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے خدا حافظ

وی۔ ڈی

۲۶ جون۔

عزیزم وارنیکا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے وہ کتاب خود نہیں پڑھی تھی۔ میں نے یونہی صفحے ادھر ادھر سے الٹ کر دیکھا تھا کہ ہنسنے ہنسانے کے لئے ذرا اچھے لطیفے درج ہیں لہٰذا میں نے سوچا کہ چلو ذرا دل لگی ہی رہے گی۔ کون جانے کہ وارنیکا کو یہ کتاب پسند ہی آ جائے۔ بس یہی سوچ کر میں نے تمہیں بھیج دی تھی۔

راتازیف نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے حقیقتاً کوئی اچھی تصنیف دے گا۔ غم مت کرو۔ پڑھنے کے لئے بہت مواد ملے گا۔ راتازیف ایک سچا محقق اور واقعی وسیع المطالعہ شخص ہے وہ خود بھی لکھتا ہے۔ اور ارے بابا کیسی کیسی چیزیں لکھ دیتا ہے وہ! اس کی تحریریں جاندار ہیں اور وہ اس راز سے بخوبی

آشنا ہے کہ تحریر میں اسلوب کیسے پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ تو ایک ایک لفظ میں جان ڈال دیتا ہے۔ خالڈ (خالد) وہی تم دوما سے بات کرتے ہوئے میری زبان سے جو الفاظ معمولی، بے معنی اور واہیات نظر آتے ہیں وہی الفاظ جب وہ استعمال کرتا ہے تو ان میں ایک اپنا ہی حسن ہوتا ہے۔ میں اسکی دعوتوں میں ہمیشہ شریک ہوا کرتا ہوں۔ وہاں ہم لوگ بیٹھے سگرٹوں کے کش لگاتے رہتے ہیں اور وہ ہمیں اپنی تخیلات سناتا ہے۔ کبھی کبھی تو صبح کے پانچ بج جاتے ہیں، میں ان محفلوں کو دعوتِ ادب کہوں گا۔ لاجواب تحریر ہے اسکی بھی پھول جھڑتے ہیں۔ واقعی ہر فقرے سے پھولوں کی لڑی گوندھی جاسکتی ہے۔ موتی پروتا ہے موتی۔ اور پھر آدمی بھی نیک دل ہے۔ دوسروں کی تکلیف کو سمجھتا ہے اور مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا اس کا کیا مقابلہ۔ میں اس کے سامنے ہوں کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ اُسکی عزت ہے شہرت ہے اور میں۔؟ میں بالکل صفر! اُس کے سامنے میری ہستی ہی کیا ہے۔ لیکن اسکے باوجود میری عزت کرتا ہے۔ وہ کبھی کبھی مجھے اتنی اجازت دے دیتا ہے کہ اس کے لئے نظم یا نثر کا کچھ حصہ کاپی کر دوں۔ لیکن عزیز اس سے یہ مطلب نہ نکالنا کہ یہ فقط اس کی چالاکی ہے۔ اور یہ بھی نہ سمجھنا کہ وہ میری عزت اس لئے کرتا ہے کہ میں اُس کی نظم و نثر کی کاپی کر دیتا ہوں۔ نہیں نہیں ایسا کوئی خیال دل میں نہ لانا۔ میں یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہوں کہ میں من سے یہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں میری اپنی خوشی ہے اور یہی وجہ کہ وہ بھی میری قدر کرتا ہے تاکہ مجھے خوشی میسر ہو۔ جانِ من جب کوئی معاملہ نازک ہو جاتا ہے تو میری آنکھوں سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ وہ اچھا اور نیک شخص ہے۔ ہاں۔ اور بے مثال ادیب ہے۔

وارنیکا ـــ یہ ادیب بھی کمال کی چیز ہے۔ واقعی خوب ہے۔ یعنی کل میں نے ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر یہی راز پایا ہے۔ ادب۔ بہت گہری اور ٹھوس حقیقت ہے۔ جاندار چیز ہے۔ ادب ایک تصویر ہے اور وہ ایک خاص قسم کی تصویر۔ یہ ایک آئینہ ہے۔ جس میں جذبات کا عکس نظر آتا ہے۔ اس میں بلند پایہ نکتہ چینی ملتی ہے۔ ہدایات ہوتی ہیں۔ اور پھر زندگی کی تفسیر ہے۔

میں نے یہ باتیں انہی لوگوں سے سیکھی ہیں۔ میں تو صاف بات کروں گا۔ میں وہاں بیٹھ کر کوئی بھی کہانی یا نظم تو سن سکتا ہوں؟ اور دوسروں کی طرح اپنا پائپ پیا رہتا ہوں) لیکن جہاں انہوں نے بحث شروع کی اور دلائل پیش کئے جب پانی اپنے سر سے گزر جاتا ہے۔ وہ باتیں اپنی سمجھ سے باہر کی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میں بھی سمجھدار نظر آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن یہی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود پر شرم آتی ہے۔ افسوس ہوتا ہے۔ کاٹھ کے پتلے کی طرح تمام شام وہاں بیٹھا رہتا ہوں۔ اور ایک صحیح اور موزوں لفظ ادا کرنے کے لئے اپنا دماغ کریدتا رہتا ہوں۔ لیکن خدا کی ایسی مار ہے کہ ایک لفظ بھی دھیان میں نہیں آتا۔ کچھ بھی نہیں کہہ پاتا میں ـــ اور وارنیکا اگر آدمی باقی لوگوں کے معیار پر پورا نہ اترے تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ کتنی سچی کہاوت ہے "بالکل کورے شخص جیسا کوئی بیوقوف نہیں ہو سکتا۔" اور پھر میں چین کے لمحات میں کرتا ہی کیا ہوں۔ بس پڑا سویا رہتا ہوں۔ اور پھر میں کر دوں بھی کیا؟ میرا خیال ہے مجھے کچھ اچھی بات کرنی چاہئیے مجھے خالی وقت میں کچھ لکھتے رہنا چاہئیے۔ یہ مشق میرے لئے بھی فائدہ مند ثابت ہو گی اور دوسرے بھی خوش ہو جائیں گے۔ اس سے میرا وقار بڑھ سکتا ہے جانِ من۔ اور تم کیا اندازہ کر سکتی ہو کہ وہ اس فن سے کتنی آمدنی بنا لیتے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ مثلاً تو داتازیف ہی مثال لے لو۔ ایک صفحہ لکھ دینا اس کے لئے بہت ہی معمولی بات ہے۔ وہ ایک روز میں پانچ صفحات لکھ سکتا ہے اور جانتی ہو کہ اس کے معاوضے میں اُسے کیا ملتا ہے؟ تین سو روبل۔ یہ داتازیف ہی نے بتایا ہے مجھے۔ اور اگر وہ کوئی ایسی کہانی لکھ دے جس میں لوگ بہت زیادہ دلچسپی دکھائیں تو اُسے پانچ سو روبل بھی مل جاتے ہیں۔ وہ انکار کر کے تو دیکھیں اگلی بار ایک ہزار روبل طلب کریں گے۔ وارونیا۔ اب اس مسئلے پر تم اپنی رائے نہ دے بیٹھنا۔ ہاں من سوچو تو ـــ فقط ایک نظم کے کچھ اشعار اور پھر اس نے تو پوری کتاب لکھ رکھی ہے۔ سات ہزار روبل اُس کی لاگت کتنا ہے۔ اندازہ تو کرو۔ یہ تو کسی جاگیر کی لاگت ہو سکتی ہے۔ کسی محل کی قیمت ہو سکتی ہے۔ داتازیف کا کہنا ہے کہ پبلشر پانچ ہزار روبل دینے پر آمادہ ہے لیکن اُسے منظور نہیں۔ یعنی

اب اس معاملے میں وہ زیادہ مہاتما ہے۔ میں نے تو اس سے بہت کہا تھا کہ خدا کے لئے پانچ ہزار روبل منظور کر لو اور اس پر لعنت بھیجو۔ بلاشبہ پانچ ہزار روبل نقد دینے کو تیار ہے لیکن داستان نویس اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے۔ وہ پوری خود اعتمادی سے کہتا ہے —"جناب۔ شوق سے آپ سات ہزار روبل دیں گے۔" وارنیکا یہ شخص کتنی گہری نظر رکھتا ہے۔

فضول کی باتیں بنانے سے کیا حاصل — میں یہاں اس کی کتاب سے کچھ ٹکڑے نقل کر رہا ہوں — تمہیں خود بخود اس کی قابلیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

"ولیڈی میر چل پڑا — کیونکہ اس کی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ اس کے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ دیلا کر بولا۔

"شہزادی! کیا تم جانتی ہو کہ میری محبت کتنی دیوانی ہے۔ کیا تم جانتی ہو کہ میرے پاگل پن کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ نہیں! میرے خواب مجھے دھوکا نہیں دے سکتے — مجھے تم سے والہانہ محبت، میں تمہیں دیوانہ وار چاہتا ہوں میں تمہاری محبت میں پاگل ہو چکا ہوں میری رگ رگ میں جو آگ بھڑک رہی ہے۔ اسے تمہارے ... کے خون کا آخری قطرہ بھی نہیں بجھا سکتا۔ جو شعلہ میرے سینے کو جلائے دے رہا ہے جو بھیانک ...! ابھی ... ختم کئے جا ... ہے، بولا! اسے نہیں روک سکتا۔ وہ زینائیڈا۔ میری زینائیڈا

"ولیڈی میر —" زینائیڈا نے آہستہ سے کہا۔ وہ اپنے آپ میں نہ رہی تھی اور وہ اس کی آغوش میں جا سمائی۔

"زینائیڈا —" وہ عاشق زار ایک بار پھر چلایا۔

وہ تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ جیسے ہانپ رہا ہو — جذبات کے مندر میں محبت کا چراغ چاروں طرف نور پھیلا رہا تھا اور دردمند بدقسمت غمزدہ دلوں کی تسکین عطا کر رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر آہستہ سے کہا — "ولیڈی میر —" اس کی آواز یوں بھاری ہو گئی تھی جیسے وہ محبت کے نشے میں سرشار تھی۔ اس کے سینے میں طوفان مچل رہا تھا۔ اس کے رخسار تمتما اٹھے تھے۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ اور ایک نئی اور خوفزدہ محبت نے وصل میں اپنی تکمیل ڈھونڈی۔

آدھ گھنٹے بعد بوڑھا کاؤنٹ اپنی بیوی کی خوابگاہ میں داخل ہوا۔ اور بولا۔

"بتاؤ تو جانِ من — مہمانوں کے لئے شوربہ بھی تیار کرا لیں کیا؟" اور اس نے اس کے رخسار پر ہلکی سی تھپکی دی۔

وارنیکا — اب اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ شاید ذرا گھٹیا بات ہے لیکن پھر بھی خوب ہے۔ کم از کم داد کا زلیخا جس داد کا مستحق ہے وہ تو اسے ملنی ہی چاہئے۔ اچھا اب اس کی ایک اور کہانی یرمک اور زلیخا کا کچھ حصہ سنو۔ تم ذرا اندازہ لگاؤ کہ سائیبیریا کا ظالم اور بے رحم فاتح زلیخا کی محبت میں گرفتار ہے۔ زلیخا سائبیریا کے سار کچم کی لڑکی ہے۔ اور اس بات سے اور تم خود محسوس کرو گی کہ ظالم آئیون کے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

"زلیخا تم مجھ سے پیار کرتی ہو — ایک بار پھر کہو کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو — تم مجھے چاہتی ہو —"

زلیخا نے نشیلی آواز میں کہا — "میں دل و جان سے تم پر فدا ہوں"

"شکریہ زلیخا — شکریہ — تم نے مجھے ساری کائنات کی خوشیاں عطا کر دی ہیں۔ پیدائش کے دن سے لیکر اب تک میری پر کرب روح کو جس کی تلاش تھی آج تم نے مجھے عطا کر دی۔ اے میری تقدیر کے ستارے اس گھڑی کے لئے تو مجھے یہاں تک لایا تھا۔ یہ لمحہ عطا کرنے کے لئے اُرلاس کی چٹانوں کی خوفناک گھاٹیوں سے گزار کر یہاں لے آیا تھا۔ اب میں ساری کائنات کو زلیخا کے قدموں پر لا کھڑا کر دوں گا۔ اور کوئی بھی انسان جہنم کے بھوت اور دیو بھی انکار کرنے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ کاش یہ اہلِ زندگی اس کے نازک دل کی دھڑکنوں کو سن سکیں۔ اور محسوس کر سکیں کہ ان میں کس قدر پراسرار جذبات موجزن ہیں۔ اس کے موتیوں جیسے آنسوؤں کے قطروں میں کیا نظمیں چھپی ہوئی ہیں کاش انہیں کوئی سمجھ سکے۔ اے خداوند اے رب کریم مجھے طاقت بخش کہ میں ان آنسوؤں کے قطروں سے اپنے من کی پیاس بجھاؤں۔

"برمک — زلیخا بولی — "برمک — دنیا بڑی ظالم ہے اور انسان ناانصاف ہے۔ وہ ہمیں اپنی دنیا سے نکال باہر کریں گے، وہ ہم پہ لعنت ملامت کریں گے۔ میرے محبوب برمک — وہ ہماری زندگی عذاب بنا دیں گے۔ تمہارے ماحول کی بے مہر، مغرور اور اونچی سوسائٹی اس غریب لڑکی کا دم گھونٹ کے مار دے گی جو برف کے چٹیل میدانوں میں اپنے باپ کے خیموں میں پلی ہے — اے میری جانِ حیات — تمہارا ماحول مجھے کبھی نہ سکھے گا۔"

برمک کی آنکھوں سے شعلے برس پڑے۔ اور وہ شیر کی طرح دہاڑ کر بولا۔

"اگر ایسی ہی بات ہے تو برمک کی تلوار موت کے نغمے سناتی اور سیٹیاں بجاتی ہوئی سب کا سر کاٹ کے رکھ دے گی۔"

وارنیکا ذرا اندازہ کرو جب برمک کو یہ پتا چلا ہوگا کہ زلیخا کو قتل کر دیا گیا ہے تو اس کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ رات کی تاریکی میں اندھا اور بوڑھا نجم برمک کے خیمے میں گھس گیا تھا اور اس نے اپنی لڑکی کے سینے میں کئی خنجر گھونپ دیئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جس شخص نے اس کا تخت اور وقار چھین لیا ہے اس کو وہ خود بھی کس قدر ضربِ کاری پہنچا رہا ہے۔

برمک غصے میں پاگل ہو اٹھا۔ اپنی تلوار کو چٹان کے چمکیلے پتھر پہ زور سے مارتا ہوا بولا — "میں پتھر پہ وار کر کے اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا اور اس بدمعاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

لیکن برمک زلیخا کی موت کا صدمہ نہ برداشت کر سکا۔ وہ آتش میں کود گیا اور یہاں کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

اور ذرا ایک اور ٹکڑا ملاحظہ کرو۔ یہ ذرا مزاحیہ انداز میں ہے۔

"کیا تم آئیون بردکوفش زلیٹوپوز کو جانتے ہو۔ یہ وہ شخص ہے جس نے بردکوفی آئیونووچ کی ٹانگ کو کاٹ کھایا تھا۔ آئیون بردکوفش منکرانہ کردار کا مالک ہے لیکن اس میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔ اس کے برعکس بردکوفی آئیونووچ مشہور اور عشرت کا دلدادہ ہے۔ جب پیلاگو ایبنٹونووا اس کی دوست تھی۔۔۔

کیا تم پیلاگو اینٹونووا کو جانتے ہو — یہ وہی عورت ہے جو ہمیشہ الٹا پہنی کوٹ پہنتی ہے۔"

وارنیکا — کیا بلند پایہ مزاح ہے۔ بلکہ یہ تو حسین مزاج ہے۔ جب داتا زیف نے ہمیں یہ کہانی پڑھ کر سنائی تھی تو مارے ہنسی کے ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔ وہ خود بھی ایسی ہی شخصیت ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔ ہو سکتا ہے کہ کہانی کا اندازِ بیاں ذرا زیادہ ہی بانک اور ہلکے درجے کا ہو لیکن کیا سادگی ہے کیا معصومیت ہے۔ بیباک خیال اور غیر فطری خیالات کا شائبہ تک نہیں ہے۔ وارنیکا میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ داتا زیف اچھے چال چلن کا مالک ہے لہٰذا بلند پایہ کا ادیب ہے۔ یہ بات اکثر و بیشتر ادیبوں کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔

اور فرض کرو کہ — آدمی کے دماغ میں کیا کیا خیالات آتے ہیں — ہاں تو فرض کرو کہ اگر میں بھی لکھنے لگ جاؤں۔ ذرا تصور کرو کہ اگر اچانک تمہیں ایک کتاب نظر آئے جس کا عنوان ہو — ماکار کی نظمیں — تو پھر تم کیا سوچو گی۔ تمہارا ردِ عمل کیا ہوگا؟ رہا میرا سوال تو پھر میں دوبارہ نیفکی پراسپیکٹ میں جانے کا نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہر شخص مجھے دیکھتے ہی بول اٹھے گا "وہ ماکار ہے — وہی ماکار — شاعر اور نامور ادبی شخصیت"، تو میں کیا محسوس کروں گا۔ پھر میں اپنے ان شکستہ جوتوں کا کیا کروں گا۔ اب بات چل ہی پڑی ہے تو میں بھی بتا دوں کہ میرے جوتے ہمیشہ ٹانکے لگے رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تلوا تو بری طرح باہر کو نکل آتا ہے۔ اگر ہر شخص اپنے شاعر ماکار کو اس حالت میں جاتے ہوئے دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔ اور اگر شہزادی مجھے وہ خستہ حال بوٹ پہنے ہوئے دیکھ لے گی تو پھر کیا ہوگا — میرا خیال نہیں کہ اس کی نگاہ جوتوں پر ہی پڑے گی کیونکہ شہزادیاں لوگوں کے جوتے نہیں دیکھتیں اور پھر کلرک کے جوتے کے بارے میں وہ خاص توجہ بھی دے گی۔ لیکن میرے اپنے دوست ڈانٹ دیں گے۔ اور داتا زیف سب سے پہلا شخص ہوگا۔ داتا زیف آئے دن شہزادی سے ملنے جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شہزادی اور شاہی خاندان کے باقی افراد ایک ذہین دوست کی طرح اس کا سواگت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ تکلف سے پیش نہیں آتے۔ داتا زیف کہتا ہے کہ شہزادی بہت ہی خوش

مزاج اور رحم دل عورت ہے - اس سے ملنا ہی ایک خوشی کی بات - اس کا کہنا ہے کہ شہزادی بہت زبردست ادیب اور ادب پرست ہے - سچ کیا کچھ داتا زلیت کے بہت ہی قابل شخص ہے -

اچھا اب کوئی اور بات کرتا ہوں - میں تو یہ سب کچھ تمہاری دلچسپی کے لئے لکھ رہا تھا - اچھا عزیزم خدا حافظ آج میں نے جو کھول کر ماہی تباہی بکی ہے - لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آج میں بے حد خوش ہوں - ہم سب نے کل داتا زلیت کے ہاں کھانا کھایا تھا - اور کچھ بدمعاشوں نے شراب بھی پی تھی - مجھے یہ سب کچھ لکھنا نہیں چاہیئے - لیکن تم مجھے غلط نہ سمجھ بیٹھنا - یہ تو محض دل جیتنے کا بہانہ ہے اور کچھ نہیں - میں کتابیں ضرور بالضرور تمہیں بھجوا دوں گا - ان دنوں پال ڈی کاک کی ایک کتاب ہمارے حلقے میں پڑھی جا رہی ہے - لیکن عزیزم وہ کتاب تمہارے مطلب کی نہیں ہے - نہیں نہیں ایسی کتابیں تمہیں دور سے بھی نہیں دیکھنی چاہئیں - سننے میں آیا ہے کہ سینٹ پیٹرس برگ کے تمام نقاد اس کتاب پر برس پڑے ہیں - میں تمہارے لئے ایک پونڈ مٹھائی بھیج رہا ہوں - میں نے خاص تمہارے لئے خریدی ہے تاکہ تم مٹھائی کی لذت اٹھاتے وقت مجھے بھی یاد کرتی جاؤ - اور ہاں صرف ان کا رس چوسنا - انہیں دانتوں سے مت کاٹنا ورنہ دانت خراب ہو جانے کا خدشہ ہے - تمہیں کیا پھلوں کا مربہ اچھا لگتا ہے - اگر اچھا لگتا ہے تو مجھے لکھ بھیجو - اچھا دلنشیکا خدا حافظ - خدا تمہارا نگہبان رہے -

تمہارا بہترین دوست

ماکار

۲۷ - جون -

میرے پیارے ماکار

فیڈورا کہتی ہے کہ اگر میں چاہوں تو کئی لوگ مجھے کام دینے کو تیار ہیں - اور بچیوں کی دیکھ بھال کا کام اچھی اجرت پہ مل سکتا ہے - تم مجھے فوراً صلاح دو کہ میں اس پیش کش کو قبول کر لوں یا نہ کروں - اگر میں یہ کام شروع کر دوں تو پھر میں تم پر بوجھ نہ بنی رہوں گی - کیوں کہ اس ملازمت کے نقد پیسے بھی ملیں گے -

لیکن دوسری طرف بھی ایک اور امر بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ کسی اجنبی گھر میں داخل ہونے کا تصور مجھے کچھ عجیب سا لگتا ہے اور جو شخص مجھے ملازمت دینے کو تیار ہے وہ کوئی جاگیردار ہے - لیکن میں ڈر رہی ہوں کہ وہ میرے ماضی کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہے گا اور میں اسے کیا کہوں گی - علاوہ ازیں میں بالکل کسی جنگلی باشندے کی طرح ہوں - مجھے لوگوں سے ڈر لگتا ہے - میں ان جگہوں کی عادی ہو جاتی ہوں جہاں مجھے زیادہ دیر رہنا پڑے اور پھر وہاں چاہے لاکھ مشکلات پیش آئیں میں گذارا کر ہی لیتی ہوں - یہ جگہ ایک تو یہاں سے کوسوں دور ہے اور پھر کون جانے کہ مجھے وہاں کیا کام کرنا ہوگا - ممکن ہے بچوں کی نگہبانی کرنی پڑے اور کوئی بھی کام نہ ہو لیکن بچوں کی دیکھ بھال کونسی آسان بات ہے - بچے کس کے قابو میں آتے ہیں - اور پھر ان لوگوں نے گذشتہ دو برسوں میں دو دا ستانیاں بدلی ہیں - ماکار خدا کے واسطے مجھے صلاح دو - کیا میں ہاں کر دوں یا انکار کر دوں ؟ تم ہم سے ملنے کیوں نہیں آتے - ان دنوں تم نظر ہی نہیں آتے - صرف اتوار کے دن ملتے ہو یا چرچ میں مل جاتے ہو - تم بھی واقعی کسی جنگلی باشندے کی طرح ہو - بالکل میری طرح ہو - اور شاید قریب میں تمہاری ہم فطرت ہوں

ماکار - تمہیں مجھ سے ذرا بھی پیار نہیں ہے - میں اکیلی بیٹھی بیٹھی کتنی اداس ہو جاتی ہوں - خاص کر کبھی کبھی شام کے وقت تو میں بالکل اکیلی ہوتی ہوں - تن تنہا بیٹھی رہتی ہوں - فیڈورا کہیں گئی ہوتی ہے اور میں بیٹھی بیٹھی سوچتی رہتی ہوں - میرے دل و دماغ میں پرانے دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور میں سوچتی رہتی ہوں کہ کونسا واقعہ غم انگیز تھا اور کونسا واقعہ مسرت بخش - تمام مناظر ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے سے گذرنے لگتے ہیں (بالکل یہی تصویریں ہوتی ہیں) اور امی جان سے متعلق جتنے واقعات یاد آتے ہیں اتنے دیگر واقعات یاد نہیں آتے - اور نہ جانے مجھے کیسے کیسے سپنے آتے ہیں - مجھے جان پڑتا ہے کہ میری صحت برباد ہو گئی ہے - میں بہت کمزور ہو چکی ہوں آج جب میری آنکھ کھلی تو اچانک بے ہوش ہو کے گر پڑی تھی - کچھ عرصے سے مجھے بری کھانسی بھی آنے لگی ہے - مجھے یقین ہے کہ

میں جلد مر جاؤں گی ۔ اور میرے مرنے کی کسے پرواہ ہے ۔ میرے لئے کون روئے گا اور قبر تک میرے جنازے کے ساتھ ساتھ کون جائے گا ۔ اور کونسی بڑی بات ہے کہ میری موت کسی اجنبی گھر میں ہو جائے ۔ بالکل اجنبی جگہ پہ جی لیوں ۔ میرے خدا ۔۔ زندگی کس قدر اداسیوں سے بھری ہوئی ہے

اور ماکار ۔۔ تم ہر وقت مجھے مٹھائیاں اور پھل کیوں کھلاتے رہتے ہو ۔ میں سوچ تک نہیں سکتی تمہارے پاس اتنا پیسہ آتا کہاں سے ہے ۔ پیسہ عزیز دوست ۔۔ اپنے پیسوں کو بچاؤ ۔۔ میں نے ایک چٹائی کی سلائی اور کڑھائی کی تھی ۔۔ فیڈورا اسے فروخت کرنے والی ہے ابھی تک ہمیں بینک نوٹ کی صورت میں پچاس روبل پیش کئے جا چکے ہیں ۔ میرا خیال ہے مہنگی بکے گی ۔ کم از کم مجھے اتنی توقع نہ تھی ۔ تین روبل میں فیڈورا کو دے دوں گی ۔ اپنے لئے ایک جمپر سی لوں گی ۔ جمپر سیدھا سادہ ہوگا لیکن گرم کپڑے کا ہوگا ۔ اور ہاں میں تمہارے لئے بھی ایک واسکٹ بناؤں گی ۔ یہ واسکٹ میں اپنے ہاتھوں سے تیار کروں گی اور اچھے سامان سے تیار کروں گی ۔

فیڈورا نے ایک کتاب خریدی ہے ۔ اس کا نام ہے The Tales of Ivan Belkin میں یہ کتاب تمہیں بھیج رہی ہوں ۔ اگر تمہارا جی چاہے تو اسے پڑھ لینا ۔ لیکن خدا کے لئے اسے خراب یا گم نہ کر دینا یا اسے اپنے پاس زیادہ دیر دیر رکھے رہنا ۔ دو برس پہلے کی بات ہے کہ یہی کہانیاں میں امی جان کے ساتھ بیٹھ کر پڑھا کرتی تھی اور جب میں نے یہ کہانیاں اکیلے بیٹھ کر پڑھیں تو میرے دل پر گہری اداسی چھا گئی ۔ اگر تمہارے پاس کچھ کتابیں ہوں تو میرے پڑھنے کے لئے بھیج دینا ۔ ہاں وہ داتا زیفت کوئی کتاب دے تو وہ نہ بھیج دینا ۔ وہ تو فقط اپنی ہی کتاب دے گا اور وہ بھی اگر کسی نے چھاپ دی ہو ۔ ماکار تم اس کی کہانیاں پسند کیسے کر بیٹھے ۔ وہ تو بہت ہی واہیات کہانیاں ہیں ۔ اچھا خدا حافظ ۔ میں نے بھی آج بے کار باتیں کی ہیں ۔ میں جب کبھی اداس ہوتی ہوں تو اسی طرح بے مقصد اور بے معنی باتیں کرتی ہوں ۔ یہ میرے درد کی اصل دوا ہے کیونکہ اس طرح میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں ۔ اچھا میرے دوست

تمہاری

دی ۔ ڈی

۲۸ ۔ جون ۔

میری ننھی فاختہ واروارا ۔

اس طرح ناامید ہوتے ہوئے کیا تمہیں شرم نہیں آتی ۔ اچھا اچھا ہٹاؤ یہ اداسی ۔ ہمت باندھو میرے فرشتے ! تم ایسی باتیں سوچ کیسے سکتی ہو ؟ نہیں جان من تمہیں کوئی روگ نہیں ہے ۔ تم بالکل بیمار نہیں ہو ۔ تم تو چہک رہی ہو ۔ تم تو ہشاش بشاش ہو ۔ تم اس سورج مکھی پھول کی طرح ہو جو ذرا سا پیلا ضرور ہے لیکن چہک رہا ہے ۔ اور سپنے کیا دیکھتی رہتی ہو تم ۔ کیا سوچتی رہتی ہو ! بہت بری بات ہے یہ تو ۔ تمہیں شرم آنی چاہئے ۔ ایسے خیالات اپنے دماغ سے جھٹک کر رکھ دو ۔ دیکھو میں کتنی اچھی نیند سوتا ہوں اتنی اچھی طرح سوتا ہوں کہ کوئی دکھ مجھے پریشان نہیں کرتا ۔ میری طرف دیکھو ڈیا اور اُسکے دکھوں سے بے خبر ہو کے سو جاتا ہوں ۔ ظاہر ہے کہ خوش رہتا ہوں ۔ ہنستا گاتا ہوں اور نوجوانوں کی طرح زندہ ہوں ۔ واقعی ۔۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ۔ وارنیکا چھوڑ دو یہ اداسی ۔۔ اپنے آپ کو سنبھالو ۔ میں جانتا ہوں تمہارے سر میں کیا خبط سمایا ہوا ہے ذرا سی بھی بات تم پر اپنا اثر کر جاتی ہے اور تم ہو کہ بیٹھی پریشان ہوتی رہتی ہو اور بلا وجہ سوچتی رہتی ہو ۔ دیکھو تم ایسا نہ کیا کرو ۔ میں اپنے پیار کا واسطہ دیتا ہوں ۔ وہی اس ملازمت کی بات تو صاف انکار کر دو ۔ نہیں نہیں تمہیں ایسی بات بھول کر بھی دماغ میں لانا ۔ میں حیران ہوں تم ایسی باتیں دماغ میں لاتی کیسے ہو ۔ اور پھر وہ جگہ کتنی دور ہے یہ بھی تو دیکھو ۔۔ تمہیں میری گڑیا تم یہ ملازمت نہیں کرو گی ۔ میں یہ بات کیسے برداشت کروں گا ۔ میں اپنی پوری طاقت سے اس کی مخالفت کروں گا ۔ میں اپنا کوٹ تک بیچ دوں گا صرف قمیص پہنے گھومنا منظور کر لوں گا لیکن تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہ کرنے دوں گا ۔ نہیں وارنیکا ۔ تمہیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا ہے یہ سر بسر حماقت ہے ۔ مجھے پورا یقین ہے یہ سب قصور فیڈورا کا ہے ۔ یہ اسی بیوقوف اور جاہل عورت کی حماقت ہے جس نے تمہارے دل میں یہ بات بٹھا دی ہے ۔ اس کا کوئی اعتبار نہ کرنا ۔ میرا کہا مانو ۔۔ اس کے بارے میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جن کا تمہیں علم ہے ۔ وہ بالکل بیوقوف عورت ہے ۔ بات

نا بتاؤ بادی سے ۔ اس کا خاوند اس کے ہاتھوں دکھی ہو کے
مرا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے اپنے خاوند
کو مار دیا تھا۔ شاید اس نے تمہیں خفا کر دیا ہو۔ نہیں جان من
بلکہ یہی ہو جائے تم ملازمت نہیں کرو گی ۔ یہ تو سوچو میں کیا
کروں گا ۔ ادھر سے میرے پاس کون رہ جائے گا۔ نہیں دار ہنگا
بالکل نہیں ۔ اس خیال کو اپنے دماغ سے نکال کر باہر کرو تم
مجھے اور منیزہ اور ان کو کتنی خوشیاں عطا کرتی ہو اور تم ہم
دونوں کی کس قدر مشتاق ہو۔ بس جس طرح بھی رہی ہو اسی
طرح رہو۔ کھاؤ پیو اور سو رہو۔ شوق پورا کرنے کے لئے
پڑھایا کرو یا سلائی کا کام کر لیا کرو ۔ یا اگر سلائی بھی نہ
کرنا چاہو تو صرف کتابیں پڑھتی رہو ۔ لیکن ایک بات سن لو
کہ تمہیں کہیں نہیں جانا ۔ تمہارا دور چلے جانا کسی کے حق میں بھی
مفید ثابت نہ ہوگا ۔ تمہیں جن کتابوں کی ضرورت ہو گی میں
خرید دوں گا ۔ ہم دونوں سیر کرنے جایا کریں گے ۔ لیکن عقل سے
کام لو سمجھدار بنو اور ایسے پاگل پن کو دوبارہ دماغ میں مت لانا۔
میں تم سے ملنے آؤں گا ۔ شاید بہت جلد چلا آؤں ۔

صاف صاف بات کر دینے پر مجھے معاف رکھنا لیکن میں
مجبور ہوں ۔ یہ تو بڑی ذلت ہے ۔ جان من بہت زیادہ
توہین ہے ۔ میں پڑھا لکھا شخص نہیں ہوں ۔ اور جیسی کہ عادت
ہے میں نے بھی پیسے دے کر تعلیم حاصل کی ہے ۔ لیکن اس وقت
میں اپنے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا میں فقط دا آزلیف کے بارے
میں کچھ کہنا چاہتا ہوں ۔ عزیزم میری خطا معاف کرنا لیکن میں
اس کی طرف سے صفائی ضرور پیش کروں گا ۔ وہ میرا دوست
ہے میں اس سے انکار نہیں کر سکتا ۔ اور نہ صفائی پیش کئے
بغیر رہ سکتا ہوں ۔ وہ اچھا لکھتا ہے اور خوب لکھتا ہے ۔
درحقیقت اس معاملے میں میں تمہارے ساتھ متفق نہیں ہوں۔
وہ انتہائی عمدہ پیرائے میں لکھتا ہے ۔ اس قدر صاف زبان اور
اس کی نشستِ الفاظ اتنی خوبصورت ہوتی ہے کہ داد دینی ہی
پڑتی ہے ۔ غالباً اسے پڑھتے وقت تمہارا دل کچھ میلا ہوگا۔
ممکن ہے تم فیڈورا کے ساتھ ناراض ہو گی یا اور ناخوشگوار
بات ہو گئی ہو گی۔ اسے دوبارہ پڑھنا ۔ اچھا! خاص
توجہ اور صحیح جذبے کے ساتھ پڑھنا ۔ مثال کے طور پر پڑھتے
وقت منہ میں معصری کی ڈلی رکھ لینا ۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ایسے
کئی ادیب ہیں جو دا آزلیف سے کہیں اچھا لکھتے ہیں ۔ مانا کہ
وہ لوگ بہت اچھا لکھتے ہیں لیکن دا آزلیف بھی اچھا لکھتا ہے۔
اگر اور لوگ اچھا لکھتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دا آزلیف
برا ادیب ہے ۔ وہ صاحبِ اسلوب ہے ۔ نئی بات کہتا
ہے اور یہ پہلو اس کے لئے اچھا ہے ۔ خدا حافظ جان من
میں اور زیادہ اس وقت کچھ نہیں لکھ سکتا ۔ آج میں بہت مصروف
ہوں دیکھو مایوسی کو اپنے دل میں جگہ مت دو ۔ خدا تمہارا
نگہبان ہے میں ہمیشہ سے ہی جو بیٹھا ہوں ۔ تمہارا سچا دوست
ماکار

ہاں ایک بات بھی بھول گیا ۔ بھیجی کتاب کے لئے بہت بہت
شکریہ ۔ میں پڑھ کر پڑھوں گا ۔ شام کے وقت میں تم سے ملنے آؤں گا۔
یہیں چولائی ۔

میرے پیارے دوست ماکار

مجھے پورا یقین ہے کہ یہاں تمہارے درمیان رہ کر میری کوئی
زندگی نہیں ۔ بار بار غور کرنے پر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس پیشکش
کو ٹھکرا دینا سخت غلطی ہوتی ۔ کم از کم اتنا تو ہوگا کہ میں اپنے دو وقت
کی روٹی ہی کماؤں گی ۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ میں ایک اجنبی خاندان کی
محبت جیتنے کے لئے پورا پورا اجتن کروں گی ۔ ضرورت محسوس ہوئی
تو میں اپنا کردار بدل ڈالوں گی ۔ ٹھیک ہے کہ اجنبی ماحول میں
رہنا بہت مشکل ہوگا ۔ انہیں خوش کرنا ہوگا ۔ میری ذاتی زندگی بے رنگ
رہے گی ۔ یہ سب ٹھیک ہے ۔ لیکن شاید خدا میری بھی مدد کرے گا۔
میں تمام عمر اسی طرح شرمیلی بن کر گزارا نہیں کر سکتی ۔ میری زندگی میں
ایسے کئی سانحات پہلے بھی گزر چکے ہیں آخر بورڈنگ ہاؤس
کے ایام میں بھول تو نہیں گئی ۔ مجھے ہر وہ اتوار اچھی طرح یاد ہے جب
میں گھر آ کر ادھم مچایا کرتی تھی ۔ حتیٰ کہ جب امی جان مجھے ڈانٹ
دیا کرتی تھیں تو بھی میرا دل پھول کی طرح کھلا اور شگفتہ رہتا تھا
لیکن جونہی شام کے سائے گہرے ہونے لگتے میرے دل پر بھی اداسی
چھا جایا کرتی تھی ۔ کیونکہ کل صبح نو بجے مجھے سکول پہنچنا ہوتا تھا ۔ وہ
سکول جس کا ہر پہلو میرے لئے اجنبی تھا ۔ جس کی سرد مہری اور سختی
مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی ۔ اور استانی کا تصور میرے لئے

عذاب جان کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں کئی بار بلک بلک کے رونا چاہتی رہی لیکن آنسو پی جاتی تھی۔ تاہم کبھی کبھار تنہا کسی گوشے میں جب کر جی بھر کے رو لیا کرتی تھی۔ کیونکہ جی میں ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ لوگ مجھے کاہل اور سست کہتے ہیں۔ لیکن پڑھائی یا سبق کے ڈر سے میں کبھی نہ روئی تھی۔ اور پھر اس کے بعد کیا رہتی؟ جوں جوں وقت گذرتا گیا میں سکول کی ہاسی فضا سے مانوس ہوتی گئی اور جب سکول سے روانگی اور ہم جماعتوں سے رخصت لینے کا وقت آیا تھا تو میں اس وقت بھی سسکیاں لے لے کر روئی تھی۔

اور پھر یہ بھی تو مناسب نہیں کہ میں تم پہ یا فیڈورا پہ بوجھ بنی ہوں۔ اس خیال ہی سے مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے۔ میں آج صاف صاف باتیں کر رہی ہوں کیونکہ میرے تمہارے درمیان کوئی تکلف نہیں ہے۔ کیا میں دیکھتی نہیں کہ بیچاری فیڈورا ہر روز منہ اندھیرے اٹھ کر کام شروع کر دیتی ہے اور پھر سارا دن اتنی مصروف رہتی ہے کہ دم لینے کی بھی اسے فرصت نہیں ملتی۔ اور پھر تم تو جانتے ہی ہو کہ بڑھاپے میں آدمی کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا میرے منہ پہ یہ دیکھنے کے لئے آنکھیں نہیں ہیں کہ تم اپنی ساری آمدنی مجھی پر خرچ کر دیتے ہو! اب ذرا سوچو کہ تمہاری آمدنی کس قدر قلیل ہے اور میں تم پر کتنا بڑا ظلم کر رہی ہوں۔ تم نے تو خط میں لکھ دیا کہ میری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تم اپنے بدن کا کوٹ تک اتار کے بیچ آؤ گے۔ اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ تم ایسا کر گذرو گے۔ میں جانتی ہوں کہ تم بہت رحمدل ہو۔ لیکن یہ سب کچھ تم اس وقت کہہ رہے ہو ــــ جب تمہیں بونس ملنے کی امید بندھ چلی ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ اور کیا تم یہ نہیں جانتے کہ میں مستقل طور پر بیمار رہتی ہوں۔ جس طرح جی مار کر تم کام پہ لگے رہتے ہو میں اتنی محنت نہیں کر سکتی حالانکہ اتنا کام کرنے پر مجھے دلی خوشی ہوگی۔ اور پھر یہ بھی مصیبت ہے نا کہ ہر وقت کام بھی تو نہیں ملتا! پھر میرے کرنے کو رہ کیا گیا ہے؟ بس یہی کہ تم پر آس لگائے بیٹھی رہوں اور سب کچھ ضائع کرتی رہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں تم دونوں کے کس کام آ سکتی ہوں۔ تم لوگوں کو میری اتنی کیا ضرورت ہے۔ میں نے آج تک تمہارے لئے کونسا اچھا کام کیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ میں دل و جان سے تمہیں چاہتی ہوں۔ تم مجھے جان سے زیادہ عزیز ہو

لیکن جب میری قسمت ہی ایسی ہے تو کسی کا کیا دوش! میں پیار کر سکتی ہوں۔ لیکن اس قابل نہیں کہ اس پیار کو نیکی بنا سکوں یا کوئی اچھا کام کر سکوں تاکہ تمہاری مہربانیوں کا کچھ تو صلہ دے سکوں۔ خواہ مخواہ مجھے اپنے پاس مت رکھو۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر ٹھنڈے دل سے ایک بار پھر غور کر لو اور اپنی آخری رائے سے مجھے آگاہ کر دو۔ میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔

وی ۔ ڈی

پہلی جولائی۔

وارنیکا! آخر کیا مصیبت ہے۔ یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے سوجھی کیا ہے! بس تمہیں ذرا سی تنہائی ملی اور تم ادھر ادھر بے سروپا سوچنے لگیں۔ کہ تمہیں یہ نہیں اچھا لگتا اور وہ نہیں ٹھیک لگتا اور سب کچھ بے معنی نظر آنے لگتا ہے۔ میں ایک بار پھر کہے دیتا ہوں کہ تم بے پر کی اڑاتی ہو! ہم سب ایک دوسرے کے مشتاق ہیں ــ ہل بیٹھتے ہیں ــ چین ہے ــ خوشی ہے ــ اور کیا چاہتے ہیں؟ اجنبی لوگوں میں جا کر کیا ملے گا؟ عزیزم اجنبی لوگوں سے تمہارا پالا پڑا نہیں۔ کم از کم مجھ سے پوچھو تو پتا ہوتا ہے کہ وہ لوگ ہوتے کیسے ہیں۔ میں ان کی خصلت سے واقف ہوں۔ رگ رگ پہچانتا ہوں۔ میں نے ان کی روٹی کا مزہ چکھا ہوا ہے۔ وارنیکا۔ وہ بہت برے لوگ ہیں۔ وہ جتنے زہریلے ہوتے ہیں تم اس قدر نیک نہیں بن سکتیں۔ کیا ان کی نظریں کیا ان کی باتیں سبھی زہر بھرے نشتر ہوتی ہیں۔ اور یہاں ہمارے درمیان رہ کر تم اتنے آرام سے دن کاٹ رہی ہو جیسے گھونسلے میں کوئی ننھا سا پرندہ رہتا ہو۔ اگر تم اڑ گئیں تو سوچو تم پہ کیا بیتے گی۔ ارے غریب لوگوں کا دل چرا کے لے جاؤ گی کیا؟ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ بولو میں کیسے دن گذاروں گا؟ تم کہتی ہو کہ تم بیکار پڑی رہتی ہو ــــ بیکار؟ کیا کہہ رہی ہو؟ ذرا سا سوچو کہ تم بیکار کیسے ہو؟ تمہارا اثر کس قدر خوشگوار ہے ــــ مثلاً یہی دیکھو کہ اب میں تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں اور بے حد خوش ہوں۔ کبھی کبھی میں اپنے سارے جذبات خط میں قلمبند کر کے تمہیں لکھ بھیجتا ہوں اور پھر تمہاری طرف سے ان کا طویل جواب آتا ہے۔ میں تمہارے پہننے کے لئے اچھے اچھے کپڑے خرید سکتا ہوں۔ میں نے تمہیں ایک ہیٹ بھی خرید دیا ہے۔ اور پھر تم مجھ سے کئی اور کام کہنے

ے لئے کہتی ہو — تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ تم بیکار ہو — اور پھر یہ
سا انسان تن تنہا کیا کرے گا۔ بتاؤ میں کس کام کا رہ جاؤں گا۔
وار نیکا شاید یہ باتیں تم سوچتی ہی نہیں — لیکن تمہیں سوچنا چاہیئے۔
اس پہلو سے سوچو کہ یہ بوڑھا آدمی میرے بغیر کیا کر سکتا — تمہیں کر
پاکر میں جیتا ہوں اور اگر تم چلی گئیں تو پھر میرے کرنے کو ایک ہی بات
رہ جائے گی اور وہ یہ کہ نیوا یر جاکر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ پھر
میں ہی کر کیا کروں گا۔ وار نیکا یوں نظر آتا ہے کہ تم مجھے کاٹ ہی ڈالنا
چاہتی ہو اور پھر کچھ لوگ مجھے بھکاریوں کے قبرستان
کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے اور تم وہاں کھڑی دیکھو گی کہ وہ میری
قبر کو ریت سے بھر دیں گے اور پھر وہیں مجھے بھول کر تم واپس چلی
آؤ گی۔ ایسا چاہنا بہت بڑا گناہ ہے — گناہ عظیم ہے۔ میں تمہاری
کتاب لوٹا رہا ہوں۔ اور عزیزم اگر تم میری رائے جاننا چاہتی
ہو تو میں اتنا ہی کہوں گا کہ میں نے زندگی بھر اس سے اچھی اور کوئی
کتاب نہیں پڑھی۔ میں نے ساری زندگی میں تین چار سے زیادہ
کتابیں پڑھی ہی نہیں۔ تمہاری اس کتاب میں سٹیشن ماسٹر کہانی
پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ ایک عمر گذر جاتی ہے لیکن یہ احساس تک
نہیں ہوتا کہ پاس کوئی ایسی کتاب بھی پڑی ہے جو زندگی کی مکمل
داستان کو سیدھے سادے نقشے کی صورت میں بیان کر دیتی ہے۔
پہلے جو باتیں صاف نہیں ہوتیں وہ مطالعے سے نظر آنے لگتی ہیں۔
ان کے حل سوجھتے ہیں۔ یادداشت بڑھتی ہے۔ سمجھنے اور سوچنے
کی طاقت بڑھتی ہے۔ اور اس کتاب میں مجھے جو سب سے اچھا پہلو
نظر آیا ہے وہ یہ ہے کہ باقی کتابوں میں اس قدر چالاکی اور عیاری
سے کام لیا جاتا ہے کہ آدمی عمر بھر پڑھتا جائے لیکن اس کے پلے
ایک بات نہ پڑے گی۔ میں فطرتاً ایسی موٹی عقل کا واقع ہوا ہوں
کہ ایسی لطیف اور بلند پایہ کتابیں میرے لئے نہیں لکھی گئیں —
اور اس کتاب میں یہ خصوصیت ہے کہ پڑھتے وقت یوں محسوس
ہوتا ہے گویا میں نے خود لکھی ہو — جیسے میں باتیں کر رہا ہوں۔ اپنے
دل کی باتیں کہہ رہا ہوں —— کچھ بھی کہا جائے —— یہ کتاب ہر
شخص کی اپنی داستان ہے — یہی بات میں اتنی دیر سے کہنا چاہتا ہے۔
واقعی بہت ہی سلیس اور زبان ہے — میں خود بھی ایسی کتاب لکھ سکتا
تھا۔ اور کیا غلط کہہ رہا ہوں — کتاب کو پڑھتے ہی مجھے یہ احساس

ہوا ہے — بیچارے سیمسن وائرن کو جن حادثات کا سامنا کرنا پڑا تھا
کیا میں انہی حادثوں سے دوچار نہیں ہوا؟ خدا جانے ہم لوگوں میں
کتنے وائرن سسک سسک کے جی رہے ہیں۔ کون جانے
ہم تم میں کون وائرن ہے۔ ماں تو قریب قریب رو دیا تھا کس طرح
وہ غریب شراب نوشی کا شکار ہوا — اتنی زیادہ شراب پینے لگا
کہ بے ہوش ہو کر سارا سارا دن چٹائی پر سویا رہتا تھا۔ اور جب
آنکھ کھلتی تو اپنی پھٹی ہوئی اور گندی آستین سے اپنے آنسو پونچھتا رہتا
اپنی بیٹی کی یاد میں رو رو کر برا حال کر لیتا۔ ہاں —— زندگی اسی کا
نام ہے۔ اس کتاب کو دوبارہ پڑھنا۔ یہ ہمیشہ رہنے والی چیز ہے۔
مجھ پہ یہ سب گذر چکا تھا۔ یہ تو ہمارے ماحول میں ہے۔ میں ہر
شخص کے چہرے پر اس کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھتا ہوں۔ تم تھوڑا سا
ہی کو لے لو — ہاں — اس غریب کلرک کی زندگی دیکھ لو۔ کیا وہ
دوسرا سیمسن نہیں ہے۔ ہم سب ہی کچھ ہیں اور کوئی بڑی بات نہیں کہ
ہم سے ایک ایک انجام ہو بہو ویسا ہی ہو — اور کون جانے کہ نوکی
یا محلوں میں رہنے والے شہزادوں کا انجام بھی ایسا ہی ہو۔ ہاں
ان کی ٹھاٹھ باٹھ کی بنا پر اس انجام میں ہلکا سا فرق آسکتا ہے۔ لیکن
صورت وہی ہوگی۔ میرا بھی یہی انجام ہوگا۔ تم سمجھیں کہ نہیں۔
ہمیں چھوڑنے کے بارے میں تم سوچ کیسے سکتی ہو؟ وائرن جیسا
ردِ عمل میرا بھی ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں تباہ ہو سکتے ہیں۔ اسلئے
کچھ عقل سے کام لو۔ اپنے دماغ میں ایسے واہیات خیالات کو ندا خل
ہونے دو۔ خواہ مخواہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو دکھی مت
کرو۔ اور میری چڑیا سی جان یہ تو سوچو کہ دنیا کے اوچھے ہتھیاروں
اور ذلیل لوگوں سے تم اپنے آپ کو بچاؤ گی کیسے؟ اچھا بھول جاؤ
ایسی باتیں۔ اس کہانی کو بار بار پڑھنے سے تمہیں بہت کچھ ملے گا۔
اس کو جتنا پڑھو گی تمہاری اتنی بھلائی ہوگی۔

میں نے راتازایف سے بھی اس کہانی کا ذکر کیا تھا۔ وہ اپنی
بات پہ بضد ہے کہ یہ کہانی پرانے انداز میں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ
موجودہ زمانے کی تمام کتابوں میں تفصیلی تصاویر اور خاکے ہوتے
ہیں۔ اس کی بات میری کچھ سمجھ میں آئی نہیں۔ وہ یہ تو مان گیا تھا کہ
پشکن اچھا ادیب ہے اور وہ یہ بھی مان گیا تھا کہ پشکن نے روس
کی عظمت میں اضافہ کیا ہے۔ دیکھو وار نیکا یہ کتاب بہت ہی

اچھی ہے۔ تم اسے بار بار پڑھو۔ اور پوری توجہ سے پڑھو۔
میری نصیحت پر عمل کرو۔ اور ایک بوڑھے آدمی کا کہا مان کر
اسے خوش کر دو۔ خدا تمہیں اس کا پھل دے گا۔ میری واریکا
خدا تمہیں ضرور اس کا صلہ دے گا۔

تمہارا دوست
ماکار۔

چھ جولائی۔

میرے پیارے ماکار

آج فیڈورا نے مجھے پندرہ روبل
لا کر دیئے۔ سب سکے چاندی کے تھے۔ اور جب میں نے
اسے تین روبل دئے تو وہ بے حد خوش ہوئی۔ بیچاری فیڈورا
یہ خط میں ذرا جلدی میں لکھ رہی ہوں۔ میں تمہارے لئے ایک
واسکٹ تیار کر رہی ہوں۔ کپڑا بہت ہی نفیس ہے۔ کپڑا پیلے
رنگ کا ہے۔ اور اس پر پھول کاڑھے ہوئے ہیں۔ میں تمہارے لئے
ایک کتاب اور بھیج رہی ہوں۔ وہ بھی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔
میں نے اس کی کچھ کہانیاں پڑھی ہیں۔ "سرد س کوٹ" نام
کی کہانی تم ضرور پڑھو۔ تم اصرار کر رہی ہو کہ میں تمہارے ساتھ تھیٹر
ضرور ہی چلوں۔ کیا پیسے زیادہ خرچ نہ آجائیں گے؟ اچھا یوں کرو کہ
اگر ضرور ہی چلنا ہو تو پھر گیلری کے ٹکٹ خرید لینا۔ مجھے تھیٹر
گئے ہوئے اتنا عرصہ ہو چکا ہے کہ کچھ یاد نہیں۔ لیکن پھر مجھے رہ رہ
کے خیال آتا ہے کہ مفت کی فضول خرچی ہو گی۔ فیڈورا توبہ کرنے
کے انداز میں سر ہلا ہلا کر کہتی ہے کہ تم چادر سے باہر پاؤں پھیلا رہے
ہو۔ اور پھر یہ تو میں دیکھ رہی ہوں کہ فقط مجھی پر تم کتنا خرچ
کر چکے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر تم اسی طرح چلتے رہے تو کسی دن بہت
بھاری مصیبت آجائیگی۔ فیڈورا نے بتایا ہے کہ کرائے کے
سلسلے میں مکان مالکن سے تمہاری کچھ لے دے بھی ہوئی ہے۔
ماکار۔ مجھے تمہارا بہت فکر لگا رہتا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔
اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں۔ کام تو بہت تھوڑا سا ہے
لیکن ہے فوری۔ مجھے اپنے ہیٹ کا ربن بدلنا ہے۔
اگر ہم تھیٹر گئے تو میں اپنا نیا ہیٹ پہنوں گی اور کالا سکرٹ
پہن کر جاؤں گی۔ بہت اچھا رہے گا۔ ہے نا؟

سات جولائی۔

میری پیاری واروارا۔

میں نے کل اپنی بات جہاں سے چھوڑی تھی آج خط میں
وہیں سے شروع کرتا ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایک وہ بھی
زمانہ تھا جب میں بھی بے پروا نوجوان ہوا کرتا تھا۔ میرے دل
و دماغ پر ایک ایکٹرس اپنا جادو کر چکی تھی۔ لیکن معاملہ یہیں
تک نہیں تھا۔ حد تو یہ تھی کہ ایک بار تھیٹر میں دیکھنے کے علاوہ
اور میں نے اُس ایکٹرس کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے
اس سے محبت تھی۔ والہانہ محبت۔ اُن دنوں کچھ واہیات
نوجوان میرے پڑوسی تھے اور میں صریحاً اپنی طبیعت کے خلاف
ان کا دوست بن گیا۔ لیکن ان کے کارناموں سے میں ہمیشہ علیحدہ
رہا تھا۔ ہاں۔ دوستی کے ناطے میں ان کی ہنسی مذاق میں ضرور
شریک ہو جایا کرتا تھا۔ اس ایکٹرس کے متعلق مجھے انہی لوگوں نے بڑھا
چڑھا کر باتیں بتائیں۔ اور ہر شام جب بھی کھیل شروع ہوتا تو ہمارا
سات لڑکوں کا پورا گروہ گیلری کے ٹکٹ لے کر تھیٹر میں ڈٹ جاتا
ویسے زندگی کی معمولی سے معمولی ضرورت پورا کرنے کے لئے ان کے
پاس دھیلا نہ ہوتا۔ لیکن اُس ایکٹرس کی خاطر وہ ہر شام وہاں
جا پہنچتے اور پاگلوں کی طرح اندھا دھند تالیاں بجاتے اور چیخ
چیخ کر اس ایکٹرس کا نام لے لے کر نعرے لگاتے۔ اور تھیٹر ختم
ہونے کے بعد سونے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا۔ ساری رات
ہر ایک شخص اپنی محبوبہ گلاشا کے بارے میں ہوائی قلعے بناتا۔
ہم سب کے سب اس ایکٹرس کی محبت میں سر سے پاؤں تک
گرفتار تھے۔ وہ مجھ سے بہت پہلے اس پر عاشق ہو چکے تھے
اور پڑوسی ہونے کے ناطے سے اس جال میں مجھے بھی کھینچ کر
لے گئے اور پیشتر اسکے کہ میں کچھ سمجھ پاتا میں نے اپنے آپ کو
اُن کے ہمراہ گیلری میں موجود پایا۔ جہاں مجھے کرسی ملی تھی وہاں
سے پردے کا ذرا سا حصہ نظر آتا تھا لیکن میرے کان کسی واقعے
سے محروم نہ رہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی آواز
بہت ہی شیریں تھی۔ اس کی آواز ایسے تھی جیسے گھنٹیاں سی
بج رہی ہوں۔ جیسے کانوں میں شہد ٹپک رہا ہوں۔ ہم اتنا
چیخے کہ ہمارا گلا بیٹھ گیا۔ اتنی زور سے اور اتنی دیر تک تالیاں

جائیں گے، ناندہ دیکھنے لگے اور اس قدر اودھم مچایا کہ ہم میں سے ایک
وکال بھی دیا گیا۔ جب میں گھر واپس آیا تو یہ عالم تھا کہ پلے کچھ
پڑا نہ تھا اور جیب میں صرف ایک روبل باقی تھا اور تنخواہ ملنے
میں ابھی دس دن پڑے تھے۔ اور وارنیکا تم کیا سوچتی ہو۔ اگلی
صبح دفتر پہنچنے سے پہلے یہ روبل بھی میں نے خوشبودار تیل
اور صابن خریدنے میں خرچ کر دیا۔ میں نے وہ تیل صابن کیوں
خریدا اس کے بارے میں میں آج بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس دن میں
نے روٹی کھائے بغیر گزارا کیا۔ اور سارا وقت اس کی کھڑکی کے
نیچے کھڑے ہو کر گزار دیا۔ وہ تیسری منزل پر رہتی تھی۔ دفتر
سے گھر پہنچ کر میں گھنٹہ بھر آرام کرتا اور پھر نیوسکی پر اس کے گھر
کے نیچے جا کھڑا ہوتا۔ پورا ڈیڑھ مہینہ مجھ پر یہی جنون چھایا رہا۔
کبھی کبھی بازار کے نکڑ پر میں ایک تیز رفتار تانگہ بھی کرائے پر کر لیتا
تھا اور اس کی کھڑکی کے سامنے سے شہنشاہی جلال میں گذر
جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا بال بال قرضے میں جکڑ
گیا لیکن آخر کار اپنا جنون تو ٹھنڈا پڑ گیا۔ درحقیقت میں اکتا گیا تھا
دیکھتی جاؤ کہ ایک ایکٹرس ایک ایماندار شخص کو کس پستی تک اتار
سکتی ہے۔ لیکن یہ نہ بھولو کہ وہ میری نوجوانی کے ایام تھے۔
ایم۔ ڈی۔

آٹھ جولائی۔

میری پیاری واروارا۔

اس مہینے کی چھ تاریخ کو جو کتاب مجھے ملی تھی میں نے فوراً
اسے واپس کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی وجہ بھی بیان
کر دی تھی۔ عزیزم ۔۔ ایسی کتاب مجھے پڑھنے کے لئے دینا کہاں
کی شرافت تھی۔ خداوند تعالیٰ نے ہر انسان کو زندگی میں وہ مقام
عطا کیا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ کچھ لوگوں کو تقدیر نے جرنیلوں
کے حکم کی تعمیل کے لئے بنایا ہے۔ کچھ وہ ہیں جنہیں پریوی کونسلر
کی حیثیت عطا کر دی ہے۔ یہ تو قدرت کا اصول ہے کچھ حکم چلائیں
گے اور باقی ان کی تعمیل کریں گے۔ اُس کے خوف سے تھر تھر
کانپیں گے اور زبان پر ایک لفظ تک نہ لا سکیں گے۔ قدرت
نے جس انسان کو جس رتبے کے قابل سمجھا اسے بنا دیا۔ کچھ لوگ
ایک کام کر سکتے تو کچھ لوگ دوسرا۔ اور یہ حکم خدا خود جاری
کرتا ہے مجھے دفتر میں کام کرتے ہوئے آج تیس برس ہونے کو آئے۔
میرے کام پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکا ۔۔ میرے رویے سے کبھی کسی
کو شکایت کا موقع نہیں ملا اور کبھی کسی نے مجھے ہڑبونگ مچاتے
ہوئے نہیں دیکھا۔ ایک شہری کی حیثیت سے جہاں میں اپنی خامیوں
سے آگاہ ہوں وہاں خدا شاہد ہے کہ مجھ میں خوبیاں بھی ہیں۔
میرے افسر میری عزت کرتے ہیں حتیٰ کہ ہز ایکسی لینسی بھی مجھ
سے خوش ہیں۔ اگرچہ انہوں نے میری کوئی خاص رعایت نہیں
کی تاہم میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے خوش ہیں۔ میں اپنی عمر
گذار کر بوڑھا ہونے کو آیا لیکن کوئی ایسا گناہ نہیں کیا جس سے
میرا سر شرم سے جھک جائے یا میں اندر ہی اندر ہی ڈرتا رہوں۔ میرے
کردار پر کوئی دھبہ نہیں ہے۔ رہی بات معمولی خطاؤں کی تو ایسی
خطائیں کس سے سرزد نہیں ہوتیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہر شخص
دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ تم بھی یہ کوشش
کرتی ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات میں نے آج تک نہیں کی جس سے
دوسروں کو نقصان پہنچا ہو یا کسی کی بے عزتی ہوئی ہو۔ میں نے
کبھی قانون نہیں توڑا۔ کبھی امن کو خراب نہیں کیا۔ نہیں کبھی نہیں۔
مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب تمغے کے لئے میرا نام بھی
تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن ایسی بات کرنے کا کیا فائدہ۔ انصاف کا تو یہ
تقاضہ ہے کہ تمہیں اس واقعہ کا علم ہونا چاہیے تھا اور اس مصنف
کو بھی۔ کیونکہ اگر کسی شخص نے ہر بات کو بیان کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہی
ہے تو اسے ہر بات جاننی بھی چاہیے۔ وارنیکا ۔۔ باقی لوگوں کا
تو ذکر ہی کیا ۔۔ کم از کم مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بدقسمت گوشہ تنہائی میں
بھی چھپ کر آرام سے زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ حالانکہ وہ صرف
جیسے بھی روکھی سوکھی مل رہی ہے کھاتا ہے۔ اس کے علاوہ خدا کا
خوف کھاتا ہے ۔۔ کسی سے زیادتی نہ کرے اور دوسروں سے
فقط یہ توقع کرے کہ وہ اُس کو اس کے حال پر چھوڑ دیں گے۔ وہ
اپنے کام سے مطلب رکھیں گے اور اس کے معاملات میں دخل نہ
دیں گے۔ آخر کسی کی ذاتیات کے بارے میں کسی کو جاسوسی کرنے کا
حق کیا ہے۔ انہیں اس فکر میں گھلنے کی کیا مصیبت ہے کہ کسی کے پاس

واسکٹ ہے یا نہیں۔ آیا کسی کے بدن پہ کپڑے ہیں یا نہیں اور آیا ان جوتوں کے نیچے عمدہ تلا لگا ہوا ہے یا نہیں؟ انہیں یہ جاننے کی کیا ضرورت ہے کہ کوئی کیا کھاتا ہے۔ کیا پیتا ہے۔ جہاں سڑک خراب ہوتی ہے اگر میں وہاں اپنے جوتوں کو بچانے کے لئے پنجوں کے بل چلتا ہوں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے — کیوں اعتراض ہو؟ کسی مصنف کو یہ تحریر کرنے کی کیا مصیبت پڑی ہے کہ یہ جو آدمی جی رہا ہے بیفاقے کر رہا ہے — یہ چار پیسے بغیر گزارہ کرتا ہے۔ جیسے چار پیسا زندگی کا فرضِ اولین ہو؛ کیا میں بیٹھا اپنے پڑوسی کے نغمے گنتا رہتا ہوں؛ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں نے ایسی حرکت کبھی کی ہے؟ تو پھر دوسرے کیوں ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ بس وار دار امیں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کوئی آدمی لاکھ ایمانداری سے اپنا کام کرے۔ اسکے افسر اس کی لاکھ عزت کریں (تم جو چاہو کہو لیکن یہ سب سچ ہے) لیکن اچانک کہیں سے کوئی موقع شناس آ ٹپکتا ہے اور اس ایماندار شخص کو سب کی نظروں میں بدھوا اور بے وقوف بنا دیتا ہے۔ اور کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ جو شخص بے وقوف بنایا گیا ہے وہ کبھی کبھار پہننے لئے نیا کپڑا ابھی سلوا لے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس قدر خوش ہو کہ رانیں جاگ جاگ کے کاٹ دے۔ کم از کم میں تو نئے بوٹ پہنتے ہوئے ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔ ہاں — مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے کیوں کہ میں اپنے پاؤں نئے چمڑے میں محسوس کر کے خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مصنف نے یہ باتیں حرف بہ حرف صحیح لکھی ہیں۔ لیکن مجھے حیرت تو اس بات کی ہے کہ ہمارا افسر نیو گوور ایسی کتابوں کے حق میں ہو۔ اسے تو ایسی کتابوں کے خلاف ہونا چاہیئے۔ اسے اپنے کردار کی حفاظت میں کچھ کہنا چاہیئے تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ابھی نیا اور نوجوان افسر ہے اور جیسا کہ کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے اسی طرح وہ ہمیں لعن طعن بھی کرتا رہتا ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ وہ لعن طعن کیوں نہ کرے — وہ ہماری مٹی کیوں نہ پلید کرے — جو لوگ چھوٹے ہوتے ہیں نا اگر انہیں کبھی کبھار ڈانٹ پھٹکار ملتی رہے تو ان کے لئے اچھا رہتا ہے — میں مانتا ہوں کہ بعض اوقات وہ یہ ڈانٹ پھٹکار محض اپنی افسری جتانے کے لئے بھی کرتا ہے لیکن میں پھر پوچھتا ہوں کہ وہ کیوں نہ کرے۔ ہمیں اپنے مقام کا احساس دلاتے رہنا اس کا فرض ہے۔

اس کا فرض ہے کہ ہمیں خدا کا خوف دلاتا رہے کیوں کہ وارنیکا میں صرف اپنی تمہاری بات کرتا ہوں کہ خوفِ خدا کے بغیر ہم ایسے ناچیز انسانوں کی قیمت ایک کوڑی بھی نہیں پڑ سکتی۔ اور ہم سب اپنی اپنی تنخواہوں پر گزر اوقات کرنے کی سوچتے ہیں۔ سوال کام کرنے کا نہیں ہے سوال تو تعلق ہے۔ اور چونکہ ہم سب کا جدا جدا مرتبہ ہے اور ہم سب اپنے سے چھوٹے آدمی کو کچلتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ کچلنے کے انداز علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اور یہ طریقہ کیسے بدل سکتا ہے۔ جان من دنیا کا دستور جو یہی ٹھیرا اپنے اپنے انداز میں جو کسی سے بڑا ہے وہ اس کو کچل رہا ہے۔ اور اگر یہ رواج قائم نہ رہے تو دنیا کا خاتمہ ہو جائے۔ خدا کی تنظیم ٹوٹ جائے۔ مجھے واقعی حیرت ہے کہ فائبدود ایسی گستاخی کو برداشت کر گیا۔

اور پھر ایسی باتیں لکھنے سے حاصل کیا ہے؟ کیا فائدہ ہوا کیا کتاب پڑھنے والا مجھے نیا کوٹ سلوا دے گا؟ یا نئے جوتے خرید دے گا؟ وارنیکا ایسی کوئی کتاب نہیں ہونے کی۔ وہ یہ قصہ پڑھے گا اور مزید پڑھنے کے لئے اس کا اشتیاق بڑھے گا۔ اس کی طلب اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کی فکر سب کو لگی رہتی ہے — افواہوں اور سرگوشیوں کو اپنے آپ بچانے کے لئے کون احتیاط نہیں کرتا۔ رائی کا پہاڑ بنایا جا سکتا ہے اور پیشتر اس کے کہ تم جان سکو کہ کیا ہو گزرا ہے تمہارا پورا الف کھلی کتاب کی طرح کسی کہانی میں پیش کر دیا جائے گا۔ تمہارا مذاق اڑے گا۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔ اس کے بعد کوئی کس منہ سے کسی سے ملے؟ ہر بات کو ہر واقع کو اتنی تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے کہ لوگ ہماری حالت سے ہمیں پہچان جائیں گے۔ اگر مصنف کتاب کے آخر میں ذرا عقل سے کام لیتا تو معاملہ اتنا نازک نہ ہوتا — بات اتنی نہ بڑھتی۔ اور اگر اس کردار کو آخر میں مار نہ دیا جاتا تو اور بھی اچھا ہوتا۔ مناسب یہی تھا کہ اسے اس کا کوٹ واپس دلا دیا جاتا۔ ایسی صورت پیدا کر دی جاتی کہ عالی جناب اسے اپنے دربار میں طلب کرتے اور پھر اس کی خدمات کے بارے میں تحقیق کر کے اسکو انعام اور تمغہ عطا کرتے تاکہ یہ سبق ملتا کہ انجام کار خوبی اور نیکی کی جیت ہوتی

ہے اور بدی اور پستی کو سزا ملتی ہے۔ اگر میں لکھتا تو اسی طرح لکھتا۔ اور جس انداز میں اس نے کہانی کو بڑھایا ہے اس کا کیا فائدہ ہے؟ ہماری روزمرہ زندگی کا مذاق اڑایا گیا ہے اسکے علاوہ اس سے کیا؟ وارنیکا — تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ ایسی کتاب مجھے پڑھنے کے لئے بھیج دی! بہت بری کتاب ہے یہ۔ اور یہ اس لحاظ سے بھی جھوٹ ہے کیونکہ ایسا کوئی کلرک اس دنیا میں وجود نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اس کتاب کے خلاف — احتجاج کرنا چاہیئے —

تمہارا دوست
ماکار

۲۷ جولائی —

مائی ڈیئر ماکار

پچھلے دنوں سے کچھ باتیں ایسی ہو رہی ہیں اور تمہارے تین چار خطوں نے تو مجھے اتنا حیران کیا کہ میں پریشان ہو اٹھی۔ آخر فیڈورا نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ ماکار اس قدر دکھی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے جتنی صفائی پیش کی ہے اس سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ اور میرا خیال ہے کہ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ مجھے وہ ملازمت کر ہی لینی چاہیئے تھی۔ حال ہی میں جو کچھ ہو گذرا ہے اس سے میں تو بہت ڈر گئی ہوں۔ تم کہتے ہو کہ محض میری محبت کی خاطر تم نے مجھ سے اتنا کچھ چھپایا۔ اور ادھر میں تمہارے احسان تلے دبی جا رہی تھی حالانکہ مجھے پورا یقین تھا کہ تم اپنے بنک کی جمع شدہ رقم مجھ پہ خرچ کئے جا رہے ہو۔ اب ذرا تم ہی مجھے بتاؤ یہ جان کر مجھ پر کیا گذری ہے کہ بنک میں تو تمہارا ایک دھیلا نہ تھا اور تم میری حالت پہ رحم کھا کھا کر کئی مہینوں کی تنخواہ پیشگی لے کر خرچ کر چکے ہو۔ میری علالت کے دوران میں تم نے اپنا کوٹ تک بیچ دیا۔ اوہ میرے ناچار ماکار اب میں کیا کروں! دوستی اور محبت کے جذبے کے تحت اگر تم نے یہ سلسلہ شروع کیا ہی تھا تو تمہیں بہت پہلے اسے ختم کر دینا چاہیئے تھا۔ تمہیں عیش و عشرت کے مقامات پر یوں روپیہ برباد نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ تم ایک سچے دوست نہیں ہو! تم نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ اور اب جبکہ مجھے اطلاع ملی ہے

کہ تم آخری کوڑی تک کپڑوں، مٹھائیوں، سینما کی ٹکٹوں، کتابوں اور تفریح کے سامان پہ خرچ کر چکے ہو تو اندازہ کرو کہ مجھے خود اپنی بے خیالی پر کس قدر اذیت ہو رہی ہو گی۔ کیونکہ کیا میں نے تمہاری ضروریات کا خیال کئے بغیر یہ سب تحفے قبول نہیں کئے؟ تم نے مجھے خوشی پہنچانے کا جتن کیا، اس کا انجام یہ ہوا کہ میں رنج و غم کے اتھاہ ساگر میں غرق ہو گئی ہوں۔ پچھلے دنوں سے میں تمہیں پریشان بھی دیکھتی رہی اور خود حیران بھی ہوتی رہی لیکن جب مجھ پر حقیقت کھلی تو میرے حواس باختہ ہو گئے۔ میں کسی اندرونی خوف سے کانپ رہی ہوں۔ ماکار — غضب خدا کا تم اپنے آپ پر کتنی اعتنا کیسے کھو بیٹھے! لوگ کیا کہیں گے؟ اور پھر میرے لئے یہ احساس کس قدر اذیت دہ ہے کہ تم ایسا شخص، نیک اور شریف انسان اس علت کا شکار ہو جائے جس سے تمہیں تمام عمر نفرت رہی ہو۔ اندازہ کرو کہ یہ جان کر میرا کیا حال ہوا ہو گا کہ تم شراب کے نشے میں دھت پائے گئے اور پولیس نے تمہیں گھر پہنچایا! مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تھا۔ اور ویسے میرا دل کہتا تھا کہ چونکہ تم گذشتہ چار روز سے مجھے ملنے نہیں آئے لہٰذا کوئی غیر معمولی بات ضرور ہوئی ہو گی۔ ماکار تم نے کبھی یہ بھول کے سوچا کہ اگر تمہارے افسران کو تمہاری غیر حاضری کی صحیح وجہ معلوم ہو جائے تو وہ کیا کہیں گے۔

تم خط میں لکھتے ہو کہ ہر شخص تمہارا مذاق اڑا رہا ہے اور سب لوگوں کو ہمارے تعلقات کا علم ہو گیا ہے نیز تمہارے پڑوسی بات بات میں منہ بنا کر میرا نام لیتے ہیں۔ ماکار — خدا کے لئے نہ انکی پروا کرو نہ اپنے آپ کو دکھی کرو۔ افسر کے سامنے تمہارا جو جھگڑا ہوا تھا اس کی خبر سن کر میں بھی بہت فکرمند ہوں۔ خدارا اس کے متعلق مجھے مکمل کہے بتاؤ۔ تم نے لکھا ہے تم سچی بات کہنے سے ڈر رہے ہو اور خاص کر اس بات سے ڈر رہے۔ کہ کہیں میری دوستی نہ کھو بیٹھو۔ تم لکھتے ہو کہ تم اس لئے مایوس رہے تھے کیونکہ تمہاری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میری مدد کس طرح کرو اور مجھے ہسپتال نہ داخل کرانے کی کیا صورت ہو۔ تم لکھتے ہو کے تمہارا بال بال قرضے میں جکڑ چکا ہے اور کرایہ نہ دینے پر مکان مالکن سے تمہاری شدید جھڑپیں ہوئی ہیں۔ ان سب باتوں کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے کہ تم اس سے زیادہ بری بات اور کیا کر سکتے تھے

لہ یہ سب کچھ مجھ سے چھپائے رکھا۔ خیر اب تو مجھے ہر بات کا علم ہو گیا ہے۔ آخر تم نے بات کھول ہی دی کہ تمہاری ہر آرزو کا سبب صرف میں تھی۔ لیکن تمہارے رویے کو جان کر میرے دکھ دوگنے ہو گئے ہیں۔ میرے دوست ماکار تم نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ بدقسمتی چھوت کی بیماری کی طرح ہے۔ ماکار ہم سب کو جو کہ غریب اور مصیبت زدہ ہیں ایک دوسرے کے نزدیک نہ پھٹکنا چاہیے۔ ہم سب کو ایک دوسرے سے دُور دُور رہنا چاہیے۔ تم نے اپنی زندگی میں جن آلام اور مصائب کا سامنا کیا تھا میں نے تمہیں انہی سے دوچار کرا دیا۔ اور یہ تصور میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔

اب تو مجھے صاف صاف بتادو کہ تم پر کیا بیتی اور تمہاری یہ حالت ہوئی کیسے! اور اگر ممکن ہو تو کوئی ایسی بات بھی بتادو جس سے کچھ تسکین ملے۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ تم سے یہ سب پوچھنا کیا میری خود غرضی نہیں ہے۔ لیکن تم نے میرے دل میں اس طرح گھر کیا ہے کہ تمہاری دوستی میرے دل سے کسی طرح نہیں بھلائی جا سکتی۔ خدا حافظ — میں بڑی بے چینی سے تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔ اور میرے بارے میں ایسا سوچنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔

تمہاری مخلص دوست

وار وارا

۲۸ جولائی۔

میری انمول بچی وار وارا

اب جبکہ طوفان تھم چکا ہے گرد جم رہی ہے اور میری زندگی پھر اپنی روش پر بہہ نکلی ہے تو دوستو میں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ کیونکہ تمہیں یہ فکر جو لگی ہوئی ہے کہ نہ جانے لوگ کیا سوچیں تو سنو۔ مجھ پر یقین کرو کہ مجھے اس دنیا میں اپنی عزت سے بڑھ کر اور کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔ اسی روشنی میں تم میری تمام مصیبتوں اور شکستوں کو دیکھو اور میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے افسران کو نہ ان باتوں کی خبر ہے نہ ہو سکتی ہے۔ بس — وہ آج بھی میری عزت کرتے ہیں اور پھر میری برائی ان کی نظروں میں مجھے اور بھی عزت کا مستحق بنا دیتی ہے۔ مجھے صرف ایک بات کی فکر ہے اور وہ ہے افواہیں پھیلانے والوں کی حرکات۔ تم نے جو دس روبل مجھے بھیجے تھے ان سے

مکان مالکن کا تو منہ بند ہو چکا ہے اب میرے سر پر اس کا کوئی کرایہ واجب نہیں ہے۔ رہی دوسرے لوگوں کی بات تو وہ زیادہ پریشان نہیں کرتے۔ اور ان لوگوں سے جب تک میں ادھار نہیں لیتا تب تک ان سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور عزیزم میں یہ کہہ کر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ تمہاری عزت مجھے اس زندگی میں سب سے زیادہ عزیز اور لائق احترام ہے۔ اور تمہاری پاکیزگی میری ان چھوٹی چھوٹی شکستوں کی بخوبی تلافی کر دیتی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس طوفان کے پہلے تھپیڑے اب ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔ تم مجھے خود غرض شخص اور جھوٹا دوست نہ سمجھو۔ اے میرے ننھے سے فرشتے میں تم سے اس قدر پیار کرتا ہوں کہ تمہیں چھوڑنے یا دھوکہ دینے کا تصور بھی میرے لیے ناقابل برداشت عذاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے دوبارہ کام پر جانا شروع کر دیا ہے اور میرے حوصلے پہلے سے دوگنے ہو گئے ہیں لہٰذا اب میں اپنے کام میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ کل میں جب البتان آیوانیچ کے قریب سے گذرا تھا تو اس نے ایک لفظ تک نہ کہا تھا۔ نہیں — میں اب یہ راز نہیں چھپاؤں گا کہ میں قرضے تلے پس چکا ہوں۔ اور میرے کپڑے بہت ہی خستہ حالت میں ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور میں التجا کرتا ہوں کہ تم ناحق پریشان نہ ہوا کرو۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ تمہارے پچاس کوپکس وصول کر کے میرے دل پر کیا بیتی۔ میں سینہ مسوس کر رہ گیا۔ میں خون کے آنسو رو دیا کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے۔ کیونکہ اب یہ بڑھاپے وقت تمہاری مدد نہیں کر رہا بلکہ ایک بے آسرا بچی میری مدد کر رہی ہے۔ میڈو واقعی قابل تعریف ہے کہ اس نے یہ رقم حاصل کر لی۔ لیکن جانِ من ابھی کچھ دیر تو کہیں سے پیسہ ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ جونہی کوئی صورت نظر آئے گی میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ فکر تو اس بات کی ہے کہ نہ جانے کیا کیا افواہیں پھیلیں گی۔ اپنے نرم و نازک ہاتھوں پر میری طرف سے بوسہ لو۔ میں اور زیادہ نہیں لکھ سکتا کیونکہ مجھے دفتر پہنچنے کی جلدی ہے۔ مجھے گذشتہ فرد گذاشت کی تلافی کرنی ہوگی۔ آج شام میں باقی سانحات کے بارے میں لکھوں گا کہ افسران حضرات سے میرا جھگڑا کیسے ہوا۔

تمہارا دوست

ماکار

۲۸ جولائی۔

وارنیکا۔

اب مجھے نہیں بلکہ تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ یہ بات ساری عمر تمہارے احساس میں پھانس کی طرح کھٹکتی رہے گی۔ تمہارے آخری خط نے تو مجھے بالکل ہی مجبور کر دیا۔ میں ورطۂ حیرت میں گم ہو گیا لیکن جب میں نے اپنا دل ٹٹولا تو دیکھا میں سراسر سچائی پر تھا۔ یہاں میں گذشتہ واقعات کی طرف اشارہ نہیں کر رہا (انھیں تو بھلا دو۔ بہت ہو چکی) لیکن میں تو اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں کہ صرف میں تمہارا آرزومند ہوں۔ اور تم ایسی ہستی سے پیار کرنا کوئی نازیبا بات نہیں ہے۔ اگر تمہیں ایک بار احساس ہو جاتا کہ مجھے تم سے کتنا پیار ہے تو تم ایسی باتیں ہرگز نہ لکھو جن سے مجھے دکھ پہنچے۔ اور تم اپنے دل سے کچھ نہیں کہہ رہیں۔ یہ تمہارا دماغ ہے جو تمہیں ایسی باتیں سکھانے کے لئے اکساتا ہے۔

اگر انصاف سے سوچا جائے تو مجھے واقعی کچھ یاد نہیں آر ہا کہ میرے اور ان افسران حضرات کے درمیان تلخی کیسے پیدا ہوئی۔ بس میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں خاصہ پریشان رہا ہوں۔ پورا مہینہ بھر میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوا میں لٹکا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ کیا کہوں کہ زندگی دوبھر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے دل کا حال تم سے چھپایا۔ اپنے پڑوسیوں سے چھپایا لیکن وہ مکان مالکن تو چڑیل ہے چڑیل۔ لیکن میں نے اس کی باتوں پر کبھی دھیان نہ دیا اور من ہی من میں سوچ لیا کہ اسے بکنے دوں۔ وہ جی کھول کر بکے۔ اوّل اوّل تو اس نے ادھر طرح ذلیل کیا لیکن نہ جانے اسے ہمارے خطوں کے بارے میں کیسے علم ہو گیا۔ بس پھر کیا۔ پھر تو اس نے وہ واہی تباہی بکی کہ میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لی تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے دوسروں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دینے کی بجائے اپنے کان کھڑے کر لئے — اب میں کیا کہوں — اب بھی اس یاد سے میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

وارنیکا۔ اس مصیبت کے طوفان نے مجھے تو قریب قریب ختم ہی کر دیا تھا۔ اور اس پہ ستم یہ کہ تم بھی اس توہین کا شکار ہو گئیں۔ فیڈورا بتا رہی تھی کہ کسی ذلیل شخص نے تمہاری بھی بہت توہین کی تھی۔ میں بخوبی سمجھ سکتا ہوں کہ تمہیں کتنا گہرا صدمہ پہنچا ہوگا۔ میں بخوبی سمجھ سکتا ہوں کیونکہ یہ واقعہ سن کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میرے۔ یہ جنون سوار ہو گیا میں دیوانہ وار اس ذلیل انسان کے گھر کی طرف لپکا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں کیا کر گذاروں گا۔ لیکن میں تمہاری توہین کی خبر سن کر ضبط نہ کر سکا۔ مجھے بہت رنج ہوا تھا۔ اور ادھر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ گلیاں اتنی گیلی ہو چکی تھیں کہ پاؤں اپنے آپ پھسل رہے تھے۔ مجھ سے زیادہ نہ بھاگا گیا تو دل پہ اداسی اور بھی گہری چھا گئی۔ میں اپنا ارادہ ترک کر کے واپس مڑنے ہی والا تھا کہ۔ پھسل کر دھڑام سے منہ کے بل جا گرا۔ اچانک میری ملاقات ایمیلا سے ہو گئی۔ ایمیلا بیچارہ کسی دفتر میں کلرک تھا۔ اسے وہاں سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ اور میں یہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اب اس کی گذر اوقات کیسے ہوتی ہے۔ اور ہم دونوں اسی جانب بڑھ گئے۔ لیکن وارنیکا — تم اپنے دوست کے دکھ درد اور مصیبت بھری کہانی پڑھ کر کیا کرو گی۔ اس سے تین روز بعد ایک شام ایمیلا نے مجھے اس افسر سے ملنے پر مجبور کر دیا۔ اس افسر کا پتہ مجھے ایک تانگے والے سے مل گیا۔ اب اس افسر کی سنو وہ بچہ کچھ خبطی ہے۔ جب وہ ہمارے گھر میں رہتا تھا تو میں اس کی حرکات کو بغور دیکھا کرتا ہے۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ جب میں اس کے گھر کے اندر داخل ہوا تھا تو مناسب لباس میں نہ تھا۔ مجھے اس کے علاوہ اور کچھ یاد نہیں کہ وہ کمرہ کئی افسران حضرات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا یا مجھے ایک کی جگہ دو دو افسر نظر آ رہے تھے۔ خدا جانتا ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں آ رہا کہ میں نے وہاں کیا کہا تھا لیکن مجھے اتنا یاد ہے۔ کہ میرے منہ میں جو کچھ آیا تھا میں کہہ گیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف مجھے کمرے سے باہر نکال دیا بلکہ دھکا دے کر سیڑھیوں سے لڑھکا دیا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے مجھے دھکا دے دیا اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے مجھے گھر سے باہر ضرور نکال دیا تھا۔ باقی تو تم جان ہی چکی ہو میں گھر کیسے پہنچا۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے وقار کو ٹھیس پہنچی تھی۔ لیکن کوئی غیر شخص اس واقعے کے بارے میں آگاہ نہیں ہے۔ اور چونکہ اس واقعے کو صرف تمہیں جانتی ہو لہٰذا میرے لئے یہ واقعہ ہو گذرا یا نہیں ایک ہی بات ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا وارنیکا؟ میں اس بارے میں کوئی دلیل پیش

نہیں کروں گا کہ میں واقعی پستی پہ اتر آیا ہوں۔ ہاں میں پستی پہ اتر آیا ہوں۔ اس سے بڑھکے اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں خود اپنی نظروں میں گر گیا ہوں۔ اور مجھے پختہ یقین ہے کہ خدا کو ایسا ہی منظور ہے۔ اس کا کیا کون ٹال سکتا ہے قسمت کے پھیر سے کون بچ سکتا ہے۔ بس وارنیکا میری ذلت یا مصیبت کی اتنی ہی داستان تھی۔ اور یہ داستان کچھ ایسی ہے نہیں کہ اسے پڑھا جائے یا اس پر غور کیا جائے۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تم مجھ پر ہمیشہ بھروسہ کر سکتی ہو۔

تمہارا مخلص دوست

ماکار

۲۹۔ جولائی۔

میرے پیارے ماکا۔

میں نے تمہارے دونوں خط پڑھے اور سخت پریشان ہوئی۔ میرے بے بس دوست یا تم اپنی مصیبت بھری داستان کا کچھ حصہ چھپا رہے ہو۔ اچھا دیکھو۔ آج شام ہم لوگوں سے ملنے ضرور چلے آؤ۔ ملنے ہی کیا۔ بلکہ آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھاؤ۔ تم مجھے یہ بھی نہیں بتا رہے کہ ان دنوں تم اپنا گذارہ کیسے کر رہے ہو۔ اس مکان مالکن کا اب برتاؤ کیسا ہے۔ نظر آتا ہے کہ تم جان بوجھ کر چپ اختیار کئے بیٹھے ہو۔ اچھا۔ شام کو ضرور آنا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ تم شام کا کھانا کھایا ہی یہیں کرو۔ فیڈورا بہت اچھا کھانا پکاتی ہے۔

تمہاری وارورارا

میری اپنی وارورارا

تم خوش ہو۔ خداوند نے تمہیں توفیق عطا کی ہے کہ محبت کا صلہ محبت سے دو۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے کیونکہ تم میں محبت کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ مجھے برا بھلا مت کہا کرو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہارے برا بھلا کہنے پر میں بھی تمہیں ڈانٹ پھٹکار سناؤں گا۔ نہیں۔ چلو اگر تم اسی بات پر بضد ہو کہ وہ گناہ تھا تو گناہ سہی۔ لیکن تمہارے منہ سے ایسی باتیں سن کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ مجھے واقعی صدمہ پہنچتا ہے۔ یوں خفا ہو کر مجھے ایسی جلی کٹی نہ سنایا کرو۔ میرا دل پہلے ہی بہت ستایا ہوا ہے۔ غریب لوگ ویسے بھی نازک مزاج ہوتے ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ پیدائشی نازک مزاج ہوتے ہیں۔ یہ احساس پہلے بھی مجھے کئی بار ہوا ہے۔ غریب آدمی ہمیشہ شکی ہوتا ہے۔ وہ ہر انگیر اور ہر چیز کو بغور دیکھتا ہے۔ کنکھیوں سے دنیا کی ہر حرکت کا جائزہ لیتا ہے کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں — شاید وہ یہ کہہ رہے ہیں — "کیا زندگی ہے اس کی بھی — یہ بھلا کیا سوچے گا۔ یہ کسی کو کیا منہ دکھانے کے قابل ہے" اور وارنیکا اس بات سے کون واقف نہیں کہ غریب کی کوئی عزت نہیں — اس کی عزت کے دام کوڑیوں میں پڑ سکتے ہیں۔ لوگ بک بک کیا کئے ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زمانہ اپنی صدیوں پرانی روش پر قائم رہا ہے اور رہے گا۔ اور کیوں نہ ہو؟ لوگ ایک غریب آدمی سے توقع رکھتے ہیں کہ ہر عذاب کو پی جائے۔ ہر ذلت کو برداشت کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تماشہ بھی بنے۔ سب کچھ سہے لیکن اس میں جذبات کی گہرائی نہ پیدا ہو۔ ایسی کوئی بات نہ ہونی چاہئے جو اس کی نظروں میں تبرک کا مقام حاصل کر لے۔ رہا ذاتی عزت کا سوال — تو غریب کی ذاتی عزت نہیں ہوتی کل ہی کی بات ہے ایمیلا مجھے بتا رہا تھا کہ اس کے لئے چندہ اکٹھا کیا گیا۔ لیکن ہر دس کوپیک اکٹھے ہونے کے بعد سرکاری طور پہ تفتیش کی جاتی تھی اور اس کی ضروریات کو پرکھا جاتا تھا۔ چندہ دینے والوں کا خیال تھا کہ وہ اپنا پیسہ ضائع کر رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایک غریب آدمی کی عینک کے لئے پیسے دے رہے تھے۔ آج کل خیرات بھی عجیب انداز میں دی جاتی ہے۔ یا کون جانے کہ ازل سے اسی طرح خیرات دی جاتی ہو۔ یا خیرات دینے والوں کو یہ علم نہیں کہ اس کا صحیح طریقہ کیا ہے یا وہ پھر بہت زیادہ جانتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی کہو ہوتا اسی طرح ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری باتوں سے متعلق ہم بہت کم واقفیت رکھتے ہوں لیکن اس پہلو کے بارے میں ہم اتنا زیادہ جانتے ہیں کہ وہ واقفیت خود ہمارے حق میں اچھی نہیں۔ کیوں؟ کیونکہ تجربہ یہی ثابت کرتا ہے۔ کیوں کہ کوئی نہ کوئی شریف انسان ہمیں ضرور نظر آجاتا ہے جو ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے اپنے آپ سے یہ کہتا جاتا ہے۔

"دیکھو سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کنگال کلرک آج رات کا کھانا کیسے کھائے گا؟ میں تو خیر بریانی اور پلاؤ کھاؤں گا اور یہ شخص شاید

بھی ہو گوشت اور وہ بھی میں ممکن ہے کہ بغیر نمک کے کھاتے۔

اسے یہ سوچنے کی کیا مصیبت پڑی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں۔ وہ دیکھا واقعی ہمارے ماحول میں ایسے شریعت زادے موجود ہیں۔ یا صرف اتنا بد معاش واقعہ ہوا ہے کہ یہاں تک غور سے دیکھیں گے آیا ہم ٹھیک ڈھنگ سے زمین پر پاؤں رکھ رہے ہیں یا نہیں۔ کیا انہوں محکمے کے کلرک کا جوتا آگے سے پھٹا ہوا ہے یا اس کے کوٹ سے اس کی کہنیاں ننگی نظر آرہی ہیں۔ پھر وہ گھر پہنچ کر اس واقعے کو کاغذ پہ اتارے گا اور اپنی اس بکواس کو کتابی صورت میں شائع کرا دے گا۔ ان نواب زادوں سے کوئی پوچھے کیوں جناب آپ کو اس جانچ پڑتال کی کیا مصیبت پڑی ہے کہ میری کہنیاں کوٹ سے باہر نکلی ہوئی ہیں یا نہیں۔ دار نیکا۔ مجھے اس تلخ کلامی کے لئے معاف رکھنا لیکن ایک غریب انسان اتنا ہی شرم سے پانی پانی ہوتا ہے جتنی ایک نوخیز دوشیزہ۔ میرے گنوارپن کے لئے معاف کرنا لیکن تم اجنبی لوگوں کے سامنے کپڑے اتار کر نہیں کھڑی ہو جاؤ گی۔ بالکل اسی طرح ایک غریب شخص بھی یہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی امیر زادہ اس کے گھریلو ماحول یا اس کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی کرے۔ اور یہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے دشمنوں کے رویے سے اتنا شدید گھائل کیوں ہو گیا تھا۔ انہوں نے میری شرافت اور میری عزت کو مٹی میں ملا دیا تھا۔

دفتر میں بھی۔ میں بالکل بے زبان جانور کی طرح سہما بیٹھا رہتا ہوں۔ اس خیال سے ہی میں زمین میں شرم کے مارے گڑ جاتا ہوں۔ پھٹی ہوئی کہنیوں یا ٹوٹے ہوئے بٹن دیکھ کر کیسے نہیں شرم آئے گی۔ لیکن بد قسمتی عجب دن دکھاتی ہے۔ آج میرے کپڑے جس قدر خستہ حال تھے شاید ہی پہلے کبھی ہوئے ہوں۔ حتیٰ کہ سیکشن کا رابرٹ بھی توجہ دیئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ کسی دفتری بات کے دوران میں کہہ اٹھا ارے بھئی ماکار۔ خدا کے واسطے۔۔ لیکن پھر اچانک چپ ہو گیا۔ لیکن مجھ پر سارا ماجرا کھل گیا اور مجھے اس قدر شرم آئی کہ میرے گنجے سر پہ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک طرح سے دیکھو تو بات کچھ نہیں غور کرو تو بہت کچھ ہے بلکہ سبھی کچھ ہے۔ کیا انہیں کسی بات کی خبر ہو گئی تھی؟ خدا نہ کرے ایسی کوئی بات ہوئی ہو۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ایک شخص پر شک ہے بھی۔ جنہیں کسی کی بے بسی کا مذاق اڑانا ہوا نہیں کیا۔ وہ تو ایک دم سے ہی میں تمہاری ذاتی زندگی کے تمام راز پیچ دیں گے ان کے لئے کچھ بھی پاکیزہ نہیں ہے۔

اور میں جانتا ہوں کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ دانا زیت کے علاوہ یہ کام اور کسی شخص کا نہیں ہو سکتا۔ ہماری منسٹری میں کسی شخص نے اس کی جان پہچان ہے اور اسی نے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اور ممکن ہے کچھ بڑھا چڑھا کر ہی بتایا ہو۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی منسٹری میں یہ بات کی ہو اور وہاں سے یہ بات ہمارے محکمے تک پہنچی ہو۔ میرے پڑوس کا بھی ہر شخص اس بات سے واقف ہے۔ میں نے انہیں تمہاری کھڑکی کی طرف اشارے کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ جب میں رات کا کھانا کھانے تمہارے کمرے میں آیا تھا تو سب لوگ اپنی اپنی کھڑکیوں میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ مکان مالکن بولی کہ بوڑھے کو شرم بھی نہیں آتی ایک بچی پہ ڈورے ڈال رہا ہے اور اس نے تمہیں گالیاں بھی دیں۔ لیکن یہ سب باتیں دانا زیت کی اس حرکت کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہیں کہ اس نے ہمیں اپنی ایک کتاب کا کردار بنا کر پیش کیا اور ہر بات کو طنزیہ پیرائے میں بیان کیا۔ اس نے اتنی زیادہ باتیں کی ہیں کہ کچھ خیر خواہ لوگوں نے مجھے آگاہ بھی کیا ہے۔ میں تو کچھ کر گزرنے کی حدوں تک اتر آیا ہوں۔ آخر تم لڑیں تو کیا؟ خدا کی یہی مرضی ہے کہ ہمیں سزا ملے۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ وقت گزارنے کے لئے تم مجھے کتاب بھیجو گی۔ خیر۔ لیکن کتاب کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر ایک کتاب ہوتی کیا ہے؟ بس یہی ادھر ادھر کی چہ میگوئیاں۔ ناول کس بلا کا نام ہے؟ بیکار لوگوں کا دل بہلانے کے لئے فضول کی بکواس۔ اور کیا! میں کیا یہ کچھ اتنے طویل تجربے سے بھی نہیں جان سکتا! لوگ جب شیکسپیئر کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ وہ اگر آپ ادب کے بارے میں بات کرتے ہیں تو شیکسپیئر کا ذکر بھی لازم ہے۔ تو تم یقین مانو کہ وہ بھی باقی کتابوں کی طرح واہیات اور بکواس ہے۔ سب بکواس ہے۔ سب دوسرے پہ کیچڑ اچھالنے کی بات ہے۔

ماکار

۱۲ - اگست

میرے پیارے ماکماز

کسی بات کا غم نہ کرو - خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائیگا - فیڈورا نے ہم دونوں کے لئے بہت کام حاصل کرلیا ہے اور تندہی سے کام کرنا بھی شروع کردیا - امید ہے کہ سب مشکلیں آسان ہو جائینگی - فیڈورا کو شک ہے کہ ان دنوں میری جو بدنامی ہو رہی ہے اس میں اپنا کا بہت بڑا ہاتھ ہے - لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے! آج نہ جانے کیوں میں بہت خوش ہوں - مجھے پتا چلا ہے کہ تم دوبارہ قرض لینے کی سوچ رہے ہو - خدا نہ کرے یہ سچ ہو - دیکھو قرض کی ادائیگی کے وقت تمہیں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا - خدا کے لئے تمہیں احساس ہونا چاہیئے کہ تم ہمارے سب سے قریبی دوست ہو - ہم سے ملنے کے لئے اکثر اوقات چلے آیا کرو - تمہاری مکان مالکن جو کچھ بھی کہہ رہی ہے اس پر توجہ نہ دو - رہا سوال تمہارے باقی دشمنوں اور نقصان پہنچانے والوں کا تو مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارا یہ خوف بے بنیاد ہے - میں نے تمہیں ایک بار بتایا تھا کہ تمہارے لکھنے کے انداز میں اکھڑا پن ہے اور وہ ابھی تک ہے - اچھا دوبارہ ملاقات ہونے تک الوداع - مجھے امید ہے کہ تم جلد ہی ملنے چلے آؤ گے -

تمہاری
وی - ڈی -

میرے ننھے فرشتے وار وارا

میں کب سے تمہیں یہ بتانے کا مشتاق تھا کہ میری امیدیں دن بدن بڑھ رہی ہیں - لیکن تم یہ کیسے کہہ رہی ہو کہ میں مزید قرض نہ لوں - یہ تو ناممکن سی بات ہے - میرے پلّے تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے - اور خدا نہ کرے اگر تمہیں کچھ ہو جائے تو پھر کیا کریں گے - تم تو بہت ہی نازک ہو - لہٰذا میں پھر بھی کہوں گا کہ قرض لینا از حد ضروری ہو گیا ہے - لیکن پہلے ضروری باتیں کرلیں -

ہاں تو پہلے یہ سنو کہ دفتر میں مجھے ایمیلان اتیو نو دیچ کے پاس بٹھا گیا ہے - یاد رہے کہ یہ شخص وہ ایمیلا نہیں ہے جس کے بارے میں تمہیں میں کچھ بتایا تھا - یہ شخص سب سے پہلے دیجے کا کلرک ہے - اس دفتر میں وہ اور میں سب سے پرانے ملازم ہیں - وہ بہت ہی رحم دل اور کام آنے والا شخص ہے - بڑا محنتی آدمی ہے - اور اس کا دستخط بہت نفیس اور عمدہ ہے - سچی بات پوچھو تو اس کا دستخط مجھ سے برا نہیں ہے - المختصر کہ خوبیوں کا مالک ہے - ہم کبھی ایک دوسرے کے دوست تو نہیں تھے ہاں دعا سلام تک بات تھی - بس کبھی کبھار پنسل یا چاقو کی ضرورت پڑ گئی تو میں اس سے مانگ لیا کرتا تھا - لیکن آج وہ اچانک کہہ اٹھا - "بھئی لاکھ روپے کی بات کی ہے -" میں محسوس کرسکتا تھا کہ وہ تہہ دل سے میرا خیر خواہ ہے لہٰذا میں نے اسے سب کچھ بتا دیا - سب کچھ کا مطلب یہ نہیں کہ ایک ایک بات بتا دی - مجھ میں اتنی ہمت کہاں - لیکن چونکہ میں حالات کے ہاتھوں بہت زیادہ پریشان تھا اس لئے اس سے مطلب کی بات کہہ دی - وہ سنتے ہی بولا - "میرے عزیز دوست - پیوتر پیٹرووچ سے کچھ روپیہ کیوں نہیں لے لیتے؟ وہ مجھے سود پہ قرض دے دیتا ہے - اور سود اچھی ہے - دم توڑنے والا نہیں" اور وارنیکا جانتی ہو کہ یہ خبر سنتے ہی میرا دل کس طرح بلیوں اچھل پڑا ہوگا! مجھے امید ہے کہ رب کریم پیوتر پیٹرووچ کے کان میں غیبی طور پہ سب کچھ کہہ دے گا اور التجا کرے گا کہ وہ مجھے قرض پہ روپیہ دے دے - میں ویسے بھی اس الجھن میں گرفتار تھا کہ مکان مالکن کی بقیہ رقم کیسے چکائی جائے - تمہاری مدد کس طرح کی جائے اور کچھ اپنی ضروریات کیسے پوری کی جائیں - ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رہنے سے تو میرا جی جلتا رہتا ہے - علاوہ ازیں مذاق اڑانے والے بھی تو میری جان پر آ بنے ہیں - انہیں خدا ہی سمجھے - حضورِ انور بھی کبھی کبھار ہماری میز کے سامنے سے گزر جاتے ہیں - خدا خیر کرے "اگر کبھی ان کی نظر میرے لباس پر جا پڑی تو کیا ہوگا - وہ صفائی کے بہت سختی سے پابند ہیں - ممکن ہے کہ حضورِ انور بغیر کچھ کہے دیکھتے ہوئے گزر جائیں لیکن میں تو شرم کے مارے زمین میں گڑ جاؤں گا - بس یہی وجہ ہے کہ میں مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق پیوتر پیٹرووچ کے پاس گیا - اور مجھے جہاں ادھار مانگنے کا خوف تھا وہاں امید تھی - اور وارنیکا اندازہ کرو کہ حاصل کچھ بھی نہ ہوا - جب میں وہاں پہنچا تو پیوتر پیٹرووچ کسی صاحب سے باتیں کرنے میں مشغول تھا - میں اس کی کہنی کو

یوں بچوں جیسے کہہ رہا ہوں — جناب قبلہ پیڑ دیچ صاحب —
وہ اس نے گھور کر دیکھا تو میں نے مدعا بیان کیا کہ مجھے تین روبل کی
ضرورت ہے۔ پہلے پہل تو یوں نظر آیا جیسے یہ بات اس کی سمجھ میں
نہیں آئی ہو۔ جب میں نے کھل کر بات کی تو وہ زور سے ہنسا اور بات
وہیں کی وہیں ختم ہو گئی۔ میں نے از سر نو التجا کی — میرے بار بار
تقاضا کرنے پر وہ بولا — کیا ضمانت پیش کر سکتے ہو —؟ یہ کہہ کر وہ
پھر کاغذات میں گم ہو گیا اور مجھے یوں نظر آیا جیسے وہ میرے وجود
کو بالکل بھول چکا ہو — مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ میں نے
گھبرا کر کہا۔

"نہیں سرکار — ضمانت تو کوئی نہیں ہے — لیکن تنخواہ سے
پائی پائی لوٹا دوں گا —"

میں ابھی اتنا کہہ پایا تھا کہ اسے کوئی شخص بلا کر لے گیا۔ میں
وہاں کمرہ میں انتظار کرتا رہا اور جب وہ واپس آیا تو اپنے قلم کی نوک درست
کرنے میں یوں منہمک ہو گیا جیسے میں وہاں موجود ہی نہ تھا۔ میں نے
پھر گڑگڑا کر کہا: "مسٹر پیوتر — پیڑ دویچ — کیا کوئی انتظام ہو سکتا
ہے —" وہ یوں بیٹھا رہا جیسے اس نے میری آواز سنی ہی نہ ہو۔ میں
وہاں بہت دیر کھڑا رہا۔ آخر میں نے سوچا کہ آخری بار پھر دیکھوں۔ میں
نے التجائیہ انداز میں پھر اس کی کہنی کو چھوا — اور تم کیا سوچ رہی ہو کہ وہ
کیا وہ منہ سے کچھ بولا — نا — بالکل نہیں۔ اس نے قلم کی نوک سنواری
اور پھر لکھنے میں محو ہو گیا۔ میں واپس چلا آیا۔

عزیزم — ممکن ہے کہ یہ لوگ اچھے ہوں۔ لیکن اتنے مغرور
ہیں — اُف — اس قدر مغرور — جیسے وہ ہماری دنیا کے لوگ
نہ ہوں۔ وہ واقعی ہم سے بہت دور ہیں — لیکن میں یہ سب کیوں
لکھ رہا ہوں؟ بات یہ ہوئی کہ میں نے ایمیلان سے پورا قصہ کہہ سنایا۔
وہ بالکل پیوتر پیڑ دویچ کے انداز میں ہنسا اور سر ہلانے لگا۔ یہ شخص
اچھا ہے۔ اس نے میرا حوصلہ بڑھایا اور وعدہ کیا کہ وہ ایک
اور شخص سے متعارف کرائے گا۔ وہ بھی سود پر ادھار دیتا ہے۔
ایمیلان کا کہنا ہے کہ وہ ضرور قرض دے دے گا۔ میں کل اس سے
ملنے جا رہا ہوں۔ تمہاری کیا رائے ہے — جاؤں یا نہیں۔ خدا کرے
کہ مجھے ادھار مل جائے۔ مکان مالکن مجھے نکالنے پر تلی ہوئی ہے اور
اس پہ طرہ یہ کہ مجھے روٹی نہیں دیتی۔ میرے بوٹ بھی بالکل پھٹ

چلے ہیں۔ اور کپڑوں پر بٹن نہیں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں یہ کیا؟ اگر
کسی بڑے افسر نے ایک نظر میرے کپڑوں پر ڈال دی تو غضب
ہو جائے گا۔ وارنیکا — ہماری مصیبتوں کا کوئی خاتمہ نہیں ہے۔
ماکار

۴۔ اگست

میرے مہربان دوست ماکار

جتنی جلدی ہو سکے تم روپیہ ادھار لے لو خدا کے لئے
موجودہ حالات کے پیش نظر میں کبھی تمہیں مدد کرنے کے لئے نہ کہتی
لیکن تم جان سکو کہ ہم کن حالات میں یہاں رہ رہے ہیں۔ اب ہم
اس کوٹھری میں زیادہ دیر نہیں رہ سکتے۔ مجھے بڑی مشکلات کا
سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میرے دل پر کیا
بیت رہی ہے۔ آج صبح ایک معمر شخص جو بزرگ نظر آتا تھا۔
اور اُس نے اچھا خاصہ لباس پہن رکھا تھا وہ سیدھا میرے کمرے
میں چلا آیا۔ میں اس قدر حیران ہوئی کہ اس کی آمد کا مقصد بھی نہ
سمجھ پائی وہ پوچھنے لگا کہ میں کس طرح رہ رہی ہوں۔ گذارا کیسے
ہوتا ہے اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر بولے کہ میں اس افسر کا
چچا ہوں۔ اور اپنے بھتیجے کے رویّے پر سخت ناراض ہوں کہ اس
نے تمہارے بارے میں افواہیں پھیلا دی ہیں۔ وہ بولا کہ اس کا بھتیجا
تو ایک آوارہ اور لغو شخص ہے، اور اس نے میری حفاظت کرنے
کی پیش کش بھی کی۔ نیلو را کچھ خرید فروخت کرنے بازار گئی ہوئی تھی۔
وہ نصیحت کرنے لگا کہ نوجوانوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے اور بولے کہ
میں اسے اپنے باپ کی طرح سمجھوں اور وہ بھی مجھے بیٹی ہی سمجھتا ہے اور
ہر وقت میری مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔ میں گھبرائی جا رہی تھی
اور میری کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ لیکن مجھے اس کا شکریہ ادا
کرنے کی بالکل نہ سوجھی۔ یہ کہتا رہا کہ میرے چہرے کے خال و خط بہت
حسین ہیں۔ میری صورت بہت اچھی ہے۔ وہ میرے گالوں کو گدگدا
رہا ہے اور یہ بھی کہنے لگا کہ وہ تو فقط ایک بوڑھا آدمی ہے۔
شیطان نہیں کا، اور یہ کہہ کر میرا منہ چومنے کی کوشش کرنے لگا
اتنے میں اوپر سے فیڈورا آ گئی۔ اب وہ ذرا گھبرایا اور پھر کھلاہٹ میں
مجھے یقین دلانے لگا کہ میری شرافت اور علمی نے اسے بہت متاثر
کیا ہے اور اس کی نظروں میں میری عزت بڑھ گئی ہے اور کہنے لگا

کہ میں اسے اجنبی نہ سمجھوں۔ یہ کہنے کے بعد وہ فیڈورا کو ایک طرف لے گیا اور اسے کسی بہانے سے کچھ روپے قبول کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ فیڈورا نے صاف صاف انکار کر دیا۔ آخرکار وہ جانے کے لئے اٹھا اور بولا کہ وہ مجھ سے دوبارہ ملنے کے لئے آئے گا اور آتے ہوئے میرے لئے کانوں کی بالیاں لیتا آئے گا۔ واب اسکی بوکھلاہٹ صاف نمایاں ہو چلی تھی! اس نے مجھے بھی نصیحت کی کہ میں کسی اچھے مکان میں رہوں۔ اور پھر ایک بہت ہی اچھا مکان اس کی نظروں میں ہے بھی۔ وہاں رہنے کی مجھے کچھ لاگت بھی نہیں دینی پڑے گی۔ اس نے ایک بار پھر کہا کہ میں اسے بے حد پسند آئی ہوں کیوں کہ میں بہت ہی ایماندار اور سمجھدار لڑکی ہوں اور اس نے تنبیہ کی کہ مجھے آوارہ گرد لڑکوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ بالآخر وہ کہہ ہی بیٹھا کہ وہ اینا فیڈورونا کو بھی جانتا ہے اور اینا مجھ سے ملنے کے لئے بہت جلد یہاں آئے گی بھی۔ اب تو مجھ پر سب حقیقت واضح ہو گئی اور میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کس درجہ غصہ آیا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے آپ کو اتنے غصے میں دیکھا۔ میں آپے سے باہر ہو گئی اور اسے صاف بتا دیا کہ میں اس جیسے لچے اور لفنگوں کو خوب سمجھتی ہوں۔ فیڈورا نے بھی اسے خوب جلی کٹی سنائیں اور ہم دونوں نے مل کر اسے قریب قریب دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ یہ سب اینا کی کرتوت ہے۔ ورنہ اسے ہمارے بارے میں کیا خبر ہو سکتی تھی۔

ماکار۔ میں التجا کرتی ہوں کہ ان حالات میں ہمارا ساتھ نہ چھوڑو۔ خدا کے لئے کہیں سے قرض لے لو کیونکہ ہمیں مکان تبدیل کرنا ہی۔ فیڈورا بھی میری رائے سے متفق ہے۔ ہمیں کم از کم ۲۵ روبل درکار ہیں۔ میں یہ پوری رقم واپس کر دوں گی۔ میں کماؤں گی۔ فیڈورا میرے لئے کام تلاش کرے گی۔ سود کی پرواہ مت کرو۔ جتنے سود پر بھی ملے قرض لے لو۔ میں ایک ایک پائی چکا دوں گی۔ بس تم اس وقت میری مدد کر دو۔ ان حالات میں جب کہ خود تمہاری جان عذاب میں ہے تمہیں تکلیف دینا ایک حد تک ظلم ہے اور مجھے اس بات کا بہت رنج ہے لیکن تم میری واحد امید ہو۔ خدا حافظ ماکار۔ ذرا میرے دل پہ غور کرو۔ اور خدا کا نام لے کر قرض لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔

وی۔ ڈی۔

میری پیاری واروارا

ان اچانک اور غیر متوقع صدموں نے مجھے توجڑ سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ بدمعاش تو ہم لوگوں کے لئے سانس لینا بھی دوبھر کر دینگے مجھے اب چاہے موت کے گھاٹ کیوں نہ اترنا پڑے لیکن میں تمہارے لئے ضرور قرضہ حاصل کروں گا۔ لیکن واروینکا۔ قرضہ مل جانے پر بھی تو میری موت یقینی ہے کیونکہ پھر تم مجھ سے دور بہت دور چلی جاؤگی۔ اور میری زندگی ویران ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ غم گھن بن کر کھائے جا رہا ہے۔ وارینکا تم میرے ساتھ ایسا ظلم کیسے کر سکتی ہو؟ میں جانتا ہوں تمہیں گہرا صدمہ پہنچا ہے اور تم بے حد دکھی ہو لیکن تم نے جہاں مجھے مدد کرنے کے لئے کہا ہے وہاں یہ لکھ دیا ہے کہ تم پائی پائی لوٹا دو گی۔ محنت کر کے کماؤ گی۔ یعنی تم اپنی صحت پر ظلم کرو اور اسے اور زیادہ برباد کر دگی! ایسا کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ بچار کر لو۔ آخر تمہیں یہ سب کچھ کرنے کی کیا مصیبت پڑی ہے۔ میں اپنی حالت بھی بخوبی جانتا ہوں کہ اب میں کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہوں لیکن میں اپنی جان پر کھیل کر بھی تمہارے کام آؤں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔ میں اور زیادہ کام کروں گا۔ میں ادیبوں کی تحریروں کی نقل اتارنے کا کام حاصل کروں گا۔ میں خود ان کے پاس جاؤں گا اور منت سماجت کر کے مزید کام حاصل کروں گا۔ تم نے لکھا ہے کہ میں سود کی پروا نہ کروں۔ بے فکر رہو اب مجھے کسی چیز کی پروا نہیں ہے۔ میں کہیں سے بھی چالیس روبل کا انتظام کر کے رہوں گا۔ میرا خیال ہے یہ رقم کچھ اتنی زیادہ نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ادھار دینے والے میرے وعدے کا یقین کر لیں گے؟ وعدہ کرنے کے سوا میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ کیا میری شخصیت ایسی ہے کہ لوگ ایک نظر دیکھ کر ہی مجھے قرض دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ ان چالیس روبل میں ۲۵ روبل میں تمہیں دے دوں گا۔ ۲ روبل مکان مالکن کے حوالے کر دوں گا اور باقی رقم سے اپنی ضروریات پوری کروں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مکان مالکن کو زیادہ پیسے دینے چاہیئں۔ وہ مطالبہ کرنے میں جائز بھی ہے۔ لیکن اگر تم اندازہ کرو تو تم پر بہ آسانی کھل جائے گا کہ میں اسے زیادہ رقم دینے کے قابل نہیں ہوں۔ لہٰذا اسکا ذکر ہی کیوں کیا جائے۔ کچھ پیسوں میں ایک نیا بوٹ خریدا جا سکتا ہے۔

میرا حوصلہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ کل مجھے دفتر تک بھی پہنچا سکے۔ اور پھر یہ سب تو لازم و ملزوم ہیں۔ کہیں حضور انور نے مجھے بغیر دھلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھ لیا تو نہ جانے کیا کہہ بیٹھیں۔

یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے اگر میں قرض لینے میں ناکام رہا تو پھر کیا بنے گا۔ خدا ہی میری مدد کرے۔ میں دعا گو ہوں کہ مجھے کامیابی نصیب ہو۔

ماکار۔

۵ اگست

میرے معزز دوست

ماکار

اگر تم اسقدر مایوس ہو جاؤ گے تو ہمارا کیا حال ہو گا۔ خدا کے لئے ایسا نہ کہو! ہم پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ میں تمہارے لئے چاندی کے تیس کوپیک بھیج رہی ہوں۔ اس سے زیادہ رقم میں نہیں بھیج سکتی۔ ان سے صرف وہی اشیاء خریدنا جن کی تمہیں خود ضرورت ہو۔ فیڈورا اور میرے پاس اب ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ اور میں نہیں جانتی کہ ہم دونوں کل کیا کریں گی۔ یہ سچ ہے کہ یہ بہت ہی افسوسناک بات ہوئی ہے لیکن ہم اپنے آپ کو تنہا پریشان نہ کرو۔ تمہیں روپیہ حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی نہ سہی لیکن تم سے جو بھی بن پڑا تم نے اتنا تو کیا۔ فیڈورا کا خیال ہے کہ ہمیں یہیں رہنا چاہیئے کیونکہ اگر وہ بدمعاش چاہیں تو ہمیں نئی جگہ پر بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ لیکن اگر آج نہیں تو کل۔ بہر صورت ہمیں اس جگہ سے تو اب جانا ہی ہے۔ میں اور زیادہ لکھتی لیکن میرا دل بجھ گیا ہے۔

ماکار۔ تم بھی عجیب کردار ہو۔ ہر بات تمہارے دل پر کتنی جلدی اثر کرتی ہے۔ اگر یہی عالم رہا تو تم زندگی بھر خوش نہیں رہ سکو گے۔ میں تمہارے خط پوری توجہ سے پڑھتی ہوں اور مجھ پہ یہ حقیقت صاف واضح ہے کہ تم بے وجہ پریشان ہوتے رہتے ہو۔ اپنی بساط سے باہر غم کھاتے ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم رحمدل انسان ہو۔ میں بھی یہی کہوں گی لیکن میں آج کچھ نصیحت دینا چاہتی ہوں۔ اسے ایک دوست کی نصیحت سمجھنا۔ ماکار۔ تم نے میرے لئے جو کچھ بھی کیا ہے میں اس کے لئے بہت شکر گذار ہوں۔ مجھے تمہارے احسانات کا پورا پورا احساس ہے۔ لیکن مجھے تو اس بات کا دکھ ہے کہ میں تو تمہاری مصیبتوں کی وجہ بنی ہوں اور تم ہو کہ میری خوشیوں اور مصیبتوں میں بھی شریک ہوتے رہتے ہو۔ تم فقط میری محبت کے سہارے پر زندہ ہو۔ اور تم جو دوسرے لوگوں کے دکھ میں یوں شریک ہوتے رہتے ہو پھر کیا عجب ہے کہ تم کبھی سکھی نظر نہیں آتے۔ دفتر سے لوٹ کر تم جب کل شام ہمیں ملنے کے لئے آئے تھے تو میں تمہیں دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ تمہارا چہرہ پیلا زرد ہو رہا تھا۔ تمہارا رنگ اڑا ہوا تھا اور حال ایسی تھی جیسے زندہ لاش چل رہی ہو۔ آخر کیوں محض اس لئے کہ تم قرضہ حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے اور یہ بات مجھے بتاتے ہوئے ڈرتے تھے؟ بس! اور جب میں تمہیں دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی تو تمہارے چہرہ پر زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جیسی بنتی گی سب لیں گے لیکن غم نہ کیا کرو۔ ماکار۔ کچھ ہوش سنبھالو۔ میں بھیک مانگتی ہوں۔ خدا نے چاہا تو یہ مصیبت کے دن ختم ہو جائیں گے۔ ورنہ جیسے تم لوگوں کے دکھ میں گھلتے رہتے ہو تمہارے لئے زندگی جنجال بن جائے گی۔ اچھا خدا حافظ میرے دوست۔ میرے بارے میں اتنا زیادہ نہ سوچا کرو۔

وی۔ ڈی۔

۵ اگست

میری ننھی فاختہ واربنکا

اگر تم کہتی ہو کہ قرض نہیں ملا تو گھبرانے کی بات نہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ پھر میں بہت خوش ہوں۔ اب میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ اب مجھے یقین آیا اور مجھے ایک سچی خوشی کا احساس ہوا۔ اور مجھے اس بات کی زیادہ خوشی ہے کہ تم یہیں رہو گی۔ اگر اپنے دل کی بات کہوں تو تمہارا خط پڑھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ تم میرے جذبات کی کتنی قدر کرتی ہو۔ میں یہ سب باتیں کسی غرور یا فخر کے ساتھ نہیں کر رہا بلکہ اس جذبے سے کہہ رہا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور میرے جذبات اور احساسات کا خیال رکھتی ہو۔ تم نے لکھا ہے کہ مجھے اپنا دل کمزور نہیں کرنا چاہیئے۔ بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ کسی بھی آدمی کا دل کمزور نہیں

دتا چاہیے۔ لیکن جان من میرے دماغ پر تو بوٹ کا تصور سوار ہے کل تک اگر نئے جوتے نہ لے سکا تو دفتر کیسے پہنچوں گا۔ کوئی یک مشکل تھوڑے سے ہی ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے غم جان کا روگ ن جاتے ہیں۔ اور میں اپنے لئے دکھی نہیں ہو رہا۔ مجھے ان باتوں ی پروا نہیں ہے کہ میرے پاس بوٹ ہے یا نہیں۔ میں تو زبردست ھر میں بھی ننگے پاؤں اور بغیر آستین والی قمیض پہن کر چل نکلوں گا۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں اپنی عمر گزار بیٹھا لیکن اگر لوگ مجھے اس حالت میں دیکھیں گے تو وہ کیا کہیں گے۔ میرے دشمن نہ جانے کیسی کیسی افواہیں پھیلائیں گے۔ بس یہی وجہ ہے کہ آدمی بوٹ اور کوٹ پہنتا ہے۔ وارنیکا میرا خیال ہے تم سمجھ گئی ہوگی کہ میری عزت اور نیک نامی کو بچانے کے لئے نئے جوتے بہت ضروری ہیں۔ بچے جوتوں میں آدمی نہ جانے کیا کھو بیٹھتا ہے۔ مجھ پہ یقین کرو۔ یہ باتیں میری عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ ہیں۔ لہٰذا تم کبھی بھی باتوں پر کان نہ دھرو بلکہ ایک بوڑھے آدمی کی بات کا یقین نہ کرو۔

لیکن میں نے ابھی یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آج کیا گذری۔ آج صبح جو کچھ میں نے برداشت کیا ہے اگر کوئی اور ہوتا تو پورا سال روتا رہتا۔ میں منہ اندھیرے اٹھ کر چل دیا تاکہ اس سے بھی مل لوں دفتر بھی دیر نہ ہو جائے۔ زور کی بارش ہو رہی تھی اور جگہ جگہ گڑھے تھے، میں اپنے کوٹ میں لپٹا ہوا چلا جا رہا تھا اور دعا مانگ رہا تھا——

"رب کریم میرے گناہ بخش دینا۔ میری دعا سن لو۔
بس اب کی بار میری دعائیں قبول کر لو——"

جب میں ایک چرچ کے سامنے سے گذرا تو ذرا جھک کر سجدہ بجا لایا اور بار بار دل میں کہتا گیا گنہگار کے گناہ بخش دو۔ میری مصیبتوں کو کاٹ دو۔ لیکن مجھے یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ خدا سے اس طرح شرطیں نہیں باندھی جاتیں۔ بس اسی دھن میں چلتا گیا۔ میں اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے آس پاس کی کسی چیز کی سدھ نہ تھی اور راستے میں جو کچھ آتا تھا میں اس سے گھبرایا نہیں۔ گلیاں سنسان تھیں اور اگر کوئی اکادکا راہی گذرتا تو وہ بھی میری طرح اپنے خیالات میں غرق گذر جاتا تھوڑی دور آگے جا کر مجھے کچھ مزدور نظر آئے اور ان بدمعاشوں نے اس بارش میں مجھے اچھی طرح دھکے دیئے۔ میں گھبرا اٹھا اور تیز تیز چلنے لگا۔ جونہی میں واسکریسنکی پل پر پہنچا تو میرے جوتے کا تلا بالکل جواب دے گیا۔ اور ایک ایک قدم اٹھانا میرے لئے مشکل ہو گیا۔ میں اسی وقت سامنے سے میر مولائی چلا آ رہا تھا۔ وہ جونیئر کلرک سے بھی نچلے درجے کا افسر ہے۔ وہ مجھے دیکھنے کے لئے ذرا سا رکا۔ اور پھر میرے پیچھے پیچھے یوں چلنے لگا جیسے مجھ سے ایک روپیہ ادھار مانگنا چاہتا ہو۔ میری صحت کی خیر مانگنے کے لئے۔ "کیوں نہیں۔ کیوں نہیں" میں نے سوچا۔ "میری صحت کی خیر کیوں نہ چاہو۔" میں جب اور نہ چل سکا تو ذرا سا سستانے کے لئے رک گیا اور پھر چل پڑا۔ میرے دماغ میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ لیکن کوئی ایسا خیال نہ آتا تھا جو دیرپا ثابت ہوا اور اسی ذہنی کشمکش کے عالم میں میں سیدھا ایک کیچڑ بھرے گڑھے میں دھنس گیا اور میرے کپڑے اتنے گندے ہو گئے کہ شرم کے مارے میرے آنسو نکل پڑے۔ آخرکار مجھے کافی فاصلے پر ایک پیلا مکان نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ مارکوف کا یہی گھر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ایمیلان نے اسی جگہ بتلایا تھا حالانکہ مجھے پورا یقین تھا لیکن میں اپنے حواس اس قدر کھو بیٹھا تھا کہ میں نے ایک چوبدار سے پوچھ ہی لیا۔ "کیوں دوست۔ یہ کس کا مکان ہے؟" اُس نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا۔ "یہ مارکوف کا گھر ہے۔" میں تین بار گھر کے سامنے سے ہو کر گذر گیا لیکن مجھے اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اندر چلا جاؤں۔ میرے دل سے یہی آواز اٹھتی تھی۔ "وہ مجھے ادھار نہیں دے گا۔ ہرگز نہیں دے گا میں ایک سراسر اجنبی شخص ہوں۔ پھر حلیہ کیا بنا رکھا ہے اور معاملہ پیسے کا ہے۔" لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ فیصلہ قسمت پہ چھوڑ دیا جائے۔ آخر وہ لوگ مجھے کھا نہیں جائیں گے۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ لیکن اب مصیبت یہ مصیبت کھڑی ہو گئی۔ مکان کے اندر قدم رکھتے ہی کتے کا پلا زور سے بھونکتا ہوا میرے سامنے ناچنے لگا۔ اب تم جانو کہ یہ ایسی چیز ہے کہ بڑے بڑوں کے ہوش اڑ جائیں۔ میں سہمے ہوئے ایسی ڈیوڑھی تک ہی پہنچا تھا کہ ایک بوڑھی عورت سے ٹکرا کر اس پر لڑھک گیا۔ وہ وہاں

بیٹھ وہ مسکرا رہی تھی ۔ ان سے دو دو ہاتھ جا رہی تھی ۔ دو ایک مرتبان ٹوٹ بھی گئے ۔ بس پھر کیا تھا ۔ اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا ۔ " چلے کہاں آتے ہو ۔ کسے ڈھونڈ رہے ہو ۔ " اور یہ وہ جانے کیا کیا کہتی گئی ۔ ڈارلنگ ۔ میں یہ سب کچھ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ جب بھی کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہے تو مجھ پر ایسی ہی بیتی ہے ۔ میری قسمت ہی ایسی ہے ۔ اس کی چیخ پکار سن کر میرے پاؤں کانپ گئے ، میری جان ہی خشک ہو گئی ۔ لیکن میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا کہ کیا مارکونٹ یہیں رہتا ہے ۔ وہ بولی ۔ یہ مارکونٹ کا مکان نہیں ہے لیکن اس نے مجھے ایک نظر اچھی طرح دیکھا اور مجھے نظر آیا کہ اس نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے کیونکہ اس نے میری آمد کا مقصد پوچھا ۔ میں نے بتایا کہ مجھے ایمیلان نے بھیجا ہے ۔ اور میں نے اس عورت کو سارا ماجرا کہہ سنایا ۔ اس نے اپنی بیٹی کو آواز دی ۔ اس کی بیٹی لمبے قد کی تھی اور وہ ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی آ پہنچی ۔ " ابا جان کو بلا لاؤ ۔ وہ اپنے کرایہ داروں سے باتیں کر رہے ہیں " ۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی ۔ " ذرا اندر تشریف لائیے " ۔

کمرہ کافی حد تک تسکین دہ تھا ، دیوار دن پر فریم کی ہوئی لٹک رہی تھیں ۔ زیادہ تصویریں فوجی جرنیلوں ہی کی تھیں ۔ ایک صوفہ تھا ۔ ایک گول میز تھی ۔ اور کوئی چیزیں پڑی تھیں ۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ آج واپس چلے جانے ہی میں بھلائی ہے اس لئے واپس چلے جاؤ ۔ کل پھر آ جانا ۔ موسم بھی اچھا ہوگا ۔ دودھ کے مرتبان بھی نہیں لڑھکیں گے ۔ اور میں نے دروازے کی طرف قدم اٹھایا ہی تھا کہ وہ کمرے میں داخل ہوا وہ چھوٹے قد کا بوڑھا آدمی تھا ۔ اس کی آنکھیں عقاب کی طرح ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھیں ۔ اس نے عمدہ لباس پہن رکھا تھا ۔ کمر پر ایک سنہری دھاگا باندھ رکھا تھا ۔ اس نے آتے ہی سوال کیا کہئے ۔ " آپ کو کیا چاہئے " ۔ میں نے ایمیلان کا حوالہ دیا ۔ اور چالیس روبل کی ضرورت بیان کی اور اپنا دکھڑا سنایا ۔ لیکن اس کی نظروں سے مجھ پر کھل گیا کہ مجھے ناکامی ہوئی ہے اس پر کوئی اثر نہیں ہوا ۔ وہ بولا ۔ " تمہیں روپیہ فوراً چاہئے ۔ اور میرے پاس ہی نہیں اور پھر تم ضمانت کے طور پر کیا پیش کر سکتے ہو ؟ " میں نے کہا کہ ضمانت تو میرے پاس کوئی نہیں ہے ۔ لیکن میں نے پھر ایمیلان کا ذکر کیا اور پھر التجا کی کہ مجھے روبلوں کی سخت ضرورت ہے ۔ " تم بات بات میں ایمیلان کو کیوں گھسیٹ رہے ہو ۔ وہ کیا کرے گا ۔ " میرے پاس پیسہ ہی نہیں ہے ۔ کیوں دوں گا ۔ " میں تو بہت پہلے جانتا تھا ۔ میں اپنے دل میں بس یہی کچھ کہہ رہا ۔ ڈارلنگ کاش اس وقت زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتا میری ٹانگیں پتھر کی مانند بھاری ہو گئیں اور میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی ۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے کہہ رہا ہو " اچھا اب معاف کرو جاؤ " اور اگر یہ کاروباری بات چیت ہوتی تو مجھے بہت پریشانی ہوتی ۔ " اس نے صاف پوچھا ۔ " تمہیں روپیہ کس لئے چاہئے " ۔ میں نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس نے سننے کی زحمت گوارا نہ کی ۔ " نہیں ۔ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے مجھے سخت افسوس ہے ۔ " میں نے بار بار التجا کی ۔ وعدے کے وقت پر رقم لوٹا دوں گا بلکہ یہ بھی کہا کہ وقت سے پہلے لوٹا دوں گا ۔ وہ جتنا سود لگا لے مجھے منظور ہے ۔ وہ جتنی رقم دے سکتا ہے اتنی ہی دے دے ۔ مجھے اس وقت تمہارا خیال آ رہا تھا اور تمہارے اس آدھے روبل کا خیال آ رہا تھا جو تم نے مجھے دیا تھا ۔ اس نے پھر زور دے کر کہا ۔ " نہیں ۔ اور تم سود کی کیا بات کر رہے ہو ۔ تمہیں ضمانت کے طور پہ کچھ پیش کرنا چاہئے بلکہ میرے پاس پیسہ ہے ہی نہیں ۔ مجھے خدارا افسوس ہے ۔ " وہ چور ۔ وہ لٹیرا ۔ خدا کا نام لے رہا تھا ۔

مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں گھر سے باہر کیسے نکلا ۔ میں بہت تھک گیا تھا ۔ میرے پاؤں من من کے ہو رہے تھے ۔ میں دفتر دیر سے پہنچا ۔ میں نے چاہا تو تھا کہ برش سے کپڑے جھاڑوں لیکن چوکیدار نے اجازت نہ دی ۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں برش خراب نہ ہو جائے اور تم جانتی ہو کہ برش آخر کار دفتر کا مال تھا سو تم نے دیکھا ۔ دنیا کا بس چلے تو میرے جسم سے اپنے پاؤں پونچھ دے ۔ مجھے روپے کی کمی نہیں مار رہی ۔ مجھے یہ سلوک مار رہا ہے ۔ یہ آرزو ، یہ تمسخر ، یہ مذاق اور اس پہ اتنی توہین ۔ خدا نہ کرے کہ کبھی حضور انور کے کانوں تک یہ بات پہنچے ۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ میرے برے دن آ گئے ہیں ۔ آج اور کچھ

نہیں سوجھا تو میں نے تمہارے تمام گذشتہ خطوط ایک بار پھر پڑھ ڈالے۔ اچھا خدا حافظ۔

ماکار۔

ممکن ہے میں کل تم سے ملنے چلا آؤں۔ میں نے یہ واقعات مزاحیہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ تم ہنسو لیکن یوں ہو نہ سکا۔

۱۱۔ اگست

وارا وارا

لو بھئی سب ختم ہو گیا۔ میں مٹی میں مل گیا۔ اور میرے ساتھ تمہاری عزت بھی مٹی میں مل گئی۔ ہم دونوں کہیں کے نہ رہے۔ دیکھیے دیکھیے سب کیا دھرا دھڑام سے نیچے آگرا۔ میری عزت میری نیک نامی خاک میں مل گئی۔ میں خود برباد ہوا اور ساتھ تمہیں بھی برباد کر بیٹھا۔ تمہاری تباہی کا میں ذمہ دار ہوں۔ دنیا والے مجھے گالیاں دے رہیں۔ مجھے لعن طعن کر رہے ہیں اور مکان مالکن نے تو حد کر دی۔ اس نے بھرے مجمع میں مجھے ذلیل کیا۔ اور رداتازیف کے ہاں ایک دعوت ہو رہی تھی اس میں کسی شخص نے میرا ایک خط زور زور سے پڑھ کر سب کو سنایا جو میں نے تمہیں لکھا تھا۔ وہ خط میری جیب سے گر گیا تھا۔ انہوں نے خوب پھبتیاں کہیں اور جی کھول کر ہمارا مذاق اڑایا۔ انکے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ میں غصے کے عالم میں کمرے میں داخل ہو گیا اور میں نے راتازیف کو جی بھر کے برا بھلا کہا۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا اور بولا کہ غدار اور دھوکے باز وہ نہیں میں ہوں۔ اس نے مجھے پراسرار شخص بتایا اور کہا کہ میں دوسرا نویس ہوں۔ اب سب لوگ مجھے مسٹر نویس کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ بہت برا ہوا۔ وہ سب کچھ جان گئے۔ میرے تمہارے بارے میں۔ ذرا سوچو تو کہ خلاڈ دنی بھی گستاخ ہو گیا ہے۔ جب میں نے اس سے کہا کہ پنساری کی دکان پر جا کر سودا خرید لاؤ تو اس نے صاف انکار کر دیا اور بولا۔ اسے فرصت نہیں ہے۔ میں نے کہا — "لیکن یہ کام کرنا تمہارا فرض ہے"۔ "جی نہیں۔ بالکل نہیں —" وہ بولا۔ "اور وہ اس لئے نہیں ہے کہ آپ کرایہ ادا نہیں کر رہے —"۔ میں ایک گنوار اور جاہل شخص سے یہ بات نہ سن سکا اور میں نے اسے بے وقوف کہہ دیا۔ جانتی ہو اس نے جواب میں کیا کہا۔ "بیوقوف آپ ہوں گے"۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ وہ اپنے ہوش میں ہے۔ میں نے چلا کر کہا۔ "جاہل۔ احمق۔ نشے میں ہنکار رہے ہو —" اور اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا — "آپ کا پیسہ کی نہیں پیا۔ بلکہ حضور کی جیب میں تو اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ پرسوں صبح ہوش میں آنے کے لئے ذرا گھونٹ بھی چڑھا سکتے۔ کیا آپ نے اس عورت سے دس کوپک نہیں مانگے تھے۔ اور وہ گڑگڑا کر" لیکن اتنا کچھ کہہ کر بھی اسے صبر نہ آیا۔ بولا کیا کہنے آپ کی شرافت کے۔ خوب شریف آدمی ہیں۔"

سن لو وارنیکا۔ اب ہماری اتنی بھی عزت نہیں رہ گئی۔ مجھے تو جیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میں تو زندگی سے عاجز آگیا۔ لوگ میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسے میں اچھوت ہوں۔ جیسے میں خانہ بدوش ہوں۔ کیا بدبختی ہے۔ مٹی میں مل گیا۔ ایسا برباد ہوا کہ تلافی نہیں ہو سکتی۔

ایم۔ ڈی۔

۱۳۔ اگست۔

بد قسمتی پہ بد قسمتی چلی آرہی ہے میرے معزز دوست ماکار۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔ تمہارا آخر کیا بنے گا؟ یا میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں؟ آج لوہے سے میرا ہاتھ زخمی ہو گیا ہے۔ لوہا آگ کی طرح جل رہا تھا۔ بس میرے ہاتھ سے پھسل گیا اور مجھے جلا کر رکھ دیا۔ اب میں کیا کروں؟ میں تو کام کرنے کے قابل رہی نہیں فیڈورا تین روز سے بیمار پڑی ہے۔ میں اب سخت پریشان ہوں۔ میں تمہارے لئے چاندی کے تیس کوپک بھیج رہی ہوں۔ بس ہمارے پاس یہی کچھ تھا۔ خدا جانتا ہے کہ میں تمہاری اور زیادہ مدد کرنا چاہتی ہوں۔ اور نہ کر سکنے کا احساس جلانے کے لئے بہت کافی ہے۔ خدا حافظ میرے عزیز دوست! اگر آج تم ملنے چلے آؤ تو مجھے بڑا سکون ملے گا۔

۱۴۔ اگست۔

ماکار۔

تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ کیا تمہارے دل میں خدا کا خوف بالکل نہیں رہا۔ تم مجھے پاگل کر کے چھوڑو گے۔ تمہیں شرم آنی چاہیے کہ اپنے آپ کو یوں تباہ کر رہے ہو۔ ذرا اپنی عزت کا خیال کرو۔ تم ایک باعزت شخص ہو۔ تم ایسی حرکت کر رہے ہو؟ اگر یہ بات دفتر میں پھیل گئی تو کیا ہو گا؟ تم شرم کے مارے مر جاؤ گے۔ اپنے سفید بالوں کا لحاظ کرو۔ خدا سے خوف کھاؤ۔ ویسے ڈرا لگتی ہے کہ اب وہ تمہاری مزید مدد کرے گی اور نہ ہی میں کروں گی اور تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارے کردار سے مجھے کوئی تعلق نہیں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں تمہاری بزدلی کا کتنا عذاب سہہ رہی ہوں۔ میں سبز صبحوں پر نہیں، کیونکہ تمہارے بارے کی نظریں مجھ پر جمی رہتی ہیں اور طرح طرح کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک شرابی کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اور اب لوگ تمہیں کندھوں پر اٹھا کر یہاں چھوڑ جاتے ہیں تو لوگ مجھے سنا سنا کر کہتے ہیں "دیکھو بھئی اس کلرک کو کچھ لوگ جو یہاں تک پہنچا گئے۔" مجھے اتنی شرم آتی ہے کہ چیخ چیخ کر رونے کو جی چاہتا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں یہاں سے بہت دور چلی جاؤں گی۔ میں نوکرانی بن جاؤں گی۔ دھوبن کا کام کروں گی لیکن میں یہاں نہیں ٹھہروں گی۔

میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھ سے ملنے چلے آؤ لیکن تم نہیں آئے میری التجائیں اور میرے آنسوؤں کا تم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور میں اس پہ حیران ہوں کہ تمہارے پاس پیسہ آیا کہاں سے؟ خدارا کچھ اپنا خیال رکھو۔ کیوں اپنے آپ کو برباد کر رہے ہو۔ اور پھر کس وجہ سے؟ میں نے سنا ہے کہ تمہاری مکان مالکن نے تمہیں کمرے میں نہیں گھسنے دیا اور تمہیں رات برامدے میں گزارنی پڑی۔ توبہ توبہ۔ جانتے ہو جب مجھ تک یہ بات پہنچی تو مجھ پہ کیا بیتی گی!

خدا کے لئے ہم سے ملنے کے لئے چلے آؤ۔ تمہیں یہاں خوشی ملے گی۔ ہم اکھٹے مل کر کوئی کتاب پڑھیں گے اور پرانے دنوں کی یاد تازہ کریں گے۔ فیڈورا جی متبرک مقامات پر جا چکی ہے وہ ان کے بارے میں بتائے گی اور میرے عزیز دوست خدا کے لئے اپنے آپ کو یوں تباہ نہ کرو۔ میں صرف تمہارے لئے جی رہی ہوں اور زندہ ہوں۔ صرف تم ہو کہ جس کی وجہ سے میں یہاں رہ رہی ہوں۔ باعزت شخص بنو۔ مصیبتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرو اور یاد رکھو کہ غریب ہونا گناہ نہیں ہے۔ اور پھر نا امید کس لئے ہوتے ہو؟ خدا سب کا نگہبان ہے ہماری مشکلات بھی ختم ہو جائیں گی۔ لیکن آدمی میں برداشت کا مادہ ہونا چاہیے۔ میں تمہارے لئے دس کوپیک بھیج رہی ہوں۔ اس سے تمباکو خرید لو یا جس چیز کی تمہیں اشد ضرورت ہو وہ خرید لو لیکن میری قسم ہے۔ شراب پر مت خرچ کرنا۔ اور ہم سے ملنے ضرور آؤ۔ شاید عادت کے مطابق تمہیں ملتے ہوئے شرم آتی ہو گی لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے اس جھوٹے دکھاوے کو ختم کر دو اور سچے دل سے پچھتاؤ۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور وہی سب کام ٹھیک کر دے گا۔

وی۔ ڈی۔

۱۹۔ اگست

میری پیاری ننھی وارنا

سچ مانو۔ میں واقعی شرمندہ ہوں۔ اور اتنا نادم ہوں کہ اپنا منہ ہاتھوں میں ڈھانپنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن ذرا سوچو تو آخر ایسا بھی کیا بگڑ گیا ہے۔ کیوں نہ کبھی کبھی اپنے دل کو خوش کر لیا جائے۔ میں یہ بھول جاتا ہوں کہ میرے جوتوں کے تلے بالکل بے کار ہو چکے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھیں تو تلے تو گھسنے ہی رہتے ہیں۔ یہ تو بہت ہی بے کار چیز۔ کچھ بھی کہو۔ ہیں تو جوتوں کے تلے ہی۔ اور بوٹ بھی واہیات چیز ہیں۔ اگر یونان کے فاضل مدبران کے بغیر چل سکتے تھے تو ہم ایسے لوگ ان کے لئے اتنا پریشان کیوں ہوں؟ پھر لوگوں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں اور میرا مذاق اڑائیں۔ وہ میری توہین کیوں کرتے ہیں؟ عزیزم۔ کیا تمہیں خط لکھنے کے لئے کوئی اچھا مضمون نہیں سوجھا۔ اور میری طرف سے فیڈورا کو کہہ دو کہ وہ آفت کی پرکالہ ہے بلا کی بے درماں ہے اور پرلے درجے کی بے وقوف عورت ہے۔ رہا سوال میرے سفید بالوں کا تو عزیزم تمہیں غلطی ہوئی ہے۔ جتنا تم سمجھتی ہو میں اتنا بوڑھا بھی نہیں۔ ایمیلا آداب عرض کرتا ہے۔ تم لکھتی ہو کہ تم نے میرے بڑے دکھ برداشت کیے اور تم

روئیں ۔ اور میں یہ کہتا ہوں میں تمہارے لئے برباد ہو گیا۔
اور رو رہا ہوں بھی۔ اب اس کے سوائے میں اور کیا کہوں کہ
خدا تمہیں اچھی صحت عطا کرے اور خوش رکھے۔ رہا میرا
سوال تو میں تندرست ہوں۔

تمہارا دوست
ماکار

میری پیاری اور قابلِ قدر دوست وارواراً
میں اپنے آپ کو گنہگار محسوس کرتا ہوں لیکن اس سے
کیا ہوتا ہے کیونکہ گناہ کرنے سے پہلے بھی میں اپنے آپ کو کم
گناہ گار محسوس نہ کرتا تھا۔ اور اس گناہ کے احساس کے
باوجود میں پھسل گیا۔ سنو۔ میں دل کا برا یا کمینہ آدمی
نہیں ہوں۔ تمہیں چوٹ پہنچانے کے لئے تو کسی جنگلی اور
خونخوار چیتے کا جگر چاہیئے اور میرے سینے میں تو بھیڑ کا دل
ہے اور تم جانتی ہو کہ ظلم کرنا میں نے نہیں سیکھا۔ انجام کار میں
یہی کہہ سکتا ہوں کہ قصور صرف مجھ اکیلے کا نہیں ہے۔ میرے
دل کا، میرے دماغ کا، میرے مزاج کا بھی کوئی قصور نہیں۔
قصور کس کا ہے میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ
تو ایک مبہم چیز ہے اس کا میں نام کیا لوں۔ تم نے پہلے مجھے چاندی کے
تیس کوپیک بھیجے ۔ بعد میں بیس اور ۔ میں بیٹھا اس رقم کو
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا تھا۔ تمہارا ہاتھ جل چکا ہے۔
تم کام کرنے ناقابل ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ جلد ہی فاقے کرو گی
لیکن اتنا کچھ ہونے کے باوجود تم میرے لئے پیسے بھیج رہی ہو
تاکہ میں تمباکو خرید سکوں۔ تو مجھے کیا کرنا چاہیئے تھا کہ ایک
بے آسرا بچی کی خون پسینے کی کمائی کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ
کر کھا لوں؟ میرا دل دھک سے بیٹھ گیا۔ مجھے یوں محسوس
ہوا گویا میں کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ بیکار شخص ہوں۔
اپنے جوتوں کے تلووں سے زیادہ بیکار۔ میری نظروں میں
میری کوئی اہمیت نہ رہی بلکہ اس کے برعکس میں اپنی نظروں میں
ذلیل ہوا۔ جونہی میں اپنی نظروں سے خود گر گیا تو مجھے تسلیم کرنا
پڑا کہ مجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ میں کسی قابل نہیں ہوں۔
اور رنجشوں نے مجھے میرا زوال دکھایا۔ جانتی ہو۔ بدقسمت
تھی۔ میں اپنے آپ کو ذرا تازہ دم کرنے کے لئے باہر نکل گیا
اور پھر بات سے بات بڑھتی گئی۔ قدرت بھی بے حد
اداس تھی۔ موسم سرد تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی
تھی اور راستے میں ایمیلیان مل گیا۔ وہ اپنا سب کچھ گروی رکھ
چکا ہے۔ وارنیکا اس کے پاس جو کچھ بھی تھا سب گروی ہو گا
دو روز سے اس کے پیٹ میں ایک دانہ بھی نہ گیا تھا۔ میں
اپنی ضروریات کے ہاتھوں اتنا تباہ نہ ہوا تھا جتنا رحم کے
جذبے سے مارا گیا۔ بس یہاں سے میرا گناہ شروع ہوتا ہے۔
ہم دونوں زور سے روتے اور ہم دونوں نے تمہیں
بہت یاد کیا۔ ایمیلیان بہت اچھا شخص ہے۔ اس کے سینے میں انسان کا دل
دھڑکتا ہے۔ نازک آدمی ہے۔

میں اپنے بارے میں بھی تو یہی کچھ محسوس کرتا ہوں ـــــ
یہی وجہ ہے کہ میری یہ حالت ہو گئی ہے۔ میں چونکہ یہ باتیں محسوس
کرتا ہوں اسی لئے تو مجھ پہ یہ مصیبتیں آئی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ
مجھ پہ تمہارے کتنے احسانات ہیں۔ اور جب میں نے تمہیں
جان لیا تو میں اپنے آپ کو اور اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ میں نے
اپنے آپ کو اور اچھی طرح جانا تو تمہیں اور زیادہ پیار کیا۔ اور اس
سے پہلے میں اس بھرے جہان میں اتنا تنہا تھا کہ جیا تو کیا محض سویا
تھا۔ ان دنوں لوگ کہا کرتے تھے کہ میرے تو چہرے پہ نحوست برستی
ہے اور ان لوگوں نے مجھ سے اتنی نفرت کی کہ خود مجھے اپنے آپ
سے نفرت ہو گئی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں جاہل ہوں اور مجھے بھی
یقین آ گیا کہ میں جاہل ہوں۔ لیکن جب تم میری زندگی میں آئیں تو
ایسے جان پڑا جیسے میری زندگی میں آسمان سے کوئی فرشتہ اتر
آیا ہو ـــ جیسے میری زندگی میں نور ہی نور ہو ـــ میرے تاریک
وجود کو تم نے روشن کیا۔ تم نے میرے دل، میری روح کو
روشنی عطا کی۔ آخر مجھے اندر سے چین آ گیا اور میں جان گیا
کہ میں باقی لوگوں سے زیادہ برا نہیں ہو سکتا ہے کہ مجھ میں شائستگی
کی کمی ہو ـــ ممکن ہے ذہانت اور خوش اسلوبی کی بھی کمی ہو ـــ
لیکن میرے دل و دماغ میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ میں انسان ہوں۔
لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب میرا وہم تھا۔ میری
نظروں میں پھر میری کوئی عزت نہیں رہی اور نامرادیوں نے

مجھے بالکل بکھیر کر دیا ہے۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے تو میری ایک التجا سن لو۔ میں ان روتی ہوئی آنکھوں سے التجا کرتا ہوں کہ دوبارہ اس بات کا ذکر نہ کرنا۔ میں بہت تھک چکا ہوں۔ میں تھکا ہارا شخص ہوں۔ میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔

تمہارا سچا دوست
ماکار

۲ ستمبر

ماکار —

میں اپنا خط پورا نہ کر پائی تھی۔ کچھ اور لکھنا میرے لئے نہ ممکن ہو گیا تھا۔ میری زندگی میں ایسے کئی لمحات آتے ہیں جب تنہا ہو کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔ میں ان لمحات میں بے اندازہ خوش اور اداس ہو جاتی ہوں اور ایسا عالم میری زندگی میں بار بار آتا ہے۔ یاد کا ایک ایسا پہلو ہے جسے کبھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ پہلو کچھ ایسا ہے جو مجھے بے ساختہ طور پہ اس دنیا سے اتنی دور لے جاتا ہے کہ آس پاس زندہ لوگوں کے لئے میں پہروں بے خبر رہتی ہوں۔ اس وقت نہ اداسی ہوتی ہے نہ خوشی۔ میرے احساس پہ کوئی ایسا اثر نہیں ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے اپنے احساس پہ کسی ایسے ہی تجربے کی پرچھائیں تیرتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ لیکن زیادہ تر بچپن کے واقعات دل و دماغ میں گھوم رہے ہیں۔ لیکن ایک بات ہے کہ جونہی یہ عالم ختم ہوتا ہے تو میں اتنی دل شکستہ ہوتی ہوں جس کا اندازہ نہیں۔ میں کمزور ہو جاتی ہوں۔ میری یہ بے خبری مجھے بری طرح تھکا کے رکھ دیتی ہے اور میں محسوس کر سکتی ہوں کہ میری صحت دن بدن خراب ہو رہی ہے۔

لیکن آج کی صبح بہت ہی پیاری اور دل خوش کرنے والی تھی۔ خزاں کے موسم میں ایسی صبحیں شاذ و نادر ہوتی ہیں۔ میں بہت خوش ہوں اور اپنے آپ کو تندرست محسوس کر رہی ہوں۔ تو — خزاں شروع ہو گئی۔ ہائے۔ دیہات میں تو میں اس موسم پہ جی جان سے قربان ہو جاتی تھی۔ اگرچہ اس وقت میں بچی تھی لیکن مجھ پہ ہر چیز کا کتنا اثر ہوتا تھا۔ پہاڑوں سے پرے ایک جھیل تھی۔ اور وہ جھیل میرے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ میں قریب قریب اسے اب بھی دیکھ رہی ہوں۔ جھیل بہت چوڑی تھی۔ وہ صاف شفاف تھی۔ بالکل شیشے کی طرح۔ اور جب شام چپ چاپ ہوا کرتی تھی تو جھیل کا پانی ہلنے تک کا نام نہ لیتا تھا۔ اور آس پاس کے درخت بھی چپ سادھ لیتے تھے۔ کسی پتے تک کے کھڑکنے کی آواز نہ آتی تھی۔ ہوا ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی تھی۔ اور دور تک گھاس کی ننھی ننھی پتیوں پودے پاؤں آکر بیٹھ جاتی تھی۔ گھاس پھوس کے ڈھیروں سے اچانک روشنی کی کئی کرنیں ابھر آتی تھیں اور مویشی اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ بس ایسے وقت میں سب کی نظروں سے خود کو بچا کر جھیل کے کنارے آ پہنچتی تھی۔ میں تب کچھ بھول جاتی تھی۔ میں پہروں بیٹھی آگ کے شعلوں کے اس عکس کو پانی پہ ناچتے ہوئے دیکھتی رہتی جو جھیل کے کئی کناروں پہ بھڑک اٹھتے تھے۔ یہ آگ مچھیرے سلگایا کرتے تھے۔ اور اوپر ٹھنڈے نیلے آسمان کو دیکھتی رہتی جو اس رنگ میں چاند کے ابھرنے تک ہلکا ہلکا سرخ نظر آیا کرتا تھا۔ اور ہواؤں سرسراتی تھی جیسے کہیں دور گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ کسی پرندے کے پر ہلانے کی آواز، جھاڑیوں کی ذرا سی سرسراہٹ یا کسی مچھلی کی ڈبکی سے ابھرنے والی آواز سناٹے کی جان ہوا کرتی تھی۔ اور پھر دھند ابھرنی شروع ہو جاتی تھی اتنی باریک اور پانی جیسی پتلی دھند اس تاریکی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔ رفتہ رفتہ دور کی تمام چیزیں دھندلی پڑتی چلی مٹ کے رہ جاتی تھیں۔ لیکن ایک ہاتھ پرے تک کی ہر چیز یوں نظر آتی تھیں جیسے کسی بت تراش نے بت تیار کر کے لٹا رکھے ہیں مثلاً کشتیاں، پانی کا کنارہ، پانی میں کہیں کہیں خشکی والی جگہ، یا بھولی بھٹکی لکڑی کا تختہ، یا پیلے پھولوں والی جھاڑیاں جہاں اور جس عالم میں کوئی چیز ہوتی اسی اسی پہلو پڑی رہتی تھی اچانک کوئی پرندہ اوپر سے ٹھنڈے پانی میں کسی مچھلی کے شکار کے لئے غوطہ لگاتا اور پھر پھڑ پھڑاتا ہوا اڑ جاتا۔ میں یہ سب کچھ دیکھتی تھی۔ سب کچھ محسوس کرتی تھی، سب

کچھ سفید تھی اور ایک عجب حیرانی میں ڈوبی رہتی تھی — اس وقت میں بچی تھی۔

ہاں مجھے خزاں سے محبت تھی۔ خاص کر موسم خزاں کے آخری دنوں سے بے پناہ محبت تھی کیونکہ اس وقت فصل کاٹی جا چکی ہوتی تھی — سب کام ختم ہو چکے ہوتے تھے اور دیہاتی لوگ ایک دوسرے کے جھونپڑوں میں اکٹھے ہو کر موسم سرما کے بارے میں بات چیت کیا کرتے اور گایا بجایا کرتے تھے۔ پھر گھرے ہوئے آسمان کے تلے ہر چیز پر اداسی چھا جاتی تھی۔ مردنی سی آجاتی تھی اور ننگے جنگلات کے کناروں پر جھاڑیوں اور پھولوں کی پتیاں بکھری نظر آتی تھیں۔ اور دن بدن وہ کالی پڑتی جاتی تھیں — ان کا رنگ نیلا ہو جاتا تھا۔ خاص کر شام کو دھند چھا جانے کے بعد ننگے درخت دیووں کی طرح منہ پھاڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایسے بھی کئی لمحات آتے تھے جب میں سیر کرنے نکل جایا کرتی تھی اور پھر رات گئے گھر لوٹتی تھی — اور پھر اچانک مجھے احساس ہوتا کہ میں تو بالکل اکیلی تھی۔ بس میں ڈر کے مارے سہمے ہوئے گھر کی طرف بھاگ اٹھتی تھی۔ میں خود بھی پتے کی طرح کانپتی اور مجھے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا کہ کسی بھی درخت کے کھوکھلے پن سے کوئی بھیانک چہرہ ابھر آئے گا۔ اور پھر تیز اور تند ہوا سارے جنگل میں پاگل اور وحشی کی طرح گھومتی گرجتی ماتم کرتی اور باقی کے رہے سہے پتے بھی اکھاڑ کر زمین پر پھینک دیتی۔ پھر اچانک پنچھی اور پکھیرو غول در غول، بے پناہ شور مچاتے ہوئے آسمان کو تاریک کرتے ہوئے بھاگ اڑتے اور میں اکیلی وہاں رہ جاتی — ڈر کے مارے میں سہم جاتی — میں اپنے من ہی من میں ایک آواز سنتی — "بھاگو — میرے بچے — بھاگو — یہاں تو قیامت آئی لو آئی — بھاگو —" اور میں دم رد کے بھاگ کھڑی ہوتی۔ گھر پہنچ کر میں دیکھتی کہ ہر طرف خوشی ہوتی اور ایک خاص چہل پہل رہتا۔ ہم بچوں کو سبزی کاٹنے یا دوسرے کام پہ لگا دیا جاتا۔ اور ادھر گیلی لکڑی تڑاخ پڑاخ کرتی ہوئی انگیٹھی میں جلتی رہتی۔ امی جان ہم سب کو پیار بھری نظروں سے دیکھتیں۔ بوڑھی نرس الائینا ہمیں بھولے بسرے زمانے کی باتیں بتاتی۔ جادوگروں اور چڑیلوں کی کہانیاں سناتی۔ ہم ڈر کے مارے ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ پھر اچانک سب پہ سناٹا چھا جاتا۔ کیا کسی نے دروازے پر تو دستک نہیں دی۔ لیکن کہاں! یہ تو بوڑھی فردولوفنا کے چرخے کی آواز ہوا کرتی۔ پھر کتنے زور کا قہقہہ بلند ہوتا۔ لیکن راتوں کو بھیانک اور ڈراونے سپنوں کے ڈر سے ہی نیند نہ آتی تھی۔ میں آدھی رات گئے جی کڑا کر کے اٹھ کے بیٹھ جاتی اور پھر پو پھٹنے تک جاگتی رہتی تاکہ کہیں کوئی ڈراونا سپنا نہ آجائے۔ لیکن اتنا جاگنے پر بھی جب صبح ہوتی تو میں پھول کی طرح شگفتہ اور تازہ دم ہوتی میں کھڑکیوں سے باہر جھانک کے دیکھتی کہ سردی نے کھیتوں کی ساری ہریالی ختم کر کے رکھ دی ہے اور خزاں کی دھند باقی ماندہ سبزے کو چاٹ رہی ہے۔ جھیل کی سطح پر ہلکی ہلکی برف کی تہ جم جاتی اور چاروں طرف پرندے خوشی سے پھڑپھڑاتے پھرتے۔ لیکن سورج کی گرم گرم کرنوں سے وہ برف کی پتلی سی تہ آسانی سے پگھل جاتی۔ دنیا نکھر اٹھتی۔ خوشبوؤں سے مسرور ہو اٹھتی۔ اور ہم گرد و غبار صاف کرنے میں لگ جاتیں اور ایک بار انگیٹھی سلگنے لگتی — ہمارا کالا کتا — اگرچہ ابھی تک رات سردی کی وجہ سے ٹھٹھر رہا ہوتا لیکن کمرے کی طرف دیکھ دیکھ کر امید بھرے انداز میں اپنی دم ہلاتا۔ اچانک کسی کسان کے ٹھیلے کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی۔ کوئی کسان ایندھن اکٹھا کرنے کے لئے جنگل کی طرف جا رہا ہوتا۔ کیا دن تھے وہ کہ ہم سب خوش تھے اور چین سے رہتے تھے۔

یہ یادیں مجھے رلا دیتی ہیں — ماضی کتنا روشن اور اچھا نظر آنے لگتا ہے اور اس کے مقابلے میں حال — اکتا دینے والا اور مایوس کن — او خدا — جانے یہ پاپ کٹے گا۔ سنو۔ کیا تم اس بات سے واقف ہو کہ مجھے پورا یقین ہے کہ میں اس خزاں میں مر جاؤں گی — مجھے پورا پورا یقین ہے۔ دیکھو تو میں کتنی بیمار ہوں — میں کبھی کبھی اس کے بارے میں سوچتی ہوں — میں یہاں نہیں مرنا چاہتی۔ میں اس مٹی میں دفن نہیں ہونا چاہتی — ممکن ہے پچھلی بہار کی طرح میں دوبارہ بستر پہ پڑ جاؤں۔ تم جانتے

ہو کہ میں پورے طور پہ تو اچھی ہوئی ہی نہ تھی۔ اب بھی میں اپنے آپ کو بہت بیمار محسوس کرتی ہوں۔ فیڈرا آج سارا دن باہر رہی ہے۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔ ہاں ایسے بھی لمحات آتے ہیں جب مجھے تنہائی سے بہت ڈر لگتا ہے اور ہر وقت یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کوئی شخص میرے کمرے میں ہے۔ کوئی مجھ سے بات کر رہا ہے۔ یہ کیفیت اس وقت بہت شدید ہوتی ہے جب میری بے خبری کے دورے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اتنا لمبا خط لکھا ہے۔ جب میں لکھتی ہوں تو ڈر نہیں لگتا۔ اچھا خدا حافظ۔ اب تو مجھے خط ختم ہی کرنا پڑے گا کیونکہ اور کاغذ بھی تو نہیں ہے۔ اور پھر میرے پاس وقت بھی نہیں ہے۔ ہیٹ اور لباس تیار کرنے کے معاوضے میں جو رقم ملی تھی اس میں صرف ایک روبل اور دو کوپک چاندی کا باقی بچ رہا ہے۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ تم نے اپنی مکان مالکن کو چاندی کے دو روبل دے دیئے۔ اب کچھ دنوں کے لئے اس کا منہ بند رہے گا۔

اپنے کپڑوں کو ترتیب وار درست کر کے رکھو۔ اچھا دوست خدا حافظ میں اتنی کمزور ہوں کہ بہت جلد تھک جاتی ہوں۔ ذرا سی کوشش کرنے پر تھک جاتی ہوں۔ ہانپنے لگتی ہوں۔ میں کام کرنے کے قابل تو رہی نہیں کام مل بھی گیا تو کروں گی کیسے؟ بس یہ خیال ہی تمام امیدوں کا خاتمہ کرنے کے لئے بہت ہے۔

دی۔ ڈی

۵ ستمبر

پیاری وارنیکا

آج مجھے کئی باتوں کا تجربہ ہوا۔ پہلے پہل تو شدید سر درد رہا۔ سر درد کا علاج کرنے کے لئے میں نے سیر کرنے کا فیصلہ کیا اور فونتانکا کے کنارے دور تک سیر کی۔ شام بھیگی بھیگی تھی اور اندھیرا چھا گیا تھا۔ ان دنوں پانچ بجے کے بعد اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لیکن بارش نہ ہوئی تھی۔ لیکن دھند بارش سے زیادہ بری تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لوگ بھاگم بھاگ کناروں پر چلے جا رہے تھے۔ سب کے چہروں پر ایک عجیب خوف و ہراس طاری تھا۔ کچھ کسان شراب کے نشے میں دھت ادھر ادھر لڑھکتے پھر رہے تھے۔ ان کی ناکیں پچکی ہوئی تھیں اور سر گنجے تھے۔ لمبے لمبے جوتوں میں فن لینڈ کی عورتیں سیر کر رہی تھیں۔ کاریگر لوگ، مزدور، کلرک اور ہر طبقے کے لوگ وہاں موجود تھے۔ غالباً ہر طبقے کے لوگوں کے اجتماع کا یہی وقت ہوتا ہوگا اور یہ نہر بھی تو دیکھنے کے قابل تھی۔ میں حیران تھا کہ اتنی کشتیاں وہاں سما کیسے گئیں۔ پل پہ عورتیں سیلے ہوئے بیٹھے کیک بیچ رہی تھیں اور گلی سڑی سبزیاں اور پھل فروخت کر رہی تھیں۔ فونتانکا سیر کے لئے قطعاً اچھی جگہ نہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر تو جی اور اچاٹ ہو جاتا ہے۔ چاروں طرف دھند اور آسمان پر کہر چھائی ہوئی تھی۔ تو کتنی اداس شام تھی وہ۔

جب میں گروکوایا تک پہنچا تو بہت اندھیرا ہو چکا تھا۔ لوگوں نے گیس کے لیمپ جلانے شروع کر دیئے تھے۔ میں اس گلی میں مدتوں بعد آیا تھا مجھے یہ گلی بہت اچھی لگی۔ اس میں زندگی کے آثار تھے۔ خوبصورت دکانیں تھیں۔ بڑی چھوٹی سجی دکانیں سجی ہوئی تھیں اور بیش قیمتی اشیا سے چمک دمک رہی تھیں۔ اس سے تم یہ اندازہ بھی لگا سکتی ہو کہ یہ سب اہتمام خوبصورتی کو مدنظر رکھ کر کیا گیا ہو۔ اور یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ ہمارے ماحول میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اتنی خوبصورت اور قیمتی چیزیں اپنی بیویوں کے لئے واقعی خرید لیتے ہیں۔ اس بازار میں دولت کا کوئی حساب نہیں۔ مالدار جگہ ہے۔ اسی گلی میں کئی جرمن باورچی بھی رہتے ہیں مجھے پوری امید ہے کہ وہ لوگ بھی ضرور امیر ہوں گے۔ بے شمار گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ گلی کا پتھر ان سب کا بوجھ کیسے برداشت کر لیتا ہے۔ اور پھر کس قدر شاندار رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کی گاڑیاں ہیں۔ بگھیوں میں کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں جن پر ریشمی پردے لٹک رہے تھے اور گاڑیوں کے ہمراہ چلنے والے پیادوں کے ہاتھ میں نیزے یا تلواریں تھیں۔ جب یہ گاڑیاں میرے قریب سے گذرتی تھیں تو میں دل ہی دل میں سوچتا رہ جاتا تھا کہ یہ شہزادیاں ہیں یا شاہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے ڈانس اور شام کی دعوتوں پہ جانے کا یہی وقت ہوگا۔ جبھی تو اتنی سج دھج کر یہ عورتیں بگھیوں میں سوار ہو کر جا رہی تھیں۔ ایک بات ہے کہ کسی بھی رئیس خاتون یا شہزادی کو قریب سے دیکھ کر بہت لطف آتا ہے آج سے پہلے میں نے کبھی کسی شہزادی یا امیر عورت کو قریب سے نہیں دیکھا تھا مجھے اس وقت تمہارا خیال آ گیا اور میرا رواں رواں رو اٹھا۔ وارنیکا۔

تم اس قدر دکھی کیوں ہو؟ تم کس لحاظ سے باقی دنیا سے بری ہو؟ تم اتنی رحمدل ہو، اتنی اچھی ہو، خوبصورت ہو، پڑھی لکھی ہو۔۔۔؟ تو پھر تم یہ برے دن کیوں دیکھ رہی ہو۔ قدرت کا یہ اصول میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک اچھا انسان اس طرح سسک سسک کر جینے پر کیوں مجبور ہو؟ اور کیا بات ہے کہ دوسرے لوگوں کو بن مانگے خوشیاں مل جاتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیئے کیونکہ اس سے آزاد خیالی میں خلل پڑتا ہے لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کوئی پیدا ہونے سے پہلے ہی قسمت کا دھنی ہوتا ہے اور کوئی اس لئے رگڑ رگڑ کے مرتا ہے کیونکہ وہ بے آسرا پیدا ہوا ہے۔ بھوت پریت کی کہانیوں میں تو ایسا اکثر ہوا ہے کہ بے وقوفوں کو انتہائی خوشی نصیب ہو جاتی لیکن حقیقی زندگی میں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس طرح سوچنا گناہ ہو سکتا ہے لیکن ایسے کئی گناہ وجود رکھتے ہیں جو اس سے پہلے کہ ہمیں علم ہو ہمارے دل میں گھر کر چکے ہوتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں تم بھی ان کنکیوں میں ہوا کے دوش پر کیوں نہیں اڑتی پھرتیں۔ جرنیلوں کے ہمراہ کیوں نہیں ہنس ہنس کے باتیں کر سکتیں۔ میرا مطلب ایسے جرنیل سے نہیں ہے جو سلام کا بھی بھوکا ہو تم ان چیتھڑوں کی بجائے سونے چاندی کے گہنوں میں لدی ہوئی نظر آؤ۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ سب کچھ ہو جائے تو کیا اتنی کمزور اور بیمار رہ سکتی ہو جتنی اب ہو۔ تمہارے نزدیک بیماری بھٹک تک نہیں سکتی۔ تم بھی اپنے محل کی چمکتی ہوئی کھڑکی میں کھڑی ہو کر اپنا سایہ دیکھا کرو اور خوشی سے پھولی نہ سماؤ کہ تم کتنی حسین اور سعادت مند ہو۔ لیکن افسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا اصل روپ کتنا مختلف ہے۔ برے لوگوں نے تمہیں رنج والم کا شکار بنا کے رکھ دیا ہے۔ اور زخم پر نمک گرانے کا کام اس بدمعاش نے کر دیا۔ کیا فقط اس لئے کہ اس کے بدن پر اچھے اچھے کپڑے ہیں اور وہ سونے کے بل پر اینٹھتا پھرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ جیسے چاہے تمہارے ساتھ ویسا سلوک کر سکتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ باقی لوگوں کو اس کی بیہودگی برداشت کرنی چاہیئے۔ لیکن کیا واقعی کرنی چاہیئے؟ آخر کیوں؟ کیونکہ تم ایک غریب اور بے آسرا لڑکی ہو اور تمہارا ایسا کوئی طاقتور دوست نہیں ہے جو تمہاری حفاظت کر سکے؟ میں پوچھتا ہوں وہ کوئی انسان ہے جو ایک یتیم لڑکی کی آبرو کا دشمن ہو جائے۔ وہ اور کچھ ہو سکتا ہے انسان نہیں۔ وہ شیطان کے بھیس میں انسان بنا پھرتا ہے۔ اس سے اچھا تو وہ مستری ہے جو [illegible] تھا۔ اگر وہ ایک آنہ اور کمانے کے لئے سارا دن گلی میں مارا مارا پھرتا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سے اس کی انسانیت میں کیا کمی آ جاتی ہے۔ وہ کسی کا غلام نہیں۔ اپنے من کا مالک ہے محنت کر کے روٹی کھاتا ہے۔ بھکاری نہیں ہے بلکہ لوگوں کے چاقو اور استرے ٹھیک اور تیز کرتا ہے اپنے خون پسینے کی کمائی کھاتا ہے۔ جیسے کہتا ہو ۔۔۔ مزے اڑاؤ ۔۔۔ آخر میں اور کس کام کا ہوں؟ شاید وہ بھی بھکاری ہے۔ شاید حقیقی معنوں میں بھکاری ہے لیکن ایک باعزت بھکاری ہے۔ بھوکا ہو تھکا ہارا ہو لیکن وہ اپنی دھن میں لگا رہتا ہے۔ محنت کرتا ہے۔ سچ مانو۔ ایسے ہزاروں لوگ ہیں جو چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہیں اور بمشکل دو وقت کی روٹی کما سکتے ہیں لیکن یہ لوگ نہ کسی کے سامنے جھکتے ہیں نہ ہاتھ پسارتے ہیں۔ میں بھی اس مستری کی طرح ہوں۔ اس مستری کی طرح ہو بہو تو نہیں لیکن پھر شائستگی اور عزت کے لحاظ سے اس کی طرح ہوں۔ جتنی محنت مجھ سے بن پڑتی ہے میں کر دیتا ہوں۔ بتاؤ اور کیا کروں؟

آج مجھے اس مستری کا خیال یوں آ رہا ہے کہ آج مجھے اپنی غربت کا شدید احساس ہو رہا ہے۔ میں اسے اوزار تیز کرتے ہوئے دیکھنے کے لئے ذرا سا رک گیا۔ اور میں اپنے دل سے کچھ مایوس کن خیالات کو جھٹکنے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا تاکہ شاید طبیعت کسی اور طرف مائل ہو۔ میرے علاوہ کچھ اور لوگ بھی کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ مستری کسی مکان کی کھڑکی کے نیچے اپنا سامان رکھ کر کھڑا رہتا ہے۔ پھر میری نظر ایک دس برس کے بچے پر جا پڑی۔ اگر یہ بچہ پیلا زرد اور کمزور نہ ہوتا تو اچھا حسین لڑکا ہوتا۔ وہ ننگے پاؤں تھا اور محض ایک قمیض پہنے ہوئے تھا۔ وہ ایک جگہ کھڑا منہ کھولے کچھ دیکھ رہا تھا۔ لڑکے آخر لڑکے ہوتے ہیں۔ سامنے ایک جگہ تیلی کا ناچ ہو رہا تھا وہ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ وہ سردی کے مارے ٹھٹھر رہا تھا اس کے گھٹنے آپس میں بج رہے

تھے لیکن وہ وہاں کھڑا اپنی قمیض کا ایک کونہ منہ میں چبا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھٹا ہوا کاغذ بھی تھا کہیں سے کچھ لوگوں نے اس ڈبے میں کچھ پیسے ڈال دیئے جس پر وہ پتلیاں ناچ رہی تھیں۔ پیسوں کی کھنک سے لڑکا چونکا اور اس نے سہمی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ یہ سمجھا کہ یہ پیسے شاید میں نے ڈالے ہیں کیونکہ وہ لپک کر میری طرف آیا اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس نے وہ کاغذ مجھے تھما دیا اور رُندھی ہوئی آواز میں درخواست کی کہ اسے پڑھوں۔ میں نے وہ کاغذ کھولا۔ اس میں وہی کچھ لکھا ہوا تھا جو ہر چہرے سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسی کئی تحریریں میں کئی بار پڑھ چکا ہوں کہ ماں بخار سے مر رہی ہے

اور ننھے ننھے بھائی بھوکوں مر رہے ہیں۔ اے مہربان لوگو! خدا کے نام پر کچھ مدد کر دو۔ اُسے سمجھنے میں زیادہ مشکل نہ پیش آئی لیکن اُسے دینے کے لئے میرے پاس تھا کیا؟ کچھ بھی تو نہیں لیکن مجھے کتنا دُکھ ہوا۔ یہ معصوم عمر۔ یہ سردی اور اتنا کمزور! اور مجھے پورا یقین تھا کہ وہ بھوکا بھی تھا۔ وہ میرے سامنے جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ نہیں میں بخوبی جانتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ ایسی مائیں زندہ ہیں جو اپنے معصوم بچوں کو اس موسم میں ادھ ننگا کر کے بھیج دیتی ہیں۔ شاید وہ حوصلہ ہار بیٹھی ہو اُس کی مدد کرنے والا کوئی نہ ہو اور بیچاری ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہو۔ یہ بھی سچ ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی بیمار ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے مناسب افسروں کے پاس درخواست کرنی چاہیئے۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ان بچوں کو بھیج کر لوگوں کے دلوں میں رحم کا جذبہ اُبھار کر پیسے وصول کرنا چاہتی ہو۔ بچے کو بھیک مانگنے پر مجبور کرتی ہو اور خود بیٹھی کھاتی ہو! لیکن کاغذ کے اس ٹکڑے سے اُسے کتنے روپے مل جائیں گے؟ وہ بھاگ بھاگ کے لوگوں سے التجا کرتا ہے گڑگڑاتا ہے لیکن اس کی بات سننے کی لوگوں کو فرصت ہی نہیں ہے۔ لوگوں کے دل پتھر کے ہو گئے ہیں اُن کی زبان خنجر۔ "بھاگ ـــ بدمعاش کہیں کا ـــ" لڑکے کا چہرہ مُرجھا جاتا تھا اور وہ ٹھٹھرتا ہوا

کسی اور کی طرف لپکتا تھا۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ برف کی طرح سُن تھے اور اس دم توڑ دینے والی ٹھنڈی ہوا میں اُس کے لئے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ جان سکے وہ کھانسنے لگے گا اور اس کے اس کومل سینے میں تپ دق سانپ ناگ کی طرح کنڈلی مار کے دھرنا دے بیٹھے گا۔ پھر کیا ہے۔ پھر موت اُس کے سرہانے آ کھڑی ہو گی کسی غلیظ اور تاریک کونے میں اس کی منتظر رہے گی۔ اس کی پروا کرنے والا کون ہے۔ اُس کی مدد کرنے والا کون ہے؟ اور اُس کی یہ مختصر سی زندگی ختم ہو جائے گی۔ دارنیکا کی زندگیوں کی بس اتنی سی ہی داستان ہے۔ کسی کے منہ سے یہ الفاظ سُن لینا آسان نہیں ہے کہ "عیسیٰ مسیح کے نام پر میری مدد کر دو"

اور پھر یہ کہہ کر گذر جانا تو بہت ہی مشکل ہے کہ "خدا تمہاری مدد کرے گا ـــ" میں مانتا ہوں کہ ایسے بھی کئی واقعات ہو گذرتے ہیں عیسیٰ مسیح کا نام بھی دل پہ خاص اثر نہیں کرتا کیونکہ کچھ بھکاری یہ فقرہ کہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اُن کی آواز دل پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ ایسے لوگوں کو کچھ نہ دینا کوئی بُری بات نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ مصیبتوں کے پالے ہوئے ہوتے ہیں۔ عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح جی ہی لیں گے۔ لیکن جب آج اُس بچے نے جنگلے کے قریب کھڑے ہو کر کہا تھا ـــ "عیسیٰ مسیح کے نام پر ایک پیسہ دے دو صاحب ـــ" تو میرے دل پہ برچھیاں چل گئیں۔ اُس کی آواز اس قدر بیٹھی ہوئی تھی کہ میرا دل بیٹھ گیا۔ میں کیا دے سکتا تھا اُسے! میرے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ لیکن میں سوچ نہیں سکتا کہ جب ایک غریب آدمی اپنی بدقسمتی کے ہاتھوں دُکھی ہو کے بھیک مانگتا ہے تو امیر لوگ اُسے بلائے جان کیوں کہتے ہیں۔ اُسے دھتکار کیوں دیتے ہیں؟ کیا غریبوں کی ماتمی آواز سے اُن کی راتوں کی نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔

میں نے یہ واقعہ اس قدر تفصیل میں اس لئے لکھا ہے کہ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا اور اپنی طرزِ تحریر کا نمونہ پیش کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے تم دیکھ رہی ہو کہ گذشتہ کچھ عرصے سے میری طرزِ تحریر سنور رہی ہے۔ اب تو میں اتنا

بے دل ہو چکا ہوں کہ میں اپنے آپ کو تسلی دیتا رہتا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس تسلی کا فائدہ کچھ بھی نہیں ہوگا تاہم کبھی کبھی اپنے آپ کو تسلی دینا اپنے آپ سے انصاف کرنے کے مترادف ہے۔ اور خاص کر اس شخص کے لئے تو بہت ضروری ہے جو جگہ جگہ ذلیل ہوتا ہو اور اپنا وقار کھو بیٹھا ہو۔ موازنے کے طور پہ کہہ رہا ہوں کہ میں اسی طرح پس چکا ہوں جس طرح وہ لڑکا۔

دارنیکا۔ کبھی کبھی جب میں دفتر جلدی چلا جاتا ہوں تو مجھے ایک نظر شہر کو دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مکانوں کی چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں اور ایسے بے شمار نظارے مجھے اپنے چھوٹے پن کا احساس دلاتے ہیں۔ لیکن آؤ ذرا زندگی کو اور قریب سے دیکھیں۔ ذرا دھیان سے سوچو کہ ان بڑے بڑے مکانوں کے اندر کیا ہوتا ہے، یہ دیکھو اور پھر سوچو کیا فقط اپنی غربت کی بنا پر اپنی نظروں میں گر جانا ٹھیک ہے؟ میرا مطلب کسی شخص سے نہیں ہے۔ ویسے ہی بات کر رہا ہوں۔ میرا کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ان عالیشان عمارتوں کو دیکھ کر اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم چاہے یہ سمجھو کہ میں جھک مار رہا ہوں یا میں نے یہ سب کچھ کسی کتاب سے نقل کیا ہے یا میرا مزاج برہم ہے لیکن ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔

میں جب گھر آیا تو بہت اداس تھا۔ میں نے انگیٹھی پر کیتلی رکھ دی تاکہ ایک پیالہ چاء پی سکوں — اس وقت میرا پڑوسی گرد شکوف میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے صبح بھی محسوس کیا تھا کہ وہ باقی لوگوں سے نظر بچا کر مجھے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ گرد شکوف کے بارے میں تمھیں اتنا ضرور بتا دوں کہ اس کی زندگی مجھ سے بھی بدتر گذر رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ اس کی بیوی ہے۔ بچے ہیں۔ اگر میں گرد شکوف ہوتا تو نہ جانے کیا کر گذرتا۔ گرد شکوف کمرے میں آیا۔ ذرا سا جھکا اور پھر چپ چاپ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ میں نے اسے کرسی پیش کی۔ بس میرے پاس یہی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی ہے۔ پھر میں نے اسے چاء پیش کی۔ وہ بہت دیر بیٹھا معافی ہی مانگتا رہا اور چاء پینے سے انکار کرتا رہا لیکن آخر اس نے چاء کا پیالہ قبول کر ہی لیا۔ لیکن اس نے چینی لینے سے انکار کر دیا بلکہ بہت عاجزی سے کہتا رہا نہیں چینی نہیں — بہت بہت شکریہ — جب میں نے بہت زور ڈالا تو اس نے چٹکی بھر چینی لے لی اور مجھے بار بار کہتا جاتا تھا کہ چاء بہت ہی اچھی اور میٹھی ہے۔ افسوس انسان کو کتنا عاجز بنا دیتا ہے۔ میں نے پوچھا۔

"کہو زندگی کیسی گذر رہی ہے —" اور اب اس نے کہنا شروع کیا۔ "ماکار — تم خدا کے نام پر کچھ مدد نہیں کر سکتے — ایک بدقسمت کنبے کی ذرا سی امداد کر دو۔ شاید تمھیں علم ہو کہ پچھلے دو روز سے میری بیوی اور میرے بچوں نے کچھ نہیں کھایا — کچھ کھانے کے لئے ہے ہی نہیں — میں باپ ہوں اور بے بسی سے ان کا منہ تکتا رہتا ہوں۔"

میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ اس نے روک دیا اور بولا —

میں یہاں کے ہر کرایہ دار سے ڈرتا ہوں — اتنا ڈرتا نہیں جتنا شرم کے مارے انھیں منہ نہیں دکھا سکتا۔ وہ لوگ ہم سے کتنے مختلف ہیں۔ کتنے علیحدہ ہیں۔ میرے دوست میں تمھیں کوئی تکلیف نہ دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم پہلے ہی بڑی مصیبت میں ہو۔ تم میری مدد نہیں کر سکتے لیکن خدا کے لئے کچھ ادھار دے دو۔ مجھے کچھ نہیں پتا کہ تمہارے پاس آنے کی مجھے ہمت کیسے ہوئی لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ تمہارے سینے میں بہت ہی نازک دل ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی میری طرح ضرورت مند ہو اور جانتا ہوں کہ میری مصیبت کا حال سن کر تم مجھ سے زیادہ دکھی ہو گے۔ اور وہ دخل اندازی کے لئے پھر معافی مانگنے لگا۔

اس کی مدد کر کے مجھے بہت خوشی ہوتی لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ پھر گڑگڑایا — "میرے دوست ماکار۔ کچھ رحم کرو۔ میں زیادہ نہیں مانگ رہا لیکن ذرا میری حالت پر غور کرو (اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا) میری بیوی اور میرے بچے — تم جانتے ہو — وہ بھوکوں مر رہے ہیں۔ تم کیا دس کوپکس بھی نہیں دے سکتے؟" یہ فقرہ سن کر شرم سے میری گردن جھک گئی۔ اس کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ میرے پاس کل سرمایہ بیس کوپکس تھے۔ اور مجھے کچھ بہت ضروری چیزیں خریدنا تھیں۔

"نہیں ـــ صاف صاف کہو ـــ پیسہ پاس کچھ ہے نہیں ـــ" لیکن بابا ـــ جو کچھ بھی کہو ـــ جو جی میں آئے کرو۔ اور دل کرے تو دس کوپکس دے دو ـــ"

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اپنے جیب کو پکس نکالے اور اسے دے دیئے۔ اور بیس کو پکس بھی جانتی ہو خیرات دیئے گئے۔ کیا خوبی ہے۔ ہم نے بات چیت شروع کردی۔ آخر میں پوچھ ہی بیٹھا کہ جب اس کی یہ حالت ہے تو اس نے پانچ روبل پہ کمرہ کیسے کرائے پہ لے رکھا ہے۔ وہ کہ آئے آئے ہوئے چھ مہینے ہوگئے ہیں اور تین مہینوں کا کرایہ اس نے پیشگی ادا کر دیا تھا۔ لیکن اب اس صورت حالات کے پیش نظر اسے کچھ پتا نہیں کہ کیا کرے۔ اسے امید تھی کہ اتنے لمبے عرصے میں اس کے مقدمے کا کوئی نہ کوئی فیصلہ ہوجائے گا۔ اس نے ایک سوداگر پہ مقدمہ چلا رکھا ہے کہ خزانے میں اس نے گڑبڑ کی تھی۔ جب مقدمے کی پیروی کی گئی تو بیچارہ گروشکوف بھی لپیٹ میں آگیا۔ گروشکوف کا صرف اتنا قصور ہے کہ حساب میں غلطی اس کی نظروں سے بچ گئی لہذا اس پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ اس نے ملک کے مفاد کو دھکا پہنچایا ہے۔ یہ مقدمہ کئی برسوں سے چل رہا ہے اور ابھی تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا اور بیچارے گروشکوف کو آئے دن نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ گروشکوف کہتا ہے ـــ "میں بالکل بے گناہ اور معصوم ہوں ـــ میری جس قدر توہین ہوئی ہے۔ مجھ پہ جعل سازی کا جو الزام لگا ہے سب غلط ہے میں بالکل معصوم ہوں ـــ" لیکن اس مقدمے سے اس کا اعتبار تو اٹھ گیا۔ اسے نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ اور اگرچہ اس کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ ہوسکا تاہم بات صاف نہ ہوئی۔ اگر وہ باعزت طور پہ الزام سے بری کر دیا جاتا ہے تو اس سوداگر کو اسے خاصی رقم ادا کرنی پڑتی۔ مجھے تو گروشکوف کی بات پہ اعتبار ہے لیکن کچہری کے ججوں کو نہیں ہے۔ یہ اتنا الجھا ہوا مقدمہ ہے۔ اس قدر پیچیدہ مقدمہ ہے کہ اس کے فیصلے کے لئے سو سال درکار ہیں۔ وکیل اور جج مر مر کے ایک گتھی سلجھاتے ہیں تو وہ کمبخت سوداگر ایک اور پہلو پیدا کر دیتا ہے۔ مجھے گروشکوف سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ اس بیچارے کو کوئی کام نہیں ملتا۔ اس کا اعتبار لوگوں کی نظروں سے اس طرح اٹھ گیا ہے کہ کوئی اسے ملازمت نہیں دیتا۔ اس کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ تو بیچ کے کھا چکا۔ مقدمہ ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا اور اسی مقدمے کے دوران میں اس کے گھر ایک لڑکا بھی پیدا ہوا کتنے غلط وقت یہ پیدا ہوا۔ کیونکہ اس پہ پیسہ خرچ آتا ہے۔ جب بچہ بیمار پڑ گیا تو پھر پیسہ خرچ کرنا پڑا۔ اور جب وہ مر گیا اور پیسہ خرچ ہوگیا۔ اس کی بیوی بیمار ہے ـــ اور اسے بھی ایک پرانا روگ لگا ہوا ہے۔ بہت دکھ اٹھایا ہے اس نے ـــ لیکن اسے امید ہے کہ کچھ ہی دنوں میں کوئی موافق فیصلہ ہوجائے گا وہ کہتا ہے کہ اب اس میں زیادہ دیر نہیں لگ سکتی۔ وارنیکا مجھے اس کے ساتھ پوری پوری ہمدردی ہے۔ مجھ سے جتنا بن پڑا میں نے اسے تسلی دی۔ اس کا بھی کوئی نہیں۔ اسے حوصلہ دیئے دیا۔ کوئی نہیں۔ اچھا ـــ خدا حافظ ـــ خدا تمہیں تندرست رکھے۔ تمہارا خیال ہی دکھتی روح کے لئے مرہم کا کام کرتا ہے۔ اور تمہارے لئے دکھ اٹھانے میں ایک خاص چین ہے۔

تمہارا سچا دوست
ماکار۔

۹ ستمبر۔

وارووارا۔

مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا۔ غضب ہوگیا ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے اور مجھے ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہورہی ہے۔ تم سوچ تک نہیں سکتیں کہ میں کیا بتانے والا ہوں۔ ہمیں ایسی بات کی امید تک نہ تھی۔ لیکن ہاں۔ مجھے کچھ ہلکا سا علم تھا۔ میرا دل کہتا ہے یہ ہوجائے گا۔ کچھ اسی نوعیت کا خواب بھی میں نے پچھلی رات دیکھا تھا۔

ہاں تو قصہ یوں ہے ـــ لیکن ایک بات ہے کہ میں اپنی تحریر کی نوک پلک سنوارے بغیر سب کچھ لکھوں گا۔ جیسے میرے من میں خیال آتے جائیں گے لکھتا جاؤں گا۔ آج صبح میں حسب معمول اپنے دفتر پہنچا اور جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ کر کام میں محو ہوگیا۔ ہاں میں کچھ اور لکھنے سے پہلے یہ ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ کل جب آئیونووچ نے آکر کہا تھا کہ اس کاغذ کی دوسری نقل فوراً

تیار کردو تو میں یہی کام کر رہا تھا۔ آیئو لو وچ نے کہا تھا۔ "اسے خوشخط بنا کر اور صاف لفظوں میں لکھنا لیکن جتنی جلدی ہو سکے اتنی جلد نقل تیار کردو حضورِ انور اس کاغذ پر آج ہی دستخط کریں گے۔" اور اب تم سے کیا چھپانا ہے کل میں اپنے آپ میں نہ تھا۔ میں بہت اداس تھا اور شدید تنہائی محسوس کر رہا تھا اور پھر میں تمہارے بارے میں بہت فکرمند ہو رہا تھا۔ اب اسے شیطان کی کرتوت سمجھو یا نہ سمجھو کہ قسمت میں ہی ایسا لکھا تھا بات یوں ہوئی کہ نقل اتارتے وقت میں ایک سطر بالکل چھوڑ گیا۔ اور اب خدا ہی جانتا ہے کہ اس سطر سے اس مضمون کا سارا مطلب کیسے ختم ہو گیا۔ مجھے تو یہ بھی شبہ ہے کہ اس میں کوئی مطلب تھا یا نہیں ہر حال دفتر والے کل تو حضورِ انور سے دستخط نہ کرا سکے انھوں نے آج اس پر دستخط کئے۔ میں جب دفتر آیا تو مجھے ایسی کسی بات کا سان گمان نہ تھا اور میں بڑی تسکین سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں تو فطرتاً ہی شرمیلا ہوں لہذا آج بھی میں بے وجہ جھینپ رہا تھا اور کسی کی نظروں سے نظریں نہ ملا رہا تھا۔ وہ ظالم آیئو لو وچ بولا۔ "ماکار تم ...... کی طرح کیوں بیٹھے جھینپ رہے ہو۔"

اور اس نے یہ فقرہ کہہ کر اس طرح منہ بنایا کہ سارا دفتر ٹھٹھا مار کے ہنس پڑا۔ لوگوں کی ہنسی تھی کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اس طرح بیٹھ گیا گویا میں نے اُس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ میں اسی طرح لوگوں سے اپنا پیچھا چھڑاتا ہوں اچانک سامنے کے کمرے سے کچھ حرکت ہوئی اور پھر میرا نام لے کر پکارا گیا مجھے یقین نہ آیا لیکن نہیں۔ میرا ہی نام پکارا جا رہا تھا۔ دیوشکن۔ میرے دل کی دھڑکن بند ہو گئی مجھے نہ جانے کیا ہو گیا لیکن میں کسی انجانے خوف کے تحت سمٹ کے گھڑوی سا بن گیا۔ میں کرسی کے ساتھ چپک گیا۔ حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ آواز قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔ آخر بلانے والا میرے قریب آ پہنچا۔

"دیوشکن — کون ہے دیوشکن —"

میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا —

"ماکار — تمھیں حضورِ انور نے طلب کیا ہے۔ تم نے وہ دستاویز بالکل خراب کر کے رکھ دی ہے۔"

اُس نے تو بس اتنا ہی کہا تھا۔ لیکن اتنا ہی بہت تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ میں کرسی سے کیسے اُٹھا اور کیسے چل سکا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میرے دماغ میں کیا خیالات چکر کاٹ رہے تھے۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ ہم دونوں نے ایک کمرہ پار کیا پھر دوسرا۔ پھر ایک اور — اور آخرکار حضورِ انور کا کمرہ آ ہی گیا۔ میں وہاں مجرموں کی طرح کھڑا تھا اور سامنے حضورِ انور اور باقی افسران حضرات بیٹھے تھے۔ مجھے پورا اندیشہ ہے کہ میری جو کیفیت تھی میں حضورِ انور کے سامنے جھکنا بھی بھول گیا۔ میرے ہونٹ کے کونے پھڑک رہے تھے اور میں سر سے لے کر پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ کمرے کے ایک طرف شیشہ لٹک رہا تھا۔ میں نے اس میں ایک نظر اپنے آپ کو دیکھا — توبہ — کیا حلیہ تھا — کیا چہرہ کیا کپڑے سب پہ لعنت برس رہی تھی۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ آج تک میں نے دفتر میں ایسی کوئی بات نہ کی تھی جس سے کوئی میرا واقف بن سکے۔ حضورِ انور کو کیا علم کہ میں دفتر میں ہوں بھی یا نہیں۔ ممکن ہے کہ انھوں نے کبھی کسی سے میرا نام ضرور سنا ہو لیکن انھوں نے مجھے جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی — وہ غصّے کے عالم میں بولے —

"آخر اس کا کیا مطلب ہے؟ تم احتیاط سے کام کیوں نہیں کرتے؟ یہ کاغذ اتنا ضروری تھا اور تم نے اس کا ناس پیٹ دیا۔"

یہ کہنے کے بعد ہز ایکسیلینسی آیئو لو وچ سے مخاطب ہوئے۔ میں یہی کچھ الفاظ سمجھ پایا — "ایسی غفلت — اتنی لاپرواہی۔ کام بڑھا۔ وقت ضائع ہوا —"

میں نے معافی مانگنے کے لئے کئی بار منہ کھولا لیکن منہ سے کوئی آواز نہ نکلی — میرا بس چلتا تو وہاں سے بھاگ نکلتا لیکن پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ اور پھر مجھ سے وہاں کھڑے کھڑے وہ حرکت سرزد ہو گئی کہ — لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے۔ میرے کوٹ پہ ایک ہی بٹن تھا اور وہ بھی کچے دھاگے سے لٹک رہا تھا — وہ اچانک ٹوٹ کے گر گیا۔ اور — ٹن ٹن کرتا ہوا سیدھا حضورِ انور کے قدموں کے پاس جا کر رُکا۔ بٹن ٹوٹنے سے پہلے کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ اُس سناٹے میں یہ بٹن ٹوٹ گیا۔ یعنی معافی مانگنے کی جگہ یہ حرکت ہو گئی۔ حضورِ انور نے آنکھ اُٹھا کر

مجھے دیکھا۔ میری صورت اور میرے لباس کا جائزہ لیا۔ مجھے یاد آگیا کہ میں نے شیشے میں اپنے آپ کو کیسا پایا تھا۔ میں نے [illegible] دیکھا۔ ایک بار نوٹ کو تھام بھی لیا لیکن وہ میرے ہاتھ سے پھر پھسل گیا — دیکھ رہی ہو۔ میں نے کس مشکل کا سامنا کیا؟ آخر کار میں نے نوٹ اُٹھا ہی لیا اور مٹ کر کھڑا ہو گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں سیدھا کھڑا ہوتا اور میرے ہاتھ نیچے ہوتے۔ لیکن کہاں مجھے بڑی مشکل سے سنبھالنا تھا کہ پھر کوٹ کو گرنے سے روکنا تھا۔ اور نہ جانے کیوں میرے چہرے پر کھسیانی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ہاں۔ میں مسکرا رہا تھا۔ برابر مسکرائے جا رہا تھا۔ حضورِ انور نے اپنی نظریں میرے چہرے سے ہٹا لیں — ایک نظر پھر مجھے دیکھا اور آئیوو وچ سے مخاطب ہوئے۔

"یہ کیا بات ہے — ایک نظر اس آدمی کو دیکھو تو —"

میرے اللہ کیا عزت پائی میں نے — "ایک نظر اس آدمی کو دیکھو تو —" آئیوو وچ بولا — "بہت پرانا ملازم ہے سرکار — لیکن اس کے خلاف ابھی تک ایک بھی شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ چال چلن — قابلِ تعریف ہے — اور تنخواہ کا حساب پائی پائی تک درست ہے —"

حضورِ انور نے فرمایا۔ "تو پھر اس کی مدد کی جائے۔ اسے پیشگی کچھ دے دیا جائے۔"

"حضور۔ حساب کے مطابق جتنی پیشگی رقم یہ لے سکتا تھا لے چکا ہے — حالات نے اسے پیشگی رقم لینے پر مجبور کر دیا۔ بہت اچھے کردار کا مالک ہے — اس کے خلاف ایک بھی شکایت نہیں ہے ایک بھی نہیں — کسی کو اس کے خلاف کچھ نہیں کہنا —"

میرا حال یہ تھا جیسے میں جہنم کی آگ میں جل رہا ہوں۔ حضورِ انور مجھے سُنانے کی غرض سے بولے — "تو ٹھیک ہے۔ خیر — جتنی جلدی ہو سکے اس دستاویز کی دوسری نقل تیار کی جائے — اور دیوشکن — ادھر آؤ۔ اب کے بار بغیر غلطی کئے اس کی دوسری نقل فوراً تیار کر دو اور سُنو —" یہ کہہ کر حضورِ انور نے سب لوگوں کو باہر بھیج دیا۔

اور صرف ہم دونوں وہاں رہ گئے۔ انھوں نے جلدی سے اپنی میز کا ایک خانہ کھولا۔ سو روبل کا ایک نوٹ نکالا اور میرے ہاتھوں میں تھما دیا — "یہ لو — اسے قرض سمجھ کر لے لو۔ میں تمہاری کچھ مدد کرنے کی کوشش کروں گا —"

مجھے کچھ پتا نہ چل رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے — میں نے ہوش میں ہوتا تو اُن کے ہاتھ چوم لیتا — اچانک اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور پھر۔ اور پھر — میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھ رہا وارنیکا — پھر انھوں نے مجھ ناچیز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور زور سے ہاتھ ملایا جیسے میں اُن کے برابر کا آدمی ہوں اور کہنے لگے — "اچھا — اب تم جاؤ — مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں تمہاری اور زیادہ مدد نہیں کر سکتا — لیکن اب دوبارہ غلطی نہ کرنا جو کچھ ہو گیا۔ اس کا الزام ہم دونوں اپنے سر لے لیں گے۔"

وارنیکا — میں تم اور چھوڑ در اسے یہی چاہتا ہوں کہ ہر روز حضورِ انور کے حق میں دعائیں مانگو — اگر میرے بچے ہوتے تو میں اُن سے بھی دعائیں مانگنے کو کہتا — میں خود بھی دعائیں مانگ رہا ہوں۔ میں نے بہت بُرے دن دیکھے ہیں۔ مجھے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہیں جب میں تمہارے لئے کچھ نہ کر سکا تھا۔ میں قسم اُٹھا کے کہتا ہوں کہ یہ سو روبل اتنے عزیز نہیں جتنی یہ حقیقت کہ حضورِ انور نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ایک شرابی اور نچلے درجے کے آدمی سے ہاتھ ملایا۔ انھوں نے مجھے دوبارہ انسان بنا دیا ہے۔ انھوں نے عمر بھر کے لئے مجھے جینے کی ہمت عطا کی ہے اور میری زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا ہے۔ اور مجھے کامل یقین ہے کہ میں لاکھ گنہگار سہی لیکن حضورِ انور کے حق میں جو دعائیں میں مانگ رہا ہوں وہ ضرور قبول ہوں گی۔

وارنیکا — مجھے اپنی سُدھ بُدھ بھول گئی ہے۔ میں خوشی کے مارے پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ میرا دل بلیوں اُچھل رہا ہے۔ میں ۴۵ روبل تمھیں بھیج رہا ہوں۔ بیس روبل میں اپنی مکان مالکن کو دے دوں گا۔ پھر میرے پاس باقی ۳۵ روبل رہ جائیں گے۔ بیس ایک کے قریب تو میرے کپڑوں پر

خرچ آ جائیں گے۔ اور باقی ضروریات پوری کرنے کے لئے پندرہ رُوبل پھر بچ رہیں گے۔ آج صبح کے واقعے نے مجھے بالکل پاگل کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے مجھے لیٹ جانا چاہیئے۔ مجھے اس وقت بہت چین محسوس ہو رہا ہے۔ ہاں میری رُوح ضرور دُکھی ہے اور میں محسوس کر سکتا ہوں کہ میرے اندر ہی اندر کوئی چیز کانپ رہی ہے۔ میں تم سے پھر کبھی ملنے آؤں گا۔ اس وقت میں کسی کام کے قابل نہیں ہوں۔ میری بچی۔ خدا سب کی سُنتا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ وہ سب پہ نظر رکھتا ہے۔

ماکار۔

۱۵ ستمبر

میرے پیارے ماکار

میں یہ واقعہ سُنکر بہت خوش ہوں۔ اور تمہارے حضورِ انور کی فیاضی کی داد دیتی ہوں۔ اب کم از کم تمھیں پریشانیوں سے تو نجات ملے گی۔ لیکن خدا کے لئے اس رقم کو ضائع نہ کر دینا۔ آرام سے رہو۔ شان میں نہ آجانا اور ہو سکے تو اب ایک ایک پائی کر کے کچھ پیسہ جمع کرنا شروع کر دو تاکہ دوبارہ مصیبت کے دن آئیں تو تم کچھ مقابلہ کر سکو۔ اور خدا را ہمارے بارے میں فکر مت کیا کرو۔ اور فیڈورا اپنا گذارہ کر لیں گی۔ ماکار۔ تم نے ہمیں اتنے رُوبل کیوں بھیج دیئے؟ واقعی ہمیں اتنی رقم کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے ہمیں اُسی سے اطمینان ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ گھر تبدیل کرنے کے لئے ہمیں پیسہ درکار تھا لیکن فیڈورا کو توقع ہے کہ اُسے اپنا ایک پُرانا قرضہ واپس مل جائے گا۔ میں ضروری کام پورا کرنے کی غرض سے بیس رُوبل اپنے پاس رکھ رہی ہوں اور باقی تمھیں واپس بھیج رہی ہوں۔ پیسے کو سوچ سمجھ کر خرچ کرنا بلکہ اسے محفوظ رکھو۔ خداحافظ۔ خدا کرے کہ تم پریشانیوں سے نجات پاؤ اور سُکھ کی زندگی بسر کرو۔ اگر میں تھکن محسوس نہ کر رہی ہوتی تو اور زیادہ لکھتی۔ کل سارا دن تو میں بستر ہی پہ پڑی رہی۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ تم نے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔

وی۔ ڈی۔

میری پیاری واروارا!

دیکھو اب تو جانے کا نام نہ لو۔ اب تو میں اتنا خوش ہوں اور چین سے ہوں۔ اب یہاں سے نہ جاؤ۔ فیڈورا کے کہنے میں نہ آجاؤ۔ تم جو کہوگی میں کر دوں گا۔ میں اچھی طرح رہوں گا۔ کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔ پہلے کی طرح ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کو خوشیوں بھرے خط لکھیں گے۔ اور اگر مصیبتیں آئیں تو مصیبتوں کا حال لکھیں گے۔ ہم چین اور سُکھ سے رہیں گے۔ ہم پھر ادب کا مطالعہ شروع کر دیں گے۔ میری زندگی ہر لحاظ سے بدل چکی ہے۔ مکان مالکن دوست بن گئی ہے۔ تھریسا اب زیادہ سمجھدار ہوگئی ہے اور فالڈونی بھی کہنا مانتا ہے۔ میں نے راتا زیف سے بھی صلح کر لی ہے۔ میں اتنا خوش تھا کہ میں خود اُس سے ملنے چلا گیا۔ وہ آدمی دل کا اچھا ہے۔ اور لوگوں نے اُس کے بارے میں جو بکواس کی ہے وہ سب غلط ہے۔ اُس نے کبھی نہیں چاہا کہ ہمیں اپنی کسی کہانی کا کردار بنائے۔ اُس نے یہ سب باتیں خود مجھے بتائیں۔ اور اُس نے مجھے اپنی کچھ نئی کہانیاں پڑھ کر سُنائیں۔ وہ کہہ رہا تھا جہاں تک تمھیں یہ شکایت ہے کہ تمہارا نام مسٹر لولیس کیوں ڈالا گیا تو یہ لفظ کوئی بُرا نہیں ہے اور نہ یہ گالی ہے۔ یہ لفظ کسی بدیشی زبان کا ہے اور اس کا مطلب ہے سخت آدمی۔ پاکستانی زبان میں یوں بھی کہہ لو۔ کیا تیز زبان آدمی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مطلب نہیں ہے۔ سو یہ تو ایک بے ضرر مذاق تھا۔ میں پھر ان پڑھ آدمی بُرا مان گیا۔ لیکن میں نے معافی مانگ لی ہے۔ آج تو موسم بھی بہت اچھا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہلکی سی بوندا باندی بھی ہوئی اور صبح کچھ دھند بھی تھی لیکن اس سے موسم اور نکھر گیا ہے۔ میں نے بہت عمدہ جوتے خریدے ہیں۔ آج صبح میں سیر کرنے کے لئے نیوسکی تک گیا تھا۔ وہاں ذرا دیر کے لئے میں "بی" اخبار پڑھنے کے لئے بھی رُکا تھا۔ میں تمھیں خاص بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ آج صبح حضورِ انور کے متعلق آئیوَ لو دیچ اور ایمیلئچ سے میری بات چیت ہوئی تھی۔ پتا چلا ہے کہ اُنھوں نے صرف مجھی پہ کرم نہیں کیا۔ حضورِ انور اپنی دریا دلی کے لئے مشہور ہیں۔ ساری دنیا اُن کی تعریف کرتی ہے اور کئی لوگ آنکھوں میں آنسو بھر کر اُن کے احسانات کا ذکر کرتے ہیں۔ سُنا ہے

کہ بہت پہلے انھوں نے ایک یتیم بچی کو گود لے لیا تھا اور جب وہ جوان ہوگئی تو ایک افسر کے ساتھ اُس کی شادی کر دی تھی یہ واقعہ بھی عام ہے کہ ایک بار انھوں نے ایک بوڑھے کے لڑکے کو ملازمت بھی دلائی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اُن کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ میں نے یہ باتیں سُننے کے بعد اپنا قصّہ سُنانا بھی اپنا فرض سمجھا۔ میں نے کوئی بات نہیں چھپائی۔ مجھے شرم تو بہت آئی لیکن میں نے سب کچھ کہہ سُنایا۔ میں چاہتا ہوں کہ ساری دُنیا حضورِ انور کے گُن گائے۔ میں نے بڑے فخر سے سارا قصّہ سُنایا۔ میں نے انھیں اور بھی بہت کچھ بتایا لیکن تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا) میں نے ان لوگوں کو مکان مالکن، ماتا ریمٹ، اپنے جوتوں اور مارکوٹ کے بارے میں سب کچھ کہہ سُنایا۔ کچھ لوگ ہنسے بھی۔ ممکن ہے میرے چہرے یا میرے جوتوں میں کوئی ایسی بات ہو کہ انھیں ہنسی آگئی۔ ارے ہاں ضرور میرے جوتوں پر انھیں ہنسی آئی ہوگی۔ لیکن وہ میری ہنسی نہیں اُڑا سکتے تھے۔ بھلا وہ لوگ حضورِ انور کی فیاضی کا مذاق کیسے اُڑا سکتے تھے۔ کیوں وارنیکا؟ جانِ من مجھے ابھی تک تسلّی نہیں ہوئی کیونکہ ان واقعات کی مجھے توقع نہ تھی۔ یہ بتاؤ کیا تمہارے پاس ایندھن تو ضرورت کے مطابق ہے نا! اپنی صحت کا خیال رکھو کہیں سردی نہ کھا بیٹھنا۔ تمہاری اُداسی بھری باتیں مجھے بہت دُکھ پہنچاتی ہیں۔ میں خدا سے ہمیشہ تمہارے لئے دُعا مانگتا رہتا ہوں۔ تمہارے پاس کوئی گرم کپڑا یا سویٹر بھی ہے یا نہیں؟ اگر کسی چیز کی کمی ہو تو مجھے فوراً بتا دو۔ اس بوڑھے آدمی پہ بڑا احسان کرو گی۔ بُرے دن گزر گئے اب اچھا وقت آگیا ہے۔

بہت دُکھ اُٹھائے ہم نے۔ لیکن اب وہ دن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے ہیں اور جوں جوں وقت گزرتا جائے گا ہم اُن دنوں کو بھی آہیں بھر بھر کے یاد کیا کریں گے۔ مجھے اپنی جوانی کے دن ابھی تک یاد آتے ہیں۔ ایسا بھی وقت گزرا ہے جب میری جیب میں ایک کوپک نہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں خوش رہا کرتا تھا۔ تم ان دنوں میرا یہ عالم تھا کہ آج صبح جیسا حسین چہرہ میں نے نیوسکی پہ دیکھا تھا اگر اُن دونوں دیکھ لیتا تھا تو بس سارا دن خوش رہا کرتا تھا۔ وہ وقت بھی خوب گزرا۔ زندگی بہت حسین ہے وارنیکا۔ خاصکر اگر پیٹرس برگ میں کٹے تو کیا کہنے! کل میں عبادت کرنے بیٹھا تو میری آنکھیں بھر آئیں اور میں نے دعا کی کہ بُرے وقتوں میں مجھ سے جو گناہ بھی سرزد ہوا ہے وہ بخش دیا جائے۔ اس کے لئے معاف کر دیا جاؤں۔ عبادت کے دوران میں مجھے تمہارا خیال بھی آیا کیونکہ تمہیں نے مجھے حوصلے عطا کئے۔ آرام پہنچایا۔ آج میں نے ہر خط کو چوما۔ مجھے پتا چلا ہے کہ پڑوس میں کوئی سرویس نوٹ بک رہا ہے۔ میں اُس کے بارے میں اطلاع حاصل کروں گا۔

خدا حافظ۔

ماکار

۱۵ اگست۔

میرے پیارے ماکار۔

میں بہت پریشان ہوں۔ میرا ہر خدشہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔ اب ذرا تم ہی غور کرو۔ وہ بائیکوف سینٹ پیٹرس برگ میں رہتا ہے۔ فیڈورا اُس سے ملی تھی۔ وہ ایک بگھی میں کہیں جا رہا تھا۔ جب اُس نے فیڈورا کو دیکھا تو اس سے ملنے کے لئے اُتر گیا اور فیڈورا سے پوچھنے لگا کہ ان دنوں کہاں رہتی ہے۔ جب فیڈورا نے بتانے سے انکار کر دیا تو وہ ہنس کر کہنے لگا کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ تمہارے ساتھ اور کون رہتی ہے۔ (یہ بات ضرور انّا فیدوروینا نے اُسے بتائی ہوگی) فیڈورا سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے سرِ عام اُس کو بہت بُرا بھلا کہا اور بولی کہ وہ اوّل درجے کا لفنگا شخص ہے بداخلاق ہے اور میرے تمام دُکھوں کی واحد وجہ ہے۔ اس پر وہ بولا کیونکہ اس کے پاس ایک دھیلا نہیں ہے لہٰذا دُکھی تو وہ رہے گی۔ فیڈورا نے اُسے بتایا کہ وہ کما کر بھی کھا سکتی ہے کسی سے شادی بھی کر سکتی ہے لیکن اُس کی بدولت اور اُس کی مہربانیوں کی بدولت ان دنوں سخت بیمار ہے اور اگر کسی دن مر بھی جائے تو کوئی بڑی بات نہیں ہوگی۔ اس پر وہ بدزبان بولا۔ کہ میں ابھی جوان ہوں، اور پھر اکیلی۔؟ ہوں اور بولا کہ میری آبرو میں داغ بھی لگ چکا ہے۔ (یہ اُس کے لفظ ہیں)

میرا اور فیڈورا کا خیال تھا کہ آج ہمارے مکان کے بارے میں کوئی علم نہیں لیکن کل میں کچھ خرید و فروخت کرنے ذرا گوسٹنی ڈور تک ہی گئی تھی کہ وہ ہمارے کمرے میں آیا۔ وہ جان بوجھ کر اُس وقت آیا تھا جب میں گھر پر نہیں تھی۔ اُس نے فیڈورا سے میرے متعلق کئی سوال کئے۔ میری زندگی کے بارے میں بہت کچھ پوچھا اور قریب قریب گھر میں جو چیز رکھی تھی اُس کا معائنہ کیا۔ میرے ہاتھ کی کاڑھی ہوئی چیزیں بھی دیکھیں اور آخرکار بولا۔ "وہ کلرک کون ہے جس سے تمہاری اتنی گہری واقفیت ہوگئی ہے؟" میں اُسی وقت تم بازار سے گذر رہے تھے اور فیڈورا نے تمہاری طرف اشارہ کرکے بتایا کہ وہ ہے۔ اُس نے تمھیں ایک نظر دیکھا اور بس مسکرا دیا۔ فیڈورا نے اُسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ یہاں سے چلا جائے اور اُس سے کہہ دیا کہ میری تمام مشکلات اُسی کی پیدا کردہ ہیں اور اُس کا مجھ سے ملنا میری مصیبتوں میں اضافہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اُس نے اس بات کا تو کوئی جواب نہ دیا لیکن کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ کہ ایک خاص کام کی غرض سے ادھر آیا تھا۔ یہ کہہ کر اُس نے فیڈورا کو پچیس روبل پیش کرنا چاہے۔ فیڈورا نے انھیں لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ وہ یہاں کیوں آیا؟ میری تو کچھ سمجھ ہی نہیں آتا۔ اُسے ہمارے بارے میں ہر بات کا علم کیسے ہوا۔ فیڈورا کہتی ہے کہ اُس کی چچازاد بہن اگنیسا جو ہمیں کبھی کبھی ملنے آتی ہے وہ ناسٹاسیا کو جانتی ہے۔ ناسٹاسیا دھوبن ہے اور اُس کا چچازاد بھائی اُس منسٹری میں کام کرتا ہے جہاں اینا کے بھتیجے کی جان پہچان والے لوگ اعلیٰ افسر ہیں ضرور اسی طرح اینا کو ہمارے بارے میں خبریں پہنچی ہیں۔ شاید فیڈورا غلطی کر رہی ہو۔ ہمیں کچھ نہیں سوجھ رہا کہ اب کیا کریں۔ کیا وہ کمبخت دوبارہ آئے گا۔ میری جان تو اسی خیال سے خشک ہو رہی ہے۔ جب فیڈورا نے مجھے یہ سب باتیں کل بتائیں تو میں قریب قریب غش ہی کھا گئی تھی۔ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ میں اُن سے نہیں ملنا چاہتی۔ وہ مجھ غریب کی جان کو کیوں آیا ہے۔ وہ کیوں میرا پیچھا کر رہا ہے۔ مجھے تو ہر وقت ڈر لگتا رہتا ہے۔ اگر بائیکوف اسی لمحے آگیا تو پھر کیا ہوگا۔ خدا جانے میری قسمت میں کیا لکھا ہوا ہے۔ مجھ سے ملنے کے لئے فوراً چلے آؤ۔ ماکار۔ خدا کے لئے فوراً چلے آؤ۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔ ترس کرو۔ پلیز۔

ورینکا

۱۵ ستمبر۔

مائی ڈیر وار وارا

آج کی تاریخ کو ہمارے مکان میں ایک سمجھ نہ آنے والا اور بالکل غیر متوقع سانحہ گذرا۔ وہ بیچارہ گرد شکوف آج ہر الزام سے بری کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ تو جج حضرات نے بہت پہلے کر لیا تھا لیکن آج وہ آخری فیصلہ سننے کے لئے گیا تھا۔ یہ مقدمہ اُس کے لئے بہت خوش قسمت ثابت ہوا۔ غلطی نہ پکڑنے کی جو بھی خطا اُس سے سرزد ہوئی تھی اُسے برطرف کر دیا گیا۔ اور اُس سوداگر سے اُسے ایک اچھی خاصی رقم معاوضے میں دلا دی گئی ہے۔ اُس کے حالات اس سے سنور گئے ہیں اور اُس کے اخلاق پر جو داغ آیا تھا وہ بھی دھل گیا۔ سب ٹھیک ہو گیا۔ اُس کی توقعات صحیح ثابت ہوئیں۔ وہ کوئی دوپہر کے تین بجے کچہری سے واپس لوٹا۔ اُس کا چہرہ گندھک کی طرح پیلا پڑ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے لیکن اُس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔ اُس نے آتے ہی اپنی بیوی کو کس کے سینے سے لگا لیا۔ بچوں کو خوب پیار کیا۔ ہم سب لوگ ہجوم کی صورت میں اُسے مبارکباد دینے لگے۔ وہ بہت جذباتی ہو گیا۔ شکریہ ادا کرنے کے لئے وہ جھکا ہی جا رہا تھا۔ وہ بار بار جھک رہا تھا۔ اور ہم میں ایک ایک کے ساتھ اُس نے کئی کئی بار ہاتھ ملایا۔ کچھ یوں نظر آتا تھا جیسے وہ لمبا ہو گیا ہو۔ جیسے اُس کی کمر سیدھی ہو گئی ہو۔ اُفوہ۔ کتنا خوش تھا وہ۔ وہ ایک منٹ بھی تو چین سے نہ بیٹھ سکتا تھا۔ ایک چیز اُٹھاتا تو دوسری رکھ دیتا۔ برابر شکریئے جا رہا تھا۔ ہزار بار تو وہ اُٹھا اور بیٹھا ہی ہوگا۔ جو بات اُس کے منہ تک آتی تھی وہ ہمیں سنا دیتا تھا۔ اپنے اعلیٰ چلن کے متعلق اپنی بیوی اپنے بچوں کے بارے میں نہ جانے کیا کیا اُس نے بتایا ـــــ وہ جذبات کی شدت میں رو بھی دیا تھا۔ ہم میں سے کئی لوگوں کی بھی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ممکن ہے اُس کی حوصلہ افزائی کے لئے راتا زیف نے کہا ہو۔ "میرے

دوست اگر جیب میں پیسے نہیں ہے تو کیا موت کو چاٹنا ہے۔ اصل بات تو پیسہ ہے۔ تمہیں اس بات کے لئے شکر گذار ہونا چاہیئے۔" اور راتاریف نے اس کے کندھوں پر تھپکی دی۔ مجھے یوں جان پڑا کہ گروشکوف کو اس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ اسے غالباً جو بات کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے کوئی ایسی ویسی بات بھی نہیں کی تھی بالکل نہیں۔ بس اس نے راتاریف کو عجیب نظروں سے دیکھا اور پھر اس کا ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیا تھا۔ وہ پہلے ایسی بات کبھی نہ کرتا۔ خیر۔ ہر شخص کا کردار مختلف ہوتا ہے۔ شاید کے طور پر میں خوشی کے ایسے موقع پر اتنا مغرور کبھی نہ ہوتا زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب آدمی محض دوستی اور مروت کے تحت ہی جھک جاتا ہے۔ لیکن اپنے متعلق کیوں کہوں۔ گروشکوف نے راتاریف کے جواب میں کہا تھا —" ہاں — ٹھیک کہتے ہو، پیسہ بھی اچھی چیز ہے۔ اس کے لئے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" اس کی بیوی نے شام کے کھانے کے لئے اچھے اچھے پکوان تیار کرنے کو کہا اور ہماری مکان مالکن نے اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کیا۔ ہماری مکان مالکن بھی اپنے ڈھنگ کی اچھی عورت ہے۔ کھانے کا انتظار کرتے وقت گروشکوف بہت بے چین ہو گیا اور وہ قریب قریب ہر کمرے میں گیا — یہ اور بات تھی کہ کسی کو دعوت دی یا نہیں۔ وہ فقط کمرے میں جاتا مسکرا کر آداب بجا لاتا پھر کرسی پر بیٹھ جاتا۔ کچھ بات کرتا یا بالکل ہی خاموش رہ کر واپس چلا آتا۔ بحری فوج کے افسر نے اسے تاش کھیلنے کے کمرے میں مدعو کیا اب وہ چار ساتھی ہو گئے لیکن گروشکوف نے سارے کھیل کا مزہ کرکرا کر دیا۔ بغیر سوچے سمجھے چالیں چل دیتا اور آخر میں یہ کہہ کر اٹھ گیا —" میں تو بس ایک دو بازیاں کھیلنے کے لئے آیا تھا —" جب وہ مجھ سے برآمدے میں ملا تو اس نے میرے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لئے۔ اس نے مجھے عجیب لیکن محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر زور سے میرے ہاتھوں کو دبایا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس کی بیوی خوشی کے مارے پاگل ہو رہی تھی۔ ان کے کمرے کا یہ عالم تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنی بیوی سے کہا —" میرا خیال ہے مجھے

تھوڑی دیر آرام کرنا چاہیئے —" پھر کچھ دیر اپنی منجھلی لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر اس نے مڑ کے اپنی بیوی کو دیکھا اور کہا —" پیٹیا کہاں ہے —" اس کی بیوی وہیں سجدے میں جھک گئی اور اسے یاد دلایا کہ پیٹیا کی تو وفات ہو چکی ہے —" ارے ہاں —" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا —" پیٹیا تو جنت میں ہے —" اس کی بیوی نے دیکھا کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ اور اس واقعے سے اس کی حالت کچھ غیر ہو گئی ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ وہ اب سو جائے —" ہاں۔ یہی ٹھیک ہے۔ مجھے اب سو جانا چاہیئے —" وہ کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ چپ چاپ لیٹا رہا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی گردن اٹھائی جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔ اس کی بیوی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا اور اس نے پوچھا کہ کیا بات ہے —؟ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی بیوی کو جب یقین آگیا کہ وہ سو گیا ہے تو وہ اٹھ کر مکان مالکن کے پاس چلی گئی اور وہاں گھنٹہ بھر بیٹھی رہی۔ جب وہ واپس آئی تو دیکھا کہ وہ ابھی تک سو رہا تھا اور وہ کسی کام میں مصروف ہو گئی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اپنے کام میں اس قدر مصروف رہی کہ اسے بھی بھول گئی۔ لیکن اچانک وہ بڑبڑا کے کام سے اٹھ بیٹھی — اور کسی انجانے ڈر کے تحت سہم کے رہ گئی۔ کمرے میں موت جیسا سناٹا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر بستر کی طرف دیکھا۔ اس کے خاوند نے ابھی تک کروٹ نہ بدلی تھی۔ وہ جس پہلو سے لیٹا تھا اسی طرح پڑا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب گئی اور دیکھا کہ وہ مر چکا ہے۔ گروشکوف — جیسے اس پر فالج گر گیا ہو۔ اور کسی کو علم نہیں کہ کیوں گر گیا؟ مجھے اتنا گہرا صدمہ پہنچا ہے کہ میں ابھی تک اپنے آپ کو سنبھال نہیں پایا۔ آدمی اس طرح کیسے مر سکتا ہے۔ بیچارہ گروشکوف — کیا زندگی گذاری اس نے! کیا زندگی گذری اس کی! اس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور خوف کے مارے وہ کچھ بول نہ سکتی تھی۔ اس کی ننھی لڑکی دبک کے کونے میں جا بیٹھی۔ پھر قیامت آگئی۔ سنا ہے کہ اس کی نعش کا پوسٹ مارٹم ہوگا — میں اپنے دکھ کو لفظوں میں نہیں بیان کر سکتا۔ ہم میں سے

کون قسمت کے کھیل کو جان سکتا ہے۔ آج یہاں ہیں تو کل کیا ہو کچھ نہیں۔

تمہارا مالکار

میری پیاری دار وارا۔

میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ راتا زیبت نے میرے لیے کسی ادیب کے ہاں ایک کام ڈھونڈ دیا ہے۔ وہ ادیب ایک ضخیم مجموعہ لے کر راتا زیبت کے پاس آیا تھا۔ شکر ہے خدا کا کہ کافی کام مل گیا۔ لیکن بدبختی یہ ہے کہ اس ادیب کا دستخط اتنا برا ہے کہ کچھ پڑھا نہیں جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ لیکن کام جلد ختم کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اصل مسودہ اتنا برا لکھا ہوا ہے کہ سطر پر سطر چڑھی ہوئی ہے۔ چالیس کوپکس فی کاغذ کے حساب سے معاملہ طے ہوا ہے۔ میں یہ سب اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اب میرے پاس کچھ مزید رقم اور بھی آجائے گی۔ خدا حافظ — مجھے اپنا کام شروع کرنا ہے۔

تمہارا دوست مالکار

۲۴ ستمبر

میرے پیارے دوست مالکار

میں نے گذشتہ تین روز سے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا لیکن ان تین دنوں میں مجھ پر آفت آپڑی ہے۔ پرسوں کی بات ہے کہ بائیکوف پھر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میں اکیلی تھی۔ فیڈورا کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھی۔ جب میں نے دروازے پر دستک سن کر دروازہ کھولا اور اسے دیکھا تو اتنی زیادہ ڈر گئی تھی کہ اپنی جگہ سے ہلنا محال ہو گیا تھا۔ میرا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ حسب معمول زور سے ہنسا اور اندر آگیا۔ کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک کونے میں بیٹھ کر کام میں لگ گئی۔ جب اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا تو اس کی مسکراہٹ دب کے رہ گئی۔ میں اتنی کمزور ہو چکی ہوں۔ یہ خیال ہے میرا رنگ کاغذ کی طرح سفید پڑ چکا ہے۔ وہ لوگ جو ایک سال پہلے مجھے جانتے تھے اگر اب مجھے دیکھیں تو شاید پہچان بھی نہ پائیں۔ کچھ دیر تو وہ سنجیدگی سے بیٹھا مجھے دیکھتا رہا پھر اس کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھر آئی۔ اس نے کچھ کہا تھا۔ میں نے جواب میں کیا کہا تھا یہ مجھے یاد نہیں لیکن وہ زور سے ہنسا تھا۔ وہ پورا ایک گھنٹہ یہاں بیٹھا رہا۔ سوالات کرتا رہا۔ باتیں کرتا رہا۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا (یہاں میں اسی کے الفاظ دہرا رہی ہوں) وار وارا — یہ بات ہمارے درمیان ہی رہنی چاہیئے۔ یہ جو تمہاری رشتہ دار اور میری واقف اینا ہے نا یہ کمینی اور بد اخلاق عورت ہے۔ اس نے تمہاری چچازاد بہن ساشا کو آوارہ لڑکی بنا دیا ہے اور تمہیں بھی تباہ کیا ہے۔ رہا میرا سوال تو اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا رویہ لفنگوں اور لچوں جیسا رہا ہے۔ اور ہر انسان کردار کی کمزوری کی بنا پر ایسا ہو جاتا ہے۔" اس کے بعد وہ زور سے ہنسا۔ پھر وہ کہنے لگا کہ وہ اچھا مقرر نہیں ہے لیکن اس نے مزاحیہ انداز میں جو کہنا چاہا وہ کہہ گیا اور اب وہ چھوٹی سی بات صاف صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہے۔ اس نے وہیں اور کھلے الفاظ میں مجھ سے کہہ دیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میری عزت اور وقار کو قائم کرنا اس کا فرض ہے۔ وہ میرے اور کہہ رہا تھا کہ شادی کے فوراً ہی بعد وہ مجھے اپنے گاؤں لے جائے گا جہاں وہ خرگوشوں کا شکار کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اب وہ پیٹرس برگ بالکل نہیں جائے گا کیونکہ وہ شہر خراب ہے۔ اس کی فضا خراب ہے۔ اس شہر میں اس کا ایک آوارہ بھتیجا بھی رہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ وہ اسے ایک پائی نہیں دے گا اور اس سے تعلقات ختم کر دے گا۔ اس نے کہا کہ شادی کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ وہ اپنی دولت کا شریک کسی غیر آدمی کو نہیں بنانا چاہتا۔ پھر بولا کہ جب اتنی غریبی میں رہ رہی ہو تو بیمار ہو جانا کون سی بڑی بات ہے۔ اور بولا کہ اگر ایک مہینہ اور یونہی رہی تو دیکھ لینا کہ چل بسو گی۔ اور کہتا گیا کہ پیٹرس برگ میں رہنا تو اپنی آبرو سے کھیلنے کے برابر ہے اور مجھ سے کہہ گیا ہے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔

اس کی اس پیش کش سے میں اس قدر گھبرائی کہ بہت روئی۔ رونے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ سمجھا کہ میں شکر کے احساس سے رو رہی ہوں اور بولا کہ آپ ہمیشہ اس بات

کا خیال تھا میں ایک نیک اچھی اور سمجھدار لڑکی ہوں لیکن تاہم جب تک اس نے میرے بارے میں مکمل تحقیق نہ کر لی تھی تب تک یہ قدم نہ اٹھایا تھا۔ پھر اس نے تمہارے بارے میں کچھ سوالات پوچھے اور کہنے لگا سنا ہے وہ آدمی بھی اصول کا مالک ہے۔ نیک ہے اور وہ بھی تمہارے لئے کسی بوجھ تلے نہیں دبنا چاہتا کیا اس نے تمہارے لئے جو کچھ کیا ہے اس کے معاوضے میں پانچ سو روبل کافی ہوں گے ؟

جب میں نے اس کو بتایا کہ تمہارے احسانات کا بدلہ کسی صورت نہیں چکایا جا سکتا — دولت سے تو بالکل نہیں چکایا جا سکتا تو وہ بولا کہ یہ سب بکواس ہے۔ کہنے لگا یہ سب کتابی قصے کہانیاں ہیں۔ کہنے لگا میں ابھی بچی ہی ہوں اور شاید مجھے ابھی تک شعر و شاعری پڑھنے کا شوق ہو۔ کہنے لگا اسی شعر و شاعری اور ناولوں نے تو نوجوان لڑکیوں کو تباہ کیا ہے۔ کتابیں خلاف بدیانتی اور ڈالتی ہیں اسی لئے تو وہ انھیں برا سمجھتا ہے۔ اگر میں بھی اتنا بچی ہی رہی جتنی اس کی عمر ہے تو شاید لوگوں کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہو جاؤں۔ جبھی مجھے پتا چل سکے گا کہ لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ وہ کہنے لگا اس کی پیش کش پر اچھی طرح سوچ بچار کروں کیونکہ وہ کہتا تھا کہ اگر میں جلد بازی اور بغیر سوچے سمجھے کوئی فیصلہ کروں گی تو اس سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی جلد بازی اور ناسمجھی نے تو نوجوانوں کو تباہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میرے منہ سے ہاں سننا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ کہتا تھا کہ پھر اسے مجبوراً ماسکو کے ایک سوداگر کی لڑکی سے شادی کرنی پڑے گی کیونکہ وہ اپنے بھتیجے کو اپنی دولت کا وارث نہیں بنانا چاہتا۔ اور وہ میرے انکار کرنے پر بھی میری الماری کے اوپر پانچ سو روبل رکھ گیا۔ اس نے کہا تھا مٹھائی کھا لینا۔ وہ کہتا تھا کہ میں دیہات میں اتنی صحت مند ہو جاؤں گی کہ اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بے حد مصروف نظر آتا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ سارا دن بھاگ دوڑ میں گذر گیا ہے۔ اس کے بعد وہ رخصت لے کر چلا گیا۔ میں نے اس کے جانے کے بعد بہت سوچا اور جتنا سوچا اتنا دکھی ہوئی لیکن آخر میں ایک نتیجے پر پہنچ گئی ہوں۔ میں اس آدمی سے شادی کروں گی۔ میں اس کی پیش کش قبول کروں گی۔ اگر کوئی شخص مجھے اس ذلت سے بچا سکتا ہے۔ میرا نیک نامی مجھے لوٹا سکتا ہے، مجھے غربت اور ان مصیبتوں سے نجات دلا سکتا ہے تو وہ یہی شخص ہے۔ اس سے زیادہ میں اپنے مستقبل سے اور کیا مانگ سکتی ہوں! اس سے زیادہ میں تقدیر سے کیا چاہتی ہوں۔ فیڈورا کہتی ہے انسان کو اپنی خوشی سے منہ نہیں پھیرنا چاہیئے۔ اور اگر یہ خوشی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ جہاں تک میری زندگی کا سوال ہے تو میرے دوست مجھے کوئی اور دوسرا راستہ نظر نہیں آ رہا۔ میں اتنا زیادہ کام کر رہی ہوں کہ میری صحت برباد ہو گئی ہے۔ کہیں استانی یا نوکرانی بن جاؤں ؟ تو سوائے اس کے کہ تنہائیوں میں گھل گھل کے مروں اور کسی کام کی نہ رہوں اور کیا ہو گا! میں نظر انداز رہوں اور ہمیشہ کسی نہ کسی پر بوجھ بنی رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں جنت میں نہیں جا رہی لیکن میں کیا کروں۔ مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں ؟ مجھے کونسا راستہ نظر آ رہا ہے۔

میں کوئی رائے نہیں چاہتی۔ میں اس معاملے پر خود غور کرنا چاہتی ہوں۔ میرا فیصلہ جو تم پڑھ چکے ہو وہ اب بدلا نہیں جا سکتا اور میں بائیکوف کو اس فیصلے کی اطلاع دے دوں گی۔ کیونکہ وہی پیش کش کر رہا ہے۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اب وہ مزید انتظار نہیں کر سکتا اور میرے کچھ وہموں کی بنا پر وہ شادی کی تاریخ کو ملتوی نہیں کر سکتا۔ میں خوش ہوں گی یا نہیں یہ تو خدا ہی جانتا ہے لیکن اپنی قسمت کا فیصلہ اس پروردگار پہ چھوڑتی ہوں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ بائیکوف اچھا انسان ہے وہ میری عزت کرے گا اور ممکن ہے کہ میں بھی اس کی عزت کرنا سیکھ جاؤں گی۔ پھر اس شادی سے میں اور کیا توقع کروں؟

ماکار میں نے یہ سب کچھ اس لئے بتایا ہے کہ مجھے یقین ہے تم معاملے کی نزاکت کو سمجھ گئے۔ مجھے اب اس فیصلے سے پیچھے ہٹانے کی کوشش نہ کرنا۔ تمھیں کامیابی نہیں ہو گی۔ اس بات پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو اور سوچو کہ کن حالات نے مجھے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ پہلے میں بہت پریشان ہو اٹھی تھی لیکن اب مجھے اطمینان ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میرا کیا بنے گا۔ قسمت کو کون جانتا ہے۔ آدمی جو چاہے کرے — ہوتی خدا کی

مرضی ہی ہے۔

بائیکوف ابھی ابھی کمرے میں آیا ہے۔ میں یہ خط اوھورا چھوڑ رہی ہوں۔ حالانکہ مجھے ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔

۲۳ر ستمبر

میری عزیز وار وارا

میں تمہارے خط کا جواب بواپسی ڈاک دے رہا ہوں۔ اور یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سخت حیران ہوں۔ کہیں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور ہے۔ کل ہم نے گروشکوف کو دفنا دیا۔ ہاں۔ بائیکوف نے نیکی کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں کیا شک ہے۔ لیکن عزیزم کیا تم واقعی ہاں کر چکی ہو؟ خیر سب کچھ کرنے والا تو وہ ہے۔ اسی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ اور خدا جیسا چاہتا ہے قسمت ویسا ہی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ فیڈورا بھی متفق ہے۔ چلو۔ اب تم خوش رہو گی۔ میری ننھی سی فاختہ۔ میرے خوبصورت فرشتے اب تم چین سے رہو گی آنند سے رہو گی۔ لیکن وارنیکا اتنی جلدی کیوں۔ آخر ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ارے ہاں۔ مسٹر بائیکوف کے کاروباری معاملات میں فرق آتا ہوگا۔ آخر ہر شخص کو اپنا کام ختم کرنا ہوتا ہے۔ میں نے اُسے تمہارے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اچھی وضع قطع کا مالک ہے۔ اچھی صورت ہے لیکن کہیں نہ کہیں کچھ خرابی ضرور ہے۔ سوال یہ نہیں کہ وہ اچھی صورت کا ہے سوال یہ ہے کہ مجھے فکر دامن گیر ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کو خط کیسے لکھ سکیں گے۔ اور میں اکیلا کیسے رہوں گا۔ میں تمہاری تمام دلیلوں پر غور کر رہا ہوں۔ ٹھنڈے دل سے غور کر رہا ہوں۔ میں اس ادیب کے سودے کا بیسواں صفحہ لکھ رہا تھا جب تمہارا خط مجھے پہنچا۔ تم جا رہی ہو۔ تم کو زندگی کی ضروریات کا پورا سامان خرید لینا چاہیئے۔ جرابیں۔ سویٹر۔ جوتے وغیرہ وغیرہ۔ گروکھووایا پر ایک دوکان ہے۔ یاد ہے میں پہلے بھی تمھیں اس کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ لیکن اب تم مجھے چھوڑ کیسے رہی ہو؟ یہ خیال مجھے کھائے جا رہا ہے۔ تم اس وقت نہیں جا سکتیں — بالکل نہیں جا سکتیں۔ یہ ناممکن ہے۔ ابھی اتنا کچھ خریدنا ہے اور پھر تمھیں بھی خریدنی ہے۔ موسم خراب ہے اور دیکھو تو سہی کہ کتنی بارش ہو رہی ہے۔ تمھیں سردی لگ جائے گی۔ اور پھر کیا ایک اجنبی کے ہمراہ جاتے ہوئے تمھیں

ڈر نہیں لگتا؟ میرا یہاں کون رہ جائے گا؟ فیڈورا کہتی ہے کہ تم بہت خوش قسمت ہو۔ لیکن وہ تو چڑیل ہے۔ وہ تو مجھے برباد کرنے کی سوچتی رہتی ہے۔ کیا تم ویسپرز دیکھنے جاؤ گی؟ میں وہاں تمھیں ایک نظر دیکھنے جاؤں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک ذہین لکھی اور سمجھدار لڑکی ہو۔ لیکن اگر وہ سوداگر کی لڑکی سے شادی کر لے تو اس کے لئے اچھا رہے گا کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟ اندھیرا چھا جانے کے بعد میں گھنٹہ بھر کے لئے تم سے ملنے چلا آؤں گا۔ ان دنوں جلدی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میں آج ضرور آؤں گا۔ بس شام ہوتے ہی چلا آؤں گا۔ تمھیں بائیکوف کے آنے کی امید ہوگی اور بس اس کے جاتے ہی میں چلا آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا میں ضرور آؤں گا۔

ماکار دیوشکن

۲۷ر ستمبر

میرے پیارے دوست ماکار

مسٹر بائیکوف کا کہنا ہے کہ میرے پاس اعلیٰ پر کین کا ریشم کی تین درجن قمیضیں ہونی چاہئیں۔ دو درجن جمپر تیار کرنے کے لئے مجھے ایک درزن تلاش کرنی پڑے گی۔ اور وقت بہت کم ہے۔ بائیکوف بے حد ... ہے وہ کہتا ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں بہت تکلیف پہنچاتی ہیں۔ ہماری شادی پانچ دن بعد طے پائی ہے اور اس سے اگلے روز ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ بائیکوف کو بہت جلدی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اتنا زیادہ وقت ضائع کرتے ہوئے اُسے شرم آتی ہے۔ میں اتنی بھاگ دوڑ کر چکی ہوں کہ میری ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ ابھی اتنا کام کرنا باقی ہے اور بہت سارا کام تو بغیر کئے ہی چھوڑنا پڑے گا۔ ہاں ایک بات اور ہے ہم نے ریشمی دھاگے اور ڈوریاں زیادہ نہیں خریدیں اور پھر ہمارے پاس خریدنے والا بھی کوئی نہیں۔ بائیکوف کہتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو دیہاتی لباس میں نہیں دیکھنا چاہتا اور اس کے بقول مجھے مقامی عورتوں کا سر نیچا کرنا ہوگا۔ کیا تم گروکھووایا جا کر میڈیم ... سے مل سکتے ہو؟ اس سے کہو کہ فوراً کسی درزن کو بھیج دے اور عین کرم ہوگا اگر خود چلی آئے آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے

ہمارا نیا کرہ بہت گندا ہے اور ابھی اسے صاف کرنے کا کام
باقی ہے۔ بائیکوف کا ایک بچہ ہے۔ وہ اتنی بوڑھی اور بیمار
ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ ہماری روانگی سے پہلے ہی نہ چل بسے۔
کون کہتا ہے کہ فکر مت کرو۔ وہ اپنے آپ چلی آئے گی۔
ہر چیز بے ترتیب ہے۔ بائیکوف خود یہاں رہتا نہیں اور نوکر
خدا جانے کہاں بھاگ جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو صرف فیڈورا
کام کرنے کے لئے رہ جاتی ہے۔ بائیکوف کا ایک خاص نوکر ہے۔
عام طور پر سب انتظام اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ تین روز کے
لئے چلا گیا ہے۔ بائیکوف ہر صبح یہاں آتا ہے اور جب بھی آتا ہے
غصہ میں آتا ہے۔ کل اس نے باورچی کو اتنا مارا کہ معاملہ پولیس تک
پہنچا۔ اب تم تک میرے خط پہنچانے والا کوئی نہیں لہذا میں یہ خط
ڈاک میں ڈال رہی ہوں۔ ارے بابا۔ میں سب سے ضروری بات تو
بھول ہی گئی۔ میڈم چیفون سے کہنا کہ بلاوز کا ڈیزائن کل جو بھیجا ہے
نمونے کے مطابق تیار کرے۔ اچھا تو یہ ہوگا کہ وہ خود چلی آئے اور
مجھے سب ڈیزائن دکھادے۔ ہاں اسے یہ بھی کہنا ہے کہ میں نے جمپروں
کے بارے میں اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ اب میرے جمپر "کریپ" سے تیار
کئے جائیں۔ اور۔ بالوں پر ریشمی دھاگوں کی بجائے گلکاری کی جائے۔
تمہیں یہ سب باتیں یاد رہیں گی نا؟ میں تو ہر بات بھولتی جا رہی ہوں۔
اسے یہ بھی کہنا ہے کہ اوور کوٹ کے کالر ذرا اونچے ہونے چاہئیں۔ اور
ان پر ریشمی ڈوری سے کڑھائی ہونی چاہئے۔ دیکھو بھولنا نہیں۔

تمہاری

وی۔ ڈی۔

مجھے بہت شرم آتی ہے کہ میں تمہیں اس طرح تکلیف دے
رہی ہوں۔ پرسوں بھی تم ساری صبح بھاگتے پھرتے رہے۔ لیکن اب
میرے کام کون کرے گا۔ یہاں کوئی چیز ترتیب سے نہیں ہے اور
میں بیمار ہوں۔ ماکار مجھ سے خفا نہ ہو جانا۔ میں پہلے ہی بہت
اداس ہوں۔ میرے نیک دل دوست جانے میرا کیا بنے گا!
میں آنے والی کل کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ میں کچھ
بھی اندازہ کرتے ہوئے ڈرتی ہوں اور ہر بات سے غافل
ہو کر جا رہی ہوں۔ میں نے جو کام بتائے ہیں انہیں نہ بھول جانا۔
مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں تم غلطی نہ کر بیٹھو۔ بھولنا مت ریشمی دھاگے
سے نہیں بلکہ گلکاری۔

۲۷ ستمبر۔

میری پیاری وار وارا۔

میں نے تمہاری ہدایت پر پوری توجہ سے عمل کیا ہے۔
میڈم چیفون کہتی تھی کہ وہ خود گلکاری کا کام کرے گی کیونکہ زیادہ
خوبصورت ہوگا یا کیا ہوگا مجھے یہ یاد نہیں رہا۔ اس نے ریشمی
دھاگے کے بارے میں بھی کچھ کہا تھا لیکن میں بھول گیا ہوں۔ مجھے
بس اتنا یاد ہے کہ اس نے ریشمی دھاگے کے بارے میں بہت
کچھ کہا تھا۔ مجھے تو وہ عورت پاگل نظر آتی ہے۔ اور اس نے کیا کہا
تھا، وہ خود ہی تمہیں بتادے گی۔ میں تو بھاگ بھاگ کے تھکن سے
اتنا چور ہو چکا ہوں کہ آج دفتر بھی نہیں گیا۔ لیکن تم اس کا فکر مت
کرو۔ میں تمہارے سکھ کی خاطر شہر کی ہر دکان پر پہنچنے کو تیار ہوں۔
تم کہتی ہو کہ تم مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈرتی ہو تو سات
بجے تمہیں ہر بات کا علم ہو جائے گا۔ میڈم چیفون نے سات بجے
آنے کا وعدہ کیا ہے۔ ہمت نہ ہارو۔ یوں دل نہ چھوڑ بیٹھو۔
سب ٹھیک ہوگا۔ ارے کیا وہ ریشمی دھاگے کی مصیبت ہے۔
نہ یاد آتی ہے نہ بھولتی ہے۔ میں خود تم سے ملنے کے لئے آؤں گا۔
میں ضرور آؤں گا۔ درحقیقت میں دو بار تمہارے گھر کے
دروازے کے آگے سے گزرا بھی ہوں لیکن وہ بائیکوف ہمیشہ
اتنے غصے میں ہوتا ہے کہ بس — واقعی — خیر کیا ہو سکتا
ہے۔

ماکار

۲۸ ستمبر۔

میرے پیارے ماکار

دیکھو فوراً بھاگ کے جوہری کی دکان پر جاؤ اور
اسے کہہ دو کہ زمرد اور نگینے کے بندے نہ بنائے۔ بائیکوف
اب کہہ رہا ہے کہ قیمت بہت ہی زیادہ ہے۔ بائیکوف بہت
ناراض ہے اور کہتا ہے کہ ان چیزوں میں پہلے ہی اندھی
دولت خرچ آچکی ہے۔ اور اسے لوٹا جا رہا ہے۔ کل
بھی وہ کہہ رہا تھا کہ اگر اسے ان اخراجات کا اندازہ پہلے
ہو جاتا تو وہ یوں وعدہ نہ کر بیٹھتا۔ اس نے کہا تھا کہ شادی
ہوتے ہی ہم یہاں سے چل دیں گے۔ کسی مہمان کو نہیں بلایا جائیگا

کوئی دعوت نہیں کی جائے گی اور ایک عرصے تک کسی دعوت کی اُمید نہیں۔ وہ اسی طرح باتیں کرتا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں اور بائیکوف نے خود انھیں تیار کرایا ہے۔ میں اُسے جواب اس لئے نہیں دیتی کیونکہ وہ بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔ نہ جانے میرا کیا بنے گا؟

۲۸ ستمبر۔

میری بچی وار وارا

میں کہنا ——— میرا مطلب ہے کہ جوہری تک تمہارا پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔ میں کہنے یہ لگا تھا کہ میں بیمار ہوں اور بستر پر پڑا ہوں۔ کتنا بدقسمت ہوں کہ جب کام کا وقت آتا ہے جبھی بیمار پڑ جاتا ہوں۔ اور میری مزید بدقسمتی یہ ہے کہ حال ہی میں حضورِ انور بہت غصے میں تھے اور انھوں نے ایمیلان ایوانووچ کو اس قدر ڈانٹا کہ بیچارہ بے ہوش ہو گیا۔ بس میں تمھیں یہ بتانا چاہتا تھا۔ میں اور لمبا خط لکھتا لیکن اس خیال سے قلم رُک گیا ہے کہ تمھیں ناواجب پریشانی ہوگی۔ میں چالاک آدمی کہاں ہوں۔ میں تو صاف صاف باتیں کہنا جانتا ہوں اور جو میرے دل میں آتا ہے وہ خط میں لکھ دیتا ہوں۔ جبھی تمھیں نظر آتا ہے کہ میری کچھ باتیں اتنی صاف نہیں ہوتیں جتنا انھیں ہونا چاہیئے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ماکار

۲۹ ستمبر۔

میری پیاری ننھی بچی۔

آج مجھے فیڈورا ملی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کل تمہاری شادی ہو جائے گی اور پرسوں تم چلی جاؤ گی۔ سُنا ہے مسٹر بائیکوف نے گھوڑے کرائے پر لے بھی لئے ہیں۔ میں حضورِ انور کے متعلق تو تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔ اور کیا لکھنا ہے؟ ارے ہاں گرد کھودا یا کی دوکان کے جتنے بل آئے تھے میں نے انھیں بار بار دیکھا ہے۔ بل تو ٹھیک ہیں لیکن بہت ہی مہنگی اور قیمتی خریدی گئی ہیں۔ اور یہ بتاؤ یہ بائیکوف تم پر کیوں خفا ہوتا ہے۔ میں تو اتنی ہی دعا کر سکتا ہوں کہ تم ہمیشہ ہمیشہ خوش رہو۔ یہ جان کر کہ تم خوش ہو میں بھی بہت خوش ہوں گا۔ اگر میری پیٹھ میں درد پھر نہ شروع ہو گیا تو میں شادی کے موقع پر ضرور آؤں گا۔ ہاں ——— خطوں کا ذکر دوبارہ زبان پر آجاتا ہے ——— خط کون پہنچائے گا؟ فیڈورا ——— خیر اُس کی جھولی تم نے بھر دی یہ بہت اچھا کیا ——— تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ اور اس کے عوض خدا تمھیں صلہ دے گا۔ اچھے کام کا ضرور پھل ملتا ہے۔ اور نیکی اُس پروردگار کے انصاف کو ضرور جیت لیتی ہے۔ میری پیاری۔ میری بچی میں تو ہر گھنٹے کے بعد تمھیں خط لکھنا چاہوں گا۔ ہر منٹ کے بعد لکھنا چاہوں گا۔ لکھتا جاؤں گا۔ لکھتا جاؤں گا۔ میرے پاس تمہاری وہ کتاب The Tales of Ivan Lin ہے۔ اُسے میرے پاس ہی رہنے دو۔ اور میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ میں اُسے پڑھنا چاہتا ہوں۔ لیکن تم جانتی ہو کہ سردیوں کا موسم شروع ہونے والا ہے۔ اور اب شامیں بڑی ہو جائیں گی۔ بڑی ہو جائیں گی اور اُداس ہو جائیں گی۔ اُس وقت کچھ پڑھنے کو جی چاہے گا۔ میں اس کمرے سے تمہارے پرانے کمرے میں چلا جاؤں گا۔ جہاں اب فیڈورا رہتی ہے۔ میں اُس نیک اور ایماندار عورت کو کبھی اپنے سے علیحدہ نہیں کروں گا۔ بہت اچھی عورت ہے۔ کیا کہنے۔ کل میں تمہارا خالی کمرہ دیکھنے گیا تھا۔ میں کمرے میں خوب گھوما۔ ہر چیز کو اچھی طرح دیکھا۔ ایک کونے میں تمہاری سلائی کڑھائی کا ادھورا کام بھی پڑا تھا جسے تم کرتے کرتے چھوڑ گئیں۔ میں نے اُسے اچھی طرح دیکھا اور ایک دو اور چیزیں بھی دیکھیں۔ مجھے یہ جان کے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے ریشم کی گولی بنانے کے لئے میرے ایک خط کو استعمال کیا ہے۔ میز پر مجھے کاغذ کا ایک ایسا ٹکڑا نظر آیا جس پر صرف اتنا لکھا ہوا تھا "مائی ڈیر ماکار ——— میں تمھیں یہ بتانا چاہتی ہوں ———" اُس وقت شاید کوئی آ گیا ہوگا اور یہ خط یونہی رہ گیا ہوگا۔ اور اُس پردے کے پیچھے میں نے تمہارا چھوٹا سا پیارا سا بستر بھی دیکھا۔ میری ننھی سی فاختہ ——— اچھا ——— خدا حافظ ——— خدا حافظ۔ میری عزیز بچی ——— جواب دینا ——— اچھا!

ماکار۔

۲۰ ستمبر

میرے بچے اور مخلص دوست ماکار

جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ناتا ہو گیا۔ اب میری قسمت میں کیا لکھا ہے یہ میں نہیں جانتی لیکن اب میں اس پروردگار کے ہاتھ میں ہوں۔

میرے قریبی دوست میری زندگی کے رکھوالے میری آقا — میں یہ الوداعی سطریں لکھ رہی ہوں کیونکہ کل ہم چلے جائیں گے۔ میرے لئے مت رونا۔ خوش رہنا۔ مجھے یاد کرو گے نا۔ خدا تمہارا نگہبان رہے۔

میں تمہیں ہمیشہ یاد کیا کروں گی اور دعا کے وقت تمہارا نام لیا کروں گی۔ میری زندگی کے جو دن یہاں گزرے تھے تو ان کا خاتمہ ہو چکا۔ مستقبل میں مجھے جو کچھ یاد آئے گا اس سے مجھے چین تو کم ملے گا لیکن تمہاری یاد مجھے سب سے عزیز ہوگی۔ ساری دنیا میں صرف تمہیں میرے دوست ہو۔ تمہیں وہ ہو جس نے مجھ سے پیار کیا۔ میں جانتی تھی مجھے سب معلوم تھا کہ تمہیں مجھ سے پیار ہے۔ محض میری مسکراہٹ یا میرے ہاتھ کی ایک سطر تمہیں خوش کرنے کے لئے بہت تھی۔ اب تمہیں مجھے بھولنا پڑے گا۔ آہ — تم کس قدر تنہا رہ جاؤ گے؟ اب تمہیں آرام پہنچانے والا یہاں کون رہ جائے گا — تمہیں کون سکھ دے گا۔ میرے مہربان اور دلی دوست میں وہ کتاب، وہ سلائی کڑھائی کا کام اور وہ خط جو ادھورا رہ گیا تھا تمہارے لئے یہیں چھوڑ جاؤں گی۔ بس پہلی سطر کو پھر پڑھو۔ پھر پڑھو اور دیکھو کہ باقی مضمون کے متعلق اندازہ کر کے تمہیں کتنی خوشی ہوگی۔ خدا جانے میں کیا لکھنے بیٹھی تھی۔ یا کیا لکھتی! دیکھو اپنی وارنیکا کو ضرور یاد رکھنا۔ تم نے اتنا پیار کیا ہے تو بھول نہ جانا۔ میں نے تمہارے تمام خط فیڈورا کی میز کے اوپر والے خانے میں رکھ چھوڑے ہیں۔ تم نے لکھا ہے کہ تم بیمار ہو لیکن بائیکوف آج مجھے باہر نہیں جانے دے گا۔ میں تمہیں خط ضرور لکھا کروں گی لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ میرا کیا بنے گا اس لئے میرے عزیز ترین دوست میری روحِ رواں اور بہتر یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو آخری الوداع اور خدا حافظ کہہ دیں۔ میرا بس چلتا تو میں تمہارے سینے سے آ لگتی۔ خدا حافظ میرے دوست خدا حافظ۔ اپنا خیال رکھنا خوش رہنا۔ میں تمہاری صحت کے لئے دعائیں مانگوں گی۔ میں اپنے دل کا بوجھ بیان نہیں کر سکتی۔ بائیکوف بلا رہا ہے۔ بچے ماکار میرا رواں رواں رو رہا ہے۔ میری روح رو رہی ہے۔ آنسو آنکھوں میں یوں امڈتے چلے آ رہے ہیں کہ جی گھٹتا جا رہا ہے۔ خدا حافظ — اپنی بے آسرا وارنیکا کو یاد رکھنا۔

ہمیشہ تمہاری

وارنیکا۔

وارنیکا میری جان۔ میری فاختہ۔ میری زندگی۔

لوگ تمہیں مجھ سے بہت دور لئے جا رہے ہیں۔ تمہیں زبردستی لے جایا جا رہا ہے۔ وارنیکا تم جا رہی ہو گیا! ایسے اس طرح کرنے سے انھوں نے کسی خنجر سے میرا دل کیوں نہیں چیر کے رکھ دیا۔ تم نے انھیں مجھ پر ظلم کرنے کیسے دیا؟ تم رو رہی ہو لیکن جانے پر مجبور ہو۔ مجھے تمہارا جو خط ابھی ابھی پہنچا ہے وہ ابھی تک آنسوؤں کے قطروں سے گیلا ہے۔ ظاہر ہے کہ تم جانا نہیں چاہتیں۔ اور وہ زبردستی کر رہے ہیں — اور تمہیں میری یاد آ رہی ہے — تمہیں میرے بارے میں سوچ کر دکھ ہو رہا ہے — تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ اب تمہارا خیال کون رکھے گا۔ تمہارا ننھا سا دل تنہائیوں میں رو رو کر ہلکان ہوگا۔ تمہیں رنج گھن بن کے کھا جائے گا۔ تمہارا دل ٹوٹ جائے گا۔ تم وہاں تنہائیوں میں گھل گھل کے مرجاؤ گی اور وہ ظالم تمہیں یخ بستہ مٹی میں دفنا دیں گے۔ وارنیکا — تمہاری قبر پر رونے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ بائیکوف تو خرگوشوں کے شکار میں مصروف ہوگا۔ اسے فرصت نہیں ملے گی۔ میری بچی تم نے ایسا قدم اٹھایا کیوں؟ ارے تم نے یہ کیا کیا۔ تم نے یہ کیا کیا۔ اپنے ساتھ تم نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ لوگ مل کر تمہیں دھکے دے دے کر موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ تمہارے تن کو مجروح کر دیں گے۔ میرے ننھے فرشتے تم تو اتنی نازک ہو جیسے فاختہ کا ننھا سا پر۔

ارے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ارے میں نے کیا کیا۔ میں دیکھ رہا تھا میں جانتا تھا کہ بچی بہک گئی ہے۔ میری بچی بیمار ہے۔ مجھے جان پر کھیل کے بچانا۔ لیکن اب کیا۔ میں تو بے وقوف بنا رہا۔ میں تو بیوقوف رہا مجھے کچھ نہیں سوجھا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ جیسے جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مجھ پر خدا کی مار! میں بیوقوفوں کی طرح ریشمی دھاگے کے پیچھے بھاگتا پھرا نہیں وارنیکا۔ یہ نہیں ہو گا۔ میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوں گا۔ میں کل ٹھیک ہو جاؤں گا اور میں بستر پر نہیں لیٹا رہوں گا کل ۔۔۔ میں تمہاری بگھی کے نیچے سر دے دوں گا۔ میں نہیں تمھیں جانے دوں گا یہ تو ظلم ہے۔ انھیں یہ ظلم کرنے کا کیا حق ہے۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ اگر تم مجھے ساتھ نہ لے جاؤ گی تو میں تمہاری بگھی کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہوں گا۔ جب تک سانس ساتھ دے گا تب تک بھاگوں گا۔ وارنیکا! کہاں جا رہی ہو؟ کیا جانتی بھی ہو؟ سنو میں تمھیں بتاتا ہوں۔ تم چٹیالی علاقوں میں جا رہی ہو۔ وہ علاقے میرے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح بے جان ننگے اور خشک ہیں۔ تم وہاں کس سے ملو گی؟ وہاں اُجڈ اور گنوار دیہاتیوں کی بیویاں ہوں گی۔ اُن کے شوہر شرابی اور بدتمیز ہوں گے۔ سردی اور بارش نے تو وہاں کے درختوں کو بھی کالا اور ننگا کر دیا ہے۔ میری بچی تم اس جگہ جا رہی ہو! بائیکوف خرگوش کا شکار کرتا رہے گا اور تم؟ تم میری بچی۔ کیا ایک زمیندار کی بیوی بننا چاہتی ہو؟ وارنیکا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اب خط کسے لکھوں گا؟ اب میں وارنیکا کہہ کر کسے پکاروں گا؟ میں اس پیارے پیارے نام سے کس کو آواز دوں گا۔ میرے ننھے فرشتے میں تمھیں کہاں ڈھونڈوں؟ میں مر جاؤں گا! وارنیکا۔ میں یہ صدمہ نہیں برداشت کر سکوں گا۔ میں نے تمھیں خدا کا نور سمجھ کر پیار کیا ہے۔ اپنی بچی جان کر پیار کیا ہے۔ میں تمہارا نام لے لے کر جیتا تھا۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے میری زبان پر تمہارا نام رہتا تھا۔ میں کام ختم کر کے اور مسودوں کی نقل اُتار کے خطوں میں اپنے جذبات بیان کر دیتا تھا کیونکہ اس طرح میں تمھیں اپنے قریب محسوس کرتا تھا۔ شاید تم نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا لیکن یہ سچ ہے۔ سنو۔ میری بات سنو۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم جا رہی ہو۔ تم نہیں جا سکتیں۔ یہ ناممکن ہے! یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ارے بارش کتنے زور سے ہو رہی ہے۔ تمھیں تو سردی لگ جائے گی۔ تم اتنی کمزور اور نازک ہو۔ بگھی کی چھت سے پانی نیچے ٹپک پڑے گا۔ بگھی ٹوٹ جائے گی۔ اس شہر کی سڑکوں سے جاتے ہی تمہاری بگھی بگھی ضرور ٹوٹ جائے گی۔ کون جانے۔ پیٹرس برگ کی بگھی بنانے والے تو گدھے ہیں۔ انھیں تو صرف اتنا پتہ ہے کہ بگھی کو اور زیادہ خوبصورت کیسے بنا دیا جائے۔ لیکن وہ مضبوط بگھی نہیں بنا سکتے۔ نہیں وہ نہیں بنا سکتے۔ میں قسم اٹھا کے کہتا ہوں۔ میں بائیکوف کے پاؤں پکڑوں گا۔ اس کے پاؤں نہیں چھوڑوں گا۔ میں اپنی بات سچ ثابت کر دوں گا۔ وہ سٹ پٹا لیں گے۔ اور جانِ من تم بھی تو اس سے کہو۔ آہ کہہ دو کہ تم یہاں سے نہیں جا سکتیں کہہ دو کہ میں یہیں رہوں گی۔ میرے خدا۔ اس نے ماسکو کے سوداگر کی لڑکی سے کیوں نہ شادی کر لی۔ آہ کیا مصیبت پڑ گئی تھی۔ اس کے ساتھ شادی کر لیتا تو اسی کے حق میں اچھا رہتا۔ سوداگر کی لڑکی اس سے نباہ کر لیتی۔ مجھے پورا یقین ہے۔ پھر تم میرے پاس یہاں رہ سکتی تھیں۔ اور پھر تمھیں بائیکوف کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی؟ وہ تمھیں کب سے پیارا ہو گیا۔ ریشمی کپڑوں کی بنا پر تو تمھیں اس سے پیار نہیں ہو گیا نا؟ اور ریشمی دھاگے ہوتے کیا ہیں۔ اُن کا ذکر ہی کیوں کیا جائے بکواس ہے۔ اب سوال زندگی اور موت کا ہے ریشمی دھاگوں کا نہیں۔ ریشمی دھاگے کیا چیز ہیں کپڑا اور کیا۔ ارے گھٹیا کپڑا۔ بس مجھے تنخواہ مل لینے دو۔ ہیں ۔۔۔ میری تنخواہ آنے کا انتظار کر لو میری بچی تم جتنے ریشمی کپڑے کہو گی میں تمہیں خرید دوں گا؟ اسی دوکان سے ۔۔۔ یاد ہے نا؟ بس میری تنخواہ آ لینے دو۔ وارنیکا ۔۔۔ میری زندگی ۔۔۔ تب تک انتظار کر لو۔ وارنیکا خدا کے لئے رک جاؤ۔ کیا تم واقعی بائیکوف کے ساتھ چلی جاؤ گی۔ ہمیشہ کے لئے؟ نہیں وارنیکا نہیں۔ تم مجھے پھر خط لکھنا۔ اچھا۔ ایک خط تو اور لکھ دو! اور اُن چٹانوں کی بستی میں جا کر دوبارہ لکھنا۔ اگر تم نہیں لکھو گی تو یہ جو تمہارا خط میرے پاس پڑا ہے یہ آخری خط بن جائیگا۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ آخری خط نہیں ہو سکتا۔ ارے یہ کیسے ممکن ہے ۔۔۔ ایک دم ۔۔۔ یہ احساس کہ یہ تمہارا آخری خط ہے ۔۔۔ میں نہیں برداشت کر سکوں گا۔ میں تمھیں خط لکھتا رہوں گا۔ تم بھی لکھنا۔ اب تو میرے لکھنے کا انداز بگڑ رہا ہے ۔۔۔ کیسا انداز ہے مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ لیکن جب تک میں لکھے جاؤں تب تک کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ میری ننھی فاختہ ۔۔۔ میری بچی ۔۔۔ میری اپنی ۔۔۔!

میکسم گورکی

حقیقت پسندی کی حامل تمام ادبی تخلیقات کی بنیاد زندگی پر ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے گورکی نہ صرف بہت بڑا حقیقت پسند تھا بلکہ زندگی کا عظیم معلم بھی تھا۔ انشا پردازی ایک بہت پیچیدہ عمل ہے۔ اس کے لئے ایک ادیب کو اپنے تجربوں، اپنی معلومات، اپنے مشاہدوں، اخلاقی مقصد، اپنے جمالیاتی ذوق اور زبان و اظہار پر اپنے عبور کی مدد سے حقیقت کی ایک جھلک دکھانا پڑتی ہے۔ میکسم گورکی نے اپنی تمام تخلیقات میں حقائق کو بڑے ہی رنگ میں پیش کیا ہے۔ میکسم گورکی نے زندگی کو نہایت ہی قریب سے دیکھا تھا۔ وہ روس جیسے عظیم ملک کے ہر گوشے میں اکیس برس تک آوارہ گردی کرتا رہا اور زندگی کے مختلف سرچشموں سے اپنے ذہن و فکر کو سیراب کرتا رہا تھا۔ اس نے زندگی کے اتنے دلآویز نقش پیش کئے ہیں کہ آج تک وہ دنیا کے حقیقت پسند ادیبوں کو متاثر کرتا چلا آرہا ہے۔ ادیب اس کی نگارشات سے نورِ عرفان حاصل کرتے ہیں۔

گورکی نے اپنے ادب میں اپنے نظریہ (کمیونسٹ خیالات) کو کچھ ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ سمویا ہے کہ انھیں عظیم ادب کا روپ دے دیا ہے۔ اس کے ناولوں سے، اس کے مقالوں سے اور اس کے خطوط سے انسان کے ساتھ بے پناہ محبت کا چشمہ بہتا ہے۔

گورکی کا کمال یہ تھا کہ وہ اپنے ملک کے تاریخی حالات سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گورکی نے روسی عوام کے انقلابی شعور کو اور بھی پختہ کیا۔ گورکی کے شہ پارے آج کے حقیقت پسندانہ ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ گورکی کے وہی ناول اور افسانے زیادہ مقبول ہیں جو انھوں نے اپنی ابتدائی انقلابی زندگی کے دوران لکھے۔ آج کے ادب میں مثبت ہیرو کا وجود، بورژوازی کے خلاف جدوجہد، استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف احتجاج گورکی کی دین ہے۔ گورکی نے سماج کو گھن کی طرح چاٹنے والی تمام قوتوں کو بے نقاب کیا ہے اور ان کی بیخ کنی کے لئے آواز بلند کی ہے۔ عوام کی انقلابی سرگرمیوں نے گورکی کی تخلیقات میں بار پایا۔ اور گورکی نے عوام کی انقلابی سرگرمیوں کو کچھ ایسے حسن کے ساتھ پیش کیا کہ اب وہ دوسروں کے لئے چراغِ منزل ثابت ہو رہا ہے۔

گورکی کی اپنی زندگی بھی تاریکیوں کے خلاف ایک طویل جدوجہد تھی۔ وہ تپ دق کا مریض تھا، ان پڑھ اور یتیم تھا لیکن اس نے زندگی کی ان تمام دشواریوں پر عظیم الشان فتح حاصل کی۔ گورکی کا افسانۂ حیات انسان کی فتح و نصرت کا عظیم افسانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گورکی کے ہر ایک ناول میں جاندار رجائیت کارفرما دیکھتے ہیں۔ اس کی تخلیقات میں زندگی سے مایوس کردار بھی رکاوٹوں کو قدموں تلے روند دینے کی خواہش رکھتے ہیں۔

گورکی کے اس ناولٹ "اے غم دوراں" میں گورکی کے تمام فنی محاسن جذب ہیں۔ یہ داستان اتنی پیاری اور زندگی سے اتنی قریب ہے کہ آپ اپنی زندگی کی نیرنگیوں پر حیران بھی ہوتے ہیں اور زندگی سے محبت کرنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی زبردست خواہش بھی محسوس کرتے ہیں۔

میکسم گورکی

مترجم: خلیل احمد

اے غمِ دوراں!

گندے اور چھوٹے سے احاطے کے گرد لکڑی کے پرانے اور بوسیدہ مکان ہیں۔ یہ سینٹ پیٹرز برگ کی جائیداد ہے۔ انہیں میں سے ایک مکان کی بالکل نچلی منزل کی دو کھڑکیوں سے ہر شنبہ کی شام کو یہ ہنگامہ سنائی پڑتا۔

ٹھہر، ٹھہر۔ بدمعاش۔ شرابی۔ ٹھہر۔ ایک تیز نسوانی آواز آتی۔

نہیں مجھے جانے دے۔ کوئی مرد کہتا سنائی پڑتا۔

میں نہیں جانے دوں گی۔ کمبخت۔

اچھا تو نہیں جانے دے گی۔ دیکھتا ہوں۔

نہیں نہیں چاہے تو مجھے مار ڈالے۔

جا، تو دیکھ نہیں جانے دوں گی۔ نہیں۔ اچھا تو یہ۔

ہائے اللہ! یہ مجھے مار رہا ہے۔ اللہ رے اب تو جانے دیجئے۔

سینکا پیسز رنگ ساز تیخ کوف کے پاس کام سیکھتا تھا۔ اور تمام دن اس احاطے کے ایک شیڈ میں بڑا ابر طرح کے پنجوں کو تمرہ کرتا تھا۔ وہ پہلی ہی آواز پر دوڑ پڑتا اور چلاتا کہ "میاں بیوی پھر لڑ رہے ہیں"

اسے اس طرح کے ہنگاموں سے ایک خاص دلچسپی تھی۔ اور وہ اطمینان کے ساتھ آکر کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا۔ اور کھڑکی میں سر ڈال کر اس تاریک کمرے میں جھانکنا شروع کرتا۔ جھانکنے میں اس کی ناک میں کچھ چمڑے کی بساند۔ موم کی بو اور کمرے کی سیلن کی مہک آتی۔ نیچے تاریک کمرے میں دو انسان ہنگامہ کرتے ہوتے۔ گالی گلوچ لات اور مکے۔

تو مجھے مار ڈالے گا کمبخت۔ عورت چلاتی۔

کوئی فکر نہیں۔ اسکا شوہر اسے طنزاً تسکین دیتا۔

پھر لات اور گھونسوں اور ساتھ ہی ساتھ عورت کی ہانپنے والی اور کراہنے کی آواز آتی۔

اف کمبخت نے آخری گھونسہ کتنا زبردست رسید کیا۔ سینکا دوسرے تمام تماشائیوں کو بتاتا۔ مفت کا تماشا دیکھنے کو کافی لوگ جمع ہو جاتے۔ خصوصیت کے ساتھ عدالت کا پیادہ لیو جنکر اور باجے والا کسیلا کوف اس موقع پر ضرور موجود ہوتے۔ اور اندر کمرے کے حالات معلوم کرنے کے لئے بے چین۔ اگر سینکا تھوڑی دیر کو خاموش ہو جاتا تو وہ اسکی ٹانگ کھینچنے لگتے۔ اور کوئی اسکا رنگ آلود پتلون بھی کھینچنے لگتا۔ ہر شخص اس جھگڑے سے پوری دلچسپی لیتا۔

اچھا! اب وہ اسے پیٹھ کے بل زمین پر گھسیٹ رہا ہے۔ اور اسکی ناک زمین پر رگڑ رہا ہے۔ سینکا شان کے ساتھ منتظر تماشائیوں کو بتاتا۔

دوسرے لوگ بھی بری طرح اس تماشے کو دیکھنے کے مشتاق ہو جاتے ہر شخص کھڑکی کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا۔ اگرچہ ان میں سے تقریباً سب کو اس طرح کی مارپیٹ کا اپنا ذاتی تجربہ تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی اوہروف کی طرح استاد نہ تھا۔

"اسے کیا عام نے اس کی ناک توڑ ڈالی؟"

اوہ خون کے قطرے بہہ رہے ہیں۔"

ہائے اللہ! عورتیں چلاتیں۔ بڑا سفاک ہے ظالم!

لیکن مردوں کی تنقید میں زیادہ ڈھنگ کی ہوتیں۔

"یہ اسے ضرور مار ڈالے گا" وہ کہتے۔

میری بات سن رکھو۔ یہ اسے ایک نہ ایک دن چھرا مار دے گا۔ کسیلا کوف صاحب پیشین گوئی کرتے۔

"کھیل ختم" سینکا نے کہا۔ اور کھڑکی سے کود کر الگ ایک دوسری جگہ کھڑا ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب تھوڑی ہی دیر میں اوہروف باہر آ جائے گا۔

"اچھا پھینک ہو گئی"۔ کسیا کوف نے اس کے پاس رکتے ہوئے پوچھا۔ "اماں تم اس حالت میں کب تک بیٹھے رہو گے۔ آؤ چلیں کچھ پی پلا چلیں۔"

ذرا ٹھہر کے۔ ادولوف نے بغیر سر اٹھائے جواب دیا۔
"اچھا میں وہیں جیٹھ کے انتظار کروں گا۔"

تھوڑی ہی دیر میں ادولوف بھی وہیں پہنچ جاتا اور اس کے جاتے ہی اسکی بیوی کا سر سے پاؤں تک شال میں لپٹی ہوئی گھر میں سے دیواروں کا سہارا لیتی نکلتی۔ شال کے گھونگھٹ میں اس کا چہرہ ذرا ذرا سا دکھائی پڑتا۔ اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی اسی سل پر بیٹھ جاتی مشروبہ کو دیکھ کر کسی کو تعجب نہ ہوتا۔ اس لئے یہ ایک معمول ہو چکا تھا ـــــ وہ اپنے شوہر کے چلے جانے کے بعد آکر وہاں بیٹھ جاتی۔ اور سب کو یہ معلوم تھا کہ وہ اپنے شوہر کے آنے تک اب وہیں بیٹھی رہے گی۔ گھر میں بھی حبس تھا۔ دوسرے جب اسکا شوہر نشے میں بدمست گرتا پڑتا آنے کا تو اسے اس کے سہارے کی ضرورت ہوگی۔ ان کے گھر کا زینہ بالکل کھڑا تھا۔ اور ایک مرتبہ ادولوف نشے کی حالت میں اس سے گر چکا تھا۔ اور اسکی کلائی میں اتنی سخت موچ آئی تھی کہ وہ دو ہفتے تک کام کے قابل نہ ہو سکا۔ مشروبہ کو ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کچھ برتن ورتن بیچنا پڑے تھے۔ اس کے بعد سے ہمیشہ مشروبہ اسکا انتظار کرتی۔

کبھی کبھی اسکا کوئی پڑوسی بھی اسکے پاس آ بیٹھتا۔ عموماً حوالدار لیو جنکو اس خدمت کو سرانجام دیتا۔ لیو جنکو کی مونچھیں جھکی جھکی۔ سر گنجا ہوا اور ناک لال چقندر سی تھی۔

پھر جھگڑا ہو گیا! اس نے اسکی بغل میں بیٹھتا اور جماہی لیتے ہوئے کہا۔

پھر تم کو کیا! مشروبہ جھلاتی۔

نہیں۔ میرا تو کوئی مطلب نہیں۔ وہ پرسکون جواب دیتا۔

اور پھر کچھ دیر بالکل سکوت رہتا۔

لیکن عورت کی سانس کچھ گہری اور سنجیدہ ہو جاتی۔

تم لوگ کیوں لڑتے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد لیو جنکو پوچھتا۔

"یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔"

"اسمیں کیا شک ہے"۔ لیو جنکو تائید میں سر ہلاتا۔
"پھر کیوں بلا وجہ ٹانگ اڑا رہے ہو؟"

عجیب عورت ہے۔ اس سے تو بات کرنا دشوار ہے۔ اور جیسی تیز اور گرم تو ری کا جوڑا بھی ٹھیک ملا ہے۔ تم بھی صبح و شام دو مرتبہ ضرور ڈنڈے بازی ہو جب جاکے تیرا مزاج درست رہے۔

عجیب عورت ہے

اس طرح بک بک جھک جھک کرتے وہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ عورت اطمینان کا سانس لیتی۔ اسے لیو جنکو کی موجودگی کبھی پسند نہ آتی خاص طور سے جب سے لوگوں نے اسے لیو جنکو کے ساتھ بدنام کرنے کی کوشش کی۔ اور وہ اسوجہ سے اسے اس سے جلن پیدا ہو گئی تھی۔ ایسے تو اسے سب ہی سے ایک طرح کا بغض ہو گیا تھا۔ اور لیو جنکو باوجود پچاس سال کی عمر کے فوجی سپاہیوں کی طرح اکڑ اکڑ کر چلتا تھا۔

یک بارگی سینکا بھی معلوم نہیں کہاں سے وہاں پہنچ جاتا

"یہ عورت تو مزاج ہے تیتا مزاج۔ اور سے یہ ادولوف کی جورو۔" وہ لیو جنکو کے کان میں مشروبہ کی طرف اشارہ کرکے دھیرے سے کہتا۔

"اچھا بتاتا ہوں تجھے تیتا مزاج کیا ہوتی ہے" لیو جنکو اسے دھمکاتا۔ لیکن اسے یہ دبلا پتلا لڑکا بہت پسند تھا۔ اور اسکی باتیں وہ بہت دلچسپی سے سنتا۔ کیونکہ سینکا کو پورے احاطہ بھر کے راز معلوم تھے۔

مشروبہ کے پاس کسی کی دال نہیں گلتی۔ پیٹر و میکسم نے بھی ڈورے ڈالنا چاہے لیکن اسنے دھتا بتا دیا۔

سینکا ابھی صرف بارہ برس کا تھا۔ لیکن اس پر اس گندے ماحول کا پورا اثر پڑ رہا تھا۔ اس لڑکے کے بچپن سے جوانی مل رہی اور یہ دونوں قسم کے جذبات سے پوری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر فکر و جذبات کے اثرات ابھی سے نمایاں ہونے لگے تھے

احاطے میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ آسمان اگرچہ روشن تھا تارے چمک رہے تھے لیکن اگر اوپر سے اس احاطے کو دیکھا جاتا تو ایک ایسے اندھیرے گڑھے کی طرح دکھائی دیتا۔ جس کے چاروں طرف اونچی اونچی عمارتیں ہوں۔ اسی احاطے کے ایک کونے میں ایک عورت بیٹھی اپنی بار کو سہلا سہلا کر تسکین دیتی اور اپنے بدمست شرابی شوہر

دوسرے لوگ بھی جلد جلد کھسک گئے۔ وہ ڈرتے کہ کہیں غصہ سے بھرا سوپلی انہیں جاسوسی کرتے نہ دیکھ لے۔ وہ ایسی حالت میں اس کے سامنے آنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اور جب تماشا کچھ کچھ گھٹے ختم ہوتا۔ اور ایسا ان کے لئے اور کوئی دلچسپی کی چیز باقی نہ رہتی۔

عام طور سے ایسے وقت سوائے سپیکانے اس احاطے میں کوئی نہ ہوتا۔ اورلوف باہر نکلتا تو اس کی سانس چڑھی ہوئی۔ چہرہ غصہ سے تمتمایا اور نفرت میں ڈوبا وہ اپنی لال لال انگارہ آنکھوں سے پورے احاطے کا جائزہ لیتا۔ تھوڑی دیر اپنے ہاتھ کو کمر کے پیچھے کر کے ٹہلتا۔ اور ایک سیلے گاڑی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا۔ اور پھر کبھی کبھی تاؤ میں آ کر سیٹی بجاتا۔ اسکے منہ کا پسینہ اور خون کے دھبے پونچھے لگتا پھر اُسے جیسے بہت زیادہ تکان کا احساس ہوتا۔ اور وہ تھکے تھکے انداز میں ان کوارٹروں کے اس کونے کی طرف دیکھنے لگتا۔ جہاں کا پلاسٹر اکھڑ گیا ہے۔ اور بینچ کوف اور دوسرے رنگ ساز اکثر اسی جگہ دیوار پر رگڑ رگڑ کے اپنے برش صاف کرتے تھے۔

اورلوف کی عمر یہی کوئی تیس برس کی تھی۔ خدوخال دلآویز تھے۔ چہرہ اس کے بہت حساس ہونے کی گواہی دیتا تھا۔ مونچھیں اس کے چہرے پر خاص طور سے بہت سجتی تھیں سیاہ بھویں بہت گھنی اور ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ بھووں کے نیچے سیاہ گہری آنکھوں سے ذہنی بے اطمینانی نمایاں تھی۔ بدن کافی مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ قد درمیانہ بوجھ کام کی وجہ سے کچھ جھکا جھکا سا معلوم ہوتا۔ وہ دیر تک اس طرح سیلے پر بیٹھے بیٹھے اس کونے کو گھورا کرتا۔ اور وہ رہ رہ کر گہری ٹھنڈی سانس لیتا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ لیکن احاطے میں ویسا ہی حبس تھا۔ گلی سڑی ترکاریوں کی بساند۔ رنگوں اور تارکول کی بدبو مل کر ایک عجیب طرح کا تعفن پیدا کر رہی تھی۔ دونوں منزلوں کی تمام کھڑکیوں سے لڑنے اور گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور کبھی کبھی کسی کھڑکی سے کوئی جھانک کر ایک نظر اورلوف پر بھی ڈال لیتا اور پھر ہنس کر غائب ہو جاتا۔

جب رنگ ساز لوگ اپنے کام سے لوٹتے تو وہ چلتے چلتے اورلوف پر بھی ایک نظر ڈال لیتے۔ اور پھر ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارہ کرتے اور اپنی کاسٹرما بولی میں باتیں کرنے لگ جاتے۔

کوئی نہانے کی تیاری کرتا اور کوئی اور کچھ کام کی۔ پھر ملازماؤں کی ٹولی اپنے کوارٹروں سے باہر نکلتی اور رنگ سازوں کو چھیڑنے لگتی اور کبھی کبھی ان کے ٹیڑھے میڑھے تلفظ کا مذاق اڑاتی۔ پھر خوب دھما چوکڑی مچتی۔ لیکن اورلوف اسی طرح بیٹھا رہتا۔ جب کوئی اس کے پاس ایسی حالت میں آتا اور نہ اس سے مذاق یا چھیڑ چھاڑ ہی کی ہمت کرتا۔

وہ غصہ میں بھرا بیٹھا رہتا۔ سانس زور زور سے چلتی۔ نتھنے پھولا کرتے۔ اور ہونٹوں کو وہ بیٹھا بیٹھا عجیب عجیب طرح سے توڑ موڑا کرتا اور کبھی کبھی اس کے پیلے دانت بھی نمایاں ہو جایا کرتے۔ کبھی اسکی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا اور آنکھوں کے سامنے سرخ حلقے ناچنے لگتے۔ اس وقت اس کے دل میں واڈکا کی زبردست خواہش پیدا ہوتی لیکن ابھی تو تھوڑی ہی رات گئی تھی اور شراب خانے میں بھیڑ ہوگی اور اُسے ان لوگوں میں جاتے ہوئے شرم آتی۔

وہ ان کے مذاق کا نشانہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ گھر میں بھی تو نہ جا سکتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہاں اسکی بیوی پڑی کراہ رہی ہوگی۔ اور ایسی حالت میں اورلوف اس سے گھن کرتا۔

وہ وہاں پڑی کراہا کرتی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ وہ بے گناہ تھی اور اورلوف ظالم اور بے درد تھا۔ اسی کی ساری زیادتی تھی۔ خود اورلوف کو اسکا پورا احساس تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ غلطی اسکی اور صرف اسکی تھی۔ لیکن یہی احساس اس کے غصے کو اور بڑھاتا۔ اور پھر اُسے نیکی بدی کی تمیز نہ رہتی۔ اور اس کے اعصاب پر سفاکی اور بے رحمی کی خواہش غالب آ جاتی تھی جسے صرف واڈکا کی ایک بوتل ہی پورا کر سکتی۔

تھوڑی دیر میں کسلیاکوف باجے والا سرخ ریشمی قمیص اور مخملی صدری پہنے۔ پتلون کو جوتے کے اندر ٹھونسے آ موجود ہوتا۔ سبز کرتے میں لپٹا ہوا اسکا باجہ اسکی بغل میں ہوتا۔ اس کی مونچھیں خوب اینٹھی اور کھڑی کھڑی تھیں۔ چہرہ سے مسخرہ پن صاف نمایاں تھا۔ وہ آتے ہی اورلوف پر جملہ چست کرتا۔ جنگ میں فتح مبارک اور ساتھ ہی ساتھ پھٹے ہوئے ہونٹ اور دھنسی ہوئی آنکھ کا انعام بھی۔

اس کے مذاق کا اورلوف بُرا نہ مانتا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ کسلیاکوف کا مذاق محض تفریح کے لئے ہوتا ہے۔ اس میں طنز اور مضحکہ کا کوئی شائبہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔

کا انتظار کرتی ہوتی۔

اورلوف کی شادی کو چار سال ہو چکے تھے۔ اُن کے ایک بچہ بھی پیدا ہوا تھا۔ لیکن اٹھارہ مہینے کا ہو کر مر گیا۔ جس کا غم میاں بیوی نے بہت کیا تھا۔ لیکن اس امید پر کہ شاید اُن کے کوئی اور اولاد ہو جائے۔ دونوں نے صبر کر لیا۔

نچلی منزل کا وہ کمرہ جس میں وہ رہتے تھے بہت تاریک تھا اور اُسکی چھت ڈاٹ پر کی تھی۔ دروازے کے پاس کھڑکی کے نزدیک ایک روسی چولہا تھا۔ اس چولہے سے گزر کر دو کھڑکیاں احاطے میں کھلتی تھیں۔ اور روشنی کی دو ایک لکیریں ان کھڑکیوں میں سے گزر کر اس کے گھر میں آتیں۔ کمرہ میں تاریکی اور سیلن کی افراط تھی۔ اور اس کے سوا وہاں جیسے کچھ نہ ہو۔ اگرچہ اس جگہ پر کچھ لوگ رہتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود موت کی سی سنسناہٹ محسوس ہوتی تھی۔ چولہے سے ہٹ کر ایک بڑا پلنگ بچھا رہتا جس پر ایک پھولدار زرد رنگ کی چادر بچھی ہوتی۔ اس بستر کے مقابل میں ایک میز تھی جس پر یہ میاں بیوی کھانا کھاتے اور ناشتہ کرتے۔ دیوار اور [illegible] کی درمیانی جگہ میں بیٹھ کر میاں بیوی اپنا کام کرتے۔ کیونکہ [illegible] کھڑکیوں سے روشنی چھن کر گرتی تھی۔

[illegible] ادھر اُدھر جھینگر صاحب محوِ خرام ہوتے۔ ان [illegible] کو بھگو کر اورلوف دیواروں پر تصویریں چپکایا کرتا تھا بطور خوان لغما استعمال کرتے۔ مکھیاں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں بھنبھنایا کرتیں۔

اورلوف کے گھر کا معمول تھا کہ مٹروِنہ صبح ۶ بجے اُٹھتی اور ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے ٹوٹے پھوٹے سینکڑوں پیوند لگے ہوئے سماوار میں پانی گرم کرنے کو رکھ دیتی۔ اور پھر کچھ صفائی وغیرہ کر کے سَودا لینے چلی جاتی۔ وہاں سے آکر شوہر کو جگاتی اور جب تک وہ منہ ہاتھ دھو کر تیار ہوتا سماوار میں پانی اُبلنے لگتا اور میاں بیوی چائے اور روٹی کے ناشتے کے لئے بیٹھ جاتے۔

اورلوف بہت ہی اچھا موچی تھا اور اُسے کبھی کام کی کمی نہ رہتی۔ ناشتہ میں وہ دن بھر کے کام کو گنا دیتا۔ باریک اور نازک کام تو وہ خود کرتا اور چھوٹے موٹے کام مشاقت کو موم مل کر کرایا کرتا۔ لیکن جوتا مٹروِنہ کرتی۔ ناشتہ پر ہی دوپہر کے کھانے کے متعلق طے ہو جاتا۔ جن دنوں میں وہ کچھ زیادہ کماتے۔ اس دن کھانے کا موضوع اُن کے لئے کافی دلچسپ ہوتا۔ لیکن گرمیوں میں وہ ذرا ہاتھ روک لیتے۔ اور چولہا تو صرف اتوار کو جلتے۔ بلکہ بعض بعض اتوار کو بھی ناغہ کر جاتے۔ اس لئے وہ ایسی چیزیں کھاتے جن میں چولہے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ نہیں تو کبھی کسی پڑوسی کے چولہے پر اپنا گوشت پکا لیتے۔ ناشتے کے بعد وہ کام پر بیٹھ جاتے۔ اورلوف ایک برتن اوندھا کر دیتا۔ اور اس پر گدے کے لئے کچھ چیتھڑا رکھ کر بیٹھ جاتا۔ مٹروِنہ اسکی بغل میں ایک لکڑی کی بنائی چھوٹی چوکی پر بیٹھتی۔

کچھ دیر تو خاموش کام میں مصروف رہتے۔ کیونکہ بات کرنے کی کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ یا کبھی کبھی کام کے متعلق ایک آدھ بات ہوتی تو ہو گئی۔ ورنہ دیر تک دونوں چپ رہتے۔ صرف ہتھوڑے کی کھٹ کھٹ یا سلائی کے وقت دھاگوں کے شپ شپ کی آواز کانوں میں آتی۔ کبھی کبھی اورلوف جماہی لیتا۔ اور ساتھ ہی ہاہو کا ایک آدھ نعرہ لگا دیتا۔ مٹروِنہ بھی ایک آدھ گہری ٹھنڈی سانس لیتی۔ مگر گاہ کبھی کبھی گنگنانے لگتا۔ اسکی آواز اگرچہ سخت تھی۔ لیکن وہ گانا خاصا اچھا گاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اسکی آواز تیز ہو جاتی۔ اور پھر وہ پوری طرح گانے لگتا۔ اور اب مٹروِنہ بھی اس کے ساتھ گلا ملانے لگتی۔ پھر دونوں کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو جاتی۔ اور مٹروِنہ جھومنے لگتی۔ اور کبھی کبھی چپ بھی ہو جاتی۔ لیکن تھوڑی سی دیر میں پھر اس کا ساتھ دینے لگتی۔ چنانچہ وہ ایک طرح سے اپنے غموں کو اس میں ڈبو دینا چاہتے تھے۔ اپنی کھوکھلی زندگی میں وہ اس خیالی زندگی کو لانا چاہتے جو ان کے اپنے شعور میں بھی ابھی ناپختہ تھی۔ کبھی کبھی اورلوف نغموں میں اپنے الفاظ گھسیڑ دیتا۔ اور مٹروِنہ ان سے چڑ جاتی۔

"کیا بیہودگی ہے۔ یہ بیٹا بالس۔ رُوکو۔" اُسکے اس جملہ کا اورلوف پر ہمیشہ بہت بُرا اثر پڑتا۔ "یہ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بدمعاش بھی سمجھ رہی ہیں۔ گدھی کہیں کی۔ اچھا چنگا بند کر کے اب بھونکنا شروع کر دیا!"

"چپ رہ بدتمیز! اور اپنا کام کر۔ چلی ہے بڑی تمیز سکھانے"

اور [illegible] سنتے ہی مٹروِنہ بالکل چپ ہو جاتی۔ وہ دیکھ لیتی کہ اورلوف کی گردن کی رگ پھول چکی ہے۔ یہ خطرہ کی علامت ہوتی پھر مٹروِنہ دیر تک چپ سادھے رہتی۔ حتیٰ کہ اپنے شوہر کی بات کا بھی جواب نہ دیتی۔ اورلوف کو غصہ جتنا جلد چڑھتا اتنی تیزی سے

آتا تھا۔

اوردولف اسکی طرف غصے کے مارے تکتا اور اس کی مسکراہٹ کا انتظار کرتا لیکن وہ نظریں جھکائے رہتی۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اسکے جذبات سے کھیلنا ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔ اور اکثر اس کے جنونانہ غصے کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے یہ خوشی ہوتی۔ کہ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہے اور وہ اسے منانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں زندگی ہے احساس ہے اور جذبات ہیں۔

دونوں جوان اور تندرست تھے۔ ایک دوسرے سے محبت رکھتے اور اس پہ ناز بھی کرتے تھے گریگوری نوجوان خوبصورت اور تندرست تھا۔ شوہر گوری۔ گداز بدن اور حسین تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ لیکن زندگی سے تنگ رہتے تھے۔ ان کے سامنے کوئی مستقبل نہ تھا۔ زندگی بالکل ٹھس ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کے دلوں میں اب جذبات اور امنگیں نہیں تھیں۔ وہ زندگی کی یکسانیت سے تنگ تھے۔ خواہش۔ احساس۔ مختصر یہ کہ زندگی کی کمی کو بری طرح محسوس کرتے تھے۔ ان کے دل کی آرزوئیں اور تمنائیں کچھ اس طرح سے مر گئیں تھیں کہ اب انہیں کوئی خواہش پیدا ہی نہ ہو۔ خواہ وہ صرف دولت ہی جمع کرنے کی خواہش ہو۔ پیسہ پیسہ جوڑنا۔ لیکن یہ بھی انہیں میسر نہ تھا۔

ہر وقت اکٹھا رہنے سے وہ ایک دوسرے کو اس طرح سے جان گئے تھے کہ اب مزید کسی علم کا کوئی امکان ہی نہ رہ گیا تھا۔ وہ جانتے کہ اب دوسرا کیا کہے گا میں کیا جواب دوں گا۔ روزانہ ایک سی زندگی۔ زندگی میں کوئی جان نہ رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی چھٹیوں میں وہ دوستوں سے بھی ملنے جاتے۔ لیکن ان کے دوست ان سے بھی زیادہ کم مایہ۔ ان میں تو احساس بالکل مردہ ہو چکا تھا۔ یہ دوست کبھی اوردولف کے گھر بھی آتے لیکن سوائے شراب و ناچ کے اور کوئی بات نہ ہوتی۔ نہ جنگ۔ نہ جھگڑا نہ فساد۔ زندگی کی ایک بھی علامت نہیں اور پھر دوسرا دن آتا۔ بالکل اس طرح سے جیسے سلسلے کی کڑیاں ہیں جو کہ ایک کے بعد دوسری آتی چلی جاتی ہیں۔ وہی کام وہی لوگ۔ وہی اکتاہٹ وہی یکسانیت۔ وہ زندگی سے عاجز تھا۔

کبھی کبھی اوردولف کہتا۔

یہ کمبخت زندگی۔ اسکا مصرف ہی کیا ہے! کام کرو اور افسوس کرو۔ اور پھر کام کرو۔ پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اپنی نظریں چھت کی طرف اٹھاتا اور زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑانے لگتا۔ خدا کی مرضی سے میری ماں مجھے اس دنیا میں لائی۔ ان کے خلاف کیا ہوں۔ پھر میں نے اپنا کام سیکھا۔

لیکن اس سے فائدہ۔ کیا دنیا میں موچیوں کی کمی ہے۔ خیر چلو میں بھی ایک موچی سہی۔ آخر اس سے مجھے کیا ملا۔ اس گندی کوٹھڑی میں بیٹھے کیلیں جڑا کروں۔ ایک دن میں مر جاؤں گا۔ ہمیشہ چپل رہا ہے۔ جیسے دو ہزار برس زمانے میں ایک موچی تھا۔ ہمیشہ کچیلا گندہ ہی۔ کیا ہوا اس سے اگر میں زندہ رہوں اور جوتے بناؤں یا مر جاؤں۔

مطرونہ چپ چاپ سنا کرتی۔ اپنے شوہر کے خیالات سنتے سنتے اس کے دل میں اس کے احترام کا جذبہ بھی پیدا ہوتا۔ پھر بھی اسے ایسی باتیں کہنے سے منع کرتی۔ کیونکہ یہ گناہ ہے اور اللہ کے خلاف بغاوت ہے۔ خدا جو کرتا ہے وہ بہتر ہوتا ہے۔ اور کبھی جب وہ جھنجلا جاتی تو کہتی کہ تم شراب پینا چھوڑ دو تو تمہاری زندگی سدھر جائے۔ دوسرے کتنے لوگ ہیں جو روپیہ بچا کر کارخانے قائم کر لیتے ہیں اور پھر شریفوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

تم بدھو ہو اور عقل سے خالی۔ ذرا سوچو تو میں شراب کیسے چھوڑ دوں۔ میری زندگی میں مسرت کی تو یہی ایک کرن ہے۔ دوسرے لوگ! دوسرے لوگوں کے متعلق تمہیں کیا معلوم ہے۔ کیا میں بھی شادی سے پہلے ایسا ہی تھا۔ اور سچ کہنے کو ہو تو تم نے میری تمام مسرتوں کو چوس لیا۔ تم جونک ہو جونک۔

مطرونہ کو اسکی بات بری معلوم ہوتی۔ لیکن وہ پھر بھی اپنے شوہر کی سچائی سے متاثر ہوتی۔ وہ سوچتی کہ ہاں وہ حقیقت میں پہلے بہت ہنس مکھ تھا۔ پہلے تو وہ نشے میں بھی ہنستا تھا۔ ہاں گریگوری شادی سے پہلے بہت نرم دل اور ہمدرد تھا۔

میں اس پر بار ہوں! وہ اپنے آپ سے سوال کرتی۔

یہ سوچ سوچ کر اسے جھرجھری آ جاتی۔ اور وہ اپنی اور اوردولف دونوں کی زندگیوں پر افسوس کرنے لگتی۔ پھر وہ اسکی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتی۔ اور اس کے سینے سے لگ جاتی۔

اچھا اب ہٹ جا۔ بہت ہو چکے نخرے۔ اوردولف مسکراتے ہوئے اس طرح سے کہتا جیسے کہ وہ ابھی اسے اپنے سے الگ کر دے گا۔

لیکن مسز ورنہ اس سے اور لپٹ جاتی اور اسے یقین تھا کہ وہ اسے نہ ہٹا سکے گا۔

اس پر اورلوف بھڑک اٹھتا۔ اور کام کو چھوڑ چھاڑ کر بیوی کو اپنی گود میں بٹھا لیتا۔ اور اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دیتا۔ اور اس سے بہت دھیرے دھیرے محبت کی باتیں کرنے لگتا وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا اس کی محبت کی باتوں کو سن لے۔

آخر مسز ورنہ ہماری بھی زندگی کیا زندگی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جانوروں کی طرح پھاڑ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ لیکن ایسا کیوں ہے کچھ بھی نہیں یہ صرف ہماری قسمت ہے۔ ہر آدمی کا ستارہ ہوتا ہے اور دہ ستارہ اس کی قسمت ہے۔ منحوس یا مبارک۔

لیکن اسے اس جواب سے تشفی نہ ہوئی۔ وہ اپنی بیوی کو اور لپٹا لیتا اور سوچنے لگتا۔

وہ دونوں دیر تک اس طرح اس تاریک اور متعفن کمرے میں بیٹھے رہے۔ مسز ورنہ سوائے ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے کچھ نہ کہتی اور اس موقع پر اسے وہ چوٹیں یاد آتیں جو اس کے شوہر نے بلاقصور اسے پہنچائی ہیں۔ اور پھر اس کے آنسو نکل آتے۔ اور کبھی کبھی ایک آدھ لفظ شکایت کا بھی اس کے منہ سے نکل جاتا اورلوف اسوقت بہت متاثر ہوتا۔ اور اسے زیادہ پیار کرنے لگتا۔ اس کی تسکین اور دلاسے سے پر مسز ورنہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اورلوف چڑ جاتا۔

چل اب بسورنا بند کر۔ نہیں تو میں تجھے پھر پیٹ کر رکھ دوں گا۔ چاہے مجھے پچھتا کر جان بھی دے دینا پڑے۔ سن لیا اچھا اب چپ ہو جا۔ عورت کو انگلی پکڑاؤ۔ اور وہ فوراً گردن ناپنے لگے گی۔ یہ رونا دھونا بند کر۔ ایک زندگی سے عاجز مرد کو اس طرح تسکین دیا کرتی ہے۔

کبھی کبھی جب وہ ہوش میں ہوتا تو ایسے موقعوں پر اسے سمجھانے کی بھی کوشش کرتا۔

میرے جیسے آدمی کس کے کام کے! میں نے تمہیں ہمیشہ دکھ دیا۔ لیکن ساتھ ہی من میں میں نے ہمیشہ تم کو اپنا سمجھا۔ ہاں کبھی کبھی مجھ پر خود فراموشی کا دورہ طاری ہو جاتا ہے۔ اور میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ اور پھر بھی تجھے بھی ایک نظر برداشت نہیں کر پاتا۔ اس کا بھی کبھی تم نے خیال کیا ہے۔ میں نے تم سے بہت زیادہ محبت کی ہے اور اب جیسے میرا جی بھر گیا ہے۔ اور پھر مجھ پر جنون کا دورہ پڑتا ہے اور میں چاہتا ہوں۔ تمہارے بلکہ اپنے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں۔

اگرچہ وہ اس کی پوری بات نہ سمجھ پاتی۔ لیکن پھر بھی اس کی اس طرح کی گفتگو سے وہ بہت متاثر ہوتی اور اسے کچھ تسکین بھی حاصل ہوتی۔

خدا نے چاہا تو یہ مشکلیں سب دور ہو جائیں گی۔ اور ہم ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو جائیں گے۔ وہ شاید کبھی جانتی تھی کہ وہ دونوں نہ جانے کب کے ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہو چکے ہیں۔ اتنے قریب کہ انہوں نے ایک دوسرے کو کھا ڈالا ہے۔

"اگر ہمارے ایک بچہ ہوتا" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی۔ "تو ہمارے لئے ایک دل بہلاوا ہو جاتا۔"

"تو پھر کیوں نہیں ایک بچہ پیدا کر لیتی۔"

"لیکن میرا حمل رک کب سکتا ہے۔ تم مجھ اس بیدردی اور بے ڈھب طرح سے مجھے مارتے ہو کہ حمل قائم ہو نہیں سکتا۔ تم پیٹ پیٹو کسی حصے کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اور گھونسے لگنے کی اور بات ہے لیکن تم تو لاتیں بھی بہت بے احتیاطی سے مارتے ہو۔"

"ہوں۔ تو کوئی ایسا بھی ہے جو غصے میں احتیاط کے ساتھ مار پیٹ کرتا ہو۔ میں مکار نہیں ہوں۔ مارتا ہوں تو مارتا ہوں اور وہ بھی اپنی مسرت کے لئے نہیں بلکہ میری بے بسی و بے چارگی مجھے مار پیٹ پر مجبور کر دیتی ہے۔"

"یہ بے بسی کہاں سے آتی ہے۔ تمہاری بے بسی؟"

"یہ میری قسمت ہے مسز ورنہ۔ گریگوری فلسفیانہ انداز میں کہتا یہ میری قسمت ہے اور میری فطرت۔ مجھے دیکھو۔ کیا میں دوسروں سے الگ لگتا ہوں۔ لیو چیکو کو ہی دیکھو۔ وہ اکیلا ہے۔ نہ اسکے بیوی ہے اور نہ اور کوئی۔ اگر میری بیوی نہ ہو تو میں مر جاؤں لیکن وہ کمبخت پھر بھی ہر وقت خوش رہتا ہے اور مگن ا پنا پاپ پیا کرتا ہے۔ اسے یہی ناز ہے کہ اس کے پاس ایک پاپ تو ہے۔ لیکن مجھ سے یہ کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے بالکل سکون نہیں۔ میری آتما معلوم نہیں کتنی بھوکی ہے۔ شاید اس کا پیٹ کبھی نہ بھرے میں

کو ایک بہت کمزور درخت سا ہوں ۔ جیسے ہوا کی ایک جنبش مجھ کو گھنٹوں نہیں دوں ہلاتی رہتی ہے ۔ شام میں بازار جاتا ہوں ۔ وہاں ہزاروں چیزیں ہوتی ہیں ۔ میں انہیں دیکھتا ہوں اور پھر گھر چلا آتا ہوں تنہا ۔ ان میں سے کوئی بھی چیز میری اپنی نہیں ہوتی ۔ یہ کیفیت مجھے دیوانہ بنا دیتی ہے ۔ اور میں آپے میں نہیں رہ پاتا ۔ لیکن پیوچکر اسکو جیسے کوئی پرواہی نہیں ۔ مجھے تو اسکا سکون دیکھ کر بھی غصہ چڑھ جاتا ہے مردہ دل کر جیسے کسی چیز کی چاہت ہی نہیں ۔ اس کا کام بغیر کسی چیز کے چل رہا ہے ۔ ادھر میں ہوں کہ مجھے ہر چیز چاہئیے ۔ ایک چیز کی کمی بھی مجھے پاگل بنا دینے کو کافی ہے ۔ لیکن میرے لئے صرف یہی ایک تاریک کمرہ ہے ۔ اور کوئی بھی چیز میری نہیں ہے ۔ تم اپنے ہی کو لو ۔ تم میری بیوی کا ہو ۔ لیکن اس سے کیا ہوا ۔ تم صرف ایک عورت ہو جیسی کوئی دوسری عورت ۔ اور پھر میں تم کو بالکل جان گیا ہوں ۔ سر سے پیر تک ۔ اب تم میں کوئی ایسی چیز نہیں رہ گئی ۔ جسے جانا چاہئے ۔ مجھے معلوم ہے اب تم روؤ گی تو تمہارا منہ کیسا بنے گا ۔ کل ہنسو گی تو کیسی شکل ہوگی اور اگلے دن اگر چیخو گی تو کیسی آواز آئے گی کیونکہ میں لاکھوں بار تمہیں ہزاروں بار ہنستے اور ہمیشہ چیختے سن چکا ہوں وہ شکلیں اور آوازیں میرے آنکھ کان میں رچ بس گئی ہیں اب یہ میرے لئے وہ کیا لا سکیں گی ۔ کچھ بھی نہیں ۔ اور اسی لئے میں شراب خانے چلا جاتا ہوں ۔ وہاں کچھ تسکین ہو جاتی ہے

"پھر تم نے شادی کیوں کی ؟ مٹرونہ نے پوچھا ۔"

گرگیوری ہنسا ۔

"خدا جانے کیوں ! اور سچ پوچھو تو مجھے شادی نہیں کرنی چاہیئے تھی ۔ مجھے تو خانہ بدوش ہونا چاہیئے تھا ۔ شاید اس سے مجھے فاقے کرنے پڑتے ۔ لیکن کم از کم میں آزاد تو ہوتا جہاں چاہتا چلا جاتا ۔ اور اس طرح تمام دنیا کے چکر لگاتا ۔"

"تم اب بھی جا سکتے ہو ۔ مجھے آزاد کر دو ۔ مٹرونہ نے ملتجی آواز میں کہا ۔"

"نہیں ۔ اچھا تم کہاں جانا چاہتی ہو ؟" گرگیوری نے سنجیدہ ہو کر پوچھا ۔

"جہاں میری مرضی ۔"

"بتا کہاں ؟" اسکی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے ۔

"چلاؤ مت ۔ تم اس طرح مجھے دھمکا نہیں سکتے !"

"اچھا تو تو نے کسی اور کو دیکھ لیا ہے ۔ بتا وہ کون ہے ؟ جلد بتا ۔"

"بس مجھے جانے دے ۔"

"کہاں جانے دوں ؟" گرگیوری گرجا ۔ اور پھر اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا ۔ گرگیوری کے غصے نے مٹرونہ کو بھی تاؤ دلا دیا ۔ اور بجائے اس کے کہ وہ اسکی تسکین کرتی وہ بے معنی چیز نظروں سے اسکی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی ۔ گرگیوری اب غصے کی تاب نہ لا سکا ۔ اور اسے بری طرح مارنے لگا ۔

رات کو جب وہ اس کے پہلو میں لیٹی کراہ رہی تھی ۔ اس کے تمام بدن پر نیل پڑ گیا تھا ۔ اور کہیں کہیں زخم پھوٹ گیا تھا ۔ تو گرگیوری نے اسکی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری ۔ اسکا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا ۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے لئے کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ۔ پھر اسکی جلن بے وجہ تھی ۔

"اچھا تو بھی اب سن جا ۔ میں مانتا ہوں کہ میرا قصور تھا ۔ پھر تو نے بھی تو کچھ جواب نہ دیا ۔ بلا وجہ مجھے بھڑکا دیا ۔ تم ایسی کیوں کرتی ہو !"

اسنے کوئی جواب نہ دیا اسے معلوم تھا کہ ایسی مار پیٹ کے بعد یہ موقع آتا ہے اور وہ پھر اسے منانے کی کوشش کرتا اور پھر وہ مجسم محبت بن جاتا اور اس کی محبت کے لطف تصور ہی سے اسکی آنکھیں بھر آتیں ۔ "آجا ۔ پیاری مٹرونہ اب آجا ۔ میری پیاری ۔ میری لاڈلی ۔ اب نہ رو ۔ مجھے معاف کر دے ۔ میری جان ۔ وہ اس کے بالوں کا بوسہ لیتا ۔ اور اسے خوب پیار کرتا ۔

ان کے گھر کی کھڑکی اگرچہ کھلی تھی ۔ لیکن وہاں سے آسمان دکھائی نہ دیتا تھا کیونکہ بیچ میں ایک دیوار حائل تھی ۔ اور ان کے کمرہ میں بدستور حبس اور اندھیرا تھا ۔

"آخر یہ کیا زندگی ہے ۔ کتے کی زندگی ۔ کہہ کر گرگیوری نے ایک ٹھنڈی سانس لی ۔ اور وہ اپنے درد کا اظہار کے لئے الفاظ ہی نہ پاتا تھا یہ سب اس مردار کال کوٹھڑی کی بدولت ہے ۔ جس میں ہم رہتے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ہم یہاں جیتے ہی دفن کر دیئے گئے ہیں ۔"

"تو پھر کہیں اور جگہ کیوں نہ چلے چلیں ۔" مٹرونہ نے اسکا مطلب

نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ اگر ہم محل میں بھی چلے جائیں تو وہ ہمارے لئے کالی کوٹھڑی ہوگا۔ یہ کمرہ نہیں کالی کوٹھڑی بلکہ یہ ہماری زندگی ہے جو ہر چیز کو کالی کوٹھڑی بنائے ہوئے ہے۔"

مسٹرونہ تھوڑی دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی اگر خدا نے چاہا تو ہمارے دن پھر جائیں گے۔"

" دن پھرنے کی بات تم روز کہا کرتی ہو لیکن دن تو روز بروز بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں۔ ہماری لڑائیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔"

اسکی یہ بات بھی ٹھیک تھی کہ اب انہیں جلد جلد جھگڑا ہونے لگا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو سوائے سنیچر کے ایسا اتفاق کم ہوتا تھا "... تو میں اب خانے میں جاکر خوب شراب پیوں گا۔ یعنی شراب اتنی شراب کہ پھر مجھے کسی چیز کی ہوش نہ رہے۔"

مسٹرونہ کی بھویں سکڑ گئیں۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ یہ ٹھیک ہے۔ تم ہرگز نہ بولنا۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو کہ خاموشی ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

اورلوف نے دن میں کتنی بار اپنے ارادے کو بیان کیا جیسے جیسے شام ہوتی جاتی تھی اس کے خیالات کا زور بڑھتا جاتا تھا۔ اسے بار بار یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کے الفاظ سے مسٹرونہ کے دل پر چوٹ پڑتی تھی۔ اور اس کے دل کو اس سے ایک طرح کی راحت بھی پہنچتی تھی۔ لیکن ایسے موقع پر اسے مسٹرونہ کی خاموشی بہت کھلتی تھی اور وہ کنول اور کرہ جاتا تھا۔ اسکا سکون اس کے غصے کو اور بڑھا رہا تھا۔

اور پھر شام کو سیکا نے رات کے جھگڑے کا اعلان کر ہی دیا۔

جب بھی اورلوف اپنی بیوی کو مارتا اس دن وہ تمام رات واپس نہ آتا۔ اور کبھی کبھی تو وہ اتوار کو بھی واپس نہ لوٹتا۔ زخموں سے چور۔ مسٹرونہ پڑی اپنے شوہر کا انتظار کرتی۔ اسکا شوہر جب آتا تو اسکی حالت بہت ہی خستہ ہوتی۔ لیکن وہ خاموش رہتی۔ پر اسکا دل ہمدردی سے لبریز ہو جاتا۔ آخر یہ اسکا شوہر ہی ہے۔ جو لوٹ کر ہر حالت میں اس کے پاس آتا ہے۔

وہ جانتی تھی کہ اب اسکا نشہ ٹوٹ رہا ہوگا۔ اور اسے خمار کی تکلیف ہوگی۔ اس خیال سے وہ تھوڑی سی شراب اس کے لئے اپنے پاس رکھتی۔ اورلوف کو بھی اسکا علم تھا۔

"مجھے کچھ دے۔" اور پھر وہ چند گلاس پی کر وہ کام پر بیٹھ جاتا۔ تمام دن وہ اپنے ضمیر کی سرزنش برداشت کرتا۔ اور اکثر جب یہ تکلیف ناقابل برداشت ہو جاتی تو وہ کام سام چھوڑ دیتا اور اول فول بکنے لگتا۔ اور کبھی اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ یا جاکر بستر پر پڑا رہتا مسٹرونہ انتظار کرتی کہ وہ قابو میں آئے اور پھر دونوں میں صلح ہو جاتی۔

شادی کے شروع کے دنوں میں جنگ کے بعد صلح کے لمحات ایک خاص مسرت لاتے جسمیں درد اور مٹھاس دونوں ہی ہوتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ زندگی کی مجبوریاں غالب آگئیں۔ وہ سمجھ گئے کہ اب وہ دونوں ایکدوسرے سے بغیر بولے گزارہ نہیں کر سکتے تھے۔ زندگی کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا تھا۔ اور اب یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک ہفتہ تک ایکدوسرے سے نہ بولیں۔

"تم ایک دن شراب پیتے پیتے مر جاؤ گے۔" مسٹرونہ آہ بھر کر کہتی ہاں۔ اورلوف تائید کرتا۔ اور پھر ایک عجیب استغنا کے ساتھ تھوکتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اسے جینے اور مرنے کی پرواہ نہیں۔ اور پھر تم مجھے چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤ گی۔ اورلوف اسے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے کہتا۔

وہ اپنی نظریں جھکا لیتی۔ اور وہ اتنی حیا پہلے نہ کرتی تھی اورلوف اسے دیکھ کر بھویں سکوڑ لیتا اور دانت بھینچ لیتا۔ مسٹرونہ اپنے شوہر کو بلا بتائے بہت سے جوتشیوں اور پیروں کے پاس گئی۔ کہتے ہیں جڑی بوٹیاں اور تعویذیں لاتی۔ بزرگوں کے مزاروں پر گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ ایسے بزرگوں جنہوں نے ہزاروں شرابیوں کو آن واحد میں ولی کر دیا تھا۔

لیکن اسکی دعائیں بے اثر رہیں۔ اور پھر اس کے بھی دل میں اس خرابی سے گھن آنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ اسکا دل اورلوف کی طرف سے سخت ہوتا گیا۔ حالانکہ یہ وہی آدمی تھا جس نے تین سال پہلے اپنی نرم و نازک بات اور ہنس مکھ پن سے اس کے دل کو جیت لیا۔ اور اس کے دل میں ہزاروں نئی نئی امنگیں پیدا کر دی تھیں

کو پیک میں آپ جتنا چاہیں مجھ تا خرید سکتے ہیں اور بہتر ہو کہ آپ شراب چھوڑ دیں۔ اچھا چلے۔ گڈ بائی۔ پھر ملیں گے۔

جیسے وہ آیا تھا ویسے ہی وہ یکبارگی غائب ہو گیا۔ لیکن اسکا مسکراتا ہوا چہرہ۔ میٹھی باتیں ابھی میاں بیوی کے نظروں میں پھر رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اور اپنے تاریک کمرہ میں اس طرح کے انسان کے آنے نے انہیں سخت متحیر کر چاتا

ایک لمبی آہ کے ساتھ گریگوری نے کہنا شروع کیا۔ یہ تھا تمہارا سینیٹری انسپکٹر۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ لوگ دوسروں کو زہر دیتے ہیں۔ ایسی شکل کا انسان کس کو زہر دے سکتا ہے۔ ہرگز نہیں اس کی باتیں کتنی دل نشیں تھیں۔ اور وہ کتنی صاف گفتگو کرتا تھا۔ اس نے کتنی سادگی اور صفائی کے ساتھ کہا تھا کہ میں سینیٹری انسپکٹر ہوں۔ اور پھر اس نے چونے کو کہا تھا کیا چونا بھی کبھی زہر ہوا ہے اور سٹرک ایسڈ۔ یہ کیا ہے۔ شاید معمولی تیزاب۔ لیکن سب سے اہم بات تو صفائی ہے۔ صاف فرش۔ صاف برتن اور صاف برتن مانجنے کی جگہ اور صاف نالیاں۔ یہ لوگوں کو زہر دیں گے! اخ۔ کیا خوب آدمی تھا۔ مٹرونہ تم نے سنا تھا کہ اس نے کہا تھا کہ ایک مزدور کو شراب ضرور پینی چاہیئے۔ لیکن اسے معلوم ہو کہ کب بس کرنا چاہیئے۔ اچھا مٹرونہ تو پھر تم مجھے ایک گلاس دے دو نا۔ کچھ رکھے ہو؟

اور پھر مٹرونہ کہیں سے ایک بوتل نکال لائی۔ اور اسکا آدھا گلاس بھر دیا۔

وہ سچ مچ اچھا آدمی تھا۔ ہر ایک کو بھلا لگنے والا۔ مٹرونہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اسکی نظروں کے سامنے اس طالب علم کا چہرہ گھوم گیا۔ ہاں یہ جو زہر کی بات تھی۔ ہو سکتا ہے۔ کہ کچھ لوگ اس کے لئے نوکر رکھ لئے گئے ہوں۔

نوکر رکھ لئے گئے ہوں۔ گریگوری نے بات کاٹی۔ کس لئے! آخر انہیں کیوں کوئی رکھے گا۔

لوگوں کو مارنے کے لئے۔ کہتے ہیں کہ غریب لوگ بہت بڑھ گئے ہیں اور انہیں کم کر دینے کا حکم ہو چکا ہے۔ مٹرونہ نے تشریح کی۔

"کون کہتا ہے؟

سب ہی لوگ۔ انہیں رنگ سازوں کی باورچن نے اس دن کہہ رہی تھی۔ اور سب ہی لوگ کہتے ہیں۔

سب گدھے ہیں۔ اس سے کسی کو کیا نفع ہوگا۔ تم خود ہی سوچو کہ بیماری میں کتنی الجھن اور کتنا خرچ ہوتا ہے۔ اور پھر مرنا دفنانا۔ قبر۔ کفن اور معلوم نہیں کتنے خرچ بڑھ جائیں گے۔ اور یہ سب خرچ گورنمنٹ کیوں بلا وجہ اپنے سر مول لے۔ اگر وہ ان سے نجات ہی پانا چاہتی ہے تو پھر سب کو سائبیریا بھیج دے۔ جہاں ایسے ایسے کروڑوں آدمی ایک کونے میں آ سکتے ہیں اور پھر وہاں بھیجنے پر گورنمنٹ کو نفع ہی نفع ہے۔ مار کر دفن کر دینے میں تو گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ اور گورنمنٹ تو ہمیشہ منافع چاہتی ہے کیا وہ کبھی اپنے لئے گھاٹا چاہے گی۔ اب اسی طالب علم کو لے لو۔ کیا کوئی اسے مارنے کے لئے نوکر رکھے گا۔ اس کی شکل ہی مارنے والوں کی سی نہیں۔ وہ کیا کسی کو مارے گا۔ ہاں وہ ہماری حالتوں میں انقلاب ضرور چاہتا ہے۔

اس دن تمام وقت اسی طالب علم کے متعلق باتیں کرتے رہے اسکی ہنسی۔ اس کے بات کرنے کا ڈھنگ۔ اسکا مسکراتا چہرہ۔ اسکا لباس وغیرہ۔ بلکہ ایک بار تو میاں بیوی اس بات پر جھگڑ پڑے اسکے کوٹ کا جو بٹن ٹوٹا تھا وہ کس طرف کا تھا۔ مٹرونہ کہتی تھی کہ وہ داہنی طرف کا تھا۔ لیکن اولوف اصرار کرتا کہ نہیں وہ بائیں جانب کا بٹن ٹوٹا تھا۔ اور غصہ میں آ کر اس نے مٹرونہ کو تین چار صلواتیں سنا دیں۔ لیکن پھر اسے فوراً یاد آ گیا کہ مٹرونہ نے ابھی بوتل میں تھوڑی سی شراب بچا رکھی ہے۔ اس لئے وہ اسکی بات مان گیا۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ کل وہ تمام فرش وغیرہ صاف کر ڈالیں گے اور اس کے بعد وہ پھر تازہ جوش و خروش کے ساتھ اس طالب علم کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

کمبخت۔ ہم سے کس طرح باتیں کرتا تھا۔ جیسے ہم سے اسے برسوں کی شناسائی ہو۔ ہر جگہ اپنی ٹانگ پھنسا رہا تھا اور پھر کلچر دے کر چلتا بنا۔ نہ کوئی غرور۔ نہ غل۔ نہ کوئی دھونس۔ وہ آیا اور کہہ کر چل دیا۔ مٹرونہ میں کہتا ہوں کہ یہ سب گدھے ہیں۔ یہ سینیٹری انسپکٹر تو ہماری جان کی حفاظت کے لئے آیا تھا۔ اور یہ زہر دہر

کی بات محض بکواس ہے۔ ہمارے پیٹ کا بھی حال تو اس نے پوچھا۔ اور پھر کسی اچھی طرح سے اس نے جراثیم کے بارے میں بتایا کہ ان کا نام بتایا تھا اس نے مٹروند۔ خیر جانے دو۔ لیکن یہ بات کہ اس نے صرف ڈرانے کو کہی تھی کہ ہم مکان و فرش صاف رکھیں۔

کون جانے۔ ہو سکتا ہے اس نے جو کچھ کہا ہو سچ ہی ہو۔ آخر سینکڑوں ہی کیڑے تو پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں اس نے ان کیڑوں کا نام کیا بتایا تھا۔ پولی وگ۔ نہیں نہیں۔ ارے نام تو میرے دل میں ہے لیکن زبان پر نہیں آرہا ہے۔

سوتے سوتے بھی وہ اسی کی باتیں کرتے۔ انہیں آج بچوں کی طرح سے مسرت حاصل تھی۔ بلکہ وہ نیند میں بھی سب بڑبڑا رہے تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی انہیں رنگ سازوں کی باورچن نے آجگایا۔ اسکا چہرہ آج کچھ اترا ہوا تھا۔

اٹھنے کا وقت ہوگیا۔ ہمارے گھر میں تو ہیضہ آگیا خدائی لعنت۔ کہتے کہتے وہ رو پڑی۔

"ارے کیا پاگل ہوئی ہے" گرگوری نے کہا۔

"میں تو کل نشست بھی صاف کرنا بھول گئی تھی" مسز رونے نادم ہوتے ہوئے کہا۔

"جہانتک میرا سوال ہے۔ میں تو نوکری چھوڑ رہی ہوں اور اپنے گاؤں چلی جاؤں گی۔" باورچن نے کہا۔

"کس کو ہیضہ ہوگیا" گرگوری نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"باجے والے کو" رات کے وقت اسے ہیضہ ہوا۔ بہت تکلیف ہے اور دست و قے ایک منٹ بھی بند نہیں ہوتے"

"باجے والا" جیسے گرگوری کو یقین نہ آرہا ہو کتنا بنس مکھ آدمی ہے۔ ابھی تو کل ہی کیسا ہنس ہنس کر بول رہا تھا۔ میں تو اسے دیکھنے جا رہا ہوں" گرگوری نے زور سے کہا۔

"نہیں گرگوری نہیں۔ یہ چھوت کی بیماری ہے" دونوں عورتیں بیک وقت چلائیں!

"خدا خیر کرے۔ ایسی بات نہ سوچو"

"چھی" گرگوری نے جوتے پہنتے ہوئے کہا اور بغیر کنگھا کئے اور قمیص کا بٹن لگاتے وہ باہر جانے کو تیار ہوگیا۔ لیکن اسکی بیوی نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ اور لوف نے اسکی انگلیوں کی تھرتھراہٹ محسوس کی۔ اور پھر معلوم نہیں کیوں اسے غصہ آگیا۔

"ہٹ! نہیں تو تیرا سر توڑ دوں گا۔" وہ چلایا اور اس کے سینے پر دھکا دے دیا۔

احاطے میں بالکل سناٹا تھا اور ایک عجیب سی خاموشی چھائی تھی۔ اور لوف کے دل پر ایک عجیب طرح کا خوف طاری ہونے لگا۔ اور وہ آپ ہی آپ کچھ کانپنے لگا اور اسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ لیکن یہ دیکھ کر کوئی اور اسے نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن یہ خیال کہ وہی اکیلا ہے جو بیمار بچے کو جا رہا ہے اسے کچھ بہت بھلی۔ اور جب اس نے دیکھا کہ ایک دوڑتی اسے مریض کو دیکھنے جاتے دیکھ رہا ہے تو اسے ایک عجیب طرح کا فخر محسوس ہوا۔ پھر وہ سیٹی بجانے لگا اور سر کو غرور سے اٹھا لیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور جب دروازے کو سینکا چیبرک نے کھولا تو اسکا منہ تک گیا کہ وہ پہلا شخص نہیں جس نے اس نے اسکو فرض کو ضرور سمجھا۔

گرگوری چچا وہ تو سوکھ کر کانٹا ہی ہوگیا ہے۔

کمرے سے بو کا ایک بھبکا آیا۔ گرگوری ابھی باہر کھڑا سینکا کی باتیں سن رہا تھا۔ اور دروازے میں سے مریض کی حالت دیکھنا چاہتا تھا۔

"کیا اسے ایک گلاس پانی پلا دوں گرگوری چچا" سینکا نے یکبارگی پوچھا۔

دونوں کے چہروں پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔

"لاؤ تھوڑا پانی لے آؤ" گرگوری نے کہا اور ہمت کر کے کمرہ کے اندر داخل ہوا۔ لیکن کمرے میں جاتے ہی اس کے قدم جیسے رک گئے۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اسے پیچھے دھکیل رہا ہو۔ اس نے دیکھا کہ کسلیاکوف دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے پیٹ کے بل میز پر پڑا ہے۔ اور پھر گیلے فرش پر بار بار تھوک رہا ہے۔

"بھئی کون آیا" اس نے بھرائی آواز میں کہا۔

گرگوری ہمت کر کے اسکی طرف بڑھا۔ بلکہ اسے خوش کرنے کی نیت سے کہا "میں ہوں گرگوری اورلوف۔ کیوں کیا رات زیادہ کھا گئے تھے۔ اتنا نہ کھاؤ کہ جو منہ پھر جائے"

لیکن یکبارگی جیسے اسے سکتہ ہوگیا۔ جب اس نے دیکھا کہ کسلیاکوف اسے پہچان بھی نہیں رہا ہے۔

کسیاکوف کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ گال کی ہڈیاں عجیب بھیانک طور سے نکل آئی تھیں۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اور وہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے سے موت کی علامات اور موت کا خوف ظاہر ہو رہا تھا۔ صرف جبڑوں کی حرکت سے یہ پتہ چلتا تھا کہ ابھی اس میں کچھ جان ہے۔ کسیاکوف اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے گریگوری کو گھور رہا تھا۔ یک بارگی گریگوری کے دل پر ایک خوف طاری ہوا اور اسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی سرد سرد ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ اور اس کمرے میں جہاں ہمیشہ نغمہ و سرود کی چہل پہل رہتی تھی اس وقت موت کے خوفناک طرح بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ گریگوری چاہتا تھا کہ کس طرح سے وہ اس کمرے سے نکل بھاگے۔ لیکن اس کے قدم منوں من کے ہو رہے تھے۔

"اچھا!" گریگوری نے رخصت ہونے کے انداز سے کہا۔

کسیاکوف کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور اس کے ہونٹوں کے کنارے پر سیاہ کف جم گیا۔ اور ایک بے آواز کی آواز میں اس نے کہا۔

"میں مر رہا ہوں!"

یہ تین لفظ گریگوری کے دل و دماغ پر ایک گھونسہ تھے۔ اور پھر وہ بیوقوفوں کی طرح سے مسکرایا اور دروازے کی طرف مڑ گیا لیکن اسی وقت سینکا پسینہ میں شرابور ہانپتا کانپتا پانی کا گھڑا لئے ہوئے آموجود ہوا۔

"سپرنٹنڈنٹ کے کنوئیں سے پانی لایا ہوں۔ سؤر کے بچے مجھے پانی ہی نہیں بھرنے دیتے تھے۔" کہتے کہتے سینکا کونے سے گلاس اٹھا کر لایا۔ اور کہتا جاتا تھا کہ وہ لوگ کہنے لگے "اچھا تم لوگوں کو ہیضہ ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "تو پھر تم کو کیا؟ کم بخت وہ تم کو بھی ہوگا اور کوئی بھی نہ بچے گا۔" حرامزادوں نے پھر مجھے مارا۔

گریگوری نے گلاس بھرا اور ایک ہی گھونٹ میں پورا گلاس پی گیا۔ اس کے کانوں میں ابھی تک کسیاکوف کی آواز "میں مر رہا ہوں" گونج رہی تھی۔

"پانی!" کسیاکوف نے کہا۔

سینکا نے لپک کر گلاس اس کے بے رنگ ہونٹوں سے لگا دیا۔ گریگوری کا دل بہت سہارا لئے کھڑا تھا۔ اور جیسے بے ہوشی کا سا عالم طاری تھا۔ اور اسی حالت میں اس نے سنا کہ سینکا کہہ رہا ہے۔ "شہر میں ہم ابھی تمہارا لباس جلا کر تمہیں چونا [illegible] ڈالنے رہتے ہیں۔" اتنے میں اس نے سنا کہ [illegible] پکانے والی کھڑکی سے جھانک کر کہہ رہی ہے۔ "کرنل تم وہ رم اس میں تھوڑی سی ملا دو۔ ایک گلاس رم میں دو چمچے۔"

احاطے میں سے کوئی کھڑے کسی نے [illegible] ٹن ایسپرین رم میں ملا کر دو۔ یک بارگی جیسے گریگوری کو جوش سا آ گیا اور اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر مڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور احاطے میں سے ہوتا ہوا سڑک پر نکل گیا۔

ہائے اللہ! اس مرچی کو بھی ہیضہ ہو گیا۔ وہ ہسپتال جا رہا ہے۔ کھانا پکانے والی نے دور دوڑ کر اس طرح بھاگتے دیکھ کر [illegible] انداز میں کہا۔

مرٹن جو اس کے پاس کھڑی تھی۔ یکبارگی چیخ پڑی اور اس کی آنکھیں جیسے نکل آئیں۔

"یہ جھوٹ ہے!" اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا۔ "یہ موذی بیماری اسے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ وہ مجھے کیسے چھوڑ دے گا۔"

لیکن کھانا پکانے والی ابھی تک سمندر سے سسکیاں لے رہی تھی۔ اور ایک اچھا خاصا مجمع احاطے میں اکٹھا ہو گیا۔ ہر ایک کے چہرے پر حسرت و یاس اور ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ان میں بعض اپنی قوتوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن یاس جیسی بجلی اڑا رہی ہو۔ سینکا بار بار آ کر انہیں کسیاکوف کی کیفیت سے مطلع کرتا۔

لوگ سب ایک ہی جگہ جمع ہو کر چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ اور ان کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی یا اللہ پکار اٹھتا تھا۔

"وہ دیکھو اسلامت!"

اسلامت ایک [illegible] میں بیٹھی تھی۔ پیچھے ایک سفید وردی پہنے ہوئے آدمی چلا رہا تھا۔

"بچو! بچو!" گاڑی والے نے چلا کر کہا۔ اور گاڑی کو گلی کی طرف بڑھا دیا۔ مجمع پر یکبارگی سکوت طاری ہو گیا۔ اور کچھ لوگ ادھر ادھر

کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ اپنی عادت کے خلاف اس نے کوئی گالی بھی نہ دی۔ بلکہ صرف چپ چاپ پڑا رہا۔ اس سے مڑونہ کو فکر تھی اور اُسے بات کا کرید لگ گئی تھی۔ چونکہ اُسے شوہر سے ایک خاص لگاؤ تھا اس لئے وہ اس کے رجحانات اور خیالات کے درپے رہا کرتی تھی۔

"کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں؟"

گریگوری نے اپنی پیالی کا آخری گھونٹ پینے کے بعد ہاتھ سے مونچھ صاف کی۔ اور پھر اطمینان کے ساتھ پیالی کو چوری کی طرف بڑھایا۔

"میں اس طالبعلم کے ساتھ ہیرک گیا تھا" اس نے الجھتے ہوئے جواب دیا۔

"کہاں ہیضہ بیرک۔ کیا بہت لوگ بیمار ہیں" مڑونہ نے پوچھا۔

"کملیا کوٹ کو لے کر ۲۵ آدمی ہیں۔ کچھ اچھے بھی ہو رہے ہیں۔"

"ہیضہ سے اچھے ہو رہے ہیں۔ ناممکن۔ ہوسکتا ہے انہیں کوئی اور بیماری ہو اور بات بنانے کو اُسے ہیضہ بتا دیا ہو۔ کہ لوگ اُن کی دوا کے قائل ہو جائیں۔"

"تم بے وقوف ہو اور اس احاطے والے سب کے سب پاگل ہیں"۔ گریگوری نے بگڑتے ہوئے کہا۔ "ایک سے ایک بڑا جاہل ہے۔ ان لوگوں کی تو صحبت بھی ہیضہ سے زیادہ مضر ہے۔ ہر ایک کوڑھ مغز ہے۔ کوڑھ مغز۔ کوئی بات سمجھ ہی میں نہیں آتی"۔ کہتے کہتے اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور اُسے پیا اور بالکل خاموش ہو گیا۔

تم آج کہاں سے علامہ کی ڈگری لے کر آئے ہو۔ مڑونہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

گریگوری نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اتنا سنجیدہ کہ مڑونہ کو دوبارہ سوال کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ کمرے میں لالٹین اور احاطے کے لوگوں کے رنگ کی بلی جلی گونجیں رہی تھیں۔ میاں بیوی خاموشی سے بیٹھے بیٹھے اپنے اپنے حصہ کی چائے پی رہے تھے۔ مڑونہ کبھی کبھی ٹھنڈی آہیں بھرتی۔ اور گریگوری جیسے انگلیوں سے میز بجاتا رہا۔

تم نے کوئی چیز بھی اسقدر صاف شفاف نہ دیکھی ہوگی۔ اس نے اچانک کہنا شروع کیا۔ ہر آدمی بالکل دودھ جیسے سفید کپڑوں میں ملبوس ہے مریضوں کو ہر گھڑی نہلایا جاتا ہے۔ انہیں بہترین غذائیں دی جاتی ہیں۔ آدھے ڈھائی ڈھائی بوتل کورم کی ملتی ہے۔ تیمارداری تو اس طرح سے ہوتی ہے کہ مادری شفقت بھی اسکا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ پتہ نہیں یہ کونسا مذاق ہے کہ انسان کی تمام زندگی میں تو اسکا پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اور جب موت کا پیغام آنے لگتا ہے تو اسکی اس طرح خبرگیری کی جاتی ہے کہ دنیا کی تمام آسانیاں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی۔ کہ اگر وہ یہی آسانیاں زندگی اور تندرستی کے ایام میں بہم پہنچائیں تو زندگی کسقدر آسودہ ہو جائے۔ اس حالت میں آنا ہسپتال اور صفائی پر بار بار ہیں پولیس خفگی ہے۔ یہ حماقت کرے۔ ہم کو شغل دھالی بڑھی سے بونہی ضائع ہو جاتی ہیں۔ یہی آسانیاں اگر تندرستی کے دنوں میں مہیا کریں۔ تو کتنا اچھا ہو۔ خواہ سال میں دو ہی چاہیں۔

مڑونہ اسکی باتیں سن رہی تھی۔ لیکن وہ انہیں سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کر رہی تھی۔ مڑونہ اس سے سوال کرنا ہمیشہ خطرناک سمجھتی تھی۔ کیونکہ وہ الٹا ہمیشہ اسکے سوالوں سے الجھ جاتا تھا۔ لیکن آخر اُس سے نہ رہا گیا اور وہ بول اٹھی۔

"شاید وہ لوگ اس بات کو تم سے بہتر سمجھتے ہوں" مڑونہ نے شوہر کو ڈرتے ہوئے دیکھکر کہا۔

گریگوری نے اپنے شانوں کو ایک بے نیازانہ شان کے ساتھ جنبش دی۔ اور مڑونہ اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔

"خیر یہ ان کا اپنا کام ہے۔ خواہ وہ اسے جانیں یا نہ جانیں۔ لیکن اگر میں زندگی کے یہ مزے اٹھائے بغیر مر گیا تو مجھے کم از کم یہ حق ضرور ہے کہ اس مسئلہ میں اپنی رائے پیش کروں۔ میں کہوں گا کہ میں اپنی موجودہ زندگی سے عاجز آچکا ہوں۔ اور اب اسکا قطعاً انتظار نہیں کرسکتا۔ کہ مجھے ہیضہ آکر دبائے اور پھر اس کے بعد آپ لوگ مجھ پر لذائذ نعمت کے دروا کریں۔ میں کسی طرح سے اس امید پر نہیں رہ سکتا۔ پوشر آمالونج نے کہا ہے کہ تقدیر کے خلاف ڈٹ جاؤ۔ ایک طرف تقدیر اور دوسری طرف تم خود پھر دیکھو کہ فتح کس کی ہوتی ہے۔ یہ جنگ جنگ ہو اور اس میں کسی مرد و عایت کی گنجائش نہ ہو سمجھیں۔ میں اسپتال میں کام کرنے جا رہا ہوں۔ میں اپنا سر خنجر کے منہ میں ڈالدوں گا۔ خواہ وہ میرا سر ہی کاٹ ڈالے۔ ہمیں وہ پلا ہفتہ تنخواہ اور شاید کچھ بونس۔ شاید اس کام میں مجھے جان دینی پڑے۔ لیکن میں اس جگہ پہ تو اس سے پہلے ہی مر جاؤں گا۔" یہ کہہ کر گریگوری نے اپنی ہلکا مکا میز پہ مارا کہ تمام برتن پیالیاں اچھل پڑیں۔

شروع تقریر کو تو مڑونہ نے کوئی اہمیت نہ دی۔ لیکن آخر کے جملوں نے اسے چونکا دیا۔ اور اس نے معاندانہ لہجہ میں کہا۔

"[illegible] آپ کی صلاح تو یہ" مسٹرونہ نے کہتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔ میں تو صرف صلاح مانگتا ہوں۔ مجھے دوسروں کے مشورہ کی کم ضرورت ہے" گرگیوری نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔
"آپ اکثر پھر تم نے میرے بارے میں تمہیں کیا صلاح دی" مسٹرونہ نے پوچھا۔
"تمہارے بارے میں" گرگیوری کچھ برہم سا ہو گیا۔ اس نے پہلا بچہ کے بارے میں ٹھیک کچھ سوچا ہی نہ تھا اور یہ سوال آتے ہی اسے سب معلوم ہوا۔ وہ آتے گھر پر چھوڑ کے ختم کرتا تو دوسرے لوگ بھی تو اپنی بیویوں کو گھر چھوڑ کر رہتے ہیں۔ لیکن مسٹرونہ کو اس طرح سے آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس پر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس نے مسٹرونہ سے کہا تم گھر پر رہو گی اور میں اپنی تنخواہ لاکر تمہیں دیا کروں گا۔
"خوب" مسٹرونہ معنی خیز نظروں سے مسکرائی۔ اصل میں یہ بات گرگیوری کو بہت بری معلوم ہوئی۔ اور اسکے شبہات اور شدت پکڑ گئے۔ اور اس کے دل میں رشک کی جلن پیدا ہو گئی۔ گرگیوری ان معاملات میں بہت زیادہ ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی اسکی خودداری نے اُسے اظہار خیالات سے روک لیا۔
"تم بیٹھی گھر اندر سے سیتی رہنا۔ اور تم کر ہی کیا سکتی ہو" اورلوف نے کہا اور پھر مسٹرونہ کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔
مسٹرونہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن وہ اسی طرح سے اُسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔
"لیکن ہمارا کیا ہو گا" گرگیوری نے کہا۔
"یہ کیا؟" مسٹرونہ نے پوچھا۔
"زہریلی ناگن۔ یہ نخرے رہنے دے۔ ورنہ میں مزا چکھا دوں گا" گرگیوری نے غصہ سے کہا۔ "خواہ میں موت ہی کے منہ میں جانا چاہتا ہوں لیکن تجھے سبق دینا چاہوں گا۔"
"میں تو تمہیں وہاں نہیں بھیج رہی ہوں۔ مت جاؤ"
"اچھا کم بخت میں خوب سمجھتا ہوں کہ تیرے دل کی تمنا کیا ہے تو چاہتی ہے کہ میں وہاں جاؤں اور پھر لوٹ کر نہ آؤں۔" وہ زور سے چلایا۔
جواب میں مسٹرونہ بالکل نہ بولی۔ اس نے اورلوف کے غصہ کو اور بھڑکا دیا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فوراً ہی اسکے خیال میں ایک چال آ گئی تھی۔
"میں تجھے خوب سمجھتا ہوں۔ تو تو مجھے پھنسا کر بہت ہی خوش ہو گی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں بھی ایسا کروں گا کہ تو آپ اپنی چال میں پھنس جائے۔ دیکھ میں تجھے دکھاتا ہوں۔"
یہ کہتے ہی اس نے جھپٹ کر اپنی ٹوپی اٹھائی اور کمرے کے باہر نکل گیا۔ اسکی بیوی اپنی حرکت پر افسوس کرتی رہی۔ کہ اس نے بے کار اسے چڑا دیا۔ اور پھر وہ کچھ متفکر بھی ہو گئی کہ اب معلوم نہیں وہ کیا کرے۔ اس کی بیوی فکر میں پڑ گئی۔ اور الٹے پریشان تھی۔
وہ بڑی دیر تک میز پر بیٹھی سوچتی رہی۔ معلوم نہیں اسکا خاوند کیا کرے۔ اور اب کی بار معلوم نہیں اُسے کیا حرکت سوجھی ہو۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ اسکی شعاعیں کھڑکی میں گزر کر صاف کئے ہوئے برتنوں پر پڑ رہی تھیں۔ جس سے اس تہ خانے میں بھی تھوڑی سی روشنی ہو گئی۔ اور مسٹرونہ اس روشن جگہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی جا رہی تھی۔ آخر کار وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور برتن وغیرہ اپنی جگہ پر رکھ کر سونے کے لئے اپنے پلنگ پر لیٹ رہی۔
سات بجے گرگیوری لوٹا۔ سیڑھیوں پر اُس کے قدموں کی آہٹ سن کر مسٹرونہ کو معلوم ہوا کہ وہ اس وقت خوش ہے۔ وہ اندھیرے کو کوستا ہوا اپنے بستر کی طرف بڑھا اور اسکی بغل میں بیٹھ گیا۔
"اچھا بوجھو؟" گرگیوری نے ہنستے ہوئے کہا۔
"کیا بوجھوں؟"
"تم میرے ساتھ کام کرو گی؟"
"کہاں؟" اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"اسی سرکس میں جہاں میں کام کروں گا۔" اورلوف نے سینہ تان کر کہا۔
مسٹرونہ نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس نے اسے چمٹا لیا اور اُس کے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا۔ مسٹرونہ نے یہ حرکت کچھ اس بے ساختہ پن کے ساتھ کی۔ گرگیوری نے اُسے جھٹک دیا۔
اس نے سوچا کہ یہ مجھے بیوقوف سمجھتی ہے۔ کہ میں اس کی حرکت سے یقین کر لوں گا کہ یہ میرے ساتھ کام پر راضی ہے۔ مکار کہیں کی۔
اس کے دل میں آیا وہ اسے اٹھا کر زمین پر دے مارے۔ لیکن اُس نے جذبات پر قابو پا کر اس سے پوچھا "یہ حرکت کیوں کی تھی؟"
"صرف اس لئے کہ ......" اُس نے اترا کے پھر سے کہنا شروع کیا۔

"بس بس۔ دیکھو مکار نہ بنو۔ میں تجھے خوب سمجھتا ہوں"
"پیارے!"
"چل ہٹ"
"گریگوری۔ میری جان"
"تمہارا مطلب کیا ہے"۔ گریگوری کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور اس نے پوچھا۔
"کیا تم ڈرتی نہیں"
"کس بات سے۔ ہم دونوں ایک ساتھ رہیں گے نا" اس نے سادگی سے جواب دیا۔
گریگوری کو یہ جواب سن کر خوشی ہوئی۔
"میری جان!" کہہ کر گریگوری نے اسکے زور کی چٹکی لی کہ وہ اچھل پڑی۔

بیرک میں کام کے پہلے ہی دن کثرت سے مریض آتے رہے۔ یہ جوڑا ابتک جس تن آسانی کا عادی رہا ہے اسکی بنا پر انہیں اس ہنگامے سے تھوڑی سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اور اپنے عہدے پر انہیں اور بھی الجھن ہوتی تھی۔ جو کچھ کہا جاتا تھا وہ اتنی جلدی انکی سمجھ میں نہ آتا تھا اور اس وجہ سے وہ اور بھی الجھتا۔ اور ہر وقت یہ سوچتا کہ اب وہ ڈانٹا جائے گا۔ اور اسے سخت سست کہے گا لیکن اسے بہت حیرت تھی کہ انکی اتنی بڑی بڑی غلطیوں پر بھی اسے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔

ایک دن ایک لمبے تڑنگے ڈاکٹر نے گریگوری سے ایک مریض کو اٹھانے کو کہا۔ اور گریگوری نے اسے اس طرح سے جوش اور بہک سے اٹھایا کہ بیمار کی چیخ نکل گئی۔

"یار! دبا کر اسکا کچومر نہ نکال۔ یہ نہ ہو کہ ہم نہانے کے ٹب میں سے اسکے ایک ایک عضو کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔"
گریگوری کا سر شرم سے جھک گیا۔ لیکن مریض نے مسکرا کر کہا
"کوئی بات نہیں آہستہ آہستہ سیکھ جائیں گے"
جب یہ میاں بیوی بیرک میں پہنچے تو وہاں ڈاکٹر نے انہیں سب سے پہلے یہ بتایا کہ مریض کے ساتھ کیسے برتاؤ کریں۔ مریضوں کو لاتے لیجاتے کیسے پکڑیں۔ کیسے اٹھائیں۔ کیسے بٹھائیں۔ اور مرض کی مختلف حالتوں میں کیا کریں۔ آخر میں ڈاکٹر نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ نہا چکے ہیں۔

اور اس کے بعد اس نے انہیں سفید ایپرن دیا جو ہر شخص سفید لباس میں تھا۔ اور ان کے سفید سفید غلاف کپڑے بہت معلوم ہوتے تھے۔ سارا کام بہت پھرتی سے ہوتا تھا۔ مریضوں کی کراہ اور دواؤں کی تیز بو سے تمام بیرک بھری تھی۔

پہلے پہل تو گریگوری کو اس سارے کا روبار میں ایک افراتفری معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ یہ سوچتا تھا کہ وہ یہاں کبھی کام کرنے کے قابل نہ ہو سکے گا۔ اور اسکا دم گھٹ جائے گا۔ یا بیمار ہو جائے گا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ بھی اس ہنگامہ میں شامل تھا۔ اس میں بھی وہ جوش عمل پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ وہ بھی کسی کام کا ہو سکے۔ شاید یہ زندگی اور خدمت کی لہر بھی اس کی زندگی کو کچھ خوشگوار کر دے۔

"کسی دوا کے لئے ایک ڈاکٹر نے پکارا۔
"گرم پانی" ایک طالب علم چیخا۔
ارے تمہارا کیا نام ہے۔ ہاں اور دیکھو۔ ذرا اس مریض کے پیر تو دباؤ۔ ارے یوں نہیں یوں۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا آہستہ آہستہ۔ اسکی کھال نہیں اتارنی ہے۔ ایک دوسرے طالب علم نے کہا۔ اور پھر اس نے خود مریض کے پاؤں دبا کر بتائے کہ کس طرح مالش کرنی چاہئے۔
"ایک اور مریض آیا ہے" کوئی پکارا۔
"اور لوٹ ذرا اسکو اندر تو لانا"
گریگوری پسینہ میں شرابور۔ گھبرایا ہوا۔ ہر کام کے انجام دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اور کبھی کبھی تو وہ کام میں اتنا محو ہو جاتا تھا۔ کہ اپنے وجود کو بھی فراموش کر جاتا تھا۔ مریضوں کی افسوسناک حالت۔ انکی کراہیں۔ الٹتی ہوئی آنکھیں اور سارے بدن کو مروڑ ڈالنے والی درد دیکھ کر گریگوری کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

ایک آدھ بار گریگوری نے اپنی بیوی کو بھی ہر آدھے سے گزرتے دیکھا۔ لیکن وہ بھی بہت جلدی میں ہوتی تھی۔ اسکا چہرہ بھی ستا ہوا اور کام کی وجہ سے ماندہ نظر آتا تھا۔ وہ کچھ دبلی بھی نظر آتی تھی۔
"کیسے حال ہیں" ایک بار اس نے پوچھ لیا۔
لیکن مٹروونا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صرف مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔
گریگوری کو خیال گزرا کہ اس نے مٹروونا کو ایسی خطرناک جگہ لا

ایک مریض کے پیروں پر پالش کرتے ہوئے سوچا۔ اس کے کانوں میں دوسرے مریضوں کی کراہ کی آواز آ رہی تھی۔

"پانی۔ خدا کے لیے ایک گھونٹ" کوئی مریض کراہا۔

"گرم سینکائی اس سے تسکین ہوتی ہے۔ ان میں اور گرم پانی ملا دو۔"

"اسے تھوڑی سی شراب دے دو۔" ڈاکٹر واس چنکو نے حکم دیا۔

کام کرتے کرتے اب اور لوٹ کو پتہ لگ گیا کہ یہ کام اتنا بھیانک اور برا نہیں ہے جتنا اس نے پہلی نظر میں محسوس کیا تھا۔ اور نہ اب ہنگامہ بے ترتیبی اور گڑبڑ ہے بلکہ یہ تمام ظاہری گڑبڑ ایک ٹھکانے کی تنظیم تھی۔ لیکن پھر بھی جب اسے اس پولیس مین کی یاد آتی تو وہ گھگھیا اٹھتا۔ کبھی وہ سوچتا کہ وہ شاید مر ہی گیا تھا۔ پھر خود ہی اس کی تردید کر دیتا۔ وہ سوچتا کہیں وہ پولیس مین اٹھ کر چلنے نہ لگے۔ اس نے سنا تھا کہ ایک بار میرے کو ایک مریض تابوت کے صندوق میں اٹھ بیٹھا تھا اور اس سے نکل کر بھاگ گیا۔

اسے پھر مونی کا خیال آیا۔ وہ کیا کر رہی ہوگی۔ اور اس کا دل چاہنے لگتا کہ کسی طرح سے کام چھوڑ کر دیکھ آئے کہ مڑونا کیا کر رہی ہے لیکن پھر اسے اپنے اس خیال ہی سے شرم آنے لگتی۔ اور پھر وہ خود ہی اپنے دل سے باتیں کرنے لگتا کہ وہ مڑونا سے کہے گا۔

ہاں کام کیے جا۔ کیے جا۔ یہاں تک کہ تیرا یہ گداز جسم گل جائے اور پھر تو تجھے کوئی نہ پوچھے گا۔ اور تیری سب تجویزیں خاک میں مل جائیں گی۔

اسے اکثر یہ شک ہوتا کہ مڑونا اسے ایک نہ ایک دن چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔ اور یہ بات اسے اپنے متوازن مقاصد کے منافی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن پھر وہ خود ہی اپنے کو قائل کرتا کہ جبکہ وہ خود ہی اس کے متعلق اتنے برے خیالات رکھتا ہے۔ تو اگر وہ اسے چھوڑ کر بھاگ بھی جائے تو کیا برا ہے۔ اسکی زندگی کونسی اچھی گزر رہی تھی۔ اور جو اس طرح کی زندگی گزاریگا۔ اسکے ہی دل میں طرح طرح کے خیالات اٹھیں گے اور پھر انہی خیالات کی بنا پر اسے یقین ہو جاتا کہ مڑونا ضرور اس سے بیوفائی کرے گی کبھی یہ سوچنے لگتا کہ آخر وہ اپنی کوٹھڑی چھوڑ کر کیوں اس ابلتے ہوئے کڑاہ میں گر پڑا۔ اسکی سمجھ میں اسکا کوئی جواب نہ آیا۔ اور پھر وہ خیالات کے دریا میں ڈوب جاتا۔ لیکن ان ڈاکٹروں کی بے پناہ خدمات دیکھ کر اس کے دل نے جو اثر قبول کیا تھا۔ وہ خیالات اسکی فطری خود غرضی کو آگے نہ بڑھنے دیتے۔ وہ ڈاکٹروں اور طالب علموں کے تھکے ہوئے چہرے دیکھتا۔ ان کی ماندگی اور اس پر سے کام کی لگن دیکھ کر وہ سوچنے لگتا کہ ان کا کمایا ہوا ایک ایک کوپک حلال کا ہے۔

شام کو جب اسکا کام ختم ہو گیا۔ تو وہ اسپتال کے احاطے میں چلا گیا۔ اس کا سر سنسنا رہا تھا اور تمام بدن تھکاوٹ کی وجہ سے چور چور تھا۔ اور وہیں گھاس پر لیٹ گیا۔ اور آسمان پر دوڑتے ہوئے رنگین بادلوں کو تکنے لگا۔ سورج ڈوبنے والا تھا۔ لیٹے لیٹے وہ سو گیا۔

اس نے دیکھا کہ ایک ڈاکٹر نے اسکی اور اسکی بیوی کی دعوت کی ہے۔ ایک بہت بڑا سا کمرہ ہے۔ اور اس میں ہسپتال کے تمام مریض بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر اور مڑونا بیچ فرش پر کھڑے ناچ رہے ہیں اور خود رباب بجا رہا ہے۔ اور ڈاکٹر کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہا ہے۔ ڈاکٹر کی ٹانگیں بہت بہت لمبی ہیں اور ناچ میں مڑونا کا ساتھ نہیں دے پا رہا ہے اور عجیب مضحکہ خیز حرکتیں کر رہا ہے۔ تمام مریض بھی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔

اتنے میں اس نے دیکھا کہ دروازے پر وہی پولیس والا کھڑا ہنس رہا ہے۔ "تم گریگوری تم تو سمجھے کہ وہ مردہ خانے میں ڈال آئے تھے۔ اور اب خود مزے سے رباب بجا رہے ہو۔ چل۔ اٹھ۔ کھڑا ہو۔"

گریگوری گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اسکا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ ڈاکٹر واس چنکو اس کے پاس کھڑا تھا

"تم عجیب آدمی ہو۔ یہاں باہر میدان میں گھاس پر پڑے ہو۔ تمہیں جب کمرہ اور بستر مل چکا ہے۔ تو تم گھاس پر کیوں لیٹے ہو۔ اس طرح تو تم بیمار پڑ جاؤ گے۔ اور جلدی ہی ٹھنڈے ہو جاؤ گے اور خود تمہیں بھی پتہ نہ چلے گا۔ ایسی حرکت پھر نہ کرنا۔ ارے تمہیں زکام ہو گیا۔ دیکھا نہ۔ خیر چلو۔ میں دوا دیتا ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب میں بہت تھک گیا تھا۔" گریگوری نے رک رک کر کہا۔

"تب تو یہ اور بھی بری بات ہے۔ تمہیں احتیاط کرنی چاہیئے۔ اور اس طرح تو بات بگڑ جائے گی۔ اور ابھی ہمیں تمہارے جیسے آدمیوں کی بہت ضرورت ہے۔ اچھا میرے ساتھ آؤ۔"

گریگوری ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے گیا۔ اور وہاں ڈاکٹر نے اسے دو گلاسوں میں دوا دی۔ گریگوری ایک ایک کر کے انہیں پی گیا۔ دواؤں کو پی کر اس نے برا سا منہ بنایا اور وہیں فرش پر تھوک دیا۔

"اچھا اب جاؤ اور جا کر سو رہو۔" کہتا ہوا ڈاکٹر تو ایک طرف کو روانہ

پوچھا۔

گریگوری تھوڑی دیر ڈاکٹر کو دیکھتا رہا۔ اور پھر مسکرا کر اس کے پیچھے دوڑا دوڑا۔

"شکریہ ڈاکٹر"

"کس لئے؟"

آپ نے اتنی زحمت کی۔ میں آپ کے اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گا۔ جو آپ نے مجھ پر کیا۔ اور میرے متعلق جن نیک خیالات کا اظہار کیا بہرحال آپ کا بہت بہت شکریہ۔

ڈاکٹر اسے تھوڑی دیر حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر مسرت اور خوشی کی جھلک تھی اور پھر وہ مسکرا دیا۔

تم عجیب آدمی ہو اس نے کہا۔ بہت زیادہ مخلص اور راست گو۔ تمہاری بات مجھے بہت پسند آتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تمہارا خلوص۔ اب اور محنت اور خلوص سے کام کئے جاؤ۔ میرے لئے نہیں۔ بلکہ ان مریضوں کے لئے جن کی خدمت پر تم مامور ہو۔ ہمیں ایک بڑی جنگ کرنی ہے لوگوں کو اس موذی مرض کے چنگل سے چھڑانا ہے۔ اور ہم اس کام میں اپنی جانیں لڑا دیں گے۔ اور اسے ایک نہ ایک دن ناکامیاب بنا دیں۔ اور تم ہمارا ساتھ دوگے۔ اچھا اب سب سے پہلے تم جاؤ تھوڑی دیر سو رہو۔

اس کے ایک منٹ بعد ہی گریگوری اپنے بستر پر لیٹا اونگھ رہا تھا۔ اس کے تمام عضو پر ایک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کی تھوڑی دیر کی اس گفتگو نے اسے ایک حسین جنت میں پہنچا دیا تھا۔

سوتے سوتے اسے یہ دھیان آیا کہ افسوس مٹروزنا نے یہ گفتگو نہ سنی۔ اور اب اگر میں اس سے کہوں گا بھی تو وہ پوری طرح یقین نہ کرے گی۔ چڑیل کہیں کی۔

صبح آکر اسے بیوی نے جگایا۔

"اٹھو چل کر چائے پی لو۔"

اس نے سر اٹھا کر مٹروزنا کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ بالوں میں کنگھا کئے ہوئے وہ سفید لباس میں بہت صاف اور حسین نظر آرہی تھی۔ اسے وہ بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے دل میں جلن اٹھی کہ وہ ایسی حسین تو اوروں کو بھی نظر آتی ہوگی

"کہاں چل کر چائے پی لوں۔ میرے پاس خود چائے موجود ہے۔ کہیں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ ہم دونوں اکٹھے چائے پئیں گے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

گریگوری نے نظریں ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔ "اچھا چلتا ہوں۔"

مٹروزنا کے جاتے ہی گریگوری پھر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔

پتہ نہیں اس کے دل میں کیا ہے۔ کیوں مجھے چائے کے لئے بلانے آئی۔ اور پھر مجھے دیکھ کر کیوں مسکراتی تھی۔ وہ کچھ دبلی نظر آتی تھی۔ اسے اس پر افسوس آرہا تھا اور وہ اسے خوش کرنے کی کوئی بات سوچنے لگا۔ وہ چائے کے لئے اگر کچھ مٹھائی خریدے تو بہتر ہو۔ لیکن سوچتے سوچتے اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ اس سے عادت خراب ہو جائے۔ بلاوجہ کیوں ایک عورت کو بری چیزوں کا عادی بنایا جائے۔ بغیر مٹھائی کے اچھی طرح سے کام چل سکتا ہے۔

چائے ایک چھوٹے سے کمرے میں تھی اور میز پر میاں بیوی اور مٹروزنا کی ایک سہیلی تھیں۔ تیسری عورت کا نام نفیتا لوگوونا تھا۔ وہ ابھی غیر شادی شدہ تھی اور اسکا باپ کسی کالج میں پروفیسر تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے سماوار کا گرم کیا ہوا پانی پیتی تھی۔ وہ اسپتال کے گرم پانی سے پرہیز کرتی تھی۔ اس نے یہ تمام باتیں گریگوری کو چائے پینے کے دوران بتائیں۔ تھوڑی دیر میں اس نے گریگوری سے کہا کہ اب وہ گھر کی لے پاس بیٹھ کر تاش نہ ہوا اپنے پیسے پڑوں میں بھر لے۔ اور پھر خود باہر چلی گئی۔

"کیا کل تم بہت تھک گئی تھیں؟" گریگوری نے مٹروزنا سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا

"بس پوچھو نہیں۔ میں تو تھکی تھی لیکن میرے پیر درد کرنے لگ گئے۔ اور مجھے چکر آ رہا تھا۔ بلکہ آخر میں تو لوگ جو مجھ سے کہتے تھے وہ میری سمجھ میں بھی نہ آتا تھا۔ میں تھک کر چور ہو گئی۔ اور سارے وقت خدا سے دعا کرتی رہی۔"

کیا تم ڈرتی ہو؟

"ہاں مجھے صرف مردوں سے ڈر لگتا ہے۔ اور ہے تم نے نہیں سنا مرنے کے بعد بھی مردے ہاتھ پیر ہلاتے رہتے ہیں؟"

گریگوری نے بھی ایک عجیب مسکراہٹ سے جواب دیا۔ میں نے تو خود دیکھا ہے۔ کل میں نے اور ... پولیس میں کی لاش کو ... رہا تھا کہ لاش کا ہاتھ کچھ سرک اٹھا اور اسنے تان ایک گھونسہ مارا اگر میں پیچھے نہ ہٹتا تو جبڑا ٹوٹ جاتا۔ یہ کیا تھا۔ گریگوری نے محض بات بنانے کیلئے کہا۔

اس شفاخانے کمرے میں چائے پیتے ہوئے اُسے بڑا مزا آرہا تھا۔ اور اس وقت کا ماحول اُسے بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ اسکی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ اسکی خوشی بیوی کی وجہ سے ہے۔ یا یہ خوشی آپ ہی آپ اس کے دل میں پیدا ہو رہی ہے۔ آج وہ اپنی نیکی کا رعب جما کر مڑوند کو مرعوب کرنا چاہتا تھا۔

اگر میں نے کام کرنا شروع کیا تو اس زمین کی وسعت بھی میرے لئے تنگ ہو جائے گی۔ کم لوگوں میں ایسا خدمت کا جوش پیدا ہو سکتا ہے۔ اور پھر اس نے کافی مبالغہ کیا۔ اسکے ڈاکٹروں کی باتیں بھی سنائیں۔ مڑوند سن کر متاثر معلوم ہوتی تھی اور اسکا دل خوشی سے بلیوں اُچھل رہا تھا۔

اور یہ کام تو خاص طور سے بہت اہم ہے۔ ایک کارزار جس کے ایک طرف ہیضہ اپنی فوجیں لئے تباہی و بربادی کے واسطے آمادہ ہے اور دوسری طرف مریض اور ہم لوگ مداخلت کے لئے۔ کون کہتا ہے؟ اس میں بہت دماغ کی ضرورت ہے۔ ہیضہ ہوتا کیا ہے۔ پھر اُسکو اچھی طرح جان لینے کے بعد ہم اسکی سب سے کمزور جگہوں پر حملہ کریں گے۔ ڈاکٹر واسن چنکوف تو کہا کرتا کہ اگر ورلوف میں تو تم جیسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے۔ تمہارے جیسے جوان ہمت مردہی ہیضہ کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ اور تمہاری مدد سے ہم ہیضہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ اور ان مریضوں کو موت کے منہ سے نکال لیں گے۔ اپنی اس زندگی کے لئے یہ مریض تمہارے ہمیشہ احسانمند رہیں گے۔ گرگیوری نے فخر سے سینہ تان لیا۔ اور اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

مڑوند نے بھی اُسے مسکرا کر دیکھا۔ وہ اسوقت بہت حسین نظر آرہا تھا۔ اور آج وہ ایسا لگ رہا تھا جیسا کہ شادی سے پہلے تھا۔

ہمارے بھی وارڈ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو خدمت کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔ ایک موٹی سی ڈاکٹر ہے۔ وہ عینک لگاتی ہے لیکن مریضوں کی تیمارداری ایسی کرتی ہے کہ جیسے وہ اس کے لڑکے ہوں۔ اور پھر اُسے اپنی خدمت کا ذرا بھی غرور نہیں۔ اور بات اس نرم و نازک لہجہ میں کرتی ہے کہ تھکے سے تھکے آدمی کو بھی ایک لفظ میں تر و تازہ کر دیتی ہے۔

اچھا تب تمہیں بھی یہ زندگی پسند ہے۔ گرگیوری کا جوش کچھ دب گیا۔

بالکل۔ تم خود ہی سمجھ لو۔ اب یا رہ روبل ہفتہ مجھے ملتا ہے یعنی روبل مہینے ملتے ہیں۔ کل بتیس روبل ہوئے۔ اور ہمارا یہاں کوئی خرچ نہیں اس لئے اگر جاڑوں تک یہ سلسلہ رہا تو پھر اسوقت تک ہم کافی بچا لیں گے۔ اور اس کال کوٹھری کو چھوڑ کر کوئی اچھا سا مکان لے لیں گے۔

ہاں بھئی یہ بات تو سوچنے کی ہے۔ گرگیوری نے سنجیدہ ہو کے کہا۔ پھر مڑوند کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اس نے جوش سے کہا۔ اور پھر تو ہمارے گھر میں بھی دھوپ آیا کرے گی۔ اور زندگی اس سے کہیں زیادہ حسین ہو جائے گی۔

مڑوند مبسم مسکراہٹ تھی۔ کاش تم . . . . .

"اب کچھ اور نہ کہو۔ جب دن بدل جائیں گے تو میری عادت بھی بدل جائے گی۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو"

"بس بھئی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے"

"پیارے گرگیوری!"

ان کے دلوں میں کئی امنگیں تھیں۔ اور ایک نئی زندگی کی تمنا۔ ان کے دل کو بے پایاں مسرت سے بھر رہی تھی۔ اتنی مسرت کی تمنا میں وہ سخت سے سخت محنت کے لئے تیار تھے۔

ادھر اورلوف بہت تن دہی سے کام کرنے لگا تھا۔ ڈاکٹروں نے کئی بار اسکی خدمت کا اعتراف کیا اور دوسروں کے سامنے اسکی تعریف کی۔ اس کے بہت سے ساتھی اُس سے جلنے لگے تھے۔ اور موقع ملنے پر اسکی بیجا شکایتیں بھی کرتے۔ اب تو سب پر دشمن بھی اُس سے جلنے لگا اگرچہ پردشن اُسے پسند تھا۔ اُس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سن لیتا تھا۔ لیکن اورلوف بھی اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔

بدمعاش۔ پردشن کا خیال آتے ہی اُس نے دل میں کہا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اپنی تمام باتیں مڑوند سے کہہ سکتا ہے۔ اور وہ دوسروں کی طرح اسکی کامیابی سے جلے گی نہیں بلکہ خوش ہی ہوگی اورلوف کام میں اور دلچسپی لینے لگا۔ اسے ہمیشہ یہی دھن لگی رہتی کہ مریضوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کس طرح کی جاسکے۔ وہ اب دواؤں کو محض سونگھ کر بتا سکتا تھا۔ کہ وہ کس وقت مریض کو دیجائیں۔ دوائیں اور مریضوں کی تیمارداری میں اُسے واڈکا سے زیادہ لطف آنے لگا تھا۔ ڈاکٹر اور طلبا میں بھی اسکی ہر دلعزیزی بڑھتی جاتی تھی اورلوف کو اب اپنی شخصیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اُسے یہ دھن تھی

چلتے چلتے وہ پہاڑی کے کنارے پہنچ گئے۔ چیڑ کے درختوں کی شاخیں جیسے انہیں خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ نیچے تمام کہر پھیل چکا تھا۔ اور ایک سوندھی سوندھی سی مہک اٹھ کر ساری فضا کو مہکا رہی تھی۔ اور تمام وادی یوں جیسے ایک پر سکون آواز روح میں بس رہی ہو۔ درخت کچھ اس طرح سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ جیسے ان کی گود میں کوئی سو رہا ہو۔ اور وہ ڈر رہے ہوں۔ کہ ان کے زور سے بولنے سے کہیں وہ جاگ نہ جائے۔ مٹرونا اور گریگوری چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گریگوری اپنی انگلیوں سے اپنے گھٹنے کو بجا رہا تھا اور مٹرونا خاموش محبت بھری نظروں سے اسے تک رہی تھی۔

"میرے پیارے۔ میری جان گریگوری" مٹرونا نے آہستہ سے کہا۔ "تم کتنے عجیب معلوم ہوتے ہو۔ میرے پیارے یہ دن بھی ہماری شادی کے پہلے دنوں کی طرح اچھے اور بہت پیارے لگ رہے ہیں۔ اب تم صرف محبت کی باتیں کرتے ہو۔ اور مجھ سے اپنے دل کی ہر بات کہہ دیتے ہو۔ اب مار پیٹ بھی نہیں ہے۔ یہ دن کتنے اچھے ہیں" "اچھا تمہیں یہی پسند ہے۔ اور اب بھی ایک آدھ گھونسا اور لات رسید کر سکتا ہوں۔" گریگوری نے اپنی بیوی کی طرف محبت اور رحم بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

مٹرونا اس کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ اور وہ محبت سے اس کے بالوں کو تھپتھپانے لگا۔ جیسے وہ کوئی ننھا بچہ ہو اور کسی بڑے کی محبت بھری آغوش میں ہو۔ اس کے بازوؤں میں کتنی گرمی اور کتنا سکون تھا۔

"پیارے۔"

"تم میری جان اور سب کچھ ہو۔ یقین کرو۔ کہ میں تمہارا سب سے بڑا دوست ہوں۔ تم شاید دوروں کا سہارا ڈھونڈتی رہی۔ میں نے جب بھی تمہیں مارا ہے تو مجبور ہو کر۔ وہ زندگی ہی ایسی تھی۔ نہ روشنی اور نہ مسرت۔ اس تنگ و تاریک جگہ میں نفرت کی بجائے محبت کیسے ہو سکتی تھی۔ میں اس وقت اندھا تھا۔ زندگی ہی کچھ ایسی تھی۔ تم میری بیوی ہو اور میری سب سے بڑی دوست۔ لیکن کیا بہت سے لوگ تو بہت ہی برے ہوتے ہیں۔ پروفن وغیرہ۔ خیر چھوڑو ان کی بات۔ اب ہم اچھی طرح سے رہیں گے۔ بس تم خوش رہو میری بچی۔"

"ارے یہ کیا"۔ مٹرونا کے مارے خوشی کے آنسو نکل آئے۔

میں اب مجھے اپنے آپ سے نفرت آتی ہے۔ میں کتنا بیہودہ ہوں۔ دوسروں کے بہکانے میں آجاتا ہوں۔ تم لوگ تو نہیں جانتی ہو۔ میں ایسا بدھو نہیں ہوں کہ اتنی آسانی سے تمہیں پھنس سکتا۔ مجھ کو نہیں۔ تو اتنی آسانی سے مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتی۔"

"اچھا تو تمہیں افسوس ہے کہ کل تعلیم تم میرے اتنے قریب کیوں آ گئے۔ تم نے مجھے پیار کیوں کیا۔ مجھ سے محبت کی باتیں کیں۔ میرے بوسے کیوں لئے۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ اپنے ان الفاظ سے تم نے میرے دل پہ کتنا بڑا چرکا لگایا۔ تم نے ان الفاظ سے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو۔ کیا تمہارا دل مجھ سے بالکل بھر گیا۔ کیا تم مجھ سے بالکل محبت نہیں کرتے؟"

اس نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں تلخی تھی اور وہ اپنی بات کا جواب چاہتی تھی۔

"نہیں" گریگوری نے کچھ بے چینی سے جواب دیا۔ "لیکن تم جانتی ہو کہ ہم ایک کیسی زندگی گزارتے آئے ہیں۔ اور اسکا خیال ہی ہماری طبیعت کو متنفض کر دینے کو کافی ہے۔ اور اب جبکہ ہم اس سے نکل چکے ہیں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہ ہر چیز اتنی جلد جلد بدل رہی ہے۔ اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تم کچھ اور تھیں۔ میں کچھ اور تھا۔ اسکا کیا مطلب ہے۔ کیا ہونے والا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"گریگوری جو کچھ خدا چاہے گا وہی ہوگا۔ لیکن کیا تمہیں اس کا افسوس ہے کہ تم نے مجھے شام کو اتنا پیار کیوں کیا تھا۔"

"خیر اب اسکا تذکرہ چھوڑو۔" گریگوری نے جیسے ہوش میں آتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ "میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ ہماری زندگی سے کچھ حاصل ہوگا۔ نہ ہماری پہلی زندگی آرام دہ تھی۔ اور نہ موجودہ زندگی ہی سے مجھے بہت زیادہ امید ہے۔ خواہ میں شراب چھوڑ دوں۔ تمہیں نہ پیٹوں یا گالی نہ بکوں۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"

مٹرونا بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"اب تو تمہیں اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ تم یہ حرکتیں کر سکو"

"خیر تمہارا یہ سوچنے کا وقت اگر میں چاہوں تو بیا بہ ہو سکتا ہے۔"

گریگوری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن اب میں خود ہی نہیں جاؤں گا۔ یہی تو ایک بات ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں خوش و خرم کیسے بنا رہ سکتا ہوں۔ یا میں شراب سے ڈر گیا ہوں۔" کہتے کہتے وہ گہری فکر میں

گیا۔

"پتہ نہیں تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ یہ اچھی خاصی زندگی ہے۔ اگرچہ تھوڑی سی محنت ضرور ہے۔ تمام ڈاکٹر تم سے محبت کرتے ہیں اور دوسرے تم نے بھی انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ پھر اور تمہیں کیا چاہئے۔ پتہ نہیں تم میں کون سا پارہ بھرا ہے؟"

"یہ تو ٹھیک ہے میں ہمیشہ بیقرار رہتا ہوں۔ اور کبھی کبھی تو تمام رات سوچتے گزر جاتی ہے۔ پوشیرآوا (?) کہتا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ تو کیا میں انسان نہیں۔ پھر بھی ٹاکر (?) اس چکو مجھ سے بہتر ہے۔ اور پوشیرآئی [illegible] بھی۔ اسے یوں سمجھو۔ کہ نہ وہ میرے برابر ہیں اور نہ میں انکے برابر ہوں میں اس بات کو خوب سمجھتا ہوں۔ انہوں نے منشا کا علاج کیا۔ اور پھر اس پر خوش بھی ہوئے۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ایک آدمی کو اچھا کرکے لوگ خوش کیوں ہوتے ہیں۔ کیونکہ سچ پوچھو تو منشا کی زندگی تو بھیڑیے سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور وہ سب اس بات کو جانتے ہیں لیکن پھر بھی اسکی زندگی بچاکر وہ خوش خوش ہیں۔ لیکن میں تو نہیں خوش ہوسکتا۔ اگر مجھ سے پوچھو تو آخر اس میں خوش ہونے کی بات کیا ہے؟"

"لیکن وہ لوگوں کے لئے افسوس بھی تو کرتے ہیں۔"

ہمارے بھی وارڈ میں جب کوئی مریضہ اچھا ہونے لگتی ہے تو لوگ خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ غریب ہوتی ہے تو اسے دوا اور پیسے بھی دیتی ہیں۔ تم سنو تو شاید رو پڑو۔ وہ لوگ کتنے اچھے ہیں؟"

"ہوں ہوں۔ نہیں مجھے صرف حیرت ہوتی ہے۔" بس گرگوری نے اپنا سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

پھر مرتونہ کو جوش آگیا۔ اور وہ اپنے شوہر کو رحم اور محبت کے معنی سمجھانے لگی۔ اور باتیں کرتے کرتے وہ اس پر جھک پڑی۔ اور نظروں میں بے پایاں محبت جھلکنے لگی۔ گرگوری سوچنے لگا۔

اب تو یہ خوب بولنے لگی ہے۔ آخر اسے اتنے الفاظ کس نے بتائے۔ اور تم بھی ان پر ترس کھاتی ہو۔ کیوں کیا تم نے نہیں کہا کہ اگر تمہیں کہیں ہیضہ ہو جائے تو تم اسکی ہڈیاں تک توڑ ڈالوگے تم ایسا کرہی کیوں۔ ہیضہ تم لوگوں کے بعد سے تو تمہاری زندگی سدھر گئی ہے۔

گرگوری بہت زور سے ہنسا۔

"بات تو ٹھیک ہے۔ میری زندگی تو ضرور سدھر گئی۔ لیکن بحث ہے اس زندگی پر کہ لوگ بھی سدھر رہے ہیں۔ اور میری زندگی سدھر رہی ہے۔ اسے تم زندگی کہتی ہو؟"

گرگوری ہنستا ہوا وہاں سے اٹھکر کام پر چلا گیا۔ اور اسپتال کے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے اس نے سوچا مرتونہ خواہ مخواہ سہی لیکن بات پتہ کی کہتی ہے۔ اگر یہاں دو چار آدمی اور ہوتے اور اس کی باتیں سنتے تو ٹھیک ہوتا۔ وہ مسکراتا ہوا مردانہ وارڈ میں چلا گیا۔ جہاں سے مریضوں کی کراہ کی آواز اور انکا پکارنا آرہا تھا۔

مرتونہ یہ سوچ رہی تھی کہ اب اس کے شوہر کی نظر میں اسکا وقار بڑھتا جارہا ہے۔ اور وہ اس مقصد کے لئے جتنی کوشش کرسکتی تھی کرتی رہی۔ اور اپنی کوشش اور محنت کو دیکھ دیکھ کر وہ خود اپنی نظروں میں اونچی ہورہی تھی۔ اگرچہ وہ سنجیدگی اور غور سے کسی بات کے سوچنے کی عادی نہیں تھی۔ لیکن پھر جب وہ اپنی کل کی کٹھن والی زندگی سے موجودہ زندگی کا مقابلہ کرتی تو اسے ایک نمایاں فرق محسوس ہوتا۔ آہستہ آہستہ اسکی یاد سے گزشتہ دن محو ہوتے نظر آرہے تھے۔ اسپتال کا تمام عملہ اسکی عزت کرنے لگا تھا۔ لوگ اسکی پھرتی اور محنت کی تعریف کرتے۔ اور ہر ایک اس سے پیار اور محبت سے پیش آتا۔ اور اسے بھی انسان سمجھا جاتا تھا۔ اب وہ ایک ایسی زندگی بسر کررہی تھی جس کا اسے پہلے کوئی تجربہ نہ تھا اور اس زندگی نے اسے اپنے سے بھی محبت کرنا سکھا دیا تھا۔

ایک بار رات کی ڈیوٹی پر سے لوٹی۔ ڈاکٹرنی نے ہنسکے اس کے حالات پوچھے۔ اور مرتونہ نے بھی باتوں باتوں میں اسے سب کچھ بتادیا اور پھر وہ ہنس پڑی۔

"تمہیں ہنسی کس بات پر آئی؟" ڈاکٹرنی نے کہا۔

"نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن وہ بھی کیا زندگی تھی۔ مجھے آج محسوس ہوا ہے۔"

بیتے ہوئے دن یاد کرکے مرتونہ کے دل میں اب بھی اپنے شوہر کا خیال آتا۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اور اسکی محبت بالکل اندھی تھی۔

وہ عورت تھی اور محبت کے باب میں بالکل اندھی۔ اب وہ سوچتی کہ شوہر کا سلوک اس کے ساتھ کیا تھا۔ اب وہ جب کبھی بھی اس کے ساتھ بات کرتی تو بہت سنبھل سنبھل کر۔ وہ اب بالکل یہ نہیں چاہتی تھی کہ اسکا شوہر کسی بات پر بھڑک کر گالیاں بکنے لگے۔ لیکن کبھی کبھی اس کے دل میں یہ شک بھی گزرتا کہ شاید وہ کبھی بھی صلح و امن کی زندگی نہ گزار سکیں گے۔ اور پھر وہ یہ بھی سوچتی کہ گریگوری کی اب وہ پہلی حالت نہیں رہی۔ اور اب اسکا غصہ گھٹ گیا ہے۔

قسمت ہی کی بات تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی گئے دونوں جوان اور محنتی تھے۔ اور دونوں نے زندگی کے لئے بھی سخت جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ لیکن پھر بھی زندگی کی الجھنیں ان کا پیچھا نہ چھوڑتیں۔ اور گریگوری کا بے چین دل تو کبھی بھی مطمئن نہ رہتا تھا۔ وہ اس روز روز کی سخت محنت سے بالکل عاجز آ چکا تھا۔

ستمبر کا مہینہ تھا۔ ایک دن شام کو ایمبولنس کار اسپتال کے دروازے پر آ کر کھڑی ہوئی اور ڈرائیور نے بتایا کہ وہ سینٹ پیٹرن کوٹ کے احاطے سے ایک اور مریض کو لایا ہے۔ یہ دوشن اس لڑکے کو اٹھا رہا تھا۔ اسکی سانس بہت رک رک کر چل رہی تھی۔

"کون سینکا"! گریگوری نے میٹھی آواز میں کہا۔ "ارے تو نے مجھے پہچانا۔"

ہاں۔ سینکا نے بے وقت جواب دیا۔ اس نے اپنے سر کو آہستہ آہستہ حرکت دی۔ اور دوشن کی طرف جو کہ اسٹریچر کو سر کی طرف سے پکڑے تھا۔ دیکھتے ہوئے کہا۔ اور دوشن کو ایک دھچکا لگا۔ سینکا کی حالت خراب تھی۔ اور اور دوشن کے دل میں رہ رہ کر یہ سوال اٹھ رہا کہ

"آخر لڑکوں کو یہ بیماری کیوں ہوتی ہے؟"

سینکا کا جسم تھر تھرا رہا تھا۔ اور وہ بالکل خاموش تھا۔۔۔ انہوں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ اور اس کے نجس اور گندے چیتھڑے کو اتارنے لگے۔ اسکا تمام جسم غلاظت میں تھڑا ہوا تھا۔

"میرا تمام بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے"! سینکا نے کہا۔

"اچھا۔ اچھا۔ ابھی ہم تمہیں گرم پانی سے نہلا دیتے ہیں اور تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے"! گریگوری نے اسے تسلی دی۔

نہیں اب میں اچھا نہیں ہوں گا۔ گریگوری چچا۔ ذرا میری ایک بات تو سن لو۔ میں نے کسی کوٹ کا بٹن چرایا ہے۔ چوری کے بعد آج بیس دن ہو گئے کہ میں نے پہلی بار اسے بیچا تھا۔ اور اسی دن مجھے ہیضہ ہوا۔ گریگوری چچا میں نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اور یہ اسی کی سزا ہے۔ میں نے زینہ کے نیچے دبا دیا۔ پڑا ٹنگ دیا ہے اور پھر اس کے اوپر کچھ لکڑی وغیرہ ڈال کر چھپا دیا تھا۔ چچا اسے کسی طرح سے پھیر دو۔ کسی کوٹ کی ایک بہن تھی جو وہاں آئی بھی تھی۔ اس نے بٹن کو مانگا بھی تھا۔ چچا تم اسی کو واپس کر دینا"! کہتے کہتے سینکا درد سے تڑپنے لگا۔ اور پیٹ میں سخت درد اٹھ رہی تھی۔

سینکا کو بچانے کی بہت کوشش کی گئی۔ لیکن مرض اس کے کمزور جسم پر پورا قابو پا چکا تھا۔ آخر شام کو دوشن اسکی لاش کو مردہ خانہ میں پہنچا آیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسکا کوئی بہت بڑا نقصان ہو گیا ہے۔

وہاں مردہ گھر میں اس نے چاہا تھا کہ وہ سینکا کے ہاتھ پیر توسیدھے کر دے۔ لیکن وہ سب بہت جلد اکڑ چکے تھے کہ وہ انہیں پھر ٹھیک بھی نہ کر سکا۔ اور اسی طرح سے بے چین۔ تھکا ہوا اور افسردہ دل ہی دل میں روتا ہوا وہاں سے چلا آیا تھا۔ اس کے ذہن میں سینکا کا اکڑا ہوا جسم سمایا ہوا تھا۔ ایک دن یہی لڑکا کتنا خوش مکھ اور تیز تھا۔

آج وہ موت کے سامنے کتنا مجبور نظر آ رہا تھا۔ اس نے سینکا کو بچانے کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی۔ ڈاکٹروں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن وہ مر گیا۔ اس کے دل میں یکبارگی بغاوت کا طوفان اٹھنے لگا۔ ایک دن شاید اسے بھی ہیضہ ہو جائے اور اسکی نس نس کو توڑ کر رکھ دے۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ اور پھر اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔ کاش وہ کسی سمجھدار آدمی سے اسکے متعلق بات کر سکتا۔ کئی مرتبہ طالب علموں سے اس موضوع پر بات کرنا چاہی۔ لیکن انہیں فلسفیانہ خیالات کے لئے فرصت ہی نہ تھی۔ اب سوائے اس کے کہ وہ بیوی سے جا کر بات کرے چارہ ہی کیا تھا۔ اور وہ ویسا ہی افسردہ اس کے کمرہ کی طرف چل پڑا۔

مطروشا اپنے کمرے میں نہا رہی تھی۔ سماور میز پر کھا ابل رہا تھا اور پانی کے ابلنے کی آواز تمام کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

گریگوری کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اور اپنی بیوی کو نہاتے دیکھنے لگا۔ کمرے کے اندر پانی کی سنسناہٹ کی آواز پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اور گریگوری نیچے قدموں کی آواز سے اندازہ لگانے لگا کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔
پھر اسے اپنی بیوی کے کندھے سیسیکا کے کندھوں جیسے معلوم ہونے لگے۔ ویسے ہی سرد اور اکڑے ہوئے۔ اور وہ یکبارگی کانپ اٹھا۔

"سیسیکا مر گیا" اس نے ڈوبی ہوئی آواز سے —— بیوی کو بغیر مخاطب کئے ہوئے کہا۔ "سیسیکا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔" اس نے اس کی بخشش کے لئے دعا مانگی۔

"بڑے افسوس کی بات ہے" گریگوری نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"بڑا شیطان تھا۔

لیکن اب تو وہ مر چکا ہے۔ ایسی بات کہنے سے فائدہ۔
بہرحال اس کی موت افسوسناک ہے۔ وہ بڑا تیز تھا۔ ہر بات کو سمجھ جاتا تھا۔ خیر وہ لڑکا بہت تیز اور ہوشیار تھا۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا تھا کہ اسے اپنے پاس لے لوں اور رکھ سکوں۔ اور بیچارہ یتیم تھا۔ ہم اس سے اولاد کی طرح محبت کرتے۔ ویسے تو تم ابھی جوان ہو اور تندرست ہو۔ لیکن کاش ہمارے ایک بچہ ہوتا۔ تو شاید ہمارا دل بہلاوا ہو جاتا۔ اور پھر زندگی بھی اتنی دوبھر نہ معلوم ہوتی۔ یہ ہم جو اتنی محنت کرتے ہیں۔ کس لئے؟ کیا صرف پیٹ بھرنے کے لئے۔ کہ ہم اور محنت کر سکیں۔ اور پھر صرف پیٹ بھریں۔ آخر اس پاگل پن کی کوئی حد بھی ہے۔ ہاں اگر ہمارے اولاد ہوتی تو اور بات ہوتی۔

کہتے کہتے اس نے گردن جھکالی۔ اور اس کے لہجے میں شکایت بھری ہوئی تھی۔ میٹرونا اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اور اس کی بات سن کر وہ زرد ہوتی جا رہی تھی۔

"ہم دونوں ہی جوان ہیں۔ دونوں تندرست ہیں۔ پھر ہمارے اولاد کیوں نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں ہے۔ میں یہی سوچا کرتا ہوں۔ اور پھر عاجز آکر شراب خانے چلا جاتا ہوں۔"

"یہ سب بکواس ہے" میٹرونا نے چیخ کر کہا۔ ایسی بات منہ سے مت نکالو۔ تم محض عیاشی کے لئے شراب پیتے ہو۔ اور یہ محض بکواس ہے۔ اور جب وہ بات بناتے ہو تمہیں اپنے آپ پر ذرہ بھر شرم نہیں۔"

گریگوری بھنا اٹھا۔ اور پھر کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا۔ تاکہ میٹرونا کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ یہ وہی میٹرونا ہے۔ ایسی باتیں کرنے لگی ہے۔ اس نے اسے ایسی باتیں کرتے نہیں سنا۔ نہ اس نے کبھی طعنہ دیا تھا۔ اور نہ اسکا اس طرح سے مذاق اڑایا تھا۔

"اچھا۔" گریگوری نے کرسی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "ہاں تو اور کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"بہت کچھ۔ میں تمہارے لئے کوئی لڑکا پیدا کروں۔ ایسا نہ ہوگا۔ کبھی نہیں ہرگز نہیں۔ سنو اب میرے کوئی لڑکا نہیں ہوگا۔" کہتے کہتے وہ رو دی۔

"بس اب چیخ مت۔" اس کے شوہر نے کہا۔

"کیوں نہ چیخوں۔ یاد ہے تم نے مجھے کتنی بار انتہائی بیرحمی سے پیٹا ہے۔ کتنی بار تم نے میرے پیٹ پر لاتیں ماری ہیں۔ کیوں اور انہیں یاد کرو تم کیسے کیسے مجھے پیٹتے ہے۔ تمہارے گھونسوں نے میرا کتنا خون بہایا ہے۔ میرے تمام کپڑے خون میں تر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے میں اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی۔ تمہیں خود شرم آنی چاہئے۔ اور مجھے اپنی صورت نہ دکھانی چاہئے۔ اپنے بچوں کے قاتل تم ہو۔ اور پھر مجھے الزام دیتے ہو۔ میں نے سب کچھ برداشت کیا اور تمہیں معاف کرتی رہی۔ لیکن تمہارے ان الفاظ کو مرتے دم تک کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ کیوں تم نہیں جانتے کہ اگر میرے اولاد نہیں ہوتی تو قصور تمہارا ہے۔ تمہاری مار پیٹ کا ہے۔ کیا میں دوسری عورتوں سے الگ ہوں۔ میرا دل اولاد کے لئے بے چین نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں۔
کتنی راتیں میں نے گڑگڑاتے گزار دیں کہ تمہاری مار سے خدا میرے پیٹ کے بچے کو محفوظ رکھے۔ لیکن تم ذلیل۔ سفاک۔ قاتل۔ تم نے کبھی مجھے نہیں بخشا۔ دوسری عورتوں کے بچے دیکھ دیکھ کر میں خفیف ہو جاتی۔ میں اولاد چاہتی تھی۔ سیسیکا کو بھی بچے کی طرح چاہنے کی خواہش کرتی۔ ہائے اللہ!

وہ سانس لینے کے لئے رکی۔ لیکن اس کے منہ سے الفاظ نکلتے ہی رہے۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اور اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ دل میں ہوک اٹھ رہی تھی۔ اور الفاظ اس کے گلے کو چیر رہے تھے۔

گریگوری بالکل مبہوت ہوکر اسے تک رہا تھا۔ اس نے اس عورت کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے کبھی ایسی باتیں کرتے سنا تھا۔ اب وہ اس عورت سے ڈر رہا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں وہ اچھل کر اس کا گلا نہ دبا دے۔ لیکن آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور وہ مبہوت سی ہو رہی تھی۔ روز کی طرح اسے اسی وقت پیٹ درد سے کراہتے نہیں پڑ رہی تھی۔ آج مرٹونہ کے چہرے پہ ایک جلال تھا جو گریگوری کو کمزور بنائے دے رہا تھا۔

"تم نے میری روح کو زخمی کر دیا ہے۔ تم نے بہت بڑا پاپ کیا ہے۔ میں اب تک سب کچھ سہتی رہی اور میں تم سے کچھ صرف اس لئے نہ کہتی تھی کہ میں تم سے پیار کرتی تھی۔ لیکن تمہارے یہ بچے میری برداشت سے باہر ہیں اور میں ان کی تاب نہیں لا سکتی۔ خدا تجھے جہنم رسید کرے۔"

"چپ رہو کم بخت۔" گریگوری نے دانت کٹکٹاتے ہوئے کہا۔ "سنو۔ یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔ کیا تم اسوقت بھول رہی ہو کہ تم کہاں ہو؟"

گریگوری جوش اور غصے میں اندھا ہو رہا تھا۔ اور اس نے دروازے میں کھڑے ہوئے آدمی کو دیکھا اور معاً کمرے سے باہر نکل گیا۔ مرٹونہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ پھر آخرکار وہ ٹٹولتی ہوئی اپنے بستر پر گر پڑی۔

اندھیرا چھا چکا۔ مسکراتا ہوا چاند اس کا حال پوچھنے کے لئے باہر نکل آیا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں بادل چھا گئے اور بارش ہونے لگی۔

گھڑی کی ٹک ٹک اور کھڑکی کے شیشوں پر پانی کی ٹپ ٹپ ایک بہت ہی ہم آہنگ نغمہ پیدا کر رہی تھی۔ وقت گزر رہا تھا۔ بارش لگاتار ہو رہی تھی۔ مرٹونہ اسی طرح بے سدھ پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کی ابھری ہوئی آنکھیں چھت کی طرف لگی تھیں۔ دانت بھنچے ہوئے تھے اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ پانی اسی طرح سے گر رہا تھا۔ جیسے اپنی بات منوانے کے لئے کوئی کسی بات کو بار بار ایک ہی لہجے میں دہرائے چلا جا رہا ہو اور باوجود اس پیہم اصرار کے اس کے لہجے میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ جیسے بڑی سے بڑی بے التفاتی بھی اسے اس کی التجا سے نہ روک سکے گی۔

دن نکلنے تک بارش ہوتی رہی۔ وہ مرٹونہ بھی تمام رات سو نہ سکی۔ مانو تمام بارش کے قطرے اس سے پوچھ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔

جواب کیا! اسے اپنی نظر کی شراب میں مدہوش تصویر نظر آتی تھی۔ لیکن اب اس کے لئے ایک محبت بھری زندگی کے خواب کو بھولنا ناممکن تھا وہ اب تک اس خواب کے سہارے زندہ تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کا شوہر ایک نہ ایک دن سیدھے راستے پر آ جائے گا۔ لیکن پھر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب اگر اس نے ایک بار بھی شراب پی لی تو پھر وہ قابو میں نہ آ سکے گا۔ اس کے شراب خوری کے دنوں کی یاد اس کے لئے بہت تلخ تھی۔ اور اب جبکہ کچھ دنوں سے وہ اپنے شوہر کے ساتھ امن سے رہ رہی تھی تو اسے گذشتہ ایام دوزخ سے بھی بدتر نظر آ رہے تھے۔ اور وہ کسی قیمت پر بھی اس دنیا کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن وہ پھر بھی عورت تھی۔ اور اپنے تمام دکھوں کو قسمت پر ٹال دیتی۔

"یا اللہ یہ سب کیا تھا۔" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی خونخوار درندہ تھا جس کی زنجیر ٹوٹ گئی ہو

اب اجالا ہو چلا تھا۔ اگرچہ کھیتوں پر کہر ابھی تک طاری تھا۔

"مرٹونہ اٹھو اب۔ ڈیوٹی پر جانے کا وقت ہو گیا۔"

یہ سنتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا اور آہستہ آہستہ ہسپتال کی طرف چل دی۔ آج وہ کچھ سست نظر آ رہی تھی۔ اور اس کی خمار آلود آنکھوں اور ستے چہرے نے ہر ایک کو متاثر کیا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں۔"

"ہم سے بتانے میں کیا بات ہے۔ تمہاری جگہ آج کسی اور کو بلایا جائے؟"

مرٹونہ کو بہت شرم معلوم ہو رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی دوسرا اس کے بھید سے واقف ہو۔ یہ ڈاکٹرنی اگرچہ اس پر بہت مہربان تھی۔ لیکن پھر بھی اجنبی تھی۔ اور پھر کوشش کر کے وہ ہنسی۔

"کوئی بات نہیں۔ ذرا ہم میاں بیوی میں بول چال ہو گئی تھی۔"

لیکن کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔

"بے چارہ! کسی کو کیا معلوم تھا کہ خود اسکی زندگی میں کیا بھید ہے۔"

مڑونہ کا دل امڈ آیا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ اس عورت سے لپٹ کر خوب روئے۔ لیکن اس نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی اور ہونٹوں تک آئی ہوئی کراہ کو زبردستی دانت سے بھینچ کر روکا۔

کام ختم کرکے جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو وہاں جاکر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ نیچے ایمبولنس اسپتال کی طرف جا رہی تھی۔ شاید کوئی اور نیا مریض آیا ہو۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اور نیچے اب کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مڑونہ وہاں سے ہٹ آئی اور میز پر آکر بیٹھ گئی۔

"اب کیا ہوگا؟" یہ سوال بار بار اس کے ذہن میں پیدا ہو رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک وہاں بیٹھی یونہی ایک طرف کو تکتی رہی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ہر آواز پر چونک اٹھتی۔ جہاں برآمدے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ کرسی پر سنبھل کر بیٹھتی اور دروازے کی طرف دیکھ لیتی۔

لیکن جب آخرکار دروازہ کھلا۔ اور گرگوری اندر آیا وہ اسی طرح سے بے تعلق بیٹھی رہی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس کے سینے پر ایک سل رکھ دی گئی ہو۔ اور اسے بے طرح دبائے جا رہی ہو۔

گرگوری پہلے تو آکر دروازے میں تھوڑی دیر رکا اور وہیں سے اس نے اپنی بھیگی ہوئی ٹوپی اتار کے فرش پر پھینک دی۔ اس کے تمام کپڑے پانی میں تر بتر تھے۔ اور ٹیڑھا ترچھا چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بیوقوفوں جیسی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ بالکل بدصورت نظر آ رہا تھا۔

"یہ او کیا بھونڈی بنائی ہے؟" مڑونہ نے کہا۔

اور اس نے عجیب نامعقولیت سے سر ہلا دیا۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے پیروں پر پڑ کر معافی مانگوں؟"

مڑونہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اور میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ آیا اس معاملے میں میری غلطی ہے کہ نہیں۔ لیکن اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ غلطی میری ہی تھی۔ اور اسی وجہ سے میں تم سے پوچھ رہا تھا کہ میں تمہارے پیروں پر گر کر معافی مانگوں۔"

وہ اب بھی کچھ نہ بولی۔ اور اس کے منہ سے واڈکا کی تیز بو آ رہی تھی۔ اور اسکا دل برا ہو رہا تھا۔

"میں زیادہ نخرے نہیں برداشت کر سکتا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم مجھے معاف کر سکتی ہو یا نہیں؟" گرگوری نے چیختے ہوئے سوال کیا۔

"اس وقت تم نشے میں ہو۔ بہتر ہے کہ جاکر سو جاؤ۔" مڑونہ نے گہری لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ ہے۔ مجھے بالکل نشہ نہیں ہے۔ ہاں میں ذرا تھک گیا ہوں۔ میں ابھی تک تمہارے بارے یہی بات سوچ رہا تھا۔ اور میں یہ سب سوچ رہا تھا۔ اچھا اب ہوشیار ہو جاؤ۔"

اس نے اسکی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے شیطنت بھری آواز سے کہا۔

"منہ سے کیوں نہیں بولتی؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"اچھا کیوں؟"

اس کی آواز میں سختی تھی اور اسکی مٹھیاں بھنچ رہی تھیں۔

"دیکھ! کل تو نے یہاں میری بےعزتی کی تھی۔ مجھ پر چیخی چلائی تھی اور اب میں ہی تجھ سے معافی مانگ رہا ہوں۔ اچھی طرح سے سمجھ لے اس بات کو۔"

اسکی آواز میں دھمکی تھی۔ اور اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ مڑونہ اسکا مطلب خوب سمجھ رہی تھی۔ اسکی نظروں میں وہ کوٹھڑی والی زندگی اور سپنر کی شامیں گھوم رہی تھیں۔ وہ مارپیٹ۔ وہ عقوبت اور وہ دوزخ۔ اس کے ذہن میں چل پھر رہی تھی۔ اب اس میں اس زندگی کو برداشت کرنے کی قوت نہ رہ گئی تھی۔

"میں خوب سمجھ رہی ہوں۔ تم میں وہی درندگی چھپی بیٹھی رہتی ہے۔"

"درندگی؟ پھر میری زندگی سے تمہاری زندگی میں کیا فرق

پڑتا ہے۔ میں تو تم سے صرف معافی چاہتا ہوں۔"

"گرگوری - بس۔ اب تم چلے جاؤ" مٹروِنہ نے روتے ہوئے کہا اور اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"چلا جاؤں!" وہ شیطانی ہنسی ہنسا۔ "اور تمہیں رنگ رلیاں منانے کے لئے چھوڑ دوں۔ یہ چڑ تم کہاں سے سیکھا" کہتے کہتے اس نے اُسے بازو سے پکڑ لیا۔ اور ایک زنگ آلود چاقو نکال کر کھول لیا۔

"کمبخت تو مجھے بھی مار ڈال" کہتے کہتے اس نے اسکا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور لوٹ پیچھے ہٹ گیا۔ اس پر مٹروِنہ کے لہجے نے الفاظ سے زیادہ اثر ڈالا۔ یہ بات تو اس نے کئی بار پہلے بھی کہی تھی۔ لیکن کبھی اسکا لہجہ ایسا نہ تھا۔ پہلے تو وہ چھوٹتے ہی ہاتھ چلا دیتا تھا۔ لیکن آج اسے ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہ پڑی۔ اور اس نے چاقو کو میز پر پھینک دیا۔ جیسے وہ اس کے الفاظ سے ڈر گیا ہو۔

"چڑیل! تو مجھ سے آخر کیا چاہتی ہے" اس نے زہریلے انداز میں کہا۔

"میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتی۔ تو مجھے مارنے آیا ہے ۔۔ مار ڈال!"

گرگوری بالکل بوکھلا سا گیا۔ وہ حیرت سے اسکا منہ تکنے لگا۔ آج وہ یہ سوچکر آیا تھا کہ آج وہ اپنی بیوی کو دبالے گا۔ کیونکہ وہ سوچ رہا تھا کہ کل شام کو اسکی بیوی نے اسے دبا لیا تھا اور یہ اسکی بے عزتی ہے۔ لیکن آج اس نے اپنی بیوی کو زیر کرنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ خواہ کچھ بھی ہو وہ اسے نیچا دکھائے گا۔

اور یہ سوچ سوچ کر اسکا غم دم بدم بڑھ رہا تھا۔ پھر بیوی کے لگائے ہوئے الزامات ۔۔ اور تلخ معلوم ہو رہے تھے۔ کیونکہ وہ ٹھیک تھے۔ گرگوری جھنجلا رہا تھا۔ وہ اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا کہ مٹروِنہ بغاوت پر آمادہ ہے اور وہ اسی لئے چپ تو لے کر چلا تھا کہ اگر مٹروِنہ نے مقابلہ کیا ۔۔ تو وہ اسکا خاتمہ کر دے گا۔ لیکن یہاں نقشہ ہی الٹا تھا۔ مٹروِنہ نے کوئی جدوجہد نہ کی۔ وہ اس کے سامنے مرنے کے لئے بالکل تیار کھڑی ہو گئی۔ اور یہ ایسی صورت ہو گئی تھی۔ جسے اس نے ۔۔ سوچا ہی نہ تھا۔ اور مٹروِنہ کی بے بسی نے اسے بہت زیادہ طاقتور بنا دیا۔ مٹروِنہ کی اس ۔۔ نے گرگوری کے

ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔

"سُن ۔ اب اتنی اونچی نہ اُڑ۔ میں تیرے سینے میں چاقو اتار سکتا ہوں۔ اچھی طرح سمجھ لے ۔۔ میرے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔"

خود ہی یہ سمجھ کر کہ یہ گفتگو بالکل مہمل سی ہے ۔۔ کی وجہ سے وہ بالکل چپ ہو گیا۔ مٹروِنہ بھی ویسی ہی خاموش کھڑی تھی۔ اس کے دماغ میں صرف ایک سوال چکر لگا رہا تھا

"اب کیا ہوگا؟"

"مٹروِنہ" گرگوری کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "میں مانتا ہوں کہ یہ سب کچھ میری غلطی ہے۔ لیکن اب ہو گیا!" اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"اُف یہ زندگی۔ تم اسے زندگی کہتی ہو۔ ٹھیک ہے کہ ابھی تک ہیضے کے مریض آ رہے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میری زندگی اسکی وجہ سے کہاں آسان ہوئی۔ ہیضے کے مریضوں میں کچھ مرتے ہیں تو کچھ اچھے ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں تو اسی طرح سے زندہ ہوں۔ یہ زندگی نہیں ہے۔ بس ایک وبال ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے۔ میں اسے پوری طرح محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن اسے بیان نہیں کر سکتا۔ اب میں یہ زندگی بالکل نہیں بسر کر سکتا۔ ان مریضوں کو دیکھو۔ انکی کیسی تیمارداری ہوئی۔ میری بھی تو روح بیمار ہے۔ اور کیا مجھے تیمارداری کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو ہیضے کے مریضوں سے بھی بدتر حالت میں ہوں۔ میری روح میں مروڑ سے اٹھ رہے ہیں۔ چاہے تم مجھے اس کے لئے ظالم کہو۔ شرابی کہو۔"

گرگوری یہ الفاظ بہت آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ لیکن مٹروِنہ کا دھیان دوسری طرف تھا۔ اپنی گذشتہ زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسکا دماغ وہ تکلیفیں جو جھیل چکی اس وقت محسوس کر رہا تھا اور وہ بالکل خاموش تھی۔

"اب تم بالکل نہ بولو گی" گرگوری کے جذبات اُمنڈ آئے۔ "تم بولتی کیوں نہیں! آخر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"میں تم سے کچھ نہیں چاہتی۔ کیا تم مجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ آخر تم خود کیا چاہتے ہو؟" مٹروِنہ نے رک رک کر جواب دیا۔

"میں کیا چاہتا ہوں۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ میں چاہتا ہوں ۔ ۔ ۔"

لیکن پھر گرگوری کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتا تھا جس سے اسکی خواہش ظاہر ہو جائے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اب اسکے اور مٹروِنہ کے درمیان ایک خلیج حائل ہو چکی ہے۔ اور ۔۔ ۔۔ میں ایک ۔۔

اس کو ہاتھ نہ لگنے دیں گے۔

پھر اس پر جنون سوار ہو گیا۔ اور اس نے تالی کر مٹھا تے ہوئے
ایک بھر پور قہقہہ لگایا۔ اور ساتھ ہی گھوڑوں کی طرف چیخنے چلانے لگا۔
"مسز کریکی۔ آخر تم جانتی ہو۔ میں تمہیں مار کر رکھ دوں گا۔
گھونسہ پڑتے ہی مسز کا سر میز سے جا ٹکرایا۔ لیکن وہ پھر
اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور انتہائی نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"پھر مار" وہ انتہائی نفرت انگیز لہجے میں چلائی۔

"چپ رہ"

"آ۔ پھر مار"

"او۔ او۔ پڑیا کہیں کی"

"بس۔ بہت ہو چکا۔ گرگوری۔ بس اب ہو چکا۔

"چپ"

"بس اب تم میرے ساتھ من مانی نہیں کر سکتے"

وہ دانت پیستا ہوا کچھ پیچھے ہٹا۔ شاید وہ دوسرا گھونسہ مارنا
چاہتا تھا۔ لیکن اسی لمحہ ڈاکٹر داس جنگو کرے میں آ گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم اس جگہ کو کیا سمجھتے ہو۔ آخر تمہارا اس
حرکت سے مطلب کیا ہے؟"

ڈاکٹر کے چہرے سے حیرت و خشونت کا بیک وقت اظہار
ہو رہا تھا۔

لیکن گرگوری نے ان الفاظ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بلکہ وہ
ڈاکٹر کے سامنے تعظیماً جھک بھی۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ذرا سی میاں بیوی کی گرما گرمی تھی"
اور قہقہہ مار کر ہنس پڑا

"تم کل کام پر کیوں نہ آئے" ڈاکٹر نے اسکی بے حسی پر غصہ
ہوتے ہوئے کہا۔

گرگوری نے یونہی کندھوں کو جنبش دی۔

"مجھے تھوڑا سا ذاتی کام تھا اس وجہ سے نہ آیا۔"

"کل رات کون یہاں جھگڑا کر رہا تھا"

"ہم . . . . ."

"تم۔ بہت خوب۔ اور تم سمجھ رہے ہو کہ یہ تمہارا گھر ہے۔
بغیر پوچھے جب جہاں چاہتے باہر چلے گئے"

"تم تمہارے غلام نہیں ہیں۔ کیونکہ . . ."

"خاموش۔ تم نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ یہ چیز میں
ابھی تمہیں بتاتا ہوں"

گرگوری کے دماغ میں یک بارگی بغاوت کا آتش فشاں
پھوٹ پڑا۔ وہ چاہتا تھا کہ سب کو برباد کر دے۔ ہر چیز توڑ پھوڑ
کر رکھ دے۔ اب وہ موقع آ گیا تھا۔ جب وہ اپنی زندگی کا سب سے
بڑا کام کر سکتا تھا۔ آج وہ ان تمام بیڑیوں کو جو اسکی روح کو
جکڑے ہوئے ہیں توڑ ڈالے۔ اسے ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی اور
چہرے سے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

"چلا جاؤ مت۔ نہیں تو گلے کی نالی پھٹ جائے گی۔ میں خوب
جانتا ہوں کہ ہم کہاں ہیں۔ ہم مذبح خانے میں ہیں۔ جہاں جانوروں
کے بدلے انسان ذبح کئے جاتے ہیں"

"کیا۔ کیا کہا تم نے" حیران ڈاکٹر اسکی طرف بڑھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم خود سب جانتے ہو۔ بالکل مردود اپنا سب"

"نہیں یہ سب کچھ نہیں۔ جیسے تم میری بات کا صاف صاف
جواب دو۔ نہیں تو میں . . . ."

"بس بس چلا کر ساری دنیا کو جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہے"
گرگوری نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ جیسے
جیسے وہ بولتا جاتا تھا اسکا جوش بڑھتا جاتا تھا۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں
نے تمہیں یہ حق دے دیا ہے کہ تم جو چاہو وہ کر سکتے ہو۔ تم کچھ نہیں ہو۔
اور تمہاری دوائیں وغیرہ اب فریب ہیں۔ ہاں اسکو ذبح خانہ کہنا شاید
غلط ہو۔ اور میرے منہ سے غلط بات نکل گئی ہو۔ لیکن پھر بھی تمہیں
اس طرح چیخنے کا کوئی حق نہیں۔

"یہ کیا! اچھا اب تم ادھر آؤ۔ میں بھی تمہیں ایک آدھ جوتی دوں"
لوگ شور سن کر برآمدے میں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ گرگوری
نے جلدی سے کوٹ کر کہنا شروع کیا۔

"میں کوئی جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہاں! لیکن آپ کے جوتی سے
پہلے میں بھی دو ایک بات بتا دوں"

"ضرور کہو"

"شہر جا کر میں سب کو بتا دوں گا کہ آپ لوگ ہیضہ کا کیسے
علاج کرتے ہیں"

"یہ کون سی بات ہے ؟"

"جی وہاں آگ و آتشبازی کی وصولی دی جاتی ہے ۔"

"یہ کیا نامعقولیت ہے ۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو" ڈاکٹر کچھ سنجیدہ اُٹھا تھا ۔ وہ اب تک اسے ایک اچھا اور محنتی کارکن سمجھتا تھا ۔ لیکن اب معلوم نہیں کیوں وہ اس قسم کی اعترابوری کر رہا تھا ۔

"بے وقوف ! کہہ کیا رہا ہے ؟"

"بے وقوف" گرگوری نے ڈاکٹر کی بات دہرائی ۔ اگرچہ وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر کے الفاظ درست ہیں ۔ لیکن اس لفظ کو اس نے اپنی بےعزتی سمجھا ۔

"جو کچھ میں کہہ رہا ہوں ۔ اسے سمجھتا بھی ہوں اور ٹھیک بھی ہے میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں ۔ کہتا ہوں ۔ میں سچی بات چھپاتا نہیں ۔ اچھا مٹروِنا اب یہاں سے چل ۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی ۔" مٹروِنا نے صاف جواب دیا ۔

ڈاکٹر نے دونوں کو بیک وقت دیکھا ۔ اور پھر اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا ۔ اسکی سمجھ میں بات نہ آرہی تھی ۔

"تم نشے میں ہو ۔ اور ہوش سے باہر ۔ تم سمجھ رہے ہو کہ تم کیا کر رہے ہو ؟"

گرگوری اب بھی اپنی بات پر جما تھا ۔ آپ ہیضہ کے مریضوں کا علاج کر رہے ہیں لیکن تندرست زندگی سے عاجز آکر مرتے جا رہے ہیں مٹروِنا اگر تو فوراً نہ اٹھ کھڑی ہوئی تو میں تیرا سر توڑ دوں گا ۔"

مٹروِنا کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا ۔ لیکن اس کے چہرے سے بلا کی متانت اور پختہ عزم کا اظہار ہو رہا تھا ۔ گرگوری باوجود انتہائی جوش میں تھا لیکن اس سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا ۔

لاحول ۔ اس کمبخت کو خود بھی ہوش نہیں کہ وہ کیا بک رہا ہے ۔

"بس اب یہاں سے نکل جا ۔ اسی کو غنیمت سمجھ کہ میں تجھے جیل نہیں بھجوا رہا ہوں ۔ اب فوراً یہاں سے نکل جا ۔

گرگوری کی گردن جھک گئی ۔ اگر اسکی ان لوگوں نے پٹائی کی ہوتی یا اسے جیل بھجوا دیا ہوتا تو وہ اتنا بُرا نہ محسوس کرتا ۔

"تو آتی ہے کہ نہیں ۔ بس یہ آخری سوال ہے ۔" گرگوری نے گلوگیر آواز میں اپنی بیوی سے کہا ۔

"نہیں ۔ ہرگز نہیں ۔" اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے جواب دیا جیسے وہ ڈر رہی ہو کہ کہیں گرگوری پھر مکا نہ مار دے ۔

"تم سب جہنم میں جاؤ ۔ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ۔"

"چل ۔ کدھے چل ۔" ڈاکٹر نے اسے بھڑکتے ہوئے کہا ۔

"چپ رہو جی ۔ بڑا آیا طرم خان کا بچہ ۔ میں تو جا ہی رہا ہوں ۔ اب ہم ملیں نہ ملیں ۔ لیکن اگر کبھی کہیں اور ملے تو پھر تمہاری خیر نہیں ۔"

اور وہ دروازے کی طرف چل پڑا ۔

"خدا حافظ ۔" ڈاکٹر نے طنزاً کہا ۔

گرگوری چلتے چلتے رک گیا ۔ اسکی آنکھوں سے کرب و بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا ۔

"بس اب مجھے نہ چھیڑو ۔ اور مجھے غصہ نہ دلاؤ ۔ بغیر کچھ کہے سنے تم اپنی گردن سلامت لے جا رہے ہو ۔ اسکو غنیمت جانو ۔"

اس نے درخش پر سے ٹوپی اٹھائی ۔ اسے پہنا ۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا ۔ چلتے وقت اس نے اپنی بیوی پر آخری نظر نہ ڈالی ۔

ڈاکٹر مٹروِنا کو دیکھ رہا تھا ۔ اسکا چہرہ بالکل سفید ہو گیا تھا ۔

اسے کیا ہو گیا ہے ۔" ڈاکٹر نے گرگوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ۔

"مجھے نہیں معلوم ۔"

"اب وہ کدھر گیا ہوگا ؟"

"شراب خانے ۔" مٹروِنا نے بغیر جھجک کے جواب دیا ۔

ڈاکٹر نے ایک بار نظر اٹھائی ۔ اور کمرے کے باہر نکل گیا ۔

مٹروِنا کھڑکی میں سے جھانکی ۔ باہر ایک انسانی شکل جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی بارش و ہوا میں سے گزرتی ہوئی جا رہی تھی ۔ بالکل تنہا ۔ کھیتوں میں سے ہو کر شہر کی طرف ۔

مٹروِنا کا چہرہ اور سفید ہو گیا ۔ وہ اپنے کمرے کی عبادت گاہ کے پاس گئی ۔ اور حضرت مریم کے سامنے جھک گئی ۔ وہ ایک ہی دعا کو بار بار دہرا رہی تھی ۔ اور اپنے گلے اور سینے کو سہلاتی جاتی تھی ۔

× × × ×

ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے مجھے اپنا صنعتی اسکول دکھانے کے لئے مدعو کیا ۔ اسے اپنے اس اسکول سے بہت محبت تھی ۔ اور وہ اسے اپنی عزیز اولاد کی طرح سے سمجھتا تھا ۔ اور ہر ایک کو دکھانے کی کوشش کرتا ۔ اسے اپنے اسکول پر فخر تھا ۔ اور وہ کہنے لگا کہ معلموں کا نوجوان طبقہ

کسی طرح سے ہم سے تعاون کر رہا ہے۔ اور اس اسکول کی نیک نامی کے لئے تو وہی سب کچھ ہے۔ آپ بیٹھیں، آپ کا بچہ جو تمہاری کی کلاس کو دیکھ لوں۔ اس کی معلمہ دوسروں کے لئے مشعل راہ بھی جا سکتی ہے۔ وہ پیدائشی معلمہ ہے۔ اسے اپنے طالب علموں سے بالکل ماں جیسی محبت ہے۔ اگرچہ اسے صرف ۸۰ روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن اسی تنخواہ پر دن رات محنت کرتی ہے۔ بلکہ دو غریب طالب علموں کی کفالت بھی کرتی ہے۔ آپ اس سے ضرور ملئے۔ آپ کو اس سے مل کر یقیناً خوشی ہوگی۔

میرے دوست کی تعریف نے مہمیز شوق پر تازیانہ کا کام کیا اور میں اس سے ملنے دوسرے ہی دن اسکے گھر پہنچ گیا۔ اور یہیں مجھے مٹرونہ اوردوت نے اپنی دردبھری کہانی سنائی۔ اوردوت سے الگ ہو جانے پر بھی اوردوت نے اسے چین نہ لینے دیا۔ وہ آکر اسے ستاتا۔ شراب کے نشے میں بدمست وہ مار پیٹ بھی کرتا۔ وہ اکثر سڑکوں پر کھڑا اسکا انتظار کیا کرتا۔ کہ اگر مٹرونہ نکلے تو اسے ستائے اور مار پیٹ اور جھگڑا کرے۔ لیکن مٹرونہ نے سب کچھ برداشت کیا۔

آخر جب اسپتال بند ہو گیا تو ڈاکٹروں نے اسے اس اسکول میں سفارش کر کے رکھا دیا۔ ایک نرس نے اسے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا بھی سکھا دیا تھا۔ اور اس کے بعد مٹرونہ کی زندگی پرسکون ہو گئی تھی۔ وہ یتیم خانے سے دو بچوں کو پرورش کرنے کے لئے لے آئی تھی۔ اور انہیں بہت عزیز رکھتی۔ اپنے طالب علموں کے لئے وہ ہر محنت اور مشقت کے لئے تیار رہتی۔ ان کے لئے بڑی سے بڑی محنت بھی آرام کے مترادف تھی۔ اسکی اس محنت اور جانفشانی نے اس کے لئے دوسروں کے دل میں احترام کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اور اب وہ بالکل مطمئن تھی۔ لیکن ماضی کی دردبھری یاد اب بھی اس کی آنکھوں میں جھلکتی تھی۔ اسے بہت ہی بری قسم کی کھانسی تھی۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے اور رخسار مرجھا گئے تھے۔

مجھ سے گرگوری کی بھی ملاقات ہوئی۔ وہ شہر کے بدترین علاقوں میں رہتا تھا۔ میں دو تین ہی ملاقاتوں میں اسکا دوست ہو گیا۔ اس نے بھی اپنی زندگی کی داستان قریب قریب وہی کہی جو مٹرونہ نے بیان کی تھی۔ اور کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا :-

یہ ہے میری رام کہانی۔ سوچتا تھا کچھ دن کے لئے میں اجڑ لیکن پھر اس کے بعد جی جاؤں گا۔ اور میں زندگی کا وہ تمام جسے کرنا چاہتا تھا نہ کر سکا۔ لیکن اسکی چاہت اب بھی میرے دل میں ہے۔ میں اب بھی چاہتا ہوں۔ کہ اس زمین کو گلزار کر دوں۔ یہاں گندم کا سمندر بن جاؤں۔ کوئی بھی ضروری اور اہم کام کر ڈالوں جو مجھے عام لوگوں سے اونچا اٹھا دے۔ تاکہ میں وہاں سے ان پر تھوک سکوں۔ اور ان سے کہوں کہ زمین پر رینگنے والے کیڑو تمہاری حیثیت کیا ہے۔ تمہاری زندگی کتوں سے بدتر ہے اور پھر تم اسکو زندگی کہتے ہو۔ اور اس کے بعد میں خود اس اونچائی سے سر کے بل آ پڑوں یعنی خاتمہ۔ اف زندگی کس قدر غلیظ اور بے مزہ ہے۔ جب میں نے مٹرونہ کو چھوڑا تھا تو میں نے کہا تھا کہ چلو چھٹی ہوئی۔ اب مزے ہی مزے ہیں۔ لیکن جیسے دن رات کی روانی ہی رک گئی ہو۔ زندگی بالکل ختم ہو گئی ہے۔ لیکن میں پھر بھی دنیا کو ضرور دکھاؤں گا کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ اور میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔ خدا جانتا ہے کہ میری بیوی . . . . لعنت ہے بیوی پر۔ میرے جیسے انسان کو بیوی کی کیا ضرورت۔ یا پھر اسکو میری کیسی حاجت۔ وہ زن جیسے چاروں طرف سے الجھنیں گھیرے ہوں۔ جو ہمیشہ سے نا آسودہ رہا۔ اسے کبھی بھی سکون نہ ملا۔ آوارہ گردی میری فطرت میں ہے۔ میں ہر جگہ پھرا۔ چلا۔ گھوما۔ لیکن کہیں سکون نہ ملا۔ شراب۔ ہاں میں شراب پیتا ہوں۔ وادکا۔ اف یہ ایک چیز ہے۔ جو سینے دل کی آگ کو بجھاتی ہے۔ اس میں آگ بجھانے کی بہت بڑی صلاحیت ہے۔ میں ہر چیز سے تنگ آ گیا ہوں۔ شہر۔ دیہات۔ آدمی۔ چھوٹے۔ بڑے۔ یہ سب کیا ہے۔ کیا اس سے بہتر اور کچھ بھی نہیں پیدا کیا جا سکتا تھا۔ ہر آدمی دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہے۔ ہر شخص درندہ ہے۔ سفاک ہے بھیڑیا ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ سب کو پیس کر رکھ دوں۔ یہ دنیا شیطانی کارنامہ ہے۔

شراب خانے کا دروازہ بار بار کھلتا اور بند ہوتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے یہ ایک اژدہا ہو اور ایک ایک کر کے ان روسیوں کو نگلے جا رہا ہو۔ خواہ وہ آسودہ ہوں یا نا آسودہ۔

یہ ناولٹ بھی ضرور ملاحظہ فرمائیے

زُلفوں کے سائے میں

انقلابی بحران اور انقلاب کی کامیابی کے زمانہ کی تصویر

۱۹۴۲ ۱۹۴۴ سے ۱۹۴۹ء تک کا زمانہ

مشہور چینی ادیب شہیدکی کا ناولٹ

اس ناولٹ میں زندگی کی تڑپ کا م اور شادابی کو جس خوبصورتی اور سچائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ بول رہی ہے کہ میرا داستان گو کنارے سے تماشا دیکھنے والوں میں نہیں وہ ہر موڑ پر میرے ساتھ ساتھ چلنے کی طرح رہا ہے۔ مترجم ظ انصاری قیمت ۱۲

پہلی محبت

تورگنیف کا رومان پرور ناول

پہلی محبت ایک ایسے نوجوان کی داستان عشق ہے جسے ایک دوشیزہ سے پیار ہو جاتا ہے۔ جو دراصل اس کے باپ کی محبوبہ ہے۔ وہ لڑکی اس سے محض ملتفت ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے عاشق کا بیٹا ہے۔ باپ بیٹے کی ایک عورت کے ساتھ محبت کا یہ پیچیدہ قصہ انتہائی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عورت کی عظمت کی جھلکیاں بھی پیش کرتا ہے۔

ضخامت ۱۴۴ — قیمت ایک روپیہ چار آنہ

سیندور کی راکھ

سیندور جب راکھ بن جاتا ہے تو ——— پیار کے ریشمی تار میں بندھے ہوئے دو دل ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ واقعی جدا ہوتے ہیں؟ ——— اس کا جواب

کشمیری لال ذاکر نے اپنے ناولٹ

سیندور کی راکھ

میں دیا ہے

جو مختصر سی ازدواجی زندگی کی دلآویز اور اندوہناک داستان ہے۔

جس میں ذاکر نے اپنے شریکِ حیات کو دوام بخشا ہے۔

جو ہمارے چھوٹے چھوٹے گھروندوں، اور ان کی چار دیواری میں سانس لینے والی زندگی سے متعلق ایک سحر آفریں مرقع ہے۔

ضخامت ۱۲۸ صفحات — قیمت ایک روپیہ چار آنہ

چیخوف

چیخوف ——— جس طرح افسانہ نگاروں میں یکتا و بے نظیر ہے بالکل اسی طرح اس کے دو ناولٹ

وارڈ نمبر ۶ اور ریل اُوٹ پہاڑ

* افسانوی ادب میں عدیم النظیر ہیں۔
* اسلوب بیان، دلچسپی اور حقائق افروزی کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔
* دنیا کے عظیم ادب کے آئینہ دار ہیں۔
* علم حیات کا سرچشمہ ہیں۔

مترجم :- محمد یوسف

ضخامت ۱۲۰ صفحات — قیمت ایک روپیہ چار آنہ

ایہہ کیو کی سچی کہانی

مصنف :- چین کا پریم چند ——— لوسون

مترجم :- ہنس راج رہبر

ایہہ کیو ——— نکبت و افلاس کے باوجود انسان تھا۔ مگر اس کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک نہ ہوا۔

ایہہ کیو ——— کو کام اور محنت کرنے کا جنون تھا مگر کام اتنا ملتا کہ پیٹ کی آگ نہ بجھتی۔

ایہہ کیو ——— نے چین کے ۱۹۱۱ء کے انقلاب میں کوئی حصہ نہ لیا مگر اُسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا چین کے عظیم فنکار کا شاہکار ناولٹ قیمت سوا روپیہ

دل ہی تو ہے

فرانس کے انتہائی بے باک ناول نگار ایملی زولا کا ناول ★ سماجی خرابیوں کے جنم داتا کون ہیں ★ خارجی حالات انسان کے طور اطوار اور عادات وخصائل پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ★ فرسودہ نظامِ حیات میں ذرا سی مسرت حاصل کرنے کیلئے کن کن مصائب سے گذرنا پڑتا ہے ★ ان تمام سوالات کا جواب آپ کو اس ناولٹ "دل ہی تو ہے" سے ملے گا۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات

قیمت ایک روپیہ چار آنہ

مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی

تورگنیف کا شمار دنیا کے گنے چنے عظیم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کی ہر تصنیف کو عالمی ادب میں حقیقت پسندی کی ایک زندۂ جاوید روایت کا درجہ حاصل ہے۔ نامور نقاد بیلنسکی لکھتے ہیں: "تورگنیف ایک انتہائی ذہین فنکار ہے۔ اس کی ہر بات میں عظمت کے ابدی نشان ملتے ہیں۔" دنیا کے عظیم ترین ناول نگار دستوئفسکی اس کے بارے میں کہتے ہیں: "قدرت نے تورگنیف کو عدیم المثال ذہانت، بے نظیر قوتِ اظہار اور اسلوب کی بیش بہا شعریت عطا کی ہے۔" ایک اور عظیم نقاد ہرزن نے لکھا ہے: "تورگنیف کا مقام روسی ادب میں بہت بلند ہے۔" اس طرح فرانس کے شہرۂ آفاق ادیبوں فلوبیئر اور زولا نے تورگنیف کو حقائق کا داستان سرا بتایا ہے۔ ماریس بیرنگ انگریزی ادب کے نامور نقاد تو تورگنیف کی تخلیقات کا یوں جائزہ لیتے ہیں: "تورگنیف ایک شاعر ہے، ایک کلاسیکی فنکار ہے اور اس کی نثر میں چشموں کی روانی، بہاروں کی تازگی اور کلیوں کی صباحت ہے۔"

گزشتہ صدی میں روسی ادب کا ایک عظیم دور شروع ہوا تھا اور اس عظیم دور کی ابتدا تورگنیف ہی سے ہوتی ہے۔ تورگنیف نے اپنے ناولوں میں نئے روس کے ابتدائی خدوخال کی تصویر کشی کی ہے۔ تورگنیف جس عہد میں پیدا ہوا، اس نے اس عہد کی نہایت ہی صحیح عکاسی کی ہے۔ اس وقت کے تمام تضادات کو اجاگر کیا ہے۔

تورگنیف ایک اچھے گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ گزشتہ صدی کے روس اور مغربی یورپ کی تاریخ کے ہنگامہ خیز دور میں زندہ رہا۔ تورگنیف اپنے عہد کا انسان تھا۔ اس نے اپنی ادبی تخلیقات سے اپنے وقت کی پود کے ذہن اور دل کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔

تورگنیف زندگی کے مشاہدات کو فن کارانہ رنگ دینے میں کمال رکھتا تھا۔ وہ وقت کے نئے تقاضوں پر عبور حاصل کر لیتا تھا اور وہ اس بات کا سختی سے حامی تھا کہ قومیت کے بغیر نہ کوئی آرٹ ہے، نہ کوئی صداقت ہے اور نہ ہی کوئی زندگی ہے — تورگنیف روسی عورتوں کی صحیح عکاسی کے لئے مشہور ہے۔ تورگنیف نے اپنے اس ناولٹ میں بھی روسی عورت اور اپنے عہد کے نوجوانوں کے کردار کو ان کے اصل رنگ میں پیش کیا ہے۔

ٹیگور

یوسف ناجی

تورگنیف

یوسف جامعی

پھرتے ہیں میر خوار

گرمیوں کی ایک پرسکون صبح تھی۔ صاف شفاف آسمان میں سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ لیکن کھیت ابھی تک شبنم سے چمک رہے تھے۔ وادی سے جو ابھی بمشکل بیدار ہوئی تھی۔ ایک تازہ مہک اٹھ رہی تھی۔ اور جنگل میں جو ابھی تک خاموش اور نم آلود تھا۔ صبح سویرے بیدار ہونے والے پرندے کلیلیں کر رہے تھے۔ ایک ڈھلوان پہاڑی پر جو اپنے دامن سے چوٹی تک رائی کی فصل سے لبریز تھی ایک چھوٹا سا گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔ یہ رائی ابھی حال ہی میں اگی تھی۔ گاؤں کو جانے والی ایک تنگ پگڈنڈی پر ایک نوجوان عورت ململ کے لباس میں چل رہی تھی۔ اس کے سر پر پیچ دار گول تنکوں کی ٹوپی تھی۔ اور اس کے ایک ہاتھ میں چھاتا تھا ایک ملازم لڑکا اس سے کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا

نوجوان عورت بڑے سکون کے ساتھ قدم رکھ رہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس سیر سے لطف اندوز ہو رہی ہے اس کے اردگرد رائی کی بلند فصل کے اوپر جو نرم اور طویل لہروں میں جھوم رہی تھی اور کبھی نقرئی سبز رنگ کی ہو جاتی تھی اور کبھی سرخ ہو کر دمکنے لگتی تھی۔ چنڈول منڈلا رہے تھے۔ یہ نوجوان عورت اپنے گاؤں سے آ رہی تھی۔ جو سامنے کی بستی سے ایک میل سے کم دوری پر واقع تھا جس کی طرف وہ جا رہی تھی۔ یہ نوجوان عورت الیگزینڈرا پاؤلوونا لیپنا تھی اور بیوہ تھی۔ جس کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ ایک امیر عورت تھی وہ اپنے بھائی سرگے پاؤلووچ والنتیف کے ساتھ رہتی تھی۔ جو رسالے کا ایک سبکدوش کپتان تھا۔ وہ کنوارا تھا۔ اور بہن کی جاگیر کا تمام انتظام اس کے ہاتھوں میں تھا۔

مادام لپنا سامنے کے گاؤں میں پہونچ گئی اور نزدیکی جھونپڑے کے آگے جا کر رک گئی۔ جس کی چھت بہت نیچی، اور بڑی خستہ حال تھی۔ اس نے لڑکے کو آواز دی اور اسے حکم دیا کہ وہ جھونپڑے کے اندر جائے اور اس جھونپڑے کی مالکن کی خیریت پوچھے۔ لڑکا ایک پتلے دبلے کسان کے ہمراہ جلدی باہر آ گیا۔ کسان کی ڈاڑھی سفید تھی

"کیا حال ہے اس کا؟" لیپنا نے پوچھا۔

"ابھی تک زندہ ہے" بوڑھا بڑبڑایا۔

"کیا میں اندر جا سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں۔"

مادام لیپنا نے جھونپڑی کے اندر قدم رکھا۔ یہ جھونپڑی تنگ اور تاریک تھی۔ دھوئیں سے بھری ہوئی تھی۔ اور اس کے اندر دم گھٹتا تھا انگیٹھی نما صوفے پر کسی نے کروٹ لی اور وہ کراہنے لگا۔ اس طرف دیکھتے ہوئے مادام لیپنا کو نیم تاریکی میں ایک بڑھیا کا زرد اور جھریوں دار چہرہ نظر آیا۔ چارخانے کا ایک رومال اس کے سر کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ وہ سینے تک ایک بڑے کوٹ سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ بڑی مشکل کے ساتھ سانس لے رہی تھی۔ اور اس کے لمبے لمبے ہاتھ بڑی نقاہت کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔

مادام لیپنا نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور بڑھیا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ پیشانی جل رہی تھی۔

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" انگیٹھی نما صوفے پر جھک کر اس نے پوچھا۔

"آہ —" عورت نے کراہتے ہوئے اور مادام لیپنا کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"میرا حال ہے بہت ہی برا پیاری خاتون! میری آخری گھڑی آ پہنچی ہے"

"خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ میری پیاری۔ تم شاید اچھی ہو جاؤ۔ کیا تم نے دوا پی تھی۔ جو میں نے تمہیں بھجوائی تھی؟"

بوڑھی عورت نے دردناک انداز میں کراہتے ہوئے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے وہ سوال سنا ہی نہیں تھا۔

"مر جانی چکی ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ جو دروازے میں کھڑا تھا۔

مادام لینا بوڑھے کی طرف مڑی۔

"کیا تمہارے سوا اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی اور نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ایک لڑکی ہے۔ اس کی پوتی۔ لیکن وہ اکثر باہر رہتی ہے۔ وہ دیر تک ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتی۔ بڑی شریر ہے۔ اتنی کاہل ہے کہ اپنی دادی کو پانی کا ایک چلو تک نہیں دے سکتی۔ اور میں بہت بوڑھا ہوں۔ میں اب کسی کام کا نہیں رہا ہوں۔"

"تو کیا میں اسے اپنے اسپتال میں لے جاؤں؟"

"نہیں۔ وہاں اسے کیوں لے جایا جائے؟ اسے مرنا تو ہے ہی۔ وہ اپنی زندگی گذار چکی ہے۔ خدا کی مرضی پوری ہو کر رہے گی۔ وہ تو اس صوفے پر سے اٹھ ہی نہیں سکتی۔ اور اسپتال کی بات کر رہی ہیں! اگر اس کو اٹھانے کی کوشش کی گئی تو مر جائے گی۔"

"آہ۔" بڑھیا پھر کراہی۔ "پیاری خاتون میری یتیم بچی کو تنہا نہ چھوڑ دینا۔ ہمارے مالک بہت دور رہتے ہیں۔ اور تم..."

بوڑھی عورت خاموش ہو گئی۔ اس کی طاقت جواب دے گئی۔

"فکر نہ کرو۔" مادام لینا بولی۔ "ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ یہ لو میں تمہارے لئے چائے اور کھانڈ لائی ہوں۔ چاہو تو تھوڑی سی پی لو ... تمہارے پاس سماوار ہے کہ نہیں؟" اس نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سماوار؟ نہیں ہمارے پاس نہیں ہے۔ مگر میں لا سکتا ہوں۔"

"ضرور لاؤ۔ نہیں تو میں تمہیں اپنا بھجوا دوں گی۔ اپنی پوتی سے کہنا کہ وہ گھر پر رہا کرے۔ یہ بھی کہنا کہ اسے شرم آنی چاہیئے۔"

جواب دیئے بغیر بوڑھے نے چائے اور کھانڈ کا پارسل اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"تیرا پونا خدا حافظ!" مادام لینا بولی۔ "میں تمہیں پھر دیکھنے کے لئے آؤں گی۔ ہمت نہ ہارنا اور دوا باقاعدگی کے ساتھ پیتی رہو۔"

بوڑھی عورت نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اس نے اپنی آنکھوں پر زور دے کر اپنی محسنہ کی طرف دیکھا

"خاتون۔ ذرا اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاؤ۔"

مادام لینا نے بوڑھی عورت کی التجا کی تعمیل نہ کی۔ اس کی بجائے وہ جھکی اور اس نے بوڑھی عورت کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ چلتے ہوئے مادام لینا نے بوڑھے سے کہا "یہ بات یاد رکھو ... باقاعدگی کے ساتھ دوا دیتے رہنا اور یہ چائے بھی پلا دینا۔"

بوڑھے نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ اور صرف اپنا سر جھکا کے رہ گیا۔

جب تک مادام لینا باہر تازہ ہوا میں نہ آئی تب تک وہ آزادی کے ساتھ سانس نہ لے سکی۔ اس نے اپنا چھاتا کھولا۔ اور گھر کی طرف چل پڑی۔ اتنے میں جھونپڑے کے کونے سے ایک چھوٹی سی دو پہیوں کی گاڑی نمودار ہوئی۔ اس میں تیس برس کی عمر کا ایک ... رنگ کے مٹیالے کوٹ میں بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر ایک اونچی ٹوپی تھی۔ نوجوان عورت کو دیکھتے ہی اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور اس کی طرف مڑا۔ اس کا چوڑا اور زرد چہرہ، چھوٹی بھوری آنکھوں اور یکساں ترشی ہوئی دو مونچھوں کے ساتھ لباس کے رنگ سے ملتا تھا۔

"صبح بخیر" اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"ایک بیمار عورت کو دیکھنے آئی تھی اور تم کہاں سے آ رہے ہو مائیجل؟"

جس شخص کو اس نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مسکرایا۔

"تم بہت اچھا کر رہی ہو کہ بیماروں کی دیکھ بھال میں لگی ہو۔ تم اسے اپنے اسپتال کیوں نہیں لے جاتیں؟"

"وہ بہت کمزور ہے۔ اور ہلنے جلنے کے قابل نہیں۔"

"اور تم کیا اسپتال سے دستکش ہو رہی ہو؟"

"وہ کیوں؟ میں بھلا ایسا کیوں کرنے لگی۔"

"تم ایسا کیوں نہیں کرتیں۔"

"بڑا عجیب خیال ہے تمہارا۔ یہ بات تمہارے ذہن میں سمائی ہی کیوں؟"

"اس لئے کہ تمہارے ہاں مادام لاسنسکایا سے گہری چھنتی ہے۔ اور تم پر اس کا اثر ہے۔ اور اس کے خیال میں یہ اسپتال اور اسکول محض بکواس ہیں۔ بیکار خوش فہمیاں ہیں۔ سخاوت کو دل کی سچی کے ساتھ ایک ذاتی معاملہ ہونا چاہیئے اور تعلیم کو بھی۔"

"میرے خیال میں اس کے الفاظ کو میں صحیح طور پر ادا کر رہا ہوں یہ

نوجوان سوچ رہی تھی کہ وہ اس قسم کے خیالات کہاں سے لاتی ہے ۔۔۔"

مادام لیپنا ہنسی "ہاں، یہ ایک ذہین عورت ہے ۔ میں اس کی بڑی قدر کرتی ہوں ۔ اور مجھے اس سے محبت ہے ۔ لیکن ایسی بات بھی نہیں کہ اس سے کوئی غلطی نہ سرزد ہو ۔ تو وہ اس کی ہر بات پر اعتبار نہیں کرتی ہے"

"تمھیں کرنا بھی نہیں چاہیے ۔۔۔" اس مرد نے اپنی رائے دی وہ ابھی تک گھوڑا گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا ۔ "کیونکہ وہ خود بھی جو کچھ کہتی ہے ۔ اس پر آدھا اعتبار کرتی ہے ۔ خیر تم سے ملاقات ہو گئی میں بہت خوش ہوں ۔۔۔"

"کیوں ؟"

"کیا سوال ہے ؟ جیسے تم سے ملاقات باعث مسرت نہ ہو آج تم اس صبح کی طرح تر و تازہ اور دلفریب ہو ۔۔"

نوجوان عورت کم مسکرائی ۔

"تم ہنس کس بات پہ رہی ہو ؟"

"مجھ سے ہنسے بغیر رہا ہی نہیں جاتا ۔ تعریف کا یہ کتنا سرد و بے روح طریقہ ہے ۔ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ تم نے آخری الفاظ کہتے ہوئے جماہی کیوں نہ لی ۔۔"

"سرد تو ہے لیکن تمھیں آگ کی ضرورت ہے ۔ مگر آگ کوئی فائدہ بھی تو دیتی ہے ۔ جو بس گرمی پہنچاتی ہے اور کچھ باقی نہیں"

"لیکن گرمی تو پہنچاتی ہے ۔۔۔" عورت نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ۔۔۔"

"ہاں مگر جلا بھی دیتی ہے ۔۔۔"

"جلا دیتی ہے ۔ تو پھر کیا ہوا ؟ اس میں برائی کی بات ہی کون سی ہے ۔ آگ بہتر چیز ہے ۔"

"اس وقت نہ جانے تم کیا کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی ہو ۔۔"

مائیکل نے جمائی لے کر کہا ۔ اس نے لگام کھینچ کر گھوڑے کے چابک لگایا ۔

"خدا حافظ !"

"ذرا ٹھہرو ۔۔۔" نوجوان عورت چلائی "تم ہمارے یہاں کب آ رہے ہو ؟"

"کل ۔۔۔ اپنے بھائی سے میرا سلام کہنا ۔"

اور گاڑی دور نکل گئی ۔

نوجوان عورت اپنی آنکھوں سے اس کا تعاقب کرتی رہی اور اس نے سوچا "یہ تو ایک بہت بڑی بیری کی طرح ہے ۔"

گرد سے اٹا ہوا اور گردن جھکا کر بیٹھا ہوا اور اپنی ٹوپی گدی سے پیچھے کی طرف کھسکائے ہوئے جس میں سے اس کے زرد رنگ کے بالوں کی لٹیں باہر نکلی ہوئی تھیں ۔ وہ واقعی آٹے کی ایک بہت بڑی بوری کی طرح دکھائی دے رہا تھا ۔

مادام لیپنا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی گھر کی طرف چل پڑی ۔ اس کی نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں ۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر وہ رک گئی اور اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں ۔ ایک کسان گھوڑے پر سوار اس کی طرف آ رہا تھا ۔ اس کے پہلو میں ایک نوجوان چل رہا تھا ۔

اس نوجوان کا قد چھوٹا تھا ۔ اس کے میلے کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے ۔ اور اس کی نکٹائی ہلکے رنگ کی تھی ۔ اس کے سر پہ بھورے رنگ کی ٹوپی تھی ۔ اس کے ہاتھ میں سیر کی چھڑی تھی ۔ وہ کچھ دیر تک مادام لیپنا کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا اگرچہ وہ دیکھ رہا تھا کہ مادام لیپنا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے ۔ اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہے ۔ جب مادام لیپنا رکی ۔ وہ اس کے قریب گیا اور نہایت ہی پرلطف انداز میں گویا ہوا ۔۔ "صبح بخیر انگیزندرا پاولونا ۔۔۔ صبح بخیر !"

"آندرے کانسٹنٹین دیوموو وچ !" اس نے جواب دیا ۔۔۔ "کیا تم داریا کے یہاں سے آ رہے ہو ۔۔۔"

"بالکل وہیں سے آ رہا ہوں ۔۔۔ مادام !" نوجوان نے دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا ۔

"داریا نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے ۔ اور میں نے پیدل چلنا مناسب سمجھا ۔ صبح بہت حسین ہے اور پھر دو میل ہی کا تو فاصلہ ہے ۔ جب میں پہنچا تو تم گھر پہ نہیں تھیں ۔ تمھارے بھائی نے اطلاع دی کہ تم اس طرف آئی ہو ۔ اور وہ خود کھیتوں کی طرف جا رہا تھا ۔ لہٰذا میں تم سے ملنے کے لئے یہاں چلا آیا ۔ بالکل ۔۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ۔۔"

یہ نوجوان اچھی اور صحیح روسی زبان بول رہا تھا ۔ اگرچہ اس کا لب و لہجہ بدیسی تھا ۔ اور اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ

لب ولہجہ کہاں کا تھا۔ اس کے خدوخال میں کچھ ایشیائی انداز تھا۔ لمبی ناک، بڑی بڑی غیر متحرک آنکھیں موٹے موٹے سرخ ہونٹ، ترچھی پیشانی اور گہرے سیاہ بال۔ اس کی ہر بات کہہ رہی تھی کہ مشرقی نسل سے ہے۔ تاہم وہ نوجوان اپنا نام پنڈے لانسکی بتاتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ وہ خوشحال پینے والا ہے۔ اگرچہ اس کی پرورش بائیلوروس میں ہوئی، اور اسے ایک سخاوت پسند امیر بیوہ نے پالا تھا۔ ایک اور بیوہ نے اس کے لئے غیر فوجی ملازمت مہیا کر دی تھی۔ عام طور سے ادھیڑ عمر کی عورتیں پنڈے لانسکی کی سرپرستی کیا کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ انھیں ڈھونڈھنا اور پھر ان کو راہ پر لانا جانتا تھا۔ اب بھی وہ مادام لاسنکایا ایک امیر جاگیردار عورت کے یہاں رہتا تھا۔ اس کے سہارے گذر بسر کر رہا تھا یعنی وہ مفت خور تھا۔ وہ انتہائی مہربان، اطاعت گذار، جذباتی اور عشرت پسند تھا۔ اس کی آواز نہایت خوشگوار تھی۔ پیانو بہت اچھا بجاتا تھا۔ اور حسن سے وہ بات کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا اس کی عادت تھی وہ بڑی نفاست کے ساتھ کپڑے پہنتا تھا۔ اور دیر تک ایک ہی سے کپڑے پہنے رہتا تھا۔ وہ اپنی چوڑی ٹھوڑی کی بڑی احتیاط کے ساتھ حجامت بناتا تھا۔ اور اپنے سر کے ایک ایک بال کو خوب سنوارتا تھا۔

مادام لیپا نے اس کی بات سنی اور اپنے بھائی سے مخاطب ہو گئی "کتنا اچھا دن ہے۔ ایک ملاقات کے بعد دوسری ملاقات ہوئی ابھی ابھی میں لیزنف سے باتیں کر رہی تھی"

"آہ لیزنف — کیا وہ کہیں جلد رہا تھا ہے"

"ہاں — اور خیال تو کرو وہ بھی دوڑ لگانے کی گاڑی میں، ٹھاٹ پہنے ہوئے تھا۔ بالکل ٹھاٹ۔ گر دیں اٹھا ہوا عجیب وغریب انسان ہے —!"

"ہاں ہے تو مگر خوب آدمی ہے"

"کون؟ موسیو لیزنف ہے" پنڈے لانسکی نے ناقابل اعتبار لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ناتیحل لیزنف —" والنتیف نے بات دہرائی "اچھا تو بہن خدا حافظ — مدت ہو گیا کہ میں تمہارے کھیتوں کی طرف چل دوں — ان دنوں گیہوں کی بوائی ہو رہی ہے — موسیو پنڈے لانسکی تمھیں گھر تک چھوڑنے جائینگے —" اتنا کہہ کر والنتیف گھوڑے کو ڈلکی چال چلاتا ہوا دور نکل گیا۔

"مجھے بہت خوشی ہوگی —" اور پنڈے لانسکی نے نوجوان عورت کو اپنا بازو پیش کیا۔

نوجوان عورت اس کے بازو میں بازو ڈال کر اس پگڈنڈی پر ہولی۔ جو اس کی جاگیر کی طرف جاتا تھا۔

• • • • •

مادام لیپا کو اپنے بازو پر لئے ہوئے پنڈے لانسکی بڑی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہا تھا اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کی مشرقی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں۔ اس کی آنکھیں اکثر نم آلود رہتی تھیں۔ پنڈے لانسکی کی آنکھیں فوراً ڈبڈبا آتی تھیں اور پھر کون ایسا ہے۔ جو ایک حسین نوجوان عورت کے بازو میں بازو ڈال کر خوش نہیں ہوتا!

گوبرنا کا پورا علاقہ متفقہ طور سے اعلان کیا کرتا تھا۔ کہ مادام لیپا ایک دلفریب عورت ہے۔ اور گوبرنا کے لوگ غلطی پر نہیں تھے اس کی باریک خم دار ناک ہی کسی فانی انسان کو پاگل بنا دینے کے لئے کافی تھی۔ اس کی مخملیں اور بادامی آنکھوں، اس کے سنہرے بالوں، اس کے گڑھے دار سرخ رخساروں اور اس کی دو سری دلی آویزیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ جب وہ ہنستی تھی تو ایک بچے کی طرح معصوم معلوم ہوتی تھی۔ گوبرنا کی خواتین اسے بڑی سادہ لوح عورت خیال کرتی تھیں۔ کوئی اس کے سوا اور کیا تمنا کر سکتا ہے؟

"تم ابھی کہہ رہے تھے کہ مادام داریانے تمھیں میرے پاس بھیجا ہے۔" اس نے پنڈے لانسکی سے پوچھا۔

"ہاں مادام داریا لاسنکایا نے مجھے بھیجا ہے —" پنڈے لانسکی نے "س" کے حرف کو ہکلاتے ہوئے ادا کیا۔ جیسے انگریز "تھ" کا حرف ہکلا کر ادا کرتے ہیں۔ "مادام لاسنکایا یہ چاہتی ہیں کہ آپ ضرور آئیں۔ اور ان کے یہاں کھانا کھائیں —" پنڈے لانسکی اس بات کی خاص احتیاط رکھ رہا تھا۔ کہ اس کے لہجے میں بے تکلفی کا عنصر داخل نہ ہونے پائے۔ وہ یہ احتیاط خاص طور پر خواتین کے معاملہ میں روا رکھتا تھا — "مادام لاسنکایا کے یہاں ایک نیا مہمان آرہا ہے۔ اور وہ چاہتی ہیں کہ آپ اس سے ضرور ملیں! —"

"وہ کون ہے؟"

میرے مغل جو سینٹ پیٹرز برگ میں رہتا ہے۔ اور جو ملک معظم کی خوابگاہ کا منتظم ہے۔

مادام لاسنکایا کی اس سے حال ہی میں شہزادہ گارن کے یہاں ملاقات ہوئی تھی۔ مادام کا خیال ہے کہ وہ ایک نہایت ہی شائستہ اور عالم و فاضل شخص ہے۔ اور ادب میں بہت دلچسپی رکھتا ہے۔ آہ کتنی حسین تلی ہے۔ ذرا اس کی طرف دیکھئے تو . . . . . . بیرن مغل سیاسی اقتصادیات کے خاص طور پر دلدادہ ہیں۔ انہوں نے ایک جاذب نظر موضوع پر ایک مقالہ لکھا ہے اور وہ چاہتے ہیں۔ کہ مادام لاسنکایا اس کے بارے میں اپنی رائے صادر فرمائیں۔

"سیاسی اقتصادیات پر مقالہ!"

"اسلوب کے نقطۂ نظر سے . . . . . آپ تو بلاشبہ جانتی ہیں۔ کہ مادام لاسنکایا اپنی دوسری خوبیوں کے علاوہ اسلوب سے متعلق اپنی رائے دینے میں مستند خیال کی جاتی ہیں۔ زوکا وسکی شاعر تو ان سے مشورہ لیا کرتا ہے۔ اور میرے سابقہ محسن معزز و محترم رمکسولن میریا دروچ ساندریکا جو آڈلیسہ میں رہتے ہیں — آپ نے ان کا نام تو سنا ہوگا؟"

"بالکل نہیں۔ میں نے ان کا نام کبھی نہیں سنا — !"

"اس معزز شخص کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا۔ خیریت ہے ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ موموسا ندریکا بھی مادام لاسنکایا کے روسی زبان پر عبور کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں —"

"آج کے جان بیرن مغل کیا ایک نظریہ پرست ہیں؟"

"بالکل نہیں۔ اس کے برعکس مادام لاسنکایا کا خیال ہے کہ انہیں دیکھ کر فوراً ہر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک دنیادار شخص ہیں بیرن نے مشہور نغمہ نگار بیتھوون کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کہیں کہ بوڑھا شہزادہ گارن بھی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ کاش میں وہاں ہوتا۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ موسیقی میرا مرغوب موضوع ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو یہ جنگلی پھول پیش کردوں!"

مادام لیپا نے وہ پھول اس کے ہاتھ سے لے لیا اور چند قدم چل کر وہ پھول زمین پر گرا دیا اب مادام لیپا کا گھر دو سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ یہ گھر نیا نیا تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی تابندہ درخشندہ کھڑکیاں جو پرانے لیموں کے پیڑوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ اس گھر میں آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔

"تو پھر میں مادام لاسنکایا سے جا کر کیا کہوں؟" پینڈرے لانسکی نے اپنے پھول کے انجام سے ہراساں ہوتے ہوئے یہ جملہ۔ "کیا آپ رات کا کھانا وہاں کھائیں گی؟

مادام لاسنکایا نے آپ کے بھائی کو بھی مدعو کیا ہے —"

"ہاں۔ ہم ضرور آئیں گے — نتالیا کا کیا حال ہے؟"

"وہ اچھی ہیں — اوہ ہم تو مادام لاسنکایا کی جاگیر کی طرف جانے والے موڑ تک پہنچ گئے ہیں! مادام مجھے اب رخصت دیجئے"

مادام لیپا ایک لمحہ کے لئے رکی اور بولی — "کیا آپ اندر نہیں چلیں گے؟" — اس کے لہجہ میں ایک جھجک سی تھی۔

"نہیں — میں بہت مسرور ہوتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے دیر ہو جائے گی۔ مادام نتالی برگ کا نغمہ سننا چاہتی ہیں مجھے ذرا مشق کرنا ہے۔ اس کے علاوہ میں یہ اعتراف کرتا ہوں۔ کہ میری ہمدمی میں آپ کو لطف نہیں آئے گا —"

"تمہیں یہ گمان کیوں گذر رہا ہے . . . . ."

پینڈرے لانسکی نے ایک سرد آہ بھری اور بڑے معنی خیز انداز میں اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

"صبح بخیر مادام! —" اس نے ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد کہا۔ اپنا سر جھکایا اور دوسری طرف قدم اٹھا کر وہ اپنے راستہ پر ہو لیا۔

مادام لیپا مڑی۔ اور اپنے گھر کی طرف بڑھی۔

پینڈرے لانسکی بھی اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اور وہ اپنے چہرے پر جو رسمی شگفتگی کا نقاب اوڑھے رہتا تھا۔ وہ اب اس کے چہرے پر سے اڑ چکا تھا۔ اب اس کے چہرے پر خود اعتمادی اور سنجیدگی کے آثار تھے۔ اب تو اس کی چال میں بھی فرق آ گیا تھا۔ اب اس کے قدم لمبے اور بھاری ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اپنی چھڑی کو لہراتا ہوا دو فرلانگ آگے بڑھ چکا تھا۔ کہ دفعتاً اس کے ہونٹوں پر تبسم نے بل سا پیدا کر دیئے اس نے سڑک کے کنارے ایک نوجوان اور شرمیلی کسان لڑکی کو دیکھا جو کھیت کی طرف اپنے بیل لئے جا رہی تھی۔ وہ اس لڑکی کے قریب جا پہونچا۔ اس وقت اس میں ایک بلی کی سی پھرتی پیدا ہو گئی۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ لڑکی پہلے تو خاموش رہی۔ پھر وہ تھوڑی سی شرمائی اور دبی زبان میں ہنسی اس کے

بعد اس نے اپنی آستین سے اپنا منہ چھپا لیا۔ اور مڑتے ہوئے بولی —
"اپنی راہ لیجئے سرکار —"

پینڈرے لافسکی نے اپنی انگلی کے اشارے سے اس سے کہا کہ وہ اس کے لئے کھمبوں کی چند بالیاں ضرور لائے۔

"آپ کو ان کی کیا ضرورت پڑ گئی حضور — کیا ہار بناؤ گے؟" لڑکی نے منہ بنا کر کہا — "اچھا اب اپنا راستہ ناپیے سرکار!"

"ذرا ٹھہرو تو میری جان —" پینڈرے لافسکی نے اسے پھنسانے کی کوشش کی۔

"جانے دیجئے۔ وہ رہا آپ کا راستہ" لڑکی نے بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا — "چھوٹے آقا آ رہے ہیں —!"

پینڈرے لافسکی نے مڑ کر دیکھا۔ واقعی سامنے سے وانیا اور پیڈیا مادام لاسنکایا کے بیٹے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا استاد بیسے توف تھا کالج سے تازہ نکلا ہوا بائیس برس کا ایک نوجوان تھا۔ بیسے توف کا قد لمبا تھا۔ اس کی ناک چپٹی تھی۔ اس کی آنکھیں سؤر کی سی تھیں۔ وہ بدصورت تھا۔ لیکن نہایت ہی سیدھا اور صاف اور مہربان دیانتدار شخص تھا۔ وہ بے ڈھنگے پن کے ساتھ کپڑے پہنتا تھا۔ اور اپنے بال نہیں کٹواتا تھا۔ یونہی نمائش کے طور پر نہیں بلکہ قدرتی وجہ سے۔ وہ اچھے کھانے کا شائق تھا۔ ایک اچھی کتاب سرگرم گفتگو اور بحث کا بھی وہ دلدادہ تھا۔ وہ اپنے دل کی گہرائی سے پینڈرے لافسکی کے ساتھ نفرت کرتا تھا۔

مادام لاسنکایا کے بیٹے بیسے توف کی پرستش کرتے تھے اور اس سے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ وہ گھر کے دوسرے افراد کا بھی گہرا دوست تھا۔ اور مادام لاسنکایا اس حقیقت کے باوجود کہ وہ کسی قسم کا تعصب نہیں رکھتی تھی۔ بیسے توف کی اس بے تکلفی کو پسند نہیں کرتی تھی۔

"میرے نوجوان شیر!" پینڈرے لافسکی نے بڑی شفقت کے ساتھ کہا — "آج تم صبح سویرے ہی سیر کے لئے نکل پڑے ہو — ہے نا؟ اور ملیو —" اس نے بیسے توف سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا — "کافی مسافت طے کر چکا ہوں۔ قدرت کے نظارے میں مجھے بہت لطف آ رہا ہے —"

"ہاں یہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ کہ تم کس طرح قدرت سے لطف اندوز ہو رہے تھے —" بیسے توف نے کہا۔

"تم تو ایک مادیت پرست ہو۔ نہ جانے تم کیا سوچتے رہتے ہو۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں —"

پینڈرے لافسکی جب بیسے توف جیسے اشخاص سے بات کرتا تھا۔ تو وہ جھلا اٹھتا تھا اور بڑی صفائی کے ساتھ "س" کا تلفظ ادا کرتا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اس لڑکی سے اپنے گھر کا راستہ پوچھ رہے تھے؟" بیسے توف نے دائیں بائیں اپنی نگاہیں دوڑاتے ہوئے پوچھا — اسے اس بات کا احساس تھا کہ پینڈرے لافسکی اس کے چہرے کو گھور رہا ہے۔

"میں پھر کہتا ہوں کہ تم ایک مادیت پرست ہو۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ تم ہمیشہ ہر چیز کی کمزور ترین طرف دیکھتے ہو —"

"لڑکو —" بیسے توف نے دفعتاً حکم دیا — "وہ سامنے چراگاہ دیکھ رہے ہو نا۔ دیکھیں وہاں سب سے پہلے کون پہنچتا ہے؟ ایک — دو — تین!"

"رذیل کمینہ!" پینڈرے لافسکی نے سوچا — "یہ ان لڑکوں کا اخلاق بگاڑ دے گا — نادار انسان۔ اور نہیں تو کیا!"

اپنے نفیس اور صاف ستھرے بدن کی طرف دیکھتے ہوئے پینڈرے لافسکی نے اپنی انگلیاں پھیلا کر اپنا کوٹ جھاڑا۔ اپنا کالر سیدھا کیا۔ اور اپنے راستہ پر ہولیا۔ اپنے کمرہ میں آکر اس نے اپنا نہایت اچھا شب خوابی کا لباس پہنا۔ اور ایک خاص مقصد کے ساتھ پیانو کے سامنے جا بیٹھا۔

۲

دار یا میخولا فنا لاسنکایا کا گھر گوبرنا کے علاقہ میں بہترین خیال کیا جاتا تھا۔ یہ پتھر کا گھر تھا۔ اور اٹھارویں صدی کی طرز کی عمارتوں کے مطابق اس کا نقشہ راسترلی نے تیار کیا تھا۔ یہ مکان ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ اور اس پہاڑی کے دامن میں روس کا ایک بڑا دریا بہتا تھا۔ خود لاسنکایا ایک دولت مند خاتون تھی اور روس کی قانون ساز مجلس کے رکن کی بیوہ تھی۔ اگر پینڈرے لافسکی یہ کہا کرتا تھا کہ مادام لاسنکایا سارا یورپ گھوم چکی ہے اور

اسے جانتا ہے۔ اس کے باوجود یورپ میں اسے کوئی نہیں
اور سینٹ پیٹرز برگ میں بھی اسے کوئی خاص مقام
تا۔ البتہ ماسکو میں اسے ہر کوئی جانتا تھا۔ اور جو ضیافتیں
تی تھی ان میں ہر کوئی شریک ہوتا تھا۔ وہ دولت مند جاگیر
سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اسے نہایت ہی عجیب و غریب اور
ہوشیار عورت سمجھا جاتا تھا۔ اپنے عہد شباب میں وہ بہت
۔ شاعروں نے اس کی تعریف میں نظمیں کہی تھیں ——
نے اس کی خاطر اپنے دل لٹا دیئے تھے۔ اور مشہور شخصیتیں
ساتھ شادی کی خواہش مند رہی تھیں۔ لیکن اس بات
۳۰ برس گذر چکے تھے۔ اس کے سابقہ حسن کے آثار اب
رہے تھے۔ جو شخص پہلی مرتبہ اسے اب دیکھتا تھا۔ وہ
سے سوال کرتا تھا —— کیا یہی وہ عورت ہے۔ جس کی عمر
یادہ نہیں۔ بلکہ ذرا کچھ دبلی پتلی ہے۔ ناک بھی لمبی ہے جو
ت میں بہت ہی حسین ہوتی تھی —— ؟ اور ہر شخص اس کی
بے پناہ تبدیلی پر جی ہی جی میں حیران ہوتا۔ پینڈے لافسکی
بھی یہ خیال تھا۔ کہ مادام لاسنکایا کی آنکھوں کا حسن ابھی تک
اور یہی پینڈے لافسکی یہ اعلان کرتا ہے۔ کہ تمام یورپ
سنکایا کو جانتا ہے۔

ہر موسم میں لاسنکایا اپنے دیہی مکان میں اپنے بچوں کے ساتھ
اس کے تین بچے ہیں۔ دو لڑکے جن کی عمر نو اور دس برس
اور ایک سترہ برس کی لڑکی نتالیا۔) اپنے اس مکان کے
زے کھلے رکھتی ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں مہمانوں کو
ہے۔ اس کے مہمان خاص طور پر کنوارے مرد ہوتے ہیں۔
ت میں رہنے والی خواتین کو پسند نہیں کرتی۔ وہ سمجھتی ہے
بڑی یکسانیت ہوتی ہے۔ مادام لاسنکایا ایسی خواتین
ملتے ہوئے درشت کلامی سے کام لیتی ہے۔ اس وقت وہ
سے کم نہیں ہوتی۔ تمام اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے
نت میں وہ اپنی زبان کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتی۔ اس
اظ پر سخت حیرت ہوتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مادام لاسنکایا دیہات میں زندگی کی ذرہ
ماہ نہیں کرتی۔ مگر پابندیوں سے آزاد اس کی سادگی میں
ایک بڑے شہر کی رہنے والی عورت کی وہ نفرت پائی جاتی تھی۔ جو
اپنے ارد گرد منڈلانے والے لاعلم اور حقیر انسانوں کے لئے اپنے دل
میں رکھتی ہے۔ وہ اپنے شہر کے شناساؤں کے ساتھ بھی تضحیک
آمیز سلوک کرتی ہے۔ لیکن وہاں نفرت غائب ہوتی ہے۔

اتفاقیہ طور پر یہاں قارئین سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ
ایک شخص جو اپنے ماتحتوں سے گریز کرتا ہے۔ وہ اپنے سے بڑوں
کے ساتھ کیوں ایسا نہیں کر پاتا —— ! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ خیر
اس قسم کے سوالات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

جب پینڈے لافسکی نے ھال برگ کے نغمہ ایٹوڈے کو
زبانی یاد کر لیا۔ تو وہ اپنے صاف ستھرے کمرے سے نیچے اترا اور
نشست گاہ میں پہونچا۔ اس نے دیکھا کہ گھر کے لوگ وہاں جمع تھے
مجلس شروع ہو چکی تھی۔ گھر کی مالکہ ایک چوڑے صوفہ پر بیٹھی تھی
اور وہ ایک فرانسیسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ کھڑکی کے
قریب دوسری جانب نتالیا لاسنکایا اور میڈموازیل بون کورٹ بیٹھی
تھیں۔ بون کورٹ نتالیا کی استانی تھی۔ اور اس کی عمر ساٹھ برس
کے لگ بھگ تھی اور نہایت ہی دبلی پتلی تھی۔ اس نے اپنے کانوں
میں روئی ٹھونس رکھی تھی اور وہ گھر پر پہننے کی رنگ دار ٹوپی
کے نیچے ایک چھوٹی سی ٹوپی پہنے ہوئے تھی۔ دروازے کے قریب ایک
کونے میں بیٹے توف اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کی دائیں طرف پیٹیا
اور وانیا ڈرافٹ کھیل رہے تھے۔ انگیٹھی کے قریب جھکا ہوا شخص
جس نے اپنے ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے باندھ رکھے تھے۔ افریکن
پگاسف تھا۔ جس کا قد پست تھا اور جس کے بال سفید تھے۔ اور چہرے
کی رنگت سیاہی مائل تھی۔ اور آنکھیں سیاہ تھیں۔

پگاسف ایک عجیب و غریب شخص تھا۔ اس کو ہر چیز سے
خدا واسطے کا بیر تھا۔ عورتوں کا خاص طور پر دشمن تھا۔ وہ صبح
سے شام تک شکوہ سرا رہتا۔ کبھی اس کی یہ شکایت بڑی تیکھی ہوتی
اور کبھی بڑی احمقانہ ہوتی۔ مگر ہر وقت وہ بڑے جوش و خروش
کا مظاہرہ کرتا۔ اس کی جھلاہٹ ہمیشہ بڑی رکیک ہوتی۔ اس کی
ہنسی، اس کے لہجہ، اور اس کا تمام وجود تنگ مزاجی کا پروردہ
تھا۔ مادام لاسنکایا بڑی فراخ دلی کے ساتھ پگاسف کا خیر مقدم
کیا کرتی تھی۔ پگاسف کی ہنسی ٹھٹھول سے وہ خوش ہوتی تھی۔

اس کا ہنسی ٹھٹھا مسخرے پن کی حد کو چھوتا تھا۔ اسے مبالغہ آرائی کا جنون تھا۔ مثال کے طور پر جب اسے کسی قدرتی آفت کا حال بتایا جاتا۔ یعنی یہ کہ بجلی کی کڑک سے ایک گاؤں جل گیا۔ سیلاب میں باندھ بہہ گیا۔ یا ایک کسان نے لکڑیاں چیرتے ہوئے اپنا ہاتھ کاٹ لیا۔ تو وہ غیر مغلوب ہٹ دھرمی کے ساتھ پوچھتا "وہ کون تھی؟" اس کا مطلب یہ ہوتا کہ کس عورت کی وجہ سے یہ آفت آئی۔ اس کا یہ یقین تھا کہ مصیبت کا سبب کوئی نہ کوئی عورت ہوتی ہے۔ ہاں اگر معاملہ کی تہہ کو کریدا جائے تو کوئی نہ کوئی عورت ہی ہر واقعہ کی وجہ نظر آئے گی۔

ایک دفعہ اس نے ایک بالکل اجنبی عورت کے سامنے اپنے آپ کو گھٹنوں کے بل جھکا دیا جو اس کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اور اپنے ماتھے پر بل پیدا کرتے ہوئے انتہائی غیظ [illegible] مگر اس نے کہا کہ وہ اسے اس خاطر و مدارات سے بچائے۔ اس نے اس عورت کو یقین دلایا کہ وہ آئندہ پھر کبھی اس کے گھر پر قدم نہیں رکھے گا۔ ایک مرتبہ رام لاسکا کا گھوڑا ان کی دھوبن کو اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے بدک گیا۔ اور اس نے اس دھوبن کو ایک کھائی میں جا گرایا۔ وہ بیچاری مرتے مرتے بچی۔ اس وقت کے بعد سے پیگاسف اس گھوڑے کو بہت سمجھدار شاندار گھوڑا کہہ کر پکارتا رہا۔ اس نے تو یہاں تک کہا کہ وہ پہاڑی، درخت و خندق سب تفریح کے لئے نہایت اچھے مقامات ہیں۔

پیگاسف نے اپنے اس خبط کی وجہ سے زندگی میں ترقی نہیں کی تھی۔ وہ ایک غریب کسان گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے باپ نے کئی جگہ چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کیں۔ وہ بہت کم پڑھنا لکھنا جانتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو کھلایا پلایا۔ اور اسے کپڑے پہنائے۔ اس کے سوا اس نے اور کچھ نہ کیا۔

اس نے اپنے بیٹے پیگاسف کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس کی اماں نے اس سے بہت لاڈ کیا۔ مگر وہ جلد مر گئی۔ پیگاسف نے اپنی ہمت سے زندگی میں قدم رکھا۔ وہ خود ہی اسکول گیا۔ اسکول سے کالج پہونچا۔ اس نے تین زبانیں سیکھیں۔ فرانسیسی، جرمنی اور لاطینی اور نہایت اچھی سند کے ساتھ وہ کالج سے باہر نکلا اور ڈرڈوپٹ چلا گیا۔ جہاں وہ مسلسل افلاس و تنگدستی کے خلاف لڑتا رہا اور وہاں اس نے تین سال کا نصاب ختم کیا۔ پیگاسف کی خوبیاں بس معمولی درجہ ہی کی رہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بلا کا صبر و تحمل رکھتا تھا۔ مگر اس کے لئے سب سے طاقتور تحریک اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح بڑے لوگوں کے حلقہ میں قبول کر لیا جائے اس کی دولت چاہے اسے کتنا ہی کیوں نہ پچھاڑے۔ مگر وہ دوسروں سے پیچھے نہ رہے۔ یہ اس کی خواہش ہی تھی جو اسے ڈرڈوپٹ کی یونیورسٹی میں لے گئی تھی۔ افلاس نے اس کے مشاہدے پر دھار رکھی۔ اس کی طرز گفتگو بہت نرالی تھی۔ زندگی کے ابتدائی ایام میں اس نے اپنی گفتگو میں چڑچڑاپن اختیار کیا۔ اس کے خیالات اگرچہ معمولی آدمیوں سے زیادہ اونچے و اعلیٰ نہ ہو سکے۔ لیکن وہ اپنے خیالات کو کچھ اس طرح پیش کرتا کہ اسے نہ صرف حاضر دماغ بلکہ ایک ذہین اور دانشمند خیال کیا جاتا۔

گریجویٹ ہو جانے کے بعد پیگاسف نے طے کیا کہ وہ درس و تعلیم کا پیشہ اختیار کرے گا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس طرح وہ اپنے طالب علموں کا ہم پلہ ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے ساتھی اونچے طبقہ میں سے چنتا تھا اور جانتا تھا کہ ان کے ساتھ تعلقات کس طرح قائم کئے جاتے ہیں وہ خوشامد سے بھی احتراز نہیں کرتا تھا اگرچہ وہ ہمیشہ جھلاہٹ سے کام لیتا تھا۔ اس مقصد کے لئے جیسے کردار والے شخص کی ضرورت تھی۔ پیگاسف نے علم کو علم حاصل کرنے کی نیت سے حاصل نہیں کیا تھا۔ اسی لئے اس کی معلومات محدود تھیں۔ بحث مباحثہ میں وہ بری طرح ناکام رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ جو طالب علم اس کے کمرہ میں رہتا تھا اور جس کا اکثر وہ مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس سے سبقت لے گیا۔ اس ناکامی نے پیگاسف کو چراغ پا کر دیا۔ اس نے اپنی تمام کتابوں اور کاپیوں کو آگ میں جھونک دیا۔ اور سول سروس میں شامل ہو گیا۔

پہلے پہل تو اسے اپنی کامیابی کے امکانات روشن نظر آئے۔ لیکن وہ روز پیدائش ہی سے بد مزاج تھا۔ وہ خوش گفتار نہیں تھا۔ لیکن اپنی اسی کمی کو وہ خود نمائی اور دلیری سے پورا کیا کرتا تھا۔ دنیا میں ترقی کرنے کی جلدی میں وہ مصیبت میں مبتلا ہوا اور اس نے غلط قدم اٹھایا۔ اسے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ وہ تین برس تک اپنے گاؤں میں رہا۔ جو اس نے خرید لیا تھا۔ غیر متوقع طور پر اس نے ایک دولتمند اور نیم خواندہ دیہاتی عورت سے شادی کر لی جس پر وہ رات دن اپنی طنز اور تلخی کے نشتروں کی بوچھاڑ کرتا رہتا

پگاسف کا گردار اب نہایت تلخ اور ہیجان زدہ ہو چکا تھا
داجی زندگی اس لیے تباہ ہو گئی تھی کہ وہ اپنی جان بچائی تھی۔ اس کی بیوی اس
ساتھ چند سال رہ کر اسکو بھاگ گئی۔ اور اس نے اپنی جاگیر ایک
بارن کے ہاتھ فروخت کر دی۔ پگاسف نے اس کی جاگیر پر بھی مکان
ہی کروایا تھا۔ یہ آخری ضرب بڑی مہلک ثابت ہوئی۔ پگاسف
اپنی۔ بیکا پہ مقدمہ دائر کر دیا۔ اور اس مقدمے میں وہ ہار گیا۔
کے بعد وہ تنہا رہنے لگا۔ کبھی کبھی اپنے پڑوسیوں کے یہاں جاتا
جن کو وہ پیٹھ پیچھے گالیاں دیتا۔ اور بعض اوقات تو وہ ان
منہ پر انھیں گالیاں دیتا۔ اس کے بعد پگاسف نے کبھی اپنے ہاتھ
کوئی کتاب نہ پکڑی۔ وہ سو غلام کسانوں کا مالک تھا۔

"آہ کا نتیئتین! مادام لاسنکا یا پینڈے لافسکی کے
ست گاہ میں داخل ہوتے ہی بولی — "کیا الگزینڈر نیا آ
رہا ہے؟"

مادام لینا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر دوں اور
انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ضرور آئیں گی —" پینڈے لافسکی نے
بائیں سر جھکا کر یہ بات کہی۔ وہ بات کرتے ہوئے اپنے صنوبری
ے بالوں پر آہستگی کے ساتھ ہاتھ بھی پھیرتا رہا —

"کیا ولنتسیف بھی آئے گا؟"

ہاں — موسیو ولنتسیف بھی آئیں گے۔

"ہاں تو تم یہ اعتراف کر رہے ہو — " مادام لاسنکا یا نے اس سے
مخاطب ہوتے ہوئے کہا — تمام نوجوان عورتیں اس مرض کا شکار

پگاسف کے ہونٹوں میں بل پڑ گئے اور اس کی کہنی پھڑ پھڑانے
— میں کہتا ہوں کہ —" اس نے واضح لہجے میں کہا — "
گھبراہٹ اور برہمی کے عالم میں بھی بڑے صاف لہجے میں بات کیا
اتھا — "نوجوان عورتیں عام طور پر اس مرض کا شکار ہوتی رہتیا
ہیں وہ نوجوان عورتیں شامل نہیں جو یہاں موجود ہیں . . . . ."

"کون تمھیں ان کو بھی ان میں شامل کرنے سے روک رہا ہے
—" مادام لاسنکا یا نے بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔

میں یہاں کی عورتوں کو ہمیشہ ہر بات سے خارج رکھتا رہا ہوں
— ہاں خیر، یہ کہہ۔ اچھا کہ نوجوان خواتین بڑی جذباتی ہوتی ہیں

مثال کے طور پر جب ایک نوجوان عورت ڈر جاتی ہے یا بہت
خوش ہوتی ہے۔ یا پریشان ہوتی ہے۔ تو سب سے پہلے وہ اسطرح کا
ڈرامائی انداز اختیار کرتی ہے — یہاں پگاسف نے نہایت بے ڈھنگے
پن کے ساتھ اپنی کمر کو بل دیا اور اپنے ہاتھ آگے کی طرف بڑھا دیے
— اس کے بعد وہ چلاتی ہے — اوہ — یا ہنستی ہے — یا
آنسو بہانے لگتی ہے۔ ایک دفعہ البتہ مجھے جذبات کا صحیح اور پرخلوص
اظہار دیکھنے میں آیا تھا —

"وہ کیسے؟" —

پگاسف کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی — میں نے پیچھے
سے اس عورت کے پہلو میں ایک چھڑی سے ضرب لگائی۔ وہ چلائی
اور بے ساختہ منہ سے نکلا — "شاباش —" یہ چیخ ایک فطری
آواز تھی — یہ کمرے میں موجود ہر شخص زور سے ہنسا۔

"کیا خرافات بک رہے ہو —" مادام لاسنکا یا بولی — "کیا تم
یہ چاہتے ہو کہ میں اعتبار کر لوں۔ کہ تم نے ایک لڑکی کے پہلو میں چھڑی
سے ضرب لگائی —"

"ہاں ہاں۔ میں سچ کہتا ہوں —"

"موسیو پگاسف ذرا بچوں کا تو خیال رکھیے —" بورسم استانی
بون کورٹ نے قہقہے لگاتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمھیں اس کی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ تم تو اسے اچھی
طرح جانتی ہو —"

"مادام لاسنکا یا بولی —"

مگر فرانسیسی عورت دیر تک مسلسل بڑبڑاتی رہی۔

"تمھیں شاید اعتبار نہیں آ رہا ہے۔ لیکن میں اب بھی یہی کہوں
گا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اور میں تنہا وہ شخص نہیں۔ جو اس راز کو جانتا
ہوں۔ تم تو یہ کہو گی کہ تمھیں میری پڑوسن مادام جیبو زوفا کا بھی اعتبار
نہیں۔ جس نے اپنے بھتیجے کو قریب قریب ہلاک کر دیا تھا —"

"کیسی بات کر رہے ہو —"

"مجھے بات تو ختم کر لینے دو۔ میری بات پوری سن لو اور پھر
خود ہی فیصلہ کر دینا۔ مگر اتنا خیال رہے کہ میں اس پر کوئی الزام نہیں
لگا رہا۔ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ جیسے ہر کوئی کسی عورت کو پسند
کر سکتا ہے۔ اس کے گھر میں کیلنڈر کے سوا کوئی کتاب نہیں ہے

وہ جب بھی پڑھتی ہے تو بلند آواز سے پڑھتی ہے۔ پڑھنے کا اور کوئی طریقہ اسے معلوم ہی نہیں ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے اسے پسینہ آجاتا ہے۔ بعد میں وہ شکوہ کرتی ہے کہ اس کی آنکھیں باہر نکل پڑنے کو ہیں۔ وہ بیسہ وہ بہت اچھی عورت ہے۔ اس کی علازمائیں سب کی سب فربہ اندام ہیں ــــ خیر میں اس پر کیوں الزام لگاؤں ــــ"

"تم پھر بہکنے لگے ہو ــــ" مادام لاسنکایا بولی۔ "تم نے اپنا من بھاتا موضوع چھیڑ دیا ہے۔ اور اب رات تک تمہاری زبان قینچی کی طرح چلے گی ــــ"

"میرا من بھاتا موضوع ــــ یعنی عورتیں میرا من بھاتا موضوع ہیں۔؟ اگر میرا من بھاتا موضوع ایک ہے تو عورتوں کے تین ہیں۔ ان کے بارے میں وہ اس وقت تک باتیں کرتی ہیں جب تک کہ سو نہیں جائیں۔"

"وہ موضوع کیا ہیں؟"

"شکوہ شکایت، ملامت اور لعن و تشنیع!"

"خدا کی قسم پگاسف ــــ" مادام لاسنکایا نے کہا ــــ "تم عورتوں کے بارے میں اس قدر تلخ ہو تو تمہارے پاس ضرور اس کی کوئی ٹھوس وجہ موجود ہوگی۔ کسی عورت نے یقیناً تمہیں ۔۔۔۔۔"

"مجھے دکھ پہنچایا ہوگا۔ تم یہی کہنا چاہتی تھیں نا؟"

مادام لاسنکایا ذرا گھبرا گئی۔ کیونکہ اس وقت وہ پگاسف کی اندوہناک شادی کے حالات کو یاد کر رہی تھی۔ وہ صرف ایسا سر ہلا کر رہ گئی۔

"مجھے عورت نے صرف ایک دفعہ سخت اذیت پہنچائی ہے اگرچہ وہ عورت بہت مہربان تھی۔"

"وہ کون تھی؟"

"میری اماں ــــ" پگاسف نے اسٹیج پر کی جانے والی سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"تمہاری اماں ــــ" وہ بھلا تمہیں کیونکر اذیت پہنچا سکتی تھی؟"

"مجھے جنم دے کر۔ ۔ ۔ ۔"

مادام لاسنکایا کے ابروؤں پر بل پڑ گیا ــــ "مجھے ڈر ہے کہ اب ہماری گفتگو افسردگی کا رخ کر رہی ہے ــــ کانستنتین تم تھالبرگ کا نغمہ مجھے سناؤ۔ شاید موسیقی پگاسف کے مزاج کو ٹھنڈا کرنے میں مدد دے ــــ کیا آرفیس نے جنگلی درندوں کو موسیقی سے رام نہیں کر لیا تھا ــــ"

پینڈے لافسکی پیانو کے پاس جا بیٹھا اور اس نے نہایت اطمینان بخش طور پر وہ نغمہ بجایا۔ پہلے تو نتالیا غور سے سنتی رہی اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

"بہت خوب!" مادام لاسنکایا بولی ــــ "مجھے تھالبرگ بہت پسند ہے۔ تم کیا سوچ رہے ہو پگاسف؟"

"میں سوچ رہا ہوں ــــ" پگاسف نے آہستگی کے ساتھ کہا ــــ "کہ دنیا میں تین قسم کے انانیت پرست ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو خود بھی زندہ رہتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی جینے دیتے ہیں دوسرے وہ جو خود تو زندہ رہتے ہیں۔ مگر دوسروں کو جینے نہیں دیتے۔ اور تیسرے وہ جو خود بھی زندہ نہیں رہتے۔ اور دوسروں کو بھی جینے نہیں دیتے۔ عورتیں تیسرے زمرے میں آتی ہیں ــــ"

"تم نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔ پگاسف ایک بات جو مجھے پریشان کرتی ہے یہ ہے کہ تم اپنے فیصلہ کی قطعیت میں یقین رکھتے ہو۔ جیسے تم کبھی کوئی غلطی نہ کر سکتے ہو ــــ"

"نہیں میں بھی غلطیاں کرتا ہوں۔ مرد بھی غلطی کر سکتا ہے مگر تم ہماری اور عورتوں کی غلطیوں میں شاید فرق کو نہیں جانتیں۔ نہیں تم اس فرق سے آگاہ نہیں ہو۔ اگر مرد مثال کے طور پر یہ کہتا ہے۔ کہ دو اور دو چار نہیں پانچ ہوتے ہیں۔ یا ساڑھے تین ہوتے ہیں تو عورت یہ ضرور کہے گی۔ کہ دو اور دو ایک موم بتی ہوتے ہیں ــــ"

"تم نے یہ بات پہلے بھی کہی تھی۔ میری سنی ہوئی ہے۔ مگر کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں۔ کہ تمہارے تین قسم کے انانیت پسندوں کے نظریہ اور اس موسیقی کے درمیان ربط کیا ہے۔ جو تم نے ابھی سنی ہے؟"

"کوئی ربط نہیں۔ کیونکہ میں موسیقی سن ہی نہیں رہا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ تم کبھی درست نہیں ہو سکتے ــــ" مادام لاسنکایا نے گریبوودف کے الفاظ کی شرح کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم موسیقی کو پسند نہیں کرتے۔ تو پھر تمہیں کیا چیز پسند ہے ــــ کیا ادب ــــ؟"

"ہاں میں ادب کا شیدائی ہوں۔ مگر جدید ادب کا نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس کی ایک وجہ ہے ـــ حال ہی کا ذکر ہے میں نے ایک شخص کے ساتھ کشتی میں لوکا دریا کو پار کیا۔ کشتی کنارے کے قریب جا کر رک گئی۔ اب ضرورت تھی کہ کشتی کو ہاتھ سے کنارے تک کھینچا جائے۔ میرا ہمنوا ذرا بھاری بھرکم شخص تھا۔ کشتی بان جبکہ پورا زور لگاتے ہوئے اپنی کمر توڑ رہے تھے۔ اور کشتی کو کنارے تک گھسیٹ رہے تھے۔ وہ بھاری بھرکم شخص کراہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ تقسیم محنت کے نظام کا یہ نیا اطلاق ہے۔ یہی بات جدید ادب پر منطبق کی جاسکتی ہے ـــ دوسرے جبکہ کام کرتے ہیں۔ اور زور لگاتے ہیں۔ نیا ادب صرف کراہتا ہے ـــ"

مادام لاسنکایا مسکرائی ـــ "اور وہ اس کراہنے کو نئی زندگی کی عکاسی کہتے ہیں۔" چرب زبان پگاسف نے جو بات کرتے ہوئے کبھی تھکتا نہیں تھا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ـــ "سماجی مسائل سے گہری دلچسپی اور اسی قسم کی دوسری باتیں محض حسین الفاظ ہیں ـــ!"

"مگر جن عورتوں پر تم حملہ کرتے ہو۔ وہ تو حسین الفاظ استعمال نہیں کرتیں ـــ"

پگاسف نے اپنے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا ـــ "وہ انھیں اس لئے استعمال نہیں کرتیں۔ کیونکہ وہ انھیں استعمال کر ہی نہیں سکتیں ـــ"

مادام لاسنکایا کا چہرہ شرم کے مارے سرخ ہو گیا ـــ "پگاسف تم بدتمیز ہوتے جا رہے ہو ـــ" مادام نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

کمرے میں چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔

"زالوں تنوشا کہاں ہے؟ ـــ" ایک لڑکے نے اپنے استاد جیسی تورت سے دفعتاً پوچھا۔

"پولتوفا گوبرنیا میں میرے بچے ـــ!" پگاسف تیزی کے ساتھ بیچ میں بول پڑا ـــ "کھاکھولوں[1] کے ملک میں ـــ"

پگاسف خوش تھا کہ اسے گفتگو کا رخ کسی دوسری طرف موڑنے کا موقع مل گیا تھا ـــ "ادب کی بات ہو رہی تھی ـــ" اس نے کہا ـــ "اگر میرے پاس فالتو روپیہ ہو تو میں فوراً ایک یوکرینی شاعر بن سکتا ہوں ـــ"

"مگر میں تو ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ اور تم کیا شاعر ہو گے!" مادام لاسنکایا نے کہا ـــ "تمھیں کیا وہ زبان آتی ہے؟"

"بالکل نہیں ـــ اور وہ زبان جاننے کی مجھے ضرورت بھی نہیں ـــ"

"ضرورت بھی نہیں؟"

"قطعاً نہیں ـــ" ایک کاغذ اٹھاؤ۔ اور اس کے ایک کونے پر لکھ دو۔ مرثیہ۔

اور اس مرثیہ کا یوں آغاز کرو۔ ہائے مقدر۔ وائے مقدر! یا پھر اس طرح ـــ کاسک نیلو اٹیکو ایک پہاڑی پہ بیٹھا ہے . . . . . . یا اسی انداز سے کچھ اور لکھ دو۔ نہایت اچھی نظم تسلیم کی جائے گی۔ یوکرینی اسے گھر گھر پڑھیں گے۔ اپنے ہاتھ پر اپنی ٹھوڑیاں رکھ کر ـــ اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے ـــ"

"خدا کے لئے ـــ" بسے ترت نے کہا ـــ "آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ لغو اور بیہودہ۔ میں یوکرین میں رہا ہوں۔ مجھے یوکرین سے محبت ہے۔ میں ان کی زبان جانتا ہوں اور یوکرین کی زبان کے بارے میں تمھارا سارا علم سنی سنائی خرافات سے کم نہیں ـــ"

"ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس کے باوجود، یوکرینی آنسو بہائے گا۔ اور تم زبان کی بات کر رہے ہو۔ کیا کیا یوکرینیوں کی بھی کوئی زبان ہے۔ ایک دفعہ میں نے ایک کھاکھول سے درخواست کی کہ وہ ایک روسی محاورہ کا ذرا ترجمہ کر دے جو اس وقت مجھے یاد آ گیا تھا۔ اس کا ترجمہ طوطے کا رٹا ہوا جملہ معلوم ہوتا تھا۔ اور تم اسے زبان سمجھتے

---

[1] زار شاہی روس میں یوکرین کے رہنے والوں کو کھاکھول کہا جاتا تھا۔

ہو۔ کیا وہ ایک خود مختار زبان ہے؟ اگر تم یہ ثابت کر دو۔ تو میں اپنے بہترین دوست کی قربانی دینے کو تیار ہوں —"

"میں تو صرف اس بحث کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔

"اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو —" مادام لاسنکایا فوراً بول اٹھی —"

تم اس سے مہمل باتوں کے سوا اور کیا سن سکتے ہو —"

پگاسوف کے لبوں پر زہر پھیل گیا۔ اتنے میں ایک خادم نے اندر آ کر مادام لپنا اور اس کے بھائی کی آمد کا اعلان کیا۔

مادام لاسنکایا اپنے مہمانوں کے خیر مقدم کے لئے اٹھی۔

"الیگزینڈرینا کہو تمہارے کیسے مزاج ہیں —" مادام لاسنکایا نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا —" تم نے واقعی مجھ پر بڑا کرم کیا ہے — کہو کیسے ہو سرگے پاؤلووچ؟"

وولنتسیف نے مادام لاسنکایا سے ہاتھ ملایا اور فوراً نتالیا کی طرف بڑھا۔

"کیا تمہارا جان پہچان کا وہ بیرن آج آئے گا بھی کہ نہیں؟"

"ضرور آئے گا —"

"یہ افواہ سننے میں آئی ہے کہ وہ ایک عظیم فلسفی ہے۔ ہیگل کا ہمنوا ہے —" اس بات کا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے میزبانہ مادام لپنا کو صوفہ کے قریب لے گئی۔ اور اس کے پاس خود بھی بیٹھ گئی۔

"فلسفہ —" پگاسوف نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا —" ایک انتہائی بلند و بالا نقطۂ نظر ہے۔ یہ بلند و بالا نقطۂ ہائے نظر میری جان لے لیں گے۔ اگر کوئی شخص اتنی بلندی پر کھڑا ہو تو وہ نیچے کی طرف کب دیکھ سکتا ہے۔ اگر تم گھوڑا خریدنا چاہتے ہو۔ تو تم اسے کبھی مینار پر کھڑے ہو کر نہیں دیکھو گے —"

"سنا ہے کہ بیرن اپنا کوئی مقالہ تمھیں سنانے کے لئے لا رہا ہے —؟" لپنا نے مادام لاسنکایا سے پوچھا۔

"ہاں —" مادام لاسنکایا نے مبالغہ آمیز لاپرواہی کے ساتھ جواب دیا —" وہ مقالہ روس میں صنعت سازی کے ساتھ تجارت کے رشتہ پر ہے۔ مگر تمھیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ مقالہ ہم یہاں نہیں پڑھیں گے۔ میں نے اس غرض سے تمھیں نہیں بلوایا۔ میں تو یہ چاہتی تھی۔ کہ تم بیرن سے ملو۔ وہ نہایت اچھی روسی زبان بولتا ہے —"

"روسی زبان وہ خوب بولتا ہے۔ مگر اس کی تعریف تم فرانسیسی زبان میں کر رہی ہو —" پگاسوف نے طنز کی۔

"پگاسوف تم طنز کرتے ہو۔ تمھیں اپنے پریشان بالوں کے ساتھ یہی زیب دیتا ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں —"

مادام لاسنکایا نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا —" آؤ ذرا باغ میں چلیں۔ کھانے میں ابھی ایک گھنٹہ کی دیر ہے۔ اور موسم نہایت خوشگوار ہے —"

محفل باغ میں جانے کے لئے اٹھی۔

مادام لاسنکایا کا باغ دریا تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں لیموں کے درختوں کے بہت سے جھنڈ تھے۔ ببول اور بنفشہ کے پیڑ تھے ان سے مہک آ رہی تھی

نتالیا اور میڈموزیل بون کورٹ کے ساتھ مادام لپنا کا بھائی وولنتسیف درختوں کے ایک گھنے جھنڈ کی طرف بڑھا وہ نتالیا کے پہلو میں خاموشی کے ساتھ چل رہا تھا۔ میڈموازیل ان کے چند قدم پیچھے چل رہی تھی۔

"آج تم دن بھر کیا کرتی رہی ہو —؟" وولنتسیف نے اپنی بھوری مونچھوں کو مروڑتے ہوئے آخر کار پوچھا —"

وولنتسیف کے خد و خال بالکل اس کی بہن کی طرح تھے مگر اس کی بہن کی طرح زیادہ جاندار اور شگفتہ نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں میں افسردگی کی جھلک تھی۔

"کچھ بھی تو نہیں کرتی رہی —" نتالیا نے جواب دیا —" تھوڑی سی ایک کتاب پڑھی کچھ کشیدہ کاری کی اور پھر پگاسوف کی ہرزہ سرائی سنتی رہی —"

"کون سی کتاب پڑھتی رہی ہو؟"

"صلیبی جنگوں کی تاریخ —" نتالیا نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

وولنتسیف نے اس کی طرف نگاہ کی اور بولا —" ہماری

دلچسپ ہوگی ۔۔۔"

پھر اس نے ایک خاغ توڑی ۔ اور اسے اپنے ہاتھ میں گھمانے لگا ۔ وہ بیس قدموں تک یونہی خاموشی سے بڑھتے گئے۔

"یہ بیرن کون ہے جس سے تمھاری اماں نے جان پہچان بڑھائی ہے ۔۔۔؟" اس نے پوچھا

"شہنشاہ کی خواب گاہ کا منتظم ہے ۔ اور اس علاقہ میں نیا نیا آیا ہے ۔ اماں اس کے بارے میں نہایت اچھی رائے رکھتی ہیں۔"

"تمھاری اماں بہت جلد متاثر ہو جاتی ہیں ۔۔۔"

"اس سے صاف ظاہر ہے کہ اماں کا دل ابھی تک جوان ہے ۔۔۔" نتالیا بولی ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔ سنو میں تمھاری گھوڑی بہت جلد لوٹا دوں گا ۔ اس کی تربیت ختم ہو چکی ہے ۔ صرف اسے سرپٹ دوڑانا باقی ہے ۔۔۔"

"شکریہ مگر میں اس کے لئے بہت بیقرار ہوں ۔ اور تم ہو کہ اسے اپنے بچے پڑھا رہے ہو ۔۔۔ سنا ہے کہ . . . ."

ولنتیف نے بات کاٹتے ہوئے کہا ۔۔۔ "مجھے بہت خوشی ہوگی اگر میں تمھارے کسی کام آ سکوں ۔۔۔"

ولانتیف کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

نتالیا نے اس کی طرف نگاہ کی اور پھر بولی ۔۔۔ "شکریہ!"

"آخر اس میں بات ہی کونسی ہے ۔۔۔" ولانتیف نے ایک لمبے توقف کے بعد کہا ۔۔۔ "میں یہ باتیں تم سے کیوں کہہ رہا ہوں ۔ تم تو جانتی ہی ہو ۔۔۔" اسی وقت گھر میں گھنٹی بجنے کی آواز آئی ۔۔۔"

"کھانے کی گھنٹی بج رہی ہے ۔۔۔" میڈموازیل بون کورٹ کے منہ سے نکلا ۔ وہ اس وقت پیچھے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

بیرن کھانے کی دعوت میں شریک نہ ہو سکا ۔ انھوں نے اس کا آدھ گھنٹہ تک انتظار کیا ۔ کھانے کی میز کے گرد گفتگو آگے نہ بڑھ سکی ۔ ولانتیف نتالیا کی طرف دیکھنے کے بغیر اور کچھ نہ کر سکا ۔ وہ اس کے پہلو میں بیٹھا رہا اور اسے پانی کے گلاس بھر بھر کے دیتا رہا ۔ پینڈرے لافسکی نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی مادام لینا کی تفریح کے سامان مہیا کرنے کی بیہودہ کوشش کی ۔ وہ بڑی کوشش کے ساتھ میٹھی اور نرم باتیں کرتا رہا ۔ مگر مادام لینا جماہیاں لیتی رہی ۔

بیسلوف خالی الذہن بیٹھا رہا ۔ پیگاسوف بھی خاموش تھا اور جب مادام لاسنکایا نے اس کے بارے میں اس بات کا اظہار کیا کہ آج وہ کچھ زیادہ دلکش نہیں ہے ۔ تو وہ بولا ۔۔۔ "کیا میں کبھی دلکش رہا بھی ہوں ؟ ۔۔۔۔" اور پھر اس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا ۔۔۔ "ذرا صبر کرو ۔ مجھے روسی شراب پی لینے دو ۔۔۔ ہاں وہ شہنشاہ کی خواب گاہ کے منتظم حضرت . . . ."

"خوب ۔۔۔" مادام لاسنکایا نے بات کاٹتے ہوئے کہا ۔۔۔ "ان کا مرض حد سے بڑھ رہا ہے ۔ وہ حضرت آئے بھی نہیں اور بیگاسوف کا دل رقابت کے مارے کھول رہا ہے۔"

پیگاسوف نے ماتھے پر تیوری چڑھائی اور خاموش رہا ۔ کلاک نے سات بجائے اور محفل دوبارہ نشست گاہ میں آ کر جم گئی ۔

"میرا خیال ہے کہ اب وہ نہیں آئے گا ۔۔" میزبانہ بولی ۔ عین اس وقت گاڑی کے کھڑکھڑانے کی آواز سنائی دی یہ ایک چھوٹی سی ٹم ٹم تھی ۔ جو احاطہ میں داخل ہو چکی تھی ۔ چند منٹوں کے بعد ایک خادم نشست گاہ میں داخل ہوا ۔ اور اس نے چاندی کی طشتری پر گھر کی مالکن کو کاغذ کا ایک پرزہ پیش کیا گھر کی مالکن نے وہ رقعہ پڑھا اور پوچھا کہ جو صاحب یہ رقعہ لائے ہیں وہ کہاں ہیں ۔

"وہ صاحب گاڑی میں بیٹھے ہیں ۔ کیا مادام میں انھیں یہاں بلا لاؤں ؟ ۔۔۔"

"ضرور ۔۔۔"

خادم چلا گیا

"کیا حماقت ہے ۔۔۔ بیرن کو پیٹرز برگ سے حکم ملا ہے ۔ کہ فوراً واپس چلے آؤ ۔ اس نے اپنا مقالہ اپنے ایک دوست کے ہاتھ بھجوایا ہے ۔ ان کے دوست کا نام مونسیور رُودن ہے بیرن اس آدمی کو مجھ سے ملانا چاہتے تھے ۔ بیرن نے اس شخص کی بہت تعریف کی ہے ۔ مگر کتنی عجیب بات ہے ۔ میرا خیال

تھا۔ کہ بیرن اس علاقہ میں چند روز قیام کریں گے ۔۔۔"
"مسٹر رُودن!" خادم نے مہمان کی آمد کا اعلان کیا

۳

۵۰ برس کی عمر کا ایک دراز قامت شخص جو ذرا جھک کر چلتا تھا۔ نشست گاہ میں داخل ہوا۔ اس کے بال گھنگھریالے تھے زیتون کا سا رنگ تھا۔ سیدھے سادے خدوخال تھے۔ مگر بشرے سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ اس کی تیز اور گہرے نیلے رنگ کی آنکھوں میں ایک نم آلود چمک تھی۔ اس کی ناک چوڑی اور سیدھی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں میں دلآویز خم تھا۔ اس کا لباس نیا نہیں تھا اور اس کے بدن پر بہت کس کے آیا تھا۔ جیسے وہ اپنے اسی لباس میں سنِ بلوغ کو پہنچا ہو اور پروان چڑھا ہو۔

وہ پھرتی کے ساتھ مادام لاسنکایا کی طرف بڑھا۔ اور اس نے تعظیماً جھک کر اطلاع دی کہ وہ ایک مدت سے اس تعارف کا خواہشمند تھا۔ اور اس کے دوست بیرن کو بے حد افسوس ہوا۔ کہ وہ ذاتی طور پر الوداع کہنے کے لئے حاضر نہ ہو سکا۔

رودن کی مہین آواز اس کے قد اور اس کے فراخ سینے کے مطابق نہیں تھی۔

"تشریف رکھئے ۔۔۔ میں واقعی آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی ہوں ۔۔۔" مادام لاسنکایا نے کہا اور پھر سب کے ساتھ اس کا تعارف کرانے کے بعد اس نے رُودن سے پوچھا۔ کہ وہ اس علاقہ کا رہنے والا ہے۔ کہ اس علاقہ میں ایک اجنبی ہے

"میری جاگیر گوبرنا میں ہے ۔۔۔" رُودن نے جواب دیا وہ اپنی ٹوپی اپنے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھا ۔۔۔" مجھے یہاں آئے ہوئے صرف چند روز ہوئے ہیں۔

میں ایک خاص کام کی غرض سے یہاں آیا ہوں ۔ اور آپ کے قصبے میں مقیم ہوں ۔۔۔"

"کس کے یہاں ٹھہرے ہو؟"

"ڈاکٹر کے یہاں ۔ وہ یونیورسٹی کے وقت کا میرا دوست ہے

"اوہ ڈاکٹر ۔۔۔ ڈاکٹر یہاں کافی مشہور ہے ۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ وہ اپنے فن کا ماہر ہے ۔۔۔ کیا آپ بیرن کو ایک مدت سے جانتے ہیں؟ ۔۔۔"

"نہیں گذشتہ سردیوں میں ان سے ماسکو میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور اب ایک ہفتہ یہاں ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ گذارا ہے ۔۔۔"

"بیرن بہت دانشمند ہے ۔۔۔"

"ہاں مادام ۔۔۔!"

مادام لاسنکایا نے اپنے رومال سے عطر سونگھا اور سوال کیا ۔۔۔ "کیا آپ سول سروس میں ہیں؟"

"کون ۔۔۔؟ میں ۔"

"ہاں آپ ۔۔۔"

"نہیں ۔ میں ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہوں ۔۔۔"

تھوڑی دیر تک توقف رہا۔ اس کے بعد پھر گفتگو کا آغاز ہوا ۔۔۔

"کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں ۔۔۔" پگاسف نے رودن سے مخاطب ہو کر کہا ۔۔۔ "کہ بیرن نے جو مقالہ بھجوایا ہے۔ اس کے مندرجات سے آپ واقف ہیں؟"

"ہاں ۔۔۔"

پگاسف بولا ۔۔۔ "مادام آپ نے یہی کہا تھا ناکہ مقالہ میں ہمارے ملک کی صنعت کے ساتھ تجارت کے رشتہ پر بحث کی گئی ہے ۔۔۔!"

"ہاں ۔ یہی اس مقالہ کا موضوع ہے ۔۔۔" مادام لاسنکایا نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ کہ میں ایسے مقالوں پر اپنی رائے نہیں دے سکتا ۔۔۔" پگاسف نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ۔۔۔ "مگر میں اس بات کا اعتراف ضرور کروں گا۔ کہ مقالہ کا عنوان ۔۔۔ میں صاف طور پر کیوں نہ کہوں ذرا مبہم اور الجھا ہوا ہے ۔۔۔"

"آپ کو ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے ۔۔۔؟"

پگاسف نے طنز سے مسکراتے ہوئے اور مادام لاسنکایا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ۔۔۔ "کیا آپ کو یہ عنوان صاف اور غیر مبہم معلوم ہوتا ہے ۔۔۔"

پگاسف نے اپنا لومڑی کا سا چہرہ رودن کی طرف موڑ دیا ——
"ہاں ——"
"خیر —— آپ بہتر جانتے ہیں ——!"
"کیا تمہارے سر میں درد ہے؟" مادام لیپانے میزبانہ سے پوچھا ——"
"نہیں ——"
"کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں ——" پگاسف نے دوبارہ ناک میں بولتے ہوئے پوچھا —— "آپ کے واقف بیرن منل —— میرے خیال میں یہی ان کا نام ہے ——"
"بالکل ——"
"کیا بیرن منل سیاسی اقتصادیات کو اپنا مشغلہ تصور کرتے ہیں۔ یا لمحات فرصت گذارنے کے لئے اس پہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ سماجی لذتوں اور سرکاری فرائض سے فراغت پاتے ہیں۔ رودن نے پگاسف کا جائزہ لیا
"بیرن اس موضوع کے شائق ہیں ——" رودن نے ذرا سا سرخ ہوتے ہوئے جواب دیا —— "لیکن ان کے مقالے میں بہت سی باتیں جائز اور تعمیری ہیں ——"
"جب تک میں وہ مقالہ پڑھ نہ لوں۔ میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ مگر یہ پوچھنے کی جرأت ضرور کر سکتا ہوں۔ کہ آپ کے دوست کا یہ مقالہ عام نقطۂ ہائے نظر تک محدود ہے۔ یا اس میں کچھ حقائق بھی ہیں ——"
"حقائق بھی ہیں اور حقائق پر مبنی نقطہ ہائے نظر بھی ہیں ——"
"بالکل —— میں آپ سے یہ کہوں گا۔ کہ میرے خیال میں۔ بعد میں اپنے اس خیال کو کبھی کبھی ظاہر بھی کیا کرتا ہوں۔ کیونکہ میں تین سال تک ڈورپاٹ میں رہا ہوں۔
یہ تمام نام نہاد نظریے، مفروضے اور نظام وغیرہ وغیرہ مجھے معاف کرنا۔ کیونکہ میں ایک دیہاتی ہوں۔ سب کے سب بالکل بیکار ہیں۔ لوگوں کو احمق بنانے کے لئے فلسفہ چھانٹا جاتا ہے۔ ہمیں تو صاف اور سیدھے حقائق کی ضرورت ہے اور بس!"
"واقعی ——" رودن نے طنز کی —— "کیا حقائق کی اہمیت بیان نہیں کی جانی چاہیئے۔
"نام مفروضے ——" پگاسف نے سلسلۂ کلام جاری رکھا —— "یہ مفروضے، یہ استفسار اور یہ نتائج میرے لئے تو جان لیوا ہیں۔ ان سب کی بنیاد نام نہاد یقینِ کامل پر ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنے عقائد کی بات کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ مطالبہ کرتا ہے کہ ان کا احترام کیا جائے۔ اور ان کے بارے میں وہ جھگڑتا ہے۔ ...."
پگاسف نے اپنا مکہ ہوا میں لہرایا۔ پنڈرے لانسکی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔
"اچھی بات ہے ——" رودن بولا —— "آپ کو اس بات پہ اصرار ہے کہ عقائد یا یقین نام کی کوئی چیز نہیں ——؟"
"ہاں ایسی کوئی چیز نہیں؟"
"کیا یہ آپ کا یقین یا عقیدہ ہے؟"
"ہاں ——"
"تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کہ ایسی کوئی چیز نہیں؟ آپ نے تو ابتدا ہی ایک یقین سے کی ہے ——"
کمرے میں موجود ہر شخص مسکرایا۔ سب کی نگاہیں آپس میں ملیں ——
"ذرا ٹھہرو ——" پگاسف نے بات شروع کی۔ لیکن مادام لاسنسکایا نے تالی بجائی اور کہا —— "شاباش۔ شاباش پگاسف کو شکست ہو چکی ہے ——" اور مادام لاسنسکایا نے رودن کی ٹوپی بڑی آہستگی کے ساتھ اس کے ہاتھ سے لے لی۔
"اتنی جلدی خوش کیوں ہوتی ہو ——" پگاسف نے تلخی کے ساتھ کہا۔ محض بزرگانہ انداز میں کوئی دانشمندانہ بات کہہ دینا کافی نہیں ہوتا۔ اسے ثابت کرنے اور اس کی تردید کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاں تو ہم اپنے موضوعِ بحث سے بھٹک گئے ہیں ——"
"معاملہ نہایت صاف ہے ——" رودن نے کہا۔ "آپ عام مفروضوں اور عقائد کی افادیت میں یقین نہیں رکھتے ——"

"بالکل نہیں۔ میں کسی بات پر یقین نہیں رکھتا ——"

"اچھی بات ہے —— آپ کوئی عقیدہ نہیں رکھتے ——"

"مجھے ان الفاظ کے استعمال کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ دوسری بات یہ ہے ——"

"کوئی بات کر رہا ہو تو اس میں دخل اندازی نہیں ہونی چاہیئے —— "مادام لزسنکایا نے مشورہ دیا۔

"اسے گردن سے پکڑ لو —— کتنا اچھا کتا ہے ——" پینڈے لافسکی نے اپنے آپ سے کہا اور فرطِ مسرت سے مسکرایا۔

"میں نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں۔ وہ معنی رکھتے ہیں اور آپ انھیں سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں انھیں کیوں نہ استعمال کروں آپ کسی بات پر یقین نہیں رکھتے۔ پھر آپ حقائق پر کیوں یقین رکھتے ہیں ——؟"

"کیوں —؟ یہ بھی کیا سوال ہے؟ ہم سب حقائق پر یقین رکھتے ہیں —ہر شخص جانتا ہے۔ کہ حقائق کیا ہوتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں اپنے تجربہ سے اپنے ادراک سے فیصلہ کرتا ہوں ——"

"لیکن آپ کا ادراک آپ کو دھوکا بھی تو دے سکتا ہے؟ کیا آپ کا ادراک آپ کو یہ بتاتا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے؟ شاید آپ کو پرنیکس سے بھی اتفاق نہیں رکھتے! کیا آپ کو اس پر بھی اعتبار نہیں؟"

ایک دفعہ پھر سب کے لبوں پر تبسم پیدا ہوا۔ اور سب کی نگاہیں رودن پر جم گئیں۔

"یہ شخص کوئی مفکر معلوم ہوتا ہے ——" ہر کوئی یہی سوچ رہا تھا۔

"آپ مذاق کر رہے ہیں۔ خیر کیجئے ——" پگاسف بولا۔ آپ کا مذاق کس قدر فطری ہے۔ لیکن اس کا اصلی نقطۂ بحث سے کوئی تعلق نہیں ——"

"جو بات میں نے کہی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ بالکل طبع زاد یا فطری نہیں ہے ——"

رودن نے طنز کی —— "اس بات کو ہر کوئی جانتا ہے اور اسے ایک ہزار مرتبہ دہرایا جا چکا ہے۔ ہاں اصلی نقطۂ بحث یہ نہیں ہے ——"

"تو پھر وہ کیا ہے؟" پگاسف نے تحیر انگیز لہجہ میں پوچھا پگاسف عام طور پر حقارت آمیز لہجہ میں بحث کی ابتدا کیا کرتا تھا۔ پھر گستاخ ہو جاتا تھا۔ اور بحث کے آخر میں پیچھے ہٹ جاتا تھا اور بالکل خاموش ہو جاتا تھا۔

"وہ یہ ہے کہ ——" رودن بولا —— "میں اعتراف کرتا ہوں۔ مجھے واقعی افسوس ہوتا ہے۔ جب میں کسی دانشمند شخص کو حملہ کرتے ہوئے سنتا ہوں ——"

"نظاموں پر ——"

"اگر آپ چاہیں تو اپنے حملہ میں نظام بھی شامل کر سکتے ہیں۔ نظام کے لفظ پر آپ کو نفرت کیوں ہے؟ ہر نظام بنیادی اصولوں یعنی زندگی کے بنیادی اصولوں کے علم پر مبنی ہوتا ہے"

"مگر یقیناً انھیں سمجھا یا دریافت نہیں کیا جا سکتا!"

"مجھے معاف کیجئے —— ہر شخص کی ان تک رسائی نہیں ہوتی...... انسان غلطی بھی کرتا ہے۔ مگر آپ یقیناً مجھ سے اس بات پر اتفاق کریں گے۔ کہ نیوٹن نے ان بعض اصولوں کو دریافت کر لیا تھا۔ وہ واقعی ایک ذہین اور دانشمند شخص تھا۔ مگر دانشوروں کی دریافتوں تک اب ہر آدمی کی رسائی ہے —— ہر انفرادی مظہرِ قدرت میں بنیادی اصولوں کو دریافت کرنا انسانی ذہن کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے۔ اور ہم اپنے مکمل علم کے ساتھ......"

"اچھا تو آپ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے ——!" پگاسف نے ہر لفظ کو کھینچ کر ادا کرتے ہوئے دخل اندازی کی —— "میں ایک باعمل شخص ہوں۔ اور میں ان تمام مابعد الطبیعاتی بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا ——"

"بہت اچھا جیسی آپ کی مرضی۔ مگر یہ بات جان لیجئے۔ کہ ایک باعمل شخص بننے کی تمھاری خواہش بھی ایک نظام ہے۔ ایک تنظیم ہے۔ اور ایک نظریہ ہے ——"

"آپ تنظیم کی بات کر رہے تھے ——" پگاسف نے پھر بات کاٹی —— "تنظیم کیا اچھی چیز ہے ——! آپ جس تعلیم کی ڈینگ مار رہے ہیں۔ وہ لوگوں کا کیا بھلا کر رہی ہے ——"

میں آپ کی اس تعلیم کی ذرہ بھر قدر نہیں کرتا ــــــ "

" افریقن پکاسف بحث کرنے کا یہ انداز نہیں ہوتا۔ ! "

میزبانہ نے اپنی رائے دی۔ اور وہ جی ہی جی میں اپنے نئے مہمان کی سکون مزاجی پر خوش ہو رہی تھی۔ وہ رودن کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ کہہ رہی تھی ــــــ " یہ شخص کسقدر بردبار اور متحمل مزاج ہے۔ ! مجھے اس کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کرنا چاہیئے ــــــ " یہ آخری الفاظ اس نے اپنے ذہن میں روسی زبان میں ادا کیے۔

" میں تعلیم کی حمایت میں کچھ نہیں کہوں گا ــــــ " رودن نے توقف کے بعد کہا ــــ " اور تعلیم کو میری امداد یا حمایت کی ضرورت بھی نہیں ــــــ آپ تعلیم کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ آپ کی اپنی پسند ہے۔ تعلیم پر بحث ہمیں اصل موضوع سے دور لے جائے گی۔ تاہم مجھے اجازت دیجئے۔ کہ میں آپ کو ایک پرانی کہاوت یاد دلاؤں ! "

" اے مورچ دیوتا تو ناراض ہے۔ اس لئے تو ہی قصور وار ہے ــــــ ! "

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ نظاموں، عام مفروضوں وغیرہ پر حملہ اس لحاظ سے اور بھی قابل مذمت ہے۔ کہ ان نظاموں کے ساتھ ساتھ لوگ علم، سائنس اور ان میں اعتقاد کی بھی تردید کرتے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر خود اپنے آپ میں اعتقاد اور اپنی صلاحیتوں کی بھی تردید کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسانوں کو اس اعتقاد کی ضرورت ہے۔ وہ صرف اپنے محسوسات اور ادراک پر زندہ نہیں رہ سکتے۔ کسی خیال پر نادم ہونا اور اس کا یقین نہ کرنا غلط ہے بے اعتقادی کو ہمیشہ بے اثری اور نامرادی کا نام دیا گیا ہے ــــــ "

" یہ محض الفاظ ہیں ــــــ " پکاسف بڑبڑایا۔

" عین ممکن ہے کہ یہ محض الفاظ ہوں۔ مگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے۔ کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ــــــ " یہ محض الفاظ ہیں ــــــ " تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اکثر الفاظ سے زیادہ کوئی واضح بات کہنے کی ضرورت کو نظر انداز کرتے ہیں ــــــ "

" کیا کہا ؟ " پکاسف نے اپنی آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا

" جو کچھ میں نے کہا ہے۔ وہ آپ سمجھ تو گئے ہیں ــــــ "

رودن نے جان بوجھ کر طنز کی۔ مگر فوراً ہی اپنی بے صبری پر قابو پاتے ہوئے کہا ــــــ " لیجئے میں اپنی بات دہراتا ہوں۔ اگر کوئی شخص ایک ٹھوس اصول نہیں رکھتا۔ جس پر اسے یقین ہو۔ اور اس کے قدموں تلے کوئی پائدار بنیاد نہیں۔ تو وہ اپنی قوم کی ضروریات کردار اور مستقبل کے بارے میں اپنے ذہن کی کھڑکیاں کیونکر کھول سکتا ہے۔ وہ کیسے جان سکتا ہے۔ کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اور اگر ...

... میں تمہارے لئے میدان چھوڑ رہا ہوں ــــــ " پکاسف نے اختتامیہ کہا اور سر جھکا کر کسی کی طرف دیکھے بغیر ایک کونے میں چلا گیا۔

رودن نے اس کی طرف نگاہ کی اور نہایت آہستگی کے ساتھ مسکرایا۔ اور اس نے کچھ نہ کہا۔

" آہا ــــــ پکاسف دم دبا کر بھاگ گیا ــــــ " مادام لاسنکایا نے کہا ــــــ " کوئی بات نہیں ...... مجھے معاف کرنا ــــــ " اس نے مسکرا کر رودن کی طرف دیکھا اور پوچھا ــــــ " آپ کا آبائی نام کیا ہے ــــــ ؟ "

" نکولائیوچ ــــــ "

" کوئی بات نہیں پیارے دمتری نکولائیوچ۔ ہم میں سے کسی کو بھی اس نے متاثر نہیں کیا۔ وہ اس بات کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ وہ بحث نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ وہ تم سے بحث نہیں کر سکتا ــــــ ذرا اور قریب آجاؤ۔ آؤ ہم باتیں کریں۔ "

رودن نے اپنی آرام کرسی ذرا آگے کھسکا لی۔

" یہ کیا بات ہے کہ ہماری پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی ــــــ " مادام لاسنکایا بولی ــــــ " مجھے تو حیرت ہوتی ہے۔ کیا آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے ؟ "

یہ کہکر مادام لاسنکایا نے رودن کو وہ کتاب پکڑا دی۔ جو وہ خود پڑھ رہی تھی۔

رودن نے وہ کتاب لے لی اور اس کے چند ورق الٹے اور اسے میز پر رکھتے ہوئے اعلان کیا۔ کہ اس نے " مونسیور ٹوکے ولے " کی یہ کتاب نہیں پڑھی۔ مگر اس کتاب کا مصنف جس موضوع پر اپنے خیالات پیش کرتا ہے اس پر اکثر غور کیا ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کا آغاز ہوا۔ رودن پہلے تو جھجکتا رہا۔ الفاظ تلاش کرتا رہا۔ مگر اس کے بعد اس نے اس موضوع پر گرم جوشی کے ساتھ بحث شروع کر دی۔ پندرہ منٹ کے بعد کمرے میں

صرف اسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ محفل اسکے گرد جمع ہو گئی تھی
بس پگاسف ہی انگیٹھی کے قریب ایک کونے میں بیٹھا رہا۔

رُودن نہایت ہوشیاری، روانی اور دانشمندی کے ساتھ بات کرتا تھا۔ بات کرتے ہوئے وہ علم کے دریا بہا دیتا تھا۔ اس کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اس محفل میں کسی شخص کو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنا حیرت انگیز شخص ہے۔ کیونکہ اس کا لباس دلآویز نہیں تھا۔ اور اس کے آنے سے پہلے کوئی افواہ نہیں پھیلی تھی ایک ایسے ہوشیار شخص کی اچانک آمد پر اور وہ بھی اس دیہی علاقہ میں ہر شخص حیران تھا اور اسے یہ بات ناقابلِ فہم معلوم ہو رہی تھی لہٰذا وہ سب حیران تھے اور اس سے متاثر ہو رہے تھے۔ خاص طور پر مادام لاسنکایا ـــــ وہ اس بات پہ خوش تھی۔ کہ یہ شخص اسکی اپنی دریافت ہے۔ اور وہ اس کو سماج کے بہترین حلقہ میں متعارف کرانے کی تجویزیں تیار کر رہی تھی۔ سن رسیدہ ہونے کے باوجود مادام لاسنکایا بچوں کی طرح اپنے پہلے تاثرات سے بہت مرعوب ہوتی تھی۔ مادام لیناکی سمجھ میں اگرچہ وہ باتیں نہیں آرہی تھیں۔ جو رودن کہہ رہا تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ بھی خوش تھی اور حیران ہو رہی تھی۔ اس کا بھائی ولنتیف بھی دل ہی دل میں رُودن کی تعریف کر رہا تھا۔ پینڈے لافسکی مادام لاسنکایا کی طرف حسد کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ پینڈے لافسکی سوچ رہا تھا ـــــ،،

میں پانچ سو روبل کی خاطر اس سے زیادہ اچھی فاختہ ڈھونڈ سکتا ہوں ـــــ،،

بیسے توف اور نتالیا رودن سے بہت متاثر ہو رہے تھے۔ بیسے توف تو اپنا سانس روک کر بیٹھا تھا۔ کبھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا اور کبھی ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ اور رودن کی بات گہری توجہ کے ساتھ سن رہا تھا۔ اور آج تک اس گہری توجہ کے ساتھ اس نے کسی کی بات نہیں سنی تھی۔ نتالیا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی تھی۔ اور اس کی آنکھیں رودن پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ آنکھیں بار بار چمک اٹھتی تھیں۔

"اس آدمی کی آنکھیں کتنی حسین ہیں!" ولنتیف نے نتالیا سے سرگوشی کی ـــــ،،

"ہاں ـــــ،،

"افسوس کی بات ہے۔ کہ اس کے ہاتھ بڑے ہیں۔ اور سرخ ہیں ـــــ"

نتالیا نے کوئی جواب نہ دیا۔

چائے پیش کی گئی۔ اب گفتگو عام باتوں پر ہونے لگی۔ لیکن جب رودن بات کرنے کے لئے ہونٹ کھولتا تھا۔ تو اس وقت اچانک ہو خاموشی چھا جاتی تھی۔ اس سے ثابت ہو رہا تھا۔ کہ اس نے ان پر کتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔

مادام لاسنکایا کو یک بیک یہ خیال سوجھا کہ پگاسف کو چھیڑا جائے۔ اس کے قریب جا کر وہ فرانسیسی زبان میں بولی تم کیا ناک بھوں چڑھا رہے ہو۔ اس سے پھر لو بابو ـــــ،،

پگاسف نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو وہ رودن کی طرف بڑھی اور اپنی انگلی سے پگاسف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ـــ"

"ایک اور بات کا شاید تمھیں علم نہیں۔ پگاسف عورتوں سے نفرت کرتا ہے۔ اور ان پر حملہ کرتے ہوئے کبھی تھکتا نہیں ہو سکے تو اس کی یہ عادت ذرا درست کر دو ـــــ،،

رُودن نے پگاسف کی طرف دیکھا۔ رودن قامت میں پگاسف سے کہیں بلند تھا۔ پگاسف نے اس کی طرف ملامت آمیز انداز میں دیکھا۔ اور اس کا جھلایا ہوا چہرہ زرد پڑ گیا ـــــ

"مادام داریا لاسنکایا غلطی پر ہیں۔ میں صرف عورتوں پر ہی حملہ نہیں کرتا۔ بلکہ عام طور پوری انسانیت کا دشمن ہوں ـــــ"

"وہ کون سی بات ہے جس نے تمھیں انسانوں کے بارے میں اتنی گھٹیا رائے رکھنے پہ مجبور کیا ہے؟" رودن نے اس سے پوچھا ـــــ،،

پگاسف نے اس کی نظر سے نظر ملاتے ہوئے کہا ـــ ہو سکتا ہے کہ یہ میرے دل کا اپنا مطالعہ ہو۔ اور یہ دل کا مطالعہ مجھے روز بروز بے بضاعت باتوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے میں دوسروں کے بارے میں اپنے دل کے ذریعہ رائے قائم کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات غیر منصفانہ ہو اور میں خود دوسروں سے زیادہ بُرا انسان ہوں۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ یہ میری عادت ہے ـــــ،،

"میں سمجھتا ہوں اور تم سے پوری ہمدردی رکھتا ہوں —"
رُودن نے جواب دیا — "ہر نیک آدمی نے اپنی تذلیل خود کی ہے۔ لیکن اس غیر محکم صورت حال میں ہمیشہ کیلئے رہنے سے تو کام نہیں چلتا —"

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ آپ نے مجھے ایک نیک انسان کہا ہے —"

پکاسف نے طنز کی — "لیکن میں جس حال میں ہوں۔ مطمئن ہوں۔ چاہے یہ صورت حال نا محکم ہے۔ مجھے اس کی کیا پروا ہے۔ میں اس صورت حال کو بدلنے کیلئے تیار نہیں —"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا۔ ذرا مجھے معاف کرنا۔ کہ زندہ رہنے اور صداقت کی روشنی میں زندہ رہنے کی خواہش پر آپ اپنے آپ سے محبت کو ترجیح دیتے ہیں۔۔۔۔"

"بالکل —" پکاسف بولا — "اپنے آپ سے محبت تو ایک بات ہوئی۔ میرا خیال ہے آپ کیا ہم سبھی اسکو سمجھتے ہیں جہاں تک صداقت کا تعلق ہے۔ صداقت کس چڑیا کا نام ہے یہ صداقت کہاں ہے ؟"

"میں تمھیں خبردار کردوں کہ تم اب باتیں دہرانے لگے ہو" میزبانہ نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

پکاسف نے اپنے کندھے ذرا بلند کئے اور کہا — "اگر میں اپنی بات دہرا رہا ہوں۔ تو پھر کیا ہوا۔ میں تو پوچھتا ہوں کہ صداقت ہے کہاں ؟ خود فلسفی یہ نہیں جانتے کہ صداقت کیا ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ صداقت یہ ہے مگر ہیگل کہتا ہے صداقت یہ نہیں ہے۔ بلکہ صداقت یہ ہے —"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہیگل صداقت کے بارے میں کیا کہتا ہے ؟"

رودن نے اس سے پوچھا۔

"میں پھر یہ بات دہراتا ہوں —" پکاسف نے تیزی سے جواب دیا — "کہ میں صداقت کو سمجھنے سے قاصر ہوں — میرے خیال میں تو صداقت کا کوئی وجود نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ صداقت نام کے لفظ کا تو وجود ہے۔ مگر خود صداقت کا کوئی وجود نہیں ہے —"

"شرم کرو —" مادام لاسنکا یا چلائی — "تم بڑا نے پاپی ہوتے ہوئے یہ بات کیونکر کہہ سکتے ہو کہ صداقت کوئی چیز نہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو انسان کے لئے جینے کی خاطر کیا رہ جاتا —"

"مادام میں واقعی یہ سوچتا ہوں۔ کہ آپ صداقت کے بغیر تو گذارہ کر سکتی ہیں۔ مگر اپنے باورچی ایشین کے بغیر گذارہ نہیں کرسکیں جو نہایت اچھا شوربہ تیار کرتا ہے۔ آپ صداقت سے کونسا اچھا کام لے سکتی ہیں۔ تو آپ صداقت سے اپنی ٹوپی کا پھندنا نہیں بنا سکتے۔"

"مذاق دلیل نہیں ہوا کرتا —" مادام لاسنکا یا بولی — "خاص طور پر جب اس سے اتہام کی بو آرہی ہو —"

"میں تمھاری فلسفیانہ صداقت کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا مگر کڑوی صداقت کے بارے میں ضرور جانتا ہوں۔ جسے نگلنا ذرا دشوار ہوتا ہے —" پکاسف نے اتنا کہا۔ اور ناراض ہو کر دوبارہ اپنے کونے کی طرف چلا گیا۔

رودن نے غرور کی بات چھیڑ دی۔ اور اس نے اس موضوع پر نہایت اچھی باتیں کہیں۔ اس نے یہ دلیل پیش کی کہ غرور کے بغیر آدمی کچھ بھی نہیں۔ اور غرور تو ارشمیدس کے لیور کی طرح ہے۔ جو زمین کو اس کے محور سے اوپر اٹھا سکتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ انسان کا لقب پانے کا اہل وہی شخص ہے۔ جو اپنے غرور پر قابو پائے۔ جیسے ایک گھوڑ سوار اپنے گھوڑے پر قابو پاتا ہے اور عام انسانوں کی بھلائی کیلئے خود کو قربان کر دیتا ہے۔

آخر میں اس نے کہا کہ — "جھوٹا غرور خود کشی کے مترادف ہے۔ اس غرور کا شکار شخص ایک بانجھ درخت کی طرح سوکھ جاتا ہے۔ اور وہ غرور جو اکملیت یا کمال حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے۔ تمام عظمتوں کا سرچشمہ ہے۔ ہاں ایک انسان کو اپنی انانیت کی خود غرضی کو دبانا چاہیئے اور اسے صحیح راستہ پر ڈالنا چاہیئے"

"کیا آپ مجھے ایک لمحہ کیلئے پنسل عنایت کر سکتے ہیں ؟"
پکاسف نے بیسے نوف کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

بیسے نوف کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ وہ کیا چاہتا ہے — "آپ کو پنسل کس لئے چاہیئے ؟" اس نے آخرکار پوچھا —

"میں نیورر ودن کا آخری جملہ لکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اگر میں نے یہ جملہ نہ لکھا تو بھول جاؤں گا۔ تمھیں مان لینا چاہیئے کہ یہ آخری جملہ "برج" کے کھیل میں گرینڈ سلیم جتنا شاندار ہے۔"

"بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو نیورپگاسف جیسے خوش مذاق انسان کو انتہائی شرمناک ہوتا ہے ——" جیسے توت نے انتہائی گرم جوشی کے ساتھ کہا۔ اور اپنے سامنے کی طرف منہ پھیر لیا۔

اس اثنا میں رودن نتالیا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نتالیا کے چہرے سے بے کلی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ملاشتیف جو اس کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا ——

"یہاں مجھے پیانو دکھائی دے رہا ہے ——" رودن نے ایک شہزادہ کی طرح بات کا آغاز کیا —— "کیا آپ پیانو بجا لیتی ہیں ——؟"

"ہاں ——" نتالیا نے ہکلاتے ہوئے کہا —— "مگر مجھے اس میں مہارت حاصل نہیں ہے۔ موشیو رپینڈسے لاسکی مجھ سے زیادہ اچھا پیانو بجاتے ہیں ——"

پینڈسے لاسکی نے اپنا منہ آگے بڑھایا۔ وہ مسکرا رہا تھا نتالیا الیگزینیت تمھیں یہ بات نہیں کہنا چاہیئے۔ تم اتنا ہی اچھا پیانو بجاتی ہو۔ جتنا کہ میں ——"

"کیا آپ شوبرٹ کا نغمہ "ارل کوننگ" بجا لیتے ہیں!"

"ہاں ——" میزبانہ نے جواب دیا۔ "کانستنتین ذرا پیانو کے قریب جا بیٹھو۔"

کیا دمتری نکولے وچ آپ کو موسیقی پسند ہے؟ ——"

رودن نے اس بات کے جواب میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ اور بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔ جیسے وہ پیانو بجانے کیلیئے خود کو آمادہ کر رہا ہو۔ پینڈسے لافسکی نے پیانو بجانا شروع کر دیا۔

نتالیا رودن کی طرف منہ کر کے پیانو کے قریب کھڑی تھی جونہی پیانو سے پہلے سر بلند ہوئے۔ رودن کا چہرہ بیحد حسین ہو گیا۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں کمرے میں چاروں طرف گھومنے لگیں۔ اور کبھی کبھی نتالیا کے چہرے پر آ کر ٹھہر جاتیں۔

پینڈسے لافسکی نے وہ نغمہ ختم کیا۔ رودن کسی قسم کی رائے کا اظہار کیئے بغیر کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ایک خوشبو دار دھند لگا باغ کو اپنی لپیٹ میں لیئے ہوئے تھا۔ پاس کے درخت غنودگی آلود تازگی چھوڑ رہے تھے۔ اور آسمان میں تارے جھلملا رہے تھے۔ گرمیوں کی رات ٹھنڈی تھی۔ اور ہر لمحہ زیادہ ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ رودن نے تاریک باغ میں جھانکا اور پھر مڑ کر ہی نے کہا۔ —— "موسیقی اور یہ رات مجھے جرمن میں اپنے طالب علمی کے ایام کی یاد دلا رہی ہے ——؟ ہمارے وہ جلسے ....."

"کیا تم جرمنی میں بھی رہے ہو؟" میزبانہ نے سوال کیا۔

"میں ایک سال تک ہیڈل برگ میں رہا ہوں اور سال کے لگ بھگ برلن میں ——"

"کیا ان دنوں تم طالب علموں کا سا لباس پہنا کرتے تھے؟ میں نے سنا ہے کہ وہاں طالب علم عجیب و غریب لباس پہنتے ہیں:"

"میں ہیڈل برگ میں رسالے کے فوجیوں کی طرح گھٹنوں تک آنے والے بوٹ اور جھالر دار کوٹ پہنتا تھا۔ اور میرے بال میرے شانوں پر گرتے تھے۔ برلن میں طالب علم عام لوگوں کا لباس پہنتے ہیں ——"

"اپنی طالب علمی کی زندگی کے بارے میں ہمیں کوئی حکایت سناؤ ——" مادام لیپانے درخواست کی ——"

پہلے پہل تو رودن کی داستان بہت بے کیف تھی۔ اس میں نہ تو رنگ تھا اور نہ ہی مزاج تھا۔ تاہم وہ جلد ہی اپنے تجربوں کا ذکر ختم کرنے کے بعد سائنس، تعلیم اور یونیورسٹیوں اور یونیورسٹی کی زندگی پر اپنی رائے کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے بیباکی کے ساتھ ان سب کی ایک واضح تصویر کھینچی، سامعین اس کی ایک ایک بات پر عش عش کر اٹھتے۔ وہ بڑی مہارت کے ساتھ دل کو موہ لینے والے انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ وہ تھوڑے سے ابہام سے بھی کام لے رہا تھا۔ اور اس سے اس کے الفاظ میں مزید دلکشی پیدا ہو رہی تھی۔

خیالات کے بہاؤ نے رودن کو وضاحت اور صفائی کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرنے سے روکا۔ وہ ایک منظر کے بعد دوسرا منظر کھینچتا۔ ایک تشبیہ کے بعد دوسری تشبیہ دیتا۔ اور وہ تشبیہ نہایت موزوں ہوتی۔ اس کی گفتگو میں ایک تجربہ کار

مقرر کا سا انداز نہیں تھا۔ اس کی ہر بات میں ایک سچا جوش و خروش تھا۔ وہ الفاظ کے لیے اپنے ذہن پر زور بھی نہیں دیتا تھا۔ الفاظ اس کا حکم مانتے ہوئے خود بخود اس کے لبوں پر آ جاتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لفظ اس کے دل سے ابھر رہا ہے۔ اور ہر لفظ اس کے یقین سے دمک رہا ہے۔

رودن خطابت کی موسیقی کا جو سب سے بڑا اسرار ہے ماہر تھا۔ جب وہ دل کے ایک تار پر انگلی رکھ دیتا تھا۔ تو دل کے تمام تار جھنجھنا اٹھتے تھے۔ سامعین میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے۔ جو اس کا مطلب پوری طرح نہیں سمجھتے تھے۔ مگر ان کے سینے میں زیر و بم پیدا تھا۔ اور ایک بے نام تابناکی ان کی نگاہوں کے سامنے پیدا تھی۔

رودن کے تمام خیالات ایسے معلوم ہوتے تھے۔ کہ مستقبل کی جھلک ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خیالات جوان اور پر شباب معلوم ہوتے تھے۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا ہو کر بات کر رہا تھا وہ کسی کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ نوجوان عورتوں کی موجودگی عام ہمدردی اور توجہ اور رات کے حسن کی وجہ سے وہ اپنے ہی جذبات میں بہا جا رہا تھا۔ اور اس کی خطابت شاعری کی سرحدیں چھو رہی تھی —— ،، اس کی نرم اور پر خلوص آواز کی صورت اس کے الفاظ کو ایک نئی دلکشی عطا کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی عظیم قوت جس سے وہ خود بھی آشنا نہیں تھا۔ اس کے لبوں کے ذریعہ بات کر رہی ہے۔ رودن وہ باتیں کہہ رہا تھا۔ جو مختصر انسانی زندگی کو ابدی قدر عطا کرتی ہیں۔

"مجھے سکینڈے نیویا کی ایک حکایت یاد آ رہی ہے" اس نے آخر میں کہا —— ،،

ایک بادشاہ آگ کے گرد ایک تاریک کھلیان میں اپنے جنگجو سپاہیوں کے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ دفعتاً ایک ننھا سا پرندہ ایک دروازے سے اڑ کر دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ یہ پرندہ ایک لمحہ روشنی اور گرمی میں گزار کر تاریکی سے باہر آیا اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔ سب سے بوڑھے جنگجو سپاہی نے کہا —— ،، اے شہنشاہ یہ پرندہ تاریکی میں فنا نہیں ہوگا۔ وہ اپنا گھونسلہ ڈھونڈ لے گا —— ،،

یہ سچ ہے کہ ہماری زندگی مختصر ہی ہے۔ بے بضاعت بھی ہے۔ لیکن ہر عظیم کارنامہ انسان ہی انجام دیتا ہے۔ انسان کا یہ ادراک کہ وہ بلند و ارفع قوتوں کا آلۂ کار ہے۔ اس کی سب سے بڑی مسرت ہے۔ موت میں بھی انسان اپنی زندگی کو ڈھونڈے گا۔ اپنا آشیانہ تلاش کرے گا —— ،،

رودن نے ایک لمحہ کے لیے توقف کیا اور غیر ارادی طور پر گھبراہٹ کے عالم میں اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

"نہایت عمدہ —— تم تو بہت بڑے شاعر ہو" مادام لاسنسکایا کے منہ سے نکلا۔

دل ہی دل میں میں نے مادام لاسنسکایا کی رائے سے اتفاق کیا۔ تاہم پیگاسوف اس بات سے متفق نہیں تھا۔ اس نے رودن کی طویل تقریر کو آخر تک سننے کا انتظار کیے بغیر اپنی ٹوپی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ اور جاتے ہوئے اس نے پینڈے لاسنسکی کے کان میں جو دروازے کے قریب کھڑا تھا یہ کہا —— ،، اس سے تو کہیں اچھا ہے۔ کہ میں احمقوں کی مجلس میں جا بیٹھوں —— ،،

کسی نے بھی پیگاسوف کو روکنے کی کوشش نہ کی اور کوئی بھی اس کی عدم موجودگی کو محسوس نہ کر سکا۔

خادم رات کا کھانا لے کر اندر آئے۔ اور آدھ گھنٹے بعد ہر کوئی اپنی گاڑی میں یا پیدل روانہ ہو گیا۔ میزبانہ نے رودن سے اصرار کیا۔ کہ وہ رات اس کے یہاں بسر کرے۔ اپنے بھائی کے ساتھ گھر لوٹتے ہوئے مادام لپینا نے بار بار رودن کی غیر معمولی ذہانت کی تعریف کی اور اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ ولانتیف بھی اس کا ہم خیال تھا۔ اور اس نے صرف اسی قدر کہا کہ رودن بعض اوقات مبہم ہو جاتا ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ اور اس کی آنکھیں، جو گاڑی کے ایک کونے میں جھانک رہی تھیں اور بھی افسردہ ہو گئیں۔

پینڈے لاسنسکی نے پلنگ پر دراز ہوتے ہوئے اپنے کندھوں پر سے ریشمی تسمے اتارتے ہوئے کہا —— ،، فوراً قبول عام حاصل کر لینے والا شخص ہے —— ! ،، اور پھر اس نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ وہ کمرے سے باہر نکل جائے۔ اچانک اس کا چہرہ بہت سنجیدہ ہو

گیا۔ تو وہ تمام رات سو نہ سکا۔ وہ اپنا لباس تبدیل کئے بغیر پلنگ پر پڑا رہا۔ اور ماسکو میں اپنے ایک دوست کے نام خط لکھتا رہا
نتالیا اگرچہ لباس تبدیل کر کے بستر پر جا چکی تھی۔ مگر نیند اسے بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ بھی اپنی آنکھیں کھولے ہوئے لیٹی رہی۔ اس کا ہاتھ اس کے سر کے نیچے تھا۔ اور وہ تاریکی میں گھور رہی تھی۔ اس کی رگوں میں اس کا لہو تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ اور اس کے سینے سے سرد آہیں ابھر رہی تھیں۔

(۴)

دوسرے دن صبح کو رودن اپنا لباس تبدیل ہی کر رہا تھا کہ جب ایک خادم اس کے پاس مادام لاسنکایا کی یہ دعوت لے کر آیا کہ وہ چائے اس کے ساتھ اس کے ذاتی کمرے میں پیئے۔ رودن نے مادام لاسنکایا کو تنہا پایا۔ وہ بڑے تپاک کے ساتھ اس سے ملی۔ اس نے یہ بھی پوچھا کہ رات کو اسے نیند تو اچھی آئی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے اس کی پیالی میں چائے انڈیلی اور اس سے دریافت کیا۔ کہ چائے میں شکر کافی ہے کہ نہیں۔ اسے سگریٹ پیش کی۔ اور دو مرتبہ اپنے اس تعجب کا اظہار کیا۔ کہ وہ اس سے پہلے کیوں نہ مل سکی۔ رودن پہلے تو اس سے دور بیٹھا رہا لیکن مادام لاسنکایا نے اسے جلدی اپنے پاس بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور پھر تھوڑا سا اس کی طرف جھک بھی گئی۔ اور اس سے اس کے رشتہ داروں، اس کے آئندہ تجاویز اور ارادوں کے بارے میں دریافت کرتی رہی۔ مادام لاسنکایا خود تو کبھی کبھار بات کرتی۔ لیکن اس کی باتیں بڑے غور کے ساتھ سنتی۔ رودن پر یہ بات نہایت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی۔ کہ وہ خوشامد کی حد تک اس سے شائستگی کے ساتھ پیش آ رہی ہے۔ اس نے صبح کی ملاقات کا یونہی بندوبست نہیں کیا تھا۔ اس نے لباس تو نہایت سادہ پہنا تھا۔ مگر بڑی نفاست سے کام لیا تھا۔ بہرکیف اس نے جلد ہی اس سے سوالات پوچھنے بند کر دیئے۔ اب وہ اپنی باتیں کرنے لگی۔ اپنی جوانی کی، اپنے رشتہ داروں کی اور ان لوگوں کی جنھیں وہ جانتی تھی۔ رودن نے بڑی توجہ کے ساتھ اس کی تمام باتیں سنیں۔ مادام لاسنکایا جس شخص کے بارے میں بھی بات کرتی۔ اسے تو وہ پس پشت ڈال دیتی۔ اور خود اپنے کو زیادہ ابھار دیتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا۔ کہ جس شخص کے بارے میں وہ بات کر رہی ہوتی۔ وہ تو بالکل غائب ہو جاتا اور وہ خود ہی سامنے رہ جاتی۔ ان سب باتوں کے باوجود رودن کو اس بات کا تفصیل کے ساتھ پتہ چلا۔ کہ مادام لاسنکایا نے فلاں مشہور شخص سے کیا کہا تھا۔ اور فلاں نامور شاعر پر اس کا کتنا گہرا اثر تھا۔ مادام لاسنکایا کی باتیں سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس صدی کے گذشتہ چوتھائی میں یہ مشہور آدمی اس سے ملنے کیلئے بیتاب تھا۔ اور اس کی عنایات کا طلبگار تھا۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں کچھ اتنی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ جیسے وہ اس کے گہرے دوست رہے ہوں۔ وہ ان کی تعریف اور ان کی قصیدہ خوانی نہیں کر رہی تھی۔ بعض اشخاص کو تو وہ بہت ہی عجیب و غریب ڈھنگ سے پیش کر رہی تھی۔ جس وقت وہ ان سے متعلق باتیں کر رہی تھی تو ان کے نام اس کے ہونٹوں سے اس طرح ادا ہو رہے تھے۔ جیسے وہ نام خود مادام لاسنکایا کے نام میں تحلیل ہوتے جا رہے ہوں۔ ایک نایاب ہیرے کے گرد جڑے ہوئے نگینوں کی طرح۔

رودن سگریٹ پیتے ہوئے اس کی باتیں سنتا رہا اور خاموش رہا۔ کبھی کبھی وہ اس خود نما خاتون کی بات پر یونہی سی کوئی رائے دے دیتا۔ رودن نہایت اچھی طرح بولتا تھا۔ اور باتیں کرنے میں اسے مزہ آتا تھا۔ وہ دوسروں سے بات چیت اچھی طرح نہیں کر سکتا تھا۔ مگر دوسروں کی باتیں خوب غور سے سنتا تھا۔ جن لوگوں کو وہ ابتدا ہی میں بوکھلا نہیں دیتا تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں کھل کر باتیں کرتے تھے۔ وہ جب دوسروں کے بیان کے تسلسل کو قائم رکھنے میں امداد دیتا تو اس طرح ان کی حوصلہ افزائی ہوتی۔ وہ نہایت اچھی طبیعت کا مالک تھا۔ ان لوگوں کی طرح نیک طینت تھا۔ جنھیں اپنی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ بحث کرتے ہوئے وہ اپنے مدمقابل کو یہ موقع نہیں دیتا تھا کہ وہ اپنی بات پوری طرح کہہ سکے۔ کیونکہ وہ اس کے طرز کلام کی روانی اور شستگی سے مرعوب ہو جاتے تھے۔

مادام لاسنکایا روسی زبان میں باتیں کر رہی تھی۔ وہ اپنی مادری زبان پر اپنے عبور کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اگرچہ اس

یہ جملوں میں فرانسیسی محاورے اور ضرب الامثال بار بار نمودار
کرتی تھیں۔ وہ جان بوجھ کر عام بول چال کی زبان استعمال کر رہی
تھی۔ مگر کبھی کبھی وہ غیر موزوں جملے بھی کہہ جاتی۔ یہ کھچڑی سی زبان
رودن کو برہم نہیں کر رہی تھی۔ وہ ان باتوں پر غور نہیں کر رہا تھا۔
جب مادام لاسنکایا تھک گئی۔ تو اس نے اپنی بازوؤں والی
کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹکا دیا۔ اور رودن کی طرف دیکھتے دیکھتے
خاموش ہو گئی۔

میں اب سمجھا ہوں۔ کہ آپ گرمیوں میں اپنے اس دیہی مکان
میں کیوں آتی ہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ راجدھانی
کی ہنگامہ پرور زندگی کے بعد یہاں سکون کی زندگی انسان کو تازہ
دم کر دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ قدرت کی دلفریبیوں سے
ہمدردی رکھتی ہیں ۔۔۔"

مادام لاسنکایا نے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔

"قدرت ۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔ میں تو قدرتی مناظر کی پرستار
ہوں۔ لیکن پیارے دفتری دیہات میں بھی احباب کے بغیر کوئی
نہیں رہ سکتا۔ اور یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ یگاسف کو یہاں
سب سے تیز و طرار اور ذہین شخص خیال کیا جاتا ہے ۔۔۔"

"وہ کل کے تلخ مزاج سن رسیدہ بزرگ ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔ دیہات میں تو اس کا بھی خیر مقدم کیا جا سکتا ہے"

"وہ شخص تو احمق ہے ۔۔۔" رودن بولا ۔۔۔ "کیونکہ
وہ غلط راستے پر جا رہا ہے۔ آپ شاید مجھ سے اتفاق نہ کریں مگر
ہر بات کی نفی اور شدید نفی ہمیشہ لاحاصل ہوا کرتی ہے۔ مگر
ایک یہ بات بھی ہے۔ کہ آپ ہر چیز کی تردید کیجئے۔ آپ کو خدا
رسیدہ بزرگ تصور کیا جائے گا۔ اور سادہ لوح لوگ بہت جلد
یہ اعتبار کر لیں گے کہ آپ جس بات کی تردید کر رہے ہیں۔ آپ اس
سے برتر ہیں۔ درحقیقت ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ ابتدا میں آپ
ہر شے میں نقص تلاش کر سکتے ہیں۔ اور دوسرے اگر آپ اسی
پر بھی ہیں۔ تو آپ آخر میں فتحیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو ذہن
نفی پر تل جاتا ہے۔ وہ خشک اور مفلس ہو جاتا ہے۔ اپنے غرور
کی تسکین آپ کو غور و فکر کی مسرت سے محروم کر دیتی ہے ۔۔۔
زندگی اور اس کا نچوڑ آپ کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور
آپ اپنی بات کو گالیوں پر ختم کرتے ہیں اور ہر آدمی کے مذاق
کا موضوع بن جاتے ہیں۔ پس جو شخص تنقید کرتا ہے۔ اسے
ہی تنقید کا حق پہنچتا ہے ۔۔۔"

"بہت خوب ۔۔۔" مادام لاسنکایا کے منہ سے نکلا۔ "
تم لوگوں کا جائزہ لینے میں مہارت رکھتے ہو۔ میرا خیال ہے
کہ یگاسف نے تمہاری یہ بات ہرگز تسلیم نہ کی ہوتی۔ کیونکہ اسے
صرف اپنے آپ سے محبت ہے ۔۔۔"

"وہ اپنے آپ پر تنقید اس لئے کرتا ہے۔ کہ دوسروں
پر تنقید کر سکے ۔۔۔"

رودن نے کہا ۔۔۔"

مادام لاسنکایا ہنسی ۔۔۔ "یعنی اسطرح الزام . . .
ہاں وہ کیا کہاوت ہے ۔۔۔" اس نے کہاوت کو یاد کرنے
کی بے سود کوشش کی ۔۔۔

"یعنی اسطرح الزام دوسروں پر لگایا جائے ۔ ہاں یہ تو
کہو بیرن کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ۔۔۔؟"

"بیرن ایک نہایت اچھا شخص ہے۔ وہ دل کا نرم ہے
اور وسیع معلومات رکھتا ہے۔ مگر اس کا کردار مضبوط نہیں
وہ عمر بھر نیم خادم رہے گا۔ اور نیم دنیا دار رہے گا۔ میرا مطلب
یہ ہے کہ فنون لطیفہ کا قدر دان رہے گا۔ اور اس طرح بے
بضاعت اور حقیر رہے گا ۔۔۔" اور یہ کسقدر افسوس کی
بات ہے ۔۔۔"

"میں نے خود بھی اس کے بارے میں یہی رائے قائم کی ہے
۔۔۔" مادام لاسنکایا نے کہا ۔۔۔"

"میں نے اس کا مقالہ پڑھا ہے . . . . . ."

"کیا آپ کا اور بھی کوئی دلچسپ پڑوسی ہے ۔؟ .."

مادام نے اپنی سگریٹ کی راکھ اپنی چھنگلیا سے جھاڑی۔

"نہیں کوئی نہیں ۔۔۔ مادام لینا ہیں جنھیں تم نے کل
رات کو یہاں دیکھا تھا۔ ایک شریف عورت ہے۔ بس اس سے
زیادہ کچھ نہیں ہے۔

اس کا بھائی بھی ایک اچھا آدمی ہے۔ ایک گھریلو قسم کا
شخص ہے۔ شہزادہ گارن کو تو تم جانتے ہی ہو۔ اور یہاں

کوئی نہیں۔ دو تین اور پڑوسی بھی ہیں۔ مگر قابل ذکر نہیں ہیں۔ یہ وہ بسر اسے آدمی ہیں۔ دنیا دار بالکل نہیں ہیں۔ میں خواتین سے بہت کم ملتی ہوں۔ ایک اور پڑوسی بھی ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑا تعلیم یافتہ اور عالم ہے سننے میں آیا ہے کہ مادام لینا اسے اچھی طرح جانتی ہے۔ اور اس سے کچھ مرعوب بھی ہے۔ دمتری تمہیں چاہیئے کہ تم اس پر ذرا توجہ دو۔ مادام لینا ایک نہایت پیاری عورت ہے۔ اس میں تھوڑا سا ذوق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ تمہاری توجہ اسے بہت بہتر بنا سکتی ہے ——"

"واقعی ایک دلآویز عورت ہے ——" رودن بولا۔

"مگر بالکل بچی ہے۔ گود میں کھیلتی ہوئی بچی — وہ بیوہ ہے۔ اگر میں مرد ہوتی تو ایسی ہی عورتوں سے عشق کرتی ——"

"واقعی ؟"

"ہاں —— ! ایسی عورتیں بڑی تازہ اور شگفتہ ہوتی ہیں۔"

رودن ہنسا —— "وہ بہت کم ہنستا تھا۔ اور جب کبھی ہنستا تھا۔ تو اس کا چہرہ عجیب و غریب انداز اختیار کر لیتا تھا۔ نہایت ہی بے ڈھنگا انداز ——" اس کی آنکھیں سکڑ جاتی تھیں اور اس کی ناک میں بل پڑ جاتے تھے۔

"وہ سنکی شخص کون ہے۔ جس سے مادام لینا اس قدر مرعوب ہیں ؟" رودن نے پوچھا۔

"مونیور یزنف —— مائیخل مائیخلوف —— ایک مقامی جاگیر دار ہے ——"

رودن نے حیرت سے کہا —— "یزنف —— کیا وہ تمہارا پڑوسی ہے ؟"

"ہاں —— کیا تم اسے جانتے ہو ؟"

رودن ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا اور پھر بولا ——

"ہاں میں کبھی اس سے واقف تھا —— مگر ایک مدت ہو چکی ہے۔ وہ ایک دولت مند شخص ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا ——" اس نے اپنی کرسی کے بازو دونوں پر زور سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ دولت مند ضرور ہے۔ مگر نہایت بھونڈا لباس پہنتا ہے۔ اور دو گھوڑوں والی گاڑی میں گھومتا رہتا ہے۔ جیسے وہ کوئی گماشتہ ہو۔ میں نے اسے یہاں بلانے کی کوشش کی ہے۔ مگر بڑا ہوشیار شخص ہے۔ میں اس سے کاروبار کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتی ہوں میں اپنی جاگیر کا انتظام خود کرتی ہوں ——" تمہیں شاید اس کا علم ہو —— ؟"

رودن نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"میں اپنی جاگیر کا خود انتظام کرتی ہوں۔ اسی لئے میں زیادہ خوشحال ہوں ——"

"میں ان لوگوں کی بات کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ جو یہ کہتے ہیں۔ کہ عورت باعمل نہیں ہوتی ——"

مادام لاسنکایا مسکرائی —— "آپ ایک نہایت مہربان شخص ہیں۔ ہاں تو یزنف سے میرا زمین کی حد بندی کے بارے میں جھگڑا ہے۔ میں اسے بار بار بلوا چکی ہوں۔ مگر وہ آتا ہی نہیں۔ وہ بڑا شکی ہے ——"

اتنے میں دروازہ کا پردہ اٹھا کر ایک ملازم اندر آیا۔

"کیوں کیا ہے ؟"

"مونیور یزنف تشریف لائے ہیں ——"

"اوہ میرے خدا —— شیطان کا ذکر کرو۔ اور وہ فوراً آدھمکتا ہے۔

اسے اندر بھیج دو ——"

ملازم باہر چلا گیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ کہ وہ شخص بڑا سنکی ہے۔ اور وہ آخرکار آ ہی گیا۔ بڑے غلط وقت یہاں آیا ہے۔ ہماری گفتگو میں خلل انداز ہوا ہے ——"

رودن کرسی پر سے اٹھا لیکن مادام لاسنکایا نے اسے روک دیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم اس کی موجودگی میں بھی بات کر سکتے ہیں۔

میں چاہتی ہوں کہ تم اسے بھی پگاسن کی طرح آڑے ہاتھوں لو ——"

رودن ایک لمحہ کیلئے سوچ میں پڑ گیا۔ مگر دوبارہ اپنی جگہ

دیا۔"

یزنف کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنا پرانا لباس پہنے ہوئے تھا۔ وہ سر جھکا کر آداب بجا لایا۔ اور چائے کی میز تک آگیا۔

"آپ نے اپنی تشریف آوری سے آخر کار مجھ پر احسان کر ہی دیا ——"

"تشریف رکھئے ——"

یزنف معمول کی طرح دیکھ کر مسکرایا۔

"میرا خیال ہے کہ ......" اس نے اپنا سر تھوڑا سا اکڑ لیا۔

"ہاں ہم دونوں یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھ رہے تھے ——"

"مگر اس کے بعد بھی تو ہماری ملاقات ہوتی تھی۔"

مادام لاسنکایا ان دونوں کی طرف بڑی پریشانی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

"آپ نے مجھے شاید حدبندی کی خاطر بلایا ہے ——"

"مگر میں تو یہ بھی چاہتی تھی کہ آپ میرے مہمان بھی ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے نزدیکی پڑوسی، نہیں ہیں؟"

"شکریہ ——" یزنف بولا ——

"جہاں تک حدبندی کا سوال ہے۔ میں سارا معاملہ آپ کے اشتراک سے طے کر چکا ہوں۔ میں اس کی تمام تجاویز قبول کر چکا ہوں"

"یہ میں جانتی ہوں ——"

"اس نے یہ بات کہی تھی کہ کاغذات پر آپ سے ملاقات ہونے پر دستخط ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں یہ ایک اصول ہے ——"

"تو میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں ——"

"آپ کے لہجے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ میرے یہاں آنے میں جھجکتے رہے ہیں ——"

"کیونکہ میری یہ عادت ہے کہ میں کہیں بھی نہیں جاتا ——"

"کیا مادام لینا کے یہاں بھی نہیں ——؟"

"ہاں وہاں جاتا ہوں۔ کیونکہ ان کا بھائی میرا دوست ہے"

"اس کا بھائی؟ خیر میں کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتی۔ لیکن میں عمر میں تم سے بڑی ہوں۔ اور اس بات پر تمہیں سرزنش بھی کر سکتی ہوں۔ تم ایک سادھو کی سی زندگی کیوں بسر کر رہے ہو ——؟ کہیں یہ بات تو نہیں کہ تمہیں میرا گھر پسند نہیں ہے"

"نہیں —— آپ کا گھر تو ایک نہایت شاندار گھر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں ذرا آوارہ مزاج واقع ہوا ہوں۔ میرے پاس شام کا لباس نہیں۔ دستانے نہیں —— میں دراصل آپ کے حلقے کا آدمی نہیں ہوں ——"

"کیوں۔ تم نے اتنی اچھی تعلیم پائی ہے۔ امیر گھرانے میں جنم لیا ہے ——"

"جنم اور تعلیم کا میری اس عادت سے کوئی واسطہ نہیں۔ آدمی کو الگ تھلگ رہنا چاہیے ——"

مادام لاسنکایا اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ پھر وہ بولی۔ "تم نہیں چاہتے کہ اپنے جاننے والوں کے حلقے میں مجھے شامل کرو ——"

"موسیو یزنف ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ بہت کے بعد سے ذاتی آزادی کے ذرا زیادہ ہی قائل ہیں ——" دوسرے نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔

یزنف نے کوئی رائے نہیں دی اور وہ دونوں کی طرف نگاہ کر کے رہ گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

"تو پھر میں یہ سمجھوں کہ سارا معاملہ طے ہو چکا ہے ——! کیا آپ کے منشی نے بورس کو کاغذات بھجوا دیے ——؟"

"ہاں، یہ درست —— ویسے تمہارا رویہ دیکھ کر تو یہی جی چاہتا ہے کہ انکار کر دوں"

"وہ کیوں —— نئی حدبندی سے تو آپ ہی کو فائدہ ہوگا"

"کیا آپ ناشتے تک یہاں نہیں ٹھہریں گے؟"

"بہت بہت شکریہ۔ میں ناشتہ نہیں کیا کرتا۔ اور پھر مجھے جلدی بھی ہے ——"

"اچھا تو میں تمہیں کیوں روکوں ——" مادام لاسنکایا نے کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ ——" اور یزنف کمرے سے باہر چلا گیا۔

"دیکھا تم نے کس قدر عجیب آدمی ہے۔ میں نے تو یہ سن رکھا تھا۔ کہ وہ ایک عجیب و غریب شخص ہے۔ مگر آج

تو جدا ہی ہو گئی ـــــ"

"یہ اور ریچاسعت ایک ہی مرض کے شکار ہیں۔" رودن نے وضاحت کی ـــــ "دونوں ہی بہت خود پرست ہیں۔ مغرور ہیں۔ ان میں ذرہ بھر صداقت نہیں۔ ذرہ بھر محبت نہیں۔ اپنے آپ کو ذہین ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر دونوں ہی ذہانت اور قابلیت کو دفنا چکے ہیں ـــــ"

"تم لوگوں کا کتنا اچھا تجربہ کرتے ہو۔ تمھاری نگاہ سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا ـــــ"

"ویسے میرا خیال ہے کہ مجھے ان لوگوں کے بارے میں اپنی کوئی رائے نہیں دینی چاہیئے۔ میں اس شخص سے محبت کرتا رہا ہوں۔ مگر بعد میں ہم دونوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور ـــــ"

"اور پھر تم دونوں آپس میں لڑ پڑے ـــــ"

"نہیں ـــــ یہ نوبت تو نہیں آئی۔ مگر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ شاید ہمیشہ کیلئے ـــــ"

"تم شاید جبھی خاموش رہے۔ بہر حال میں آج کی خوشگوار صبح کے لئے تمھاری شکرگذار ہوں۔ تم ناشتہ کے وقت تک ٹہل سکتے ہو ـــ میں ذرا اپنا کام کر لوں ـــــ"

مادام لاسنکایا نے اپنا ہاتھ رودن کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے یہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا اور اس پر بوسہ دیا۔ وہ نشست گاہ سے ہوتا ہوا چھجے کی طرف چل دیا۔ اور چھجے کے اوپر اس کی ملاقات نٹالیا سے ہوئی۔

(۵)

مادام لاسنکایا کی بیٹی نٹالیا پہلی نگاہ میں حسین نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ بہت دبلی پتلی تھی اور اس کا رنگ سانولا ہی مائل تھا اس کی کمر میں ذرا سا خم تھا۔ ابھی اس نے پوری طرح نشو و نما نہیں پائی تھی۔ اس کے ابرو بہت دلآویز تھے۔ پیشانی چوڑی تھی۔ وہ بہت کم باتیں کیا کرتی تھی۔ مگر سنتی زیادہ تھی کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوتا اور غائب ہو جاتا۔

میڈموازیل بون کورٹ اکثر کہا کرتی تھی۔ کہ ایک نوجوان خاتون کو یہ زیب نہیں دیتا۔ کہ وہ کھوئی ہوئی سی رہے۔

مادام لاسنکایا اپنی بیٹی کو نہایت مدبر اور سگھڑ خیال کرتی تھی اور مذاق کے طور پر اکثر کہا کرتی تھی ـــــ "میری نٹالیا سرد ہے وہ مجھ پر نہیں ہے۔ یہی اس کے لئے اچھا بھی ہے ـــ وہ زندگی میں خوش رہے گی ـــــ" مگر مادام لاسنکایا غلطی پر تھی آخر کون ایسی ماں ہے جو اپنی بیٹی کو اچھی طرح جانتی ہے۔

فرمانبردار بیٹی ہوتے ہوئے بھی نٹالیا اپنے سب راز اپنی ماں سے نہیں کہتی تھی۔

"تمھیں مجھ سے کوئی بات چھپانی نہیں چاہیئے ـــــ" مادام لاسنکایا اکثر اسے ہدایت دیتی۔

رودن جب چھجے میں داخل ہوا تو نٹالیا میڈموازیل بون کورٹ کے ساتھ اپنے کمرے میں جا رہی تھی تاکہ ٹوپی پہن کر باغ کی سیر کے لئے جائے۔ وہ اپنا صبح کا مطالعہ ختم کر چکی تھی۔ نٹالیا کے ساتھ اب بچوں کا سا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ نٹالیا صبح کو تاریخ سفرنامہ پر کتاب اور دوسرا صاف ستھرا ادب پڑھا کرتی تھی ـــ استانی بون کورٹ اسے ہر قسم کا فرانسیسی ادب ڈوما کے ناولوں کے سوا پڑھنے کے لئے دیتی تھی۔ ڈوما کے ناول استانی بون کورٹ خود پڑھتی تھی۔ چوری چھپے نٹالیا دوسری کتابیں بھی پڑھتی جن کا علم استانی بون کورٹ کو نہیں تھا۔ اسے پشکن کا مجموعہ کلام زبانی یاد تھا۔

رودن کو دیکھ کر نٹالیا ذرا سا مسکرائی۔

"کیا آپ سیر کے لئے جا رہی ہیں؟" رودن نے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔ ذرا باغ تک جا رہی ہوں ـــــ"

"کیا میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟ ـــــ"

نٹالیا نے استانی بون کورٹ کی طرف دیکھا۔

"آپ بڑی خوشی کے ساتھ ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں ـــــ" ادھیڑ عمر کی استانی نے فرانسیسی زبان میں کہا۔

رودن اپنی ٹوپی اٹھا کر ان دونوں کے ساتھ ہو لیا۔

نٹالیا پہلے پہل تو رودن کے ہمراہ چلتے ہوئے ذرا گھبرائی لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ رودن اس کے درس و مطالعہ کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔

رودن نے شالیا کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا ــ "آپ دیہی علاقہ میں بے کیفی تو محسوس نہیں کرتیں ؟"

"نہیں ــ میں تو خوش ہوں ــــ"

"خوشی ہو ــــ خوشی بڑی چیز ہے ــــ آخر آپ کیوں خوش ہوں ــ آپ جوان جو ہیں ــــ"

ایک لمحہ کے لئے خاموشی طاری رہی۔

"آج صبح میں آپ کی والدہ سے باتیں کرتا رہا ہوں۔ وہ ایک غیر معمولی عورت ہیں۔ میں اب سمجھا ہوں کہ ہمارے شاعران کے ساتھ دوستی کی کیوں اتنی قدر کرتے رہے ہیں کیا آپ کو شاعری سے کچھ شغف ہے ۔ ؟"

شالیا نے سوچا ــــ "یہ شخص میرا امتحان لے رہا ہے پھر اس نے جواب دیا ــــ ہاں ــ"

رودن بولا ــــ "شاعری دیوتاؤں کی زبان ہے ــ میں شعر و شاعری کا دلدادہ ہوں۔ مگر شاعری صرف نظموں تک محدود نہیں ــ شاعری تو ہر جگہ موجود ہے ۔ ہمارے چاروں طرف ــــ ذرا ان درختوں کی طرف اور آسمان کی طرف دیکھیے ــــ ہر چیز سے حسن اور زندگی پیدا ہے ۔ اور جہاں کہیں حسن اور زندگی ہوتی ہے۔ وہیں شاعری بھی موجود ہوتی ہے ــــ" اس نے آگے چل کر کہا ــ "آؤ ذرا یہاں بنچ پر بیٹھ جائیں ــــ" اس کے بعد اس نے شالیا کی طرف بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ــــ "جب آپ مجھ سے مانوس ہو جائیگی ۔ تو آپ میری دوست بن جائیگی کیوں آپ کا کیا خیال ہے ــــ ؟"

"وہ مجھ سے ایک اسکول کی طالبہ کی طرح سلوک کر رہا ہے ــــ" شالیا نے اپنے آپ سے کہا ــــ پھر اس نے پوچھا کہ کیا وہ دیہات میں ایک لمبی مدت تک رہے گا ــــ"

"آہ گرمیاں یہیں گذاروں گا شاید سردیاں بھی ۔ میں دولت مند نہیں ہوں ۔ میرے حالات خراب ہیں ۔ اور پھر میں آوارہ گردی کرتے ہوئے تھک گیا ہوں ــــ اب میرے آرام کرنے کا وقت ہے ــ"

شالیا حیرت زدہ رہ گئی ــــ "کیا واقعی یہ آپ کے آرام کا وقت ہے ۔ !"

"اس سوال سے آپ کا کیا مطلب ہے ! ــــ" اس نے ذرا سا گھبراہٹ کے ساتھ جواب دیا ــــ

"میرا مطلب ہے کہ دوسرے تو آرام کر سکتے ہیں ۔ مگر آپ کو کام کرنا چاہیئے ۔ اور دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہیئے ۔ اگر آپ کام نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا ــــ"

"آپ کی اس تعریف کے لئے آپ کا شکریہ ــــ" یہ کہنا کہ کوئی مفید کام کرو ۔ ایک آسان بات ہے اگر مجھ میں یہ یقین بھی پیدا ہو جائے کہ میں کوئی مفید کام کر سکتا ہوں تو مجھے ہمدرد کہاں میسر آئیں گے ــ" رودن خاموش ہو گیا اور ساتھ ہی افسردہ بھی۔

شالیا جی ہی جی میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو رات کو اتنی گرم جوش تقریریں کر رہا تھا۔

یکدم رودن نے اپنے بال پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے کہا ــ "میں جو کچھ کر رہا ہوں بکواس ہے ــــ آپ ٹھیک کہتی ہیں ــــ شالیا انگیز تھا ــ" میں تہہ دل سے آپ کا ممنون ہوں ــ"

شالیا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کا شکریہ کس بات کے لئے ادا کر رہا ہے

"آپ کے ایک ہی لفظ نے مجھے میرے فرض کا احساس دلا دیا ہے ۔ آپ نے مجھے صحیح طور پر میرا راستہ دکھایا ہے ــ ہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ میں عمل کروں ــ مجھے اپنی ذہانت چھپا کے نہیں رکھنا چاہیئے ــــ"

اس کے منہ سے الفاظ ندی کے بہاؤ کی طرح نکل رہے تھے اس نے اپنے آپ کی ملامت کی ۔ اپنی بے حسی کو کوسا ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کام کرنے والے شخص کے ہمدرد پیدا ہو جاتے ہیں ۔ آخر میں اس نے ایک بار اور شالیا کا شکریہ ادا کیا ۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ذرا سا مروڑا اور کہا ــ "آپ بہت خوبصورت ہیں ۔ آپ ایک نیک دل خاتون ہیں ــــ"

میڈموازیل بون کورٹ رودن کی بے باکی اور بے تکلفی پر حیران ہو رہی تھی ۔ استانی بون کورٹ نے اگرچہ چالیس برس روس میں گذارے تھے ۔ مگر وہ روسی زبان کو مطلقاً نہیں سمجھتی تھی ۔ وہ تو صرف رودن کے بات کرنے کے انداز کی جی ہی جی میں تعریف کر رہی تھی ۔ وہ اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر سے ہٹا نہیں رہی تھی ۔ اسے یقین تھا کہ ایسے شخص اخلاق کے اتنے پابند نہیں ہوتے ــ

وہ اٹھی اور اپنے لباس کے بل سیدھے کرنے لگی اور اس نے

نگاہوں ہی نگاہوں میں شالیا سے اشارہ کیا کہ ان کا اب گھر کے اندر چلنے کا وقت ہو چکا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ناشتہ پر ولانتیف بھی آ رہا ہے

"لو ولانتیف تو آ بھی پہونچا۔۔۔" بوڑھی استانی نے گھر کی طرف آنے والے راستے پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

ولانتیف اب زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے دور ہی سے سر جھکا کر سب کو سلام کیا اور شالیا کی طرف اضطراب کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔ "آہ۔ تم سیر کر رہی ہو۔۔۔!"

"ہاں۔۔۔ ہم گھر کو لوٹنے ہی والے تھے۔۔۔" شالیا نے جواب دیا۔۔۔

"تو آؤ چلیں۔۔۔" وہ سب گھر کی طرف چل دئے۔

"آپ کی بہن کیسی ہیں؟" رودن نے ولانتیف سے پوچھا۔

"شکریہ۔ وہ اچھی ہے۔ شاید وہ آج یہاں آئے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کسی بات پر بحث کر رہے تھے؟"

"ہاں۔ نہایت عجیب باتیں کر رہے تھے۔ اور شالیا! ایگزینیا نے ایک ایسی بات کہی ہے جس سے میں بید متاثر ہوا ہوں۔۔۔"

ولانتیف نے یہ نہ پوچھا کہ وہ بات کیا تھی اور وہ خاموش گھر کو لوٹ گئے۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے محض ایک دفعہ پھر کی لیکن بگاسف نہ آیا۔ رودن بھی اس وقت اچھے موڈ میں نہیں تھا۔ پینڈے لاؤسکی نے بھوون کا نغمہ بجایا۔ ولانتیف فرش کی جانب نظر جھکا کر دیکھتا رہا۔ شالیا اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھی رہی۔ جیسے لوف رودن کی طرف دیکھتا رہا اور اس انتظار میں رہا کہ رودن ابھی کوئی دانشمندانہ بات کہے گا۔

اس بے چینی میں تین گھنٹے گذر گئے۔ مادام لینا دوپہر کے کھانے پر نہ آئی۔ جونہی محفل کھانے کی میز پر سے اٹھی۔ ولانتیف نے اپنی گاڑی منگوائی اور کسی سے خدا حافظ کہے بغیر وہاں سے کھسک آیا۔

ولانتیف کا دل غم سے لبریز تھا۔ وہ ایک مدت سے شالیا کے ساتھ محبت کر رہا تھا۔ مگر وہ شادی کی تجویز ابھی تک پیش نہیں کر سکا تھا۔ شالیا اس کے ساتھ شفقت سے پیش آتی تھی مگر اس کا دل اس کی طرف نہیں کھنچتا تھا۔ ولانتیف بھی اس کے دل میں جذبات کو سلگانا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس امید میں تھا کہ وہ خود بخود اس کی طرف راغب ہو جائے گی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ مضطرب تھا۔؟ اس نے شالیا میں کون سی تبدیلی دیکھی تھی۔؟ شالیا اس سے پہلے کی طرح برتاؤ کرتی تھی۔ اس کے باوجود وہ مضطرب اور بیقرار تھا۔

جب وہ گھر پہنچ کر اپنی بہن سے ملا تو اس نے پوچھا۔۔۔ "آج تم اس قدر جلد کیوں لوٹ آئے ہو؟"

لزنف بھی اس وقت گھر میں موجود تھا۔

"میں اکتا گیا تھا!۔۔۔" ولانتیف نے جواب دیا۔

"کیا رودن وہیں ہے۔؟"

"ہاں۔۔۔"

ولانتیف نے اپنی ٹوپی زور سے ایک کونے میں پٹک دی اور بیٹھ گیا۔ اس کی بہن اس سے مخاطب ہوئی۔۔۔ "بھیا ذرا میری مدد کرو یہ لزنف یہ بات مانتا ہی نہیں کہ رودن ایک ذہین اور دانشمند شخص ہے۔۔۔"

ولانتیف زیر لب کچھ بڑبڑایا۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ رودن دانشمند نہیں یا ایک نہایت اچھا مقرر یا خوش بیان نہیں۔ میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ وہ شخص مجھے پسند نہیں ہے۔۔۔"

"کیا تمھاری اس سے ملاقات ہوئی؟" ولانتیف نے پوچھا۔

"ہاں آج صبح ہی۔ مادام لاسنکایا کے یہاں۔ وہ تو ان دنوں مادام کا وزیر بنا ہوا ہے۔ مگر وہ دن جلد آنے والا ہے۔ جب وہ اس سے جدا ہو جائے گی۔ مگر پینڈے لاؤسکی اسے جدا نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ میں نے اسے وہاں دیکھا۔ اس لئے وہاں سے جلد کھسک آیا۔"

"تم وہاں گئے کیوں تھے۔؟"

"حد بندی کا معاملہ طے کرنے کے لیے۔۔۔۔۔"

"میرا خیال ہے کہ رودن کی برتری تمھاری ناراضگی کا باعث ہے۔" مادام لینا نے کہا۔۔۔ "شاید اسی بات کے لئے تم اسے معاف نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اس کا دل اور اس کا ذہن بھی نہایت اچھا ہے۔ ذرا اس کی آنکھوں کی طرف تو دیکھا ہوتا۔۔۔"

"اس کی آنکھوں میں پاکیزہ اخلاق کا جھلک ہے۔۔۔ کیا یہی کہنا چاہتی ہو نا؟" لزنف نے بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں بگڑ جاؤں گی۔۔۔ اور رو پڑوں گی۔ مجھے واقعی افسوس ہو رہا ہے کہ میں مادام لاسنکایا کے یہاں کیوں نہ گئی اور تمھارے

پاس کیوں بیٹھی رہی۔ اب مجھے زیادہ مت ستاؤ۔ اور مجھے اس کے شباب کی داستان سناؤ۔"

"کس کے شباب کی۔ کیا رودن کے شباب کی؟"

"ہاں۔ تم نے ابھی تو کہا ہے کہ تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ اور بہت سے جانتے ہو۔"

رزنف اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے بات شروع کی "میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم چاہتی ہو کہ میں اس کے شباب کا قصہ سناؤں۔ بہت اچھا تو سنو۔ وہ گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین غریب جاگیر دار تھے۔ اس کے والد کی جلد ہی موت ہو گئی۔ وہ اور اس کی ماں تنہا رہ گئے۔ اس کی ماں ایک نہایت مہربان اور شفیق عورت تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی پرستار تھی۔ وہ اپنا پیٹ کاٹتی تھی اور جس قدر روپیہ اس کے پاس ہوتا تھا اپنے بیٹے کو دے دیتی تھی۔ اس نے ماسکو میں تعلیم پائی۔ اس کے پہلے اخراجات اس کے کسی چچا نے برداشت کئے اور پھر ایک امیر شہزادہ اس کی تعلیم کا خرچ دینا رہا۔ وہ اس شہزادے کی نگاہ پر چڑھ گیا۔ اچھا مجھے معاف کرنا۔ میرا مطلب ہے کہ وہ شہزادہ اس کا دوست بن گیا تھا۔ اس کے بعد وہ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ میری ملاقات اس سے یونیورسٹی میں ہوئی۔ ہم دونوں گہرے دوست بن گئے۔ ان دنوں کی اپنی زندگی کا حال میں پھر کبھی سناؤں گا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد وہ غیر ممالک کی سیر کو نکل گیا۔ . . . ."

رزنف برابر کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اور مادام لپنا کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

"جن دنوں وہ غیر ممالک میں تھا اس نے اپنی اماں کو کبھی خط نہ لکھا۔ صرف ایک دفعہ اس سے ملنے کے لئے گیا۔ اور وہ بھی دس روز کے لئے۔ بوڑھی خاتون کا اس کی عدم موجودگی میں انتقال ہو گیا۔ جب اس کی ماں نے دم توڑا تو اس وقت بھی رودن کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ میں ان دنوں گاؤں ہی میں رہتا تھا۔ میں اکثر اس کی ماں سے ملنے جایا کرتا تھا۔ وہ ایک بڑی مہمان نواز عورت تھی۔ — اس کے بعد غیر ممالک میں میری ملاقات رودن سے ہوئی۔ اس وقت وہ ایک خاتون کی نظروں پر چڑھا ہوا تھا۔ وہ خاتون نہایت بدشکل تھی۔ ویسے ہماری ہموطن تھی۔ وہ ایک مدت تک اس خاتون سے وابستہ رہا۔ بعد میں اس نے اسے چھوڑ دیا — مجھے معاف کرنا۔ میرا مطلب ہے کہ اس خاتون نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ ۔ ۔ ۔"

رزنف خاموش ہو گیا۔ اس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور کرسی پر جا بیٹھا۔

"معلوم ہوتا ہے رزنف تم اس کو پسند نہیں کرتے۔ تم ایک بد طینت شخص ہو۔ بالکل پیگاسف کی طرح۔ میرا یہ خیال ہے کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے اور تم نے کوئی بات اپنی طرف سے بڑھائی نہیں۔ مگر تم نے کتنی تنگ دلی کے ساتھ یہ داستان سنائی ہے۔ غریب خاتون اپنے بیٹے کے ساتھ اس کا سلوک۔ تنہائی میں اس کی موت — غیر ممالک میں رہنے والی ہماری ہموطن خاتون . . . . یہ سب باتیں تم نے سیاہ رنگ کے ساتھ بیان کی ہیں . . . ."

رزنف اپنی کرسی پر سے اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہیں رنج پہنچا ہے۔ لیکن میں نے کسی پر بہتان نہیں لگایا۔ تم ٹھیک کہتی ہو کہ میں نے سیاہ رنگ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مگر کون جانے رودن بدل چکا ہو۔ شاید میں اس کے ساتھ انصاف نہیں کر رہا . . . . ."

"دیکھا تم نے — تم مان رہے ہو۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اس کے ساتھ دوبارہ دوستی پیدا کرو گے تاکہ تم اسے اچھی طرح جان سکو اور پھر اس کے بارے میں کوئی آخری رائے دے سکو۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ مگر ولاتیسف تم کیوں خاموش ہو؟"

ولاتیسف چونک پڑا جیسے وہ ابھی سو کر اٹھا ہو۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے —"

"آج تمہارا رنگ زرد ہے —" لیکن ہن نے کہا۔

"میرے سر میں درد ہے —" ولاتیسف یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

مادام لپنا اور رزنف نے ولاتیسف کا نگاہوں سے تعاقب کیا۔

(۶)

دو مہینے گزر گئے۔ اس مدت کے دوران میں رودن نے مادام

لاسنکایا کے گھر سے باہر قدم نہ رکھا۔ وہ مادام لاسنکایا کیلئے ایک ضرورت بن گیا۔ ایک روز جب اس نے مادام لاسنکایا سے یہ کہا کہ اس کا روپیہ ختم ہو چکا ہے۔ اور وہ جانا چاہتا ہے تو مادام لاسنکایا نے اسے پانچ سو روبل دے دیئے اور وہ رک گیا۔ اس نے دو سو روبل ولانتیف سے قرض لئے۔

پگاسف اب مادام لاسنکایا کے یہاں کبھی کبھی آتا۔ وہ رودن کی موجودگی میں اپنا سکہ نہ بٹھا سکتا۔ رودن نے تنہا پگاسف ہی کو کچل کے نہیں رکھ دیا تھا۔ بلکہ کچھ اور بھی روندے اور مسلے گئے تھے۔

پگاسف اب یہ کہتا ــــ "رودن روسی زندگی سے متعلق کسی ناول کے کردار کی طرح بولتا ہے۔ اگر آپ کو چھینک بھی آتی ہے۔ تو وہ آپ پر جھپٹ پڑتا ہے۔ جب وہ آپ کی تعریف کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ کو کوئی اعزاز بخش رہا ہو ــــ"

پینڈے لافسکی بھی رودن سے ہراساں تھا اور وہ اس کی خوشامد کرنے لگا تھا۔ رودن اگر اس کی کبھی تعریف کرتا پینڈے لافسکی کو یہ شک گزرتا کہ وہ اسے بنا رہا ہے۔ ولانتیف کی بھی یہی حالت تھی وہ نتالیا کی وجہ سے رودن سے حسد کرنے لگا تھا۔

جبکہ توف برابر رودن کی پرستش کرتا رہا۔ رودن اس کی طرف دھیان تک نہیں دیتا تھا بس ایک روز صبح کو رودن نے بیسے توف سے بات چیت کی تھی۔ نہایت نازک مسئلوں پر بحث چھیڑی تھی۔ اس نے بیسے توف کے دل کو خوب گرمایا تھا۔ اس روز کے بعد رودن نے بیسے توف کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ یزنف اب اکثر مادام لاسنکایا کے یہاں آنے لگا تھا۔ رودن اس کے ساتھ کبھی بحث نہیں کرتا تھا اور جب وہ موجود ہوتا تو رودن اکثر باہر چلا جاتا تھا۔ یزنف بھی اس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتا۔ اس نے مادام لیپنا کو رودن کے بارے میں اپنی آخری رائے سے ابھی تک آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ رودن کی تعریف کرتی تھی۔ مگر یزنف پر اعتبار بھی کرتی تھی۔

مادام لاسنکایا کے گھر کا ہر فرد رودن کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کیا جاتا۔ دن کا پروگرام رودن وضع کیا کرتا۔ رودن اب تو مادام لاسنکایا سے اس کی جاگیر کے بندوبست سے متعلق بھی اپنی رائے دینے لگا تھا۔ وہ اس کے بچوں کی پرورش کے بارے میں بھی مشورے دیتا۔ وہ بڑے غور کے ساتھ اس کی باتیں سنتی۔ وہ اس کی محض لفظی تعریف کرتی مگر عمل اپنے گماشتہ کی نصیحت پہ کرتی۔

مادام لاسنکایا کے بعد رودن دیر تک نتالیا سے باتیں کرتا۔ وہ چوری چھپے اسے کتابیں لا کر دیتا۔ اس کو اپنے ارمان اور اپنی تمنائیں بتاتا۔ مستقبل میں جو مقالے اور جو کتابیں وہ لکھنے والا تھا۔ ان کے بارے میں نتالیا سے بحث کرتا۔ اس کی بعض باتیں نتالیا کی سمجھ میں نہ آتیں۔ رودن اس بات کی پروا نہ کرتا کہ نتالیا اس کی باتیں سمجھتی نہیں تھی۔ وہ تو خوش تھا کہ نتالیا بڑے غور کے ساتھ اس کی ہر بات سنتی تھی۔

مادام لاسنکایا غلطی پر تھی۔ نتالیا بچوں کی سی باتیں نہیں کرتی تھی۔ وہ واقعی رودن سے مرعوب تھی۔ وہ اس کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرتی۔ جب رودن اسے ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کی کتاب "فاؤسٹ" پڑھ کر سناتا اور جو پیرے اس کی سمجھ میں نہ آتے ان کی تشریح کر کے بتاتا تو وہ جرمنی کی رومان پرور فضا میں پہونچ جاتی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے حسین و جمیل اور پر اسرار منظر کھل جاتے۔ اس کے ذہن میں خیالات کا ہجوم پیدا ہو جاتا۔ اس کے دل میں جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ اس کے جذبات کی چنگاریاں شعلے بن جاتیں

ایک دن کمرے میں کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے نتالیا نے اسے پوچھا ــــ "اب کے سردیاں تم پیٹرزبرگ میں گذار رہے ہونا؟"

"ابھی مجھے اس کا علم نہیں ــــ" رودن نے کتاب اپنے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے جواب دیا ــــ "اگر مجھے ذرائع میسر آ گئے تو میں ضرور پیٹرزبرگ جاؤں گا ــــ"

وہ صبح سے بیکار رہا تھا۔ اس لئے تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا

"مجھے یقین ہے کہ تم ذرائع حاصل کرنے میں ناکام نہیں ہوگے"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے"

نتالیا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر خاموش رہی۔

"وہ دیکھو سیب کا درخت اپنے پھلوں کے بوجھ سے ٹوٹ چکا ہے ــــ" رودن نے کہا۔

"ہاں اس لئے ٹوٹ گیا کہ اس کا کوئی سہارا نہ تھا ــــ" نتالیا بولی

"آدمی کیلئے سیاہ تلاش کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔"

رودن نے کہا۔

نتالیا بات کاٹ کر غیر متوقع لہجے میں بولی "تم دیہات میں سردیاں
کیسے بسر کرو گے۔؟"

"میں اپنی کتاب زندگی اور آرٹ میں المیہ لکھوں گا۔"

"کیا تم یہ کتاب شائع کرواؤ گے۔؟"

"نہیں۔"

"نہیں۔ تو پھر یہ کتاب لکھو گے کیوں؟"

"تمہارے لئے۔"

نتالیا نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ "یہ تو بہت بڑا ایثار
ہوگا۔"

"اس کتاب کا نام کیا ہوگا۔؟" بیے توف نے دور سے
بات سنتے ہوئے پوچھا۔

"آرٹ اور زندگی میں المیہ" رودن نے جواب دیا
ہاں۔ موسیو بیے توف بھی میری یہ کتاب پڑھینگے۔ ابھی اس کتاب
کا بنیادی خیال میرے ذہن میں نہیں ہے۔ ابھی تو میرے ذہن میں محبت
کی المناک اہمیت ہی واضح ہوتی ہے۔"

محبت کے بارے میں رودن بہت کم باتیں کیا کرتا تھا۔ استانی بون
کورث پہلے تو محبت کے لفظ پر اپنے کان کھڑے کرتی تھی۔ لیکن وہ جلد ہی
محبت کے موضوع پر گفتگو سے مانوس ہو گئی اور جب کبھی محبت کا لفظ اسے
سنائی دیتا تو وہ اپنے ہونٹ بھینچ لیتی اور اس کی پتلی ناک میں چڑھاؤ
لگتی "مجھے اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبت کا المیہ یہی ہے کہ جب
حاصل نہ ملے۔"

"نہیں" رودن بولا "یہ تو محبت کی مضحکہ خیز صورت ہے
محبت تو ابتدا سے آخر تک ایک اسرار ہے۔ محبت کا پیدا ہونا۔ محبت
کا پروان چڑھنا اور محبت کا غائب ہونا۔ یہ سب ایک راز ہے۔ اسرار ہے
ابھی محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک نئے دن کی طرح مسرت انگیز ہوتی
ہے۔ پھر راکھ تلے دیر تک سلگتی رہتی ہے۔ ایک شعلہ بننے کیلئے۔ اس
کے بعد وہ دل میں ناگن کی طرح رینگتی ہے۔ اور دفعتاً کہیں گم ہو جاتی
ہے........ یہ ایک ٹیڑھا سوال ہے۔ اور پھر ہمارے
اس زمانے میں محبت کرتا ہی کون ہے۔ کون محبت کرنے کی جرأت کر سکتا
ہے۔"

رودن دیر تک محبت کے موضوع پر گفتگو کرتا رہا۔ یکایک اس
نے سوال کیا "کیا بات ہے ایک مدت سے موسیو ولاسیف
دکھائی نہیں دیتے؟"

نتالیا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔
"میں نہیں جانتی وہ کیوں نہیں آتے" نتالیا نے سرگوشی کے انداز
میں کہا۔

"وہ بہت اچھے انسان ہیں" رودن نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"وہ ایک روسی رئیس زادے کی بہترین مثال ہیں۔"

استانی بون کورث نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔
رودن نے ٹہلتے ہوئے کہا "برگد کا پیڑ آپ نے دیکھا
ہے۔ اس کے پرانے پتے اس وقت جھڑنے لگتے ہیں۔ جب نئے پتوں کی
کونپلیں پھوٹتی ہیں۔

"ہاں میں نے اکثر دیکھا ہے" نتالیا نے آہستگی کے ساتھ
کہا۔

"یہی حالت پرانی محبت کی ایک مضبوط دل میں ہوتی ہے۔ اگرچہ
پرانی محبت دل میں زندہ ہی ہوتی ہے۔ مگر نئی محبت کے بیدار ہوتے
ہی پرانی محبت دم توڑ دیتی ہے۔"

نتالیا نے اس بات پر اپنی رائے کا اظہار نہ کیا۔ اس نے اپنے
آپ سے سوال کیا۔

"اس بات سے اس کی مراد کیا ہے۔"

رودن دیر تک کھڑا ہوا اپنے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتا رہا
اور پھر باہر چلا گیا۔

نتالیا اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ وہ دیر تک رودن کے آخری
الفاظ پر دماغ سوزی کرتی رہی۔ یکایک اس نے تالی بجائی اور زار و
قطار رونے لگی۔ وہ کیوں رو رہی تھی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ وہ
بار بار اپنے آنسو پونچھتی لیکن پھر رو پڑتی۔ جیسے دیر سے ایک بند چشمہ
پھوٹ بہا ہو۔

اس روز مادلم لیپنا نے رودن کے متعلق لژنف سے بات کی
پہلے تو لژنف نے رودن کے بارے میں بات کرنے سے انکار کیا لیکن

مادام لینا نے اصرار سے کام لیا۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ تم رودن کو بدستور ناپسند کرتے ہو۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم اسے ناپسند کیوں کرتے ہو ۔۔۔"

"جیسی تمہاری مرضی ۔۔۔" لزنف نے تحرک نکالتے ہوئے کہا ۔۔۔ "اگر تم ناراض نہ ہو تو کہوں ۔۔۔"

"کہو بھی ۔۔۔"

"ہاں میں رودن کو ناپسند کرتا ہوں۔ وہ ایک بہت ہی چالاک شخص ہے ۔۔۔"

"بالکل ۔۔۔"

"نہایت ہی چالاک شخص ہے لیکن کھوکھلا ہے ۔۔۔"

"خیر کھوکھلا ہونا تو کوئی برائی نہیں۔ میں اسے یہ الزام بھی نہیں دوں گا کہ وہ ایک سنگدل شخص ہے، کاہل ہے اور کافی ذہین بھی نہیں ۔۔۔"

"کافی ذہین بھی نہیں ؟" مادام لینا نے زور دے کر پوچھا۔

"ہاں کافی ذہین بھی نہیں۔ دوسرے وہ برف کی طرح سرد ہے۔"

"مگر اس کی روح تو بہت گرم ہے۔"

"نہیں وہ برف کی طرح سرد ہے۔ وہ خود بھی اس بات کو جانتا ہے اور خواہ مخواہ گرمجوش بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایک خطرناک کھیل کھیل رہا ہے۔ یہ کھیل اس کے لئے خطرناک نہیں۔ کیونکہ وہ خود گرہ سے کبھی ایک کوڑی بھی خرچ نہیں کرتا اور دوسرے اس کی خاطر جان کی بازی لگا دیتے ہیں ۔۔۔"

"تم کس کی باتیں کر رہے ہو؟"

"رودن کی ۔۔ وہ ایماندار بھی نہیں ہے۔ وہ ایک نہایت اچھا مقرر ہے۔ مگر وہ ایک بچے کی طرح اپنے الفاظ سے حظ اٹھاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ رودن کے الفاظ محض الفاظ ہوتے ہیں۔ اس کے الفاظ کبھی عمل میں تبدیل نہیں ہوتے۔ مگر یہ الفاظ ایک نوخیز دل کو تباہ بھی کر سکتے ہیں ۔۔۔"

"تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"کیا تم جاننا چاہتی ہو کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ نتالیا کی۔"

مادام لینا ایک لمحہ کے لئے ششدر رہ گئی ۔۔۔ "کیا بات کرتے ہو۔ نتالیا تو ابھی بچی ہے۔ اگر میں تمہاری بات مان بھی لوں۔ تو مادام لاسنکایا اس کی ماں . . . ."

"اس کی ماں بہت بڑی انانیت پرست ہے۔ وہ تو اپنے آپ میں گم رہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ اپنے بچوں کی طرف ایک نگاہ ڈالے گی اور ہر بات ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ خود کو ایک ذہین عورت سمجھتی ہے۔ مگر وہ ایک احمق بیوہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ نتالیا بچی نہیں ہے۔ وہ سوچنے کی عادی ہے اور اکثر اس کی سوچ مجھ سے اور تم سے گہری ہوتی ہے۔ کسقدر شرمناک بات ہے۔ کہ ایک ایماندار، جذبات سے لبریز لڑکی کو ایک اداکار کے حوالے کر دیا جائے۔"

"اداکار ۔۔۔"

"ہاں اور نہیں تو کیا۔ کیا ایک شریف شخص کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی گھرانے کے امور میں دخل دے ۔۔۔"

"تم اسوقت بہت مشتعل ہو۔ مجھے تو یہ جان پڑتا ہے کہ تہ میں کوئی اور بات بھی ہے ۔۔۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ کہ تم ایسا ضرور سوچو گی۔ ایک عورت کے ساتھ عقلمندی کی بات کرو تو وہ عورت ہر بات کی تہہ میں کوئی راز ڈھونڈنے لگتی ہے ۔۔۔"

بزنف کی اس بات پر مادام لینا کو بہت غصہ آیا۔ وہ بولی "سو ہو بہ بزنف تم تو بگا سف کی طرح عورتوں سے نفرت کرنے لگے ہو۔ جا ہے تم کچھ بھی کہو مگر میں یہ نہیں مان سکتی کہ تم ایک شخص کو اتنی مختصر سی مدت میں اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ اگر تمہاری بات سنی جائے تو رودن ایک لنگا بھگت معلوم ہوتا ہے۔"

"مصیبت تو یہ ہے کہ وہ بگلا بھگت بھی نہیں۔ بگلا بھگت کو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس مقصد کی جستجو میں ہے۔ مگر یہ شخص تو اپنی ذہانت کے باوجود . . . ."

"ہاں ہاں کہو رک کیوں گئے ۔۔۔"

بزنف اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔۔۔ "میں چونکہ رودن کے بارے میں اپنی بے باک اور کڑی رائے کا اظہار کر رہا ہوں۔ اس لئے تم مجھ سے ناراض ہو رہی ہو۔ مگر مجھے حق حاصل ہے۔ کہ میں اس کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کروں۔ یہ حق حاصل کرنے کے لئے میں نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ میں اسے نہایت اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ دیر تک رہا ہوں۔ اور تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے کہا تھا کہ ہم اپنا دونوں کی زندگی کے بارے میں

سیں پھر کبھی قصہ سناؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ قصہ مجھے اب
بیان کرنا ہوگا۔ کیا تم صبر کے ساتھ یہ داستان سن سکو گی؟"
"ہاں ہاں۔ کہو۔"
"اچھا تو سنو۔" یزنف کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اور
بات کرتے کرتے وہ کبھی رک بھی جاتا۔ "شاید تمہیں معلوم ہو میرے
والدین کا سایہ لڑکپن میں میرے سر پر سے اٹھ گیا تھا۔ میں اس
وقت سترہ برس کا تھا۔ میں ماسکو میں اپنی چچی کے یہاں رہتا تھا
میں ان دنوں بڑا خود پسند اور کھوکھلا لڑکا تھا۔ میں یونیورسٹی
میں داخل ہوا اور اسکول کے لڑکوں کی طرح عمل کرنے لگا
جس کی وجہ سے مجھے مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں یہ نہیں
بتاؤں گا کہ وہ مصیبت کیا تھی وہ قابل ذکر بھی نہیں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا اور اس
کی وجہ سے مجھے سب کے سامنے ذلیل کیا گیا۔ میں بات سہ ر رہا۔ میں اس وقت
اپنے ایک دوست کے کمرے میں تھا۔ اور وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ سب میرا
مذاق اڑا رہے تھے مگر اس کو مجھ پر ترس آگیا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر وہاں سے اپنے ساتھ باہر لے گیا۔
"کیا وہ رودن تھا؟"

"نہیں وہ شخص اب مر چکا ہے۔ وہ ایک غیر معمولی شخص تھا۔ اس کا نام
پوکورسکی تھا۔ میں چند لفظوں میں اس شخص کو بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر میں نے
اس کی بات شروع کر دی تو پھر کسی دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکوں گا
وہ ایک نیک طینت فرشتہ خصلت اور بے نظیر انسان تھا۔ وہ ایک
چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا۔ وہ بہت غریب تھا۔ وہ بعض اوقات
اپنے کسی مہمان کو ایک کپ چائے بھی نہیں پلا سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہزاروں
آدمی اس سے ملنے آتے تھے۔ ہر شخص اس سے پیار کرتا تھا۔ وہیں رودن
سے میری ملاقات ہوئی کیونکہ ان دنوں اس کے دوست شہزادہ نے اسے چھوڑ دیا تھا۔
پوکورسکی میں غیر معمولی بات کیا تھی؟" مادام نے پوچھا۔
"الفاظ اس کی فطرت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ اپنی ذہانت
کے باوجود بچوں کی طرح دلکش تھا۔"

"کیا وہ بہت اچھی باتیں کرتا تھا؟"
"ہاں جب وہ موڈ میں ہوتا تھا۔ مگر میرا کوئی حد تک نہیں وہ
ان دنوں میں بھی اس سے بیس گنا اچھی باتیں کرتا تھا۔"
یزنف ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر سینے پر اپنے ہاتھ باندھ کر بولا۔
"رودن اور پوکورسکی میں کوئی بات مشترک نہیں تھی۔ رودن زیادہ بھڑکیلا
تھا۔ بلند بانگ الفاظ کا مالک تھا اور شاید زیادہ جوشیلا بھی تھا۔ وہ

پوکورسکی سے زیادہ ذہین معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پوکورسکی سے اس کا کوئی مقابلہ
ہی نہیں کیا جا سکتا۔ رودن ایک خیال کی نہایت اچھی وضاحت کرتا تھا
اور نہایت اچھی بحث کرتا تھا۔ لیکن اس کے خیالات اس کے ذہن کی پیداوار
نہیں ہوتے تھے۔ دوسری طرف پوکورسکی اگرچہ سادہ، شریف اور کمزور
تھا۔ مگر وہ عورتوں کا دلدادہ تھا۔ تفریح کا عاشق تھا۔ اور اس سے
میں کوئی اس کا ثانی نہیں تھا۔ وہ خیالات کا بادشاہ تھا۔ رودن یوں تو
بڑا گرم جوش تھا۔ لیکن برف کی طرح سرد تھا۔ ان دنوں ہمارا حلقہ
نوجوانوں پر مشتمل تھا۔ ہم آرٹ، علم اور زندگی کی باتیں کیا کرتے
تھے۔ یہ بالکل حسین الفاظ تھے گو پیچیدہ۔ ہم ان باتوں کے واضح
کا شعور نہیں رکھتے تھے اور جاہل انداز میں بحث کیا کرتے تھے اور جب ہم
رودن کی باتیں سنتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمام باتیں واضح
ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر ہمارے خیالات طبیعت زادہ نہیں تھے تو اس کی کون
پروا کرتا تھا۔ ہاں ایک بات ہے کہ ان دنوں ہم جس قدر علم ان نوں حاصل
کر سکے وہ رودن کی بدولت ہی حاصل کر سکے۔ یہ ٹھیک ہے پوکورسکی
ہمارے دلوں میں عمل کی آگ روشن کر دیتا تھا۔ مگر وہ بعض اوقات
بری طرح خاموش ہو جاتا تھا۔ پوکورسکی کی صحت بہت خراب تھی
رودن ایک خوبصورت جوان تھا۔ وہ بہت باتونی تھا۔ وہ ہر بات
میں ٹانگ اڑاتا تھا۔ وہ ہر بات کی وضاحت اور تشریح کی کوشش
کرتا تھا۔ میں اس وقت اس زمانے کے رودن کی بات کر رہا ہوں۔ مگر
مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ۳۵ برس
کی عمر میں بھی اس کے خیالات نہیں بدلے۔
"بیٹھ جاؤ۔ تمہارے ادھر ادھر گھومنے سے مجھ پر غنودگی سی طاری ہوتی ہے۔"
"میں اس طرح زیادہ اچھی طرح بات کر سکتا ہوں۔ میں جب
پوکورسکی کے حلقے میں شامل ہو گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا نیا جنم
ہوا ہے۔ میں زیادہ منکسر ہو گیا۔ ہر بات کی زیادہ کھوج کرنے لگا۔
پانچ چھ نوجوان جمع ہوتے رات بھر باتیں ہوتیں۔ صبح کا اجالا پھیلتا
اور ہم اپنے اپنے گھر کو روانہ ہوتے۔ کتنا اچھا زمانہ تھا۔"
لزنف خاموش ہو گیا۔ اس کا بے رنگ چہرہ اس وقت سرخ ہو رہا تھا۔
"مگر تمہارا رودن سے جھگڑا کب ہوا؟" مادام سیپلنے لزنف
کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"میرا اس سے جھگڑا نہیں ہوا۔ میں نے اس سے قطع تعلق کر لیا

جب مجھے پردیس میں اس بات کا پتہ چلا کہ وہ درحقیقت کیا ہے۔ ماسکو میں اس سے جگری دوستی کی بہر حال موجود تھی۔ اس نے میرے ساتھ نہایت رذیل دھوکہ کیا"

"وہ دھوکا کیا تھا۔۔؟"

"بتاتا ہوں۔ میں ہمیشہ کسی نہ کسی سے محبت کرنے کا جنون رکھتا تھا۔"

"تم ؟"

"ہاں۔ سنو تو سہی۔ میں ایک نہایت ہی پیاری لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ مگر تم میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہا ہو؟ میں تمہیں اس سے زیادہ حیران کن بات بتا سکتا ہوں۔"

"ذرا میں بھی سنوں وہ کونسی بات ہے۔۔؟"

"تو سنو جن دنوں میں ماسکو میں تھا تو میں اپنے باغ میں جا کر گھنٹوں سے ملا کرتا تھا۔ لیموں کے درخت سے۔ میں لیموں کے درخت سے لپٹ جاتا۔ اس کے تنے کو اپنے آغوش میں لے لیتا اور مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری قدرت میرے آغوش میں ہو۔ مگر میں تو تمہیں اپنی محبت کی داستان سنا رہا تھا۔ ایک لڑکی سے میری واقفیت ہو گئی۔"

"لیموں کے درخت سے محبت چھوڑ دی؟"

"ہاں۔۔ وہ ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ بڑی نیک دل۔ اس کی آنکھیں بہت ہی چمکدار تھیں اور اس کی آواز چاندی کی گھنٹی کی آواز کی طرح تھی۔۔"

"تمہاری قدرتِ بیان پر حیرت ہوتی ہے۔" مادام سہلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نہایت ہی بڑی نقاد ہو۔ خیر تو وہ لڑکی اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ اس لڑکی سے ملاقات کے تیسرے دن میں نے اپنی محبت کا ذکر رودن سے کیا۔ کیونکہ ایک نوجوان کے لئے اپنی محبت کو چھپانا دشوار ہوتا ہے۔ جب رودن کو میری محبت کا حال معلوم ہوا تو اس نے بڑی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ اس نے مجھے میرے فرض سے آگاہ کیا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہا۔ اس کے الفاظ نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ رودن نے میری محبوبہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے ہی اسے اس لڑکی سے متعارف کرانے پر زور دیا ہوگا۔"

"اب میں سمجھی رودن تمہاری محبوبہ لے اڑا اور اس کے لئے تم اسے معاف نہیں کر سکتے۔ کیوں میں ٹھیک کہتی ہوں نا!"

"نہیں رودن میری محبوبہ کو نہیں لے اڑا۔ اس کا یہ ارادہ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے میری مسرت کا گلا گھونٹ دیا۔ اور آج اسی بات کے لئے میں اس کا شکریہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔ مگر ان دنوں تو میں پاگل ہو گیا۔ رودن مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی یہ عادت تھی کہ وہ دوسرے لوگوں کی زندگی کا پروگرام مرتب کیا کرتا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو بتایا کہ ہمیں ایک دوسرے سے کیا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اس نے تو ہم سے خط و کتابت بھی شروع کر دی جو ہم دونوں کو اکتا کر رکھ دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ہم کم سے کم چند مہینے تو مزے سے گزار سکتے۔ ایسا نہ ہو سکا کیونکہ ایک روز رودن نے کہا کہ وہ ہمارا بہترین دوست ہے اور اس کا یہ فرض ہے کہ وہ لڑکی کے باپ سے بات کرے اور وہ لڑکی کے باپ سے بات کرنے چلا گیا۔"

"کیا واقعی؟"

"ہاں ایسا اس نے میری مرضی اور اجازت سے کیا۔ میں اس وقت بڑا پریشان تھا مجھے سفید چیزیں سیاہ اور سیاہ چیزیں سفید نظر آ رہی تھیں۔ اب بھی مجھے جب اس کا خیال آتا ہے۔ تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔"

"اور تمہیں اس لڑکی سے الگ ہونا پڑا؟" مادام سہلا نے بڑے پیار سے اور نزاکت سے پوچھا۔

"ہاں ۔۔۔ اور یہ جدائی بڑی الم ناک تھی۔ میں بھی رویا اور وہ لڑکی بھی روتی۔ مجھے نہیں معلوم ہم نے ایک دوسرے سے کیا کہا۔ بہرکیف اس جدائی کا نتیجہ اچھا نکلا۔ اس لڑکی نے ایک قابل شخص سے شادی کر لی ہے اور خوش ہے۔"

"اس پر بھی تم یہ کہتے ہو کہ رودن کو معاف نہیں کر سکتے۔"

"نہیں یہ بات نہیں جب رودن غیر ممالک کی سیر کے لئے روانہ ہوا تو میں بچوں کی طرح لپٹ کر اس سے رویا۔ یہ ٹھیک ہے کہ نفرت کا بیج اس دن سے میرے دل میں بویا جا چکا تھا۔ اس کے بعد پردیس میں میری اس سے ملاقات ہوئی۔ میں اس وقت عمر میں ذرا بڑا ہو چکا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ رودن کیا تھا۔"

"تم نے کیا دریافت کیا؟"

"وہی ایک گھنٹہ پہلے جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ خیر رودن کا قصہ اب ختم ہو لیا۔ میں تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر میں اس کے بارے میں سخت فیصلہ صادر کر رہا ہوں تو اس لئے نہیں کہ میں اسے جانتا نہیں

بلکہ اسے جلتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں - میں اب اور کچھ نہیں کہوں گا-
تم ذرا اپنے چاچا پر توجہ دو۔"

"اپنے چاچا پر ---- وہ کیوں؟"

"ذرا اس کی طرف دیکھو تو - کیا تمہیں کوئی بات نظر نہیں آتی؟"

"نظر کیوں نہیں آتی - میں دیکھ رہی ہوں کہ کچھ دنوں سے وہ
بہت خاموش ہیں - کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ ---"

"- ذرا آہستہ سے" لوئن نے سرگوشی کی "مجھ پر اعتماد کرو
نتالیا بچی ہے - اگرچہ وہ ایک ناتجربہ کار بچی ضرور ہے : میری
بات یاد رکھنا ایک دن وہ لڑکی تمہیں حیرت میں ڈال دے گی۔

"وہ کیسے؟"

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایسی لڑکیاں ہی دھوکہ دیتی ہیں۔ یا زہر
کھا لیتی ہیں - تم اس کی سادگی پر نہ جاؤ - وہ اندر سے آگ ہے آگ -
[illegible] وہ تم تو شاعری کرنے لگے تمہیں تو ہر جگہ ایک
آنکھوں میں فضائی بیابانی نظر آتی ہوں گی۔"

"اور نہیں تو کیا ---- لوئن نے مسکراتے ہوئے کہا۔"

ولانتیف کمرے میں داخل ہوا اور اس نے اپنی بیوی اور
لوئن پر ایک خفیہ سی نگاہ ڈالی۔ وہ گذشتہ دنوں بہت خاموش سا ہو گیا
تھا - ولانتیف کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ نتالیا اس کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی
ہے اور اس کے ساتھ اس کے پیروں تلے کی زمین نکل رہی ہے -

دوسرے دن اتوار تھا اور نتالیا ذرا دیر سے جاگی - کل کے دن
اور بہت خاموش رہی تھی جی ہی جی میں اپنے آنسوؤں پر ندامت محسوس
کرتی رہی تھی - رات کو اسے نیند نہیں آئی تھی - پیانو کے سامنے بیٹھ کر وہ
نہایت دھیمے سروں میں اسے بجاتی رہی تھی تاکہ استانی بون کورٹ کی
آنکھ نہ کھل جائے - وہ رودن کے بارے میں کم مگر اس کے خیالات کے
بارے میں زیادہ سوچتی رہی تھی - کبھی کبھی ولانتیف کی تصویر اس کی
نگاہوں کے سامنے آ جاتی وہ جانتی تھی کہ ولانتیف اس سے محبت
کرتا ہے - مگر وہ جلد ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتی وہ ایک
عجیب و غریب کھلبلی سے دوچار تھی -

صبح کو وہ تیزی کے ساتھ اپنا لباس تبدیل کر کے باغ کی طرف
نکل گئی - دن بہت گرم تھا - دھوپ نکلی ہوئی تھی - ہوا میں ایک
تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی - نتالیا ٹہلتی ہوئی تالاب کے قریب جا پہنچی - دفعتاً
رودن اس کے سامنے آ کھڑا ہوا جیسے زمین نے اسے اگل دیا ہو -

"حیران ہو گئی -"

"کیا تم اکیلی ہو؟"

"ہاں" نتالیا نے جواب دیا ---- "گھر میں ذرا سی دیر کے لئے
باہر آئی ہوں - مجھے اب لوٹ جانا چاہئے۔"

"کیا میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں -؟"

یہ کہہ کر رودن اس کے ساتھ چلنے لگا -

"تم آج افسردہ دکھائی دے رہی ہو!"

"کیا واقعی؟ اور میں یہ کہنے والی تھی کہ تم آج زیادہ ملول ہو۔"

"مجھ پر اکثر غم کے دورے پڑتے ہیں - مگر تمہاری عمر اداس
ہونے کی نہیں۔"

"کیوں -؟ تمہارا کیا خیال ہے - کہ مجھے کبھی کوئی رنج
نہیں ہوتا -؟"

"تمہاری عمر میں تو ہر شخص کو زندگی کا لطف اٹھانا چاہئے"

نتالیا چند قدم تک خاموش رہی - پھر وہ بولنے لگی!

"ہاں تو کہو کیا بات ہے؟"

"کیا تمہیں وہ موازنہ یاد ہے جو تم نے کل کیا تھا - وہ برگد
کے پیڑ کا قصہ؟"

"ہاں۔"

نتالیا نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارا
اس سے مطلب کیا تھا؟"

رودن نے سر جھکا لیا - اور دور خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔
"نتالیا تم نے یہ بات دیکھی ہوگی کہ میں اپنے متعلق بہت کم ذکر کرتا ہوں
میں اپنے دل کے بہت سے تاروں پر انگلی نہیں رکھتا - کسی کو یہ جاننے
کی کیا ضرورت ہے کہ میں کن مصائب میں سے گزرا ہوں - لیکن میں تم سے
صاف صاف باتیں کر سکتا ہوں - میں تم سے یہ بات چھپانا نہیں چاہتا کہ میں
نے بھی محبت کی ہے اور دکھ جھیلے ہیں - میرا دل بے پایاں مسرت اور
بے کراں دکھ سے آشنا رہا ہے -" رودن ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا -
"کل جو بات میں نے کہی تھی وہ مجھ پر صادق آتی ہے میں دھوپ سے
جلے ہوئے راستے پر ایک مسرت انگیز گاؤں میں سفر کر رہا ہوں میری
منزل کب آئے گی یا آئے گی بھی کہ نہیں - یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے ......

"آؤ اب ہم تمہارے بارے میں باتیں کریں۔"
"دمتری نکولے وچ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں زندگی سے کوئی توقع ہی نہیں رہی؟"
"نہیں میں زندگی سے بہت توقع رکھتا ہوں۔ زندگی جو مسرت اور سرگرمی عطا کرتی ہے۔ میں اسے کبھی ترک نہیں کروں گا۔ لیکن محبت شاید میری قسمت میں محبت نہیں ہے۔ محبت یوں سمجھو ایک عورت مرد کے کل وجود کو طلب کر سکتی ہے۔ مگر میں اپنے پورے وجود کو نہیں دے سکتا۔ اس کے علاوہ جوانی بڑی خوبصورت ہوتی ہے میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میں کسی کو اپنا دیوانہ نہیں بنا سکتا۔"
"میں سمجھتی ہوں" شالیا بولی "کہ جو شخص ایک بلند وارفع مقصد حیات رکھتا ہے وہ اپنے بارے میں سوچنا چھوڑ دیتا ہے لیکن کیا کوئی بھی عورت اس شخص کی قدر نہیں کر سکتی۔ تم میرا اعتبار کرو کہ عورت نہ صرف ایثار کی قدر کرتی ہے بلکہ اس کی اہل بھی ہوتی ہے۔"
شالیا کے رخسار گلابی ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ روڈن سے ملنے سے پہلے اس نے کبھی اتنی زیادہ بات نہیں کی تھی۔

"تم عورت کے بارے میں میری بات سن چکی ہو" روڈن بولا "میرے خیال میں تو جون آف آرک ہی صرف قربانی کر سکتی تھی۔ لیکن میں تو تمہارا ذکر کر رہا تھا۔ تم زندگی میں قدم رکھ چکی ہو اس لئے تمہارے مستقبل سے متعلق بات چیت زیادہ سودمند ثابت ہوگی۔ اگر میں ایک سوال کروں تو اس سے تم کوئی میرا مقصد تو غلط نہیں کرو گی؟ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہارا دل آزاد ہے؟"
شالیا حیا سے سرخ ہو گئی اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ روڈن رک گیا اور وہ بھی کھڑی ہو گئی۔
"تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں" وہ بولی "لیکن تمہارے اس سوال کی مجھے توقع نہیں تھی۔"
"بہرکیف تمہیں اس سوال کے جواب دینے کی ضرورت نہیں —— میں تمہارے دل کا بھید جانتا ہوں۔"
شالیا نے گھبراہٹ کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں وہ کون ہے۔ تمہارا اس سے اچھا اور کوئی انتخاب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے وہ تمہاری قدر کرے گا۔ زندگی نے اس پر کوئی خراش نہیں ڈالی۔ وہ اب بھی تابناک اور صاف ہے۔ وہ تمہیں خوش رکھے گا۔"
"تم کس کا ذکر کر رہے ہو؟"
"جیسے تمہیں علم ہی نہ ہو۔ میری مراد وولشیف سے ہے۔ کیا میں سچ نہیں کہہ رہا؟"
شالیا نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ بہت گھبرا گئی۔
"کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتا۔ بھلا کبھی جب وہ تمہاری طرف دیکھتا ہے تو پھر اپنی نگاہیں تم پر سے نہیں اٹھاتا۔ تمہاری ہر حرکت کی نگرانی کرتا ہے۔ ہر آدمی کے لئے اپنی محبت کو چھپانا بہت دشوار ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ تمہاری والدہ بھی اسے پسند کرتی ہیں۔"
"دمتری نکولے وچ" شالیا نے اپنا ہاتھ بڑھا کر بات بیچ میں کاٹ دی۔ "میرے لئے اس معاملے پر بحث کرنا مشکل ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم غلطی پر ہو۔"
"اچھا تو یہ بات ہے۔ نہیں میرا یہ خیال نہیں ہے۔ ہم اگرچہ ایک دوسرے کے پرانے دوست نہیں ہیں۔ پھر بھی میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں...... ورنہ جو میں تبدیلی تم میں دیکھ رہا ہوں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے تم وہ نہیں ہو جو چھ ہفتے پہلے ہوا کرتی تھیں۔ نہیں شالیا تمہارا دل آزاد نہیں ہے۔"
"شاید" شالیا نے دبی زبان میں کہا۔ "مگر تم غلطی پر مصر رہو تو وہ کیسے؟"
"برائے کرم مجھے تنہا چھوڑ دیجئے اور مجھ سے سوالات نہ کیجئے۔" وہ گھر کی طرف تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی بڑھی۔ اس کے سینے میں جو جذبات یک بیک ابھر آئے تھے وہ ان سے خوفزدہ تھی۔
روڈن نے اسے جا لیا۔ اور وہ اسے روک کر بولا۔ "شالیا یہ گفتگو یوں ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ میرے لئے بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ورنہ میں تمہیں کیسے سمجھ پاؤں گا۔"
"مجھے تنہا چھوڑ دیجئے" شالیا نے بات دہرائی۔
"شالیا مجھے اس کا جواب دو" روڈن زرد پڑ گیا تھا۔ "تم ہر بات کو سمجھتی ہو۔ اس لئے تم مجھے بھی سمجھ سکتی ہو۔ ابھی تم نے

اپنا ہاتھ اس سے چھڑا لیا اور مڑ کر دو پیٹی پر نگاہ ڈالے بغیر گھر کی طرف چل پڑی۔

"سنو، ایک بات سنتی جاؤ..." رودن نے التجا کی۔

وہ رک گئی لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

رودن بولا — "تم نے اپنی ماں سے پوچھا تھا کہ میں نے برگد کے درخت کا قصہ کیوں سنایا تھا۔ تمہیں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ نہ میرا اور تمہارا قصہ تھا۔"

"میرا قصہ تھا؟"

"ہاں تمہارا بھی۔ تم جانتی ہو میں نے ایک نئے احساس اور ایک نئے جذبے کی بات کی تھی۔ آج سے پہلے میں یہ جرأت کبھی نہ کرتا۔"

نتالیا نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور گھر کی طرف بھاگ گئی۔

نتالیا گفتگو کے اس غیر متوقع عروج سے اتنی حیران ہوئی تھی کہ وہ ولاتیف کو دیکھے بغیر اس کے پاس سے گزر گئی۔ ولاتیف ایک پیڑ کے تنے سے پیٹھ لگا کر کھڑا تھا۔ وہ پندرہ منٹ پہلے مادام لاسنکایا کے مکان میں داخل ہوا تھا۔ اس نے گھر کی مالکہ کو نشست گاہ میں پایا تھا۔ اس سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد نتالیا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ ایک عاشق کے سے احساس کے ساتھ وہ سیدھا باغ میں پہنچا تھا۔ اس وقت نتالیا اپنا ہاتھ رودن کے ہاتھوں سے چھڑا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ نتالیا کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر پیڑ کی اوٹ سے باہر نکلا۔ رودن نے جب اپنی نظر اٹھائی تو اس نے ولاتیف کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ ان دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ دونوں نے سر جھکا کر ایک دوسرے کو سلام کیا۔ اور دونوں الگ الگ سمت چلے گئے۔

"یہ ابھی انجام نہیں ہے۔" دونوں سوچ رہے تھے۔

ولاتیف باغ میں ٹہلتا رہا۔ اور جی ہی جی میں بل کھاتا رہا۔ اس کے دل پر منوں بوجھ تھا اور بعض اوقات اس کا خون کھولنے لگتا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی۔ رودن اپنے کمرے میں پہنچا وہ بھی پریشان تھا۔

کھانے کی میز پر کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ نتالیا کا رنگ بالکل زرد تھا وہ بمشکل کرسی پر بیٹھ سکتی تھی۔ وہ اپنی نگاہیں اوپر نہیں اٹھا رہی تھی۔ ولاتیف بدستور اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی وہ نتالیا سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ اس روز پگاسوف بھی مادام لاسنکایا کے یہاں کھانا کھا رہا تھا۔ وہ سب سے زیادہ باتیں کر رہا تھا۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ لوگوں کو بھی کتوں کی طرح دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جیسی چھوٹی دم کے کتے، لمبی دم کے کتے۔ چھوٹی دم کے کتے یا آدمی ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ مگر جن کتوں کی دم گھنی اور لمبی ہوتی ہے وہ ہمیشہ تقدیر کے دھنی ہوتے ہیں۔ اس نے کہا "میرا شمار چھوٹی دم والے کتوں میں ہوتا ہے اور پاگل بنا دینے والی بات تو یہ ہے کہ دُم میں نے خود چھوٹی کی ہے۔"

"دوسرے لفظوں میں —" رودن بولا — "تم وہ بات کہنا چاہتے ہو جو کہ راسپچے فوکو لڈ بہت پہلے کہہ چکا ہے۔ اپنے آپ پر بھروسہ کرو تو دوسرے تم پر بھی بھروسہ کرنے لگیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر دُم کہاں سے آ گئی۔"

"ہر شخص کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جس طرح وہ چاہے آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر سکے۔" ولاتیف نے غضب آلود ہو کر کہا۔ "اور اگر آپ مطلق العنانی کے بارے میں میری رائے پوچھتے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ ان نام نہاد ہوشیار اشخاص کی مطلق العنانی سے بڑی چیز دنیا میں اور کوئی ہے ہی نہیں۔ خدا انہیں غارت کرے۔"

سب طرف خاموشی چھا گئی۔ ہر آدمی ولاتیف کے یک بیک بھڑک اٹھنے پر حیران رہ گیا تھا۔ رودن نے اس کی طرف دیکھا۔ مگر دونوں کی نگاہیں دیر تک متصادم نہ رہ سکیں۔ رودن مسکرایا اور خاموش رہا۔

"اچھا تو تم بھی دُم کٹے کتے ہو —" پگاسوف سوچ رہا تھا۔

نتالیا کا کلیجہ اس کے منہ کو آ گیا تھا۔ مادام لاسنکایا بھی ولاتیف کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اس خاموشی کو توڑا اور ایک وزیر کے کتے کا ذکر لے بیٹھی۔

کھانا ختم ہوتے ہی ولاتیف نے اجازت چاہی اور جاتے جاتے وہ نتالیا سے دبی زبان میں کہہ گیا — "تم کیوں پریشان ہوتی ہو جیسے تم کوئی مجرم ہو — تم کبھی کسی کے سامنے مجرم نہیں ہو سکتیں"

نتالیا اس کی بات کے مطالب نہ سمجھ سکی اس نے ولاتیف کی طرف بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ کمرے سے باہر جا رہا تھا۔

چائے سے پہلے رودن اس کی میز کے قریب آیا اور اخبار کو موڑتے کے بہانے کرتے ہوئے اس نے کہا "سب باتیں ایک خواب ہیں۔ کیا نہیں ہیں؟ میں تم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں" اور پھر اس نے شالیا کی طرف ذرا اور جھکتے ہوئے کہا۔ "اس بجے باغ میں آنا میں تمہارا منتظر رہوں گا۔"

رودن میران پیگاسف کے ہاتھوں میں تھما کر باہر چلا گیا۔

آج کی شام کا ہیرو پیگاسف تھا۔ مادام لاستکایا اس کی باتوں سے بہت لطف اندوز ہو رہی تھی۔ پہلے تو پیگاسف نے اپنے ایک پڑوسی کی کہانی سنائی جو زن مرید تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ مرد تو بھی نسوانی حرکات کرنے لگا اور ایک دن تو اس نے اپنے کوٹ کا کنارا اس طرح اوپر اٹھایا جیسے عورتیں پیٹی کوٹ اٹھاتی ہیں۔ پھر اس نے دیہات میں رہنے والے ایک رئیس کا قصہ چھیڑ دیا۔ مادام لاستکایا خوب ہنس رہی تھی۔ پیگاسف اپنی عورتوں پر فتوحات کا بھی ذکر کر رہا تھا وہ بتا رہا تھا کہ عورت کو عورت بنا دینا یا اسے محبت میں مبتلا کر دینا نہایت آسان ہے بس ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ بس روز تک لگاتار اس سے یہ کہو کہ اس کے ہونٹ بہشت ہیں اس کی آنکھیں مسرت ہیں اور دوسری تمام عورتیں کھلونے ہیں گیارھویں دن وہ خود یہ کہنے لگے گی کہ اس کے ہونٹ جنت ہیں اس کی آنکھیں مسرت ہیں۔ وہ تم سے عشق کرنے لگے گی۔ یہ باتیں اکثر ہوتی ہیں شاید پیگاسف ٹھیک کہہ رہا تھا۔

ساڑھے نو بجے رودن باغ میں پہنچ گیا آسمان پر کوئی کوئی تنہا ستارا ٹمٹما رہا تھا اور سامنے سارا گھر تاریکی میں لپٹا ہوا تھا۔ کھڑکیوں میں نہایت مدھم روشنی تھی۔ رودن اپنے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس نے اپنا سانس روک رکھا تھا۔ آخرکار اسے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آ رہا تھا۔

رودن اچھل کر شالیا کی طرف بڑھا اور اس نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ لڑکی کے ہاتھ برف کی طرح سرد تھے۔ "شالیا" رودن نے سرگوشی کے انداز میں کہا "میں کل تک انتظار نہ کر سکا میں تم سے ایک راز کی بات کہنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے مجھے خود بھی یہ معلوم نہیں تھا میں تم سے محبت کرتا ہوں"

شالیا کے ہاتھ اس کے ہاتھ میں کپکپا اٹھے۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ معلوم نہ تھا کہاں میں اب تک اندھا تھا۔ ویسے میں تم سے ایک مدت سے محبت کر رہا ہوں اور تم شالیا۔۔؟"

شالیا نے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم دیکھ تو رہے ہو کہ یہاں کھڑی ہوں"

"مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے کہ نہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ۔۔۔!" اس نے سرگوشی کی۔

رودن نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر دی اور اسے اپنی طرف کھینچنا چاہا۔

"مجھے چھوڑ دو میں خوفزدہ ہوں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ کوئی میری باتیں سن رہا ہے"

"اس کی پرواہ نہ کرو۔۔۔ تم دیکھ تو رہی ہو کہ دوپہر کو میں نے اس کی بات کا جواب تک نہیں دیا"

شالیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "مجھے جانے دو"

"صرف ایک منٹ کے لئے ٹھہرو"

"تم مجھ سے خوفزدہ دکھائی دیتی ہو۔"

"نہیں۔۔۔ مجھے اب جانا چاہئے"

"ایک بات بتاتی جاؤ۔"

"تم خوش ہو نا؟" شالیا نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں دنیا کا مسرور ترین انسان ہوں۔ کیا تمہیں اس میں کوئی شک ہے"

شالیا نے اپنی گردن اوپر اٹھائی۔ اس وقت وہ بہت حسین۔۔۔ پر جذبات اور پر شباب دکھائی دے رہی تھی۔

"تو اس بات کا یقین رکھو کہ میں تمہاری ہوں"

"اے میرے خدا!" رودن کے منہ سے نکلا۔

شالیا اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر گھر کی طرف بھاگ گئی۔ رودن وہیں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔

"میں خوش ہوں" اس نے زیر لب کہا "ہاں میں بہت خوش ہوں" جیسے وہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش

کر رہا ہو۔" وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے لبوں کو جھٹکا دیا اور
تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اصطبل کی طرف بڑھا۔
اسی اثنا میں نینشسی ... نکی پیڑوں میں سے باہر نکلا
اور اس نے پیچ ہونٹ بھینچ کر اپنے آپ سے کہا "مادام ماسٹکایا
کو تمام باچلا بتانا ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ بھی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ولاتیف جب گھر پہنچا تو وہ اس قدر اداس تھا کہ اس نے
اپنی بہن کے کچھ پوچھنے پر کوئی جواب نہ دیا۔ اور فوراً کمرے میں
جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اور مادام ستہا نے فیصلہ کیا کہ
وہ اندر سے لزنف کو بلوائے اور اس سے مشورہ کرے۔ لزنف
کے یہاں سے پیغام آیا کہ وہ کل صبح آسکے گا۔"
دوسرے دن صبح کو بھی لزنف آیا اس اور کھویا کھویا سا
تھا وہ چلتے چلتے بعد کھیت پر کام کرنے کی غرض سے جانا چاہتا تھا۔
ادام ستہا کی نگاہیں اپنے بھائی کی نگاہوں سے ملیں مگر اس نے کوئی
سوال کرنے سے احتراز کیا۔ اتنے میں ایک گاڑی صدر دروازے
کے آگے آکر رکی۔"
"خدا کا شکر ہے۔" وہ بولی۔ "ضرور لزنف آیا ہوگا۔" اتنے
میں ایک ملازم اندر آیا اور اس نے رودن کی آمد کا اعلان کیا۔
"ولاتیف نے اپنی کتاب میز پر پھینک دی اور گردن اٹھا کر پوچھا
"کون؟"
"مسٹر رودن۔" ملازم نے جواب دیا۔
"ولاتیف اچھل کر کھڑا ہو گیا۔" انہیں اندر لے آؤ۔"
پھر وہ اپنی بہن سے مخاطب ہوا۔ "بہن تم ہمیں ایک لمحے کے لئے تنہا
چھوڑ دو۔"
"اس کی وجہ بعد میں بتاؤں گا۔"
"رودن کمرے کے اندر داخل ہوا۔ ولاتیف کمرے کے بیچوں بیچ
کھڑا تھا۔ اس نے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ تک نہ پیش کیا۔
مجھے یقین ہے کہ تمہیں میری آمد کی توقع نہیں ہوگی۔" رودن
نے اندر آتے ہی کہا اور اپنی ٹوپی میز پر پھینک دی۔ اس کے ہونٹ
لرز رہے تھے اور وہ بے قرار دکھائی دیتا تھا۔ اور اپنی گھبراہٹ کو
چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"بالکل نہیں۔" ولاتیف نے جواب دیا۔ "کل رات جو کچھ ہوا
ہے اس کے بعد تو مجھے تمہاری طرف سے پیغام کی توقع تھی اور یہ توقع
نہیں تھی کہ تم خود آؤ گے۔"
"اچھا۔" رودن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری
صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں۔ میں خود تمہارے پاس چل کر آیا ہوں
ایک شریف انسان کی طرح۔"
"ان صفات کے استعمال کی کیا ضرورت ہے؟"
"میں اپنی آمد کا مقصد بتانا چاہتا ہوں۔"
"ہم دونوں جانتے ہیں تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔"
"مجھے یقین ہے کہ تم میری بات پر دھیان دو گے۔"
"مجھے کچھ بھی کرنا نہیں۔" اس نے اپنی مونچھ مروڑتے ہوئے
رودن کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔
"میں تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں اور فوراً ان کی ابتدا
نہیں کر سکتا۔"
"کیوں؟"
"اس لئے کہ ایک تیسرے آدمی کا سوال بھی ہے۔"
"وہ تیسرا آدمی کون ہے؟"
"تمہیں معلوم ہے۔ سرگئے ولاتیف۔"
"نہیں دفتری لہجے وجہ میں اسے نہیں جانتا۔"
"تو تم جانتے ہو۔"
"میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ تم ادھر ادھر کی باتیں چھوڑو اور
اصل بات کرو۔"
"ولاتیف کا غصہ دم بدم تیز ہوتا رہا تھا۔"
رودن نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ "اچھا تو میں اس کا
آغاز کرتا ہوں۔"
"ویسے تمہیں اس کا اندازہ بھی ہے۔ مجھے نتالیا سے محبت
ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔"
"ولاتیف کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ خاموش رہا۔ کھڑکی کے
قریب جا کر وہ رودن کی طرف پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔"
"تم تو سمجھتے ہو۔" رودن بولا۔ "اگر مجھے یقین نہ ہوتا
تو میں یہاں۔۔۔"

"میرے خدا" — ولا تیف بیچ میں بول اٹھا — "مجھے ذرہ بھر شبہ نہیں۔"

"مبارک ہو — لیکن تم مجھے یہ خبر سنانے کیوں آئے ہو؟ مجھے اس سے واسطہ — مجھے اس کی کیا پروا ہے کہ تم کس سے محبت کرتے ہو۔ اور کون تم سے محبت کرتا ہے۔ اور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

ولا تیف کھڑکی میں سے باہر گھورتا رہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ روون اٹھ کھڑا ہو گیا۔ "یہ بھی ابھی بتاتا ہوں کہ میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے تم سے یہ راز چھپانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں تمہارا احترام کرتا ہوں۔ اسی لئے آیا ہوں۔ میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نتالیا کے لئے اپنے دل میں کیا جذبہ رکھتے ہو۔ اب جب کہ تقدیر نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں فریب سے کام نہیں لینا چاہئے۔"

ولا تیف ابھی تک سینہ پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا جیسے اپنے دل میں اٹھتے ہوئے جذبات کے طوفان کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"سرگے ولا تیف" — روون نے آگے بڑھ کر کہا — "میں نے تمہارے احساسات کو مجروح کیا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں۔ مگر مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

ولا تیف ہنسا اور بولا — "کیا تم صرف اپنی طرف سے بول رہے ہو۔ کیا نتالیا کو تمہاری اس آمد کا مقصد معلوم ہے؟"

روون ایک لمحے کے لئے حیرت زدہ رہ گیا۔ "نہیں۔ میں نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ میری ہم خیال ہے۔"

"تم اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں — میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے مکار اور سازشی خیال نہ کرو — میرے خلوص پر شبہ نہ کرو۔ ہمیں دوستوں کی طرح جدا ہونا چاہئے — مجھ سے ہاتھ ملاؤ —" یہ کہہ کر روون ولا تیف کی طرف بڑھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں" — ولا تیف روون کے روبرو ہوتے ہوئے اور ایک قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا — "میں تمہارے ارادے سے انصاف کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ارادے نیک ہیں عظیم ہیں۔ لیکن مجھ جیسا سادہ لوح شخص تمہارے ذہن کی پرواز کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ جو چیز تمہارے نزدیک پرخلوص ہے وہ میرے نزدیک خودنما ہے۔ جو چیز تمہارے نزدیک سادہ اور واضح ہے۔ وہ میرے نزدیک الجھی ہوئی اور مبہم ہے۔ مجھے معاف کیجئے میں تمہیں اپنا دوست نہیں سمجھ سکتا۔ اور تم سے ہاتھ نہیں ملا سکتا۔"

روون نے اپنی ٹوپی اٹھالی اور افسردہ لہجہ میں کہا — "اچھا تو سرگے ولا تیف خدا حافظ! میں نے تم سے غلط توقع رکھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے یہی سلوک کرنا چاہئے تھا۔ تم راستی پر ہو — الوداع! مگر مجھے تم پر اب بھی اعتماد ہے —"

"حد ہو گئی —" ولا تیف بولا — "میں نے تمہارا اعتماد حاصل کرنے کے لئے کوئی کام نہیں کیا۔ اور تمہیں بھی حق نہیں پہنچتا کہ مجھ پر اعتماد کرو۔"

روون کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔ ولا تیف نے خود کو صوفے پر گرا دیا اور دیوار کی طرف منہ کر لیا۔

اتنے میں دروازے کے باہر سے اس کی بہن کی آواز سنائی دی — "کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟"

ولا تیف نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن نہ جانے اس نے کیا سوچ کر کہا —

"ایک لمحہ کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

آدھ گھنٹے کے بعد وہ پھر دروازے تک آئی —

"لزنف آگیا ہے — کیا تم اس سے ملنا چاہو گے؟" وہ صوفے کے قریب بازو والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا —

ولا تیف کہنیوں کے بل بیٹھ گیا۔ اور اس نے اپنے دوست کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس نے روون کے ساتھ اپنی ساری گفتگو من وعن کہہ سنائی۔ — اس نے آج تک نتالیا سے اپنی محبت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی محبت چھپی ہوئی نہیں۔

"مجھے روون سے تو بہت عجیب وغریب باتوں کی توقع تھی لیکن اس کا تو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ لیکن اس بات میں بھی وہ صاف طور پر جھلکتا ہے۔

میں نے اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا ہوتا — وہ یہاں کیوں آیا؟"

"سنو میرے دوست اس کی آمد کے مقصد میں ریاکاری نہیں تھی —"

ایسا کرنا واقعی نیک دلی کا ثبوت ہے۔ وہ یہاں اپنی خوشی بیان کی ستی کرنے آیا تھا۔ اور وہ ایسے مواقع کی تلاش رہتا ہے۔ یہ ایک بہترین موقع تھا۔ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی زبان اس کی دشمن ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی زبان اس کی غلام ہی ہے۔ خادم بھی ہے۔"

ذرا اس کی ڈھٹائی تو دیکھو۔ بڑے یقین کے ساتھ یہاں آیا اور نہایت بے دھڑک ہو کر باتیں کرنے لگا۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ اس کی اس حرکت کے کیا معنی ہیں؟۔ کیا یہ فلسفہ ہے؟"

"ہاں۔۔۔ ایک طرف تو یہ فلسفہ ہے اور دوسری طرف اس کی یہ حرکت بالکل الگ مقصد رکھتی ہے۔"

میرا تو خیال ہے کہ وہ ایک بہت بڑے جھوٹ سے کام لے رہا تھا۔"

"نہیں ــــ خیر چھوڑو ــــ آؤ پائپ سلگائیں اور تمہاری بہن کو آواز دیں۔ وہ ہمیں چائے پلائے گی۔"

"ٹھیک ہے ــــ الیگزنڈر! اب اندر آ جاؤ۔" اس نے اپنی بہن کو آواز دی۔

مادام سنتھیا اندر آئی تو اس نے اپنی بہن کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور ان پر بوسہ دیا۔

رودن گھر لوٹا تو وہ ذہنی طور پر پریشان تھا۔ وہ اپنے آپ سے ناراض تھا۔ اپنے اوپر ملامت کر رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اس نے یہ بچگانہ حرکت کیوں کی۔ اس بات سے زیادہ تکلیف دہ کوئی اور بات نہیں ہوتی۔ جب اس کا آپ کو احساس ہو کہ آپ سے حماقت سرزد ہوئی ہے۔

رودن متاسف تھا ــــ "میں اس جاگیردار کے یہاں کیوں گیا۔ کس بات نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا۔"

اس اثنا میں مادام لاسنکایا کے گھر میں عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے تھے۔ گھر کی مالکن صبح سے کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پینڈلے لاسنکی ہی کو اس کے کمرے میں جانے کی اجازت تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ مادام کے سر میں درد ہے۔ رودن کو نتالیا بھی کہیں نہ دکھائی دی۔ وہ اپنی استانی بونکورٹ کے ساتھ اپنے کمرے میں تھی۔ جس وقت وہ نشست گاہ میں داخل ہوا تو اس کی مڈبھیڑ نتالیا سے ہوئی۔ اس نے اس کی طرف افسردگی سے دیکھا۔ اور رودن کا دل ٹوٹ سا گیا۔ اس کے چہرے میں ایک نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ رودن کے دل میں غلط فہمیاں سر اٹھانے لگیں۔ وہ توقف سے ملنے چلا گیا اور بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ دو گھنٹے کے بعد مادام لاسنکایا نشست گاہ میں آئی۔ وہ رودن سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملی۔ مگر اس سے الگ تھلگ رہی۔ کبھی وہ مسکراتی اور کبھی ناک بھوں چڑھاتی۔ رودن کے ساتھ وہ سرد مہری سے پیش آ رہی تھی ــــ "آخر معاملہ کیا ہے؟" رودن سوچ رہا تھا۔

اسے زیادہ دیر تک یہ سوچنا نہ پڑا۔ وہ جب اپنے کمرے میں آدھی رات کو لوٹ رہا تھا تو تاریک ڈیوڑھی میں کسی نے اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ دے دیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی الٹے پاؤں واپس جا رہی تھی۔ اس نے پہچان لیا یہ نتالیا کی خادمہ تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے نوکر کو باہر بھیج دیا اور نتالیا کا خط پڑھنے لگا ــــ

کل صبح ساڑھے چھ بجے اودیوکن تالاب کے کنارے پہنچ جانا۔ اس وقت کے سوا ملاقات مشکل ہے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی ــــ یہ انجام ہوگا ــــ ضرور آنا۔ ہمیں جلد فیصلہ کرنا چاہئے۔ اور اگر تم نہ آئے تو ہم ایک دوسرے سے مل نہ سکیں گے۔ اور ایسی حالت میں تمہیں پھر ایک رقعہ بھجواؤں گی۔

رودن سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے یہ رقعہ اپنے تکئے کے نیچے رکھ دیا۔ لباس تبدیل کیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ اسے دیر تک نیند نہ آئی ــــ ابھی پانچ بھی نہیں بجے تھے کہ وہ بیدار ہو گیا۔

اودیوکن تالاب جہاں نتالیا کو رودن سے ملنا تھا، اب تالاب نہیں رہا تھا۔ تیس سال ہوئے اس کا پانی ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس پر کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ جو ایک گڑھا بن گیا تھا۔ بس اسی سے لوگ پہچان سکتے تھے کہ یہاں کبھی تالاب تھا۔

تالاب کے کنارے ایک جوگی بابا کا گھر تھا۔ لیکن اب اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا تھا۔

اس تالاب کے بارے میں دیہاتی لوگوں میں عجیب و غریب افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ تالاب کے کنارے صنوبر کے جو دیوقامت درخت تھے ان کے نیچے لوگوں کا خیال تھا کہ بھیانک جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے یہ مقام آسیب زدہ خیال کیا جاتا تھا۔ لوگ ادھر تالاب کی طرف محض اشد ضروری کام کی غرض سے آتے تھے ورنہ ادھر سے دور ہی رہتے تھے نتالیا نے جان بوجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

سورج آسمان میں کافی بلند ہو چکا تھا جب رودن ویرکن تالاب پر پہنچا تو یہ ایک بے کیف صبح تھی۔ آسمان میں دو دھیا رنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ رودن وہاں ٹہلنے لگا۔ وہ بہت بے قرار اور مضطرب تھا۔ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ انجام قریب ہے۔ ادھر رودن ٹہل رہا تھا اور ادھر نتالیا تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی تالاب کی طرف بڑھ رہی تھی —— سینیڈ موازیل آپ کے پاؤں بھیگ جائیں گے۔ اس کی خادمہ بار بار اسے خبردار کر رہی تھی۔

نتالیا اس کی آواز پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔

"سینیڈ موازیل کیا ہو؟ اگر لوگ ہمیں یہاں دیکھ لیں گے۔ اگر سینیڈ موازیل پولن کورٹ ہمارے ساتھ ہوگئیں تو کیا ہوگا۔" —— مونیور رودن —— ملازمہ کی رودن پر نگاہ پڑی —— "وہ اس طرح سامنے کیوں کھڑے ہیں؟ وہ کہیں چھپ کیوں نہیں گئے؟"

"ماشا تم یہاں ٹھہرو" —— نتالیا نے اپنی پریشان خادمہ سے کہا ——

رودن نتالیا کی طرف بڑھا اور اس کے چہرے کے آثار دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ نتالیا کے ابروؤں پر بل تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں میں سنجیدگی کی جھلک تھی۔

"دمتری نکولائیوچ ہمیں وقت نہیں ضائع کرنا چاہئے۔ میں صرف چند منٹوں کے لئے یہاں آئی ہوں۔ میں تمہیں بتا دوں۔ میری والدہ کو سب باتوں کا علم ہے۔ پینڈے لافکی ہماری نگرانی کرتا رہا ہے۔ وہ اماں کا جاسوس ہے۔ اس نے کل مجھے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔"

"او میرے خدا" رودن کے منہ سے نکلا۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔ تمہاری اماں نے کیا کہا۔؟"

"وہ مجھ سے ناراض نہیں ہے۔ اور اس نے مجھے ڈانٹ بھی نہیں پلائی۔ صرف اتنا کہا کہ میں بچوں کی طرح عمل کر رہی ہوں۔"

"بس؟"

"ہاں —— اور یہ کہا کہ اگر میں تم سے شادی کر دوں گی تو وہ ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لے گی۔"

"کیا انہوں نے یہ کہا تھا؟"

"ہاں —— اور میری اماں نے یہ بھی کہا تھا کہ تم مجھ سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ تم مجھ سے محبت کی پینگ محض اس لئے بڑھا رہے ہو کہ تم بے کیفی محسوس کر رہے ہو اور انہیں اس بات کی تم سے توقع نہیں تھی ——"

نتالیا کا لہجہ نہایت پھیکا تھا۔

"تم نے ان سے کیا کہا نتالیا؟"

"میں نے اس سے کیا کہا؟" نتالیا نے اس کا سوال دہرایا اور کہا۔ "تم اب کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"او میرے خدا —— کس قدر ظلم ہے۔ کیا تمہاری والدہ بہت ناراض تھیں؟"

"ہاں —— وہ تو تمہارا نام تک سننا نہیں چاہتیں۔"

"او، کس قدر ظلم ہے۔ پھر تو کوئی امید نہیں؟"

"کوئی نہیں ——"

"نتالیا تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں میرا سر چکرا رہا ہے —— مجھے صرف یہ خوشی ہے کہ تم کس قدر پُرسکون ہو ——"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں خود پریشان نہیں ہوں؟"

رودن نے ٹہلنا شروع کر دیا —— "تمہاری والدہ نے سوالات تو نہیں کئے ——؟"

"ہاں —— اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں کہ نہیں ——"

"تو تم نے کیا جواب دیا؟"

نتالیا ایک لمحہ کے لئے رکی اور بولی —— میں اس سے جھوٹ نہیں بول سکی ——

"تم کتنی نیک دل اور پاک دامن ہو —— لڑکی کا دل شاندار ——

ہونا ہوتا ہے۔ کیا تمہاری والدہ ہماری شادی کے سخت خلاف ہیں؟"

"وہ تمہیں بتا چکی ہوں۔ اسے یقین ہے کہ تم مجھ سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔"

"وہ مجھے دغاباز سمجھتی ہیں۔ میں نے کیا گناہ کیا ہے؟" رودن نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"دفع کرو اسے۔ ہم وقت ضائع کر رہے ہیں —" ثالیا بولی۔ "یہ بات یاد رکھو کہ میں پھر کبھی تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی۔ میں یہاں رونے اور شکوہ کرنے کے لئے نہیں آئی۔ میں تم سے مشورہ کرنے آئی ہوں۔"

"میں تمہیں کیا مشورہ دے سکتا ہوں ثالیا؟"

"کیا مشورہ دے سکتے ہو —؟ تم مرد ہو — مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ میں آخری دم تک تم پر بھروسہ کروں گی — مجھے بتاؤ تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

"میرا ارادہ —— تمہاری اماں مجھے گھر سے نکال دیں گی۔"

"ہو سکتا ہے۔ وہ کل مجھے بتا چکی کہ وہ تم سے کوئی واسطہ نہیں رکھے گی۔"

"مگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"یہی کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔"

"ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔"

"ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟" رودن نے پھر اس کا سوال دہرایا۔ "ہمیں پیچھے ہٹ جانا چاہیئے۔"

"پیچھے ہٹ جانا چاہیئے" ثالیا نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ اور اس کے ہونٹ سفید ہو گئے۔

"ہاں قسمت کے آگے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں۔ ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ ٹھیک ہے کہ میں کام کر سکتا ہوں۔ لیکن میں اگر امیر بھی ہوتا تو کیا میں تمہاری والدہ کے غصہ کی تاب لا سکتا تھا۔ کیا میں تمہارے کہنے سے اس طرح الگ ہو سکتا تھا؟ نہیں ثالیا۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنا تقدیر میں نہیں لکھا تھا۔ اور ہم نے کتنی بڑی مسرت کا خواب دیکھا تھا۔"

ثالیا اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"ثالیا، عزیز از جان ثالیا —" وہ چلا یا۔ "اس طرح کیوں روتی ہو — مجھے کیوں کرب و اذیت سے دوچار کرتی ہو — اپنے آپ کو ذرا سنبھالو۔"

ثالیا نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ "تم مجھے مشورہ دے رہے ہو کہ میں چپ ہو جاؤں؟"

اس نے کہا۔ "میں اس بات کے لئے آنسو نہیں بہا رہی ہوں جس کے بارے میں تم سوچ رہے ہو — مجھے اس بات پر رنج ہو رہا ہے کہ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی — میں اس وقت یہاں تم سے مشورہ لینے آئی تھی، اور تم سب سے پہلی بات مجھ سے یہ کہہ رہے ہو کہ میں ہتھیار ڈال دوں۔ کیا تم آزادی اور راستہ کے بارے میں تم اپنے خیالات کو یونہی عمل میں لاتے ہو؟"

پہلو بدل کر اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

"لیکن ثالیا —" رودن نے ذرا شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ "یاد رکھو کہ میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔"

تم نے مجھ سے ابھی پوچھا تھا کہ میں نے اپنی والدہ کو کیا جواب دیا۔ جب اس نے یہ کہا تھا کہ میں نے اگر تم سے شادی کی تو وہ ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لے گی۔ اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں نے اسے کیا جواب دیا۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ اگر کسی دوسرے شخص سے میری شادی کی گئی تو میں اس دنیا میں نہیں رہوں گی۔ اب میں سوچتی ہوں کہ میری والدہ ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ کہ تم میری طرف اس لئے متوجہ ہو کہ تم یہاں بے کیفی محسوس کر رہے ہو۔"

"ثالیا میں قسم کھاتا ہوں —" میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ — — —"

لیکن ثالیا نے رودن کی بات سننے سے انکار کر دیا۔

"مگر تم نے مجھے روکا کیوں نہیں؟ مجھے شرم آ رہی ہے۔ خیر اب تو بات ہی ختم ہو گئی۔"

"ذرا صبر سے کام لو — ہم دونوں کو مل کر سوچنا چاہیئے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"تم بہت باتیں کرتے رہے ہو۔ اگر تم نے اس وقت مجھ سے یہ کہا ہوتا کہ ثالیا میں تم سے محبت کرتا ہوں مگر تم سے شادی نہیں کر سکتا — لاؤ مجھے اپنا ہاتھ دو اور میرے ساتھ چلو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں

کہیں تمہارے ساتھ چل پڑتی۔ میں ہر بات کے لئے تیار ہو کر آئی تھی۔ لیکن بات اور عمل میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

رودن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نتالیا کے بے باک الفاظ نے اس پر بہت اثر کیا۔ نتالیا کے آخری جملے نے اس کی خود پسندی پر بھرپور ضرب لگائی۔

"نتالیا اس وقت تم اپنے آپے میں نہیں ہو۔ تم نہیں جانتیں کہ اس وقت تم کس قدر سنگدلی کے ساتھ مجھے رنج پہنچا رہی ہو۔ مگر وقت آئے گا جب تم میرے ساتھ انصاف کرو گی۔ اس وقت تمہاری سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ اس مسرت کو ترک کرتے ہوئے کیا قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے:

شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر میں نے تم پر اعتبار کیا۔ آئندہ بات کرنے سے پہلے تولا کرو۔ جب میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے تو اس بات کے مفہوم کو میں جانتا تھا۔ میں ہر بات کے لئے تیار تھی۔ ویسے جو سبق تم نے مجھے دیا ہے میں اس کے لئے تمہاری شکر گزار ہوں الوداع!"

"ٹھہرو خدا کے لئے ٹھہرو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں میں نے تمہاری نفرت کا ہدف بننے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں قسم کھاتا ہوں تم ذرا میری جگہ لے کر سوچو میں تمہارے اور اپنے دونوں کے لئے فکر مند ہوں۔ اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو میں نے فوراً یہ پیشکش کی ہوتی کہ آؤ بھاگ چلیں جلد یا بدیر تمہاری والدہ نے ہمیں معاف کر دیا ہوتا۔ لیکن اپنی مسرت کے بارے میں سوچنے سے پہلے میں نے ..... وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"تم یہ ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے ہو کہ تم ایک باعزت شخص ہو"

نتالیا بولی "مجھے اس بارے میں ذرہ بھر شک نہیں۔ لیکن کیا میں تمہاری جانب سے اس ثبوت کے لئے یہاں آئی ہوں؟

"نتالیا مجھے خیال نہیں تھا کہ"

"آہ آخر تم نے وہ بات کہہ دی نا" تمہیں یہ خیال نہیں تھا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا" گھبراؤ نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔ اور میں خود کو تم پر ٹھونسنا نہیں چاہتی"

"مجھے تم سے محبت ہے --- رودن بولا"

نتالیا تن کر کھڑی ہو گئی --- "ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ محبت کہاں ہے؟

شاید تمہیں اپنے الفاظ یاد ہوں۔ مکمل مساوات کے بغیر محبت ہو ہی نہیں سکتی تم مجھ سے بلند درجہ رکھتے ہو۔ میرا اور تمہارا کوئی مقابلہ نہیں۔ میری یہی سزا تھی۔ مجھے یہ دن یاد رہے گا۔ خدا حافظ"

"نتالیا تم جا رہی ہو؟ کیا ہمیں اسی طرح ایک دوسرے سے جدا ہونا تھا؟"

اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ نتالیا رک گئی۔ رودن کی التجا نے اس کے ارادے کو متزلزل کر دیا تھا۔

"نہیں" وہ بولی "مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی چیز میرے اندر ٹوٹ گئی ہے۔ میں یہاں آئی اور تم سے اس طرح باتیں کرتی رہی جیسے مجھے ہوش آ جانا چاہئے۔ جب میں یہاں آئی تو میں اپنے گھر کو اپنے تمام ماضی کو خیرباد کہہ کے آئی تھی۔ لیکن میری یہاں کس سے ملاقات ہوئی! ایک کمزور اور ناتواں دل سے۔ تمہیں یہ وہم کیونکر ہوا کہ میں اپنے کنبے کو نہیں چھوڑ سکتی۔ کیا تم واقعی دفتری رودن ہو۔ اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہوتی تو میں نے اسے بھی محسوس کر لیا ہوتا۔ مگر نہیں --- اچھا خدا حافظ۔!"

وہ مڑی اور اپنی خادمہ ماشا کی طرف دوڑی۔ ماشا بڑی دیر سے اسے اشارے کر رہی تھی۔

"تم بزدل ہو نتالیا۔ میں بزدل نہیں ہوں --- رودن زور سے چلایا۔ اس کی طرف کوئی توجہ نہ کرتے ہوئے نتالیا کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی گھر کی طرف بڑھتی رہی۔ اپنی خوابگاہ میں پہنچ کر اسے چکر سا آیا اور وہ اپنی خادمہ ماشا کے بازوؤں میں جا گری۔

رودن اس تالاب کے پاس دیر تک گھومتا رہا اور پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ بہت شرمندہ اور مضطرب تھا "کیا لڑکی ہے! وہ سوچ رہا تھا" اور عمر میں اٹھارہ برس سے زیادہ نہیں۔ نہیں میں اسے پہچان ہی نہ سکا۔ حیرت انگیز لڑکی ہے۔ کیا قوت ارادی رکھتی ہے "وہ ٹھیک کہتا ہے" میں اس کی محبت کا مستحق نہیں ہوں"

اور گھوڑوں کی گاڑی نے اسے چونکا دیا۔ گاڑی میں لژنف تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کو سر کے جنبش سے سلام کیا۔ رودن جلد راستہ کاٹ کر بادام دار سنکا یا کے گھر کی طرف چل دیا۔

لژنف نے اسے گزر جانے دیا۔ وہ ایک لمحے کے لئے اس کی طرف

بیٹھا رہا اور پھر وہ ولاتیف کے مکان کی طرف چل پڑا جہاں اس نے
رات بسر کی تھی۔ اس نے ولاتیف کو سویا ہوا پایا۔ اس نے ملازموں کو
تنبیہ کی کہ وہ اسے سویا ہوا رہنے دیں اور پیچھے بیٹھ کر وہ سگار
پینے لگا اور جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔

ولاتیف دس بجے بیدار ہوا۔ کمرے میں لزنف کو بیٹھا ہوا پاکر
وہ بہت حیران ہوا۔ اس نے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔
"کیوں کیا بات ہے؟ تم تو گھر جا چکے تھے"
"نہیں راستے میں مجھے رودن مل گیا۔ وہ کھیت میں تنہا تھا اور
بہت مضطرب نظر آرہا تھا۔ اس لئے میں یہاں لوٹ آیا۔"
"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم یہاں اس لئے لوٹ آئے کہ تمہیں
راستے میں رودن مل گیا تھا؟"
"ہاں سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں یہاں
کیوں لوٹ آیا۔ شاید اسے دیکھ کر مجھے تم یاد آگئے۔ یا شاید اس لئے
کہ مجھے گھر جانے کی جلدی نہیں۔"
ولاتیف مسکرایا "ٹھیک ہے تم ان دنوں جب بھی اپنے
بارے میں سوچتے ہو تو تمہیں رودن کا بھی خیال آجاتا ہے" پھر
اس نے زور سے چلا کر کہا "کوئی ہے؟ ذرا چائے کے لئے آؤ"
دونوں دوست چائے پینے لگے۔ لزنف نے کاروباری باتیں
شروع کردیں۔
ولاتیف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اب میں زیادہ برداشت نہیں
کرسکتا۔ میں رودن کو مبارزت کی دعوت دوں گا۔ یا تو خود گولی کا
نشانہ بن جاؤں گا یا اس کے فلسفے سے لبریز سر میں گولی سے چھید
کردوں گا۔"
"خدا کے لئے چپ رہو بھی۔ کیوں اتنا چلاتے ہو۔ میرے منہ سے تو میرا
پائپ گر چلا تھا۔ یہ تمہیں یک بیک کیا ہوگیا؟"
"میں اب اس کا نام نہیں سن سکتا۔ میرا خون کھولنے لگتا ہے۔"
"تمہیں شرم آنی چاہئے۔ کیا احمقانہ باتیں کر رہے ہو۔"
"نہیں اس شخص نے میری توہین کی ہے۔ میں اس فلسفی
کو گولی سے اڑا دوں گا۔"
"اس کا فائدہ؟ تم اس وقت اپنے آپ میں نہیں ہو کیا اس طرح
تمہارا معاملہ سلجھ جائیگا۔"
ولاتیف اپنی کرسی میں جاگرا "میں یہاں سے کہیں چلا جاؤں
گا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں"
"تم کہہ رہے ہو کہ تم یہاں سے کہیں چلے جاؤ گے۔ میرا بھی
خیال ہے کہ تمہیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔ آؤ ہم دونوں کہیں دور نکل جائیں۔
کاکیشیا چلیں یا پھر سیر کریں۔"
"اور اپنی بہن کو یہاں چھوڑ جاؤں؟"
"نہیں۔ مادام تمہارا بھی ہمارے ساتھ چل سکتی ہے۔ میں وعدہ
کرتا ہوں کہ ان کی نگہداشت کروں گا۔ وہ صرف ایک مرتبہ ہاں کر دیں
پھر تو میں ہر رات کو ان کی کھڑکی کے نیچے باجا بجانے کے لئے پہنچ جایا کروں
گا۔ گاڑی بان کو عطر میں نہلا دوں گا۔ اور پوری سڑک پر پھول بچھا دیا
کروں گا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میرے دوست ہم دونوں کا نیا جنم ہوگا۔
اور جب ہم واپس آئیں گے تو ہماری توند نکلی ہوئی ہوگی۔"
"بس تم تو مذاق کر سکتے ہو۔"
"نہیں مذاق نہیں کر رہا۔ تمہیں واقعی ایک نہایت اچھا
مذاق سوجھا ہے۔"
"وہ سب واہیات ہے۔ میں اس سے مبارزت لڑوں گا۔"
"پھر وہی بات۔"
اتنے میں ایک خادم اپنے ہاتھ میں ایک خط لئے ہوئے
اندر آیا۔
"یہ کس کا خط ہے؟" لزنف نے پوچھا۔
"موسیو رودن کا ۔۔۔ مادام لاسنسکایا کا ملازم ابھی
ابھی لایا ہے۔"
"رودن کا؟" ولاتیف نے پوچھا "کس کے
نام ہے؟"
"آپ کے لئے حضور!"
"میرے لئے ۔۔۔ لاؤ ادھر لاؤ۔"
ولاتیف نے جھپٹ کر وہ خط ملازم کے ہاتھ سے لے لیا اور تیزی
کے ساتھ لفافہ چاک کیا اور عبارت پڑھنے لگا۔ لزنف غور سے اس کی
طرف دیکھتا رہا۔ ولاتیف کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔
"کیا لکھا ہے؟" لزنف نے سوال کیا۔

"خود ہی پڑھ لو ۔۔" دالتیف نے وہ خط اپنے دوست کو دیدیا لزنف نے پڑھنا شروع کیا ۔ رودن نے لکھا تھا ۔

پیارے دالتیف!

میں آج مادام لاسنکایا کا مکان چھوڑ کر جا رہا ہوں اور ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں ۔ تمہیں حیرت ہو گی ۔ خاص طور پر کل کے واقعہ کی وجہ سے میں تمہیں اپنی روانگی کی اطلاع دینا ضروری خیال کرتا ہوں ۔ تم مجھ سے ناراض ہو اور مجھے ایک بدنام شخص خیال کرتے ہو ۔ میں اپنی صفائی پیش نہیں کرنا چاہتا ۔ یہ تو وقت کریگا ۔ جو شخص بھی مجھے جانتا ہے وہ مجھے معاف کر دے گا ۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی ہے ۔ تم ایک ایماندار شخص ہو ۔ ہاں تو میں جا رہا ہوں اور تمہاری مسرت کا خواہاں ہوں ۔ ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے پر تم میرے بارے میں اپنی رائے کو تبدیل کر لو ۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم پھر کبھی مل سکیں گے بھی کہ نہیں ۔ اس کے باوجود میں ہمیشہ تمہارا دوست رہوں گا ۔ دمتری رودن ۔۔"

نوٹ :۔ جو دو سو روبل تمہارے مجھے دینا ہیں وہ میں اپنے گاؤں پہنچتے ہی بھیج دوں گا ۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم اس خط کا مادام لاسنکایا سے ذکر نہ کرنا ۔ ایک درخواست اور بھی ہے کہ نتالیا سے کبھی اس بات کا ذکر نہ کرنا کہ میں تم سے ملنے آیا تھا ۔

"کیوں ؟ اس خط کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے ۔ ؟"

دالتیف نے لزنف سے پوچھا جس نے خط پڑھ لیا تھا ۔

"کوئی کیا کہہ سکتا ہے " لزنف نے کہا " کوئی مشرقی انداز میں ماشاءاللہ کرنے اور دانتوں میں انگلی دبانے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے " وہ جا رہا ہے اچھا ہوا " جان بچی لاکھوں پائے عجیب بات تو یہ ہے کہ اس نے تمہیں خط لکھنا اپنا فرض سمجھا ۔ اس قسم کے حضرات جو بھی قدم اٹھاتے ہیں وہ ایک فرض ہوتا ہے ۔ ان کے ذمہ کوئی نہ کوئی قرض ہوتا ہے یا کوئی نہ کوئی فرض ۔" اس نے خط کے آخری حصہ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا ۔

ذرا دیکھو تو کیا جملے لکھے ہیں ۔

لزنف نے کوئی جواب نہ دیا ۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کی جھلک تھی ۔

دالتیف اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔ میرا خیال ہے کہ مجھے مادام لاسنکایا کے یہاں جانا چاہئے ۔ مجھے جا کر اس خط کا مطلب بتا دینا چاہئے ۔"

"میرے دوست ، صبر سے کام لو ۔ اسے وقت دو کہ وہ یہاں سے چلا جائے ۔"

"وہ یہاں سے غائب ہو رہا ہے " تم اور کیا چاہتے ہو؟ اس سے تو زیادہ اچھا ہے کہ جا کر سو رہو ۔ تم ساری رات کروٹیں بدلتے رہے ہو گے ۔ لیکن اب تمہارا معاملہ سلجھ رہا ہے "

تمہیں یہ خیال کیوں پیدا ہو رہا ہے ؟"

"صاف ظاہر ہے ۔۔۔ جاؤ جا کر سو رہو ۔ اور میں تمہاری بہن کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا ہوں ۔"

"سونے کو میرا جی نہیں چاہتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ میں ذرا کھیتوں کا جا کر ایک چکر لگا لوں ۔"

"خیال تو برا نہیں ۔"

اس کے بعد لزنف مادام سنہا کے کمرے کی طرف بڑھا ۔

لزنف نے مادام سنہا کو نشست گاہ میں پایا ۔ مادام سنہا نے خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا ۔ وہ اسے دیکھ کر ہمیشہ خوش ہوتی تھی ۔ مگر آج اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے ۔ وہ کل رودن کی آمد کے وقت سے پریشان تھی ۔

"میرے بھائی سے ملے ہو ۔ آج اس کی طبیعت کیسی ہے ؟"

"ٹھیک ہے ۔۔ وہ کھیتوں کی طرف گیا ہے ۔ مادام سنہا ایک لمحے کے لئے خاموش رہی پھر اس نے اپنے رومال کے کنارے سے جھانکتے ہوئے کہا ۔۔" کیا تمہیں رودن کی آمد کا ۔۔"

مقصد معلوم ہے ۔۔" لزنف نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا "

ہاں! وہ خدا حافظ کہنے آیا تھا ۔

"خدا حافظ کہنے آیا تھا ؟"

"ہاں! کیا تم نے سنا نہیں ۔۔۔ وہ مادام لاسنکایا کے یہاں سے جا رہا ہے "

"جا رہا ہے ؟"

"ہاں اور ہمیشہ کے لئے "

"میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا "

"یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں — میرا خیال ہے کہ ان دونوں کے درمیان معمولی سی بات ہوئی ہے۔ اس نے ساز کے تار کو ذرا زیادہ کس دیا ہوگا۔ اور وہ تار ٹوٹ گیا"

"تم کن معنوں میں بات کر رہے ہو — ہمیشہ مذاق اچھا نہیں ہوتا"

"مذاق کون کر رہا ہے۔ میں کہہ تو رہا ہوں کہ وہ جا رہا ہے۔ اس نے اپنی روانگی کی تحریری اطلاع بھیجی ہے۔ چلو اچھا ہوا کہ وہ جا رہا ہے۔ مگر اس کی روانگی نے ایک بے نظیر تجویز کو تہہ و بالا کر دیا ہے جس پر میں تمہارے بھائی کے ساتھ بحث کر رہا تھا"

"وہ کیا تجویز تھی؟"

"میں نے تمہارے بھائی کو مشورہ دیا تھا کہ یہاں سے کہیں دور تفریح کی غرض سے چلا جائے اور تمہیں بھی اپنے ساتھ لیجایا جائے اور میں نے تمہاری دیکھ بھال کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لی تھی۔"

"خوب میں جانتی ہوں جس طرح تم میری دیکھ بھال کرو گے میں اس سے واقف ہو گئی ہوں"

"تم دراصل مجھے جانتی نہیں ہو" تم سمجھتی ہو کہ میں پتھر کی مورت ہوں۔ لیکن تمہیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ میں کسی لڑکی کی طرح پگھل سکتا ہوں اور کئی دن اپنے گھٹنوں کے بل گزار سکتا ہوں"

اتنا کہہ کر لزنف اٹھا اور مادام سنہا کے آگے گھٹنوں کے بل جھک گیا — پھر آہستگی سے بولا — "مجھے جاننا چاہتی ہو تو مجھ سے شادی کر لو"

"کیا کہا — ؟"

"وہی جو میں ایک مدت سے کہنا چاہتا تھا — اور میں کہہ چکا ہوں"

میں اس وقت تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تاکہ تم سوچ سکو میں تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں" میں جا رہا ہوں۔ اور اگر تمہیں میری یہ پیشکش منظور ہو تو مجھے بلوا بھیجنا"

مادام سنہا نے لزنف کو روکنا چاہا۔ لیکن وہ تیزی سے مڑ کر جا چکا تھا۔ جب وہ باغ میں سے گزر رہا تھا۔ تو اس کے سر پر ٹوپی بھی نہیں تھی۔ اتنے میں ایک خادمہ نے آواز دی — "مونیور لزنف مالکن تم سے ملنا چاہتی ہیں"

لزنف تیزی کے ساتھ مڑا۔ اس نے خادمہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور حیران و ششدر خادمہ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور پھر وہ مادام سنہا کے کمرے کی طرف بڑھا۔

لزنف سے منہ پھیر کے جب رودن گھر لوٹا تو اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا اور اس نے دو خط لکھے ایک تو والنیتف (جس سے آپ واقف ہیں) اور دوسرا نتالیا کے نام۔ دوسرے خط کو تحریر کرتے ہوئے اس نے زیادہ وقت لیا۔ اس خط میں اسے بہت کچھ کاٹنا پڑا۔ اور بہت کچھ دوبارہ لکھنا پڑا۔ اس خط کو پھر ہونے از سر نو صاف کیا اور اپنی جیب میں رکھ لیا — انتہائی افسردگی کے عالم میں وہ اپنے کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ پھر کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ اور اپنی ہتھیلیوں پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر سوچنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ پھر وہ اٹھا اس نے اپنے کوٹ کے بٹن لگائے اور نوکر کو آواز دی۔ نوکر کمرے میں آیا تو اس نے اس سے کہا کہ وہ مادام لاسنکایا کے پاس جائے اور جا کر پوچھے کہ وہ کب اس سے مل سکتی ہیں۔

نوکر جلد ہی واپس آ گیا اور اس نے اطلاع دی کہ مادام اس کی منتظر ہیں۔

مادام لاسنکایا رودن سے اپنے دارالمطالعہ میں ملی۔ اس وقت مادام لاسنکایا تنہا نہیں تھی۔ پینڈے لافکی اس کی بغل میں بیٹھا تھا۔

مادام لاسنکایا نے رودن کا بڑی شائستگی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ رودن بھی سر جھکا کر آداب بجا لایا۔ مگر اس کے چہرے کی طرف ایک ہی نگاہ کسی بھی طالب علم کو یہ بتا سکتی تھی کہ ان دونوں کے درمیان کوئی ناخوشگوار واقعہ گزر چکا ہے۔ رودن جانتا تھا کہ مادام لاسنکایا ناراض ہے۔

پینڈے لافکی نے جو راز مادام لاسنکایا کو بتایا تھا اس سے مادام کے اندر ایک عظیم خاتون بیدار ہو گئی تھی۔ اسے اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ رودن جیسا مفلس بے بضاعت اور گمنام شخص اس کی بیٹی پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ دایا ماجیلو تنا لاسنکایا کی بیٹی پر۔

"ٹھیک ہے کہ وہ ایک ذہین اور ہوشیار شخص ہے" وہ اپنے آپ سے کہتا رہا تھا "مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں ایک ذہین مگر قلاش شخص میرا داماد بن جائے"

"مجھے تو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا۔ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ آدمی اپنی حیثیت اور اپنے مقام کو بھول جاتا ہے۔ پینڈے لافسکی نے مادام کے غصے کو ہوا دی تھی۔

برہمی کے عالم میں مادام نٹالیا پر بھی خوب برسی تھی۔

مادام لاسنکایا نے رودن کو بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ سابقہ رودن سے نہیں جو گھر کا مالک بن گیا تھا جو ایک پرانا دوست تھا۔ بلکہ ایک نئے رودن سے اب جس کی حیثیت ایک اجنبی مہمان سے زیادہ نہیں تھی۔

"مادام میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں" رودن نے گفتگو کا آغاز کیا "میں آپ کا مہمان نوازی کے لئے شکرگزار ہوں۔ میرے گاؤں سے میرے نام خط آیا ہے اور میں آج جا رہا ہوں"

مادام لاسنکایا نے لاپروائی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور اپنے جی میں کہا "وہ بھانپ گیا ہے۔ چلو اچھا ہوا نہیں تو مجھے یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا ہوتا"

"کیا واقعی جا رہے ہو؟" اس نے بلند آواز میں کہا "خیر اگر تمہیں ضرور جانا ہے تو پھر میں تمہیں کیونکر روک سکتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سردیوں میں تم سے ماسکو میں ملاقات ہوگی۔

"میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا مادام۔ شاید میں ماسکو نہ جا سکوں۔ ہاں اگر مجھے ذرائع میسر آئے تو پھر میں ماسکو میں شرف ملاقات ضرور حاصل کروں گا۔

پینڈے لافسکی جی ہی جی میں سوچ رہا تھا "میرے دوست کل یہاں تمہارا راج تھا۔ اور آج تم کس انداز میں بات کر رہے ہو"

"کیا تمہارے گاؤں سے کوئی بری خبر آئی ہے؟"

"ہاں"

"شاید فصل اچھی نہیں ہوئی۔؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں۔ بہرحال میں تمہارا ممنون ہوں" یہاں میرا بہت اچھا وقت گزرا"

"میں بھی اپنی اس ملاقات کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ کب جا رہے ہو؟"

"آج دوپہر کو کھانے کے بعد"

اس قدر جلد۔ خیر میری خواہش ہے کہ تمہارا سفر اچھی طرح کٹے اور اگر تمہارے گھریلو امور تمہیں جلد فارغ کر دیں تو تم ہمیں یہیں پاؤ گے"

"میں شاید نہ آسکوں" رودن نے اٹھتے ہوئے کہا "ہاں میں آپ کا اس وقت قرض ادا نہیں کر سکتا۔ مگر"

"مگر سنیئے تو سہی"

"چھوڑو بھی دمتری تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا وقت ہوگیا؟"

پینڈے لافسکی نے اپنی سونے کی گھڑی واسکٹ کی جیب سے نکال کر جواب دیا

"دو بجکر ۲۳ منٹ ہو چکے ہیں"

"اچھا تو میں ذرا اپنا لباس تبدیل کر دوں۔ خدا حافظ دمتری"

رودن کمرے سے باہر آگیا۔ مادام لاسنکایا اور اس کے درمیان تمام بات چیت ایک خاص نوعیت کی تھی۔ اداکار اسطرح اپنے پارٹ کی مشق کرتے ہیں۔ یا پھر سیاست دان کانفرنس میں پہلے ہی سے تیار رکھے گئے جملوں کا تبادلہ کرتے ہیں"

رودن اپنے تجربے سے یہ بات جانتا تھا کہ اونچی سوسائٹی کے لوگ نہ صرف ایک شخص کو اپنے حلقے سے بڑی آسانی کے ساتھ نکال باہر کرتے ہیں۔ بلکہ جب ضرورت ہوتی ہے تو اسے اپنے دستانے کی طرح ناچ کے بعد گرا دیتے ہیں جیسے وہ دستانہ لاٹری کا ٹکٹ ہو۔ جس کا انعام نہ نکلا ہو"

رودن نے اپنا سامان عجلت کی ساتھ باندھا اور اپنی روانگی کے لمحوں کا انتظار کرنے لگا۔ گھر میں ہر شخص اس کی یک بیک روانگی پر حیران تھا۔ ملازم بھی اس کی طرف پریشانی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

بیس توف تو خاص طور پر اداس تھا۔ نٹالیا اسے قطعی طور پر نظرانداز کر رہی تھی۔ تاہم رودن اس کے ہاتھوں اپنا خط دینے میں کامیاب ہوگیا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت مادام لاسنکایا نے ایک دفعہ پھر اپنی یہ بات دہرائی کہ ماسکو جانے سے پہلے شاید اس سے پھر ملاقات ہوگی مگر رودن نے کوئی جواب نہ دیا۔ پینڈے لافسکی نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ ایک سے زیادہ مرتبہ رودن کا جی چاہا کہ وہ اس پر جھپٹ پڑے اور اس کے گلابی اور صحت مند چہرے کو نوچ ڈالے مادموازیل بونکورٹ کنکھیوں سے رودن کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو "اب تمہارے ساتھ کتنا برا سلوک کیا جا رہا ہے"

آخر وہ چلا گیا۔ اور رودن کے لئے گاڑی گھر کے احاطے میں
آگئی۔ اس نے عجلت کے ساتھ سب سے رخصت طلب کی۔ اس کے دل پر
ایک بوجھ سا تھا اور وہ ملول تھا۔ اسے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ اسکو
اس انداز میں یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے
وہ گھر سے نکالا جا رہا ہو۔ کیا اچھی صورت حال ہے۔ میں نے
ایسا کیوں کیا؟ خیر جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔
جس نے نتالیا کی طرف آخری نگاہ ڈالی۔ اور اس کا دل ڈوب گیا۔
اس کی آنکھوں میں [illegible] کی جھلک اس کے لئے سرزنش سے کم نہیں تھی۔
وہ تیزی کے ساتھ سیڑھیوں پر سے اترا اور گاڑی کی طرف دوڑا
لیس نوف اسے رخصت کرنے کے لئے آگے بڑھا اور کود کر گاڑی
میں بیٹھ گیا۔

گاڑی جب احاطے سے گزری اور صنوبر کے پیڑوں والی سڑک
پر آگئی تو رودن بولا "تمہیں یاد ہو گا جب کوان کوف نازک جیسی
کے بارے باہر نکلا تھا تو اس نے دریا [illegible] سے کہا تھا "آزادی ایک
بے نظیر تحفہ ہے جو خدا نے انسان کو عطا کیا ہے۔ وہ شخص بہت خوش
ہے۔ جسے خدا روٹی کا ایک نوالہ دیتا ہے اور وہ شخص خدا کے
سوا کسی اور کا ممنون نہیں۔ جو بات ڈوان کوکسزاٹ نے اس وقت
محسوس کی تھی۔ میں اب محسوس کر رہا ہوں۔ خدا کرے پیارے
لیس نوف کہ تمہیں بھی اس تجربے سے ایک دن گزرنا پڑے"۔
لیس نوف بہت متاثر ہوا۔ اس نے رودن کا ہاتھ
اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ اس وقت لیس نوف کا دل اس کے
سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ راستہ بھر رودن انسان کے
وقار کی اور سچی آزادی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ بڑی ایمانداری
اور تقدس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اور جب رخصت کے وقت آیا
تو لیس نوف نے رودن کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور سرد آہیں
بھرنے لگا۔ رودن کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ وہ لیس نوف
سے جدا ہونے کی خاطر آنسو نہیں بہا رہا تھا۔ یہ اس کی خود نمائی کے
آنسو تھے۔

نتالیا اپنے کمرے میں آکر رودن کا خط پڑھنے لگی۔
"پیاری نتالیا! اس نے لکھا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں
یہاں سے چلا جاؤں۔ میرے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اس سے
پہلے کہ مجھ سے یہ کہا جاتا کہ یہاں سے چلے جاؤ میں جا رہا ہوں۔
میری روانگی کے بعد حالات معمول پر آجائیں گے۔ اور
کوئی مجھے یاد بھی نہیں کرے گا۔ اور کوئی مجھے کیوں یاد کرے؟
یہ ایک حقیقت ہے پھر بھی میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ نہ جانے
کیوں؟ میں تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہوں اور میرے لئے
یہ بات بڑی اندوہناک ہو گی۔ اگر تم میرے بارے میں کوئی برا خیال
رکھو گی۔ اسی لئے میں تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میں اس وقت اپنی
صفائی میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اور کسی دوسرے پر کوئی الزام بھی لگانا
نہیں چاہتا۔ میں تو صرف تمہاری جانب اپنے رویئے کی وضاحت کرنا
چاہتا ہوں۔ گذشتہ چند دنوں کے واقعات غیر متوقع تھے۔ اور
اچانک ظہور میں آئے تھے۔
تم سے ملاقات میرے لئے ایک ناقابل فراموش سبق ہے
تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں تمہیں جانتا ہوں لیکن حقیقت
یہ ہے کہ میں تم سے ناآشنا تھا۔ اپنی زندگی کے دوران ہر قسم کے لوگوں
سے میرا واسطہ پڑا ہے۔ بہت عورتیں اور لڑکیاں میری دوست رہی
ہیں۔ لیکن تم تنہا۔ تم ایک پاکیزہ اور ایماندار لڑکی ہو۔ لہٰذا مجھے
حیرت ہوئی اور میں انصاف نہ کر سکا۔ میں [illegible] طاقت [illegible] سے
کھنچ گیا تھا اور اب بھی اس کا عالم ہے۔ جو کچھ تمہارے پاس
بیٹھا رہا ہوں۔ اس کے باوجود میں تمہیں نہ پہچان سکا۔ اور میں
ایمانداری کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہیں سمجھنے کی کوشش
بھی نہیں کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس پر بھی میں یہ خیال کر رہا تھا کہ
میں تمہاری محبت میں مبتلا ہوں۔ اس گناہ کی مجھے یہ سزا ملی ہے
میں نے اس سے پہلے بھی ایک عورت سے محبت کی اور اسے
بھی مجھ سے محبت تھی۔ لیکن اس کی سمت میرے احساسات بڑے
پیچیدہ تھے اور وہ بھی میری جانب سے پیچیدہ احساسات رکھتی تھی
وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ اس کی فطرت سادہ نہیں تھی۔ مگر اس وقت
مجھ پر حقیقت کا انکشاف نہ ہوا۔ لیکن جب اس سے میں دوچار ہوا
تو وقت گزر چکا تھا۔ کوئی ماضی کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔ ہو سکتا ہے
کہ ہماری زندگی متحد ہو جاتی۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ میں یہ کیسے ثابت
کروں کہ میں نے تم سے شاید سچی محبت کی ہوتی

وہ محبت جو دل سے کی جاتی ہے خیالات سے نہیں۔ لیکن شالیا میں اس قسم کی محبت کے قابل نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ قدرت نے مجھ کو بہت سی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ اور اس وقت میں انکسار و عجز سے کام نہیں لینا چاہتا۔ خاص طور پر ایسے لمحوں میں جب میں انتہائی ندامت محسوس کر رہا ہوں — ہاں قدرت نے مجھکو بہت سی صلاحیتیں عطا کی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میں کوئی مفید کام کئے بغیر مر جاؤں گا۔

نہ جانے مجھ میں کیا کمی ہے — شاید مجھ میں اس بات کی کمی ہے کہ میں لوگوں کے دلوں کو متاثر نہیں کر سکتا۔ کسی عورت کے دل پر فتح نہیں پا سکتا۔ میری قسمت عجیب و غریب ہے۔ میں بڑے شوق کے ساتھ جان و دل کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا چاہتا ہوں مگر ایسا کرنے کی اپنے میں قدرت نہیں پاتا۔ میرا خیال ہے کہ میں کسی ایسی احمقانہ بات کے لئے خود کو قربان کر دوں گا جس پر میں یقین نہیں رکھتا ہوں گا۔ او میرے خدا! پینتیس برس کی میری عمر ہو چکی ہے اور میں ابھی تک کچھ نہ کچھ کرنے کا ارادہ باندھ رہا ہوں۔

میں نے آج تک کسی کے سامنے اپنا دل یوں کھول کر نہیں رکھا یہ میرا اعتراف ہے۔

خیر میں اپنے بارے میں بہت سی باتیں کہہ چکا ہوں۔ اب مجھے تمہارے متعلق باتیں کرنا ہیں۔ میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں اس کے سوا کچھ اور بات کا اہل نہیں ہوں۔

تم ابھی جوان ہو اور تم چاہے کتنی دیر زندہ کیوں نہ رہو۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ ہمیشہ اپنے دل کی رہنمائی قبول کرنا اپنے یا کسی دوسرے کے خیالوں سے بہک نہ جانا۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ ایک شخص کی زندگی کا حلقہ جس قدر تنگ اور سادہ ہوتا ہے اس قدر وہ اچھا ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی کے نئے امکانات تلاش نہ کئے جائیں۔ بلکہ زندگی کو تمام مراحل سے گزرنے دیا جائے۔ وہ شخص کتنا خوش نصیب ہے جو اب ابھی جوانی میں جوان رہتا ہے — لیکن مجھے ایسا ہو رہا ہے کہ یہ مشورہ خود میرے اپنے لئے ہے اور تمہارے لئے نہیں۔

بات تو یہ ہے شالیا میں اس وقت نہایت ہی بری صورت حال میں مبتلا ہوں۔ جب نے تمہاری والدہ میں جو احساسات بیدار کئے تھے ان کی نوعیت سے متعلق میں نے خود کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے ایک عارضی پناہ گاہ میسر آگئی ہے — لیکن مجھ کو پھر بے خانماں ایک جگہ سے دوسری جگہ آوارہ رہنا ہو گا۔ تمہارے ساتھ گفتگو تمہاری موجودگی اور تمہاری دلنشیں ادا اور ایماندارانہ نگاہ ان کا بدلہ مجھے نہیں ملے گا۔ میں ہی مورد الزام ہوں۔ تم بھی اس بات کو تسلیم کرو گی کہ قدرت نے ہمارا مذاق اڑایا ہے۔ مگر میں تمہیں وہ باتیں کیوں یاد دلاؤں جو تم پہلے ہی کہہ چکی ہو — آج میں بڑی عجلت کے ساتھ روانہ ہو رہا ہوں۔ اور اپنے دل پر جبر کر کے یہ وضاحت پیش کر رہا ہوں۔ مستقبل کی کوئی امید نہیں .... اور میں نے جو پیار روبرو جرم کیا ہے اس کو تم پوری طرح نہیں جانتیں۔ بعض اوقات میں اس قدر باتیں کرتا ہوں۔ خیر۔ اب چھوڑو میں تو جا رہا ہوں۔

یہاں روون نے شالیا کو آگاہ کیا تھا کہ وہ والنتیف سے ملنے گیا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے پورا پیرا کاٹ دیا تھا۔ اور اس کے بعد یہ لکھا تھا۔

میں اس دنیا میں تنہا ہوں اور خود کو ان باتوں کے لئے وقف کرتا ہوں جن کے میں قابل نہیں۔ تم نے صحیح یہ طنز کیا تھی۔ کاش میں ان باتوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کر سکوں۔ اور اپنی سستی اور کاہلی کو تیاگ سکوں۔ لیکن نہیں میں ہمیشہ ایک کمزور دل شخص رہوں گا۔ میرے راستے میں ایک ہی رکاوٹ پیدا ہو گی اور میری ہمت جواب دے جائے گی۔ تمہارے ساتھ جو کچھ گزر رہا ہے وہ اس کا ثبوت ہے۔ میں اس ذمہ داری سے ڈر گیا جو میرے کندھوں پہ آپڑی تھی اور اس لئے میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم میری خاطر اپنے حلقہ کو چھوڑ دو — شاید یہ ایک اچھی بات ہوئی ہے شاید میں اس آزمائش سے پاکیزگی کے ساتھ اور ایک مضبوط آدمی بنا کر ابھروں گا۔

میں تمہاری بھرپور مسرت کا خواہاں ہوں۔ الوداع
مجھے کبھی کبھی یاد کر لیا کرنا —— مجھے امید ہے کہ میں تمہیں پھر خط لکھوں گا۔

(روون)

شالیا کے جس ہاتھ میں روون کا خط تھا وہ اس کی گود میں جا گرا اور وہ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ اس خط نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کر دیا تھا

...ر اس محبت نہیں تھی مگر وہ ایک نہایت ہی پر دی تکلیف تھی ... بیچ دیا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ تاریک موجوں نے ... لیا تھا اور وہ وہ سب رہ گئی ہے جان اور شل ہوکر ... دیا وہم کو پیدا ازالہ ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے مگر ... تسکین کے ساتھ جو دو فریب ہیں تسکین نہیں دھونڈتا یہ ... داشت ہو جاتا ہے ۔

...نالیا کو اپنا بچپن یاد آیا۔ کس طرح شام کو سیر کے وقت ... کی روشنی جنگل کی طرف آگے بڑھتی رہی تھی۔ جہاں غروب ... آفتاب شعلہ ریز تھا۔ وہ تاریکی کی طرف کبھی قدم ... اٹھاتی تھی۔ اب زندگی اس کے سامنے تاریک تھی اور روشنی ... وہ منھ موڑ کر کھڑی تھی ۔

...نالیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ آنسو ہمیشہ تسکین کا باعث ... کرتے ۔ آنسو تو محض اس وقت مرہم ثابت ہوتے ہیں ... جب آنکھوں میں رُکے پڑے ہوں ۔ مگر آنسو سرد بھی ہوتے ... افسوس کے انبار میں نکلتے ہیں اور وہ آنکھوں سے دل پر ... بوجھ کی وجہ سے ایک ایک بوند کی صورت میں ٹپکتے ہیں ... کوئی تسکین نہیں ہوتی ۔ دل کو آرام نہیں آتا ۔ شاید ہی ... اسی لیے آنسو بہاتا ہے اور اس شخص کو ہم صحیح معنوں میں ... نہیں کہہ سکتے جو یہ آنسو بہا نہیں پاتا ۔ نالیا اس روز ... ان سے واقف ہوئی ۔

...دو گھنٹے گزر گئے اپنے کو سنبھالتے ہوئے نالیا اٹھی جس نے ... دیکھے اور موم بتی جلائی ۔ رودن کے خط جلا دیا اور راکھ ... سے باہر پھینک دی ۔ اس کے بعد اس نے شکن کا مجموعہ کلام ... اور بے سوچے سمجھے اس کا ایک ورق اٹھا (وہ اپنی تقدیر کا ... جاننے کے لئے اکثر شکن کی مدد لیا کرتی تھی) اس کی نگاہ ... سطروں پر پڑی ۔

جس کسی نے بھی جنوں خیز محبت کی ہے
بیتے ایام کے عفریت ستاتے ہیں اُسے
کوئی بھی شے ہو مسرت نہیں ملتی اس کو
اس کی یادیں اسے سانپوں کی طرح ڈستے ہیں
حیات جاتا ہے تاسف دل محزوں اس کا

نالیا ایک لمحہ تک کھڑی رہی پھر آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگی اور وہ مسکرائی اس نے اپنے سر کو جنبش دی اور نیچے نشست گاہ میں چلی گئی ۔

اسے دیکھتے ہی مادام لاسنکایا اس کو اپنے دارالمطالعے لے گئی ۔ اس نے نالیا کو اپنے قریب بٹھا لیا اور بڑی شفقت کے ساتھ اپنی بیٹی کی طرف دیکھتی رہی ۔ مادام لاسنکایا دل ہی دل میں پریشان تھی ۔ اسے ابھی ابھی یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو نہیں جانتی تھی ۔

جب پنیلے واکی نے اس سے کہا تھا کہ اس کی بچی رودن سے چوری چھپے ملتی ہے تو اسے صدمہ کی بجائے حیرت ہوئی تھی کہ اس کی بیٹی بھلا اس طرح کیونکر عمل کر سکتی ہے ۔ جب اس نے اپنی بیٹی کو اپنے پاس بلا کر اسے ڈانٹ پلانی شروع کی تھی تو نالیا کے تو کی جواب نے اسے پریشان کر دیا تھا اور وہ ڈر گئی تھی ۔

رودن کی اچانک روانگی نے اس کے دل سے بھاری بوجھ اٹھا دیا تھا مگر اس وقت وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ اس کی بیٹی آنسو بہائے گی اور کہرام بپا کر دے گی ۔۔۔ نالیا کے ظاہری سکون اسے بے حد مضطرب بنا رہا تھا ۔

" بیٹی آج تمہاری طبیعت کیسی ہے ؟ "

" نالیا نے اپنی والدہ کی طرف دیکھا

" تمہارا عاشق تو جا چکا ہے ۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کیوں اس قدر جلد یہاں سے چلا گیا ۔

" اماں ۔۔۔ " نالیا نے دھیمی آواز میں کہا ۔ " میں وعدہ کرتی ہوں کہ اگر تم اس کے بارے میں ایک لفظ نہ کہو گی تو میں بھی اس کے بارے میں خاموش رہوں گی "

" اچھا تم اپنے جرم کا اقبال کرتی ہو نا ؟ "

نالیا نے اپنا سر جھکا لیا اور اپنا جملہ دہرایا ۔۔۔ " میں اس کے بارے میں خاموش رہوں گی ۔۔۔ "

" میں تمہارے اس وعدہ پر یقین کرتی ہوں ۔۔۔ " اس کی اماں نے مسکراتے ہوئے کہا ۔۔۔ " مجھے تم پر اعتبار ہے ۔ لیکن کل تم نے ۔۔۔ تمہیں تو یاد ہی ہوگا ۔۔۔ خیر اب میں کچھ نہ کہوں گی ۔۔۔ بات ختم ہو چکی ہے ۔ کون گڑے مردے اکھاڑے ۔ تم اب مجھے پہلے کی طرح

دکھائی دے رہی ہو۔ ویسے تم نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا ــــ لاؤ مجھے بوسہ دو بیٹی ــــ

نتالیا نے اپنی امّاں کا ہاتھ اٹھا کر اس پر بوسہ دیا اور مادام وسنکایا نے اپنی بیٹی کے جھکے ہوئے سر پر بوسہ دیا۔

ہمیشہ میرے مشورے پر عمل کیا کرو۔ تمہیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہئے کہ تم لاسنکایا ہو اور میری بیٹی ہو ــــ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم خوش رہوگی ــــ اچھا اب جا سکتی ہو ــــ

چپکے سے نتالیا وہاں سے چلی آئی۔ معمر عورت نے نگاہوں سے اس کا تعاقب کیا، اور وہ سوچنے لگی ــــ اس کی ہر بات میں مجھ سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ کس قدر آسانی کے ساتھ جذبات کی رو میں بہہ جاتی ہے ــــ اس کے بعد مادام لاسنکایا بیتے ہوئے ایام کی یادوں میں کھو گئی۔

مادام لاسنکایا نے میڈموازیل لون کورٹ کو بلوا بھیجا اور وہ دونوں دیر تک بند کمرے میں باتیں کرتی رہیں۔ لون کورٹ کے جانے کے بعد اس نے چینڈے لانکی کو بلوایا۔ اس نے تہیّہ کر رکھا تھا کہ وہ دونوں کی روانگی کا سبب جان کر رہے گی۔

چینڈے لانکی نے اسے مطمئن کر دیا۔ وہ اس بات میں بڑی مہارت رکھتا تھا ــــ

دوسرے دن والنتیف اور اس کی بہن نے مادام لاسنکایا کے یہاں کھانا کھایا۔ مادام لاسنکایا پہلے سے کہیں زیادہ ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئی۔ نتالیا کی اس وقت بری حالت تھی۔ مگر والنتیف بڑی شائستگی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا وہ کچھ اس قدر گھبرا کر باتیں کر رہا تھا کہ نتالیا خود کو اس کا ممنون سمجھ رہی تھی ــــ

دن بڑی تیزی مگر بے کیفی کے ساتھ گزر گیا اور جب محفل برہم ہوتی تو ان سب نے اس طرح محسوس کیا جیسے وہی پرانے دن لوٹ آئے ہوں ــــ

ہاں پرانے دن لوٹ آئے تھے۔ مگر نتالیا یہ محسوس نہیں کر رہی تھی ــــ

آخرکار وہ اپنے پلنگ پر جا گری۔ وہ تھکی ہوئی تھی اور

غم زدہ تھی۔ اسے زندگی انتہائی تلخ نظر آ رہی تھی۔ اسے اپنے وجود پر اپنی محبت پر اور اپنے غم و آلام پر ندامت ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے اس وقت موت آ جائے ــــ وہ بہت دنوں تک اداس رہی۔ کئی راتیں اس نے جاگ کر کاٹ دیں۔ لیکن ابھی جوان تھی۔ اس کی زندگی کا ابھی آغاز ہی تھا۔ کسی کا غم چاہے کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو اسے کھانا تو کھانا ہی پڑتا ہے۔

نتالیا نے بہت دکھ اٹھائے۔ یہ دکھ اس نے پہلی مرتبہ اٹھائے تھے مگر پہلے دکھ پہلی محبت کی طرح اپنے آپ کو دہراتے نہیں ہیں، اور یہی خوش نصیبی کی بات ہے ــــ

دو سال گزر چکے تھے۔ مئی کے مہینے کا آغاز تھا۔ مادام اب مادام لزنف بن چکی تھی اور وہ اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اس کی شادی ہوئے ایک سال سے زیادہ مدت ہو چکی تھی۔ وہ پہلے کی طرح حسین جمیل تھی۔ اس کا بدن ذرا بھاری ہو گیا تھا۔ برآمدہ کے سامنے باغ میں ایک آیا گلاب جیسے چہرے والے بچے کو کھلا رہی تھی۔ اس بچے کی ماں اس کی طرف دیکھ رہی تھی بچہ رو نہیں رہا تھا اور انگوٹھا چوس رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بچہ اپنے قابل باپ لزنف کی طرح ذہین ثابت ہوگا۔

پیگاسف اس وقت مادام لزنف کے قریب برآمدہ میں بیٹھا تھا۔ اب اس کے بال سفید ہو گئے تھے۔ اس کی کمر میں خم پیدا ہو گیا تھا۔ وہ دبلا پتلا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جب بولتا تھا تو سیٹی سی بجتی تھی کیوں کہ اس کے تمام اگلے دانت جھڑ گئے تھے۔ وقت کے گزرنے پر اس کا ذہن کند ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنی باتیں دہرانے لگا تھا لزنف گھر پر نہیں تھا۔ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ چائے کے وقت آ جائے گا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ افق پر زرد رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فلک پر ہلکے ہلکے بادل منڈلا رہے تھے۔

یک بیک پیگاسف نے ہنسنا شروع کیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" مادام لزنف نے پوچھا۔

کچھ نہیں کل میں نے۔ ایک کسان کو اپنی چرب زبان بیوی سے یہ کہتے سنا ــــ "لڑنا چھوڑو ــــ مجھے یہ بات بہت پسند آئی

تو یہ کہ عورت ٹینا کی بات کر سکتی ہے۔ معاف کرنا۔ میں
ں بات نہیں کر رہا۔ ہمارے پیش رو ہمارے آباؤ اجداد
ہے آدمی تھے۔ ان کے بیویوں کے قصوں میں عورت کا ذکر کبھی
یں چھادر ایک لفظ سے نہیں لگاتی ہے، اور ہوتا بھی
ہیے۔ تم خود ہی فیصلہ کرو کہ ہمارے اس علاقے کے مارشل
وی مجھ سے کہنے لگی کہ وہ میرے اس رجحان کو پسند نہیں کرتی
۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے نہایت قریب سے گولی
ادہ ہو ۔ رجحان کی بھی ایک ہی کہی ۔ کیا ہی اچھا ہو۔ اگر
ت اُسے زبان سے محروم کر دے؟"

تم ابھی تک اپنی پرانی ڈگر پر قائم ہو اور ہم غریب عورتوں
لامت کا نشانہ بنائے رکھتے ہو۔ تمہیں شاید معلوم نہیں
تمہاری سب سے بڑی بدقسمتی ہے ۔ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے۔

کیا مطلب ہے تمہارا؟ ۔ دنیا میں صرف تین قسم کی
بیبیاں ہیں۔ سردیوں میں ایک سرد کمرے بیٹھا رہنا ۔ گرمیوں
تنگ جوتے پہننا ۔ اور روتے ہوئے بچے کے کمرے میں سونا

— یہ ہیں تو اب میرے بھی اخلاقی اصول ہیں"

کیا اخلاقی اصول ہیں؟ ابھی کل ہی کی بات ہے مارشل
بیوی نے مجھ سے تمہاری شکایت کی تھی"

۔ سچ؟ ذرا میں بھی تو سنوں اس نے میرے بارے
تم سے کیا کہا؟"

"اس نے یہی کہا کہ تم صبح سے شام تک اس کے سوالوں
جواب سے"

کیا کہا ۔ کیا کہا" — یہ بیہودہ ہے اور وہ بھی چیختی
ہوئی آواز میں"

لیگا نیف زور سے ہنسا — "میں نے بہت اچھا کیا"

"کیا عورت کے ساتھ گستاخی سے پیش آنا اچھی
بات ہے؟"

"کیا تم مارشل کی بیوی کو عورت سمجھتی ہو؟"

"عورت نہیں تو وہ اور کیا ہے؟"

"ایک ڈھولک ہے — جسے لکڑیوں
سے پیٹا جاتا ہے"

"ہاں۔ ہاں" مادام لاسکایانے بات کا موضوع
بدلنے کی غرض سے کہا "میں نے یہ سنا ہے کہ تمہیں مبارکباد
دینی چاہیئے"

"کس بات پر؟"

یہی کہ تم مقدمہ جیت گئے ہو۔ اور چراگاہیں اب
تمہارے قبضہ میں رہیں گی"

"ہاں" — لیگا سف نے اداسی کے ساتھ جواب دیا۔

"سالوں تک یہ مقدمہ تم لڑتے رہے ہو اور اب
یہ مقدمہ جیتنے پر تم غیر مطمئن نظر آ رہے ہو؟"

"میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔" لیگانف نے
سنجیدگی کے ساتھ کہا

"ایک مسرت جو مدت کے بعد حاصل ہوا اس سے بڑی اور
کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس سے تم ایک رعایت سے محروم ہو جاتے
اپنی شہرت کو کوستے رہنے کی مسرت انگیز رعایت سے — میں
ٹھیک کہتا ہوں مادام جو مسرت مدت کے بعد حاصل ہوتی ہے
وہ بہت گھناؤنی ہوتی ہے"

مادام نے صرف اپنے کندھے جھٹک کر رہ گئی "ایا!"
اس نے آواز دی — "مسز کورٹ لا دو" "لاؤ مجھے دو"

وہ اپنے بچے کو کھلانے لگی۔ لیگا سف بڑبڑاتا ہوا
برآمدہ کے دوسرے کونے میں چلا گیا"

دفعتاً لزنف باغ کے گرد گھومتا ہوا سڑک پر نمودار
ہوا۔ وہ اپنی دو گھوڑوں والی گاڑی میں آ رہا تھا۔ دو نیچے قد کے
کتے اس کے گھوڑے کے آگے دوڑ رہے تھے۔ یہ کتے ایک
دوسرے کے دوست بھی تھے اور آپس میں لڑتے بھی رہتے تھے۔

لزنف — "ادھر دیکھو۔ میں اپنے ساتھ کسے لایا ہوں"
لزنف نے دور ہی سے اپنی بیوی کو آواز دی —

مادام لزنف اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو
پہچان نہ سکی — آخرکار وہ بولی — "اوہ موسیو رمیس توف!"

"یہ ایک نہایت اچھی خبر لائے ہیں —"

لزنف احاطہ میں داخل ہوا — احاطے سے ہوتا ہوا
میس توف کے ہمراہ برآمدے میں پہنچا —

"خوش ہو جاؤ سنیا تمہارے بھائی کی شادی ہو رہی ہے"
"کس سے؟"
"نتالیا سے اور کس سے — ہمارا دوست بیس توف ماسکو سے یہ خبر لایا ہے!" "تمہارے نام ایک خط بھی ہے — سنو میشا!" اس نے پھر اپنے بچے کو بیوی کی گود سے چھینتے ہوئے کہا — "تمہارے ماموں کی شادی ہو رہی ہے! تم تو بس رال ٹپکاتے ہوتے ہو یا آنکھیں جھپکتے رہتے ہو —!"
"اسے نیند آ رہی ہے" آیا نے کہا۔
"ہاں — بیس توف نے مادام لزنف کے قریب جاتے ہوئے کہا"
"میں مادام لاسنکایا کے حکم کے مطابق آج ہی ماسکو سے یہاں آ رہا ہوں — یہ رہا وہ خط!"
مادام لزنف نے لفافہ چاک کر کے اپنے بھائی کا خط پڑھا۔ یہ ایک مختصر خط تھا۔ صرف چند ہی سطور میں مسرت کے عالم میں اس نے اپنی بہن کو اطلاع دی تھی کہ اس نے نتالیا کے سامنے شادی کی تجویز رکھی اور وہ مان گئی۔ اس کی اماں بھی رضامند ہے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے خط میں وہ تمام تفصیلات لکھے گا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بے خودی کے عالم میں یہ خط لکھا تھا۔
چائے آ گئی اور بیس توف پر سوالات کی بوچھار کر دی گئی۔ لیگا سف بھی اس خبر پر خوش تھا۔
"ہم پر ایک شخص موضور کورچاگن سے متعلق افواہیں پہنچی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ جھوٹی ہیں"
"کورچاگن ایک خوبصورت نوجوان تھا بڑا تند مزاج اور اکھڑ۔ وہ کچھ اس قسم کے دبدبہ کا اظہار کرتا تھا۔ جیسے وہ انسان نہ ہو۔ بلکہ ایک مجسمہ ہو جس پر کوئی عبارت کندہ ہو۔"
"نہیں بالکل جھوٹی تو نہیں ہیں" بیس توف نے مسکراتے ہوئے کہا "مادام لاسنکایا اس کے حق میں تھیں۔ مگر میڈم موازیلی نتالیا اس کو دیکھنا تک پسند نہیں کرتی تھیں"
"میں اس شخص کو جانتا ہوں" لیگا سف بولا "بالکل کاٹھ کا الّو ہے۔ خدا کی قسم اگر تمام انسان اس جیسے ہوتے تو میرے لئے جینا محال تھا"
"مگر اونچے طبقوں میں اس کی بڑی قدر کی جاتی ہے"
"چلو اب اس کی باتیں ہی چھوڑ دو — مادام لزنف نے کہا" "میں خوش ہوں کہ میرا بھائی کامیاب ہو چکا ہے کیا نتالیا بھی خوش ہے؟"
"ہاں! وہ ہمیشہ بڑی پُرسکون رہتی ہے"
وہ شام نہایت گرمجوش باتوں میں بسر کی گئی۔ پھر رات کے کھانے کا وقت ہو گیا۔
"ہاں — یہ تو کہو" لزنف نے بیس توف کے جام میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا "کیا کبھی کچھ رودن کے بارے میں بھی سنا ہے —؟"
"نہیں ایک مدت ہو چکی ہے وہ گزشتہ سردیوں میں تھوڑی سی دیر کے لئے ماسکو آیا تھا اور پھر ستمبر تک چلا گیا وہ ایک کنبہ کے ہمراہ تھا۔ ہم دونوں میں کچھ دنوں تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ اپنے آخری خط میں اس نے لکھا تھا کہ وہ سمبر تک چھوڑ کر جا رہا ہے — کہاں — اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ پھر مجھے اس کی کوئی خبر نہیں معلوم ہو سکی"
"وہ شخص اپنی دیکھ بھال کر سکتا ہے" لیگا سف بیچ میں بول اٹھا — "میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی کہیں بیٹھا ہوا پرچار کر رہا ہے۔ اس شخص کو ہر وقت دو تین مداح میسر آ سکتے ہیں جو حیرت میں کھلے ہوئے منہ کے ساتھ اس کی باتیں سن سکتے ہیں اور اسے روپیہ قرض دے سکتے ہیں۔ میری بات یاد رکھنا اس کا انجام یہ ہو گا کہ وہ کہیں دور افتادہ مقام میں مثلاً زارف کاک یا کھو ما میں ایک بوڑھی عورت کے بازوؤں میں دم توڑے گا جو اسے نہایت قابل شخص سمجھتی ہو گی"
"آپ اس کے بارے میں نہایت سخت الفاظ ادا کر رہے ہیں —" بیس توف بولا
"بالکل نہیں۔ میں سچی بات کہہ رہا ہوں۔ میرے خیال میں وہ ایک مفت خورے کے سوا کچھ بھی نہیں" لیگا سف نے پھر لزنف کی طرف مڑتے ہوئے کہا
"میں تمہیں یہ تو بتانا بھول ہی گیا۔ کہ میری ملاقات تارلوخوف

ہر کی تھی جو یہ لیتے ہیں۔ رودن کے ہمراہ رہ چکا ہے۔ تمہیں کیا بتاؤں
کہ اس شخص نے رودن کے متعلق مجھے کیا کچھ بتایا۔ میں تو سوچ بھی نہیں
سکتا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ وقت گزرنے پر دوستوں کے
بھی دوست دشمن بن جاتے ہیں"

"یہ ان میں سے نہیں" بیس توف نے گرم ہوتے کہا۔

"تمہاری بات دوسری ہے ——— میں تمہاری بات
نہیں کر رہا ہوں"

"تمہیں تارلوخوف نے کیا بتایا؟" مادام لزنفانے پوچھا۔

"بہت سی باتیں بتائیں۔ مجھے سب تو یاد نہیں مگر ایک
قصہ تو نہایت ہی اچھا ہے۔ رودن جیسے شخص ہر وقت ترقی
کرتے رہتے ہیں جب کہ دوسرے کھاتے اور سوتے ہیں۔ ایسے
شخص کھاتے اور سوتے بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ترقی بھی کرتے
ہیں۔ کیا میں ٹھیک نہیں کہہ رہا مسٹر بیس توف! (بیس توف نے
کوئی جواب نہ دیا) اس طرح وہ مسلسل ترقی کرتے رہتے ہیں۔
رودن کو یہ خیال سوجھا کہ وقت آ گیا ہے کہ محبت کی جائے
قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کی شناسائی ایک فرانسیسی
عورت سے ہو گئی۔ وہ نہایت ہی حسین عورت تھی۔ یہ قصہ دریائے
رائن پر واقع ایک جرمن شہر کا ہے۔ رودن اس عورت کے یہاں
مسلسل جانے لگا۔ اسے اپنی کتابیں دیتا رہا اور اس سے ہیگل اور
قدرت کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ فرانسیسی عورت نے اسے
ایک نجومی خیال کیا۔ تم تو جانتے ہی ہو رودن دیکھنے میں برا نہیں
پھر وہ ایک بدیسی تھا روسی۔ فرانسیسی عورت کی نگاہ پہ چڑھ گیا۔
آخر کار انہوں نے ملاقات کے لئے ایک جگہ مقرر کی۔ یہ جگہ بھی
شاعرانہ تھی — دریا میں کشتی کی سیر — فرانسیسی عورت مان گئی
اس نے بہترین لباس پہنا اور اس کے ساتھ کشتی کی سیر کو چل پڑی
وہ دو گھنٹے تک کشتی میں سیر کرتے رہے اور جانتے ہو اس نے
کیا کیا؟ وہ عورت کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا اور خواب آلود
آنکھوں سے آسمان کو تکتا رہا۔ اور بار بار اس عورت سے
یہ کہتا رہا کہ وہ اس کے لئے ایک باپ کی سی شفقت محسوس کر رہا ہے۔
یہ عورت بہت برافروختہ ہو کر گھر لوٹی۔ اس نے بعد میں یہ سارا قصہ
تارلوخوف کو سنایا — ہاں تو رودن ایسا شخص ہے ———"

——— پیگاسف سنا ——

"تم بہت بڑے کلبیت پسند ہو" مادام لزنفانے اسکو
ڈانٹتے ہوئے کہا "مجھے دن بدن یہ یقین ہوتا جا رہا ہے
کہ جو شخص بھی رودن کو برا بھلا کہتا ہے اس کے پاس کوئی ایسی
بات نہیں ہوتی جس سے وہ برا ثابت ہو"

"یہ بری بات ہی نہیں — وہ دوسرے لوگوں کی جیب پر
ڈاکہ ڈالتا ہے — قرض لینے کی اسے عادت ہے ———
مونیو رلزنف اس نے ضرور تم سے کچھ روپیہ قرض لیا ہوگا؟"

"ادھر دیکھو مونیو رپیگاسف" لزنف نے بات کی
ابتدا کی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار پیدا ہو گئے "
تم بھی جانتے ہو اور میری بیوی بھی جانتی ہے کہ میں رودن کا
قدردان نہیں ہوں۔ بلکہ میں نے تو اس میں کئی عیب نکالے ہیں
اس کے باوجود میں"

یہاں پہنچ کر لزنف نے سب کے گلاسوں میں شراب ڈالی
اور کہا "

یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ اپنے بھائی اور اس کی محبوبہ
کی صحت کو جام دینے کے بعد ہم رودن کی صحت کا جام پئیں"

مادام سنہا اور پیگاسف نے لزنف کی طرف حیرت
سے دیکھا۔ بیس توف سینہ تان کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں
سے مسرت جھلک رہی تھی"

"میں رودن کو اچھی طرح جانتا ہوں" لزنف
نے اپنی بات جاری رکھی "

میں اس کے عیوب اور اس کی کوتاہیوں کی طرف سے
اپنی آنکھیں بند نہیں کرتا۔ مگر یہ کوتاہیاں اس لئے ہمارے
سامنے نمایاں ہوتی ہیں۔ کیونکہ رودن بذاتِ خود کوئی
چھوٹا آدمی نہیں ہے"

"رودن ایک نہایت ہی ذہین شخص ہے" بیس توف
نے دخل اندازی کی۔

"ہاں اس میں ذہانت کی چنگاریاں ہیں۔ لیکن جہاں تک
اس کے انسان ہونے کا تعلق ہے۔ مصیبت تو یہی ہے کہ
وہ پورا انسان نہیں ہے۔ خیر یہ ایک غیر متعلقہ بات ہے

میں صرف اس کی تقریروں کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں جوش و خروش ہے — ہمارے اس عہد میں ایک گراں قدر خوبی ہے۔ ہم سب تھک چکے ہیں۔ لاپروا بن چکے ہیں — ہم سو رہے ہیں اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے ہیں۔ ہمیں اس شخص کا ممنون ہونا چاہیئے جو ہمیں جگاتا ہے اور ہم میں گرمی کی لہر دوڑاتا ہے چاہے یہ گرمی لمحاتی ہی کیوں نہ ہو۔ سنیا تمہیں یاد ہوگا ایک مرتبہ اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے اس پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ سرد ہے۔ میں اس وقت ٹھیک بھی کہہ رہا تھا اور غلط۔ اس کے خون میں سردی ہے۔ یہ اس کا اپنا کوئی قصور نہیں۔ مگر اس کے ذہن میں آگ ہے۔ وہ کوئی اداکار نہیں ہے جیسا کہ پہلے میں نے اسے کہا تھا — وہ بہروپیا بھی نہیں — وہ مکار بھی نہیں۔ وہ دوسرے شخص کے اخراجات پر ایک چالاک شخص کی طرح زندہ نہیں رہتا بلکہ ایک بچے کی طرح — عین ممکن ہے کہ تنگدستی اور ناداری میں اس کی موت واقع ہو مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ محض اس بات کے لئے اسے سنگسار کر دیا جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ خود کوئی کامیابی نہیں حاصل کر سکے گا۔ اس لئے کہ اس میں ہمت نہیں اور اس کا خون سرد ہے۔ مگر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ مفید ثابت نہیں ہو رہا اور مفید ثابت ہی نہیں ہوگا — میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس کے الفاظ نے جوان دلوں میں بیداری کے بیج بو دئے ہیں ان نوجوانوں کے دلوں میں جو عمل کی قوت رکھتے ہیں اگرچہ قدرت نے اسے عمل کی قوت عطا نہیں کی ہے۔ وہ کیوں جائے خود میں اس کا بہت ممنون ہوں کہ میرے دل میں بھی اس نے بیداری کا بوٹا لگایا ہے میری بیوی سنیا جانتی ہے کہ جوانی کے ایام میں رودن کا میرے دل میں کیا قدر و قیمت تھی۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ رودن کے الفاظ انسانوں کو متاثر نہیں کر سکتے۔ لیکن اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ اس کے الفاظ ان انسانوں کو متاثر نہیں کرتے جو سن رسیدہ ہیں اور میری طرح زندگی کے تلخ تجربوں سے گزر چکے ہیں مگر نوجوان جو ابھی پختہ کار نہیں ہیں وہ اس کے الفاظ سے ضرور متاثر ہوتے ہیں اور اگر وہ نوجوان جو کچھ اس سے سنتے ہیں اسے حسین اور خوبصورت پاتے ہیں تو پھر بے عملی کی کون پروا کرتا ہے — وہ نوجوان اپنے میں خود قوت عمل پیدا کر لیں گے۔

"خوب — خوب — میں تو پھر بول اٹھا — کتنی سچی بات کہی ہے۔

جہاں تک تاثر کا تعلق ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ وہ شخص نہ صرف دلوں میں جوش و خروش پیدا کرتا ہے۔ بلکہ دل کو آگے بڑھاتا ہے اور آپ کے آگے بڑھنے کو جاری رکھتا ہے وہ تمہیں جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے اور آگ لگا دیتا ہے۔"

"سنا تم نے؟" لژنف نے پگاسوف کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"اب تمہیں کس مزید ثبوت کی ضرورت ہے۔ تم فلسفہ پر حملہ کرتے ہو۔ مگر تمہیں حملہ کرتے وقت الفاظ موزوں نہیں ملتے میں خود بھی فلسفہ کا اس قدر قائل نہیں ہوں اور میری سمجھ میں بھی کم آتا ہے۔ مگر میں یہ کہوں گا کہ ہماری مصیبتوں کا باعث صرف فلسفہ ہی نہیں۔ ایک روسی کبھی فلسفیانہ شعبدہ گری سے متاثر نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ جو شخص بھی صداقت کی تلاش کرتا ہے ہم اس کی اس تلاش کو فلسفہ کہہ کر معتوب نہیں بنا سکتے رودن کی یہ بدقسمتی ہے کہ وہ روس کو نہیں جانتا۔ روس کو ہماری ضرورت نہیں مگر ہمیں روس کی ضرورت ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ روس کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے وہ دکھ اٹھاتا ہے۔

اپنے آپ کو پردیسی ظاہر کرنا خود کو تباہ کرنا ہے۔ میں پھر یہ کہوں گا کہ رودن کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ یہ اس کی بدقسمتی ہے اور ہمیں اس پر الزام لگانے کا کوئی حق نہیں۔ اس کے اندر جو اچھائیاں ہیں۔ ہمیں تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے —

ہمیں اس کو سزا دینے کا کوئی حق نہیں۔ اس نے خود اپنے آپ کو سزا دی ہے۔ خدا کرے اس کے اندر جو برائیاں ہیں وہ تباہ ہو جائیں اور وہی کچھ باقی رہ جائے جو اس کے اندر خوبصورت اور [illegible] دینہ ہے میں رودن کے نام پر جام پیتا ہوں۔"

اس پر سب نے لژنف کے ساتھ اپنے گلاسوں کو ٹکرا دیا اور اپنے جوش و خروش میں رودن نے اپنا گلاس توڑ دیا — مادام لژنف نے اپنے خاوند کا ہاتھ دبایا۔

"مجھے اس کی امید ہی نہیں تھی کہ تم بھی ایک اچھے مقرر ہو۔ تم تو رودن کی طرح خوش بیاں ہو —!"

"نہیں میں خوش بیاں نہیں ہوں — خیر رودن کے متعلق بہت باتیں

۔ آد اب گفتگو کا موضوع بدل دیں۔ کیا پینٹ ے ولکی ابھی تک
تا پا کے پہلو میں پا ہے !"
ہاں ۔۔۔ مادام پینتا کی نے نہایت اچھی ملازمت حاصل
کی ہے !"

کھانا ختم ہوا تو مہمان رخصت ہو گئے۔ مادام پینتا اپنے خاوند کے
ساتھ رہ گئی۔ اس نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی: "تم تم
دیا ہے" آج تم نے روون کے حق میں ووٹ دیا۔ میں نے تیک
گرم جوشی و خوشی سے کبھی بولتے ہوئے نہیں سُنا:
یہ اس وقت آدمی پر حد نہیں کر سکتے جو گرچا ہو رہے
اُن کا پیٹا سف بہت تلخ ہو گیا تھا جب وہ روون پر نکتہ چینی
کرتا تھا!"

- میں نے محض پیٹا سف کی وجہ سے روون کا ساتھ دیا تھا۔ وہ
رسیوں کچھ کیونکر کہہ سکتا ہے جبکہ وہ خود ایک سپری نجرب ہے۔
معلوم ہے جب پیٹا سف سرکاری ملازم تھا تو رشوت لیا کرتا تھا"
- نہیں مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔۔۔!" اور پھر اس کے بعد اُس
نے شوہر سے پوچھا: "تمہارا کیا خیال ہے میرا بھائی تانیا کے
ساتھ خوش رہے گا؟"
- ہاں کیوں نہیں ۔۔۔ شاید جلد ہی غم و الم پر قابو پالے گی ۔۔۔
ان کی آپس میں محبت ہے۔ ہم بھی تو ایک دوسرے سے محبت کرتے
اور خوش ہیں"
وہ مسکرائی اور اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر
سے دبایا۔

جس دن مادام پینتا کے گھر میں وہ واقعہ ہوا جس کا ذکر کیا جا چکا
اس دن ایک چھکڑا جسے کسانوں کے تین گھوڑے کھینچ رہے تھے۔
اس کے علاقہ گبیرنا کے دور و دراز علاقہ میں دوپہر کے وقت بڑھا جا رہا
تھا۔ کوچوان کی نشست پر سفید بالوں والا ایک کسان پھٹا پرانا کوٹ پہنے
ہوئے بیٹھا تھا۔ ترپال کے نیچے ایک لمبے قد کا شخص بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ
ایک تھیلا تھا۔ اس کے سر پر ایک اونچی ٹوپی تھی اور اس کا کوٹ گرد
آلود تھا۔ یہ شخص روون تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اور اس نے اپنی ٹوپی
آنکھوں تک جھکا رکھی تھی۔ گاڑی کو ایک جھٹکا لگا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
- "کیا ہم کبھی اس چوٹی تک پہنچ بھی سکیں گے؟" اس نے کسان سے پوچھا۔

- "حضور صرف ایک دو میل کی بات ہے!"
- "تم ایسے ذرا تیز نہیں ہو!"
تھکے ہوئے گھوڑے آخرکار اس چوکی تک پہنچ گئے۔ روون بیزاری
سے اُس گاڑی میں سے اُترا۔ اُس نے کسان کو کچھ رقم دی اور چونیا تھیلا
اٹھا۔ اس گھر میں داخل ہوا۔

میرے ایک دوست نے ایک دفعہ کہا تھا کہ جس چوکی میں روسی
جرنیلوں کی تصویریں لگی رہتی ہیں وہ فوراً تمہیں تازہ دم گھوڑے دیتے
ہیں لیکن جس چوکی میں جواری جاسوس کی جگہ لڑکی کی تصویر آویزاں ہوتی ہے
وہاں آپ کو کتنے ہی دن پڑے رہتے ہیں اور گھوڑے نہیں ملتے۔ جس کمرے
میں روون نے قدم رکھا اس میں اُس جواری کی تصویر لگی ہوئی تھی، اُس
نے جب آواز دی تو ایک شخص اونگھتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اُس نے
خواب آلود لہجے میں انکشاف کیا۔ "گھوڑے ابھی نہیں مل سکتے!"
- "کیا مطلب ہے تمہارا!"
- "حضور گھوڑے ہوں تو دوں!"
روون گھبراہٹ کے عالم میں کھڑکی کے قریب چلا گیا۔
گزشتہ دو برسوں میں اس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی
البتہ اس کا چہرہ ذرا زیادہ مغموم ہو گیا تھا۔ اس کے گھنگریالے بالوں
میں سفیدی نمودار ہو گئی تھی۔ اُس کی خوبصورت آنکھیں اپنی خفوڑی سی
چمک کھو بیٹھی تھیں۔ اس کے لبوں کے گرد اُس کے گھٹے ہوئے جذبات
نے جھریاں پیدا کر دی تھیں۔ اُس کا لباس پرانا اور بوسیدہ تھا جوانی
کے ایام گزر چکے تھے۔
روون نے دیوار پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنا شروع کر دی۔
دفعتاً دروازہ چرچرایا اور چوکی کا مالک اندر آیا۔
"آپ کے گاؤں تک جانے کیلئے گھوڑے مل نہیں رہے۔ دیر
تک ملنے کی امید بھی نہیں۔ گاؤں اوف تک گھوڑے مل سکتے ہیں"
"کیا گاؤں پنیزا تک گھوڑے نہیں مل سکتے؟"
"نہیں"
- "اچھا تو اوف تک ہی سہی۔ گھوڑے جتنے کا حکم دو!"
جلد ہی گھوڑے تیار ہو گئے۔ روون نے اپنا تھیلا اُٹھایا
اور گاڑی میں اُچک کر جا بیٹھا۔ وہ اب بھی اپنے سر کو جھکائے ہوئے
تھا۔ اس کے خمیدہ جسم سے واقعی افسردگی اور اس کی مایوسی کا اظہار

ہوتا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ جارہی تھی اور جھٹکوں کی وجہ سے اُس کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

اختتامیہ

چند سال اور گزر گئے۔

موسم خزاں کا یہ ایک سرد دن تھا دفعتاً گوبرنسکے علاقہ کے قصبہ ایلیس کے سب سے بڑے ہوٹل کے سامنے ایک سفری گاڑی آکر رُکی۔ اُس میں سے ایک شخص نکلا اور اُس نے "گرا ئی لی"۔ وہ کوئی بوڑھا شخص نہیں تھا۔ اس کے طور و اطوار سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی مہذب اور دولت مند شخص ہے۔ وہ سیڑھیوں سے اس ہوٹل کی پہلی منزل پر پہنچا۔ کہیں ایک دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی اور ایک خادم نمودار ہوا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر مسافر نے اپنا کوٹ اُتار دیا۔ یہ مسافر لیزنف تھا۔ وہ ایک سال سے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے کی مہم پر تھا اور اب وہ قصبہ ایلیس میں پہنچا تھا۔

اتنے میں لیزنف کا خادم بھی آگیا۔ یہ ایک گلابی سے رخساروں والا نوجوان تھا۔ اس نے بھورے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔

"آخر ہم پہنچ ہی گئے۔ اور وہ گاڑی کا ٹائر جس کے متعلق تم اتنے فکر مند تھے ٹھیک ہی رہا۔" لیزنف بولا۔

"ہاں، پہنچ ہی گئے حضور" خادم نے جواب دیا۔

ڈیوڑھی میں سے آواز آئی۔ "اندر کون ہے!"

"ذرا ہیلو۔ اندر کون ہے" یہ آواز پھر آئی۔

لیزنف اٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

اس کے سامنے ایک دراز قد شخص کھڑا تھا جس کی کمر خمیدہ تھی۔ اس کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے اُس نے مخمل کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ جس میں پیتل کے بٹن لگے ہوئے تھے لیزنف نے اسے فوراً پہچان لیا۔

"رودن" اسکے منہ سے نکلا۔

رودن ہکا بکا کھڑا تھا وہ ابھی تک لیزنف کو نہیں پہچان سکا تھا چونکہ لیزنف روشنی کی طرف اپنی پیٹھ موڑ کر کھڑا تھا۔

"تم مجھے پہچانتے ہی نہیں ہو؟" لیزنف بولا۔

"اوہ، ٹھیک لیزنف!" رودن نے حیرت سے کہا اور اُس نے جھجکتے ہوئے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

لیزنف نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

"آؤ۔ آؤ۔ میرے کمرے میں آجاؤ۔" اور پھر رودن کو دھکیل کر اپنے کمرے میں لے آیا۔

"تم کسقدر تبدیل ہو چکے ہو؟"

"ہاں مگر تم بھی تو بوڑھے ہو گئے ہو۔ تمہاری بیوی کا کیا حال ہے؟"

"شکریہ۔ اچھی ہے۔ مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں یہاں اتفاقیہ پہنچ گیا ہوں۔ میں اپنے ایک شناسا کو یہاں ڈھونڈنے آیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تم سے ملکر خوشی ہوئی!"

"تم کھانا کہاں کھاتے ہو؟"

"میں۔ جو ہوٹل بھی سامنے آجائے وہیں کھا لیتا ہوں لیکن آج مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔!"

"کیا یہ اتنا ہی ضروری ہے؟"

رودن نے معنی خیز طور پر مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں وہ مجھے میرے گاؤں میں بھیج رہے ہیں"

"آؤ۔ میرے ساتھ کھانا کھاؤ!"

رودن نے لیزنف کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم واقعی مجھے کھانے کی دعوت دے رہے ہو؟"

"ہاں۔ بالکل اچھے دوستوں کی طرح۔ پرانے دنوں کی طرح کیا تمہیں یہ دعوت منظور ہے؟ میرے خدا مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ تم سے یہاں ملاقات ہو جائے گی۔ ہم اس طرح جدا نہیں ہو سکتے!"

"بہت اچھی بات ہے۔!"

اس پر لیزنف نے زور سے رودن کا ہاتھ دبایا اور نوکر کو بلا کر اُسے میز پر کھانا لگانے اور برف میں لگی ہوئی شمپین شراب لانے کا حکم دیا۔

کھانے کے دوران لیزنف اور رودن جھجکتے ہوئے اپنی طالب علمی کے ایام کا ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے بہت سے واقعات

ے لوگوں کو یاد کیا۔ پہلے پہل تو رودن ذرا خاموش تھا
نے سوسکے ۔ کو گل دیا۔ شام جب کھانا لگا کر چلا گیا
اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔
تم مجھے ہم سے جدا ہونے کے بعد کا سارا قصہ سناؤ گے؟"

رودن نے لیزنف کی طرف دیکھا۔ لیزنف سوچ رہا تھا۔
یہ غریب آدمی کتنا تبدیل ہو چکا ہے!"
رودن کے خدوخال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی صرف اس
کا انداز بدلا ہوا تھا۔
کیا سارا قصہ سناؤں!" رودن بولا۔ میں تمہیں
نہیں سنا سکتا۔ میں نے بہت آوارہ گردی کی ہے
دکھ اٹھائے ہیں۔ لوگوں اور بہت سی باتوں پر سے میرا
اٹھ چکا ہے۔ بعض اوقات مجھے اپنے ہی الفاظ پر غصہ
میں نے کئی مرتبہ اپنے آپ کو گالیاں دی ہیں۔ میں کہاں
نہیں گھوما۔ اور بعض راستے بہت ہی گندے تھے۔ کیا تمہیں
ہے مونسیور۔!"
یہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیوں تکلف سے کام لے رہے ہو
تکلف کہاں تھا۔ آؤ شراب پئیں۔" لیزنف بولا۔
"ہاں میرے دوست آؤ شراب پئیں!"
"کیا تمہیں معلوم ہے۔" اب کے رودن نے سولینور کا
دیا۔
میرے اندر ایک کیڑا ہے جو مجھے آہستہ آہستہ کریدرہا
اور بھگا رہا ہے۔ مجھے چین میسر نہیں۔ یہ ان لوگوں کو میرے
ہے جو مجھ سے پہلے متاثر ہوتے ہیں۔ جب سے میں تم سے جدا
میں نے بہت سی چیزوں کو آزمایا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ نئی زندگی
کیا اور اس کا جو انجام ہوا وہ تم دیکھ ہی رہے ہو!"
"تم میں صرف ہمت کی کمی ہے۔" لیزنف نے کہا۔
"کیا کہا مجھ میں ہمت نہیں۔ میں کبھی ایک معمار نہیں رہا۔ جب کسی
پاس ایک ٹھوس بنیاد ہی نہ ہو وہ کیا تعمیر کر سکتا ہے۔ خیر میں
وہ تمام واقعات نہیں سناؤں گا۔ یا یوں کہو اپنی ناکامیوں کا
نہیں کروں گا۔ لیکن تم سے صرف واقعات بیان کروں گا۔ اپنی

زندگی کے وہ واقعات جب میری تقدیر مسکرا اٹھی تھی اور مجھے
کامیابی کی امید ہو گئی تھی:
رودن نے اپنے سفید بالوں کو انگلیاں پھیر کر سیدھا کیا اور
اپنے بالوں کی سرمئی لٹوں کو پیچھے ہٹاتا ہوا بولا: "سمبا سکو میں
میری ایک عجیب و غریب شخص سے ملاقات ہو گئی۔ وہ سرکاری ملازم
نہیں تھا مگر بہت دولت مند تھا۔ اُس کی بڑی بڑی جاگیریں تھیں۔
وہ سائنس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آتا
کہ اُسے سائنس سے محبت کیوں تھی۔ وہ اس کے لئے موزوں
نہیں تھا۔ تقریر تو وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بڑی محنت کرتا تھا
خوب پڑھتا اور لکھتا تھا۔ وہ ایک مضبوط ارادے کا انسان تھا۔
وہ تنہائی پسند تھا اور لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ ایک عجیب
و غریب انسان ہے۔ میں نے اُس سے واقفیت پیدا کی۔ وہ
مجھ سے متاثر ہوا۔ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس سے واقعی
کوئی اچھا کام کیا جا سکتا تھا۔ میں اس کے یہاں رہنے لگا۔ دیہات
میں اس کی جاگیر تھی وہاں بھی اس کے ہمراہ گیا۔ میں نے بہت سے
منصوبے تیار کئے تھے۔ میں بہت سی اصلاحات کرنا چاہتا تھا۔
میں نے بہت سی باتیں سوچ رکھی تھیں۔
"جیسا تم نے مادام لاسنکایا کے یہاں کہا تھا!" لیزنف
نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"نہیں ــ وہاں تو مجھے علم تھا کہ میرے الفاظ کی کوئی قیمت
نہیں۔ مگر یہاں مجھے ایک شاندار موقع مل رہا تھا۔ میں نے اپنی تجاویز
کی آزمائش کی اور وہ صحیح ثابت ہوئیں۔ وہ خود بھی گہری دلچسپی کا
اظہار کرتا۔ ہر تجویز میں سرگرمی سے حصہ لیتا لیکن جلد ہی اُس
ساری تجویز کو ملیامیٹ کر دیتا اور نئی تجویز پر عمل شروع کر دیتا۔ لہٰذا
میں اُس سے برسوں تک جدوجہد کرتا رہا۔ دشواریوں کے باوجود
کام اچھی طرح ہو رہا تھا مگر میں جلد ہی اپنے دوست سے اکتا گیا۔
میں نے اس پر طنز شروع کر دی۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ میری
کامیابی سے ڈر کر میری ہر تجویز کو منسوخ کر دیتا تھا۔ بعد میں مجھ پر
یہ انکشاف ہوا کہ میں خواہ مخواہ اُس سے جھگڑتا ہوا ہوں۔ اس بات کا
انکشاف بہت تلخ تھا۔ میری تمام اُمیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ یہ
انکشاف بہت تکلیف دہ تھا کہ میں اپنا وقت اور اپنی قوت ضائع

کر رہا ہوں ۔ میں یہ سب جانتا تھا کہ اس جگہ کو چھوڑ کر میرا کیا حال ہوگا لیکن میں نے ان باتوں کے باوجود اُس سے جھگڑا کیا اور اس رئیس زادہ کو چھوڑ کر چلا آیا۔ جب روس آئے میں جرمنی کا ولیمر ملا کر گوندھا گیا تھا ۔۔۔!"

" یعنی تم نے اپنی روزی پر لات مار دی ۔۔۔!" نیرلف نے رودن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

" ہاں ۔۔۔ ایک دفعہ پھر میں نے خود جوکا اور ننگا پایا۔ میرے ہر طرف بیکراں خلا تھا اور میں جہاں بھی چاہتا اُڑ کر جا سکتا۔ خیر آؤ شراب پئیں "

" میں تمہاری صحت کا جام پیتا ہوں ۔" نیرلف نے اُٹھ کر رودن کے رخساروں پر بوسے دیتے ہوئے کہا ۔" میں تمہاری صحت کے لئے دا ... کرسکو کی میں جام پیتا ہوں ۔ اُس میں بھی غریب رہنے کا حوصلہ تھا "

" ہاں تو یہ پہلا واقعہ تھا ۔ کیا میں اپنی کہانی جاری رکھوں؟"

" ہاں ہاں ۔۔۔ خوشی سے !"

" میرے دوست اب میں باتیں کرتا ہوا تھک جاتا ہوں۔ خیر ۔ بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے تجارت شروع کرنی چاہیئے ۔۔۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ میری ملاقات کوربیف سے ہوگئی ۔ کیا تم نے اس کا نام سُنا ہے؟"

" نہیں ۔۔۔ مگر رودن میرے دوست تمہیں تاجر بننے کا خیال کیوں آیا؟ تاجر بننا کونسی اچھی بات ہے "

" میں جانتا ہوں ۔" رودن بولا ۔" کاش تم نے کوربیف کو دیکھا ہوتا ۔ میں اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھا ۔ وہ ایک بہت دانشمند شخص اور صنعت و تجارت کے متعلق بے پناہ واقفیت رکھتا تھا ۔ اس کا ذہن تجاویز کا مرقع تھا ۔ ہم نے مل کر عوام کے مفاد کا ایک کام کرنا چاہا "

" وہ بھلا کیا تھا ؟"

رودن نے اپنی نگاہیں جھکا کر کہا ۔" سنو گے تو ہنسو گے !"

" ہم نے فیصلہ کیا کہ گوبرنا کے علاقہ میں دریائے ... کو جہاز رانی کے قابل بنائیں " رودن اس انکشاف پر مسکرایا۔

" کیا خوب بات سوچی ۔ کوربیف ضرور کوئی سرمایہ دار ہوگا ۔۔۔؟"

" نہیں تو وہ مجھ سے بھی زیادہ غریب تھا " رودن نے دستور سر جھکائے ہوئے کہا ۔

نیرلف نے ایک قہقہہ سر کیا لیکن جلدی اس نے اپنے آپ کو روک لیا اور رودن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر زور سے دبایا اور بولا ۔" تمہاری تجویز کاغذ پر ہی رکھی رہی ہوگی ؟"

" نہیں یہ بات تو نہیں ہے ۔ ہم نے مزدور بھرتی کئے اور کام شروع کر دیا لیکن جلد ہی ہمیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ بات یہ تھی کہ مِل کے مالک اس منصوبہ کا ساتھ دینے کیلئے تیار نہیں تھے ۔ ہمیں مشینری کی ضرورت تھی ۔ ہمارے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا ۔ ہم چھ مہینے تک مٹی کی جھونپڑیوں میں رہے ۔ اور جب آخری دھیلا تک خرچ ہوگیا تو ہم وہاں سے واپس آ گئے ۔۔۔!"

" اور تم کر ہی کیا سکتے تھے ؟"

" بالکل ۔۔۔ مگر میں اتنا کہہ دوں وہ منصوبہ تھا شاندار!"

" کوربیف اب کہاں ہے ۔۔۔؟"

" وہ سائبیریا میں ہے زمین کھود کر سونا نکالنے میں مصروف ہے ۔ تم دیکھ لینا کہ ایک دن وہ بے پناہ دولت پیدا کرے گا ۔۔۔!"

" ہو سکتا ہے ۔ مگر تم کبھی بھی دولت پیدا نہیں کر سکو گے !"

" خیر تم تو ہمیشہ مجھے نکما سمجھتے رہے ہو ۔۔۔!"

" تم اور نکمے ہو ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ ٹھیک ہے ایک وقت تھا جب میں صرف تمہاری کمزوریوں کو دیکھتا تھا لیکن مجھ پر اعتبار کرو ۔ اب میں تمہاری قدر و قیمت کو پہچانتا ہوں۔ تم دولت پیدا نہیں کر سکو گے ۔ مجھے اس لئے تم سے محبت ہے ۔"

رودن مسکرایا ۔۔۔" کیا سچ ۔۔۔!"

" ہاں میں تمہارا احترام کرتا ہوں ۔۔۔ اچھا اب تم مجھے تیسرا واقعہ سناؤ ۔۔۔"

" جب میں ان باتوں میں ناکام ہوگیا تو میں نے سوچا کہ مجھے بچوں کو پڑھانا چاہیئے ۔۔۔ میں نے جو علم حاصل کیا ہے اب دوسروں کو بھی عطا کرنا چاہیئے ۔ میں نے ملازمت کے لئے

درخواست دے دی کیونکہ میں پرائیویٹ طور پر پڑھانا نہیں چاہتا
تھا۔ آخر کار مجھے ملازمت مل گئی۔"

"کیا تم ایک اُستاد بن گئے ——؟"

"ہاں میں مدرسے میں ادب پڑھانے لگا۔ میں نے بڑے جوش و
خروش سے یہ کام شروع کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نوجوانوں
کے ذہن کو بہتر طریقے سے ڈھال سکوں گا۔ میں نے تین ہفتے تک اپنی
لیکچر لکھنے میں صرف کئے ——!"

"کیا اس کی کوئی نقل تمہارے پاس ہے؟"

"نہیں وہ مجھ سے گم ہو چکی ہے۔ میں اپنے اس کام میں
بہت کامیاب رہا۔ پہلا موقع تھا۔ انسپکٹر بھی موجود تھا۔ وہ
ایک بوڑھا آدمی تھا۔ پیلا دُبلا۔ میں نے جب پلیٹ فارم پر
جا کر لیکچر دیا تو میرا خیال تھا کہ وہ لیکچر ایک گھنٹے میں ختم ہوگا۔
لیکن میں نے صرف بیس منٹ لئے۔ وہ بوڑھا انسپکٹر بولا: "
لیکچر اچھا تھا۔ ذرا مبہم تھا دراصل موضوع پر بہت کم باتیں
کی گئی ہیں۔" مگر میرے شاگردوں نے مجھے حیرت سے دیکھا
اور انہوں نے میری حمایت کی۔ اس کے بعد میں نے لکھے بغیر زبانی
لیکچر دینے شروع کر دئے۔

"کیا تم اس میں بھی کامیاب رہے ——؟"

"ہاں —— اس جماعت میں صرف تین چار لڑکے ایسے تھے
جو میری باتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے باقی سب کند ذہن تھے۔ میں
اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ لڑکے میری باتوں کو سمجھتے
تھے وہ بھی بعض اوقات مجھ سے ایسے سوالات کرتے تھے جن
سے میں اُلجھن میں پڑ جاتا تھا۔ اس کے باوجود انھیں مجھ سے محبت
تھی اور وہ امتحان میں پورے نمبر حاصل کرتے تھے۔ اس کے بعد
میرے خلاف ریشہ دوانیوں کا آغاز ہوا۔ میں دراصل پڑھانے
کے سلسلے میں انقلابی تبدیلیاں لانا چاہتا تھا۔ تعلیم کے طریقے میں
اصلاح کا قائل تھا۔ میں ہیڈ ماسٹر کی مدد سے یہ اصلاحات
نافذ کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہیڈ ماسٹر ایک نیک انسان تھا۔ اُس کی
بیوی میرا حوصلہ بڑھایا کرتی تھی۔ میں اُس جیسی بہت کم عورتوں
سے ملا تھا۔ اس کی عمر تیس برس سے زائد تھی لیکن وہ ہر خوبصورت
چیز سے ایک پندرہ برس کی لڑکی کی طرح محبت کرتی تھی، ہر ایک کے
سامنے وہ اپنے خیالات کا بے باکی سے اظہار کرتی تھی میں اس
کی روح کی پاکیزگی اور اس کے مقدس جوش و خروش کو کبھی فراموش
نہیں کر سکوں گا۔ اس کے مشورے سے میں نے ایک تجویز تیار کی مگر
میرے سامنے ہی اس پر پھبتیاں لگانے لگے۔ علم ریاضی کے اُستاد نے
جو میرا مخالف تھا مجھے سخت نقصان پہنچایا۔"

"ہاں یہ تو کہو تمہارے مخالف کا کیا حال ہے؟"

"اُس نے شہر کی ایک عورت سے شادی کر لی ہے اور یہ
عام افواہ ہے کہ وہ عورت اُسے پیٹتی ہے ——!"

"جیسے کو تیسا ملنا چاہئے۔ [illegible] لیا ماسلکایا کا کیا حال ہے؟"

"اچھی ہے ——"

"خوش ہے؟"

"ہاں ——"

رودن خاموش ہو گیا اور پھر چونکتے ہوئے بولا: "ہاں
تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ خوب یاد آیا۔ علم ریاضی کا ٹیچر جو مجھ سے نفرت
کرتا تھا۔ یہ بات بنائی کہ میرے لیکچر آگے ہوتے ہیں —— بالکل آگے۔ اور
پھر اُس نے یہ بات پھیلا دی کہ ہیڈ ماسٹر کی بیوی کے متعلق میری نیت اچھی
نہیں ہے —— انسپکٹر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ جس سے میری [illegible] نہیں
سکی تھی۔ اس انسپکٹر نے ہیڈ ماسٹر کو میرے خلاف کر دیا۔ جھگڑا ہوا۔
میں نے سرنگوں ہونے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ کا حکام کو بھی پتہ چلا اور
مجھے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ مگر میں چپکا نہ بیٹھا۔ میں انہیں بتا دینا چاہتا
تھا کہ میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اب میرا خیال ہے کہ
مجھے یہاں سے روانہ ہونا پڑے گا۔"

رودن خاموش ہو گیا اور دونوں دوست دیر تک خاموش رہے
اور پھر رودن بولا: "میں کوتسف٭ کے الفاظ میں کہہ سکتا ہوں: "تم نے
میری محبوبہ مجھے اتنے دُکھ دئے ہیں کہ اب نجات کا بھی کوئی راستہ میرے
سامنے کھلا نہیں ہے۔" میں تمہیں بتا دوں کہ اب میرے لئے کچھ بھی نہیں
رہا۔ اس کے باوجود اس دھرتی پر کوئی ایسا کام نہیں ہے جسے میں نہ کر سکوں
میں پہلے یہ نہیں جانتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں لیکن اب میں بلند آواز سے
کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کیا چاہئے۔ میں حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے

٭ کوتسف روس کا ایک سرکردہ جمہوری شاعر تھا۔ یہ الفاظ اس کی نظم "دوراہا"
سے لئے گئے ہیں۔

کے لئے تیار ہوں ۔ میرا مطالبہ زیادہ نہیں ہے ۔ میں اس منزل تک پہنچنا
چاہتا ہوں جو میرے نزدیک ہے ۔ تاکہ میں کسی کام آسکوں ۔ وہ کونسی
چیز ہے جو مجھے دوسروں کی طرح کام کرنے سے روک رہی ہے ؟ ۔ بس
اب میں یہی سوچتا ہوں اور یہی میرے خواب ہیں ۔ میں جب بھی کوئی کام
کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اب میں یہاں جم گیا ہوں ۔ اس وقت تقدیر
میرے خلاف ہو جاتی ہے ۔ کیا تم میرے لئے یہ معمہ حل کر سکتے ہو ؟"

"یہ واقعی ایک بہت بڑا معمہ ہے ۔" لیز نف بولا " تم خود بھی
میرے لئے ایک معمہ رہے ہو ۔ تم عظیم قوتیں رکھتے ہو ۔ لیکن اپنے مقصد
کو حاصل کرنے کیلئے تھکا دینے والا راستہ اختیار کرتے ہو "

" وہ محض الفاظ تھے میرے دوست میں نے کوئی کام نہیں کیا"
رودن بولا ۔

" ہاں ۔ مگر اچھا الفاظ بھی ایک کارنامہ ہوتا ہے ۔"

رودن نے خاموشی سے لیز نف کی طرف دیکھا اور اپنا سر اوپر
اٹھایا لیز نف کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اپنے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیر کر رہ گیا ۔

" تم کیا واپس اپنے گاؤں جا رہے ہو ۔ ؟" لیز نف نے پوچھا ۔

" ہاں ۔"

"کیا ابھی تک تم اس کے مالک ہو ؟"

" ہاں اس کا کچھ حصہ ابھی تک میرے پاس ہے ۔ صرف دو
چار غلام کسان ہیں ۔ بس یوں سمجھ لو کہ وہ ایک ایسا کونہ ہے جہاں میں
آرام سے مر سکتا ہوں ۔ تم شاید سمجھ رہے ہو کہ میں اب بھی خوبصورت
الفاظ ادا کر رہا ہوں ۔ لیکن یہی الفاظ میری تباہی ہیں ۔ میں ان سے
نجات حاصل نہیں کر سکتا ۔ تم نے میرے متعلق بہت غلط اندازہ لگایا ہے
اور کڑا تجزیہ کیا ہے ۔ لیکن میرے دوست یہ صرف الفاظ نہیں ہیں ۔
یہ بال ۔ یہ جھریاں ۔ یہ گھسی ہوئی کہنیاں ۔ خیر اب وقت گذر چکا
ہے ۔ لیمپ میں تیل نہیں رہا اور شعلہ بھڑک رہا ہے ۔ میرے دوست
موت ہی سکون کا پیغام لائے گی "

لیز نف اچھل کر کھڑا ہو گیا ۔" رودن تم ایسی باتیں کیوں کہتے
ہو ۔ کیا تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں تمہارے متعلق کیا سوچتا ہوں ۔
تو سنو ۔ میں کہتا ہوں کہ رہا وہ شخص جو اپنی ذہانت کی وجہ سے کیا
کچھ حاصل نہیں کر سکتا تھا ۔ وہ اس دنیا کی کونسی دولت جمع نہیں کر سکتا
تھا ۔ اگر وہ چاہتا تو وہ یہ سب کچھ حاصل کر سکتا تھا ۔ لیکن آج میں اسے
بھوکا اور بے گھر دیکھ رہا ہوں ۔"

" تم مجھ پر ترس کھا رہے ہو ۔" رودن نے کہا ۔

" نہیں تم یہاں غلطی کر رہے ہو ۔ میں تمہارا احترام کرتا ہوں ۔
اگر تم نے اس امیر جاگیردار کو ہی خوش کیا ہوتا تو وہ تمہارے قدموں
پر دولت کے انبار لگا دیتا ۔ تم اسکول میں کیوں ناکام ہوئے ۔ اس لئے
کہ تم نے اپنے مفادات کی قربانی دی ۔"

" میں تو پیدا ہی اس لئے ہوا تھا کہ ایک پتھر کی طرح لڑھکتا رہوں
اور ہمیشہ لڑھکتا رہوں گا ۔"

" ٹھیک ہے ۔ لیکن یہ اس کیڑے کی وجہ سے نہیں ہے جس کا
تم نے ابھی ذکر کیا تھا ۔ تمہارے باطن میں صداقت کے لئے محبت کا
دیا جل رہا ہے ۔ اور تمہارے اندر یہ دیا ہم لوگوں کے دئیے سے
زیادہ روشن ہے ۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس کیڑے کو کبھی کا ختم
کر چکا ہوتا اور ہر بات پر تیار ہو جاتا مگر تم نے اس سے کوئی سمجھوتہ نہیں
کیا ۔ میرا تو اب بھی یہی خیال ہے کہ تم ایک نوجوان کی طرح پھر کسی تجربات
کا آغاز کرنے والے ہو ۔"

" نہیں میرے دوست میں بہت تھک چکا ہوں ۔"

" تھک چکے ہو ۔ یہ کیا کہہ رہے ہو ۔ تمہاری جگہ کوئی دوسرا
ہوتا تو کبھی کا مر گیا ہوتا ۔ تم سمجھتے ہو کہ موت سکون بخش ہوتی ہے ۔
مگر تمہارا کیا خیال ہے کیا حیات بھی سکون نہیں بخشتی ؟ جو شخص زندہ
ہے اور اپنے ساتھیوں کی طرف روادار نہیں ہے وہ اپنے لئے بھی
روادار نہیں ہو سکتا ۔ تم جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے ہو ۔ تم اور کیا کرتے ؟"

" میرے دوست ۔ تم تو ایک بالکل بدلے ہوئے انسان ہو ۔"
رودن نے سرد آہ بھر کے مداخلت کرتے ہوئے کہا ۔

" یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے راستے جدا ہو گئے چونکہ میں نے ایک
دولت مند گھرانے میں جنم لیا تھا ۔ مگر غور سے دیکھو ۔ ہم ایک دوسرے
کے کس قدر قریب ہیں ۔ ہم ایک سی زبان بولتے ہیں ۔ ایک دوسرے کو
فوراً سمجھ لیتے ہیں ۔ ہم ایک ہی سا آدرش لیکر بڑھے ہوئے ہیں ہم میں
سے اب رہ ہی کتنے گئے ہیں میرے دوست ۔ پہلے ہم ایک دوسرے
سے اختلاف کر سکتے تھے لیکن اب کیونکر کر سکتے ہیں جبکہ نئی پود ہمارے
سامنے سے گذر رہی ہے اور ہماری منزل پر پہنچنے کے لئے تلی ہوئی
ہے ۔ ہمیں اب ایک دوسرے کے قریب رہنا چاہیئے ۔ میرے دوست

اپنا کام ... سا ... اتحاد کے معاہدہ پر دستخط کریں۔"

دونوں دوستوں نے اپنے گلاس ٹکرائے۔ وہ لوگ بے حد متاثر
ہے ... اور دونوں نے ... اپنے وقت کا وہ گیت
گایا جو ... گانے لگے۔

"میں جانتا تھا کہ اب تم کہاں جا رہے ہو" لیزنف بولا۔
"تم ... — میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہارا انجام کیا ہوگا۔
لیکن اس بات کو یاد رکھنا کہ تم پر چاہے کچھ بھی کیوں نہ بیت جائے
تمہارے پاس ایک جگہ ہے۔ ایک آشیانہ جہاں تم پناہ لے سکتے
ہو۔ میں اپنے گھر کی بات کر رہا ہوں میرے دوست — خیالات بھی
... ہوتے ہیں انہیں بھی گھر کی ضرورت ہوتی ہے۔"

رودن اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا — "شکریہ میرے دوست۔
شکریہ — میں اس بات کو ہرگز نہیں بھولوں گا۔ میں اگرچہ اس کے قابل
نہیں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی غلط بسر کی ہے۔ میں نے اپنے خیالات
کی اس طرح خدمت نہیں کی جس طرح کہ مجھے کرنا چاہیئے تھی۔"

"چپ رہو — قدرت نے جس طرح کسی انسان کو بنایا ہے وہ
اسی طرح رہتا ہے" لیزنف بولا "اس سے کسی اور بات کا مطالبہ نہیں
کیا جا سکتا۔ تم اپنے آپ کو ایک آوارہ گرد یہودی کہتے ہو — لیکن
تمہیں کیا خبر ہے شاید تمہاری قسمت میں مسلسل آوارہ گردی لکھی ہے۔
شاید تم اس طرح کوئی مقصد عظیم پورا کر رہے ہو جس کی تمہیں خبر نہیں۔
کیا تم جا رہے ہو" لیزنف نے پوچھا چونکہ رودن نے اپنی ٹوپی
اٹھا لی تھی۔ "کیا تم رات یہاں بسر نہیں کرو گے؟"

"نہیں میں جا رہا ہوں۔ خدا حافظ اور شکریہ — ہاں میرا
بہت برا انجام ہوگا۔"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے — کیا تم واقعی جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں خدا حافظ — مجھے ہمیشہ مہربانی سے یاد کرنا۔"

"بہت اچھا — تم بھی مجھے مہربانی سے یاد کیا کرنا۔ اور میں
نے جو بات کہی ہے اسے بھول نہ جانا۔ اچھا خدا حافظ۔"

دونوں دوست بغلگیر ہوئے اور رودن تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا
چلا گیا۔ لیزنف دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا اور پھر کھڑکی کے قریب جا کر
رک گیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور بڑبڑا رہا تھا "بیچارا
(یہودی)" پھر وہ میز کے گرد جا بیٹھا اور اس نے اپنی بیوی کو خط لکھا۔

باہر ہوا چل رہی تھی اور چیخ رہی تھی اور اس کی کھڑکیوں کو کھڑکھڑا
رہی تھی۔ موسم خزاں کی طویل رات آ پہنچی تھی۔ وہ لوگ کتنے خوش
قسمت ہیں جو اپنے گھروں کی چھت تلے بیٹھے ہیں اور جن کے پاس ایک
گرم گوشہ ہوتا ہے — اور خدا بے گھر آوارہ گردوں پر اپنا رحم کرے۔

....

۲۶ جون ۱۸۴۸ء کی ایک گرم دوپہر کو پیرس میں مزدوروں کی
بغاوت کو دبانے کی مہم آخری مرحلے میں تھی اس وقت ایک باقاعدہ
پیدل پلٹن فوبرگ سینٹ انٹون کے شہر کی ایک گلی میں ایک مورچہ پر
حملہ کر رہی تھی۔ توپ کے گولوں نے اس مورچہ کو توڑ دیا تھا اور اس
مورچہ کے جتنے محافظ زندہ رہے تھے وہ سب کے سب اپنی
جان بچانے کی سوچ رہے تھے۔ دفعتاً اس مورچہ کے عین اوپر ایک
ٹوٹی پھوٹی بس پر ایک دراز قد شخص نمودار ہوا۔ اس نے ایک پرانا
اور بوسیدہ کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے سر پر سرخ رنگ کی شکنوں والی
ٹوپی تھی اور اس ٹوپی میں سے اس کے سفید بالوں کی لٹیں باہر نکلی ہوئی تھیں
اس کے ایک ہاتھ میں سرخ جھنڈا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کند تلوار
تھی وہ عجیب و غریب لہجہ اور چیختی ہوئی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور
اپنے سر کے اوپر اس جھنڈے اور تلوار کو لہرا رہا تھا۔ شاہی حکومت
کے ایک فوجی نے نشانہ باندھا اور گولی داغ دی۔ وہ دراز قد شخص
جھنڈے کو پھینک کر ایک بوری کی طرح اوندھے منہ گر پڑا۔ جیسے وہ
اپنے آپ کو کسی کے قدموں پر گرا رہا ہو۔ گولی اس کے دل کو چیرتی ہوئی
نکل گئی تھی۔ ایک باغی نے بھاگتے ہوئے کہا "یہ ہمارا کمانڈر تھا"۔

"ہاں" — دوسرے نے جواب دیا۔ اور پھر وہ دونوں ایک گھر کے
تہ خانے کی طرف بھاگ گئے جس کی کھڑکیاں بند تھیں اور اس مکان کی دیواریں
گولیوں اور توپ کے گولوں سے چھدی ہوئی تھیں۔

اور وہ کمانڈر دمتری رودن تھا۔

نکولائی گوگل

نکولائی گوگل پولٹاوا کے قریب سارو چینزی کے مقام پر ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا۔ گوگل نے اپنا بچپن دیہی یوکرین میں بسر کیا۔ وہ زمانہ یوکرین کا سنہری زمانہ تھا۔ اس کے والدین چھوٹے جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا باپ ایک اچھا اداکار تھا اور اس نے کچھ مزاحیہ ناٹک بھی لکھے تھے۔ گوگل کو یہ صفات اپنے باپ سے ورثے میں ملیں۔ اپنے اسکول کے ایام میں گوگل بھی ایک اچھا اداکار تھا۔

گوگل کا قد چھوٹا تھا اور وہ اکثر بیمار رہتا تھا۔ گوگل اپنی ان کمزوریوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اس نے اپنی کمزوریوں کا بہتر حل ڈھونڈنے کے لئے مشاہدہ پسندی کا آغاز کیا اس نے طنز و مزاح کو اپنا خاص موضوع بنایا۔ وہ افسانوں میں مضحکہ خیز باتوں کا خاص طور سے مشاہدہ کرتا تھا۔ اس کی اہم نگارشات "انسپکٹر جنرل" اور "مردہ روحیں" اس کے اس ذہنی جھکاؤ کا ثبوت ہیں۔

اس نے طنز و مزاح میں بڑا نام پیدا کیا۔ اپنے فن میں پختگی حاصل کرنے سے پہلے اسے بہت سی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ اپنے احساس کمتری کو چھپانے کے لئے ہمیشہ اس انداز میں سوچا کرتا تھا کہ اسے دنیا میں عظیم کارنامے سرانجام دینا ہیں۔ وہ اس مقصد کے لئے سینٹ پیٹرس برگ پہنچا۔ جہاں اس کا خیال تھا کہ وہ ایک شاندار زندگی کا آغاز کرے گا ـــــ مگر وہاں جاکر اسے ایک کلرک بننا پڑا اور اس کی تمام تمناؤں پر اوس پڑ گئی ـــ کلرکی سے مایوس ہو کر اس نے اسٹیج پر اداکاری کو اپنا پیشہ بنانا چاہا۔ لیکن اس کی آواز اتنی کمزور تھی کہ یہاں بھی اسے ایک تلخ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ـــ آخر کار سب طرف سے مایوس ہو کر اس نے ادب کے میدان کا رخ کیا۔ اس کی کہانیاں بہت کامیاب ہوئیں۔ ان کہانیوں میں مزاح کی نہایت اچھی جھلکیاں ملتی ہیں۔ وہ نشتر زنی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ گوگل نے خود اپنے اس فن کی وضاحت کی ہے۔ اس نے کہا ـــ "میں بہت اداس رہتا تھا اور مجھے قہقہوں کی تلاش تھی ـــ میں یہ قہقہے اپنے افسانوں میں بھر دیا کرتا تھا۔"

سینٹ پیٹرس برگ میں نکولائی گوگل نے ایک نہایت اندوہناک زندگی بسر کی تھی۔ اس نے اپنے اس ناولٹ "نفیسکی پراسپیکٹ" میں سینٹ پیٹرس برگ سے انتقام لیا ہے۔ جن لوگوں نے اسے رنج پہنچایا تھا اس نے اس ناولٹ میں ان کا مضحکہ اڑایا ہے۔ مگر اتنا خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اس نے حقیقت کو کہیں مسخ نہیں ہونے دیا۔ گوگل مضحکہ خیز کردار اور عجیب و غریب واقعات ایجاد کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اور اس کا یہ ناولٹ اس کی جدت و اختراع کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

نکولائی گوگل

مترجم: دلیپ سنگھ

دیارِ جاناں

سینٹ پیٹرس برگ میں بہر صورت بازار نیفسکی پراسپکٹ کا کسی دوسرے بازار سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ اس شہر کے لئے یہ بازار ہر چیز پر حاوی ہے۔

یہ بہار کا حسن ہے ــــ مجھے یقین ہے کہ اس شہر کی زرد اور کمزور لوگوں کی آبادی میں سے ایک بھی شخص نیفسکی پراسپکٹ کو کسی دوسری ارضی نعمت سے تبدیل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا ــــ وہ صرف ۲۵ برس کی عمر کا پرشباب نوجوان جس کی مونچھیں حسین ہوتی ہیں۔ اور جو کسی اچھے درزی کا حیرت انگیز حد تک سلا ہوا نفیس ملبوس کوٹ پہنتا ہو۔ بلکہ وہ شخص بھی جس کی ٹھوڑی پر سفید بال اُگے ہوتے ہیں۔ اور جس کا سر چاندی کی طشتری کی طرح چمکدار ہوتا ہے۔ بازار نیفسکی پراسپکٹ کے بارے میں بہت جوش و خروش کا اظہار کرتا ہے ــــ اور خواتین! اوہ ان خواتین کے لئے تو یہ بازار بہت بڑی مسرت ہے ــــ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس بازار کے سلسلے میں مسرور کون نہیں ہے ــــ

آپ ابھی اس بازار میں داخل ہی ہوتے ہیں۔ کہ آپ پاکیزہ چہل قدمی کی خوشبو سے دوچار ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی ضروری کام بھی ہوتا ہے تب بھی آپ اس بازار میں قدم رکھتے ہی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ یہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں لوگ خود پسند نہیں ہیں۔ اور جہاں انھیں وہ ضرورت اور کاروباری مفاد نہیں لاتا جس نے سارے سینٹ پیٹرس برگ کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے ــــ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس بازار نیفسکی پراسپکٹ میں جس آدمی سے ملتے ہیں وہ مارسکایا ' گورخوودایا ' لتے تایا اور میش چانسکایا ' کے بازاروں میں ملنے والے آدمی کی بہ نسبت کم انانیت پسند ہے۔ جہاں حرص و ہوس ' ذاتی مفاد اور ضرورت کے آثار ہر راہ گیر اور ان لوگوں کے چہروں پر ثبت ہوتے ہیں۔ جو گاڑیوں اور ٹمٹم میں بھاگے پھرتے ہیں۔ نیفسکی پراسپکٹ ایک طرح سے سینٹ پیٹرس برگ کی چوپال ہے ــــ وہ شخص جو سینٹ پیٹرس برگ میں یا وابورگ ضلع میں رہتا ہے اور اپنے دوستوں سے پیسکی یا ماسکو دروازے پر ملنے کے لئے برسوں نہیں گیا ہوتا اُسے یقین ہوتا ہے کہ اس کے احباب اس بازار میں ضرور مل جائیں گے۔ نیفسکی پراسپکٹ میں جتنی صحیح اطلاع مل سکے گی ' وہ نہ تو کوئی تیسری کی کتاب اور نہ کوئی ڈاک خانہ مہیا کر سکتا ہے ــــ نیفسکی پراسپکٹ قادرِ مطلق ہے ــــ سینٹ پیٹرس برگ میں رہنے والا ایک غریب آدمی جب اس میں سیر کے لئے آتا ہے تو بے مثال جوش و خروش محسوس کرتا ہے۔ ــــ اس کی پٹڑیاں کتنی صاف ہیں۔

اوہ میرے خدا ــــ کتنے ہی قدموں کے ان پر نشانات موجود ہیں۔ ایک تُند خو وحشی فوجی کے بھونڈے اور گندے بوٹوں کے نشان جس کے بوجھ تلے چٹان بھی چیخ جاتی ہے ــــ اور ایک عورت کے ننھے منے دھوئیں کی طرح ہلکے سلیپروں کے نشان ' جو دوکانوں کی تابناک کھڑکیوں کی طرف یوں اپنی گردن موڑتی ہے جیسے سورج مکھی کا پھول سورج کی طرف ــــ ان پٹڑیوں پر ایک علم بردار فوجی کی تلوار کا نشان بھی ہے جس سے اُن پر خراش پڑ گئی ہے ــــ ہر شخص ان پٹڑیوں سے اپنی کمزوری اور اپنی طاقت سے انتقام لیتا ہے ــــ یہاں ایک دن کے دوران کتنے ہی فریب نظر کے مظاہر جمع ہوتے ہیں ــــ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر یہاں کتنی ہی تبدیلیاں ظہور میں آتی ہیں۔

ہم اپنی کہانی کا آغاز بہت سویرے سے کرتے ہیں جب تمام سینٹ پیٹرس برگ ایک تازہ پکائی ہوئی گرم روٹی کی طرح خوشبو چھوڑتا ہے۔

اور سب پیچھے ... میں ملبوس بوڑھی عورتیں پاک باز اور رحم دل راہ گیروں سے بھیک مانگنے کی غرض سے دعا مانگ رہی ہیں۔
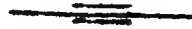
اس وقت نیوسکی پراسپیکٹ خالی ہوتا ہے۔ موٹے پیٹ والے دوکاندار اور اُن کے منشی بابو اس وقت سوئے ہوتے ہیں۔ اور یا پھر منہ ہاتھ دھو کر کافی پی رہے ہوتے ہیں۔ پیسٹری بنانے والوں کی دکان کے سامنے بھیک مانگنے والے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور جنھیں جو کل دِ اکلیٹ کے پیالے ہاتھوں میں تھامے مکھی کی طرح اُڑتا پھر رہا تھا۔ اب نیم خوابی کی حالت میں ہاتھ میں جھاڑو تھامے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے دوکان سے باہر نکلتا ہے اور باسی پیسٹریاں اور روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے اُن کی طرف پھینکتا ہے۔ سڑک کے کنارے آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جنھیں مجبوراً وہاں آنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی روسی کسان جس کے بوٹ چونے میں اس قدر لتھڑے ہوئے ہیں۔ کہ انھیں کیتھرائن دی گریٹ کی نہر جو اپنی صفائی کے لئے مشہور ہے۔ بھی شاید صاف نہ کر سکے۔ کام پر جاتے ہوئے سڑک کو عبور کرتا ہے۔ ایسے وقت پر عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ روسی لوگ اپنے خیالات کا اظہار کچھ ایسے نامناسب الفاظ میں کرنا پسند کرتے ہیں کہ عورتیں انھیں تھیٹر میں ہی سننا پسند کرتیں۔ کبھی کبھار کوئی کلرک اپنی بغل میں فائلوں کا پلندہ تھامے ہوئے نظر آجاتا ہے۔ اگر اس کے دفتر کا راستہ اُس گلی کی طرف سے ہو۔ قصہ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت سے بارہ بجے تک نیوسکی پراسپیکٹ کسی کی منزلِ مقصود نہیں۔ بلکہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آہستہ آہستہ اس میں ایسے لوگ آنے شروع ہوتے ہیں جنھیں اپنی فکر دامنگیر ہوتی ہے اور جو اپنے خیالات میں گم ہو چلے جاتے ہیں۔ اور جنھیں اس گلی کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ روسی کسان اپنی ساتھ "گوشت" چاندی کی بات کر رہا ہوتا ہے۔ بوڑھے مرد اور عورتیں۔ اپنے ہاتھوں کو ہلا رہے ہوتے ہیں۔ اور بڑے نمایاں اشاروں کے ساتھ خود سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں لیکن کوئی نہ تو اُن کی بات سنتا ہے اور نہ اُن کے ہاتھوں کی حرکت پر ہنستا ہے سوائے اُن شریر بچوں کے جو لکیر دار کپڑے کی بنی جیکٹیں پہنے ہاتھ میں خالی برتن یا مرمت شدہ جوتے لئے اُس گلی میں بجلی کی سی پھرتی سے بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوپہر کے وقت ہر قوم کے گورنس اپنے طلباء کے ہمراہ اس گلی پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ انگریز اور فرانسیسی استاد اپنے شاگردوں کو انگلی لگائے مناسب سنجیدگی سے یہ بتاتے ہوئے گزرتے ہیں کہ یہ جو دوکانوں پر سائن بورڈ لگائے گئے ہیں۔ یہ اس لئے لگائے گئے ہیں کہ لوگ ان ہی کو دیکھ کر بتا دیں کہ فلاں دوکان کے اندر کونسی چیز بکتی ہے۔ زرد رنگ کی مامائیں اپنے ساتھ شوخ و شنگ ننھی لڑکیوں کو یہ بتاتے ہوئے گزرتی ہیں کہ اپنے کندھوں کو قدرے ابھار کر اکڑ کر چلنا چاہئے۔ مختصر یہ کہ نیوسکی پراسپیکٹ پر اس وقت مدرسانہ ماحول چھایا ہوتا ہے۔

دو بجے کے قریب یہ استاد، مامائیں اور طلباء کم سے کم تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس گلی میں بچوں کے بھلے چنگے والدین اپنی شوخ و شنگ خاتون دوستوں کو ساتھ لئے اس گلی میں آدھمکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان میں وہ تمام لوگ شامل ہوتے ہیں جو اپنے گھر کے ضروری معاملات میں مصروف تھے۔ اور ابھی ابھی اُن سے فارغ ہوئے تھے۔ اُن کے ضروری معاملات کچھ اس قسم کے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر کے ساتھ موسم کے متعلق بات چیت کی۔ اور اُس نامعلوم سی پھنسی کے بارے میں اُس کا مشورہ لیا۔ جو اُن کی ناک پر اُبھر آئی ہے۔ یا اپنے گھوڑوں اور بچوں کی خیر و عافیت دریافت کی یا اخبار میں تازہ واردان شہر اور شہر سے رخصت ہونے والوں کے نام کی فہرست پڑھی یا کسی تھیٹر کا اشتہار دیکھا۔ اور آخر میں کافی کا ایک پیالہ پیا۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی اس گلی میں آشامل ہوتے ہیں۔ جنھیں خدا نے کلرک کے عزت دار رتبے سے سرفراز کیا ہے۔ پھر

میں وہ لوگ آملتے ہیں جو خاص آفس میں کام کرتے ہیں۔ اور اپنے پیشے اور عادات کی وجہ سے نمایاں ہیں۔ سیکرٹریٹ کے افسر اور یہ ملازمین کتنی حیران کن ہوتی ہیں۔ یہ دل کو کس قدر خوشی پہنچاتے ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ میں ملازم نہیں ہوں اور اپنے افسرانِ بالا کی ہیک ہونی کا اندازہ لگانے سے قاصر ہوں۔ جیسے جناب کو نیوی کی پیک میں نظر آتی ہے۔ اس میں ایک خاص سلیقہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ اپنے پتلونوں کی جیب ہاتھ ڈال کر چلنے والے نوجوان ہوں یا سُرخ سفید اور نیلی ساٹن کا لباس اور خوبصورت پینٹ پہنے والی عورتیں ہوں۔ یہاں آپ کو قسم قسم کی مونچھیں نظر آئیں گی۔ بھوری مونچھیں، ریشمی مونچھیں کوئلے کی طرح سیاہ مونچھیں ـــــ لیکن یہ سیاہ مونچھیں آپ کو محکمہ خارجہ کے کارکنوں کے چہروں پر نظر آئیں گی۔ خدا نے دوسرے دفتروں میں کام کرنے والوں کو یہ عطیہ نہیں بخشا۔ وہ چاہے کتنا ہی ناپسند کریں۔ انہیں مجبوراً سُرخ مونچھیں رکھنا پڑتی ہیں ـــــ آپ کو یہاں ایسی ایسی مونچھیں نظر آئیں گی جو نہ تو برش بنا سکتا ہے نہ قلم بیان کر سکتا ہے۔ ایسی ایسی مونچھیں جن پر زندگی کا بیشتر حصہ صرف کر دیا گیا ہے اور ایسی مونچھیں جن کی حفاظت کی گئی ہے ـــــ مونچھیں جنہیں بہترین قسم کی خوشبو دار ملہم سے آراستہ کیا گیا ہے۔ جنہیں رات کے وقت بہترین قسم کے کاغذ میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ مونچھیں ـــــ جن پر ان کے مالکوں نے محبت کے حسین ترین جذبات قربان کر دیئے ہیں۔ مونچھیں جنہیں راہ گیر حاسدانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اس گلی میں آپ کو ہزاروں قسم کے زنانے کوٹ، بینٹ اور رومال نظر آتے ہیں جنہیں دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور جو کم سے کم دو دن کے لئے اپنے مالک کے جسم سے جدا نہیں ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تتلیوں کا ایک بھاری گروہ پھولوں سے اُٹھ کر ایک بادل کی طرح مردوں کے کالے سروں پر منڈلا رہا ہو۔ یہاں آپ کو ایسی ایسی کمر نظر آئے گی جو آپ نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی۔ ایسی ایسی پتلی کمر جو بوتل کی گردن سے زیادہ پتلی نہیں۔ جنہیں دیکھ کر آپ ادب سے ایک طرف ہو جائیں گے کہ کہیں آپ کی کہنی اس سے چھو نہ جائے۔ آپ کے دل پر خوف سا چھا جائے گا کہ کہیں آپ کی کوئی گستاخ سانس قدرت اور فن کے اس عجوبہ کو ضرر نہ پہنچائے۔ اور پھر عورتوں کے کیسے کیسے آستین اس گلی میں نظر آئیں گے۔ اور وہ صنعت کے کتنے حسین نمونے ہیں۔ بالکل دو غباروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اگر ان عورتوں کو فضا میں تیرنے ہوا میں اُڑ جائیں کیونکہ ایک عورت کو ہوا میں اُٹھا لینا اتنا ہی آسان ہے اور بڑا لطف جتنا ایک شمپین کے گلاس کو ہونٹوں تک لے جانا۔ دنیا کے کسی کونے میں دو آدمی ایک دوسرے کو اس طرح جھک کر نہیں ملتے۔ جیسے اس گلی میں ملتے ہیں۔ یہاں پر آپ کو بے مثال مسکراہٹیں نظر آئیں گی۔ جن کو پیدا کرنے میں بڑی فنکاری سے کام لیا گیا ہے۔ کبھی ایسی مسکراہٹ جو آپ کو خوشی سے پاگل کر دے۔ اور کبھی ایسی کہ آپ شرم سے زمین میں گڑ جائیں۔ اور پھر کبھی ایسی کہ جسے دیکھ کر آپ اپنے کو کسی جہاز کے مستول سے بھی زیادہ بلند محسوس کریں۔ یہاں آپ کو ایسے آدمی ملیں گے جو موسم یا کسی کنسرٹ کا ذکر بھی کریں۔ تو آپ کو ان کے خاندان کی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں آپ کو ہزاروں قسم کی عادات و اخلاق کے لوگ ملیں گے۔ کیسے کیسے عجیب و غریب آدمیوں سے اس گلی میں ملاقات ہوتی ہے یہاں کئی ایسے آدمی ہیں جو آپ سے ملتے ہیں تو عموماً آپ کے جوتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں لیکن جب آپ گزر جاتے ہیں تو وہ پیچھے مڑ کر آپ کے کوٹ کا دامن دیکھتے ہیں مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ شروع شروع تو مجھے خیال ہوا کہ یہ شاید موچی ہیں لیکن یہ بالکل غلط تھا کیونکہ ان میں سے اکثر دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو گھوم پھر کر یا چائے خانوں میں بیٹھ کر اخبار پڑھتے ہوئے اپنا وقت گزارتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ لوگ عام طور پر بڑے ہی دلچسپ ہوتے ہیں۔

بعد از دوپہر اور دو بجے کے درمیان کے خوش نصیب وقت پر یہ گلی اپنی پوری تابانی پر ہوتی ہے۔ انسان کی بہترین تخلیق کی اس وقت یہاں نمائش ہوتی ہے کہیں تو آپ کو بہترین فراک کوٹ نظر آتا ہے۔ اور کہیں یونانی ناک کا بہترین نمونہ کہیں پر بہترین مونچھیں نظر آتی ہیں۔ کہیں پر کوئی عورت ـــ دو خوبصورت آنکھیں اور ایک حیران کن چھوٹا سا ہیٹ اور پھر کوئی اور عورت جس کی نازک اور خوبصورت انگلی پر ہیرے کی طلسمی انگوٹھی نظر آتی ہے۔

جونہی تین بجتے ہیں۔ تو اس گلی میں گھومنے والوں میں ایک اور تبدیلی نمودار ہوتی ہے۔ اس وقت اس گلی میں اچانک بہار آجاتی ہے۔ اس میں سبز لباس پہنے والے کلرک آدھمکتے ہیں۔ اس وقت یہاں آپ کو کالجیٹ رجسٹرار اور پروونشل سکریٹری اس انداز سے ٹہلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ جس سے یہ ظاہر کرنا مطلوب ہوتا ہے کہ

وہ کونسل چیمبر میں چھ گھنٹوں سے زیادہ نہیں بیٹھے لیکن بوڑھے کالجیٹ سکریٹری اور کونسلرز سر جھکائے تیزی سے چلتے ہیں۔ راہگیروں کا نظارہ کرنے کی انھیں فرصت نہیں۔ وہ ابھی تک اپنے دفتر کے کام سے مکمل طور پر قطع تعلق نہیں کر پائے۔ اب بھی اُن کے دماغ میں دفتر کے کاغذات گھوم رہے ہیں۔ کافی دیر تک انھیں دوکانوں کے سائن بورڈز کی بجائے کاغذوں سے بھرے ہوئے بکسے اور چانسلر کے دفتر کے افسرِ اعلیٰ کا چہرہ دکھائی پڑتا ہے۔

چار بجے کے بعد نیوسکی پراسپکٹ خالی ہو جاتا ہے۔ اور آپ کو یہاں پر ایک کلرک بھی نظر نہیں آئے گا۔ کوئی ایک دوکان میں نکل کر نیوسکی پراسپکٹ میں سے گذر جائے یا کوئی اجنبی جس کے لئے سارا وقت ایک سا ہے۔ یا کوئی لمبی اور پتلی انگریز عورت جس کے ہاتھ میں ایک مالا اور ایک کتاب ہے۔ ایک روسی مزدور ایک اوور کوٹ پہنے جس کی کمر اُس کی پشت پر آتی ہے۔ اور جس کی مختصر سی داڑھی ہے جس نے اپنی تمام زندگی تیزی سے چلتے ہوئے گذار دی ہے۔ اور جس کی ہر چیز ہلتی ہے۔ کمر، ہاتھ، ٹانگیں، سر جب وہ چلتا ہے تو اُس کا سب کچھ ہلتا ہے۔ یا کبھی کبھار کوئی مستری۔ اس وقت اس گلی میں آپ کو ان لوگوں کے سوا اور کوئی نہیں ملے گا۔

لیکن جونہی مکانوں اور گلیوں پر شام کے دھندلکے چھا جاتے ہیں۔ اور چوکیدار اپنے آپ کو کمبل میں لپیٹ کر لیمپ جلانے کے لئے نکل پڑتا ہے۔ اور دوکانوں کے شوکیسوں میں سے ایسی ایسی چیزیں جھانکتی ہیں جو دن کے وقت شکل دکھانے کا حوصلہ نہیں کر سکتیں۔ تب نیوسکی پراسپکٹ پر پھر رونق آ جاتی ہے اور پھر وقت شروع ہو جاتا ہے جب لیمپ ہر شے کو حیران کن اور عجیب و غریب بنا دیتی ہے۔

اس وقت آپ بہت سے نوجوانوں سے دو چار ہوں گے جن میں سے اکثر کنوارے ہوتے ہیں اور گرم کوٹ اور چغے میں ملبوس ہوتے ہیں اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کا یہاں آنے کا کوئی مقصد ہو۔ یا مقصد سے ملتا جلتا کوئی جذبہ ہو یعنی آپ یہاں بغیر کوشش کے کھنچے چلے آئے ہیں۔ ہر ایک کے قدم تیزی سے اُٹھ رہے ہوتے ہیں۔ دیواروں اور چھتوں پر لمبے لمبے سائے ابھرتے ہیں جو "پولیس برج" سے بھی اونچے اٹھ جاتے ہیں نوجوان کالجیٹ سکریٹری کچھ دیر تک گھومتے رہتے ہیں۔ لیکن بوڑھے کالجیٹ سکریٹری اور جنرل عام طور پر اس وقت گھر پر بیٹھے ہوتے ہیں کیونکہ یا تو وہ شادی شدہ ہوتے ہیں۔ اور یا پھر اُن کے جرمن باورچی جو اُن کے گھروں میں ہوتے ہیں بہت اچھا کھانا پکاتے ہیں۔ آپ اُن عزت مآب بزرگوں سے جو دو بجے کے قریب اسی گلی میں ٹہل رہے تھے اور جن کی چہل قدمی سے اُن کی اہمیت اور برتری کا احساس ہوتا تھا، ملیں گے۔ لیکن اس وقت وہ بھی کالجیٹ سکریٹری اور کونسلر کی طرح تیزی سے چلتے ہوئے دکھائی دیں گے کیونکہ انھیں بھی اُس عورت کے ہیٹ کے نیچے جھانکنا ہے جس کے اُبھرے اُبھرے سرخ ہونٹ بہت پیارے لگتے ہیں۔ خاص طور پر بارمین، مزدور اور دکاندار لوگ جو ہمیشہ جرمن اوور کوٹ میں ملبوس ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ جیب میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں۔

"ایک منٹ ٹھہرنا" لفٹیننٹ پیروگو نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے ڈریس کوٹ میں ملبوس نوجوان کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "دیکھا تم نے"

"ہاں بھئی دیکھا۔ وہ بہت خوبصورت ہے۔"

"تم کونسی کی بات کر رہے ہو؟"

"اُس کی، جس کے بال کالے ہیں" اوئی اللہ! کتنی پیاری آنکھیں ہیں۔ اور اُس کے چہرے کے نقوش کتنے پیارے ہیں۔"

"لیکن میں تو بھورے بالوں والی اُس لڑکی کی بات کر رہا ہوں جو اُس کے پیچھے گئی ہے، لیکن اگر تم کو وہ لڑکی اتنی پیاری لگی ہے تو اُس کا تعاقب کیوں نہیں کرتے"۔

"تعاقب! کیا بکتے ہو۔ کیا تم اسے اُن عورتوں میں سے سمجھتے ہو جو شام کو نیوسکی پراسپکٹ میں گھومتی ہیں وہ تو ضرور کسی اونچے خاندان کی عورت ہے اُس کا تو اکیلا کوٹ ہی اسی روبل کا ہوگا"۔ اُس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف کہیں کا"۔ پیروگو نے زور سے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "جاؤ جاؤ" اُس کے پیچھے جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے اور میں بھورے بالوں والی لڑکی کا تعاقب کرتا ہوں"۔

۔۔۔دونوں دوست جدا ہو گئے۔

"ہم تمہیں اچھی طرح سمجھتے ہیں" پیٹرو گو نے اپنے آپ کو تسلی
دیتے ہوئے مسکرا کر کہا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ کوئی حسینہ اُسے
پسند نہیں کر سکتی۔

اوورکوٹ میں ملبوس نوجوان شرماتا اور ڈرتا ہوا اس گلی
کی طرف سے پیچھے جہاں لیزا رہتی تھی چلا جا رہا تھا۔ وہ ٹوپی بھی تو لیمپ
کی روشنی میں چمک اٹھتی اور کبھی لمحہ بھر کے لئے سایوں میں ڈوب جاتی۔
اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور انجانے میں اُس کے
قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

وہ ایک لمحے کے لئے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کہ وہ اُس
حسینہ کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا وہ صرف وہ مکان دیکھنا چاہتا
تھا۔ جہاں وہ حسین شمائل مکین تھی۔ وہ حسینہ جو ایسا معلوم ہوتا تھا
جیسے وہ اس گلی میں آسمان سے اُتر آئی ہو اور پھر شاید کسی نامعلوم
جگہ کو چلی جائے۔ وہ اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ وہ لگاتار کئی
عزت دار بھوری مونچھوں والے آدمیوں کو   پرے دھکیل
رہا تھا۔

یہ نوجوان اُس فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو ہمارے درمیان
عجیب سا لگتا ہے۔ اور سینٹ پیٹرز برگ کے ساتھ اُس کا وہی تعلق
ہے جو خواب میں دیکھے ہوئے ایک چہرے کا حقیقی زندگی کے ساتھ
ہوتا ہے۔ سوسائٹی کی یہ مخصوص کلاس اُس شہر میں خاص طور پر عجیب
لگتی ہے۔ جہاں کا ہر ایک باشندہ یا تو کلرک ہے یا دکاندار
اور یا پھر جرمن کاریگر .... وہ ایک آرٹسٹ تھا۔ یہ عجیب
سین ہے کیا؟ آرٹسٹ اور سینٹ پیٹرز برگ میں۔ برفیلی زمین
آرٹسٹ۔ اُس جگہ کا آرٹسٹ جہاں کی ہر چیز بھیگی بھیگی سی ہے۔
صاف چپٹی۔ بھوری اور دھندلی ہے۔ یہ آرٹسٹ اٹلی کے
آرٹسٹوں سے مختلف ہیں۔ اٹلی کے آرٹسٹ اپنے ملک کی زمین
اور آسمان کی طرح مغرور اور جوشیلے ہیں۔ یہاں کے آرٹسٹ عام
طور پر نیک۔ شرمیلے اور الگ تھلگ رہنے والے لوگ ہیں۔
اکثر آپ ایک دو دوستوں کے ساتھ کسی چھوٹے سے کمرے
میں چائے پیتے ہوئے اپنے کسی پسندیدہ مضمون کے متعلق گفتگو
کرتے سنتے ہیں۔ اور اُس مضمون سے ہٹ کر کبھی کوئی بات
نہیں کرتے۔

یہ آرٹسٹ اکثر کسی بوڑھی فقیر عورت کو گھر لے آیا کرتا۔
اور اُسے مجبور کرتا کہ وہ پورے چھ گھنٹے وہاں بیٹھی رہے۔ صرف
اس لئے کہ وہ اس کے دردناک چہرے کو کینوس پر منتقل کر سکے۔
وہ اپنے کمرے کو پینٹ کرتا ہے جس میں ہر ایسی غلاظت کا ڈھیر ہے
جس کا اس کے پیشے کے ساتھ کوئی تعلق ہو سکتا ہے ــــــ
پلاسٹر آف پیرس ــــ جس کا رنگ وقت اور گرد کی متفقہ
کوششوں کی وجہ سے کافی سوچکا ہے ــــ ٹوٹے ہوئے
فریم ــــ ٹوٹا ہوا طنبورہ الٹا پڑا ہے۔ گٹار بجاتے ہوئے
ایک دوست کی تصویر۔ رنگ سے آلودہ دیواریں۔ اور ایک
کھلی کھڑکی جس میں سے نیوا کے زرد رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔
اور اُس کے رشتہ دار غریب مچھیرے اپنی سُرخ قمیصوں میں دکھائی
دیتے ہیں۔ اُن کے ہمیشہ بھورے رنگ کے بال ہوتے ہیں۔
شمالی علاقوں کا خاص نشان۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے
یہ آرٹسٹ لوگ محنت سے کام کرنے میں حقیقی خوشی محسوس کرتے
ہیں۔ اُن میں سے اکثر واقعی اچھے فنکار ہوتے ہیں۔ اور اگر کبھی
وہ اٹلی کی تازہ ہواؤں میں سانس لے سکتے تو اُن کا فن بھی شاید
اُسی آزادی اور بغیر رکاوٹ کے ترقی کرتا جیسے ایک پودا پھیلتا
پھولتا ہے۔ جسے کمرے سے اُٹھا کر باہر رکھ دیا جائے۔ عموماً
طور پر وہ بڑے ڈرپوک ہوتے ہیں۔ کسی اچھے لباس میں ملبوس گاہک
کو دیکھ کر وہ اکثر اپنی تصویروں کی قیمت کم کر دیتے ہیں۔
وہ فیشن ایبل بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے فیشن میں بھی
گنوارپن کی جھلک نظر آتی ہے۔ کبھی آپ کو یہ لوگ بڑے خوبصورت
ڈریس کوٹ میں ملبوس لگتے ہیں لیکن اُس کے اوپر ایک گندہ سا
چغہ ہوگا۔ کبھی ایک قیمتی کرتی اور اُس پر رنگ آلود جیکٹ۔ یعنی
اُسی طرح آپ اُن کو کسی نامکمل سینری پر ایک حسینہ کی تصویر
دیکھیں گے جس کا سر نیچے ہوتا ہے۔ اور پاؤں اوپر۔ اور کسی اور
مناسب جگہ کی ناموجودگی میں یہ تصویر کسی اور نامکمل سینری کا پر
لٹکا دی جائے گی۔

یہ آرٹسٹ کبھی آپ سے آنکھ نہیں ملائیں گے۔ اور اگر کبھی مل
جائے تو شرما کر پرے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کے

دیکھتے ہیں نہ تو عقاب کی سی تیزی ہوتی ہے نہ باز کی سی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آپ کے نقش و نگار دیکھنے کے ساتھ ساتھ پلاسٹر آف پیرس کے بنے ہوئے کسی ہرکولیس کے نقش و نگار بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ جو اُن کے کمرے میں پڑا ہوتا ہے۔ یا وہ اپنی وہ تصویر دیکھ رہے ہوتے ہیں جو ابھی انھوں نے بنائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آپ کی باتوں کا جواب اکثر ٹوٹے پھوٹے اور نامناسب الفاظ میں دیتے ہیں۔ اُن کے دماغ میں مضامین کی آمیختگی انھیں اور شرمیلا بنا دیتی ہے۔

اور اِس کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ نوجوان جس کا ہم ابھی ابھی ذکر کر رہے تھے۔ آرٹسٹ بکاریو — شرمیلا۔ گوشہ نشین۔ لیکن اُس کی روح میں احساسات کے ایسے ذرّے روشن تھے جو موقع ملنے پر شعلوں کی صورت اختیار کر سکتے تھے۔ وہ بے پاؤں اپنی خواہشات کے مرکز کے پیچھے، جس نے اُسے اس قدر مسحور کیا تھا، چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنی اس بدسلوکی پر خود حیران تھا۔ اس اثنا میں اُس اجنبی نے جس پر اُس کی آنکھیں اُس کے خیالات اُس کے احساسات مرکوز ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک دم مڑ کر دیکھا اللہ! اللہ! کیتنے حسین نقش تھے اُس کے۔ ایک نہایت ہی حسین ماتھے کی چند حیا دینے والی سفید رنگت خوبصورت بالوں سے چھپی ہوئی تھی۔ اُس کی حسین زلفیں ہیٹ سے نکل کر اُس کے رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ رخسار جن میں، سے شام کی ٹھنڈی ہواؤں کی تازگی جھلک رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کے اِردگرد حسین خوابوں کا سلسلہ چھایا ہوا تھا — اُس نے بکاریو کو پلٹ کر دیکھا بکاریو کا دل دھڑکنے لگا۔ لڑکی نے اُسے بے حسی سے دیکھا۔ اِس قسم کے بیہودہ تعاقب کی وجہ سے اُس کے چہرے پر حقارت کے جذبات ابھر آئے تھے لیکن غصّے نے اُس کے چہرے کو اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ شرم اور کمزوری کے غلبے کی وجہ سے وہ نظریں جھکا کر رُک گیا۔ لیکن اُس مندر کا پتہ لگائے بغیر جہاں وہ جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کوئی کیسے اُس پری وش سے سبکدوش ہو جائے۔ اُس نوجوان کے دماغ میں اس قسم کے خیالات پیدا ہوئے اور اُس نے تعاقب جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اپنے اس ارادے کو چھپانے کی خاطر وہ کافی فاصلے پر چل رہا تھا۔ یوں ہی اِدھر اُدھر جھانک رہا تھا۔ ظاہراً دوکانوں کے بورڈوں پر نگاہ ڈالے جا رہا تھا۔ لیکن اُس حسین عورت کے ایک قدم سے بھی غافل نہیں تھا۔ راہ گیر کم ہوتے گئے۔ گلی میں خاموشی چھا رہی تھی۔ اُس عورت نے مڑ کر دیکھا اور اُس نوجوان کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ وہ کانپ گیا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

نہیں! اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ضرور لیمپ کی روشنی کا بھرم ہے۔

نہیں! یہ ضرور اُس کے اپنے خوابوں کا عکس ہے۔ اُس کا سانس سینے میں گھٹا جا رہا تھا۔ اُس کے سارے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ اُس کے احساسات جل رہے تھے۔ اور اُس کی نظروں کے سامنے ہر چیز دھندلی سی دکھائی دے رہی تھی اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی ہو گاڑیاں تیز گھوڑوں کے باوجود ساکن کھڑی ہیں۔ پُل پہلے سے بہہ گیا اور پھر ٹوٹ گیا۔ سامنے والا مکان اُلٹا کھڑا ہے۔ ایک جھونپڑی گرتی نظر آئی۔ ایک بورڈ کے سنہری الفاظ اُسے اپنی بھنوؤں پر جھکتے نظر آئے — یہ تمام تصورات ایک حسین چہرے کی فقط ایک جنبش کا نتیجہ تھے۔ بغیر کچھ سُنے دیکھے یا سمجھے وہ اُن حسین قدموں کے پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اُس کے پاؤں اس کے دل کی رفتار کے ساتھ چل رہے تھے۔ کبھی تو وہ اُس حسینہ کے اشارے کے متعلق شک میں مبتلا ہو جاتا۔ اس پر وہ ایک لمحے کے لئے رُک جاتا لیکن اُس کے دل کی دھڑکن اور ایک غیبی طاقت اُسے مجبور کرتی کہ وہ آگے بڑھے اچانک اُس کے سامنے ایک چار منزلہ مکان نمودار ہوا جس کی کھڑکیوں کی چار قطاروں میں سے روشنی چھن چھن کر اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُس نے اُس حسینہ کو اُس مکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ پھر واپس مڑ کر دیکھتے ہوئے۔ وہ ہونٹوں پر اُنگلی رکھے اُسے پیچھے آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اُس کے پاؤں ڈگمگائے۔ اُس کے احساسات اور خیالات جل اُٹھے۔ خوشی کا شعلہ تیزی سے

آخر اُسے دل کو چیر کر نکل گیا۔
نہیں یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ میرے اللہ! ایک لمحہ میں
اس قدر مسرت۔ ایک پل میں اتنی حسین زندگی۔
لیکن یہ سب کچھ کیا تھا۔ کیا وہ حسینہ جس کے ایک اشارے
پر وہ اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار تھا جس کے در پر پہنچنا ایک
ناقابلِ بیان مسرت تھی۔۔۔ کیا وہ اب اُس کی طرف اس قدر
متوجہ ہو سکتی ہے۔۔۔ وہ سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اُس کے
دماغ میں کوئی دنیاوی خیالات نہ تھے۔ نہ ہی اس کے دل میں
دنیاوی جذبات کی گرمی تھی۔ وہ اُس کے لیے ایک کنواری لڑکی کی طرح
پاک و پوتر تھا۔ جس کے دل میں محبت کا ایک ناقابلِ بیان روحانی
تصور ہوا اور بس۔ ایک ایسی چیز جو ایک عام انسان میں گھٹیا
قسم کے جذبات بیدار کر دیتی۔ پکاریو کے جذبۂ انسانیت کو ابھار
نے کا باعث ثابت ہوگی۔

اُس نازک اندام حسینہ نے جو اعتقاد اُس پر رکھا۔ وہ
اُس کے لئے بالکل ویسے ہی تھا جیسے ایک بہادر آدمی کا ارادہ یا
ایک غلام کی غلامی۔ اُس کی صرف ایک خواہش تھی وہ یہ کہ وہ
حسینہ اُسے مشکل سے مشکل حکم دے تاکہ اُس کو سرانجام دینے
میں اُسے اپنی تمام قوت صرف کرنی پڑے۔ اُسے یقین تھا کہ کسی
غیبی طاقت نے اُس حسینہ کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اُس پر اعتقاد
رکھے۔ اُسے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اہم خدمت کے لئے تیار کیا جائے
گا۔ اور وہ اُس قوت ارادی اور طاقت کو اپنے اندر پہلے سے
ہی محسوس کر رہا تھا۔ جو اس خدمت کو سرانجام دینے کے لئے
درکار تھی۔

سیڑھیاں آگے جا کر مڑ گئیں اور ان کے ساتھ اُس کے
خیالات کا دھارا بھی۔ دیکھنا! دھیان سے چڑھنا" ہنسی کی
جلترنگ کی طرح کی ایک آواز نے اُس کے دل میں ایک نیا جوش بھر دیا۔
چوتھے چھت کے گہرے اندھیرے میں اُس اجنبی نے ایک
دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا اور وہ دونوں ایک ساتھ
اندر داخل ہوئے۔ ایک حسین سی عورت ہاتھ میں موم بتی لئے
انھیں ملی۔ اُس نے پکاریو کی طرف کچھ اس طرح دیکھا کہ اُس
کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔

کمرے کے مختلف کونوں میں اُسے تین عورتیں دکھائی دیں۔
ایک تاش کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ دوسری دو انگلیوں سے
پیانو پر ایک پرانے گیت کی دھن بجا رہی تھی۔ تیسری ایک
آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے لمبے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔
اور ایک اجنبی کی آمد سے اُس نے بار سنگھار میں مداخلت
کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

ہر ایک چیز سے ایک نا رسیدہ بے ترتیبی کا احساس
ہوتا تھا۔ جیسے عام طور پر ایک کنوارے آدمی کے کمرے کو
دیکھ کر ہوتا ہے۔ فرنیچر جو کہ خاصہ اچھا تھا۔ گرد کی ایک
تہہ جمی ہوئی تھی۔ انگیٹھی پر جگہ جگہ لکڑی کا جال بنا ہوا تھا۔
ایک اور کمرہ جس کا دروازہ اس کمرے میں کھلتا تھا۔ اُس
میں سے ایک کشتی اور چپو کے علاوہ ایک سرخ لباس نظر آ رہا
تھا۔ ایک مرد اور عورت کے ملے جلے قہقہوں کی آواز بھی
سُنائی دے رہی تھی۔

یا خدا! وہ کہاں آگیا — پہلے تو اُسے اپنی آنکھوں پر
یقین نہ آیا۔ اُس نے کمرے کے سامان کو زیادہ غور سے دیکھنا
شروع کیا۔ لیکن آرائش سے مبرا دیواریں اور بے پردہ کھڑکیاں
اس بات کی شاہد تھیں۔ کہ یہاں کوئی گھریلو قسم کی عورت
نہیں رہتی۔ ان قابلِ رحم مرجھائے ہوئے چہروں میں سے ایک
اُس کے بالکل قریب تھا۔ اور اسے اس طرح دیکھ رہا تھا۔
جیسے پکاریو کسی اور کے لباس پر ایک دھبہ ہو۔ یہ سب کچھ
دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ ایک ایسے غلیظ ماحول میں آگیا ہے۔
جہاں قابلِ رحم گراوٹ کلین ہے۔ گراوٹ جو ایک ایسے
نظام کی پیداوار ہے۔ جہاں ایک طرف تو دولت کے انبار
ہیں اور دوسری طرف بھوک اور افلاس —— ایسے ماحول
میں جہاں انسان نے ہر پاک اور پوتر احساس کا گلا گھونٹ
کے رکھ دیا ہے۔ جہاں عورت جو دنیا کا حسن اور تخلیق کا سرمایہ
ہے۔ ایک بے حقیقت سی چیز بن کے رہ گئی ہے۔ اُس سے
اس کی روح کی پاکیزگی اور عورتیت چھن گئی ہے۔ اور نزاکت
اور حسن جو عورت کا خاص سرمایہ ہے چھن کر اُس میں مرد کے
سے انداز اور دلیری آ گئی ہے۔ پکاریو نے اُس عورت کو

سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ جیسے وہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کہ آیا یہ وہی عورت ہے جس نے اس پر اس قدر جادو کر دیا تھا کہ وہ اس کے پیچھے یہاں تک کھنچا چلا آیا ہے ـــــ وہ اپنے حسن کی تمام رنگینیوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے بال ویسے ہی خوبصورت تھے۔ اس کی آنکھوں میں وہی سحر انگیزی تھی۔ اس کے چہرے کی تازگی بھی ویسی ہی تھی۔ اس کی عمر صرف سترہ برس کی ہو گی۔ ابھی تک پیکاریو میں اس قدر ہمت نہ تھی کہ وہ اس کے تازہ اور گلابی رخساروں کو چھو سکے۔ وہ بہت حسین تھی۔

وہ اس کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا تھا اور اپنے آپ میں کھو جانے کے لئے ویسے ہی تیار تھا۔ جیسے وہ پہلے اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ لیکن وہ حسین لڑکی اس لمبی خاموشی سے تنگ آ گئی۔ اور پیکاریو کی نگاہوں میں جھانکتی ہوئی معنی خیز طور پر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں ایک دردناک بیہودگی تھی۔ یہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر اتنی عجیب لگ رہی تھی جتنا کسی جلاد کے دل میں رحم اور کسی شاعر کے ہاتھ میں بہی کھاتہ۔ وہ کانپ سا گیا۔ اس نے اپنے حسین ہونٹوں کو جنبش دی اور کچھ کہنا شروع کیا۔ لیکن یہ سب فضول اور بیہودہ تھا ـــــ جیسے پاکیزگی کے چھن جانے سے عقل بھی چھن گئی ہو۔ وہ اب کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ پیکاریو میں ایک بچے کی سی سادگی تھی۔ اس قسم کا موقع کسی بھی اور شخص کے لئے مسرت کا باعث ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور گلی میں اتر آیا۔

سر جھکائے اور اپنے بازوؤں کو ڈھیلا چھوڑے وہ اپنے کمرے میں ایک ایسے دکھی انسان کی طرح بیٹھا تھا جو ایک نایاب ہیرا پا کر اسے سمندر میں گرا دے۔ "اتنی حسین عورت! اتنے پیارے نقش و نگار! اور کہاں پڑی ہے؟" وہ صرف یہی الفاظ کہہ سکا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہم اس قدر رحم دل کبھی نہیں ہوئے جتنا ہم ایک حسین چہرے کو غلاظت کے گڑھے میں گرا دیکھ کر ہوتے ہیں۔ بدصورتی اور غلاظت کو ایک جگہ دیکھ کر دکھ نہیں ہوتا۔ لیکن حسن ـــــ حسن کی اور بات ہے۔ حسن کا تعلق ہمارے خیالات میں پاک و صاف چیزوں سے ہوتا ہے۔ وہ حسین لڑکی جس نے پیکاریو کو مسحور کر دیا تھا۔ واقعی حسن نسوانیت کا ایک حسین نمونہ تھی۔ اس غلاظت کے گڑھے میں اس کی موجودگی کچھ زیادہ ہی عجیب لگ رہی تھی ـــــ اس کے چہرے کے نقوش اس قدر متناسب تھے۔ اس کے چہرے سے اس قدر برتری ٹپکتی تھی کہ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ گراوٹ نے اسے اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔

وہ ایک نایاب ہیرا ہو سکتی تھی۔ ایک بے پناہ محبت کرنے والے خاوند کی جنت ہو سکتی تھی۔ وہ ایک خاندان کا چشم و چراغ ہو سکتی تھی۔ اس کے حسین لبوں کی جنبش حکم صادر کر سکتی تھی۔ رقص و سرود کی محفلوں کی وہ شہزادی ہو سکتی تھی۔ جہاں موم بتی کی روشنی میں ہزاروں عشاق اپنے دلوں کے نذرانے اس کے قدموں پر پیش کرنے کو تیار ہو جاتے لیکن افسوس کسی شیطانی قوت کے زیر اثر وہ زندگی کی قدروں کو برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اور اس غلاظت کے کنوئیں میں دھکیل دی گئی تھی۔

دکھ اور رحم کے ملے جلے جذبات میں ڈوبا وہ موم بتی کے سامنے بیٹھا تھا۔ آدھی رات کب کی گزر چکی تھی۔ گھنٹہ گھر کی گھڑی سے جب آدھی بجنے کی آواز آئی تو وہ نیند سے بیدار گم سم پڑا تھا۔ نیند کی دیوی آہستہ آہستہ اسے اپنی گود میں لے رہی تھی۔ کمرے کے در و دیوار اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو رہے تھے۔ وہ اپنے خیال میں گم تھا۔ اسے صرف موم بتی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ کانپ سا گیا۔ اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا اور ایک بڑے قیمتی لباس میں ایک کوچوان اندر داخل ہوا۔ آج تک اس کمرے میں کبھی اتنے حسین لباس میں ملبوس کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔ اور پھر اتنی رات گئے اسکی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوچوان کو اس نے بڑے بے صبر تجسس سے دیکھا۔ کوچوان جھک کر آداب بجا لایا اور کہا "میری مالکہ جس سے آپ چند گھنٹے ہوئے مل کر آئے ہیں آپ کو بلا رہی ہے۔ میرے ساتھ چلنے کی زحمت گوارا فرمایئے۔ گاڑی نیچے کھڑی ہے"

پیکاریو حیرت میں گم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی! حسین لباس

یہ بلوہی کوچوان بمشکل کہہ پایا ہے۔

"شکریہ مت ادا کرو" اس نے مصنوعی بشاشت سے کوچوان سے کہا۔ "تم غلطاً غلط جگہ پر آگئے ہو۔ تمہاری مالکن نے شاید کسی اور کے پاس جانے کو کہا تھا۔"

"نہیں حضور، مجھ سے غلطی نہیں ہوئی۔ کیا آپ ہی تو نہیں ہیں جو میری مالکن کی گاڑی کے ایک مکان کے چوتھے چھت پر چھوڑ کر گئے ہیں۔"

"ہاں، میں ہی تھا۔"

"حضور پھر جلدی کیجئے۔ میری مالکن ابھی اسی وقت آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ اور ان کا حکم ہے کہ میں ابھی آپ کو لے کر آؤں۔"

لیکاریو نیچے اترا۔ ایک گاڑی واقعی صحن میں کھڑی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہوا، گاڑی کے پہیے اور گھوڑوں کے سُم پتھریلی سڑک پر بلند آواز پیدا کرنے لگے۔ گاڑی چلتے ہوئے سائن بورڈ اور مکانوں کو پیچھے چھوڑتے بھاگی جا رہی تھی۔

لیکاریو راستہ بھر سوچتا گیا۔ لیکن وہ فیصلہ نہ کر پایا کہ یہ سب کیا ہے۔ ایک پرائیویٹ مکان کی گاڑی۔ باوردی کوچوان۔ یہ تمام چیزیں چوتھی منزل کے اُس مکان کے ساتھ جس کی کھڑکیوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ جہاں ایک بے سُرا پیانو بج رہا تھا۔ نامناسب معلوم ہوتی تھیں۔

گاڑی ایک روشن برآمدے میں رُکی۔ لیکاریو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار کو چوانوں کی گپ شپ۔ روشن کھڑکیوں اور موسیقی کی سروں نے اُسے حیران کر دیا۔ ایک خوبصورت باوردی کوچوان نے اُسے گاڑی سے اُتارا۔ اور اُسے کمرے میں لے گیا۔ جس کے ستون سنگِ مرمر کے تھے۔ جس کے باہر سنہری لباس میں ملبوس چوکیدار کھڑے تھے۔ جہاں خوبصورت فرکوٹ بکھرے ہوئے تھے۔ اور جہاں کئی لیمپ روشن تھے۔

سامنے ایک شاندار زینہ تھا۔ جہاں سے خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ لوگوں کی بے پناہ بھیڑ سے گھبرایا ہوا وہ پہلے کمرے میں داخل ہوا۔

لوگوں کے اس قدر ہجوم نے اُسے مکمل طور پر گھبرا دیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے شیطان نے دُنیا کو کئی حصّوں میں موڑ کر پھر انہیں بغیر کسی ترتیب کے رکھ دیا ہو۔ عورتوں کے چمکتے ہوئے کندھے مردوں کے کالے ڈریس سوٹ، قمقموں کی روشنی، رنگ برنگے پھول اور ایک بڑا بینڈ بجانے والوں کا گروہ۔ ہر چیز اُسے حسین لگ رہی تھی۔

اُسے ایک ہی نظر میں کئی باعزت بوڑھے ادھیڑ عمر دو تمغے سجائے لباس پہنے، عورتوں کی ایک خاصی بڑی تعداد، نزاکت سے چلتی ہوئی یا کرسیوں پر جلوہ نشین دکھائی دی۔ کئی انگریزی اور فرانسیسی زبان کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے۔

علاوہ ازیں، کالے ڈریس سوٹ میں ملبوس نوجوان اس قدر خوبصورت تھے۔ اُن کی گفتگو یا خاموشی۔ اس قدر بارعب تھی۔ فضول باتوں سے پرہیز کرنے کی عادتیں اس قدر تمیز تھی۔ وہ ایسی بلند آواز میں لطیفے کہہ رہے تھے۔ اُن کے مسکرانے کا انداز، اُن کی مونچھوں کو رعب اور اپنی نکٹائی کو درست کرتے وقت اپنے حسین ہاتھوں کی نمائش کرنے کا سلیقہ، عورتوں کی خود پسندی اور مسرت اور نگاہیں جھکانے کا انداز اس قدر دلفریب تھا کہ...

لیکن ستون کے ساتھ لگے ہوئے لیکاریو کی نگاہیں صاف گویا تھیں۔ کہ وہ اپنی سُدھ بُدھ سے غافل تھا۔

اُس وقت بہت سے لوگ ناچنے والوں کے گروہ کو گھیرے ہوئے تھے۔ وہ چکر لگا رہے تھے۔ پیرس میں بنے ہوئے بہت ہی باریک لباس میں ملبوس ـــــ لباس جو کہ ہوائی دھاگوں سے بنا ہوا تھا۔ اُن کے ننھے ننھے پاؤں فرش کو نفرت سے دیکھ رہے تھے اور زمین سے اُٹھ کر وہ کہیں زیادہ نورانی لگ رہے تھے۔

ان چہروں میں ایک بہت زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ سب سے حسین تھا۔ اس کا لباس خوبصورت ترین تھا۔ اُس کے بناؤ سنگھار میں ایک حسین سلیقے کا احساس ہوتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی عیاں تھی کہ وہ اس بناؤ سنگھار سے خود بھی بے بہرہ ہے اور یہ سب کچھ اپنے آپ ہو گیا ہے۔

وہ نمائش بینوں کے اس گروہ کو بیک وقت دیکھ بھی رہی تھی اور نہیں بھی۔ اس کی خوبصورت پلکیں بغیر کسی مقصد کے اُٹھتیں اور اُس کی چندھیا دینے والی حسین گردن پر دیکھنے والے کی نگاہ کا محور مرکز تھی۔ اِس اثنا میں اُس نے جب

ایک طرف سر گھمایا تو اُس کے ماتھے پر ایک ہلکا سا سایہ اُبھرا۔

پکاریو نے اپنی تمام کوششوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تاکہ اُسے دیکھ سکے۔ لیکن کسی کا بڑا سر اور لمبے سیاہ بال اُس کی آنکھوں کے لئے سدِّ راہ بن گئے، اور پھر بھیڑ میں وہ اس قدر پھنسا ہوا تھا کہ وہ نہ تو آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ڈرتا تھا کہ اس کشمکش میں کسی بڑے کونسلر کو نہ دھکیل بیٹھے۔ آخرکار کسی طرح سے وہ آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اچانک اُس کی نظر اپنے لباس پر پڑی جس میں سجاوٹ کی بہت کمی تھی۔ میرے اللہ! یہ کیا! وہ ایک کوٹ پہنے تھا جس پر رنگ کے چھینٹے تھے۔ پہنچنے کی جلدی میں وہ لباس تبدیل کرنا بھول گیا تھا۔ شرمندگی کی سُرخی اُس کے کانوں تک پھیل گئی۔ اُس کا سر جھک گیا۔ وہ زمین میں دھنس جانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ نوجوان امیرزادے زرق برق لباس پہنے ایک دیوار کی شکل میں اُس کے پیچھے کھڑے تھے۔ اُس نے چاہا کہ وہ اُس حسین ماتھے اور سیاہ پلکوں والی حسینہ سے زیادہ دور کھڑا ہو۔ اُس نے ڈرتے ہوئے آنکھیں کھولیں کہ کہیں وہ اُسے دیکھ تو نہیں رہی۔ ارے! وہ تو بالکل اُس کے سامنے کھڑی تھی لیکن یہ کیا؟ "یہ تو وہی ہے" وہ چلا اٹھا۔ یہ واقعی وہی لڑکی ہے۔ جو اُسے "نادسکی پرسپکٹ" میں ملی تھی اور جس کے پیچھے وہ اُس کے گھر تک گیا تھا۔

اس اثنا میں اُس نے اپنی پلکیں اُٹھائیں اور سارے ہال پر نگاہ ڈالی۔ "ہائے کتنی حسین ہے"۔ پکاریو اُکھڑی ہوئی سانس میں بس یہی کہہ سکا۔ پھر اُس نے نگاہ جو پھیری۔ تو اُس کی آنکھیں پکاریو کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔

"ہائے یہ حسنِ دلفریب، یہ جنت۔ میرے خدا مجھے طاقت دے کہ میں اس حسن کی تاب لا سکوں میری زندگی اس حسن کی تاب نہیں لا سکتی۔ یہ تو میری روح کو اُڑا کر لے جائے گی۔ اُس نے اشارہ کیا۔ ہاتھ سے نہیں۔ نہ ہی سر سے بلکہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اس طرح اشارہ کیا۔ کہ پکاریو کے علاوہ کوئی اور نہ دیکھ سکا۔ رقص جاری رہا۔

تھکی تھکی موسیقی کبھی تو بند ہوتی نظر آتی۔ لیکن پھر سے تیز ہو جاتی۔ آخرش رقص ختم ہوا۔ وہ تھک کر بیٹھ گئی۔ باریک لباس میں اُس کے سینے کا اُتار چڑھاؤ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ (ہائے کتنے خوبصورت ہاتھ تھے) اُس کے گھٹنوں پر آ پڑے۔ اس وجہ سے اُس کا حسین لباس سمٹ گیا۔ لباس میں سے ایک طرح کی موسیقی پیدا ہوئی۔ لباس کے رنگ کے تضاد سے اُس کے ہاتھوں کی سفیدی اور بھی نمایاں ہو گئی۔ پکاریو کو اُس کے ہاتھوں سے چھو جانے کی تمنا تھی اور بس۔ اُسے کوئی اور خواہش نہ تھی۔ کیونکہ باقی تمام خواہشیں بیہودہ ہیں۔ وہ اُس کی کرسی کے پیچھے زبان بند کئے اور سانس روکے کھڑا تھا۔ "تم بور ہو گئے تھے۔ میں خود بور ہو گئی تھی" وہ کہنے لگی۔ "میں جانتی ہوں تم مجھ سے نفرت کرتے ہو" اُس نے اپنی پلکیں جھکا کر کہا۔

"تم سے نفرت اور مجھے" پکاریو جو مکمل طور پر ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا کہنا چاہتا تھا۔ اور شاید ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اور بھی بہت کچھ کہہ جاتا۔ لیکن عین اس وقت ایک شخص جو کہ ایک بڑا خوبصورت ہیٹ پہنے تھا۔ وہاں آ گیا۔ اس نے کوئی دلچسپ سی بات کہی۔ اور اُس کے ساتھ اپنے خوبصورت دانتوں کی نمائش کی۔ لوگوں نے اُس کی بات پر خوب زور کے قہقہے لگائے۔ اس پر اُس نے اور لطیفے کہنے شروع کئے۔ ہر لطیفے کے ساتھ پکاریو کے دل پر چھری سی چل جاتی۔ آخرش خوش قسمتی سے کسی نے اُس حسین کی توجہ ایک سوال کے سلسلے میں اپنی طرف مبذول کر لی۔

"کتنا ناقابلِ برداشت ہے یہ سب کچھ" وہ نگاہیں اُٹھا کر بولی۔ "میں بال روم کے دوسرے کونے پر بیٹھی ہوں۔ وہاں آ جاؤ" یہ کہہ کر وہ بھیڑ کو چیر کر غائب ہو گئی۔ وہ بھی کسی باؤلے کی طرح لوگوں کو دھکیلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"کیا یہ وہی ہے"۔ وہ ایک ملکہ کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ تمام حسیناؤں کی ملکہ اُس کی آنکھیں پکاریو کی متلاشی تھیں۔

"تم آ گئے" وہ دھیرے سے بولی "میں تم سے صاف صاف بات کرنا چاہتی ہوں۔ ہماری آج کی ملاقات تمھیں شاید کچھ عجیب لگ رہا ہے۔ کیا تم یقین کر سکتے ہو کہ میں اس قابلِ نفرت فرقے سے تعلق رکھ سکتی ہوں۔ جہاں تم نے مجھے دیکھا تھا۔ میری حرکات تمھیں بُری لگیں گی۔ میں تمھیں راز کی بات بتانا چاہتی ہوں۔ کیا تم، میرے راز کو راز رکھ سکو گے!" "ضرور۔ ضرور۔"

اسی وقت ایک بوڑھا سا شخص کہیں سے آ دھمکا۔ اُس نے
جو اُس زمانے میں تھا اُس حسینہ سے کچھ کہا جو نیاز یوں کی تھی
[illegible] ماہر تھا۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا جو اُس حسینہ نے تھاما
اور نیاز یو کی طرف التجا بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے
اشارہ کیا۔ کہ جب تک وہ واپس نہ آئے۔ وہ وہیں رہے
لیکن بے صبری کی وجہ سے وہ حکم ماننے سے قاصر تھا۔
تھا۔ وہ حکم اس حسینہ کے ہونٹوں سے ہی کیوں نہ نکلا ہو۔
وہ اُس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن بھیڑ نے انھیں الگ کر دیا۔ وہ
حسین لبادہ اب اُس کی آنکھوں سے اوجھل تھا۔

وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بھاگا جا رہا
تھا۔ اور راہ روکنے والوں کو بڑی بے رحمی سے دھکیل رہا
تھا۔ لیکن پھر بھی ۔ راہ ملنا مشکل تھی۔ کیونکہ تمام کمرے
لوگوں سے بھرے پڑے تھے۔ ایک کونے میں بہت سے
بزرگ فوجی اور غیر فوجی پیشوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک
اور کونے میں نوجوانوں کا ایک گروہ ایک محنت کش شاعر
کی مشکلات کا ذکر کر رہے تھے۔ نیاز یو کو یوں محسوس ہوا۔
جیسے کسی بزرگ نے اُس کو کوٹ کے بٹن سے پکڑ کر مخاطب
کیا ہو۔ لیکن اُس نے اُسے بھی دھکیل دیا۔ یہ بھی خیال نہ کیا
کہ اُس آدمی کے گلے کا ہار اُس کی اہمیت کا ثبوت تھا۔

وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے کو بھاگا....
وہ وہاں نہ تھی تیسرے کمرے میں گیا۔ وہ یہاں بھی نہ تھی....
آخر گئی کہاں۔ "اُس کو مجھے دیدو۔ میں اُس کے بغیر زندہ
نہیں رہ سکتا ...... میں اُس کے راز کو جاننا چاہتا
ہوں" وہ چیخ اٹھا۔

لیکن اُس کی جستجو فضول ثابت ہوئی۔ فکر اور تھکاوٹ
کے عالم میں وہ ایک ستون سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں
اب بھی بھیڑ میں اُسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ اُس کو ہر ایک چیز ڈولتی
ڈولتی نظر آ رہی تھی ....

آخر کار اپنے کمرے کی دیواریں اُسے صاف طور دکھائی
دیں۔ اُس نے نظریں اٹھائیں۔ سامنے موم بتی جل رہی تھی۔
شعلہ دم توڑ رہا تھا۔ موم بتی تقریباً پگھل چکی تھی۔ اور پگھلی
ہوئی موم اُس کی میز پر پھیلی ہوئی تھی۔

اوہ! تو وہ سو رہا تھا۔ بستر [illegible] بے نتیجہ خواب تھا۔
وہ کیوں بیدار ہوا وہ [illegible] کیوں نہ سویا۔ شاید وہ پھر [illegible]
ایک مایوس کن صبح [illegible] کھڑکی
میں نمودار ہوئی۔ اُس کے کمرے پر بے ترتیبی چھائی ہوئی تھی۔
وہ حقیقت کس قدر تلخ ہوتی ہے اس نے جلدی جلدی
کپڑے اتارے اور کمبل اوڑھ کر پھر لیٹ گیا تاکہ دوبارہ
خواب کی کڑیاں جوڑ سکے۔ نیند کی دیوی نے جلد ہی اُسے
اپنی آغوش میں لے لیا اور [illegible] نظارے دکھائے لیکن
ان میں وہ نظارہ نہیں تھا جس کو دیکھنے کی اُسے تمنا تھی ـــ
اُس نے خوابوں میں کبھی لیفٹیننٹ پیرد گود اپنے باپ کے ساتھ
پھرتا۔ کبھی اکیڈمی کا قلی۔ کبھی کوئی کونسلر اور کبھی نو لینڈ
کی وہ عورت جس کی کبھی اُس نے تصویر بنائی تھی۔ یا پھر
اس قسم کی کوئی اور بکواس۔

وہ دوپہر تک نیند کی خواہش لئے بستر میں لیٹا رہا لیکن
اُسے نیند نہ آئی۔ کاش ایک لمحے کے لئے وہ اپنی حسین شبیہ
دکھائے۔ کاش وہ ایک بار اُس کے حسین قدموں کی چاپ
سن سکے۔ کاش اُس کا ننگا سفید ہاتھ ایک بار اُس کی نظروں
کے سامنے سے گذرے۔

وہ ہر ایک چیز کو نظر انداز کئے ہر شے سے غافل بیٹھا
تھا۔ اُس کے چہرے پر شکست اور نراشا کا عکس جھلک رہا
تھا۔ اُس کا جی کسی چیز کے چھونے کو نہیں چاہتا تھا۔ اُس
نے خالی نگاہوں سے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ یوں ہی اُس کی
نگاہ صحن پر پڑی۔ وہاں ایک غلیظ بہشتی پانی تقسیم کر رہا
تھا۔ ایک آواز اُس کے کانوں میں آئی۔

"پرانے کپڑے والا"۔

روزمرہ کی حقیقتیں اُس کے کانوں کو عجیب سی لگ رہی
تھیں۔ وہ دن بھر اسی طرح بیٹھا رہا۔ اور پھر حریصانہ بستر
پر گر پڑا۔ وہ بہت دیر تک بے خوابی کے خلاف جنگ کرتا رہا۔
آخر کار اُسے کامیابی نصیب ہوئی۔ پھر اُسے کوئی بے ہودہ
خواب نظر آیا۔

"میرے اللہ۔ مجھ پر رحم کر۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے اُس کا دیدار بخش دے"۔

وہ اب شام کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے اُسے نیند آگئی۔ نیند کے ساتھ خواب آئے۔ ایک کلرک کا خواب جو ایک کلرک بھی تھا اور سپاہی بھی۔ کس قدر ناقابل برداشت تھے یہ خواب... آخر وہ بھی نمودار ہوئی۔ اُس کا سر۔ اُس کی زلفیں ... لے نظر آئیں۔ لیکن صرف چند لمحوں کے لئے پھر ایک دھند لکا سا چھا گیا۔ اور پھر اُسے کوئی اور گھٹیا سا خواب دکھائی دیا۔

یہ خواب آہستہ آہستہ اُس کی زندگی بن گئے۔ اب سے اُس کی زندگی کے دھارے نے ایک خاص رُخ اختیار کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیداری میں سوتا ہے، اور نیند میں جاگتا ہے۔ اگر کوئی اُسے اپنی میز پر گم سم بیٹھے دیکھ لیتا۔ یا اُسے گلی میں چلتے ہوئے دیکھ لیتا تو وہ شاید پکاریو کو پاگل یا شرابی سمجھا۔ اُس کا چہرہ بالکل بے حس تھا۔ اور غفلت جو اُس کی پیدائش سے اُس کی زندگی کا ایک حصہ تھی اب اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ اُس کا چہرہ ہر قسم کے احساس و حرکات سے عاری ہو گیا۔ رات کو البتہ اُس میں کچھ گرمی پیدا ہوئی۔

ان حالات میں اُس کی صحت بالکل تباہ ہو گئی۔ شب بیداری اس کے لئے ایک مصیبت بن گئی۔ اس ایک جزا نے کو پا لینے کے اُس نے ہر ممکن کوشش کی۔ اُس نے کہیں سے سُن رکھا تھا کہ افیم کھانے سے خوابوں کی کڑیاں جوڑی جا سکتی ہیں۔ اُسے ایک دم ایک ایرانی کا خیال آیا۔ جو شالیں بیچتا تھا۔ اور پکاریو سے اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھے ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر بنا دو۔ پکاریو نے اُس کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ وہاں سے افیم مل سکے گی۔

ایرانی اُسے آلتی پالتی مارے دیوان پر بیٹھا ملا۔

"تمھیں افیم کس لئے چاہیئے" ایرانی نے پوچھا۔

پکاریو نے اپنی بے خوابی کا حال کہہ سنایا۔

"اچھی بات ہے۔ میں تمھیں افیم دوں گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم مجھے ایک بہت ہی حسین لڑکی کی تصویر بنا دو۔ دیکھو۔ لڑکی بہت خوبصورت ہو۔ اُس کی پلکیں سیاہ ہوں اُس کی آنکھیں بادام ایسی ہوں۔ مجھے اُس کے قریب لیٹا ہوا دکھاؤ۔ میرے منہ میں میرا پائپ ہو۔ مجھے لڑکی بے حد خوبصورت ہونی چاہیئے"۔

پکاریو نے تمام شرطیں منظور کر لیں۔ ایرانی ایک پل کے لئے باہر گیا۔ جب واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا۔ جس میں سیاہ رنگ کا پانی سا تھا۔ اُس نے اس ڈبے میں سے کچھ ایک اور ڈبہ میں الٹا اور پکاریو کو دیتے ہوئے ہدایت کی کہ ایک وقت میں سات بوندوں سے زیادہ نہ پیئے۔ پکاریو نے لالچی ہاتھوں سے ڈبیا کو اُس سے چھین لیا۔ ڈبہ۔ جو اُس کے لئے سونے کی ایک ڈلی سے کہیں زیادہ قیمتی تھا ــــ اور ایک ہی سانس میں گھر پہنچ گیا۔

واپس پہنچ کر اُس نے اُس میں سے چند قطرے ایک گلاس میں ڈالے اور ایک ہی گھونٹ میں انھیں پی گیا۔ سونے کے ارادے سے وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔

اُس کی مسرت کی انتہا نہ رہی، وہ اس کے خوابوں میں نمودار ہوئی۔ لیکن ایک بالکل نئے ماحول میں وہ ایک گاؤں کی ایک جھونپڑی کی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ اُس کا لباس شاعر کے تخیل سے بھی زیادہ حسین تھا۔ کس قدر سادگی تھی اُس کے بال بھی بڑے سادہ انداز سے سنوارے ہوئے تھے۔

لیکن کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ اُس کی ترافنی ہوئی گردن کے گرد ایک رومال بندھا ہوا تھا۔ اُس کی ہر چیز سادہ تھی۔ الوکھی تھی۔ اور ایک ناقابل بیان سلیقے کی حامل تھی۔

اُس کے چلنے کے انداز میں ایک عجیب بانکپن تھا۔ اُس کے قدموں کی چاپ اور لباس کی سرسراہٹ میں کس قدر موسیقی تھی۔ بالوں کے بنے ہوئے کنگن میں اُس کا ہاتھ کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی پریم آنکھوں سے پکاریو کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی۔

"مجھے بُری مت سمجھو۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھتے ہو۔ میری طرف دیکھو۔ غور سے دیکھو اور کہو کہ میں وہ کر سکتی ہوں جس کے تم مجھے اہل سمجھتے ہو"۔

"نہیں ہرگز نہیں۔ وہ مجھے اپنے بچے کا ......"
لیکن ابھی یہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو
تھے اور دل میں درد سا کچھ رہا تھا۔

"بہتر تھا کہ تمہارا اس دنیا میں وجود ہی نہ ہوتا۔ تم محض
ایک خواب ہوتیں۔ تاکہ میں تمہیں ہمیشہ دیکھتا رہتا۔ اور
سے سی جانا ہوتا۔ تم میرے سانسوں میں رہتیں۔ اگر میرے
خواب کی تکمیل ہو سکے تو اس دنیا میں مجھ سے بڑھ کر کوئی
خوش نہ ہوگا۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔
خواب اور بیداری کے عالم میں تمہیں اپنے محافظ فرشتے کی
طرح پاتا۔ خدائی نور کی تلاش کرتے وقت میں تمہارے حسن
کا سہارا لیتا۔ لیکن اب —— کس قدر تلخ ہے میری زندگی۔
بے تمہاری ہستی سے کیا ہے۔ کیا ایک پاگل کی زندگی اُس کے
دوستوں اور عزیزوں کے لیے جن سے وہ کبھی محبت نہیں کرتا،
خوشگوار ہو سکتی ہے؟ میرے اللہ! یہ بھی کیا زندگی ہے۔
جہاں حقیقتیں خوابوں سے اس قدر مختلف ہیں!؟ وہ ہر وقت
اس قسم کے خیالات میں گھرا رہتا۔ اُسے کسی اور چیز کا خیال
نہیں تھا۔ بہت ہی کم کھاتا تھا۔ ایک عاشق کی طرح ہمیشہ
اپنی آرزوؤں کے بر آنے کا شدت سے انتظار کیا کرتا۔ اُس
کے تمام خیالات ایک نقطہ پر مرکوز ہوجانے کی وجہ سے اُسے
تقریباً ہر روز اپنی خواہشات کا عکس نظر آتا۔ اور اکثر اُن
حالات میں نظر آتا جو حقیقت سے کہیں دور تھے۔

چونکہ اُس کے خیالات ایک بچے کی طرح پوتر تھے۔ اس
لئے اُس کے خوابوں کا محور بھی پوتر اور روحانی چہرے کے
طور پر نظر آتا۔

افیم کے استعمال نے اُس کے خیالات کو پاش پاش
کر دیا تھا۔ اُس کی حالت اُس بدبخت عاشق کی تھی۔ جو
پوری شدت اور پاگل پن کی آخری حد تک اپنے محبوب سے محبت
کرتا ہے۔

آج تک جو خواب اُس نے دیکھے تھے۔ اُن میں سے ایک
بہت ہی پیارا تھا۔ اس خواب میں اُسے اپنا شوہر لو نظر آیا۔
وہ بہت خوش تھا۔ اس کے ہاتھ میں رنگوں کی طشتری تھی۔ اور
وہ بھی وہیں تھی۔ اُس کی بیوی کی حیثیت سے۔ وہ اُس کے قریب
بیٹھی تھی۔ اُس کی کرسی کی پشت پر اپنی کہنی ٹکائے اُسے کام
کرتے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی خواب آور آنکھوں میں مسرت
کی جھلک تھی۔ اس کے کمرے میں جنت کی سی کیفیت تھی۔ بڑا
سجا ہوا اور زندگی سے بھرپور تھا۔ اللہ! اُس نے اپنا حسین
سر اُس کی چھاتی پر جھکا دیا۔ اس سے حسین تر خواب اُس نے
کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس خواب کے بعد جب اُس کی آنکھ کھلی
تھی تو وہ اپنے میں نئی زندگی محسوس کر رہا تھا۔

اُس کے دماغ میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ اُس نے سوچا
شاید وہ کسی حادثے کی وجہ سے اس غلاظت کے کنوئیں میں
جا پڑی ہے شاید وہ پراشچت کرنے کو تیار ہو۔ شاید وہ
خود بھی اس غلاظت کے گڑھے سے نکلنے کی متمنی ہو۔ اور
یقیناً کوئی بھی غلاظت کے اس دریا میں بہتے نہیں دیکھ
سکتا۔ خاص طور پر جب اُسے بچانے کے لئے محض ہاتھ
بڑھانے کی ضرورت ہے۔

وہ سوچے جا رہا تھا۔ مجھے کوئی نہیں جانتا کسی کو میرے
معاملات سے کیا۔ اور پھر دنیا سے ڈرتا نہیں۔ اگر وہ
سچے دل سے توبہ کرے اور اپنی زندگی کا رُخ بدل لے تو
میں اُس سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ میں اُن کئی لوگوں
سے بہتر ہوں گا جو اپنی بھونڈی نوکرانیوں سے شادی
کر لیتے ہیں۔

اس قسم کا پلان بنا لینے کے بعد اُسے محسوس ہوا جیسے
اُس کے رخساروں میں نیا خون اُبل آیا ہو۔ اُس نے آئینہ
دیکھا۔ تو وہ ڈر سا گیا۔ اُس کے رخسار اندر کو پچکے
ہوئے تھے اور رنگ زرد تھا۔

اُس نے اپنے آپ کو سنوارنا شروع کیا۔ نہایا۔ بال
سنوارے۔ نیا کوٹ پہنا۔ ایک خوبصورت سا اسکٹ پہنی۔
اور گلی میں نکل پڑا۔ تازہ ہوا میں سانس لے کر اُسے بالکل
ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی بیمار کافی عرصے بیمار رہنے کے بعد
پہلی بار باہر آئے۔

جب اُس نے اُس گلی میں قدم رکھا جہاں وہ اُس ناقابلِ

فراموش ملاقات کے بعد کبھی نہیں گیا تھا۔ تو اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

وہ کافی دیر تک اُس مکان کو تلاش کرتا رہا جہاں وہ شمائل ملی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی یادداشت کھو گئی ہو۔ وہ دو بار گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گیا لیکن فیصلہ نہ کر سکا کہ اُسے کہاں رکنا چاہئیے۔ آخر ایک مکان اُسے بالکل ویسا ہی لگا۔ وہ جلدی سے سیڑھیاں چڑھ گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازہ کھلا۔ سامنے کون کھڑا تھا۔ اُس کا نصب العین۔ اُس کے خیالات کی دیوی اُس کے خوابوں کا عکس جس کے لئے وہ اس قدر شدت سے اِس قدر دُکھ سے اس قدر پیار سے زندگی گذار رہا تھا۔

وہ خود اُس کے سامنے کھڑی تھی وہ کانپ سا گیا کمزوری کی وجہ سے اُسے کھڑا ہونا مشکل تھا۔ لیکن وہ انتہائی مسرت محسوس کر رہا تھا۔

وہ اس کے سامنے اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ گو اُس کی آنکھیں خواب آلودہ تھیں۔ اگرچہ اس کا چہرہ قدرے مُرجھایا ہوا تھا لیکن اُس کا حُسن بدستور قائم تھا۔

دو بج چکے تھے۔ پیکاریو کو دیکھ کر وہ چلّائی۔ "اوہ تم! اُس دن کیوں بھاگ گئے تھے"؟

پیکاریو تھکاوٹ کی وجہ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اُس کی طرف گھورنے لگا۔

"میں ابھی ابھی جاگی ہوں۔ وہ صبح سات بجے مجھے گھر چھوڑ گئے تھے۔ میں شراب کے نشے میں بدحال تھی" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اف! اس قسم کی باتیں کرنے سے اُس کا گونگا اور بہرہ ہونا بہتر تھا۔ اُس نے ایک ہی فقرے میں اپنی زندگی کی مکمل تصویر اُس کے سامنے پیش کر دی تھی لیکن ان سب باتوں پر واہ کئے بغیر اور اپنے حقیقی جذبات کو چھپا کر وہ آج یہ جاننے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ آیا اُس پر اس کی نصیحتوں کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں۔

جی کڑا کر کے جوش اور خوف سے ملی جلی آواز کے ساتھ وہ اُس کی حالت کی گراوٹ بیان کرنے لگا۔ وہ اُس کی باتوں کو بڑے غور سے سُن رہی تھی لیکن اُس کے چہرے سے وہ تعجب عیاں تھا۔ جو ہمیں کسی عجیب و غریب نظارے کو دیکھکر ہوتا ہے۔ اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی سہیلی کی طرف دیکھا جو کمرے میں ایک طرف بیٹھی اپنے بال سنوارتے پیکاریو کی ناصحانہ باتوں کو غور سے سُن رہی تھی۔

"میں غریب ہوں۔ مجھے معلوم ہے"۔ پیکاریو نے ایک لمبی ناصحانہ تقریر کا خاتمہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم محنت کریں گے۔ اپنی محنت پر زندہ رہنے سے زیادہ کوئی چیز خوشگوار نہیں۔ میں تصویریں بناؤں گا۔ تم میرے پاس بیٹھکر میرا حوصلہ بندھانا۔ یا تم کڑھائی کا کام کرنا یا کوئی اور کام کرنا جو تمھیں پسند ہو۔ ہم دونوں محنت کریں گے۔ تو ہم غریب نہیں رہیں گے۔

"میں کام کروں" اُس نے حقارت آمیز آواز میں اُسے ٹوکا۔ "کیا میں کوئی دھوبن یا درزن ہوں جو کام کروں"۔

اِن الفاظ سے اُس کی کھوکھلی زندگی کا کمینہ پن پوری طرح عیاں تھا۔

"تمہارے ساتھ شادی"۔ کونے میں بیٹھی ہوئی اُس کی سہیلی جو ابھی تک خاموش تھی۔ بول اُٹھی۔ "اگر میں تمہاری بیوی ہوتی تو بھوکی مرا کرتی"۔ یہ کہہ کر اُس عورت نے اپنے قابلِ رحم چہرے پر ایک عجیب مضحکہ خیز تاثر پیدا کیا۔ جو اس حسینہ کو بیحد پسند آیا۔

یہ انتہا تھی۔ وہ اِسے برداشت کرنے کے قابل نہ تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کے خیالات اور جذبات بے قابو ہو گئے۔ اُس کا دماغ خالی تھا۔ وہ بغیر کچھ دیکھے سُنے یا محسوس کئے سارا دن بے مقصد پھرتا رہا۔ کوئی اُسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ رات بھر سویا رہا ہے' وہ کہیں دوسرے دن کسی فضول سے جذبے کے ماتحت اپنے مکان پر پہنچا۔ اُس کا زرد چہرہ بھیانک لگ رہا تھا۔ اُس

ے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور اُس کے چہرے پر پاگل پن
ے آثار نمایاں تھے۔

اُس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کرلیا۔ کسی کو اندر آنے
نہیں دیتا تھا۔ اُسے کسی چیز کی تمنا نہ تھی۔ چار دن گذر گئے
اور اُس کے کمرے کا دروازہ ایک بار بھی نہ کھلا۔ ہفتہ گذر گیا
مگر اسی طرح بند رہا۔ لوگ اُس کے دروازے سے یہ
سن ہو گئے۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ آخرکار دروازہ توڑا
گیا۔ اندر اُس کی لاش پڑی تھی۔ اُس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ خون
میں لت پت ایک استرا پاس پڑا تھا۔ اُس کے مڑے ہوئے
ہاتھ اور اُس کے چہرے کی مسخ شدہ حالت اس بات کی
شاہد تھی کہ اُس کے ہاتھوں نے ٹھیک طور پر کام نہیں کیا۔
اور اس کی گناہگار روح جسم کے پنجرے سے نجات پانے سے پہلے
بہت دیر تک تڑپتی رہی تھی۔

اس طرح بیچارہ نیکاریو مٹ گیا۔ نیکاریو جو ایک اندھے
جنون کا مریض تھا۔ خاموش۔ شرمیلا جس میں ایک بچے کی
سادگی تھی۔ جس میں فن کے شرارے تھے۔ جو وقت گذرنے
پر شعلوں کی بلندی اور چمک دمک اختیار کرسکتے تھے۔
ختم ہو گیا اُس کی موت پر کسی کی آنکھ سے آنسو نہ ٹپکے۔ اُس
کی لاش کے قریب کوئی شخص نہ تھا۔ سوائے مکانوں کے
سپروائزر اور پولیس کے ڈاکٹر کے اُس کا جنازہ خاموشی سے
اٹھایا گیا۔ اور بغیر چرچ کی رسوم کو ادا کئے اُسے اٹھا
لے جایا گیا۔ اُس کے جنازے کے ساتھ صرف ایک ماتمی تھا۔
ایک سپاہی۔ وہ بھی اس لئے کہ اُس نے رات زیادہ ووڈکا
پی لی تھی۔ لفٹیننٹ پیروگو کے ساتھ اُس نے اپنی زندگی میں
دوستی کا حق نبھایا تھا۔ وہ بھی اس بدقسمت کی لاش کے آخری
دیدار کے لئے نہ آیا۔ دراصل اُس کے پاس ایسے کاموں کے
لئے وقت ہی نہ تھا۔ کیونکہ وہ خود ایک دلچسپ مہم سر کرنے
میں لگا ہوا تھا۔ آیئے ہم اُس کی باتیں کریں مجھے لاشیں پسند نہیں۔
جب کوئی جنازہ میرے راستے سے گذرے تو مجھے ایک عجیب
بدمزگی کا احساس ہوتا ہے۔ میں جب بھی ریشمی کفن میں ملبوس
کسی لاش کو دیکھتا ہوں۔ تو میں اپنے دل پر ایک بوجھ سا
محسوس کرتا ہوں۔ لیکن جب میں کسی غریب کی بے کفن لاش کو
دیکھتا ہوں جس کے پیچھے صرف ایک بھنگن ہوتی ہے۔
اور وہ بھی اس لئے کہ اُس کے پاس کوئی اور کام نہیں ہوتا۔
تو میرے دل کے بوجھ میں غم کے آثار بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ہم لفٹیننٹ پیروگو سے اُس
وقت جدا ہوئے تھے جب وہ بیچارے نیکاریو کو چھوڑ کر
اُس سنہرے بالوں والی لڑکی کے پیچھے چل پڑا تھا۔ سنہرے
بالوں والی لڑکی بڑی دلچسپ لڑکی تھی۔ وہ ہر شو ونڈو
کے سامنے رکی اور بیٹریاں۔ رومال، بالیاں۔ دستانے
غرض جو بھی خرافات شوکیسوں میں لگی تھی اُن میں نگاہ ڈالتی ہوئی
جا رہی تھی۔ اُس کی نگاہ ہر طرف اٹھ رہی تھی آگے پیچھے دائیں
بائیں۔

"میری جان، تم میری ہو" لفٹیننٹ پیروگو نے اُس
کا تعاقب کرتے ہوئے پورے بھروسے کے ساتھ کہا۔ اُس
نے اپنے چہرے کو کوٹ کے کالروں میں چھپا رکھا تھا۔ تاکہ
اگر اُس کا کوئی ملنے والا مل جائے تو پہچان نہ سکے۔ یہاں
قارئین کو لفٹیننٹ پیروگو کے بارے میں کچھ بتا دینا ضروری
نظر آتی ہے۔

لیکن پیشتر اس کے کہ لفٹیننٹ پیروگو کے بارے میں کچھ
کہا جائے یہ بہتر ہوگا کہ اُس سوسائٹی کا بھی ذکر کیا جائے
جس سے وہ تعلق رکھتا تھا۔ سینٹ پیٹرزبرگ میں کچھ ایسے
افسر تھے۔ جو اس شہر کا درمیانہ درجہ شمار ہوتے تھے۔ کونسلرز
کی طرف سے دی جانے والی پارٹیوں پر (کونسلر چاہے وہ
وہ پیدائشی ہوں یا اپنی محنت کی وجہ سے اس رتبے پر پہنچے
ہوں) اس قسم کے لوگوں سے ضرور ملاقات ہوتی تھی۔ اِن
کے علاوہ اِن پارٹیوں پر آپ کو چائے کی میزیں پیانو اور
ڈانس کے ساتھ ساتھ آپ کو کچھ بے رونق سی عورتیں نظر آتی
ہیں، جن کی جوانی ڈھلک چکی ہے۔ اِن بے رونق عورتوں
کو ہنسانا یا اپنی طرف متوجہ کرنا بڑا ہی مشکل کام ہے کیونکہ
اس کے لئے بڑی کاریگری کی ضرورت ہے۔ یا بلکہ یوں
کہئے کہ کسی کاریگری کی ضرورت نہیں۔ آپ کی گفتگو نہ تو بہت

سنجیدہ ہونی چاہیئے اور نہ بہت بچپن جیسی بس ایسی ہونی چاہیئے جس میں ہر قسم کی وہ خرافات شامل ہو جو عورتوں کو ہمیشہ پسند رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مذکورہ بالا نوجوان بہت کامیاب ہیں۔ ان بے رونق عورتوں کی باتوں کو سننا اور انھیں خوش کرنا ان لوگوں کی خاص خوبی ہے۔ اور اس خوبی کا معاوضہ اکثر انھیں ان الفاظ میں ملتا: "اب بس بھی کرو۔ اس قسم کا مذاق کرتے تمھیں شرم نہیں آتی" اونچے طبقے میں یہ لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ بلکہ نظر آتے ہی نہیں۔ تاہم انھیں پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ سمجھا جاتا ہے۔ انھیں ادبی گفتگو کا بہت شوق ہے۔ وہ بلگرن، لیشلن اور گرنیج کی تعریف کرتے ہیں اور اے اے۔ آر لو کا نام آتے ہی ناک بھوں چڑھا لیتے ہیں۔ وہ پبلک ہلکے کبھی مس نہیں کرتے چاہے وہ حساب کتاب اور جنگلات کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کے کچھ لوگ آپ کو تھیٹر میں ضرور مل جائیں گے۔ چاہے وہاں "فلاٹھا" قسم کی کوئی چیز سٹیج کی جاری ہو جو ان کے مذاق اعلیٰ کو پسند نہیں۔ تھیٹر کے ڈائریکٹروں کے لئے یہ لوگ بڑے مفید ہوتے ہیں ڈرامے میں اچھے اشعار کو پسند کرنا اور ایکٹروں پر آوازے کسنا ان کا محبوب شغل ہے۔ ان میں اکثر سول سروس کا امتحان دیتے ہیں یا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن آخر دو گھوڑوں کی ایک گاڑی خرید لینے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ تب ان کی دوستی کا دائرہ وسیع ہونا شروع ہوتا ہے۔ آخر کار وہ کسی بیوپاری کی لڑکی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جو پیانو بجا سکتی ہے۔ اور جس کے پاس ہزار ایک روپیہ نقد اور بہت سے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ عزت انھیں اس وقت تک نصیب نہیں ہوتی جب تک وہ کرنل نہ ہو جائیں۔ کیونکہ رشتہ دار روسی، باوجودیکہ ان سے گوبھی کی بو آتی ہے۔ اپنی لڑکی کی شادی جنرل یا کم سے کم کرنل سے کم کے ساتھ کرنے پر رضامند نہیں ہوتے۔ یہ تو اس کلاس کے مخصوص ۹ تھے۔ لیکن لفٹیننٹ پیروگو میں بہت سی ایسی خوبیاں تھیں جو محض اس کی ذات تک محدود تھیں۔ مثال کے طور پر وہ "ڈمنزی دانسکا کے" اور ڈی مسعار جونز آف بی انگ کلیوڈ میں سے بڑی خوبصورتی سے شعر پڑھ سکتا تھا۔ اُسے اپنی پائپ سے دھوئیں کے دائرے بنانے میں اس قدر مہارت تھی کہ وہ ایک کش کے ساتھ دس دائرے بنا لیتا تھا۔ اس قسم کے دلچسپ قصے کہ ایک تو پ کیوں ہے اور ایک توپ 'توپ کیوں' سنانے میں اُسے بہت جلد تھی۔ پیروگو کی تمام خوبیوں کا، جو اُسے قدرت کی طرف سے عطا ہوئی تھیں بیان نہایت مشکل ہے، وہ ایکٹروں اور رقاصوں کے بارے میں گفتگو کرنے کا بہت مشتاق تھا لیکن اُس کی گفتگو ایک نئے رکروٹ کی طرح بدمزہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے عہدے سے بہت خوش تھا جس میں اُس کی ابھی ابھی ترقی ہوئی تھی۔ ویسے وہ کبھی کبھی کہا کرتا تھا۔ کہ اگر میں لفٹیننٹ ہوں تو کیا ہے۔ یہ عہدے وغیرہ سب بکواس ہے۔ لیکن اندر ہی اندر وہ اپنے عہدے سے بہت خوش تھا۔ وہ اکثر بات چیت کے دوران میں اپنی پوزیشن کے متعلق اشارہ کر جاتا تھا۔ ایک دفعہ جب بازار میں اس کا ایک کلرک سے جھگڑا ہو گیا تھا جس نے اُس کی شان میں کچھ گستاخ الفاظ کہے تھے۔ تو پیروگو نے دو ٹوک اُس کو احساس دلا دیا تھا کہ وہ ایک لفٹیننٹ سے بات کر رہا ہے۔ کسی ایرے غیرے سے نہیں۔ اور اُس نے یہ بات نہایت فصیح زبان میں کہی تھی کیونکہ اُس وقت وہاں سے دو قدرے حسین عورتیں گذر رہی تھیں۔

پیروگور کو ہر حسین شے کا اشتیاق تھا۔ اسی لئے وہ پسکاریو کا حوصلہ بندھایا کرتا تھا، ویسے ہو سکتا ہے۔ پسکاریو کے ساتھ اس کی دوستی کی حقیقی وجہ یہ ہو کہ پیروگو اپنے حسین نقش تصویر کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہو۔

پیروگو کی بہت سی خوبیاں ہم نے بیان کر دیں لیکن یہاں پر بات ختم نہیں ہو جاتی۔ انسان خدا کی ایک ایسی حیران کن تخلیق ہے کہ کوئی بھی اس کی تمام خوبیاں بیان نہیں کر سکتا۔ اور جب بھی کوئی اس کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کی کئی اور خاصیتیں اُبھرتی ہیں، اور ان سب کا بیان کرنا ناممکن ہے۔

پیروگور اس اجنبی لڑکی کا تعاقب کرتا رہا۔ اور وقتاً فوقتاً کئی ایسے سوالوں سے اُس کا جی بہلاتا رہا جن کا جواب وہ

کرتے [illegible] الفاظ میں دیتی تھی وہ اندھیرے کا زان [illegible] سے گذر کر [illegible] میں داخل ہو گئے۔ یہ تمباکو بیچنے والوں [illegible] یہاں تمباکو فروشوں کے علاوہ زمین کا ریڈیو کی دکانیں [illegible] سنہرے بالوں والی لڑکی تیزی سے ایک تنگ [illegible] میں داخل ہو گئی۔ پیرو گور بھی اس کے پیچھے [illegible] میں داخل ہو گیا۔ وہ تیزی سے اندھیری سیڑھیوں میں سے گذر کر ایک دروازے میں داخل ہوئی۔ پیرو گور بھی دلیرانہ [illegible] کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک بڑے سے کمرے میں پایا جس کی دیواریں کالی اور چھت دھواں زدہ تھی۔ دھات کے پرزوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا، اوزار، چھتے ہوئے کانچ کے برتن اور ٹیم بتیاں میز پر پڑی تھیں۔ فرش پیتل اور لوہے کے بوسے سے چمک رہا تھا۔ پیرو گور فوراً سمجھ گیا کہ یہ ایک کاریگر کا مکان ہے۔ اجنبی لڑکی بغل کے دروازے سے نکل گئی۔ پیرو گور نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ اور پھر روسی قاعدے کے مطابق دروازے میں داخل ہو گیا۔ اب وہ ایک اور کمرے میں تھا۔ جو پہلے سے بالکل مختلف تھا۔ بڑا صاف اور ستھرا تھا جس سے یہ پتہ چلتا تھا۔ اس کا مالک ایک جرمن کاریگر ہے۔

یہاں اس نے ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھا، جسے دیکھ کر وہ حیران پریشان رہ گیا۔ اس کے سامنے شلر بیٹھا تھا۔ وہ شلر نہیں جس نے Wilhelm tell اور The History of the thirty Years war لکھی ہے۔ بلکہ یہ تو وہ مشہور شلر تھا جو اس گلی میں لوہار کا کام کرتا تھا۔ اس کے پاس ہافمین کھڑا تھا۔ ہافمین ادیب نہیں۔ بلکہ آفیسر ز سٹریٹ کا موچی جو شلر کا بڑا قریبی دوست تھا۔ شلر بہت سی شراب پئے ہوئے تھا اور کرسی پر بیٹھا ہوا [illegible] پاؤں کو زمین پر مار رہا تھا۔ اور بڑی گرمجوشی سے باتیں کر رہا تھا لیکن پیرو گور کی حیرانی کا کارن یہ سب کچھ نہیں تھا۔ اس کی حیرانی کا سبب ان لوگوں کے بیٹھنے کا انداز تھا۔ شلر اپنا چہرہ اونچا کئے ہوئے اپنی موٹی ناک کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ہافمین اپنی انگلیوں سے اس کی ناک کو پکڑے ہوئے تھا۔ اور اس پر موچیوں کا چاقو پھیلا رکھا تھا۔ دونوں جرمن بول رہے تھے۔ اور چونکہ پیرو گور جرمن بہت کم سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ ماجرے کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ دراصل شلر یہ کہہ رہا تھا "مجھے نہیں چاہئے۔ مجھے ناک کی کوئی ضرورت نہیں"۔ وہ اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا "میں مہینے میں تین پونڈ تمباکو اکیلے ناک پر خرچ کرتا ہوں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ وہ مجھے ایک گھٹیا سی روسی دکان سے لینا پڑتا ہے۔ (کیونکہ جرمن دکاندار روسی تمباکو نہیں بیچتے) اس گلی سڑی روسی دکان کو مجھے ایک پونڈ کے تیس کوپک دینے پڑتے ہیں یعنی ایک روبل اور بیس کوپک۔ ایک روبل اور بیس کوپک سے ضرب دو تو ہو جائیں گے چودہ روبل اور چالیس کوپک سنتے ہو ہافمین بھائی۔ چودہ روبل اور چالیس کوپک اکیلے ناک پر اور چھٹی والے دن میں ریپی (Rapee) لیتا ہوں۔ کیونکہ میں چھٹی والے دن گھٹیا روسی تمباکو استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے سال میں دو پونڈ ریپی خریدنا پڑتا ہے۔ اس پر میرے دو روبل خرچ آتے ہیں چھ اور چودہ بیس۔ بیس روبل۔ اور چالیس کوپک صرف تمباکو پر۔ یہ لوٹ ہے۔ کیوں دوست ہافمین ہے کہ نہیں لوٹ۔ ..... ہافمین چونکہ خود شراب پئے ہوئے تھا اس لئے اس کی ہر بات پر ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

" بیس روبل اور چالیس کوپک۔ میں جرمن ہوں۔ ایک ایسے ملک کا باسی جہاں پر شاہی حکومت ہے، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے نہیں چاہئے یہ ناک۔ اسے کاٹ دو تمہارے سامنے رکھی ہے۔

..... اور اگر اچانک لفٹیننٹ پیرو گور نہ آجاتا۔ تو ہافمین اپنے دوست کی خواہش پوری کر چکا ہوتا۔ کیونکہ وہ چاقو کو بالکل اسی حالت میں پکڑے ہوئے تھا جیسے وہ تلا کاٹتے وقت پکڑتا تھا۔

شلر کو بڑا غصہ آیا کہ ایک اجنبی کی بے موقع آمد اس کے لئے رکاوٹ ثابت ہوئی ہے بیر اور وسکی کے ملے جلے

نشے کے باوجود اُس نے محسوس کیا کہ اس قسم کے سین کے درمیان کسی اجنبی کی موجودگی اچھی نہیں لگتی یعنی اس وقت پیروگور نے قدرے جُھک کر اُن آداب کے ساتھ جن سے وہ قدرتی طور پر آشنا تھا کہنے لگا۔

"معاف کیجیے گا ...."

"باہر نکل جاؤ" شلر نے آہستہ سے جواب دیا۔

اس سے پیرو کو بھی غصہ آگیا۔ وہ اس قسم کے سلوک سے قطعی طور پر ناواقف تھا۔ اُس کے ہونٹوں کی مُسکراہٹ یکلخت غائب ہو گئی۔ اور اُس نے زخم خوردہ آن سے کہا۔

"جناب ..... میں حیران ہوں .... آپ نے شاید نوٹ نہیں کیا۔ میں ایک افسر ہوں"۔

"افسر ہو تو کیا۔ میں جرمن ہوں۔ میں خود (اس پر شلر نے میز پر مکّہ مارا) میں خود افسر بن سکتا ہوں۔ سال ایک سال کے لئے کیڈٹ، دو سال میں لفٹیننٹ۔ میں کل ہی افسر بن جاؤں۔ لیکن میں ملازمت کرنا نہیں چاہتا۔ افسر، تھو"۔ اور شلر نے اپنی ہتھیلی پر تھوک دیا۔

لفٹیننٹ پیروگور سمجھ گیا کہ یہاں سے چلے جانے کے سوا چارہ نہیں۔ لیکن ایسے چلے جانا اُس کی پوزیشن کے خلاف ہونے کے علاوہ اس کے لئے ویسے بھی اچھا نہ تھا۔ وہ کئی بار سیڑھیوں میں رُکا۔ جیسے وہ اپنی ساری طاقت اکٹھا کر کے یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہو کہ وہ شلر کو کیسے اُس کی بدسلوکی کا مزا چکھائے۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شلر کو معاف کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ شراب کے نشے میں تھا۔ اور پھر جب اُسے اُس سنہرے بالوں والی لڑکی کا خیال آیا تو اُس نے فیصلہ کیا کہ اس سارے قصے پر مٹی ڈالو ..... دوسرے دن لفٹیننٹ پیروگور صبح صبح لوہار کی دوکان پر آدھمکا۔

پہلے کمرے میں اُس کی اُس حسینہ سے ملاقات ہوئی۔ لڑکی نے بڑے روکھے پن سے جو اُس کے چہرے پر بہت مناسب معلوم ہو رہا تھا۔ پوچھا

"تمھیں کیا چاہیئے"۔

"میری جان۔ آداب عرض کرتا ہوں — مجھے پہچانا

نہیں۔ ...... تمہاری آنکھیں کتنی حسین ہیں۔

اس پر لفٹیننٹ پیروگور اُسے اپنی ٹھوڑی کے نیچے دبا لینا چاہتا تھا لیکن لڑکی نے چیخ کر اسی روکھے پن سے پوچھا۔

"تمھیں کیا چاہیے؟"

"میں صرف تم سے ملنا چاہتا ہوں مجھے اور کچھ نہیں چاہیے" لفٹیننٹ پیروگور نے مسکراتے ہوئے اور قریب کھسکتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ شرمیلی حسینہ بغل والے کمرے میں کھسک جانا چاہتی ہے۔ اُس نے کہا۔

"جانِ من سنو۔ میں کچھ ایڑیاں (Sp[illegible]) بنوانا چاہتا ہوں۔ اگرچہ تم سے محبت کرنے کے لئے ایڑیوں کی اسقدر ضرورت نہیں جس قدر چابک کی ... تمہارے ہاتھ کس قدر خوبصورت ہیں۔

لفٹیننٹ پیروگور اس قسم کی وضاحتیں پیش کرنے کا خدا تھا۔

"میں ابھی اپنے خاوند کو بلاتی ہوں" جرمن لڑکی نے چیخ کر کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

کچھ لمحے گذرنے کے بعد شلر نیم بیداری کی حالت میں کمرے میں داخل ہوا۔ کل رات پی ہوئی شراب کا خمار ابھی تک اُس کی آنکھوں میں باقی تھا۔ اُسے صاف طور پر کچھ یاد نہیں تھا۔ لیکن اُسے اتنا احساس ضرور تھا کہ کل رات اُس سے کچھ ناواقف حرکت سرزد ہوئی تھی۔ اس لئے اُس نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔

"میں ایڑیوں کے پندرہ روبل سے کم نہ لوں گا"۔

ایک ایماندار جرمن کی حیثیت سے اُسے ایسے آدمی سے باتیں کرتے ہوئے جس نے اُسے نہایت گھٹیا حالت میں دیکھا تھا، اُس کا ضمیر اُسے ملامت کر رہا تھا۔

شلر دو ایک دوستوں کو چھوڑ کر کسی کے سامنے شراب نہیں پیتا تھا۔ بلکہ وہ تو اپنے کاریگروں سے بھی چھپ کر پیتا تھا۔

پیروگو نے نہایت ادب سے پوچھا۔

"اس قدر مہنگے کس لئے؟"

"جرمن کاریگری کی وجہ سے" شلر نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"کسی روسی سے بنوالیجئے۔ وہ آپ کو دو روبل میں بنا دے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ اس امر کا ثبوت دینے کے لئے کہ تم مجھے بہت پسند ہو اور میں تم سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق رکھتا ہوں۔ میں پندرہ روبل ادا کر دوں گا۔"

شلر ایک لمحے کے لئے سوچ میں ڈوب گیا۔ چونکہ وہ ایک یاندار جرمن تھا۔ اس لئے اُسے بہت شرم محسوس ہوئی۔ اس خواہش میں کہ کسی طرح پیترو گو آرڈر دینے سے باز آجائے۔ اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ ایڑیاں پندرہ دن سے پہلے تیار نہ ہوسکیں گی۔ لیکن پیترو گو اس پر کچھ نہ کہا بلکہ یوں ظاہر کیا کہ اس قدر وقت کا لگ جانا بالکل جائز ہے۔

شلر اب یہ سوچ رہا تھا کہ کام کس خوبصورتی سے کیا جائے کہ وہ پندرہ روبل کا نظر آئے۔

اس اثنا میں سنہرے بالوں والی وہ لڑکی ورکشاپ میں آگئی۔ اور اُس میز سے جھاڑ پونچھ شروع کر دی جس پر پانی کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ لفٹیننٹ شلر کی خود فراموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھا اور اُس کے قریب جا کر اُس کے بازو پر جو کندھوں تک ننگا تھا چٹکی دی۔

شلر کو یہ بات بہت بُری لگی۔

"مین فرا" اُس نے جرمن زبان میں کہا۔

"واز دولٹ سائی ڈاچ" لڑکی نے جواب دیا۔

"گون سائی ان ٹو دی کچن"۔

لڑکی چلی گئی۔

"تو پھر پندرہ دن میں ہو جائے گا تیار"۔

"ہاں ہو جائے گا" خیالات میں ڈوبے ہوئے شلر نے جواب دیا "مجھے ان دنوں بہت کام ہے"۔

"اچھا میں پھر آؤں گا"۔

"بہت اچھا" شلر نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

اگرچہ اُس جرمن لڑکی نے پیترو گو کو صاف ٹھکرا دیا تھا۔ لیکن اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اُس کا پیچھا جاری رکھا جائے۔ یہ بات سمجھنے سے وہ بالکل قاصر تھا کہ کوئی اُس سے کیسے غیر دوستانہ برتاؤ روا رکھ سکتا ہے۔ خاص طور پر جب اُس کی شکل و صورت اور رتبہ اس قدر اچھا ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ شلر کی بیوی باوجود اپنے حسن کے بہت بے وقوف تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بے وقوفی عورت کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ میں کم سے کم کئی ایسے خاوندوں کو جانتا ہوں جنہیں اپنی بیویوں کی بے وقوفی بے حد پسند ہے۔ اور اسے وہ غلطی سے معصومیت کا نام دیتے ہیں۔ حسن کئی معجزوں کا محرک ہوتا ہے۔ ایک خوبصورت کی تمام روحانی کمزوریاں بُری لگنے کی بجائے نسبتاً زیادہ خوبصورت لگتی ہیں خود بُرائی حسین لگنے لگتی ہے لیکن اگر کوئی عورت حسن سے محروم ہو تو ایک مرد کی محبت تو کیا عزت حاصل کرنے کے لئے بھی اُسے مرد سے بیس گنا زیادہ چالاک ہونے کی ضرورت ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ شلر کی بیوی بے وقوف ہونے کے باوجود اپنے فرائض سے واقف تھی۔ ان حالات میں پیترو گو کے لئے اپنی اس دلیرانہ مہم میں کامیاب ہونا ممکن نہ تھا لیکن رکاوٹوں کو دور کرنے میں بھی ایک عجیب لطف ہے وہ لڑکی دن بدن اُس کے دل کی گہرائیوں میں اترتی گئی۔ وہ اکثر ایڑیوں کے بارے میں پوچھتے چلا جاتا۔ اس سے شلر بہت تنگ آگیا۔

وہ جلد سے جلد ایڑیاں تیار کر دینا چاہتا تھا۔ آخر ایک دن وہ مکمل ہوگئیں۔ "کاریگری کا کتنا حسین نمونہ ہے" لفٹیننٹ پیترو گو نے ایڑیاں دیکھ کر کہا "خدا کی قسم کتنی حسین بنی ہیں۔ ہمارے جنرل کے پاس بھی اس قدر خوبصورت ایڑیاں نہیں ہیں"۔

خود پسندی کی ایک لہر شلر کے دل میں دوڑ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کی ایک جھلک پیدا ہوئی۔ اور دل ہی دل میں پیترو گو سے اُس کی نفرت جاتی رہی۔

"روسی افسر اچھے کام کی قدر کرنا جانتا ہے"۔ اُس نے سوچا۔

"میرے خیال میں تم چھری کا دستہ قسم کی چیز بھی بنا

سکتے ہو۔"

"ہاں، کیوں نہیں" شلر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر تم مجھے چھری کا ایک دستہ بنا دو۔ میں کل چھری لے آؤں گا۔ میرے پاس ایک بہت خوبصورت ترکی چھری ہے۔ لیکن میں اس کا دستہ بدلنا چاہتا ہوں۔"

یہ الفاظ شلر کو تیر کی طرح چبھے۔ اچانک اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کی۔ کہ یہ مصیبت پھر گلے ڈال لی ہے۔ انکار کرنا اب کمینگی کے مترادف ہے۔ خاص طور پر جب کہ روسی افسر اس کے کام کی اس قدر تعریف کرتا ہے اس نے سر کے ہلکے سے خم کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن اس بوسے والے واقع نے اسے عجیب شش و پنج میں ڈال دیا۔

میرے خیال میں قارئین کو اس وقت شلر کے بارے میں ذرا اور تفصیل کے ساتھ بتا دینا بیجا نہ ہوگا۔ شلر ہر لحاظ سے جرمن تھا۔ ایک صحیح جرمن کی خوبیاں۔ برائیاں سب اس میں موجود تھیں بیس سال کی عمر میں جب ایک روسی عیاشی میں لگا ہوتا ہے شلر نے اپنی زندگی کا مکمل پلان بنا لیا تھا۔ اور حالات کا اتار چڑھاؤ اسے اس پلان سے ایک قدم بھی ادھر ادھر نہ کر سکے۔ وہ ہر صبح سات بجے اٹھتا تھا۔ دو بجے کھانا کھاتا تھا۔ بہت کم گو تھا۔ ہر اتوار کو شراب پیتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ دس سال میں پچاس ہزار روپے کمائے گا، اور اس کے لئے یہ فیصلہ نوشتۂ تقدیر کی طرح اٹل تھا۔

ایک کلرک دفتر میں داخل ہو کر اپنے افسر کے کمرے میں جھانکنا بھول جائے لیکن ایک جرمن اپنے فیصلے سے کبھی نہیں بدلتا۔ وہ کسی قیمت پر بھی اپنے خرچ میں اضافہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ مثال کے طور پر اگر آلوؤں کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے۔ تو بجائے خرچ بڑھنے کے وہ آلوؤں کی مقدار میں کمی کر لیتا تھا۔ اسے اسے کبھی کبھی بھوکا رہنا پڑتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اس کی کم کھا کر رہنے کی عادت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اس نے اپنی بیوی کے بوسوں کا بھی راشن مقرر کر رکھا تھا۔

وہ دن میں صرف دو بار اپنی بیوی کا بوسہ لیتا تھا۔ اور دو سے زیادہ بار بوسے لینے کی ترغیب سے بچنے کے لئے وہ اپنے شوربے میں ایک چمچ سے زیادہ کالی مرچ نہیں ڈالتا تھا۔ ہاں البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اتوار کو اس قانون پر سختی سے کاربند نہیں رہتا تھا۔

لیکن اس کی ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ اتوار کو وہ دو بوتلیں بیر اور واڈکا کی بوتل پیتا تھا۔ شراب وہ انگریزوں کی طرح نہیں پیتا تھا۔ جو رات کو کھانا کھا کر دروازہ بند کر لیتے ہیں اور اکیلے پیتے ہیں۔ بلکہ وہ تو جرمنوں کی طرح بیٹھ کر دوستوں کے ساتھ پیتا تھا۔ شراب یادہ ہاف مین موچی کے ساتھ اور پھر ایک اور جرمن دوست کنٹز ترکھان کے ساتھ جو خود بڑا شرابی تھا۔ پیتا تھا۔

یہ تھا شلر محترم جو ایک بڑی عجیب الجھن میں پھنس گیا تھا اگرچہ وہ لاپرواہ قسم کا جرمن تھا لیکن پیروگو کی حرکتوں نے اس کے دل میں حسد سا پیدا کر دیا تھا۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے چہرے کا رنگ نیلا پڑ گیا۔ لیکن اسے روسی افسر سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس عرصے میں پیروگو اپنے دوستوں کے درمیان پائپ پیتے ہوئے ——

یہ قدرت کا اصول ہے کہ افسری ملتے ہی آپ کو پائپ مل جاتی ہے۔ ایک حسین مسکراہٹ کے ساتھ وہ ایک حسین جرمن لڑکی کے ساتھ اپنے تعلقات کی طرف بڑا معنی خیز اشارہ کرتا۔ اس کی باتوں سے کہ وہ اس لڑکی سے کافی میل جول پیدا کر چکا ہے اور اسے حاصل کرنے کی اسے رتی بھر امید نہیں۔

ایک دن شستنایا گلی میں گھومتے ہوئے اچانک اس نے اس دوکان کی طرف دیکھا۔ جس پر شلر کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس کی خوشی کی حد نہ رہی۔ جب اس نے اس حسینہ کو کھڑکی سے سر باہر نکالے راہگیروں کا نظارہ کرنے میں مشغول پایا۔ وہ وہیں رک گیا۔ ہاتھ ہلاتے ہوئے اس نے کہا۔

"سلام عرض کرتا ہوں۔"

جواب میں اس لڑکی نے بالکل ویسے ہی ہاتھ ہلایا جیسے ایک دوست ہلاتا ہے۔

"تمہارا خاوند گھر پہ ہے؟"

"ہاں" وہ بولا۔

"وہ گھر سے باہر گیا ہے؟"

"اور کیا وہ گھر پہ نہیں ہوتا؟" اس بے وقوف لڑکی کے منہ سے نکل گیا۔

"بھاگی پر نہیں" پیروگو نے دل ہی دل میں کہا مجھے ضرور اُس کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اگلے اتوار کو وہ اپنا اُس پہلی پوزیشن کے ساتھ پیش ہوا۔ شلر واقعی گھر پر نہیں تھا۔ گھر کی حسین مالکن گھبرا سی گئی لیکن اس بار پیروگو نے زیادہ ہوشیاری سے کام لیا۔ وہ اُس کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آیا۔ اور جھک کر اپنے حسین جسم کی مکمل نمائش کی۔ وہ بڑی عزت کے ساتھ بڑی عجیب باتیں کرتا رہا لیکن وہ بھولی بھالی لڑکی صرف ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔ آخر کار جب اُس کے تمام حربے اُس حسینہ کو رام کرنے میں ناکام رہے۔ تو اُس نے رقص کی تجویز پیش کی۔ پیروگو کو رقص پر بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ کیونکہ ایک یہ کہ ایسی شے تھی جو اس لڑکی کو پسند تھی۔ دوسرے اُس میں وہ اپنے حُسن کی نمائش بہتر طریقے سے کر سکتا تھا۔ تیسرے رقص میں چونکہ ایک دوسرے کے قریب آنا پڑتا تھا۔ لہذا اُسے بغل گیر ہونے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ قصہ مختصر اُسے یقین تھا کہ رقص یقیناً اس کی کامیابی کا باعث ثابت ہوگا۔ وہ کسی گیت کا ایک مصرعہ گنگنانے لگا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جرمن لڑکیوں کے ساتھ تیزی دکھانے سے کام نہیں چلتا۔ لڑکی کمرے کے وسط میں چلی گئی اور اپنا خوبصورت پاؤں رقص کے انداز میں اُٹھایا۔ لڑکی کے اس انداز کو دیکھ کر پیروگو خوشی سے پاگل ہو گیا۔ وہ اُس کا بوسہ لینے کے لئے آگے بڑھا۔ لڑکی رونے لگی۔ رونے سے اُس کے حُسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ پیروگو نے اس کی آنکھوں کے بے شمار بوسے لئے ـــــ اچانک دروازہ کھلا۔ اور شلر ہافمین اور کنسٹر ترکمان کے ساتھ اندر داخل ہوا تمام کاریگر حضرات نوابوں کی طرح شراب میں بدمست تھے۔

شلر کے غصے کا اندازہ قارئین خود لگا سکتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں خاموش رہنا بہتر سمجھوں گا۔

"کمینے" وہ غصے میں چلایا۔ "میری بیوی کا بوسہ لینے کی جرأت تمہیں کیسے ہوئی۔ تم روسی افسر نہیں۔ حرامی ہو۔ تم شیطان کی ماں۔ میں جرمن ہوں۔ تمہاری طرح کوئی روسی کمینہ نہیں۔ کیوں بھائی ہافمین (ہافمین نے سر ہلا کر اُس کی ہاں میں ہاں ملائی) مجھے نہیں چاہیئے افسری۔ ہافمین بھیا اسے گردن سے پکڑ کر باہر پھینک دو مجھے نہیں چاہیئے ......" وہ اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اُس کی واسکٹ کی طرح سُرخ تھا۔

"میں آٹھ سال سینٹ پیٹرزبرگ میں رہا ہوں۔ میری ماں سوئیبیا میں اور میرا چچا نیورم برگ میں۔ میں جرمن ہوں۔ کوئی گدھا نہیں۔ ہافمین اِسے باہر پھینک دو۔ کامریڈ کنسٹر اسے ٹانگوں سے پکڑو۔"

جرمنوں نے پیروگو کو بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ لیا۔ پیروگو کو اپنے آپ کو چھڑانے کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ یہ تینوں کاریگر سینٹ پیٹرزبرگ کے مضبوط ترین انسان تھے اُنھوں نے پیروگو کے ساتھ اس قدر بیہودہ سلوک کیا۔ کہ مجھے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ میں اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے دن شلر کو بخار ہو گیا ہوگا۔ وہ سارے دن پتے کی طرح کانپتا رہا۔ اُسے ہر لحظہ پولیس کا انتظار تھا۔ اور وہ خدا کے حضور میں منتیں مانگتا رہا کہ کل کا واقعہ کسی طرح خواب ثابت ہو۔ لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اور اس میں تبدیلی ناممکن تھی۔ اِدھر پیروگو کے غصہ کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اپنی بے عزتی کا خیال آتے ہی وہ پاگل ہو اُٹھا۔ اُس کے خیال میں شلر کم از کم دیش بدر کیا جانے کا مستحق تھا۔ وہ سیدھا گھر گیا تاکہ کپڑے بدل کر جنرل سے جا کر جرمنوں کی بغاوت کا ذکر سخت ترین الفاظ میں کرے۔ وہ چیف آف سٹاف کو اس سلسلے میں تحریری درخواست دینا چاہتا تھا۔ اور اگر وہاں سے شلر اور اُس کے ساتھیوں کو مناسب سزا نہ ملے تو وہ یہ شکایت افسرانِ بالا تک لیجانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

لیکن اس سارے واقعہ کا خاتمہ بڑے عجیب و غریب طریقے سے ہوا۔ گھر واپس آتے وقت راستے میں وہ ایک ریسٹورانٹ

تک داخل ہوا وہاں کچھ پیسٹریاں کھائیں۔ نادوران بی کی دردی گولی کی۔ گھر پہنچنے تک اُس کا غصہ کافی ٹھنڈا ہو چکا تھا علاوہ بریں شام کی خنک ہوا نے نادسکی پراسپیکٹ میں گھومنے کا موڈ پیدا کر دیا۔ نو بجے تک اُس کا غصہ بالکل ہوا ہو چکا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اتوار کو جنرل کو تکلیف دینا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ چنانچہ وہ شام گذارنے کے لئے کنٹرول ڈیپارٹمنٹ کے کسی ڈائریکٹر کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہاں اُس کی رجمنٹ کے بہت سے کلرک اور افسر جمع تھے۔ وہاں اس نے بہت پُرلطف شام گذاری۔ جہاں اس کے گیتوں نے نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں میں بھی بڑی خروش پیدا کر دیا۔

پرسوں "نادسکی پراسپیکٹ" میں گذرتے ہوئے ان دو واقعوں کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا "یہ دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ قسمت جو کھیل ہمارے ساتھ کھیلتی ہے وہ کتنا عجیب و غریب ہوتا ہے۔ ہمیں خیال تک نہیں ہوتا کہ ایسا ہوگا۔ کیا ہم کبھی اس طرف کا خیال بھی کرتے ہیں۔ جہاں قسمت ہمیں لے جا رہی ہوتی ہے۔ ہر ایک بات ہماری خواہشات کی الٹ واقع ہوتی ہے۔ ایک تو وہ آدمی ہیں جنھیں قدرت کی طرف سے بڑے خوبصورت گھوڑے عطا ہوتے ہیں۔ اور وہ اُن پر سواری کئے جا رہے ہیں۔ لیکن انھیں کبھی خیال تک نہیں آتا کہ وہ ان گھوڑوں کی خوبصورتی کی طرف متوجہ ہوں۔ یا خدا کا شکر بجا لائیں کہ اُس نے اُن پر اپنا خاص کرم کیا ہے۔ اور ایک وہ ہیں جس کے دل کو گھوڑے کے گوشت کی آرزو نے جلا کر رکھ دیا ہے۔ سڑک پر جاتے ہوئے جب کوئی تیز رفتار گھوڑا اُس کے قریب ہو کر گذر جاتا ہے تو اُس کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

ایک آدمی ہے جس کے پاس روٹی ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے اُس کا منہ اس قدر چھوٹا ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک آدھ ٹکڑے سے زیادہ کھا نہیں سکتا۔ اور ایک وہ ہیں۔ جن کا منہ جنگی دفتر کے گیٹ کے برابر کھلا ہوتا ہے، لیکن آلو کھانے پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

قسمت انسان سے کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ لیکن جو کھیل آپ سے نادسکی پراسپیکٹ میں کھیلے جاتے ہیں وہ عجیب ترین ہوتے ہیں۔ اس گلی کا کبھی اعتبار نہ کریں۔ جب بھی یہاں سے گذرتا ہوں اپنے اوورکوٹ کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیتا ہوں۔ اور جو لوگ راہ میں مجھ سے دوچار ہوتے ہیں اُن پر کبھی نگاہ نہیں ڈالتا۔ یہ گلی ایک دھوکا ہے۔ چھلاوہ ہے۔ خواب ہے۔ حقیقت سے بہت دور ——— تم سمجھتے ہو کہ وہ نوجوان جو اُس خوبصورتی سے سلے ہوئے کوٹ میں ملبوس چلا جا رہا ہے۔ بہت امیر ہے۔

وہ کوٹ ہی اُس کا تمام سرمایہ ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ بھاری بھر کم آدمی جو اُس زیر تعمیر چرچ کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ اُس کے فن تعمیر کی تعریف کر رہے ہیں۔ نہیں صاحب وہ تو یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ دو کوّے جو ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہیں کتنے عجیب ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ نوجوان جو بڑے جوش و خروش سے اپنے بازو ہلا رہا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ کیسے اُس کی بیوی کا ایک اجنبی افسر پر کھڑکی سے گولہ پھینکا۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو Lafayette پر بحث کر رہا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ عورتیں۔ عورتوں پر بالکل بھروسہ نہ کرو۔ کھڑکیوں میں بہت زیادہ مت جھانکو۔ جو چیزیں اُن میں نظر آتی ہیں وہ خوبصورت ضرور ہیں۔ لیکن اُن میں سے مزدوروں کے خون کی بو آتی ہے لیکن عورتوں کو ہیٹ سے نیچے دیکھنے سے آپ کو خدا بچائے۔ میں کسی قیمت پر بھی اُن کا پیچھا کرنے کو تیار نہ ہوں گا۔ خدا کے لئے لیمپ سے دور بہت دور رہیے اور جتنی جلدی سے ہو سکے وہاں سے گذر جائیے۔ اگر تم وہاں سے اپنے خوبصورت کوٹ پر تیل کے ایک دو دھبوں کو گرا کر بچ نکلے تو سمجھ لو کہ تم سستے چھوٹ گئے۔ صرف لیمپ ہی نہیں۔ ہر چیز میں دھوکا ہے۔ "نادسکی پراسپیکٹ" بجائے خود ایک بڑا جھوٹ ہے۔ لیکن خاص کر رات کے دھندلکے میں جب کہ مکانوں کی سفید اور پیلی دیواریں اور نمایاں ہو جاتی ہیں۔ جب تمام شہر شور و غل سے جاگ اٹھتا ہے۔ جب ہزاروں گاڑیاں سڑکوں پر دندناتی ہیں جب ہرکارے چیختے ہوئے اپنے گھوڑوں پر سوار گذرتے ہیں اور شیطان خود اپنے ہاتھوں سے لیمپ جلا کر ہر ایک شے کو ایک مصنوعی شکل میں پیش کرتا ہے تو یہ جھوٹ اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔

سومرسیٹ مام

سومرسیٹ مام ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوا۔ اُسے گزشتہ نصف صدی سے انگریزی کے نہایت ہی مقبول ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ اُسے تمام اصناف ادب پر عبور حاصل ہے۔ جس نے افسانہ، ناول اور ڈرامہ کے میدان میں اپنی بلند قامتی کو برقرار رکھا ہے۔

پیرس میں اُس کے والد برطانوی قونصل تھے۔ ابتدائی تعلیم بھی اُس نے فرانس میں ہی حاصل کی۔ ابھی وہ آٹھ سال کا تھا کہ اُس کی ماں مر گئی۔ اور پھر دو سال بعد اُس کا باپ بھی رخصت ہو گیا۔ والدین کی موت کے بعد اُسے اُس کے چچا نے اپنے پاس انگلستان بلا لیا۔ اُس کے چچا ایک پادری تھے وہ مام کو بھی پادری کی تعلیم دلانا چاہتے تھے مگر مام بڑا خود سر واقع ہوا تھا کبھی مصوری کی طرف لپکتا اور کبھی ڈاکٹری کی طرف۔ اُس کا بچپن اور جوانی عجیب و غریب کشمکشوں میں گذری۔ اُس نے ماحول اور معاشرت سے شدید ٹکر لی۔ اور آخر اپنا راستہ خود متعین کیا۔

مام کا مرتبہ تنہا وہی ہے جو موپساں اور دیگر انفرادیت پسند ادیبوں کا ہے۔ اس کا شمار چوٹی کے ادیبوں میں ہے۔ اُس نے ادب کے ذریعہ لاکھوں روپے کمائے۔ وہ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی گذارتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اونچے طبقے کا نمائندہ ادیب ہے تو کسی حد تک بے جا نہ ہو گا مگر اس کے لئے ہم اُسے سرزنش نہیں کر سکتے۔ وہ زندگی کے حسن اور قبح کی طرف بے نیازانہ رویہ رکھتا ہے۔ وہ ٹھوس حقیقتوں کو جوں کا توں اپنی کہانیوں میں سمو دیتا ہے اور تجزیہ و تبصرہ کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں سے بے رحمانہ سلوک کرتا ہے۔ اُن کے آلام اور مصائب پر نہ روتا ہے اور نہ ہنستا ہے۔ مام نے دنیا کو خوب چل پھر کر دیکھا ہے۔ اور سیاحت اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ مام ادب برائے ادب کا قائل ہے مگر اس کے باوجود اُس کے ادب میں زندگی کی جھلک ہے۔

سومرسیٹ مام کا کوئی خاص اسلوب نگارش نہیں ہے۔ اور یہی بات اُس کا منفرد اسلوب تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کا قول ہے کہ ایک طالب علم اور ایک ادیب کو جی بھر کے سیاحت کرنی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں سومرسیٹ مام کے یہاں ان گنت کردار ملتے ہیں۔ جو ایک دوسرے قطعاً مختلف ہیں۔ سومرسیٹ مام مزاج کے اعتبار سے رومانیت پسند ہے۔

سومرسیٹ مام خود تنقیدی کا زبردست حامی ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں جتنے بھی کردار ملتے ہیں وہ اپنے آپ پر بھی کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ سومرسیٹ مام نے اپنے آپ کو ہر پہلو سے دیکھا ہے جب ہی اپنی بیشتر کہانیوں میں وہ خود موجود ہے۔ وہ ایک نیا کردار تلاش کرتا ہے اور اس کردار میں اپنے آپ کو بھی شامل کر لیتا ہے۔

سومرسیٹ کا یہ ناولٹ "تسخیر" ۔ ان ہی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں عورت اور مرد کے کرداروں کے دلچسپ پہلو بے نقاب کئے گئے ہیں۔

سومرسٹ مام

تسخیر

مترجم اے نصیر خاں

(۱)

وہ بنگلہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا۔ اس کے چبوترے سے فلورنس کا ایک حسین منظر بہت بھلا لگتا تھا۔ بنگلے کے عقب میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ باغیچہ میں پھول کم تھے مگر اس کے ... بہت خوبصورت تھے۔ چوکور حاشیہ کی جھاڑیاں سلیقہ سے کٹی ہوئی تھیں۔ خوبصورت گھاس کے لان میں ایک مصنوعی غار بنایا گیا تھا جس میں ایک مجسمہ سے سرد نقرئی آبشار گرا کرتا تھا۔ یہ بنگلہ سولہویں صدی میں کسی معزز اطالوی نے بنوایا تھا اور اس کے موجودہ ورثا نے اسے ایک انگریز کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ میری پلٹن نے اسی انگریز سے اسے کچھ مدت کے لئے کرایہ پر لیا تھا۔ بنگلہ کا رقبہ کچھ بہت طویل نہ تھا مگر اس کے کمرے وسیع اور بلند تھے۔ میری کے لئے اس کے رکھ رکھاؤ کو تین ملازم کافی تھے۔ اس میں پرانا فرنیچر قرینہ سے سجا ہوا تھا۔ ہر چند کہ فرنیچر زیادہ نہ تھا۔ مگر اپنی سجاوٹ کی وجہ سے خوب دیدہ زیب تھا۔ بنگلہ پُر تکلف یقیناً نہ تھا۔ مگر اس کے جدید مالکان نے اس میں بجلی کے آتش دان اور گرم غسل خانے بنوا دیئے تھے۔ میری مارچ میں وہاں پہنچی تھی۔ اس وقت بھی موسم سرما کا اثر بہت زیادہ تھا۔ مگر آتش دانوں اور گرم غسل خانوں کی موجودگی میں میری کو کوئی خاص تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ اب جون کا مہینہ تھا اور میری دن کا بیشتر وقت سامنے کے چبوترہ پر بیٹھ کر گزارتی تھی۔ جہاں سے فلورنس کے حسین گنبد اور مینار بہت اچھی طرح نظر آتے تھے۔ یا پھر کبھی کبھی وہ باغیچہ میں چھوٹے چبوترہ پر بیٹھ جاتی تھی۔

اپنے قیام کے شروع کے چند ہفتے اس نے فلورنس کے عجائبات اور گرجاؤں کی سیر میں گزارے۔ وہ خوشگوار صبحیں اُفیزی اور بارگیلو میں گزارتی یا بازاروں میں یونہی آوارہ گردی کرتی۔ لیکن اب وہ شب میں وہ فلورنس میں کم ہی جاتی یا اگر جاتی تو وہ صرف کسی تقریب کے موقع پر ہی جاتی۔ وہ باغ میں بیٹھے اور کتابوں کے مطالعہ سے مطمئن تھی اور اگر کبھی اس کا دل باہر جانے کو چاہتا تو وہ اپنی فیٹ دو چھوٹی کار لے کر نواح کے دیہات کی طرف نکل جاتی۔ ٹسکنی کے اس پُر فریب معصوم منظر سے زیادہ دنیا میں اور کیا شے حسین ہو سکتی تھی۔ وہ پھلدار درختوں پر لدے ہوئے شگوفے اور کونپلوں کا نیلگوں اور تازہ چھوٹا ہوا رنگ اور اس کے گرد زیتون کا دائمی سبزہ یہ سب کس قدر فرحت بخش تھا۔ وہ طبیعت میں ایک نیا ہلکا پن محسوس کرتی۔ اپنے شوہر کی غمگین موت کے بعد سے، جسے ایک سال کا عرصہ ہو چکا تھا وہ غیر معمولی پریشانیوں میں مبتلا رہی تھی۔ گزشتہ مہینوں میں اسے زیادہ وقت گھر پر رہنا پڑتا تھا کہ وہ وکیل جو اس نے شوہر کی فضول خرچیوں سے بچی کھچی جائداد کے حصول کے لئے کر رکھے تھے۔ اور اسے ہر وقت گھیرے رہتے تھے کسی فوری مشورہ کے لئے ہر وقت اس سے مل سکیں ـــ چنانچہ ان تمام الجھنوں کے بعد وہ بیونارڈ سیم اس مکان کو حاصل کرنے کے بعد بہت خوش ہوئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے اعصاب کو آرام دے۔ وہ اپنی آیندہ زندگی کے بارے میں کچھ طے کرے۔ آٹھ سال کی مسرفانہ زندگی اور ناخوشگوار شادی کے بعد تیس سال کی عمر میں اس کے پاس صرف کچھ قیمتی موتی اور صرف اتنی آمدنی کی جائداد بچ گئی تھی کہ وہ سخت کفایت شعاری کے بعد اپنی گزر کر سکے۔ بہر حال یہ غنیمت تھا کیونکہ شروع میں تو وکیلوں نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ اسے بتا دیا تھا کہ قرضے ادا کرنے کے بعد کچھ بھی نہ بچ سکے گا۔ ڈھائی مہینے فلورنس میں گزارنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ مستقبل کا مقابلہ وہ استقلال سے کر سکے گی جب وہ انگلینڈ سے روانہ ہوئی تھی تو اس کے پرانے رفیق وکیل نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھپکتے ہوئے کہا تھا۔

"اب تمہارے لئے کوئی پریشانی نہیں رہی۔ تمہیں صرف اپنی صحت کو بحال کرنا ہے۔ میں تمہارے شوہر کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ کیونکہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تم ایک جوان اور بہت خوبصورت عورت ہو اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ تم پھر شادی کرو گی۔ مگر آئندہ محبت کی خاطر شادی مت کرنا یہ ایک بڑی غلطی ہوگی شادی صرف ساتھ اور عزت کے لئے کرنا"

وہ یہ سن کر ہنس رہی تھی۔ اسے شادی کا تلخ تجربہ تھا اور وہ آئندہ شادی کرنا نہ چاہتی تھی۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ اب وہ بالکل وہی کرنے کا ارادہ کر رہی تھی جو اس کے وکیل نے کہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس شام اس کے متعلق فیصلہ کرنے والی ہے۔ ایڈگر سوفٹ اس کے بنگلے میں پہنچنے والا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے اس نے فون پر بتایا تھا کہ وہ اچانک لارڈ سی فیئر سے ملنے کینسی جا رہا ہے۔ اور جانے سے پہلے اس سے فوری ملنا چاہتا ہے۔ لارڈ سی فیئر وزیر ہند تھے۔ اس اچانک بلاوے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ آخر کار ایڈگر کو وہ منصب دیا جانے والا ہے جس کے لئے وہ متمنی تھا۔ سر ایڈگر سوفٹ، اس کے والد کی طرح ہندوستانی سول سروس کے آدمی تھے۔ سر ایڈگر کا ماضی بہت ممتاز تھا۔ وہ صوبہ سرحد کا گورنر رہ چکا تھا۔ اور بدامنی کے زمانہ میں غیر معمولی قابلیت سے حالات کو قابو میں رکھا تھا۔ پانچ سال کی گورنری کے بعد وہ ہندوستان میں تعینات برطانوی افسران میں سب سے زیادہ فائق خیال کیا جاتا تھا اس نے خود کو ایک عظیم منتظم ثابت کیا تھا۔ اس میں متضاد خوبیاں تھیں سخت گیری کے ساتھ ہی وہ رحم دل اور موقع شناس بھی تھا۔ وہ ایک مصلحت پسندی کی حد تک منصف بھی تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کو اس نے اپنی سیاست میں جکڑ رکھا تھا۔ اور بظاہر یہ دونوں قومیں اُسے پسند کرتی تھیں۔ میری اُسے بچپن سے جانتی تھی۔ جب اُس کے والد جوانی میں مر گئے۔ اور میری اور اس کی ماں کو ہندوستان چھوڑ کر ولایت آنا پڑا۔ تو بھی ایڈگر سوفٹ نے اُن سے اپنا تعلق ختم نہ کیا۔ وہ جب کبھی چھٹی گزارنے انگلینڈ آتا تو زیادہ وقت انہیں کے گھر گذارتا۔ جب وہ بچی تھی تو وہ اسکو سرکس اور مزاحیہ تھیٹر میں لے جاتا تھا، عنفوانِ شباب کو پہنچی تو ڈراموں اور سینما میں اس کے ساتھ جاتی تھی۔ وہ اُسے اسکی سالگرہ پر ہمیشہ تحفے بھیجا کرتا تھا

جب وہ انیس سال کی ہوئی تو اسکی ماں نے اس سے کہا تھا "میں اگر تمہاری عمر کی ہوتی تو ایڈگر سے اتنا زیادہ نہ ملتی۔ پتہ نہیں تم نے کچھ محسوس کیا یا نہیں، وہ تم سے محبت کرتا ہے"!

میری ہنس دی تھی۔

"وہ، وہ تو ایک بوڑھا آدمی ہے بیچارہ"!

"وہ صرف تینتالیس سال کا آدمی ہے"! اس کی ماں نے ترشی سے کہا تھا

لیکن جب اُس کے دو سال بعد میتھو پیٹن سے شادی کی تو ایڈگر نے اُسے کچھ خوبصورت ہندوستانی زمرد تحفہ میں دیئے تھے۔ اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اُسکی شادی ناخوشگوار رہی تو اس کے ساتھ بہت ہی مہربانی سے پیش آتا تھا۔ اپنی پانچ سالہ گورنری کے بعد جب وہ لندن پہنچا تو یہ معلوم کر کے کہ وہ فلورنس چلی آئی ہے وہ اُس سے ملنے کے لئے یہیں چلا آیا۔ وہ کئی ہفتہ سے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اور میری نے تاڑ لیا تھا کہ وہ اُس سے شادی کی درخواست کرنے کے لئے مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ اُس سے کتنے عرصے سے خاموش محبت کر رہا تھا۔ ماضی کے متعلق سوچتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ پندرہ سال کی عمر سے ہی وہ اس کا دلدادہ ہے۔ اس وقت ہندوستان سے لندن چھٹی گذارنے آیا تھا اور اُس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ کہ اب وہ بچی نہیں ہے۔ یہ طویل لگاؤ قدرے دل گیر تھا۔ دراصل اُنیس سال کی لڑکی اور تینتالیس سال کے مرد میں اس وقت جو تفاوت تھا وہ اب تیس سال کی عورت اور ۵۴ سال کے مرد میں نہ تھا۔ یہ تفاوت اب بہت کم معلوم ہوتا تھا۔ اب وہ ایک نامعلوم ہندوستانی افسر نہ تھا۔ بلکہ ایک ممتاز اعلیٰ افسر تھا۔ اور وقت کے دھاروں کو موڑ سکتا تھا۔ یہ سوچنا غلط تھا کہ حکومت اُسے ملازمت میں نہ رکھے گی۔ اُسے یقیناً ایک اہم عہدہ ملنے والا تھا۔ میری کی ماں بھی اب مر چکی تھی۔ اس کا دنیا میں کوئی عزیز اور رشتہ دار نہ تھا۔ اور اُس کے لئے دُنیا میں ایڈگر سے زیادہ کوئی عزیز نہ تھا۔

"کاش کہ میں خود کو آمادہ کر سکتی"! اُس نے اپنے دل میں کہا۔

وہ اب آنے ہی والا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ اُس سے کہاں ملا جائے۔ آیا اپنے ڈرائنگ روم میں جس میں آبی رنگ سے وہ مشہور تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ جن کا تذکرہ مقامی سیاحت کی کتابوں میں

ہے گا۔"

وہ سمجھ گئی کہ اس کی گفتگو کا رُخ کدھر جا رہا ہے مگر اسکی
شرارت بھری چمکیلی اور چمکدار آنکھوں سے اور اپنے رویے
سے ظاہر کیا جیسے وہ اُس کے جذبے سے بے خبر ہے۔ دیکھتی رہی
اور دل ہی دل میں بہت مسرور ہو چلی تھی۔

درحقیقت ایک گورنر کے لئے شادی شدہ ہونا ضروری ہے۔
وہ کہہ رہا تھا۔ "ایک مجرد کے لئے اس عہدہ کو سنبھالنا بہت
مشکل ہے۔"

جب اُس نے جواب دیا تو اُس کی آنکھوں میں بڑی عجیب
شرارت کی جھلک تھی۔

"مجھے پورا یقین ہے تمہیں بہت سی ایسی معقول عورتیں مل جائیں
گی جو اس ٹھاٹ باٹ میں خوشی سے حصہ بٹانا چاہیں گی۔"

"میں ہندوستان کے پچھلے تیس سال کے قیام میں یہی سوچتا
رہا کہ بہت سی عورتیں مجھ سے شادی کرنا پسند کریں گی۔ لیکن
سچی بات یہ ہے کہ دنیا میں صرف ایک ہی عورت ہے جس سے میں
شادی کرنے کے خواب دیکھتا رہا ہوں۔"

اب بات قریب آ چکی تھی۔ اسے ہاں کہنا چاہیئے یا نہیں؟
اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اسکی طرف ترچھی
نظروں سے دیکھا۔

"مجھے یقین ہے تم ضرور جانتی ہو گی کہ مجھے تم سے اُس وقت سے
بے پناہ محبت ہے جب سے تم نے بال کٹوانے شروع ہی کئے تھے۔"

وہ اس کا کیا جواب دیتی صرف ہنس سکتی تھی۔

"اوہ ایڈگر آج تم کیسی باتیں کرنے لگے۔"

"میں نے دنیا میں جتنی بھی جاندار چیزیں دیکھی ہیں تم ان میں
سب سے زیادہ خوبصورت اور خوش اخلاق ہو۔ دراصل میں سمجھتا تھا
کبھی یہ بتانے کا موقع نہیں آیا۔ میں تم سے پچیس سال بڑا ہوں اور تمہارے
باپ کا ہمعصر تھا۔ اور مجھے شک ہے کہ تم بچپن میں مجھے عجیب اگلے
وقتوں کا آدمی سمجھتی ہو گی۔"

"ہرگز نہیں" وہ میری اونچی آواز میں بولی۔ اس میں کچھ کچھ سچائی
بھی تھی۔

"بہرحال جب تم محبت میں گرفتار ہو چلیں تو یہ قدرتی بات تھی کہ تم
اپنے ہم عمر سے محبت کرتیں۔ میں تم سے یقین کرنے کی استدعا کرتا ہوں
کہ جب مجھے تمہاری شادی کی خبر ہوئی تو میں صرف یہی چاہتا تھا کہ تمہاری
ازدواجی زندگی خوشگوار گزرے۔ اور جب مجھے علم ہوا کہ تم خوش نہیں
ہو تو مجھے سخت ذہنی تکلیف پہنچی۔"

"ہماری شادی کی ناکامی کا سبب شاید ہمارا کم عمری میں شادی
کرنا تھا۔"

"اس وقت سے لے کر اب تک کئی تغیرات گزر چکے ہیں اور
میں نہیں سمجھتا کہ ہماری عمروں کا تفاوت اب بھی اتنا اہم ہے جتنا پہلے تھا۔"

اس سوال کا جواب بہت مشکل تھا اور میری نے سوچا اُس
کا سلسلہ کلام منقطع نہ کرے۔

"میری میں اپنی صحت کا بہت خیال کرتا ہوں۔ مجھے اپنی عمر کا کوئی
احساس نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا عجیب پہلو یہ ہے کہ وقت کا تم پر کوئی
اثر نہیں ہوا۔ تمہاری خوبصورتی تو پہلے سے بھی زیادہ دوبالا ہو گئی ہے۔"

وہ مسکرائی۔

"ایڈگر کیا یہ ممکن ہے کہ تم بھی رومانی بن سکتے ہو۔ میں تمہیں تو ٹھوس
کا آدمی سمجھتی تھی اور آج تم خلاف اُمید جذبے بھری ہوئی باتیں کر رہے ہو۔"

"تم بڑی سریع ہو۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں جذباتی ہو رہا ہوں۔ جہاں
تک قوتِ ارادی کا تعلق ہے۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہاری محبت
میں ہمیشہ میں روئی کا گالا بنا رہا ہوں۔"

"کیا میں یہ سمجھنے کا حق بجانب ہوں کہ تم مجھ سے شادی کی فرمائش
کر رہے ہو؟"

"یہ بالکل صحیح ہے۔ تمہیں اچنبھا ہوا یا صدمہ؟"

"یقیناً مجھے کوئی صدمہ نہیں۔ تم جانتے ہو ایڈگر میں تمہیں بہت
عزیز رکھتی ہوں۔ میں کہتی ہوں۔ جتنے انسانوں سے بھی میں آج تک
ملی ہوں تم اُن میں سب سے زیادہ باکمال ہو۔ میری انتہائی عزت افزائی
ہے کہ تم مجھ سے شادی کی فرمائش کر رہے ہو۔"

"تو کیا تم راضی ہو؟"

اُس کے دل میں عجیب قسم کا شک پیدا ہوا۔ وہ یقیناً بہت خوبصورت
تھا۔ بنگال کے گورنر کی بیوی بننا یقیناً بڑا ہیجان خیز تھا۔ اس کے
ارد گرد اے۔ ڈی۔ سی رہیں گے۔ جو اس کے احکامات پر سر تسلیم خم کیا
کریں گے۔

ملتا تھا اور جس میں شاہ ثانیہ کے زمانہ کا شاہی فرنیچر اور شمعدان آراستہ تھے۔ لیکن وہ رسمی اور پر تکلف کمرہ تھا اور اس نے محسوس کیا کہ اس موقع پر اس کمرہ میں بیٹھنے سے ایک عجیب قسم کے سنجیدہ پن کا احساس ہوگا۔ اس لیے سوچا اس کا استقبال چبوترہ پر بیٹھ کر ہی کرنا چاہیئے۔ جہاں وہ شام کو بیٹھا کرتی تھی اور اس پر سے نظر آنے والے منظر سے وہ کبھی نہ تھکتی تھی یہ نسبتاً بے تکلف جگہ ہے۔ کیا وہ واقعی اس سے شادی کے متعلق کہے گا۔ اگر ایسا ہے تو دونوں کے لئے ایسے ماحول میں بات کرنا آسان تر رہے گا۔ چائے کی میز پر جیکز وہ کیک کا نرم ٹکڑا دانتوں سے کتر رہی ہوگی۔ وہ بے تکلفی سے اس سے دل کی بات کہہ دے گا۔

چائے و توع مناسب اور کسی حد تک رومانی تھی چبوترہ کے سرے پر چینی کے بڑے بڑے گملوں میں سنترے کے درخت رکھے ہوئے تھے۔ جن کے بھوں گملوں کے کناروں پر جھول رہے تھے۔ چبوترہ ایک پرانے پتھر کے جنگلے سے گھرا ہوا تھا۔ جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بڑے بڑے پیالے بنے ہوئے تھے اور اس کے سروں پر کسی بد نما پیشوا کے خستہ حال بت نصب تھے

میری ایک لمبی بیت کی کرسی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور اس نے اپنی خادمہ نینا کو چائے لانے کا حکم دیا۔ دوسری کرسی ایڈگر کا انتظار کر رہی تھی۔ آسمان پر بادل بالکل نہ تھے۔ اور نیچے گھاٹی میں شہر جون کی سہ پہر کی نرم دھوپ میں نہا رہا تھا۔ معاً اسے بنگلہ کی سمت آتی ہوئی ایک کار کی آواز سنائی دی۔ ایک لمحہ بعد اس کے خادم نینا کے شوہر سیرو نے ایڈگر کو چبوترہ پر پہنچا دیا۔ نیلی سرژ کے سوٹ اور کالے فیلٹ ہیٹ میں اس کا لمبا جسم کسرتی اور ممتاز نظر آ رہا تھا۔ اگر میری اس سے واقف بھی نہ ہوتی تب بھی وہ یہ قیاس ضرور کرتی کہ وہ ایک اچھا ٹینس کا کھلاڑی شہسوار اور نشانچی ہے۔ اس نے اپنا ہیٹ اتارا۔ اس کے سر کے بال کالے اور گھنگریالے تھے اور مشکل ہی سے کوئی بال سفید ہوگا۔ اس کا چہرہ ہندوستانی دھوپ سے تانبہ کے رنگ کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ پتلا، ٹھوڑی مضبوط اور ناک کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بھوری اور تیز بین تھیں۔ چون سال؟

وہ پینتالیس سال سے ایک دن بھی زیادہ نہ معلوم دیتا تھا۔ ایک خوبصورت انسان جو کامیابی کے زینہ پر کھڑا ہے۔ اس کی شخصیت میں وقار تھا۔ اس میں اعتماد کی جھلک نظر آتی تھی۔ یہ وہ شخصیت تھی جسے کوئی اچانک واقعہ یا حادثہ نہ گھبرا سکتا تھا۔ وہ بے مقصد اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں وقت ضائع نہ کرتا تھا۔

سی فیر نے آج مجھے فون کیا اور بنگال کی گورنری کی پیشکش کی ہے۔ وہ طے کر چکا ہے کہ موجودہ صورت حال میں انگلینڈ سے کوئی نیا آدمی اس عہدہ پر نہ بھیجا جائے گا۔ کیونکہ اسے پہلے وہاں کے حالات کو سمجھنا ہوگا۔ اس لئے وہ ایسے آدمی کو اس عہدہ پر بھیجنا چاہتا ہے جو وہاں کے حالات سے واقف ہو۔" اس نے رسمی گفتگو کے بعد کہا۔

"تم نے یقیناً اس پیشکش کو قبول کر لیا ہے۔" میری بولی

"بالکل۔ یہ وہ عہدہ ہے جس کے لئے ہر شخص مشتاق تھا۔"

"مجھے بہت ہی خوشی ہوئی۔"

"مگر مجھے اس سلسلے میں بہت کچھ گفت و شنید کرنی ہے اور میں نے آج شام ہی ملان جانے کا انتظام کر لیا ہے۔ جہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز میں کشتی بیچکر لارڈ سی فیر سے ملوں گا۔ مجھے دو تین دن لگیں گے۔ اور وہاں میرا مل نہ سکے گا۔ مگر سی فیر مجھ سے فوری ملنا چاہتا تھا۔" وہ بولا

"یقیناً"۔ میری بولی۔

اس کے ہونٹوں پر ایک نرم مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اسکی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ جو عہدہ مجھے مل رہا ہے وہ بہت بلند اور اہم ہے۔ اگر میں اس فرض سے عہدہ برآ ہو گیا ——— تو میری مقبولیت اور عزت میں نمایاں اضافہ ہوگا۔"

"مجھے یقین ہے تم ضرور کامیاب رہو گے۔"

"اس عہدہ کا مطلب ہے بہت زیادہ کام اور ذمہ داری۔ اور میں ان چیزوں کو پسند کرتا ہوں۔ درحقیقت اس کا نعم البدل بھی کم نہیں بنگال کا گورنر ایک بڑی عمارت میں رہتا ہے اور مجھے اس کا اعتراف کرنے میں جھجک نہیں کہ مجھے یہ شاندار ٹھاٹ پسند ہیں۔ بنگال کے گورنر کا گھر ایک محل سے کم نہیں اور میرے یہاں دعوتوں کا سلسلہ بکثرت

"تو کیا یہ سمجھوں کہ تم دو تین دن کے باہر جا رہے ہو؟"

"ہاں صرف تین دن کے لئے کیونکہ سوموار پھر لندن جانے کا۔"

"کیا تم اپنی واپسی تک صرف تین دن تک میرے جواب کا انتظار نہیں کر سکتے ہو؟"

"ٹھیک! میں سمجھتا ہوں موجودہ حالات میں یہ بہت مناسب ہوگا۔ مجھے یقین ہے یہ بہت اچھا ہوگا کہ تم اپنی رائے کو خوب پختہ کر لو۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر جواب نفی میں ہو تاکہ تمہیں مزید سوچنے کی ضرورت نہ ہوگی۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے" وہ مسکرائی۔

"اچھا تو بات کو یہیں چھوڑ دیا جائے۔ اور اب مجھے رخصت ہونا چاہیئے ورنہ ریل کے ہاتھ سے نکلنے کا ڈر ہے۔"

وہ اسکو ٹیکسی تک چھوڑنے کے لئے ساتھ ہولی۔

"خوب یاد آیا۔ کیا تم نے شہزادی کو کہہ دیا ہے کہ تم آج رات وہاں نہ جا سکو گے!"

ان دونوں کو شہزادی سان فرڈینیو نے رات کے کھانے کی پارٹی میں دعوت دے رکھی تھی۔

"ہاں میں نے اسے فون کر دیا ہے کہ میں دو تین دن کے لئے فلورنس سے باہر جا رہا ہوں۔"

"کیا تم نے اسے بتایا کس لئے باہر جا رہے ہو؟"

"تمہیں معلوم ہے وہ کھوسٹ بڑھیا کتنی شریر ہے۔" وہ دلجوئی کے انداز میں مسکرایا۔ "وہ میری دعوت کی عدم شرکت کی معذرت پر بہت مضطرب ہوئی اور مجھے صورت حال کا اعتراف کرنا پڑا اور اسے اصل واقعہ بتانا پڑا۔"

"پھر اسے تمہارا نعم البدل تلاش کرنا پڑے گا۔" میری نے یوں ہی کہہ دیا۔

"میں تمہیں مشورہ دوں گا تم اپنے ملازم سیرو کو ساتھ لے جانا۔ کیونکہ میں تمہارے ساتھ نہ ہوں گا۔"

"نہیں بھئی۔ میں نے سیرو اور نینا سے کہہ دیا ہے کہ شام کو انکی ضرورت نہ پڑے گی۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں ان سنسان سڑکوں پر رات کو تنہا موٹر نہ چلانا چاہیئے۔ اچھا تو تم اپنے عہد پر عمل کرو گی۔ ہے نا؟"

"کون سا عہد؟ اچھا وہ پستول والا عہد۔ ارے بھئی یہ تو بڑا مضحکہ خیز سا ہے۔ یہاں کی سڑکیں اتنی ہی محفوظ ہیں جتنی انگلینڈ کی۔ بہرحال تمہارے اطمینان کی خاطر تمہیں یقین دلاتی ہوں پستول ضرور ہمراہ لے جاؤں گی۔"

ایڈگر کو یہ معلوم تھا کہ میری کو تنہا موٹر میں گشت کرنے کا بہت شوق ہے۔ اور انگریزوں کے عام خیال کے مطابق وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ غیر ملک بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس نے اسے ایک پستول دے رکھا تھا اور اس سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ جب بھی گھر سے باہر جائے گی اسے اپنے ساتھ باہر لے جائے گی۔

"یہ علاقہ بیکاروں اور مہاجرین سے پٹ پڑا ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے تمہاری طرف سے ہر وقت فکر رہتی ہے" واقعی مجھے یہ معلوم ہو کہ ضرورت پڑنے پر تم اپنی حفاظت کر سکتی ہو۔"

اس کے ملازم سیرو نے ٹیکسی کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ ایڈگر نے پانچ روپے کا نوٹ اپنی جیب سے نکالا۔ اور اسے تھما دیا۔

"دیکھو سیرو میں آج باہر جا رہا ہوں اور رات کو انہیں لینے نہ آ سکوں گا۔ جب یہ دعوت میں جائیں تو پستول انہیں ضرور یاد دلا دینا۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے۔"

"بہت بہتر حضور۔" ملازم بولا۔

۲

میری آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔ اس کی ملازمہ نینا اس کے پیچھے کھڑی ہوئی مناسب مشورے دے رہی تھی۔ نینا بنگلہ کے مالکان کی بہت عرصہ سے ملازم تھی۔ اور انگریزی بول سیکھ گئی تھی۔ اور اپنے پانچ ماہ کے قیام میں میری نے بھی اطالوی زبان حسب سیکھ لی تھی۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کی بات خوب سمجھ لیتے تھے۔

"نینا کیا تمہارا خیال ہے میں نے سرخی زیادہ لگائی ہے؟"

"جب آپ کا رنگ قدرتی خوبصورت ہے تو پھر آپ نے سرخی لگائی ہی کیوں ہے؟"

"بات یہ ہے پارٹی میں جو دوسری عورتیں ہوں گی وہ خوب سرخی تھوپ کر آئیں گی اور اگر میں نے ذرا سی بھی سرخی نہ لگائی تو میں بہت بھدی لگوں گی۔"

اس نے اپنا فراک پہنا ——— جن زیورات کو آج پہننا چاہتی تھی وہ بھی زیب تن کئے۔ پھر ایک بہت خوبصورت ہیٹ اٹھا کر کہ ۔۔ پارٹی

اس قسم کی تھی جس میں یہ لباس موزوں تھا۔ پارٹی ایک ایسے ریسٹوران میں دی جا رہی تھی جو ندی کے کنارے تھا۔ اور جہاں کھانا بہت اچھا بنتا تھا۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے جون کے چاند کی روشنی میں ندی کے دوسرے کنارے پر بنے ہوئے مکانوں کا نظارہ کر سکتے تھے۔ بوڑھی شہزادی نے ایک مغنی کا انتظام کیا تھا جس کی سُریلی آواز کی وہ بہت مداح ہے۔ اور وہ اپنے مہمانوں کو پوری طرح خوش کرنا چاہتی تھی۔

میری نے اپنا پرس اُٹھایا۔

"اب میں تیار ہوں۔"

"حضور آپ پستول لینا تو بھول ہی گئیں۔" پستول سنگار دان پر پڑا تھا۔ میری ہنس پڑی۔

"ارے پگلی اسی کو تو میں بھولنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس کے لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی پستول نہیں چلایا۔ اور مجھے اسے لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ میرے پاس لائسنس نہیں ہے اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو مجھے بلاوجہ پریشان ہونا پڑے گا۔"

"حضور نے سرکار سے وعدہ کر لیا تھا کہ اسے ساتھ لیجائیں گی۔"

"سرکار تو نرے وہمی ہیں۔"

"جب کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" نینا نے جذباتی ہو کر کہا۔

میری کچھ سوچنے لگی۔ وہ اس معاملہ کو زیادہ اہمیت نہ دینا چاہتی تھی۔ اطالوی ملازم بہت اطاعت شعار اور محنتی ہوتے ہیں۔ میری جانتی تھی کہ نینا اس موضوع پر اُس سے دل کھول کر بات کرنا چاہتی ہے اس نے اپنا پرس کھولا۔

"اچھا تو اس کمبخت کو بھی ڈالے لیتی ہوں۔"

پیرو نے گراج سے گاڑی نکال دی تھی۔ کار چھوٹی اور کپڑے کی چھت کی تھی۔ میری نے اُسے بنگلہ کرایہ پر لیتے وقت خریدا تھا۔ وہ اندر بیٹھ گئی۔ اور اسٹارٹ کر کے احتیاط سے چل پڑی۔ اور لوہے کے پھاٹک کو طے کرنے کے بعد ایک پرپیچ سڑک پر مڑ گئی۔ اور جب وہ بڑی سڑک پر پہنچی تو بتی جلا کر گھڑی میں وقت دیکھا اور یہ دیکھ کر کہ ابھی بہت وقت باقی ہے۔ کار کو فرحت بخش انداز میں کم رفتاری سے چلانا شروع کر دیا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشہ میں وحشت کی ناگواری کا احساس جاگ رہا تھا۔ وہ آج اپنے بنگلہ کے چبوترہ پر کھانا کھانے کو پسند کرتی اور جون کی خوشگوار رات میں تادیر کھانا کھانے کے بعد وہیں بیٹھی رہتی۔ ایسا کرنے سے میری کبھی نہ اُکتاتی تھی۔ اس میں اسے بہت خوشگوار سکون ملتا تھا۔ یہ سکون اس قسم کا نہ تھا جو کاہلی کی پیداوار ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں اُسکا ذہن اور اس کا احساس جاگتا رہتا تھا۔ غالباً یہ تسکین کی فضا اور اُس میں گھلی ہوئی ہوا کا اثر تھا کہ انسان کی جسمانی خواہشات میں بھی روحانیت سی محسوس ہوتی تھی۔ اس سکون میں ایسا احساس کارفرما رہتا تھا جو موزارٹ کی موسیقی میں ہوتا ہے۔ جس کی نغمہ خیز دُھنوں کے پیچھے غم کی لہریں اس طرح اُبھرتی ہیں کہ آدمی خوشی اور طمانیت کے احساس سے جھوم اُٹھتا ہے اور محسوس کرنے لگتا ہے۔ کہ گوشت پوست کے وجود سے ماورا بھی کوئی چیز ہے۔ اس سکون میں موسیقی کی دُھنوں کی طرح کچھ منٹ کے لئے آدمی زندگی کی چاہ اور الجھنوں سے بے نیاز ہو کر خود کو صرف محبت اور سکون کا محور سمجھنے لگتا ہے۔

"میں نے گھر سے نکل کر حماقت کی۔" میری خود سے کہنے لگی۔ جب ایڈگر ہی اس دعوت میں نہیں جا رہا تو مجھے بھی منع کر دینا چاہئے تھا۔ مگر یہ بھی بڑی حماقت ہوتی۔ وہ تنہائی میں ایڈگر سے کی گئی بات چیت پر اب خوب غور کر سکتی تھی۔ حالانکہ اس نے ایڈگر کے ارادہ کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا لیکن آج سہ پہر تک اُسے پوری طرح یقین نہ تھا کہ وہ آخر شادی کی پیشکش کر ہی دے گا۔ اور اسی لئے اُس نے اس مسئلے پر کسی جواب کے متعلق آخری فیصلہ کرنا قبل از وقت اور غیر ضروری سمجھا تھا۔ اس نے اسے لمحاتی کیفیت پا کر رکھ دیا تھا۔ اب جبکہ وہ پیشکش کر چکا ہے تو اُسے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ اب وہ شہر میں پہنچ چکی تھی اور سائیکل سوار اور پیدل چلنے والوں نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی توجہ دوسری طرف سے ہٹا لے اور احتیاط سے گاڑی چلائے۔

جب میری ریسٹوران میں پہنچی تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ سب سے آخر میں پہنچی ہے۔ شہزادی سان فرینیڈو امریکہ کی رہنے والی تھی۔ وہ ایک معمر عورت تھی اور اُس کے بال نیم سفید تھے۔ اُس کے اطوار تحکمانہ تھے وہ چالیس سال سے اٹلی میں مقیم تھی اور اس عرصہ میں کبھی اپنے وطن نہ گئی

تھی۔ اُس کا شوہر ایک روسی شہزادہ تھا۔ جس کا پچیس سال ہوئے انتقال ہو چکا تھا۔ اُس کے دو لڑکے تھے جو اٹلی کی فوج میں ملازم تھے۔ اُس کے پاس زیادہ دولت نہ تھی۔ اُس کی عادت بہت اچھی تھی مگر اُسکی زبان میں دو شستگی تھی۔ اُس کا قد سیدھا تھا اور اُس کی آنکھیں بڑی تھیں۔ جوانی میں اگرچہ وہ خوبصورت نہ تھی مگر اپنے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے اب پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آتی تھی۔ کہا جاتا ہے اُس نے شہزادے کے ساتھ وفا نہیں کی مگر اُس کی حیثیت پر اسکا کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ بیشتر لوگوں سے واقف تھی اور ہر آدمی اس سے خوش تھا۔ اسکے علاوہ دعوت میں ایک انگریز سیاح کرنل گرلیس ٹرپل اور اُنکی بیوی ایک انگریز نوجوان روپلے فلنٹ اور کچھ اطالوی معززین شریک تھے۔ میری نے اٹلی کے قیام میں روپلے فلنٹ سے بخوبی واقف ہو گئی تھی۔ درحقیقت وہ اُس کی طرف بہت توجہ دے رہا تھا۔

"مجھے میں تو اس پارٹی میں اچانک بلا لیا گیا ہوں۔" اُس نے میری سے مصافحہ کے وقت کہا

"ان کی یہ بہت بڑی مہربانی ہے۔" شہزادی بولی۔ "جب مسز ایڈگر نے مجھے بتایا کہ وہ پارٹی میں نہ آسکیں گے تو میں نے اس سے درخواست کی۔ اس نے یہاں آنے کی خاطر ایک دوسری دعوت کو ترک کر دیا۔"

"شہزادی صاحبہ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ آپ کی دعوت میں آنے کے لئے مَیں دنیا بھر کی دعوتیں ٹھکرا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ شہزادی خاص انداز میں مسکرائی۔

"بات یہ ہے کہ میری دعوت قبول کرنے سے پہلے یہ صحیح صحیح جاننا چاہتا تھا کہ دعوت میں کون کون آرہا ہے۔"

"یہ ہماری عزت افزائی ہے کہ انہوں نے ہمارے ساتھ دعوت میں شرکت منظور کر لی۔" میری نے کہا۔

شہزادی نے روپلے کی طرف اُس مخصوص خاموش مسکراہٹ سے دیکھا جو اُس کی عیاش مزاجی کی عکاسی کر رہی تھی۔ اس مسکراہٹ میں اُس کا شوخ ماضی جھلک رہا تھا۔ جسے نہ اُس نے بھلایا تھا اور جس پر اُسے افسوس تھا بلکہ یہ مسکراہٹ اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ ساری دُنیا کو خوب سمجھتی ہے اور خود سب سے زیادہ پاک چلن ہے۔

"روپلے تم بڑے اکھڑ ہو اور ہمارے پاس معذرت کے لئے کوئی معقول بات نہیں۔ بہرحال ہم لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں" شہزادی بولی۔

یہ صحیح ہے کہ روپلے دیکھنے میں کچھ زیادہ خوش اندام نہ تھا۔ اُس کی شخصیت گوارا تھی۔ وہ متوسط قد کا آدمی تھا اور کپڑوں میں کسی قدر سے موٹا معلوم دیتا تھا۔ اس کے خد و خال میں کوئی ایسی بات نہ تھی جسے اچھا کہا جا سکے۔ اُس کے دانت سفید تھے لیکن متوازی نہ تھے۔ اس کا رنگ تازہ تھا۔ مگر کھال صاف نہ تھی۔ اس کے بال گھنے تھے۔ لیکن بال بھدے بھورے رنگ کے تھے۔ جیسے کالے اور سفید رنگ کی آمیزش سے بنے ہوں۔ اُس کی آنکھیں خوب بڑی تھیں۔ مگر اُن کا رنگ ہلکا نیلا تھا۔ جسے کچھ کچھ بھورا کہا جا سکتا ہے۔ اس کی شخصیت سے پراگندگی ٹپکتی تھی۔ اور جو لوگ اُسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اُسے مکار، اور عیاش کا خطاب دیتے تھے۔ اُس کے عزیز ترین دوست اس بات کا اعتراف کرتے تھے وہ قابل اعتماد آدمی نہیں۔ اس کا ماضی خراب تھا۔ جب وہ بیس سال کا تھا تو ایک ایسی لڑکی کے ساتھ فرار ہو گیا۔ جس کی منگنی کسی اور سے ہو چکی تھی۔ تین سال بعد وہ ایک طلاق کے مقدمہ میں ماخوذ پایا گیا۔ اور جب اس عورت کو اس سے ناجائز تعلق کی بنا پر طلاق ہو گئی تو اسکی بیوی نے بھی اس سے طلاق حاصل کر لی۔ پھر اُس نے بجائے اُس عورت سے شادی کرنے کے جس کو اس کی وجہ سے طلاق ہوئی تھی۔ ایک اور عورت سے شادی کر لی اور دو تین سال بعد اسکو بھی چھوڑ دیا۔ اب وہ تیس سال سے کچھ ہی زیادہ تھا۔

درحقیقت وہ ایک بدنام اور جوان آدمی تھا اور وہ اپنے حالات کی وجہ سے اس بدنامی کا مستحق بھی تھا۔ غرض اُس میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو اُسے مقبول بناتی۔ کرنل ٹرپل جو ایک معزز اور جانے آدمی تھے حیران تھے کہ شہزادی نے اس جیسے بدقماش اور آدھے آدمی کو دعوت پر کیسے مدعو کر لیا۔

"میرا خیال ہے یہ آدمی اس لائق نہیں کہ کوئی معقول عورت اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں بیٹھ سکے۔" اگر موقع ملتا تو وہ یہ جملے ضرور کہہ دیتا۔

اُسے یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اگرچہ اُسکی بیوی روپلے کے برابر بیٹھی ہوئی ہے۔ مگر وہ اسکی باتوں کو پسند نہیں کرتی۔ اس کا سب سے بالاتر پہلو یہ تھا کہ یہ شخص کوئی جسم پسند انسان نہ تھا۔ دراصل وہ اس کی بیوی کا دُور کے رشتہ کا چچا زاد بھائی تھا۔ اسکی ایک معقول

آمدنی تھی۔ آج تک اُس نے کبھی کما کر نہ کھایا تھا۔ بہر حال ہر خاندان میں ایک نکما بھی ہوا کرتا ہے۔ کرنل کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آتی تھی کہ عورتیں روڈلے میں کیا خوبی دیکھتی ہیں جو اُس پر مرنے لگتی ہیں۔ اس سیدھے سادے انگریز کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آئی تھی کہ روڈلے کی شخصیت میں بڑی جنسی اپیل ہے۔ اور عورتوں کے متعلق اُس کے رویہ نے اسے اور بھی اہمیت دے دی تھی۔ کوئی عورت اس سے کتنی ہی بدظن کیوں نہ ہو اگر اُس کے ساتھ نصف گھنٹہ تنہائی میں گزار لے تو اسکی بری طرح گرویدہ ہو جاتی ہے۔ اور اُس کے بعد وہ کہنے لگتی ہے کہ روڈلے کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ بالکل جھوٹ ہے۔ اور اگر اُس سے معلوم کیا جائے کہ اُس نے روڈلے میں کیا دیکھا تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے گی۔ وہ دیکھنے میں کوئی خاص خوبصورت نہ تھا بلکہ کسی کارخانے کا مزدور سا لگتا۔ وہ اپنے کپڑے لاپرواہی سے پہنتا تھا۔ اُس کے مزاج میں لاپرواہی جھلکتی تھی۔ جیسے وہ کپڑوں کو کوئی اہمیت نہ دیتا ہو یہ بات جھنجلاہٹ کا باعث تھی کہ وہ کسی چیز کو بھی اہمیت نہ دیتا تھا۔ یہاں تک کہ محبت کرنے کو بھی۔ اس کی شخصیت سے یہ بات ظاہر تھی کہ وہ عورت سے صرف ایک چیز چاہتا ہے۔ اُسکی شہوت پرستی خطرناک حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن اُس میں ایک طرح کی فراخدلی ایسی بھی تھی جس کی بنا پر آدمی ایک دم ہنسنے لگتا۔ اُس کے بے باک رویے کے پیچھے ایک گرم خلوص بھی تھا۔ وہ عورتوں کو مردوں کی نسبت ایک عجیب مخلوق سمجھتا تھا۔ جس سے عورتیں بہت متاثر ہوتی تھیں اُس کے چہرے میں ایک عجیب سحر اور آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔

لیکن بھی شہزادی نے معاملہ کو بڑی خوبصورتی سے سلجھا دیا۔

"سچ مچ یہ بہت بُرا آدمی ہے۔ ایک بہت ہی بر خود غلط آدمی۔ اگر میں تیس سال چھوٹی ہوتی اور یہ مجھ سے بھاگ چلنے کو کہتا تو میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ مجھے ایک ہفتہ بعد چھوڑ دیگا اور میں تمام عمر بربادی میں گزاردوں گی ایک لمحہ کے لئے بھی نہ جھجکتی۔"

شہزادی عام بات چیت کی شوقین تھی اور جب تمام مہمان اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو اس نے میری سے خطاب کیا۔

"مجھے سر ایڈگر کی عدم شرکت کا بہت افسوس ہے۔"

"جی ہاں انہیں بھی بہت افسوس تھا مگر انہیں کینیں جانا پڑ گیا۔"

پھر شہزادی نے پوری پارٹی کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ ایک بڑا راز ہے۔ آپ سب اپنے تک ہی محفوظ رکھیں وہ بنگال کے گورنر بنا دیئے گئے ہیں۔"

"واللہ سچ مچ"! کرنل تقریباً چیخ پڑا۔ "یہ تو بہت بڑا عہدہ ہے۔"

"کیا تمہیں اچنبھا ہوا؟" شہزادی بولی۔

"نہیں انہیں معلوم تھا کہ وہ اس عہدہ پر فائز کئے جانے والے ہیں" میری نے کہا۔

"وہ اس جگہ کے لئے موزوں ترین آدمی ہے۔ اس کے متعلق کوئی شک نہیں کیا جا سکتا"! کرنل بولا۔ "اگر وہ اس مقام پر کامیاب رہا تو وہ دن دور نہیں کہ اسے ہندوستان کا وائسرائے بنا دیا جائے۔"

"میں دنیا میں وائسرائن بننے سے زیادہ اور کسی چیز کو پسند نہیں کرتی" شہزادی بولی۔

"تو تم اُن سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں"! میری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ شادی شدہ نہیں ہیں" کرنل کی بیوی بولی۔

"نہیں"! شہزادی نے میری کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے یہ حقیقت نہیں چھپانا چاہتی کہ وہ اپنے قیام کے پچھلے چھ ہفتوں میں مجھ سے شدید اظہار محبت کرتا رہا ہے۔"

روڈلے ہنسنے لگا اور اُس نے میری کی طرف منہ پھیر کر دیکھا

"تو پھر کیا شہزادی تم نے اس سے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے؟ اگر واقعی ایسا ہے تو اس بے چارے کو زندگی کا لطف اٹھانے کا زیادہ موقع نہ ملے گا۔"

"میرا خیال ہے یہ بہت ہی مناسب جوڑ رہے گا" میری بولی۔

اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ روڈلے اور شہزادی دونوں اس کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن وہ انہیں کسی بات کا علم نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔ ایڈگر سوفٹ نے اپنے قیام کے دوران میں سب پر یہ بات بخوبی واضح کر دی تھی۔ کہ وہ میری سے محبت کرتا ہے اور

شہزادی کو یہ بات معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھیں کہ اس معاملہ کا کوئی نتیجہ برآمد ہوا — یا نہیں۔"

"میرا خیال ہے شہزادی تمہیں کلکتہ کی آب و ہوا موافق نہ آئے گی۔" کرنل کی بیوی نے کہا۔ وہ اس گفتگو کو سنجیدگی سے سمجھ رہی تھی۔

"اوہ! اب میری عمر ایسی نہیں کہ میں شادی کر دوں۔" شہزادی بولی۔ "میں تو بس بطور بہو ممکنہ لڑکے کی ملتی ہوں۔ اسی لئے تو رونے کے لئے میرے دل میں خاص جگہ ہے۔ مگر اسکی نیت صاف نہیں!"

کرنل نے اپنی پلیٹ پر چیں بجبیں ہو کر نظر جمالیں اور اسکی بیوی طنزاً مسکرادی۔

اس ریسٹوران میں آرکسٹرا کا بھی انتظام تھا۔ باجے والوں کا لباس سلیقے کا نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد شہزادی بولی

"میرا خیال ہے اب مغنی کو بلوانا چاہیئے۔ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ وہ بہت میٹھے سروں میں گاتا ہے۔ ریسٹوران کا مالک اُسے باقاعدہ گانے کی تعلیم دلانا چاہتا ہے۔" اس نے ہیڈ ویٹر کو بلایا۔ "اس آدمی سے گانے کو کہو جس نے اس دن میری موجودگی میں گایا تھا۔"

"یور ایکسیلینسی مجھے افسوس ہے کہ وہ آج آیا نہیں ہے۔ وہ بیمار ہے۔"

"یہ تو بڑی تکلیف دہ خبر سنائی۔ میں اپنے احباب کو خاص طور سے اس کا گانا سنوانا چاہتی تھی۔ میں نے ان لوگوں کو اس ریسٹوران میں صرف اسی لئے دعوت دی تھی۔"

"اس نے اپنے عوض دوسرا آدمی بھیجا ہے۔ مگر وہ صرف وائلن بجاتا ہے۔ میں اس سے وائلن بجانے کو کہتا ہوں"

"مجھے موسیقی میں صرف وائلن پسند نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ ہیڈ ویٹر نصف درجن سے زیادہ زبانیں بخوبی بول سکتا تھا۔ مگر سمجھتا ایک کو بھی نہ تھا۔ اس نے شہزادی کی گفتگو سے یہ سمجھا کہ وہ اس کے مشورہ سے خوش ہو گئی اور وائلن والے سے وائلن شروع کرنے کو کہا اس پر اپنی کرسی سے کھڑا ہوا اور کورنش بجالایا۔ وہ ایک گورا اور لمبا نوجوان تھا۔ اسکی بڑی بڑی آنکھوں سے بھوک اور افلاس ٹپکتا تھا۔ اور اس کے چہرہ سے افسردگی جھلکتی تھی۔ سازندوں کے

بھڑکیلے لباس میں وہ عجیب رومانی سا لگ رہا تھا۔ وہ بھوک کا ستایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اُس کا چکنا چہرہ پتلا تھا اور گال اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ اس نے وائلن پر ایک گت شروع کر دی۔

"ارے بھائی یہ تو بہت خراب نکلا" شہزادی نے ہیڈ ویٹر سے کہا۔

اس مرتبہ ویٹر نے بات کو سمجھ لیا۔

"بے شک شہزادی صاحبہ یہ کوئی خاص نہیں بجاتا۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ پہلے والا آدمی کل ہی آجائے گا۔"

وائلن والے کو روک دیا گیا اور آرکسٹرا پھر شروع ہو گیا۔ رونے نے برابر بیٹھی ہوئی میری کی طرف دیکھا اور بینڈ کی اونچی آواز سے فائدہ اٹھا کر میری سے بولا۔

"آج تم بہت حسین نظر آرہی ہو"

"شکریہ" میری نے جواب دیا۔

اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

"کیا میں تمہیں وہ بات بتاؤں جو میں خصوصیت سے تمہارے متعلق محسوس کرتا ہوں! دوسری عورتوں کی نسبت جب تم سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم خوبصورت ہو تو تم اسے جھوٹ نہیں سمجھتیں۔ تم اسے بالکل قدرتی بات سمجھتی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی تم سے کہے کہ تمہاری انگلیاں پانچ ہیں۔"

"جب تک میں نے شادی نہیں کی تھی میرا حسن ہماری روزی کا ذریعہ تھا۔ جب میرے باپ کا انتقال ہوا تو میری اور میری والدہ کی گزر اُن کی پنشن پر تھی۔ جب میں نے مدرسہ کی تعلیم ختم کی تو مجھے صرف میری خوبصورتی کی بدولت فوراً اداکاری مل گئی۔ میرا حسن میری خوش قسمتی کا باعث ہے۔"

"میرا خیال ہے تم فلمی زندگی میں لاکھوں روپے پیدا کرتیں۔"

وہ ہنس پڑی۔

"بدقسمتی سے مجھ میں اچھی اداکاری کی صلاحیت نہ تھی۔ بس صرف خوبصورتی ہی خوبصورتی تھی۔ اگر میں کچھ دن فلم میں اور کام کرتی تو شاید اداکاری میں بھی کامیاب ہو جاتی۔ مگر میں نے شادی کر لی اور اداکاری چھوڑ دی۔"

اُس کے چہرہ پر ایک ہلکی سی لہر دوڑنے لگی اور اُسے ایک لمحہ

کے لئے اپنے ماضی کی یاد آگئی۔ رودلے اس کی طرف برابر دیکھتا رہا۔ درحقیقت وہ بہت ہی خوبصورت واقع ہوئی تھی۔ صرف اس کے خدوخال ہی موزوں نہ تھے۔ بلکہ اس کا رنگ بھی نہایت شاندار تھا۔

"تم سونے کا ایک حسین مجسمہ ہو۔ ٹھیک ہے نا؟" رودلے نے کہا۔ اُس کے بال گہرے سنہری تھے۔ اس کی بڑی آنکھیں گہری عنابی تھیں۔ اور اُس کی جلد زرد سنہری۔ یہ اُس کا رنگ ہی تھا جس کی وجہ سے اُس کا حسن سرد اور بے جان نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے رنگ سے حرارت اور اُس کے خدوخال سے شدید جاذبیت ٹپکتی تھی۔

"میرا خیال ہے میں نے دنیا میں جتنی بھی عورتیں دیکھی ہیں تم ان میں سب سے زیادہ حسین ہو۔" رودلے بولا۔

"تم نے کتنی عورتوں سے یہ بات اور کہی ہے؟"

"بہتوں سے۔ مگر جب میں تم سے کہتا ہوں تو اس کی سچائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"بہرحال ہمیں اس موضوع کو ختم کر دینا چاہیئے۔"

"کیوں؟ یہی تو میرا محبوب ترین موضوع ہے۔"

"سولہ سال کی عمر سے لوگ مجھ سے برابر یہی کہہ رہے ہیں کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ اور اب ان جملوں کا مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ یہ ایک سرمایہ ہے اور یہ میری بے وقوفی ہوگی اگر میں اس کی قیمت کا شعور نہ رکھوں۔ بہرحال خوبصورتی کے نقصانات بھی ہوتے ہیں۔"

"تم بہت سمجھدار لڑکی ہو۔"

"اب تم مجھ سے ایسی بات کہنے لگے جو میرے نفس کو بہکائیگی۔"

"میں تمہیں بنا نہیں رہا۔"

"تم بیچ میں آگے بڑھ رہے ہو۔ بہت سے لوگوں نے اسی طرح میری طرف بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ تم بالکل اس کہاوت پر عمل کر رہے ہو کہ ایک عام لڑکی کو سیب پیش کرو اور ایک خوبصورت لڑکی کو کتاب پیش کرو۔ اُسے مطلق شرمندگی نہ ہوگی۔"

"آج تمہارے تیور کچھ ٹھیک نہیں معلوم دیتے۔"

"افسوس کہ تم یہ سوچتے ہو۔ میں تم سے نہایت صفائی کے ساتھ بتا دوں کہ مجھ سے تمہیں کچھ حاصل ہو سکے گا۔"

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے تم سے شدید محبت ہو گئی ہے؟"

"غالباً شدید کا لفظ موزوں نہ ہوگا۔ تم نے پچھلے ہفتوں میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم مجھ سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو۔ فلورنس کی رومانی آب و ہوا میں ایک خوبصورت بے سہارا بیوہ سے فائدہ نہ اٹھانا بیوقوفی ہوگا۔ تمہارا مطمح نظر یہی ہے۔"

"تم مجھ پر بڑا بھاری الزام لگا رہی ہو۔ موسم بہار میں ایک نوجوان کا دل ایک حسین عورت پر آ جانا قدرتی بات ہے۔"

اسکی حرکات میں بے تکلفی تھی۔ وہ خود کو اس قدر بے تکلف ظاہر کر رہا تھا کہ میری مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

"میں تم پر الزام نہیں رکھ رہی۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ تم ایک غلط درخت پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اور مجھے تمہارے وقت ضائع کرنے پر نفرت ہوتی ہے۔"

"کیا تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں۔ درحقیقت میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت کی کمی نہیں۔"

"سولہ سال کی عمر سے لوگ مجھ سے محبت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہر آدمی چاہے وہ بدشکل ہو یا خوبصورت ہو، بڈھا ہو یا جوان ہو یہی سمجھتا ہے کہ میں اُس کی آرزوؤں کو پورا کرنے کے لئے بنائی گئی ہوں۔"

"کیا تمہیں کسی سے محبت نہیں ہوئی؟"

"صرف ایک مرتبہ۔" وہ بولی۔

"کس سے؟"

"اپنے مرحوم شوہر سے۔"

ایک لمحہ تک خاموشی رہی۔ پھر شہزادی نے کوئی بات کہنی شروع کر دی اور بات چیت کا رُخ پھر عام موضوعات کی طرف مُڑ گیا۔

— ۳ —

اُنہوں نے کھانا دیر میں شروع کیا تھا۔ اور گیارہ بجتے ہی شہزادی نے بل طلب کیا۔ جب یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ چلنے والے ہیں تو دائنن والا لڑکا پلیٹ لے کر اُن کے پاس آیا۔ برابر کی میز سے اُسے کچھ سکے ملے تھے اور اسکی پلیٹ میں سکوں کے علاوہ ایک دو چھوٹے چھوٹے نوٹ بھی نظر آ رہے تھے۔ اسے اس طرح سے جو کچھ وصول ہوتا تھا وہی اسکا معاوضہ تھا۔ میری نے

بنا پرسن کھوؤ۔

"تم کیوں دیتی ہو" — رو نے بولا۔ "میں اسے کچھ دے دونگا۔"

اُس نے اپنی جیب سے ایک دس روپے کا نوٹ نکالا اور اُس کی پلیٹ میں رکھدیا۔

"میں بھی اسے کچھ دینا چاہتی ہوں۔" میری بولی۔

اور پھر میری نے سو روپے کا نوٹ اُس کی پلیٹ میں رکھ دیا۔ لڑکا حیران ہوگیا۔ اُس نے میری کی طرف اچنبھے سے دیکھا۔ اور سر کو خم کر کے واپس ہوگیا۔

"تم نے اسے سو روپے کیسے دے ڈالے؟" رو نے حیرت ناک لہجہ میں کہا۔ "یہ تو فحش غلطی کی۔"

"کیونکہ اسے واُمن بجانا نہیں آتا اور یہ بہت آفت زدہ معلوم دیتا ہے۔" میری نے بے نیازی سے کہا۔

"لیکن یہ لوگ اتنے انعام کی توقع نہیں رکھتے۔"

"مجھے معلوم ہے اسی لئے تو میں نے اُسے دیئے ہیں۔ اس بے چارے کے لئے یہ بہت زیادہ ہوں گے۔ ہوسکتا ہے اس سے اس کی زندگی ہی بن جائے۔"

برطانوی لوگ اپنی اپنی کاروں میں رُخصت ہوگئے۔ اور شہزادی بھی ان کے پیچھے چل دی

"میری تم ذرا رو نے کو اُس کے ہوٹل میں چھوڑتی جانا۔" شہزادی بولی۔ "اس کا ہوٹل میرے رستے میں نہیں پڑتا۔"

"کیا تم محسوس کروگی؟" وہ بولا۔

میری کو شبہ ہوگیا کہ یہ اسکیم پیشتر سے بنائی گئی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ بڑھی عیاش مزاج شہزادی کو دو مرد عورتوں کے تعلقات بڑھوانے میں مزا آتا ہے۔ اور رو بے اُس کا دل پسند نوجوان تھا۔ مگر اس معقول درخواست کو ٹھکرانا بدتہذیبی ہوتی۔ اور مجبوراً میری نے رضامندی کا اظہار کردیا۔ وہ اُس کی کار میں بیٹھ گیا اور وہ دونوں ساحل کے کنارے کنارے چل دیئے۔ چاندنی شباب پر تھی۔ وہ زیادہ گفتگو نہ کر رہے تھے۔ رو بے سوچ رہا تھا کہ وہ ان خیالات میں غرق ہے جس کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اس لئے اُس نے اُسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ مگر جب وہ ہوٹل پر پہنچ گئے تو اُس نے کہا۔

"کیسی شاندار رات ہے۔ ایسی حسین رات میں بستر پر دراز ہو جانا بدذوقی ہوگی۔ کیا تم تھوڑی دُور اور نہ چلو گی۔ تمہیں نیند تو نہیں آ رہی؟"

"نہیں۔"

"چلو ذرا دیہات کی طرف گھوم آئیں۔"

"نہیں ابھی بہت رات ہوگئی۔ دیہات کی طرف جانے کا وقت نہیں رہا۔"

"کیا تم دیہات سے ڈر رہی ہو یا مجھ سے؟"

"کسی سے بھی نہیں۔"

اس نے گاڑی پھر چلا دی وہ دریا کے کنارے کنارے چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھیتوں کی برابر سے گزر رہے تھے۔ کہیں کہیں اِکّا دُکّا جھونپڑیاں نظر آرہی تھیں۔

"کیا تم ایڈگر سوفٹ سے شادی کر رہی ہو؟" اس نے اچانک سوال کیا۔

اُس نے حیرت سے اُسکی طرف دیکھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں اس وقت اُسی کی بابت کیوں پوچھ رہا ہوں؟"

"مجھے کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟"

جواب دینے کے لئے پہلے وہ کچھ دیر رکے۔

"آج کینس جانے سے پہلے اُس نے مجھے شادی کا پیغام دیا ہے۔ میں نے اُس سے کہا ہے کہ میں واپسی پر اُسے جواب دونگی۔"

"تو تمہیں اُس سے محبت نہیں ہے؟"

میری نے گاڑی کی رفتار ہلکی کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ اس موضوع پر کھل کر بات کرنا چاہتی ہے۔

"تمہارے دل میں یہ خیال کیسے آیا!"

اگر تمہیں اُس سے محبت ہوتی تو تم تین دن کی مہلت نہ مانگتیں۔ تم اسی وقت ہاں کر دیتیں۔"

"میرا خیال ہے تم درست کہتے ہو۔ بے شک مجھے اُس سے محبت نہیں ہے۔"

"خیر اُسے تو تم سے محبت ہے؟"

"وہ میرے باپ کا دوست تھا اور میں اسے بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ میرے اوپر بہت مہربان رہا ہے اور میں اُسکی

شکرگزار ہوں۔"

"وہ تم سے بیس سال بڑا ہوگا۔"

"نہیں چوبیس سال۔"

"کیا تم اس کے رتبہ سے مرعوب ہوئی ہو!"

"ہاں شاید۔ تم نہیں جانتے کتنی عورتیں اس مرتبہ پر پہنچنا چاہیں گی۔ میں بھی آخر انسان ہوں۔"

"کیا تم نہیں جانتیں کہ جس آدمی سے محبت نہ ہو اس کے ساتھ زندگی گزارنے میں کوئی مزہ نہیں۔"

"مگر مجھے محبت نہیں چاہیئے۔ میں نے محبت کا مزہ خوب چکھ لیا ہے۔"

اُس نے یہ بات اس قدر تلخی سے کہی کہ روحی چونک پڑا۔

"تمہاری عمر کی عورت سے میں بڑی عجیب بات سن رہا ہوں۔"

اب وہ دیہات میں بہت آگے نکل آئے تھے اور ایک پتلی سڑک پر چل رہے تھے۔ چودھویں کا چاند اپنی چاندنی فضائے بسیط میں بکھیر رہا تھا۔ اور آسمان بادلوں سے خالی تھا۔ اُس نے کار روک لی۔

"بات یہ ہے میں اپنے شوہر سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی۔ لوگ کہتے تھے میں نے اُس سے شادی کر کے سخت بیوقوفی کی ہے۔ وہ کہتے تھے وہ جواری اور شرابی ہے۔ مجھے کوئی پروا نہ تھی۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اُسکے پاس روپیہ کی کمی نہ تھی۔ اگر اس کے پاس ایک پائی بھی نہ ہوتی تو بھی میں اُس سے شادی کر لیتی۔ تمہیں نہیں معلوم وہ اس زمانے میں کتنا خوبصورت تھا۔ وہ بڑا پیارا لگتا تھا۔ وہ اُس زمانہ میں بڑا خوش مزاج اور نرم دل تھا۔ ہم بہت تفریح کرتے تھے۔ اُس میں بہت کشش تھی۔ جب وہ سنجیدہ ہوتا تو بہت ہی مہربان اور رحم دل بن جاتا۔ جب وہ شراب پیئے ہوئے ہوتا تو بے حد لڑاکو، اکھڑ اور بد مزاج بن جاتا۔ ایسے وقتوں میں مجھے بڑی تکلیف ہوتی۔ اُسکی اس حالت پر مجھے بڑی شرم آتی تھی۔ مجھے اس پر کبھی غصہ نہ آتا تھا کیونکہ بعد میں وہ اپنے کئے پر بُری طرح پچھتاتا تھا۔ جب وہ میرے ساتھ ہوتا تو شراب پینا نہ چاہتا تھا اور بڑی شرافت سے پیش آتا تھا۔ مگر جب دوسرے لوگ اس کے ساتھ ہوتے تو وہ قابو سے باہر ہو جاتا۔ اور دو تین پیگ کے بعد اُس کی عقل اور انسانیت جواب دے جاتی۔ ایسے وقت میں میں اُس وقت تک انتظار کرتی جب وہ بالکل مدہوش ہو جاتا اور اُسے بستر پر لٹا دیتی۔ میں نے اُسے ٹھیک کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مگر میری کوشش کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ میرا خیال ہے شرابی کی اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی بہرحال میں اس کی خدمت کرنے پر مجبور تھی۔ جب کبھی میں اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی تو وہ قابو سے باہر ہو جاتا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھے اپنی اُستانی سمجھ بیٹھے۔ مگر میرے پاس اُس کی اصلاح کے سوا کیا چارہ کار تھا۔ کبھی کبھی مجھے بھی اپنے ضبط پر قابو نہ رہتا پھر ہمارا جھگڑا بڑی عجیب شکل اختیار کر لیتا۔ وہ ایک بیبڑک جواری تھا۔ اور شراب پینے کے بعد ہزاروں روپے ہار دیتا۔ اگر وہ اپنے وقت پر نہ مرتا تو ہم لوگ بالکل دیوالیہ ہو جاتے۔ اور مجھے پھر اداکاری کی طرف لوٹنا پڑتا۔ اب میری آمدنی کچھ ہزار سالانہ کی ہے یا پھر کچھ تھوڑے بہت زیورات بچ گئے ہیں۔ کبھی کبھی وہ رات کو زیادہ شراب پی لیتا اور واپس نہ لوٹتا۔ میں سمجھ جاتی کہ وہ نشہ میں اندھا ہو گیا ہوگا۔ اور جو بھی عورت اُسے ایسے میں مل گئی ہوگی۔ اُسی کے ساتھ سو گیا ہوگا۔ شروع شروع میں مجھے بڑا حسد اور غصہ آتا۔ مگر بعد میں اسے غنیمت سمجھ بیٹھی۔ کیونکہ اگر نشے کے اندر اُسے کوئی عورت نہ ملتی تو وہ گھر آ کر مجھے بری طرح جھنجھوڑتا۔ اُس کے منہ سے شراب کی بدبو آتی۔ اور اس کا منہ بگڑ جاتا۔ وہ مجھے بازاری عورتوں کی طرح پیار کرتا اور میرا دم سخت گھٹنے لگتا۔ اور جب وہ اپنی پیاس بجھا لیتا تو ایک دم خراٹے لے کر سونے لگتا۔ تم میرے اس کہنے پر کہ میں محبت کا مزہ خوب چکھ چکی ہوں حیران ہوگے۔ دیکھا تم نے یہ تھی محبت۔"

"مگر تم نے اُسے چھوڑ کیوں نہ دیا؟"

"میں اسے کیونکر چھوڑ سکتی تھی۔ وہ مجھ پر اتنا بھروسہ کرتا تھا۔ جب کبھی وہ بیمار ہو جاتا یا اُس پر کوئی مصیبت آتی وہ صرف میری ہی ذات تھی جو اس کا سہارا بنتی۔ وہ مجھ سے بچوں کی طرح چمٹ جاتا۔" اُسکی آواز بھرا گئی "اُس کی ایسے وقت کی کیفیت پر میرا دل اُس کے لئے رونے لگتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اُسے مجھ سے شدید محبت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر میں نے اُسے چھوڑ دیا تو وہ ایک دن بھی نہ جی سکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ دُنیا میں اُس کی واحد ہمدرد صرف میں ہی ہوں اور جب

اس نے میری خوشی پر ماتم کرنا شروع کر دیا اور میرا دل پھٹ کر چور چور ہو گیا۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور اس نے انہیں روکنے کی بالکل کوشش نہ کی۔ رودلے نے سوچا کہ رونے سے اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔ اور اس نے سگریٹ سلگا لی۔

"مجھے بھی ایک سگریٹ دو۔ رہ جانے میں کیوں جذبات میں بہہ گئی۔"

اس نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر اسے پیش کی۔

"ذرا میرا رومال بھی نکال دو۔ میرے پرس میں ہوگا۔"

پرس ان کے بیچ میں رکھا تھا۔ اور جب اس نے رومال نکالنے کے لئے اسے کھولا۔ تو اس کا ہاتھ پستول پر پڑا۔ اور وہ چونک پڑا۔

"تم نے پستول کس لئے رکھ چھوڑا ہے؟"

"ایڈگر کو میرا تنہا جانا پسند نہ تھا۔ اس نے مجھ سے پستول لے جانے کا وعدہ لے لیا تھا۔ مجھے معلوم ہے یہ بیوقوفی ہے۔"

مگر جو موضوع رودلے نے چھیڑا تھا اس پر بحث کا اسے بہت احساس تھا وہ خود کو معمول پر لانا چاہتی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ مجھے خود پر قابو نہ رہا۔" وہ بولی۔

"تمہارے شوہر کا انتقال کب ہوا؟"

"ایک سال پہلے۔ میں اب خدا کا شکر کرتی ہوں کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ ورنہ میری زندگی میں سوائے لا انتہا مصیبت کے اور کچھ نہ تھا اب میں مطمئن ہوں۔"

"وہ جوان عمری میں مر گیا ہے نا؟"

"اس کی موت کار کے حادثہ میں ہوئی۔ وہ ساٹھ میل گھنٹہ کی رفتار سے موٹر چلا رہا تھا کہ موٹر پھسل کر سڑک سے نیچے جا پڑی۔ اور وہ چند گھنٹوں کے بعد مر گیا۔ میری قسمت کہ میں اس تک مرنے سے پہلے پہنچ گئی۔ اس کے آخری الفاظ تھے۔

"میری میں نے تم سے ہمیشہ محبت کی ہے" اس نے آہ بھری۔ اسکی موت نے ہم دونوں کو آزاد کر دیا۔"

تھوڑی دیر وہ سگریٹ پیتے رہے۔ رودلے نے اپنی سگریٹ کے ٹکڑے سے دوسری سگریٹ سلگا لی۔

"کیا تمہیں اس کا اندازہ نہیں کہ تم پھر خود کو غلامی میں سونپ رہی ہو اور ایک ایسے آدمی سے شادی کر رہی ہو جس سے تمہیں محبت نہیں۔" اس نے پوچھا۔

"تم ایڈگر کو اچھی طرح نہیں جانتے۔"

"میں اس سے پچھلے پانچ چھ ہفتوں میں کثرت سے ملتا رہا ہوں وہ معمار شخصیت ہے اور مجھے اس قسم کا آدمی کبھی پسند نہیں آیا۔ بڑی ذہانت سے بھرا ہوا۔"

"نہیں ایسی بات نہیں وہ تو ایک ہوشیار اور محتمد آدمی ہے۔"

"غرض وہ سب کچھ جو میں نہیں ہوں۔" اس نے طنزاً کہا۔

"کیا تم تھوڑی دیر کے لئے اپنی ذات کو بیچ میں نہ لاؤ گے۔"

"اچھا تو تم اس کی خوبیاں ہی بیان کرو۔"

"وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ وہ عہدہ اور مقام کا بھوکا ہے۔ اس نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اور آئندہ بھی وہ بڑے اہم کام کرتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے میں اس کی اس جدوجہد میں مددگار ثابت ہوں۔ اگر میں تمہارے کہنے پر دنیا میں بے مصرف زندگی گزارنا چاہتی ہوں تو شاید تم اسے بیوقوفی سمجھو گے۔"

"تمہاری میرے متعلق رائے اچھی نہیں ہے۔ ہے نا یہ بات؟" اس نے پوچھا۔

"بے شک میری رائے تمہاری نسبت کچھ ٹھیک نہیں۔" وہ بولی۔

"مجھے حیرت ہے آخر اس کا سبب؟"

"اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہیں بتا دوں۔" اس نے سرد مہری سے کہا۔ "کیونکہ تم ناکارہ اور بے مصرف آدمی ہو کیونکہ تم سوائے اس کے کچھ اور نہیں سوچتے۔ کہ جتنی عورتیں تمہارے جال میں آ سکیں۔ ان سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکو۔"

"میرا خیال ہے تم کچھ کچھ ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ خوش قسمتی سے مجھے ترکہ میں اتنی معقول دولت ملی ہے کہ میں نے اور کمانا ضروری نہ سمجھا۔ کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھتی ہو کہ میں ایسی دولت کمانے کے پیچھے پڑ جاتا جو کسی غریب فاقہ کش کے منہ سے چھین لی جائے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں آدمی صرف ایک مرتبہ ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور اس زندگی کے علاوہ کوئی اور زندگی نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے میرے حالات ایسے ہیں کہ میں اپنی زندگی سے پورا پورا فیض اٹھا سکتا ہوں۔ میں عورتوں کو پسند کرتا ہوں۔ اور عجیب بات ہے کہ وہ بھی

مجھے چاہتی ہیں۔ میں جوان ہوں۔ اور مجھے معلوم ہے جوانی ہمیشہ نہیں رہتی۔ تو پھر مجھے اگر زندگی میں لطف اٹھانے کا موقع ملتا ہے تو اسے رائگاں کیوں جانے دوں!"

"میرا خیال ہے تمہارے اور ایڈگر کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔"

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر ایڈگر کے مقابلہ میں میرے ساتھ تم بہتر زندگی گذار سکتی ہو۔"

"تم بھول رہے ہو کہ ایڈگر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور تم مجھے ایک مختصر اور عارضی زندگی کا مشورہ دے رہے ہو۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا؟"

"اس لئے کہ تم شادی شدہ ہو۔"

"اسے تمہیں غلط معلوم ہے۔ دو ماہ ہوئے کہ میری بیوی نے طلاق حاصل کر لی ہے۔"

"تم اس کے متعلق ہمیشہ خاموش رہے۔"

"قدرتاً۔ عورتیں شادی کے متعلق عجیب خیالات رکھتی ہیں۔ ان حالات میں یہی مناسب ہے کہ کبھی اسکا ذکر نہ آنے دے۔"

"تو پھر تم نے میرا مقصد سمجھ لیا ہوگا۔"

"اب میں سمجھی۔ میری مسکراہٹ۔ تم نے مجھے یہ گندا راز کس لئے بتایا ہے؟ اسی لئے ناکہ اگر میں تمہارے ساتھ اچھی طرح پیش آؤں تو تم مجھے شادی کی انگوٹھی پہنا دو۔"

"جانِ من۔ مجھے خوب معلوم ہے تم سب سمجھتی ہو۔"

"تمہیں مجھے جان کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"چھوڑئیے بھی میں تو آپ کو شادی کی پیشکش کرنے کے لئے راستہ صاف کر رہا ہوں۔"

"وہ کیوں کر اور کس لئے؟"

"میرا خیال ہے اس میں کوئی عیب نہیں۔"

"یہ ذلیل خیال تمہارے دل میں کیسے آیا؟"

بات یہ ہے کہ جب تم اپنے شوہر کا ذکر کر رہی تھیں۔ میرے دل میں تم سے شادی کا خیال یکلخت پیدا ہو گیا۔ میں نے اچانک محسوس کیا کہ مجھے تم سے شدید ترین محبت ہو گئی ہے۔ ایسی بات نہیں کہ میرے دل میں پہلے سے تمہاری محبت نہ تھی۔ بلکہ اسی محبت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔"

"تمہیں ہرگز ایسی باتیں کرنا زیب نہیں دیتیں۔ تم بچے شیطان ہو تم خوب سمجھتے ہو کہ عورتوں کو کس قسم کی باتیں کر کے رام کیا جاتا ہے۔"

"جب میں عورتوں کے جذبات کو سمجھتا ہی نہیں تو پھر کیسے وہی باتیں کر سکتا ہوں۔"

"اچھا بس خاموش رہیئے۔ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ مجھے غصہ کم آتا ہے اور میرا مزاج بھی کچھ پر مذاق ہے۔ چلئے میں آپ کو ہوٹل پر چھوڑ دوں۔"

"تو پھر میں کیا سمجھوں کہ جواب نفی میں ہے؟"

"یقیناً"

"کیوں"

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مجھے تم سے مطلق محبت نہیں ہے۔"

"مجھے ذرا بھی تعجب نہیں۔ مجھے اس کا علم تھا۔ اگر تم خود کو میری طرف ملتفت کرنے کا ذرا بھی موقع دو تو تمہیں مجھ سے محبت ہو جائے گی۔"

"تم بھی کتنے بھولے بنتے ہو! مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں تمہاری طرف التفات برتوں!"

"تو کیا تم نے ایڈگر سوفٹ سے شادی کرنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے؟"

"ہاں اب میں نے بالکل پکا ارادہ کر لیا ہے۔ بالخصوص تمہاری گفتگو کے بعد شکریہ ہے تمہاری بات چیت سے میں اس نتیجہ پر جلد پہنچ گئی۔ تمہاری گفتگو میرے کام آئی۔"

"لعنت ہے مجھ پر اگر میری وجہ سے ایسا ہوا ہے۔"

"عورتیں مردوں کی طرح سوچنے کی عادی نہیں ہوتیں۔ تم نے جو کچھ کہا اور میں نے بھی مرحوم شوہر کے متعلق جو کچھ کہا۔ اس سے میری ایڈگر کی عقیدت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ وہ چٹان کی مانند ہے۔ مگر جانتی ہوں۔ میں اس پر بھروسہ کرتی ہوں۔ وہ مجھے کبھی نہ بھٹکنے دے گا۔ وہ مجھے تحفظ بخش رہا ہے۔ مجھے اس لمحہ اس سے اتنی عقیدت بڑھ گئی ہے۔ کہ اسے محبت کہا جا سکتا ہے۔"

چیز سے محروم رہا ہو جسے روپیہ سے خریدا جا سکتا ہے تو میں اُسے ایک عجیب تجربہ کراؤں۔ اُسے ایک گھنٹہ کی غیر محدود خوشی بخشوں، جس میں اس کی ہر جسمانی آرزو پوری کراؤں۔ اُسے ایک ایسا تجربہ کراؤں جو اُسے زندگی بھر یاد رہے اور جس کا کبھی اس نے بھول کر بھی خواب نہ دیکھا ہو۔ میں اُسے خوشی کے ساتھ وہ سب کچھ دے دوں گی جو میرے پاس ہو۔"

"میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی عجیب اور پُرجنون بات نہیں سنی۔"

"بہرحال اب تو سن لی۔ اچھا اب آرام کیجئے اور مجھے گھر جانے دیجئے۔"

"تم تنہا چلی جاؤ گی نا؟"

"بالکل۔"

"اچھا تو شب بخیر، اس معمار شہنشاہیت سے شادی کر لو اور خوش رہو۔"

میری فلورنس کی سنسان سڑکوں پر گاڑی چلانے لگی۔ سڑک کی چڑھائی اونچی تھی اور گھوڑے کی نال کی طرح چکردار تھی۔ آدھی چڑھائی چڑھنے پر ایک چبوترہ ملتا تھا جو نیم گول تھا۔ اس پر سرو کے اونچے اونچے درخت کھڑے ہوئے تھے اور ایک منڈیر بنی ہوئی تھی۔ رات کے حسن سے متاثر ہو کر میری نے وہاں کار روک لی۔ اور اتر گئی۔ وہ چبوترہ کے سرے پر آئی اور نیچے گھاٹی کو دیکھنے لگی۔ ساری وادی چاندنی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وسیع اور نیلے آسمان کے نیچے وادی تھی۔ چاندنی کے نغمے نے اس کے دل کے تاروں کو جھنجھنا دیا۔

دفعتاً اُسے احساس ہُوا کہ سرو کے درخت کے نیچے کوئی آدمی کھڑا ہُوا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں سگریٹ جل رہا تھا۔ وہ اُس کی طرف بڑھا۔ وہ گھبرا سی گئی مگر خود کو قابو رکھا۔ وہ اُس کے سامنے آیا اور ہیٹ اتار کر سلام کیا۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ وہی ہیں نا جو ریسٹوران میں فیاضی سے پیش آئی تھیں؟" وہ بولا "میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔"

وہ اُسے پہچان گئی۔

"تم وہی وائلن بجانے والے ہو؟"

اب اُس نے سازندوں والا بھڑکیلا لباس نہ پہن رکھا تھا۔ وہ ایک عام لباس پہنے ہوئے تھا جو بوسیدہ اور میلا نظر آ رہا تھا۔ وہ انگریزی خاصی بول سکتا تھا۔

"مجھے مکان کا کرایہ ادا کرنا تھا۔ میرے مالک مکان شریف ہیں مگر انہیں روپے کی ضرورت تھی۔ اب میں انہیں باقی ماندہ کرایہ ادا کر سکوں گا۔"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میری نے پوچھا۔

"دراصل یہ جگہ میرے راستے میں پڑتی ہے۔ میں صرف نظارہ کی خاطر رُک گیا تھا۔"

"کیا تم یہیں کہیں رہتے ہو؟"

"میں ان جھونپڑیوں میں رہتا ہوں جو آپ کے بنگلہ کے سامنے بنی ہوئی ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہُوا میں اُس بنگلہ میں رہتی ہوں؟"

"میں نے تمہیں کار میں گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہارا باغیچہ بہت خوبصورت ہے اور تمہارے کمروں کی دیواروں پر بہت بڑھیا تصویریں بنی ہوئی ہیں۔"

"تو تم اس کے اندر ہو آئے ہو؟" ایک کسان سے مجھے اس کے متعلق پتہ چلا تھا۔

"نہیں میں بھلا کیسے جا سکتا تھا۔"

میری کی گھبراہٹ اب ختم ہو چکی تھی۔ وہ ایک خوش گو اور شرمیلا نوجوان تھا۔ اُسے یاد آیا کہ ریسٹوران میں وہ کس قدر جھینپا ہوا تھا۔

"کیا تم وہ باغیچہ اور تصویری دیکھنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا

"مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ جب بھی آپ مناسب سمجھیں میں حاضر ہو سکتا ہوں۔"

روے اور اس کی شادی کی غیر متوقع فرمائش سے وہ سخت کوفت محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل ابھی بستر پر لیٹنے کو نہ چاہ رہا تھا۔

"ابھی کیوں نہیں؟" وہ اچانک وقتی کیفیت کے تحت کہنے لگی۔

"ابھی"۔ اُس نے حیرت سے کہا۔

"باغیچہ چاندنی میں ہو تو اور بھی حسین لگتا ہے۔"

"مجھے بہت خوشی ہوگی۔" اس نے تکلفاً کہا۔

"آؤ گاڑی میں بیٹھو میں تمہیں لے چلتی ہوں"

وہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔ وہ راستے میں خاموش رہے جب

ـــــ وہ جھونپڑیوں کے قریب پہنچے۔ تو وہ بولا،
"میں ان جھونپڑیوں میں رہتا ہوں۔"
میری نے گاڑی کی رفتار کم کر لی۔ اور ان افلاس زدہ جھونپڑیوں کی طرف دیکھا، وہ بہت غلیظ اور تنگ معلوم دیتی تھیں۔ تھوڑی دیر میں وہ بنگلے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔
اس نے گاڑی روک دی اور وہ دونوں سیڑھی پر چڑھنے لگے۔ میری کا سونے کا کمرہ اور دوسرے مخصوص کمرے دوسری منزل پر تھے۔ جن پر جانے کے لئے ایک خوبصورت زینہ بنا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اور بجلی روشن کی۔ ہال میں ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ اس نوجوان کو ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ جہاں دیواروں پر مصوری کے نادر نمونے نقش تھے۔ یہ ایک اعلیٰ کمرہ تھا جسمیں مالکان نے اعلیٰ فرنیچر سجا رکھا تھا۔ بڑے بڑے گلدانوں میں پھول سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بنی گئی رنگین تصویریں اگرچہ پرانی ہو چکی تھیں اور ان کے نقوش مدھم پڑ گئے تھے۔ مگر ان میں زندگی کا شدید احساس ہوتا تھا۔
"بہت خوب، بہت ہی خوب" وہ خوشی سے چلایا۔
"میرا خیال تھا ایسی چیزیں صرف عجائب گھروں میں ہوا کرتی ہیں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ لوگ ان کے مالک بھی ہو سکتے ہیں۔"
اسے اسکی خوشی سے ایک کیف سا محسوس ہوا۔ اس نے اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ یہاں اس کے سوا کوئی کرسی نہیں ہے۔ اور سردی میں سنگ مرمر کے فرش اور ہوادار چھت کے باعث بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔
"کیا یہ سب تمہارا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں یہ میرے دوستوں کا ہے۔ انہوں نے مجھے عارضی طور پر دیا ہے۔"
"معاف کیجئے گا، آپ بہت حسین ہیں اور آپ کو ایسی اعلیٰ عمارت میں رہنا زیب دیتا ہے۔"
"چلو میں تمہیں انگور کی شراب کا ایک گلاس پلاؤں گی۔ پھر اس کے بعد باغیچہ میں چلیں گے۔"
"نہیں، میں نے ابھی کھانا نہیں کھایا، شراب مجھے بیخود کر دیگی۔"
"تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟"
وہ اس کی سادگی پر ہنسنے لگا۔
"میرے پاس روپے نہیں تھے، مگر آپ اسکی کوئی پروا نہ کیجئے، میں صبح کھا لوں گا۔"
"نہیں یہ نہیں ہو سکتا، چلو باورچی خانے میں چلیں۔ شاید کچھ بچا کھچا مل جائے۔"
"مجھے بھوک نہیں لگ رہی، یہاں کا نظارہ کرنے سے بہتر ہے۔ مجھے اس محل کی ان چیزوں کا اچھی طرح نظارہ کرا دو۔"
"باغ اور چاندنی کہیں بھاگے نہیں جا رہے۔ میں پہلے تمہارے لئے کھانے کا انتظام کر دوں۔ پھر تم جو چاہو دیکھنا۔"
وہ باورچی خانے میں گئے۔ باورچی خانہ بہت بڑا تھا جس میں ایک بڑی پتھر کی میز پڑی ہوئی تھی۔ مثلاً جب باورچی ملازم تھے ان پچاس آدمیوں کا کھانا تیار ہو سکتا تھا۔ لیکن اور اس کا فرنیچر بیکار ہو چکے تھے۔ اور اسکا باورچی بھاگ چکا تھا۔ میری اور اس اجنبی نے خود کو چوروں کی طرح محسوس کیا۔ انہیں ٹھنڈی انگیٹھی، گوشت، انڈے اور شراب سب مل گئے۔ میری نے بجلی کا چولہا جلایا اور ڈبل روٹی کے ٹکڑوں پر مکھن لگایا اور فرائی پین میں انڈوں کی ٹکیاں تیار کیں۔
"تھوڑا سا گوشت بھی بھون لیتے ہیں۔" وہ بولی۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"
ایک ہاتھ میں چھری اور دوسرے میں گوشت کا ٹکڑا پکڑے ہوئے وہ بولا۔ "کارل رچرڈ، میں کلا کا طالب علم ہوں۔"
"ارے میرا خیال تھا تم اطالوی ہو، تم تو بہترین معلوم دیتے ہو۔"
"جی نہیں، آسٹریا کا باشندہ ہوں۔" اسکی آواز میں قدرے تلخی تھی۔
میری نے اس کی طرف دیکھا۔
"تم نے انگریزی کہاں سے سیکھی، کیا کبھی تم انگلینڈ گئے ہو؟"
"جی نہیں، میں نے کالج میں پڑھی تھی۔" وہ مسکرایا۔ "آپ کھانا بنانے میں خوب ماہر ہیں۔"
"شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہو کہ میں ایک معمولی گھرانے کی لڑکی تھی اور مجھے اپنا کھانا خود تیار کرنا پڑتا تھا۔"
"مجھے اس کا یقین نہیں آتا۔" وہ بولا۔

"تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے ہمیشہ سے امیرانہ زندگی بسر کی ہے اور نوکروں چاکروں پر حکومت کی ہے؟"

"بالکل، پریوں کی شہزادی کی طرح، تم شروع سے امیر معلوم دیتی ہو۔"

"تمہارا خیال ٹھیک ہے، میں نے اپنے اسکول میں کھانا پکانے کی تعلیم حاصل کی تھی اور میری ماں نے مجھے پریوں کی شہزادی کی طرح ہی تربیت دی تھی۔"

جب ساری چیزیں تیار ہو چکیں تو انہوں نے ساری چیزیں ایک ٹرے میں رکھیں اور میری اُسے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی ——— ڈرائنگ روم کا کمرہ بھی بہت بڑا تھا۔ اور اس کی چھت پر بھی نقش و نگار بنے ہوئے تھے، اس میں رنگین پردے لٹک رہے تھے اور لکڑی کی منقش الماریاں سجی ہوئی تھیں۔ وہ شاہانہ عکسی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"مجھے اپنے میلے کپڑوں سے شرم آرہی ہے۔" وہ بولا "اس عالیشان کمرے کیلئے ریشمیں سوٹ کا ہونا ضروری ہے۔"

اُس کا سوٹ واقعی میلا تھا، اُس کے جوتوں میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ اور قمیض بھی پیوند زدہ تھی، اُس کے گلے کا بٹن کھلا ہوا تھا اور اُس نے کوئی ٹائی نہ باندھی ہوئی تھی۔ لمبی موم بتیوں کی روشنی میں اُس کی آنکھیں سیاہ نظر آرہی تھیں، اُس کا سر عجیب تھا جس پر گھنے بال جمے ہوئے تھے، اُس کے گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں، اس کی جلد زرد تھی، اور اس کے چہرہ سے افلاس اور مصائب ٹپک رہے تھے جس سے آدمی کا دل متاثر ہونے لگتا، میری نے سوچا اگر وہ قیمتی سوٹ زیب تن کئے ہوئے ہوتا تو خاصا خوبصورت نظر آتا۔

"تمہاری عمر کتنی ہے؟" میری نے پوچھا۔

"تینتیس سال۔"

"پھر تمہیں اور کیا چاہیئے؟"

"ایسی جوانی کس کام کی، جس کا کوئی لطف نہ اٹھایا جا سکے، میں تو ایک قیدی جیسی زندگی گذار رہا ہوں جس سے کوئی مفر نہیں۔"

"کیا تم کلاکار ہو؟"

وہ ہنسا۔

"کیا تم میرا وائلن سننے کے بعد بھی یہی سمجھتی ہو، میں وائلن بجانے والا نہیں ہوں، جب میں آسٹریلیا سے یہاں پہنچا تو ایک ہوٹل میں کام کرنے لگا مگر ہوٹل والے کا کام اچھا نہ چلا اور مجھے علیحدہ ہونا پڑ گیا، میں اِدھر اُدھر کچھ کام کر لیتا ہوں، مگر پردیسی ہونے کی وجہ سے کام کا ملنا بہت مشکل ہے۔ وائلن تو میں صرف زندہ رہنے کے لیئے بجاتا ہوں، مگر مجھے روزانہ یہ کام نہیں ملتا۔"

"تم نے آسٹریا کیوں چھوڑ دیا۔"

"ہمارے کچھ طالب علموں نے حکومت کے خلاف احتجاج کیا تھا، حکومت سے ٹکر ہوئی مگر ہم مقابلہ نہ کر سکے، ہمارے دو ساتھی مر گئے اور باقیوں کو جیل میں ڈال دیا گیا، مجھے بھی چھ ماہ کی سزا دی گئی تھی مگر میں فرار ہو گیا اور اٹلی میں آکر پناہ لی۔"

"یہ تو بڑی وحشتناک بات معلوم دیتی ہے" میری بولی، واقعی میری کو اُسکی روداد سن کر وحشت ہوئی اور اس نے اُس کی طرف ملعون نظروں سے دیکھا۔

"میں اپنے عقیدہ کا واحد آدمی نہیں ہوں، دنیا میں ہمارے ہم عقیدہ ہزاروں آدمی ہیں۔ بہرحال میں آزاد ہوں۔"

"مگر مستقبل کے لیئے تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

اُس کے چہرے پر ناکامی کی کیفیت اُبھر آئی۔ اور وہ جواب دینے ہی والا تھا۔ مگر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اور اس نے گردن کا مایوسی اشارہ کیا اور جھینپ کر ہنسنے لگا۔

"خدا کے لئے مجھے اسی طرح سوچنے دو۔ مجھے ان قیمتی لمحوں سے پورا پورا حظ اٹھانے دو، مجھے زندگی میں ایسا خوشگوار موقع کبھی نہیں ملا، میں اس موقع سے پورا پورا لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں تاکہ میری زندگی میں اسکی یاد ایک قیمتی سرمائے کی طرح محفوظ رہے۔"

میری نے اسکی طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ اُس کے دل کی دھڑکن سُن رہی ہے۔ اُس نے دو لمحے تھوڑی دیر پہلے جو کچھ کہا تھا وہ صرف ایک مذاق تھا، کسی بیکار لمحہ میں اُس کے ذہن میں وہ خیال آیا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ وقت آنے پر وہ ایسا کبھی نہ کر سکے گی۔ کیا وہ لمحہ آچکا ہے! اس نے خود کو بے قابو سا محسوس کیا، وہ شراب بہت کم پیا کرتی تھی۔ مگر اس کا ساتھ دینے کی خاطر اس نے دوبارہ پھر پی لی تھی۔ اور اسکی طبیعت بے قابو ہو رہی تھی۔ اس بڑے کمرے میں جس نے ہزاروں رومان دیکھ رکھے تھے۔ اس اجنبی کے ساتھ شراب کے سرور کی کیفیت

میں بیٹھا عجیب عالم میں رہا تھا ، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی ، مکمل ہوئی کھڑکیوں سے خوشگوار اور ہلکی ہلکی ہوا اندر آ رہی تھی میری نے اپنے ہیجانی خیز جذبات کے پیچھے ہلکی سی کمزوری سی محسوس کی ۔ اسے محسوس ہوا جیسے اُس کا دل اُس کے سینے کے اندر پگھلا جا رہا ہے ۔ اُسکی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو چکی تھی ، وہ میز سے یکدم اٹھ کھڑی ہوئی ۔

" آؤ اب میں تمہیں اپنا باغیچہ دکھاؤں ، اور پھر تم کو چل دینا چاہیئے "

باغیچہ کے لئے قریب ترین راستہ ڈرائنگ روم سے ہو کر تھا وہ اُسے اُس طرف لے جانے لگی ، کمرہ میں پہنچ کر وہ ایک عطردان کو دیکھنے کے لئے رک گیا جو دیوار کے سہارے کھڑا تھا ، پھر اُسکی نظر گراموفون پر پڑی ۔

" اس ماحول میں یہ کتنا عجیب لگتا ہے "

" کبھی کبھی میں جب باغ میں بیٹھتی ہوں تو کوئی ریکارڈ اس پر لگا دیتی ہوں "

" کیا میں ایک ریکارڈ بجا سکتا ہوں ؟ "

" ہاں اگر تمہارا دل چاہ رہا ہے ۔ "

اُس نے سوئچ کھول دیا ۔ اتفاق سے مشین پر والنٹز کا ریکارڈ چڑھا ہوا تھا ، خوشی سے اسکی ہلکی سی چیخ نکل گئی ۔

" ونیا ، یہ میرا محبوب ترین والنٹز کا ریکارڈ ہے "

اُس نے اس کی طرف چمکدار آنکھوں سے دیکھا ، اُس کا چہرہ اب بدل چکا تھا ، وہ سمجھ گئی کہ وہ کیا چاہتا ہے ۔ مگر اسے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی ، وہ مسکرانے لگی ۔

" کیا تم ناچنا جانتے ہو ؟ "

" ہاں ہاں میں خوب جانتا ہوں ۔ "

" اچھا دیکھوں کیسا ناچتے ہو ! "

اُس نے اپنا ہاتھ اُس کی کمر میں ڈال دیا ۔ اور پھر اسی بے تکلف کمرے میں وہ پیانو والنٹز کی دھن پر رقص کرنے لگے ۔ پھر اُس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باغیچہ میں لے گئی ۔ دن کے وقت باغ کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڑھیا عورت ہو جس نے اپنے شباب میں خوب رنگ رلیاں منائی ہوئی ہوں ، مگر اس چاندنی رات میں اسکی سلیقہ سے کٹی ہوئی جھاڑیاں ، خوبصورت آبشار اور ہموار سبز گھاس کے لان نے اس میں ایک عجیب حسن پیدا کر دیا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ وہاں پیچھے رہ گئی ہیں ۔ اور وہ اس نئی نسل کے انسان ہیں جو جذبات کی تسکین کو زیادہ اہمیت دیتی ہے ۔ اور تمام قیود سے بے نیاز ہوتی ۔۔ ایک نرم ہوا میں سفید پھولوں کی مہک بسی ہوئی تھی ، وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے ٹہل رہے تھے ۔

" وہ کتنا حسین ماحول ہے " وہ آخر بڑبڑایا ۔ " تقریباً ناقابل برداشت " پھر اُس نے گوئٹے کے فاؤسٹ کی وہ مشہور لائن دہرائی جس میں فاؤسٹ دائمی رواں وقت سے رکنے کی درخواست کرتا ہے " تم پیاری بہت خوش ہو گی ؟ "

" بہت " وہ مسکرائی ۔

" مجھے بہت خوشی ہے کہ تم ایک مہربان اور فراخ دل انسان ہو ، تم مسرت کی مستحق ہو ، میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں زندگی میں وہ سب کچھ مل جائے جس کی تمہیں تمنا ہے "

وہ ہنسنے لگی

" مجھے زندگی میں وہ سب کچھ حاصل رہا جس کی مجھے خواہش ہوتی ہے "

اس نے ایک آہ بھری ۔

" میں آج کی رات مرنا چاہتا ہوں ، آئندہ مجھے ایسی خوشی کبھی میسر نہ ہوگی میں اسکو تمام عمر یاد رکھوں گا ، مجھے یہ شام اور تمہاری خوبصورتی ہمیشہ یاد رہے گی ، میں تمہیں ہمیشہ جنت کی دیوی سمجھوں گا اور میں مریم کی طرح تمہاری پرستش کرتا رہوں گا "

اس نے اس کا ہاتھ اپنے لبوں کی طرف اٹھایا اور بے ڈھنگے پن سے جھک کر اسے بوسہ دیا ، میری نے بھی اس کا چہرہ نرمی سے چھوا ۔ معاً وہ اپنے گھٹنوں پر کھڑا ہوگیا اور اس کے لباس کے حاشیہ کو چوم لیا ۔ اور وہ بے پناہ وجد کی کیفیت میں مبتلا ہوگئی ۔ اس نے اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے کھڑا کر کے اس کی آنکھوں اور چہرہ کو بوسوں سے پاٹ دیا اس عمل میں ایک عجیب سنجیدگی اور کیفیت تھا ، اس کے دل میں عجیب سا احساس جاگ اٹھا ۔ اس کا دل ہمدردانہ محبت سے لبریز ہو اٹھا ۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا اور اسے اپنی آغوش میں جکڑ لیا ۔ تیئس سال کا تھا اور

وہ بھی کوئی ایسی ویسی بات تھی جس کی طرف پرواہ کی جا سکتی ہے آخرش گورنمنٹ پیلس کی ایک جوان عورت ہی تو تھی۔

وہ پارلیمنٹ کی طرف چل دیئے۔

۴

کمرے میں اندھیرا تھا، مگر کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور چاندنی اندر آ رہی تھی۔ میری ایک پرانی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور نوجوان کا سر اسکی ران پر لٹکا ہوا تھا، وہ سگریٹ پی رہا تھا اور نیم تاریکی میں اسکی سرخ روشنی چمک رہی تھی۔ اس کے سوالوں کے جواب میں وہ اسے بتا رہا تھا کہ اس کا باپ آسٹریا کی پولیس میں ایک افسر تھا، اس کے باپ نے جمہوریت کو سختی سے دبا دیا تھا، بڑا وطن پرست آدمی تھا اور جرمنوں کا قبضہ اپنے ملک پر ہونا نہ چاہتا تھا۔ اس کے باپ کے نازی بہت سخت دشمن ہو گئے تھے۔ اور جب جرمن کی افواج آسٹریا میں گھس آئیں تو اس نے گولی مار کر خودکشی کر لی۔ اسوقت وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ اس نے آرٹ کی تعلیم ختم کر لی تھی اور ایک سکول میں جگہ ملنے والی تھی۔ اسی زمانہ میں ہٹلر آسٹریا آیا تھا۔ اور اسکی تقریر پر لوگوں نے بڑی تالیاں بجائی تھیں۔ مگر بعد میں لوگوں نے دیکھا کہ ان کا فاتح بڑا ظالم ہے۔ تمام قوم میں غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اور ایک جماعت جرمنوں کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے بنائی گئی۔ مگر ان کی حرکات و سکنات سے خفیہ پولیس خوب واقف تھی۔ ایک رات وہ سب گرفتار کر لئے گئے۔ دو آدمیوں کو گولی مار دی گئی۔ باقیوں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ تین ماہ بعد وہ فرار ہو کر اٹلی کی سرحد میں پہنچ گیا۔ اس کے پاس کوئی پاسپورٹ نہ تھا اسے ہر وقت گرفتار ہونے کا ڈر تھا۔ اس صورت میں یا تو وہ آوارہ سمجھ کر جیل میں ڈال دیا جائے گا یا واپس نازیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور اس صورت میں اسے کافی سخت سزا ملے گی۔

"اگر میرے پاس ریوالور ہوتا تو میں بھی اپنے باپ کی طرح خودکشی کر لیتا"۔

اس نے اسکا ہاتھ اٹھایا اور اپنے سینہ پر رکھ لیا۔ بس اسی جگہ جہاں تمہارا ہاتھ ہے وہاں گولی مار لیتا۔"

"ایسی باتیں نہ کرو" میری نے اپنا کیکپاتا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

وہ کھوکھلی ہنسی ہنسنے لگا۔

"تم نہیں جانتیں۔ میں نے کتنی دفعہ دریا کی طرف دیکھا ہے اور یہ سوچا ہے کہ وہ دن کب آئے گا جب میرے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ میں اس میں کود کر جان دے دوں۔"

میری نے گہری سانس بھری، اس کی قسمت ایسی خراب تھی کہ اس کے دلاسے کو اگر کوئی جملہ کہا بھی جاتا تو وہ نشتر کا کام کرتا۔ اس نے اس کا ہاتھ پھیر دبایا۔

"آہیں مت بھرو" اس نے کہا "مجھے کسی چیز کا غم نہیں۔ آج کی رات کی خوشی سے مجھے تمام تکلیفوں کا بدلہ مل گیا ہے۔"

وہ خاموش ہو گئے، میری اسکی مصیبت زدہ کہانی کے متعلق سوچنے لگی، مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ اس کے لئے کیا کر سکتی ہے کیا اسے کچھ روپیہ دیدے؟ مگر اس سے کتنے دن کام چل سکے گا؟ وہ ایک رومانی نوجوان تھا جو اپنے پڑھاپے، تجربوں سے زیادہ کتابوں کو اہمیت دیتا تھا۔ اور یہ قطعی ممکن تھا کہ وہ اسکی دی ہوئی کوئی رقم قبول نہ کرے گا۔ دفعتاً ایک پرندے کی آواز سنائی دی۔ اس آواز نے خاموشی کو اس تیزی سے چیرا کہ وہ بوکھلا گئی۔ اس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"اچھا میرے عزیز اب تمہیں جانا چاہیئے۔"

"ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔ میری جان میری روح!"

"صبح ہونے والی ہے۔"

"ابھی نہیں" اس نے خود کو گھٹنوں پر کھڑا کیا اور اس کی گردن میں ہاتھ حمائل کر دیئے "میں تمہاری پرستش کرتا ہوں!"

اس نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔

"اب تمہیں چل دینا چاہیئے، رات بہت گزر چکی ہے خدا را مان جاؤ!"

اس نے اس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی مسکراہٹ محسوس کی وہ گھٹنے لگا۔ اور اپنا کوٹ اور جوتے تلاش کرنے لگا، اس نے بتی جلا دی۔ جب اس نے لباس پہن لیا تو اس سے ہم آغوش ہو گیا۔

"میری پیاری میری جان!" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "تم نے مجھے کتنی عظیم مسرت بخشی ہے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم خوش ہو گئے" وہ بولی۔

"تم نے وہ چیز بخشی ہے جس کے سہارے میں زندہ رہ سکتا ہوں۔ اب جب تم مجھے حاصل ہو تو پھر میرے پاس سب کچھ ہے مستقبل

ان تعلقات کو دوبارہ استوار کرے گا، زندگی میں جینے کا لطف لوٹ آیا ہو۔"

"تو مجھے کبھی نہ چھوڑو گے؟" اُس نے پوچھا۔

"کبھی نہیں۔"

اُس نے اپنے ہونٹ اُسکی طرف بڑھائے۔

"اچھا تو خدا حافظ۔"

"کیا مطلب ہے خدا حافظ؟" اس نے جذباتی ہوکر عاجزی سے پوچھا۔

"ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، میں یہاں سے بہت جلد چلی جاؤں گی، شاید دو تین دن کے اندر۔" اسکی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ اور کیا کہے۔ "اب ہم ایک دوسرے سے کبھی نہ مل سکیں گے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے میں خود مختار نہیں ہوں۔"

"کیا تم شادی شدہ ہو؟ مجھے پتہ چلا تھا کہ تم بیوہ ہو۔"

وہ آسانی سے جھوٹ بول سکتی تھی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ایسا کیوں نہ کر سکی، وہ جھجک سی گئی۔

"تم نے اس سے کیا مطلب نکالا کہ میں خود مختار نہیں ہوں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارا اور تمہارا اب آیندہ ملنا ناممکن ہے۔"

"مگر میں تم سے ایک مرتبہ اور ملنا چاہتا ہوں صرف ایک مرتبہ ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

"پیارے مدہوش نہ بنو۔ میں تم سے کہہ رہی ہوں یہ ناممکن ہے اب ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔"

"مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں، کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟"

وہ ایک لمحہ کے لئے جھجکی، وہ نامہربانی کا ثبوت نہ دینا چاہتی تھی، مگر اس نے مناسب سمجھا کہ اُسے صحیح حقیقتِ حال بتا دے۔ اس نے اس کا ہاتھ [illegible] ایک لمحہ کے لئے مسکرائی۔

"نہیں۔"

اس نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اسکی بات سمجھ نہیں سکا۔

"تو پھر تم مجھے کیوں لائی تھیں؟"

"چونکہ تم تنہا اور پریشان تھے، میں تمہیں تھوڑی دیر کی خوشی بخشنا چاہتی تھی۔"

"اُف تم کس قدر ظالم ہو، کتنی سنگدل ہو۔"

وہ گھبرا گئی۔

"ایسا مت کہو، میں تم پر کوئی ظلم نہ کرنا چاہتی تھی، میرا دل رحم اور ہمدردی سے پُر تھا۔"

"میں نے تم سے کبھی رحم کی درخواست نہیں کی، تم نے مجھے میرے حال پر کیوں نہ چھوڑ دیا۔ تم نے مجھے جنت میں داخل کیا۔ اور اب پھر دوزخ میں پھینک رہی ہو۔ نہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اُس کے الفاظ میں وقار کی جھلک تھی۔ اُسکی جھنجلاہٹ کے پیچھے غم کا طوفان چھپا ہوا تھا۔ وہ بُری طرح مرعوب ہو رہی تھی۔ اُس کے خیال میں بھی نہ آیا تھا کہ وہ ایسی بات سوچے گا۔

"شاید میں نے سخت حماقت کی ہے؟" وہ بولی "میں تمہیں ستانا نہیں چاہتی۔"

اس کی آنکھوں میں اب محبت کی کوئی جھلک نہ تھی بلکہ ایک سوختہ تھا۔ اس کا سفید چہرہ سفید تر ہو گیا تھا۔ اس کے چہرہ پر موت کے سے آثار چھائے ہوئے تھے۔ اسکی یہ حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ اُس نے اب محسوس کیا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر چکی ہے۔ نوکر دوسرے گوشہ میں سو رہے تھے۔ اور اگر وہ چیخی تو اُن تک آواز نہ پہنچ سکے گی۔ وہ کتنی بڑی پاگل اور احمق تھی، اس کا علاج صرف ایک ہی تھا کہ وہ اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ وہ خوفزدہ ہے۔

"مجھے بے انتہا افسوس ہے، میں تمہارے جذبات کو تکلیف دینا نہ چاہتی تھی۔ اگر میں تمہاری تکلیف کا کوئی کفارہ دے سکتی ہوں تو اس کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔" اسکی زبان میں لرزش تھی۔

اُس نے تلخی سے منہ بنایا۔

"تم زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتی ہو۔ یہی نا کہ مجھے کچھ روپے دے دو۔ مجھے روپیہ نہیں چاہیئے۔ تمہارے پاس اسوقت کتنے روپے ہیں؟"

اُس نے اپنا پرس سنگھار دان سے اٹھایا اور جیسے ہی اس نے اپنا ہاتھ اندر ڈالا۔ اس کا ہاتھ پستول پر پڑا۔ اسکی ہمت بندھ گئی۔ اُس نے زندگی میں کبھی پستول نہ چلایا تھا۔ نہیں اسکی نوبت کبھی نہ آئی تھی پھر بھی خدا کا شکر ہے اُس کے پاس پستول تھا۔ خدا ایڈگر کو خوش رکھے وہ بڑا دور اندیش آدمی ہے۔ اُس کے دل میں مختلف شبہات پیدا ہو رہے تھے، بہرحال اس عجیب خیال سے وہ بہت خوش ہوئی وہ اس کا امتحان لینا چاہتی تھی۔ اب وہ اپنے آپ میں تھی۔

"میرے پاس اسوقت صرف دو تین ہزار روپے ہیں۔ ان سے تم بہ آسانی سوئٹزرلینڈ پہنچ سکتے ہو، تم وہاں زیادہ امن سے رہو گے۔ یقین کرو مجھے ان کا کوئی دکھ نہ ہوگا۔"

بے شک تمہارے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ تم امیر ہو۔ صحیح ہے نا؟ تم ایک رات کی خوشی کے لئے اتنی بڑی رقم بآسانی صرف کر سکتی ہو۔ کیا تم ہمیشہ اسی طرح نوجوان لڑکوں سے لطف اندوز ہوتی ہو۔ اگر مجھے روپے کی ضرورت ہوتی تو کیا میں اسی پر قناعت کرتا۔ میں تم سے جواہرات مانگتا۔"

"تم انہیں بھی لے سکتے ہو۔ میرے لئے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ سنگھار دان پر رکھے ہوئے ہیں۔ جاؤ لے لو!"

"تم بہت کمینی عورت ہو۔ کیا تم اتنی ذلیل ہو کہ ہر آدمی کو پیسے سے خرید لو۔ تمہیں نہیں معلوم اگر میں روپیہ کو کوئی اہمیت دیتا۔ تو نازی مجھے روپیہ دینا چاہتے تھے۔ مجھے وطن سے غداری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"یا اللہ! تمہاری سمجھ میں کوئی بات ہی نہیں آتی! میں تمہارے ساتھ ہمدردی کرنا چاہتی تھی اور تم سمجھتے ہو۔ میں نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے۔ میں تمہیں نقصان کا معاوضہ دینا چاہتی ہوں۔ اگر تمہیں میری ذات سے تکلیف پہنچی ہے تو میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ میں صرف تمہاری بھلائی چاہتی تھی!"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم ایک شہوت پرست اور آوارہ عورت ہو۔ تم نے زندگی میں بھی کوئی بھلا کام کیا ہے؟ تم نئے نئے معصوم نوجوانوں کو پھانستی ہو۔ ان کے جذبات برانگیختہ کرتی ہو اور نئے نئے تجربوں سے لطف اٹھاتی ہو۔ تمہیں جو بھی نوجوان ہاتھ لگ جاتا ہے۔ اسی کو اپنی وقتی تسکین کے لئے پکڑ لیتی ہو۔ تمہیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ اس سے دوسروں کو کتنا نقصان پہنچتا ہے۔ مگر اس دفعہ تم نے بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ اجنبی آدمی کو اپنے گھر میں لے جانا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ میں تمہیں دیوی سمجھا تھا مگر تم رنڈی نکلیں۔ اگر میں تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں ابھی ختم کر دوں تو یہ بہتر رہے گا۔ تاکہ تم کسی اور معصوم کو نہ ستا سکو۔ میں بہت آسانی سے ایسا کر سکتا ہوں۔ کسی کو مجھ پر شبہ تک نہ ہوگا۔ مجھے اس مکان میں داخل ہوتے کس نے دیکھا ہے؟"

وہ اسکی طرف ایک دم آگے بڑھا۔ وہ سخت خوفزدہ ہو گئی۔ اس کا نسوانی چہرہ نفرت سے بگڑ گیا تھا اور اسکی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اُس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ابھی تک پرس اسکے ہاتھ ہی میں تھا۔ اس نے پستول نکال لیا اور اس کی طرف تان لیا۔

"اگر تم فوراً نہ گئے تو میں گولی مار دوں گی!"

"تو پھر مارو گولی۔"

وہ اسکی طرف ایک قدم اور بڑھا۔

"اگر تم ایک انچ بھی آگے بڑھے تو میں گولی داغ دوں گی۔"

"مارو۔ کیا تم سمجھتی ہو میں زندگی کو پسند کرتا ہوں۔ تم مجھے ایک ناقابل برداشت مصیبت سے چھٹکارا دلا دو گی۔ مارو۔ مارو۔ مارو میں تمہیں ہر چیز کے لئے معاف کر دوں گا۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔" اُس کا چہرہ بدل گیا تھا۔ وہ پہلی جیسی تلخی کے آثار ختم ہو چکے تھے۔ اور اس کی بجائے اب اُسکی آنکھوں میں خوشی کی چمک آ گئی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس کا سر پیچھے کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ اور اُس نے اپنا سینہ اس کے نشانے کے لئے پیش کر دیا تھا۔

"تم بڑی آسانی سے کہہ سکتی ہو کہ تمہارے گھر میں ایک چور گھس آیا تھا اور تم نے اُسے گولی مار دی۔ لو اب جلدی کرو۔ مارو نا گولی۔"

اُس نے پستول کو اپنے ہاتھ سے چھوٹ جانے دیا اور ایک کرسی پر گر کر آنکھوں کو ڈھک کر بے تحاشہ رونا شروع کر دیا۔ اُس نے ایک لمحہ کے لئے اُسکی طرف دیکھا۔

"کیا تم میں جرأت نہیں ہے؟ کمزور عورت۔ تم کتنی بیوقوف ہو۔ تمہیں لوگوں سے اس طرح کھیلنا نہیں چاہیئے۔ اٹھاؤ اسے اور مارو گولی۔"

اُس نے اپنے بازو اسکی گردن میں حمائل کر دیئے۔ اور اُسے پاؤں کے بل کھڑا کرنے لگا۔ وہ نہیں سمجھ سکی وہ کیا چاہتا ہے۔ اور کرسی سے چمٹی رہی۔ اور برابر روتی رہی۔ اُس نے اسکا ہاتھ جھٹکا اسکی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اور درد کے مارے وہ کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اُسے اٹھا کر کمرے میں دوسری طرف لے گیا۔ اور بستر پہ لے جا کر پٹک دیا اور خود بھی اس کے اوپر لیٹ گیا۔ اور اسے زور سے چمٹا لیا۔ اور اُس کے منہ پہ بوسوں کی یلغار کر دی۔ اُس نے خود کو اُس سے علیحدہ کرنا چاہا۔ مگر اُس نے اُسے بری طرح جکڑ لیا۔ وہ اپنے وجود سے زیادہ طاقتور تھا۔ اور اُسکی مضبوط گرفت کے آگے بے بس

جھی۔ آخر اس نے زور لگانا بند کر دیا۔ اور خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا۔ اس کی چول چول ہل گئی تھی۔ وہ پلنگ کے کونے پر ... اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔ میں تو بھلا دوں گا۔ مگر تم نہ بھلا سکو گی۔"

وہ ساکت رہی اور خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے ایک کرخت قہقہہ لگایا۔

"ڈرو مت! میں تم پر حملہ نہ کروں گا۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ اس کی قہر آلود نظروں کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دفعتاً اس نے تاریک کمرے کے اندر ... پاؤں چلنے کی آہٹ محسوس کی۔ اس کے کان میں گولی کی آواز ... پھر ایک جسم زمین پر گرا۔ وہ چیخ مار کر ایک دم کھڑی سی ہو گئی۔

"ہائے اللہ تم نے کیا کیا"

وہ کھڑکی کے سامنے لیٹا ہوا تھا اور چاندنی اس پر پڑ رہی تھی۔ گھٹنوں کے بل اس پر جھک گئی، اور اسے نام لے کر پکارنے لگی۔

"کارل — کارل یہ تم نے کیا کر ڈالا؟"

اس نے اس کا ہاتھ اوپر اٹھایا اور جب اسے چھوڑا تو وہ بے جان نیچے آن پڑا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے چہرہ اور پھر دل پر رکھا وہ مر چکا تھا۔ وہ خوف سے پیچھے پلٹ گئی۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ بیہوش ہونے والی ہے۔

معاً وہ کھڑی ہو گئی کیونکہ باہر کسی کے ننگے پاؤں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ پھر وہ آواز رک گئی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ دروازہ پر کوئی کھڑا ہوا ہے۔ وہ خوف سے دروازہ کی طرف دیکھنے لگی اور آہٹ سننے لگی کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ خوف سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ چیخ اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ وہیں زمین پر قطعاً ساکت بیٹھ گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے برابر میں پڑی نعش۔ دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔ اس نے قوت لگا کر آواز نکالی۔

"ہاں، کیا بات ہے؟"

"حضور آپ خیریت سے ہیں؟" یہ نینا کی آواز تھی۔ "میرا خیال ہے میں نے کچھ آواز سنی تھی۔"

میری نے اپنی انگلیاں اپنی ہتھیلی میں گڑا دیں تاکہ وہ معمول کے لہجے میں بول سکے۔

"تم خواب دیکھ رہی ہو گی۔ میں نے کچھ نہیں سنا۔ جاؤ سو جاؤ۔"

"بہت بہتر حضور۔"

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ اور پھر اس نے ننگے پاؤں واپس جانے کی آہٹ سنی۔ میری دیر تک اس آہٹ پر کان لگائے رہی۔ اس نے ان لمحوں کے لئے اپنی قوت جمع کر لی تھی۔ اس نے گہری آہ بھری۔ مگر کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر نعش کی طرف دیکھا۔ وہ کانپ اٹھی۔ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر اس نے ایک ہاتھ مرے ہوئے آدمی کے سر کے نیچے ڈالا اور اسے کھڑکی سے باہر پھینکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ کسی شدید خوف کے باعث وہ اسے کمرے سے باہر ڈالنا چاہتی تھی۔ مگر نعش وزنی تھی۔ اس نے بے بسی سے آہ بھری۔ اس نے خود کو بے جان محسوس کیا۔ اس کی سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ معاً اسے خیال آیا کہ نینا کو اس طرح ٹال دینا سخت غلطی ہے۔ اس نے اس سے یہ کیسے کہہ دیا کہ اس نے کوئی آواز نہیں سنی۔ جب کہ گولی اس چار دیواری میں چلی ہے۔ اپنی بدنامی کے ہر قسم کے خیالات اس کے دل میں جگہ لینے لگے۔ بے عزتی شرم اور نہ جانے کیا کیا۔ آخر وہ کیا جواب دے گی۔ کہ اس نے کیوں خودکشی کی ہے۔ اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سچ سچ کہہ دے۔ اور سچ میں بدنامی تھی۔ ایسی حالت میں تنہا ہونا سخت پریشان کن تھا۔ اس کا کوئی معاون نہ تھا۔ اس مایوسی کی حالت میں اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی سے ملے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ سخت ضرورت ہے۔ رودلف! ایسے میں صرف وہی واحد آدمی ہے جو کام آ سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے اسے بلایا تو وہ ضرور آئے گا۔ وہ اسے چاہتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا اسے اس سے محبت ہے۔ ہر چند کہ وہ برا آدمی ہے مگر اس وقت ضرور کام آئے گا۔ بہر حال وہ اسے مشورہ ضرور دے گا۔ وہ رات میں اس سے کیسے مل سکتی ہے؟ مگر وہ دن نکلنے تک انتظار نہ کر سکتی تھی۔ اگر صبح ہونے سے پہلے پہلے کچھ نہ کیا تو کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔

اس کے بستر کے قریب فون رکھا ہوا تھا۔ اسے ہوٹل کا نمبر جلد

تھا۔ کیونکہ ایڈگر وہیں ٹھہرا تھا۔ اس نے ہوٹل سے فون ملایا۔ شروع میں کوئی جواب نہ ملا۔ پھر ایک ملازم نے جواب دیا۔ غالباً وہ سوتے سے اٹھا تھا۔ اس نے اس سے فون دوسرے کمرے میں ملانے کو کہا۔ اس نے گھنٹی بجنے کی آواز سنی۔ مگر جواب نہ مل رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ خوف زدہ ہوگئی۔ کہیں وہ باہر نہ ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں باہر چلا گیا ہو۔ کہیں جوا کھیل رہا ہو یا کسی عورت کے پاس ہو۔ مگر جب اس نے ایک تیز خواب آلود آواز سنی۔ تو ایک اطمینان کا سانس لیا۔

"ہاں، کون ہے؟"

"رولے، میں میری بول رہی ہوں۔ میں سخت پریشانی میں مبتلا ہوں۔"

اس نے محسوس کیا کہ وہ بالکل جاگ چکا ہے۔ وہ آہستہ سے ہنسا۔

"اتنی رات گئے کیسی پریشانی، آخر کیا بات ہے؟"

"میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ بہت سخت بات ہے۔ میں چاہتی ہوں تم یہاں چلے آؤ۔"

"کب؟"

"ابھی۔ اسی وقت۔ جتنی بھی جلدی ہو سکے۔ خدا کے لئے جلدی آؤ۔"

اس نے اس کی آواز کی لرزش کو محسوس کیا۔

"اچھا میں ابھی آیا گھبراؤ مت۔"

یہ دو بول کتنے سکون بخش تھے۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس نے سوچا وہ کتنی دیر میں یہاں پہنچے گا۔ ہوٹل تین میل دور تھا۔ اور زیادہ راستہ چڑھائی کا تھا۔ اس وقت اسے کوئی ٹیکسی بھی نہ ملے گی۔ اگر وہ پیدل آیا تو ایک گھنٹہ سے کم نہ لگے گا۔ ایک گھنٹہ بعد دن نکل آئے گا۔ وہ کمرہ میں انتظار نہ کر سکتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر پٹری میں آ گئی جیسے چاندنی سے تھوڑی دیر پہلے وہ لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اب اس کے خوف سے درختوں کی چھاؤں میں چلنے لگی۔ بالآخر وہ دروازے پر پہنچ گئی۔ اور یہاں اس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ وقت کے تیزی سے نہ رسنے کے خوف سے پریشان ہو رہی تھی۔ دفعتاً اس نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ اور چونک کر درخت کی آڑ میں کھڑی ہوگئی۔ کوئی شخص پہاڑی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ یہ سیڑھیاں اس کے بنگلہ کے دروازے کے نیچے سامنے گھاٹی میں اترتی تھیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو وہ بنگلہ کی طرف تیزی سے آ رہا تھا۔ جب وہ تاریکی سے باہر چاندنی میں پہنچا تو اس نے سمجھا کہ رولے تھا۔ اسکو دیکھ کر اسے بے اندازہ سکون ہوا۔

"خدا کا شکر ہے تم آ گئے! تم یہاں اتنے جلدی کیسے پہنچے؟"

"ہوٹل کا ملازم سو رہا تھا۔ میں نے اس کی سائیکل اٹھائی اور چلا آیا۔ سائیکل پہاڑی کی نشیب میں چھوڑ دی ہے۔ میں نے سوچا میں سیڑھیوں سے ہو کر جلدی پہنچ سکتا ہوں۔"

"اچھا آؤ" وہ بولی۔ اس نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"تم بڑی گھبرائی نظر آ رہی ہو۔"

اس نے اپنا سر ہلایا۔ وہ کچھ نہ بتا سکی۔ اس نے اس کا بازو پکڑا اور تیزی سے کمرے کی طرف چل دی۔

"زیادہ سے زیادہ خاموش رہنے کی کوشش کرو۔" اس نے سرگوشی کی۔ "بالکل مت بولو۔"

وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور وہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ اندر پہنچ کر اس نے قفل لگا لیا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ روشنی کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔ بہرحال اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس نے سوئچ دبایا۔ کمرے کی چھت میں ایک بہت بڑا فانوس لٹک رہا تھا۔ ایک دم تمام کمرہ روشنی سے منور ہو گیا۔ جب رولے کی نظر اس مردہ جسم پر پڑی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ہے معبود" اس کی چیخ نکل گئی۔ اور اس نے اس کی طرف دیکھا

"یہ کیا ہے؟"

"یہ مر گیا ہے۔"

"یہی تو میں دیکھ رہا ہوں۔ مگر..." وہ نیچے جھکا۔ اور اس مرد کی آنکھ کا غلاف اوپر کو اٹھایا اور پھر اپنا ہاتھ اس کے دل پر رکھا۔

"یہ تو بالکل مردہ ہے۔" پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں جکڑا ہوا تھا۔ "اس نے خود ہی گولی ماری ہے۔"

"کیا تم نے سوچا تھا کہ میں نے اسے مارا ہے۔"

"نوکر کہاں ہیں، کیا تم نے پولیس کو بلایا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"مگر تمہیں فوراً بلانا چاہئے۔ اسے یہاں نہیں چھوڑا جا سکتا۔" [illegible] سوچے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے غیر ارادی طور پر اس آدمی کی مٹھی میں سے پستول نکال لیا۔ اور اسے دیکھنے لگا۔

"یہ تو وہی پستول معلوم دیتا ہے جو تم نے مجھے کار میں دکھایا تھا۔"

"وہی ہے۔"

اُس نے اسکی طرف خالی الذہن ہو کر دیکھا۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ بست حال بالکل اچنبا سی ہوئی تھی۔

"اس نے غصہ کیوں چھڑکیا!"

"خدا کے لئے مجھ سے اس وقت سوالات نہ کرو!"

"تمہیں معلوم ہے یہ کون ہے؟"

"نہیں!"

اُس کا رنگ سفید ہو چکا تھا۔ اور وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا وہ بیہوش ہو جائے گی۔

"میری تمہیں خود کو سنبھالنا چاہیئے۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہ تھا۔ ایک لمحہ ٹھہرو۔ میں ڈائننگ روم سے تمہارے لئے کچھ برانڈی لے آتا ہوں۔ کہاں رکھی ہے؟"

وہ جانا چاہتا تھا مگر اس نے اُسے روک لیا۔

"مجھے تنہا نہ چھوڑو۔ مجھے سخت ڈر لگتا ہے۔"

"اچھا تو میرے ساتھ آؤ!" اس نے ایک دم کہا۔

اُس نے اسکے گرد باہیں ڈالیں اور اُسے سہارا دے کر کمرے سے باہر لے آیا۔ ڈائننگ روم میں ایک بتی جل رہی تھی کمرے میں گھس کر اسکی نظر سب سے پہلے اُن دو خالی پلیٹوں پر پڑی۔ دو گلاسوں اور شراب کی بوتل پر پڑی جس میں ان دونوں نے کھایا پیا تھا۔ رونے میز پر پہنچا جس کرسی پر کامل بیٹھا تھا اس کے برابر والی کرسی پر اس کا میلا ہیٹ پڑا ہوا تھا۔ رونے نے اُسے اٹھایا ایک نظر اسکی طرف اور پھر میری کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے آنکھیں نہ ملا سکی۔

"جب تم نے تم سے کہا تھا کہ میں اسے نہیں جانتی تو یہ غلط تھا۔"

"مجھے کہنا چاہیئے کہ واقعی یہ بات صاف ظاہر ہے۔"

"خدا کے لئے بس باتیں نہ کرو رونے میں سخت پریشان ہوں!"

"مجھے افسوس ہے۔" وہ بولا۔ "تو پھر یہ کون ہے؟"

"وہی وائلن بجانے والا، جو ریسٹوران میں ملازم ہے اور جو بیٹھ کے گیا تھا کیا تمہیں یاد نہیں۔"

"میں سوچ رہا تھا میں نے اسے کہیں دیکھا ہے، مگر اسوقت وہ سازندوں کا لباس پہنے تھا۔ اس لئے میں اسے نہ پہچان سکا۔ اور اب وہ مختلف نظر آتا ہے۔ وہ یہاں کیسے پہنچا؟"

"میری بیگی۔"

"جب میں گھر کی طرف آ رہی تھی تو راستے میں اس سے مڈبھیڑ ہو گئی وہ پریشان تھا، مجھے اس پر ترس آ گیا۔"

رونے نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ سخت رنجیدہ ہوا۔ میری دنیا میں آخری عورت تھی جس پر اسے شبہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایسی حرکت کر سکتی ہے۔

"میری میری جان۔ میں تمہارے لئے دنیا میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میں تمہاری پوری پوری مدد کروں گا۔"

"وہ بھوکا تھا۔ میں نے اسے کچھ کھانے کو دیا۔" وہ بولی۔

رونے نے منہ بنایا۔ "تمہارا مطلب ہے اس نے کھانا کھایا اور پھر گولی مار لی؟"

میری رونے لگی۔

"لو کچھ برانڈی پیو! پھر بعد میں رو لینا!"

اُس نے اپنے سر کو جنبش دی۔

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں، اب نہ روؤں گی، میں اب سمجھ گئی ہوں کہ میں نے حماقت کی ہے۔ مگر اسوقت مجھے کچھ پتہ نہ چلا میرا خیال ہے ایک لمحے کے لئے میں دیوانی ہو گئی تھی، تمہیں معلوم ہے۔ میں نے تمہارے کار سے اترنے سے پہلے کیا کہا تھا۔"

وہ فوراً سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے:

"میرا خیال تھا وہ صرف ایک مدہانی مذاق تھا۔ میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تم ایسی احمقانہ حرکت کر بھی سکتی ہو۔ مگر اس نے خودکشی کیوں کیا؟"

"مجھے نہیں معلوم، مجھے نہیں معلوم!"

اُس نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا اور پھر پلیٹوں کو اٹھا کر بڑے میں رکھنے لگا۔

"تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا

"تم نہیں سمجھتیں کہ تمہیں ایسی کوئی علامت گھر میں نہ چھوڑنی چاہیئے جس سے یہ معلوم ہو کہ کوئی اجنبی گھر میں آیا تھا۔ باورچی خانہ کدھر ہے؟"

"دروازہ کے سامنے نیچے زینہ سے اتر کر!"

وہ ٹرے باہر لے گیا۔ جب وہ واپس آیا تو میری اپنا سر پکڑے ہوئے میز پر بیٹھی تھی۔

"خوش قسمتی تھی کہ میں نیچے چلا گیا۔ تم نے تمام بتیاں جلا کر چھوڑ دیں

یقیناً تم اپنے جرائم کو چھپانے کی عادی نہیں معلوم ہوتیں، تمہارے ملازمین نے آٹھ برتن صاف نہ کئے تھے۔ میں نے وہ برتن انہیں میں ملا دیئے، امید ہے کہ انہیں پتہ نہ چلے گا، اب ہمیں پولیس کو بلانا چاہئے۔"

وہ تقریباً چیخ پڑی۔

"رودلے ۔۔۔!"

"میری جان ذرا ہوش میں آؤ، میں نے اس معاملہ پر خوب غور کر لیا ہے۔ اور تم میرا مشورہ سنو، تم کہنا کہ میں سو رہی تھی کہ ایک آدمی کی آہٹ سے جاگ پڑی، جو یقیناً چور تھا۔ اور تمہارے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ تم نے بتی روشن کی اور برابر کی میز سے اس نے پستول اٹھا لیا پھر وہ تم سے لپٹ گیا۔ اور اتفاق سے پستول چل گیا۔ تم نے اسے مارا یا اس نے تمہیں مارا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ جب اس نے یہ محسوس کیا کہ وہ گھر گیا ہے۔ اور تمہاری چیخوں سے نوکر جاگ جائیں گے تو اس نے گولی ماری۔"

"اس کہانی پر کون یقین کرے گا، یہ ناقابل یقین ہے۔"

"بہرحال یہ سچائی کے مقابلہ میں زیادہ قابل یقین ہے، اگر تم اس بات پر جمی رہیں تو کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"نینا نے گولی کی آواز سنی تھی کہ وہ میرے کمرے کے دروازہ تک دریافت حال کے لئے آئی تھی۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں ہے، جب پولیس اس سے پوچھے گی تو وہ یہ بات بتا دے گی، پھر میں کیا کہوں گی، آخر جب میرے کمرہ میں ایک مردہ آدمی پڑا ہوا تھا تو میں نے اسے کہہ دیا کہ کوئی بات نہیں ہے، یہ بالکل مایوس کن بات ہوگی۔"

"آخر تم مجھے تو سچ سچ بتا ہی دو۔"

"یہ سخت ذلیل بات ہے، مگر اس وقت میں سوچ رہی تھی کہ میں کوئی بہت نیک کام کر رہی ہوں۔"

وہ اور زیادہ نہ کہہ سکی اور وہ اس کی طرف نیم نیم انداز میں دیکھنے لگا، اس نے ایک گہری آہ بھری۔

اچھا تو پھر پولیس کو بلاؤ۔ اور معاملہ کو ختم کرو، اس کا مطلب بربادی ہے، مگر میرا خیال ہے کہ میں اسکی مستحق بھی ہوں۔ میں پھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی، سارے اخباروں میں یہ خبر چھپے گی۔ اور ایڈگر کو بھی معلوم ہوگا، اور پھر میری شخصیت ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے گی۔

رودلے نے اسکی طرف غور سے دیکھا۔

"بے شک اس کا مطلب بربادی ہی ہے، اور یہ بدنام کہانی سب میں پھیل جائے گی۔ میری جان تم نے بہت بڑی مصیبت مول لے لی ہے، تمہاری کوئی بھی مدد نہ کر سکے گا، کیا تم ایک خطرہ مول لینے کو تیار ہو؟ میں بتائے دیتا ہوں کہ یہ بہت بڑا خطرہ ہے اور اگر تم اپنے اقدام میں کامیاب نہ ہو سکیں تو اس سے بھی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔"

"میں ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔"

"تو پھر ہمیں نعش کو کہیں اور سرکوانا ہوگا، اس کے بعد کون شبہ کر سکتا ہے کہ اسکی موت کا تم سے کوئی تعلق ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ناممکن ہے۔"

"نہیں بالکل نہیں، اگر تم میری مدد کرو تو ہم اسے موٹر میں ڈال لیں گے۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں پہاڑیاں بہت ہیں ہم نعش کو کسی ایسی جگہ ڈال دیں گے۔ جہاں اسکا مہینوں پتہ نہ چلے گا۔"

"مگر لوگ اس کی تلاش شروع کر دیں گے۔"

"انہیں کیا ضرورت ہے، ایک اطالوی سازندے کی کون پروا کرے گا۔"

"نہیں وہ اطالوی نہ تھا، وہ تو ایک آسٹرین مہاجر تھا۔"

"پھر تو یہ اور بھی بہتر ہے، کسی کو بھی اسکی تلاش نہ ہوگی۔"

"مگر رودلے یہ سخت خطرناک کام ہے، اور کیا تمہیں اپنا خیال نہیں تم کتنا سخت خطرہ مول لے رہے ہو۔"

"مگر میری جان اسکے سوا اور کوئی چارہ نہیں، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے خطرے مول لینے میں مزہ آتا ہے۔"

اس کی باتیں سن کر میری کا دل بند ہونے لگا۔ اسکی پریشانی کم ہو چلی تھی، اس تجویز میں امید کی کرن نظر آتی تھی۔ مگر اسے ایک اور شبہ نے گھیر لیا۔

"مگر اب دن نکلنے والا ہے، دھندلکا ہوتے ہی کسان اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔"

اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

"روشنی کب ہوگی؟ پانچ بجے کے بعد، ابھی ہمارے پاس ایک گھنٹہ ہے، اگر ہم نے مستعدی برتی تو ہم فوراً ایسا کر سکتے ہیں۔"

اس نے گہری سانس لی۔

"میں خود کو تمہارے حوالے کرتی ہوں، میں وہی کرونگی جو تم کہو گے"

"اچھا تو اٹھو، اور خدا کے لئے دل کڑا کر کے کام میں لگو۔"

تب انہوں نے مردہ آدمی کا ہیٹ اٹھایا اور وہ اس کمرے میں آئے۔ جہاں اس کی نعش پڑی ہوئی تھی۔

"تم اس کی ٹانگیں پکڑو" وہ بولا۔ "اور میں اس کی کمر پکڑتا ہوں۔"

انہوں نے اسے اٹھایا۔ اور ہال کمرے میں لے گئے۔ رو لے نے بڑی مشکل سے اسے الٹے پاؤں سیڑھیوں سے نیچے اتارا۔ پھر انہوں نے اس کی نعش نیچے رکھ دی۔

"کیا تم کار یہاں تک لا سکتی ہو؟" رو لے نے کہا۔

"ہاں مگر یہاں واپس موڑنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، مجھے الٹی چلانی پڑے گی۔" میری بے یقینی سے بولی۔

"یہ کام میں کر لوں گا۔" وہ بولا۔

وہ پکی پٹڑی پر کار لینے چل پڑی۔ اسی اثنا میں رو لے مکان کے اندر گیا، سنگ مرمر کے فرش پر خون جما ہوا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے زیادہ نہ تھا۔ کیونکہ آدمی نے گولی اپنے دل پر ماری تھی۔ اور خون اندر ہی جذب ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ غسل خانے میں گیا اور ایک تولیہ کو پانی میں بھگو یا اور اسے فرش پر رگڑا۔ فرش سنگ مرمر کا تھا اور اسے یقین تھا کہ بغیر گہری نظر ڈالے کوئی بھی خون کو محسوس نہ کر سکے گا۔ وہ خون سے بھیگے ہوئے تولئے کو لے کر باہر گیا۔ میری کار کے پاس کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔

رو لے نے موٹر کی پچھلی کھڑکی کھولی، اور پھر اس مردہ آدمی کی بغلوں کے نیچے ہاتھ ڈال دیئے، اس نے اسے اوپر اٹھایا۔ اور میری نے یہ دیکھا کہ اسے سخت زور لگانا پڑ رہا ہے۔ اس کے پاؤں اٹھا لئے، انہوں نے نعش فرش پر لٹا دی۔ اور رو لے نے تولیہ کو اس کے سینہ کے گرد لپیٹ دیا۔ مبادا جھٹکے لگنے سے پھر خون جاری نہ ہو جائے۔ اس نے اس کے ملائم ہیٹ کو اس کے سر پر منڈھ دیا، رو لے گاڑی میں بیٹھ گیا اور اسے صدر دروازہ تک الٹی لے گیا۔ اب یہاں گھمانے کے لئے کافی جگہ تھی،

"کیا میں ہی چلاؤں؟" وہ بولا۔

"ہاں دہنی طرف کو موڑو۔"

"ہمیں جلد از جلد بڑی سڑک سے گزر جانا چاہیئے۔"

"یہاں سے چار پانچ میل دور ایک چھوٹی سی سڑک مڑتی ہے۔ جو ایک پہاڑی پیدا تیج چھوٹے سے گاؤں کی طرف جاتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس سڑک کے بائیں جنگل ہے۔"

جب وہ چوڑی سڑک پہ پہنچ گئے تو رو لے نے گاڑی تیز کر دی۔

"تم بہت تیز چل رہے ہو" میری بولی۔

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے جان من" وہ ترشی سے بولا۔

"مجھے سخت خوف معلوم ہو رہا ہے۔"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں، تم سنبھل بیٹھی رہو۔"

اس کے مزاج میں تلخی تھی وہ خاموش ہو رہا۔ چاند چھپ چکا تھا اور رات تاریک ہو چلی تھی۔ میری رفتار کی سوئیاں نہ دیکھ سکی۔ اس نے اندازہ کیا کہ وہ اسی میل فی گھنٹہ سے کم نہیں جا رہے وہ ہاتھ بھینچے ہوئے بیٹھی تھی۔ وہ بہت زیادہ ڈر رہی تھی۔ مگر اس کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اپنے دل میں بڑبڑا رہی تھی۔

"میں نے کتنی بڑی حماقت کی۔

"اب ہم پانچ میل نکل آئے ہیں۔ کیا وہ موڑ پیچھے تو نہیں چھوٹ گیا؟" وہ بولا۔

"اب ہم جلدی وہاں پہنچنے والے ہیں۔ گاڑی ذرا ہلکی کر لو۔"

وہ چلتے رہے میری اس سڑک کے فکر میں لگ گئی۔ جو اس پہاڑی کی طرف جاتی تھی۔ وہ تین چار مرتبہ اس سڑک پر جا چکی تھی،

"یہ رہی" وہ اچانک بولی۔

مگر رو لے اس سے آگے بڑھ چکا تھا۔ اس نے بریک لگائے اور گاڑی الٹی چلائی پتلی سڑک پہ چڑھ کر وہ آہستہ آہستہ پہاڑی پہ چڑھنے لگے۔ وہ دونوں تاریکی میں اس جنگل کو دیکھنے لگے، مثا میری نے اس کا بازو پکڑا۔ اور بائیں طرف اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی روک دی، سڑک کے ایک طرف چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کا بن کھڑا ہوا تھا اور زمین گھاس کباڑ سے پٹی ہوئی تھی۔ سڑک سے جھاڑیوں کی طرف ایک دم سیدھی گہرائی تھی۔ اس نے گاڑی کی بتیاں گل کر دیں۔

"میں نیچے جاتا ہوں۔ اور جگہ کا معائنہ کرتا ہوں، میرے خیال میں یہ جگہ ٹھیک رہے گی۔"

وہ نیچے اترا۔ اور کباڑ میں داخل ہو گیا، اس تاریکی میں اسکے پاؤں نیچے کباڑ کی آواز بڑی اونچی اور ڈراؤنی معلوم دیتی تھی۔ دو تین منٹ بعد وہ پھر واپس آ گیا۔

میرے خیال میں یہ جگہ بالکل ٹھیک ہے ،" وہ سرگوشی میں بولا ۔ "لڑکی اتنی نشے میں تھی کہ وہاں دُور دُور تک کوئی متنفس نہ تھا ۔ اچھا ذرا اسے باہر نکالنے میں میری مدد کرو ۔ اگر میرے بس کا ہوتا تو خود ہی لے جاتا ۔ تم نیچے نہ جا سکو گی ۔ تمہاری کھال اور کپڑے سب پھٹ جائیں گے ۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں ۔" وہ بولی ۔

"تم اپنے نوکروں سے کیا کہو گی ؟" وہ بولا ۔ "تمہارے کپڑے اور موزے سب پھٹ جائیں گے ، میں تو سب سنبھال لوں گا ۔"

وہ گاڑی سے اُتر گئے اور انہوں نے پچھلی کھڑکی کھولی وہ نعش کو اٹھانے ہی والے تھے کہ انہیں روشنی نظر آئی ، یہ ایک کار کی روشنی تھی جو پہاڑی کی طرف سے نیچے آ رہی تھی ۔

"اُوہ ! اب ہم پکڑے جائیں گے ۔" وہ گھبرائی ، "دوست تم بھاگ جاؤ ، ورنہ تم خواہ مخواہ پھنس جاؤ گے ۔"

"ایسی پاگل باتیں نہ کرو ۔"

"میں تمہیں مصیبت میں تنہا نہ چھوڑوں گا ۔"

وہ رونے لگی ۔

"پاگل نہ بنو ، اگر تم نے خود کو قابو میں رکھا تو سب ٹھیک رہے گا ۔ ہم انہیں دھوکا دے سکتے ہیں ۔"

"نہیں رولے ، اب میری خیر نہیں ۔"

"ٹھہرو ، تمہیں خود کو سنبھالنا ہو گا ۔ چلو گاڑی میں پیچھے بیٹھو ۔"

"مگر وہاں تو نعش رکھی ہے ۔"

"خاموش رہو ۔"

اس نے اُسے اندر دھکیلا ، آنے والی کار کی روشنی ایک موڑ کی وجہ سے چھپ گئی تھی ، مگر اگلے موڑ پر وہ بالکل سامنے آ نکلی تھی ۔

"مجھ سے لپٹ جاؤ ۔ وہ ہمیں آشنا سمجھیں گے ، جو آوارگی کے لئے ایک تنہا جگہ نکل گئے ہیں ۔ مگر بالکل خاموش رہنا ۔ بالکل مت بولنا ۔"

اب کار سامنے آ چکی تھی ۔ دو تین منٹ میں وہ اُن تک پہنچ جائے گی ۔ سڑک بہت پتلی تھی ۔ اور کار اُن کے بالکل برابر سے گزرے گی ۔ بس بالکل اُن کی کار سے رگڑ کر ہی گزرے گی ۔ رولے نے اپنے بازو اس کی کمر میں ڈال دیئے اور اسے خوب چمٹا لیا ۔ اُن کے پاؤں کے نیچے نعش سکڑی ہوئی پڑی تھی ،

"میں تمہارا بوسہ لوں گا ۔ تم بھی میرا بوسہ لینا ، ایسا معلوم ہو جیسے ہم یہاں اسی لئے آئے ہیں ۔"

کار اب قریب تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا وہ بھاگی ہوئی آ رہی ہے ۔ اور پھر انہیں اس میں بیٹھے ہوئے لڑکوں کے قہقہے سنائی دیئے ۔ جو خوب اونچی آواز سے گا رہے تھے ،

"واللہ وہ پیئے ہوئے معلوم دیتے ہیں ، خدا کرے وہ ہمیں دیکھ لیں ، کہیں ایسا نہ ہو نشے میں ہم سے ٹکرا جائیں ، جلدی کرو میرا بوسہ لو ۔"

اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے مگر آنکھ وہ آنے والی کار سے بالکل غافل ہیں اور اپنے مزہ میں وہ کھوئے ہوئے ہیں ۔ گاڑی آدمیوں سے خوب بھری ہوئی تھی اور وہ بہت اونچی آواز سے بول رہے تھے ۔ گویا مردہ بھی جاگ پڑے گا ۔ شاید آس پاس گاؤں میں کوئی تقریب ہوگی ۔ جہاں انہوں نے خوب پی ہوگی اور اب واپس اپنے گھر لوٹ رہے تھے ۔ وہ بیچ سڑک میں آتے ہوئے معلوم دیتے تھے ۔ اور ایسا معلوم دیتا تھا کہ اُن کی گاڑی اُن کی کار سے ٹکرا جائے گی ۔ مگر کیا کیا جا سکتا تھا ۔ اچانک اُن سب کی چیخ نکل پڑی ، موٹر کی بتیاں کھڑی ہوئی کار پر پڑیں ۔ پھر بریکوں کی تیز چنگھاڑ نکلی اور وہ کار آہستہ ہو گئی ۔ معلوم ایسا دیتا تھا ۔ کہ اس غیر متوقع حادثہ سے ڈرائیور ہوش میں آ گیا تھا اور اب وہ بہت آہستہ چل رہا تھا ، اور پھر جب انہوں نے دیکھا کہ کھڑی ہوئی کار میں ایک جوڑا ایک دوسرے سے چمٹا بیٹھا ہے ۔ تو وہ سب ایک ساتھ زور سے ہنسے ، ایک آدمی نے ایک غلیظ جملہ کہا ۔ اور وہ تین آدمی طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے ۔ رولے نے میری کو اپنے بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا کوئی یہ سمجھے کہ وہ محبت کے جوش میں گرد و پیش سے بالکل بے نیاز ہیں ۔ ایک دوسرے آدمی نے ایک بازاری گیت شروع کر دیا ۔ اور پھر سب نے اُسے دہرانا شروع کر دیا ۔ اور سیٹیاں بجانے لگے ۔ انہوں نے کار بہت آہستہ سے برابر سے نکالی ۔ صرف ایک انچ کا بچاؤ تھا ،

"اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دو ۔" رولے نے اس کے کان میں کہا اور جب اُن کی کار اُن کے برابر سے گزری تو اس نے خوشی سے اپنا ہاتھ گاڑی میں بیٹھے ہوئے شرابیوں کی طرف ہلایا ۔ "خوش رہو ، شاباش خوب موج کرو ۔" وہ چیخنے لگے ، اور پھر انہوں نے وہی بازاری گیت گانا شروع کر دیا ۔ پھر اُن کی آوازیں دُور ہوتی گئیں ،

اس وقت رولے نے اپنے بازو علیحدہ کئے اور پھر میری کار کے کونے میں وحشت زدہ سی ہو کر بیٹھ گئی ۔

"ہم نے اس وقت بالکل ٹھیک کیا۔" روڈے نے کہا۔ "تحقیقات کرنے والوں کو کوئی نہیں روکتا، اچھا اب ہمیں اپنا کام جلد ختم کرنا چاہیئے۔"

"کیا یہ جگہ محفوظ ہے؟ اگر نعش اسی جگہ ملی تو . . . ."

"کوئی بات نہیں، ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ کوئی دوسری جگہ تلاش کریں۔ آؤ وہ پیچھے جھاڑیوں ... یہاں ہی ہم کو صبح کرے گا، سب ہی کہیں ... اس نے حرکت کی ہے۔ ... پیچھے ہٹو۔"

"مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں کھڑی بھی ہو سکوں۔"

"مگر تمہیں اسے نکالنے میں میری مدد کرنی ہوگی، اس کے بعد تم پھر بیٹھ جانا۔"

وہ باہر نکلا اور اسے بھی کھینچا۔ ... فٹ پیرل پر پہنچ کر وہ بے تاب ہو کر رونے لگی، اس نے اس کا بازو پکڑا۔ اور ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا، وہ اتنی گھبرائی کہ ایک دم اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی اور رونا بند کر دیا، اس کے منہ سے آہ تک بھی نہ نکلی۔

"اب میری مدد کرو۔"

بغیر ایک لفظ کہے انہوں نے نعش کو باہر نکالا۔ روڈے نے اسے بغلوں کے نیچے سے پکڑ رکھا تھا۔

"اب اس کی ٹانگیں میرے دوسرے بازو پر رکھ دو، اس میں بہت ہی بوجھ ہے۔ اچھا ان جھاڑیوں کو ایک طرف کرو تاکہ میں بآسانی گزر سکوں۔"

اس نے وہی کیا جو کہا گیا تھا۔ اور پھر وہ ایکدم گہرائی میں اتر گیا۔ اس کے گرنے سے اتنے زور کی آواز نکلی جس نے تمام فضا کو چونکا دیا، جتنی دیر وہ نظروں سے اوجھل رہا اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وقت لامحدود ہو گیا ہے۔ آخر اس نے اسے اوپر آتے ہوئے دیکھا

"میں نے سوچا تھا جس راستہ سے میں گیا ہوں اس سے واپس نہ لوٹوں گا۔"

"سب ٹھیک ہو گیا؟" وہ پوچھنے لگی۔

"میرا خیال ہے۔ خدا کی قسم میں سخت تھک گیا ہوں، بغیر شراب کے میں اتنا کام نہ کر سکتا تھا۔"

اس نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ "اب تم جتنا چاہو رو سکتی ہو۔"
وہ کچھ نہ بولی اور وہ دونوں کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں یہاں کار نہیں رکھ سکوں گا، اس کے علاوہ ہم کوئی ایسا نشان نہیں چھوڑنا چاہتے جس سے یہ معلوم ہو کہ ایک کار یہاں تک آئی اور واپس ہو گئی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ آگے کوئی ایسی سڑک ہے جس سے گھوم کر ہم بڑی سڑک پر پہنچ جائیں؟"

"میرا خیال ہے صرف یہی ایک سڑک ہے، یہ سڑک کرموٹ گاؤں میں جا کر ختم ہو جائے گی۔"

تھوڑی دور وہ خاموشی سے چلتے رہے۔

"تولیہ ابھی تک کار میں پڑا ہے۔"

"میں اسے ساتھ لیجا کر کہیں دور پھینک دوں گا۔"

"مگر اس پر ہالکان ہوٹل کا نام کڑھا ہوا ہے۔"

"تم اس کی پرواہ نہ کرو۔ میں اس میں ایک بھاری پتھر باندھ کر دریا میں پھینک دوں گا۔"

ایک دو میل کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سڑک کچھ زیادہ چوڑی تھی۔ اور گاڑی بمشکل گھمائی جا سکتی تھی۔ روڈے نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا۔

"ارے! وہ چیٹا پستول تو . . ."

"کیا؟ وہ تو میرے کمرے میں ہی رہ گیا ہے۔"

"اگر لوگوں نے اسے بغیر پستول کے دیکھا تو وہ طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ہمیں پستول اس کے برابر میں رکھنا چاہیئے تھا۔"

"اب کیا کیا جائے؟" وہ بولی

"خدا کا شکر کرو کہ وہ ابھی تک ہمارے پاس ہی ہے، اگر نعش بغیر پستول کے ملی تو پولیس سوچے گی کہ کوئی آدمی یہاں آیا اور پستول اٹھا کر چلتا بنا۔"

وہ جس تیزی سے آئے تھے اتنی ہی تیزی سے واپس چل دیئے کبھی کبھی روڈے آسمان کی طرف رات کا اندازہ کرنے کے لئے دیکھ لیتا۔ ابھی رات باقی تھی، مگر تاریکی اب زیادہ نہ رہی تھی۔ ابھی دن نہ نکلا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دن نکلنے ہی والا ہے، اطالوی کسان بہت سویرے کھیتوں کو چل دیتے تھے۔ اور روڈے میری کو جلد از جلد بنگلے پر چھوڑنا چاہتا تھا۔ آخر وہ اس پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے جس پر بنگلہ واقع تھا۔ صبح کاذب ہونے ہی والی تھی۔

"اچھا اب تم موٹر چلاؤ، میں نے سائیکل یہیں چھوڑنی تھی۔"
اُس نے اُسکی بے جان مسکراہٹ دیکھی، وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی، اُس نے اُس کے کندھے کو تھپکا۔

"بس سب ٹھیک ہے۔ گھبراؤ مت، اور دیکھو دو خواب آور گولیاں کھا لینا۔ جاگنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، گہری نیند کے بعد تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اب میں کبھی نہ سو سکوں گی۔"

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ خواب آور گولیاں کھا لینا۔ میں دن میں کسی وقت تمہارے پاس آؤں گا۔"

"میں تمام دن گھر پر ہی رہوں گی۔ اور اگر کسی نے پوچھا تو کہہ دوں گی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں تمہیں ایسا نہ کہنا چاہیئے، تمہیں ایسا ظاہر کرنا چاہیئے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی، یہ ایک معمولی بات ہے۔ فرض کرو کسی نے تم پر شک کیا تو تم اپنے رویے سے بالکل اس کا اظہار نہ کرنا۔ سمجھیں!"

"ٹھیک ہے۔"

میری اسٹیرنگ وہیل پر بیٹھ گئی اور روے کو سائیکل اٹھاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ جب وہ چلا گیا تو وہ بنگلے کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس نے کار گیرج میں کھڑی کی جو دروازہ کے پاس ہی بنا ہوا تھا، اور پھر پچھلی سے گھر کی طرف چلدی۔ وہ اپنے کمرہ میں پہنچی اور ایک لمحہ کے لئے جھجکی۔ اُسے توہمات نے گھیر رکھا تھا کہ دروازہ کھولتے ہی اُسکا بھوت اُسکی چمٹ پڑے گا، ہر چند وہ خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ایک انجانا سا خوف اس پر حاوی تھا، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے دروازہ کھولا۔ اور جلدی سے بتی روشن کی۔ اور جب دیکھا کہ کمرہ خالی ہے تو اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے مسہری کے پہلو میں رکھی ہوئی گھڑی کو دیکھا، ایک بجنے نہ بجے تھے۔ اس تھوڑے سے وقفہ میں کیسے خطرناک واقعات گزر چکے تھے۔ چند گھنٹے کی زندگی کو خریدنے کے لئے وہ دنیا کی مہنگی سے مہنگی چیز دے سکتی تھی کاش وہ پہلی جیسی باعزت اور آزاد عورت بن سکتی۔ آنسو اسکے رخساروں پر بہنے لگے۔ وہ بری طرح تھکی ہوئی تھی اور اُس کی کنپٹیوں کی رگیں پھڑک رہی تھیں۔ اُسے سارے واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے، اُس نے آہستہ آہستہ کپڑے بدلنے شروع کر دیئے۔

وہ اُس بستر پر لیٹنا نہ چاہتی تھی مگر اس کے علاوہ دوسرا حل نہ تھا۔ اُسے اس بنگلہ میں ابھی کئی دن اور ٹھہرنا تھا۔ روے اُسے بتائے گا کہ یہاں سے جانا کب مناسب ہوگا۔ اگر وہ ایڈگراور اپنی منگنی کا اعلان کر دے گی تو اس پر کسی کو شک نہ ہوگا۔ کہ وہ غلط نمبر میں اپنے طے شدہ پروگرام سے زیادہ کیوں نہ ٹھہر سکی۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ ہندوستان کب روانہ ہوگا۔ مگر غالباً جلد ہو جائے گا۔ وہاں پہنچکر وہ بالکل محفوظ ہو جائے گی۔

جوں ہی بستر پر وہ لیٹ رہی تھی، اُسے وہ برتن یاد آگئے جو روے نے باورچی خانہ میں رکھ دیئے تھے۔ اس کے کہنے کے باوجود اس کا دل نہ مانا، اور وہ خود جا کر اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی، اگر کسی نوکر نے اُسے دیکھ لیا تو وہ کہدے گی کہ اُسکی آنکھ بھوک سے کھل گئی اور وہ کچھ کھانے کے لئے یہاں چلی آئی۔ اس نے اپنا گاؤن پہنا اور ڈرائینگ روم سے ہو کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ سارا گھر خاموشی اور ویران معلوم دے رہا تھا اور باورچی خانہ کسی غار کی طرح عجیب لگ رہا تھا اس نے گوشت کو میز پر رکھا ہوا دیکھا اور اُسے اٹھا کر الماری میں رکھدیا۔ اس نے انڈوں کے خول ٹب میں پھینکدیئے۔ اور وہ پلیٹیں اور گلاس جن میں اُس نے اور اُس مردہ آدمی نے کھایا پیا تھا۔ دھو کر صاف کئے اور انہیں پہلی والی جگہ پر رکھدیا۔ فرائی پین کو اسکی کیل پر لٹکا دیا۔ اب وہاں کوئی ایسی علامت نہ تھی جو کسی قسم کا شک پیدا کرتی۔ اس نے خواب آور دوا کھائی اور واپس اپنی خوابگاہ میں آگئی۔ خواب آور گولیوں نے اسکی اُمید کے خلاف کوئی جلد اثر نہ کیا۔ اور اُسے ایسے لگا جیسے اس کا سر پھٹ جائے گا۔ مگر پھر تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند میں کھو گئی۔

۵

جب میری کی آنکھ کھلی تو اس نے نینا کو باہر میں کھڑے ہوئے دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے غنودگی کی حالت میں پوچھا۔

"سرکار آپ بہت دیر تک سوتی ہیں۔ سرکار کو ایک بجے لنچ پر جانا تھا اور اب بارہ بج رہے ہیں۔"

میری کو یاد آگیا، اب وہ پوری طرح جاگ چکی تھی اُس نے ملازمہ کی طرف دیکھا، وہ بدستور شفقت سے مسکرا رہی تھی۔ میری نے

اچھے دوست بن گئے۔

"جب تم نے مجھے جگایا تو میں پھر سو نہ سکی۔ اور باقی رات جاگ کر گزارنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے اپنی خواب آور گولیاں کھا لی تھیں۔"

"حضور مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو جگایا۔ مگر میں نے آواز سنی تھی اور مناسب سمجھا کہ حضور کی خیریت دریافت کر لوں۔"

"کس قسم کی آواز تھی؟"

"گولی چلنے کی سی۔ مجھے اس پستول کا خیال آگیا جو سرکار نے آپ کو دیا تھا۔ اور مجھے خوف سا لگا۔"

"کسی کار کی آواز ہوگی۔ رات میں دور کی آواز بھی پاس کی معلوم دیتی تھی۔ مجھے ایک پیالی چائے لا دو۔ پھر میں نہاؤں گی۔ جاؤ ذرا جلدی کرو۔"

جونہی مینا کمرے سے باہر گئی میری لپک کر اس الماری کے پاس پہنچی جہاں اس نے پستول رکھ دیا تھا، ایک لمحہ کے لئے اسے شک ہوا کہ مبادا مینا نے پستول نہ دیکھ لیا ہو اور اسے کہیں اور رکھ دیا ہو۔ اس کا شوہر سیمور اسے بتا دے گا کہ ایک کارتوس چل چکا ہے، وہ کوئی آج سے پہلے کچھ سوچنے لگی۔ وہ سمجھ گئی کہ رولے نے اس سے کیوں اصرار کیا تھا کہ وہ لنچ پارٹی میں ضرور جائے۔ وہ خود کو اس کا بہت شکر گزار محسوس کرنے لگی، وہ کس قدر مطمئن تھا، اس نے کس قدر اطمینان سے یہ کام سرانجام دیا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ اس اوباش آدمی میں ایسی صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ جس وقت وہ شرابی لنگڑا برابر سے گزر رہے تھے اگر اس وقت وہ حاضر دماغی کا ثبوت نہ دیتا تو کیا حشر ہوتا۔ اس نے ایک آہ بھری۔ شاید وہ سوسائٹی کا ایک بدنام آدمی ہے۔ مگر وہ ایک ہمدرد دوست ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

جب میری چائے پی چکی اور غسل کر کے سنگار دان کے سامنے بال بنانے لگی تو اس نے خود کو مطمئن محسوس کیا۔ یہ تعجب خیز بات محسوس ہوتی تھی کہ اتنے اہم واقعات سے گزرنے کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ اس کے چہرہ پر ان تمام خطروں اور مصیبتوں کی کوئی علامت نہ تھی۔ وہ خود کو بالکل چاق چوبند محسوس کرتی تھی۔ اس کی زعفران رنگ کی جلد پر کسی تھکاوٹ کے آثار باقی نہ بچے تھے۔ اس کے بال چمکیلے اور آنکھیں مسرور تھیں۔ اس نے خود کو ایک عجیب کیفیت میں ڈوبا ہوا پایا۔ وہ اس پارٹی کے متعلق سوچ رہی تھی جہاں اسے خوش اخلاقی اور لطیف طبعی کا ثبوت دینا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ اس کے آنے کے بعد لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ آج میری بہت زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہ رولے سے یہ پوچھنا بھول گئی تھی کہ وہ بھی پارٹی میں آئے گا یا نہیں۔ اسے امید تھی کہ وہ بھی وہاں ملے گا۔ اسکی وجہ سے اس میں اعتماد اور زیادہ آ جائے گا۔

اب وہ جانے کے لئے تیار تھی۔ اس نے آئینہ میں اپنے اوپر ایک آخری نظر ڈالی۔ مینا نے اسے پسندیدہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

"سرکار آج ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہیں۔"

"مینا تمہیں میرے نفس کو اتنا نہ بہکانا چاہیئے۔"

"مگر سرکار میں سچ کہہ رہی ہوں، ہلکی نیند نے آپ کو بہت تر و تازہ کر دیا ہے۔ آپ تو لڑکی معلوم دیتی ہیں۔"

جن لوگوں کے پاس یہاں لنچ پارٹی میں جانا تھا وہ ایک امریکی جوڑا تھا جو پچھلے بیس سال سے لندن میں مقیم تھا۔ ان کا بنگلہ بھی بہت حسین تھا اور اس میں بھی دیواروں پر اعلے تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ اس میں بہت قیمتی فرنیچر سجا ہوا تھا۔ یہ امریکی جوڑا بہت متواضع اور حساس تھا اور دونوں میاں بیوی اکثر پارٹیاں دیتے رہتے تھے۔ جب میری کو ڈرائنگ روم میں پہنچایا گیا تو بہت سے مہمان پیشتر سے پہنچ چکے تھے۔ وہ ملازم باہر کھڑے ہوئے مہمانوں کو کاک ٹیل پیش کر رہے تھے۔ عورتیں پیرس کے سلے ہوئے قیمتی لباسوں میں خوبصورت نظر آ رہی تھیں اور مرد اپنے ٹھنڈے سوٹوں میں ملبوس عورتوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان کے باہر باغیچہ میں بڑے بڑے مجسمے اور پھولوں سے بھرے گملے عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ جون کی اس گرم دوپہر میں ہر شخص کے اندر ایسی زندہ دلی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جو طرح طرح کی خوش گپیوں اور لطیفوں کو دعوت دیتی ہے۔ وہاں پہنچکر یہ احساس ہوتا تھا کہ ہر آدمی فارغ البال ہے۔ وہ زندگی کا مقصد ہی خوش رہنا ہے۔ یہاں کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر یہ باور کرنا مشکل تھا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔

میری جب کمرہ میں داخل ہوئی تھی تو اسے وہاں کے ماحول کا کچھ طرح اندازہ تھا۔ مگر اچانک اس کا دل بیٹھنے لگا، جیسے کوئی گھنی چھاؤں کے بعد چلچلاتی دھوپ میں پہنچ جائے۔ وہ غریب لڑکا ابھی تک تہ خانے میں مرا پڑا ہوگا، معاً اسکی نظر رولے پر پڑی جو کمرہ میں دوسرے سرے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اسکی نصیحت یاد آگئی۔ وہ اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اُس کا میزبان ایک ادھیڑ عمر کا امریکی تھا۔ جسے خوبصورت عورتوں سے بات چیت کرنے میں مزا آتا تھا، اور وہ میری سے پدرانہ محبت کرتا تھا۔
وہ ابھی تک اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا، اتنے میں روبے آ گیا۔

"میں اس لڑکی سے کہہ رہا تھا کہ وہ تصویر سے بھی زیادہ حسین ہے" امریکی میزبان نے روبے کی طرف مڑ کر کہا۔

"دوست تم اس پر اپنا وقت فضول خراب کر رہے ہو" روبے طویل مسکراہٹ کے بعد بولا۔ "تم کسی تصویر کی ہی تعریف کرو۔"

"کیا تم اس کے گرویدہ ہو گئے ہو؟"

"بے شک۔"

"بات یہ ہے جناب والا"۔ اُس نے میزبان کو خطاب کر کے کہا۔ "مجھے لڑکے بالکل پسند نہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ پچاس سال کی عمر تک کا کوئی آدمی بھی لڑکیوں سے میل جول کے لئے ٹھیک نہیں۔"

"ہمیں کسی وقت مل جل کر اس مسئلہ کو حل کرنا پڑیگا" میزبان بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمارے خیالات بہت حد تک مشترک ہیں"

پھر وہ ایک دوسرے مہمان کی طرف مصافحہ کے لئے بڑھا۔

"تم پر تو آج بڑا رنگ آیا ہوا ہے" روبے نے دبی آواز میں کہا۔

اسکی پسندیدہ نظروں نے اسکی ہمت بڑھائی۔ مگر پھر بھی اُس نے اسکی طرف کچھ خوفزدہ ہو کر دیکھا۔

"بالکل مت گھبراؤ۔ خود کو ایک ایسی اداکارہ سمجھو جسے ایک پارٹ ادا کرنا ہے۔"

"لیکن تمہیں بتا چکی ہوں کہ اداکاری کا ہنر مجھے کبھی نہیں آیا" اُس نے مسکراہٹ کر جواب دیا۔

"اگر تم عورت ہو تو ضرور اداکاری کر سکتی ہو۔"

اور واقعی اُس نے اس عصرانہ میں یہی کیا بھی۔ عصرانہ جلد شروع ہو گیا۔ اس کے داہنی طرف اس کا میزبان بیٹھا ہوا تھا جس سے وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور اس کے بائیں طرف جرالڈ [illegible] بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ بھی وہ آرٹ کے متعلق بڑی دلچسپی سے باتیں کرتی رہی۔

فلورنس کی اونچی سوسائٹی کے لوگ زیادہ تر تھے۔ اور اس عصرانہ میں بیشتر وہی لوگ تھے جو سارے ریسٹوران میں مدعو تھے۔ شہزادی سان [illegible] جس کی دعوت میں اسکی میزبان تھی، امریکی میزبان کے داہنی طرف بیٹھی ہوئی تھی، اسکی موجودگی سے میری کچھ پریشان سی تھی۔ بوڑھی شہزادی میز پر جھک کر میری سے مخاطب ہوئی۔

"میں آپ سے رات کا ذکر کر رہی تھی"۔ اُس نے امریکی میزبان کو مخاطب کیا۔ "میں نے کچھ دوستوں کو ایک ہنگری کا گانا سننے کے لئے ریسٹوران میں دعوت دی تھی۔ مگر وہ بیمار تھا۔"

"میں نے اسکا گانا سنا ہے۔ میری بیوی اس کی بہت تعریف کرتی ہے" امریکی میزبان بولا۔

"بجائے اس کے انہوں نے ایک وائلن بجانے والے کو بلا لیا تھا مجھے بتایا گیا کہ وہ ایک جرمن مہاجر ہے اور صرف اسکی امداد کے لئے انہوں نے اُسے وائلن بجانے کا موقع دیا تھا۔ اب وہ اُسے ملازمت میں کام نہ دینگے، میری تمہیں یاد ہے نا وہ لڑکا؟ وائلن بجانا تو آتا ہی نہیں۔"

"واقعی وہ اچھی وائلن نہ بجاتا تھا" میری بولی

"اس نے سوچا کہ اس کی آواز دوسروں کو بھی ایسی ہی تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے جیسے خود اس کو ہوتی ہے"

"یہ کہنا تو کم ہے" وہ بولی۔ "اگر میں اسکی طرح وائلن بجاتی تو اپنے کو گولی مار لیتی۔"

میری نے سوچا وہ کچھ بولے۔ اُس نے اپنے کندھوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"ایسے پریشان حال لوگوں کو کام ملنا بہت مشکل ہے"

"آہ بیچارہ" امریکی میزبان بولا۔ "جوان لڑکا ہی تھا نا وہ"

"ہاں! ابھی عمر ہی کیا ہے بیچارے کی" شہزادی نے جواب دیا۔ "اُس کا سر بڑا عجیب ہے نا میری؟"

"میں نے اُسے غور سے نہیں دیکھا" وہ بولی۔ "میرا خیال ہے وہ اُن کپڑوں میں عجیب سا لگ رہا تھا"

"مجھے خبر نہ تھی کہ وہ مہاجر ہے۔ اب مجھے اُس پر ترس آ رہا ہے، مجھے افسوس ہے کہ میں اُسکے ہاتھ پیچھے پڑ گئی کہ ریسٹوران والے نے اُسے کام سے علیحدہ کر دیا، پتہ نہیں کہ وہ مجھے کہیں مل سکے گا یا نہیں، میں اُسے سو دو سو روپے دینا چاہتی ہوں تاکہ وہ نوکری ملنے تک اپنا وقت نکال سکے" شہزادی کہہ رہی تھی۔

وہ اس کے متعلق بے تکلف باتیں کرنے لگے۔ میری نے روبے کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھا۔ مگر وہ میز کے دوسرے سرے پر تھا اور نظر سے اوجھل تھا۔ اُسے صورت حال کا تنہا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ [illegible]

ٹھنڈا سرد ہو چکا ہے۔ میری صحت کی ہو گئی تھی، وہ ایک موضوع کے بعد دوسرے موضوع پر گفتگو کرتی رہی مگر تمام وقت اس کے ذہن کے پیش نظر یہی بات تھی ایک ایسا معاملہ ہے جسے بعد میں طے کرنا ہے۔ آخر میں جب وہ وہاں سے چلنے لگی تو اس نے شکریہ ادا کیا،

"شکریہ! صحت بہت ہی کامیاب رہی، مجھے یقین ہے تمہارا اس سے زیادہ کسی اور صحت میں کبھی مزہ آیا ہو۔"

میری نے اس کا ہاتھ زور سے دبایا۔

"شکریہ آپ کی صحت اور ہاں جس پارٹی میں آپ جیسی حسین عورتیں ہوں گی وہ تو کامیاب رہے گی۔ میرا شوہر بڑا نکتہ چیں مزاج آدمی ہے آپ کسی بات کا خیال نہ کیجئے گا۔"

"نہیں وہ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آئے۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم ہم سے جلد جدا ہونے والی ہو؟"

اس کے لہجے سے میری کو اندازہ ہوا کہ اس کا مطلب ایڈگر سے ہے شاید شہزادی نے اسے کچھ بتا دیا ہے۔

"کون جانے۔"

"میرا خیال ہے جو کچھ میں نے سنا ہے وہ سچ ہے، میں ایڈگر کو خوب پہچانتی ہوں۔ تم ایک نیک اور خوبصورت عورت ہو، خدا تمہیں خوش رکھے گا۔"

میری نے اپنی آنکھوں میں ابھرتے ہوئے آنسوؤں کو بمشکل ضبط کیا۔ اس کے چہرہ پر ایک مایوس مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ فوراً رخصت ہو گئی۔

——— ۶ ———

جب وہ گھر پہنچی تو ایک تار جو تھوڑی دیر پہلے آیا تھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"کل واپس پرواز کر رہا ہے —— ایڈگر!"

باغیچہ میں ایک اور چبوترہ بھی تھا۔ اور میری اسے بھی بہت عزیز رکھتی تھی، اس میں ایک چھوٹا سا گول لان تھا جسے سرو کے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ ایک حصہ، جدھر سے منظر کا نظارہ ہو سکتا تھا، خالی تھا، یہاں سے فلورنس نہیں بلکہ ایک گاؤں نظر آتا تھا۔ جو ایک پہاڑی پر بنا ہوا تھا جس پر زیتون کے درخت اگے ہوئے تھے، اس پر بنے ہوئے مکانوں کی چھتیں سرخ تھیں۔ یہ حصہ ایک گوشے میں تھا اور خوشگوار حد تک سرد تھی۔ میری کو یہاں بیٹھ کر بڑا سکون حاصل ہوتا تھا۔ تنہائی کا حاصل ہونا بڑا فیض بخش تھا، اب وہ اپنے پسندیدہ خیالات میں غرق ہو سکتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد نینا اس کے لئے چائے لے آئی۔ میری نے اسے بتایا کہ راؤلے آنے والا ہے۔

"جب وہ آ جائے تو کچھ برف، سوڈا اور وہسکی دے جانا!"

"بہت اچھا سرکار۔"

نینا ایک نوجوان عورت تھی جسے باتیں کرنے کا شوق تھا اور میری کو ایک نئی خبر سنانا چاہتی تھی۔

"حضور، پادری کہہ رہے تھے کہ اس کے رشتہ داروں نے ایک مہاجر کو ایک جھونپڑی کرائے پر دے رکھی تھی مگر وہ کل سے غائب ہے۔ وہ بے چارے غریب لوگ ہیں اتنا بڑا نقصان کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ اس کے پاس سوائے جسم کے کپڑوں کے اور کوئی سامان نہ تھا جو کچھ تھوڑا بہت سامان ہے بھی تو وہ پانچ روپے سے زیادہ کا نہ ہوگا، انہوں نے تین ہفتے سے اس سے کرایہ نہ مانگا تھا کیونکہ اس کی حالت سقیم تھی۔ مگر اب وہ روپیہ لے کر بھاگ گیا ہے نا اوچھی بات۔ مگر انہیں عقل آ گئی ہے اب وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں نیکی کرنے سے کتنا نقصان ہوتا ہے۔"

"وہ کب بھاگا؟" میری نے پوچھا۔

"وہ کل رات ایک ریسٹوران میں وائلن بجانے گیا تھا، اسی ریسٹوران میں جہاں رات سرکار کی دعوت تھی۔ وہ کہہ گیا تھا کہ وہاں سے پیسے ملیں گے اور وہ کرایہ ادا کر دے گا، مگر وہ واپس نہیں آیا۔ انہوں نے ریسٹوران جا کر معلوم بھی کیا۔ مگر وہاں کچھ پتہ نہ چلا۔ ریسٹوران والوں نے بتایا کہ اسے کام سے ہٹا دیا گیا ہے، اگر اس کے پاس رات کافی روپے تھے۔ صرف ایک ہی عورت نے ہی سو روپے کا نوٹ دیا تھا!"

میری نے اس کی بات کاٹی اور کچھ اور سننا چاہتی تھی۔

"پادری سے پوچھو اس جابر پر کتنے روپے چڑھے ہوئے تھے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی غریب آدمی اس طرح ستایا جائے۔ سارا کرایہ میں ادا کروں گی۔"

"حضور آپ کی بہت بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ لوگ بہت ہی غریب ہیں، وہ کھانا بھی ان کے ذمے ہی کھاتا تھا اور حضور کو معلوم ہے آجکل

کتنی مہنگائی ہے! انہیں جنگ کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے!"

"میں ضرور دعا کروں گی۔ اچھا اب تم جا سکتی ہو۔"

یہ دن میں دوسرا موقع تھا کہ اُسے مردہ آدمی کا تذکرہ سننا پڑ رہا تھا۔ میری پر خوف طاری ہو گیا تھا، جس پریشان حال آدمی کی زندگی میں کوئی پرواہ نہ کرتا تھا۔ اب ہر شخص اسی کی فکر میں لگ گیا ہے۔ گویا کہ وہ مرنے کے بعد ہر آدمی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہا ہے، اسے شہزادی کا ایک جملہ یاد آ گیا۔ اُس نے کہا تھا کہ چونکہ اس کا کام اسی کی وجہ سے چھوٹا ہے۔ اب وہ اسے تلاش کرے گی اور اُسکی کچھ مدد کرے گی اور وہ ایک ضدی عورت تھی، اگر وہ اُسے نہ پا سکی تو زمین آسمان کا کونہ کونہ چھان مارے گی۔ "مجھے یہاں سے چل دینا چاہیئے، مجھے بہت خوف معلوم دیتا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

کاش روبے جلد آ جائے، اس وقت وہی اس کا واحد سہارا تھا۔ ایڈگر کا تار اُس کے پرس میں تھا۔ اُس نے اُسے نکالا اور ایک مرتبہ دوبارہ پڑھا۔ بس بھاگنے کی یہی ایک صورت تھی، وہ انہاک سے سوچنے لگی۔ بالآخر اس نے اپنا نام پکارتے ہوئے سُنا،

"میری!"

یہ روبے کی آواز تھی، وہ ہال کے دوسری طرف سے آ رہا تھا، اس نے اپنے ہاتھ جیبوں میں ٹھونس رکھے تھے، اور نہایت اطمینان سے آ رہا تھا۔ اسکی اس بے نیازانہ چال میں کوئی آدمی بھی اُسے ایک بدنام آدمی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس چال سے میری بہت متاثر ہوئی، وہ ضرورت سے زیادہ متفکر تھی۔

"نینا نے مجھے بتایا کہ تم یہاں بیٹھی ہوئی ہو، وہ کچھ مشروب لا رہی ہے اور میرا دل بھی یہی چاہ رہا تھا۔ خدا کی قسم تمہارے بنگلہ کی بلندی پر چڑھنا تھکا دیتا ہے۔" اس نے اسکی طرف غور سے دیکھا۔

"کیا بات ہے، تم کچھ پریشان سی ہو؟"

"ذرا ٹھہرو! نینا کو چلی جانے دو۔"

وہ بیٹھ گیا اور ایک سگریٹ سلگائی، جب نینا آئی تو اُس نے اُس سے خفا خفا کہا۔

"نینا تمہارا خدا تو کہتا ہے کہ ہر اطالوی عورت کو زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے چاہئیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے تم اس فرض میں کوتاہی کر رہی ہو۔"

"میرے یہاں آجکل تو اپنا پیٹ پالنا بھی مشکل ہے، آدھی درجن بچوں کو کون کھلا سکتا ہے؟"

جب وہ چلی گئی تو وہ میری کی طرف مخاطب ہوا۔

"اب کہو کیا بات ہے؟"

اُس نے اُسے عمرانہ والی بات بتائی جو شہزادی نے مٹر رینے کے متعلق کہی تھی، اور جو کچھ نینا نے ابھی کہا تھا وہ بھی۔ روبے غور سے سنتا رہا،

"مگر میری جان ان ساری باتوں میں کوئی بات بھی تشویشناک نہیں ہے۔ تم بہت شکی عورت ہو۔ ابھی لوگ یہی سوچیں گے کہ اس نے خودکشی کر لی، اُس کی نوکری چھوٹ گئی تھی، اس پر مالک مکان کا قرض تھا، اور اس نے ادا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا مگر اس کے پاس روپے نہ تھے، فرض کرو اسکی نعش مل بھی گئی تو یہی سمجھا جائے گا کہ اُس نے گولی مار لی اور اس کے بہت سے وجوہ ہو سکتے ہیں۔"

جو کچھ روبے کہہ رہا تھا وہ یقیناً معقول لگتا تھا، میری نے مسکرا کر ایک آہ بھری۔

"میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔ بے شک مجھے وہم ہو گیا ہے۔ مگر میں تمہاری بغیر سبب گھبراتی ہوں۔"

"میں نہیں سمجھ سکتا کیوں؟"

"اگر ہم رات پکڑے جاتے تو پتہ نہیں ہمارا کیا حشر ہوتا؟"

"جو کچھ بھی مصیبت آتی خیر مقدم کرتے۔"

میری نے گہرا سانس لیا۔

"کیا ہم جیل میں نہ جاتے؟"

اُس نے اسکی طرف طنزیہ مسکراہٹ سے دیکھا۔

"اگر نوبت یہاں تک پہنچتی تو ہماری پہلی خیر نہ تھی۔ مقتول کیپ کا ایک نعش کو رات کی تاریکی میں لئے لئے گھومنا کیا معنی رکھ سکتا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا ہم انہیں کیسے یقین دلاتے کہ اس نے خود گولی ماری ہے، ہم میں سے کسی ایک نے ضرور گولی ماری ہے۔"

"تم کیوں مارتے؟"

"پولیس والوں کو اس میں بہت سے شکوک پیدا ہو سکتے تھے، ہم دونوں ریسٹوران سے رات ساتھ ساتھ گئے تھے، لوگ کہتے ہیں کہ عورت کے معاملے میں میں بہت بدنام ہوں تم اپنی صنف میں غیر معمولی ممتاز ہو

بصورت جب ہم یہ ثابت کر سکتے تھے کہ ہمارے درمیان کوئی
تعلق نہ تھا، ہوسکتا تھا کہ میں نے آپ کے تمہارے کمرے میں دیکھا ہو
اور ... سے شک کرلیا ہو! اس نے ہمیں ایک ساتھ دیکھ
لیا ہو اور میں نے اسے تمہاری جرأت بچانے کی خاطر مار دیا ہو۔ آخر
دنیا میں ایسے حادثات ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

"تم نے ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔"

"اس کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"میں بات اتنی چاہتی تھی کہ تمہارا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ مگر
میں تمہاری بڑی احسان مند ہوں۔ وہ لوگ تم نے میرے ساتھ بہت بڑی
ہمدردی کی ہے۔ اگر تم میری مدد نہ کرتے تو شاید میں خودکشی کر لیتی۔ آج
تک کسی نے مجھ سے اتنی ہمدردی کی ہے۔ جو تم نے میری خاطر اتنا بڑا
خطرہ مول لے لیا۔"

اس نے ایک لمحہ کے لئے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر فلسفیانہ
انداز میں مسکرا دیا۔

"میری جان میں کسی آدمی کے لئے بھی ایسا کر سکتا تھا اگر کوئی دیکھ
ہوتا تو اس کی بھی میں ایسے وقت ضرور مدد کرتا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے
خطرات پسند ہیں۔ دراصل میں قانون کی پابندی زیادہ نہیں کرتا۔
اور مجھے ایسے کاموں میں بڑا مزہ آتا ہے۔ ایک دفعہ پیرس میں میں نے
تاش کھیلتے ہوئے دس ہزار روپے داؤ پر لگا دیئے تھے۔ مجھے اس
میں بڑا مزہ آیا تھا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اچھا وہ پستول کہاں ہے؟"

"وہ میرے پرس میں ہے۔ میں اسے گھر میں نہ چھوڑ سکی۔
مجھے ڈر تھا کہیں وہ نینا کے ہاتھ نہ لگ جائے۔"

اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"ذرا اپنا پرس مجھے دینا۔"

اسکی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ اپنے کیوں مانگ رہا ہے۔ مگر . . . .
پرس اسکے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے اسے کھولا پستول نکالا اور
اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

وہ آرام سے کرسی پر لیٹ گیا۔

"میرا خیال ہے کہ جلد یا بدیر اسکی لاش کا پتہ چل جائے گا،
میں اس کے متعلق برابر سوچتا رہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں یہ اچھا رہیگا
کہ پستول بھی اس کے پاس ہی پڑا ہوا ملے۔"

میری کے لبوں پر ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔

"تو کیا تم پھر اس جگہ جاؤ گے؟"

"کیوں نہیں؟ شام بہت خوشگوار ہے اور میرا دل ٹہلنے کو چاہتا
ہے۔ میں نے ایک سائیکل کرایہ پہ لے لی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ میں اس
سڑک پر سیر کرنے جاؤں اور وہاں کے نظاروں سے لطف اندوز ہوں۔"

"کوئی آدمی تمہیں جنگل میں گھستے دیکھ لے تو؟"

"میں یقیناً ضروری احتیاط برتوں گا اور داخل ہونے سے پہلے چاروں
طرف دیکھ لوں گا۔"

وہ چلنے لگا۔

"تو کیا تم ابھی جاؤ گے؟"

"ہاں یہی سوچ رہا ہوں۔ دراصل وہ جنگل اتنا گھنا نہیں ہے
میں نے تمہیں رات یہ بات نہ بتائی تھی کیونکہ تم اور زیادہ ڈر جاتیں
اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ میرا خیال ہے اسکی نعش جلد ہی مل جائیگی۔"

"تمہاری واپسی تک میں سخت پریشان رہوں گی۔"

"بہتر" وہ مسکرایا۔ "میں واپسی میں تم سے ملتا جاؤں گا۔ اور
تم کچھ پینے کا بھی انتظام کرلینا۔"

اور وہ بولے:

"دوست، انسان فطرتاً خطرات کو پسند کرتا ہے۔ ایسی کوئی
بات نہیں۔"

وہ چلا گیا۔ اس کا انتظار کرنا سخت مشکل کام تھا۔ وہ پہلے ان
ہی مصائب سے گزر رہی تھی، جو بات اس پر گزر چکے تھے۔ اس کو اس
اقدام سے باز رکھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ اس کام کو ایک تفریح
کے طور پہ کر رہا تھا اور بے دھڑک اپنا سر شیر کے منہ میں دیئے جا رہا
تھا۔ اسے خطروں کا مقابلہ کرنے میں مزہ آتا تھا۔ اسے اس پر سخت
غصہ آنے لگا۔ اسے ایسی احمقانہ حرکت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اسے
ہر حالت میں اسکو روکنا چاہئے تھا۔ مگر وقتی طور پر اسکی موجودگی میں اسے
یہ خطرہ اتنا اہم نہ معلوم ہوا۔ جتنا کہ اس کے جانے کے بعد۔ علاوہ ازیں
وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جب اس نے ایک کام کا ارادہ کر لیا تو اس سے
اسے باز رکھنا ناممکن تھا۔ وہ ایک عجیب آدمی تھا۔ کون جانتا تھا کہ اس
سطحی آدمی کے اندر اسقدر عزم چھپا ہوا ہے۔

"درحقیقت وہ مایوسی کی حد تک بگڑ چکا ہے۔" اس نے خود سے کہا

بالآخر وہ واپس آگیا، تو وہ اسکی طرف جھومتا ہوا آرہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر فتحیک آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔ وہ آرام کرسی پر بیٹ گیا۔ اور وسکی اور سوڈا پینے لگا۔

"کام بہت اطمینان سے ہو گیا۔ وہاں کوئی پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔ جانتی ہو کبھی کبھی مجرم کو ایسے مواقع ملتے ہیں جو اس کے کام میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ لاش کے پاس آکر کچھ پانی جمع تھا۔ میرا خیال ہے وہاں کہیں قریب ہی کوئی چشمہ ہے اسی لئے تو رات زمین میں اسقدر نم تھی، میں نے پستول نعش کے قریب پانی پر پھینک دیا، کچھ ہی دن میں اس میں زنگ لگ جائے گا۔"

وہ اس نعش کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی اگر الفاظ اسکی زبان پر نہ آسکے، کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اور تھکے تھکے انداز میں سگریٹ اور ٹھنڈی شراب پیتا رہا۔

"میں تمہیں رات کا واقعہ حرف بہ حرف سنانا چاہتی ہوں" وہ بولی۔

"تمہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں اہم واقعات کو خود محسوس کر سکتا ہوں اور جزئیات کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔"

"مگر میں تو چاہتی ہوں، میں تمہیں اپنی شخصیت کے بدترین پہلو سے روشناس کرانا چاہتی ہوں۔ مجھے درحقیقت اس کا علم نہیں۔ اس بیچارے نے خودکشی کیوں کی۔ مجھے اس کے عبرتناک انجام پر سخت ذہنی صدمہ ہے۔"

وہ بغیر کچھ بولے سنتا رہا۔ اسکی آنکھوں میں خاموشی تھی۔ اس نے اسکول شروع سے لے کر آخر تک حرف بہ حرف لوہا قصہ، مرحوم کارٹر کے ملنے سے لے کر اس کے گولی مار لینے تک سنایا۔ کچھ کچھ باتیں بتانی پڑیں ذاتی تھیں۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے کوئی بات چھپائی تو وہ سنجیدہ آنکھیں جو اسکی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی ہیں فوراً تاڑ جائیں گی۔ ان خوفناک واقعات کو بیچ بیچ سننے سے اسکا بوجھ بھی ہلکا ہو رہا تھا، جب وہ پورا قصہ سنا چکی تو وہ اپنی کرسی پر پیچھے کی طرف جھول گیا اور ارادتاً سگریٹ کے دھوئیں سے دائرے بناتا رہا۔

"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ اس نے خودکشی کیوں کی بالآخر وہ بولا۔" وہ خانماں برباد، بھوکا اور قلاش تھا اُسے آئندہ زندگی سے کوئی امید وابستہ نہ تھی، اور پھر اسکی تم سے ملاقات ہوگئی میرا خیال ہے اس نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی حسین عورت نہ دیکھی ہوگی۔ تم نے اُسے وہ چیز دی جو وہ خواب میں بھی نہ پا سکتا تھا۔ اس کے لئے تمہاری محبت ملتے ہی ساری دنیا بدل گئی، وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے اسمیں محبت کو دخل نہ تھا۔ تم نے بتایا کہ اس کے پیچھے صرف رحم تھا، میری جان لوگ مجھ سے جذباتی ہوتے ہیں۔ اور وہ ایک خاص طور پر کیا تم اسے نہیں سمجھتیں، اس میں شک نہیں کہ اس نے تم کو تقریباً مار ہی ڈالا تھا۔ مگر تم نے اسے ستاروں میں پہنچا کر غار میں دھکیل دیا، وہ ایک ایسے قیدی کی طرح تھا۔ جسے جیلر دروازہ تک لائے۔ اور جب وہ باہر نکلنے لگے تو دروازہ ایک دم بند کر دے۔ اُسے یہ طے کرنے کے لئے کہ زندگی زندہ رہنے کے قابل نہیں یہ سب کافی تھا۔

"اگر یہ صحیح ہے تو میں خود کو کبھی معاف نہ کروں گی۔"

"میرا خیال ہے یہ صحیح ہی ہے مگر میں نہیں کہتا۔ کہ صرف یہی سب کچھ ہے۔ دراصل وہ اپنی پچھلی زندگی میں بھی غیر متوازن تھا۔ غالباً وہ پوری طرح صحیح الدماغ بھی نہ تھا ہو سکتا ہے اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہو، ہو سکتا ہے کچھ لمحوں کی انمول مسرت کے بعد اس نے مزید ایک دن بھی زندہ رہنا بے کار سمجھا ہو۔ ہم میں سے اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ کہ اگر کبھی ہماری زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب ہم مسرت کی تکمیل کے عروج پر پہنچ جاتے ہیں۔ تو پھر ہم اپنے آپ سے کہتے ہیں خدایا کاش ہم ابھی مر جاتے۔ تو اسے وہی لمحے میسر آگئے تھے، اور اس نے بھی یہی سوچا ہوگا اور پھر وہ مر گیا ہوگا۔"

میری نے رونلے کی حیرت سے دیکھا، کیا یہ وہی آزاد منش زندہ دل انسان ہے۔ جو ایسی بامعنی باتیں کر رہا ہے۔ اسوقت کا رونلے اُس رونلے سے مختلف تھا۔ جسے وہ اب تک جانتی تھی۔

"تم یہ تاویلیں کیوں گھڑ رہے ہو؟"

"کچھ تو اسوجہ سے بھی کہ تم اس حادثہ کو ضرورت سے زیادہ محسوس نہ کرو، علاوہ ازیں اب اس معاملے میں تم کچھ کر بھی نہیں سکتیں۔ اب صرف ایک ہی صورت ہے کہ تم اس واقعہ کو بالکل فراموش کردو۔ اور اسی لئے میں نے تمہیں اس واقعہ کا تجزیہ کرکے دکھایا ہے۔" اس نے اس کی طرف مذاقیہ مسکراہٹ سے دیکھا۔ وہ اس مسکراہٹ کو خوب

سمجھتی تھی۔

"آمنہ اس کے علاوہ میں نے آنکھ کچھ زیادہ ہی رکھی ہے۔ آمنہ کا خیال بہت ہوا۔"

"مجھ پر یہی آمنہ اسکی طرف ایڈگر کا تار بڑھا دیا۔ اس نے اُٹھا لیا۔

"تو کیا تم اس سے شادی کرو گی؟"

"میں یہاں سے جلد چلی جانا چاہتی ہوں۔ مجھے اب اس گھر سے نفرت ہے۔ جب میں اپنے کمرہ میں جاتی ہوں۔ تو نفرت سے چیخیں نکلتی ہیں۔"

"اور ہندوستان یہاں سے بہت دور ہے؟" اس نے طنزاً کہا۔

"دراصل ایڈگر بہت معتمد اور نیک ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں خود کو کسی کے سپرد کرنا چاہتی ہوں۔ میں جینے کے لئے سہارے کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔"

"اچھا تو بات یہی ہے نا؟"

اُسکی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اور استفساریہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اسکی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا جس سے کسی جذبہ کا پتہ نہ چلتا تھا۔

اُس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مگر شاید وہ مجھ سے شادی کرنا پسند نہ کرے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو، وہ تو تمہارے پیچھے پاگل ہو رہا ہے؟"

"سدھے۔ مجھے اُسے یہ واقعہ ضرور بتا دینا چاہیئے۔"

"کیوں؟" وہ حیرت سے چیخ پڑا۔

"جب تک یہ واقعہ میرے ذہن پر سوار رہے گا۔ میں اس سے شادی نہ کر سکوں گی۔ میرا ضمیر ہمیشہ ملامت کرتا رہے گا۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی سکون نہ ملے گا۔"

"تمہارا سکون؟ مگر اس کے سکون کا کیا ہوگا؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ تمہارے واقعہ سنانے پر شکر گزار ہوگا۔ میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں۔ ہر چیز اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ آیندہ زندگی میں اسکی موت سے تمہارا کوئی تعلق کبھی ظاہر نہ ہو سکے گا۔"

"دراصل مجھے پرخلوص ہونا چاہیئے۔"

اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"تم ایک خطرناک غلطی کر رہی ہو، میں ان معاملات میں بہت کو زیادہ سمجھتا ہوں۔ ان کے خلوص و جذبہ کو خوب پہچانتا ہوں، انہیں کبھی خلوص کی ضرورت نہیں پڑتی، اُس کا اپنے متعلق اعتماد ختم کرنا پاگل پن ہے۔ وہ تم پر لٹو ہو گیا ہے، وہ تمہیں بالکل ٹھیک سمجھتا ہے۔"

"اگر میں ٹھیک نہیں ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"کیا تم نہیں سمجھتیں کہ جتنا وہ لوگ تمہیں بہتر سمجھیں گے تم اتنا ہی اور بہتر ہونے کی کوشش کرو گی، تم جانتی ہو کہ ایڈگر میں بہت سی صفات ہیں، لوگ جانتے ہیں کہ وہ کس مرتبہ کا آدمی ہے اور اسی لئے اسے وہ عہدہ پیش کیا ہے۔ اگر تم بہ نظر غور دیکھو تو اسکی شخصیت میں ایک احمقانہ خبط پائی جاتی ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ کامیاب ہوا ہے۔ بغیر اس کے وہ اتنا بڑا آدمی نہ بن سکتا تھا۔ تم اس کے مزاج کے خلاف عمل کر رہی ہو۔ تم اس سے توقع رکھتی ہو کہ وہ عورت کے دل کی گہرائی میں پہنچ جائے؟"

"اگر اسے واقعی مجھ سے محبت ہے تو وہ محسوس نہ کریگا۔"

"اچھی بات ہے تم جانو، اگر میں عورت ہوتا تو اس جیسے آدمی سے کبھی شادی نہ کرتا، بہرحال اگر تم نے طے ہی کر لیا ہے تو کر ڈالو، تم اس سے شادی ہی کر رہی ہو تو یہ بات اُسے نہ بتاؤ۔ اور اس کے جذبۂ رقابت کو ہوا نہ دو؟"

وہ ہنسنے لگا اور اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا، اور اپنے لہراتے ہوئے قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ شاید اب وہ اس سے کبھی نہ مل سکے گی، اُس کے دل کو ہلکا سا دھچکا لگا۔ اس نے اس سے شادی کا کہہ کے اچھا مذاق کی تھی۔ اور اگر وہ ہاں بھر لیتی تو وہ مایوسی سے مسکرا کر رہ جاتا۔

—— ۷ ——

اُس سے اگلے دن چار بجے کا وقت تھا، میری باغیچہ کے اسی گوشے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ آمنہ اپنی توجہ ہٹانے کے لئے ایک غلاف کاڑھ رہی تھی۔ اتنے میں نینا اس کے پاس آئی اور اُسے بتایا کہ ایڈگر ٹیلیفون پر اُسکا انتظار کر رہا ہے، وہ اپنے ہوٹل ابھی پہنچا تھا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ میری سے ابھی مل سکے گا۔

اُسے معلوم نہ تھا کہ اس کا جہاز کب پہنچ رہا ہے اور لنچ کے وقت سے اُسکی آمد کا انتظار کر رہی تھی، اُس نے نینا سے کہہ دیا کہ وہ اُسے کہہ دے کہ وہ اُسکا انتظار کرے گی، اس کا دل زور زور سے

دھڑکنے لگا۔ اُس نے پرس سے آئینہ نکالا اور اپنے چہرہ کا جائزہ لیا اس نے رخساروں پر کوئی سرخی نہ لگائی ہوئی تھی۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ ایڈگر سرخی پسند نہیں کرتا اور صرف ہونٹوں پر سرخی لگا رکھی تھی، اُسکا رنگ زرد تھا۔ اُس نے نیلی سلک کا ہلکا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ بہت ہی سادہ دکھائی دیتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی خادمہ کا لباس ہے۔ مگر درحقیقت اُسکا کپڑا قیمتی تھا۔ اور وہ پیرس کے اعلیٰ ترین درزی خانوں کا سلا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اُسے کار کی آواز سنائی دی اور ایک لمحہ بعد ایڈگر سامنے آگیا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور اُسکا استقبال کیا حسب معمول وہ اپنے رتبہ کی مناسبت سے بہترین لباس میں ملبوس تھا، اُسکو دیکھنے سے مسرت ہوئی تھی، اس کا قد لمبا تھا۔ اور وہ سینہ تان کر چلنے کا عادی تھا، اُس نے اپنا ہیٹ اُتارا اور اس کے نیچے سے چمکیلے گھونگریالے بال نمودار ہوئے گھنی بھووں کے نیچے اُسکی آنکھیں دوستی اور خوشی کا پیغام دے رہی تھیں۔ اسکے چہرہ پر معمول کے مطابق کرختگی اور سنجیدگی کے آثار نظر آتے تھے بلکہ اس کی بجائے خوش اخلاقی ہویدا تھی۔ اُس نے گرمجوشی سے اُسکا ہاتھ دبایا۔

" تم کتنی مطمئن اور خوش نظر آرہی ہو۔ واللہ جیسے کوئی حسین مرقع ہو۔"

امریکی ہمیشہ اُس سے ملنے پر یہی جملہ کہا کرتا تھا میری نے ایڈگر کی طرف دیکھ کر آنکھیں جھپکائیں اور سوچا کہ مرد ایک خاص عمر پر پہنچ کر اپنے سے کم عمر عورتوں کو اسی طرح خطاب کرتے ہیں۔

" تشریف رکھئے نینا ابھی چائے لاتی ہوگی، تمہارا سفر بخیر گذرا۔"

" میں تم سے دوبارہ مل کر کتنا خوش ہوں۔" وہ بولا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایک صدی تم سے علیحدہ رہا ہوں۔"

" ہمیں جدا ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگا۔"

خوش قسمتی سے ۔۔۔ ہر وقت تمہارا خیال میرے ساتھ رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم کہاں کہاں رہی ہوگی اور میں اپنے خیال میں ہر جگہ تمہارے ساتھ رہا۔" میری کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

" میرا خیال ہے تم بہت مصروف رہے ہوگے۔"

واقعی میں بہت مصروف رہا، مجھے وزیر ہند سے دو تین دفعہ کافی طویل گفتگو کرنی پڑی۔ بہرحال سارے معاملات ٹھیک ہو گئے ہیں میں ستمبر کے شروع میں ہندوستان روانہ ہو جاؤں گا۔ اس نے مجھ سے یہ بالکل نہ چھپایا کہ یہ ذمہ داری بہت اہم ہے۔ اور یہ کہ میں بھی اسکی اہمیت سے اتنا ہی واقف ہوں جتنا کہ وہ۔ اور اسی لئے وہ مجھے یہ ذمہ داری دینا چاہتا ہے۔ خیر میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہیں وہ سب باتیں بتاؤں۔ جو اس نے مجھ سے کہی ہیں۔ ورنہ تم خواہ مخواہ بور ہوگی۔"

" نہیں میں بڑے شوق سے سنوں گی۔"

" اس نے مجھ سے کہا کہ خصوصی حالات کیوجہ سے انہیں ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو بیک وقت صلح جو اور سخت ہو۔ اور اس نے کہا۔ میرے علاوہ وہ کسی اور آدمی میں ان خصوصیات کو نہیں پاتا۔"

" مجھے یقین ہے وہ ٹھیک کہتا تھا۔"

" بہرحال یہ تو صرف حسن ظن ہے، تمہیں معلوم ہے مجھے اس کے لئے بڑی جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ تب کہیں اس منزل پر پہنچا ہوں۔ یہ ایک بہت اہم عہدہ ہے، اس جگہ پہنچ کر میں اُن پر ثابت کر سکتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اور یہ بات میرے اور تمہارے درمیان تک رہنی چاہیے کہ واقعی میں اہم ترین کام انجام دوں گا۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رُکا اور پھر بولا: "اگر میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگیا۔ تو پھر میرے لئے اور بھی اعلیٰ مواقع پیدا ہو جائیں گے۔"

" تم بڑے جاہ طلب آدمی ہو، ہے نا!" اُس نے لطیف طنز کی۔

" بے شک! میں اقتدار کو پسند کرتا ہوں اور ذمہ داریوں سے نہیں کتراتا، مجھ میں کچھ خوبیاں ہیں اور میں خوش ہوں کہ مجھے اُن کو عملی جامہ پہنانے کے واقع بھی میسر ہیں۔"

" پرسوں کی ریسٹوران والی دعوت میں ایک کرنل ترپل بھی تھے جو کہہ رہے تھے اگر تم بنگال کی گورنری میں کامیاب رہے "تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہیں ہندوستان کا وائسرائے نہ بنایا جائے۔"

ایڈگر کی بے باک نظروں میں ایک روشنی پیدا ہوئی۔

" اب وہ گورنر جنرل کہلاتا ہے۔ میرا خیال ہے ایسا ہونا ممکنات کی حد سے باہر نہیں، انہوں نے ولنگڈن کو وائسرائے بنایا تھا اور وہ بہت ہی کامیاب وائسرائے تھا۔"

اب وہ چائے ختم کر چکے تھے، اُس نے اپنی پیالی میز پر واپس رکھدی۔

"میرا تم جانتی ہو کہ جو اعزاز اور رتبہ مجھے بخشا گیا ہے۔ اسکی مجھے بہت خوشی ہے۔ بلکہ مجھے معلوم ہو کہ تم اس خوشی اور اعزاز میں میری شریک نہ ہو گی تو اسکی مسرت میرے لئے آدھی رہ جائے گی"

اُس کا دل ٹھہرنے لگا اور وہ لمحہ آ گیا ہے۔ اپنے حواس پر قابو پانے کے لئے اس نے ایک سگریٹ سلگایا۔ اس نے اسکی کی طرف نہ دیکھا مگر اُسے معلوم تھا کہ وہ مسلسل اسکی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا ہے۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ میری واپسی پر جواب دو گی"۔ وہ ہنسا۔ "اور یہ حقیقت ہے کہ اس بات کا جواب جاننے کے لئے مجھے پورا ایک ہوائی جہاز کرایہ پر لینا پڑا ہے۔ اسکی اہمیت کا پورا ثبوت ہے"

اُس نے جو سگریٹ ابھی سلگایا تھا بجھا دیا اور ایک چھوٹی سی آہ بھری۔

"قبل اسکے کہ ہم اس موضوع پر کچھ اور گفتگو کریں میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے تمہیں سخت تکلیف ہو گی۔ خدا را بغیر کچھ بولے میری بات پوری سن لینا جو کچھ تم کہنا چاہو یا پوچھنا چاہو بعد میں پوچھنا"

اس کا چہرہ یک لخت سخت ہو گیا اور اس نے اسکی طرف تیز نظروں سے گھورا۔

"اچھی بات میں کچھ نہ بولوں گا۔"

"مجھے تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ اس بات کو اپنی حد تک رکھنے کے لئے میں بڑی سے بڑی قیمت ادا کر سکتی ہوں۔ مگر تم سے اس بات کو چھپانا ریاکاری ہو گی۔ تم کو حقائق کا علم ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد تم جو چاہو فیصلہ کرنا"

"میں ہمہ تن گوش ہوں"۔ وہ بولا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے وہ تکلیف دہ طویل کہانی جو مدلے کو ایک دن پہلے سُنا چکی تھی۔ ایڈگر کو بھی سنا دی۔ اس نے کوئی بات خلافِ حقیقت نہ کی۔ اُس نے بات کو نہ تو بڑھایا اور نہ گھٹانے کی کوشش کی مگر مدلے کی نسبت ایڈگر کو یہ بات سنانی سخت تر تھی۔ وہ بغیر کسی جنبش کے سنتا رہا۔ اس کا چہرہ سخت اور سنجیدہ تھا۔ اسکی آنکھوں اور چہرہ کی کیفیت سے بالکل پتہ نہ چلا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ اس بات سے باخبر تھی۔

کہ مدلے کے مقابلے میں یہ کہانی ایڈگر کو سناتے وقت اسکی زبان پوری طرح اس کے قابو میں نہ تھی۔ وہ اس کو اپنے اصل مقصد اور اپنی پاکیزگی کا یقین دلانے میں ناکام رہی۔ کچھ واقعات تو نا ممکن نا قابلِ یقین محسوس ہوتے تھے۔ اور اُس نے اچھی طرح تاڑ لیا کہ اسے ان باتوں کا یقین نہیں آ رہا۔ اُسے پتہ چلا کہ اس کا اسمد سے کا نقش کار میں ڈال کر باہر لے جانا محض غلطی تھی۔ اسکی سمجھ میں اب تک یہ نہ آیا تھا۔ وہ اس بدنامی سے کیسے بچتی اور پولیس کے چکروں سے کیسے پیچھا چھڑاتی۔ واقعہ ایسا نرالا تھا کہ کسی کو یقین ہی نہ آ سکتا تھا۔ کہ اس جیسی عورت کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور یہ عام دنیا سے ماورا معلوم دیتا تھا۔ ایسا معلوم دیتا تھا کہ ایسے واقعات صرف خواب میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔

آخرکار اس نے بات ختم کی۔ تھوڑی دیر ایڈگر خاموش بیٹھا رہا۔ اور پھر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور لان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنے لگا۔ اسکا سر جھکا ہوا تھا اور ہاتھ پشت کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اسکے چہرہ پر بلا کی کرختگی تھی۔ اس سے پہلے میری نے کبھی اسکو اس کیفیت میں نہ دیکھا تھا۔ عجیب بات تھی کہ وہ ہمیشہ سے زیادہ معمر سا لگ رہا تھا۔

بالآخر وہ اُس کے سامنے آ کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر کربناک مسکراہٹ تھی مگر اس کی آواز اتنی ملائم تھی کہ اس کے دل کے تار ہل اُٹھے۔

"معاف کرنا۔ مجھے یہ واقعہ سن کر سخت حیرت ہوئی ہے۔ تم جانتی ہو کہ دنیا میں تم آخری عورت ہو جس سے میں اس قسم کی لغزش کی توقع رکھ سکتا تھا۔ میں تمہیں اس وقت سے جانتا ہوں۔ جب تم ایک معصوم بچی تھیں۔ یہ بات ناقابلِ یقین لگتی ہے کہ تم بھی دوسروں کی طرح . . . . "

وہ ٹھہر گیا۔ مگر اس نے سمجھ لیا کہ اُس کے ذہن میں کیا بات ہے۔ یہ بات ناقابلِ یقین معلوم دیتی ہے کہ وہ دوسروں کی طرح ایک آوارہ نوجوان کی آشنائی پر اُتر آئے گی۔

"میں اپنے متعلق کوئی عذر پیش نہیں کرنا چاہتی۔"

"معاف کرنا، میرا خیال ہے تم نے بہت بڑی حماقت کی ہے۔"

"بہت ہی بڑی"۔ اُس نے جھینپ کر کہا۔

"خیر ہمیں اس گہرائی میں زیادہ جانے کی ضرورت نہیں، میرا خیال ہے۔ مجھے تم سے اتنی شدید محبت ہے۔ کہ مجھے تمہارے اوپر کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا۔ اور معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

آہستہ انسان کی آواز بھرانے لگی۔ اسکی مسکراہٹ میں اب نرمی آ چکی تھی "تم ایک حسین اور پیاری لڑکی ہو۔ میں اس سے متفق ہوں کہ اس بدنصیب لڑکے کی موت کے بعد تم نے جو کچھ کیا وہ حالات کے عین مطابق تھا۔ یہ ایک بہت بڑا خطرہ تھا، بہرحال اب معاملات ٹھیک معلوم دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہیں ایک آدمی کے سہارے کی سخت ضرورت ہے۔"

وہ اسکی طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔

"کیا تم ان سب واقعات کو جاننے کے بعد بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

وہ ایک بہت مختصر لمحے کے لئے جھجکا، اتنے مختصر کہ میری کے علاوہ کوئی دوسرا محسوس تک نہ کرتا۔

"تم یقیناً مجھ سے یہ توقع نہ رکھو گی کہ میں تمہیں اس جھمیلے میں پھنسا رہنے دوں۔ میری — ! جانِ من میں کبھی بھی یہ گوارہ نہیں کر سکتا۔"

"مجھے اپنے آپ سے بڑی ہی شرمندگی ہے۔"

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں خوش رکھنے کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے ملک کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ کوئی حرج نہیں۔ اگر میں اب اس خدمت سے ہاتھ اٹھالوں۔ اور اپنے سے کم عمر کو اس موقع سے فائدہ اٹھانے دوں۔"

وہ اس کی طرف مبہوت ہو کر دیکھنے لگی۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ڈارلنگ، بات یہ ہے کہ صورت حالات اب کچھ بدل گئی ہے میں اس عہدہ کو اب قبول نہیں کر سکتا۔ یہ ٹھیک نہ ہوگا، اگر بات پھوٹ نکلی تو نتائج بہت تباہ کن ہو سکتے ہیں۔"

وہ بوکھلا گئی۔

"میں سمجھی نہیں۔"

تم پرواہ نہ کرو جانِ من، میں وزیر سے کہہ کر استعفیٰ دے دوں گا۔ کہ میں شادی کر رہا ہوں اور اب ہندوستان نہ جا سکوں گا۔ میں تمہاری صحت کو ایک معقول بہانہ بنا سکتا ہوں۔ افسوس میں تمہیں وہ حیثیت نہیں بخش سکتا۔ جو میں چاہتا تھا، مگر اسکی وجہ سے کوئی فرق نہ پڑیگا۔ ہم بہت اچھی زندگی گذار سکتے ہیں، ہم ساحل پر ایک جگہ خرید لیں گے، میں ہمیشہ سے ایک کشتی خریدنے کا مشتاق ہوں۔ ہم اس میں بیٹھ کر خوب تفریح کیا کریں گے۔"

"مگر اب جبکہ تم کامیابی کے عین قریب پہنچ چکے ہو تو تمہیں اس عہدہ کو نہیں چھوڑنا چاہیئے۔"

"سنو میری جان، جو ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے وہ بڑی اہم ہے۔ اس کے لئے مجھے اپنی تمام دماغی اور جسمانی قوتوں کو صحیح رکھنا پڑے گا۔ مجھے ہمیشہ یہی خوف لگا رہے گا کہ کہیں کوئی بات پھوٹ نہ پڑے۔ اور جب کوئی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہو تو کسی کام میں بھی پورے انہاک سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

"اب بات کیسے پھوٹ سکتی ہے؟"

"پستول ہی کو لو، پولیس نے محنت کی تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ میری ملکیت تھا۔"

"مجھے قطعی امید نہیں ایسا ہو، میں نے اسکے متعلق سوچ لیا ہے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس آدمی نے ریسٹوران میں اسے چرا لیا ہو؟"

"بیشک یہ صحیح ہے کہ پستول اس تک پہنچنے کے بہت سی معقول وجوہات ہو سکتی ہیں: مگر اس صورت میں مجھے صفائی دینی پڑے گی اور میں اسے برداشت نہیں کر سکتا، میں مخصوں میں پھنسنے سے نہیں گھبراتا، مگر میں اس قسم کا آدمی نہیں کہ خواہ مخواہ جھوٹوں کا پلندہ اپنے ذمہ لے لوں، اور پھر یہ راز تمہیں تک محدود نہیں ہے، اور وے بھی اس سے آگاہ ہے۔"

"تم اسکی ایک لمحہ کے لئے بھی فکر نہ کرو کہ وہ کبھی اس بات کو ظاہر کر دے گا۔"

"مجھے اسی کی تو فکر ہے، وہ ایک غیر معتمد آدمی ہے، ایک کاہل اور خراب آدمی ہے۔ وہ اس قسم کا آدمی ہے جس کے لئے میرے پاس کوئی مفر نہیں۔ تم کیونکر کہہ سکتی ہو کہ اگر اسے کوئی عورت مل گئی۔ تو وہ اپنے قابو میں نہ رہے گا۔ اور اسکو بطور کہانی کے سب سنا دیگا، یکے بعد دیگرے وہ ہر عورت سے بھی ملے گا اسی کو یہ کہانی سناتا رہے گا، اور قبل اس کے کہ تم اس سے جواب طلب کرو سارے لندن کو اس راز کا علم ہو جائے گا۔ یقین کرو۔ پھر اس خبر کو ہندوستان پہنچنے میں دیر نہ لگے گی!"

"ایڈگر تم غلط کہتے ہو جو اتم نے اُسے سمجھا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آئندہ [illegible] ہے۔ مگر وہ جتنا دن خوش رہتا تو میرے ساتھ یقیناً کبھی نہ رہتا۔ میں اس پر پورا پورا اعتماد کرتی ہوں۔ وہ کبھی میری بھلائی نہ چاہے گا بلکہ وہ اس پر موت کو ترجیح دے گا۔"

"تم انسانی فطرت کے متعلق مجھ سے زیادہ نہیں جان سکتیں، اس میں اتنے ضبط کا مادہ بھی نہیں کہ وہ کسی راز کو چھپا سکے۔"

"لیکن اگر تم یہ سوچتے ہو تو پھر ملازمت میں رہنے یا نہ رہنے سے کیا فرق پڑے گا؟"

"ہو سکتا ہے اس معاملہ کا چرچا عام ہو جائے، لیکن اگر میں ذاتی زندگی گزار رہا ہوں گا۔ تو کوئی فرق نہ پڑے گا۔ ہم اس کی مطلق پروا نہ کریں گے لیکن گورنر جنرل کی حیثیت میں یہ بہت مشکل ہوگا، آخر جو کچھ تم نے کیا ہے وہ ایک مجرمانہ فعل تھا، جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ ناقابلِ معافی ہے، انہی سے برطانیہ کے تعلقات خراب ہیں اور وہ اس مسئلے پر خوب کیچڑ اچھالے گا، کیا تم نے محسوس کیا ہے کہ اس آدمی کے قتل کا الزام تمہارے اوپر لگایا جا سکتا ہے؟"

اس نے اس کی طرف اس قدر تیز نظروں سے دیکھا کہ وہ کانپ اٹھی۔

"مجھے ایمانداری سے کام لینا پڑے گا؟" وہ بولتا رہا، "حکومت نے ہمیشہ مجھ پر بھروسہ کیا ہے اور میں اس کے اعتماد کا احترام کروں گا، جو رتبہ مجھے سونپا جا رہا ہے۔ اس کے شایانِ شان یہی ہے کہ کوئی شخص میرے یا میری بیوی کے چال چلن کے متعلق کچھ نہ کہہ سکے، ہندوستان میں اب ہماری قوم کی عزت کا انحصار منتظمین کی ذاتی خوبیوں پر ہے، اگر مجھے بے عزتی کے ساتھ مستعفی ہونا پڑا۔ تو اس سے بڑے تلخ نتائج برآمد ہوں گے۔ بحث کرنا بیکار ہے امیری، مجھے وہی کرنا ہوگا جو میں صحیح سمجھتا ہوں۔"

اس کا لہجہ بتدریج بدل گیا تھا، اور اس کے چہرہ کی سختی کے ساتھ اس کا لہجہ بھی کرخت ہو گیا تھا۔ میری نے اس بدلے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا جو اپنی انتظامی قابلیت کے علاوہ بے دھڑک عزم کے لئے بھی مشہور تھا۔ اس کے سنجیدہ چہرہ کے ہر خط اور اس کی آنکھوں کی ہر حرکت سے میری نے اس کے اندر کے خیالات کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے اچھی طرح اندازہ لگا لیا کہ وہ اس واقعہ کو سن کر سخت مایوس ہو گیا ہے، اس نے اپنے ناقابلِ برداشت جارحانہ رویے سے میری کی ہمدردی بالکل کھو دی تھی۔ اس نے اس کے دل سے اپنا اعتماد قطعی ختم کر دیا تھا، مگر وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو اپنی پیشکش کو واپس لے لیں۔ جب اس نے اپنی ہی مرضی سے یہ راز اُسے بتا دیا تو وہ اس کی صاف گوئی سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اس سے شادی کر کے اتنی بڑی قربانی کر رہا تھا۔ کہ اتنے بڑے عہدہ کو چھوڑ رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس سے اس قدر محبت کرتا تھا بلکہ اس لئے کہ اس قربانی سے اس کا نفس تسکین پاتا تھا۔ اور وہ بددلی سے یہ ناخوشگوار قربانی دے رہا تھا، اُسے معلوم تھا کہ وہ اسے کبھی اتنی بڑی قربانی دینے کے طعنے نہ دے گا۔ مگر ساتھ ہی وہ اتنے بڑے عہدے کو چھوڑنے پر تاحیات غم کھاتا رہے گا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اگر اس کے احساس خود غرضی کو روک لگے بغیر یہ شادی طے ہو تو وہ آسانی سے اس سے شادی کرنے کا ارادہ ترک کر سکتا ہے۔ وہ عزت و جاہ کا غلام تھا۔

میری نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں تاکہ ایڈگر ان آنکھوں میں خوشی کی جھلک محسوس نہ کر سکے، اچانک میری کو صورتِ حال بدلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بالکل اتفاقیہ طور پر اسے لگا کہ اگر وہ ہندوستان کا گورنر جنرل بھی ہو جائے تب بھی وہ اس سے شادی کرنا نہ چاہے گی، وہ اس کو چاہتی تھی اور اس کے احسانات کو بھی تسلیم کرتی تھی، وہ اس بات کی بھی احسان مند تھی کہ اس نے اس حادثہ کو بڑی ہمدردی سے سنا ہے مگر اسے احتیاط سے کام لینا پڑے گا، اگر اس کے منہ سے غلط بات نکل گئی تو وہ ہر قیمت پر اس سے شادی کر کے چھوڑے گا وہ بڑا ضدی آدمی ہے، مگر صورتِ حال کتنی ہی بدتر کیوں نہ ہو جائے وہ اس سے شادی کبھی نہ کرے گی۔ چاہے وہ اس کی رہی سہی عزت بھی اپنے دل سے نکال دے، یہ بات ذرا بھی نہ رہے گی مگر اس صورت میں وہ اس سے اور بھی زیادہ بدظن ہو جائے گا۔ اور اس کا پیچھا آسانی سے ہو جائے گا۔

ایک ٹھنڈا سانس لے کر وہ رو لے کے بارے میں سوچنے لگی۔ ایڈگر کے مقابلہ میں اس آوارہ آدمی کے ساتھ زندگی گزارنا کتنا آسان کام ہے وہ چاہے کیسا بھی ہو ہمیشہ سے کبھی نہ ڈرتا تھا، اس نے خود پر قابو پایا۔

"تمہیں معلوم ہے ایڈگر پیارے، مجھے یہ سوچ کر سخت تکلیف ہوگی کہ تم نے اپنا منصب عالی کھو دیا ہے۔"

"مجھے امید ہے کہ تم اس کے متعلق کبھی نہ سوچو گی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ نجی زندگی میں آنے کے بعد میں اس کے متعلق سوچوں گا

تک نہیں ؟"

"مگر ہمیں صرف اپنے متعلق ہی نہیں سوچنا ہے، تم اس مخصوص عہدہ کے لئے منتخب کئے گئے ہو۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنی ذات کی خاطر اس ذمہ داری سے سبکدوشی اختیار نہ کرو۔"

"میں اس حد تک غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ کہ میری ضرورت ناگزیر ہے۔"

"میں تمہاری کتنی قدر کرتی ہوں، میں اس خیال کو برداشت نہیں کرسکتی کہ تم اپنا فریضہ ترک کردو۔ جبکہ تمہاری موجودگی سخت ضروری ہے یہ بڑی کمزوری معلوم دیتی ہے۔"

اُس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اس نے محسوس کر لیا۔ کہ اسکی کمزوری اُس کے ہاتھ آگئی ہے۔

"مگر اس کے سوائے چارہ کار نہیں، موجودہ صورت حال میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا اور بھی بے عزتی ہوگا۔"

"مگر یہ سوال تو بالکل آسان ہے، تم مجھ سے شادی کرنے کیلئے مجبور تو نہیں ہو؟"

اس نے اُسکی طرف اس انداز سے دیکھا کہ وہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکی، وہ بات کو تاڑ گیا تھا۔ اور اس کی نظروں سے یہ بات ظاہر تھی۔ کاش وہ اس صورت حال میں کامیاب ہوجاتی، کیا وہ نہیں جانتا وہ ضرور کامیاب ہوگی۔ مگر اُسے اپنے تاثرات پر پُورا قابو تھا۔ اور جب اس نے جواب دیا تو اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھوں میں پیار تھا۔

"مگر میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، مجھے دُنیا میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

تو کیا پھر اُسے اپنا نسخہ استعمال کرنا ہی پڑے گا؟

"ایڈگر پیارے، تم مجھے بہت ہی عزیز ہو، مجھ پر تمہارا بہت کچھ حق ہے، تم میرے عزیز ترین دوست ہو۔ مجھے معلوم ہے تم کتنے بڑھیا، کتنے سچے، کتنے مہربان اور کتنے مخلص آدمی ہو۔ مگر مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔"

"درحقیقت میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں تم سے کتنے ہی سال بڑا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے اس شدت سے محبت نہیں کرسکتیں جس شدت سے کہ اپنے ہم عمر سے کرسکتی ہو، مگر مجھے اُمید ہے کہ جو آرام تمہیں میری ذات سے حاصل ہوگا وہ بہت حد تک اس کمی کو پوری کردیں گے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ جو کچھ میں تمہیں اب پیش کروں گا وہ تمہاری قبولیت کے معیار پر شائستہ نہ اُترے۔"

یا اللہ! وہ صورت حال کتنا پیچیدہ بنا رہا تھا! آخر وہ کیوں نہیں کہہ دیتا کہ وہ ایک گندی عورت ہے اور اچھا ہوا کہ اُسے پہلے ہی ہوش آگیا، جلتے ہوئے تیل کا کڑھاؤ اب بالکل سامنے آگیا تھا۔ اور اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کہ وہ اپنی آنکھیں بند کرلے اور اُس میں چھلانگ لگا دے۔

"ایڈگر میں تم سے صاف صاف کہنا چاہتی ہوں، جب تم بنگال کی گورنری کے بارے میں کیلس گئے ہوئے تھے تو تم اپنے کام میں بہت مصروف رہے تھے اور اسی طرح مجھے بھی بہت سے کام کرنے پڑے تھے۔ آخر میں ایک انسان ہی تو ہوں، اور متوکل حیثیت کی آنکھیں خیرہ کرنے والی ـــ یہ بات کافی معلوم ہوتی تھی کہ میں تمہیں چاہتی ہوں۔ ہمارے تمہارے درمیان بہت سی باتیں مشترک تھیں اور محبت کا نہ ہونا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ اب مشکل ترین حقیقت آتا تھا۔ لیکن اگر ہم صرف ساحل پر ہی پُرسکون زندگی گزارنے والے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ مجھے بھی تم سے اتنی ہی محبت ہو۔ جتنی کہ مجھ سے تمہیں ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں کہ ہم صرف ساحل پر ہی آباد ہوں، جہاں تم چاہو ہم وہیں رہ سکتے ہیں۔"

"اُس سے کیا فرق پڑے گا؟"

وہ کافی دیر خاموش رہا، جب اس نے دوبارہ اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں سرد مہری چھلک رہی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے تم صرف گورنر بنگال سے شادی کرنے کو تیار تھیں اور ایک ہندوستانی سول سروس کے پنشنر سے نہیں؟"

"اب جب صاف بات کہنے کی ضرورت ہی پڑگئی تو میں کہوں گی کہ واقعی یہی بات تھی جس کی وجہ سے میں تم سے شادی کرنا چاہتی تھی!"

"ایسی صورت میں ہمیں اس مسئلے پر مزید گفتگو نہ کرنی چاہیے؟"

"بے شک ایسا کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں، ہے نا؟"

وہ پھر خاموش ہوگیا، وہ بہت گمبھیر ہوگیا تھا۔ اور اسکے چہرے سے اُس کے خیالات کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ اسکی سخت بیچارگی ہوئی تھی، بے چارہ ایڈگر آدمی، اُسے اُس کی ذات سے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ لیکن میری یہ سمجھ چکی تھی کہ اُس کے کندھوں سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ لیکن وہ اس سے زیادہ اُس پر کوئی بات ظاہر نہ کر سکا۔ بالآخر وہ جھٹ سے کرسی سے کھڑا ہوگیا۔

اب میرے فلورنس کے قیام میں کوئی مقصد نہیں، البتہ اگر تم محسوس کرو کہ خودکشی کرنے والے قضیہ میں میری مدد کی ضرورت پڑے گی تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔"

"اوہ نہیں، میرا خیال ہے اسکی ضرورت نہیں ہے۔"

"ایسی صورت میں کل لندن روانہ ہو جاؤں گا، شاید مجھے تمہیں ابھی الوداع کہہ دینا چاہیئے۔"

"خدا حافظ ایڈگر! مجھے معاف کر دینا۔"

اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑا، اور اُسے بوسہ دیا اور پھر پُرسکون انداز میں لان پر سے گزرنے لگا۔ ایک لمحہ میں وہ درختوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اُس نے اُسکی جاتی ہوئی کار کی آواز سُنی۔

ایڈگر کی ملاقات نے میری کو تھکا دیا تھا۔ پچھلی دو راتوں سے اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی، موسم گرما کی ٹھنڈی اور خواب آور ہوا سے سرشار ہو کر وہ وہیں آرام کرسی پر پڑ کر سو گئی، ایک گھنٹہ بعد اس کی آنکھ کھلی، وہ اب خود کو تر و تازہ محسوس کر رہی تھی۔ وہ پُرانے باغیچہ میں ٹہلنے لگی۔ اور پھر اس کا جی چاہا کہ وہ بڑے چبوترے پر بیٹھ کر ڈھلتے ہوئے دن کی روشنی میں شہر کے نظارہ سے لطف اندوز ہو مگر جوں ہی وہ اُدھر جانے لگی۔ اس کا ملازم سیرو اسکے قریب پہنچا

"حضور، رولے صاحب کا فون آیا ہے وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں!" وہ بولا۔

"اُن سے کہو اپنا پیغام تمہیں دے دیں۔"

"مگر وہ آپ سے ہی بات کرنا چاہتے ہیں!"

میری نے اپنے کندھوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا، وہ اُس وقت رولے سے بالکل بات نہ کرنا چاہتی تھی، مگر اُس نے سوچا وہ کوئی ضروری بات کہنے والا ہو، اُس بدنصیب لڑکے کی نعش کا بوجھ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتا تھا، وہ ٹیلیفون پر پہنچی۔

"کیا تمہارے یہاں کچھ برف ہوگی؟"

"کیا تم نے صرف یہی پوچھنے کے لئے مجھے فون تک بلوایا تھا؟" اُس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"نہیں صرف یہی نہیں بلکہ میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ تمہارے پاس کون کون سی شرابیں مل سکیں گی!"

"اور کوئی بات؟"

"ہاں تو میں صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر میں تمہارے پاس ٹیکسی میں بیٹھ کر ابھی پہنچ جاؤں تو کیا تم مجھے کاک ٹیل پلاؤ گی؟"

"مجھے اور بہت سے کام کرنے ہیں!"

"یہ اور بھی بڑھیا رہے گا میں بھی تمہارا کچھ ہاتھ بٹاؤں گا!"

میری نے اپنے کندھوں کو نیم غصہ سے جھٹکا اور سیرو سے کاک ٹیل و شراب بنانے کو کہا اور بڑے چبوترہ پر چلی گئی وہ جلد از جلد فلورنس کو چھوڑ دینا چاہتی تھی، اسے اس شہر سے نفرت ہو گئی تھی، مگر وہ اپنی جلد روانگی کے متعلق چہ میگوئیاں نہ چاہتی تھی۔ شاید رولے اسی لئے آرہا ہو، وہ اس سے مشورہ لے گی، یہ بات بڑی عجیب تھی کہ وہ اس اوباش انسان پر اتنا اعتماد کئے ہوئے تھی۔

پندرہ منٹ بعد اُس کے سامنے تھا، ایڈگر اور اُس کے چال میں بڑا تضاد تھا۔ ایڈگر اپنے قد اور رکھ رکھاؤ سے بڑا ممتاز نظر آتا تھا، اسکی شخصیت سے قدرتی عظمت نمایاں تھی، اس کی شخصیت سے یہ بات ٹپکتی تھی کہ وہ دوسروں پر حکمرانی کرنے کا عادی ہے، اگر وہ کسی مجمع میں کھڑا ہو تو ہر آدمی ایک دوسرے سے کہے گا کہ یہ وجیہ آدمی کون ہے جس کی شخصیت سے اتنا رُعب ٹپکتا ہے۔ رولے ایک موٹا، متوسط قد کا بھدا سا آدمی تھا۔ وہ حسب عادت جیبوں میں ہاتھ پھنسائے ہوئے رہتا تھا اسکی ذات سے بڑی آزاد منشی ٹپکتی تھی اور میری کو اس میں کچھ کچھ جاذبیت محسوس ہوتی تھی، اسکی ہنستی ہوئی آنکھوں اور ہنس مکھ چہرہ سے یہ بات ظاہر تھی کہ وہ بہت بے تکلف آدمی ہے اور اُس سے ہر آدمی کی خوب نباہ ہو سکتی ہے، میری کو اچانک

محسوس ہُوا کہ بلا لحاظ اسکی غلطیوں اور میری کے ساتھ اُس کی ہمدردیوں کے وہ بہت ہی مہربان دوست ہے۔ اس کی موجودگی میں تم خود کو بہت آزاد رکھ سکتے ہو، تمہیں اسکی موجودگی میں تصنع کی ضرورت نہیں ہے، اُس کے مزاج میں کوئی بناوٹ نہیں اور نہ ہی دوسروں کے بننے کو پسند کرتا ہے۔

اُس نے کاک ٹیل تیار کیا اور ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اُتار لیا اور پھر آرام سے کرسی پر دراز ہوگیا اور اس کیطرف شریر نظروں سے دیکھا۔

"تو جانِ من ۔ سمار شبنشاہیت نے تمہیں ٹھکرا دیا نہ ؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہُوا ؟" وہ جلدی سے بولی۔

"مَیں نے خود ہی سب تاڑ لیا۔ جب وہ ہوٹل نے ریلوں کی روانگی کی بابت دریافت حال کیا اور جب اُسے معلوم ہُوا کہ پیرس جانے والی ٹرین آج رات کو مِل سکے گی تو اس نے اسی وقت اسٹیشن جانے کے لئے موٹر منگائی میں نے سمجھ لیا کہ اگر وہ بد دل نہ ہوتا تو اس قدر جلد یہاں سے نہ بھاگتا، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تمہارا راز فاش کرنا سخت بے وقوفی ہوگا، تم اس قسم کے آدمی سے اس بات کی توقع نہیں کرسکتیں کہ وہ تمہاری کہانی کو برداشت کرے۔"

اس سانحہ کو اتنی اہمیت دینے سے کوئی فائدہ نہ تھا جبکہ روڈلے اُسے بالکل مذاحیہ انداز میں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ میری مسکرائی۔

"اُس نے اپنا رویہ بہت اچھا رکھا۔"

"اُسے یہی چاہیئے تھا، میرا خیال ہے۔ اُس نے شرافت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ہوگا۔"

"وہ ایک مکمل شریف انسان ہے۔"

"وہ بظاہر مجھ سے زیادہ شریف لگتا ہے، میں پیدائشی شریف ہوں فطرتاً نہیں۔"

"روڈلے تمہیں مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

"کیا تمہیں ناگوار لگتا ہے ؟"

"نہیں، نہیں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ گفتگو کے دوران ہی میں میں نے محسوس کیا کہ مجھے اُس سے کسی قیمت پر بھی شادی منظور نہیں۔"

"تو تم اس جھمیلے سے اب باہر ہوگئی ہو، میں تم سے زیادہ کہنا نہ چاہتا تھا کیونکہ تم نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا، تمہیں بہت عقل آگئی، تم اُس قسم کی عورت نہیں جو کسی اعلیٰ افسر سے شادی کرو۔"

"روڈلے، وہ ایک بڑا آدمی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے، وہ ایک بڑا آدمی ہے۔" اور خود کو بڑا ہی ظاہر کرتا ہے۔ ایسے ہی جیسے چارلی چیپلن خود اپنی نقل کرتا ہے۔

"میں یہاں سے جلد جانا چاہتی ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں تمہیں ضرور ایسا کرنا چاہیئے، تمہیں تبدیلی کی ضرورت ہے۔"

"مجھے تم سے چھٹنا پڑے گا، تم نے میرے ساتھ بہت بھلائی کی ہے۔" وہ بولی۔

"مگر میں سمجھتا ہوں ہم ایک دوسرے سے مستقبل میں زیادہ سے زیادہ قریب رہیں گے۔"

"یہ تم کیسے سوچتے ہو ؟"

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں اب تمہارے لئے مجھ سے شادی کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔"

وہ سیدھی بیٹھ گئی اور اسکی طرف گھورنے لگی۔

"تمہارا مطلب کیا ہے ؟"

"بھئی جب مَیں نے تم سے اُس رات شادی کی درخواست کی جب سے ابتک واقعات نے کتنے موڑ لیئے ہیں، میرا خیال ہے تمہیں ابھی تک وہ بات خوب یاد ہوگی، میں نے تو اسے جواب کو اس وقت بھی جواب نہ سمجھا تھا، اب تک میں نے جتنی عورتوں سے بھی شادی کی درخواست کی ہے۔ اُن میں سے کسی نے بھی اس کو رد نہیں کیا۔"

"میرا خیال تھا تم مذاق کر رہے ہو، میرا خیال ہے تم میرے ساتھ اب شادی کرنا کبھی پسند نہ کرو گے ؟"

وہ آرام کرسی پر دراز ہوگیا، اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہُوا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی، اس کے بے تکلف جملوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا

اسے وہ زندگی نہیں دے سکتیں جو مصائب سے پُر تھی۔ آخر وہ تمہارے لئے اہمیت ہی کیا رکھتی ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ اگر وہ کل سڑک پر تمہارے برابر سے گزرے تو تم اسے پہچان بھی نہ سکو گے۔ اپنے ذہن کو ماضی سے پاک رکھو۔ ڈاکٹر جانسن نے یہی بات کہی تھی اور سچ تو یہ بہت صحیح بات ہے۔"

اُس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھولیں۔

"تمہیں ڈاکٹر جانسن جیسے مفکر سے کیا واسطہ؟"

"اپنی کالج زندگی کے بے مصرف لمحوں میں میں نے بہت کچھ مطالعہ بھی کیا ہے۔ شہرۂ آفاق جانسن میرا محبوب ترین مصنف ہے۔ وہ ایک مفکر تھا۔ اور انسانی فطرت کے بارے میں اچھا مشاہدہ رکھتا تھا۔"

"تم غیر متوقعات سے پُر ہو، روڈ لے۔ میں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ تم سوائے کھیلوں کی خبروں کے کچھ سنجیدہ ادب بھی پڑھتے ہو۔"

"میں اپنا تمام سامان ایک ساتھ کبھی دکان میں نہیں سجایا کرتا۔" وہ ہنسا۔ "میرا خیال ہے تم مجھے شادی کرنے میں پہلے کی نسبت اب کم قباحت محسوس کرو گی۔"

وہ یہ پُر مذاق جملہ سن کر بہت خوش ہوئی۔

"مجھے یہ یقین کیونکر آسکتا ہے کہ تم میرے ساتھ وفادار رہو گے؟"

"دراصل اس کا انحصار تمہاری ذات پر ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کو کام کی مزدوری ہے اور ازلیقہ تمہارے لئے بہت مناسب رہے گا۔"

ایک لمحہ کے لئے اُس نے اُسکی طرف جوابی نظروں سے دیکھا۔

"روڈ لے تم میرے ساتھ شادی کے جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہو؟ اگر تمہیں واقعی اپنے قول کے مطابق مجھ سے اتنی ہی محبت ہے۔ تو میں تمہارے ساتھ چلنے میں کوئی قباحت نہ محسوس کروں گی۔ ہم اور تم کار لے سکتے ہیں اور خوب سیاحت کر سکتے ہیں۔"

"ہاں یہ مشورہ بھی ٹھیک ہے مگر یہ کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔"

"بات یہ ہے کہ ایک بار جتنا اُمید افزا شوہر کی بجائے تم ایک اچھے دوست ضرور ہو۔"

"واقعی ایک معزز عورت کو یہی کہنا چاہیئے۔"

"میں اب اتنی معزز نہیں رہی۔ کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ میرے لئے اب ظاہرداری کا وقت گزر چکا۔"

"نہیں، میں ہرگز یہ نہیں سوچتا۔ اور اگر تم احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی تو میں ایک منیجر تک تمہیں اپنی شکل نہ دکھاؤں گا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور کچھ نہیں۔ مجھے تم سے شادی کرنے کی شدید آرزو ہے۔"

"مگر روڈ لے مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔"

"میں نے تمہیں اس رات بتایا تھا کہ اگر تم مجھے قربت کا موقع دو تو جلد ہی تمہیں مجھ سے محبت ہو جائے گی۔"

اُس نے اس کی طرف تھوڑی دیر مشتبہ نظروں سے دیکھا اور پھر اچانک اُسکی آنکھوں میں ایک شرمیلی چمک پیدا ہوئی۔

"میں نہیں سمجھتی کہ تم کہاں تک صحیح ہو۔" وہ زیر لب بولی۔ "اس رات جب اُن شرابیوں کی کار ہمارے برابر سے گزر رہی تھی اور تم نے مجھے آغوش میں لے رکھا تھا تو باوجود انتہائی خوف کے تمہارے ہونٹوں کے لمس نے مجھے ایک عجیب و غریب لذت بخشی تھی۔"

وہ بڑے زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔ وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اور اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

"بولو اب تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ بولا۔

"اچھا اگر تم مجھ سے شادی کرنا ہی چاہتے ہو تو ..... مگر ہم اب بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں۔"

"جانِ من زندگی نام ہی خطرہ کا ہے۔ مجھے خطرے مول لینے میں مزہ آتا ہے۔"

پریمیندر متر

پریمیندر متر ۱۹۰۴ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ شروع میں اسکول میں ماسٹر رہے۔ اسکے بعد آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سے وابستہ ہو گئے۔ بچوں کے لئے کہانیاں لکھنے کے علاوہ فلموں کی بھی ڈائرکٹ کرتے ہیں۔ بیک وقت صفِ اول کے جرنلسٹ، افسانہ نگار، شاعر اور ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول اور افسانوں میں بنگال خصوصاً کلکتہ کی معاشرتی زندگی کی حقیقی جھلک ملتی ہے۔ جدید بنگال کے ممتاز ادیبوں میں شمار ہے۔

"چہل" (جلوس) پریمیندر متر کا مشہور و معروف ناولٹ ہے۔ اس جلوس "زندگی کے جلوس" کی کوئی متعین شاہراہ نہیں ہے۔ شاہراہ متعین کرنے کی کوئی خواہش کشمکش اور تصور بھی نہیں ہے۔ حالات جہاں کہیں لے جاتے ہیں وہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اسی بہاؤ میں بہہ جاتے ہیں۔ کبھی ساحل پر لا کر پٹخ دیتی ہیں، کبھی منجدھار میں بہا لے جاتی ہے۔ ہماری زندگی میں اکثر یہی تو ہوتا ہے۔ ہم میں سے کتنے پار اتر جاتے ہیں اور کتنے منجدھار میں ڈوب جاتے ہیں، اس کا حساب کون رکھتا ہے۔ اب ان کے اس ناولٹ کی بات لیجئے۔

"ملک کی آزادی کی جنگ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے شامل ہونے والے ان نوجوانوں کی اس جماعت کی داستان جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی سبق آموز۔ آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے جس مہم کی داغ بیل ڈالی ہے ملک کی خدمت کو بھول کر اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن لاکھ کوشش کرنے پر بھی اس کو خوبی سے نہیں چلا سکتے۔ ان میں شمپن جیسا چلتا پرزہ، زندہ دل اور عاشق مزاج نوجوان ہے۔ جس کا قول ہے زندگی اگر ضائع کرنی ہے تو چالاکی سے ضائع کی جائے۔ اس کا یہی بھاری پن ہے لیکن اس کی زندہ دلی، سوجھ بوجھ، طنز، ہنسی مذاق، ان سب کے اوپر مدن کے لئے اس کا دوستی کا جذبہ اور منّو سے ایک خاموش، مبہم اور بے لوث لگاؤ دیکھ کر آپ اسے چاہے بغیر نہیں رہ سکتے ۔۔۔ مدن ایک طرح سے اس ناولٹ کا ہیرو کہا جا سکتا ہے لیکن شمپن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے کیونکہ شمپن کے بغیر مدن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شمپن کی چالاکیوں سے نفرت کرنے کے باوجود اس کی شخصیت کے دباؤ سے آخر تک آزاد نہیں ہو پاتا۔ معصوم، دنیاداری سے بےخبر، پُرخلوص لیکن بدمعاشی کا مقابلہ کرنے کے نااہل۔ منّو اس کے بھولے پن کی وجہ سے اسے چھیڑنے سے گھبراتی ہے۔ منّو کی یہ حسرت ۔"اچھا میں تو چلتی ہوں، شاید پھر ملاقات نہ ہو۔ ایک دن اچھی طرح چھیڑنے اور چڑھانے کی حسرت ہی رہ گئی۔" لیکن منّو ایک راہبہ ہے۔ ساری دنیا کا بار سر آنکھوں پر لینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ اس نے صرف دینا سیکھا ہے لینا نہیں سیکھا۔

اس ناولٹ کا سب سے بڑا کردار اسٹیشن ماسٹر کا ہے جو ناولٹ کے آخر میں آتا ہے اور ہم سب پر گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔ اسی کے بارے میں مدن کہتا ہے "ماسٹر صاحب سے زندگی میں پھر کبھی ملاقات نہ ہوگی۔ آدھ گز کی دھوتی پہنے، ننگا جسم، سر پر ٹوپی پہنے شاید آج بھی وہ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر ریل گاڑیوں کو پاس کراتے ہوں گے ۔۔۔۔ لیکن پھر بھی انسان کی کمینگی دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہوں، ماسٹر صاحب کی یاد سے کچھ تسلی ملتی ہے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں۔ ہم اور آپ بھی ایسے موقعوں پر اسٹیشن ماسٹر کو یاد کر کے دل کو تسلی دیں گے۔

رمنی، شرت، سجان، گوسائیں جی، شندپال وغیرہ بھی اپنی اپنی جگہ آپ کو ضرور پسند آئیں گے۔

پریمندرا متر

شیام سنگھ

پدمیندر دتہ

ترجمہ: شیام سُند

جلوس

نہ جانے کب نیند آگئی۔

غنودگی کی حالت میں ایسا محسوس ہوا گویا نیچے سمندر گرج رہا ہو۔ میں چونک کر اٹھا۔ واقعی سمندر کی ہی گرج تھی۔ بجٹ مباحثہ کے سمندر کی گرج!

زندگی کے متنوع، عجیب و غریب اور مفصل روپ کی کہانی تیز رفتاری سے سیاہ حروف میں کاغذ پر اتر رہی تھی۔

پروف کو میز پر رکھ کر اوناش نے کہا۔ "دیکھئے، ذرا جلدی سے دیکھئے۔ اس آرٹیکل کے واسطے فرمہ رکا ہوا ہے۔"

شمپین ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وہیں سے پھنکار سنائی۔ "رکا ہوا ہے تو رکا رہے۔ میری بلا سے۔ تمہارا فرمہ تو رکا ہی رہتا ہے۔ ایک یہی تو کاغذ ہے اور وہ بھی گیلا۔ قلم رکھتے ہی پھٹ جائے گا۔ اتنی جلدی پروف کیسے پڑھا جائیگا؟ ذرا میں بھی تو سنوں؟"

اسی بات کی تائید کرتے ہوئے کاشی ناتھ نے کہا۔ "دوسرا پروف لانے کے لئے کہو۔ سمجھے؟ نہیں تو ہم لوگ جلدی نہیں کر سکیں گے۔"

سیاہی سے سنے ہوئے دونوں ہاتھوں کو بے بسی سے پھیلا کر اوناش نے کہا۔ "آپ ہی بتائیے۔ میں کیا کروں۔ میرے ہاتھ میں سب ہی کیا ہے!" یہ کہہ کر کاشی ناتھ نے پروف اٹھا لیا۔

شمپین کی پھنکار سے سہم کر اوناش نے صرف مجھی کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنے غم کی داستان سنائی۔

"مجھے جھڑکنے سے کیا ہوگا۔ آپ ہی بتائیے۔ مجھے اس جلد بازی کی عادت تھوڑا ہی ہے۔ بجلی مشین ٹوٹ جانے سے دیر ہو گئی۔ ڈاک چھوٹ گئی اور میرے اوپر دو روپیہ جرمانہ ہو گیا۔ باوا آدم کے زمانہ کی تو مشین ہے۔ ہمیشہ بگڑی ہی رہتی ہے۔ لیکن سارا قصور میرے سر منڈھا جاتا ہے۔ اسی لئے جرمانے کے ڈر سے جی چاہتا ہے کام جلد از جلد ختم ہو جائے۔"

اوناش پرنٹر ہے۔ اخبار میں روزانہ اس کا نام بھی ایڈیٹر کے نام کے ساتھ ٹائپ کے حروف میں شائع ہوتا ہے۔ کوئی خطا ہو گئی تو اسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔ ضرورت پڑنے پر شاید جیل بھی جانا پڑے۔ لیکن اسے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔

داڑھی مونچھ سے عاری، رسی کی طرح اینٹھا ہوا اس کا چہرہ دیکھ کر اس کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک خاص حد تک پہنچ کر اسکی عمر آگے بڑھنا ہی نہیں چاہتی۔

"چھپ چھپا کر تھوڑی سی پی بھی لیتا ہے"۔ پوچھنے پر بے باکی سے جواب دیتا ہے۔ "وہ نہ پیوں تو روزانہ رات کو کیسے جاگ سکتا ہوں؟" نشہ کے اثر سے یا کسی دوسری وجہ سے، وہ رات رات بھر جاگتا رہ سکتا ہے۔ اس بات میں کسی کو شبہ کی گنجائش نہیں۔ آج پچیس سال سے وہ اسی طرح رات رات بھر جاگتا آیا ہے۔ جب موقع ملتا اور سانس لینے کی فرصت ہوتی تو وہ یہ بات سنانے سے باز نہ آتا۔ اپنے منہ سے اپنی تعریف کرتے ہوئے وہ کہتا۔ "آج تو یہ کاروبار بہت پھیل گیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں، تین تین راٹری مشینیں اور تین سو آدمی۔ لیکن جب یہ اخبار ایک چھوٹے سے مکان میں ہینڈ پریس میں چھپ کر نکلتا تھا، تب رات رات بھر یہ اوناش اکیلا ہی اپنے دم پر سارا اخبار نکالتا تھا۔"

ایک عجیب انداز سے انگلی سے سینے کی طرف جس کی

ایک ایک پسلی ابھری ہوئی تھی؛ اشارہ کر کے وہ کہتا "آپ یقین نہیں کریں گے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ رام بابو کو لکھنے کی فرصت نہ ہوتی۔ بس کھڑے کھڑے منہ سے بولتے جاتے اور میں سن سن کر کمپوز کرتا جاتا۔ اور تب وہ فتوے صادر کر دیتا، ایسا ایڈیٹر ایسا کبھی نہ پیدا ہوگا۔ ان جیسا زور اب کس کی قلم میں ہے!"

پچیس سال پہلے جب "بیباک" کلکتہ کی ایک معمولی سی گلی کے ایک بوسیدہ اور پرانے مکان کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں (آج نہ کہیں اس گلی کا نشان ہے اور نہ اس گھر کا) ایک پرانے ہینڈ پریس کی کوکھ سے وجود میں آیا۔ تب اس کی پرورش صرف دو آدمیوں نے کی۔ ایڈیٹر سوامی رام بابو اور ہمارا یہ اوناش۔ اس کے بعد "بے باک" ماہ نو کی طرح دن بدن بڑھنے لگا۔ دو صفحوں سے سو صفحوں کا ہوا۔ ہینڈ پریس کی جگہ تین تین روٹری مشینیں ناکافی ہوتیں۔ بنگال کے قصبات اور دشوار گزار راستوں والے گاؤں تک بے باک کی بے خوف آواز پہنچتی۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ، دوسرے سے تیسرے۔ اس طرح اس کا حلقہ اور رسوخ دن بدن بڑھتا ہی گیا۔

"بے باک کی ترقی کی منزل تک اگر کسی نے لگاتار اس کا ساتھ دیا تو صرف اوناش بابو نے۔

"لیکن جرمنی کی بات غلط ہے۔ میں کہتا ہوں تمہاری یہ بات جھوٹ ہے اوناش۔ بھلا تمہارے اوپر وہ لوگ جرمانہ کر سکتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی اوناش کا لہجہ بدل جاتا۔ سوکھی ہنسی ہنس کر کہتا۔ "ٹھیک ہی کہتے ہو۔ ایسا ہونے پر ایمان زندہ رہ جائے گا! کہتے ہیں۔۔۔۔۔"

لیکن اسے اپنی بات ختم کرنے کا موقع نہ ملتا۔

مضمون کا پروف سامنے پھینک کر، منہ بنا کر کاشی ناتھ کہتا "اچھا زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لے جاؤ یہ سینکڑوں غلطیاں ہم لوگ کہاں تک درست کریں گے!"

اوناش جواب تک نہ دیتا۔ پروف لے کر ایک سانس میں نیچے اتر جاتا۔ میز کے اوپر پیر پھیلا کر، کرسی سے سر ٹیک کر کاشی ناتھ کچھ دیر سو لینے کی کوشش کرتا۔

نیچے پریس سے رات کی خاموشی کا سینہ چیرتا ہوا مشینوں کا شور بلند ہوتا رہتا۔ نیند میں سمندر کے گرجنے کی آواز عجیب محسوس ہوتی۔

چھپائی کے حروف میں بند ہونے سے پہلے کتابت کی یہ آخری صبح ہوتی!

x x x x x

صبح بیاہی نفرت ہوتا۔

نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اٹھ کر طبیعت نہ کرتی جلدی اٹھنے کو۔ پڑا پڑا سب آوازیں سنتا رہتا۔

قریب کے مکان میں چھاپہ خانے والے ردی کاغذ کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر ایک گودام میں ڈھیر لگا دیا تھا۔ نیچے روٹری مشین اب بھی چل رہی تھی۔ لیکن ٹھیکے داروں کے شور و غل، سائیکل والے اخبار فروش لڑکوں کی چیخ و پکار نے مشین کی آواز کو بھی دبا دیا تھا۔

کافی دیر بعد جب بستر سے اٹھا تو آفس کے دروازے کے سامنے اخبار فروش پھیری والوں کی بھیڑ بہت کم ہو گئی تھی۔ میرے سامنے سے شاید آخری پھیری والا کمر پر لپیٹ کر لگائے باہر نکل گیا۔ بھاری بھاری چیتھے جن میں کاغذ کے گٹھڑ بھرے ہوئے تھے جیل گاڑی سے آتا جا رہا تھا۔ باہر جانے کے تنگ راستے پر ان بڑے بڑے پیسوں کے پاس سے نکل کر جاتے جاتے دیوار پر چپکے پوسٹر کا پیغام نظر سے گزرا۔ "ہندوستان کے نوجوانو! جاگو!"

رات کو جاگنے سے جسم کسلمند تھا۔ یہ پیغام پڑھ کر ایک پھیکی سی ہنسی چہرے پر آ گئی لیکن یاد آتا ہے، ایک دن اسی پیغام کو پڑھ کر میں جوش سے بھر اٹھا تھا۔ اس دن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ "بے باک" اس پیغام کو بنگال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا رہا ہے۔ بنگال کے نوجوانوں میں نئی زندگی کی روح پھونکنے کی تحریک کو چاہے کتنی بھی کامیابی ملی ہو، اس میں میرا بھی تھوڑا سا ہاتھ رہا ہے، یہ سوچ کر ان دنوں میں نے شاید کچھ فخر محسوس کیا تھا۔

x x x x x

ایک دیہاتی لڑکا گاؤں کے محدود ماحول کے اندر ملک کی خدمت کرنے کا خواب دیکھتا ہوا گھر میں بیٹھ کر چرخہ کاتتا۔ کڑاکے کی سردی میں بھی اپنے ہاتھ کا بنا موٹا کپڑا پہن کر سوچتا کہ ملک کی خدمت کر رہا ہوں۔

گاندھی کے ستیہ گرہ کرنے کے جوش میں آکر آدمی آدمی عادت کر لی تھی کر مجھ ہی کے گھنٹوں کا کوڑا کرکٹ صاف کرتے جاتے اور دوسروں کے تالاب میں نہانے کا کام کرتی تھی۔ اس کام میں کبھی کبھی تو مار اور پیٹ بھی کھانی پڑتی تھی۔

اس کے بعد عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں جتنا جا میں کلکتہ پہنچا۔ جیل ہی میں شمیم سے ملاقات ہوئی۔ ایک ہی کوٹھری میں پچیس آدمی سوتے تھے۔

ایک دن بیچ میں کسی کی نیند ٹوٹ گئی۔ کوٹھری میں جتنا اندھیرا تھا۔ میرے سرہانے کے بستر پر جو لڑکا سوتا تھا۔ اس نے بعد ازاں میں مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "ارے اٹھئے صاحب! کوئی گلے میں رسی باندھ کر لٹک گیا ہے۔"

جلدی جلدی اٹھ کر دیکھا تو ایک اونچی کھڑکی کی سلاخوں سے ایک لمبا کپڑا باندھ کر اسکا پھندہ گلے میں ڈالے ایک آدمی جھول رہا تھا۔ اسکے چاروں طرف بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔

غور سے دیکھنے میں اسکا چہرہ بڑا بھیانک معلوم ہوا۔ زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ اسکی بند آنکھوں کے کناروں پر سیاہی لگی ہوئی تھی۔

اس کو چھونے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ خطرے کی گھنٹی ابھی تک نہ بجائی گئی تھی۔ جیلر کو خبر دے کر وارڈن اس عجیب واقعہ سے دم بخود ہو کر کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

کسی نے کہا۔ "کمبخت کا کیا بگڑے گا چارہ۔"

تب میں نے وارڈن سے کہا۔ "مجسمہ کی طرح کھڑے کیا دیکھتے ہو۔ اسے اتار نہیں سکتے ہو" — یہ دیکھ کر اس میں ہمت نہیں ہے۔ میں خود اسے اتارنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے یہ خوفناک منظر کب تک دیکھا جا سکتا تھا۔

لوہے کی چابی سے اوپر کو اٹھا کر گلے کا پھندہ کھولنے ہی لگا تھا کہ یکایک اس کے جسم سے ہاتھ جو چھوا تو چونک پڑا۔ اسکے جسم کی حرارت کرتا رہی تھی جیسی صحت مند آدمی کی ہوتی ہے اس کے سینے کے اندر دل بھی کافی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

تعجب کے عالم میں یہ سوچ رہا تھا کہ اور لوگوں کو یہ بات بتاؤں یا نہ بتاؤں کہ گال پر ایک زور کا طمانچہ پڑا۔

اپنے ہاتھ سے ہی پھندے سے گردن نکال کر وہ لڑکا چلایا۔ "بھیا بتاؤ! کس خوبی سے اس نے گلے میں ایسا پھندہ باندھا تھا!"

میں حیران رہ گیا۔ اترتے ہوئے اس نے کہا۔ "کیسا تمہیں کا سارا مزا کرکرا کر دیا۔ سپرنٹنڈنٹ کو وہ ناچ نچاتا کہ یاد کرتا۔"

چاروں طرف ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ اگر اس ہنسی میں کوئی شریک نہ تھا تو بیچارہ وارڈن۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو بلا کیا کیفیت دے گا یہی سوچتا ہوا بار بار سب کے چہروں کو تاک رہا تھا۔

آنکھ کے کناروں سے لالٹین کی سیاہی پونچھتے ہوئے اس خودکشی کرنے والے لڑکے نے ہنسی میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "بڑے چودھری بنے پھرتے ہو۔ تمہیں کیا ضرورت تھی مجھے اتارنے کی؟ بتاؤ!"

یہ تھا شمیم۔ وارڈن کو پریشان کرنے کے لئے روز نیا کوئی نیا طریقہ سوچ رہا تھا۔ وہ نا گایا بھی بہت کچھ تھا۔ گانا بجانا، جمناسٹک وغیرہ۔ ان تمام ہنروں سے وہ اکیلا ہی سارے وارڈ کا دل لبھائے رکھتا تھا۔

یاد نہیں پڑتا۔ اتنی زندہ دلی اس سے پہلے کہیں دیکھی ہو۔ اس کے ساتھ تعلقات جیل سے باہر آنے پر مضبوط ہوئے ہم دونوں ایک ہی دن چھوٹ کر باہر نکلے تھے۔

کلکتہ میں میرا ایک ٹھکانہ تھا تو ضرور لیکن یہ جانتا تھا کہ جیل سے چھوٹ کر ایک سرکاری ملازم کے گھر کچھ اچھا خیر مقدم نہ ہوگا۔ مجھے شش و پنج میں پڑے دیکھ کر اس نے خود مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ اسکے گھر کے بارے میں بغیر کچھ جانے بوجھے میں اس کے ساتھ چل کھڑا ہوا۔

* * * * * * * *

کلکتہ کے ایک غریب محلے کے ایک ٹوٹے پھوٹے، کچے گھر کی شکل دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ کلکتہ میں ٹھکانہ ہوتے ہوئے بھی شمیم کی حالت میری نسبت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ گھر اسکا اپنا نہ تھا۔ ایک کوٹھری میں وہ کرایہ دے کر رہتا تھا بس۔

دروازہ کھٹکھٹاتے ہی ایک اٹھارہ انیس سال کی لڑکی نے آکر کواڑ کھولے۔ اور پیچھے ہٹ گئی۔ شمیم نے تقریر کرنے کے انداز میں کہا۔ "دیکھا تو نے بیان کا حال۔ اس سے ملک کی خدمت کرنے کی خواہش بھلا کیسے ہوگی۔ کہاں تو جیل کے پھاٹک سے آواز آتی تھی جاگ

سے انسان جانگ۔ وہ تو دور رہا، راستے میں کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ گھر آنے پر ایک صنفِ نازک کی شکل نظر آئی تو وہ بھی غائب ہو گئی۔ بڑا اچھا تو آیا۔"

یہ سوچکر کہ یہ لڑکی رشتے میں اسکی کچھ لگتی ہوگی مجھے اس کی بات پر ہنسی آئی۔ لیکن گھر میں جاکر بیٹھنے پر اسکی بات سے بڑی حیرانی ہوئی۔ گھر کے ایک کونے میں لپیٹ کر رکھی ہوئی چٹائی کو کھول کر اس نے بچھا دیا۔ جس لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔ شاید وہی دبے قدموں سامنے سے نکل گئی۔

اچانک میری دونوں آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے موند کر شمپین نے کہا۔ گدھا کہیں کا۔ ادھر اس طرح کیا دیکھ رہا ہے۔ میں نے تجھے گھر میں پناہ دی۔ اور تو مجھے ہی تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ تیری قسم دو برس کی ریاضت کے بعد تو مقصود ہاتھ میں آنے کو ہے۔ میں کہے دیتا ہوں اب اگر تو نے کیا دھرا چوپٹ کیا تو اچھا نہ ہوگا۔

اس کے بعد میرے چہرے کو دیکھ کر اتنے زور سے ہنسا کہ سارا گھر دہل گیا۔ بولا۔ تو تو دھونا رشی کا اوتار ہے۔ یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

سوچا تھا۔ اسی دن اسکا گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ لیکن جا نہ سکا۔ بات یہ نہ تھی کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہ تھا لیکن شمپین کو چھوڑ کر جانا کچھ آسان نہ تھا۔ شمپین میں خامیاں کچھ کم نہ تھیں۔

کبھی کبھی ایسا لگتا کہ اس کے نزدیک زندگی کے کسی آدرش کی کوئی قیمت نہیں۔ کبھی کبھی اس کے معمولی مذاق سے میرا دل دکھ جاتا۔ لیکن پھر نہ معلوم کیسے میں اسے چاہنے لگا۔

اسی کے سہارے دن گزر رہے تھے۔ شروع میں تو کئی دن تک میں نہ جان سکا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ کسی دوسرے آدمی کا بوجھ اٹھانا تو درکنار خود اپنا گزارہ کرنا بھی اسکے بس کی بات نہ تھی۔ ایک دن شرم کے مارے میں نے واپس وطن جانے کی اجازت مانگی۔

شمپین پہلے تو سنجیدہ ہو گیا پھر ہنس کر زور سے آواز دی "منو"! منو کہیں نزدیک ہی تھی، اس کے آتے ہی شمپین نے بھاری آواز بنا کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے تم دو دن کو پیٹ بھر کھانا نہیں دیتی ہو۔ یہ تمہاری بڑی بے انصافی ہے۔ گاؤں کا لڑکا ہے۔ یہ مانا کہ ملک کی خدمت کرنے آیا ہے۔ لیکن وہ فاقہ کرکے تو نہیں رہ سکتا۔ دیکھ لو وہ خفا ہو کر اپنے وطن جا رہا ہے"!

بے حد شرمندہ ہو کر میں نے کہا۔ "واہ کیا میں اس لئے وطن جانا چاہتا ہوں؟"

ادھر کئی دنوں سے منو میرے سامنے بالکل کھلنے لگی تھی۔ ان کئی دنوں کے تعارف سے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ شرارت کرنے میں یہ نٹ کھٹ لڑکی کسی سے کم نہیں۔ چنانچہ اس نے ہنس کر کہا "فاقہ کرنے پر بھی دیو جیسا چہرہ ہے۔ دیکھنے سے ہی خوف آتا ہے۔ پیٹ بھر کھانا دے دیا تو زندہ نہ چھوڑیں گے"!

منو جا رہی تھی۔ اسے واپس بلا کر شمپین نے کہا "دیکھو منو، یہ میں۔ نتا ہوں کہ یہ دین نوجوان ہے۔ لیکن تم اس طرح میرے سامنے اسکے چہرے کی تعریف نہ کیا کرو۔ مجھے رشک ہوتا ہے!"

"میری بلا سے"۔ یہ کہہ کر منو چلی گئی۔

شمپین کو میں پہچانتا تھا، میری بات کو اس نے اس طرح دبا دیا، یہ بھی میں نے سمجھ لیا۔ لیکن اس طرح کتنے دن کام چلیگا۔ یہ سوچکر میں فکر کئے بغیر نہ رہتا تھا۔

اس کی اپنی آمدنی کچھ بھی نہ تھی۔ پرانے تعلقات کے ذریعے یا کسی بھی رشتے سے اس غریب کنبہ پر اپنا بوجھ ڈال کر وہ رہ سکتا ہے۔ لیکن بلاوجہ ایک دوست کا بوجھ بھی ڈال دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ اس سے یہ بات کہنا بیکار ہے۔ میں نے ایک دن بڑے زور شور سے بات اٹھائی اس نے میری بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے کہا۔ انسان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہو، بتاؤ تو سہی۔ ہم تو سب لوگوں کی بھلائی کریں اور ہماری بھلائی کوئی نہ کرے۔ ہمارا یہ عزم ہے!

لیکن یہ بھلائی میرے لئے برداشت کرنا میرے لئے ناممکن ہو گیا۔ ایک اکیلے آدمی کی کمائی سے منو وغیرہ کے گھر کا خرچ جیسے تیسے چل رہا تھا۔ موٹر کے ایک کارخانہ میں مستری کا کام کرکے منو کا بڑا بھائی جو کمائی کرتا تھا، وہ اسکی بیوہ ماں اور بہن کے لئے ہی کافی نہ تھی، اس کے اوپر دو آدمیوں کے بوجھ سے اس گھر پر مصیبت آجائے گی، یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا۔

اس کی پیشانی پر میں نے کبھی شکن تک نہ دیکھی۔ اتنے دنوں کے برتاؤ سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ شمپین سے ان لوگوں

ر بڑی عقیدت ہے۔ اُن کے لئے وہ کسی دیوتا سے کم نہ تھا۔

اپنا کام ختم کرکے گھر لوٹتے ہیں اکٹھے کو رات ہو جاتی تھی۔ اس سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ شمپین کے ساتھ سے، وہ ایسے بات کرتے سُنا تو میں حیران ہو گیا۔ انسان کو انسان سے اتنی عقیدت ہو سکتی ہے۔ اس کا میں نے کبھی تصور ہی نہ کیا تھا۔

شمپین کے لئے اس عقیدت کو برداشت کرنا کوئی بڑی بات تھی یہ جانتے ہوئے بھی اس عقیدت کی پاکیزگی سے رن کاٹنے کے خیال سے میرا دل فخر سے بھر جاتا تھا۔

پھر وطن جانے کی بات کر دیا کر شمپین اطمینان سے بستر پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے کتاب چھین کر میں نے کہا۔ "بھائی تمہارے پیروں پڑتا ہوں۔ ذرا سی دیر کے لئے ہنسی مذاق کو بالائے طاق رکھ کر میری بات سن لو۔"

میری طرف ایک بار دیکھ کر معلوم نہیں کیا سوچ کر چہرے پر آئی ہوئی ہنسی روک کر اس نے کہا۔ "کہو کیا بات ہے؟"

"اس طرح کاہل کی طرح دن گزارنا تمہیں اچھا لگتا ہے؟"

"یہ تو ہوئی تمہید۔ اس کے بعد؟"

"اسکے بعد! ...... اسی طرح اگر رہنا ہے تو کچھ کام دھندہ کی کوشش نہیں کی جا سکتی! تم چپ رہے نہ کرو لیکن کیا میں بھی نہیں کر سکتا!"

تیزی سے اٹھ کر بیٹھتا ہوا شمپین بولا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ کچھ کام دھندہ کرنا ضروری ہے۔ یہاں کاہلوں اور اپاہجوں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس دھرتی کو خون پسینے سے سینچ کر سرسبز اور شاداب بنا دیا ہے۔ جنہوں نے اپنے ناخون سے دھرتی کا سینہ چیر کر اس میں سے گوہر مقصود برآمد کیا ہے۔ ہم لوگ محتاج نہیں ہیں، جو ہاتھ ہم اپنے منہ میں ڈالتے ہیں وہ ہاتھ نازک نہیں ہیں بلکہ محنت سے سخت پڑ گئے ہیں۔ ... منو!"

اسکی بات سن کر میں کھسیانا: "ضرور ہوا۔ لیکن جوش میں آ کر جب اس نے منو کو پکارا تو میں ہنس پڑا۔ بولا۔ "پھر منو کی ضرورت کیوں آ پڑی؟"

"واہ انہی لوگوں کی تو پہلے ضرورت ہے۔ سب کاموں کے محرک وہی تو ہیں۔ وہی تو ہماری طاقت ہیں۔"

"تمہارا جوش میں دیکھ رہی ہوں۔ اس وقت کیسی طاقت کی ضرورت ہے ذرا میں بھی تو سنوں!" منو آکر چوکھٹ پر کھڑی ہو کر ہنسنے لگی۔

"جانتا ہوں تم سب باتیں سن رہی تھیں۔ تمہیں یہاں سے دیکھ کر تو بولا تھا۔ اچھا، تمہارا وہ کنگن ابھی ہے یا چلا گیا؟"

"ہیں پھر پہلے شاید تم سے لیا تھا۔ واپس دیا کہ نہیں، یاد نہیں آتا۔"

"واپس دے دیا تھا۔ ٹھہرو لا دیتی ہوں" یہ کہہ کر منو چلی گئی۔

مجھے بڑا غصہ آیا۔ بولا تم بڑے بے حیا ہو شمپین۔ ان لوگوں کے اوپر اتنا ظلم کر کے بھی تمہیں چین نہیں آیا۔ منو کا کنگن تم نے کس منہ سے مانگا تھا؟"

"بڑے خوبصورت ہیں کمہ منہ سے ذرا دیکھو!" کچھ دیر چپ رہ کر اس نے پھر کہا۔ "ناراض کیوں ہوتے ہو بھائی۔ دیکھتے جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔"

منو کے کنگن لا دینے پر شمپین مجھے ساتھ لے کر نکل پڑا۔

دل ہی دل میں کڑھتا ہوا اس کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں کاغذ میں لپٹے ہوئے کنگن کو ایک بار نکال کر شمپین نے کہا۔ "تو نے ہی تو کام دھندے کی بات شروع کی تھی۔ ورنہ مجھے تو اسکا خیال تک نہ آتا۔"

"خیال تو خوب ہے! چلے ہو ایک بیکس لڑکی کا زیور بیچنے؟"

شمپین مسکرا دیا اور میری کمر تھپتھپا کر بولا۔ "بدھو سمجھ گیا؟ اخبار کا بنڈل لے کر پھیری لگانے میں شرم لگے گا تو نہیں!"

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پھر کہا۔ "ارے پاگل تمام دھندے کے لئے بھی تو روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کنگن کا روپیہ اخبار کے دفتر میں جمع کرا دو۔ دونوں آدمی اخبار بیچا کریں گے۔ دو مہینے میں کنگن تو کیا منو کے لئے سونے کا ہار بنوا کر سارا قرض اتار دیں گے۔ سمجھا؟"

سمجھ کر بھی میں زیادہ خوش نہ ہو سکا۔

اس کے ساتھ شہر کے دوسرے سرے پر ایک دکان پہ جب پہنچا تو شام ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ "راستے میں کسی اور سنار کی دکان نہ تھی؟"

میری بات کا جواب دیئے بغیر وہ دکان میں گھس گیا۔ لیکن اتنی

وہ دو کرنے کے باوجود سودا نہ پٹ سکا۔ سنسار جو دینا چاہتا تھا وہ شاید بہت کم تھا۔ کنگن کو کاغذ میں لپیٹ کر وہ واپس چلنے لگا تھا۔ یکایک نہ جانے کیا سوچکر وہ مڑا اور موڑا ہوا کاغذ اس کی طرف پھینک کر بولا۔ "لیجئے جو آپ اپنا دھرم سمجھیں، وہی دیجئے۔ بہت گھوم چکا ہوں۔ اب اور ٹھوکریں کھانے کی ہمت نہیں ہے۔"

سنسار نے شاید بیچ بیچ بازی مار لی تھی، کہیں ہمارا ارادہ بدل نہ جائے۔ یہ سوچکر اس نے جلدی سے روپیہ نکال کر دیئے۔

راستے میں چلتے چلتے میں نے کچھ تعجب سے پوچھا۔ "زیادہ قیمت حاصل کرنے کے ارادے سے اتنی دور آکر اتنے کم پیسوں میں کیوں راضی ہو گئے؟"

"کیا کرتا اور کہاں کہاں گھومتا!" کہکر وہ ہنس پڑا۔

گھر آکر اس کی ہنسی کا مطلب سمجھکر میرا دل تعجب، شرم اور نفرت سے بھر گیا۔ منو کو بلاکر شمپین نے کہا "یہ روپے رکھ لینا منو۔ کل ان روپوں سے کوئی دھندہ شروع کریں گے۔ اور تمہارے کنگن کی آج ضرورت نہیں پڑی۔ اسے بھی رکھ لو!"

کاغذ میں لپٹا "کنگن" نکال کر اس نے منو کو دیدیا۔

منو کے جاتے ہی اس نے میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر اپنی عادت کے مطابق ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہا "دنگ رہ گیا نہ تو روی! جادو ہے جادو۔ ہاتھ کی صفائی یونہی تھوڑا ہی سیکھی ہے۔"

"تمہارا جادو دیکھ کر دنگ نہیں ہوا شمپین۔ لیکن خیر چھوڑو اس بات کو۔ کل سے میں یہاں نہیں رہوں گا۔" غم و غصہ سے میری آواز بھرا رہی تھی۔

"میرے پاس آکر بیٹھ۔ میری طرف دیکھ ذرا!" وہ ہنس پڑا۔ پھر غمگین لہجہ میں بولا "تم سب کارل مارکس اور لینن پڑھتے ہو۔ منہ سے کہتے ہو دنیا کی ساری ملکیت سب کو برابر تقسیم کر کے سب کو ایک معیار پر لانا چاہیئے۔ میں ٹھہرا سیدھا سادہ آدمی۔ یہ باتیں سن کر میں نے بیچارے سنسار کے روپوں کے پہاڑ کا ایک کونہ ذرا سا سرکا دیا۔ بس اتنی سی بات پر ہی بگڑ گئے۔ لینن کی پارٹی چاہے مار دھاڑ اور خون خرابہ کر کے اپنا کام نکال لے۔ لیکن میری ذرا سی ہاتھ کی صفائی بھی جرم ہو گئی۔"

اس وقت اس کا مسخرا پن برداشت نہ کر سکا۔ غصہ آنا ہی کہا "نہیں شمپین میں اب اور یہاں نہ رہ سکوں گا!"

منو کھانا کھانے کے لئے بلانے آئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے اس کے کانوں میں میری بات چیت کا آخری حصہ پڑ گیا تھا۔ اس نے پوچھا "نہ رہ سکیں گے! کون نہیں رہ سکے گا؟"

شمپین نے کہا "روی کل یہاں سے چلا جائے گا منو! خیر چلا جائے۔ اچھا ہی ہے۔ رقابت کے مارے میری تو کئی راتوں سے نیند حرام ہو گئی ہے۔"

منو ہنس پڑی۔ بولی "رات دن کیا مذاق کرتے رہتے ہو!"

اس رات کھانے کے وقت اور کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ شمپین نے ایک آدھ بار مذاق کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کی بات کوئی نہیں سنتا وہ خاموش ہو کر رہ گیا۔

اچانک اس گھر کو چھوڑ کر چلے جانے کا اپنا ارادہ ظاہر کر کے مجھے نہ جانے کیوں اپنے اوپر شرم آنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا گویا منو بھی میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ مجھے بھات پڑستے وقت ایک بار نظریں جو ملیں تو اس نے ہنس کر کہا "معلوم ہوتا ہے آپ ہمارے روکھے سوکھے کھانے سے گھبرا کر بھاگ رہے ہیں!"

"اور چاہے کچھ بھی کہو، روی پر یہ الزام تم نہیں لگا سکتیں منو۔ تمہارا کھانا تو کیا جیل کی "لپسی" اور فرانسیسی "شیف" کے کھانے کا فرق روی سمجھ سکتا ہے۔ اس کا بڑے سے بڑا دشمن بھی اس پر یہ الزام نہیں لگا سکتا!" کہہ کر شمپین ہنس پڑا۔

دوسرے دن سویرے جب سوکر اٹھا تو زیادہ دیر نہ ہوئی تھی۔ پھر بھی اپنے معمول کے مطابق نو بجے سے پہلے بستر چھوڑنا جس کے اصول کے خلاف تھا۔ وہ شمپین اتنے سویرے اٹھ کر کہاں غائب ہو گیا؟ گھر میں اس کا پتہ نہ تھا۔

میرا تھوڑا سا سامان تھا وہ ایک پوٹلی میں باندھ رہا تھا۔ اتنے میں منو آکر چوکھٹ پر بیٹھ گئی اور بولی "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

بلا وجہ جھجکتے ہوئے میں بولا "آج مجھے جانا ہے!" یہ سن کر پھر اس نے کچھ نہ کہا۔ میری طرف لمحہ بھر عجیب نظروں سے دیکھ کر خاموشی سے اٹھ گئی۔ اس کے اس نئے اور اپنائیت کے تخاطب

سے مجھے جو تعجب ہوا تھا وہ ابھی دور نہ ہوا تھا۔

میرا سامان بندھ چکا تھا۔ صرف شمیم سے ملاقات کئے بغیر اور منو سے ایک بار اچھی طرح وداع لئے بغیر چلے جانا مناسب ہوگا یا نہیں، یہی سوچ رہا تھا۔ کبھی یہ بھی شبہ ہونے لگتا تھا کہ شمیم کا اس طرح صبح صبح اچانک غائب ہو جانا کہیں مجھے روکنے کا بہانہ تو نہیں ہے۔

لیکن تھوڑی دیر بعد ہی منو پھر آئی اور دروازے سے میری طرف دیکھے بغیر بولی: "اگر بالکل جانا ہی چاہتے ہو تو کھانا کھا کر جانا۔ میں نے کھانا چڑھا دیا ہے۔"

منو کی بات سے میرا ارادہ بالکل پکا ہوگیا۔ زیادہ دیر یہاں رہنے پر اتنی ہمت برقرار رہے گی کہ یہاں سے جا سکوں۔ مجھے اس بات میں شک ہونے لگا تھا۔ چنانچہ جلدی سے بول اٹھا "نہیں نہیں اب کھانے پینے کا وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی جانا ہے۔" اور میں پوٹلی ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

منو کیا یک ہنس پڑی۔ بولی "اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے؟ ہم لوگ زبردستی تو تمہیں یہاں نہیں باندھ سکتے۔"

شمیم ہوتا تو شاید اس بات کا جواب دیتا۔ منو کے سامنے خاموش رہ جانا پڑا۔

منو نے پھر ہنس کر کہا۔ "اخلاق کی خاطر ہی سہی، میری بات سے انکار تو نہ کرنا چاہیے تھا۔ ایسے منہ چڑھ آدمی ملک کو آزاد کرنے چلے ہیں۔ تم فوراً گھر واپس چلے جاؤ، سمجھے؟"

میں گونگا تو نہیں ہوں۔ لیکن اس دن اس لڑکی کے سامنے میری زبان پر تالے پڑ گئے تھے۔ مجرم کی طرح خاموش سر جھکائے پوٹلی لے کر دروازے سے باہر آگیا۔ منو پہلے تو دروازہ چھوڑ کر پرے ہٹ گئی تھی۔ لیکن پھر میرے قدم آگے بڑھانے سے پہلے ہی اس نے جھٹ میرا داہنا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں سہم کر کھڑا ہوگیا۔ یہ اس کی کیسی عجیب حرکت ہے!

مجھے بھونچکا دیکھ کر منو پھر ہنس پڑی۔ "اب اگر تمہیں پکڑ کر باندھ دوں تو؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ پھر بول اٹھی۔ "سوچتے ہوگے کیسی بے حیا، بے شرم لڑکی ہے۔ ٹھیک ہے نا؟ نفرت اور غصے سے شاید سارا جسم کانپ رہا ہوگا!

اس کے بعد میرا ہاتھ چھوڑ کر بولی۔ "لیکن تمہارے جیسے آدمی کے ساتھ مذاق کرنا بھی پاپ ہے۔" اور پھر گھر کے دروازے تک میرے ساتھ ساتھ آکر دروازے کے ساتھ کھڑی ہوکر اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "میرے بارے میں چاہے کچھ بھی سوچنا لیکن میرے سلوک سے ساری عورت ذات کو غلط نہ سمجھ بیٹھنا۔ حالانکہ تمہارے جیسے آدمی سے یہ کچھ بعید نہیں!"

میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکا۔ اتنا ضرور دیکھا کہ اس وقت بھی وہ ہنس رہی تھی۔ نشے کی حالت میں راستہ چلتے چلتے مجھے محسوس ہوا کہ آج تک ایسی ہنسی اس کے چہرے پر کبھی نہ دیکھی تھی۔

× × × × ×

کہاں جاؤں گا، کچھ طے نہ کر پایا تھا، بلا مقصد راستے پر چلا جا رہا تھا۔

شمیم کب میرے پیچھے لگ لیا تھا، یہ بھی پتہ نہ چلا۔ اچانک میری کمر پر ایک دھول جما کر اس نے پوچھا۔ "اس طرح کیا سوچتا چلا جا رہا ہے۔ بول نا! میں پانچ منٹ سے تیرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہوں۔"

میں جو کچھ سوچ رہا تھا وہ شمیم کو بتاتا تو وہ کنارہ خود میرے ذہن میں بھی زیادہ واضح نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے اس کی طرف مڑ کر صرف اتنا کہہ سکا۔ "آج تم سویرے کہاں چلے گئے تھے؟"

اس بات کا جواب نہ دیکر شمیم نے کہا۔ "تو تو واقعی جا رہا ہے۔ میرا خیال تھا تو مجھ سے ملے بغیر تو کبھی نہ جا سکے گا۔ لیکن تو بے بھیشم کی ذات کا آدمی۔ تیرے لئے سب کچھ ممکن ہے۔"

اس سے پہلے منو نے بھی یہی بات کہی تھی۔ شمیم کی بات کا جواب نہ دے کر آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شمیم نے پوچھا۔ "لیکن جا کہاں رہا ہے؟ پہلے جو تیرا ٹھکانہ تھا وہاں تو میرا خیال ہے جانے کا کوئی امکان نہیں۔"

بات صحیح تھی۔ میں نے جواب دیا۔ "ابھی کچھ سوچ نہیں سکا ہوں۔"

"سوچنے کو رکھا ہی کیا ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "کلکتے

کی سڑکوں کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی فٹ پاتھ ہیں۔ دیکھ بھال کر ایک پورٹیکو میں بسیرا لینے پر میں نے دیکھا ہے۔ موسلا دھار بارش میں بھی ایک بوچھار نہیں آتی۔ سر کے نیچے رکھنے کے لئے ایک اینٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُس کا ملنا بھی دشوار نہیں ہوتا اس لئے تو جہاں بھی رہے گا اچھا ہی رہے گا۔

اس کے بات کرنے کے انداز میں ہنس پڑا۔

اُس نے پھر کہا "میرے ساتھ تو تو اب کہیں نہیں رہ سکے گا لیکن میری ایک بات سُن کر کہیں جا بھارت کی جنگ تو نہیں چھیڑ دے گا، بول؟

میں نے پوچھا۔ کیا بات ہے؟

"فٹ پاتھ سے کچھ ہی بہتر ایک جگہ میری دیکھی ہوئی ہے۔ کوئی خاص تو جگہ نہیں ایک مَیس ہے۔ ملک کی خاطر جو تین بار جیل ہو آیا ہو۔ اُس کے لئے وہاں کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ اس لئے اُمید ہے بسن بات سین اور ڈی ویلرا کی مَیس میں تو آرام سے رہے گا!"

مَیس کا پتہ وغیرہ اُس نے بتا دیا تھا۔ تجویز بری نہ تھی۔ لیکن پھر بھی میں تذبذب میں پڑ گیا۔

شمیم نے میرے دل کی بات کو بھانپ کر کہا "نہیں نہیں۔ روپے پیسے کی فکر نہ کرو۔ جب بھی سہولت سے ممکن ہو کچھ دے دینا۔ تقدا اگر کوئی چیز وہاں درکار ہے تو جذبۂ حب الوطنی۔ اور یہ تیرے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہُوا ہے۔ لوگ تجھے دیکھتے ہی یہ بات سمجھ جائیں گے۔ اچھا تو میں چلتا ہوں" کہہ کر شمیم نے اجازت مانگی اور چلا گیا۔

پتہ لگاتے لگاتے جب میں اُس مَیس میں پہنچا تو دوپہر ہو گئی تھی۔ کھدر کی گاندھی ٹوپی ایک دُبلا پتلا لڑکا میس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اُس سے پوچھا کہ میس میں رہنے کے لئے جگہ ہے یا نہیں موٹے چشمے کے اندر سے لو پھر وہ غور سے میری طرف دیکھتا رہا اور سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لینے کے بعد بولا "آپ کا ہی نام روبن بابو ہے؟"

اگلے ہی لمحہ بڑی عزت سے مجھے سلام کر کے لڑکے نے کہا "واہ میں آپ ہی کے انتظار میں تو کھڑا تھا۔ دیر کیسے ہو گئی؟"

معاملہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن کچھ پوچھنے سے پہلے ہی لڑکے نے جلدی سے کہا "اُوپر آئیے۔ آپ کے لئے اوپر ہی ایک سیٹ طے کی گئی ہے۔" اور پوٹلی گویا زبردستی میرے ہاتھ سے چھین وہ ویب کے زینے سے اُوپر چڑھ گیا۔

مجبور ہو کر اُس کے پیچھے پیچھے چلنا پڑا۔ لیکن یہ راز کچھ میں آیا۔ تھوڑی دیر کے تعارف سے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ لڑکا بڑا باتونی ہے فضول کی بکواس کئے جا رہا تھا۔ سنگل سیٹ کا نام تو اس میس میں کوئی ہے ہی نہیں۔ ڈبل سیٹ کا بھی ایک یہی ہے آپ کو جو سے زمین کو زبردستی بھیجا گیا ہے۔ وہ آسانی سے تھوڑا ہی جانا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہوں گے وہ رجنی بابو کی سیٹ تھی۔ سرکاری قیدی رجنی مکرجی۔ سمجھ گئے آپ؟

باتوں کی اس جھڑی میں کچھ پوچھنے کی گنجائش نہ دیکھ کر خاموش ہی رہا۔ لیکن اسکی باتوں سے ہی راز کھل گیا۔

وہ کہہ رہا تھا "سنا ہے آپ تنہائی چاہتے ہیں۔ لیکن کیا کریں بتائیے کمرہ تو ہے نہیں سبھی کمروں میں پانچ پانچ چھ چھ آدمی ہیں۔ آخر شمیم بابو نے کہا یہ بات ہے تو پھر مجبوری ہے۔ یہی سیٹ دیدو۔ وہ تو ایک ماہ کا پورا خرچ دے رہے تھے ہم نے کہا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم لوگ یہاں دکان لگا کر تھوڑا ہی بیٹھے ہیں!"

× × × × ×

ایک چھوٹا سا گھر۔

اُسی کے اندر بقول شمیم مستقبل کے ہمیں بامیس ڈی ویلرا اور سن یات سین رہتے ہیں۔

لیکن چھوٹا ہونے پر بھی اس گھر کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

اس گھر کے کسی کمرے میں شاید دلیش بندھو رہتے تھے۔ اس گھر سے ہی وطن کا ایک سپوت ملک کے لئے اپنی قربانی دینے مانڈلے کی جیل میں گیا تھا۔

سال بھر میں دو بار اس گھر میں پولیس کا آنا معمولی بات تھی مَیس کے قیام کے دوران میں وہاں کی پوری داستان سننے کی نوبت کئی بار آئی۔ فضول کی بکواس کرنے کی عادت کے باوجود مجھے یہ لڑکا اچھا لگتا تھا۔ کمرے میں میرا ساتھی بھی یہی تھا۔ اسے دیکھ کر محسوس

ہوتا تھا۔ کہ وہ صرف عقل کے خوابوں کی دُنیا سے باہر نہ نکلا تھا۔ وہ اپنی عمر کے ساتھ نہ بڑھا تھا۔ اور شاید کبھی نہ بڑھ سکے گا۔ اس کا چھوٹا دُبلا پتلا جسم جس کے اندر انکساری اور دوسروں کی خاطر خود کو مٹا دینے کا جذبہ تھا۔ اسکی ان خصوصیات کو بزدلی سے منسوب کیا جا سکتا تھا۔ دوسروں کے سامنے وہ چھوٹا بن کر رہنا چاہتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا خوابوں اور عقیدت میں ہی اس کی زندگی کی حقیقت پوشیدہ ہو۔ اس نے ہمیشہ اوپر نظر اٹھا کر ہی انسان کو دیکھا تھا۔ نیچی نظروں سے کسی کو دیکھنا اس نے نہ سیکھا تھا۔

اس کے ساتھ تفصیلی گفتگو کر کے مجھے بڑا تعجب ہوا۔

اسکی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ وطن میں اسکی بیوہ ماں تھی۔ کئی چھوٹے چھوٹے بھائی بہن تھے۔ بڑی اُمیدوں کے ساتھ تمام آسائشوں سے خود کو محروم کر کے اسکی ماں نے جس لڑکے کو پڑھنے کے لئے کلکتہ بھیجا تھا۔ وہ واپس گھر نہیں لوٹا۔ زندہ ہے یا مردہ، اسکی بھی کوئی خبر اس نے اپنی ماں کو نہیں بھجوائی۔

وِنے نے غمگین انداز سے مسکرا کر کہا۔ "گھر پہ ماں فاقے کر رہی ہے اور یہاں میں ملک کی خدمت کر رہا ہوں۔ یہ مذاق معلوم ہوتا ہے نہ روی دادا!"

اس کے بعد وہ خود بخود کہتا گیا۔ لیکن سارے بنگال کی ماؤں کے بیٹے مر گئے ہیں روی دادا۔ اُن کے غم میں میری ماں کا غم بھی شامل ہے۔

اتنا نازک مزاج اور جذباتی تھا وِنے۔

کسی دوسرے کے منہ سے سنتا تو شاید یہ باتیں مصنوعی معلوم ہوتیں۔ لیکن وِنے کے منہ سے سُن کر کوئی غلط نہ معلوم ہوئی۔

وِنے کہتا گیا۔ اپنی قابلیت کے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے روی دادا! ملک تو دُور رہا اپنی ماں کا دُکھ دور کرنے کی بھی اہلیت مجھ میں نہیں ہے۔ دُنیا کے ناکارہ اور نااہل لوگوں میں میرا شمار ہوتا ہے، یہ میں جانتا ہوں لیکن زندگی کے کسی بنیادی مقصد میں اپنی نااہلیت ظاہر کر کے میں زندہ نہیں رہنا چاہتا روی دادا!

تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس نے پھر کہا۔ پروانے کو اگر جلنا

ہی ہے تو اسے کم از کم یہ اطمینان تو ہو۔ کہ وہ روشنی حاصل کرنے کی کوشش میں جل رہا ہے۔"

ہم دونوں لمحہ بھر خاموش بیٹھے رہے۔

کھڑکی کے باہر ویران نظروں سے دیکھتا ہوا وِنے شاید اپنی اہمیت اور وجود کو شاعری کا رنگ دے کر دلکش بنا رہا تھا۔ ادھر میں یکایک اپنے دل کی تیز دھڑکن کا خیال کر کے شرمندہ ہو گیا پچھلے کئی دنوں سے میرا تخیل جس مقصد کے حصول کے لئے چکر کاٹ رہا ہے۔ اُسکا ٹھکانہ کہاں ہے۔ اس بات کو ... چھپا نہ سکتا تھا۔ یہی سب کچھ سوچ کر میں شرمندہ ہی نہیں خوفزدہ بھی تھا۔

عورت کے بغیر زندگی کا خواب میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میری زندگی کو ناکامیابی کے راستے سے ہٹانے والی جس عورت کے بارے میں میں نے اپنے ذہن میں تشکیل کی تھی۔ وہ مجھے زندگی میں ابھی تک نہ ملی تھی۔ سوچا تھا عورت پر کٹے ہوئے پرندے کی مانند میری آغوش میں آ کر گر جائے گی، میری پناہ کی طلبگار ہوگی لیکن یہ خواب زندگی میں شاید پورے نہ ہوں گے۔

اچانک شمیمن کی بات سے میرا دھیان ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ کب سے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہنستے ہنستے اور پھر سنجیدہ چہرہ بنا کر اس نے کہا۔

"مجھے بڑا اطمینان ہوا وِنے۔ ملک کے لئے اسی لگن کی ضرورت ہے۔ نیچے مکان مالک میس کا کرایہ لینے آیا ہے۔ کرایہ کے بدلے تمہارے رسوئیے جہاں نے اسکی گردن پکڑ کر باہر نکال دیا ہے۔ تم لوگوں کے اس میس کے جھگڑے سے آدھا کلکتہ پریشان ہے۔ لیکن تم لوگوں کے کان پہ اگر جوں نہیں رینگتی تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔"

وِنے کچھ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ شمیمن نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ کہتا گیا۔ "ملک کی خدمت کے لئے جو لوگ آتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی کوئی تو صرف اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیتے ہیں ہتھکڑی پہننے کے لئے! لیکن اس کے علاوہ کچھ دماغ بھی خرچ کرنا پڑتا ہے، یہ بات وہ لوگ نہیں جانتے۔

شمیمن کی تقریر جاری تھی کہ ایک گھنے اور اُلجھے بالوں والا میلا کچیلا لحیم شحیم لڑکا گھبرایا ہوا آ کر بولا۔ دیکھو تو سہی وِنے تیرے

صندوق میں کیا ہے؟ جو کچھ ہے باہر نکال دے۔ آج اُس سالے کے سامنے سب روپے پھینک کر کل ہی یہ مکان چھوڑ دیں گے۔ جو کچھ بھی ہو تم نکال کر رکھو۔ ردی مدد امیں ابھی آتا ہوں۔“ اُس کے آخری الفاظ باہر سے سُنے گئے۔

پوچھ تاچھ کرکے جو کچھ معلوم ہُوا اُس میں مالک مکان کی زیادہ غلطی نظر نہ آئی۔ اُس کا شاید ۸ مہینے کا کرایہ واجب الادا تھا۔ وہ کرایہ مانگنے آیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کرایہ مانگتے ہوئے دیہاتی لڑکوں کے لئے اس کے منہ سے کوئی تلخ بات نکل گئی۔ یہ بے عزتی شاید اور سب برداشت کر سکتے تھے لیکن بھارا سوئیا برداشت نہ کر سکا۔ اسی وجہ سے جھگڑا شروع ہُوا۔

اخیر میں سب کا اثاثہ جمع کرکے جو کچھ اکٹھا ہُوا اس سے ۲ ماہ سے زیادہ کا کرایہ ادا نہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مالک مکان کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اُسے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہ ہو رہا تھا۔

× × × × ×

دو مہینے کے کرایہ کے ساتھ مکان مالکوں کی لالچ کے بارے میں سو دو سو چیدہ چیدہ گالیاں دے کر سبحان اُسے رخصت کر آیا اور ہمارے کمرے میں گھس کر اپنے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہُوا دھپ سے بیٹھ گیا اور بولا۔ ”آج تو ایکادشی ہے!“

دو چار دنوں کے اندر ہی میں نے میس کا رنگ ڈھنگ دیکھ لیا تھا۔ صبح کا کھانا کھانے کے بعد کوئی یقین کے ساتھ نہ کہہ سکتا تھا کہ شام کو کھانا بنے گا یا نہیں۔ اکٹھے دونوں وقت کے کھانے کا بھروسہ یہاں بہت کم لوگ کرتے تھے۔ اس لئے آج کھانا نہ بنے گا یہ جان کر کسی کو تعجب نہ ہُوا۔ پھر بھی ہم میں سے کسی کے چہرے لٹک گئے۔

معلوم ہوتا تھا آج میس کی مالی حالت دوسرے دنوں سے کچھ زیادہ خراب تھی۔ بنگالیوں کو اپنے کھانے پینے کی عادت بدلنی چاہیئے، پروٹین سے جسم کی طاقت بڑھتی ہے۔ ہندوستانیوں کی صحت کا منبع کیا ہے۔ ان سب باتوں کے بارے میں تقریر کرکے سبحان نے سب کو ستو کی آزمائش کرنے پر آمادہ کیا۔ اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر سب نے آزمائش کی ضرور۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ اس آزمائش سے بہت سے لوگ مطمئن نہ ہوئے۔ صبح ستو کھانے کے بعد شام کو کھانے کی بات کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھی۔

میس کا انتظام سبحان کے ہاتھ تھا۔ سخت سے سخت حالتیں بھی اُسے کبھی ہمت ہارتے نہ دیکھا تھا۔ آج اُسے بھی مایوس دیکھ کر سب کا دل بیٹھ گیا۔ سبحان نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا: ”غصے میں آکر کرایہ نہ دینا ہی بہتر تھا۔ اب تو سب کچھ بیچ دینے پر بھی ایک پائی نہ ملے گی۔“ وہ دروازے کی طرف منہ کرکے بیٹھا تھا۔ یکایک چونک کر بولا۔ ”لیکن یہ دھواں کہاں سے آرہا ہے۔ مہاراج نے چولہے میں آگ تو نہیں سلگائی ہے؟“

چولہے میں آگ! یہاں کا حال مہاراج سے پوشیدہ نہیں ہے تین سال سے وہ یہاں کام کر رہا ہے۔ اور تین سال کے اندر اُس کی ایک سال کی تنخواہ باقی ہے۔ آرڈر حاصل ہونے سے پہلے چولہا سلگانے کی طاقت تو وہ نہیں کر سکتا۔

لیکن رسوئی گھر سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ تجسس کے مارے سب کے سب نیچے اتر پڑے۔ مہاراج نے جھجکتے ہوئے کہا کہ آج تنخواہ ملنے پر وہ مودی کی دکان سے کچھ دال چاول خرید لایا ہے۔

ہمارے یہاں کام کرنے کے علاوہ صبح شام سڑک کے نل سے پانی بھرنے کا کام کرکے مہاراج کو ماہ بماہ کچھ نہ کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔

سبحان نے ناراض ہو کر کہا: ”یہ تمہاری بڑی بے انصافی ہے مہاراج۔ ہم تمہاری ایک سال کی تنخواہ تو دے نہیں سکے۔ اس کے باوجود......“

شمیم نے اُسے روک کر کہا: ”خاموش رہو سبحان! انسان کی عظمت کو سیدھی طرح تسلیم کر لینا چاہیئے۔ تعریف کرکے اس کو مزید بنانا گناہ ہے۔“

وہ نے ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ اُس نے کچھ جھنجھلاتے ہوئے لہجہ میں کہا: ”ارے سُن! ردین منّو نے تجھے بلایا ہے۔ ایک بار ہو آنا۔“ اور باہر جاکر ایک بار پھر چلّا کر کہا: ”بہت ضروری ہے یہ بات۔ اسی لئے آیا ہوں۔“

× × × × ×

منّو سے ملنے نہیں گیا۔ لیکن اس بات کو کسی طرح فراموش نہ کر سکا۔ ایک بار جاکر مل آتا تو بات آسانی سے ختم ہو جاتی۔ بار بار یہ سوچ کر کہ میری یہ ضد ایک دھوکا ہے۔ دل میں بڑی کشمکش ہوتی تھی

لیکن اگر پہر آ کا قصیدا صبح لوٹ جاتا۔ دل کو مارے ہوئے سارا دن گھر میں بیٹھا رہا۔ یہ سوچتے ہیں کہ مَنو نے کیوں بلایا ہے کوئی نقصان نہ تھا۔ نقصان تو دوا ان جانے میں تھا۔

اپنے دل کو میں نے اسی طرح بہلایا ہے۔

× × × × ×

تین دن کے بعد اچانک سویرے سویرے شمین پھر آموجود ہوا۔ سوچا منو کے یا شہر ہی نہیں گیا۔ اس کا طعنہ دینے آیا ہوگا۔ لیکن اُس نے اس طرف اشارہ تک نہ کیا۔ اس سے اطمینان ہونا مناسب تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے مایوسی ہوئی۔

بستر پہ ایک کنارے بیٹھ کر شمین نے کہا۔ "میں تمہیں جانتا تھا کہ تم اتنا بے شرم سے ہو دی"

اُس کے اس مذاق کا اشارہ کس طرف ہے۔ یہ نہ سمجھ کر میں نے کچھ تعجب سے اسکی طرف دیکھا۔ اُس نے ہنس کر کہا۔ "تعجب کی کوئی بات نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دھرمشالہ ہے یا لنگر؟ بیٹھا بیٹھا کب روٹی توڑتا رہے گا؟"

"لیکن تمہارا حب الوطن تو اب بھی گھر میں موجود ہے شمین! تم نے تو کہا تھا کہ یہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں!"

شمین کب دینے والا تھا۔ اُس نے کہا۔ "لیکن اس وقت یہ نہ معلوم تھا کہ تمہیں مہاراج کے سہارے چلے گا۔"

سبحان شاید باہر کھڑا تھا۔ شمین کی آواز سُن کر اندر آ کر بولا۔ "فضول کا ہمیں بدنام نہ کرو شمین دادا! آجکل ہم حسبِ دستور دیوالئے ہیں۔ ضرورت ہو تو مہینہ دو مہینہ ہمارے مہمان بن کر رہ سکتے ہو"

"مہاراج دن میں تو نل چلاتا ہے۔ رات کو تمہارے لئے نقب لگاتا ہے کیا؟"

"بڑے افسوس کی بات ہے شمین دادا، مہاراج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔"

شمین نے بڑے تعجب سے پوچھا کیوں کیسے؟ اس میس کے اندر وہی تو سب سے بڑا محب الوطن تھا۔ تنخواہ نہ لے کر بھی اُس نے دو سال شوقیہ نوکری کی۔ یقین نہیں آتا۔ کہ وہی ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔" کچھ دیر رُک کر شمین نے پھر کہا۔ "تم لوگ شاید اُس کی تنخواہ چکا دینا چاہتے تھے۔ شاید اس ہتک سے وہ جلاوطن ہونے پر مجبور ہوا"

سب ہنس پڑے۔ ہنسی رُکی تو ونے نے کہا۔ "نہیں شمین دادا مہاراج کے جانے سے واقعی بڑی پریشانی ہو گئی ہے۔ اس میس کے ہر آدمی کی اتنی خدمتگذاری اور کوئی نہ کر سکے گا۔ اور وہ گیا صرف سبحان کی غلطی سے"

سبحان نے تیز ہو کر کہا۔ "میری غلطی ہے؟"

اُسے جواب نہ دے کر ونے نے اپنی بات جاری رکھی۔ اچانک اُس کی مذہبیت جاگ اُٹھی۔ خالی میز پر کھانا نہ کھا کر پیچھے پڑا پکانا شروع کیا۔ اس سے بھی کچھ نہ ہوا۔ سبحان سے مہاراج کو عقیدت تھی۔ ہم لوگ اسے مسلمان کہہ کر چڑاتے لیکن وہ اسے مذاق سمجھ کر ٹال دیتا۔ لیکن آخر میں انکا صبح شام نماز پڑھنا دیکھ کر اُسے شبہ ہوا۔ پھر بھی اسکا اعتقاد صرف سبحان کے اوپر تھا۔ ایک دن اُس نے ڈرتے ڈرتے سبحان سے پوچھ ہی لیا۔ "یہ شام سویرے آپ کیا کرتے ہیں بابو؟" تب بھی اگر سبحان بات ٹال دیتا تو کچھ نہ بگڑتا۔ لیکن کم بخت نے پنڈت جی کے سر پہ کھڑی اینٹ ماری: "میں نماز پڑھتا ہوں۔ مسلمان جو ہوں" لیکن تب بھی مہاراج کو اس کی بات پہ یقین نہ آیا۔ اُن کے نزدیک سبحان کسی اوتار سے کم نہ تھا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کچھ جھجک کر کہا۔ "آپ دل لگی کر رہے ہو بابو" لیکن سبحان بھی ایک ضدی ہے۔ وہ کب چھوڑنے والا تھا۔ اُن کو یقین دلا کر ہی دم لیا۔ . . ."

بیچ میں ہی اُس کی بات کاٹ کر سبحان نے کہا "اور تب شمین دادا تم نے اپنے محب الوطن کا غصہ دیکھا ہوتا۔ اُس نے ہماری جوتہ پشتوں کو کوس ڈالا۔ اتنے دنوں کی حب الوطنی مذہب کے سیلاب میں نہ جانے کہاں بہہ گئی۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر شمین نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "ہندوؤں کی حب الوطنی کا ہمیشہ یہی حشر ہوا ہے"۔

ہم لوگ ہنس پڑے۔ ونے نے کہا۔ "پوری بات کہنے دو سبحان۔ اُس کے بعد شمین دادا، مہاراج تو ناراض ہو کر چلا گیا ہم نے سوچا بیچارہ کفارہ ادا کر کے اپنے وطن لوٹ جائے گا۔

لیکن اس کے اگلے ہی دن وہ پھر آ موجود ہوا۔ وہ سیدھا سبحان کے کمرے میں گیا۔ اور سبحان کے پاؤں پڑنے کے علاوہ اُس نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وہ سبحان کی شدھی کر کے ہندو بنا لینا چاہتا تھا۔ اپنے گاؤں کے ایک مسلمان کو اُس نے ہندو بنتے دیکھا تھا۔ اُس نے کہا "اصل میں تو آپ ہندو ہیں بابو جی ہندو۔ اُن کا یہ رہن سہن دیکھ کر ہی میں نے سمجھ لیا ہے۔ پچھلے جنم میں کوئی چھوٹی سی خطا ہو گئی ہو گی۔ بو اسی لئے آپ کو ملیچھ کا جامہ پہننا پڑا۔ آپ کو شدھی کے لئے تیار ہونا پڑے گا۔

شمیم زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ بولا "سارے مسائل کا اتنا بڑھیا حل! یہ آئیڈیا صرف مہاراج کے ذہن میں ہی آسکتا ہے۔ تمہیں مہاراج کا ممنون ہونا چاہیئے سبحان!"

لیکن سبحان سنجیدہ ہو گیا۔ بولا "یہ مذاق کی بات نہیں ہے شمیم دادا۔ تمہارے اس مہاراج کی تجویز سے مجھے واقعی ڈر محسوس ہوتا ہے۔ ہمیں کے چولہے میں آگ سلگا تے سلگاتے وہ ایک دن سارے ملک میں آگ لگا دے گا تم دیکھ لینا۔ یہ مہاراج عام ہندو کا مثالی نمونہ ہے اور شدھی تحریک ان کی ذہنیت کا آئینہ ہے۔ شدھی تحریک سے انسان پاک ہوتا ہے یا نہیں، یہ تو میں نہیں کہہ سکتا البتہ اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ملک کی آزادی کے دروازے ہر طرف سے بند ہو جائیں گے۔

شمیم کچھ بے چین ہو گیا۔ اُس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے بدلے ثروت نے جواب دیا۔ وہ سبحان کے ساتھ ایک ہی صبح، ایک ہی گاؤں سے آیا تھا۔ دونوں میں جتنی گہری دوستی خیالات میں اتنا ہی اختلاف تھا۔ کسی نے کبھی ان دونوں کو ایک بات پر متفق ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

اختلاف ظاہر کرتے ہوئے ثروت نے کہا۔ "تمہارے اصول اور تمہاری دلیل میں سے کسی سے بھی میں متفق نہیں ہوں۔ تمہارا چند آدمیوں کو ہندو بنانے اور ہمارے دو چار مسلمانوں کو ہندو بنا لینے سے ملک تباہ ہو جانے کی دلیل میں نہیں مانتا۔

سبحان نے جوش میں آکر کہا "میں نے یہ تو نہیں کہا ثروت کہ صرف مسلمان کو ہندو بنانے سے ملک تباہ ہو جائیگا۔ تم لوگ کتنے بھی آدمیوں کو ہندو بناؤ۔ لیکن تمہارا مہاراج تو صرف ہندو بنانا نہیں چاہتا بلکہ وہ تو میری شدھی کرنا چاہتا ہے۔ ہم لوگ اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے جاتے ہیں تو کہتے ہیں تمہارا مذہب خراب ہے ہمارا اچھا ہے۔ تم ہمارا مذہب اپناؤ۔ تم لوگ مذہب کی تبلیغ کے لئے کہتے ہو۔ تمہارا جسم گندہ ہے۔ تمہارا لمس ناپاک ہے۔ تمہیں پاک کریں گے۔ میرے چھونے سے تمہارا کھانا پینا خراب ہو جائے گا۔ چوکھٹ کے اندر قدم رکھنے سے تمہارا مندر ناپاک ہو جائے گا۔ ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود ہم لوگ یہ توہین بہت دنوں سے برداشت کرتے آئے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے مذہب کا پہلا سبق دیتے ہوئے بھی تم نہ سکو گے کہ کہو گے کہ تمہیں پہلے شدھ کرنا پڑیگا۔ اتنی بڑی توہین سے اگر ہمارا مذہب ہی نہیں بلکہ انسانیت بھی بغاوت کر بیٹھے تو اس میں تعجب کی بات نہ ہو گی۔

وہ کچھ کہنے لگا تھا۔ اُس نے روک کر سبحان نے پھر کہا۔ "آپس کے اس جھگڑے اور رنجش کا انجام یہ ہو گا کہ ہم لوگ مذہب کی دیوار اتنی اونچی اٹھا دیں گے کہ ہماری نظر اس میں اُلجھ کر رہ جائے گی۔ ملک ہمیں نظر تک نہ آئے گا۔ مجھے نظر آتا ہے کہ اس حالت پہ پہنچنے میں اب دیر نہیں ہے۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری تمہارے متعصب ہندوؤں پر ہے!"

ثروت نے تالی بجا کر اور منہ چڑا کر کہا۔ "واہ مولوی صاحب کیا مچھے دار باتیں کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے پچھلے کئی دنوں سے بڑے زور شور سے کپڑا بچھا کر کھانے اور دھوتی کی لانگ کھول کر اُٹھنے بیٹھنے کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ اچھا میں یہ تو مانتا ہوں کہ شدھی کی تحریک سے ملک تباہ ہو جائے گا۔ لیکن ملک کو تباہی کے غار سے نکالنے کی کیا ترکیب ہے، ذرا یہ بتائیے!"

سبحان ہنس پڑا۔ ثروت کے سر پہ ایک چپت لگا کر بولا۔ "تیرے ساتھ اتنی دیر ناحق مغز پچی کی۔ لیکن اتنا کہے دیتا ہوں کہ ملک اگر کسی دن آزاد ہوا تو مسلمان ہو کر ہی ہو گا۔"

سب لوگ ہنس پڑے۔ شمیم نے کہا "تم نے کوئی غلط بات نہیں کی سبحان۔ اسلام کے مقابلہ میں باقی سارے مذہب ٹھنڈے معلوم ہوتے ہیں۔ جذبات کو سرد کرنا ہی اُن کا کام معلوم ہوتا ہے۔ صرف یہی ایک ایسا مذہب ہے۔ جو خون میں گرمی پیدا کرتا ہے۔ اب مجھے

کر بیٹھا ہو تو تبھی ایسا ہونے دینا کہ سر کر ڈالا۔ کل سے سبھی
تو سامنے تک مٹا ڈالے!"

نصرت نے کہا: "جو تم ہو ان باتوں سے شمیم دادا، بھلا
ہونے سے پہلے اگر شادی ہو سکتی ہے تو آؤ ہم سب لوگ بیٹھ کر
پڑھ ڈالیں۔ اس کے بعد شادی ہونے پر پھر ہندو ہو جائیں گے، خواہ
لڑکی نے ہندو ہی رہیں۔"

سبحان کچھ جواب دینے والا تھا۔ لیکن اس کو بولنے
سے پہلے ہی بات کا رخ بدل دینے کی غرض سے شمیم نے کہا: "لیکن
میں سمجھا تو ـــــ ابھی تک کچھ بھی نہیں۔ میں ابھی تک یہ نہ سمجھ
سکا کہ تمہارے میس کی حالت اچانک کیسے تبدیل ہو گئی؟"

"دادا یہ بھی نہیں جانتے! ہمارے گوپال بابو نے شادی
کی ہے۔ گوپال کو تو جانتے ہوگے۔ وہی جو کچھ دن بڑے جوش و
خروش سے ملک کی فلاح و بہبود کی تحریک چلا رہا تھا۔ تم کہتے
تھے اسے اخبار نہیں۔ لیکن وہ بھی بھیگی بلی ہے۔" یہ کہہ کر سبحان
منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا۔

"اسکو اچھی طرح یاد ہے۔ لیکن اسکی شادی اور میس کی
حالت تبدیل ہونے کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ بہتیرا سوچنے پر بھی یہ بات
سمجھ میں نہیں آئی۔"

"تعلق بھلا کیا ہوگا۔ شادی کی خوشی میں اس نے اپنے
پرانے ساتھیوں کی امداد کے لئے تین سو روپیہ دے ڈالا۔"

شمیم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ونے بول اٹھا۔ "جھوٹ
بات ہے شمیم دادا۔ نصرت اور سبحان دونوں نے سازش کر
کے گوپال سے یہ روپیہ اینٹھا ہے۔ یہ یقیناً بلیک میل ہے۔ دادا وہ بیچارہ
کھدر چھوڑ کر خوشنما پوشاک اختیار کر کے ایک پولیس انسپکٹر کی اکلوتی
لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی تجویز سوچ رہا تھا۔ اس لالچ میں
کہ خاصی رقم بھی ملے گی اور اچھی نوکری بھی۔ لیکن نصرت نے نہ معلوم
کہاں سے یہ خبر سبحان کو دے دی۔ اس نے سن کر کہا، پھر تو ہم میس
کی حالت مزید بدل دیں گے۔ دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے
گوپال کو لکھا کہ یہ خط دیکھتے ہی اگر اس نے میس کے لئے تین سو روپے
نہ بھیجے تو وہ اس کے ہونے والے سسر کو جا کر بتا دیں گے کہ وہ انقلابی
پارٹی کا آدمی ہے۔ بلکہ اسے دیہاتی ڈاکوؤں کا سردار بتا کر کہے
گا کہ پولیس کی گرفت سے باہر رہنے کی غرض سے گوپال یہ شادی کر
رہا ہے۔ اس میس میں گوپال ایک سال گزار چکا ہے۔ اس بات کا
ثبوت ملنے پر اس کے سسر کو ان کی بات میں شبہ نہ رہے گا۔ یہ سب
باتیں سبحان نے حاشیہ لکھ دیں۔ حقیقتاً لڑکی کوئی بات ہو یا نہ ہو
لیکن خط ملنے کے تین دن کے اندر گوپال کا منی آرڈر پہنچ گیا۔"

جب سب لوگ ہنس پڑے۔ اس دوران سبحان اور نصرت
نہ جانے کب چپکے سے کھسک گئے تھے۔

* * * * *

اگلے دن شمیم نے مجھے پھر پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ صبح سویرے
سویرے باہر نکلتے ہی پتہ چلا کہ اخبار فروخت کیا جائے۔ راستے
بھر شمیم مجھے سمجھاتا رہا کہ اخبار فروخت کرنے سے ہم ایک دن
بڑے آدمی بن جائیں گے۔

شمیم سے معلوم ہوا کہ کلکتہ کی شیئر مارکیٹ میں دلالی کرنے
سے بڑھ کر اگر کوئی دھندہ ہے تو اخبار فروخت کرنا۔ شمیم چلتے
چلتے کہہ رہا تھا، "کلکتہ کی ایک سڑک کے ایک سرے سے شروع کر کے
دیکھ لینا۔ ہم ایک دن سارے ملک میں اپنی دھاک بٹھا دیں گے۔ ہم
لوگ اخبار کے آڑھتی بنیں گے۔ تو دیکھیگا کہ ایک دن ہمارے
کارخانے میں بنگال کی ساری خبریں تیار ہوا کریں گی۔ ایک منٹ میں ہزار
ہزار خبریں۔ روئیٹر بھی تو ایک دن لندن کی سڑکوں پر اخبار فروخت
کرتا تھا۔"

میں نے ہنس کر اثبات میں سر ہلایا۔
"زیادہ تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن یہ کام کرنے میں حرج بھی
کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "اچھا تو تم یہ بتاؤ تمہاری کیا تمنا ہے۔ بڑا آدمی
بننے کی یا خبریں تیار کرنے کی؟"

شمیم نے کہا۔ "دونوں۔ بڑا آدمی اگر نہ بنا تو زندگی بیکار
ہے۔ اور خبریں تیار نہ کر سکا تو ملک کے لئے کوئی امید نہیں کر سکوں گا۔"

میری طرف مخاطب ہو کر ہنس کر اس نے پھر کہا۔ "موجودہ
دور کی سیاست اخبار کے سہارے ہی چلتی ہے۔ جن کے بس کا
خبریں تیار کرنا نہیں وہ ملک کو بھلا کیا چلا سکیں گے۔ خبریں تیار کرنا یا
انہیں توڑنا مروڑنا جو چاہے کر سکتے ہو۔"

"پھر تو اخبار فروخت کرنے سے اخبار شائع کرنا بہتر ہوگا۔"

"آہستہ آہستہ!" شمپین نے جھک کر قریب کی ایک گلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "مستقبل کے بنگال کے اخبار نویسوں کے شہنشاہ ہوں کے عروج کا آغاز اس گلی سے ہوگا۔ چلو!"

× × × × ×

گلی کے اندر ایک بڑا پرانا مکان ہے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے اوپر بنگالی اور انگریزی حروف میں ایک سائن بورڈ لگا ہوا تھا "بے باک"۔ سائن بورڈ نیا تھا۔ اس کا نیا پن اور چمک دمک مکان کی بوسیدگی پر گویا طنز کر رہی تھی۔ لیکن اگر سائن بورڈ نہ بھی ہوتا تو بھی یہ سمجھنا دشوار نہ ہوتا کہ یہ کسی اخبار کا دفتر ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ اخبار فروش ابھی موجود تھے۔ سائیکلیں گلی میں قطار در قطار کھڑی تھیں۔ اندر سے اخبار کے بنڈل باہر آتے اور نہ جانے کدھر غائب ہو جاتے۔ پتہ نہ چلتا تھا۔ ایک اخبار فروش سے پوچھا۔ "بیچنے کے لئے اخبار کس طرح ملے گا بھائی؟"

سائیکل کے اوپر اخبار کا بنڈل دبا کر وہ ہماری طرف ایسی چوکنی نظروں سے دیکھ کر چلا گیا گویا ہم نے اس سے جنت کا دروازہ دکھانے کے لئے کہا ہو۔

دوسرے آدمی نے تعجب کا اظہار تو نہیں کیا لیکن چھوٹے بڑے آدمی کا سوال اٹھا کر تفصیل سے سمجھایا کہ یہ کام شریف بنگالیوں کے کرنے کا نہیں ہے۔ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ ہم کسی دفتر میں نوکری کی تلاش کرتے۔ اس صلاح کے باوجود اس نے ہمیں بتایا کہ اخبار دینا نہ دینا ارجن سنگھ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم چاہیں تو ایک بار اس سے بات کر کے دیکھ لیں۔ حالانکہ اس بات کی امید کم ہے کہ اس سے بات کرنے پر بھی اخبار مل سکے گا یا نہیں۔ نئے لوگ تو درکنار پرانے اخبار فروشوں کو بھی جتنی تعداد وہ چاہتے ہیں نہیں ملتی۔

اس کے اس بیش قیمت مشورہ کو گانٹھ میں باندھ کر اور پیدل اور سائیکل والے اخبار فروشوں کو دھکیل کر ارجن سنگھ کی تلاش میں ہم اندر گھسنے ہی والے تھے کہ کسی نے پکارا۔ "ٹھہریئے بابو صاحب اندر جانے کا حکم نہیں ہے۔"

یہ ہم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ اخبار کے دفتر پر بھی پہرہ ہوگا۔

دربان کے سامنے میں اپنا مقصد بیان کرنے والا تھا کہ شمپین نے اشارے سے مجھے روک کر کہا۔ "منیجر صاحب کے ساتھ ملاقات کرنا مانگتا!"

دربان اس بات سے بھی نہ دبا۔ بولا "سلپ دیجئے!"

آغاز میں ہی جہاں اتنی رکاوٹیں آئیں وہاں اخیر میں کچھ کام بنے گا اس بات کی مجھے امید نہ تھی۔ شمپین کو میں روکتا ہی رہ گیا لیکن اس سے پہلے ہی اس نے کاغذ پر لکھ دیا۔ "اشتہار دینے کے لئے ملنا چاہتے ہیں۔ ایجنٹ، پاپولر کیمیکل ورکس۔"

دربان نے ایک چپراسی کو سلپ دے کر بھیج دیا۔ کچھ الگ ہٹ کر میں نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ پاپولر کیمیکل ورکس کہاں سے پیدا ہو گیا۔ اخبار بیچنے نکلے ہو۔ لیکن کیمیکل ورکس کے ایجنٹ کیسے بن گئے؟"

"اتنا بدھو نہ ہوتا تو ملک کی خدمت کرنے کیسے آتا۔ پاپولر کیمیکل ورکس ابھی ابھی تیار ہوا ہے۔" کچھ دیر رک کر بولا۔ "یہ میرے دماغ کی پیداوار ہے! اخبار کا منیجر نائٹ صاحب کو واپس لوٹا سکتا ہے۔ لیکن اشتہار دینے والے کو نہیں لوٹا سکتا۔ سمجھا؟"

"لیکن اس کے بعد؟"

"ایک بار اندر گھس تو جائیں پھر دیکھا جائے گا۔"

شمپین کا اندازہ غلط نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی چپراسی نے آکر کہا۔ "آپ لوگ منیجر صاحب سے ملاقات کر سکتے ہیں۔"

چپراسی کو ہمیں راستہ دکھانے کے لئے چلنے پر آمادہ دیکھ کر شمپین نے کہا۔ "خیر تم اپنا کام دیکھو۔ ہم منیجر کا کمرہ جانتے ہیں۔ پہلے بھی ہم پہلے ایک بار آ چکے ہیں۔"

نہ معلوم چپراسی نے کیا سمجھا۔ لیکن ہمارے جانے پر اس نے اعتراض نہ کیا۔ شمپین نے کہا۔ "پاپولر کیمیکل ورکس کا اشتہار اس بار 'بے باک' میں نہیں جائے گا۔ چپراسی کی قسمت میں ڈانٹ کھانا لکھا ہے تو کھائے۔ خیر چھوڑو اسے۔ اب ارجن سنگھ کو تلاش کرنا ضروری ہے۔"

اب میں نے چاروں طرف سے دیکھا۔ مکان پرانا ہوتے ہوئے بھی چمک رہا تھا۔ اس کے کشادہ صحن میں ٹین کے کھمبے سائبان ڈال کر چھاپہ خانہ قائم کیا گیا تھا۔ جس شیڈ کے نیچے ہم کھڑے تھے۔ اس میں چھت تک بڑے بڑے پہیوں کی طرح نیوز ریل کے بنڈل کے بنڈل لگے ہوئے تھے۔ اس کے برابر کے شیڈ سے سیسہ گلانے کی بو آ رہی تھی۔

لکڑی کی ایک تختی کے اوپر ایک آدمی کچھ ٹائپ کے حروف رکھے

تک۔ طرف سے دوسری طرف لے جا رہا تھا۔ شمیم نے اس سے پوچھا۔ "ارجن سنگھ کہاں ہیں؟"

اس آدمی نے للا کر اوپر سے نیچے تک ہمارا جائزہ لیا اور بولا۔ "ارجن سنگھ سے کیا کام ہے جناب جی۔ پریس میں کام کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے سپرنٹنڈنٹ آشو بابو کو پکڑ لیجئے۔ کام تو اچھی طرح جانتے ہیں نا؟ پہلے کبھی اخبار میں کام کیا ہے؟"

پہلے کبھی کام نہیں کیا۔ ہمارے کہنے سے پہلے ہی تاڑ گیا اور بولا۔ "پھر تو کام نہیں بنیگا صاحب۔ اس فلیٹ مشین کا کام ٹھک ٹھک کرنے سے نہیں ہوتا۔ بالکل مشین کی طرح ہاتھ چلانا پڑتا ہے۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو ... ہندوستانی! خود سنگھ ... پکڑ لیجئے یا کسی اور کو۔ کچھ نہ ہوگا۔" ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ آدمی مشین کی طرح ہاتھ تو نہیں البتہ پیر چلاتا ہوا ٹیک تیزی سے باہر نکل گیا۔ ارجن سنگھ کا پتہ بتانے کی غالباً اس نے ضرورت محسوس نہیں کی۔

بالآخر ارجن سنگھ نظر آئے۔ وہ ایک شیڈ کے پاس چارپائی ڈالے ننگے جسم بیٹھے ہوئے تھے۔ دو ہندوستانی نوجوان اُن کی مالش کر رہے تھے۔ اور ان کا دیوہیکل جسم تیل مالش سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ شمیم نے باقاعدہ سلام کرکے کہا۔ "سلام سنگھ صاحب۔ طبیعت اچھی ہے؟"

ارجن سنگھ نے بھویں سکوڑ کر ہماری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ بولے۔ "پہچانا نہیں آپ کو!"

"کیسے پہچانیں گے بھلا سنگھ صاحب۔ پہلے کبھی آپ سے ملنے کا شرف کبھی تو حاصل نہیں ہوا۔"

نہ جانے کیا سوچ کر سنگھ صاحب نے بنگالی میں کہا۔ "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"چاہتے کچھ نہیں سنگھ صاحب سنا ہے آپ کے سب اخبار فروش ایک سے ایک بڑھ کر کامل الوجود ہیں۔ بازار میں اخبار کھپا نہیں پاتے۔ آپ دو اچھے اخبار فروشوں کی تلاش میں ہیں یہ سن کر ہم یہاں حاضر ہوئے ہیں۔"

پوری بات کا مطلب سمجھے بغیر سنگھ صاحب بگڑ کر بولے۔ "کون کہتا ہے ہمارا اخبار بازار میں نہیں کھپتا؟ کون کہتا ہے؟ کون...!

اور پھر اپنا غصہ دبا کر بولے۔ "جاؤ ہمیں ضرورت نہیں ہے۔"

"ارے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے سنگھ صاحب؟ آج اگر ضرورت نہیں ہے تو ضرورت پیدا ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔ آج ہی خدا نہ کرے۔ آپ کے دو اخبار فروش گاڑی کے نیچے دب کر مر سکتے ہیں۔ اچھے آدمی مل سکتے ہیں تو انہیں ہاتھ میں رکھنا مناسب ہے۔ اچھا ہم لوگ کل ہی آکر اخبار لے جائیں گے۔ کیا خیال ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میں اپنی ہنسی کو بمشکل روک سکا۔ لیکن سنگھ صاحب نے غصہ ہو کر کہا۔ "کیا بکواس کرتے ہو۔ ہم تمہیں اخبار نہیں دیں گے جاؤ پریشان مت کرو۔"

شمیم ابھی تک چارپائی پر ایک کنارے بڑے آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ اب اٹھ کر بولا۔ "پھر تو مجبوری ہے سنگھ صاحب۔ اچھا چلیں پھر آئیں گے۔ لیکن ہماری بات بھولئے گا نہیں۔ ممکن ہوا تو پھر کسی دن آکر آپ کی طبیعت کا حال چال پوچھ جائیں گے۔"

جواب میں سنگھ صاحب نے نہ جانے کیا کہا۔ کچھ صاف نہ سنائی دیا۔ ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔

میں باہر کی طرف جا رہا تھا کہ شمیم نے روک کر کہا۔ "جب یہاں آئے ہیں تو کیوں نہ گھوم کر ایک بار اس مکان کو دیکھ لیا جائے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم یہاں کس لئے آئے۔ اس طرح بات کرنے سے کہیں کام بنتا ہے؟"

ضمیر کی آواز کیسے کہتے ہیں اب سنا ہے! میں تو ابھی بالکل ... اس لئے اس بار میں نے ضمیر کے زہریلے دانتوں کو توڑ دینے کا انتظام کیا ہے۔ پڑے پڑے جب بیکار زندگی نہ کٹے گی اور جب میرا ضمیر مجھ پر لعنت بھیجے گا۔ تب دل کی پریشانی دور کرنے کی ترکیب میں نے سوچ لی ہے۔ کام تو نہیں ملا لیکن یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کام حاصل کرنے کی ہم نے کوشش بھی نہیں کی۔"

خیر شمیم کو اپنے ضمیر کو زیادہ دھوکا دینے کی ضرورت نہ پڑی۔ ادھر اُدھر کچھ دیر گھوم کر ہم دوسری منزل سے نیچے اتر رہے تھے کہ ایک صاحب ایڈیٹر کے کمرے سے سپرنگ والے دروازے کو دھکیل کر نکلے اور بولے۔ "آپ لوگ کیا صداقت کی آواز سے آئے ہیں۔"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی شمیم بول اٹھا۔ "جی ہاں۔"

"اچھا تو اندر آئیے۔ مسٹر سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اندر جاتے جاتے آفس صاحب نے سوال کیا۔ "لیکن آپ کے یہاں سے تو ایک اور آدمی کے آنے کی بات تھی۔"

شمپین نے جھٹ جواب دیا۔ "جی ہاں تھی تو سہی لیکن معلوم ہوتا ہے وہ نہ آسکے گا۔"

شمپین کی باتوں میں میں نے ابتک کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔ لیکن اب مجبور ہو کر میں نے اس کے کان میں کہا۔ "اس بار تم حد سے بڑھ گئے ہو شمپین۔ اسکا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔" شمپین نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ دفتر مسٹر سرکار کون ہیں۔ "صداقت کی آواز" سے کون آنے والا تھا۔ اور اس سے مسٹر سرکار کو کیا غرض ہے۔ اس نے بلا سوچے سمجھے زبردستی مجھے بھی اس خطرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ بات سوچ سوچ کر مجھے شمپین کے اوپر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ نہ معلوم معاملہ کیا شکل اختیار کرلے۔ لیکن شمپین کو دیکھا تو وہ بالکل بے فکر تھا۔ فکر یا تردد کی کوئی بھی علامت اس کے چہرے پر نہ تھی۔

مسٹر سرکار میز پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ منہ اٹھا کر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولے۔ "میں بہت دیر سے آپ لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ لوگوں کو تو اس سے پہلے آنا تھا؟"

"جی ہاں! کچھ دیر ہوگئی۔" شمپین نے جواب دیا۔

"ہمیں پروف ریڈروں کی سخت ضرورت آپڑی ہے۔ لیکن آپ لوگوں کو آج سے ہی کام شروع کرنا ہوگا۔"

"جی آج سے تو نہیں البتہ کل سے آجائیں گے۔"

"اور آپ کا تیسرا آدمی کہاں ہے؟"

شمپین کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔ اس نے یقینی لہجہ میں کہا۔ "انہوں نے کہا ہے کہ وہ نہ آسکیں گے۔"

مسٹر سرکار نے کہا۔ "اچھا یہ بات ہے۔ خیر اس وقت دو آدمیوں سے ہی کام چل جائے گا۔ لیکن ابھی تھوڑے دن آپ لوگوں کو رات کو کام کرنا ہوگا۔"

"ہم لوگ کریں گے، لیکن . . . . ."

مسٹر سرکار نے کہا۔ "ہاں میں نے طے کیا ہے کہ آپ لوگوں کو وہاں سے زیادہ تنخواہ ملے گی۔ اور آپ لوگوں کا اپائنٹمنٹ لیٹر (پروانۂ تقرری) آج منیجر صاحب دستخط کر کے تیار رکھیں گے۔ آپ کو کل مل جائے گا۔"

"اچھا اچھا ہمیں اسکی فکر نہیں ہے۔ اچھا تو ہم لوگ چلیں۔" شمپین اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں تو آپ کل ہی رات کو آئیں گے۔ رات کو دس بجے۔ سدھین بابو انہیں پروف ریڈروں کا کمرہ دکھا دیجئے۔"

مسٹر سرکار پھر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ جن صاحب نے ہمیں بلایا تھا وہی ہمیں کمرہ دکھا کر چلے گئے۔ شمپین نے وہاں سے چلتے ہوئے کہا۔ "چلو اچھا ہی ہوا۔ اخبار کی فروخت پر مجھے زیادہ بھروسہ نہ تھا۔ اخبار فروشی سے مصنف بننے کا امکان زندگی میں بہت کم ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے؟"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "لیکن یہ بات کیا ہے شمپین۔ تمہارا دماغ خراب تو نہیں ہوگیا؟"

"ابھی تو نہیں ہوا۔ لیکن کچھ دن پروف ریڈنگ کرنے پر ہو جائے گا۔ اس بات کا مجھے یقین ہے۔ دماغ کا زیادہ اچھا ہونا بھی پریشانی کی بات ہے۔ تھوڑا سا فتور آ جائے تو کیا حرج ہے؟"

زینے سے نیچے اترتے ہوئے ہی بولا۔ "یہ مذاق کی بات نہیں شمپین۔ کیا واقعی تمہارا خیال ہے کہ دوسرے آدمیوں کی جگہ ہم کام کر سکیں گے؟"

شمپین میری بات کا کچھ جواب دینے والا تھا کہ یکایک مجھے چھوڑ کر دھم دھم کرتا ہوا نیچے چلا گیا۔ نیچے تین اشخاص زینہ کے نزدیک اوپر چڑھنے میں ہچکچا رہے تھے۔ شمپین سیدھا ان کے پاس جا کر بولا۔ "آپ لوگ کیا صداقت کی آواز سے آرہے ہیں؟"

ایک آدمی نے جواب دیا۔ "جی ہاں!"

"اوہ۔ آپ لوگوں نے تو بڑی دیر کردی۔ مسٹر سرکار آپ لوگوں کا انتظار کر کے ابھی گئے ہیں۔"

تینوں آدمیوں کے چہروں پر مایوسی کا سایہ پڑتے دیکھ کر واقعی بڑا افسوس ہوا۔

شمپین نے کہا۔ "کل اس وقت آپ لوگ ایک بار پھر آسکتے ہیں۔ لیکن ہمیں پروف ریڈروں کی جو فوری ضرورت ہے۔ اس کے پیش نظر اس کے پہلے ہی آدمی لے لئے جائیں تو کوئی تعجب نہیں۔ آپ لوگ بہت دیر کرکے آئے۔"

ایک آدمی نے مایوسی کے لہجے میں کہا: "پھر کیا طریقہ ہے۔ کچھ بتا سکتے ہیں؟" جواب کا انتظار کئے بغیر تینوں باہر کی طرف چل دئیے۔ شمیم نے کہا: "آپ لوگوں نے صداقت کی آواز" بالکل چھوڑ دی ہے کیا؟"

"نہیں بالکل تو نہیں چھوڑی۔ لیکن اگر یہاں بات بن جاتی تو ضرور چھوڑ دیتے۔"

تب اچانک شمیم نے بڑے جوش سے کہا: "تب تو بڑا اچھا طریقہ ہے صاحب۔"

تینوں نے ہم زبان ہو کر کہا: "کیا؟"

"صداقت کی آواز" نہ چھوڑیئے۔" شمیم نے اپنی آواز ذرا بھاری بنا کر کہا: "ذرا یہ تو بتائیے کس وقت سے یہاں آتے ہیں۔"

"میں دس سال سے پرمٹ سیڈری کر رہا ہوں صاحب۔ لیکن یہاں سے نکل سکوں تو کچھ جان بچے۔ اور آپ لوگ ہیں کہ بڑی آرزو رکھتے ہیں یہاں آنے کی۔ حالانکہ ہمیں یہ باتیں کہنا سب نہیں ہے۔"

اپنے متجسس سامعین کے سوال کے جواب میں شمیم نے پھر کہا: "میری بات مانیں تو صاحب صداقت کی آواز بھول کر بھی نہ چھوڑیئے۔ وہاں ماہ بماہ تنخواہ تو مل جاتی ہے۔"

"یہاں بھی تو سنا ہے تنخواہ باقاعدگی سے ملتی ہے۔"

شمیم نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا: "ٹھیک ہے جب آپ نے سن لیا تو ہمارے کہنے سے کیا فائدہ؟"

"نہیں نہیں آپ یہاں کام کرتے ہیں۔ آپ یہاں کا حال زیادہ جانتے ہیں۔ اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔"

شمیم نے یکایک اپنا لہجہ بہت دھیما کر کے آہستہ آہستہ کہا: "پھر تو صاحب ایسی بیوقوفی بھول کر بھی نہ کر بیٹھنا۔ ورنہ آخر میں پچھتانا پڑے گا۔ آپ لوگوں کو یہ مشورہ دینے میں ہماری کوئی غرض نہیں۔ آپ ہماری ملازمت تو چھین نہیں رہے۔ ہم لوگ چونکہ خود بھگت رہے ہیں۔ اس لئے آپ کو خبردار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اب بھی اگر آپ کا دل چاہے تو کل مسٹر سرکار سے گفتگو کر کے دیکھ لیں۔"

لیکن جس طرح وہ لوگ لوٹ گئے۔ اسے دیکھ کر ذرا بھی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ ان کے دل میں دوبارہ آنے کی خواہش باقی رہ گئی ہے۔ شمیم نے میری طرف دیکھ کر ہنس کر کہا: "چلو دل میں ایک وسوسہ تھا وہ بھی دور ہوا۔ کیسی کی روزی مارنے کا سوال نہیں ہے۔"

میں نے کہا: "اگر لیا ہوتا تب بھی تمہیں اعتراض نہ ہوتا؟"

شمیم نے حیرانی سے کچھ دیر میری طرف دیکھ کر کہا: "اعتراض ہونا مناسب بھی نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چلتے چلتے شمیم نے کہا: "اتنی اچھی خبر سنو گے نہیں سنانے کا؟" چل!"

نہ جانے اس دن انکار نہ کر سکا۔ اصل تو یہ کہ شمیم سے اس بات پر بحث کرنا چاہتا تھا کہ یہ خبر زیادہ بڑھیا نہیں ہے دوسرے منہ کو یہ خبر سنانے کی خواہش کو دبانے کے لئے خود کو سمجھانے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس دن یہ سب باتیں فضول معلوم ہوئیں۔ ممکن ہے یہ میری کمزوری ہو۔ زندگی بھر کوشش کر کے اصول زندگی کو جو ڈھال تیار کی ہو۔ اس میں اگر بہت بڑا سوراخ نکل آئے تو اس کی وجہ سے خود کو لعنت ملامت کرنے کی خواہش نہ تھی۔ مجھے اس خیال سے بھی کوئی خوف محسوس نہ ہوا کہ شمیم کی صحبت سے شاید میرے اندر بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

چلتے چلتے شمیم نے یکایک کہا: "تیرے گاؤں میں کسی نام کی لڑکی ہے نا؟"

حیران ہو کر میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا: "میں تو نہیں جانتا!"

شمیم نے زیر لب مسکرا کر کہا: "ارے کملا، سمجھی اس کا نام شاید دینا ہے۔ نہیں دیوا ہے یا سیوا ہے۔ نام مجھے یاد تھوڑا ہی رکھا ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا: "ایسی تو نہ جانے کتنی ہیں۔"

"کتنی نہیں میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ جو کانوں میں کرن پھول پہنتی ہے۔ ماتھے پر بندی۔ پاؤں میں آلتا۔ اوڑھنا آلتا نہیں، کمر میں کس کر باندھی ہوئی نیلا میری دھوتی۔ لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتی ہے۔ درختوں کے اوپر چڑھ کر چڑیوں کے بچے پکڑتی ہے۔ غصہ میں آ کر اس نے ایک دن تیرے ہاتھ میں کاٹ کھایا تھا اور جس دن تو آیا تھا اس دن رو کر بولی تھی۔ "روی دادا میں بھی چل جاؤں گی۔" کیوں ہے نہ ایسی ایک لڑکی؟"

"نہیں، یاد نہیں آتا۔"

"اوہ پھر تو غلطی ہو گئی۔ پاؤں میں اس کے آلتا ہی ہوگا۔

شرم کے مارے سامنے نہیں آتی۔ آتی ہے تو سر نیچا کئے رہتی ہے۔ پیچھے پھرنے پر مڑ کر چہرے کی طرف دیکھتی ہے۔ لیکن آنکھیں چار ہونے پر شرم سے سرخ ہو کر نظریں جھکا لیتی ہے۔ بات کرتی ہے تو گویا گلا جکڑ جاتا ہے۔"

شمیم نہ جانے اور کیا کہنے والا تھا۔ میں نے اُسے روک کر کہا۔ "بات کچھ بھی نہیں شمیم دادا۔"

"نہ سہی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تو نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟"

"اچانک یہ سوال کیوں کیا؟"

"ایسے ہی پوچھ لیا۔ بتا نہ۔ کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اسکا جواب دینا آسان نہیں ہے شمیم دادا۔"

شمیم نے سنجیدہ ہو کر کچھ دیر میری طرف دیکھا۔ پھر قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے تجھے یہ گھن لگ چکا ہے۔"

حیران ہو کر میں نے پوچھا۔ "اسکا مطلب؟"

"اسکا مطلب یہ کہ اگر آنکھ نہ لڑتی تو تیرے دل میں کوئی بات اس طرح نہ اٹکتی۔" میری کمر پہ ہاتھ مار کر شمیم نے پھر کہا۔ "ہماری عدم تعاون کی تحریک زوروں پر ہے۔ دیکھ جانتا ہے نہ! وہ ہوتا تو صرف ایک بات کہتا۔ لیکن ہمارے رفیق کو تو بات کا جواب دینا مشکل ہو رہا ہے۔"

کچھ دیر بعد دوسری طرف دیکھتے ہوئے اُس نے بالکل ایک نئی بات کہی۔ "یہ لڑکی منو بڑی عجیب ہے۔ ہے نہ؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "میری نسبت تم زیادہ جانتے ہو۔"

شمیم نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "ہاں شاید زیادہ ہی جانتا ہوں۔"

× × × × ×

منو کے گھر جس وقت پہنچے، دوپہر ہو چکی تھی۔ صبح سے گھومتے گھومتے کچھ کچھ تھک گیا تھا۔ اس غریب کنبے کی مہمان نوازی کا خیال آتے ہی کچھ خوشی سی ہوئی۔ گھر کے اندر داخل ہونے میں جو جھجک محسوس ہو رہی تھی وہ منو کی خاطر تواضع کے خیال سے جلد دور ہو گئی۔ کنڈی کھڑکانے کے تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا تو تعجب سے دیکھا کہ جس شخص نے دروازہ کھولا وہ ہمارے لئے قطعی ناآشنا تھا۔ ہماری طرف حیرانی سے دیکھ کر کسی قدر بے اعتنائی سے اُس نے کہا۔ "کس سے ملنا چاہتے صاحب؟" شمیم نے مسکرا کر کہا "ابھی تو کسی خاص آدمی سے نہیں ملنا۔ لیکن اندر جانے دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔"

اُس آدمی نے جھنجلا کر کہا۔ "آپ لوگ کون ہیں جناب؟" وہ جس ڈھنگ سے دروازہ روکے کھڑا تھا، اُس سے ہمیں آسانی سے اندر جانے کے آثار نظر آتے تھے۔ اخبار کے دفتر میں ایک پاسبان نے روکا تھا۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ منو کے گھر میں داخل ہونے میں بھی رکاوٹ پیش ہوگی۔ شمیم نے کہا۔ "دروازے پہ کھڑے کھڑے اپنا پورا تعارف دینا مناسب نہ ہوگا۔ چلئے اندر چل کر آپ کے تجسس کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے ہماری بات سمجھی یا نہیں یہ تو معلوم نہیں لیکن گرم ہو کر بولا۔ "کس سے ملنا چاہتے ہیں آپ، بتا نہیں سکتے؟ دروازے پہ کنڈی کھٹکھٹاتے ہیں۔ عجیب آدمی ہیں آپ!"

شمیم نے ہنس کر کہا۔ "پولیس کمشنر کا سرٹیفکیٹ کہیں گم ہو گیا ہے۔ ورنہ ابھی ثابت کر دیتے کہ چوری، جوا، ڈکیتی، رہزنی سبھی الزاموں سے ہم لوگ بری ہیں اور بالکل شریف آدمی ہیں۔ لیکن آپ کے سوال کا کہ کس سے ملنا چاہتے ہیں، ابھی جواب نہ دے سکیں گے۔"

شمیم کی تقریر کا سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا رہتا۔ اور نہ جانے اسکا کیا انجام ہوتا۔ دروازے پر کھڑا کھڑا میں اُسکی بکواس سنتے سنتے تنگ آ گیا تھا۔ کہ اسی وقت منو نے آ کر سارا جھگڑا ختم کر دیا۔ دروازے کے سامنے آ کر اُس نے کہا۔ "آؤ۔"

اس بار اُس شخص نے حیرانی سے اسکی طرف دیکھا اور بولا۔ "انہیں جانتی ہو کیا؟ تبھی یہ لوگ یہ بتانے میں ہچکچا رہے تھے کہ انہیں کس سے ملنا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے دروازہ چھوڑ دیا اور حقارت آمیز طنز یہ ڈھنگ سے مسکرایا۔ سارا ماحول اسکی بات سے بوجھل ہو رہا تھا۔ دل میں مجھے عجیب پریشانی کا احساس ہو رہا تھا۔

شمیم نے گھر میں داخل ہو کر کہا۔ "معاف کیجئے گا صاحب! بدقسمتی سے آپ کا تعارف حاصل نہ ہوا۔ آپ کی تعریف؟"

اُس نے خشک سی ہنسی ہنس کر کہا۔ "صاحب! تعارف بھلا کیا دوں۔ آپ کی طرح کسی اور کو ان سے اس لئے تکلف سے ملنے آتے نہیں دیکھا۔

رشتہ تھا یہ میری بھابی لگتی ہیں۔" اس کے طنز سے میں کانپ گیا۔ لیکن شمیمین نے اسی طرح ہنس کر کہا "اتنی دور کا رشتہ! کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر قریبی رشتہ ہوتا تو شاید ابھی تین سال تک آپ کا دیدار حاصل نہ ہوتا۔" اس پر اس شخص نے کوئی جواب نہ دیا۔ منہ لٹکائے اندر چلا گیا۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ منو بھی نہ جانے کب چپ چاپ اندر چلی گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس گھر میں قیام کرنے میں مجھے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ شمیمین کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہیں نے کہا۔ "میں اب جاتا ہوں شمیمین!"

شمیمین نے کہا۔ "جائے گا تو سہی۔ تیرا اس جگہ پر سونا ضروری تو ہے نہیں۔ لیکن پھر بھی کھا پی کر جانا۔" اس کے بعد منو کو پکارا۔ "منو رانی! دیکھو، درشن دینے کی کیا!"

منو نے دروازے پر آ کر کہا۔ "کیا بات ہے؟"

آج میں نے منو کو غور سے دیکھا اور دیکھ کر حیران رہ گیا۔ منو کو میں نے کبھی اداس تو درکنار سنجیدہ بھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن آج میں نے حیرانی سے دیکھا اس کے چہرے پر درد و کرب اور بغاوت کا ایسا انقلابی سایہ تھا کہ میں اسے پہچان نہ سکا۔ امید تھی کہ وہ مجھے پیار اور احترام سے پکارے گی۔ لیکن اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ میں اتنے دنوں بعد اس کے گھر آیا ہوں۔ لیکن اس قسم کے کسی بھی جذبے سے اس کا چہرہ قطعی عاری تھا۔ یہ بات شمیمین نے بھی محسوس کی۔ بوجھل ماحول کو کچھ ہلکا بنانے کی غرض سے اس نے کہا۔ "حالانکہ ہمارا درجہ ندر داشا رشتے سے بہت کم ہے۔ لیکن پھر بھی مہمان نوازی میں کوئی کسر رہ گئی تو ہم معاف نہ کریں گے منو رانی۔ یاد رکھنا۔ جاؤ جلد تین آدمیوں کے لئے آپ تندور دھوپ میں خشک کیا ہوا چاول، اور کیلے کا ساگ پکانے کا انتظام کرو۔ اس دفعہ کی مردم شماری میں روبن کی "دو" میں گنتی ہوئی ہے۔ تم جانتی ہو کہ یہ غلط بات نہیں ہے۔"

منو رانی کے چہرے پر کسی قسم کی تبدیلی نہ آئی۔ اطمینان سے اس نے کہا۔ "نہیں اب لیکن دیکھنے کی گنجائش نہیں شمیمین دادا۔ میری ساس کی حالت خراب ہے۔ میرا دیور یہ خبر لے کر آیا ہے۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔"

"زندگی میں جس کو دیکھنے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی، اسے بستر مرگ پر دیکھنے کی ایسی کیا ضرورت آن پڑی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی منو۔"

"سمجھنے کی کوشش جب میں نے ہی نہیں کی، تو تم کیوں کرتے ہو شمیمین دادا۔ اس بار میں نے طے کر لیا ہے۔ ضرور جاؤں گی۔"

شمیمین نے یکایک جوش میں آ کر کہا۔ "نہیں تم نہیں جا سکتیں منو۔ تمہارے اوپر ان کا کوئی حق نہیں۔ کیا اس بات کو اتنی جلدی کہیں بھول گئیں؟"

"بھولی نہیں ہوں۔ تبھی تو جا رہی ہوں۔"

شمیمین نے بے صبر ہو کر کہا۔ "مسئلے کو زیادہ پیچیدہ نہ بناؤ منو۔ میں تمہیں اس طرح اپنا خون نہ کرنے دوں گا۔"

"اور بننے دو بھابی۔" سب نے چونک کر دیکھا منو کا دیور دہلیز پر کھڑا تھا۔ بڑی بےرحمی ہنسی ہنس کر بولا۔ "تمہارے جانے کی ضرورت نہیں رہی بھابی۔ ان کی مرضی کے خلاف تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ساس کو بیمار رہنے دو۔ تمہارے نہ جانے سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔" کچھ رک کر ہم سب کی طرف دیکھنے کے بعد اس نے پھر کہا۔ "تمہاری پرائیویٹ گفتگو میں دخل انداز ہو کر شاید میں نے اچھا نہیں کیا۔"

"واقعی اچھا نہیں کیا۔ کچھ دیر اگر آپ کمرے میں کھڑے رہتے تو اور بہت سی باتیں سنتے۔ جلد بازی کر کے آپ نے بڑا سنہری موقع گنوا دیا۔" شمیمین نے کہا۔

"خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ بغیر سنے ہی جو کچھ سمجھ لیا ہے۔ وہی کافی ہے۔ میں چلا بھابی۔ ماں اکیلی مر جائے تو اچھا ہے۔ اس کے ساتھ تمہارا خون نہ ہونا چاہیئے۔ واپس پہنچ کر اگر ماں زندہ ملی تو مرنے سے پہلے اس سے تمہیں آشیرواد دینے کے لئے کہوں گا۔"

وہ جانے لگا تو منو نے اسے روک کر کہا۔ "ٹھیرو لالہ، میرے کپڑے لتے ابھی نہیں بندھے ہیں۔"

شمیمین اور میں خاموش بیٹھے رہے۔ وہ شخص تذبذب میں پڑ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ "اس کا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں۔ مجھے لینے آئے ہو تو لے کر ہی جانا۔"

منو کا دیور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ منو نے اسے روک کر کہا۔

"اگر تم نہیں لے جاؤ گے تو میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔"

منو کے جانے تک کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ گاڑی کے آنے پر منو کا دلید سامان رکھ کر، گاڑی کا دروازہ کھول کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ منو کی ماں نے روتے روتے آکر لڑکی کو گاڑی میں بٹھایا آخر میں جب شبنم سے نہیں رہا گیا تو اس نے ایک بار صرف اتنا کہا "تم نے غلطی کی ہے منو!"

منو نے کچھ مسکرا کر کہا۔ "اتنے دنوں میں میں نے یہ بات سمجھ لی ہے شبنم دادا۔ میرے لئے غلطی کرنا نہ کرنا برابر ہے" اس کے بعد گاڑی روانہ ہونے پر یکایک میری طرف مڑ کر بولی۔ "اچھا، تو میں چلتی ہوں۔ شاید اب تم سے ملاقات نہ ہو" اور اگلے ہی لمحہ اپنے پرانے انداز میں ہنس کر بولی۔ "تمہیں ایک دن دل بھر کر چھیڑنے اور چڑانے کی حسرت ہی رہ گئی۔"

میں ہنسنا چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کچھ کہہ نہ سکا۔

× × × × ×

گاڑی چلی گئی۔ نہ جانے ہم کب تک اسے ٹکٹکی باندھے کھڑے دیکھتے رہے۔ منو کے جانے کے بعد لمحہ بھر کے اندر زندگی میں اتنی بے کیفی اور بیزاری آسکتی ہیں۔ ہم نے کبھی نہ سوچا تھا۔ اس لڑکی کو میں کافی پہچان چکا ہوں۔ اس کے ساتھ کافی دنوں کا تعارف ہے۔ اور ایک دن گہرے تعلقات کا جو دھاگا ہم دونوں کے درمیان بندھنے لگا تھا۔ میں نے اسے بھی قبول کرنے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ اسے توڑ دیا تھا۔ پھر آج یکایک میرا دل ویران کیوں ہو گیا! میری ساری قوتیں مجھ پر لعنت بھیج رہی ہیں۔ لیکن پھر بھی دلیل اور تدبیر سے قطع نظر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس غم و اندوہ کے عالم میں بھی میرا دل ایک نئی کروٹ لے رہا ہے۔

اچانک شبنم کی طرف مڑ کر دیکھا تو وہ بھی منہ لٹکائے نہ معلوم کیا سوچ رہا تھا۔ مجھے اس طرح مستغرق دیکھ کر اس نے نہ جانے کیا سوچا ہوگا۔ یہ خیال کر کے مجھے کچھ جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میں نے آواز دی "شبنم!"

پہلے چونک کر پھر اگلے لمحے ہنس کر اس نے کہا۔ "ہاں، بھوک مجھے بھی لگی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "میں بھوک کی بات نہیں کر رہا ہوں۔"

شبنم نے کہا "بھوک ہی نہیں، پیاس بھی لگ رہی ہے منو چلی گئی، ہماری بلا سے۔ لیکن ہمیں بھوکا چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ اچھا نہیں ہوا مودین!"

شبنم کا مذاق کچھ پھیکا محسوس ہوا۔ اس کی آواز بھی بے سُری لگی۔ اس کی ہنسی میں بھی وہ بات نہ تھی۔ میں نے کہا "اب کیا کرو گے؟"

"اب یہ پتہ لگاؤں گا کہ کھانا اور کچھ ناداں کہاں ملے گا؟ اس کے بعد کچھ دیر آرام کرنے میں بھی اعتراض نہ ہوگا۔"

"تب چلو۔ اپنے میس چلیں۔"

شبنم نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے۔ کھانا، ناداں اور آرام تینوں بیک وقت ہونے کا امکان نہ ہوتے ہوئے بھی وہاں آرام کے بارے میں بے فکر ہو جاتی ہے۔"

× × × × ×

میس میں جا کر دیکھا، وہاں نقشہ ہی الٹا تھا۔ سارے میس میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ ہر طرف اژدہام تھا۔ ان کا حلیہ اور لباس اور سلوک دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ لوگ کلکتہ کی بجائے کسی دوسری دنیا کا ثواب لوٹنے آئے ہیں۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا۔ کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ رونے کسی کام سے کالی گھاٹ گیا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو پنڈوں کے چنگل سے چھٹکارا دلا کر یہاں پناہ دی تھی۔ رونے کی سخاوت سے مجھے خوشی نہ ہوئی۔ اوپر نیچے جدھر بھی نظر پڑی۔ میں نے دیکھا کوئی نہ کوئی چولہا سلگ رہا تھا۔ اور گیلی لکڑیوں سے اتنا دھواں نکل رہا تھا کہ سارا گھر دھوئیں سے بھر رہا تھا۔ آنکھوں سے کچھ دیکھنا اور سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

سب ملا کر پانچ خاندان تھے۔ چھوٹے بڑے سمیت ہر عمر کے مرد عورتوں کی گنتی لگ بھگ تیس تھی۔ تھوڑی دیر میں بِنا پہلے تعارف کے بغیر ان تیرتھ یاتریوں نے سارے مکان پر قبضہ جما لیا تھا۔

سبحان پریشانی سے چاروں طرف دیکھتا ہوا نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے سبحان! اس بھیڑ میں کیا تلاش کر رہے ہو؟"

سبحان نے فکرمندانہ انداز سے کہا "میرا ایک مگدر نہ جانے کہاں گم ہوگیا۔ کچھ معلوم ہے؟ ایک ہی مگدر نظر آتا ہے۔ دوسرا کہاں ہے؟"

شمپین نے کہا۔ "اس موضوع پر میں کچھ روشنی ڈال سکتا ہوں۔ بےفکر رہو تمہارے مگدر نے بڑے نیک کام میں اپنی جان گنوائی ہے!"

سبحان بولا۔ "مذاق چھوڑو شمپین دادا۔ کل ہی مگدروں کی نئی جوڑی خرید کر لایا تھا!"

شمپین نے کہا۔ "اسکی کمسن زندگی کام آئی۔ صحن میں ان حضرت کو دیکھ رہے ہو جو انگوچھے سے اپنے تیل میں ڈوبے ہوئے جسم سے پسینہ پونچھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تھا کہ انہوں نے ایندھن کی کمی کلہاڑی سے ایک مگدر چیر کر پوری کی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ تمہارا ہی مگدر ہو!"

سبحان کا چہرہ دیکھ کر آسانی سے کہا جاسکتا تھا کہ اسے اس خبر سے کچھ خاص خوشی نہیں ہوئی۔

تبھی دیکھا کہ ونے بازار سے خریدا ہوا سامان لادے لئے بدحال ایک شخص کے پیچھے میس میں داخل ہوا۔ سبحان نے اسے پکڑ کر کہا "کیا معاملہ ہے ونے!"

"چھوڑو مجھے فرصت نہیں ہے!"

لیکن سبحان اسے کب چھوڑنے والا تھا۔ بولا "معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ان ناکارہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں میرا ایک مگدر کام آگیا ہے۔ وہ تمہیں جوڑا کر دینا ہوگا، سمجھے!"

ونے نے تعجب سے کہا۔ "ناکارہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں مگدر کام آگیا؟ کیا مطلب؟"

شمپین نے مطلب اچھی طرح سمجھا دیا۔ ہم لوگوں نے مگدر کی وفات حسرت آیات پر سبحان سے اظہار ہمدردی کیا۔ لیکن ونے نے بڑے اطمینان سے کہا "ارے تو کیا ہوا۔ دوسرا تو موجود ہے!"

سبحان نے چڑ کر کہا "ہاں وہ تمہارے لئے ہے!"

نصرت نہ جانے کہاں تھا۔ ابھی تک اسے نہ دیکھا تھا۔ یکایک اس نے آکر کہا "چڑتے کیوں ہو سبحان۔ کسی دن تم اپنے حاجیوں کو بلا کر کھلا پلا دینا۔ جھگڑا ختم ہو جائے گا۔"

جواب میں سبحان کوئی سخت بات کہنے والا تھا۔ شمپین نے اسے روک کر کہا "اچھا تم لوگ اپنا یہ 'دھرم یدھ' اور 'جہاد' بند کرو۔ پہلے ونے کی اس بیگار کا تعارف حاصل کرنا ضروری ہے۔"

لیکن تب تک ونے سبحان سے چھٹکارا حاصل کر کے بازار سے لائے ہوئے سامان سمیت غائب ہو چکا تھا۔ تعارف حاصل کرنے کے لئے خود کوشش کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

شمپین نے کہا۔ "تمہارے مگدر کو جن حضرت نے ٹھکانے لگایا ہے معلوم ہوتا ہے وہی اس عوامی قافلے کے سردار ہیں۔ دوسروں کی ملکیت تقسیم کرنے کا ان کا ایک اصول معین ہے۔ اس اصول کو عملی جامہ پہنانے میں بھی وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ چنانچہ انہی سے گفتگو شروع کی جائے!"

اس وقت وہ حضرت پسینہ پونچھ کر اسی انگوچھے سے ایک بہت بڑی ہانڈی چولہے سے اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شمپین نے آگے بڑھ کر کہا "گوسائیں جی پرنام۔ کھانے دانے میں کوئی تکلیف تو نہیں آپ کو!"

ہانڈی اتار کر گھبراہٹ اور عجلت میں گوسائیں جی نے پرنام کا جواب دے کر کہا "جی بالکل نہیں۔ آپ لوگوں اور گورو کی کرپا سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی!" اس کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی پر لے جاتے ہوئے عقیدت مندانہ انداز سے بولے "اور تکلیف ہو بھی کیسے۔ گورو اپنے بھوگ کا بندوبست خود کر لیتے ہیں صحرا ہو یا جنگل دو مٹھی پرساد تو کسی نہ کسی طرح مل ہی جاتا ہے۔"

نصرت نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن آپ کو معلوم ہے جنگل میں جتنی آسانی سے مل جاتا ہے صحرا میں اتنی آسانی سے تھوڑا ہی مل سکتا ہے۔ جنگل کی تو بات ہی الگ ہے۔"

نصرت کی بات کا مطلب نہ سمجھ کر گوسائیں جی احمقوں کی طرح اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر خاموش رہ گئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اپنے دیوہیکل جسم میں جنبش پیدا کرتے ہوئے وحشیانہ قہقہے سے ساری عمارت کو سر پہ اٹھاتے ہوئے بولے "اس میں کیا شک ہے بابو صاحب۔ گورو کے لئے صحرا اور جنگل سب برابر ہیں۔ ان کے لئے بھی کہیں کون و مکان کی قید ہو سکتی ہے!"

شمپین کا انہیں گوسائیں جی کہہ کر پکارنا کسی طرح موزوں نہ تھا۔

گلے میں تین لڑیوں کی موٹی مالا تھی اور پیشانی پر تلک لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سویرے کالی گھاٹ پر گنگا اشنان کیا ہوگا لیکن پسینے سے تر جسم کو بار بار انگوچھے سے پونچھنے کے باوجود "سیتارام" "سیتارام" کا چھاپہ ابھی تک نہ مٹا تھا۔ بات چیت اور رنگ ڈھنگ سے انکساری ٹپکتی تھی۔

شبنم نے کہا "میں نے کہا اگر کسی چیز کی کمی ہو تو بتا دیجئے گا۔ چولہے کے لئے ایندھن کی ضرورت ہو تو کہیئے۔ ایک گٹھر ابھی باقی ہے۔"

"گٹھر؟" گوسائیں جی نے تعجب سے کہا اور پھر ہیں ہیں کر کے ہنس پڑے۔ بولے۔ ہم تو فقیر ذات ہیں۔ گٹھر لے کر بھلا کیا کریں گے؟

اچھا اچھا سہی۔ کوئی بات نہیں۔ اچھا دیں آج سا دن گوسائیں جی کے پرشاد پہ گذارا جائے۔ کیا خیال ہے؟

گوسائیں جی نے کہا ـ ہماری خوش نصیبی ہوگی۔"

"ضرور ہوگی۔ ضرور ہوگی۔ ہمارے اندر بھی تو خالی ہیں گوسائیں جی۔ ہم کسی کی بات ٹال نہیں سکتے۔ بیٹھو دین۔ بیٹھ جاؤ شبنم دادا۔ سبحان اعتراض نہ ہو تو تو بھی بیٹھ جا۔ یہاں چھوت چھات بالکل نہیں ہے۔ سمجھ لے!"

گوسائیں جی کے چہرے کی طرف دیکھ کر رحم آتا تھا۔ بولے آپ لوگوں کو تکلیف ہوگی۔ دو چار آدمیوں کے لئے اندازہ سے کھانا بنایا ہے۔"

گوسائیں جی کو کچھ کہنے کا موقعہ دیئے بغیر شرت نے فوراً کہا۔ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تکلیف بھلا کا ہے کی۔ اس طرح پرشاد بانٹنے میں ہی انہیں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ کیوں گوسائیں جی؟

گوسائیں جی نے غمگین انداز سے کہا "جی ہاں۔ یہی بات ہے اچھا تو ایک ہانڈی اور چڑھا دوں؟"

شبنم نے کہا۔ خوب دیکھ بھال کر چڑھائیے گا۔ ہمارے کئی آدمی ابھی پہنچنے والے ہیں۔"

گوسائیں جی کے چہرے سے بچی کھچی ہنسی بھی کافور ہوگئی۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اور کتنے آدمی آئیں گے؟

"یہی بارہ تیرہ آدمی ہوں گے۔" یہ کہہ کر شرت نے آواز دی ارے وِنّے ذرا ادھر آنا۔"

ہمارا انداز دیکھ کر ونّے کو بات سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ بولا "یہ تم لوگوں کی زیادتی ہے شرت۔ مہمانوں کے اوپر ظلم۔"

شرت نے فوراً کہا "ظلم کیا؟ اس دفعہ سبحان کا دوسرا گٹھر بھی کام آ جائے گا!"

سبحان اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ بولا "اگر اس سے بھی کام نہ بنا تو تیری چوکی اٹھا کر لے آؤں گا۔"

شرت نے اس انداز سے کہا "ٹھیرئے آئیے۔ لیکن ٹھیریئے پہلے اس کا ٹھکانہ نہ بتا دوں۔ کل پیسوں کی قلت کی وجہ سے میں اُسے ایک دکان پر بیچ آیا تھا۔"

سارے دن کی دوڑ دھوپ اور فاقے کے بعد نہایت شاندار دعوت ہوئی۔ کچھ بھی ہو، میں نے دیکھا گوسائیں جی کھانا پکانے میں طاق تھے۔

شرت نے کہا "کچھ بھی کہو۔ بیچارہ بڑا آدمی ہے۔ بالکل گائے۔ بے ضرر!"

شبنم نے ونّے کی کمر ٹھوک کر کہا۔ "مہا راجا بھی قافلہ زندہ باد۔ ونّے! صبح سے جیسی مصیبتیں نازل ہونی شروع ہوئی تھیں اُن سے تو امید نہ تھی کہ آج نوالہ منہ میں جائے گا۔"

سبحان نے کہا "ونّے کے جمہور میں میرا ایک گٹھر بھی شامل ہے شبنم دادا۔ یہ نہ بھولو!"

"گٹھر کے بغیر کوئی بھی جمہور خوبی سے نہیں چل سکتا سبحان۔"

ونّے نے جھلا کر کہا۔ "تمہارا یہ ہنسی مذاق مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا شبنم دادا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے تمہارے دل میں حقارت کا جذبہ ہے۔ اور درحقیقت ہمارا ملک انہی لوگوں پر مشتمل . . . !"

ونّے کی تقریر پوری نہ ہوسکی۔ اچانک نیچے صحن سے اتنا شور اٹھا کہ اسے برداشت کر کے بیٹھا رہنا دشوار ہوگیا۔ مجبور ہوکر ہم سب یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا بات ہے اٹھ کھڑے ہوئے باہر آکر پہلے تو شور و غل میں کچھ سننا مشکل ہوگیا۔ تیرتھ یاتریوں کے گروہ میں سبھی مرد عورتوں کی زبانیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

بلا بھی کہیں تو پہلے بھی حوصلہ لے رہے تھے۔ البتہ اتنا ضرور سمجھ میں آیا کہ اس بے ضرر کا سا ضعیف گوسائیں جی کے اوپر جو اس جھگڑے کی بنیاد تھی، گنڈے کا انگوچھا انہوں نے کس کر کمر پر باندھ لیا تھا۔ گھوڑ کی گنتی کی ایک لڑائی نہ معلوم کیسے ٹوٹ گئی تھی سرخ آنکھیں اور بھاری بازوؤں کے بار بار خم ٹھونکنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ گوسائیں جی مذہبی معاملات میں خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن کشتی کے فن میں طاق ہیں۔ انکی یہ بدلی ہوئی صورت پہچانی نہ جاتی تھی۔

دوسرے فریق کے چودھری کی حیثیت سے جو شخص بحث کر رہا تھا اس کے زور بازو پر کچھ زیادہ اعتماد نہ ہوتا تھا۔ دبلا استخوانی چہرہ تھا اور پسلیاں جسم سے باہر نکل پڑتی تھیں۔ لیکن جسمانی طاقت کی کمی وہ اپنے گلے سے پوری کر رہا تھا۔ اس کی زبان جتنی تیزی سے چل رہی تھی آواز بھی اتنی ہی بلند تھی۔

کچھ دیر اس لڑائی کا نظارہ کرنے کے بعد شمیم نے کہا "بھئی اس جنگ عظیم میں تیسری طاقت کی دخل اندازی کی ضرورت ہے۔"

بڑی مشکل سے بکھرے ہوئے دونوں فریقوں کی باتوں سے جوڑ توڑ کر اتنا سمجھ میں آیا کہ ہمارے گوسائیں جی کی رہنمائی میں، انکے گاؤں اور قریب کئی گاؤں کے دس خاندان تیرتھ یاترا کے لئے نکلے تھے۔ کالی گھاٹ پر کالی دیوی کے مندر اور اسکے ساتھ کلکتہ کا عجائب گھر، چڑیا گھر، پرلیش ناتھ کا باغیچہ اور دوسرے قابل دید مقامات دکھانے کی ذمہ داری بھی انہی پر تھی۔ ہر یاتری نے ان پر اعتبار کرکے انہیں کچھ نقد روپیہ بھی سونپا تھا۔ اس وقت ان روپیوں پر ہی جھگڑا ہو رہا تھا۔ گوسائیں جی صرف کالی گھاٹ دکھا کر خاموش ہو گئے اور اب گاؤں واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ لیکن روپیہ لوٹانے کا نام نہ لیتے تھے۔ صرف یہی نہیں کالی گھاٹ پر پنڈوں کے گھر ٹھہرنے میں کرایہ کی رقم میں جو بچت ہوتی تھی اسکو واپس کرنے پر بھی آمادہ نہ تھے۔

آخر میں گوسائیں جی ان سب باتوں سے عاجز آکر بولے۔ "جاؤ! جاؤ میں روپیہ واپس نہیں کروں گا۔ جو ہو سکے کر لو۔ پنڈوں کے گھر ٹھہر کر کرایہ میں جو بچت ہوئی تھی۔ لیکن میں نے اپنی دانشمندی سے ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا۔ پھر میں یہ روپیہ کیوں واپس کروں۔ بتاؤ؟"

ونے پر گویا سکتہ طاری تھا۔ نصرت نے اسے آنکھ مار کر کہا۔ "ونے بات سنو!" دبلے پتلے شخص نے تیز ہو کر کہا۔ "اچھا کرانے کا روپیہ تو خرچ ہی ہوتا، تم نے رکھ لیا تو خیر۔ لیکن عجائب گھر اور چڑیا گھر دکھانے کے لئے جو روپے لئے تھے وہ کہاں ہیں؟"

گوسائیں جی نے اسے پوری بات نہ کہنے دی، بولے۔ "مفت جتنا کتنا روپیہ دیا تھا تم نے۔ عجائب گھر اور چڑیا گھر مفت تھوڑا ہی دکھائے جاتے ہیں؟"

اس کے بعد ان روپیوں پر جو شرمناک ہنگامہ شروع ہوا اور عورتوں اور بچوں کے سامنے ایک دوسرے کے لئے جس زبان کا استعمال کیا گیا اسے دیکھ کر خاموش رہنا دشوار ہو گیا۔

شمیم کی دخل اندازی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جھگڑا ختم کرنے کی کوشش میں ونے کی جس طرح بے عزتی ہوئی۔ اس سے مشتعل ہو کر لڑنے کے لئے کمر کستے ہوئے نصرت نے کہا "نہیں شمیم، اب زیادہ برداشت نہیں ہو سکتا۔ ٹھہرو میں ان بدمعاشوں کو دھکا دیکر باہر نکال آتا ہوں۔"

لیکن یہ لوگ صرف دھکے کھا کر نکلنے والے نہ تھے۔ گوسائیں جی نے کہا۔ "کیوں بے نفو۔ کتے میں خوب جانتا ہوں۔ نند پال کی دونوں بھتیجیوں کو تو یہاں کس لئے لایا ہے۔ بتا دوں؟ کہہ دوں سب کے سامنے؟ تو مجھ سے روپیہ لے گا! اس سے پہلے میں تجھے جیل بھجوا دوں گا۔ جانتا ہے؟"

نفو کتے نے بھی جان پر کھیل کر کہنا شروع کیا۔ "مجھے جیل بھیج کر تو بچ جائے گا بدمعاش! تو نے خود پچاس روپے اس کے لئے پیشگی نہیں لئے؟"

سبحان اور نصرت اس بار واقعی غصے سے آگ بگولہ ہو کر انہیں مارنے دوڑے کہ شمیم نے کہا۔ "صرف مارنے پیٹنے سے اس جھگڑے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا سبحان۔" اتنی بات سننے کے بعد ہم خاموش کیسے بیٹھ سکتے تھے۔

مجھے بھی شمیم کی بات کی تائید کرنی پڑی۔ تیرتھ یاتریوں کے اس گروہ میں نند پال کی بھتیجیاں کونسی ہیں۔ یہ جاننے کی کوشش میں تھے۔ ان کے سلسلے میں جو ذلیل سازش ہو رہی تھی۔ اسے معلوم کرکے خاموش نہیں رہا جا سکتا تھا۔

نصرت نے گوسائیں جی کے پکنے کے مانند پھولے ہوئے گال پر ایک زوردار طمانچہ لگا کر کہا "چُپ رہ بدمعاش۔ بتا اس گروہ میں سندپال کی بھتیجیاں کونسی ہیں؟"

ایک ہی لمحہ میں گوسائیں جی کا برتاؤ، چہرے کا انداز، گفتگو سب کچھ بدل گیا۔ ایک بار سامنے دیکھ کر، ہماری طاقت کا کچھ اندازہ کر کے اچانک نرم پڑ کر ملائمیت سے بولے۔ "مار دیجئے مجھے آپ لوگ پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ بے ادبی کر کے دو ہاتھ بھی مار سکتے ہیں!"

سبحان نے کہا۔ "بہانے مت تراشو۔ سندپال کی دونوں بھتیجیاں کہاں ہیں، جلدی سے دکھاؤ۔ ورنہ ہڈی پسلی باقی نہ بچے گی۔ سمجھے!"

سارے جسم میں کپکپی پیدا کر کے ایک زوردار قہقہہ لگا کر گوسائیں جی بولے۔ "آپ لوگ بھی عجیب آدمی ہیں۔ لڑائی جھگڑے میں تو نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ آپ ان باتوں کو صحیح سمجھ بیٹھے۔ سندپال کی بھتیجیاں بھلا یہاں کہاں؟ وہ تو اپنے گاؤں میں ہی کیوں لبشو؟"

آفت آتی دیکھ کر لبشو نے اب تک خود کو اچھی طرح سنبھال لیا تھا، ہنس کر بولا۔ "جھگڑے میں ہمارے منہ سے نہ جانے کتنی باتیں نکل جاتی ہیں۔ سبھی پر اعتبار تھوڑا ہی کیا جاتا ہے۔"

سبحان نے اس کے گال پر بھی ایک طمانچہ جڑ کر کہا "خبردار جھوٹ بولا تو پولیس میں دے دوں گا۔"

آسانی سے کامیابی ہوتے نہ دیکھ کر گوسائیں جی نے اس بار بات کا رُخ پلٹ کر کہا۔ "پولیس میں کیوں دے دیں گے۔ ہم نے رہزنی کی ہے؟ دیکھتا ہوں، کون دیتا ہے پولیس میں۔ میں جتنی شرافت سے پیش آتا ہوں۔ اتنا ہی ظلم کرتے ہیں۔ واہ!"

نصرت نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں پولیس میں تو نہ دیکھے گوسائیں جی۔ یہیں بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دیں گے۔ جانتے نہیں ہم سب دیہاتی لڑکے ہیں، کسی سے ڈرتے نہیں ہیں۔"

نصرت کا چہرہ دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔ لیکن نہ معلوم گوسائیں جی کا چہرہ کیوں فق ہو گیا۔ شاید دیہاتی لڑکوں کے بارے میں وہ کچھ جانتے نہ رکھتے تھے۔ ایک بار آخری کوشش کرنے کی غرض سے گھبرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "میں۔۔۔ لیکن۔۔۔ ارے لبشو۔ بولو نہ بھائی ہم بھلا سندپال کی بھتیجیوں کو کیا جانیں!"

لیکن انہیں زیادہ بتانے کی زحمت نہ کرنی پڑی۔ سفید دھوتی پہنے گھونگھٹ نکالے دو لڑکیاں لے آکر روہانسی آواز میں کہا "دہائی ہے بابا۔ ہمیں گھر پہنچا دو۔ ہمیں اور کچھ نہیں چاہیئے"

ہم سب سکتے میں آگئے۔ کچھ دیر تک کسی کے منہ سے بات نہ نکلی۔ گوسائیں جی اور اُن کے ساتھی کو آتا دیکھ کر ہم نے کسی وقت یہ نہ سوچا تھا۔ کہ یہ لوگ اتنے کمینے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن تھا کہ وہ ابھی اپنے وطن میں ہوں۔ انہیں یہاں لانے کی شاید ان ڈھونگیوں کی ہمت نہ ہوئی ہو۔ لیکن اپنی آنکھوں سے انہیں اپنے سامنے موجود دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔

گوسائیں جی کچھ دیر تو شش و پنج میں پڑے رہے پھر اچانک دونوں لڑکیوں کے سامنے جا کر ہاتھ پیر چلاتے ہوئے انہیں مارنے کو آمادہ ہو کر بولے "کیوں۔ بدذات لڑکیو! مجرم اجیل رہو ہو دونوں۔ تمہاری شامت تو نہیں آئی؟" اور پھر نک بھوں سکوڑ کر بولے "ذرا پھر کہنا کہ ہمیں گھر پہنچا دو! ہم تمہارے تاؤ ہیں یا خصم؟"

انہیں ہاتھ پیر چلاتے دیکھ کر لڑکیاں ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گئیں۔ سبحان اور نصرت نے دھکا دے کر گوسائیں جی کو پیچھے دھکیل دیا۔ "خبردار جو آنکھیں نکالیں۔ کچھ ہم نکال دیں گے۔" اس کے بعد دونوں لڑکیوں سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "بہنو تمہارا گھر کہاں ہے؟"

ان لڑکیوں نے ڈرتے جھجکتے جس گاؤں کا نام بتایا۔ اس سے میں ناآشنا تھا۔ وہ لڑکیاں بھی گاؤں کے ضلع اور گھر کے مفصل پتے سے ناواقف تھیں۔ بھولی بھالی لڑکیاں دوسرے یاتریوں کے ساتھ اعتبار کر کے تیرتھ یاترا کے لئے چلی آئی تھیں۔ اس بات کا تو انہیں گمان بھی نہ تھا۔ کہ ان کے ساتھ کوئی سازش بھی کی جا سکتی ہے۔ میں نے سوچا ان لڑکیوں کو کتنا بھی ڈرایا دھمکایا جائے۔ صحیح بات کا علم نہ ہو سکے گا۔ ان کا پتہ ٹھکانہ معلوم کرنے کے لئے کوئی دوسرا طریقہ نکالنا ہوگا۔

سبحان نے کہا۔ "پولیس کے سپرد کر دوں ان لوگوں کو؟"

شمیم نے ہنس کر کہا "ہاں تاکہ ان لڑکیوں کو بھی پریشان ہونا پڑے۔ تم بھلا اور کیا کرو گے؟"

لیکن سوال درپیش تھا کہ کیا کیا جائے!

بڑی پریشانی آن پڑی تھی۔ یاتریوں کے قافلہ میں مرد دو چار ہی تھے

لیکن انہوں نے اسوقت اپنا گروہ بنا لیا تھا۔ وہ لوگ جیتی جاگتی
... کرنے کے کلکتہ کے چندہ لیڈر پیدا کرے ان کے
گاؤں کے دو آدمی ساتھ لے لئے۔ اُن سے کوئی بات پتہ لگانا مشکل تھا
عورتیں جتنی بھی تھیں سب ان پڑھ۔ اُن کو تو صرف یہ معلوم تھا کہ
وہ بیل پیر چڑھ کر کالی گھاٹ آئی ہیں۔ گاؤں کے نام کے علاوہ
انہیں زیادہ کچھ نہ معلوم تھا۔

باہم دونوں لڑکیوں کے بارے میں سوچ میں پڑ گئے۔ ان
بیچاریوں کے چنگل سے انہیں چھڑانا مشکل نظر آتا تھا۔ پولیس کے
سپرد کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ ان دونوں
لڑکیوں کو بھی پریشان ہونا پڑے گا۔ موقع دیکھ کر گوسائیں جی نے
کہا۔ "ہمیں فضول کیوں حیران کر رہے ہیں۔ آپ لوگ رئیسوں کے
لڑکے ہیں۔ آپ کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

سبحان نے ڈپٹ کر انہیں خاموش کیا اور کہا "شمیم دادا۔
نظر آتا ہے کہ انکی مرمت کئے بغیر سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلے
گا"۔ شمیم نے سر ہلا کر اُسے منع کیا۔ اور پھر اچانک نہ جانے
کیا سوچ کر گوسائیں جی کے ساتھ والے شخص کو بلا کر اُسے ساتھ
لے کر چلا گیا۔

بات کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ گوسائیں جی پہلے تو گھبرائے لیکن
پھر آہستہ آہستہ خوش ہو گئے۔ مار کھانے کا اندیشہ دُور ہوتا دیکھ کر ہی
شاید وہ خوش ہوئے تھے۔

دونوں لڑکیوں سے کافی پوچھ تاچھ کرنے پر بھی ہمیں اس
بات کا پتہ نہ چل سکا کہ ان دونوں کے خلاف کیا سازش ہو رہی
ہے۔ دونوں ہی دو صوالتیں۔ اپنی جائیداد ہونے کے باوجود وہ
چچا کے گھر رہتی تھیں۔ چچا کئی بار جائیداد اپنے نام کرانے کی
کوشش کر چکا تھا۔ لیکن وہ اس کے لئے رضامند نہ ہوئی تھیں۔
اسوقت انکے دل میں یہ شبہ تھا کہ شاید اپنے مقصد میں کامیابی حاصل
کرنے کے لئے چچا نے انہیں تیرتھ یاترا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔
لیکن تیرتھ یاترا کی خوشی میں اُن لوگوں نے یہ بات سوچنے کی کوشش
نہ کی تھی کہ اتنا معلوم کرنے کے بعد بھی انکے خلاف کی گئی سازش
کی حقیقت نہ سمجھ سکا۔

گوسائیں جی دونوں لڑکیوں کی کہانی سنتے ہوئے بڑے بے ہودہ انداز

انداز سے گھور دیتے رہے۔ اتنے دن مجھے گود میں کھلایا آج آگ
میں تیرا دشمن ہو گیا۔ اور یہ حبشی لڑکے بیگانے ہو گئے۔ بانے رے
کلجگ! آج سے کان پکڑتا ہوں کبھی کسی کی بھلائی کی کوشش نہ کروں
گا۔ میں نے سوچا بیچاری لڑکیاں گھر سے نہیں نکلتیں۔ میرے ساتھ
کچھ تیرتھ یاترا کر لیں تو کیا حرج ہے، اور انہیں دیکھو تو مجھے تباہ
کرنے پر تلی ہوئی ہیں!"

نصرت اور سبحان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ نصرت نے کہا
"شمیم دادا نہ معلوم کہاں گئے۔ ہمیشہ دماغ کی طاقت سے کام نہیں
چلتا۔ بعض بار وہی کبھی کبھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ شمیم دادا
یہ بات نہیں سمجھتے۔"

لیکن شمیم کو زیادہ دیر نہ لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ مسکراتا
ہوا لوٹ آیا۔ سب نے پوچھا۔ "اس شخص کو کہاں چھوڑ آئے؟"

شمیم نے کہا۔ "اُسے اُسکے گناہوں سے نجات دلا دی۔
اُسے ایک نئے مذہب کا سبق دے کر آ رہا ہوں۔ ابتک وہ گیروے
کپڑے پہن کر ہمارا پیغام پھیلانے نکل گیا ہوگا۔"

اس بات کا مطلب نہ سمجھ کر گوسائیں جی نے ڈرتے ڈرتے
پوچھا۔ "ایں۔ بنسو بھاگ گیا؟"

"بھاگ کر کہاں جائے گا گوسائیں جی۔ آپ لوگوں کی حقیر سازش
کا راز افشا کرنے کے بعد اس کے اندر آپ کے سامنے آنے کی ہمت
نہیں رہی تھی۔ اس لئے میں نے اُسے جانے کی اجازت دیدی۔"

اب تو گوسائیں جی کے چہرے کا رنگ دیکھنے لائق تھا۔ بڑے
غمگین انداز سے لیکن ہمت کر کے انہوں نے کہا۔ "اچھی بات ہے بیٹا
مجھے پھنسا کر دیکھوں گا، بھلا کہاں جائے گا۔ میں ڈوبوں گا تو سب کو
لے ڈوبوں گا۔ نند پال کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

شمیم نے سنجیدگی سے کہا "چھوڑنا مناسب بھی نہیں ہے
گوسائیں جی!"

"اور کیا میں نے ہی پیسہ کھایا ہے تو اُس حرامزادے نے
نہیں کھایا! اور نند پال نے جائداد کے لالچ میں ہمیں جو رشوت دی
وہ بھلا کیسے چھپ سکتی ہے!"

شمیم نے اسی سنجیدگی سے کہا "خود سے دیکھا جائے۔
تو اصل بدمعاش نند پال ہے مانا کہ دیوتا جیسی پوتر زندگی میں ایک لمحہ

کے لئے لالچ کی ندی میں بہہ کر آپ پھسل گئے اور آپ سے ایک معمولی سی غلطی سرزد ہو گئی۔ لیکن . . . . !

گوسائیں جی نے بھونچکے ہو کر دیکھتے ہوئے کہا "جی؟"

میں نے کہا مانا کہ آپ نے کچھ روپے لئے ہیں۔ لیکن ابھی کچھ کیا تو نہیں۔ ان لڑکیوں کو تباہ کرنے کی سکیم تو نندپال کے دماغ میں ہی آئی ہے۔ ساری بدمعاشی کی جڑ تو وہ ہے۔"

اندھیرے میں پھر کچھ روشنی ملنے پر گوسائیں جی نے کہا "بتائیے آپ ہی بتائیے نہ۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے۔ کہ میں نے روپیہ لیا ہے۔ اور حقیقتاً میں نے ابھی تک ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑا۔"

شمیمن نے کہا۔ بے شک آپ کے خلاف کوئی الزام نہیں لگ سکتا۔ بشرطیکہ آپ ساری بات سچ سچ بتا دیں۔ لیکن اس سالے نندپال کو چھوڑنا مناسب نہیں۔ کیا خیال ہے؟

گوسائیں جی نے اور خوش ہو کر کہا۔ "جی اور کیا ہوا؟"

شمیمن نے کہا۔ "اسے اگر سزا نہ ملی تو دنیا سے انصاف اٹھ جائے گا۔"

"جی ہاں"

شمیمن نے گوسائیں جی کے کان کے سرے جا کر کچھ سرگوشی کی۔ "مصیبت آئے گی تو نندپال کی آئے گی۔ اس نے آپ لوگوں سے کیا کہا تھا؟"

گوسائیں جی نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "میں اس سازش میں شریک نہیں تھا۔ بشتو ہی تھا۔"

"یہ کیا ہم لوگ جانتے نہیں! لیکن پھر بھی آپ نے بات تو سنی ہے"

گوسائیں جی نے بڑے غمگین انداز سے کہا "جی سنا تو ضرور ہے لیکن بڑی گندی بات ہے کیا کہوں!"

شمیمن نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ "پھر بھی"

گوسائیں جی نے کہا "یہ نندپال بھی شیطان کا باپ ہے۔ اس کا بس چلتا تو دونوں لڑکیوں کو زہر دے دیتا۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں بعد میں کوئی آفت نازل نہ ہو جائے۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ دونوں لڑکیوں کو کالی دیوی کا مندر دکھانے کے بہانے کلکتہ بھیج کر وہاں کسی طرح چھوڑ آیا جائے۔"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد کیا؟ گاؤں لوٹنے پر مشہور کر دیا جاتا کہ کہیں نکل گئی ہیں۔ واپس لوٹنے پر ان کی نیک چلنی پر شک کر کے کوئی بھی ان کو اپنے گھر میں نہیں رکھتا۔ ایک ہی داؤ میں ساری جائیداد نندپال کے قبضہ میں ہوتی۔"

شمیمن نے کہا "اچھا آپ لوگوں کا گاؤں . . . ؟"

گوسائیں جی نے بے خوفی سے گاؤں کا پتہ بتا دیا۔

اس کے بعد شمیمن کو بلا وجہ ہنستے دیکھ کر سب کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "ارے شرت تمہارے بشتو عرف بخوشفور بابو کو اب تنہائی کی قید ناقابل برداشت ہو گئی ہوگی۔ اپنے کمرے کی چٹخنی کھول کر اسے باہر لے آؤ"

"اس کا مطلب ہے بشتو گیا نہیں" گوسائیں جی نے تعجب سے کہا۔

شمیمن نے کہا۔ "نہیں۔ لیکن اس میں اس کا کوئی قصور نہیں وہ کوئی بات بتانے پر راضی نہ ہوا۔ تو میں نے اسے نہ جانے دیا"

"تو بشتو نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔"

جی ہاں میں نے دیکھا اس کا عہد آپ کی نسبت زیادہ مضبوط ہے۔ اس لئے مجھے آپ سے بات اگلوانے میں تھوڑی سی چال چلنی پڑی۔ آپ اس کے لئے کچھ بھی کہیں لیکن میری درخواست ہے کہ اس کا برا نہ مانیں۔"

گوسائیں جی کا چہرہ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہیں اس وقت غصہ آ رہا تھا۔ یا تعجب۔

شمیمن نے ہم سب کی طرف مڑ کر کہا۔ "ہم لوگوں میں سے کسی نہ کسی کو ان دونوں لڑکیوں کو گھر پہنچانے کی ذمہ داری لینی ہوگی۔ گوسائیں جی ٹھہرے بے چارے حاجتمند۔ اس واقعہ کے بعد بھی نندپال کی رشوت آسانی سے ہضم کرنا ان کے لئے دشوار ہوگا۔ چنانچہ ان دونوں لڑکیوں کو ان کے ساتھ بھیجنے کی ہمت نہیں ہوتی"

سیمان نے کہا۔ "میں جاتا ہوں"

شمیمن نے سر ہلا کر کہا۔ "او جنٹلمین! زمانہ نازک ہے۔ جاؤ گے عورت ذات کی حفاظت کرنے کے لئے۔ لیکن الٹے اغوا کے الزام میں پکڑے جاؤ گے"

اسی وقت شرت بشتو کو قید سے آزاد کر کے آ گیا۔ یہ طے ہوا کہ

ابھی وہ دو چار انہیں گر اُن کے گاؤں پہنچا کر ان کا سامان بندوبست کر کے واپس آ جائے گا۔"

سبھی گوسائیں جی اور ان کے گروہ کے بارے میں بحث ہونے لگی۔ ونے نے کہا صاحب انہیں زیادہ دیر تک پکڑ کر رکھنے میں کیا فائدہ ہے۔ شمیم ... انہیں چھوڑ ہی دیا جائے۔

لیکن سبحان اور نصرت اس پر راضی نہ تھے۔

نصرت نے کہا: "ہم انہیں کچھ سزا دیئے بغیر نہ جانے دیں گے۔"

ونے نے کچھ گرم ہو کر کہا: "سزا دینے کا اختیار صرف ہم کو ہی ہے؟"

سبحان نے ونے کی کمر پر ہاتھ مار کر کہا: "اختیار جو ملنا ہو دیوانی عدالت کی مصیبت کون اٹھائے گا۔ اس جرم کے مقدمہ کا فیصلہ اس جرم سے پہلے کرنے کی فرصت عدالت کو نہیں ہوتی۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ہم ہی لوگ اس جھگڑے کو نپٹا دیں۔"

ونے نے کہا: "اچھا تو یہ بتاؤ کہ سزا کیا دی جائے؟"

نصرت نے کہا: "یہی تو سوچنے کی بات ہے۔"

انہیں سوچنے کا موقع دے کر میں شمیم کے ساتھ اوپر چلا گیا۔ سارے دن دل کے اور جسم کے اوپر جو گذری تھی۔ اسکا اثر اب معلوم ہو رہا تھا۔ سارا جسم تھکن سے چور ہو رہا تھا لیکن آرام کرنے میں بھی نہ معلوم کیوں خوف محسوس ہوتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آرام کرنے سے کبھی چین نہ ملے گا۔ دن بھر جس خلش کو باہر کے شور وغل میں بھلائے رہا۔ ذرا سا موقع پا کر وہ پھر دل پر چھا جائے گی۔ اس خلش کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی خوف تھا کہ اس خلش کی روشنی میں شاید اپنے دل کا وہ روپ نظر آئے گا جس کا میں نے تصور بھی نہ کیا ہوگا اور جسکو برداشت کرنے کی طاقت میں ابھی تک نہ جٹا سکا تھا۔

شمیم دوسرے کمرے میں جا رہا تھا۔ بلا کر اُسے قریب بٹھایا۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس سے کیا بات کروں۔ جس بات نے دل پر غلبہ کیا ہوا تھا۔ اُسے بھلانے کے لئے کیا کہوں۔ اس مصیبت سے شمیم نے ہی نجات دلائی۔ بولا۔ "دیکھو دونوں لڑکیوں کے ساتھ اکیلے نصرت کو بھیجکر ہم بے فکر نہیں ہو سکتے۔ انہیں لے جانے میں بڑی پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ نصرت اکیلا ساری ذمہ داری نہیں اٹھا سکیگا سوچتا ہوں میں بھی ساتھ چلا جاؤں۔"

"جان بچی۔ کہنے کو کوئی بات تو ملی۔" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "میرے جانے سے کام نہیں چلے گا؟"

شمیم نے کہا: "چلے گا کیوں نہیں۔ لیکن بڑا جھنجھٹ ...؟"

میں نے ہنس کر کہا: "جھنجھٹ ہی تو میں چاہتا ہوں!"

شمیم نے نہ معلوم کیسے کوئی مذاق نہ کیا۔ میری طرف عجیب نظروں سے کہا: "اچھا تو تو ہی ساتھ جا!"

اس کے بعد بہت دیر تک کوئی بات نہ ہوئی۔ شام کا اندھیرا گھر آیا تھا۔ اور اس اندھیرے میں گھر کا سارا ماحول دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اس دھندلی روشنی میں مختلف سمتوں میں دیکھ رہے تھے۔ شمیم کو اس طرح خاموش بیٹھنے کی عادت نہ تھی۔ اسکا یہ انداز دیکھ کر حیران ہونا قدرتی بات تھی۔ میں خاموش بیٹھا کوئی بات چھیڑنے کی سوچ رہا تھا کہ اچانک شمیم بول اٹھا "ہو سکے تو ایک بار بستی پور ہو آنا۔ اسی راہ پر پڑیگا۔"

میں نے تعجب سے کہا: "بستی پور؟"

شمیم نے کہا: "ہاں! منو کا سسرال وہیں ہے۔" اور یہ کہکر وہ فوراً چلا گیا۔

× × × × ×

نصرت اور سبحان نے گوسائیں جی اور اُن کے گروہ کا کیا بندوبست کیا، یہ تو وہی جانیں۔ البتہ دوسرے دن صبح اٹھ کر دیکھا تو اُن کا پتہ نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ رات ہی میں گزر کر صبح ہوتے ہی وہ لوگ چلے گئے تھے۔ کافی دیر تک نصرت اور سبحان ہم سے کتراتے رہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ گوسائیں جی کے بارے میں انہوں نے کیا فیصلہ کیا تھا لیکن ونے نے سارا معاملہ چھیڑ دیا۔ بولا "شمیم دادا نصرت اور سبحان کی بے انصافی دیکھی۔ مانا کہ سارا قصور گوسائیں جی اور لبھو ... کا ہی ہے لیکن ان کے لئے سارے قافلے کو سزا دینا کہاں تک مناسب ہے؟"

سبحان بگڑ اٹھا تو انکار کیسے کرتا۔ ونے کی بات کی تردید کرتے ہوئے بولا۔ "کیسی سزا۔ ایسے نیک کام میں حصہ لینے کا ذوق بھلا کیسے حاصل ہوتا ہے!"

شمیم نے کہا: "ذرا سنوں تو سہی کہ اس بار آپ نے کون سا نیک کام کیا ہے؟"

نصرت کے جواب دینے سے پہلے ہی ونے نے کہا۔ "اپنے پر تلی

کی یاد ہے یا نہیں؟ وہی جو ویدپران کا ماہر ہو گیا تھا۔ ان دنوں رنگ پور سے ایک بغیر ہاتھ پاؤں کی مورتی اُٹھا لایا تھا۔ اس کے بعد بہت کوشش کرنے پر اُلٹا بیکار رہنے پر جب اُسے کارآمد ثابت نہ کیا جا سکا تو ہمارے عالموں نے اُسے پرانا سنگ میل یا اس طرح کے دوسرے خطابات دے ڈالے۔ اور بعد میں اُسے ایک اندھیری کوٹھڑی میں ڈال دیا تھا؟

تعجب سے میں نے کہا۔ بہت بڑا تعلق ہے۔ ذرا سنئے نا۔ ادھی رات کو شرت کندھے پر اٹھا کر اس مورتی کو کوٹھڑی سے نکال لایا اور اُسے سامنے رکھ کر بولا۔ یہ بھدرکالی دیوی کی مورتی ہے۔ دیوی ظاہر ہوئی۔ لیکن پیسے کی کمی کی وجہ سے اس کا مناسب پوجا نہ ہو سکی۔ اگر سائیں جی اور اُن کے قافلے کے افراد مل کر اُن کی پوجا کا خرچ دے دیں تو اُن کے سات خون بھی معاف ہو سکتے ہیں؟

میں نے پوچھا۔ "انہوں نے اس بات پر اعتبار کر کے پیسہ دیا؟"

اس بار شرت نے کہا۔ "دیں گے نہیں! دوسرے طریقے سے خواہ نہ دیتے۔ لیکن یہ سُن کر کہ بھدرکالی دیوی کی مورتی ہے۔ اعتبار کیا یا نہیں کیا خوف سے پیسے نکال کر خود ہی دے دیے۔ افسوس کی بات صرف یہ ہے کہ جن کو زیادہ سزا ملنی چاہیئے تھی۔ انہی نے زیادہ روپیہ دیا۔"

میں نے کہا۔ "یہ تمہاری زیادتی ہے شرت۔ انسان کے مذہبی اعتقاد کا اس طرح مذاق اڑانا میری سمجھ میں مناسب نہیں معلوم دیتا۔"

ونے نے میری بات کی داد دیتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ یہ مذاق نہیں ذلیل بھی ہے۔"

شرت نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "لیکن معلوم ہے کہ گوپال کے بیتے ہوئے تین سو روپے ختم ہونے والے ہیں۔ کالی گھاٹ کے پنڈے دنیا کو لوٹتے ہیں۔ ہم نے بھی اگر بھدرکالی دیوی کے نام پر کچھ لے لیا تو کیا ستم ہو گیا۔ بھدرکالی ماں اتنی سنگدل نہیں ہیں کہ اس بات سے ناراض ہوں۔"

ونے نے کہا۔ "تو کالی گھاٹ کے پنڈے ہی بن جاتے۔ ملک کی خدمت کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔"

شاستر پڑھ کر تو ملک کی خدمت کرنے نہیں آیا۔ نہ ہی کبھی ایسے عہدنامہ پر دستخط کئے ہیں کہ کبھی کسی کو دھوکا نہ دوں گا۔ ہمیشہ سچ بولوں گا!

ونے کو واقعی غصہ آ گیا۔ بولا۔ "تم لوگوں کا یہ مسخرہ پن تمہیں کہاں لے جا رہا ہے۔ جانتے ہو؟ جنہوں نے ملک کی خدمت کو ایک عہد بتایا ہے۔ انہوں نے اس لفظ کا استعمال بغیر سوچے سمجھے نہیں کیا۔ شاستروں کی باتوں کا مذاق اُڑا سکتے ہو۔ لیکن وہ لنکا یا ٹرائے کو شیشہ ٹوٹ گیا تو اس کے ٹکڑے خاک میں مل جائیں گے۔"

شرت ونے کی زبان بند کرنے کے لئے کچھ کہنے والا تھا۔ لیکن ونے نے اسے روک کر اپنی بات جاری رکھی۔ "تم کہتے ہو کہ شاستروں کی پابندی سے انسان تنگ خیال ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بغیر ذہنی قوت بھی نہیں بڑھتی۔ جنہوں نے ملک کی خدمت کو ایک پاکیزہ عہد سمجھ رکھا ہے۔ وہ اس بات کو جانتے ہیں۔ تم لوگ جسے مسخرہ پن سمجھتے ہو وہ آہستہ آہستہ تمہارے دل پر چھاتا جا رہا ہے۔"

شرت نے ہاتھ کی انگلی پر گن کر کہا۔ "عہد۔ خاک۔ ارتقی۔ تیرے خیالات کیسے بھی ہوں۔ ونے لیکن یہ ماننا پڑے گا۔ کہ تیری زبان بڑی سلیس ہے!"

شمیپین نے سامنے آ کر انہیں خاموش کرتے ہوئے کہا۔ "جانتے ہو شرت کو گھاٹ کی بیماری لگ گئی ہے۔ اس کی جگہ میں تمہارے ساتھ لڑتا ہوں!"

ونے نے ہنس کر کہا۔ "نہیں شمیپین دادا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صرف شرت ہی نہیں بلکہ اس عہد کے سبھی آدمی بہت زیادہ چالاک بن کر اپنی زندگی ضائع کر رہے ہیں۔"

شمیپین نے کہا۔ "زندگی ضائع ہی ہوتی ہے۔ تو بیوقوفی سے تو نہ ہو۔ بہادری اسی میں ہے کہ چالاکی سے ہو!"

"میری بات تم نے سمجھی نہیں شمیپین دادا۔ ہماری چالاکی کے پیچھے دلی خلوص نہیں ہے۔ یہ ایک افسردہ دلی کی ظاہری شکل ہے۔ اس طرح ہم لوگوں نے منہ بچکانے کے سوا اور کچھ نہیں سیکھا۔ لیکن منہ بچکا کر ہر بات کا مذاق اڑانے اور ہر چیز کو حقیر سمجھنے کی کوشش میں ہم خود بہت حقیر ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا تم یہ محسوس نہیں کرتے کہ پرانے لوگوں کے مقابلہ میں ہم بہت چھوٹے ہیں۔"

شرت نے کہا۔ "تمہیں دیکھ کر ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن تمہارے اس پیچیدہ احساس کا ذکر کرنا فضول ہے!"

ہم سب ہنس پڑے۔ شمیپین نے کہا۔ "شرت کو لوٹ آنے دو ونے۔ تبھی اس موضوع پر سنجیدگی سے بحث کی جائے گی۔"

× × × × ×

نصرت کے ساتھ دونوں لڑکیوں کو پہنچانے میں بھی روانہ ہوا۔ اودھ سے دہلی پہنچ کر اور پھر کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ایک جنکشن پر اترنا تھا۔ وہاں سے چھوٹی لائن کی گاڑی پر سوار ہو کر دونوں لڑکیوں کو ان کے گاؤں تک پہنچنے میں دیر نہ تھی۔

جب ہم لوگ گاڑی سے سٹیشن پر اترے تو شام ہو گئی تھی۔ ایک میدان کے بیچ میں ٹین کے سائبان سے ڈھکا ہوا چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ گو سائیں جی سے اتا پتہ معلوم ہو چکا تھا۔ کہ اس سٹیشن سے دو کوس کے کھلے میدان کو پار کر کے دونوں لڑکیوں کا گاؤں ملے گا۔ یہاں کسی سواری کا بندوبست نہ تھا۔ اگر گاؤں میں کسی کا اثر و رسوخ ہو اور کافی پیسے خرچ کئے جائیں تو پالکی کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے لئے بھی سات دن پہلے کہنا ضروری تھا۔ بیل گاڑی ضرور چلتی تھی۔ لیکن اس کا بھی کوئی خاص راستہ نہ تھا۔ کبھی میدان میں چلتی تو کبھی کچے راستے پر۔ یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ بیل گاڑی سے سفر کرنے میں جسم کا کوئی عضو سالم رہ جائے گا۔ پھر بھی ہو بیل گاڑی سے سفر کرنے کی خواہش ہوتے ہوئے اس خواہش کی تکمیل کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔

سٹیشن پر ہمارے سوا کوئی نہ اترا۔ جو شخص ایک ہری جھنڈی ہلا کر تھکی ہاری گاڑی کو ایک طرح سے زبردستی سٹیشن سے باہر ہانک کرنے گیا، اس کے علاوہ سٹیشن پر چڑیا کا بچہ بھی نہ تھا۔

اس شخص کا لباس کچھ عجیب تھا۔ جسم کی دھوتی جتنی چھوٹی تھی، اتنی ہی میلی۔ اُسے گھٹنوں سے نیچے پہننا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ جسم پر دھوتی کی مانند میلی ایک صدری تھی۔ لیکن لباس خواہ کچھ بھی ہو سر کی طرف دیکھتے ہی اس کے عہدہ کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔ سر کی ٹوپی دیکھتے ہی ہم سمجھ گئے کہ یہی سٹیشن ماسٹر ہیں۔ اس چھوٹے سے سٹیشن پر ٹکٹ بیچنے سے لے کر ٹکٹ واپس لینے تک تمام ضروری فرائض انہی کو انجام دینے پڑتے تھے۔ لیکن ان کے چہرے سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ یہ سب کام کرنے میں انہیں کوئی دقت محسوس ہوتی ہے۔ صحتمند، گول مٹول چہرہ، چہرے پر تازگی، بال پک گئے تھے لیکن چہرہ پر جھریاں نہیں پڑی تھیں۔ چہرے پر جو ہنسی تھی اس سے یہ شخص سادہ لوح نہیں بلکہ بیوقوف نظر آتا تھا۔ پھر بھی ہنسی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ ہمارے ٹکٹ لینے کے بعد ان کا چلے جانے کا ارادہ نظر نہ آیا۔ ذرا ادھر اُدھر دیکھ کر احمقوں کی طرح کئی مرتبہ ہنسکر انہوں نے پوچھا۔ "آپ لوگ کہاں جائیںگے؟"

بات کرنے کا انداز دیکھ کر محسوس ہوا کہ اس ویرانے میں انسان سے دو دفعہ بات کرنے کی سعادت حاصل کرنا ان کے لئے بہت بڑی بات تھی۔

ہماری منزل مقصود کا نام سن کر انہوں نے کہا "یہ تو قریب دو کوس کا راستہ ہے۔ اب شام کے وقت جانا تو مشکل ہو جائے گا۔ آپ کے پاس لالٹین ہے؟"

نصرت نے کہا۔ "نہیں لالٹین تو نہیں ہے۔ لیکن ہے تو خاص فائدہ نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ کہنا مشکل ہے کہ روشنی میں راستہ دیکھ کر بھی ہم راستہ پہچان لیتے۔ ہم لوگ یہاں پہلی بار آئے ہیں۔"

سٹیشن ماسٹر صاحب کے معصوم چہرے پر فکر و تردد کی گہری لکیریں نمودار ہوئیں۔ انہوں نے کہا "تب تو آپ راستہ نہ دیکھ سکیں گے۔ بڑا پیچدار راستہ ہے۔"

ہم کو پہلے ہی اس بات کا اندیشہ تھا۔ سٹیشن ماسٹر کی بات سے یقین ہو گیا۔ اور فکر پیدا ہوا۔ ان دونوں بے سہارا عورتوں کو لے کر رات کے وقت راستہ تلاش کرنے میں اگر گاؤں نہ پہنچ سکے تو نہ جانے کس مصیبت میں پڑ جائیں۔ پھر بھی امید کے آخری تنکے کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا "ایسا کوئی آدمی نہ دے سکیں گے جو ہمیں راستہ دکھا دے۔ ہم لوگ اسے کچھ بخشش دے دینگے۔"

"بخشش تو دیدیں گے لیکن دے گا کون؟" یہ کہہ کر سٹیشن ماسٹر نے اپنے مذاق پر خود ہنسکر کمال کر دیا۔ ہنسی رکنے پر بولے۔ "سالا کیشا ہوتا تو آپ کے ساتھ چلا جاتا۔ لیکن جب سے یہاں آیا ہوں۔ شام کے وقت کبھی اس کی صورت نہ دیکھی۔ اسکی یہاں نائٹ ڈیوٹی ہے نا!"

سٹیشن ماسٹر صاحب کی ہنسی دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی اُن کا پیٹنٹ مذاق ہے۔

کیشا کا تعارف راز کے پردے میں پوشیدہ ہونے پر بھی انہوں نے اسکی نقاب کشائی کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ میں نے کہا۔ "تو کوئی نہ مل سکے گا؟"

سٹیشن ماسٹر صاحب نے کہا "میں خود آپ کے ساتھ جا سکتا تھا۔ لیکن ساڑھے آٹھ بجے تھرو اپ پسینجر کو پاس کرنا ہے"

میں نے ان کی فیاضی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "نہیں نہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے سٹیشن چھوڑ کر بھلا آپ کو چلنے کے لئے کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"ضرور کہہ سکتے ہیں۔ شوق سے کہہ سکتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح مجھے جانا نہیں پڑا؟ ابھی پرسوں سویرے کی بات ہے سرڈنی کے ہمارے ٹلرجی مہاشہ اپنی لڑکی کی شادی کے لئے بازار سے ایک گدھے کا بوجھ لے کر اترے اور بولے۔ ماسٹر گھر کے لڑکے تو نظر نہیں آتے۔ دوپہر کی گاڑی سے آنے کی اطلاع دی تھی شاید اسی لئے نہیں آئے۔ سامان میں کیسے لے جاؤں۔ بتاؤ کیا کرتا؟ سوچا ابھی سات بجے ہیں۔ دوپہر کی گاڑی ۱۲ بجے آتی ہے۔ اس سے پہلے گیارہ بجے ایک مال گاڑی کو پاس کرنا تھا۔ چنانچہ تیزی سے چل کر گیارہ بجے تک سرڈنی سے واپس لوٹا جا سکتا ہے"

نصرت نے کہا۔ "تو ان حضرت کا سامان لے کر ان کے گھر گئے یا نہیں؟"

بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلا کر سٹیشن ماسٹر صاحب نے کہا۔ "نہ جاتا تو کرتا۔ آپ ہی بتائیے۔ ان کی مچھلی بارہ بجے تک سڑ نہ جاتی۔ وہاں سے لوٹ کر مال گاڑی کو صحیح وقت پر پکڑ تو لیا لیکن ذرا دوڑنا پڑا۔"

نصرت نے کہا۔ "اس عمر میں بھی آپ کھانا کھانے کے بعد دوڑ سکتے ہیں؟"

"کھانا کھانے کے بعد؟" سٹیشن ماسٹر صاحب نے قدرے تعجب سے پوچھا؟

میں نے کہا۔ "انہوں نے کھلا پلا کر ہی بھیجا ہوگا۔"

"ارے رام کا نام لو۔ ٹلرجی مہاشہ بھلا کب کھلانے والے ہیں۔ اتنا کنجوس ہے کہ صبح اگر اسکا نام لے لو۔ تو دن بھر کھانا ہی نہ ملے۔"

نصرت نے کہا۔ "اتنی دوڑ ان کی مچھلی لاد کر لے جانے کے بعد انہوں نے آپ کو کھلائے پلائے بغیر جانے دیا۔"

سٹیشن ماسٹر صاحب نے جواب دیا۔ "اور کیا۔"

ہم نے سوچا حالانکہ دور دیہات کے ایک چھوٹے سے سٹیشن کا سٹیشن ماسٹر ہے۔ لیکن ایسا آدمی ملتا کہاں ہے۔ یہ آدمی واقعی فراموش کرنے لائق نہیں ہے۔ اتنی سی دیر میں ہی اس شخص کے ساتھ یگانگت پیدا ہو گئی تھی۔ ایسے شخص کے ساتھ بھلا کیوں نہ ہوتی!

x x x x x

ہم نے سوچا رات بھر کے لئے سٹیشن ماسٹر سے پناہ مانگنا مناسب نہ ہوگا۔ اتنے میں ماسٹر صاحب نے خود ہی یہ بات چھیڑی۔ بولے۔ "اگر مانیں تو ایک بات کہوں۔ آج رات اگر ہمارے یہاں گزار دیں تو کل صبح میں ہی آپ کو پہنچا آؤں گا۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ!" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم نے بڑی خوشی سے یہ تجویز منظور کر لی۔

ماسٹر صاحب بولے۔ "ذرا ٹھہریئے آفس کا کچھ کام باقی ہے۔ ذرا اس سے فارغ ہو لوں۔"

یہ کام بھی کچھ معمولی نہ تھا۔ ہمارے چاروں ٹکٹوں کو ایک ٹین کے ڈبے میں ڈالا۔ ٹوپی میز پر رکھی۔ اور اس کے بعد سٹیشن کی سرخ اور سبز شیشوں والی لالٹین اٹھا کر کہا۔ "چلئے۔"

نصرت نے کہا۔ "آپ کا کام پورا ہو گیا ماسٹر صاحب؟"

ماسٹر صاحب نے کہا۔ "جی ہاں! اب صرف آٹھ بجے والی ٹرین پاس کرنے کے بعد مکمل چھٹی ہو جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "آفس کے کمرے میں تالا نہ لگائیں گے؟"

ماسٹر صاحب نے کہا "تالا لگانے کی کیا ضرورت ہے۔"

سٹیشن کے تحفظ کے بارے میں بھی مجھے جو غلط فہمی تھی وہ ان کا تعجب دیکھ کر دور ہو گئی۔ بولا۔ "کچھ نہیں۔ ایسے ہی کہہ رہا تھا۔"

ماسٹر صاحب آگے آگے لالٹین لئے چل رہے تھے۔ بولے "ارے صاحب تالا ہوتا تو لگاتا۔ کیشٹو کمبخت نے نہ معلوم تالا کہاں غائب کر دیا ہے۔"

سٹیشن سے تھوڑی دور میدان میں ماسٹر صاحب کا کوارٹر تھا۔ سٹیشن کیسا بھی ہو کوارٹر برا نہ تھا۔ دو کمروں کا پکا مکان، ساتھ میں رسوئی، سامنے ایک کنواں۔

جیسا سٹیشن کا حال تھا وہی گھر کا تھا۔ تالا کہیں نہ تھا۔ باہر سے دھکیلتے ہی دروازہ کھل گیا۔ ماسٹر صاحب نے اندر جا کر کہا۔ "جو سوچا تھا وہی ہوا۔ کمبخت کیشٹو نے آگ نہیں سلگائی۔ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ بدمعاش کو کتنی بار کہا کہ میں اور سب کام کر سکتا ہوں،

بولا۔ یہ تک میرے بس کی بات نہیں ہے۔ بھائی تو اتنا عرصہ رکھ دیا کرو لیکن سفر لمبا پڑا ہے میری آنکھ بچا کر بھاگ جانے میں بڑا مزا آتا ہے۔"

سکینہ کو یہ نیا تعارف پا کر بڑا مزا آیا۔ معلوم ہوتا ہے اپنے شوہر کی کمزوریوں کو اس نے خوب پہچان لیا تھا۔

ماسٹر صاحب نے الماری کے اوپر رکھا ایک سفری چولھا جو ... نظر آتا ہے کہ آپ لوگوں کو بڑی پریشانی ہوئی۔ میں تو اکیلا آدمی ہوں۔ میری گزر تو جیسے تیسے ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کو کھانے کے لئے کیا لا کر دوں۔"

ان کی پریشانی دیکھ کر انہیں تسلی دینے کے لئے میں نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ رات گزارنے کو ٹھکانہ تو ملا۔ ایک دن نہیں کھائیں گے۔ تو کیا حرج ہے۔"

میں نے یہ کہہ تو دیا لیکن دن بھر ٹرین میں دھکے کھانے کے بعد رات فاقہ کرنے کا خیال کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا۔ اس کے علاوہ ہم تو فاقہ کر بھی سکتے تھے۔ لیکن دونوں لڑکیوں کو کیسے بھوکا رکھا جا سکتا تھا۔

ماسٹر صاحب نے بے چین ہو کر کہا۔ "نہیں نہیں بغیر کھائے پئے کیسے رہیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

عشرت نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں بغیر کھانا کھائے نہ رہ سکوں گا۔ آپ کا کوئلہ وغیرہ کہاں ہے ماسٹر صاحب ذرا بتایئے۔ میں ہی چولھا سلگاتا ہوں۔"

گہرے سمندر میں گویا کنارہ پا کر ماسٹر صاحب ہنس کر بولے۔ "کیا واقعی آپ چولھا سلگا سکتے ہیں؟" ان کی تعریفی نظریں دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ شاید انہوں نے اس بات کا تصور نہ کیا تھا کہ ایک معمولی آدمی اتنی ہمت کر سکتا ہے۔

عشرت کو عزت ملتے دیکھ کر میں جل کر بولا۔ "عشرت چولھا تو سلگا سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ جس دن عشرت کا چولھا سلگ گیا اس دن کھانے کا وقت نہ بچے گا!"

عشرت مجھے تیز نظروں سے گھور کر باہر چلا گیا۔

× × × × ×

دو کمروں میں سے ایک لڑکیوں کے اٹھنے بیٹھنے کے لئے رکھا اور دوسرے میں ہم لوگوں نے ڈیرہ لگایا۔ یہ ماسٹر صاحب کا سٹور معلوم ہوتا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی چوکی پر چند ٹین کے ڈبے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف میز کے اوپر آلو اور دوسری سبزیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں سبزیوں کے چھلکے نہ جانے کتنے دنوں سے پڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ ماسٹر صاحب کو انہیں پھینکنے کی فرصت نہیں ملی۔ چوکی کے نیچے کبھی تھوڑا سا تیل گر گیا ہوگا۔ آج تک اسے صاف نہیں کیا گیا تھا۔ میز پر گرد کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس کمرے کو دیکھ کر ماسٹر صاحب کے گھر اور رہن سہن کا پورا اندازہ ہو گیا۔

کافی دیر کمرے میں بیٹھے رہنے پر جب ماسٹر صاحب اور عشرت نہ آئے تو میں انہیں دیکھنے باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہی آنکھوں کے سامنے جو منظر آیا اسے دیکھ کر ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔

ماسٹر صاحب زمین پر اکڑوں بیٹھے آنکھیں اور چہرہ سرخ کئے ہوئے چولھا پھونک رہے تھے۔ اوپر سے عشرت چولھے پر بڑے زور سے پنکھا کر رہے تھے۔ چولھے کا یہ حال تھا کہ آگ پکڑنا تو درکنار ذرا سا دھواں دے کر بھی ان کی محنت کامیاب ہونے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔

عشرت نے مجھے نہ دیکھا تھا۔ بولا۔ "ماسٹر صاحب تھوڑا سا تیل اور ڈال دوں؟"

ماسٹر صاحب نے مایوسی سے کہا۔ "اور تیل ہے کیا!"

معلوم ہوا کہ تیل ڈالنے میں عشرت نے کنجوسی سے کام نہ لیا تھا بولا۔ "تھوڑا سا ہے۔"

میں نے بھانپ لیا کہ عشرت کی قابلیت کے بارے میں ماسٹر صاحب کا تصور کافی ٹوٹ چکا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "لیکن پھر بھی آگ نہ پکڑی تو؟"

عشرت عاجز ہو چکا تھا۔ جل کر بولا۔ "تو اس چولھے کو پھینک دینا ہی مناسب ہوگا۔"

میں ان دونوں کی گفتگو سن کر ہنس پڑا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور میٹھی ہنسی کی آواز سن کر چونک گیا۔ دیکھا تو تھوڑا سا گھونگھٹ نکالے دونوں لڑکیوں میں سے ایک قریب کھڑی تھی۔ دھوتی منہ میں دبا کر ہنسی روکتی ہوئی بڑے

میٹھے لہجہ میں بولی "آپ لوگ پیچھے ہٹ جایئے!"

نصرت شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ ماسٹر صاحب گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ لڑکی نے ملایمت سے کہا۔ "آپ کہہ رہے تھے ذرا سا تیل باقی ہے۔ کہاں ہے؟"

اُن کی تنگ و دو لڑکیوں نے دیکھی ہو گی۔ اور اُن کی باتیں سن کر دل ہی دل میں ہنستی ہوں گی۔ اس خیال سے نصرت کی جو حالت ہوئی اُسے بیان کرنا مشکل ہے۔ شرم سے سرخ ہو کر اُس نے تیل کی بوتل آہستگی سے آگے سرکا دی۔

اس کے بعد کئی منٹ تک خاموشی رہی۔ ماسٹر صاحب بڑی حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ جس ناخوشگوار کام کرنے کی کوشش میں انہیں اس قدر حیران ہونا پڑا تھا اُسے ان لڑکیوں نے دیکھتے دیکھتے کتنی جلدی کر ڈالا۔ میں سوچ رہا تھا چولہا جلانے کی اتنی سہل ترکیب اس سے پہلے ہم میں سے کسی کو کیوں نہ سوجھی۔ دونوں لڑکیوں کی حفاظت کا خیال ہمارے ذہنوں پر اس طرح مسلط تھا کہ بے بس ہونے کے علاوہ وہ کچھ کر بھی سکتی ہیں۔ اس بات کا خیال ہی نہ آیا۔

لیکن سارا قصور ہمارا ہی نہ تھا۔ ان دو دنوں میں انہوں نے ہمیں گھونگھٹ کے علاوہ کچھ دیکھنے کا موقع ہی نہ دیا تھا۔ ہمیں صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ دونوں نند پال کی بھتیجیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں کچھ نہ معلوم تھا۔ اور نہ کچھ جاننے کا موقعہ ہی ملا تھا۔

اسی لئے میں نے محسوس کیا کہ ہماری مدد کے لئے آئی ہوئی اس لڑکی کے چہرے اور آنکھوں سے حیرانی اور تجسس کے آثار ابھی دور نہ ہوئے تھے۔ اسکی عمر کم تھی اور وہ غیر معمولی حسین تھی۔

اس کے بعد چولہا سلگنے میں دیر نہ لگی۔

ماسٹر صاحب نے اچھل کر کہا "بہو بیٹیوں کے علاوہ یہ کام کون کر سکتا تھا! مانا میں نہیں کر سکتا لیکن کیشٹو بھی تو آدھی بوتل ختم کئے بغیر آگ نہیں جلا سکتا۔"

نصرت نے کہا "کیشٹو کا زیادہ ذکر نہ کیجئے ماسٹر صاحب۔ آنکھوں سے تو اسے نہیں دیکھا۔ لیکن آپ کے منہ سے اسکی تعریف سن کر اس کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہا ہوں۔"

ماسٹر صاحب نہ معلوم کیا سمجھے۔ لیکن اس خیال سے کہ کیشٹو کے حق میں ہم کوئی زیادتی نہ کر بیٹھیں۔ وہ جلدی سے بولے "نہیں نہیں کیشٹو اچھا آدمی ہے۔ بس تھوڑا سا سنکی ضرور ہے۔ وہ گھڑی بھر کر ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔"

کیشٹو کیلئے ماسٹر صاحب کی کمزوری بھانپ کر اور یہ سوچ کر کہ ایک بار اس کا ذکر شروع ہو کر ختم نہ ہو گا۔ میں نے بات کا رُخ بدل دیا۔

نصرت سامان وغیرہ اکٹھا کر کے دونوں لڑکیوں کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "ابھی وقت ہے ماسٹر صاحب نصرت کو روک لیجئے۔ چولہا سلگانے میں تو اس نے مٹی کے تیل کی ساری بوتل ختم کر دی۔ اب بھی اگر اس کے شوق کو نہ دبایا گیا۔ تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج کھانا نہیں مل سکتا!"

میں نے محسوس کیا نصرت سے ماسٹر صاحب کا اعتقاد بالکل اُٹھ گیا تھا۔ میری بات سنتے ہی فوراً سنجیدہ ہو کر بولے۔ "نہیں نہیں نصرت بابو اب آپ کی ضرورت نہیں۔ انہیں کچھ پریشانی ضرور ہو گی لیکن جو کام آپ نہیں کر سکتے۔ اُسے کرنے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔ اس سے ان کی پریشانی بڑھے گی اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

چنانچہ نصرت کو ان کی مدد سے ہاتھ کھینچنا پڑا۔ دونوں لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ اپنے اوپر ساری ذمہ داری لے کر لڑکیاں کھانے کا انتظام کر رہی تھیں۔ چہرے پر تھوڑا سا گھونگھٹ ہونے کے باوجود ان کی جھجک کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ شاید رسوئی میں داخل ہوتے ہی صنفِ نازک کی ساری جھجک خود بخود دور ہو جاتی ہے۔

ماسٹر صاحب کے سٹور سے چاول، آٹے، دال سبزی ترکاریوں کی بھی کمی نہ تھی۔ پھر بھی افسوس کرتے ہوئے بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کو بڑی پریشانی اُٹھانی پڑے گی۔ نمک تیل تو ہے لیکن اور کوئی مسالہ نہیں ہے!"

لیکن ان کا اندیشہ فضول تھا۔ ان کا اندیشہ دور کرتے ہوئے چھوٹی لڑکی نے کہا "مسالہ تو ہے"۔ ماسٹر صاحب نے تعجب سے کہا "ایں؟ کہاں ہے؟ بھگوان جانے۔ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا!"

ہم سب لوگ ہنس پڑے۔

کھانا کھاتے وقت ہم نے دیکھا کہ مسالہ ہی نہیں ماسٹر صاحب

سوا اپنے گھر کی بہت سی چیزوں کا علم نہ تھا۔ ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ ماسٹر صاحب خود نہ سمجھ سکے کہ ان کے اس چھوٹے سے گھر میں ایسے لذیذ کھانے کا سامان کیسے اکٹھا کیا گیا۔

کھانے کے دوران میں انہوں نے دونوں لڑکیوں کا نام پوچھ لیا تھا اور اُن کی بات چیت اور سلوک کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ ان کے قریب ترین رشتہ دار نہیں ہیں۔

کھانا تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ ہماری تھالی کے قریب چٹنی کی کٹوری رکھ کر چھوٹی لڑکی پلٹ کر جا رہی تھی۔ (بنگال میں چٹنی کھانے کے بعد کھائی جاتی ہے) اس بار مجھے دھوکا نہیں دے سکتی بیٹی۔ چٹنی کے لئے املی ضرور اپنے ساتھ لائی ہوگی۔

کملا نے آدھے گھونگھٹ کی اوٹ سے کچھ ہنس کر کہا: "نہیں ہم املی کہاں سے لاتیں؟"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ املی ہمارے ہی گھر میں تھی۔ اور کل سویرے چٹنی کے لئے املی کو ڈھونڈنے کے لئے میں گھنٹوں کتنوں کی خوشامد کرتا رہا؟"

کملا نے کہا: "آپ نے کہاں تلاش کی تھی؟"

"صندوق میں۔ اور کہاں؟"

"املی تو آپ کے سونے کے کمرے میں تھی۔" یہ کہہ کر کملا چلی گئی۔ ماسٹر صاحب کا چہرہ دیکھ کر ہم لوگ ہنس پڑے۔ اس بار تو لگا گویا وہ آسمان سے گر پڑے تھے۔

کھانا ختم ہونے پر ہم لوگ کمرے میں بیٹھے کچھ گپ شپ کر رہے تھے۔ کھانا بنانے اور پروسنے میں لڑکیوں کی جھجک کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ ماسٹر صاحب کی موجودگی سے اُن کے اندر بے تکلفی بھی آ گئی تھی۔ چنانچہ دونوں ہمارے نزدیک آ کر بیٹھ گئیں۔ اچانک ماسٹر صاحب پوچھ بیٹھے: "راج پور میں آپ کس کے گھر جا رہے ہیں؟"

اتنی دیر کے بعد یہ سوال پوچھنا ماسٹر صاحب کا ہی حق تھا۔ میں نے بتایا کہ ہمیں کس کے گھر جانا ہے۔

نند پال کا نام سنتے ہی ماسٹر صاحب کا اعتقاد گہرا ہو گیا۔ بولے: "بڑا اچھا آدمی ہے۔ اس جیسا گاؤں کا ہمدرد اور کوئی نہیں ہے۔"

ماسٹر صاحب کی بات سے متعجب ہو کر میں نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"یعنی جس طرح دس آدمیوں میں سے ایک آدمی ہوتا ہے گاؤں میں وہ تالاب بنوا دیئے ہیں، غریب اور یتیموں کو دل کھول کر دان دیتا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے نند پال کا جو تعارف پیش کیا۔ اس سے میں کچھ خوفزدہ ہو گیا۔ "پھر تو پیسے والا آدمی ہو گا۔" "کیوں؟ پیسے والا نہیں تو اور کیا ہے۔ دس ہزار روپیے کا معاملہ میں لگا رکھے ہیں۔ زمین، جائیداد، باغ اور تالاب کا تو شمار ہی نہیں۔"

اب سمجھ میں آیا کہ نند پال کو اپنی بھتیجیوں کی جائیداد کی اتنی فکر کیوں ہے۔ یہ بھی سمجھ لیا کہ دونوں لڑکیوں کو اُن کے مشفق چچا کے گھر پہنچانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہم نے سمجھا تھا۔

× × × × ×

اگلے دن سویرے ماسٹر صاحب نے ہم لوگوں کو منزل پر پہنچا دیا۔ راستہ زیادہ مشکل نہ تھا۔ دن میں تو ہم خود لوگوں سے پوچھ تاچھ کر کے پہنچ سکتے تھے۔ البتہ رات کو دقت ہوتی۔

نند پال کے گھر کا ٹھاٹ باٹ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ دولت مند اور فارغ البال شخص ہے۔ امید نہ تھی کہ اتنے دور کے دیہات میں اتنا ٹھاٹ باٹ نظر آئے گا۔ پکوس اور ٹین سے ڈھکی ہوئی اسکی شاندار حویلی تھی، اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ نند پال نے ویشنو دھرم اختیار کیا تھا۔ مکان کے دو حصے لیکن باہر کا حصہ اندرونی حصہ کے مقابلہ میں بڑا تھا۔ پکے صحن سے آگے چل کر ایک سوالے گھر تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی کرشن جی کا مندر۔

ہم نے دیکھا کہ نند پال کو ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی خبر مل چکی تھی۔ گھر کے قریب پہنچتے ہی چندن اور تلک لگائے ہوئے وہ برہمن ہمارے خیر مقدم کو آئے۔ ویشنو دھرم کے بارے میں کوئی سبق دینے کی بجائے وہ ہمارے ساتھ شائستگی سے پیش آئے۔ بولے: "ہماری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ نے ہمارے گاؤں میں آنے کی تکلیف گوارا کی۔" یہ کہتے کہتے وہ سیدھے

اور آسان راستے سے ہمیں اندر لے چلے۔

شروع میں اتنی خاطر ہوتے دیکھ کر ہمیں کچھ تعجب ہوا۔ گھر کے اندر جا کر دیکھا۔ ہمارے سواگت کے لئے کچھ کم تیاری نہیں ہوئی تھی۔ نند پال کا اُگھا گنجا سر، تیل سے چکنا فربہ جسم اور بازو میں سونے کا کڑا دیکھ کر ہی پہچان سکے وہ بڑے شائستہ اور مہذب طریقے سے ہمارا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھے۔

سامنے ہی بڑے کمرے میں ایک فرش لگایا گیا تھا۔ چاندی کی فرشی اور زری کے کام کا مسند نہایت قاعدے سے لگا ہوا تھا۔ یہ سب دیکھ کر بھی ہمیں تعجب ہوا۔ انہوں نے اتنی تھوڑی دیر میں ہی ہمارے خیر مقدم کی اتنی تیاری کیسے کر لی! یہ سوچنا تو بیکار تھا کہ اس دیہات میں مہمانوں کی خاطر کے لئے روزانہ بندوبست قائم رہتا ہے۔ لیکن ہماری حیرانی بہت جلد دُور ہو گئی۔ ہمارے گوسائیں جی گلے میں کنٹھی پہنے ایک کھمبے کی آڑ میں کھڑے تھے۔ میں نے انہیں دیکھ لیا۔ اب مَیں سمجھا کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے انہوں نے ہی گاؤں پہنچکر ہمارے آنے کی خبر نند پال کو دی تھی۔

نند پال نے ہم سے درخواست کی کہ ہم اسکی چوڑی پشتوں کے سجادہ نشین بن کر فرش پر رونق افروز ہوں۔

نصرت نے مجھ سے کہا۔ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو سارے میس کو ساتھ لے آتا۔ کھانے کا بندوبست بھی بیٹھنے کے بندوبست سے کچھ کم نہ ہوگا۔" مَیں نے گاؤ تکئے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اتنی عزت ہوتے ہوئے دیکھ کر مجھے تو دال میں کالا نظر آتا ہے۔"

نصرت نے چڑ کر کہا "تیرا مزاج تو شکی ہے۔ تیری نجات مشکل ہے۔" لیکن وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اس آؤ بھگت اور خاطر تواضع کے اندر جو فریب تھا اس کا پتہ چل گیا۔

نند پال کی دونوں بھتیجیاں کچھ دُور ہمارے ساتھ آکر اب گھر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ مَیں نے سُنا۔ نند پال انہیں پکار کر کہہ رہا تھا "پگلی لڑکیو! ابھی سے گھر میں جانے لگیں۔ یہ بابو لوگ اتنی تکلیف اٹھا کر تمہیں یہاں ساتھ لائے ہیں۔ انہیں پرنام کر کے جاؤ۔"

نند پال کے لہجے سے شفقت اور محبت کا اظہار ہو رہا تھا دونوں لڑکیاں شرمندہ ہو کر لوٹیں۔ اور ہمارے قریب آکر انہوں نے ماسٹر صاحب کو اور ہمیں پرنام کیا۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ اندر نہ جا سکیں۔ نند پال نے ہنس کر کہا۔ "ارے اتنی جلدی کیا ہے بیٹھو۔ بیٹھو۔ یہیں بیٹھو۔ ان بابو لوگوں سے پورا قصہ تو سن لیں۔ میں یہاں کئی دنوں سے تمہارے بارے میں سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔

نند پال کا چہرہ دیکھ کر اس کے دل کا حال جاننا مشکل تھا۔ لیکن پھر بھی میرا دل دھڑک رہا تھا وہ ضرور کوئی شیطانی چال چل رہا ہے اس بارے میں کوئی شبہ نہ رہ گیا تھا۔

ماسٹر صاحب ٹھہرے بیچارے سیدھے سادے آدمی۔ نند پال کی باتوں پر ہنس کر بولے "لیکن بھائی تمہاری دونوں بھتیجیاں ہیں بہت اچھی۔ کل ہمیں ایسا کھانا بنا کر کھلایا کہ تم سے کیا کہوں؟" اس کے بعد لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولے "لیکن چچا کے گھر آکر اس بوڑھے کو بھول نہ جانا۔ گھر کے کھانے سے جس دن طبیعت اکتا جائے گی۔ یہیں آکر ڈیرہ ڈال دوں گا۔ پہلے بتائے دیتا ہوں۔" لڑکیوں نے شرم سے سر جھکا لیا۔

نند پال اس بار فرش کے قریب میز پر بیٹھ کر بولا۔ "لیکن بات کیا ہے ماسٹر جی تو سہی۔ ان کے ساتھ انہیں دیکھنے کی تو امید نہ تھی!"

ماسٹر صاحب نے کہا "ڈرو نہیں بھائی۔ ڈرو نہیں۔ میں آج ہی ڈیرہ نہیں ڈالوں گا!" اپنی بات پر خود ہی ہنستے ہوئے ماسٹر صاحب نے پھر کہا۔ میرے ساتھ نہ ہونے پر بھلا اپنی بھتیجیوں سے دوبارہ کیسے ملتے۔ یہ لوگ تو راستہ جانتے ہی نہیں!"

نند پال نے کچھ کھانس کر چہرے پر غم کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا "پچھلے کئی دنوں سے فکر ہو رہا تھا ماسٹر۔ کھانا پینا سونا ایک طرح سے چھوڑ رکھا تھا۔ سوچتا تھا دونوں لڑکیاں اگر نہ جاتیں تو میں نہ جانے دیتا۔ گنگا نہانے کا لی گھاٹ گئیں تو نہ جانے کونسی آفت ٹوٹ پڑی۔ کئی دنوں سے کچھ پتہ نہ لگا۔ گاؤں کے لوگ جیسے ہیں تم جانتے ہو ماسٹر۔ انہیں تو کوئی بہانہ ملنا چاہیئے!"

اس بار نصرت نے فکرمند انداز سے میری طرف دیکھ کر اشارہ

کیا۔ اب ہم سمجھا میرا غصہ بے بنیاد تھا۔ لیکن ماسٹر صاحب کے یانی جیسے صاف دل پر کوئی داغ نہ پڑا۔ انہوں نے سنپال کی بات کا منشا نہ سمجھ کر کہا "مجھے بھی ہو بھائی۔ اب تو تمہیں یہی لینی نہ۔ اب تو تمہارا فکر دور ہو گیا۔ بیٹیوں کو کہو گھر میں جائیں۔ کئی دن سے تم نے ڈھنگ سے کھایا پیا نہیں ہے۔ اب بے فکر ہونے کی کوشش کرو۔"

سندپال نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا "نہیں ماسٹر بے فکر کیسے ہو سکتا ہوں۔ دنیا بے فکر کیسے ہونے دے گی۔ کمبخت گوسائیں نے آکر ایسی مجبوری سے کہ سر چکرا گیا۔ تھانے میں رپٹ کروں یا کلکتہ جاؤں، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔"

اتنی لمبی چوڑی تمہید سے ماسٹر صاحب نے متعجب ہو کر کہا۔ "کیا بکواس کرتے ہو سند۔ بھتیجیوں کی فکر کرتے کرتے کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل پڑا ہے؟"

"اس میں اب کسر بھی کیا رہ گئی ہے ماسٹر۔ میری جگہ اگر تم ہوتے تو تمہارا دماغ بھی چل پڑتا۔ گاؤں میں کیسی آفت مچی ہوئی ہے۔ کچھ اسکی بھی خبر ہے!"

اتنی دیر میں دونوں لڑکیاں مصیبت آتی دیکھ کر بے چین ہو اٹھیں۔ ماسٹر صاحب کی سمجھ میں پھر بھی کچھ نہ آیا انہوں نے سادگی سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

سندپال نے سر پہ ہاتھ رکھکر کہا۔ "میری تباہی کا سامان ہوا ہے۔ جن لوگوں کی بھلائی کے لئے دن رات مرتا ہوں۔ وہی لوگ سر پہ چڑھتے ہیں۔ سمجھے ماسٹر؟"

سنجیدگی سے فلسفیانہ انداز میں ماسٹر صاحب نے سندپال کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ اسی لئے کسی کی بھلائی نہیں کرنی چاہیئے۔" اس مصیبت کے وقت بھی میں ماسٹر صاحب کی بات سن کر ہنس پڑا۔

سندپال کی تمہید اب شائد ختم ہو گئی تھی۔ اچانک اصلی موضوع پر آکر اس نے کہا۔

"جانتے ہو ماسٹر اس کمینے گوسائیں نے گاؤں میں آکر کیا خبر اڑائی ہے؟"

ماسٹر صاحب نے استفہامیہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "گوسائیں جی کچھ بھی اڑائیں لیکن میرے خیال سے تو اس سے کچھ بگڑ نہیں سکتا۔"

سندپال نے یقینی لہجے میں کہا۔ "میں نے کبھی کسی کی برائی نہیں کی۔ بھگوان جانتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی میرے گھر میں آگ لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

ماسٹر صاحب نے چونک کر کہا۔ "ارے کس نے گھر میں آگ لگانے کی کوشش کی؟"

سندپال ماسٹر صاحب کی سادہ لوحی سے تنگ آکر بولا۔ "گھر میں آگ لگا دیتے تو بہتر تھا ماسٹر۔ لیکن اس کی بجائے یہ لوگ ہمیں تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے خاندان پر بدنامی کا ٹیکہ لگانا چاہتے ہیں۔ گوسائیں کے ساتھ گنگا اشنان کے لئے لڑکیوں کو بھیجا تھا۔ واپس آکر گوسائیں نے یہ خبر اڑا دی کہ وہ نہیں آئیں۔ میں نے پوچھا کیوں نہیں آئیں۔ اس نے کہا۔ ان کا پتہ نہ چل سکا۔ غصے میں آکر میں نے پوچھا تم لوگوں کے ساتھ بھیجا تھا اور تم ہی لوگ پتہ نہ لگا سکے۔ اس کا کیا مطلب؟ اس پر بھی اس نے کہا آنکھوں سے اوجھل تو ہونے نہ دیا تھا۔ پھر بھی کھلونا خریدنے کے بہانے نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ پھر نہ ملیں۔"

بہت دیر سے دل میں غصہ بھر رہا تھا۔

دونوں لڑکیاں اس بار سب کے سامنے ہی بے چین ہو کر مڑ بیٹھیں۔ اپنے چچا کے پیر پکڑ کر بولیں۔ "یہ ساری بات جھوٹ ہے چاچا جی۔ ہم تمہارے پیر چھو کر کہتی ہیں چاچا جی۔"

سندپال نے جلدی سے پیر کھینچ لئے اور کہا۔ "اری پگلیو! میں کیا تمہاری بات پر یقین نہیں کرتا۔ کیسی پاگل لڑکیاں ہیں۔"

ہم دونوں ایسے گم سم بیٹھے تھے گویا سانپ سونگھ گیا ہو۔ ساری بات سمجھتے ہوئے بھی کچھ بول نہ سکتے تھے۔ سندپال ایک تجربہ کار کھلاڑی کی طرح چاروں طرف سے سوچ بنا کر چال چل رہا تھا۔

ماسٹر صاحب لڑکیوں کا رونا دھونا دیکھکر پہلے تو گھبرائے لیکن پھر سنبھل کر سندپال کی بات پر دھیان دے کر بولے۔ "اری پگلیو! تمہارے بارے میں کوئی کچھ کہدے اس سے بات سچ تھوڑا ہی ہو جاتی ہے۔ جاؤ بیٹیو گھر کے اندر جاؤ!"

اس بار سندپال واقعی ماسٹر صاحب پر بگڑ اٹھا۔ ہم لوگوں کو امید تھی کہ شاید اس شخص کی غیر معمولی سادگی ہی شاید سندپال کی چال کو بیکار کر دے

کر دے۔ لیکن نندپال نے اپنے تیور سے بڑی خوبی سے جارکیا۔ اچانک ہمارے گوسائیں جی اور دبلا پتلا لبتو نہ جانے کہاں سے اس بساط پر نمودار ہوگئے۔ دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر اُن کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔

گوسائیں جی نے آنکھیں پھاڑ کر اُن کی طرف دیکھا اور کہا "ارے! یہاں موجود ہو! کچھ بھی ہو تم لوگ ہو خوب۔ کھلونا خریدنے کے بہانے گئیں اور ایسی کھسکیں کہ پتہ ہی نہ چلا"

دونوں لڑکیوں نے بے بسی سے روتے روتے صرف اتنا کہا "کیا بات کرتے ہو گوسائیں کاکا!"

لبتو گوسائیں جی سے بھی ایک گز آگے نکلا۔ چہک کر بولا۔ "بات کیسی۔ نندپال کی بھتیجی ہونے کی وجہ سے تمہاری بات چھپ نہ سکے گی۔ میں تو صاف بات کرنا جانتا ہوں۔ اس دن چپکے سے کہاں کھسک گئی تھیں۔ بتاؤ؟"

اچانک ایک غیر معمولی واقعہ ہوگیا۔ میں دیکھ رہا تھا بہت دیر سے شرت کے نتھنے غصہ سے پھول رہے تھے۔ یکایک اس سے برداشت نہ ہوسکا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے لبتو کے منہ پہ زور کا طمانچہ مارا اور کہا "زبان سنبھال کر بات کر بدمعاش۔ شیطانی کرنے کے لئے یہی جگہ ملی ہے؟" لبتو بھونچکا رہ گیا۔

معلوم ہوتا ہے نندپال نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ جب اس نے خود اٹھ کر لبتو کی گردن پکڑ کر باہر نکال دیا تو ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ اس بار میں نے سوچا کہ کہیں میں اب تک اُسے غلط تو نہیں سمجھتا رہا۔ تو کیا ماسٹر صاحب نے اس کے بارے میں جو تعریف کے پل باندھے تھے وہ صحیح تھے؟

لیکن یہ شبہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ دھکا دے کر باہر نکالے جانے کے باوجود لبتو کچھ دیر بعد گوسائیں جی اور دوسرے آدمیوں کو لے کر پھر آموجود ہوا۔ اس بار وہ لوگ لڑنے پر آمادہ ہوکر آئے تھے۔

دو بےکس لڑکیوں کو تباہ کرنے کے لئے ان لوگوں نے جو گہری سازش کی تھی اس کی حقیقت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ لبتو کو گردن سے پکڑ کر باہر نکال دینے کے بعد نندپال بڑی توجہ سے ہماری کہانی سن رہا تھا۔

یہ واقعہ دیکھ کر ماسٹر صاحب بھی سکتے میں آگئے تھے ہماری کہانی کے بیچ بیچ میں اپنی رائے دیتے جا رہے تھے۔ "چھی۔ چھی۔ یہ آدمی اتنی غلط بات بھی اڑا سکتے ہیں! کبھوں نے لڑکیوں کے منہ کی طرف بھی نہیں دیکھا۔"

نندپال کا چہرہ دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری بات سن کر اسکا سارا شبہ دور ہوگیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے معلوم ہو گیا کہ ہمارا یہ سوچنا کتنی بڑی غلطی تھی۔

لبتو اور گوسائیں کے ساتھ اس بار ایک نیا آدمی آیا تھا۔ بالکل بوڑھا۔ سر کے بال اور داڑھی بالکل سفید۔ اس کے پکے ہوئے بال اور داڑھی دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص بڑے ٹھنڈے دماغ کا ہوگا۔ لیکن اسکی ظاہری شکل کتنا بڑا دھوکا تھا۔ یہ معلوم ہونے میں دیر نہ لگی۔

نندپال نے اس کا خیر مقدم کرکے جس عزت کے ساتھ اسے بٹھایا۔ اسے دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ اس شخص کا گاؤں میں کافی اثر و رسوخ ہے۔ بوڑھے نے اپنی جگہ پر اطمینان سے بیٹھ کر کہا "آپ لوگ شاید کلکتہ سے آئے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

بوڑھے نے کہا "کالج میں پڑھتے ہیں شاید؟"

میں نے ہنس کر جواب دیا "نہیں!"

بوڑھے نے تعجب سے کہا "پھر کیا کرتے ہیں۔ نوکری؟"

یہ سن کر کہ نوکری بھی نہیں کرتا وہ کچھ حیران ہوئے پھر خاموش ہوگئے۔ اس کے بعد ہماری بات چھوڑ کر نندپال سے بولے "تم نے لبتو کو گردن پکڑ کر باہر نکال دیا نند؟"

نندپال نے جوش کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ہاں نکالا ہے۔ کیوں نہ نکالوں۔ جانتے ہیں اس نے میری کتنی بڑی بےعزتی کی ہے؟"

"کیا کیا ہے اس نے بھائی؟" یہ کہہ کر بوڑھے نے حقے کی نے ہونٹوں میں دبالی۔

لیکن نندپال کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔ لبتو نے خود آگے بڑھ کر کہا "انصاف کی بات کہنے سے بےعزتی ہوتی ہے

ان کی بھتیجیوں کو ہم لوگ کالی گھاٹ دکھانے لے گئے تھے۔ ہمارے واپس آنے کے دو سال بعد آج وہ نہ جانے کہاں سے آئی ہیں۔ ذرا پوچھئے تو سہی"

عشرت کو پھر غصہ آ گیا۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا لیا۔ غصہ مجھے بھی کم نہ آ رہا تھا۔ لیکن میں یہ سمجھ رہا تھا کہ غصہ ہو کر ان کی سازش ناکام نہ کر سکوں گا۔

نند پال نے لیتو کی بات پر بے حد غصہ ہو کر کہا۔ "اور یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ کچھ معلوم ہے!"

بوڑھے نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے ہوئے کہا "یہ لوگ کچھ بھی کہیں۔ یہ بات تو سچ ہے کہ تمہاری بھتیجیاں لیتو وغیرہ کے ساتھ نہیں لوٹیں؟"

خواہش نہ ہونے پر بھی گویا نند پال نے مجبور ہو کر اس بات کو تسلیم کیا۔

بوڑھے نے کہا "اونچے گھر کے ہندو کی دو [illegible] دو بن پردیس میں کہاں رہیں بھائی؟"

نند پال نے گویا بڑی مصیبت میں پڑ کر کہا "ان لوگوں نے بتایا نہ ......"

"یہ لوگ کچھ بھی کہیں۔ تم انہیں بہتر جانتے ہو یا لیتو اور گوسائیں کو؟"

نند پال کو جواب نہ سوجھا۔ شاید اسی لئے خاموش ہو گیا۔

بوڑھے نے کہا "اتنے دنوں سے گاؤں میں رہتے ہو۔ کبھی سنا کہ لیتو یا گوسائیں نے کوئی گندہ کام کیا ہے؟"

"نہیں کبھی نہیں سنا!"

یہ سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ ہم لوگ کتنی بڑی سازش میں آ کر پھنس گئے ہیں۔ ان لوگوں نے کتنی خوبی سے اس بھیانک کھیل کی ایک ایک تفصیل کی تکمیل کی ہے۔ یہ سمجھنا مشکل نہ تھا پھر بھی مجبور ہو کر بیٹھے رہنا پڑا۔

بوڑھے نے گویا نند پال کے جواب سے اپنی بات کی صداقت کی سند حاصل کر لی تھی۔ فخر کے ساتھ بولا "پھر لیتو اور گوسائیں کی بات پر یقین نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟"

"یہ لوگ کلکتے کے ہیں۔ خوب پڑھے لکھے اور اچھے لڑکے ہوں گے۔ لیکن ہم تو انہیں پہچانتے نہیں۔ ہم لوگ بیوقوف گنوار ہیں۔ تم ہمیں کیسے سمجھاؤ گے؟"

نند پال سنجیدہ چہرہ بنائے خاموش بیٹھا رہا۔ یکایک بڈھے نے اٹھ کر کہا "تم گاؤں کے چودھری ہو۔ تمہارے پاس روپیہ ہے، نوکر ہیں۔ جس طرح چاہو اپنی من مانی کر سکتے ہو۔ اپنی بھتیجیوں کو اگر عزت سے گھر میں رکھ لو۔ تو تمہیں روکنے والا کون ہے۔ لیکن یہ تنبیہ دیتا ہوں نند۔ ہمیں پنچ میں مت [illegible]۔ جس معاملہ میں ہم نہیں، کسی بھی معاملے میں ہم پنچ میں نہ پڑیں گے۔ تمہارے پاس روپیہ ہے روپیے کے زور سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم لوگ غریب ہیں ہم کو تو سماج کے ساتھ چل کر جینا پڑے گا۔" بڈھا بڑے غمگین انداز سے اپنی تقریر ختم کر کے ہم سے کچھ بھی پوچھے بغیر چھوڑ کر چلا گیا۔

.... نند پال اس کے چلے جانے کے بعد بھی غم کے بوجھ سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

دونوں لڑکیاں یکبارگی مایوس ہو کر اور ہم سب کی طرف دیکھ کر اپنے چچا کے قدموں پر گر کر سسک سسک کر رونے لگیں اور بولیں "بھگوان کی دہائی ہے۔ ہم لوگوں نے کوئی گناہ نہیں کیا چاچا......"

ہم دونوں کے جسم گویا پتھر کے ہو گئے تھے۔ دونوں لڑکیوں کے غمگین اور اداس چہروں کو دیکھ کر اس ظالمانہ بھیانک سازش پر اس قدر غصہ آ رہا تھا۔ گویا دل میں آگ لگ گئی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ یہ سازش کتنی مضبوط اور گہری ہے۔ اس کے خلاف ہماری ساری کوشش بیکار ہو گی۔ [illegible] بزدلوں کا گروہ اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے متحد ہو گیا تھا۔ ہمیں اپنے چنگل میں دبوچ کر سارا دم [illegible] کھینچ لیا تھا۔

اس معاملہ میں کچھ اور دیر ہو جاتی تو شاید عشرت کے صبر کی [illegible] مٹ جاتی۔ وہ شاید کچھ بھی کر بیٹھتی۔ لیکن اس سے ان دونوں لڑکیوں کے بجز نقصان فائدہ نہ ہو سکتا تھا۔ اور شاید عشرت نے یہ بات سمجھ بھی لی تھی۔

ہم دونوں گم سم بیٹھے ہوئے خاموشی دور کرنے کا کوئی طریقہ نہ سوجھ رہا تھا۔

یکایک میں چونک پڑا۔ اتنی دیر سے ماسٹر صاحب کی طرف نہ دیکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان کی موجودگی بالکل فراموش کر چکا تھا۔ اچانک ان کا چہرہ دیکھ کر تعجب ہوا۔

ماسٹر صاحب نے پکارا: "نند!" اس آواز سے میں نے محسوس کیا کہ نند پال کا دولت کا نشہ ایک ہی لمحہ میں کافور ہو گیا۔ ماسٹر صاحب نے کہا: "تم ان ذلیل آدمیوں کی بات پر اعتبار کرتے ہو؟"

نند پال نے ہاں یا نہ کچھ بھی نہ کہا۔ لیکن ماسٹر صاحب آسانی سے چھوڑنے والے آدمی نہ تھے۔ بے بس لڑکیوں کے اوپر ظلم ہوتے دیکھ کر ان کی فطرت بدل گئی تھی۔ انہوں نے دوبارہ کڑک کر کہا: "بولو۔ اعتبار کرتے ہو؟"

نند پال نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "اعتبار نہ کروں تو کیا کروں۔ آپ ہی بتائیے۔"

"کروں نہ کروں کی بات چھوڑو۔ تمہارا ضمیر کیا کہتا ہے۔ تمہارا ایمان کیا کہتا ہے؟" نند پال کو خاموش بیٹھے دیکھ کر ماسٹر صاحب اور بھی تیز ہو کر بولے "پھر تو تم اچھے آدمی نہیں ہو نند۔ آدمی کا چہرہ دیکھ کر تم اسے نہیں پہچانتے۔ تم کیسے ان لڑکیوں کے اوپر اتنا بڑا کلنک لگانا چاہتے ہو؟"

نند پال نے مایوسی سے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا: "میں کیا کروں بتائیے۔ مجھے تو سماج کے ساتھ ہی چلنا پڑے گا۔ دونوں لڑکیاں کلکتہ میں دو دن گزار کر نہ آئی ہوتیں تو اتنا بڑا ہنگامہ کیوں کھڑا ہوتا؟"

ماسٹر صاحب غصے کے مارے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اس کا مطلب ہے، تم نے دونوں لڑکیوں کو راستے میں چھوڑ آنے کے لئے یہ سازش کی تھی۔ میں یہ بات سب کے سامنے کہتا ہوں۔ لعنت ہے، تم اپنی بے سہارا، یتیم اور دکھیا بھتیجیوں کو اس طرح تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔"

نند پال نے اس بار غصہ ہو کر کہا: "پاگلوں کی طرح الٹی سیدھی باتیں منہ سے نہ نکالو ماسٹر۔ میں نے برداشت کیا ہے۔"

نند پال کے بہت سے تابعدار وہاں اس کے اشارے پر ہم لوگوں پر جھپٹنے کے لئے ایک طرف تیار کھڑے تھے۔ لیکن ماسٹر صاحب نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ میز کے اوپر زور سے پیر پٹخ کر انہوں نے کہا: "الٹی سیدھی باتیں منہ سے نہ نکالوں! دیکھ! میں تمہارے گھر میں کھڑا ہو کر کہے دیتا ہوں کہ تم پاپی شیطان اور ڈاکو ہو۔ دونوں لڑکیوں کی جائیداد ہڑپ کرنے کے لئے یہ چال چلی ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا نند کہ تم آسانی سے کامیاب ہو جاؤ گے۔ اپنے گھر میں ان لڑکیوں کو جگہ نہیں دیتے تو نہ دو۔ میں انہیں لئے جاتا ہوں۔ دیکھوں گا کہ تم معصوم لڑکیوں کو کس طرح دھوکا دیتے ہو!"

اس سادہ لوح اور زندہ دل فدائی چہرہ کے سامنے نند پال دل میں خواہ کچھ بھی سمجھتا ہو لیکن منہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔

ماسٹر صاحب نے دونوں لڑکیوں کو پکار کر کہا: "چلو بیٹی چلو۔ یہ سالا تمہارا چچا نہیں چمار ہے!" لیکن لڑکیوں نے پھر بھی چچا کے قدموں میں گر کر کہا: "چاچا جی۔ کیا ہم کو اس طرح دور کریں گے؟"

نند پال کو اب اپنا اصل چہرہ دکھانے میں کوئی عار نہ تھی۔ جس کرسی پر بیٹھا تھا اسے پیچھے سرکا کر دانت پیس کر بولا۔

"مجھے اب کیوں پوچھتی ہو۔ کلکتہ میں جو یار بنائے ہیں اب انہی کے پاس جاؤ نہ!"

لڑنے پر آمادہ ہو کر شرت اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس سے پہلے ہی ماسٹر صاحب نے کڑک کر کہا: "زبان سنبھال کر بات کرو نند۔ مجھے زیادہ غصہ نہ دلاؤ۔"

نند پال اس بار بھی بت کی مانند خاموش رہا۔ ماسٹر صاحب نے خود دونوں لڑکیوں کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "چلو بیٹی چلو۔ قصائی کے اندر رحم نہیں ہوتا۔"

آخر ماسٹر صاحب کے ساتھ جانے کے علاوہ ہمیں کوئی راہ نظر نہ آئی۔ ہم لوگ ماسٹر صاحب کے ساتھ باہر چلے آئے۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ دونوں لڑکیوں کی جانے کی بالکل خواہش نہ تھی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر اپنے چچا کو دیکھ رہی تھیں۔ شاید اب بھی انہیں امید تھی کہ ان کے چچا انہیں واپس بلا لے گا۔

باہر آتے ہی ماسٹر صاحب کا ایک نیا روپ نظر آیا۔ یکایک جیب سے اپنی زنگ آلود گھڑی نکال کر انہوں نے بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔ ہم نے تعجب سے پوچھا: "یہ کیا ماسٹر صاحب!" لیکن وہ اس وقت تک کافی آگے نکل گئے تھے۔ دور سے ان کی آواز سنائی دی: "ساڑھے گیارہ بجے کی ریل گاڑی پاس کرانی ہے۔ آپ لوگ انہیں لے کر آئیے۔"

× × × × ×

ہم نے سوچا تھا کہ دونوں لڑکیوں کو ماسٹر صاحب کے پاس چھوڑ کر ہم لوگ کلکتہ واپس لوٹ جائیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ماسٹر صاحب کے کوارٹر میں نہ جانے کیسے آگ لگ گئی۔ ان کا تھوڑا بہت ایندھن کا سا ڈھیر تھا۔ اوپر چھپر تھپا ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی کچھ کم نقصان نہ ہوا۔ رات کے اندھیرے میں آگ کے شعلے بھڑک گئے۔ دونوں بہنوں نے بڑی کوشش سے دروازہ کھول کر باہر نکل کر جان بچائی۔ لیکن سامان کافی جل گیا تھا۔ کمرے بھی رہنے کے لائق نہ رہے تھے۔

ہمیشہ خوش رہنے والے ماسٹر صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھے۔ دونوں لڑکیاں روتے روتے کہہ رہی تھیں، ان کی پھوٹی قسمت کی وجہ سے ہی ماسٹر صاحب کا اتنا نقصان ہوا۔ لیکن ماسٹر صاحب یہ بات سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ بار بار یہی کہہ رہے تھے۔ "یہ بڈھا تمہیں چند روز پناہ بھی نہ دے سکا بیٹی" پھر ہم سے بولے "اب کیا کریں بھائی!" کوئی چارہ نہ دیکھ کر رات کو ہی میں نے یہ بات سوچ لی تھی۔ ماسٹر صاحب کو تسلی دے کر کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔"

اس کے بعد اس چھوٹے سے گاؤں کے تھوڑے دنوں کی جان پہچان کے ایک معمولی سے سٹیشن ماسٹر سے رخصت لیتے وقت واقعی ہماری آنکھیں بھر آئیں۔ گاڑی چلتے پر ہماری کھڑکی کو پکڑ کر چھوٹے بچے کی مانند روتے روتے ماسٹر صاحب پلیٹ فارم کے دوسرے سرے تک دوڑے آئے۔ دونوں لڑکیوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کھڑکی سے سر نکال کر ان سے وداع لی۔ شرت اپنی سخت دلی کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن اس وقت دیکھا وہ بھی دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھا تھا۔ اس طرف دیکھنے کی اس کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ اس گاؤں سے انسان کی محبت دیکھ کر آئیں۔ ایسے شخص کی یاد لے کر جاؤں گا۔ جو عمر بھر یاد آتا رہے گا۔

x x x x x

ماسٹر صاحب کے ساتھ اب شاید زندگی بھر ملاقات نہ ہو گی۔ آٹھ گز کی دھوتی باندھے۔ ننگے جسم۔ سر پر ٹوپی پہنے شاید وہ اب بھی اس چھوٹے سے سٹیشن پر ریل گاڑیوں کو "پاس" کراتے ہوں گے۔ میں نے یہ بھی نہ معلوم کیا کہ اس سٹیشن سے ان کی تبدیلی کسی دوسرے سٹیشن پر تو نہیں ہو گئی۔ لیکن پھر بھی جب انسان کی کمینگی دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہوں۔ ماسٹر صاحب کی یاد سے کچھ تسلی ملتی ہے۔

ایک معمولی سے سٹیشن ماسٹر کی اتنی تعریف شاید سب کو اچھی معلوم نہ ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگ خوش نصیب ہیں۔ جنہوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ کہ دنیا میں چھوٹے انسانوں کی گنتی کتنی ہے۔

x x x x x

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دونوں لڑکیوں کو کہاں چھوڑا۔ ان کی جلدی جا بسیرا انہیں آج تک نہ مل سکا۔ لیکن انہیں اس کا کوئی افسوس نہیں۔ کسی گاؤں میں گھر کے رشتہ داروں میں گھری ہونے پر بھی تنہائی محسوس کرنے والی ایک حسین لڑکی مایوس نظریں لئے خاوند کے بغیر اپنی سسرال کی گرہستی زندگی چلا رہی ہے۔ اس کے دل کی بات تو بھگوان ہی جانیں۔ اس کا چہرہ دیکھ کر کچھ پتہ نہیں چلتا۔

ایک دن شمیں نے ان کے چھوٹے سے کنبے پر اپنا بوجھ ڈالا تھا۔ میں اس بات پر ناراض ہوا تھا۔ آج اچانک پہلے سے پوچھے بغیر میں نے اسی کے سر پر دو اجنبی لڑکیوں کا بوجھ ڈال دیا۔ اور اس کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔

پہلے کی طرح ہی اس نے ہنس کر پوچھا۔ "تم اتنے دبلے کیوں ہو گئے ہو۔ میرے بارے میں تو نہیں سوچتے رہتے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اس بات کا حق تم نے مجھے کہاں دیا ہے؟"

ممتو نے ہنس کر کہا۔ "یہ تو اچھی بات ہے۔ کس کی ہو گئی ہے تمہیں جو تمہاری یہ حالت ہو گئی۔ مجھے تو سچ مچ رشک ہو رہا ہے۔" اس کے بعد کچھ دیر رک کر ممتو نے مجھ سے کہا۔ "پھر کب تم راستے سے بے کس لڑکیوں کو سمیٹو گے۔ بتاؤ؟"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

"تبھی تو انہیں اس بدنصیب کے سر منڈھنے آئے ہو۔ ورنہ تمہارے دشمن بھلا کیسے ہوں گے!"

میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "واقعی کیا تم نے یہاں سے نہ جانے کی ٹھان لی ہے ممتو؟" جواب میں اس نے بس تھوڑا سا سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کونسا جذبہ تھا۔ رخصت ہوتے وقت وہی مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ لوٹی شمیں وادا ——

میرے بارے میں بہت فکر کرتے ہیں نہ ؟"

میں نے کہا "یہ شاید ان کی بے انصافی ہے ۔"

"میری زندگی رائگاں گئی۔ شمیم، دادا یہ سوچ کر بہت افسوس کرتے ہیں نہ ؟"

اس بات کا میں کیا جواب دیتا۔ خاموش رہا۔

منو نے کہا "شمیم دادا سے ایک بات کہنا۔ کہنا کہ انسان کی ساری کہانیاں پوری ہو جاتی ہیں۔ لیکن قسمت کی ساری کہانیاں شروع ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں سے بڑی مشکل سے ایک پوری ہوتی ہے۔ سارے دھاگے نہیں ملتے — شمیم دادا سے ایک بار مل جانے کے لئے کہنا۔"

کلکتہ واپس لوٹنے پر شمیم نے پوچھا "بستی پور گیا تھا یا نہیں ؟"

ساری داستان سنانے کے بعد میں نے کہا۔ "منو نے تمہیں ایک بار مل جانے کے لئے کہا ہے ۔"

شمیم نے کچھ دیر خاموش رہکر یکایک بڑے جوش سے کہا۔ "ارے تجھ سے کہنا بھول گیا۔ بے بال کے دفتر میں ملازمت پکی ہوگئی ہے۔ میں نے اتنے دنوں مجھے تیرا کام چلا دیا۔ آج سے تجھے حاضر ہونا ہے۔"

"بے بال کے دفتر میں ہی ملازمت کر رہا ہوں ۔"

جے نیندر کمار

ہندی کے سربرآوردہ ادیب جے نیندر کمار ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۱۸ء میں گھر ہی پڑھ کے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے دو سال تک بنارس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں آپ نے کالج چھوڑ دیا۔ عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ آپ ۱۹۲۳ء میں پہلی بار اور پھر ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں دوسری اور تیسری بار جیل گئے۔ آج تک کوئی ملازمت نہیں لی۔ اپنے آپ کو مستقل بیکار سمجھتے ہیں۔

آپ کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "پھانسی" کے نام سے ۱۹۲۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اور اس وقت کے بعد سے آپ مسلسل ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ان دنوں آپ با قدرت بہت کم لکھتے ہیں۔ آپ بولتے جاتے ہیں اور کوئی دوسرا لکھتا ہے۔ آپ افسانہ، ناول اور فلسفیانہ مقالوں کی دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔

وہ ہندی ادب کے میدان میں کچھ اس طرح داخل ہوئے کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ منشی پریم چند نے کہا۔ "تم گورکی کو ڈھونڈنا چاہتے ہو ہندوستان میں کوئی گورکی ہے یا ہو سکتا ہے تو وہ جے نیندر ہے"۔

جے نیندر کمار نے ۱۹۲۸ء میں لکھنا شروع کیا۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ انھوں نے انشاء پردازی کو محض ایک تفریح سمجھا تھا۔ لیکن اُن کی نگارشات کچھ اتنی مقبول ہوئیں کہ انھوں نے عوام کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مسلسل لکھنا شروع کر دیا۔

جے نیندر کمار ادب اور سیاست کے تعلق کو ناگزیر تو سمجھتے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ سیاست کو ادب کی بلندی عطا کرنی چاہیئے جس طرح گاندھی جی نے سیاست کو [illegible] کی بلندی تک اُٹھایا۔ اس طرح ادب کی حیثیت ہنگامی ہونے کی بجائے دوامی ہو جاتی ہے۔

جے نیندر کمار نے اپنی تخلیقات میں گاندھی جی کے فلسفہ کو بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ آپ منشی پریم چند سے بھی متاثر ہیں۔ آپ بھی منشی پریم چند کی طرح فرقہ پرستی کے مخالف تھے۔ اور اُردو ہندی کے درمیان کسی خلیج کو گوارا نہیں کرتے۔

جے نیندر کمار ادب میں داخلیت پسندی کے زیادہ قائل ہیں۔ آپ ہندی کے صاحب طرز انشاء پرداز ہیں اور آپ ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں — آپ چونکہ ایک غیر ریاستی سماج کے حامی ہیں اس لئے آپ کی تخلیقات میں آپ کے اس نظریئے کی نمایاں جھلکیاں ملتی ہیں۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے نظریات میں کچھ تبدیلیاں بھی کی ہیں جس کی مثال آپ کا یہ ناولٹ "استعفا" ہے اس ناولٹ میں خارجیت اور داخلیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہ ناولٹ ہندی زبان میں بے حد مقبول ہوا ہے۔

جے نیندر کمار　　　　مترجمہ: شریف احمد

استعفا

نہیں بھائی (گناہ اور خواب) پر تبصرہ مجھ سے نہ ہو گا۔ جج ہوں، قانون کی ترازو کی اہمیت کو جانتا ہوں، مگر ــــ تولنے والوں کی بے حسی سے بھی واقف ہوں اس لئے کہتا ہوں کہ جن کے اوپر رائی رتی کا پ تول کر پاپ کو پاپ کہہ کر سماج کا نظام برقرار رکھنے کی ذمہ داری ہے وہ جانیں۔ میرے بس کا یہ کام نہیں۔ میری بُوا (پھوپی) گناہ گار نہیں تھیں، یہ کہنے والا بھی میں کون ہوں؟ مگر آج میرا دل ان کی جدائی کے لئے چار آنسو بہا رہا ہے۔ میں نے اپنے چاروں طرف طرح طرح کی عزت کی دیوار کھڑی کر کے خوب مضبوط حمایت ہے مخالف ہواؤں کی کوئی لہر اسے پار کر کے مجھ تک نہیں آ سکتی۔ لیکن بُوا کی یاد جیسے میرے سارے وجود کو کھٹا کر دیتی ہے۔ کیا یہ یاد مجھے اب چین نہیں لینے دے گی؟ ابھی ان کے مرنے کی خبر پا کر بیٹھا ہوں۔ یہ تو ان کی موت کے دسیوں سال پہلے جانتا تھا۔ پھر بھی جاننا چاہتا ہوں، کہ آخر وقت کیا انہوں نے اپنے اس بھتیجے کو بھی یاد کیا تھا؟ یاد کیا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہم لوگوں کا اصلی گھر پچھاؤں کی طرف تھا۔ پتا معزز شخص تھے اور ماتا ایک اچھی گھربارن۔ جتنی اپنے کام میں ماہر تھیں اتنی ہی نازک بھی ہوتیں تو؟ مگر نہیں، یہ آج تم پتے کے منہ میں نہیں پڑھنا ہوگا۔ بڑھے کر گئے۔ پھر تو ساری کہانی اس منہ میں سما جائے گی اور اس میں سے نکلنا بھی نصیب نہ ہوگا، اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ ماتا جتنی ماہر تھیں، اتنی نازک نہیں تھیں۔ بُوا پتا جی سے کافی چھوٹی تھیں۔ مجھ سے کوئی چار پانچ سال بڑی ہوں گی۔ میری ماتا کی دیکھ ریکھ میں میری ہی طرح بُوا بھی رہتی تھیں۔ دیکھ ریکھ کوئی معمولی نہ تھی اور آج بھی میرے ذہن میں اس دیکھ ریکھ کی سختی کے فوائد اور نقصانات کا خیال آتا رہتا ہے۔

پتا جی کے دو بھائی تھے اور تین بہنیں۔ بھائی پہلے تو اور سیری میں یو پی کے ان ضلعوں میں رہے۔ پھر یکایک ان کی خواہش کے مطابق انہیں برما بھیج دیا گیا۔ تب سے وہ وہیں بس گئے اور رفتہ رفتہ آنا جانا ایک رواج و رسم کی بات رہ گئی۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم سا ہو گیا۔ دو بڑی بہنیں شادی ہونے کے بعد زچگی میں چل بسیں۔ اکیلی یہ چھوٹی پھوپی رہ گئی تھیں۔ پتا جی ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کی سب ہی خواہشیں پوری کرتے تھے۔ پتا جی کی یہ محبت بگاڑ نہ دے، اس بات کا میری ماتا کو خاص خیال رہتا تھا، وہ اپنی دیکھ ریکھ میں چوکس تھیں۔ میری پھوپی سے کم محبت کرتی تھیں۔ یہ تو کسی حالت میں بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن آریہ گھربارن کا جو اُن کے ذہن میں آدرش تھا، پھوپی کو وہ ٹھیک اُسی کے مطابق ڈھالنا چاہتی تھیں۔

پھوپی کا تب کا سروپ سوچتا ہوں تو دنگ رہ جاتا ہوں۔ ایسا حسن خدا کبھی کسی کو دیتا ہے اور جب دیتا ہے تب شاید اس کی قیمت وصول کرنے کی بھی نیت ہوتی ہے۔ پتا جی تو پھوپی کی موہنی صورت پر جان چھڑکتے تھے۔ خیر! اس بات کو چھوڑیئے۔ میری اور پھوپی کی خوب بنتی تھی۔ وہ شہر کے بڑے اسکول میں بگھی میں بیٹھ کر پڑھنے جاتی تھیں اور گھر آ کر جو نئی شرارتیں وہاں ہوتیں، ایسے میں مجھے سناتی تھیں: "آج ماسٹر جی کو ایسا بنایا، ایسا بنایا، کہ بس موہے کیا بتاؤں؟" کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر اتنے زور سے ہنستیں کہ میں دیکھتا رہ جاتا۔ اس وقت مجھے کہانی کی پریوں کا خیال آتا اور میں مورت کی طرح اپنی پھوپی کی طرف دیکھتا رہ جاتا۔

کہتیں: "اور سُنو، وہ ہیں نہیں حساب کے ماسٹر، شیلا نے ان کی کرسی کی گدی میں پن چبھو کر رکھ دی۔ شیلا بڑی شریر ہے۔ ماسٹر کی ایک آنکھ تو ہے نہیں، دیکھی ہو تو ماسٹر جی دیکھتے اس طرف کو ہیں تو وہ آنکھ کسی اور ہی طرف کو دیکھتی ہے۔ پن جو چبھی تو خوب بگڑے، خوب بگڑے، ڈپٹ بولے، یہ کس کی شرارت ہے ــــ ؟ وہ کھڑے ہو جاتے، سب لڑکیاں سہم گئیں۔ شیلا تو بس ایسی ہو گئی جیسی مٹھائی کے آگے گا لے۔ ماسٹر نے

بید کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ "میں کسی ایک کو معاف نہیں کروں گا" اور سچ تو یہ ہے کہ انھیں بڑا غصہ آرہا تھا۔ ان کا غصہ دیکھ کر سب لڑکیاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں — یہ مجھے بڑا بُرا لگا۔ میں نے کھڑے ہو کر کہا، یہ میرا قصور ہے ماسٹر جی۔ ماسٹر جی پہلے تو مجھے دیکھتے رہے پھر بولے، "یہاں آؤ" میں چلی گئی۔ کہا "ہاتھ پھیلاؤ" میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ اُس پہلی ہتھیلی پر انھوں نے دو تین بید جڑ دیئے۔ میں سمجھتی تھی کہ ابھی اور ماریں گے لیکن جب بید انھوں نے ہاتھ سے الگ کر دیا تو میں نے بھی اپنا ہاتھ کھینچ لیا — سچ! پرمود میرے پر اثر تک بھی نہ ہوا۔ میں اُن کی اس آنکھ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماسٹر جی مجھے دیکھ رہے تھے، لیکن وہ آنکھ نہ جانے کہاں دیکھ رہی تھی — پرمود! تو ماسٹر جی کو ایک بار تو ضرور دیکھ — پھر ماسٹر جی نے چیخ کر کہا: "اب تو نہیں کرے گی"؟ میں چپ چاپ کھڑی رہی اور سوچتی رہی کہ ایک بار تو مجھے بھی سچ مچ کا قصور ہی کرنا چاہیئے — ماسٹر جی بولے "جاؤ"۔ میں اپنی جگہ پر آ گئی۔ شیلا میرے پاس بیٹھتی ہے۔ وہ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے کھا ہی تو جائے گی۔ میں نے کہا: "ہٹ پگلی"۔ اُس نے میرے ہاتھ کو ڈسک پر رکھے رکھے اپنے ہاتھ سے دبا دیا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بڑی پگلی لڑکی ہے یہ شیلا بھی — میں نے کہا: "شیلا کیا کر رہی ہے؟ اری دیکھ! ماسٹر جی کی وہ آنکھ مجھے دیکھ رہی ہے"۔ پرمود، تو شیلا کو جانتا ہے۔ شیلا بڑی اچھی لڑکی ہے، لیکن بڑی نٹ کھٹ بھی ہے، — ہم دونوں بڑی اچھی سہیلی ہیں ایک دوسرے کی — لیکن وہ ہے پگلی — اسکول سے میں آنے لگی تو اور کچھ نہیں تو میرے گلے لگ کر رونا شروع کر دیا میں نے اس کے گال پر ایک چپت رسید کیا اور بولی: "یہ کیا ہے شیلا؟" وہ پلک پلک کر روتی رہی۔ بولی: "کچھ نہیں" پرمود تجھے ایک دن شیلا کے گھر لے چلوں گی۔ چلے گا نا؟"

یکایک نہ جانے انھیں کیا یاد آجاتا — چونک کر کہتیں۔ "ارے چل! نہیں تو تیری ماں بگڑے گی"۔ میری ماں سے وہ ہمیشہ ڈرتی تھیں اور انھیں میرے سامنے ہمیشہ "تیری ماں" کہا کرتی تھیں۔

بُوا کا پڑھنے لکھنے میں کوئی خاص دل نہیں لگتا تھا لیکن وہی کتابیں کاپیاں بڑے سلیقے سے رکھتی تھیں اسابل بڑے چاؤ سے جاتی تھیں۔ ویسے بڑی خوش مزاج تھیں بس ماں کے سامنے کچھ جھجک سی محسوس کرتی تھیں بچپن کی بہت سی باتیں یاد آتی ہیں — وہ کیسے مجھے کپڑے پہناتیں، کیسے چپت مار مار کر کھلاتیں، کیسے پیار کرتیں، اور کیسے اپنے راز کی باتیں مجھے بتاتی تھیں — یہ سب کچھ رہ رہ کر یاد آتا ہے۔

دِن گزرتے گئے۔ میں بڑا ہوتا گیا اور پھوپی کو بھی شعور آتا گیا۔ مجھے انکی موجودگی میں ایک عجیب قسم کا اطمینان سا ملتا تھا، اور انکے ساتھ کا میں ہمیشہ بھوکا رہتا تھا جب بھی ملتیں، پیاری پیاری نصیحتیں کرتیں۔ "دیکھو بیٹا! بڑوں کا کہنا ماننا چاہیئے۔ اچھے لڑکے آگے چل کر بڑے آدمی بنتے ہیں۔ کیوں پرمود بھیا! تم بڑے آدمی نہیں بنو گے" — کبھی وہ مجھے بیٹا کہتیں، کبھی بھیا اور کبھی گدھے کا لقب بھی دیدیا کرتیں۔

نویں درجے میں تھیں یا دسویں میں مجھے کچھ ٹھیک یاد نہیں میری عمر کوئی بارہ سال کی ہوگی۔ میرا دل اس وقت صرف اُنھیں کے بس میں تھا۔ دراصل وہ مجھے پیار بھی بہت کرتی تھیں۔ لیکن جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ ان کے پیار کا رُخ بدل گیا ہے۔ وہ مجھے اب نصیحتیں نہ کرتیں بلکہ سینے سے لگا کر نہ جانے کہاں دیکھنے لگتی تھیں۔ نہ اب وہ مجھ سے زیادہ باتیں ہی کرتیں — میں پوچھتا: "پھوپی! کیا بات ہے آج اسکول میں کیا ہوا؟" اس پر وہ کہتیں: "کچھ نہیں بھیا! کچھ بھی تو نہیں"۔ یہ کہہ کر جیسے اُن سے میری طرف دیکھا نہ جاتا۔ تب میں ہاتھ پکڑ کر ٹھیک اُن کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا: "دیکھو، پھوپی، تم ہمیں کچھ نہیں بتاتیں"۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیتیں اور داہنے ہاتھ سے چپت مار کر کہتیں: "ہے نا پرمود بابو پاگل"!

میں نے انھیں دنوں یہ بھی محسوس کیا کہ تنہائی اب انھیں بُری نہ لگتی تھی۔ شام کے وقت چھت پر کھڑی خاموش کبھی آسمان پر اُڑتی ہوئی چیلوں کو دیکھتیں، کبھی پتنگوں کے پیچ دیکھتے دیکھتے اتنی محو ہو جاتیں کہ کٹی ہوئی پتنگ کا تعاقب انکی نگاہیں اس وقت تک کرتیں جب تک کہ وہ غائب نہ ہو جاتی اور نہیں تو کھڑے کھٹولے پر پیٹ کے بل لیٹ جاتیں اور کوئلے سے زمین پر بے ڈھنگے نقش و نگار بنانے لگتیں۔ جب میں اوپر پہنچتا تو انھیں اس حالت میں دیکھ کر ہکا بکا رہ جاتا۔ جب انھیں میرے آنے کا احساس ہوتا تو دفعتاً چونک کر کہتیں: "ارے یہ مُودا! تو کہاں تھا"؟

"یہیں تھا!"

"کیوں رے! تو اب مجھ سے بولتا بھی نہیں"

میں بغیر جواب دیے انکے پاس کھٹولے پر بیٹھ جاتا۔ وہ دھیرے دھیرے مجھے اپنے اوپر ہی گھسیٹ لیتی اور کہتی۔ دیکھو! پتنگ دیکھو!"

کچھ دیر تامل کے بعد کہتیں: "پتنگ تجھے اچھی لگتی ہے"؟

میں کہتا: "ہاں"!

"تو پتنگ اُڑائے گا"؟

میں کہتا: "بابو جی منع کرتے ہیں"

اس پر وہ یکایک مجھے آغوش میں لے لیتیں اور کہتیں۔ "ہم تم دونوں ساتھ ساتھ پتنگ اُڑائیں گے — ایسی پتنگ جو سب سے نرالی، سب سے دُور ہو گی، کیوں یہ مودا! سب سے اونچی پتنگ اُڑائے گا نا"؟

میں کہتا، "پیسے دو، میں لاؤں"

وہ تھوڑی دیر مجھے دیکھتی رہتیں۔ ان کی نگاہیں بظاہر میری طرف ہوتی تھیں لیکن دراصل مجھ سے بہت دُور خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہی ہوتی تھیں۔ پھر ایک دم چونک پڑتیں۔ کسی قدر لجا کر دھیمی آواز سے کہتیں: "چل رے پتنگ سے بالک گر پڑتے ہیں"

انھیں دنوں کی بات ہے۔ ایک روز اسکول سے وہ خلافِ معمول کافی دیر میں لوٹیں۔ ماں نے پوچھا: "کہاں رہ گئی تھی"؟

"شیلا کے گھر گئی تھی"

ماں سُن کر خاموش ہو گئیں۔

اس دن سے بُوا میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی، لیکن یہ بے چینی تھی مسرت انگیز۔ وہ خوش رہنے لگیں۔ کام کاج سے طبیعت اُکتا گئی۔ انھوں نے میرے ساتھ طرح طرح کی تجویزیں رکھیں طرح طرح کی باتیں کیں۔ "مودا! ایک دن نہر کے پُل پہ چلنا چاہیے، چلو گے؟ بتاؤ تمہیں کونسی مٹھائی پسند ہے؟ — گھیور — ہشت — گھیور بھی کوئی مٹھائی ہے۔ دیکھو تم پتنگ نہیں لائے نا — یہ مودا میں شیلا کے یہاں رہ گئی تھی تیری ماں کو تو کچھ خیال نہ ہوا ہوگا۔ چل رے چلیں یہ مودا، یہاں کیا کمرے میں بیٹھے ہیں چل کر اوپر ہوا میں بیٹھیں گے — ایک بات کہتیں کہ جھٹ بھول جاتیں۔ اس وقت انکے دل میں کچھ ٹھہرتا ہی نہ تھا، بے اثر بات ہو یا با اثر۔ انکے لئے سب برابر تھا۔ معلوم ہوتا تھا گویا اُن کا پورا وجود ہوا میں تبدیل ہو چکا ہے اور دل ہے کہ باہر نکل کر اُڑ جانا چاہتا ہے۔ وہ بے بات ہنستی اور بے بات مجھے پکڑ کر اِدھر اُدھر کھینچتیں۔ اُس دن وہ میری سمجھ سے باہر تھیں۔ میں نے کہا۔ "بُوا، آج کیا بات ہے"؟

بولیں: "میں بُوا ہوں یہ بُوا" "مجھے اچھا نہیں لگتا یہ مودا تو مجھے جی جی کہا کر۔ شیلا بھی تو مجھے جی جی کہتی ہے"

میں نے کہا: "میری تو بُوا ہو"

"میں بُوا نہیں ہونا چاہتی — تو ... اچھی دیکھ تو یہ — چڑیا کتنی اونچی اُڑ رہی ہے۔ میں چڑیا ہونا چاہتی ہوں"

میں نے کہا "چڑیا"؟

"بولیں، "ہاں، چڑیا! کتنے نرم اور نازک پر ہوتے ہیں اس کے کتنی آزاد! پر تولے اور جہاں جی چاہا آسمان میں اُڑ گئی کیا مزے کی بات ہے، ننھی منی چڑیا، ننھی منی بولو... میں چڑیا بننا چاہتی ہوں۔

اس دن وہ رات گئے تک مجھے اپنے سے چپٹائے رہیں

ایک بار پوچھ بیٹھیں "کیوں پرمود، تو مجھے پیار کرتا ہے"؟ اتنا سنتا تھا کہ بغیر کچھ کہے سنے میں نے اپنا منہ انکی چھاتیوں میں چھپا دیا۔ اس پر وہ بولیں "پرمود، میں تجھے بہت چاہتی ہوں"۔

اس دن کے بعد کئی دن تک وہ روز اسکول سے دیر میں واپس آتی رہیں۔ اور ایک دن تو اتنی دیر ہو گئی کہ انھیں بلانے کے لئے نوکر بھیجنا پڑا۔ نوکر انھیں سشیلا کے گھر سے لے آیا۔

اس سے تین دن بعد کی بات ہے کہ میں گھر میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ماں غیظ و غضب میں بھری جھپٹی جا رہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر کسی قدر جھجکیں اور بولیں "کیوں رے، کہاں تھا اب تک"؟

اُن کی یہ حالت دیکھ کر مجھ سے جواب بن نہ پڑا۔

"بیٹی ۔ بھاگ کے بید تو لے آ"

مجھے کسی بات کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ماں کی تیزی اور غصے سے یہی سمجھا کہ میری ہی گھر شامت ہوگی — ایک دم بابوجی کے کمرے میں جا، بید اٹھایا۔ ماں نے ایک جھٹکے سے بید میرے ہاتھ سے چھین لیا اور خاموش پچھلے کمرے کی طرف لوٹ گئیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انھوں نے کواڑ بند کر لئے۔ اور پھر شڑاپ شڑاپ کسی کو پیٹنا شروع کر دیا۔ میرے پیر جیسے فرش میں گڑ گئے۔ بید کی پہلی ضرب پر تو ایک چیخ سنائی دی لیکن پھر کوئی آواز نہیں آئی۔ بید کی شڑاپ شڑاپ پہلے سے تیز ہو گئی تھی مجھے شک ہوا کہ کہیں بوا تو نہیں ہیں۔ لیکن یہ شک شک ہی رہا، کوئی بات ایسی معلوم نہیں ہوئی جس سے میرا شک یقین میں بدل جاتا۔ میں اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا۔ وہاں کھڑا رہنا ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ماں نے دروازہ کھولا اور باہر آئیں — ان کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے، جس ہاتھ میں بید تھا، وہ بری طرح لرز رہا تھا۔ چہرے پر خاک سی اڑ رہی تھی۔ انکی وحشت سے گمان ہوتا کہ اگلے لمحے وہ کہیں اپنے آپ کو ہی پیٹنا شروع نہ کر دیں۔ جیسے اپنے پر اب تک ہاتھ نہ اٹھانا اُن پر بڑا گراں گذر رہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے میرے سامنے سے ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ پھر جاتے جاتے یک بیک دروازے پر رکیں اور بید زور سے دالان میں پھینک دیا۔ بید میرے پاس آ کر گر پڑا۔

کچھ دیر کے لئے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ بس یوں ہی سُسٹ پٹایا سا کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ہمت کر کے میں اُس کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر جا کر دیکھا تو بوا اوندھی پڑی ہیں۔ ساڑی جگہ جگہ سے بے جگہ ہو گئی ہے۔ اور کئی جگہ پے در پے خراش پڑنے سے اسکا کپڑا چھلنی ہو گیا ہے۔ جگہ جگہ نیل پڑ گئے ہیں۔ کئی جگہ خون بھی چھلک آیا ہے۔ بوا بے ہوش سی پڑی ہیں۔ نہ روتی ہیں، نہ سسکتی ہیں۔ بال بکھرے ہیں۔ زمین پر پڑی دونوں بانہوں پر ماتھا ٹکا ہوا ہے۔ وہاں کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھنا میرے لئے وبال ہو گیا۔ زبان پر جیسے کسی نے قفل لگا دیا۔ پھوپی کے گلے لگ کر تھوڑی دیر رو بھی لیتا تو بھی شاید طبیعت ہلکی ہو جاتی۔ لیکن میرے لئے یہ بھی ناممکن تھا۔ اسی کشمکش میں وہاں سے دبے پاؤں لوٹ آیا۔

اس واقعے کے بعد پھوپی ہنسنا بھول گئیں۔ پانچ چھ مہینے کے بعد ان کی شادی ہو گئی۔ ماں نے بڑی مستعدی سے جلدی جلدی تمام انتظام کر دیا۔ اور وہی دن پھوپی کے اسکول کا آخری دن تھا۔ اس دن سے وہ سینے پرونے، جھاڑو بہارو اور خانہ داری کے دوسرے کاموں میں بڑی خاموشی سے مصروف ہو گئیں۔ کام کرنے کے علاوہ انھیں اور کسی بات سے مطلب تھا نہ غرض۔ نہ وہ کسی کی نگاہوں میں چڑھنا چاہتی تھیں۔ دھوبی کے یہاں کے دھلے کپڑے اب وہ پہلے کی طرح جلدی جلدی میلے نہ کرتی تھیں۔ مجھ سے بھی کچھ کھنچی کھنچی اور کٹی کٹی سی رہتی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ بابوجی کا چہرہ بھی کافی گمبھیر ہو گیا ہے۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی بوا سے ہنسی مذاق کرتے لیکن بوا کے پاس جواب میں صرف خاموشی، اور متانت دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔ ماں کی حالت تھی۔ بات بات پر مجھے ڈانٹتیں ڈپٹتیں۔ نوکروں بیچاروں کی تو مصیبت آ گئی تھی۔ خود کام کرتی ہوں یا نوکروں پر ڈانٹ ڈپٹ کی

اچھا لگتا ہوں، بیٹا جی" عجیب بے ہنگم انداز سے نہ جانے کیا بڑبڑاتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی ایک دم بھڑک اٹھتی تھیں۔ میں سامنے ہوا اور فوراً گرجی داغی۔

"آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہا ہے، پرمود؟ بڑا سے بڑا اور جھانڈ نہیں دے سکتا — آجکل کے لڑکے بڑے ہی حرام کے ہیں"

کبھی خشکم ہوتا۔

"کہاں گیا یہ منی؟ نہیں ہے؟ نہیں ہے؟ سارا کام بیچاری لڑکی کو کرنا پڑتا ہے — خیر کوئی بات نہیں — ایک پیسہ بڑا ہو — یہ نوکر بڑے حرام خور ہوتے جاتے ہیں"

اس طرح کی بہت سی باتیں تھیں جو روزانہ ماں سے سننے میں آتی تھیں۔ یہ سب تو تھا لیکن بڑا سے وہ سب سے منہ بات بھی نہ کرتی تھیں۔

بوا کی شادی کے دن قریب سے قریب تر ہوتے گئے اور ایک دن شادی بھی ہو گئی۔ شادی سے پہلے بوا نے مجھے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور گھنٹوں آنسو بہاتی رہیں۔ مجھے نصیحت کی: "بیٹا، پرمود بزرگوں کا حکم ہمیشہ بجا لانا چاہیئے۔ ہمیشہ سچ بولنا چاہیئے۔ یہی طریقہ اچھے لڑکے بننے کا ہے۔ پرمود، تو ایک دن بڑا آدمی بنے گا نا؟"

میں اس وقت تک بچہ نہ رہا تھا، کافی بڑا ہو چلا تھا، پھر بھی اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں بوا کی گود میں چپ چاپ پڑا رہا۔

بوا بولیں "پرمود، تیری بوا تو مرگئی۔ اب اسے کبھی یاد مت کرنا۔ میرا راجہ بیٹا بڑا اچھا ہے"

میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ لیکن میں نے بوا کو پتہ نہ چلنے دیا اور ان کی گود میں دبکا پڑا رہا۔

بوا کی رخصت کے وقت میں خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ میں نے کسی کی شرم نہ کی۔ میں نے مچل کر گھونگھٹ والی بوا کا آنچل پکڑ لیا۔ اور گلوگیر آواز سے کہا: "میں بغیر بوا کے نہ کھانا کھاؤں گا نہ پانی پیوں گا" ماں سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا: "تو راکشس ہے اور میں اس گھر میں پیر بھی نہیں رکھوں گا" اس کا جواب مجھے وہیں مل گیا۔ لیکن ماں سے نہیں۔ بابو جی نے کڑک کر تے دو تین چپت رسید کر دیئے۔ لیکن میں بھی اتنا سستا چھوڑنے والا تھوڑی تھا۔ چپت کھا کر آنچل چھوڑا تو بوا کے پیروں سے لپٹ گیا۔ پیروں کے بچھوؤں کو میں نے زور سے پکڑ لیا، اس پر بوا نے مجھے اپنے قدموں میں سے اٹھا لیا۔ میں نے دیکھا گھونگھٹ میں ان کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ انھوں نے میری ٹھوڑی اپنے ہاتھ میں لی اور میرے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"پرمود، تو میری بات نہیں مانے گا؟ مجھے جانے دے بیٹا۔ میں جلدی آجاؤں گی"

بوا کے چہرے پر آنسوؤں کے موتی بکھرے پڑے تھے۔ ان موتیوں نے میری ضد کو موم بنا کر پگھلا دیا۔ میں نے پوچھا۔

"جلدی آجاؤ گی"؟

"جلدی آؤں گی"

"میری قسم کھاؤ"

"اپنے پرمود کی قسم"

پاس ہی ماں کھڑی تھیں۔ ان کا منہ بھی سستا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر جی میں آیا کہ کیوں نہ میں ان کے گلے لگ جاؤں اور چیخ کر کہوں "ماں، میری ماں" اتنے میں بوا نے میرے ہاتھ میں ایک ریشم کا رومال تھما دیا اور دوسرے لمحے خود تیزی سے چل دیں۔ میں سنبھلنے بھی نہ پایا کہ موٹر دروازے کے آگے سے روانہ ہو گئی۔

(۳)

بوا کے چلے جانے کے بعد گھر سے میرا دل بالکل اچاٹ ہو گیا۔ ماں مجھے سمجھاتی تھیں اور کبھی کبھی میں بھی ماں کو سمجھایا کرتا تھا۔ لیکن شادی کی دھوم دھام کے بعد گھر کی خاموشی کاٹنے کو دوڑتی تھی۔

چوتھے روز بوا آگئیں۔ شادی کے وقت میں نے پھوپھا کو دیکھا تھا۔ لمبی لمبی مونچھیں تھیں عمر بھی کافی معلوم ہوتی تھی۔

اچھے خاصے گرانڈیل تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ انکی دوسری شادی تھی۔ ہماری بُوا انکے سامنے بالکل تھپول سی معلوم ہوتی تھیں سسرال سے وہ جب آئیں تو میرے لئے طرح طرح کی چیزیں لیکر آئیں۔ مجھے الگ لے جاکر کہنے لگیں۔

"پرمود۔ دیکھے گا میں تیرے لئے کیا کیا لے کر آئی ہوں!"

لیکن میں اُن چیزوں کا بہت آرزو مند نہ تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ بُوا مجھ سے باتیں کریں جس طرح پہلے ہر سکھ دُکھ کی بات کرتی تھیں اب بھی بتائیں کہ سسرال میں اُن پر کیا گذری۔؟ چہرہ اُترا ہوا کیوں ہے؟ طبیعت بجھی بجھی سی کیوں ہے۔ دیکھو! بُوا! میں وہی پرمود ہوں — میں اب بچہ نہیں رہا۔ ذرا کہہ کر دیکھو میں تمہارا سارا دُکھ سمجھ لونگا۔ میں اب زور و کرنا ک میں دم کرنے والا بچہ نہیں ہوں جس نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہوگی میں اس کی طبیعت درست کردونگا۔ یہ چیز ویز مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

مجھے اپنے دل کا حال نہیں بتلاؤگی بُوا!

میں بغیر لب ہلائے یہ سب کچھ اُن سے کہہ دینا چاہتا تھا مجھے خاموش دیکھکر وہ بولیں "کیوں رے، اپنی چیز نہیں لے گا۔؟ چپ کیوں ہے"؟

میں نے ان کی طرف دیکھکر آہستہ سے کہا، دکھاؤ"

بُوا حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ پھر پوچھا" یہ تو کیسے بول رہا ہے،

ہوا کیا ہے تجھے؟"

میں نے کہا، کچھ نہیں"

"پھر کیا بات ہے"۔؟

میں نے کہا" تم مجھے پہلے جیسا اب نہیں چاہتی ہو" شاید انھیں یہ بات لگ گئی۔ بولیں یہ تو کیا کہہ رہا ہے!۔

اگر پہلے جیسا نہیں چاہتی تو اب کیسا چاہتی ہوں؟"

"مجھے غیر سمجھتی ہو"

شاید اس کی انھیں توقع نہ تھی۔ وہ حیرت اور یاس سے ملے جلے جذبات کے ساتھ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر بولیں، پرمود، سچ تو یہ ہے کہ میں ہی پرائی ہوگئی ہوں۔ تم سب لوگوں کے لئے غیر ہوگئی ہوں۔ تیری ماں نے مجھے اپنے ہاتھوں سے دھکا دے کر غیر بنا دیا ہے۔ لیکن جہاں مجھے بھیجا گیا ہے پرمود، وہاں کا میرا دل نہیں۔ تو ایک کام کرے گا۔؟"

میں بے چین اور مشتاق نظروں سے ان کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

چاہتا تھا کہدوں کہ اگر تمہارا کام نہیں کروں گا تو پھر پرمود بن کر میں نے یہ جنم پایا ہی کیوں ہے؟

"کرے گا"؟

وہ بارہ یہ سوال سُن کر میں بڑی سُرعت سے انکی گود سے اُٹھ بیٹھا۔

اور کہا۔ کہو، بُوا، ابھی کروں گا۔"

وہ کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہیں، پھر کسی قدر خفیف ہو کر بولیں،

"نہیں نہیں، کچھ نہیں۔"

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"سچ سچ بتاؤ بُوا، میں ضرور کروں گا۔"

"سُسرال کے جائے گا"؟

"جاؤں گا"!

"جاکر کیا کرے گا"؟

میں سوالیہ نشان بنا انکی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بولیں نہیں، میں تو مذاق کررہی تھی۔ کوئی کام نہیں"۔

اس کے بعد اپنی لائی ہوئی چیزیں زبردستی مجھے دکھانے لگیں ان چیزوں میں ایک بندوق بھی تھی۔ بندوق مجھے بہت پسند آئی بُوا نے دریافت کیا۔ "بندوق تجھے بہت اچھی لگتی ہے"؟

میں نے کہا، بندوق سے کوؤں کو ماروں گا، یہ کوے مجھے بہت بُرے لگتے ہیں"۔

بُوا بولیں، "بندوق سے آدمی بھی مر جاتے ہیں۔ اسی لئے میں کھلونا لائی ہوں۔ مرنا کسے کہتے ہیں، تو جانتا ہے"۔؟

"جانتا ہوں۔"

"بھلا کیا؟"

"ہر آدمی — بس مر جاتا ہے"

چونک پڑیں۔ لیکن پھر جلد ہی خاموش ہو گئیں۔ کہنے لگیں۔

"میں مر جاؤں تو کیا کرے گا تو"؟

جواب میں میں انھیں گھورتا رہا۔ میں کہہ دینا چاہتا تھا کہ میں اب بچہ نہیں ہوں۔ اس قسم کی ساری باتیں جانتا ہوں۔ گستاخی معاف! یہ باتیں اچھی نہیں ہیں۔ اگر وہ مر سکتی ہیں تو کیا میں نہیں مر سکتا۔ میں بڑے آرام سے مر سکتا ہوں۔ انھیں معلوم نہیں کہ میں کس آسانی سے مر سکتا ہوں۔ میں انکے بعد زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب تک زندہ ہوں دیکھوں گا کہ انھیں کون مارتا ہے؟

اگلے دن ایک پرچہ دے کر انھوں نے مجھے شیلا کے یہاں بھیجدیا۔ میں شیلا کو جانتا تھا لیکن یہ نہ جانتا تھا کہ اُس کے کوئی بڑے بھائی بھی ہیں۔ پرچہ صرف انھیں کے ہاتھ میں دینے کے لئے کہا گیا تھا۔ شیلا کے بڑے بھائی مجھے بہت اچھے لگے۔ لیکن پرچہ لے کر وہ ایسی سوچ میں پڑ گئے کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں انکے پاس کھڑا ہوں میں نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا۔ لیکن جلد ہی وہ لوٹ آئے۔ انھوں نے بڑے والہانہ انداز سے مجھے گود میں لے لیا، رخساروں پر بوسے دیئے، کندھے پر بٹھا لیا اور نہ جانے کتنی قسم کی چیزیں مجھے دے ڈالیں شیلا بھی مجھے بڑی اچھی لگی۔ میں سوچنے لگا کہ کوئی بہانہ ملے تو میں روز یہاں آیا کروں۔ اتنی دیر میں شیلا کے بھائی نے ایک خط لکھ کر میری جیب میں رکھدیا۔ کہنے لگے: "تمہارا نام پرمود ہے نا! بڑے بہادر ہو تم" یہ کہہ کر مجھے پھر زمین سے بہت اوپر اُٹھا کر چوم لیا، پھر بولے۔

"یہ خط اپنی بُوا کو دیدینا۔ دوگے نا"!

اگر ماں کے لئے خط ہوتا تب بھی میں پہلے بُوا ہی کو دیتا اور اَب تو خط ہی بُوا کے لئے تھا — میں نے کوئی جواب نہ دیا خاموش ہو رہا۔

شیلا کے بھائی نے میرے کوٹ کی دونوں جیبیں چاکلیٹ سے بھر دیں اور کہا۔

"تم بڑے پیارے لڑکے ہو۔ کونسی کلاس میں پڑھتے ہو۔"؟

"ساتویں میں"

"بہت خوب۔ پرمود، جا کر کہنا کہ میں ابھی ایک مہینہ یہاں اور رہوں۔ سمجھے نا!"

میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

"کیا سمجھے"؟

"— میں ایک مہینہ یہاں اور رہوں!"

شیلا کے بھائی اس پر خوب ہنسے۔

"تم نہیں بھائی — میں، میں، میں"

دیا ہوا خط لفافہ میں بند نہ تھا۔ اور اسی طرح بُوا نے بھی کاغذ موڑ کر دیدیا تھا۔ لیکن شیلا کے بھائی مجھے اتنے اچھے لگے کہ میں انکی تحریر کی خوبصورتی بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے کھول کر دیکھا۔ اس کے حروف مجھے بڑے پیارے معلوم ہوئے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کبھی اتنی اچھی انگریزی لکھ سکوں گا یا نہیں خط کے اوپر ایک کونے میں "مائی ڈیر" تو مجھے اتنا اچھا معلوم ہوا کہ بہت دنوں تک اپنے خطوں میں بالکل اُسی کی نقل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ گھر آ کر میں نے خط بُوا کے حوالے کر دیا۔ اور فوراً ہی کھول کر انھوں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ خط کوئی بہت لمبا چوڑا نہ تھا، پھر بھی وہ کئی منٹ تک اُسے پڑھتی رہیں۔ یہ بھی بھول گئیں کہ یہ کام میں نے کیا تھا۔ میری بھی کچھ اہمیت ہے، اور میں پاس ہی کھڑا ہوں۔ کافی دیر کے بعد انھوں نے اس پرچے سے نظریں ہٹائیں۔ پرچے کو آہستہ سے تہ کیا اور میری طرف دیکھا۔ اس طرح جیسے مجھے پہچان نہ رہی تھیں، جیسے سب کچھ بھول گئی تھیں کہ کیا تھا، کیا ہے اور کیا ہوگا —؟ پھر اُسی کھوئے کھوئے انداز سے اس پرچے کے بہت سے ننھے ننھے ٹکڑے کر دیئے۔ انکے ہاتھ مجھے مشین کی طرح تیز چلتے ہوئے معلوم ہوئے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ کام وہ نہیں کر رہی تھیں، کوئی اور ہی کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ انکے حواس بحال ہوئے۔ گویا انھوں نے اب پھر کچھ کچھ دنیا کو سمجھنا شروع کیا تھوڑی دیر بعد بولیں "پرمود اب تو وہاں کبھی مت جانا، تجھ سے جواب لانے کو کس نے کہا تھا؟ کبھی کسی کا خط لانے کی ضرورت نہیں، سمجھا۔"

مَیں کچھ نہ سمجھا تھا۔

وہ بولیں: "تُو اتنا نا سمجھ کیوں ہے پرمود، تو نہیں جانتا کہ میری شادی ہو گئی ہے۔!"

مَیں نے کہا: "جانتا ہوں۔"

بولیں: "تو کچھ نہیں جانتا، تو گدھا ہے۔ میرے دِل میں آگ لگ رہی ہے۔۔۔!"

مَیں چُپ رہ گیا۔

"۔۔۔۔۔۔ تو جانتا ہے دِل کی آگ کیا ہوتی ہے؟"

دِل کی آگ کو سچ مچ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اس وقت بُوا کو دیکھ کر اور انکے ہونٹوں پر رقص کرتی ہوئی اس مُسکراہٹ کو دیکھ کر جو ایک پل میں غائب ہو گئی تھی، میرا دِل بھر آیا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی طرح میں انکے کام آ جاؤں، کوئی ایسا کام کروں کہ ان کا جی ہلکا ہو جائے۔ اور کچھ نہیں تو انکے گلے لگ کر رو ہی پڑوں۔

انھوں نے کہا: "دیکھ پرمود، شیلا کے بھائی کا کوئی پیغام آیا تو مَیں چھت سے کود پڑوں گی۔ سمجھے انھوں نے سمجھا کیا ہے؟"

مَیں کہنا چاہتا تھا کہ شیلا کے بھائی نے کہا ہے کہ ابھی ایک مہینہ وہ یہاں اور رہیں گے اور یہ کہ وہ مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ لیکن انھوں نے موقعہ ہی نہ دیا۔ فوراً بولیں۔ "جا کر شیلا سے کہدینا، سچ کہتی ہوں مَیں مر جاؤں گی۔ مرنال کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔"

یہ انھوں نے اِس طرح کہا کہ جیسے ابھی انھیں بہت کچھ اور بھی کہنا ہے۔ ابھی تو انھیں پُورے طور پر سمجھنا سمجھانا ہے کہ اِس حالت میں انھیں مرنا ہی ہوگا۔ کسی قسم کا سوچ وچار اس کے علاوہ بیکار ہے۔

اِس بار ہمارے یہاں انھیں چار پانچ دِن ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد پھوپا آ کر انھیں سُسرال لے جانے والے تھے۔ سُسرال جانے کے لئے وہ رضامند معلوم نہ ہوتی تھیں۔ جُوں جُوں جانے کا دِن نزدیک آتا جاتا تُوں تُوں ان کی نگاہیں بندھی سی جا رہی تھیں۔ جہاں دیکھتیں بس دیکھتی ہی رہ جاتیں۔ جیسے انھیں کچھ دیکھتا ہی نہیں تھا بس قسمت دیکھتی تھی جس کے لکھے کو پڑھنا بہت مشکل ہے۔ وہ سر سے پیر تک سوال بن گئی تھیں، انکا چہرہ، ان کی نگاہیں نہ جانے کس سوال کا جواب پوچھنا چاہتی تھیں۔

اگلے روز پھوپا آنے والے تھے۔ رات کو انکی طبیعت بگڑی بگڑی سی ہو رہی تھی۔ اپنے کمرے میں ایک کھُردرے تخت پر بیٹھی تھیں۔ مجھ سے بولیں: "پرمود، کل میں چلی جاؤں گی۔"

مَیں کچھ نہ بولا۔ سر داب رہا تھا۔

کہنے لگیں: "بس، اب رہنے دے۔"

مَیں نے کہا: "دوا تو تم پیتی نہیں ہو۔"

اس پر مجھے مسلسل کئی منٹ تک دیکھتی رہیں۔ کچھ رُک کر بولیں: "ایک کام کرے گا پرمود۔ شیلا کے بھائی ڈاکٹری پڑھتے ہیں۔ دوا کا نام لکھے دیتی ہوں، تو اُن سے لے آئے گا؟"

مَیں کیوں نہ لے آتا۔ انھوں نے کاغذ کے ایک پُرزے پر انگریزی میں کچھ لکھ دیا۔ اور میں اُسے لے کر دوڑ گیا۔ لیکن اُس پُرزے میں نہ جانے کیا تھا کہ شیلا کے بھائی اُسے پڑھ کر مجھے مارنے پر تُل گئے۔ دھمکا کر پوچھا: "یہ کیا ہے؟"

"بُوا نے دَوا منگائی ہے۔"

"دوا؟"

"ہاں، دوا۔ ان کے سر میں درد ہے۔"

شیلا کے بھائی نے آگے کچھ نہ کہا۔ وہ تیزی سے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ کاغذ تُڑا مُڑا کر انکے ہاتھ میں گولی ہو گیا۔ اُس کاغذ کی گولی پر انکی چُٹکی سخت ہو گئی، اتنی سخت کہ انکے ہاتھ کا تناؤ دیکھ کر میرے دِل میں نہ جانے کیسے کیسے خیال پیدا ہونے لگے۔

کچھ دیر کے بعد مَیں نے ہمت کر پوچھا: "مَیں جاؤں؟"

شیلا کے بھائی رُک گئے۔ مجھے دیکھ کر نرمی سے بولے: "میں چل کر انکی طبیعت کا حال دیکھ نہیں سکتا ہوں؟ پرمود، مجھے لے چلو گے؟"

مَیں نے کہا: "نہیں۔ جی جی چھت سے گِر کر مر جائیں گی۔"

اس پر انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے پوچھا: "دوا نہیں دیجئے گا؟"

انھوں نے جیسے مجھے للکارا: "دوا؟"

"نہیں دیجئے گا تو میں جاؤں؟"

اس پر انھوں نے اپنی چٹکی سے اس کا فندکی گری کو کھولا اور اس چھوٹے سے پڑے کے اور بتیت سے ٹکڑے کرڈالے۔ اور ان سب کی مڑتڑ تڑی کرکے میری طرف پھینک کر کہا: "یہ ہے دوا، لے جاؤ!"

اس کے بعد مجھے کوئی خاص بات یاد نہیں۔ اگلے روز پھوپا آئے میں نے محسوس کیا کہ میرے دل میں انکے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا۔ بوا کی طبیعت اب اور بگڑ گئی تھی۔ لیکن شکایت کوئی خاص نہ تھی۔ پھوپا نے سفر کا سارا انتظام کر دیا ہے۔ بوا کو کوئی تکلیف نہ ہوگی یہاں سے تین سو میل دور ہی تو جانا ہے۔ موٹر میں جائیں گے، ضرورت ہوئی تو راستے میں ایک دو جگہ رک جائیں گے۔ ڈاک بنگلے جگہ جگہ ہیں ہی۔ چاچی مطمئن رہیں کہ پھوپا ہماری بوا کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہونے دیں گے۔

چاچی نے کہا: "اچھا، اچھا۔ لیکن . . . . !"

پھوپا نے کہا: "جی! آپ بے فکر رہیے۔ انھیں تکلیف کسی قسم کی نہ ہوگی۔"

چاچی نے کہا: "میرا مطلب ہے کہ اس کی طبیعت ذرا . . ."

پھوپا نے کہا: "یہاں کی آب و ہوا کسی قدر . . . . . ذرا تبدیلی چاہیئے ستمبر شروع ہوا کہ کشمیر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں ستمبر اکتوبر کشمیر کے سب سے خوشگوار مہینے ہیں۔ گل مرگ کی ہوا دہ ہے . . . . . ."

اگلے دن پھوپا پورے انتظام اور چاؤ سے بوا کو لے گئے۔

(۳۷)

کچھ دن بعد ہم لوگوں کو ادھر پورب کی طرف آنا پڑا۔ میں ہائی اسکول میں داخل ہوگیا اور اگلی جماعت میں پہنچ گیا۔ بوا مجھے رہ رہ کر یاد آتی تھیں۔ انکے خط آتے تھے لیکن بڑے مختصر۔ ان سے معلوم ہوا کرتا تھا کہ بوا اچھی ہیں، خط میں اور کچھ نہیں لکھا۔ بابوجی سے بوا کے متعلق کچھ پوچھتا تو وہ خاموش ہو جاتے۔ وہ اس بارے میں کچھ خوش نہیں تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ میں کہتا "بابوجی! مجھے بھیج دیجئے کہ میں بوا کے پاس ہو آؤں" وہ کسی قدر دلچسپی لیتے اور پوچھتے "تو جائیگا؟" "لیکن دیکھتے کہ دیکھتے ان کی دلچسپی ختم ہو جاتی اور کہتے "تو کیا جائیگا کہاں جائیگا؟ مرتال تو اپنے گھر کی ہے۔ گھر پر خوش ہے۔"

شادی کو آٹھ دس مہینے گذر چکے ہوں گے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ بوا ایک نوکر کو ساتھ لئے چلی آرہی ہیں۔ چاچی کو ان کی یہ حرکت کچھ نہیں تو کچھ اچھی بھی نہیں لگی۔ ان نے ناراضگی یا خوشی کا کچھ اظہار نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے ٹال ٹال کر پھوپا کو کافی سرد و گرم کہہ ڈالا۔ بوا آئیں کہ میرے پرانے دن لوٹ آئے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ بوا میں بڑی تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ ان کی طبیعت کو قرار نہ تھا۔ ابھی خاصی ہنسی خوشی بیٹھی باتیں کر رہی ہے کہ یکایک کچھ سوچ کر فوراً سنجیدہ ہو جاتیں اور کمرے میں جا اکیلی پڑ رہتیں۔ ان کی تندرستی بھی اب ٹھیک نہ رہتی تھی۔ تمام جسم پیلا پڑ گیا تھا۔ ایک دن میں نے سنا کہ انھیں حمل ہے۔

ان کی طبیعت اکثر مالش کرتی۔ کھانا پینا کچھ اچھا نہ لگتا۔ کسی بات اور کسی کام میں دلچسپی نہ لیتیں۔ میں نے ایک دن تنہائی میں پوچھا۔ اب تو یہیں رہو گی نا۔

"بوا! جلدی تو نہیں جاؤگی۔"؟

بوا نے کہا: "نہیں جاؤں گی۔ لیکن تو آنے جانے کی بات کیوں کرتا ہے۔؟

اپنے پڑھنے لکھنے کی بات کیا کر!" یہ کہتے کہتے انکی آنکھیں نہ جانے کیسی ہوگئیں۔

آواز سانپ کر رک جانا چاہتی تھی۔

میں نے اپنے طور پر نہ جانے کیا سمجھ کر کہا "تو بوا، پھر وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نہیں جانے دوں گا۔"

بوا نے کہا: "بھلا کیسے نہ جانے دوں گا؟"

"بس کہدیا نہیں جانے دے گا۔"

بوا طنز سے ہنسی۔

"تو روکنے کی بات کرتا ہے۔ تو پہلے ہی کیوں نہ روک لیا تھا۔

اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

بے بسی نے ان کے چہرے پر جیسے دھواں اُڑا دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر جوش آگیا۔ بولا "کیوں نہیں ہو سکتا۔ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ دیکھوں تو پھوپا کیسے لے جاتے ہیں۔؟"

بُوا بولیں "بڑے بہادر بنتے ہو پرمود۔ لیکن اس کے متعلق کیا ہوا سے کچھ نہ پوچھو گے۔ اب بُوا یہاں کی نہیں ہے، وہاں کی ہے اپنے پھوپا کی چیز کو چھیننے والے بھلا تم کون۔؟"

میں ان ساری باتوں کی گہرائی کو نہ سمجھ سکا۔ لیکن ان کی آواز کا درد اور اضطراب مجھ سے کچھ کہتا ضرور تھا۔ اتنا میں سمجھ ہی گیا تھا کہ سسرال کا ذکر آتے ہی انھیں تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اس میں کیا پس و پیش ہے۔

میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ جگہ پسند نہیں ہے۔ وہاں نہ جائیں۔ بس

لیکن جس آسانی سے میں بس کہہ دیتا تھا، بات اتنی آسان نہ تھی۔ یہ میں آج جانتا ہوں۔ شادی کا رشتہ صرف دو کے درمیان نہیں ہے۔ اس کا تعلق سماج سے بھی ہے۔ یہ رشتہ چاہنے سے کیا ٹوٹ سکتا ہے؟ اس کی بنیاد محض جذبات پر ہی نہیں ہے بلکہ سماج پر بھی اس کی بنیاد ہے۔ یہ سوال اس طرح ٹالے ٹل سکتا ہے؟

وہ گرہ ہے کہ بندھ جائے تو کھُل نہیں سکتی کوشش کی جائے تو ٹوٹ سکتی ہے لیکن ٹوٹنا کس چیز کا اچھا ہوتا ہے؟

لیکن آٹھویں جماعت کا طالب علم بھلا میں یہ باتیں کیسے سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے میں نے پورے اعتماد سے بُوا کو یقین دلایا کہ وہ اب یہیں رہیں گی۔ دیکھوں کون ہوتے ہیں پھوپا جو تمہیں لے جائیں؟ کیوں سوچ سوچ کر اپنی جان گھلاتی ہو بُوا؟ تمہیں آخر فکر ہے کیا؟ پرمود بڑا ہو کر خوب کمائے گا، تمہاری خوب خدمت کرے گا، تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دے گا۔

بُوا کی میری باتوں سے بالکل بھی تسلی نہ ہوئی، یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا۔ ان کے چہرے پر کیا فوراً اطمینان کی جھلک نہ آگئی تھی۔ آہستہ سے ہنس کر بولیں،

"تو ایسا بہادر ہے پرمود، تو پھر بیڑا پار ہے۔ کیوں؟ اچھا اب یہ بتا کہ تو اپنی کلاس میں اول ہے یا نہیں؟"

اول یا پسندیدہ ہونے میں مجھے اس وقت دلچسپی نہ تھی۔ میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ بُوا کے دل میں اب کوئی اندیشہ نہیں۔ میں نے پوچھا:

"سچ سچ بتاؤ بُوا تم وہاں جانا چاہتی ہو یا نہیں"؟

"سچ بتائیں؟"

"ہاں، بالکل سچ سچ"!

بُوا نے ہنس کر کہا، "کیوں بتاؤں سچ سچ؟"

میں نے ناراض ہو کر کہا، "نہیں بتاؤ گی؟"

بولیں۔ "اچھا بتاتی ہوں۔ میں تیرے ساتھ رہنا چاہتی ہوں رکھے گا؟"

یہ کہہ کر انھوں نے کچھ یوں دیکھا کہ میں جھینپ گیا۔ مجھے کھینچ کر اپنی گود میں لے لیا۔ پھر ایک دم مجھے چمٹا کر بولیں "ایک بات بتا۔ تجھے بید کھانا اچھا لگتا ہے۔"

میں نے کہا، "بید؟"

بولیں "میں ایک بار تجھے بید سے پیٹوں گی۔ دیکھوں گی تجھے اچھا لگتا ہے یا بُرا؟"

بُوا کے بات کرنے کا انداز کچھ عجیب ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "بُوا، یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

بولیں "سچ سچ کہتی ہوں پرمود، یہ باتیں میں نے کسی سے نہیں کہیں۔"

بس تجھ سے کہی ہیں۔ بید کھانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ نہ یہاں نہ وہاں۔"

میں تعجب میں رہ گیا۔ بولا "کیا کہتی ہو، بُوا، وہ مارتے ہیں؟"

"ہاں مارتے ہیں۔"

بید سے مارتے ہیں؟"

"ہاں بید سے مارتے ہیں!"

"کیوں مارتے ہیں؟"

"میں خراب جو ہوں، اس لئے!"

یہ سُن کر نہ جانے مجھ پر کیا اثر ہوا کہ میں بُوا کے چہرے کی طرف نظر نہ اٹھا سکا۔ جذبات سے مرعوب ہو کر میں نے اپنا منہ ان کے پہلو میں چھپا لیا۔ معاً جی چاہا میں نے چاہا کہ بُوا کو گود میں لے لوں

...دھیرے دھیرے ان کی پیشانی تھپک کر کہیں "وہ سب بھول جاؤ
...۔ اچھا بٹیا سب بھول جاؤ۔ ایسی ہی جگہ ہے
جہاں کوئی خراب نہیں، جہاں کوئی بھید نہیں۔ ہم دونوں وہیں چلی
رہیں گے۔"

... وچار دھارا میں ان کے من سے بہتا رہا۔ میں نے محسوس
... بوا کا دل بھر آیا۔
... آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک آدھ قطرہ بھی ٹپک پڑا تھا۔

مجھے ساری باتیں تو یاد نہیں۔ لیکن یہ یاد ہے کہ پتا جی
... پھوپھا سے کچھ خط و کتابت ہوئی تھی جو کافی عرصے تک جاری رہی
... پھوپھا چاہتے تھے یہاں رہیں۔ آخر میں فیصلہ ہوا کہ پھوپھا انہیں
... لے جا سکتے ہیں۔ پتا جی شاید اس بات پر تیار ہو گئے تھے کہ اگر
... وہ پھوپھا کی مرضی کے بغیر چلی آئیں گی تو وہ اپنے گھر میں جگہ نہ
دیں گے۔

پھوپھا نے پتا جی کے سامنے بوا پر کچھ الزامات بھی لگائے تھے
جن کو انھوں نے معافی مانگ کر واپس لے لیا تھا۔

ایک بار میں بابوجی کے پاس تھا۔ بوا آئیں اور خاموش
بابوجی کے پاس بیٹھ گئیں۔ بابوجی نے کہا "مرنال! کہو طبیعت کیسی
ہے؟"

"اچھی ہے۔"

"یہاں شاید تمہارا دل نہیں لگتا، معلوم ہوتا ہے۔"

بوا خاموش رہیں۔

"...کی چٹھی آئی ہے۔ اتوار کو آ رہے ہیں۔ پانچ روز ہیں۔ منی
دیکھو اب ایسی غلطی مت کرنا۔ وہ بھلے آدمی ہیں، اس سے بات بن
بھی گئی۔ نہیں تو بیٹیا!
ایسا کیا کرتے ہیں؟ تھوڑا بہت جھگڑا ہوتا ہی ہے۔ لیکن شوہر
بنا کے گھر کے علاوہ استری کو اور کیا آسرا ہے۔؟ یہ جھوٹ نہیں ہے
مرنال کہ پتنی کا دھرم پتی ہے۔ اس کا گھر صرف پتی کا گھر ہے۔ اس کا
دھرم کرم اور نجات سب وہی ہے۔ سمجھتی تو ہو نا بیٹیا۔

کہتے کہتے ان کی آواز معذرت خواہ ہو گئی۔ بوا اب بھی چپ
رہیں۔ تھوڑی دیر پھر پتا جی نے کہا، کہو کہو، مرنال، تم کچھ کہنا چاہتی
ہو؟"

بوا نے کہا "میرا جی اچھا نہیں رہتا۔ میں ابھی جانا نہیں چاہتی۔"

"ابھی نہیں جانا چاہتی ہو!"

بوا خاموش رہیں۔

"لیکن وہ تو آج ہی لے جانا چاہتے ہیں۔"

بوا اب بھی چپ رہیں۔

بابوجی اس خاموشی پر کچھ مضطرب ہو گئے۔ انھوں نے پہلے
تو میری طرف دیکھ کر کہا۔ "جاؤ، پڑھو اپنا سبق دیکھو۔" میں
فوراً نہیں اٹھا تو خفا ہو کر بولے "سنتے نہیں ہو؟ جاؤ!" میں
کمرے سے باہر ضرور آ گیا لیکن دبک کر کھڑا ہو گیا۔ پتا جی نے
کہا "سنو، مرنال! ابھی بھیجنا میں بھی نہیں چاہتا تھا۔ تمہاری حالت
نازک ہے۔ لیکن تمہیں بتاؤ میں کیا کروں؟"

بوا کچھ نہ بولیں۔

بابوجی کمرے میں ٹہلنے لگے۔ کچھ دیر تک وہ بھی نہیں بولے پھر
کہنے لگے "منی،
سچ بتاؤ کیا بات ہے؟" یہ کہہ کر رک گئے۔ بوا چپ رہیں
تو پھر ٹہلنے لگے۔ پھر ایکا ایک رک کر بولے "مرنال! میں دیکھتا ہوں
تمہیں تکلیف ہے۔ لیکن بتاؤ گی نہیں تو میں کیسے جانوں گا؟ کیا
کروں گا؟ منی! تجھے پتا جی تو کیا یاد ہوں گے۔ ابھی تو ننھی سی تھی
تھی کہ پتا جی بھگوان کو پیارے ہو گئے۔ اور ماں تو ان سے بھی پہلے چل
بسی تھیں۔ اب تو ماں باپ سب کچھ تیرے لئے میں ہی ہوں
مجھ سے نہ کہے گی اور کس سے کہے گی؟ مرنال بٹیا! سچ بتا کیا بات
ہے؟"

بوا نے کہا "کچھ بھی بات نہیں بابوجی لیکن میں جانا نہیں
چاہتی۔"

"جانا نہیں چاہتی ہو۔ یہ تو میں دیکھتا ہوں، لیکن بھلا
کہیں ایسا ہو سکتا ہے"

اور کب تک نہیں جاؤ گی؟"

"بالکل نہیں جاؤں گی۔"

بابوجی نے زچ ہو کر کہا "تو کیا کرو گی؟"

"آپ نکال دیں گے تو یہاں سے بھی نکل جاؤں گی۔"

بابوجی کو غصہ آ گیا "کہاں نکل جاؤ گی؟"

جہاں پتا جی چلے گئے ہیں۔ کوئی راہ بتادے تو میں بھی وہیں چلی جاؤں۔"

اس کے بعد مجھے کچھ سنائی نہ دیا۔ البتہ پتا جی کے تیز قدموں کی چاپ ضرور سنائی دیتی رہی۔ دو ایک بار کھانسنے کی آواز بھی آئی جیسے کچھ گلے میں بھرا آرہا ہو۔ چند لمحوں تک میں کچھ اور سننے کا منتظر رہا۔ لیکن پتا جی کے قدموں کی چاپ، کھانسی اور سرد آہوں کے علاوہ میں اور کچھ نہ سن سکا۔ آخر میں وہاں سے کھسک آیا۔

اس کے بعد میں نے بوا سے پوچھا "بوا! پتا جی بھیجنے کو کہتے ہیں؟"

بوا نے ڈپٹ کر کہا۔ "چپ رہا کرو جی، پرمود! اپنے کام سے کام رکھا کرو۔"

ان کا یہ اچانک غصہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن رد عمل کے طور پر میں بھی اس دن الگ الگ رہا۔ لیکن سرِ شام مجھے سینے سے لگا کر پھر رونے لگیں،

اور بولیں "تو روٹھ گیا پرمود؟"

تھوڑی دیر بعد خود ہی کہنے لگیں "بابو جی مجھے بھیج رہے ہیں چلی جاؤں؟"

میں کیا کہتا۔؟

انھوں نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا "مجھے چلا جانا چاہیے۔ کیوں پرمود؟"

مجھے خاموش دیکھ کر بولیں، "اچھا جانے دو اس بات کو۔ یہ بتا میں چلی گئی تو مجھے یاد کرے گا؟"

اس بار میں نے کہا "بوا میں تمہارے پیچھے تمہیں بہت یاد کرتا تھا۔"

"میں مر جاؤں، تب بھی یاد کرے گا؟"

اب مجھے سمجھ آگئی تھی۔ بولا "بوا، ایسی باتیں مت کرو۔ میں نہیں سننا چاہتا۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔ جب بڑا ہو جائے گا اور میں بلاؤں گی تو آئے گا؟"

"فوراً آؤں گا۔"

"کیسی بھی حالت میں میں ہوں، تو آئیگا؟"

"ہاں! آؤں گا۔"

تو سن، میں کہتی ہوں تو نہیں آئیگا۔ تجھے بلاؤں گی ہی نہیں۔ ... کہتی ہوں تم سب لوگ مجھے بھول جانا۔ میں یہاں سے گئی! مری، برابر ہی ہے۔

اس کے بعد میں تم لوگوں کو بالکل تکلیف نہیں دوں گی۔

تھوڑی دیر بعد بوا نے مجھ سے پوچھا، "تو جانتا ہے جی کا گھر کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔

"سورگ ہوتا ہے۔"

میں نے مان لیا کہ ہاں ہوتا ہوگا۔ لیکن میرے اس آسانی سے مان لینے سے انھیں کوئی تسلی نہیں ہوئی۔ بولیں "وہ سورگ بھی ہوتا ہے جس کے لیے ایسا نہیں ہوتا وہ بد قسمت ہے۔"

مجھے خاموش پاکر پھر بولیں "جانتا ہے سورگ کیا ہوتا ہے؟" پھر خود ہی جواب دیا "سورگ بڑے آرام کی جگہ ہوتی ہے جہاں دیوتا رہتے ہیں۔"

اگلی صبح انکی حالت بہت سنبھلی ہوئی۔ نرم ہوتی تھی۔ ماں سے انھوں نے کہا کہ دھوبی سے ان کے کپڑے اتوار تک آجائیں کیونکہ مجھے جانا ہے۔ دو چار چیزیں بھی مجھے بازار سے منگوانا ہیں۔ اس وقت وہ اپنا سامان رکھنے رکھانے میں بڑی مصروف نظر آتی تھیں۔ ایک بکس میں سامان نکال کر دوسرے میں رکھ دیا گیا۔ کتابیں سب نکال کر علیحدہ رکھ دی گئیں۔ کہنے لگیں۔ کتابیں اچھی نہیں ہوتی۔ انھیں "اچھی نہیں لگتیں ان سے وقت برباد ہوتا ہے۔

نہیں۔ اس بار کچھ نہیں۔ نہ نئی، نہ پرانی۔

دوپہر تک وہ اسی طرح مصروف رہیں۔ لیکن کھانا کھا کر جو لیٹیں تو سر میں درد شروع ہوا۔ میں نے پوچھا کیا ہوا بوا؟" بولیں۔

"سر میں درد ہے۔"

"ماتھا داب دوں؟"

"نہیں۔"

"بام لگا لیجیے۔"

"نہیں۔"

"یو ڈی کولن کی پٹی لاتا ہوں۔"

"ارے نہیں، نہیں، نہیں۔"

معلوم ہوا کہ دو تین روز سے انھیں سخت تبض ہے۔ پیٹ پتھر ہو رہا ہے

شما نے کہا، "ڈاکٹر۔۔۔؟"

بولیں "کوئی ڈاکٹر واکٹر نہیں۔"

میں نے پوچھا "پھر۔۔۔۔؟"

"یونہی سب ٹھیک ہو جائیگا۔"

درد بڑھتا ہی گیا۔ جیسے جیسے بھی درد کی شدت بڑھتی وہ تڑپنے لگیں۔ لیکن کسی کو پاس بلانا منظور نہ تھا کھلی پڑی رہیں۔ میں کئی بار بابوجی کو اطلاع کرنے کے لئے تیار ہوا لیکن بُوا نے ایسا مجبور کیا کہ میری ہمت نہ پڑی۔ اب ان کے پیٹ میں بھی تکلیف معلوم ہوتی تھی۔ درد رہ رہ کر اٹھ رہا تھا۔ جیسے کوئی پیٹ میں بیٹھا ہوا رگ رگ کو آنتیں مروڑ رہا ہو۔ درد سے بے چین ہو کر ان کا چہرہ پیلا اور زرد سا ہو جاتا تھا۔ میں نہیں جانتا شما نے یہ سب کچھ کیسے برداشت کر لیا اور کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ میں کہنے کے لئے جانا چاہتا تو وہ اپنی قسم کھلا کر روک لیتیں۔ یہ مہوا اگر کہو تو مجھے میری صورت تک دیکھنی نصیب نہ ہو۔

"شما نے کہا کہ پھر کیا ہو؟"

"پیٹ کا درد ہے۔ اپنے آپ ٹھیک ہو جائیگا۔"

"دیکھ اگر بازار جاتا ہو تو جمال گوٹا لیتے آنا۔ یاد رہے گا نا۔

جمال گوٹا۔"

میں اب بُوا کی طرف سے مشکوک ہو گیا تھا۔ پوچھا "یہ کیا چیز ہوتی ہے؟"

درد کی حالت میں بھی وہ مسکرائیں اور کہا "تو اب سمجھدار ہوتا جاتا ہے"

"یہ ہو لیکن وہ مرنے کی چیز نہیں ہوتی۔ لے آئیگا نا۔"

میں نے پوچھا "اس سے طبیعت ٹھیک ہو جائیگی۔؟"

"ہاں ہو جائیگی۔ جائیگا؟"

جمال گوٹے کے استعمال سے ان کی جو بری حالت ہوئی اسے دہرانا فضول ہے۔ ماں اور بابوجی دونوں پریشان ہو گئے۔ میں نے مارے ڈر کے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ دوبارہ اندیشہ ہوا کہ کہیں حمل نہ جاتا رہے۔ حمل تو نہ گرا لیکن اور سب کچھ ہو گیا۔ تین روز میں اتنا سا منہ نکل آیا کہ دیکھ کر دل بھر آتا تھا۔ لیکن کیا رحم کچھ خاص حد پار کر کے غصے کا روپ دھار لیتا ہے؟ بس ان دنوں آگ بگولہ رہتا تھا۔ بُوا کو نہ جانے کتنی بار سخت سست سنا ڈالا۔ سنتی رہیں۔ بس یہی

بولیں "تو بھی مجھے ہی کہے گا یہ مہوا۔"

"تم سے نہ کہوں گا تو اور کس سے کہوں گا؟"

"اچھا کہہ لے بھیا، تو بھی کہہ لے۔"

بُوا نے مجھے اس انداز سے دیکھا کہ میری تمام گرم گفتاری سارا غصہ کافور ہو گئی۔

ندامت سے مجھے پسینہ سا آ گیا۔ بولا "لیکن بُوا یہ تم نے کیا کیا کیا؟"

"میں جانتا ہوں یہ جو کچھ بھی ہوا صرف تمہاری وجہ سے ہوا۔"

بس یہ کچھ دیر تک وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں "لالہ جان پر سو، میں نے کچھ نہیں کیا۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں جو کچھ کرتی ہوں کیا جان بوجھ کر کرتی ہوں۔ یہاں کوئی بھی تو نہیں جو مجھے کچھ بتائے۔ اپنے دل کی بات کس سے کہوں؟ پر مہوا میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ایسے شما تو بھی مجھے ہی قصوروار ٹھہرائے گا تو میں کیا کروں گی؟"

اُن کی باتوں کے یہ معنے میں کسی طرح بھی حل نہ کر سکا۔ دل درد کی لہروں میں ڈوبنے لگا۔ میں نے پوچھا "بُوا تم کیا چاہتی ہو؟"

"کیا چاہتی؟"

"اپنی صحت کیوں برباد کرتی رہو؟"

"صحت کیوں برباد کرتی ہوں؟ میں نہیں جانتی۔ اچھا بتاؤ صحت کا کیا کروں؟"

میرے سوئیاں چبھو رہی تھیں۔ ایسی تکلیف ہو رہی تھی جس کا نہ کوئی مرکز تھا نہ مقصد۔ میں نے کہا "کیوں بُوا، بابوجی سے ایک بار صاف کیوں نہیں کہہ دیتی ہو۔؟" "دنیا کیسا اور کس سے؟ پھر میں دیکھ رہی ہوں کہ کون زبردستی کرتا ہے۔"

بُوا عجیب انداز سے مجھے گھورنے لگیں۔ پھر بولیں "کس سے کہہ دوں کیا کہہ دوں؟ کیسی صاف بات؟ یہ سب تو کیا کہہ رہا ہے؟ پر مہوا تو ابھی کچھ نہیں جانتا، تو ابھی بچہ ہے۔"

اپنے کو بچہ سن کر میں نے بے عزتی سی محسوس کی۔ بولا۔ "ہاں! بچہ ہوں، لیکن ایک بار تم کھل کر کہہ دو کہ تم وہاں نہیں جانا چاہتیں۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ کون بھجوا کر تمہیں لے جاتے ہیں؟ تم سمجھتی ہو کہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

اُس وقت وہ نہ جانے کیوں خوفزدہ ہو گئیں۔ بولیں "چھی بھیا

کہیں ایسی بات کہتے ہیں؟ عورت ذات کیا اپنے گھر کی ہوتی ہے؟ میں کیا نرالی عورت ہوں۔؟ پھر میرے پتا ہی کہاں ہیں؟ نہ ہوتے۔"

میں بے اختیار چلا اٹھا "کون پتا؟ کیسے پتا؟ کیا کہہ رہی ہو۔

بوا؟ کیا بابو جی تمہارے نہیں ہیں؟ ماں تمہیں ہیں؟ میں نہیں ہوں؟"

وہ آہستہ سے بولیں، "کوئی نہیں ہے۔"

میں ان کے گلے سے لگ کر بولا "میں نہیں ہوں؟"

انھوں نے مجھے باہوں میں جکڑ لیا۔ اور کہنے لگیں "تو ہے بھیا! تو ہی تو ہے۔ ورنہ میں یہاں پیٹ کا دوزخ لئے کیوں پڑی ہوتی۔"

اتوار کو پھوپا آگئے۔ بوا کی حالت دیکھ کر انھیں بڑا تعجب ہوا۔ کہنے لگے، "معلوم ہوتا ہے اس جگہ کا پانی انھیں موافق نہیں آیا۔ دیکھیے نا کیا حالت ہو گئی ہے؟ آخر ہوا کیا تھا؟" "تین روز تک دست آور رہے۔"

"اُف......ڈاکٹر آیا تھا۔ کیا یہاں ڈاکٹر بھی سلیقے کے نہیں مل سکتے۔"

"ضلع کے سول سرجن......"

پھوپا بوا کی حالت دیکھ کر واقعی پریشان ہو گئے۔ وہ بار بار ان کی بری حالت پر تبصرہ کرتے جس سے ان کی دلی بے چینی اور ذہنی خلفشار معلوم ہوتا تھا۔ میرے سامنے ہی وہ بابو جی سے بولے، "ایسی حالت میں مجھے تار کیوں نہیں دیا گیا؟ میں کچھ بندوبست کر دیتا ہمارے یہاں کا پانی اور گھی دودھ کیسا ہے، آپ جانتے ہی ہیں مثل مشہور ہے کہ گھی اور مرنگیاں کا... کیسی ہی گری طبیعت کیوں نہ ہو، وہاں دیکھتے دیکھتے سنبھل جاتی ہے۔"

بتاجی سے کوئی خاص جواب نہ بن پڑا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اقرار کر رہے ہوں کہ انھیں کا قصور ہے۔ بس وہ ایک بار بولے کہ "خیر حالت کمزور ہے، کچھ دن اور رک کر لے جائیں تو کیا مناسب نہ ہوگا۔"

لیکن کمزور حالت ہی کی بنا پر پھوپا کا فرض کچھ اور شدید ہو جاتا تھا۔

"آپ ہی سوچئے کہ ایسی حالت میں انھیں یہاں چھوڑ جانا کہاں تک مناسب ہے۔

لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہاں پہنچ کر تھوڑے ہی دنوں میں ان کی طبیعت درست ہو جائیگی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ چھوٹے موٹے مرضوں کے لئے اتنی بھاگ دوڑ آگی پرورش کرنا ہے۔ لاکھ علاجوں کا ایک علاج ہے بے فکری۔"

پھوپا نے پھر کہا۔ "آپ نے انھیں سمجھا تو دیا ہی ہوگا۔ ذرا صحت کا خیال رکھا کریں۔ پھر دنیا کا بھی لحاظ رکھنا ہی پڑتا ہے آپ جانتے ہی ہیں کہ ہوشیلوں کی نیک چلنی ہی سب کچھ ہے۔ اپنے تو وہی پرانے عقیدے ہیں۔ ہماری تو ایک پرانی روایت چلی آتی ہے اگر نئی نہ بھی تو پھر کیا؟ ذرا یہ باتیں سمجھانی چاہئیں۔ میں تو اپنی طرف سے تھوڑا بہت کہہ دیتا ہوں۔ لیکن آپ جانئے، آپ کی بات کا کہیں زیادہ اثر پڑیگا۔"

میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا کیا سمجھتا ہوں گا کیا نہ سمجھتا ہوں گا۔ پھر بھی یہ باتیں مجھے کسی طرح بھی اچھی نہ معلوم ہو رہی تھیں۔ بے مطلب اور بے مقصد غصہ آرہا تھا جی چاہتا کہ بڑھ کر سب کچھ الٹ پلٹ کر ڈالوں۔ اس کی وجہ تو کچھ بھی نہ تھی۔ لیکن بابو جی کے چہرے پر ایک قسم کی افسردگی اور شکست خوردگی دیکھ کر میرے باغیانہ جذبات کچھ ٹھنڈے پڑ گئے۔ جانے کس چیز نے روک لیا کہ میں بہت نہ بڑا۔

بابو جی نے پھوپا کو جواب دیا "جی ہاں!"

فوراً ہی پھوپا میری طرف مخاطب ہوئے کہنے "جناب آپ کا اسم شریف ـــ؟ اوہ، یاد آیا پرمود! پرمود نام تو اپنی جگہ بہت ہے۔ مگر اس سے کسی کو کیا مطلب ہے؟ ـــ" میں کچھ نہیں بولا۔

"کس درجے میں پڑھتے ہو؟"

"اس چھ ماہی امتحان میں فیل ہو گیا ہوں۔"

"فیل ہو گئے ہو ـــ بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن کس جماعت میں؟"

میں چپ رہا ـــ کیوں بولوں؟ نہیں بولتا۔

"گھبراؤ نہیں ـــ کس جماعت میں پڑھتے ہو؟"

"میں فیل ہونے سے نہیں ڈرتا۔"

انھوں نے بڑی نرمی سے کہا۔ "فیل ہونے سے ڈرنا چاہیئے بھائی! جو شروع میں دل لگا کر پڑھتے ہیں وہی آگے چل کر کچھ کام کرتے ہیں۔ سمجھے؟ اچھا یہاں آؤ۔ آؤ، ہمارے پاس آؤ۔"

میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔

پتا جی نے کہا "جاؤ بیٹا! جاؤ۔ جواب دو۔"

اس پر میں سینہ تان کر پھوپھا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے دونوں کندھے پکڑ کر کہا "ورد سلمت میں پڑھتے ہو، یا آٹھویں میں؟"

"آٹھویں میں۔"

"دیکھو کلاس میں فیل نہیں ہونا چاہئے۔ اچھا بتاؤ کتنی اٹھنی ہوتی ہیں؟" یہ کہہ کر انہی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

بات تو بڑی تھی لیکن دل میں آئی کہ یہ الٹی ہی فہرست ہے لیکن اگر میں ان کی ہی بات نہ کہوں تو انہیں کیسا رہے گا؟ بس اس کا جواب دیدیں۔ ساگر راضی ہیں تو پھر میں ہی انہیں اٹھنی دیدوں گا۔

پھوپھا نے دونوں مٹھیاں بند کر کہا "بولو کتنی لوگے؟"

میں دیکھتا رہا۔ جواب کچھ نہ دیا۔

"جلدی بتاؤ ورنہ دونوں کا مال اڑ جائیگا اور پھر دیکھتے رہ جاؤ گے"

"آپکو چاہئے تو دو ہی میں آپ کو دے سکتا ہوں۔"

وہ جھینپ گئے اور کھسیانی ہنسی ہنس دئے۔ ان کی جھینپ اور کھوکھلی ہنسی نے میرے اندر ایک طرح کا بڑائی کا احساس پیدا کر دیا۔

میں نے کہا۔

"میں آٹھویں درجے میں پڑھتا ہوں اور اس امتحان میں اول آیا ہوں۔"

پھوپھا اس پر پھر ہنسے "ہو، ہو، ہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کٹے کٹے رہ گئے۔ اور ان کلاس کٹنے پن سے مجھے پتہ نہیں کیوں اور خوشی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے پتا جی کا بدلہ میں نے لے لیا۔ اگلے دن جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مجھ سے بوا نے کہا "پرمود، میرا کہا سنا معاف کر دینا۔ جانے تم لوگوں سے کب مل سکوں گی۔"

میں نے سوچا کہ بوا کے لئے مجھے مضبوط بننا ہوگا لیکن بوا کے سامنے آتے ہی میری سب مضبوطی ختم ہو جاتی تھی۔ بوا کی یہ بات سن کر میرا کلیجہ منھ کو آنے لگا۔ پھر بھی صرف کہنے کے لئے ہی کہدیا، "بوا خط لکھتی رہوگی؟"

بوا نے کہا، "خط؟ دیکھو!"

میں نے کہا، "ضرور لکھنا بوا۔ بلاؤگی تو میں فوراً آجاؤں گا۔ ریل میں اکیلا سفر کر لیتا ہوں۔"

"تجھے نہ بلاؤں گی تو اور کسے بلاؤں گی۔ لیکن یہ تو بتا کہ اکیلا سفر کرکے تو مجھ تک پہنچ بھی سکے گا؟"

"ہاں ہاں، ضرور بوا، میں آؤں گا ـــــ بلاؤگی تو سارے کام چھوڑ کے آ جاؤں گا۔"

بوا نے میرے گال پر ملکا سا چپت مارا اور رو دیں۔ ہنگامہ اس وقت جاتے ہوئے بوا نے روتے ہوئے ماں کے پیر چھوئے اور ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ لیکن بولیں کچھ نہیں۔ ماں نے بے تاب ہو کر انہیں گلے لگا کر کہا، "منی! میں تجھے جلد ہی بلاؤں گی۔ وہاں اپنی گرہستی اچھی طرح سنبھالنا۔ ورتی کو خوش رکھنا۔ منی....."

ماں نے ایک ہی سانس میں انہیں بہت سی دعائیں دے ڈالیں۔ بوا گردن جھکائے سب سنتی رہیں۔ شوہر کی فرماں بردار رہنے، پوتوں پھلنے، خوش قسمت ہونے وغیرہ کی دعائیں لیتے وقت وہ ایسی ہشاش بشاش نظر آ رہی تھیں کہ اگر ان دعاؤں کے بوجھ تلے دب کر بھی مر جائیں تو امر ہو جائیں۔

پتا جی کے سامنے بوا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ پتا جی نے رومال نکال کر چہرے کو پونچھا اور بے مطلب طریقے پر کہنا شروع کیا، "کیا ہے، کیا ہے؟ کچھ نہیں کچھ نہیں۔ مت رو منی مت رو۔ ہشت! ایسے بھی روتے ہیں۔" اور یہ کہتے کہتے فوراً بوا کے سامنے سے چلے گئے۔ ساتھ جانے والی گٹھری، بکس، بستر اٹھوانے میں لگ گئے۔ ایسے ہی اور بہت سے کام تھے ہمیں فرصت کہاں رکھی ہے؟

میں نے عہد کیا تھا کہ میں کبھی نہیں روؤنگا، ہرگز نہیں روؤنگا۔ میں نہیں رویا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا کہ میں کیوں نہیں کوئی حرکت کر رہا ہوں۔

بار بار خیال آ رہا تھا کہ اب تک میں کسی سے جھگڑا کیوں نہیں خواہ مخواہ کسی نہ کسی سے الجھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ رہیں بوا سو وہ جاتی ہیں تو جائیں۔ میرا ان سے کوئی مطلب نہیں۔ میرا کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ میں اکیلا سب سے نپٹ لونگا۔ اکیلا، بالکل

اکیلا۔ مجھ سے کوئی نہ بولے۔ میں بوا کو بھی یاد نہیں کروں گا۔ وہ کیوں جا رہی ہیں؟ میرے بغیر کیوں جا رہی ہیں؟

پھوپا کون ہوتے ہیں جو لے جا رہے ہیں؟ لیجاتے ہیں تو لے جائیں — جائیں کہیں ملیں تو — ایک بے نام سا خوف مجھے دبائے لے رہا تھا۔ نہ رونے دیتا تھا، نہ کچھ کرنے دیتا تھا۔ اور پھر یہاں تک ہوا کہ بوا کی رخصت کے وقت جھنجھلا کر میں بوا کے کمرے میں بھاگ آیا اور اپنے آپکو بند کر لیا۔ کواڑ بند کر لینے سے اندھیرا ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ گم سم کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی کوئی نہ کوئی کرشمہ ہو جائے گا، بھونچال آ جائے گا، کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا، اور آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چاہتا تھا کہ سانس روک لوں۔ بے جان ہو جاؤں۔ دنیا میں رہوں ہی نہیں۔

اتنے میں ماں کی تیز اور چیختی ہوئی آواز آئی — پرمود، پرمود!

میں نہیں بولا — میں نہیں بولوں گا — پرمود کہاں ہے؟ کہیں نہیں —

میں پرمود کو نہیں جانتا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔

"ارے پرمود! او بھیا پرمود۔"

ماں کی آواز اب میرے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ میں دوہیں سے کھڑے کھڑے چیخا۔ "کیا ہے؟ میں نہیں سنتا۔"

"کہاں ہے رے تو؟ تیری بوا بلا رہی ہے۔"

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ بغیر بولے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف چلا گیا۔ باہر آ کر دیکھتا ہوں کہ سب تیار ہیں۔ پھوپا کہہ رہے ہیں — جلدی کرو، جلدی۔" بوا کھڑی ہیں، منہ پر گھونگٹ ہے۔ کیا میری ہی راہ دیکھ رہی ہیں؟ میں نے پاس جا کر کہا "بوا کیا ہے؟" وہ جھپٹ کر میرے گلے لگ گئیں۔ بلند آواز سے رونے لگیں۔

پھوپا نے کہا "ریل کا وقت ہو گیا ہے۔ چلو چلو۔ کندھے سے لگے لگے ہی میں انہیں موٹر تک لے گیا۔ پھوپا نے بابو جی کو پرنام کیا اور موٹر میں جا بیٹھے۔ موٹر نے گھر گھر شروع کی۔ پھوپا نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا "آداب عرض ہے پرمود صاحب! میں خون کا سا گھونٹ پئے کھڑا رہا۔ میں اب سانس لوں گا۔ بہت کہہ چکا۔ میرا دل بڑا دکھی ہے یوں تو جب یہ شروع کی ہے تو پوری بھی کرنی ہو گی۔ جینا جب تک کہ ایک بار موت آ کر رہا نہ کر دے، جینا ہی رہتا ہے۔ بیچ میں رہائی کہاں۔

لیکن میں ذرا سانس لینا چاہتا ہوں۔

یہ جو کچھ اس دنیا میں ہو رہا ہے ویسا ہی کیوں ہو رہا ہے مختلف کیوں نہیں ہوتا۔ اس کا کیا جواب ہے؟ جواب ہو یا نہ ہو لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہی ہوتا ہے جو مقرر ہے، وہی ہوتا ہے جو لکھا ہوا ہے۔ ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا لکھنے والے نے جو لکھ دیا وہ نہ بدلے گا، بدلا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن وہ ہے کون جس کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ اس گتھی کو بھی تو سلجھانا چاہیئے۔

شاید نہیں۔ عقل مند کہہ گئے ہیں کہ وہ اس کائنات میں اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ نہ مانوں تو رہوں کیسے؟ چاہتا تھا کہ پکار کر کہوں کہ اے کرشمہ ساز! تیری کرشمہ سازیاں میری سمجھ سے باہر ہیں رونے بلکنے کی آواز چاروں طرف سے میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہی تھی۔

اے دنیا کے مالک! یہ سب کیا ہے۔؟ تیری پُر ملال حکومت میں یہ نالہ و فریاد کیسی؟ کرشمے تو دکھاتا ہے، نیرنگیاں تیری نظر آتی ہیں، اور جیتے مرتے ہم ہیں — کیوں جیتے ہیں، کیوں مرتے ہیں؟ ہماری کوشش کیا ہے، ہمارا ارادہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ پوچھے جاؤ! جواب کچھ نہیں — پھر وہ بھی خاموش زبان میں ہمیشہ ظاہر ہے۔ اندر بھی جواب ہے اور باہر بھی۔ جس کا جی چاہے پڑھ لے، سمجھ لے۔ جیسا سمجھ میں آئے ویسا ہی پڑھ لے، سمجھ لے۔

اپنے سوال کا وہ خود ہی جواب ہے۔

لیکن اُسے اب چھوڑیں بھی۔ کہیں وہ جو کہا جاتا ہے کہو کہ جو ہے کرم پھل ہے۔ میں آج جوانی اور بیکار عزت کے ٹیلے پر بیٹھا ہوں۔ یہ سب فریب ہے، چھلاوا ہے۔ دل کہاں ہے اس میں؟ سچی عزت کہاں ہے۔ لیکن یہی سب کچھ تو مجھے بلند کئے ہوئے ہے۔ نامور وکیل رہا، اب جج ہوں۔ لوگوں کو پھانسی دیتا اور جیل بھیجتا ہوں۔ سماج میں اثر ہے، عزت ہے۔ ان سب باتوں کے تحت چلو یہی کہو کہ یہ کرم پھل ہے۔ لیکن کوئی پوچھو تو دل جانتا ہے کہ یہ کیسا کرم کا پھل ہے؟

کامیاب وکالت اور ججی کے اس قد لمبے جسم جُثے میں کیا روح

سایہ بھی ہے؟ مجھے اس میں شک ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے اپنی کوئی کہانی شعوری طور پر کہی ہے تبھی کامیاب و مکمل افسانہ بن سکا ہوں۔ اس کہانی کو میں یہاں کیوں چھیڑ رہا ہوں، جب کبھی موقع ہوگا تب ہی کہوں گا۔

میرا دل خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ سماج کی دی ہوئی عزت کے جس مینار پہ پہنچ کر میں کھڑا ہوں، وہ کسی کی قربانی کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس پہ جتنا غور کرتا ہوں اتنا ہی دل خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگتا ہوں۔ لیکن کروں کیا! اس سماج کی ہو کھونے سے ہاتھ کیا آئے گا؟ تھوڑی ذلیل ہی ہوگی۔ ہاتھ آنے والا کچھ نہیں ہے۔

سوچتا ہوں اور رہ جاتا ہوں۔

لیکن کیوں؟ میں یہ نہیں جانتا کہ سب اپنے کو لوٹنا اور ٹھگنا ہے۔ سماج پہ پتھر جیسی چیزیں تو آتے دیکھ تو سکتا ہوں، بدل نہیں سکتا۔ اس کے بچنے پھولنے کی تو ایک ہی ترکیب ہے کہ میں اپنے خون سے اس کی بنیادیں سینچ دوں۔ جاہل رہ کر عالم بنوں۔ جھوٹا بن کر نام کمانے میں کیا رکھا ہے؟ آہ! ایسی ناموری بیکار ہے، فضول ہے۔ روح گنوا کر اگر دنیا کی دولت پائی تو کیا پائی۔ یہ تو لعل کو گنوا کر خزف ریزہ پانے سے بھی کم تر ہے۔

زندگی میں ایک ہی بات تو نہیں ہے۔ سیوں باتیں ہیں جو بار بار دل میں پلٹتی ہیں۔ ان کو قصداً نظر انداز بھی کیا جائے تو نہیں کیا جا سکتا۔ یہ میرے اندرون میں سلگتی رہتی ہیں اور کبھی کبھی ان سے ایک شعلہ بھڑکتا ہے جس کی روشنی میں دیکھ سکتا ہوں کہ سچائی کیا ہے؟ حقیقت کیا ہے؟ تب میری ہستی محض ایک چھلاوا معلوم ہوتی ہے، محض دھوکا معلوم ہوتی ہے۔ سچائی کو جھوٹا بننے میں ہے، بے نیاز بننے میں ہے، تو آملنے میں ہے۔ بہت کچھ دیکھا، بہت کچھ پڑھا ہے لیکن وہ سب جھوٹ ہے۔ سچ اتنا ہی ہے کہ مبارک ہے وہ انسان جو محبت کی آگ میں تپ کر زندگی کا عرفان پا جائے، گمراہ ہے وہ آدمی جو کبر و نخوت کے نشے میں چور زندگی کی پھونکوں پر چہکتا ہے۔

لیکن ان بے مقصد اور بے مطلب باتوں سے کیا فائدہ؟ اس طرح کچھ دیر کے لئے تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور قابل برداشت ہو جاتا ہے لیکن اس کا فیضان پہلے سے کہیں کم ہو جاتا ہے۔

میں سوچتا ہوں۔ کیا انسانی زندگی کی رفتار اندھی ہے؟ کیا اس کی کوئی سمت مقرر نہیں؟ اندھی ہے۔ یہ تو میں نہیں مانوں گا، بہتر متحرک اور رواں ضرور ہے۔ جوں جوں انسانی زندگی گزرتی جاتی ہے درد بوند بوند اکٹھا ہو کر اس کے رگ و پے میں سرایت کرتا جاتا ہے سب کچھ نچوڑ کے۔ یہی انسان کا جوہر ہے، اسی کی روشنی میں حیات انسانی کی راہ منور ہوگی۔ ورنہ چاروں طرف گھنا جنگل ہے جہاں کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اور انسان بھوک، پیاس، عزت، لالچ اور حسد کے دھندلکے میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ یہاں جاتا ہے وہاں جاتا ہے لیکن دراصل وہ کہیں بھی نہیں جاتا۔ کہیں نہیں جاتا۔ ایک ہی مقام پہ کولھو کا بیل بنا چکر کاٹتا رہتا ہے۔

اتنی عمر گزار کر، بہت سوں کو پیدا ہوتے اور بہت سوں کو مرتے دیکھ کر میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ یہ درد میری زندگی کا مقصد بن جائے۔ دھن نہ چاہوں، من چاہوں۔ دھن میل ہے اور من کا درد امرت۔ سچائی کی جگہ اور کہیں نہیں۔ اس درد کے وجود سے اعتراف اور احسان مندی سے حقیقت اور عرفان کی کرنیں پھوٹیں گی۔ اس کے علاوہ سب ڈھکوسلا ہے۔ سچائی صرف یہاں ہے۔ اگر اور کہیں سے آواز آئے کہ یہ ہے سچائی تو وہ کچھ بھی ہو سکتی ہے لیکن سچائی نہیں۔

ہونی کے لئے کسے قصوروار ٹھہرایا جائے۔ پیدا کرنے والے کو تو دوش نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس تک تو میں اپنی مبارک باد بھی نہیں پہنچا سکتا۔ دوش دوں بھی کیوں؟ دل اگر دوش دینا ہی چاہتا ہے تو پھر دوش اپنے آپ ہی کو کیوں نہ دوں ــــ میں یہ راز پا جاؤں کہ ہر ایک غم پیدا کرنے والے ہی نے دیا ہے۔ لیکن جو دنیا کی سختیوں کا بوجھ ہنستے کھیلتے برداشت کرکے چپ چاپ چلے جاتے ہیں، اور پھر وقت آنے پر اسی طرح ہنستے ہنستے دھرتی ماں کی گود میں سو جاتے ہیں، میں انھیں سلام کرتا ہوں۔ میں انھیں بدنصیب بھی کہوں گا، پاپی بھی کہہ لوں گا، لیکن میں انھیں سلام کرتا ہوں۔

ہوا کا جو حشر ہوا، اس پر میں کیا سوچوں؟ میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا شاید جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ اس لئے کہ اسے اب کسی طرح نہیں بدلا جا سکتا لیکن اتنا سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو محبت مجھے ان سے ملی تھی کیا وہ

اب بھی مل سکتی ہے؟

کیا اُس محبت کو بھولا جا سکتا ہے؟ کہاں محبت بذات خود اتنی پاکیزہ تھی ہے کہ جنت کے دروازے اس کے استقبال کے لئے کھل جائیں۔ میں نہیں جانتا۔ جنت، دوزخ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ قدرت کا نظام میری سمجھ سے بالا ہے۔ لیکن اتنا البتہ جانتا ہوں کہ اگر بے دل اور بے ضمیر نہ ہوتا تو اس کرسی عدالت پر متمکن نہ ہوتا۔

اُس دن کے بعد جب بُوا جمال گوٹا لینے کے باوجود بچیا ——— کے ساتھ چلی گئیں تو ایک عرصہ تک میں انہیں نہ دیکھ سکا۔ نویں جماعت سے دسویں میں آیا اور دسویں سے ایف۔ اے میں۔ یعنی کالج میں داخل ہو گیا اور پھر انٹرمیڈیٹ بھی پاس کر لیا۔ نیا ماحول ملا نئے دوست ملے۔ نظر میں گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی۔ زندگی کے ولولے اور خواہشیں منہ کھول کر واپس آئیں۔ بُوا کی یاد رفتہ رفتہ دھندلی ہو گئی۔ پہلے تو میں بے قرار ہو کر ان کی خیریت پتاجی اور ماں سے پوچھتا رہا۔ معلوم ہوتا رہا کہ خیریت ہیں، اچھی طرح سے ہیں۔ میں اپنے آپ سے پوچھتا رہ جاتا کہ یہ "بخیریت" اور "اچھی طرح سے" ہونا کیا ہوتا ہے۔ کیا بُوا واقعی خوش ہیں؟ اگر ہیں تو پھر میں خوش کیوں نہیں ہوں —؟ کچھ دن بعد پتہ چلا کہ ان کے ایک مری ہوئی لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ اور خود ان کی حالت بھی تقریباً مُردوں جیسی ہو گئی ہے۔ لیکن جیسے خدا رکھے، اسے کون چکھے۔ بُوا بھی بھاستا کی کرپا سے بچ گئیں۔ کرپا کہتے ہوئے کچھ جی رُکتا ہے پھر بھی اکرپا تو اسے نہیں کہا جا سکتا۔

ایک دن میں نے ماں سے پوچھا، "ماں! بُوا کا کچھ حال معلوم ہوا ہے؟ اب کی چھٹیوں میں میں ان کے پاس جاؤں گا۔" سُن کر ماں مجھے آنکھوں سے دیکھنے لگیں۔ بولیں، "کچھ نہیں۔"

میں نے پھر لجاجت سے کہا، "بتاؤ، بُوا کا کچھ حال معلوم ہوا؟"

ماں نے لاپرواہی کے ساتھ کہا، "نہیں۔"

میں نے پھر کہا، "معلوم ہوا ہے؟"

بولیں، "نہیں معلوم ہوا، نہیں معلوم ہوا، کیوں میری جان کھائے جا رہا ہے؟"

میں نے کہا، "کیا بات ہے؟ بتلاتی کیوں نہیں ہو؟"

بولیں، "بات! ارے کہہ تو دیا کہ بات کچھ بھی نہیں — وہ اچھی ہی ہو گی اور کیا —؟ پڑھنا لکھنا کچھ نہیں، جب دیکھو بُوا، مر گئی تیری بُوا — خبردار جواب بُوا کی بات مجھ سے کی۔"

میں سکتے میں رہ گیا، پوچھا، "کیوں؟ کیا ہے —؟"

کہنے لگیں، "کچھ نہیں، چل جا اپنا سبق دیکھ۔"

کسی طرح ماں سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ وہ بکھری بکھری سی رہتی تھیں۔ بابوجی سے پوچھا وہ بھی جواب میں خاموش رہ گئے۔

بابوجی آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے، بولے، "کس نے کہا —؟"

"کسی نے بھی کہا، آپ سچ سچ بتلائیے — کیا مر گئی ہیں —؟"

"نہیں تو!"

"تو کیا بات ہے —؟"

"بات کچھ نہیں ہے۔"

مدت گذر گئی۔ یہ معمہ میری سمجھ سے باہر رہا۔ اب بُوا کا ذکر گھر میں ممنوع ہو گیا تھا۔ ان کا نام آتا تو سب چپ رہ جاتے۔ پتاجی میں ایک خاص قسم کی تبدیلی ہوئی تھی۔ وہ کچھ سنجیدہ، کچھ غمگین ہو چلے تھے۔ ماں چڑچڑی ہوتی جاتی تھیں۔

بہت دنوں بعد جو کچھ مجھے معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ بُوا کو ان کے پتی نے چھوڑ دیا۔ بُوا کا چال چلن خراب ہے اور پھوپھا کو معلوم ہوا ہے کہ ان کا چال چلن ہمیشہ سے خراب ہے۔ "چھوڑ دیا ہے" کا مطلب ٹھیک میری سمجھ میں نہ آیا۔ کہاں چھوڑ دیا ہے؟ کہاں چلی گئی ہیں وہ؟ یا کسی الگ جگہ انہیں رکھ دیا گیا ہے۔ یا اُسی گھر میں ہیں اور پھوپھا سے ان کا تعلق ختم ہو گیا ہے —؟ معلوم ہوا کہ اسی شہر میں انہیں ایک علیحدہ چھوٹے سے گھر میں رکھ دیا گیا ہے۔ کوٹھری ہے بس۔ وہاں چاہے جیسے رہیں، چاہے جیسا کھائیں پئیں۔ کہاں سے رہیں اور کیا کھائیں پئیں اس کا بھی پتہ چلا کہ پھوپھا نے اُن سے کہا تھا کہ میکے چلی جاؤ لیکن بُوا ہی اس پر راضی نہ ہوئیں۔ دھمکایا گیا، مارا پیٹا گیا لیکن انہیں مرنا منظور تھا، ہمارے یہاں آنا منظور نہ تھا۔ تب خود پھوپھا نے انہیں الگ گھر میں چھوڑ دیا ہے۔

یہ سب کچھ میں نے یوں سُنا جیسے کہانی سُن رہا ہوں۔ پھر ایک عجیب سا خلفشار اور ہیجان میرے ذہن میں پیدا ہو گیا، لیکن جلد ہی ہیجان ٹھنڈا پڑ گیا اور زندگی پھر رفتہ رفتہ اُسی ڈھرّے پر آ گئی — میں نے اس کہانی کو قبول کر لیا۔

زندگی رواں دواں ہے۔ کہاں کس کا انتظار کرتا ہے؟ مرنے
والے مر جاتے ہیں، لیکن جینا ہے جنھیں، وہ تو مُردوں کو لے کر
نہیں مر سکتے۔ مرنے کے ساتھ کوئی مرتا ہے؟ یہ تو چکر ہے۔ آنے
جانے کے لیے سوچا اور پھر شہ۔ بس چلے چلو۔ اس چل چلاؤ
میں مجھے یکایک معلوم ہوا کہ بُوا اس جگہ نہیں ہیں۔ فلاں شہر
چلی گئی ہیں جو کوئلے والا ایک بنیا ساتھ ہے۔ وہ "فلاں" شہر
جہاں ہم رہتے تھے اُس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بُوا نے بھی
اسکا ایک گوشہ آباد کر دیا ہوگا۔ یہ بات بڑی تعجب اور نا ممکن معلوم
ہوئی۔

اس کے تھوڑے دن بعد پتاجی کا انتقال ہو گیا۔ ہم لوگ ذرا
جھکے جھکے رہنے لگے کیونکہ ماں بڑی سوجھ وچار والی عورت تھیں
دولت مند خاندان سے بچتیں اور مجھ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کیے
ہوئے تھیں۔ اس اثنا میں میں نے ایف۔ اے پاس کر لیا تھا اور
تھرڈ ایئر میں پہنچ گیا تھا۔ یونیورسٹی جاتے ہوئے اُس شہر کا بورڈ دیکھا کر دل
میں طرح طرح کے جذبات موجیں مارنے لگے۔ پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ اب تو
واپسی میں یہاں اُتروں گا، بُوا کو ڈھونڈ نکالوں گا اور کہوں گا، بُوا
— یہ تمہارا کیا حال ہے؟ چلو، یہاں سے چلو۔"
ماں نے لکھ بھیجا تھا کہ چھٹی ہوتے ہی گھر چلے آؤ۔ بات یہ تھی کہ
میرے بیاہ کے سوت کو اٹھا کر ماں اس برس کی تھانت دینا چاہتی تھیں
لیکن لوٹتے میں راستے کے اس اسٹیشن پر بغیر اُترے نہ رہا گیا۔ اور میں نے
بُوا کو ڈھونڈھ ہی نکالا۔

شہر کے اس محلے میں جاتے ہوئے میرا دل کسی ان جانے ڈر
ان دیکھے بوجھ تلے دبا جاتا تھا۔ کہاں بُوا؟ اور کہاں یہ زندگی؟ وہاں نیچے
درجے کے لوگ رہتے تھے۔ گلی میں اندر جا کر بُوا کی کوٹھری تھی۔ سامنے ہی باہر
ایک دکان کرلی تھی اور دن میں وہاں کوئلے کا بیوپار کرتا تھا۔ میں کوٹھری
کے دروازے پر پہلے تو ٹھٹھکا، پھر ہمت کر کے اندر داخل ہو ہی گیا۔
وہ بُوا ہی تھیں — کیا وہی ہیں؟ لیکن وہی تھیں۔ ایک دھوتی
سے بدن ڈھانپے کوئلے کی آنچ پر روٹی سینک رہی تھیں۔
کسی کو آتے دیکھ، انھوں نے جھٹ ماتھے کے آگے آنچل کھینچ لیا
لیکن جب غور کیا اور مجھے دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئیں۔ پہچانا نہیں؟
یا پہچان لیا؟ میرے پیر جیسے زمین میں گڑ گئے۔ میں اپنے آپ پر لعنت
کرنے لگا۔ کیوں آیا یہاں۔ کیوں آیا؟ تاثیر ایسی نگاہ میں ایسی کچھ
کچھ دیر کے بعد انھوں نے اپنی نظریں پھر انگیٹھی پر جما لیں اور
روٹی پکانے لگیں۔

تھیں بُوا ہی — لیکن ان کا یہ کیا روپ تھا۔ جسم بھر گیا تھا
منہ ستا کر نکل آیا تھا۔ یہ سب اندر چلا ہی اس بات کا اشارہ
تھا کہ وہ پھر حاملہ تھیں۔ پورا جسم ایک دھوتی میں چھپائے بیٹھی تھیں
چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ کوٹھری کوئی
بارہ مربع فٹ ہوگی۔ باہر تھوڑی سی کھلی جگہ تھی، جہاں دھوتی والا گھوچے
کھو رہے تھے۔ اندر کمرے میں کھونٹی پہ میلے کچیلے کپڑے تتر بتر پڑے تھے
انکے پاس کچھ بکس تھے۔ اوپر ایک بانس لگا ہوا تھا جس پر کسی قدر
اچھے کپڑے پڑے تھے۔ بُوا کی پشت کے پیچھے کچھ زنگ خوردہ کنستر
رکھے تھے۔ برتن اور دو تین ٹین کے ڈبے رکھے ہوئے تھے پاس ہی
کچھ پتیلیاں اور المونیم کے برتن، ایک ٹین کی بالٹی، اور ایک پانی کا گھڑا رکھا
تھا۔ کونے میں ایک کوئلے کی بوری آدھی جھکی ہوئی کھڑی تھی۔

میں یہ سب کچھ اس طرح دیکھ رہا تھا کہ جیسے یہ چیزیں اس سے
پہلے کبھی نہ دیکھی ہوں۔ جیسے کوئی عجوبہ دیکھ رہا ہوں — میں دیکھتا
رہا، بُوا خاموش روٹی پکانے میں لگی رہیں۔
میں نے کہا، "میں پرمود ہوں، بُوا — !"
وہ کچھ نہ بولیں۔
میں بھی چپ ہو رہا۔
پھر کچھ دیر بعد بولا، "میں جاؤں؟"
اس بار بھی انھوں نے نہ نظر اُٹھائی، نہ لب ہلایا۔
لیکن مجھ سے جایا بھی نہ گیا — پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ میرے
منہ سے دفعتاً نکلا، "لو — ! نہیں جاتا — لیکن کچھ بیٹھنے کو دو تو
جب ہی آ بیٹھوں۔"
میں سوچ رہا تھا کہ اب تو انھیں بولنا ہی پڑے گا۔ لیکن
وہ اب بھی خاموش رہیں۔ اتنے میں باہر سے کسی کے پیروں کی
چاپ سنائی دی اور آواز آئی:-
روٹی پک گئی —؟ اور دوسرے لمحے ایک آدمی ایک دم اندر داخل
اور مجھے دیکھ کر مبہوت سا کھڑا رہ گیا۔
بُوا نے انگیٹھی پر نظریں جمائے ہوئے کہا، "سُنتے ہو! ان سے

کہہ دو کہ جائیں۔ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

اُس آدمی کا تعجب پہلے سے اور زیادہ ہو گیا۔ وہ بار بار مجھے اُوپر سے نیچے تک گھورنے لگا۔ اس وقت مجھے غلطی کا احساس ہوا اور غصہ آیا کہ چلتے وقت کوٹ، پتلون اور ٹائی، ہیٹ کیوں پہن آیا۔ وہ شخص ابھی تک مجھے بدستور حیرت اور استعجاب سے گھور رہا تھا۔ جسم پر کپڑے کلستے ہوئے محسوس ہوئے۔

میں نے کہا، "بوا، سچ بچ جاؤں؟"

بوا نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے کہا، "تو تو میں جاتا ہوں لیکن کل سے مجھے کچھ بھی کھانے کو نہیں ملا ہے۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔ یہ سچی بات ہے بوا۔"

یہ کہہ کر میں چلنے کے لئے مڑا۔

بوا نے بغیر کسی طرف دیکھے کہا، "سنتے ہو، کھڑے کیا ہو، باہر جا کر چار پیسے کا دہی لے آؤ — اور پورا بھی لیتے آنا۔"

وہ شخص بغیر کسی تامل کے باہر چلا گیا۔

میں نے اپنے بوٹوں کے تسمے کھولے اور بے تکلفی سے ان کپڑوں پر جا بیٹھا جو ایک کونے میں پڑے تھے۔ میں بوا کے بالکل مقابل تھا میں نے کہا، "سچ جاننا بوا، میں کل کا بھوکا ہوں۔"

بوا نے اب آنکھ اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُف آنکھوں میں کیا تھا؟ بولیں، "آپ یہاں کھائیں گے؟"

میں نے کہا، "میں آپ ہی سہی! لیکن میں بھوکا ہوں۔ نہیں کیسے کھاؤں گا۔"

بوا نیچے دیکھنے لگیں۔ انھوں نے انگیٹھی پر سے توا اُتارا اور روٹی سینکنے لگیں۔ روٹی پھول گئی۔ وہ اسے ادھر اُدھر کر کے سینکتی رہیں، بولیں کچھ نہیں — روٹی سینک کر الگ رکھ دی۔ توا پھر انگیٹھی پر رکھ دیا اور پھر . . . .

مجھے محسوس ہوا کہ ان کی آنکھیں ایک دم اُوپر نہیں اُٹھتیں — مجھے اس پر بڑی تکلیف سی ہوئی۔ چاہتا تھا کہ انھیں جتلا دوں کہ میں پرمود ہوں، پرمود — بوا سنو تو، دیکھو تو میں وہی پرمود ہوں۔ اور تم بھی تو بوا، وہی بوا ہو۔

کیا نہیں —؟

میں نے کہا، "بوا!"

اُنھوں نے سن لیا۔

میں نے کہا، "بابو جی تو چلے گئے بوا۔ تمہاری یاد میں دل میں لئے چلے گئے۔ بتاؤ میرے اب کون ہے؟ ایک ماں اور دوسری تم!"

بوا خاموش بیٹھی رہیں۔ اور کچھ نہ بولیں۔

دل میں آیا کہ کھل کر ان کے سامنے بچھ جاؤں تاکہ بوا کچھ کہیں تو لوں کیوں مجھے سزا دے رہی ہیں۔

میں نے کہا، "بی۔ اے میں پڑھ رہا ہوں، بوا — ابھی یونیورسٹی سے آ رہا ہوں۔ ماں بیاہ کی بات کر رہی ہیں سنتی ہو نا؟ ماں اسی سال بیاہ کرنا چاہتی ہیں، لیکن میں نہیں چاہتا۔ جب تک بی۔ اے پاس کر لوں، تب تک اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ کیوں ٹھیک ہے نا، بوا؟ تم مت بولو، لیکن میں تمہیں بتلائے دیتا ہوں کہ میں ابھی بیاہ نہیں کروں گا۔ لیکن ماں سے میرے دل کی بات کہنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ مجھے دبا لیتی ہیں۔ بوا اگر میرے ساتھ زبردستی ہوئی تو ذمہ دار تم ہو گی۔ میں اور کچھ نہیں جانتا۔"

میں نے دیکھا کہ بوا کے ہاتھ بیلن پر دھیمے ہوتے ہوتے بالکل رُک گئے۔ اور توے پر روٹی پھول کر اب جلنے کا انتباہ دے رہی ہے

اتنے میں دروازے پر کچھ آہٹ ہوئی۔ بوا جیسے چونک کر باخبر ہو گئیں۔ اور چکلے پر پڑی ہوئی روٹی پھر قاعدے سے بیلنے لگیں۔ اتنے میں وہ شخص اندر آیا اور دہی اور بورا بوا کے پاس رکھ دیا۔

بوا نے کہا، "ابھی دکان پر بیٹھو — منا کھانے کے لئے تھوڑی دیر میں آتا ہے۔"

وہ شخص مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

بوا نے آنکھ اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولیں، "لو آؤ۔"

میں نے کہا، "پہلے تیار کر لو، پھر اطمینان سے کھاؤں گا۔"

بوا نے کہا، "نہیں! تم بیٹھو۔"

میں نے کہا، "میرے ساتھ نہیں بیٹھو گی؟"

"نہیں"

"کب کھاؤ گی؟"

"بعد میں کھاؤں گی۔"

میں نے کہا "تم بعد میں کب کھاؤ گی، ابھی نہ کھاؤ؟"

"نہیں کھاکر کھاؤں گی؟"

میں نے موفسے اُتار کے کوٹ اتار کر بانس پہ ٹانگ دیا۔ ملی اُٹھائی اور ایک لمحے سوچتا رہا کہ کہاں کیسے بیٹھوں۔

وہاں سے ایک دری لے لو نا اور یہاں بچھا کر بیٹھ جاؤ۔"

میں نے دری لی اور ٹاٹ سے ہٹ کر جگہ بچھا کر بیٹھ گیا۔

کھانے وقت بُوا سے پوچھا "ماں اچھی ہیں؟"

"اچھی ہیں"

"یہاں کہاں ٹھہرے ہو؟"

"اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں سامان پڑا ہے۔"

"کل ہی آئے ہو؟"

"کل ہی آیا۔"

"یہاں کا پتہ کس نے دیا؟"

"لگ گیا۔"

"کب جاؤ گے؟"

"جب تم چلو گی؟"

یہ سننا تھا کہ جیسے انہیں بجلی نے چھو لیا۔ چہرہ فق ہو گیا جیسے خون منجمد ہو گیا ہو۔ نگاہیں نیچی کر لیں اور کچھ نہ بولیں۔ میں بھی چپ ہو رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا "چلو گی نہیں؟"

بُوا نے قدرے دُرشتی سے کہا "کہاں؟"

میں نے کہا "کہاں کیا؟ گھر۔!"

بُوا نے اُسی دُرشتی سے کہا "کس نے کہا ہے؟"

"میں تو کہہ رہا ہوں!"

یہ سُن کر گویا انہیں کچھ تسلی ہو گئی۔ چہرے کی کڑواہٹ اور درشتی کچھ کم ہو گئی۔ بولیں، "پہلے شادی تو کر لو۔ تب گھر بنے گا۔ اور اس وقت کہنے آؤ گے، تب میرے سننے کا بھی وقت ہو گا۔"

میں نے زور سے کہا "میرا گھر نہیں ہے تو کس کا ہے؟"

وہ بدستور خاموشی سے مجھے تکتی رہیں۔ میں نے پوچھا "تو نہیں چلو گی؟"

وہ اس پر کچھ مسکرائیں اور بولیں، "تم تو کہتے تھے کہ بی۔ اے میں پڑھتا ہوں لیکن میرا خیال ہے تم نے ابھی تک کچھ نہیں سیکھا۔"

میں نے کہا۔ "اچھا یوں ہی سہی لیکن تمہیں گھر لے کے جاؤں گا۔"

بُوا نے کہا "اچھا پہلے کھا تو لو، پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

میں نے کہا "تمہیں پتہ نہیں بیس برس کا ہو گیا ہوں۔ بالغ ہوں گھر کا مالک میں ہوں۔ ماں میری ہے۔ میں تمہیں یہاں کیسے رہنے دوں گا۔"

بُوا بولیں "تو ضرور لے چلے گا؟"

"ضرور لے چلوں گا۔"

وہ ایک لمحے کے لئے رُکیں۔

"ضرور لے چلے گا تو سُن ۔۔۔ میں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جا سکتی۔ تم مجھے نہیں جانتے۔ میں بی بی کے گھر کو چھوڑ کر آ گئی ہوں۔ بی بی موجود ہیں لیکن دوسرے کے سہارے رہ رہی ہوں۔ تم نہ سمجھو لیکن میں تو سمجھتی ہوں۔ تم اپنی آنکھیں بند کر لو لیکن جو سلطانہ بی بی کے نکل جانے کو نہیں کہہ سکتے۔ پھر جس کو ساتھ لے کر بی بی کو چھوڑ آئی ہوں، انہیں میں چھوڑ دوں؟ انہوں نے کون سی قربانی نہیں دی میرے لئے۔؟

انھوں نے تو مجھے دوسری زندگی دی ہے۔ میں مر سکتی تھی لیکن۔ یہ نہیں مرنے کو میں انسانیت کے خلاف سمجھ کر ہی نکل سکی۔ جس کے سہارے میں موت کے منہ سے بچی، اُسی سے الگ ہو جاؤں۔؟ میں الگ نہیں ہو سکتی۔ پاپن ہو سکتی ہوں لیکن احسان فراموش نہیں ہو سکتی۔ نہیں بد مود تم سب لوگ کیوں نہیں سمجھ لیتے کہ میں مر گئی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ اس قسم کی باتیں میں نے پہلی بار بُوا کے منہ سے سُنی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اندرونی طاقت انھیں قائم رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ آدھ مری تو تھیں ہی۔

میں نے کھانا کھایا۔ بُوا نے بھی اپنا چولھے کا کام ختم کر لیا تھا۔ وہ میرے برتن اٹھا کر مجھ سے کہنے لگیں، "سنو ابھی تو نہیں جا رہے ہو؟"

"ابھی تو نہیں۔"

"تو ایک کام کرو۔ باہر کی دکان پر جا کر انھیں کھانے کے لئے بھیج دو۔ تم اتنے پانچ منٹ وہاں بیٹھنا۔ پھر یہاں آ کے آرام کرنا ہو سکے تو دوپہر بیتے جانا۔"

میں نے باہر آ کر اُس شخص سے کھانے کے لئے کہہ دیا۔ میں خود سوچنے لگا کہ اس کوئلے کی دکان پر کیسے بیٹھوں؟ ایک ٹاٹ تھا جس

پر چورا کیونکہ بڑا اشتا۔ اس چورے پر مجھ سے نہیں بیٹھا گیا۔ میں دکان کے آگے ٹہلنے لگا۔

عجیب و غریب محلہ تھا۔ دن وہاں شاید ہی نکلتا ہو، دن میں رات معلوم ہوتی تھی، رات میں کیا ہوگا، کچھ پتہ نہیں۔ کوٹھریاں ایک دوسرے سے اتنی ملی ہوئی تھیں کہ ایک دوسری میں گھستی معلوم ہوتی تھیں۔ پھر یہ کوٹھریاں ہی دکانیں بھی تھیں اور رات کو باپ کے اڈے بھی۔ کسی پہ پیٹ ڈھانے کی سستی چیزیں تھیں تو کسی پر باسی سنبل اور خشک دبے رَس بھل رکھے تھے۔ کہیں نائی بیٹھا ہوا استرے پر دھار لگا رہا ہے، کہیں درزی بیٹھا سلائی کی مشین پر انگریزی وضع کے کپڑے سی رہا ہے۔ یہاں آسمان بھی ایک گلی معلوم ہوتا ہے۔ وقت کا شمار راتوں کے حساب سے ہوتا ہے۔

میں بی۔ اے کا طالب علم پتلون پر صرف قمیض اور قمیض پر ٹائی لگائے اس دکان کے آگے چکر لگاتا رہا اور بغیر سوچے بھی بوا اور اس ماحول کے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

اتنے میں وہ شخص آیا اور بولا کہ بُوا مجھے بلا رہی ہیں۔

میں چلنے لگا۔ یکایک اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے روک کر کہا، "ایک منٹ، بس ایک منٹ۔" یہ کہہ کر مجھے وہیں چھوڑ وہ آگے لپک گیا۔ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا پان تھا، اُسے سامنے کر کے بولا، "لیجئے۔"

میں نے پان لے لیا۔ پوچھا، "تمباکو؟" میں نے کہا، "جی نہیں اور کچھ نہیں چاہیے۔"

وہ شاید مجھے بالکل بے تکلف دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنی بنڈی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈبیا نکالی اور کہا، "بنارسی تمباکو ہے، بابو!"

میں نے کہا، "میں....."

"!..... روپے سیر والا ہے، بابو! بنارسی دکان کا۔"

مجھے یاد نہیں رہا کہ وہ تمباکو کتنے روپے سیر تھا۔ ضرور وہ تمباکو اعلیٰ درجے کا ہی ہوگا۔ اپنی مجبوری پر میں شرمندہ ہو گیا۔ میں نے کہا، "جی..... میں....."

وہ شخص ہمدردی سے میری مجبوری پر ہنس دیا۔ "ہیں، ہیں، ہیں۔"

میں چلا آیا۔

آ کر دیکھا کہ کپڑوں کا ڈھیر اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا ہے۔ الگ از کرنے کے لئے نیچے کئی کپڑے ڈال کر بُوا اُوپر ایک نئی چادر بچھا رہی ہیں۔ مجھے آتے دیکھ کر بولیں، "آؤ، اب ذرا آرام کر لو۔"

میں نے پوچھا، "تم نے کھانا کھا لیا؟"

"ابھی کھاتی ہوں۔"

"تو کھا لو۔"

"بس کھاتی ہوں — تم یہاں بیٹھو تو۔"

میں بچھی ہوئی چادر پر آ بیٹھا۔ انھوں نے دو دو ہی دو تکیے میرے سامنے پھینک دئے اور کہا، "لیٹ جاؤ نا۔"

میں نے کہا، "لیٹ جاؤں گا۔"

اس پر بغیر کچھ کہے وہ جھوٹی تھالی مانجھنے لگیں۔ مانجھنے کے بعد اس میں کھانا نکال کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں، "آؤ، میرا ساتھ دو گے؟"

میں نے کہا، "میرا ساتھ تو تم نے دیا نہیں۔"

بولیں، "اب تم ساتھ نہیں دے سکتے۔"

میں نے کہا، "دیکھ لیا بُوا، تم میرا ساتھ نہیں چاہتیں۔"

"تمہارے ساتھ کھلاؤں میرا کیا منہ؟" کہہ کر تھالی اُٹھائی اور کونے میں چلی گئیں۔ کھا پی کر اسی وقت برتن مانجھنے لگیں۔

میں نے کہا، "یہ بعد میں نہیں ہو سکتا۔"

بولیں، "ابھی دو منٹ میں ہوا جاتا ہے۔"

میں نے اِدھر سے آنکھیں پھیر لیں، ایک تکیہ دبا کر وہیں کے پڑ رہا۔ اس وقت مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ آنے والا کل آج سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ بلکہ کل ہی کو سرے سے بھول گیا۔ یہ حالت کچھ دیر بعد اتنی بحرانی ہوگئی کہ مجھے قصداً اسے بدلنا ہی پڑا۔ ورنہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ میں بھی یہیں کا، اسی محلے کا ایک فرد ہوں — کہاں میرا کالج؟ کہاں شادی کی بات چیت؟ کہاں ماں اور میری زندگی کے فیصلے کیا واقعی اُن کا وجود ہے؟ نہیں، سب دھوکا ہے۔ مستقبل بے معنی لفظ ہے۔ جو کچھ ہے، بس وہی ہے۔ اور وہ بھی وقت کا اسیر۔ محسوس ہوتا تھا کہ باہمی گفتگو، بحث و تمحیص اور اختلاف رائے کے لئے کوئی موضوع باقی نہ رہا تھا۔ سب کچھ ایک خلا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا

ہم سفر کا وہاں ہونا بھی اس سب ٹھیک "ہی کا ایک جزو تھا
ماضی، حال اور مستقبل کی حدیں ٹوٹ سی گئیں تھیں، اس تثلیث سے
اب صرف ایک حال ہی بنتا تھا—
(نانی) امی — اور انہی کے اشارے پر میں یہاں چلا آیا ہوں۔
اس بیداری کے خواب میں آواز آئی — "سو گئے؟"
کروٹ لے کر دیکھا تو بُوا میرے پاس زمین پر بیٹھی تھیں۔ "نیند
نہیں آئی کیا"؟
انھوں نے پھر پوچھا۔
"نہیں تو۔"
"نہیں آئی تو اب ذرا آنکھ لگا لو۔"
"تمھیں اب کچھ اور کام ہے؟"
"کام — ؟"
"ہاں کچھ اور کام نہ ہو تو —!"
"کام کی تو کمی نہیں ہے — لیکن وہ دیکھا جائیگا۔ پر تم"
"بُوا! تم یہیں بیٹھو — آج کام دام رہنے بھی دو۔"
"چھوڑ تو دیا ہے اور بیٹھی بھی ہوں۔"
میرے ذہن میں اس وقت بہت سے سوالات اُبھر
آئے — آج بُوا جس حالت میں ہیں اُس کی ذمہ دار وہ نہیں
ہیں — دل یہ بات مانتا ہی نہیں — انکی زبوں حالی نے مجھے
مجسم ترس، رحم اور رقت بنا دیا تھا لیکن باوجود کوشش کے
بھی یہ نہ ہو سکا کہ اُن سے ہمدردی کا اظہار کروں۔ اس گومگو کی حالت
میں میرے منہ سے اچانک نکل گیا!
"بُوا — !"
بولیں "کہو — کہو۔"
میں نے قدرے جھجک کر کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا یہ جگہ
اچھی ہے یا بُری؟"
"کون کہتا ہے جگہ اچھی ہے — لیکن جگہ تو ہے۔ کبھی کبھی
جگہ کا سوال ہی بہت بڑا ہوتا ہے۔ صاف صاف کہو نا بیٹا، جو
کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟"
یہ کہہ کر انھوں نے نہ جانے کس انداز سے مجھے دیکھا — یہ انداز مجھے
اچھا نہ لگا۔

میں نے کہا "تم یہیں رہوگی، اسی جگہ؟ کب تک رہوگی — ؟"
"میں تو اسی جگہ ہوں — اس کوٹھری میں میں نہ رہوں گی اور کوئی
رہے گا۔ یہ کوٹھریاں تو آباد رہینگی ان میں رہنے والی آدمی بہت ہیں۔
آگے کا حال میں نہیں جانتی — کچھ ایسا لگتا ہے کہ زیادہ دن یہاں نہ
رہ پاؤں گی۔"
"کہاں جاؤ گی — ؟"
"کون جانتا ہے — ؟"
"کیوں جاؤ گی — ؟"
"تمہیں خبر — وہ آدمی جس کے ساتھ میں یہاں رہتی ہوں زیادہ
دن یہاں نہیں رہ سکے گا۔ میں جانتی ہوں ایک دن چھوڑ کر چلا جائے گا
تب ہی اس کوٹھری سے میرا نکلنے کا دن ہوگا۔"
وہ جس تحمل اور بے نیازی انداز سے بات چیت کر رہی تھیں،
میں اسکی تاب نہ لاکر دبا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "پھر کیا کروگی — ؟"
"میں کیا کروں گی — ؟ میں ابھی سے کیسے بتادوں؟ کوشش بھی کروں
تو کچھ نہیں بتا سکی۔ لیکن ایک بات کہہ سکتی ہوں . . . ."
یہاں جیسے اُن کی آواز کو ندرت کسی نے دبا دیا — وہ ٹکٹکی باندھ
کر مجھے دیکھتی رہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا — ؟"
"طوائف کا پیشہ نہیں کرونگی، اس بات کا یقین رکھو۔"
یہ میرے لئے بہت تھا۔ میں کچھ خوف زدہ اور حیرت زدہ سا ہوگیا
... جس کو تن دے دیا جائے اُس سے پیسہ کیسے لیا جا سکتا ہے میری
سمجھ میں نہیں آتا — تن دینے کی ضرورت تو سمجھ میں آتی ہے۔ تن
دے سکوں گی، شاید وقت ایسا کرنا ضروری بنادے — لیکن لینا کیسا؟
دان عورت کا فرض ہے — اور فرض ہی کیا ہے؟ اس سے من مانگا
جاتا ہے، تن مانگا جاتا ہے۔ نیک چلنی یہی تو ہے۔ لیکن بکری؟
نہیں نہیں، یہ نہ ہوگا —"
اگرچہ کہہ وہ مجھ سے رہی تھیں، لیکن ایسا معلوم نہ ہوتا تھا
وہ تو اپنے باغی اور سرکش خیالات کو ظاہر کرکے خود ہی لاجواب کر رہی
تھیں — میں نے کہا "بُوا ناراض نہ ہونا — میں پوچھتا ہوں ایسی تم
کیوں ہوگئی ہو — ؟ بستی کو کیوں چھوڑ آئیں"؟
بُوا نے ٹکٹکی باندھ کر کہا "میں تم ناراض ہونگی — ؟ یہ ہو سکتا ہے
بستی کو میں نے نہیں چھوڑا — انھوں نے مجھے چھوڑا ہے — میں تو یہی

مانتی ہوں کہ عورت کا مذہب ہے شوہر کی فرماں برداری۔ عورت کا دھرم اپنے پتی کے دھرم سے کیسے الگ ہو سکتا ہے؟

شوہر کی فرماں بردار بیوی یہ کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ شوہر نہ چاہے اور وہ پھر بھی اُس پر لوجھ بنی رہے۔ یہ جان کر کہ وہ مجھے نہیں چاہتے میں انکی آنکھوں سے دور ہو گئی۔ انھوں نے کہا میں تیرا پتی نہیں ہوں۔ تو پھر میں کیوں انھیں ایذا پہنچاتی۔ شوہر پرست بیوی بھلا یہ کیسے کر سکتی ہے؟!

"نُوا! یہ سب تم کیا کہہ رہی ہو۔؟ یہ سب کیوں ہوا۔؟"

"کیوں ہوا، یہی تو تمھیں بتاتی ہوں —— بیاہ کے بعد میں نے بہت سوچا۔ سوچ کر میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ میں دھوکا نہیں دے سکتی۔ دھوکا پاپ ہے۔ جو ہوا سو ہوا۔ بیاہتا عورت کا تو پتی ہی سب کچھ ہے۔ سب بعد کی باتیں ہیں، پتی کے لئے سچا ہونا پہلی بڑی چیز ہے۔ سچا بن کر ہی قربانی دی جا سکتی ہے۔ پرمود، شیلا کے بیاہ کو تم جانتے ہو؟"

اس اچانک سوال نے مجھے پھر حیرت میں ڈال دیا۔

ان کا ایک خط آیا تھا۔ کوئی خاص بات تو نہ لکھی تھی یہی لکھا تھا کہ میں اب سول سرجن ہو گیا ہوں۔ شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے، اور نہ ہی کرنے کا خیال ہے۔ تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ تم خوش رہو۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور یاد کرنا۔ اس خط کو پڑھتے ہی ذہن میں خیالات کی چکی چلنے لگی تھی۔ میں نے جواب دیا تھا کہ آپ کے خط کے لئے احسان مند ہوں، لیکن آئندہ کوئی خط نہ بھیجئے۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ خوش رہوں۔ جواب دینے سے پہلے دونوں خطوں کا ذکر تمہارے پھوپا سے کر دینا ضروری تھا۔ سن کر بولے کہ مجھ سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر مجھ سے شادی کیوں کی؟ پھر کہا کہ میں حرام زادہ کا ہوں —— میں نے کوئی چوں چرا نہ کی۔ اُس دن سے تمہارے پھوپا مجھ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ مجھے ناراض ہونے کا کیا حق تھا۔؟

انھوں نے میری پروا کرنی چھوڑ دی۔ میں اسی قابل تھی پھر، لاپرواہی کے متعلق پوچھنے کا حق کیا تھا مجھے۔ گھر کا کام کاج شروع کر دیا تھا، جو کچھ اس سے مل جاتا، اسی سے پیٹ بھر کر پڑ رہتی تھی —— لیکن اس پر بھی میں اُن کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی۔ اداس کی وجہ بھی مجھ سے چھپی نہ رہی کہ میرا وجود کیوں انھیں ناگوار تھا، اور ایک روز میں نے اُن سے کہہ دیا کہ آپ چاہیں تو مجھ کو گھر سے دور کر سکتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا، جاؤ اپنے میکے چلی جاؤ —— میں نے کہا کہ وہاں سے تو ہمیشہ کے لئے آ چکی۔ آپ کی یہی خوشی ہو تو بھی وہاں جا سکتی ہوں۔ آپ کو ناراض کر کے وہاں جانا میرا دھرم نہیں۔ بولے، پھر جو چاہے کر جہاں چاہے جا۔ میں نے پوچھا، کہاں جاؤں، کیا کروں۔؟

اُنھوں نے کہا، جان مت کھا، دور ہو جا —— کچھ دن یونہی بیت گئے میں انکے راستے کا پتھر تھی۔ ایک دن انہوں نے اچانک کہا، چل نکل یہاں سے میں نے حکم عدولی کی ضد نہ کی۔ شہر سے دور ایک اکیلی کوٹھری میں لا کر وہ خود ہی چھوڑ گئے۔ ساتھ ہی ضروری سامان بھی، خود سے لا کر دے دیا۔ یہ ہے کل کہانی۔"

میں نُوا کی طرف دیکھتا رہا۔ انکا چہرہ ہر قسم کے تغیر سے عاری تھا۔ میں حیران تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا نُوا کو اس کی شکایت نہیں ہے۔ میں نے بے تاب ہو کر کہا، "تم گھر کیوں نہیں آ جائیں نُوا، اس آدمی کے ساتھ یہاں رہنے کیوں آ گئیں۔؟"

بولیں، "پرمود، میں تجھے کیسے بتاؤں، میں گھر نہیں آ سکتی تھی ایک بار گھر آ کر میں سمجھ گئی تھی کہ اب میکے جانا ٹھیک نہیں ہے عورت جب تک سسرال کی ہے تبھی تک میکے کی ہے۔ سسرال سے ٹوٹی تو میکے کا رشتہ خود بخود ختم۔"

میں تعجب سے اُن کی طرف دیکھتا رہا۔ انکے الفاظ سے میں کوئی خاص بات نہ سمجھ سکا تھا۔ مجھے غصہ بھی آیا۔ میں نے کہا، "یہ کیا کہہ رہی ہو۔؟ تم گھر نہیں جا سکتیں۔؟ یہاں آ کر ایک غیر شخص کے ساتھ رہ سکتی ہو، بس سکتی ہو۔ آخر یہ کیا ہے۔؟"

"گھر تو نہیں جا سکتی۔ ایک غیر آدمی کے ساتھ رہنے کی بات کے متعلق میں کچھ نہیں کہوں گی۔ لیکن وہ آدمی غیر کیوں ہے۔؟"

"وہ غیر کیوں ہے۔؟"

"ہاں غیر تو نہیں —— کیا میرا برتاؤ اس کے ساتھ غیر معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ پتی ہے۔؟"

"پتی! میں نہیں جانتی —— لیکن میرا وجود میرے لئے نہیں ہے۔ اس وقت تو بے شک میں اس کی خدمت کر رہی ہوں ——"

"خدمت ——؟"

مذمت کیوں نہیں — میں جب کوٹھی تک اکیلی چھوڑ دی
گئی تو میں کیوں نہیں — جانتے ہو — میں نے تو سوچا بھی تھا اور
ارادہ بھی تھا کہ مر جاؤں گی ایسے جینے میں کیا ہے — لیکن پیٹ کے بچہ
کا خیال کر کے میں نے پیچھا کیا ہے، [illegible] مارے گا — تو موت کا سوا آگے کون گی
[illegible] زخم میں اگر [illegible] میں کرون — بھوک سے مرنا پڑے تو میں
[illegible] جاؤں — اپنے ہاتھوں کیسے گلا گھونٹ لوں — اسی حالت میں تین
دن بعد جان جوکھوں میں ڈال کر اس آدمی نے میری خبر لی تھی — اور
[illegible] خبرگیری میں برائی بھی کیا تھی — شاید میرے روپے کا لالچ بھی ہو
لیکن اس کے لئے میں اسے کیا الزام دے سکتی ہوں۔ آنے والی مصیبتوں
کی تھا پرواہ کئے بغیر وہ میرے پاس آیا تھا۔ [illegible] عزیز تھے
یار دوست تھے — اس نے ان سب کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں
[illegible] لیکن میری مدد سے باز نہ آیا۔ پہلے چھپ چھپ کر اور پھر
کھلم کھلا — اس کے اس اچھے یا برے کام میں میرا ہاتھ نہ تھا — مدد
اس نے میری ہی کی کہ [illegible] اور رکھیئے — اور وہ ایک [illegible] ڈھارس
کی [illegible] — میں نے موت سے منہ موڑ لیا۔ لیکن موت سے منہ موڑ کر
میں نے دیکھا کہ زندگی بھی میرے لئے سازگار نہ تھی — اور ٹھیک اس وقت
اس آدمی نے میری مدد کی — میں نے احسان مند ہو کر اسکی مدد قبول کر لی
پرمود تم نے اسے دیکھا تو ہے — میرے روپ کا [illegible] اس پر سوار ہو گیا
اور وہ اس نشے میں چور ہو گیا — مجھے اس پر ترس آ گیا — پرمود تمہیں
کیسے بتاؤں، تم بچے ہو — اس بدقسمت پر یہ نشہ ایسا چڑھا کہ میں
کہہ نہیں سکتی — وہ اپنے گھر کو بھول گیا، اپنا کاروبار بھول گیا اور اپنا
سب کچھ قربان کرنے کے لئے تل گیا۔ ایک روز مجھ سے بولا "چلو بھاگ
چلیں —" میں اگر سمجھاتی بھی تو کیا وہ سمجھتا — گرم توے پر جیسے پانی کی بوند
گر کر چھن سے غائب ہو جاتی ہے، میرا عاجزانہ سے عاجزانہ مشورہ بھی اسی
طرح اس پر بے اثر ہوتا — میں نے پوچھا "کہاں چلو گے —؟"
"جہاں کہو، چلیں — میرا سب کچھ تمہیں ہو —" جیسے میں اس کی پیاری
تھی اور پیاری ہوں — میں ہی جانتی ہوں — اس وقت میرے دل
پر جو کچھ گذری، اس کا ذکر بیکار ہے — ایسی بے چینی تو میں نے کم ہی محسوس
کی تھی — اسکی محبت کو قبول کرنے کا خیال بھی میرے لئے ناقابل برداشت
تھا لیکن کیا اس کا حق نہ تھا۔ اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اس وقت
اس کا سب کچھ میں ہی تھی — میں اگر اس کی طرف سے بے رخی اختیار کرتی
تو وہ ضرور کچھ کر بیٹھتا — یا اپنے ساتھ یا میرے ساتھ — سچ کہتی ہوں
پرمود، اس وقت مجھے اس آدمی پر کتنا رحم آ گیا تھا — تم ہی جانتی
ہو — میں اس کے اس جبر کو کسی طرح بھی نہ کھول سکی کہ میں بھی اس پر
[illegible] ہوں — کیونکہ ایسا کرنا میرے نزدیک ظلم ہوتا — میرے پاس جو کچھ
بھی بچا تھا، میں نے اسی کو سونپ دیا — ہزار بارہ سو سے زیادہ کا مال
نہ ہو گا — سب کچھ اس کے حوالے کرنے کے بعد اس جگہ کا نام میں نے
ہی اسے کہا یا [illegible] دور جگہ ہے دیکھا چلو — جانتے ہو پرمود اس جگہ
کا نام کیوں بتایا — اس لئے کہ میں جانتی تھی کہ وہ جگہ تم سے زیادہ دور
نہیں — اور ایک نہ ایک روز میں تمہیں ضرور دیکھ لوں گی۔"

میں بوا کا منہ دیکھتا رہ گیا — میرے اندر ایک ہلچل سی مچ رہی
تھی — میں نہیں جانتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں، مجھے کیا کرنا چاہیئے
اس سامنے بیٹھی ستائی ہوئی عورت سے نفرت کرتا ہوں یا ہمدردی
— ؟ وہ عورت بدستور مجھے دیکھتی رہی، اپنا دکھڑا سناتی رہی۔

"لیکن اس کا سان و گمان بھی نہ تھا کہ تم ایک دن مجھے خود ہی
ڈھونڈھ نکالو گے — میں سوچتی تھی کہ جب دل نہ مانے گا تو تمہیں
دور سے دیکھ کر ہی اپنے آپکو سمجھا لیا کروں گی — تم مجھ سے نفرت کر سکتے
ہو، پرمود — لیکن ہوں میں تمہاری بُوا ہی۔"

میں اپنے کو بے بس پا رہا تھا — جی میں آیا کہ ایک دم سے لگ
کر [illegible] — لیکن ایک ایسی زنجیر پیروں میں پڑی ہوئی تھی جو دیکھی
تو نہ تھی لیکن محسوس ہو سکتی تھی — منوں بوجھ تھا کہ مجھے دبائے
دے رہا تھا — نہ غصہ سے چلا سکتا تھا — نہ محبت کے وفور میں
رو سکتا تھا۔

"…. پرمود، میری حالت دیکھتے ہو — تم سے چھپاؤں گی کیا؟
یہ حمل اسی آدمی سے ہے …."

یہ کہکر انھوں نے ایسی نگاہ سے مجھے دیکھا جس میں ہزاروں حسرتوں
اور ارمانوں کا خون تھا — میں تاب نہ لا سکا اور تکیئے میں منہ
چھپا لیا۔

"تمہیں لاج آتی ہے — ؟ لاج کی بات ہی ہے۔ لیکن اب
یہ آدمی بھی مجھ سے کھنچ رہا ہے — وہ اپنے بیوی بچوں کو یاد کرنے لگا ہے
یہ نہیں کہ میں اس وقت جبکہ وہ سب کچھ چھوڑ مجھے ساتھ لے جانے پر
تل گیا تھا، یہ نہ جانتی ہوں کہ اس کا یہ جوش اور ابال کچھ دن کا ہے

اُسے بہت جلد اپنے گھر کی یاد ستانے لگی۔ اور یہ بھی بے بس اور مجبور آدمی ایک دن پھر آزاد اور خود رائے ہو جائیگا۔ یہ سب سمجھتے ہوئے اُسے سا تھ نے آئی۔ اس کی بے رُخی شروع ہو گئی ہے۔ اُسے اب چلا جانا ہی چاہیئے۔ اس کے بیوی بچے اکیلے ہیں۔ وہ میرے ساتھ نہیں نباہ سکتا۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے اُکتا جائے۔ اپنی حالت میں جانتی ہوں۔ پیٹ میں بچہ ہے۔ لیکن خود غرضی مجھ سے نہ ہوگی مجھے چین تب ہی آئیگا جب وہ اپنے خاندان میں واپس چلا جائے وقت آگیا ہے کہ اُسے عقل آجائے۔ اب اس کی محبت کے منہ سے نقاب اُٹھ چکا ہے۔ وہ جان گیا ہے کہ میں اس کا سب کچھ نہیں ہوں ——— میں تو ایک بدذات، بدچلن اور آوارہ عورت ہوں۔"

تکیئے میں منہ چھپائے یہ سب سُنتا رہا۔ اتنی تکلیف شاید ہی کبھی پائی ہو ——— دل مسوس مسوس کر رہ جاتا تھا کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ چاہتا تھا کہ پھوٹ پڑوں کہ وہ لاوا باہر آجائے لیکن آنسوؤں نے تو باہر نکلنے کی قسم کھالی تھی۔

"میں سمجھتی ہوں یہ آدمی دو مہینے کے اندر یہاں سے چل دے گا۔ اور میرے پاس کوڑی بھی نہ چھوڑے گا۔ اُسے معلوم ہے کہ دنیا پیسے کی ہے۔ اس لئے سات سو آٹھ سو جو کچھ بچے گا، وہ اُسی کے آڑے دن کام آئیگا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک آوارہ عورت کسی نہ کسی طرح جی ہی لے گی۔ پھر پیسہ اس کے پاس چھوڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے ——— میں سب جانتی ہوں اور اسی لئے فکر نہیں کرنا چاہتی..... لیکن اس بچے کا کیا ہوگا۔؟"

انھوں نے ایک گہری سانس لی۔ میرا دل تڑپ کر رہ گیا۔

"..... کیا ہوگا۔؟ بھگوان ہی جانتا ہے کیا ہوگا۔ میرا اور کوئی آسرا نہیں ہے۔ لیکن بھگوان دلوں کا حال جانتا ہے۔ مجھے کسی اور آسرے کی ضرورت بھی کیوں۔؟"

کچھ دیر تک بالکل خاموشی رہی۔ میں تکیئے میں منہ دیئے پڑا رہا پھر تو وہ بولیں، "پرمود، اسی لئے کہتی ہوں، جب تک وہ آدمی یہاں ہے تب تک غیر نہیں۔ میرا سب کچھ اس کا ہے۔ اس کی سیوا میں کمی نہیں کر سکتی۔ ہمارا دھرم یہی تو کہتا ہے۔"

اس کے بعد بہت دیر تک نہ وہ بولیں نہ میں بولا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک سناٹا ہے کہ سائیں سائیں کر رہا ہے، جیسے وقت کے پاؤں جم گئے ہیں۔ اس سناٹے میں ہم نے ایک دوسرے کے سانس کی آواز صاف سُنی۔ اس طرح کتنا ہی وقت گذر گیا۔ سناٹا کاٹنے لگا۔ تب بُوا نے خاموشی کی بوجھل چٹان کو توڑ کر کہا۔

"تم سوئے تو نہیں ہوگے۔ ! میں جانے کیا کیا بکتی رہی۔؟ کہنی اَن کہنی سب کہہ گئی۔ دُنیا میں ایک تم ہی تو ہو جس سے میں دو رنگی نہیں برت سکتی۔ اچھا، تم آرام کرو، میں ذرا پڑوس میں ایک بچے کو دیکھ آؤں۔"

میں پڑا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔ بُوا چلی گئیں۔

٦

میں وہاں سو نہیں سکا۔ دل بہت گھبرانے لگا۔ جو کہانی سُنی تھی اُسے حقیقت سمجھنے کے لئے دل تیار نہ تھا۔ لیکن ایسا ہوا تھا، اُسے جھٹلانا بچگانہ حرکت تھی، بیوقوفی تھی۔ علاج یہی تھا کہ اس سے بچ کر چلا جاؤں۔ اُس دنیا میں چلا جاؤں جہاں ہر چیز اور آدمی کی عزت ہے، (خواہ کیسے بھی سہی) جہاں کوئی جھمیلا نہیں، جہاں راستہ بنا بنایا ہے، ڈھونڈھنے یا بنانے کی ضرورت نہیں۔ ہر خواہش پر دم نہیں نکلتا۔ بُوا کا کیا کروں۔؟ اس تنگ و تاریک کوٹھری میں اپنا کیا رنگ کروں؟ یہاں کی ہر چیز تلپٹ ہو چکی ہے۔ شوہر کے گھر کو چھوڑ کر اس ذلیل بستی میں آکر رہنے والی عورت، شوہر پرستی اور دھرم کی باتیں کرتی ہے؟

اور مجھ جیسا پڑھا لکھا جاہل انھیں سُن کر اس عورت پر لعن طعن نہیں کرتا بلکہ اُس سے اور ہمدردی کرتا ہے۔ آہ، کتنی بڑی اور ناقابل معافی غلطی ہے۔

ایک دم غلط ہے۔ بالکل غلط ہے۔ میں چلا جاؤنگا۔ میں یہاں نہیں رہونگا۔ بُوا گھر جانے پر آمادہ نہیں۔ میں اپنی سی کر کے دیکھ لی میں انھیں نہیں لے جا سکتا۔ میں ایک قدم بھی انکے راستے سے انھیں اِدھر اُدھر نہیں کر سکتا۔ مجھے نہیں معلوم میں شاید کچھ نہ کر سکوں گا۔ وہ مجھے کچھ نہ کرنے دینگی۔ انکی عقل ماری گئی ہے۔ وہ سدھرنا ہی نہیں چاہیں۔ تو میں انھیں کیا سُدھاروں۔ مجھے تو اب یہ بھی شک ہونے لگا ہے کہ سُدھار کی انھیں ضرورت ہے یا مجھے۔؟ یہ شک جان لیوا ہو رہا ہے۔ میں بی۔ اے کا ایک نوجوان طالب علم اپنے خیالات میں مست تھا بلندی اور بزرگی کی طرف دیکھتا تھا۔ اپنی اہمیت مجھ پر خوب واضح تھی۔

اس بیت کے دو مصرعوں میں جانے کیا گہرائی ہے۔ مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے پڑا ہونا تھا۔

بیٹھے بیٹھے میں دفعتاً اٹھ بیٹھا۔ مجھے کپڑوں پر ایک ایک کر کے اٹھایا اور تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ سوچنے لگا کہ اس کوٹھری کی سجاوٹ کے لیے کیا میں کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن ایسا کوئی کام مجھ سے نہ آیا۔ کوٹھری کی جو اپنی جگہ پر تھی۔ کیوں نہ صاف کر کے رکھ دیا۔ بار جھاڑو دے کر اور صاف کر دوں۔ ہرج ہی کیا ہے۔ جلدی سے جوتا پہن کر کیسے باندھے اور جھاڑو ہاتھ میں لے کام شروع کر دیا۔ بالکل چپ چاپ وہاں سے چلے جانے کی ہمت نہ تھی۔ احسان کا بوجھ کچھ تو کم ہو۔ مجھے تو یہ معلوم ہی نہیں جا رہا۔ جھاڑو دے کر بھی نہ ہی چلایا تھا کہ بوا آ پہنچیں۔ حیران سا ہو گیا۔ جلدی سے جھاڑو پھینک ایسا کھڑا ہو گیا جیسے یہ بھول گیا میں بالکل بے قصور ہوں۔ اور غلطی سے ملزم کے کٹہرے میں آ کھڑا ہوا ہوں۔

پرمود یہ کیا سوجھی تمہیں۔؟ کیا ابھی جا رہے ہو۔؟ نیند نہیں آئی۔؟

"ہاں اب جانا چاہیئے۔"

جانا تو چاہیئے۔ مگر کوٹھری میں ایسی کوئی بات نہیں کہ جھاڑو کی ضرورت ہو۔ اور کیوں بھائی یہ اب جانا ہی چاہیئے؟"

"ماں نے گھر بلایا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ شادی کی بات چیت ہو رہی ہے۔"

اسی سلسلے میں جانا ہے۔

"بیاہ کی بات چیت۔؟"

"میں نے کہا تو تھا۔"

"میں نے سنا نہ ہوگا۔ تو بیاہ کی بات چیت چل رہی ہے۔ تیرے بیاہ میں میں بھی شریک ہونا چاہتی تھی۔"

"چاہتی تھیں کیا مطلب؟ ضرور شریک ہونا پڑے گا۔"

انھوں نے شرمندہ ہو کر کہا "ہاں رے۔ ضرور شریک ہوں گی۔ تم نے کام جو ایسے کئے ہیں۔ بات پکی ہو گئی ہے۔؟"

"بغیر میرے کیسی پکی ہوگی۔ بوا۔ میں ابھی شادی نہیں کروں گا۔"

انھوں نے بات وہیں تک بڑھنے دی اور بولیں "کب جاؤ گے۔؟ ابھی گاڑی جاتی ہے۔؟"

اس کا جواب دئے بغیر میں نے پوچھا "بوا! آپ نے شادی تک بھی نہ کی۔؟"

"کیسے کرتی۔؟"

"جیسے کیا ہوتا ہے۔ اسی طرح سے کرتی۔ میں سماج کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔"

"تم پرواہ نہ کرو تو چلو۔ کافی ہے۔ لیکن مجھ سے تو نہیں ہو سکتا۔ بیٹا۔ شریف۔ میں سماج کو توڑنا چھوڑنا نہیں چاہتی۔ سماج ٹوٹ گیا تو ہم کس طرح رہیں گے۔ کوئی چیز نہیں بن سکے گی اور جو کچھ بچا ہے گا اس لئے میں اتنا ہی کر سکتی ہوں۔ سماج کی بھلائی کے لئے نیچے ہی کو تو دونا بھی سوچا تھا کہ تمہارا بیاہ ہو گا اور میں الگ دن پورا کر رہ جاؤں گی۔ لیکن جو ہونا ہے سو ہو رہے گا۔"

اس کے بعد میں پھر کپڑوں کے ڈھیر پر آ بیٹھا۔ وہ بھی بیٹھ گئیں۔ میں نے کہا "تو پھر مجھے تمہارے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔" بوا نے کسی قدر رکتے ہوئے کہا "ہاں یہ بھی سچ ہے کام ایسے ہوتے ہیں کہ غیر ضروری ہوتے بھی ضروری ہو جاتے ہیں۔ بھلا تمہارا آنا ہی کیا غیر ضروری بات نہیں ہے۔ لیکن کوئی بات بھی اسے نہ روک سکی۔ اور تم یہاں آتے ہی رہے۔ بس ایسے ہی۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا "اب نہ آؤں گا۔"

"آنا بھی نہیں چاہیئے۔ میں تم کو خود ہی کہنے والی تھی۔ جو سماج میں ہیں سماج کا بھرم رکھنے کی ذمہ داری انہی پر ہے ان کا فرض ہے۔ سماج کے کرتا دھرتا ہی زندگی کے نئے نئے تجربے کر سکتے ہیں۔ پرمود یہ بات تو صحیح ہے کہ نئے نئے تجربے ہونے چاہئیں۔ لیکن ان تجربوں میں انھیں کو پڑنا چاہیئے جو سماج سے بلند ہو چکے ہیں۔"

میں اندر گر جو بیٹ ان کی کوئی بات نہ سمجھ سکا۔ آج وہ باتیں مجھے یاد آتی ہیں۔ اور سمجھتا ہوں کہ جوش سروں میں نہیں ملتا وہ روح کی تڑپ اور درد و کرب میں مل جاتا ہے۔ ورنہ زندگی کی اتنی گمبھیر سچائی کو بھلا آسانی سے بوا کس طرح بس میں لا سکتی تھیں۔

میں نے اُس وقت کہا تھا "بوا۔ اب میں نہیں آؤں گا۔ میں ایک درد مند دل لے کر آیا تھا۔ دیکھتا ہوں کہ میری ہمدردی کی کسی کو ضرورت نہیں۔

تھے۔ لیکن حالات کے اس بے رحم دھارے میں اپنے آپ کو اس طرح بہا دینے پر بھی آمادہ نہ تھا۔

..... وہاں کیا ہوا ہوگا۔؟ کیا وہ آدمی اب تک چلا گیا ہوگا۔؟ پھر اس کے بعد کیا ہوا ہوگا۔؟ کچھ بھی ہوا ہو۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں کر ہی کیا سکتا ہوں....؟

دل میں ایک گرہ سی پڑ رہی تھی۔۔ نہ کھلتی تھی، نہ کھلنی تھی۔ کچھ چھوڑ چھاڑ دو تو اور اُلجھتی اور کستی جاتی تھی۔۔ کچھ تو ہونا چاہیئے۔ ضرور کہیں گڑبڑ ہے۔ کہیں کیوں، ہر جگہ گڑبڑ ہی ہے۔۔ زندگی میں غلطی ہے، سماج میں غلطی ہے، اس پوری کائنات میں غلطی ہے یہ رات دن کا چکر محض اوٹ پٹانگ ہے۔ میل جول جھوٹ ہے، ایثار و قربانی بے معنی۔۔ اس بے ہنگم پن کا کچھ نہ ہوگا کچھ تو اس کا کرنا ہوگا۔

لیکن کسی بات کا سرا ہاتھ میں نہ آتا تھا۔ دل گھٹ کر رہ جاتا تھا۔ اس اثناء میں ساتھیوں سے ملنا جلنا میرا بہت کم ہو گیا وہ چڑنے لگے۔ میں نے پروا نہ کی۔ یہ خیال کہ امتحان دینا ہے ہر وقت ذہن میں چکر کاٹتا رہتا۔۔ امتحان دینا ہے اور امتیازی نمبروں کے ساتھ نام پیدا کرنا ہے۔ لیکن سماج سے میری بے تعلقی بڑھتی جا رہی تھی۔ الغرض یہ ایک پودا ہی سوکھ چلا تھا جو سماج کی کھلی فضاؤں میں پھل پھول اٹھتا ہے۔ کم تعلقی یا بے تعلقی سے کھیلنے کودنے سے جو کمی محسوس ہوتی ہے، وہ مجھے نہ ہوتی تھی۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کوئی کرنے یا نہ کرنے قابل کام میں کر رہا ہوں۔۔ ایک دن ایسی ہی حالت میں میرے پاؤں کالج سے اس شہر کے اسٹیشن کی طرف بڑھ گئے

لیکن وہ کُنبے کی دکان کہاں تھی۔۔؟ اس کوٹھری میں کچھ اور لوگ آگئے تھے۔ دکان سے پوچھنے پچھانے پر بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ اس آدمی کے متعلق معلوم ہوا کہ بہت دن ہوئے وہ کہیں چلا گیا ہے۔ اور اپنی عورت کو مار پیٹ کر نکال دیا ہے۔ لیکن پھر اس عورت کا کیا ہوا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم۔ اتنا اور معلوم ہوا کہ مرد کے چلے جانے کے بعد بھی وہ عورت ڈیڑھ مہینے تک وہاں رہی۔ کپڑے سی کر پیٹ بھرتی تھی۔ بڑی بھلی عورت تھی۔ سُکھ دکھ میں دوسروں کے کام آتی۔ بچوں کو گھر بٹھا کر پڑھاتی۔ اور سب کے چھوٹے موٹے کام کو تیار رہتی۔۔ لیکن گئی کہاں؟ یہ کسی کو نہیں معلوم۔

جب اور کھود کھود کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ پیٹ سے تھی اور اکثر اسی فکر میں مبتلا رہتی۔ اور کبھی کبھی اسپتال جانے کی بات بھی کرتی تھی۔

میں نے اسپتال میں جا کر چھان بین کی۔۔ معلوم ہوا کہ اسپتال میں پانچ مہینے ہوئے کہ مرنال نام کی ایک عورت آئی تھی۔ اس کے وہاں ایک لڑکی ہوئی تھی۔ چار دن کے بعد اُس لڑکی کے چیچک نکلی۔ وہ جنرل وارڈ میں تھی۔ نرسوں کو کچھ زیادہ یاد نہیں۔ پندرہ روز بعد لڑکی اچھی ہو گئی۔ اُسی روز سے ماں بیٹی کا نام رجسٹر میں نہیں ہے۔۔؟

کہاں گئی۔۔؟

میرے سوال پر اسپتال کی بڑی لیڈی ڈاکٹر مجھے دیکھتی رہ گئی، بولی "کیا آپ سچ مچ سمجھتے ہیں کہ اس سوال کا جواب ہم دے سکتے ہیں۔؟"

میں نے کہا "ہاں! ہو بھی سکتا ہے کہ آپ جواب دے سکیں۔"

"مجھے آپ پر تعجب ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "میں ایک بات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ انھوں نے اپنی بچی کو مشن میں تو نہیں دینا چاہا!"

بولیں "ہاں۔۔ یاد آیا۔۔ مہینہ کونسا تھا۔؟ ہاں ستمبر۔۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔۔ وہی کیس ہوگا۔ عمر کیا تھی۔؟"

"کوئی چوبیس پچیس!"

"ٹھیک۔۔ صاف رنگ۔۔؟"

"ہاں اچھا کھلا ہوا رنگ تھا۔"

"ٹھیک۔۔ پھر تو وہی کیس ہے۔۔ ہم سے وہ کچھ کام بھی مانگتی تھیں۔۔ نرس بننے کو تیار تھیں۔۔ انگریزی بھی جانتی تھیں نا؟ اچھی لڑکی تھی۔ مجھے یاد ہے۔۔ ہم نے کہا بچہ مشن کو دیدو اور تم عیسیٰ مسیح کو پہچان لو تو یہاں رہ سکتی ہو۔ اور کام بھی سیکھ سکتی ہو۔۔ وہ نہیں مانی۔ ہندوؤں میں یہی تو مرض ہے۔۔ وہ تمہاری کون تھی۔۔؟ اسے تو سمجھانا کہ مسیح خدا کا برگزیدہ نبی ہے۔ دنیا کو نجات کی راہ بتانے والا۔۔ اس پر ایمان لانا چاہیئے۔

سمجھے نا۔۔!

میں نے دریافت کیا، "پھر کیا۔۔ وہ نہیں رہی۔؟ چلی گئی؟"

"اب ہمیں نہیں چاہو گا۔"
اب سوچتا ہوں کہ کتنا خود دار ہوتے ہوئے بھی ایسی بیوقوفی کی
بات میں نے کیسے کہہ دی۔ اس کے جواب میں بُوا نے جو کہا تھا۔ مجھے آج بھی
خوب یاد ہے۔
انھوں نے کہا تھا۔
"پرمود! زندگی میں بھوک کبھی نہیں ہو سکتا۔؟ تم سے ہی مجھے مدد نہ ملی
پھر اس سے ملے گی۔؟ لیکن تم وعدہ کرو کہ مجھے اس طرح تنہائی میں چھوڑ جانا چاہتے ہو
ہاں۔۔۔ بھائی! مجھے معاف کر دے۔ میں یہ نہیں چاہتی۔ مگر مجھے
اتنی مدد اس لئے چاہیے کہ کوئی مجھ پہ کیچڑ تو نہ اچھالے۔ اور میں ہاتھ کی
زندگی جو کہ اس کے گناہ کے بوجھ کو بھی سہار لوں۔ اور سب کے لئے اچھائی کی
دعا کروں۔ بڑائی مجھے کیوں چاہیے؟ بس یہ چاہیے کہ جیسی بھی زندگی ہے
صبر شکر سے گذر جائے۔"
اُن کے یہ الفاظ بھی اُس وقت میری سمجھ سے اونچے تھے۔ میں نے
جواب میں کہا تھا "میں جاؤں۔۔؟"
انھوں نے کہا تھا "ہاں! جاتا ہے تو جاؤ ۔۔۔ خوش رہو"
جاتے جاتے میں نے دل کو سخت کر کے کہا تھا "کچھ ضرورت ہو تو
لکھنا۔"
بُوا نے ہنس کر جواب دیا تھا "ہاں لکھوں گی۔"
میں کھڑا ہو گیا تھا، کوٹ بانہوں پر ڈال لیا تھا، ہیٹ ہاتھ
میں تھا۔
اس ہیئت میں ان کے سامنے چلنے کو تیار کھڑا اپنے آپ کو عجیب و
غریب سمجھ رہا تھا۔ جھک کر ان کے پیر چھو لوں۔۔؟ ضرور چھونے
چاہئیں ۔۔۔ لیکن مجھ سے کچھ نہ بن پڑا۔ اس وقت میں نے اپنی کلائی پر
بندھی گھڑی کو اس طرح دیکھا جیسے دیر ہو رہی ہے۔ پھر ذرا سر جھکا کر
کہا، "اچھا بُوا! پرنام!"
اور کہتے ہی مڑ کر چل دیا۔
بُوا نے کہا، "سکھی رہو بھیا۔" اس دعا اور شفقت نے جسم میں
پارہ بھر دیا۔ قدم خود بخود تیز ہو گئے اور میں یوں چلنے لگا گویا پھر
کر دیکھا اور کسی نے پکڑا۔ لمبے ڈگ بھرتا باہر آیا اور سیدھی
اسٹیشن کی راہ لی۔ باہر کوئلے کی دکان پر بھی نظر پڑی، جہاں وہ شخص
ترازو کی ڈنڈی تھامے، گاہک کو کوئلہ تول رہا تھا۔ اس ڈر سے کہ
کہیں مجھے دیکھ نہ لے۔ میں نے ہیٹ نیچا کر لیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا
چل دیا۔

۷

گھر پہ ماں نے پوچھا۔ کہاں رہ گئے تھے؟ اسٹیشن کہاں تھا کالج
سے تو اُس سے ایک روز پہلے تم نکل گئے تھے۔
میں نے کہا "بُوا کے ڈھونڈنے میں لگ گیا تھا۔ وہ اسی شہر
میں رہتی ہیں۔"
میری بات کے پورے ہونے تک ماں نے پوچھا "کون؟"
"بُوا ۔۔۔! میں اُن سے مل کر آ رہا ہوں۔"
"کیا ۔۔۔۔۔۔ میں۔"
"ہاں، وہ یہاں نہیں آ سکیں۔؟"
ماں نے زور سے کہا، "اس کمبخت کا ذکر بس کر پرمود ۔۔۔ تیری بُوا اب
کوئی نہیں۔ میرے سامنے اس کا نام نہ لینا۔"
لیکن سنتی ہو ماں۔ میں نے کہا "میں انھیں نہیں بھول سکتا۔"
ماں نے کہا۔ "تو جو چاہے کر ۔۔۔ لیکن خبردار جو مجھ سے اس کی
کوئی بات کہی ۔۔۔ کلنکنی کہیں کی۔۔!"
بُوا کے نام سے ماں کو جو نفرت تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے
انھیں اس نام سے تکلیف ہو رہی تھی، اور اس تکلیف کا اظہار ان کے
الفاظ میں ہو رہا تھا۔ لیکن اس وقت میں یہ نہ سمجھ سکا تھا۔ لیکن ان کا یہ
رویہ مجھے اچھا معلوم نہ ہوا تھا اور اسی وجہ سے میں اپنے گھر والوں سے
دُور سمجھ رہا تھا۔
یہ کہنا ضروری ہے کہ شادی کی جو قرارداد اٹھائی گئی میں نے اسے
منظور نہیں کیا۔ ماں ناراض ہو گئیں۔ میں نے دیکھ لیا کہ دنیا میں تنہا
اکیلا ہوں۔ کوئی کسی کا نہیں ۔۔۔ ناتے رشتے محض نام ہیں۔
زندگی وقت کے بہاؤ میں بہتی رہی۔ بی۔ اے کا امتحان
نزدیک تھا۔ میں اس میں امتیاز حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کہ بُوا کی یاد
مجھے بار بار پریشان نہ کرے۔ لیکن بے سود۔ ان کی یاد تو دل کی
اتھاہ گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی۔ ان کی وجہ سے اس دنیا کا بہت کچھ
بے رنگ، بے کیف اور فضول معلوم ہوتا تھا ۔۔۔ جیسے ہر چیز
لٹی لٹی، اُجڑی اُجڑی۔ خواہشات دم توڑ چکی تھیں۔ باہمی
تعلقات جن سے زندگی کو رس ملتا ہے، وہم معلوم ہوتے

"ہاں یہاں سے چلی گئی — اُس سے آگے مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔"

امتحانات نزدیک آ گئے تھے۔ میں وہاں اور زیادہ دن نہیں رہ سکتا تھا۔ چلا آیا۔ اب میں نے مطالعہ شروع کر دیا تھا یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی تھی کہ بچپن تک جن لوگوں کے پاس رہا، اب اُنھیں تلاش بھی نہیں کر سکتا۔ وہی جو میرے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں، اب شاید مجھے بھول چکی ہیں۔ میں سوچتا — یہ دنیا میں ہم نے کیا کیا گھڑ لیا ہے جو دلوں کی محبت کو اس طرح کاٹ دیتا ہے محبت کی اپنی جگہ کوئی نہیں۔ — ؟ دل اس طرح ٹکڑے ہونے کے لیے ہے ؟

وہ دل جڑ کر ایک نہیں ہو سکتے۔ — ؟

شادی کا مسئلہ پھر چھڑ گیا تھا۔ اس بار رشتہ ماں کو بہت ہی پسند آیا۔ خاندان، شرافت اور نجابت میں بہت اعلیٰ تھا۔ لڑکی خوبصورت خوش مزاج اور پڑھی لکھی تھی — دیر بس یہ تھی کہ ایک بار اس کے یہاں پہنچ کر میں اُسے دیکھ لوں اور وہ مجھے دیکھ لے — میں اسے بہت دنوں سے ٹال رہا تھا۔ اپنے میں کوئی بڑی بات نظر ہی نہ آتی تھی یوں تعریف کرنے والے میرے بھی کم نہ تھے۔ لیکن خود مجھے قابلِ تعریف کوئی بات نظر نہ آتی تھی۔ سوائے اس کے علاوہ جو کچھ میں دیکھ سکتا، اُسے دیکھ کر اداس ہو جاتا تھا۔

لیکن اس بار وہاں جانا ہی پڑا۔ یہ اتفاق ہی تو تھا کہ اُسی دن اُس ڈاکٹر کے یہاں بُوا سے مڈبھیڑ ہو گئی — میں نے غور سے دیکھا کہ ڈاکٹر کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو جو عورت پڑھا رہی ہے وہ بُوا کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ — اس وقت میں کچھ نہیں بولا۔ اور انھوں نے بھی مجھے دیکھ کر ظاہر کیا کہ نہیں پہچانا۔ کچھ دیر تک میں وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہ تھا۔

لڑکی نے مجھے ناپسند نہیں کیا (جہاں تک میں سمجھتا ہوں) مجھے ناپسند کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اُس کے حسن کی خامیوں یا خوبیوں پر سوچنے کا موقع ہی نہ تھا۔ یہ شدھ بدھ بھی نہ رہی کہ وہ انسان کی نوع سے تعلق رکھتی ہے، حوا کی بیٹی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر پرستان کی پری کیا ہوتی ہے۔ — ؟ اس راج نیندنی (کیا کروں، نام ہی یہ تھا) کے لیے کمرہ ہی میں فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے میری قوتِ گفتار میرا ساتھ

نہ دے سکی — میں جھینپ کر رہ گیا — ایک لفظ زبان سے نہ نکلا — اس حرکت پہ مجھے اپنے پر غصہ بھی آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غصہ دوسروں پر ظاہر بھی ہو گیا تھا کیونکہ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ لڑکی مجھے پوری طرح پسند نہیں ہے۔ لیکن یقین ہے کہ دوسرے ہی لمحے میں نے لوگوں کی اس بدگمانی کو دُور بھی کر دیا۔

اس پہ اُس گھر میں میرا وقار اور بڑھ گیا۔ سب کو میری دل جوئی خاطر منظور تھی۔ لیکن اب بات کچھ اور تھی — میری ہونے والی ساس کی بات تو بس کچھ پوچھئے مت۔ وہ مجھے ہر وقت گھیرے رہتی تھیں — باتوں باتوں میں ایک دن ان سے پوچھا، "بچے اسکول میں تو پڑھنے جاتے ہیں نا، یا گھر پر ہی پڑھتے ہیں —"

اُنھوں نے کہا، "اسکول میں تو جاتے ہی ہیں — لیکن کچھ پڑھائی یہاں بھی ہوتی ہے۔ اور یہاں اتنا شور مچاتے ہیں کہ بس کچھ مت پوچھو — اس سے ایک، تو ماسٹرنی لگا رکھی ہے اور ایک ماسٹر تیس روپے ماہوار علاوہ پڑھائی پر خرچ کرتی ہوں۔ تب جا کر تو......"

"ماسٹرنی اچھا پڑھاتی ہے۔ — ؟"

"ہاں! بھلی عورت ہے — بیچاری غریب ہے۔ اچھی طرح سمجھا دیتی ہے — بڑی صبر والی ہے —"

"بچے اُن سے خوش ہیں۔ — ؟"

"ہاں! بچے تو بہت ہی خوش ہیں — دو مہینے سے لگی ہے۔ لیکن ہمیں تو اس کا بہت سہارا ہو گیا ہے —"

"یہاں کہیں اسکول میں پڑھاتی ہوں گی ؟"

"ہاں! پڑھاتی ہیں — ہم کیا دیتے ہیں، یہی آٹھ دس روپے کچھ ابھی طے بھی نہیں ہوا ہے۔ آٹھ دس میں بھلا کیا ہوتا ہے۔ لیکن غریب ہے۔ ایک سہارا ہی سہی۔ اُسے بلواؤں۔ — ؟"

میں نے کہا، "نہیں، نہیں — کیوں بلوائیے۔"

اُنھوں نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جب کام ہوتا ہے، میں بلوا لیتی ہوں۔ اور وہ آ جاتی ہے۔ اکیلی ہے۔ ہمارا کام بنا دیتی ہے۔ تو اس کا دل بہل جاتا ہے اور ہمیں سہارا بھی ہوتا ہے اچھی لڑکی ہے۔ بات کا بُرا نہیں مانتی۔"

"معلوم ہوتا ہے تمہارے گھر سے بہت مانوس ہو گئی ہے۔ — ؟"

"ہاں، آ جاتی ہے۔ اس شادی کا ایسے بڑا اچھا تھا ہے مگر
نے بچے کا شکر تو ہماری کے مقدر میں ہی نہ تھا۔ تمہیں دیکھنے
کو بڑی بے قرار تھی۔ جانے آج چلی کیوں گئی۔ ٹھہری کیوں نہیں۔
ہم بچاؤ ورنہ تمہیں دیکھنے کی تو بڑی خواہش مند تھی۔"

"بچہ کون۔۔؟"

"ہاں بڑی دور کا تعلق ہے۔ اس کی بڑی بڑی گنا رسی کھتی
ہے ہم سب ہی اُسے چاہتے ہیں۔ وہ اُسے کھتی ہوں۔ یلنا بولنا"

میں نے جلدی سے کہا "نہیں، نہیں! کیا ضرور رستہ ہے۔؟"

میں کچھ ان ہونے والی ساس سے باتیں نہ بڑھانا چاہتا تھا لیکن
وہ تو ایک بار بات شروع کرکے ختم کرنا بھول جاتی تھیں۔ پھر بولیں
میں ابھی اُسے ٹمن کے ہاتھ بلواتی ہوں۔"

میں نے ذرا زور سے کہا، "ناحق کسی کو تکلیف ہوگی۔ رہنے بھی
دیجئے۔"

بولیں، "تکلیف۔۔! اُسے کب کوئی بار بار بلاتا ہے۔؟"

میں نے کہا "کیوں۔۔؟"

بولیں "اکیلی بیوہ ہے۔ کہیں دور کی بتلاتی ہے۔ اس کا
خاندان، عزیز رشتے دار یہاں تھوڑی ہیں۔"

میں نے پوچھا "نہیں کہیں پاس ہی رہتی ہوگی۔؟"

"یہی کوئی تین منٹ کا راستہ ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا "خیر کوئی بلانے کی ضرورت نہیں۔"

"تو جانے دو پھر۔۔ ٹھیک ہے پریشان ہوگی بیچاری
اب تم آرام کرو۔"

میں آرام تو کرنا چاہتا تھا لیکن اس وقت ان کا چلا جانا
ہی میں نے غنیمت سمجھا۔

اُسی دن شام کو میں بوا کے یہاں گیا۔ اسکول کے پاس ہی
وہ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتی تھیں۔ پہنچا تو فریم پہ رومال
کاڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہا۔۔ آؤ! اور ایک پیڑھی
بیٹھنے کے لئے سرکا دی۔

بیٹھ کر تھوڑی دیر انہیں دیکھتا رہا۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ بغیر
کناری کی سفید دھوتی تھی۔ بال جوڑے میں تو بندھے ہوئے
تھے لیکن جوڑا کافی ڈھیلا تھا۔ آنکھوں سے بشاشت ٹپکتی تھی
جسم اُبھرا۔۔ پورا سراپا بتا رہا تھا کہ انھیں اپنی قسمت سے کوئی
شکایت نہیں ہے۔۔ ناموافق حالات سے انھوں نے ایک خوشگوار
سمجھوتا کر لیا ہے۔ وقت کی تلخی جسم میں نفوذ کرکے رس بن گئی ہے

بالآخر میں نے سکوت توڑا۔ "میں وہاں گیا تھا۔"

آہستہ سے آواز ابھری "میں جانتی تھی۔"

"اسپتال میں بھی گیا تھا۔۔ تم نے مجھے نہیں لکھا۔؟"

"کیا لکھتی۔۔؟"

"اچھا، منی کہاں ہے۔؟"

"مرگئی۔۔"

"کب مرگئی۔۔؟ کیسے مرگئی۔۔؟"

"دس مہینے کی ہو کر مری۔۔ کچھ بیماری سے، کچھ بھوک سے"

میں چپ رہ گیا۔۔ پھر تھوڑی دیر میں بولا "جشن والے
سے مانگتے تھے تم نے دے کیوں نہیں دیا۔۔؟"

وہ خاموش رہیں۔ پھر جیسے کچھ سوچ کر بولیں "ہاں غلطی ہوئی۔
ہاں بڑی غلطی کی۔"

میں نے پوچھا "یہاں کیسے آ گئیں۔۔؟"

"بھٹکتی بھٹکتی۔۔!"

میں آگے اور کچھ نہ پوچھ سکا۔ خود ہی سوچنے لگا بھٹکتی
بھٹکتی یہاں آئی ہیں، لیکن بھٹکنا ابھی ختم کہاں ہوا ہے۔؟ ایسا
لگتا ہے کہ بھٹکنا ان کی قسمت بن چکا ہے، انھیں تو وہ بھی اس کا احساس
ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی اور دھوپ چھاؤں سے
اب انھیں کوئی شکایت باقی نہیں رہی۔ جیسے ایک ہی راستہ باقی
بچا ہے۔ دوسری طرف وہ نگاہ اٹھانا بھی گوارا نہیں کرتیں۔

میں نے کہا "بوا، آئندہ کے لئے...."

بولیں "آئندہ؟ آئندہ تیری شادی ہوگی نا۔؟"

"ہوگی۔۔! لیکن کیا تم جانتی تھیں۔؟"

"نہیں۔۔! یہ جانتی تھی کہ راج نندنی کی شادی ہونے والی ہے
یہ پتہ نہ تھا کہ وہیں تمہاری شادی بھی ہوگی۔ اگر معلوم ہوتا تو میں یہاں
ٹھہرتی۔۔؟"

"کیوں ٹھہرتی کیوں نہیں۔؟"

"میں بدچلن۔۔ جو ہوں، آوارہ جو ہوں۔۔ اور پھر منحوس بھی۔

نحوست تو بنا کام بگاڑ دیتی ہے بھیا — سوچ رہی ہوں کہ کیوں نہ چلی جاؤں —؟

لیکن سُن پر میرا، میں کہتی ہوں اب کوئی بیوقوفی مت کرنا۔ اس بار آ گیا تو آ گیا، آئندہ کبھی مت آنا بھیا۔ میرے حسب نسب کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہیں — اور سُن، شادی کی بات چھیڑی ہے تو کرنی ہی ہوگی — لڑکی میری دیکھی بھالی ہے۔ خوبصورت ہے، خوش مزاج ہے۔"

میں نے جلدی سے پوچھا "تو تمہاری رائے ہے کہ یہ رشتہ قبول کر لیا جائے —؟"

"ضرور —!"

اچھی بات ہے، کر لونگا — اب تک تو کچھ اور سوچتا تھا لیکن اب مجھے سب سے کھل کر کہہ دینا ہوگا کہ تم میری بُوا ہو —"

اُنھوں نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے اور بولیں، "نا، نا — نہیں بھیا، نہیں —!"

"میں دھوکا نہیں دے سکتا۔ شادی کے معاملے میں تو دھوکا دے ہی نہیں سکتا۔ شادی جیسا اہم مسئلہ، جو پوری زندگی سے تعلق رکھتا ہے، دھوکے کی چٹان پر کھڑا کیا جائے —؟"

بُوا نے کہا، دھوکا تو آج یہ ہے کہ میں تیری کوئی بھی ہوں بیٹا کیا اب بھی میں تیری بُوا ہوں —؟ بتا میں تیری کون ہوں اب —؟ کبھی میں تیری کچھ تھی — اس وقت یہ سچ تھا کہ میں تیری پھوپی تھی لیکن اس رشتے کے ان مول موتی کو میں نے گمراہی کے ایسے اتھاہ سمندر میں پھینک دیا، جہاں سے اُسے کوئی واپس نہیں لا سکتا۔ تو چاہتا ہے کہ جھوٹ موتی لا کر اُسے سچا بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرے — یہ نہیں ہو سکتا — یہ دھوکا ہے — پر سو، مجھے میرے حال پر چھوڑ، یہاں سے چلا جا تیرا یہاں زیادہ رُکنا خرابی پیدا کر سکتا ہے —"

اُنکی آخری بات نے مجھ پر زیادہ اثر کیا — میں سچ مچ ڈرنے لگا کہ میرا وہاں رُکنا خرابی پیدا کر سکتا ہے۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔؟ میں آج اس پر تعجب کرتا ہوں کہ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا —؟ کیوں اپنے اوپر لے کر ہم اپنی روش کو ٹھیک کیوں نہیں کرتے؟ لوگوں کے اپنے منہ ہیں، اپنی زبانیں — وہ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق نہ کہیں گے تو اور کیا کریں —؟ پھر اُن پر کس کا زور ہو سکتا ہے؟ انسان کیوں یہ بوجھ خندہ پیشانی سے برداشت نہیں کرتا — وہ کیوں اپنے ضمیر کی آواز نہیں سُنتا؟ کیوں اپنے اندر کے سچ کا خیر مقدم نہیں کرتا —؟

میں وہاں دو روز رُکا رہا — سب نے دیکھا کہ میری ماسٹرنی سے جان پہچان ہے — اور اب بڑھتی جا رہی ہے — لیکن کسی نے اس طرف کوئی خاص توجہ بھی نہیں کی، کیونکہ ماسٹرنی جی اکیلی رہتی تھیں، بھلی اور اونچی تھیں کہ میرا ان کی طرف میلان کسی کو کھٹکا نہیں — دن ہنسی خوشی گذر گئے — اور دو دن تھے۔ ڈاکٹر کی طرف سے میری فکر بھی کم ہو گئی — دو چار آدمی ہیں ہی کہ ان کا حال پوچھ لینے میں چلا رہا، وقت آسانی سے مل جاتی ہے — سب مجھ سے خوش تھے — بچے ہر وقت مجھے گھیرے رہتے — سالے سالیاں اب مجھے نئے رشتے کے مطابق پکارنے لگی تھیں — اس درمیان میں راج نندنی بھی چند ایک بار نظر پڑی — بڑی بھولی بھالی اور بڑی نزیب معلوم ہوتی تھی — شرمیلی اتنی تھی کہ بمشکل ایک پل رُکتی اور بھاگ جاتی۔ منگنی کی رسم بھی ادا کر دی گئی — مجھے بہت سے روپئے اور ناریل بھینٹ چڑھائے — اس وقت میرے دل میں بہت سے سوالوں نے سر اٹھایا — میں نے اپنے طور پر کوشش کی کہ دل کا بھید چہرے سے ظاہر نہ ہو — پتہ نہیں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا — لیکن باوجود کوشش کے طبیعت تھی کہ بندھی جاتی تھی میرے یار بار کا نشانہ سا چبھتا تھا کہ میں کیوں سچائی کو چھپا رہا ہوں — یہ چبھن آخر میں اتنی تیز ہو گئی کہ چلتے وقت میں نے جرأت کر کے ڈاکٹر سے کہہ دیا کہ ماسٹرنی میری بُوا ہے۔

توقع کے خلاف ڈاکٹر نے میری بات سُن کر تعجب یا پریشانی کا بھی اظہار نہیں کیا۔ میری ہمت بڑھ گئی، اب میں نے بات کی اور وضاحت کر دی کہ وہ اچھی طرح سوچ لیں، سمجھ لیں "ماسٹرنی میری بُوا ہے اور بُوا میں اُسے ہمیشہ مانونگا۔"

پھر ڈاکٹر کے چہرے پر رنگ بدلنا شروع ہوا، لیکن صرف یہی:

"آئی سی یو — وہاٹ مور ڈو آئی وانٹ —؟"

ڈاکٹر کی اس روشن خیالی نے میرے شبہات دھو دیئے بلکہ میں دل میں شرمندہ بھی ہوا کہ میں خواہ مخواہ ان لوگوں کے متعلق کیا کیا سوچنے لگا تھا۔ راج نندنی نے مجھے مسکراہٹوں کے تحفوں کے ساتھ الوداع کہا۔

لیکن تقدیر کو منظور تھا کچھ اور۔ حالات میں ایک تیز ایک تبدیلی ہوئی جو سنبھالے نہ سنبھل سکی۔ رشتہ ٹوٹ گیا میری ساس اور مجھ سے ہوتے ہوتے رہ گئیں۔ راتوں رات تمام کی تمام سرشتے ناقابلِ بحال ہو گئیں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ پوری برادری نے بیزاری کا اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب البتہ حالات کی اس تبدیلی پر بڑے مغموم تھے۔ آخر تک ان سے میرے تعلقات بڑے خوشگوار رہے۔ وہ خطوں میں ہمیشہ وہی لب و لہجہ اختیار کرتے جو ایک بیٹے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نفسیاتی دوسرے رشتے پر بھی انہوں نے اپنی آمادگی ظاہر نہیں کی اور یاد ہے کہ جب میں اس شادی کا نتیجہ بھی کچھ خوشگوار نہ ہوا تھا۔ بہرحال، جو کچھ اور جیسا کچھ بھی رہا ہو۔ ڈاکٹر کی رائے خاندان کی عزت اور شرافت اور برادری کی مرضی کے آگے نہ چلی۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن تنہائی وہ ملازمت بہت جلد ختم کر دی گئی۔ نیو شفٹ جلدی ہی چھوٹ گئی تھی۔

اس خبر کو سُن کر مجھے سخت افسوس ہوا۔ فوراً ایک خط لکھا، پھر ایک تار دیا۔ خود اس بار جانے کا موقع نہ مل سکا۔ نہ خط کا جواب آیا اور نہ تار کا ہی ـــ یہ ضرور معلوم ہوا کہ انہوں نے وہ جگہ چھوڑ دی ہے۔ چھوڑ کر کہاں گئیں، کون جانے۔؟ اس دنیا میں کس گھر کا دروازہ ان پر کھلا ہوا ہے۔ کہ وہ سر چھپا سکیں۔؟ لیکن دنیا صرف گھروں اور دیواروں میں ہی تو بند نہیں ہے۔ تو ابھی کہیں چلی تو گئی ہوں گی، پوری دنیا انکی ہے۔

۸

کہانی طویل ہوتی جاتی ہے۔ ختم کر دینی چاہیئے۔ اب زندگی بھی تو ایک کہانی سے زیادہ اور کیا ہے۔ پُرانی کہانی میں اب وہ دلچسپی بھی کہاں رہ گئی ہے۔

واقعات اور سانحات ہوتے ہیں، گذر جاتے ہیں۔ ہم زندگی گذارتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ زندگی کا آغاز کس حوصلے اور کس ارمان سے کرتے ہیں، لیکن ابھی دوسرے کنارے پر نہیں پہنچے کہ طبیعت اکتاہٹ ہو جاتی ہے، دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ میں اس بیوقوفی یا دانشمندی پر سوچتا ہوں، بہت سوچتا ہوں۔ کوئی سُراغ نہیں ملتا۔ کچھ ہاتھ نہیں آتا بجز حیرت کے۔

بحرِ ذخار ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ ہم اپنی کاغذکی چھوٹی سی، تانگ سی ناؤ اس میں کھینے کے لئے اُترتے ہیں۔ لیکن خیریت ساحل ہی پہ ہے۔ آگے تباہ نہیں ہے۔ ہمت والے آگے بھی بڑھتے ہیں۔ کچھ موجوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ ہاتھ پیر مارتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ساحل پہ سیفٹواروں کا ایک اژدھام ہے کہ سانس لینا دشوار ہے۔ کٹے ہاتے ہائے کرتے رہتے ہیں۔ چھین جھپٹ کر۔ لیجئے سارا کرب ہی گیا۔؟ یہ ہم فیصلہ نہیں کر پاتے۔ ایک محدود دائرے میں چکر ہی کاٹ لیتا ہے۔ جی لیتا ہے۔ تینوں طرف سمندر کس جوش میں ہے۔ رہے ہمیں کہاں اتنی فرصت ہے کہ اس کے جوش اور اس کی گہرائی کو دیکھیں۔ ہمیں اور کام بہت ہیں۔

اس طرف توجہ بھی کریں تو نتیجہ معلوم۔ اس سمندر کا کہیں اور چھور بھی ہے۔؟ دوسرا کنارہ ہے کہیں۔؟ کوئی دوسرا سہارا بھی نہیں کہ ہماری تھکی آنکھیں کچھ دیر اسی سے تازگی اور روشنی حاصل کرلیں۔ ایک لق و دق میدان ہے جس کا کنارہ اُفق سے جا ملتا ہے ـــ ہاں دُھندلکوں میں لپٹی نیلاہٹ ضرور ہے لیکن چھورا اس کا بھی نہیں ـــ چھورا اگر ہے تو ہماری نظر کا۔ عقل مایوس، ناکام واپس آجاتی ہے۔

ہاں کھلا ہُوا ہے مت فریب ہستی ـــ اس سمندر کی تلی نہیں ہے یہاں آواز، فریاد، نالہ پانی کی سطح پہ تیرتا ہے۔ ایک سناٹا ہے جو دُور دُور تک مسلط ہے۔ آوازیں، فریادیں اور نالے سب اس اژدہے کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

سبکسارانِ ساحل ہی رہیں تو ٹھیک ہے۔ یہاں ہمارے پیر زمین کو تو ـــ چھو لیتے ہیں، یہاں ہمارا لنگر دھرتی کا سہارا تو اور لے لیتا ہے۔ یہاں کھڑے کھڑے ہم اس بحرِ ناپیدا کنار کی بے کناری پہ ایک نظر بھی ڈالیں تو کیا کم ہے۔؟ اتنا ہی بہت ہے ہمارا دل تو اسی سے سہم جاتا ہے۔ ہماری نظر تو اسی سے تھک جاتی ہے، ہمارا سر تو اسی سے سہم جاتا ہے۔ قوت برداشت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ پھر بھی برداشت کرتے ہیں، جھینپتے رہیں، کنارے کنارے بڑھتے رہیں، موجوں سے بچتے بچاتے، سُلجھتے سُلجھاتے ـــ بس یہی انسان کی زندگی ہے۔

تو اس سمندر کی طغیانی میں کیوں آ نکلیں۔ انہیں پتہ تھا

یا نہیں کہ یہاں پاؤں ٹکانے کے لئے دھرتی نہیں ہے — پانی ہی پانی ہے — میں نے ساحل پر کھڑے کھڑے پکار کر کہا۔

یہاں آجاؤ بُوا — یہاں آجاؤ — میں پرمود ہوں — تمہارا بھتیجا — جسے تم نے پیار کیا ہے، جسے تم نے لوریاں سنائی ہیں۔ بُوا یہاں آجاؤ — یہاں ہم سب تمہیں ہیں — یہاں دھرتی ہے اور مضبوط بھی ہے — یہاں کسی بات کا خوف نہیں۔ آرام ہی آرام ہے۔ اطمینان ہے، آسودگی ہے — زمین خشک ہے۔"

میری پکار بہت دیر میں پہنچی، بُوا کے گلے گلے پانی آچکا تھا۔ وہ ہاتھ پیر مار رہی تھیں — اسے تیرنا کیسے کہا جائے —؟ تیرنے کی تو انھوں نے کبھی مشق بھی نہیں کی۔ موجوں کے دوش پر لرزتی ہوئی آواز آئی۔

"نہیں، پرمود نہیں — تم میرے وہی پرمود ہو۔ لیکن کنارہ ایک دفعہ چھوٹا تو چھوٹا — پرمود، میرا سانس پھول رہا ہے۔ بہت تھک چکی ہوں — اگر تھک کر اس سمندر کی گود میں سو بھی جاؤں تو کیا ہرج ہے۔ میرا پریم لو پرمود — تم نہیں جانتے کہ جہاں پیر نہیں ٹکتا وہیں تیرا جاتا ہے — میں بھی تیر رہی ہوں — انجام سے بے خبر! اس منجدھار سے واپس کنارے پر آجاؤں —؟ نہیں نہیں، اں اتنی کم بخت اور کم ظرف نہیں ہو سکتی۔"

میں نے رسی پھینکی، انہوں نے نہیں پکڑی، مسکرا دیں اور کہا
"تمہاری بڑی احسان مند ہوں پرمود —!"

میں پوری طاقت سے چلایا "تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔ اگر کرتی ہو تو آجاؤ۔"

وہ ڈبکیاں کھانے لگیں۔ ان کی ڈبکیاں لگاتی آواز آئی "تم سے پریم کرتی ہوں، بہت پریم کرتی ہوں، اسی لئے تمہیں نہیں ٹال سکتی۔ اور تمہارے پاس تو آ ہی نہیں سکتی — پانی کی چادر پھیلتی ہی جاتی ہے۔ مجھے اُس پار جانا ہے۔"

میں نے خفا ہو کر کہا، "جاؤ۔ میں اب تمہاری طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔"

انھوں نے کہا، دیکھنا بھی نہیں چاہئے — برابر دیکھتے رہنے سے کنارے سے پیر اُکھڑ جائیں گے۔"

میں غضبناک ہو کر چیخا، "جاؤ، ڈوبو — مرو —!"

میری غضبناکی نے ان کی ہنسی کو اور تیز کر دیا۔ بولیں، میرا ڈوب مرنا اتنا آسان ہوتا تو اچھا ہی نہ ہوتا — نہ جانے ابھی کتنے تھپیڑے کھانے ہیں۔ لیکن تم ان تھپیڑوں سے دور ہو — میں تم سے محبت کرتی ہوں، اسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔

..... آخری بار جب اُن سے ملا تو وکیل تھا۔ ان کی منت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا — کوئی خطرناک مرض ان کے پیچھے پڑ گیا تھا — وہ ایک اندھیری کوٹھری میں پڑی تھیں — دوا دارو کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کچھ پڑوسیوں کی ہمدردی انھیں ضرور حاصل تھی۔ لیکن ان کی یہ ہمدردی اس حد تک تھی جہاں پیسے کا سوال آتے ہی ہر اچھی چیز ایک بڑا معمہ بن کر رہ جاتی ہے۔ بڑا تعجب یہ تھا کہ اس بار انھوں نے تعمداً مجھے خط لکھا تھا۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا، اس کی خبر انھیں بہت دنوں میں ملی تھی، لیکن ملتے ہی انھوں نے فوراً خط لکھا تھا — اس خط کو کتنی بار پڑھ چکا ہوں، میں خود بھی نہیں بتا سکتا۔ پڑھتا ہوں لیکن اس سوچ کو کسی اور وقت کے لئے اُٹھا رکھوں — خط میں لکھا تھا۔

"پرمود! ماں نعمت ہوتی ہے — میں تو پیدائش سے ہی اس نعمت سے محروم ہوں۔ مجھے بڑا رنج ہے کہ میں سُورگ باشی کی کوئی خدمت نہ کر سکی۔ چاہتی تھی کہ جیتے جیتے ایک بار اُن کے قدموں پر گر کے معافی مانگ لوں لیکن واہ ری بدقسمتی۔ میرا یہ چاہا بھی پورا نہ ہو سکا۔ میں اپنی بدقسمتی کو گلے لگاتی ہوں۔

"پرمود، کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ اس لئے میں نے اوپر اپنا پتہ بھی لکھ دیا ہے۔ میں جانتی ہوں تم آؤ گے — میرے پہلے پتہ پر بھی تم نے ضرور چھان بین کی ہوگی — اور وہ خط اور تار تم نے کیوں بھیجے تھے، ان کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ان باتوں سے فائدہ —؟ میری بات بھی چھوڑ دو، یہ بھی اب بیکار ہو چکی ہے۔ زندگی ایک آزمائش ہے — میں نے تو کہا زخم بنا ہی لی ہے۔ آتے ہو تو آجاؤ — لیکن مجھ سے کوئی اُمید نہ لے کر آنا۔ اس بار جن لوگوں کے بیچ بسیرا لیا ہے، وہ سماج کا بچا کھچا جھوٹا کھاتا ہیں اور کون جانتا ہے وہ جھوٹن بھی ہیں یا نہیں — بہرحال! انسان ہیں۔ یہ بات میں جو ان کے درمیان رہ رہی ہوں، بڑے صاف طریقے سے دیکھ رہی ہوں۔ میں کسی اور سہارے پر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ اب تو ان کی انسان سوز انسانیت ہی کے سہارے جینا ہے۔ در در بھٹکنے کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ بُرے لوگوں کے نیک جذبات ہی پرکھ

دہلی کے [illegible] کر سکتی ہوں ۔۔۔ اس کے علاوہ میری اور
[illegible] نہیں ہو سکتی ۔۔۔ اس کے علاوہ اور کسی سہارے پر جینے
کی [illegible] نہیں [illegible] سکے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان
[illegible] اور [illegible] لوگوں کے دلوں میں برائی ، بد معاشی
[illegible] کی [illegible] ایک [illegible] ہوتی ہے ۔ اس [illegible] کو
[illegible] کی [illegible] سفید [illegible]
[illegible] ہے ۔ اس [illegible] یہ کہنا بہت مشکل نہیں رہتا ہے
[illegible] ہے ۔۔۔ وہ [illegible] ہر چیز
سے [illegible] یہاں سے نکل کر اور کہیں نہیں جانا چاہتی ۔ اور
جاؤں بھی کہاں ۔؟

"[illegible] یہاں رہنے میں فائدہ ۔ ؟" فائدہ بہت ہے
یہاں کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ میں آوارہ ہوں یا پاکباز ۔ یہاں
پاکیزگی سے انسان کی قدر و قیمت نہیں ناپی جاتی ۔ یہاں تو یہ
[illegible] ہے ۔ اس کی کمی یا زیادتی سے قیمت گھٹتی بڑھتی ہے ۔
میں [illegible] ہوں کہ یہاں کا سب سے بڑا روگ یہی ہے ، سب سے بڑی
خرابی یہی ہے ۔ لیکن اس روگ اور خرابی میں فائدوں کی کمی تھوڑی ہے
اس جگہ آکر یہ ناممکن ہے کہ اپنے کو آدمی پاکباز ظاہر کرے ۔ دوسروں
سے منہ موڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ پاکبازی نام کی اس بازار
میں کوئی چیز نہیں ملے گی ۔ مگر دوسری جگہ درندگی دل کی گہرائیوں
میں چھپی ہے تو یہاں اوپر آجاتی ہے ۔ یہاں اس چھل کپٹ
نہیں جس پر مہذب سماج کی بنیاد رکھی جاتی ہے ۔ تہذیب کی جب
کھپت نہیں تو آئے گی کہاں سے ۔ بے حیائی جتنی بے نقاب
بلکہ ننگی ہو اتنی ہی یہاں اصلی اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے ۔
یہاں [illegible] کے لئے عزت اور ناموس کی آڑ کی کوئی ضرورت نہیں
درندگی یہاں بے لگام ہے ۔ جو آدمی یہاں جانور نہیں بن سکتا
اُسے آدمیت کی لعنت سمجھا جاتا ہے ۔ اس لئے پاکباز یہاں ٹک
ہی نہیں سکتا ۔ کپڑے جھاڑ ، سر پر پاؤں رکھ ایسا بھاگتا ہے
کہ مڑ کر بھی نہیں دیکھتا ۔ جو عریانی کی حد تک بے شرم ہے ، وہی بچا
ہے ۔ جو دل میں وہی منہ پر ۔۔۔ اندر شیطان چھپا بیٹھا ہو تو پھر
یہاں کی آب و ہوا میں باہر کا انسان ایک پل نہیں ٹھہر سکتا ۔ انسان
ہو تو اندر باہر دونوں طرف انسان ہونا ہوگا ۔ قطعی یہاں آتے ہی

کھل جاتی ہے ، ملمع یہاں ہو ہی نہیں سکتا ۔ اس بازار میں صرف سونے
اور خالص سونے کا سکہ چلتا ہے ، کیونکہ اُسے پرکھنے کی نوبت ہی
نہیں آتی ، وہ چیز [illegible] جاتا ہے ۔ یہاں نہ سونے سے محبت ہے نہ پیتل سے
گھبراہٹ ۔ گھبراہٹ تو تب ہو جب اس بات کا ڈر ہو کہ پیتل دبے
پاؤں اس بازار میں آکر سونے کی جگہ لے لے گا ۔ یہاں کا تو ہر فرد کسوٹی
ہے جو پیتل کو اپنی حدود میں قدم ہی نہیں رکھنے دیتا ۔۔۔ میرا ایمان
ہے کہ پیتل دبے پاؤں اس بازار میں آکر سونے کی جگہ لے گا جہاں
کا تو ہر فرد کسوٹی ہے جو پیتل کو اپنی حدود میں قدم نہیں رکھنے دیتا
میرا ایمان ہے کہ تم اس کسوٹی پر پورا اترو گے ، دوسروں پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے
"پرمود ! تمہاری سمجھ میں نہ آئے گا ۔ تم نہ آؤ تو ہی بہتر ہے ۔
تم نے ابھی زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے ۔ پرمود نے ابھی سر
اٹھایا ہے ۔ تمہارا مزاج نازک ، خیالات بلند اور پاکیزہ ہیں ۔ یہاں
بلندی اور پاکیزگی نہیں ہے ۔ یہاں گندگی اور غلاظت ہے ۔ اسی لئے میں
نے روکا ہوں ۔ ہو سکتا ہے کہ بلند خیالات اور پاکیزگی کا احساس
ہی مر گیا ہو ۔ تم نہ آؤ تو ہی ٹھیک ہے ۔ تمہارا پریم کھو دینا مجھ
سے برداشت نہ ہو سکے گا ۔ پچھلی زندگی اور پچھلی دنیا کے لوگوں میں
سے ایک تم ہی تو بچے ہو جسے میں جانتی ہوں ، جس سے میں محبت
کرتی ہوں ، ورنہ نہ میں کسی کو جانتی ہوں اور نہ کوئی مجھے جانتا ہے
لیکن صرف تمہاری وجہ سے اب تک میں اس دنیا کے لوگوں سے
نفرت نہیں کر سکی ہوں ۔ تم نہیں جانتے پرمود ، تم ان جانے میں
مجھ پر کتنا بڑا احسان کر رہے ہو ۔ جس سماج میں تم ہو ، تمہارے
رہتے میں اُس سے نفرت کا تصور بھی کر سکتی ہوں ۔ ؟ کبھی کبھی اس
نفرت کی سوچ میرے دل میں بہت اونچی اٹھ جاتی ہے لیکن
تمہاری یاد اسے نیچا ، بہت نیچا کر دیتی ہے ۔ اور اس طرح نفرت
کے اس زہر سے میرا وجود محفوظ رہتا ہے ۔ اور تمہیں یاد کر کر کے
اسے طاقت بناتی ہوں ۔ تمہارا پریم مجھے پاک رکھتا ہے ۔ لیکن ڈر
ہے کہ تم یہاں آؤ اور بچا کھچا تمہارا پریم بھی میرے ہاتھوں سے
جاتا رہے ۔ پھر میرا کیا حشر ہوگا ۔ ؟ زندگی ویران ہو جائے گی
بل کر جائے گا ۔ نراشا چاروں طرف سے مجھے گھیرے گی ۔ پھر
اتنی بڑی پہاڑ سی زندگی کے بیچ میرا کون سا سہارا ہوگا ۔ ؟ اب تو
اس سہارے ہی کی وجہ سے دل اونچا کر کے تازہ اور کھلی فضا میں سانس

سے لیتی ہوں، پھر تو یہ بھی نہ ہو سکے گا۔ مر جاؤں گی، اس کا ڈر نہیں ڈر اس کا ہے کہ جیون کی ٹیک ہاتھ سے چھوٹ جائیگی۔ مرنے مرنے میں فرق ہے۔ زندہ رہ کر مرنا کچھ اور ہے اور مر، مر کے مرنا کچھ اور ہے دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ مجھے خوف ہے کہ تم آئے تو کہیں یہ زندہ رہنا مجھ سے نہ چھوٹ جائے۔ جہاں میں ہوں، وہ جگہ تمہارے آنے قابل اور دیکھنے قابل نہیں ہے۔ میں صرف تمہارے سہارے ہی یہاں رہتے ہوئے بھی یہاں کی نہیں ہوں۔ تم مت آؤ پرمود۔ مت آؤ ــــ آئے تو تم جانو.....

یہ اتنا لمبا چوڑا خط میں نے کیسے لکھ دیا۔ میں خود نہیں جانتی لیکن کسی اور کو اتنا لمبا خط تھوڑی لکھ سکتی تھی۔ یہ باتیں صرف تم سے ہی کہہ سکتی تھی۔ لیکن میں نے لکھ کیسے دیں؟ انھیں تو میں سوچ بھی نہ سکتی تھی ــ!

"پرمود! اسے ناممکن مت سمجھنا کہ میں تمہیں پکاروں اور کہوں کہ میرا ہاتھ پکڑ لو، مجھے نکالو۔ کہوں گی، لیکن تب جب جی کا حوصلہ ساتھ چھوڑ دے گا جب یہ زندہ رہنا چھوڑ دے گا ــــ یہ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں ــــ تم مت آنا پرمود!"

لیکن میں ختم کرنا چاہتا ہوں۔ فضول کیوں طول دوں۔

جہاں اور جس حالت میں میں نے بُوا کو پایا اس کا بیان کرتے ہوئے قلم کی زبان لڑکھڑاتی ہے۔ میں بیان نہیں کروں گا لیکن اس خط سے اُس جگہ کا اندازہ بھی تو نہیں کیا جا سکتا، جہاں شہر کی ساری سڑاند، سارا تعفن جمع ہو گیا تھا۔ ادھیڑ عمر کی بیوائیں بے کار مجبور، معذور پیشہ ور بھک منگے، قانون کی آنکھ اور جیل سے بچ کر چھپے کام کرنے والے یہاں آباد تھے۔ بُوا وہاں کیسے گئیں وہ بیمار تھیں، پلنگ سے لگی تھیں۔ اُوپر بیان کی ہوئی صفتیں رکھنے والے چار پانچ عورت، مرد انکے پاس تھے۔ ان کے چہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بُوا کی وجہ سے وہ فکر مند ہیں۔ لیکن بات بڑی نابہ دانی سے کرتے تھے۔ اور وہ باتیں اس حد تک بے باک اور ننگی ہوتیں کہ سن کر مجھے متلی آتی تھی۔ اگرچہ وہ بُوا کی عزت کرتے تھے لیکن بات ایسے بے تے اور تو تڑاق سے کرتے تھے۔ حیا اور شرم کو وہاں آتے شرم آتی تھی۔ بُوا کے پلنگ کے پاس بھی انکے سستے اور بازاری اشارے ہوتے رہے۔ انھوں نے مجھ اجنبی کو دیکھ کر بھی کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ جیسے ان کسی غیر ملک کا ڈراؤنا اور بھیانک جانور تھا۔ ان میں سے بہت سوں کی باتیں اور اشارے بتلاتے تھے کہ وہ مجھے اس پلنگ پر پڑی بیمار عورت کا پرانا عاشق سمجھ رہے ہیں۔ ایسا عاشق جس کے عشق نے اسے اس حالت کو پہنچا دیا ہے۔ اُن کے ان اشاروں اور کچھ دور باتوں نے مجھے کاٹ کاٹ دیا۔

پلنگ پر خاموش پڑی بُوا۔ یہ سب کچھ سنتی اور دیکھتی تھیں اور کسی سے کچھ نہ کہتی تھیں ـــ لیکن کبھی کبھی کسی کی حد سے زیادہ چھچھوری بات پر ڈپٹ بھی دیتی تھیں اور ان کی ڈپٹ بے کار بھی ثابت نہ ہوتی تھی۔ لیکن اکثر وہ اس طرف سے اُداس تھیں۔

میں نے کہا۔ "بُوا، چلو۔ میں لینے آیا ہوں۔"

"کہاں لے چلے گا۔؟"

"اب تو گھر بھرا بنا ہی رہ گیا ہے۔ شادی ہو گئی ہے۔ اپنی حکومت ہے۔ تیسرا کوئی نہیں۔ اب بس تمہارا ہی راج ہوگا۔"

"اس بڑھاپے میں چلوں۔؟"

"بڑھاپے سے کیا ہوا۔؟ بڑھاپے میں تو آرام کی اور بھی ضرورت ہے ـــ میں کچھ نہیں جانتا ــــ مجھے پورا یقین ہے کہ میری وکالت اچھی چل نکلے گی۔ کوئی فکر نہیں ـــ بڑے بڑے افسر دوست ہوتے جاتے ہیں ـــ میں کسی سالے کی پرواہ نہیں کرتا۔"

بُوا چپ چاپ پڑی رہیں۔ پھر بولیں، "پرمود، تم نے بھابی کو تو بڑھاپے نا؟ یہ مشرجی سورگ گئے تو کسے کو بھی ساتھ لے گئے ـــ یہ تمہارا گھر کتنا بڑا ہے ـــ ان سب کو لے چلے گا۔؟ یہ کتنے نہیں ہیں، ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔"

میں نے دل تھامتے ہوئے کہا، "کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو بُوا، آخر میں تمہارا کچھ تو ہوں۔؟ دیکھتا ہوں، اس حالت میں تم میرے ساتھ نہ جاؤ گی۔"

بُوا مسکرائیں۔ میں نے اس مسکراہٹ میں زہر کی تہیں دیکھیں، بولیں،

"ضرور لے چلو گے۔"

"سُن، ضرور لے چلے گا۔؟"

"ہاں، ہاں کہہ تو رہا ہوں۔ ضرور لے چلوں گا۔"

کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو جلانے بیٹھا ہوں وہی کیا کم ہے۔
اگر اسی کو سہہ جاؤں تو غنیمت ہے۔
بڑا تم کہیں۔ تمہارے جیتے جی میں راہ پر نہ آیا۔ اب سنو،
میں اس جی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ دنیا کے اچھے بُرے سے مجھے کچھ مطلب
ہی نہیں۔ اوروں کے لئے نئے سرے سے زندگی گذارنا، شاید مجھ
سے نہ سیکھا جائے۔ عادتیں پک گئی ہیں۔ جہاں تک اپنا تعلق ہے
اس زندگی سے ننگ کر اتنا ہی زندہ رہوں گا جتنا ممکن ہے۔ یہ میرا
وعدہ ہے۔

بنگوان! تم میری بات سنتے ہو۔ اولاد کا مجھے غم نہیں
دو لیکن وعدہ کا پاس نہ کروں تو نرک ضرور دینا۔
دستخط: ایم۔ ڈیال
مورخہ ۴ - ۳
نوٹ:۔ اطلاعاً عرض ہے کہ جی سے اپنا استعفیٰ میں نے
داخل کر دیا ہے۔
ایم۔ ڈی مورخہ ۴ - ۴
(ختم شد)

لوچن بخشی

لوچن بخشی نے ۱۹۲۲ء میں ضلع راولپنڈی کے ایک گاؤں تھوہا گریلا میں جنم لیا۔ پوٹھوہار کی یہ سرزمین صدیوں سے ادب، آرٹ اور کلچر کا گہوارہ چلی آ رہی ہے۔ ٹیکسلا کی مشہور اور قدیم درسگاہ بھی یہیں ہے۔ اس سرزمین نے پنجابی کے کئی عظیم ادیب پیدا کئے ہیں۔

اردو کی طرح پنجابی کے بھی بیشتر ادیب متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لوچن بخشی نے بھی دیہاتی حلقے کے ایک گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اس کا بچپن پنجاب کی صحت مند اور شاداب آب و ہوا میں گذرا۔ لوچن بخشی کی تمام کہانیاں دیہات اور اپنی فوجی زندگی کے ماحول کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس کے والد چونکہ ملازمت پیشہ تھے اس لئے لوچن بخشی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے کئی مقامات کی سیر کی جس نے اس کے لئے زندگی کے گہرے مطالعہ اور مشاہدے کے مواقع فراہم کئے۔ وہ ابتدا ہی سے ایک دوربین نظر رکھتا تھا۔ آنکھ دوڑائی زرجیات کے پھول چنتا رہا۔ مڈل پاس کرنے کے بعد وہ لاہور آیا تو اس کے سامنے شہری زندگی بے نقاب ہوئی۔ اس نے مشاہدات کا جو ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اس میں نئے لعل و گہر کا اضافہ ہوا۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد وہ فوج میں ملازم ہو گیا۔ اب اس کے سامنے ایک نیا ماحول اور ایک نئی زندگی کا منظر تھا ـــ اس فوجی زندگی نے اس کے مشاہدے کو مزید سان پر چڑھایا۔ اس کی بہترین کہانیاں اس دور سے وابستہ ہیں۔ وہ ایک دانش ور اور ایک ادیب تھا۔ یہ فوجی ملازمت اس کی زندگی کا ایک مختصر سا پڑاؤ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ تلوار کی بجائے اپنے قلم سے زندگی کی خرابیوں کے ساتھ بہتر طریقہ سے لڑ سکتا ہے۔ لہٰذا ۱۹۴۵ء میں جنگ سے واپس آتے ہی اس نے اپنی ادھوری تعلیم مکمل کی۔ ویسے بھی وہ اپنی زندگی میں کسی ادھورے پن کا قائل نہیں۔ اگر یہ کہاوت تسلیم کر لی جائے کہ "وہی ادیب عظیم ہوتے ہیں جو بھرپور زندگی بسر کرتے ہیں" تو لوچن بخشی اس کا بہترین ثبوت ہے۔ خلوص عظیم ادب کا خالق ہوتا ہے ـــ اور یہ خلوص لوچن بخشی کی فطرتِ ثانی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب گریجویٹ ہو جانے کے بعد اس نے سول سپلائی محکمہ کی ملازمت کی تو جہاں اس کے ساتھی اپنے ہاتھ رنگ رہے تھے وہاں وہ صرف خلوص کی دولت لئے بیٹھا تھا اور اپنی کہانیاں ادب کے بینک میں جمع کرا رہا تھا۔ تقسیم ملک نے اس کی انسان دوستی پر مزید جلا کی ـــ اس کے ذہن و فکر میں کہیں کہیں جو دھندلاہٹ ابھی باقی تھی وہ بھی تابندہ ہو گئی۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا قصد کیا۔ نئی بلندیوں کو چھونے کا اس کا قصد ادب کے میدان میں بھی جاری ہے۔ وہ ایک مقام پر ٹھہرنے کا قائل نہیں۔

لوچن بخشی کا فنی کمال یہی ہے کہ وہ زندگی کے نگار خانے میں بیشتر الٹی ہوئی تصویروں کو نہ صرف سیدھا دیکھتا ہے بلکہ انہیں سیدھا کر کے دوبارہ لٹکا دیتا ہے ـــ اس کے ناولٹ "بھرے میلے میں" بھی بعض تصویریں الٹی لٹکی ہوئی ہیں جنہیں وہ چابکدستی سے آہستہ آہستہ سیدھا کرتا چلا جاتا ہے۔ اور آپ کو آخر میں ہر تصویر سیدھی لٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔ لوچن بخشی کی سحر نگاری کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ وہ ایک توانا زندگی کے کردار چنتا ہے اور ماحول میں کچھ اتنی توانائی سرایت کر دیتا ہے کہ کہانی کا ماحول بھی بجائے خود ایک کردار بن جاتا ہے ـــ اس کے اس ناولٹ میں "بنتو" جس عورت کے روپ میں پیش کی گئی ہے وہ ہر عورت میں چھپی ہوئی عظیم عورت کی ایک امٹ اور جاوداں شبیہہ ہے۔

لوچن بخشی

مترجمہ محمود جالندھری

بھرے میلہ میں

پیرجی

بھئی دین ایمان کی قسم! میں تم سے کچھ جھوٹ کہوں تو مجھ پر واہگورو کا عتاب نازل ہو۔ لیکن ایک بات سنو۔ میری تم سے ابھی ابھی جان پہچان ہوئی ہے۔ تم کہو گے کیسا عجیب آدمی ہے۔ ملتے ہی قسمیں کھانے لگا۔ اور پھر قسم تو جھوٹے کھاتے ہیں۔ میں تو تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ بھئی یہ بات ہے سولہ آنے سچی تم اس پر اعتبار کرو نہ کرو!

ہاں جناب تو اس جگہ جہاں سے ستلج دریا پُرپیچ پہاڑوں کی کوکھ سے ساٹھ میل اور سمٹتا ہوا گذرتا ہے۔ وہاں پہاڑ اور میدان کے اتصال پر ایک چھوٹا سا گاؤں تمھیں ضرور دکھائی دیا ہوگا۔ اور تم اسے دیکھنے کے لئے ادھر چلے آئے۔ مگر دیکھو تو سہی یہ گاؤں بھی کیا ہے۔ بمشکل۔ سے آٹھ دس گھر ہوں گے ان گھروں سے تم ذرا اور آگے بڑھو تو تم ایک بڑا کھنڈر دیکھو گے۔ ٹوٹے ہوئے مکان۔ پانی اور دھوپ سے گری پڑی دیواریں اور ان پر جما ہوا کیچڑ اور کائی۔ مٹی کے برتنوں کی ٹوٹی پھوٹی ٹھیکریاں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اگر تمھیں حیرت نہ ہو تو کوئی بات نہیں۔ لیکن ایک بار تو تمھارے دل میں خوف وہراس کی لہر ضرور دوڑ جائے گی۔ معاف کرنا تمھیں اس طرح خوف زدہ دیکھ کر اگر تم میرے دوست ہوتے تو میں تمھیں ایک موٹی سی گالی دے دیتا۔ لیکن تم تو راہگیر ہو اور اصل بات تو یہ ہے کہ میں دل ہی دل میں تمھیں اپنی کہانی سنانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ اس لئے میں اب تم سے کیا کہوں۔ لیکن میں تمھیں تھوڑی دور تک اور لے جاؤں گا۔ ڈرنے اور جھجکنے کی ذرا ضرورت نہیں۔ اسی راستے پر چلے آؤ۔ سامنے بیریوں کے جھنڈ میں ــ وہاں جہاں تم چند دیواری سی دیکھ رہے ہو ــ

لو بس صرف اتنی سی بات تھی۔ ہیں یہ کیا تم تو ڈر گئے۔ یہ کوئی قتل گاہ تھوڑے ہی ہے۔ یہ تو تم پیرجی کے مزار تک آگئے ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پیرجی مسلمان تھے۔ اور وہ اس جگہ کو "روضہ شریف" کہتے ہیں لیکن بعض لوگوں کے خیال کے مطابق پیرجی ہندو تھے۔ پیرجی ہندو تھے یا مسلمان یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ لیکن پیرجی تو پیرجی تھے۔ خدا رسیدہ فقیر تھے۔ سادہ لوح تھے۔ دریا دل اور سخی تھے۔ اور ایک دفعہ جس پر بھی ان کی مہر کی نظر ہو جاتی وہ نہال ہو جاتا۔

تم نے دیکھا ہوگا کہ یہ جگہ کس قدر حسین ہے۔ لیکن شاید تم سوچ رہے ہو گے کہ یہ جگہ کس قدر بھیانک بھی ہے۔ ویران اور سنسان۔ غیر آباد۔ مگر جناب میں نے ٹھیک کہا ہے نا۔ اگر سچ پوچھو تو یہ جگہ مجھے بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔ ویسے یہ بات اور ہے کہ اگر کوئی مسافر دن دہاڑے لوٹ لیا جائے یا کسی کو قتل کر کے اس کی لاش کو ستلج دریا میں پھینک دیا جائے اور یا کوئی ایک اکیلی عورت اپنا سب کچھ لٹا بیٹھے۔ میں یہ باتیں تمھیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ اس دھرتی پر ایسی باتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ مگر اس میں پیرجی کا کیا قصور ہے۔ یہ بات تو اب دھرتی کے خمیر میں ازل سے موجود ہے۔ اس دھرتی کا چپہ چپہ ایک آرزو اور حسرت کی تصویر ہے نہ جانے کیوں اس چار دیواری میں آ کر میرے دل میں کچھ گدگدی سی ہونے لگی ہے اور پھر میں بولتا چلا جاتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ میں یہ سوچتا ہوں کہ اس سکوت سے اس دھرتی کی ویرانی میں اضافہ ہوتا ہے اور آواز تو آپ جانتے ہی ہیں کہ برچھے کی نوک کی مانند خوشی کے سینے کو بیدھتی چلی جاتی ہے۔

تم تو کہو گے کہ کسی عجیب بیوقوف کے ساتھ واسطہ آ پڑا ہے لیکن میں تمھیں زیادہ دیر تک انتظار میں نہیں رکھنا چاہتا۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو اگر میں اس جگہ کے حسن کا تمھیں قصہ سناؤں۔ ہاں یہی بات اچھی رہے گی۔ میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ ایک

بہت ہی حسین وجمیل اور پیاری وادی ہے ۔لیکن اس پر شباب
سال بھر میں صرف ایک ہی بار آتا ہے ۔بہار کے دنوں میں جب
پروائیا چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دھرتی کی تمام آرزوئیں
بیدار ہو گئی ہیں ۔اس کے سینے میں چھپی ہوئی خوشبوئیں ابھر آتی ہیں
ہر طرف خودرو جنگلی پھول کھل اٹھتے ہیں ۔کہا جاتا ہے کہ ان دنوں پیر
جی اپنی چلہ کشی ترک کر کے باہر آجاتے تھے ۔ان کے چیلے چانٹے دور
دراز سے دیش کے ہر حصے سے آیا کرتے تھے ۔ان سے پیر جی بات
چیت اور تبادلہ خیالات کیا کرتے ۔

انہی دنوں ایک جمعرات کو پیر جی کا عرس ہوتا ہے ۔کاش آپ
نے اس رات کی چہل پہل اور رونق دیکھی ہوتی ۔ ایک نئی نویلی دلہن
کی طرح اس دھرتی کا یہ خطہ سج دھج کے اپنے پورے جوبن پر ہوتا ہے
ایسے تو ہر جمعرات کو اس چاردیواری میں کوئی نہ کوئی گمنام عقیدت
کیش چراغ جلا جاتا ہے ۔مگر رات کو جیسے ساری کی ساری دھرتی
پر چراغاں ہوتا ہے ۔سارا دن ساری رات قوالیاں گائی جاتی ہیں
اور وجد میں آکر سامعین جھوم جھوم اٹھتے ہیں ۔اس میلہ میں پریم کے
بندھن مضبوط بھی ہوتے ہیں اور ٹوٹتے بھی ہیں ـــــــ
مدت سے سینے میں دبے ہوئے ارمان یہاں نکلتے ہیں ۔ لاڈ چاؤ سے
پالی ہوئی آرزوئیں اس میلہ میں پروان چڑھتی ہیں ۔یہاں چھوٹی سی
چھوٹی بات پر بھی آدمی کو قتل کیا جا سکتا ہے اور بڑی سی بڑی قربانی
بھی یہاں بے اثر ثابت ہو سکتی ہے ۔معاف کرنا میں نے یہ سب
باتیں اپنی ان آنکھوں سے دیکھی ہیں ۔اس لئے تمھیں یہ سب
باتیں بتا رہا ہوں ۔تم اب تک بھی وہاں گئے ہو گے ۔کہ میں سلیقہ کا
قائل ہوں اور سلیقہ سے تمھیں اس بات کا پس منظر بتانا ضروری
تھا ۔اس سلسلے میں تمھیں اس ویرانے میں کھینچ لایا ہوں ۔ دراصل میری
اس کہانی کا تعلق اس میلہ سے ہے جس کا ذکر تم ابھی تک سنتے رہے
ہو ۔میری اس کہانی سے تم نے یہ تو اندازہ لگا لیا ہوگا ۔کہ میں یہ میلہ
ہر سال ضرور دیکھنے آتا ہوں گا ۔ ہاں جناب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ
میں سال کے ان دنوں میں کہیں بھی کیوں نہ ہوں ۔اس میلہ میں ضرور
شامل ہوتا ہوں ۔اس میلہ کا میرے زندگی سے نزدیکی اور گہرا تعلق
ہے ۔تعلق بھی کیا ہے حقیقتاً یہ میلہ ہی میری زندگی ہے ۔جب سے
میں نے ہوش سنبھالا تھا ۔اس میلہ کو دیکھتا چلا آیا ہوں ۔ ان گنت
آرزوؤں کا اس میلہ میں جنم ہوا ۔ان گنت حسرتوں نے اس
میلہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفنا دیں ۔مثلاً تم میرے دوست جیلے
ہی کو لو ۔

جیلا

اگر تم اس علاقہ کے رہنے والے ہوتے تو جیلے کا نام سنتے ہی تمہارا
دم خشک ہو جاتا اور تم غش کھا کر گر پڑتے ۔ہو سکتا ہے کہ تمھارے دل کی
دھڑکن ہی بند ہو جاتی ۔اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ۔میں قسم کھا کر
کہہ سکتا ہوں ۔اور میں تمھیں ابتداء میں بتا چکا ہوں کہ قسم تو جھوٹے کھاتے
ہیں ۔اب میں کوئی قسم نہیں کھاؤں گا ۔مجھ پر اعتبار کرو ۔ایسے واقعات
کئی بار ہوئے ہیں ۔ادھر جیلا کا نام لیا گیا اور ادھر سننے والے کی دل کی
دھڑکنیں بند ہو گئیں ۔

جیلا میرا دوست بھی تھا ۔اس علاقہ کا بدنام ڈاکو بھی تھا ۔اس کی
دھاک دور دراز ان پہاڑیوں میں بھی بیٹھی ہوئی تھی ۔جہاں سے ستلج
دریا نکلتا ہے ۔اس کی شہرت پنجاب کے ان میدانوں میں بھی تھی جہاں
ستلج دریا مست و مدہوش ہو کر اٹھلاتا ہوا بہتا ہے ۔ستلج کے بہاؤ کی
طرح لوگ اس سے واقف تھے ۔جب وہ ہلہ بولتا تھا تو دریاؤں کے چڑھاؤ
کی طرح آگے بڑھتا جاتا تھا ۔اس کو کبھی کوئی روک نہیں سکا تھا ۔اس
نے اپنی زندگی میں بے شمار قتل کئے تھے ۔بے شمار ڈاکے ڈالے تھے
لوگ کہتے ہیں کہ وہ شرابی اور بدکار تھا ۔اس میں ہزاروں عیب تھے ۔
لیکن جناب وہ ہمارا یار تھا ۔ہمیں اس کی برائیوں سے کوئی واسطہ نہیں
تھا ۔ہمیں تو اس کی یاری سے غرض تھی ۔ایسا دوست اگر تم چراغ لیکر بھی تلاش
کرو تو حشر تک ڈھونڈتے رہو گے اور پھر بھی حسرت تمھارے دل میں
کھٹکتی رہے گی ۔

اس کے ساتھ میری دوستی اس چراغاں کے میلہ میں ہوئی تھی اور
وہ بھی محض اتفاقیہ ۔اس وقت میری مسیں نہیں بھیگی تھیں ۔ان دنوں
مجھے پہلوانی کا بہت شوق تھا ۔ایک دن اکھاڑہ میں کسرت کے دوران
ہماری آپس میں تو تو میں میں ہو گئی ۔اور میرے چار ساتھی مجھ پر یکدم
ٹوٹ پڑے ۔تھوڑی دیر تک تو میں پہلو بچاتا رہا ۔لیکن صاحب کہاں تک
بچتا ۔وہ چار تھے اور میں اکیلا ۔میں آخر گر پڑا ۔مجھے یوں محسوس ہوا ۔جیسے

رہی سہ پہر ندرسے کھیلا جا رہا ہو۔ اتنے میں ایک گرجدار آواز سنائی دی۔ "بیاد بند سے گے تھرز! یہ بھی کوئی شرافت ہے۔ پہلوان کے سامنے ہوں تو۔ اکیلے سے اکیلا لڑنے تو بات بھی ہے۔"

لیکن وہ لڑکے باز نہ آئے اور مجھ دیت میں رگیدتے رہے۔ اتنے میں ... جنبی نے آگے بڑھکر ایک ایک رسول ان کی گدی پر یوں جمائی رہزو ... گیا۔ ایک لڑکے کی تو گردن کا مٹکا ہی ٹوٹ گیا۔ دوسرا جہنم ... کرجاتا مسا۔ وہ لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس نے مجھے اٹھا کر کھڑا کیا اور بولا — "جان تو اچھا ہے —" اس کے بعد اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور کہا — "بات سن بے اوہ پہلوان کے بچے — آج تو تجھے بچا دیا ہے لیکن آئندہ دوست بناتے ہوئے ذرا سوچ لیا کرنا —"

اس کے بعد وہ مجھ سے کئی بار ملا۔ مجھے پہلوانی سکھاتا رہا۔ کئی داؤ پیچ بتاتا رہا۔ دراصل وہ مجھ پر مہربان ہو گیا تھا۔ جیسے پیر جی کی کسی پر مہر کی نظر ہو جاتی ہے۔ نود بخود اور بے غرض —

لیکن اس دوران میں مجھے ایک بار بھی اس نے یہ نہ بتایا کہ اس کا نام جیلا ہے۔ میں سوچتا ہوں ایک طرح تو اس نے اچھا کیا۔ جناب اگر وہ اس وقت مجھے اپنا نام بتا دیتا تو میرے دل کی دھڑکنیں ہی بند ہو جاتیں اس تک میں جیلے کے متعلق ان گنت قصے سن چکا تھا مگر جس شخص کے ساتھ میری دوستی ہوئی تھی وہ جیلا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو کوئی خدا دوست انسان تھا جس کو ہمیشہ کمزور پر ترس آتا تھا۔ جو پیر جی کا عقیدت مند تھا اور ہمیشہ غریبوں کے لئے لنگر لگاتا تھا۔ چراغاں کے میلے پر ہزاروں روپے خرچ کرتا تھا۔ مگر یہ سب باتیں مجھے اس وقت معلوم ہوئیں جب میں اپنا گھر بار چھوڑ کر اس کی ٹولی میں آ شامل ہوا۔ اس کے ساتھ جا ملنے کا قصہ بہت ہی عجیب ہے۔ اس سے پہلے کہ میں تمھیں یہ قصہ سناؤں تمھیں اپنے متعلق ایک دو باتیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں

میرا باپ ایک دولت مند زمیندار تھا۔ ہمارا ایک کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بچپن سے میری طبیعت میں لاابالی پن اور نا پختگی زیادہ تھی۔ چھوٹی عمر کی مجھے صرف ایک ہی بات یاد ہے۔ میں اس وقت آٹھویں جماعت میں تھا میں قصبہ ... میں سب سے آگے تھا اور پڑھنے لکھنے میں بھی چند ... میرے دوستوں کا کہنا ہے کہ میں اچھا کھاتا تھا اور کڑ دا ہوتا تھا۔ اچھا کھانے پینے کی بات تو تم سن ہی چکے ہو۔ اب ذرا بیبے ایڈ ہونے کا قصہ سنو۔

ایک دن منشی جی (منشی جی) کے پاس ایک لڑکے نے یہ شکایت کی کہ میں نے شراب پی کر اس کو گالیاں دی ہیں۔ معاف کرنا۔ ہر ایک جاٹ کا بیٹا خود بخود ہی یہ کام سیکھ جاتا ہے۔ میرا یقین اس وقت اور بھی پختہ ہو گیا۔ جب ہمارا منشی میرے باپ سے ملنے آیا منشی جی نے میرے باپ سے کہا — "آپ کا بیٹا شراب پیتا ہے۔ آپ کا بیٹا چوری کرتا ہے اور آپ کا بیٹا جوا کھیلتا ہے۔ معاف کرنا آپ کے بیٹے میں ایک ایسی بری عادت بھی ہے جسے میں بیان نہیں کر سکتا —"

شاید تم یہ سمجھ رہے ہو گے کہ یہ بات سن کر میرے والد کو تشویش ہوئی ہو گی — نہیں جناب۔ اگر تم یہ سوچ رہے ہو تو معاف کرنا تمھارا واسطہ کسی خاندانی جاٹ سے نہیں پڑا — منشی جی کی باتیں سن کر میرا باپ تو بہت خوش ہوا۔ اور ہنس کر بولا — "منشی جی! اگر آپ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتے تو آپ تشریف لے جا سکتے ہیں اپنے بیٹے کے متعلق یہ باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا بیٹا واقعی میرا بیٹا ہے ——"

اس دن کے بعد سے میں کبھی اسکول نہ گیا۔ اس دن کے بعد سے میرا کام صرف پہلوانی رہ گیا تھا۔ گھی پیتا تھا۔ بادام کھاتا تھا۔ اور پہلوانی کرتا تھا —" ایک دن کی بات ہے میں اپنے کنوئیں پر بیٹھا تھا۔ گرمیوں کی دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میں بیلوں کو چارہ ڈلنے اٹھا ہی تھا کہ اچانک میرے پیچھے ایک لڑکی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کانوں میں گھنگرو چھنکنے لگے ہوں۔ مگر یہ ہنسی خود بخود بند ہو گئی اور ایک بھیانک چیخ مجھے سنائی دی۔ میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نمبردار ... کی بیٹی جنو کو جیسے کوئی مرد اپنی آغوش میں لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسے اٹھا کر بھاگ جانے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس نے اپنے چہرے پر منڈاسا باندھا ہوا تھا میں اسے پہچان نہ سکا۔ وہ ایک لمبے قد کا طاقتور مرد تھا۔ خیر صاحب! ایک تو لڑکی سو۔ اپنی جان پہچان کی لڑکی اور پھر جنو جیسی لڑکی —" میں تیزی سے اٹھا اور جاتے ہی اس شخص کے پہلو میں زور سے دو مکے

جا سکے۔ لوجی وہ لمبے قد کا مرد دو بکے بھی نہ سہہ سکا۔ دھرتی پہ اوندھے منہ جا پڑا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون کا دھارا بہہ نکلا۔ لیک بھانسلنز کی طرح وہ اپنی آنکھیں چڑھا کر لیٹا رہا۔ بنتو مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ اس دن پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ میرے بکے میں کتنی طاقت ہے۔ آدمی کو ہلاک کرنا کتنا آسان ہے اور بنتو کتنی حسین ہے۔ اس دن کے بعد سے کئی لوگ کہتے ہیں کہ مجھے بنتو سے پیار ہو گیا تھا۔ لیکن جناب مجھے واہگورو کی سوگند ——— میں ابھی تک یہ نہیں جانتا کہ پیار کس مورت کا نام ہے۔ معاف کرنا میں پھر قسم کھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر یہ بات تمہیں سولہ آنے صحیح بتا رہا ہوں مجھے تو بنتو سے نفرت ہو گئی تھی تم پوچھو گے کیوں ——— ؟ لو یہ بات بھی سن لو ———

جس وقت بنتو مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ اس وقت مجھے وہ کچھ اور ہی نظر آ رہی تھی ——— اب میں آپ سے کیا کہوں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ اس کی آنکھیں کبھی تو مجھے شعلوں کی طرح جلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور کبھی ان میں سے اندھیری راتوں کی تاریکی جھانکنے لگتی تھی میں سوچ ہی رہا تھا۔ کہ اس سے پوچھوں ——— بنتو تجھے کیا ہو گیا ہے۔ میری طرف یوں نہ دیکھ ——— وقعتاً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے پیچھے پڑی ہوئی لاش نے ایک جھرجھری سی لی ہو۔ اور پھر ایک سایہ سا میرے سر کے اوپر سے گذرتا ہوا لمبا ہوتا ہوا دور کھیتوں تک پھیل گیا تھا۔ میں نے لاش کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح دھرتی پہ اوندھے منہ پڑی تھی۔ میرا جی چاہا کہ چارہ کترنے والا ٹوکرا لا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں اور دریا میں بہا آؤں۔ یہی بات میں نے بنتو سے کہی تو اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ کہنے لگی ——— یہ بات بعد میں کرنا۔ پہلے مجھے گاؤں تک چھوڑ آ۔ میری تو ڈر سے جان نکلی جاتی ہے ———" اور وہ گاؤں کی طرف چل دی اور میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہی تھی۔ لیکن میرے دل میں اس وقت ایک ہی خیال موجزن تھا میرے والد کہا کرتے تھے۔ کہ جب جاٹ کا کوئی لڑکا پہلا قتل کرلے تو یہ سمجھ لو کہ وہ جوان ہو گیا۔ میں آج جوان ہو گیا تھا۔ جب میرے والد نے پہلا قتل کیا تھا تو اسے سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ اس بات کو سچ جاننا جناب جس ماحول کا پروردہ ہوں وہاں اگر سات سال تو کیا چودہ سال کی بھی سزا ہو جاتی تو میں شاید پچھتا نہ کرتا۔ بنتو جیسی حسین لڑکی کے لئے چودہ سال کی سزا کیا تھی۔ مجھے اس کا ذرہ بھر غم نہ ہوتا۔ مجھے تو غم اس بات کا تھا کہ گاؤں میں داخل ہوتے ہی اس نے کہنا شروع کر دیا ——— "قتل میرے لئے خطرناک ہے۔ مجھے کیا خبر کہ اس کو کس نے ہلاک کیا ہے ———"

مجھے اس بات پر بہت غصہ آ رہا تھا بنتو نے میری محبت اور ہمدردی سے اپنی عزت کو زیادہ بہتر خیال کیا تھا۔ میری غیرت کو جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میرا جی چاہتا تھا کہ میں واپس کنوئیں پہ جاؤں اور بنتو کے جھوٹ کا پردہ چاک کر دوں لیکن میری حیرت کی حد ہی نہ رہی۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ کنوئیں پر لاش کا نام و نشان ہی نہیں تھا۔ جس شخص کو میں اپنی طرف سے قتل کر کے کھیتوں میں پھینک آیا تھا وہ ایک پیشہ ور استاد کی طرح مجھے جُل دے گیا تھا۔ میں نے سوچا اس مسئلہ کو جیسے استاد سے حل کروایا جائے۔ تو پھر کیا تھا جناب ——— میں جیلے کے پاس چلا گیا۔ وہ میری بات سن کر بے تحاشا ہنسا۔ اس نے پوچھا ——— وہ کون تھا۔ یہ بات تمہیں کوئی بھی نہیں بتا سکے گا کوئی بھی ——— اس کے بعد وہ پھریریں ہنسا جیسے بادل پھٹ پڑا ہو۔ اس کی آنکھیں کبھی مجھے شعلوں کی طرح جلتی ہوئی نظر آتی تھیں اور کبھی ان میں کالی راتوں کا گہرا اندھیرا پھیل جاتا تھا۔

بنتو

نند، زمین اور زن ——— یعنی عورت۔ ان کے متعلق ہمارے علاقہ میں یہ عام مشہور ہے کہ یہی ہمیشہ آدمی کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں ہو سکتا ہے کہ تم میری اس بات سے اتفاق کرو۔ اگر اتفاق نہ بھی ہو تب بھی کوئی بات نہیں۔ معاف کرنا، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس لئے سوچتا ہوں کہ چلتے چلتے یہ بات بھی ذرا ہو جائے۔

زمین کے متعلق قتل ہوتے تو ہم روز دیکھتے ہیں۔ یہ تمہاری نظر سے بھی گزرے ہونگے۔ جس طرح فصل کے اُگنے پر اس کا کاٹنا اور چھیلنا ضرور ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں اس طرح زمین کے متعلق کسی کا قتل ہونا ہماری زندگی کی ایک عام بات ہے۔ چونکہ یہ بہت آسان اور سادہ ہوتی ہے

یک عام بات بہت دلچسپ ہوتی ہے اس لئے اس کا بیان بھی غیر دلچسپ ہوگا۔ اس ... پہ ... طور۔

... کے متعلق قتل تو سوڈو بہت سے تھے یہ جانا پہچانا تھا۔ ہم ڈاکو ... تھے قتل کے لئے دن کی روشنی کی طرح یہ بات بھی صاف ظاہر ہے۔ اس لئے میں سوچتا ہوں کہ یہ بھی ایک معمولی سی بات ہے۔ چلو اسے بھی چھوڑ دو۔

اب رہی دن کی بات ـــ ہاں جناب یہ عورت کوئی سیدھی سادی عورت نہیں ہے بلکہ خود بنتو ہے اس لئے اس کا بیان ضروری ہے ـــ بنتو تو خود دیکھنے اور سُننے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں آپ سے زیادہ کیا کہوں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ بنتو بے حد حسین اور بہت جوان تھی۔ میں تمہیں پہلے یہ بھی بتا چکا ہوں کہ کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ مجھے بنتو سے محبت ہے مگر تم ان لوگوں کے سر پر خاک ڈالو۔ وہ تو یونہی بکتے ہیں۔ تم بنتو کی بات سنو۔ ہاں جی اس قتل کے کچھ دنوں بعد بنتو کی شادی ہو گئی اور وہ چلی گئی۔ میں جیلے کی ٹولی میں جا شامل ہوا اور بنتو کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ دیکھو یہ بات ہی بھول نے والی تھی۔ چونکہ ہمارے علاقہ میں عورتیں ہوتی ہی کم ہیں خاندان میں اگر ایک بھی بھائی کا بیاہ ہو جائے تو بس یوں سمجھ لیجئے کہ سارے خاندان کو ایک نعمت مل گئی ورنہ جناب اگر کوئی شخص ساری عمر اس دھرتی پر پیاسے کے گھر سے ... سے ناواقف رہے تو کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ دوسری بات یہ بھی کہ جیلے کا سنتے ہیں کوئی شخص کسی عورت کی بات نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا تھا۔

میں تم نے تو سنا اس دھار لیا ہے ـــ یہ بات جیلا کئی مرتبہ کہا کرتا تھا۔ یہ اس کا اصول تھا اور معاف کرنا جیلا اپنے اصول کی خاطر کبھی موت مار تے سے بھی نہیں ٹلتا تھا۔ ایک مرتبہ ہم نے ایک گھر پر ڈاکہ ڈالا۔ کافی دولت مند گھر تھا۔ جب ہم سارا سامان باندھ کر چلنے لگے تو اندر کے کمرے سے ایک چیخ بلند ہوئی۔ یہ چیخ کسی عورت کی تھی۔ پلک جھپکنے میں جیلا اندر کے کمرے میں جا پہنچا۔ اس نے وہاں دیکھا کہ ہمارا ایک ساتھی اسی گھر کی ایک عورت کا بازو پکڑے کھڑا تھا۔ جیلے کا بیان ہے کہ وہ اس کی چوڑیاں اتارنے لگا تھا۔ جیلے نے اس سے کہا ـــ "حرامزادے۔ بے اصول کتے!" اور فوراً گولی مار کر اُسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اس عورت سے معافی مانگی اور کہا

"بیٹا مجھے معاف کر دینا۔ میرے ساتھی چاہے سارا گھر لوٹ لیں۔ چاہے سارے گھر کے آدمیوں کو قتل کر دیں۔ لیکن کسی عورت کے بدن پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے ـــ دیکھو میں جیلا تیرے سامنے ہاتھ باندھ کر شرمندہ کھڑا ہوں۔"

"جیلا" اس لڑکی نے کہا اور خود کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جیلے کو وہ عورت بہت ہی عجیب نظر آئی۔ عام عورتیں تو جیلے کا نام سنتے ہی بیہوش ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن یہاں تو جیلا خود اس کے سامنے کھڑا تھا۔ خیر جیلے نے اس گھر کا سارا سامان واپس کر دیا اور اپنے ساتھیوں کو خالی ہاتھ لے جا کر پیر جی کے مزار پر چلا گیا۔ یہ بھی اس کا ایک اصول تھا۔ ڈاکہ مارنے سے پہلے پیر جی کے مزار پر سلام کرنے جاتا اور ڈاکہ ڈالنے کے بعد لٹی ہوئی دولت کا دوسرا حصہ پیر جی نذر کرتا۔ کہتے ہیں کہ اس نے آج تک کبھی اس اصول میں ہیرا پھیری نہیں کی تھی لیکن ـــ اب پتہ نہیں کیسے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیلا اپنے اصول میں ہیرا پھیری کرنے لگا تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اسی عورت کے حسن پر فدا ہو گیا ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ چونکہ وہ بیحد خوبصورت بتائی جاتی تھی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جیلے کی اس ادا پر وہ عورت فریفتہ ہو گئی ہو۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جیلے نے اُس عورت سے ملنے کے لئے ہی یہ سارا ڈھونگ رچایا ہو۔ میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جیلا آدمی بڑا ٹیڑھا تھا اور اس لئے اس کی چالوں کا کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ اگر اُسے مغرب کی طرف جانا ہوتا تو وہ مشرق کی طرف ... کرتا۔ اس لئے میں اُسے شک کی نگاہ ہی سے دیکھ سکتا تھا۔ ایک دن میں بیریوں کے جھنڈ میں بیٹھا تھا کہ جیلا میرے پاس آیا۔ اُس نے اس روز اپنا سر دھو رکھا تھا اور اپنی داڑھی میں جو نئے کٹے ہوئے گھاس کی طرح ہموار اور یکساں نظر آ رہی تھی اُس نے سرسوں کا تیل لگا رکھا تھا۔ وہ کمبخت اپنے اس روپ میں بے حد حسین نظر آ رہا تھا۔ اس کا نکلتا ہوا قد، بھرپور جوانی، پر جلال چہرہ اور دو ظالم آنکھیں نشیلی اور قہر آلود تھیں۔ اونچا لمبا قد۔ دو پتلے پتلے ہونٹ اور ان پر پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی مسکراہٹ ـــ اس پر طرہ یہ کہ یکساں ترشی ہوئی اور تیل سے چپڑی ہوئی داڑھی۔

"خدا خیر کرے" ـــ جب بھی جیلا اس روپ میں نمودار ہوتا تھا تو یہ سمجھ لینا پڑتا تھا کہ ضرور کوئی اہم معاملہ ہوگا۔ اور جناب ہوا بھی یونہی ـــ وہ چپکے سے میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا "کیا بات

ہے؟" ۔ اُس نے کچھ نہ کہا اور دھرتی پر بیٹھا جنگلی پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ لیکن اس کے ہاتھوں اور پیروں کی بے چینی سے میں نے اندازہ لگایا کہ ضرور اس کے دل میں کوئی بات کھٹک رہی ہے جو اُسے چین نہیں لینے دیتی۔ میں نے پھر پوچھا۔ "جیلے تم پر کیا بیت گئی ۔ ؟" جیلے نے جواب دیئے بغیر میری طرف ٹکر ٹکر دیکھنا شروع کر دیا۔ بالکل اس طرح جیسے ایک دفعہ بختو نے میری طرف دیکھا تھا۔ "جیلے تجھے خدا کی قسم میری طرف یوں نہ دیکھ اور منہ سے کچھ پھوٹ۔" خیر صاحب وہ بڑی ناز و ادا کے ساتھ بولا۔ "میں آج سے جیلا نہیں ۔ جرنیل سنگھ ہوں ۔۔!"

"یہ تجھے کیا ہو گیا جیلے ۔۔"

"اوئے مجھے جیلا نہیں، جرنیل سنگھ کہو۔ یہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ نہایت ہی سیدھی سادی بات ہے۔ مجھے ایک گورو مل گیا ہے بس یوں سمجھو کہ جیلے پر وہلا پڑ گیا ہے۔ ایک بات سُن۔ تجھ سے کیا چھپاؤں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ میں پیر جی کے مزار والی چار دیواری میں سجدے میں پڑا تھا۔ بالکل بے خود تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی عورت میرے پاس آ کھڑی ہوئی ہے۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو وہی اس رات والی لڑکی میرے سر پر کھڑی مجھ سے کہہ رہی تھی ۔۔۔ "کتنا حسین جوان ہے اور کون سے دھندوں میں پڑ گیا ہے۔" مجھے بہت غصہ آیا۔ اور میں ایک ہی وار میں اس کا صفایا کرنے لگا تھا کہ ایک دم کسی نے مجھے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑ دیا۔ میں نے کیا دیکھا کہ وہاں نہ وہ لڑکی تھی اور نہ کوئی اور۔ بس میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور پیر جی کا مزار بھیگ گیا۔ میں نے سمجھا کہ یہ تو پیر جی کی کوئی کرامات ہے۔ اگر کوئی عورت پیر جی کے مزار تک پہنچ سکتی ہے تو اس میں ضرور کوئی بھید ہے جبکہ یہاں تو ایک عورت کیا اس کا سایہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ یہ عورت کوئی سچ مچ کی عورت نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں جیلے تیری بات تو ٹھیک ہے ــــــ تو نے وہ بات تو سن رکھی ہے نا۔ جب سیار پور (ہوشیار پور) کا ایک ساہوکار اپنی بیوی کے ہمراہ "چراغاں" کے میلہ میں آ گھسا تھا اور جب وہ تیاد دیکر واپس آیا تو اس نے کیا دیکھا کہ بہت سے لوگ اس کی بیوی کے گرد چکر کاٹ رہے تھے اور شور کر رہے تھے۔ "پیچھے جناب۔" ایک دفعہ تو لالہ چکرا گیا اور جب لالہ جی سنبھل کر اپنی بیوی کے ہمراہ یکے میں بیٹھنے لگے تو جناب پیڑوں میں سے ایک گھوڑ سوار جوان نکلا اور جھٹ سے اُس عورت کو اپنے گھوڑے پر ڈال کر ہوا ہو گیا ۔۔ آج تک نہ اس عورت کا پتہ چلا اور نہ اس جوان کا۔"

جیلا ایک دم زور سے ہنسا جیسے پاگل ہو گیا ہو۔

"ہاں یہ بات آج تک کوئی نہیں جان سکا کہ وہ کون تھا ۔۔ بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ پیر جی کی کرامات تھی۔ پیر جی نے اُسے سزا دینا ہی تھی آخر وہ اپنی اس مال کو اپنے ساتھ لیکر آیا ہی کیوں تھا پیر جی کے مزار پر اس دن کے بعد سے "یہ لڑکی ہے جو پیر جی کے مزار پر آتی ہے"

"جیلے یہ بالکل جھوٹ ہے۔۔!" میں نے کہا۔ وہ بولا "میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھا ہے۔ آخر یہ کیا بھید ہے ۔۔" میں نے اُس کو بہت سمجھایا لیکن وہ تو کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھا تھا۔ "وہ میری ہنسی اُڑائے اور یہ کچھ جائے ۔۔" "وہ عورت نہیں تھی۔ ایک چھلاوہ تھی۔ خیر میرا نام بھی جرنیل سنگھ ہے۔ مجھے پیر جی کے مزار کی قسم۔ ایک دفعہ تو اُسے سبق پڑھا کر چھوڑوں گا ۔۔!"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جیلے پر کیا بیت گئی ہے۔ اس کے بعد سے وہ کبھی ڈاکہ ڈالنے نہ گیا ۔۔ اس کے بعد سے جیلے نے چوری کرنی چھوڑ دی۔ اس کے بعد سے جیلا شراب بھی کبھی نہ پیتا۔ ایک صبح کو جب ہم سارے ساتھی ڈاکہ ڈال کر لوٹے تو جیلے نے اپنا گھر آباد کر لیا تھا۔ جو کھنڈر آپ ابتدا میں دیکھ کر آئے ہیں وہی جیلے کا گھر تھا۔

چھلاوہ

اگر آپ یہ نہیں جانتے کہ چھلاوہ کیا ہوتا ہے تو یقیناً مجھے معاف کرنا میں بھی یہ سمجھا تو نہیں سکتا لیکن اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ چھلاوہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جو چاہے تو بلی بن کر تمہیں نظر آئے اور پھر تم سے ڈر کر میاؤں میاؤں کرے اور پھر روپوش ہو جائے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شیر بن کر تمہارے سامنے آئے اور پل میں تمہیں چٹ کر جائے۔ ایک بات اور ہے۔ اگر کوئی چھلاوہ غلطی سے عورت کا روپ دھار لے تو بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ اس عورت سے خدا ہی بچائے۔ جناب جانے یا جیلے کو سچ مچ عورت کے روپ میں چھلاوہ مل گیا تھا۔ بس جناب دن رات اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ ہمارے سامنے آتا تو اس کی تعریف

میلہ لگا کا سماں ہوتا ہے۔ کوئی کچھ خریدنے آتا ہے اور کوئی بکریاں بیچنے۔ کوئی گھر کے بنے ہوئے مٹی کا سامان لیکر آتا ہے تو دوسرا چاول، چینی اور گڑ۔ مگر ایک بات سب میں مشترک ہے۔ سارے ایک ہی پیر کے مرید ہیں۔ سب لوگ ایک ساتھ لنگر میں بیٹھ کر بڑے پریم سے کھانا کھاتے ہیں۔ اور گھر کی نکالی ہوئی شراب جو یہاں عام بکتی ہے ضرور پیتے ہیں۔ پیر جی کے مزار پر قوالیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اگر کلکاریاں مارتی ہوئی کوئی ٹولی ادھر آتی ہے تو دوسری ٹولی ستلج دریا کے کنارے وارث شاہ کی ہیر گانے میں مشغول ہو جاتی ہے۔

خیر صاحب میلہ اپنے پورے جوبن پر تھا کہ جنگل کی آگ کی طرح ایک بات سارے میلے میں پھیل گئی۔ ایک جاٹ اپنی بیوی کو ساتھ لیکر میلے میں آیا ہے۔ وہ جاٹ بڑا بانکا ہے ہاتھ میں سم چڑھی لاٹھی جو اس کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ لاٹھی کو اس نے تیل پلا رکھا ہے۔ اس کے گلے میں تعویز ہے۔ لمبا کرتہ اور کمر میں تہبند ہے۔ جتی بیحد حسین تھی!

میں یہ بات سنتے ہی جان گیا کہ ہو نہ ہو یہ ضرور جیلا ہی ہے۔ میں اس خبر کے لئے جیسے پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ میں اٹھا اور میلے کی طرف چل دیا۔ میں نے اُن کو دور سے دیکھا۔ ہاں جیلا ہی تھا۔ وہی لمبا قد۔ چوڑا چکلا سینہ اور مضبوط بدن۔ عورت بھی انتہائی حسین معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ان سے دور ہونے کے باعث میں اُسے پہچان نہ سکا۔

وہ پہلے پیر جی کے مزار پر گئے۔ چڑھاوا چڑھایا۔ نذر نیاز دی اور واپس آ گئے۔ لوگ ان کے سامنے سے جیسے خود بخود ہٹتے جاتے تھے۔ جیلے کا رعب ہی کچھ ایسا تھا اور پھر جناب وہ گھوم پھر کے میلہ دیکھنے لگے۔ وہ آگے آگے چل رہی تھی اور جیلا اپنے کاندھے پہ لاٹھی رکھے اس کے نقش پا پر چل رہا تھا۔ جدھر سے وہ گذرتے لوگ ان کی طرف دیکھتے ہی رہ جاتے۔ خبر نہیں۔ یہ جیلے کے چہرہ کا جلال تھا۔ کہ اس کی ابھرتی ہوئی لاٹھی کا رعب تھا یا عورت کی صورت کا جادو۔ لوگ انہیں خود بخود راستہ دیتے جاتے اور وہ گھومتے جاتے۔

اس طرح جیسے کوئی گم کی ہوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ سیلئے جب سارا میلہ گھوم کر باہر نکلے تو یہ بھی محض ایک اتفاق تھا کہ وہ اُدھر آ نکلے جہاں میں کھڑا تھا۔ میری حیرت کی حد نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ جیلے کے ساتھ ساتھ چلنے والی لڑکی کوئی اور نہ تھی بلکہ خود بنتو تھی۔ ہاں جی نمبرداروں کی لڑکی بنتو جس کے تم کئی قصے سن چکے ہو۔ جیلے نے میری طرف نہ دیکھا اور ہجوم سے باہر آتے ہی اپنی بھرپور آواز میں شیطان کی طرح ہنستے ہوئے گرجا۔ یوں جیسے بادل چمکتا ہے۔ اس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا۔ اُس نے منہ کے آگے ہاتھ رکھ دئیے۔ "بب" ایسی آواز نکالی اور پھر بنتو سے مخاطب ہو کر۔ "لے دیکھ لے بنتو نارا! آج تک کسی ماں نے ایسا بیٹا جنم نہیں دیا جو اس جوان کے سامنے ٹھہر سکے۔ میں تجھے بھرے میلہ میں سے نکال لایا ہوں۔ سوں واہگورو دی بنتو! اگر تیری طرف کوئی آنکھ بھر کے دیکھتا تو اس کی گردن زمین پر لڑھکتی نظر آتی۔ ہا ہا۔ ہا ہا۔"

اور اس نے بنتو کو آغوش میں لے لیا۔

میں نے دیکھا کہ جیسے کسی ان جانے ڈر سے بنتو کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن میں سے چنگاریاں پھوٹ رہی ہوں۔ میں اور آگے بڑھا۔ بیساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "بنتو!" اس سے پہلے کہ جیلا اپنی لاٹھی اوپر اٹھاتا بنتو میری آغوش میں تھی۔

"او ہو — تو —" جیلا چیخ اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے جیلے کی لاٹھی میری گردن میں دور تک اتر گئی ہو جیسے میری گردن چٹخ گئی ہو۔ لیکن اس کے بعد جیلا لاٹھی کا دوسرا وار نہ کر سکا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک ہی ضرب لگا کر اس کا دم ٹوٹ گیا تھا۔ لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور وہ دوڑ کر پیر جی کے مزار پر چلا گیا اور جاتے ہی یوں سجدے میں گرا کہ پھر کبھی نہ اٹھ سکا —

بنتو کو دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میں اٹھا اور میں نے بنتو کے پانچ سات ہاتھ لگا دئیے۔ وہ بلبلا اٹھی اور سسکتی ہوئی بولی۔ "اس میں میرا کیا قصور ہے —" وہ مجھے اس وقت بہت ہی لاچار نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نہ تو مجھے مشعلوں کی طرح روشن دکھائی دے رہی تھیں اور نہ ہی ان سے تاریک راتوں کا اندھیرا جھانک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ وہ جس انداز سے مجھے دیکھ رہی تھی اس پر مجھے پیار آ گیا۔

"بنتو —!" میں نے کہا۔ اور ایک دفعہ پھر وہ میری آغوش میں تھی۔

اس کے بعد بنتو میرے یہاں رہتی رہی۔ میری مرہم پٹی کرتی رہی۔ اپنے ہاتھوں سے مجھے دودھ پلاتی رہی اور میرے تلوے سہلاتی

رہی۔ وہ مجھے کہیں چھلاوہ دکھائی نہ دی — وہ مجھے ایک سیدھی سادی اور معصوم عورت نظر آتی تھی اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مجھے عام چیزوں سے چڑ ہے۔ ایک بات ہے اس کے ہوتے میں کبھی ڈاکہ ڈالنے نہ گیا۔ کبھی چوری نہ کی۔ یہاں تک کہ اب مجھے شراب کی ابھی نہیں لگتی تھی — انہی دنوں بنتو ایک صبح کو خود بخود مجھے چھوڑ کر چلی گئی — اس کے جانے کے بعد اب کئی مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوتا بنتو بھی ایک چھلاوہ تھی — اسے پیشہ ور مجرم اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اُسے چور اور ڈاکوؤں سے محبت تھی۔ جو یہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس سے کوئی بڑا ڈاکو بن سکے چونکہ وہ خود ایک ڈاکو تھی۔ معاف کرنا بنتو کا خیال آتے ہی پھر سینہ سلگ اٹھا ہے میرا بند بند پھڑک رہا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ بنتو اگر مجھے کہیں اتفاق سے مل جائے تو میں اس سے پوچھوں : کتنے میں سو ہوتا ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ کبھی نہ کبھی "چراغاں" کے میلہ پر میری بنتو سے ضرور مڈ بھیڑ ہوگی۔ اور اس کے ساتھ اس کا نیا خاوند بھی ضرور ہوگا۔ مجھے پیر جی کے مزار کی قسم میں ایک ہی وار میں اُسے قیمہ بنا دوں گا۔ میری باہوں میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ میں اب بھی اپنی آغوش میں اُٹھا کر بھرے میلے میں سے لے جاؤں گا۔

دریا

لیجئے۔ بنتو تو چلی گئی — مگر تم تو جانتے ہو کہ اس کے جاتے جاتے اس کی کئی نشانیاں میرے پاس رہ گئیں۔ بنتو کی یاد میرے سینے میں آشیانہ بنا کر بیٹھ گئی تھی۔ لوگ کہا کرتے —

"تیری ہک تے آلنا پایا نی گوندیے۔
جنگلی کبوتر نے —"

اے گوندی کا تیرے سینے پر جنگلی کبوتر نے آشیانہ بنا لیا ہے۔ لیکن — یہاں تو خود گوندی جنگلی کبوتر کے سینے پر آشیانہ بنائے بیٹھی ہے — نہ جانے کب سے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ستلج کی لہروں کی طرح بنتو ایک دن ہنستی کھیلتی میرے پاس آتی اور جاتے ہوئے اپنے ساتھ میرا سب کچھ بہا کر لے گئی — اگر تم نے دریاؤں کی زندگی کے متعلق سوچا ہو تو تم قیاس کر سکتے ہو کہ بنتو بھی اصل میں ایک دریا ہی تھی — اس کا معصوم بچپن شاید اس طرح ہوگا جیسے کوئی پہاڑی چشمہ بوند بوند رستا ہے پاکیزہ موتیوں کی طرح درخشاں اور ابھرتا — اور پھر وہ میرے سامنے پل پل پروان چڑھتی گئی۔ ٹپ ٹپ رستا ہوا پہاڑی چشمہ بڑھتا بڑھتا ایک دریا بن گئی۔ اس دریا میں سے لہریں اچھلتیں اور پھر روپوش ہو جاتیں اور جب کبھی ایک طوفان اٹھتا تو پانی میں ہلچل پیدا ہوتی جیسے کناروں کو گلا دے گا۔ اور جب یہ دریا پرسکون ہو جاتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے اس جیسا کوئی بھلا مانس کوئی اور نہ ہو۔ پتہ نہیں کیوں جوں جوں میں بنتو کے متعلق سوچتا ہوں تو وہ ایک بھرپور دریا کی طرح مجھے کبھی چنچل اور کبھی گمبھیر معلوم ہوتی ہے۔

لیجئے میں اپنی دریا جیسی بنتو کی ایک اور جھلک تمہیں دکھاتا ہوں۔ ایک صبح کو جب جیلے کی موت کے بعد میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ بنتو کہیں نظر نہیں آ رہی۔ ادھر ادھر جھانکا۔ اسے پکارا لیکن وہ تو جیسے روپوش ہو گئی تھی۔ اُسے ڈھونڈتا ہوا میں جیلے کی حویلی میں جا نکلا۔ میں ابھی اس کی حویلی کے نزدیک ہی پہنچا تھا کہ اندر سے مجھے بنتو کی دبی دبی چیخوں کی آواز سُنائی دی — میں بھاگ کر اس حویلی کے اندر گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ بنتو دھرتی پر پڑی ہوئی بلک رہی ہو یوں جیسے کسی نے اس پر کاری ضرب لگائی ہو۔

"بنتو —" میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہ کہے اور مجھے دیکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رو تی جائے — میں نے اسے پیار کیا۔ دلاسہ دیا۔ تب جا کر اس نے مجھے بتایا کہ اسے پرسوت پڑ رہی ہے —

"جیلے کی اولاد کے لئے اس نے جیلے کی حویلی انتخاب کی ہے" ایک دم یہ بات میرے دماغ میں آئی۔ مجھے جیسے اس وقت بنتو سے نفرت ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ کیا اسے جیلے کی اولاد سمیت جا کر ستلج میں بہا آؤں۔ اس نے میری آنکھوں میں نفرت کی یہ جھلک دیکھ لی تھی — وہ بولی "اسی لئے تو میں یہاں چلی آئی۔ اس میں میرا کیا قصور ہے"
اور میں نے سوچا کہ واقعی اس بیچاری کا کیا قصور ہے۔
اس کے بعد وہ دھرتی پر پڑی بلکتی رہی۔ کبھی چیختی تھی کبھی ہچکیاں لیتی تھی اور کبھی کبھی چپ چاپ پھیل کر لیٹ جاتی تھی — نحیف اور نڈھال ہو کر — میں اس طرح اُسے کتنی دیر تک جدوجہد کرتے دیکھتا رہا — کبھی

زندگی سے اور کبھی موت سے ـــ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی ۔ اور اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں ـــ اس نے پانی مانگا اور میں پانی لانے کیلئے ستلج کے کنارے کی طرف دوڑا ـــ جب میں واپس آیا تو بنتو ماں بن چکی تھی ـــ ایک میٹھی سی مسکراہٹ اس کے سارے چہرے پر پھیل رہی تھی ۔ ایک صناع کی طرح جو اپنی تخلیق کے مکمل ہونے پر خوش ہوتا ہے ۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا ۔ میں نے آج تک اُسے کبھی یوں نہیں دیکھا تھا ۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ اندازہ لگایا کہ کسی کو زندگی دینا کسی کو ہلاک کر دینے کی بہ نسبت کتنا عظیم کام ہے ـــ میں آج تک تاریکی میں رہا تھا ۔ مجھے تو صرف موت ہی کا علم تھا ۔ میں نے ان گنت لوگوں کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھا تھا لیکن بنتو کی اس مسکراہٹ نے میری تاریک راہیں جگمگا دی تھیں ۔

" کسی کو مٹانے کے لئے صرف ایک پل چاہیئے " میں نے سوچا " مگر کسی کو بنانے کیلئے ایک ماں کا کلیجہ چاہیئے ۔ واہگورو جتنی وسعت چاہیئے ۔ کسی صناع کی صناعی چاہیئے " اور میں بہت خوش تھا ـــ

بنتو نے اپنی جیسی ایک اور بنتو کو جنم دیا ۔ جنم دیا اور خود چل دی ۔ دریا کی بھی یہی خاصیت ہے ۔ بہتے بہتے دریا میں سے اگر کوئی نہر نکلتی ہے تو دریا اس کے لئے رک نہیں سکتا ۔ دریا کا کام آگے بڑھتے رہنا ہے ۔ اور وہ مسلسل بہتا چلا جاتا ہے ۔ نہر اپنے راستے پر ہو لیتی ہے کبھی تم نے دریا میں طغیانی دیکھی ہے ؟ ۔ اس وقت اس کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا ۔ کوئی رکاوٹ اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔ لیکن جس وقت دریا چڑھ کر اترتا ہے تو وہ اپنے کنارے پر سنہری ریت چھوڑ جاتا ہے ۔ ریت جس میں سونے کے ریزے ہوتے ہیں ۔ کنکر اور پتھر ہوتے ہیں ـ میں نے بھی اسی ریت پر اپنا محل تعمیر کیا تھا ۔ اس میں میری بنتو کی نشانی کے طور پر ایک ننھی سی بنتو پرورش پا رہی ہے ۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دریا اپنی پرشباب روانی میں اپنے دل کا بھید اپنے لبوں پر لے آیا ہو ۔ آج میں نے بھی تمہیں اپنے اس بھید میں شریک کر لیا ہے تاکہ اس ناطے تم مجھے بھی ایک دریا کہہ سکو ۔ لیکن یہ بھید میرا اپنا بھید ہے ـــ جس بھید کی میں آپ کو کہانی سنا رہا ہوں وہ جیلے اور بنتو کا مشترکہ بھید تھا ۔ مگر میں بھی اس بھید میں شامل ہوں ـــ میں اُسے اپنی بنتو سمجھتا ہوں ۔ وہ بنتو نہیں جو ایک ندی کی طرح میرے اور جیلے کے درمیان آکر پھیل گئی تھی ۔ اور ہمیں دو کناروں کی طرح جس نے

ایک دوسرے سے جدا رکھا ۔ بلکہ وہ بنتو جو نفرت کے زخموں کو اپنی محبت سے رفو کرے گی ۔ آؤ میں تمہیں اپنی بنتو سے ملاؤں ـــ اب میری بنتو سیانی ہو گئی ہے ۔ اس کے خد و خال اپنی ماں کی طرح ہیں ۔ میرے سامنے وہ پلا پل پروان چڑھ رہی ہے ۔ آزاد جنگلی ہرنی کی طرح سارے علاقے میں چوکڑیاں بھر رہی ہے ۔ وہ اس سارے علاقہ کی ملکہ ہے ـــ ابھی ابھی اس دریا کے کنارے پر گھروندے بنا رہی تھی ہو سکتا ہے جھاڑیوں میں تتلیاں پکڑنے چلی گئی ہو ـــ یا کہیں دریا کے کنارے بیٹھی ہوئی شاید لہریں گن رہی ہو ـــ یہ اس کا من بھاتا کھیل ہے ـــ دریا کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکا کر گھنٹوں بیٹھی رہے گی ۔ اصل میں وہ خود بھی تو دریا کی ایک لہر ہے ۔ میں نے کئی بار اسے لہروں سے باتیں کرتے سنا ہے ۔ لہریں اس کو بہت عزیز ہیں ۔ جب بھی وہ لہروں کی اس دنیا میں کھو جاتی ہے تو میں اس سے کئی بار یہ کہتا ہوں ـــ " پگلی ـــ لہروں کا کیا بھروسہ ـــ چھوڑ انہیں ۔ ان کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں ہوتا ـــ "

مگر وہ جیسے لہروں کی زبان سمجھتی ہے ۔ لہریں اس کے دل کے راز کو جانتی ہیں وہ کھلکھلا کر ہنستی ہیں ۔ اور خود لہروں کی " تتلی سل " کی طرح اس کی ہنسی دریا کی سطح پر پھیل جاتی ہے ۔ لہریں اس کی ہنسی کو کہیں دور لے جاتی ہیں ـــ اپنے ساتھ ـــ اور وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی ہے ـــ دور تک پانی کے بہاؤ کو ۔

" پتن سے گذرا ہوا پانی لوٹ کر نہیں آتا " میں پھر اس سے یہ کہتا ہوں کر اور وہ اُداس ہو جاتی ہے ۔

" کیا رکھا ہے سپنوں کے اس دیش میں ـــ چھوڑ انہیں ـــ آؤ چلیں پیر جی کے مزار پر ۔

شام ہو جاتی ہے اور وہ میرے ساتھ لوٹ آتی ہے ۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے وہ پیر جی کے مزار پر چراغ جلاتی ہے ـــ چراغ کی لو اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں میں جگمگا اٹھتی ہے ـــ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے چاروں طرف چاندنی چھٹک گئی ہو اور اس وقت وہ مجھے بالکل مختلف نظر آتی ہے ـــ میرے سامنے اس بنتو کا چہرہ تابندہ ہو جاتا ہے جس نے اُسے جنم دیا تھا ۔ اور یوں ہی چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے ۔ اور لہر سے لہر نکلتی چلی آتی ہے ـــ

پیر جی کے مزار پر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میری ننھی منی بنتو

سندری اُتم چندانی

سندری اُتم چندانی ۲۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو حیدرآباد سندھ میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ اسکول میں ڈرامے اور مضامین لکھنے شروع کئے۔ ۱۹۴۶ء میں "ساتھی" رسالے کی اسسٹنٹ ایڈیٹر رہیں۔ یہ رسالہ کراچی سے عورتوں کے لئے نکلتا تھا۔

۱۹۴۷ء میں موصوفہ کی شادی جناب اُتم سے ہوئی جو سندھی زبان کے اچھے ادیب ہی نہیں بلکہ وہاں کی ترقی پسند ادبی تحریک کے روحِ رواں تھے۔ اس شادی نے اُن کی ادبی زندگی کا رخ بدل دیا۔ اور اردو، مراٹھی اور بنگالی زبانوں کے ترقی پسند مصنفین کرشن چندر، رضیہ سجاد ظہیر، تاپالو ساٹھے اور مانک بنرجی کی کہانیاں سندھی زبان میں منتقل کیں جو ان کے ترقی پسند رسالے "نئی دنیا" میں شائع ہوتی تھیں۔ ۱۹۵۲ء "ممتا" کہانی پر پہلا انعام حاصل کیا۔ دوسری بہترین کہانی "کوشش" پر بھی ۱۹۵۴ء میں پہلا انعام ملا۔ یہ کہانی آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے بھی براڈکاسٹ ہوئی۔ مصنفہ نے پانچ سال کے قلیل عرصے میں ۲۵ کہانیاں، تین ناٹک اور دو ناول "گرتی دیواریں" اور "پریت پرانی ریت نرالی" ناول لکھیں۔ یہ دونوں ناول سندھی زبان میں بہترین گنے جاتے ہیں۔

"گرتی دیواریں" میں مصنفہ نے عورت کی اہمیت اور اس کی جدوجہد فنکاری سے پیش کی ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ عورت صرف بیوی ہی نہیں بلکہ اپنے شوہر کے ساتھ مل کر زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے میں اس کی جیون ساتھی ہے۔ ناولٹ کے دو اہم کردار "ریکھا" اور چندن دو متضاد خیالات کے حامی ہیں۔ ریکھا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عیش و عشرت کی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ اور اس کی دلی خواہش یہ ہے کہ چندن صرف اس کا ہی ہو جائے۔ لیکن چندن بیوی کا ہوتے ہوئے بھی ایک ایسا حساس دل رکھتا ہے جس میں ریکھا جیسی ہزاروں عورتوں، مردوں اور بچوں کے لئے بھی محبت ہے۔ زندگی کی یہ کشمکش کچھ عرصے بعد ریکھا کو مجبور کرتی ہے کہ وہ چندن کے دوش بدوش چلے۔ اور اس کو محسوس ہوتا ہے کہ چندن کے پاس اس کے لئے ہی نہیں بلکہ سب کے لئے ایک محبت بھرا مگر دکھی دل ہے۔

سندری کی تحریر میں دکھی جیون کی تخلیقی تصویر کشی، قوت دار کردار نگاری اور اصلاحی پہلو کے ساتھ ساتھ رنگین بیانی بھی ہے۔ یہ ناولٹ ان تمام خوبیوں کا حامل ہے۔

سندری اُتم چندانی
مترجم: درباری لعل اجوانی

گرتی دیواریں

(۱)

دیپک نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا:۔
"پتاجی! دوکان کا سارا سامان جا رہا اور بازار کا قرض اتنا بڑھ گیا ہے کہ بیوپار سے سنیاس لینے کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں رہا۔"

گوپال داس نے اپنی ساری زندگی جائداد میں دوکان جمانے میں بتادی تھی تاکہ جب دیپک قابل ہوگا تو دوکان اس کے ہاتھوں میں سونپ کر باقی زندگی اپنے دیس میں چین سے گزاریں گے مگر دیپک نے پانچ سال میں ہی دوکان چوپٹ کر دی۔ دیپک کے بھاگ جانے کی اطلاع جب حیدرآباد (سندھ) پہنچی تو اس ہرے بھرے گھر کا نصیب ڈوبنے کی راہ پر ڈھلک رہا تھا۔

گوپال داس ویسے تو اتنے معمر نہیں تھے مگر اس واقعے نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی اور وہ اتنے نحیف ہو گئے کہ اٹھنے کے لئے کمر پہ ہاتھ رکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ زیادہ باتیں کرتے تو کھانسی کا دورہ پڑنے لگتا۔ چوٹ بھی کوئی معمولی چوٹ نہیں تھی ان کی ساری جائیداد بک گئی۔ اس جائیداد کے بل بوتے پر ہی تو انھوں نے ریکھا کی بیس برس تک لاڈ پیار سے پرورش کی تھی اور پندرہ ہزار روپے اپنی بڑی لڑکی کے جہیز میں دے کر اسے چار سو روپے ماہوار تنخواہ پانے والے ہونہار شوہر کے ہاتھ سونپا تھا۔

گوپال داس اب کرائے کے مکان میں رہنے لگے تھے جو رشتے دار ان کے گھر میں ڈیرا ڈالے پڑے رہتے تھے اب بڑے بڑے تیوہاروں پر بھی مشکل سے بلائے جاتے۔ دوستوں کے گھر میں آنا جانا بند ہو چکا تھا۔ جب وہ اکیلے ہوتے تو اپنے ننھے پوتے کو گود میں لیکر کہتے "بیٹے جب دانہ ہی ختم ہو گیا تو پنچھی کیوں آئیں گے؟ چلو ہم دونوں کھیل کر من بہلائیں۔"

بچہ پوچھ بیٹھتا "دادا! میرے ساتھ کھیلنے کے لئے میرے پتاجی کب آئیں گے؟"

پوتے کا یہ سوال سن کر ان کا دل بھر آتا اور دکھ کی گھٹائیں انھیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ گیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ کہتے ـــ "جب اس کو سمجھ آ جائے گی۔ تبھی آئے گا بیٹے۔"

ان کا دل تڑپ اٹھتا۔ آخر اس بچے نے کیا گناہ کیا ہے؟ ماں کے پیار سے تو بچپن میں ہی محروم ہو گیا تھا اور زمونی کے جال میں پھنسا پڑا ہے۔"

ریکھا کی ماں جب کبھی دیپک کی تصویر دیکھتی اسے ایسا محسوس ہوتا گویا اس کی آنکھوں کی روشنی بجھتی جا رہی ہے۔ ریکھا جب اپنے کمرے میں بیٹھی، بینا کے تار چھیڑتے ہوئے درد بھری آواز میں کوئی گیت گاتی تو گوپال داس کے منہ سے آہ نکل جاتی۔ ریکھا کی ماں آنسو بہانے لگتی۔ گوپال داس کہتے۔ اگر ریکھا کے نصیب میں سکھ لکھا ہوتا تو یہ سب کچھ کیوں ہوتا۔ تب اسے ایسا شوہر لیکر دیتا کہ ساری دنیا اس پر رشک کرتی رہ جاتی۔

اور تب اچانک ندر کی ایک آندھی آئی۔ دیس کے بٹوارے کی بھیانک آندھی۔

پہلے تو لوگ سہم گئے پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ حیدرآباد کی گلیاں سونی ہونے لگیں۔ ریکھا کی ماں کہنے لگیں "ـــ پہلے جب مہاماری آتی تھی تب بھی لوگ ایسے نہیں بھاگتے تھے۔ اب ایسا کیا ہو گیا کہ لوگ اپنی جائیداد کوڑیوں کے مول بیچ کر بھاگے جا رہے ہیں؟"

گوپال داس اسے اخبار پڑھ کر سناتے کہ کس طرح لاہور میں مال اسباب اور انسانوں کی تباہی اور دوشیزاؤں کی لوٹ بھی ہوئی ہے۔

اور پھر والدین کی نگاہیں ریکھا کے خوبصورت سڈول جسم پر جا کر
ٹک جاتیں اور اُن کا دل کسی خوفناک تصور سے کانپ اٹھتا جب
ریکھا ابھی بچی تھی اور ماں کے ساتھ باہر نکلتی تو لوگ کہتے "یہ لڑکی
تو تم نے دودھ اور گھی میں مل کر پیدا کی ہے۔"
بیٹی کی خوبصورتی کے متعلق تعریف سن کر رکمنی خوشی اور
فخر سے پھول جاتی اور دل ہی دل میں کہتی کہ اس کومل بچی کو گرم
ہوا نہ لگے۔

ایک دن گوپال داس کی بہن نے آکر کہا "بھیا، بیوپار میں
بھاری نقصان اٹھانے پر بھی آپ کے پاس اتنا کچھ باقی ہے کہ
کہ مشکل پڑنے پر آسانی سے پاکستان چھوڑ سکتے ہیں۔ پرماتما
کی مہربانی سے آپ پر کسی کا قرض بھی نہیں ہے مگر میرے پاس تو
سو دو سو روپے بھی نہیں کہ لڑکیوں کو لیکر کہیں جا سکوں۔"
گوپال داس بولے۔ "بہن ایسا نہ کہو۔ تمہاری لڑکیاں تو ابھی
چھوٹی ہیں جس کے گھر میں سیانی لڑکی ہے وہی سب سے بڑا
قرضدار ہے اگر ریکھا کے لئے دس ہزار بھی بچ رہتے تو اس جھگڑے میں
بھلا اس بوجھ کو سر پر لادے پھرتا ہے تاہم دل کا کنجوس نہیں ہوں
وقت آنے پر سو دو سو دینے سے نہیں چوکوں گا۔"
بہن نے سر جھکا لیا اور بولی ——— "بھیا، بُرا نہ مانو تو ایک
بات کہوں؟"
"کیسی باتیں کرتی ہو بہن۔ تم بھی میرے لئے ریکھا سے کم نہیں ہو۔ بولو
کیا کہنا چاہتی ہو؟"
"تو پھر ریکھا کی سگائی میری دیورانی کے بھتیجے کے ساتھ کر دو۔
لڑکا تین تین کالج پڑھا ہے اور کماتا بھی ہے لین دین کی کھینچا تانی
بھی نہ ہوگی۔ بڑی بہو میکے چلی گئی ہے۔ کام کاج میں ہاتھ بٹانے والی
کوئی نہیں ہے۔"
بہن چلی گئی تو ریکھا کی ماں نے گلا پھاڑ کر اپنا فیصلہ سنا دیا کہ
وہ ایسے کنگال گھر میں اپنی لڑکی کبھی نہیں بیاہے گی۔
شہر خالی ہوتا رہا۔
گوپال داس اخبار پڑھ پڑھ کر ریکھا کی ماں کو سمجھاتے رہے کہ
کس طرح انگریز ایک ضدی بچے کی مانند، جو کھلونے کو اپنے پاس
نہ رکھ سکنے کی حالت میں توڑ ڈالتا ہے، اس دیس کے ٹکڑے ٹکڑے
کر کے تباہی کی آگ بھڑکا رہے ہیں۔
ملک بھر میں سنسنی پھیل گئی تھی سندھ کے گاؤں میں ہر رات
سینکڑوں شادیاں ہونے لگی تھیں۔ لوگ لڑکیوں کو بوجھ سمجھ کر دوسروں
کے کندھوں پر ڈالنے کی دوڑ میں گویا ایک دوسرے سے بازی جیتنے
کی فکر میں حواس باختہ ہو رہے تھے۔
ایک روز پڑوس سے لوٹ کر آنے پر رکمنی سیدھے پتی کے کمرے
میں جا کر بولی۔
"اب تو میرا دل بیٹھتا جا رہا ہے۔ سبھی یہاں سے بھاگنے کی تیاری
کر رہے ہیں۔ ہم جوان کنواری لڑکی کو لے کر کہاں کہاں بھٹکیں گے؟"
گوپال داس نے کہا "پگلی کہیں کی، یوں رونے سسکنے سے تو یہ
مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ تمہیں یہ تو ہوتا نہیں کہ اس کے لئے کسی گھر۔
ور کی تلاش کرو۔ بہن والی بات بھی تجھے پسند نہیں۔"
"آپ کا مزاج بھی کچھ عجیب سا ہے۔ اور بھی تو کئی گھر ہیں۔
ان کی کوئی پوچھتا نہیں بس اسی کی رٹ جاری ہے۔ ہر وقت
دیدی والی سگائی۔ میں کہتی ہوں آپ کو سیتل داس کے گھر کا
خیال کیوں نہیں آتا؟"
"لیکن، ——— چارپائی پر بیٹھتے ہوئے گوپال داس نے کہا۔
"سیتل داس کو چاہیں تیس ہزار روپے، یہاں گانٹھ میں بیس سو
بھی نہیں، چلی ہے ہاتھیوں کے ساتھ گنا کھانے۔"
"روپے تو بہت تھے مگر انہیں ختم ہونے کونسی دیر لگتی ہے یہی
وجہ ہے کہ لڑکی کا بوجھ اتارنے کے قابل نہیں رہے۔"
رکمنی دن بھر آنکھوں سے آنسو بہاتی رہی رات کو وہ دل میں
چبھتے ہوئے نشتر کو برداشت نہ کر کے شوہر سے بولی "اگر دیدی کی
بات مان لیں تو ریکھا بُرا تو نہیں مانے گی۔"
"جا کر ریکھا سے پوچھ لو۔"
گوپال داس کے ہاتھوں پر گرم گرم آنسوؤں کی بوندیں ٹپکیں
چونک کر بولے "ارے پگلی روتی ہے؟ اگر ریکھا کا نصیب اچھا
ہوگا تو اس کا ستارہ ضرور چمکے گا۔"
"——— مگر ریکھا کیا کہے گی؟" بھاری آواز میں ریکھا کی ماں بولی۔
"بھور میں پال پوس کر کانٹوں میں کیسے پھینک دیں؟"
"ہاں، میں کچھ نہ کہوں گی۔"

گریاں دامن سے اُٹھتے ہوئے گرم گرم آنسوؤں کی بوندیں چھلیں۔ ٹک کر بولے

ریکھا نے ہمت باندھ کر جواب تو دیا تھا مگر اب وہ گھبرا کر وہیں رُک سکی اور کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ایک ہفتہ بیت گیا۔ شادی کی ساری تیاریاں جلدی جلدی ہو رہی تھیں۔ اُس دن جیسے ہی ریکھا کی آنکھ کھلی اُسے محسوس ہوا کہ سارا آسمان جگمگا رہا ہے جو کچھ وہ رات بھر سوچتی رہی تھی اُسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی تو پانی میں تیرتے ہوئے پھولوں کی طرح اُس کے دل کے تالاب میں ایک ہی بات تیرنے لگی — — —

— — آج میری شادی ہے — — ''

اُس نے سوچا آخر میری زندگی کی ناؤ بھٹکتی رہی ہے اب کنارہ سامنے ہے۔

اتنے میں اندرا، شیلا اور گوپی تینوں رشتے کی بہنیں اُس کے سرہانے کھڑی ہو گئیں۔ اُن کے ہنسی مذاق سے سارا کمرہ گونج اُٹھا۔ ایک دوسرے کو چٹکی کاٹتے ہوئے وہ ریکھا سے مذاق کرنے لگیں۔

ایک نے کہا "تم نے آج رات بڑا سہانا سپنا دیکھا ہوگا"

دوسری بولی۔ ذرا دیر سے اُٹھی، آج تو ساری رات جاگنا پڑے گا

تیسری لہسن اور پیاز میں ہینگ ملانے کی خاطر بولی "اجی ایک آدھ رات ہی کیا اب تو نجانے کتنی راتیں جاگ کر گزارنی ہوں گی۔ اُن ساری راتوں کے لئے آج ہی نیند پوری کر لینی کیا ؟"

ریکھا شرمائی، مسکرائی، ہنسی، چہکتی، بہنوں کی چٹکیوں کو سہتی ہوئی کسی طرح جا پہنچی، چہرے سے لاج اور مسکان کی لالی دھونے کے لئے گلاس میں پانی لے کر دھونے لگی۔ ہاتھ منہ دھو کر اُس نے اندر جھانکا تو اُس کی ماں، میری بہن اور شیلا تینوں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

ریکھا کو دیکھتے ہی سب خاموش ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر ریکھا کو کچھ کھٹک سا ہوا۔ اُن کے اُترے ہوئے چہرے دل میں نیزے کی مانند چبھنے لگے۔ وہ ماں کے کمرے کے پردے سے ہٹ کر گزری تو دیکھا، اس کی ماں کرسی پر بیٹھی شوہر سے باتیں کر رہی تھی۔ ریکھا کو دیکھتے ہی دونوں چپ ہو گئے۔ ریکھا نے اندر جا کر دیکھا دونوں کے چہرے پر غم کے

رنج کا سایہ پڑا ہوا تھا، اُس کا شک یقین میں بدلنے لگا۔ ضرور کوئی بُری بات ہوئی ہے۔

مگر ایسا بھی کیا راز ہے جو اس سے چھپایا جا رہا ہے ؟

دوسرا کمرہ بھی، جو بیٹھک میں ہے، سنسان تھا، یکا یک گھبراہٹ میں دل گھبرا گیا۔ ریکھا وہاں پہنچی سب غور سے چاچی کی بات سن رہی تھیں۔ ریکھا وہاں پہنچی تو چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ کمرے میں اتنی عورتیں موجود ہونے کے باوجود ریکھا کو جیسا سناٹے کا احساس ہوا وہ سوچنے لگی۔ کہاں جاؤں، کیا کروں؟ یہ سب میری طرف ایسی نگاہوں سے کیوں دیکھ رہے ہیں ؟ اور دیکھ کر اپنا منہ کیوں موڑ لیتی ہیں؟

اُس نے چاہا سب کا دامن کھینچ کھینچ کر پوچھے کہ اُس نے کیا گناہ کیا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی ماں کے کمرے میں گئی، رکمنی غمگین سی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی یہ دیکھ کر ریکھا کے دل کی رفتار رک سی گئی۔ جب ماں کرسی سے گھر میں دوڑ دوڑ کر سب کے کھانے پینے کی فکر کرنی چاہئے اُس وقت اس حالت میں کیوں ؟ وہ رہ رہ کر ہوا میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا ۔ ۔ ۔ کیوں ؟ کیوں ؟ اور کیوں ؟ —

ایک انجانے خوف کے تصور سے اس کے منہ سے چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ وہ دوڑ کر ماں کی گود میں جا گری سسکتے ہوئے اُس نے پوچھا "ماں، آپ سب لوگ اس طرح چُپ کیوں ہیں ؟

رکمنی، ریکھا کے سر پر ہاتھ رکھ کر سہلاتے ہوئے بولی "یونہی بیٹی، کوئی خاص بات نہیں ہے"

" میری قسم ! اپنی چھلکتی ہوئی آنکھیں اوپر اُٹھاتے ہوئے ریکھا نے پوچھا۔

رکمنی کا دل پسیج گیا۔ بولی ... رات کو ایک بُری خبر سُنی ہے۔"

"کیا سُنا ہے"؟ ایسی کونسی بُری بات سُنی ہے ماں ؟ ریکھا بے صبر ہو کر بولی۔ اُس نے ماں کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں۔

ماں نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "رات کو تمہارے پتا جی کے پاس جوہری رام بیٹھا تھا وہ تمہاری جیٹھانی کا رشتہ دار ہے وہ کہتا تھا چندن شکل سے اتنی روپیہ ماہوار کماتا ہے، مگر میاں اتنی

مفلسی ہے کہ بڑی بہو کھانے پینے کی تنگی کی وجہ سے اپنے میکے چلی گئی ہے۔"

ریکھا کچھ دیر خاموش رہی پھر چنچل بچے کی مانند مسکرا کر بولی —
"بھلا اس میں ایسی کیا بڑی بات ہے ماں جو سارے گھر میں اُداسی چھا گئی ہے؟"

بیٹی کی معصوم نگاہوں میں جھانکتے ہوئے رکمنی بولی: "میں نے تمہیں پھول کی طرح پالا پوسا اب تمہیں ایسے کنگال گھر میں کیسے جانے دوں؟ میں تو پہلے ہی انکار کر رہی تھی۔"

ریکھا چونک اُٹھی گوپال داس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بیوی کے آخری الفاظ سن لیے تھے۔ بولے "پگلی۔ تو کیا شادی کے دن سگائی توڑنے کا خیال ہے؟ اب تو وچن دیدیا سو دیدیا۔"

بہو بیٹیوں والے گھر میں لڑکی جا رہی ہے، بھوکوں نہیں مرے گی۔ جو کچھ نصیب میں لکھا ہے وہ تو ہوگا ہی۔ ہم بھی تو مجبور ہیں۔ . .
اچھے بَر، خوش حال خاندان بنا جہیز کے کہاں ملتے ہیں؟"

رکمنی خاموش رہی۔ دل ہی دل میں کہا "یہ مجبوری اور بے بسی ہی تو سب سے بڑا دُکھ ہے۔"

ریکھا چپ چاپ باہر چلی گئی۔ سوچنے لگی۔ ابتک ماتا پتا نے مجھے پالا پوسا ہے اب میرا یہ فرض ہے کہ میں اُن کا بوجھ ہلکا کردوں۔

دوپہر کے کھانے تک ہری رام والی بات تقریباً سبھی بھول چکے تھے، صرف رکمنی ہی اس فکر میں گھلتی رہی تھی۔ بار بار اُسے چکر سا آجاتا تھا۔ ریکھا کی فطرت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ جو اونچے درجے کے رہن سہن میں، ذرا سی کمی بھی برداشت نہیں کرتی تھی، ایسی غریبی میں بھلا کس طرح گذار سکے گی؟ . . . . . اس خیال سے وہ رہ رہ کر اُداس ہو جاتی۔ جب کبھی ریکھا ماں کی یاس اور ممتا بھری نگاہ دیکھ لیتی، اُس کے دل کی بینا پر بجتے ہوئے لگن کے سہانے گیت خاموش ہو جاتے تھے مگر پھر گھر کے شور و غل، سہیلیوں کے جنسی مذاق اور کھل کھلاہٹ کے درمیان وہ سب کچھ بھول جاتی۔

گھر کے رسم و رواج کے خلاف کام کرنا رکمنی کے بس کی بات نہیں تھی، جگا نٹھ خالی ہوتے ہوئے بھی، اُس نے رشتے داروں کو بلا کر گھر بھر لیا تھا۔ دن بھر نئی نویلی دوشیزائیں ریکھا کو چاروں طرف سے گھیرے رہتیں اور اپنے اپنے مدھر تجربے سنا کر اس کے جذبات کو اُکساتی رہتیں۔

۲

سہاگ رات کو ریکھا نے جو کچھ دیکھا، اُسے الفاظ کی شکل دے کر دل کے ایک کونے میں محفوظ کر لیا کہ چندن کے پاس میرے جذبات کو سمجھنے والا دل نہیں ہے۔"

بات معمولی تھی۔ چندن نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "آؤ۔ چارپائی پر آکر سو جاؤ۔"

ریکھا نے انکار کیا۔ "نہیں، میں الگ چارپائی پر سوؤنگی۔" اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

چندن اُداس ہو کر بولا . . . "بد نصیب، اس کمرے میں دوسری چارپائی رکھنے کی جگہ ہی کہاں ہے۔"

ریکھا شوہر کی اس صاف گوئی پر حیران سی رہ گئی۔ اُس نے سوچا تھا کہ اُس کا دولہا اُس کی بل کھاتی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے اپنی چارپائی پر لٹائے گا، پھر ہنس ہنس کر کہے گا: "رانی، کہیں میاں بیوی بھی الگ الگ سوتے ہیں۔ اور بوسوں سے اُس کا مکھڑا کمل اُٹھے گا۔ مگر ریکھا کا تصور صرف تصور ہی رہا۔ وہ آہستہ سے کرسی پر سے اُٹھ کر بستر پر جا لیٹی۔

اُس رات میاں بیوی میں بہت باتیں ہوئیں۔ باتوں ہی باتوں میں زندگی کے مقصد پر خیالات کی لے دے ہونے لگی۔ ریکھا نے کہا "میرے لئے، میرے خیال میں، پتی پتنی کا باہمی پریم ہی زندگی کا مقصد ہونا چاہیئے۔"

چندن بولا: "میں تو دیش واسیوں کی سیوا کرنا ہی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتا ہوں۔"

یہ بات ریکھا کے گلے میں نہ اُتری۔ بولی، "دوسروں کی اُلجھنوں سے ہمیں سروکار؟ دوسروں کی زندگی سے ہمیں کیا تعلق؟ یہ بڑی بڑی، آدرش کی باتیں مجھے نہیں بھاتیں۔" اور اچانک ریکھا کو اپنے چاروں طرف بازوؤں کا بندھن ڈھیلا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کا دل زخمی ہو گیا۔ کچھ دیر تک دونوں میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی اور نہ ہی پھر بازوؤں کا بندھن کسا۔ آہستہ آہستہ پتی کی باہوں سے آزاد ہو کر ریکھا کروٹ بدل کر سو گئی۔

صبح جب وہ اٹھی تب اُسے ایسا لگا گویا رات بھر وہ بُرے سپنے دیکھتی رہی ہو۔ اُسے اپنے سامنے بدن میں درد سا محسوس ہوا۔ کھڑکی کھلے پر سورج کی سنہری کرنوں کو اپنے سہاگ سندور میں چمکتے دیکھ کر بھی وہ خوش نہ ہو سکی۔

بڑے دھیان سے اپنے نئے گھر کی چھت اور دیواروں کو دیکھنے لگی۔ ہر طرف ایک عجیب اُداسی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ریکھا نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک بیس سالہ سانولی لڑکی ہاتھ میں برش لیے ادھر سے جا رہی تھی۔ اُس نے ریکھا کو نکلتے دیکھا تو ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لیے چھجے میں جا بیٹھی۔ دونوں مسکرانے لگیں۔ مگر دونوں کے دل ساون کی گھٹاؤں سے گھرے آسمان کی طرح برسنا چاہتے تھے۔ کملا سوچ رہی تھی۔ کاش میں بھی اسی طرح کسی کی آغوش سے نکل کر آفتاب کی نئی کرنوں میں اس کائنات کو دیکھتی اور ریکھا سوچ رہی تھی کہ بیتی رات کو بھول جائے اور میں اپنے پچھلے سنسار میں لوٹ جاؤں! مگر دونوں بے بس تھیں۔ ایک کا باپ غریب تھا، دوسری شادی کے بندھن میں جکڑ چکی تھی۔ دل بھاری ہوتے ہوئے بھی کچھ دیر دونوں ہنس رہی تھیں۔

تین دن کے اندر ہی ریکھا اور کملا ایک دوسرے کو بُری طرح چاہنے لگیں مگر اُن کی یہ محبت دونوں کے لیے بہت مہنگی ثابت ہوئی۔ چوتھے دن کملا نے ریکھا کی ساس سے کہا۔ "پھوپھی، آج بھیا مجھے لینے ضرور آئیں گے۔"

اور سچ مچ ہی کملا اُسی روز اپنے گھر چلی گئی۔

ریکھا کی جیٹھانی اُس دن دوپہر کو ہی جھگڑ کر میکے چلی گئی تھی۔ ایسے تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ گلاب (جیٹھ) کی ماں دھوپ میں گیہوں چھان رہی تھیں، ساتھ ساتھ اپنے بوڑھے جسم کو دھوپ میں گرما بھی رہی تھیں۔

اگرچہ سردی زیادہ نہ تھی پھر بھی گلاب کی بیوی دھوپ میں گرم پانی سے اپنے بچے کو نہلا رہی تھی، اتفاق سے پانی کی کچھ بوندیں چھٹک کر گیہوں میں جا گریں۔ گلاب کی ماں نے کہا: "دیوی ذرا ہٹ کر بچے پر پانی ڈال، سردی تو اتنی زیادہ نہیں ہے جو دھوپ میں گرم پانی سے نہلا رہی ہو۔"

بڑی بہو جلتی بھنتی بولی: "ماں جی، پھر آپ کو کیوں سردی لگ رہی ہے جو دھوپ میں بیٹھی گیہوں چھان رہی ہیں؟ کیا صرف بچے کے لئے ہی سردی کم ہے؟"

اُسی وقت ریکھا نئے بھڑکیلے لباس میں ساس سے میکے جانے کے لیے چھٹی مانگنے آئی۔ دیوی ایسی جلن میں جل رہی تھی اُسے یہ معلوم نہ ہوا کہ ریکھا پیچھے کھڑی ہے۔ جان بوجھ کر اُس نے سارا پانی بچے پر اُنڈیل دیا۔ ریکھا کی ساڑھی پر پانی کی کچھ بوندیں جا پڑیں۔ اُسے گھر میں آئے ابھی تین ہی دن تو ہوئے تھے، وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی مگر اُسکا چہرہ ضرور اُتر گیا۔

ساس مسکراتی ہوئی بولی: "ہاں ہاں، جاؤ چھوٹی بہو، بھگوان تمہیں خوش رکھے!"

ریکھا تو چلی گئی مگر بڑھیا خاموش نہ رہی۔ بولیں۔ "بیچاری کتنی بھولی لڑکی ہے نئی ساڑھی خراب ہو گئی مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔"

بڑی بہو کے سینے میں گویا تیر سا چبھ گیا۔ جب سے نئی آئی ساس ریکھا کے رُوپ اور گُن کی تعریف کرتی آ رہی تھیں جیسے ہر بات میں دونوں کا مقابلہ کر رہی ہوں۔ بڑی بہو بولی

"ہاں جی، دُوسری تو تمہارے ساتھ جھگڑتی رہتی ہے؟"

بڑھیا اُڑتی چڑیا کو پہچاننے والی تھیں۔ بولیں۔

"میں نے تمہیں تھوڑے ہی کہا۔ آنکھوں بھی دیکھا؟ بیچاری کی ساڑھی خراب ہو گئی، دُکھ نہیں ہوگا؟"

"دُکھ نہیں ہوگا!" ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے دیوی بولیں۔ "جو گھر میں کچھ لائے گی وہی کچھ بول سکے گی۔ جو لائے گی ہی کچھ نہیں وہ بولے گی کیا؟"

ساس بولیں: "تم لین دین کی باتیں نکالنے والی کون ہوتی ہو؟ بھگوان نے میرے چندن کے نصیب میں جو کچھ لکھا ہو گا وہ اُسے دیگا ہی۔"

دیوی نے حسد کی آگ میں جلتے ہوئے کہا: "جانتی ہوں، مجھے دیکھتے ہی انکے کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے! میں تو آ ہی نہیں رہی تھی۔ پہلے آپ کے ساتھ نہیں رہی ہوں کیا؟ بڑے سُکھ دیئے ہیں؟ کہتی تھیں، شادی میں چل کر ہماری عزت رکھ لو۔ اب شادی ہو گئی نہ۔ اب مجھے کیوں رہنے دینے لگیں۔ اماں نے بہتیرا سمجھایا، سندر کے باپ ہی آ کر تیری خبر لیں گے۔" مگر میں نہ مانی۔ چل سندر اپنے کپڑے

لے آ، تیری ننھیال چلیں گے۔"

شام کو جب ریکھا ٹیکے سے گھر لوٹی تو دیوی گھر میں نہ تھی چندن نے انگیٹھی پر ہاتھ سینکتے ہوئے کہا: "ماں، بھابھی اتنی جلدی کیوں چلی گئیں؟"

ماں نے سارا واقعہ لفظ بہ لفظ سُنا دیا۔ پھر بولیں "نجانے کہاں سے یہ ڈائن میرے گلاب کے گلے آ پڑی ہے۔

"بھیا کو اس بھابھی کی خدمت تھوڑے ہی تھی، اُسے تو پانچ ہزار روپے چاہیئے تھے۔"

"بیٹے، اس میں اُس بیچارے کا کیا قصور؟ اُن پانچ کو پچاس بنانے کے لیئے ہی تو وہ سمندر پار گیا ہے۔ آجکل روپے کو روپا ہی کھینچتا ہے ورنہ اس کالی کلوٹی کو گھر کیوں لاتا؟ آج بھی اُس سے جو کچھ ہوتا ہے بھیجتا رہتا ہے۔"

ریکھا نے کھانا پروستے ہوئے یہ سب کچھ سُن لیا تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں یہ قیاس کر لیا تھا کہ گلاب ضرور کوئی بُرا آدمی ہوگا۔ جس نے روپوں کے لیئے شادی کی ہے مگر جب اُس کی تصویر کی طرف آنکھیں اُٹھا کر باتیں کرنے لگیں تو وہ اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی۔ خوبصورت چہرہ، مسکرانے کے لئے تیار، ریکھا تصویر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

اتنے میں چندن بولا: "ماں تم پانچ منٹ میں ہی دُنیا بھر کی باتیں بتا دیتی ہو"

"اب بھی گھر گرہستی کی طرف توجہ نہیں دوگے تو کب دوگے؟ تمہارے ایسے خیالات کی وجہ سے تو میں نے تمھیں شادی بیاہ کے بندھن میں باندھا ہے"

چندن ٹھنڈی سانس لیکر، کپڑے بدلنے کے لیے جاتے ہوئے کہتا گیا۔

"اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے خیالات کی قربانی دینے کے لئے ہی مجھے بیاہ کروا رہی ہو تو میں ہرگز شادی نہ کرتا۔ میں نے تم پر بھروسہ کیا لیکن ... خیر میرے بجائے تمہاری گھر گرہستی میں چار پہیئے والی ایک نوکر گئی۔"

ریکھا متعجب بھری نگاہوں سے پتی کی طرف دیکھتی رہی، تب تک جب تک اس کے ساتھ جلتی ہوئی پرچھائیں بڑی ہوتے ہوئے اُس سے پہلے ہی کمرے میں غائب نہ ہوگئی۔

کھانے کی تھالیوں سے اُڑتی ہوئی بھاپ کو دیکھ کر ریکھا سوچنے لگی کہ لیکن دن میں جیسے زمانہ ہی بدل گیا ہو۔ اس گھر میں اور اُس گھر میں کتنا فرق ہے؟ وہ گھر بلندی کی چوٹی سے گر رہا تھا جبکہ یہ گھر نیچی گھاٹی میں کھڑا ہو کر بھی اوپر اُٹھنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ خواب تو پہلا گھر بھی کچھ کم نہیں دیکھتا تھا مگر دونوں کے سپنوں میں بڑا فرق ہے اس گھر کے سپنوں میں طلوع آفتاب کی سُرخی اور اُمیدوں کی کرنیں ہیں۔ ریکھا کی ساس سوچتی رہتی ہے میرے سبھی بیٹے کمائیں گے۔ میں نوکر رکھوں گی میرے گھر میں چاندی کے برتن اور چینی کے چائے کے سیٹ چمکتے نظر آئیں گے۔ مگر مُورت جیسی بھیا کی بہو اسی بھی اس گھر میں بُت ہے۔

چندن کپڑے بدل کر کرسی پر آ بیٹھا۔ تو ماں بولی: "چندن، اب پاکستان چھوڑنا ہی پڑے گا۔ پاس پڑوس میں گنتی کے چند گھر ہی تو باقی رہ گئے ہیں۔

چندن نجانے کن خیالات میں گم تھا۔

ماں پھر بولی "ایسی پھول سی خوبصورت بہو لا کر دی پھر نجانے کیوں اتنے اُداس رہتے ہو؟"

چندن کی آنکھیں ایک بار ریکھا کے گلابی چہرے کی طرف اُٹھیں۔ پھر اُس نے ماں سے کہا۔

"ماں، اگر خوبصورت پھول میں خوشبو نہ ہو تو اُس کے پانے میں کونسی خوشی حاصل ہو سکتی ہے؟"

ماں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چندن نے پھر کہا۔ اس دیش کو چھوڑنے کے لئے میرا جی نہیں کرتا۔ ماں! یہاں اسی روپے کی نوکری بھی ہے اور رہنے کے لئے مکان بھی۔ اگر بزرگوں کا مکان چھوڑا تو مکان اور نوکری کے لئے بھٹکنا پڑے گا۔"

ماں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اپنی پونجی کا دھیان آتے ہی وہ چُپ رہ گئی۔

کھانا کھا کر سبھی اُٹھ گئے۔ ریکھا اپنے لئے اور کوئی جگہ نہ دیکھ کر ساس کے پاؤں دبانے بیٹھ گئی۔ اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب اُس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگتی تھیں تو وہ اپنے ٹھکرائی ہوئی عزت کو دل سے لگا کر کروٹ بدل کر سو جاتی تھی صبح چوکے میں ہی ہوتی

سی کہ چندن نوکری پہ چلا جاتا تھا۔ گھر میں اکیلی رکھا ساس اور اپنے دو چھوٹے دیوروں کے لئے کھلونا بن جاتی۔ چھوٹے گوپ اور شیام رکھا کے گورے گورے مکھڑے کو بڑے چاؤ سے دیکھتے تھے۔ مگر ریشمی کپڑوں میں سمٹی ہوئی نئی دلہن کبھی کبھار ہی اپنی خوابیلی دنیا سے آزاد ہو کر اپنی بڑی بڑی آنکھیں اوپر اٹھاتی۔ اس وقت گوپ اور شیام تالیاں بجاتے ہوئے "بہن جی، ماں جی" کرتے ہوئے پلنگ سے جا ماں سے لپٹ جاتے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد چوکے سے باہر نکل کر اُس کا چارپائی کے پیچھے چھپ کر رکھا کے خوبصورت جسم کو دیکھتے رہتے تھے۔ رکھا کی کالی کالی آنکھیں اوپر اٹھنے پر بچوں کے تن بدن میں بجلی سی دوڑ جاتی۔ رکھا سوچتی، کاش! میرے حسن کا جادو چندن کو بھی موہ لیتا!

رکھا ساس کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے لگی گلاب کی ماں پہلے تو اُسے بڑے لاڈ پیار سے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ صرف کھانا بنانے کے وقت ایک آدھ چھوٹا موٹا کام کرا لیتی مگر دھیرے دھیرے رکھا کے روپ کا جادو کم ہونے لگا۔ وہ ڈرپوک ہرنی نہ لگ کر دوڑتی بھاگتی لومڑی سی لگنے لگی۔ اُس نے جلدی ہی گھر کے کام کاج میں مصروف رہنا شروع کر دیا۔ باورچی خانے میں رکھے اناج کے پیپے اور مسالے کی شیشیاں رکھا کے ہاتھ لگنے سے جگ مگا اُٹھیں۔ گھر کی تمام اشیا کہاں کہاں رکھی جانی چاہئیں۔ وہ کہاں اچھی لگیں گی اس کام میں رکھا ساس سے بازی مارتی ہوئی جان پڑی۔ یہاں تک کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی ہے، اس بارے میں گلاب کی ماں کو رکھا سے ہی پوچھنا پڑتا۔ اب ساس رکھا کی چمکدار آنکھوں، سڈول بدن چمکدار کر دو پھڑکتے ہوئے کپڑوں میں سمٹے ہوئے حسن کو رشک کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ رکھا سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھی سی دکھائی دیتی رہی اور چپ چاپ مطمئن پالتو پرندے کی طرح کودتی پھاندتی رہی۔ انجانے میں کبھی منہ سے آہ نکل جاتی تو گوپ اور شیام کو گلے لگا کر من کو ڈھارس دے دیتی تھی!

ایک دن سونے سے پہلے گلاب کی ماں نے رکھا کو اپنے پاس بٹھا کر چارپائی پر لیٹے لیٹے کہا "گنگو کی ماں کے گھر گھڑوں پڑھنا بھی نہ تھا لیکن بہوئیں ایسی ملیں کہ جہیز میں سات سات پیٹیاں اور ڈھیر سارے گہنے لیکر آئیں۔ آج تو گنگو کی ماں کا پاؤں دھرتی پر نہیں پڑتا۔ ولایت میں دوکانیں کھول لیں اور دو نوکر رکھ لئے ہیں"

رکھا ساس کے پاؤں دباتی ہوئی مسکراتی رہی دل میں کوئی ناراض ہو کر کہہ رہا تھا گنگو کی ماں کو میری جیسی خوبصورت بہوئیں تھوڑے ہی ملی ہیں اگر حسن کی قدر ہو تو اُس کی قیمت لگائی جا سکتی ورنہ خوبصورتی کی قیمت ہی کیا؟

رکھا کے چہرے پر دکھ کی لکیریں اُبھر آئیں۔

"تم اسے تانا سمجھ بیٹھیں کیا؟ میں نے تمہیں تو نہیں کہا"

رکھا باہر سے ہنس پڑی مگر دل اور بھی بے چین ہو اُٹھا۔

"تو پھر اس مثال کی کیا ضرورت تھی ماں جی؟" تھوڑا ٹھہر کر رکھا نے سوال کیا۔ اور دل ہی دل میں بڑھیا کی چالاکی پر نفرین دی۔

"بڑی سیانی ہو! اگر ایسا ہی سمجھتی ہو تو بھی میں نے کچھ غلط تو کہا نہیں۔

میں نے بھی بیٹے پیدا کئے اور پالے پوسے ہیں، انہیں سے اُٹھا کر تو نہیں آئی۔ گلاب کی ماں نے چوٹ لگائی۔

رکھا سہم سی گئی۔

دوسرے دن رکھا کے میکے سے چیزوں کا بھرا ہوا تھال آیا جس میں ڈبل روٹیاں گوشت اور کباب وغیرہ تھے، گلاب کی ماں پہلے تو بہت خوش ہوئی مگر جب ساری چیزیں دیکھ چکیں تو جل کر کہنے لگی: "رام کی ماں کو تو سمدھیوں نے ایک بڑا سا چاندی کا ٹفن بھی کھانے کی چیزوں کے ساتھ دیا تھا۔"

رام کی ماں گلاب کی ماں کی چچیری بہن تھی۔ اُس کے گھر میں نوکر تھے اور گھر بڑا گاڑی تھی۔ رکھا نے سوچا، وہ کہہ دے "ماں جی، رام کی ماں تو ٹھاٹھ سے رہتی ہے پھر اُن کی باتیں کیوں کرتی ہو۔" مگر اپنے پتا کی حالت کا دھیان آتے ہی چپ رہ گئی۔ اُس نے سوچا اگر ساس کہہ دیں کہ تمہارے ماں باپ نے آنکھ رہے ہیں تو پھر اُس کے دل کا کیا حال ہوگا؟ اُس نے چپ رہنا ہی ٹھیک سمجھا۔

اتنے میں دوسرا وار ہوا۔

گوشت کے ساتھ برانڈی کی ایک بوتل آنی چاہیئے تھی۔ اتنا کچھ پانے کے بھی ہم حق دار نہیں ہے؟

ریکھا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ نہ جانے اور کون کون سی چیزیں آنی چاہیئے تھیں۔ اُس نے پتی کی طرف دیکھا تو وہ کھانا کھانے میں مگن تھا۔ گویا اس باتوں پر دھیان دینا اس کی عادت کے خلاف تھا۔ پتی کی اس لاپرواہی سے اُسے کچھ ڈھارس ملی۔ گویا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔

(۳)

شام کا وقت تھا۔ سارا آسمان شفق کی لالی سے گلابی ہو رہا تھا۔ گویا سینکڑوں حسیناؤں نے ہولی کھیل کر اپنے حُسن کا گلال آکاش کے آنگن میں بکھیر دیا ہو۔ ماٹونگا کی بستی سے کچھ ہی دُور ناریل کے پیڑوں کا چھوٹا سا جنگل ہے اس کے بعد ایک لمبی سڑک ہے۔ سڑک پار کر کے سمندر کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھی ریکھا سوچ رہی تھی۔ عرصے کے بعد اسے اس نیلے آسمان کے نیچے سانس لینے کا موقع ملا ہے جس کی وجہ سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ آج جی بھر کر اس شفق کی سُرخی کو دیکھتی رہے۔

جب سے پاکستان چھوڑا تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے بیٹھنے کا موقع اُسے نہیں ملا تھا۔ ماٹونگا میں پگڑی دینے پر جو مکان انھیں ملا تھا اس میں صرف دو کمرے تھے۔ حیدرآباد والے لمبے چوڑے اور کھلے صحن والے مکان میں رہتے ہوئے ریکھا نے ایسے چھوٹے چھوٹے گھروں کا کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔ اُسے جب چھت کے اوپر جگمگاتا آسمان نظر آتا تو وہ کھو سی جاتی۔ آج پہلی بار گھر والوں سے بِن پوچھے بنا اس پتھر پر آ بیٹھی تھی۔

دھیرے دھیرے آسمان سے گلابی رنگ اُڑنے لگا۔ اور اُس پر سمندر جیسی گہری نیلاہٹ چھانے لگی تبھی دور سے کسی کی آہٹ سُن کر ریکھا سنبھل کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پتھروں کے ڈھیر سے چندن ٹکرا گیا اور گرتے گرتے سنبھلا۔ ریکھا۔ ریکھا نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا "کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" اور جواب کا انتظار کیئے بغیر ہی دامن سے مٹی جھاڑنے لگی۔

چندن خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد بولا "تمہیں سیر سپاٹے کی تو ممانعت نہیں پھر گھر میں کسی کو کچھ بتائے بغیر یہاں چلے آنے اور خواہ مخواہ سب کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ریکھا کوئی جواب نہ دے کر چپ چاپ پتی کے ساتھ چلنے لگی۔

دہلیز پر گلاب کی ماں گنا چوس رہی تھیں۔ ریکھا کو دیکھتے ہی ادھ چوسا گنا ہاتھ میں لئے بولیں ــــ "کیوں بہو جی گھر کاٹتا ہے کیا؟"

آنچل ٹھیک کرتے ہوئے ریکھا بولی "ماں جی آج گھر میں دل نہیں لگ رہا تھا۔"

"واہ ری دنیا! گھر میں دل نہیں لگتا اور باہر پتھروں پر دل بہل رہا تھا۔ ہم تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔ شیام اور گوپ نے بتایا کہ وہ بنچ پر پتنگ اُڑاتے رہے اور تم پتھروں پر بہار ڈھونڈتی رہیں۔" پھر طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے گنا چوسنے لگیں۔

ریکھا کو گویا جی جلانے کا موقع مل گیا چندن تو دروازے سے ہی ایک دوست سے مل کر آتا ہوں کہہ کر چلا گیا تھا۔ ریکھا اپنے کمرے میں جا کر آنسوؤں سے اپنے من کی آگ کو بجھانے لگی تبھی اُسے محسوس ہوا کہ ساس پیچھے کھڑی ہے وہ سہم گئی۔

"میں نے ایسی کونسی جلی کٹی کہدی جو رو رو کر آسمان سر پر اُٹھائے جا رہی ہو؟ آجکل کی بہوؤں سے تو توبہ ہی بھلی۔"

ریکھا اور زور سے رو پڑی۔ ساس جل بھن کر رہ گئی۔ ریکھا نے بہتیرا چاہا کہ کسی طرح آنسو تھم جائیں مگر آنسوؤں کا سیلاب رکتے نہیں رکتا تھا۔

اُس رات چندن کافی دیر تک جاگتا رہا۔ ماں کے کہتے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ آجکل کی لڑکیاں کتنا تین پانچ سیکھ گئی ہیں، ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی مگر پتی کو دیکھتے ہی سب بند ہو گیا۔

چندن جتنا ہی اُن الفاظ کے متعلق سوچتا اُتنا ہی اس کے خیالات کا گھوڑا اُلجھنوں کے دوراہے پر رُک جاتا۔ آخر اس لڑکی کو کیا چاہیئے؟ وہ خود کیوں نہیں دیکھتی کہ بمبئی کی زندگی کتنی کٹھن زندگی ہے۔ صرف جگہ لینے کے لئے ہی کتنی ہاتھا پائی کرنی پڑی۔ ڈیڑھ ہزار پگڑی دیکر یہ مکان ملا ہے۔ رات دن بھٹکنے کے بعد دو ایک چھوٹی موٹی نوکریاں ملی تھیں وہ بھی جاتی رہیں اب جا کر سنسروان جی مل میں پیر جمے ہیں۔ بی اے کا امتحان دے کر یہ کلرکی قبول کر لی ہے۔ یہ لڑکی

ان سب پریشانیوں کی طرف آخر کیوں نہیں دیکھتیں؟
اس سے زیادہ اس موضوع پر سوچنے کے لئے چندن کے پاس وقت نہیں تھا۔ اُسے کتنے ہی مسائل پر سوچنا تھا۔ بمبئی کی گھٹن زندگی نے اس کے اصولوں کی بنیاد کو ہلا دیا تھا۔ اس کے باوجود اُسکا راستہ الجھنے کی بجائے چوڑا ہو گیا۔ جن نئے سیاسی اور اقتصادی نظریات کو اُس نے اپنایا تھا اُن کو عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے اُس کے آگے کافی لمبا چوڑا میدان موجود تھا اُس کی منزل مقصود پر کامیابی کے سینکڑوں دیپک چمکتے ہوئے دکھائی دینے لگے اور وہ آگے بڑھتا رہا۔

مل کے کارکنوں کی یونین سے ابھی معمولی سی واقفیت ہوئی تھی کہ اُسے یونین کا جوائنٹ سیکرٹری چن لیا گیا۔ مل میں جتنے پڑھے لکھے کارکن تھے، جنہوں اُنکے لئے سٹڈی سرکل چلاتا تھا اسی سرکل میں دوسرے دن اُسے "سرمایہ اور محنت" پر تقریر کرنا تھی اُس نے بہت سی کتابوں میں اس موضوع پر نشان لگا کر رکھے تھے بتی جلا کر روشنی میں پڑھنے بیٹھ گیا۔

بجلی کی روشنی سے ریکھا کی آنکھیں کھل گئیں۔ چندن گریا کری کی بھولی ہوئی بات یاد کرکے اٹھ بیٹھا۔ بولا۔

"جب میں اپنے دوست کے ہاں گیا تھا، تب تم روئیں کیوں تھیں؟"

ریکھا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چندن پھر بولا: "شاید تمھیں یہاں آرام نہیں ملتا؟ اور اچھے اچھے کپڑے بھی نہیں۔"

ریکھا کی پلکیں ذرا سی دیر کے لئے اُوپر اُٹھیں۔ چندن نے دیکھا اس میں دُکھ نہیں توہین کی بُو آ رہی تھی۔ پہلے تو اُسے غصہ نہیں آیا مگر جب بارہا سوچنے کے باوجود بھی اُسے اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی تو وہ چونک اٹھا۔

سکول و کالج کا ہیرو چندن، دیش بھگت اور گمبھیر سے گمبھیر بین الاقوامی مسائل اور حالات کو سلجھنے والا چندن اپنی ریکھا رانی کے اِس راز کو نہ سمجھ سکا۔ شکست کے احساس اور غصہ کو دبانے کی وجہ سے اُس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئیں۔ ریکھا نے منہ پھیر لیا۔ وہ رو پڑی۔ بے چین دل سے وہ سوچتی رہی۔ اچھا لباس کون مانگتا ہے؟ ٹھاٹ باٹ کسے چاہئیں؟ جتنا وقت وہ گھر میں گزارتا ہے، اخباروں اور کتابوں کو لگا رہتا ہے۔ کالے کلوٹے [illegible] اور گجراتی دوستوں کو ساتھ لے آتا ہے اُنکے ساتھ بیٹھ کر بحث مباحثہ کرتا ہے۔ بڑی دلچسپی سے اُنکے دُکھ درد سنتا ہے مگر میرے متعلق وہ اتنا بے پروا کیوں ہے؟ میں بدصورت یا لولی لنگڑی بھی نہیں ہوں پھر بھی وہ پوچھتا تک نہیں۔ آخر اس آدمی کو کبھی پیار کرنے کی فرصت بھی ملے گی یا نہیں؟ پیار و محبت کی باتوں کو وہ بیکاروں کا کھیل سمجھتا ہے یہ بھی نہیں سوچتا کہ پاس پڑوس والے کیا کہتے ہیں۔ ریکھا کو یاد آیا۔ آج صبح ہی پڑوسن رادھا نے کہا تھا: "چھوٹی بہو۔ تمہارا پاؤں زمین پر نہیں پڑتا مگر اپنے شوہر کا یہ کیا حال کر دیا ہے؟ مرہٹوں کی طرح شرٹ کے ساتھ چپل پہن کر آفس جاتے ہیں کندھوں پر کتابوں کا تھیلا لٹکتا رہتا ہے ..."

ریکھا کیا کہتی۔ اُس کی آنکھیں زمین میں گڑ گئیں۔

مگر رادھا سے ریکھا کی اُداسی نہ دیکھی گئی بولی۔ "تو برا مان گئی کیا بہو؟ تمہارے شوہر سیدھے سادے ہیں تو کیا ہوا، بہتوں سے اچھے ہیں۔ یہ تو تقاضا نہیں کرتے کہ ساس نے یہ نہیں بھیجا سسر نے وہ نہیں بھیجا۔ آجکل کے لڑکے تو سسرال کے پیسوں پر گلچھرے اُڑاتے پھرتے ہیں گھر میں چاہے پھوٹی کوڑی نہ ہو مگر نام کروڑپتی ہی ہوگا۔"

اس بات سے ریکھا کو کافی تسکین ملی۔ آج اُس نے نیلے آکاش کے نیچے بیٹھ کر سمندر کی چنچل لہروں کا لطف اُٹھایا تھا وہ سوچنے لگی آخر اتنا فرق کیوں؟ جو منظر مجھے اتنا سہانا لگا کہ پتھروں سے ٹکرا کر میں قدرت سے باتیں کرنے لگی تھی چندن کو وہ ذرہ بھر بھی متاثر نہ کر سکا؟

کافی دیر تک یہ سوال اُس کے خیالات کے آسمان میں پرندے کی مانند پرواز کرتا رہا اور سوچتے سوچتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔

ریکھا صبح کو اٹھی تو آفتاب آسمان پر ہنس رہا تھا۔ پڑوس کے مندر میں گھنٹے بج رہے تھے گھنٹوں کی آواز نے ریکھا کو بچپن کی یاد دلا دی اس وقت وہاں گیتا اور سکھمنی کا پاٹھ ہوتا تھا۔
ریکھا اُٹھی تو اُس نے دیکھا چندن اور ایک نوجوان کچھ

کا غذ... یہاں سے دیکھ رہے تھے وہ منہ دھو کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُسے اپنی صورت پھیکی جان پڑی۔

اتنے میں چندن کمرے سے بولا۔

"ماں، بہتر ہے کے لئے بھی چائے بھیجنا۔"

ریکھا چائے پینے گئی تو ساس بولیں: "ابھی جاگ کھلی ہے رانی صاحبہ کی؟ دیکھو تو سہی کتنا دن چڑھ آیا ہے۔"

ریکھا بہت شرمندہ ہوئی اور چپ چاپ باہر چلی گئی۔

جب ریکھا نے چائے کا پیالہ بہترے کے سامنے رکھا تو اُسے دو خوبصورت اور سڈول آنکھیں تشکر آمیز جذبات کے ساتھ اپنی طرف اُٹھتی نظر آئیں۔ اُس لڑکے کے کپڑے صاف تو میلے تھے جب وہ جانے لگا تو ریکھا کو اُس کی چال بھی اچھی لگی مگر پاؤں میں چپلیاں پرانی تھیں۔

ریکھا ہنس پڑی، آخر دوست کس کا ہے۔

---

(۴)

گلاب کی ماں کے گھر آج مدت کے بعد چہل پہل دکھائی دی۔ لذیذ کھانے تیار کئے جا رہے تھے اور مصالحوں کی خوشبو سے تر چوکے میں بیٹھی ہوئی پلاؤ پر سے اُڑتی ہوئی بھاپ کو دیکھتی ریکھا سوچ رہی تھی، آنے والے جیٹھ نجانے کس طرح کے ہوں گے اُسے ریکھا کا پکایا ہوا کھانا پسند بھی آئے گا یا نہیں کیا انہیں اتنی فرصت ملے گی کہ ریکھا کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھ کر کہیں کہ ریکھا، تم نے کھانا بہت بنایا ہے؟

تین نئے ٹرنک ایک ریڈیو اور چھ سات چھوٹے چھوٹے بکس آ پہنچے، گرمیوں کی کڑاکے دار دھوپ میں ٹیکسی سے اُتر کر گلاب نے ماتھے سے پسینے کی بوندیں پونچھ کر گھر کی طرف دیکھا، ریکھا کھڑکی کے کونے سے انہیں دیکھ رہی تھی، گلاب کی نگاہ اپنی طرف اُٹھتے دیکھ وہ کمرے میں چلی گئی۔ بچے تالیاں بجاتے ہوئے اوپر آ گئے: "ماں، دادا آ گئے!"

ماں نے بیٹے کا ماتھا چوما اور گلے لگا کر بولی، کاش آج تمہارے پتا ہوتے۔ پھر ریکھا کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگیں: "گلاب، یہ ہے چندن کی بہو۔"

ریکھا کی نگاہیں جھک گئیں۔

ساس نے بڑی شان سے کہا: "کیوں گلاب، چندن کے لئے ڈھونڈی ہے نہ؟ اپنا کھانا دوسروں کے کھلانے سے بڑھیا کر ہر فخر کے ساتھ بچے کا دل پھول اُٹھتا ہے۔ ویسا ہی فخریہ الفاظ کہتے وقت گلاب کی ماں کے دل میں تھا ساس کی طرف نگاہ، بیٹھے ہوئے بھی، کہیں نے دیکھ لیا کہ گلاب اُس کی خوبصورتی سے متاثر ہو چکا ہے۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ ریکھا اب گلاب کے سامنے بھی آنے لگی تھی گلاب کے کپڑے دھو ڈالتی تھی، نئے نئے جوتے صاف کرکے تپائی پر رکھتی، نکٹائیاں اور رومال سمیٹتے وقت اُن میں نکلتی خوشبو سے مست ریکھا کے دل میں ایک خواہش سی اُبھرتی، کاش، چندن کو بھی ریشمی کپڑے پہننے اور عطر لگانے کا شوق ہوتا۔

"ریکھا، یہاں کیا کر رہی ہو، مجھے کل جیسی نمکین روٹی تو پکا دو!" گلاب چوکے کے قریب کھڑا ہو کر کہتا۔ ریکھا شرما جاتی کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ جلدی ہی الماری بند کرکے چوکے میں چلی جاتی تھی۔

گلاب ولایت سے ریڈیو لایا تھا۔ گھر کو ریشمی پردوں سے سجایا گیا تھا۔ اس طرح گھر میں ایک نئی زندگی آ گئی تھی۔

گلاب کی ماں کہتی: "گلاب، اچھا کیا جو ریڈیو لے آئے۔ میں سوچتی تھی کہ کب ہمارے گھر میں ریڈیو کا گانا گونجے گا۔ ریکھا غسل خانے میں ریڈیو کے گانے گنگناتی تھی تو میں منع کرتی تھی۔"

"اچھا، تو ریکھا گانا بھی جانتی ہے؟" گلاب اُچھل پڑا: "میں آج تمہارا گانا ضرور سنوں گا!"

ریکھا کا دل ناچ اُٹھا۔ وہ ہنسنے لگی۔

ہنستی ہی رہو گی یا کچھ گاؤ گی بھی؟ گلاب کے الفاظ میں اصرار تھا مگر ماں نے منہ پھلا کر کہا: "بس بھی کرو۔ بہت ہوا۔ میں ایسی ویسی باتیں اپنے گھر میں نہیں ہونے دوں گی۔ تمہاری چاچی کتنی بڑی ہیں مگر اُن کی بہوئیں ایسی ڈھنگ سے چلتی ہیں کہ کیا کہنا۔"

رات کو گرجیت اور شیام جلدی ہی کھانا کھا کر سو گئے۔ ریکھا ساس اور گلاب کے لئے کھانا میز پر رکھ کر اپنے کمرے میں جا کر فلمی اخبار پڑھنے لگی۔

گلاب نے کہا: "ماں، جسے خوبصورت اور پیار کرنے والی لائق بیوی ملتی ہے وہ بڑا خوش قسمت ہے۔"

ماں نے جواب دیا تھا۔ ہے تو ویسا ہی۔ مگر تمھیں کیا کم خوبصورت
بیوی ملی تھی؟ تم نے خود ہی تو بار بار لڑکی والوں سے کہہ کر رکھی تھی کہ
بیوی ہو مگر وہ پیسہ بہت ملنا چاہیے
"ہاں، آدمی دو کشتیوں پر پاؤں نہیں رکھ سکتا۔ مگر میں بتاتا
ہوں جو پونجی تھی اس سے چھ گنا کر کے آیا ہوں۔ ولایت کا ایک دھیلا
بھی لگایا تو تم سونے کی تھالیوں میں کھانا کھاؤ گی۔"
ریکھا اس وقت، پانی کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے جیٹھ کے
چہرے کے تاثرات دیکھ کر حیران رہ گئی۔ دل ہی دل میں کہنے لگی
جیٹھ کے پاس چاہے جتنا ہو مگر ان کی عمر صرف روپے کے چکر میں بیت
رہی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا، اگر انھیں بھی خوبصورت اور قابل
بیوی ملتی۔
اتنے میں ساس ذرا چلا کر، ریکھا کو سنانے کی غرض سے بولی۔
"ہاں بیٹے، کھالی ہاتھ آنے والی لڑکیوں کو لا کر کیا سکھ ملتا
ہے۔ شوہر رات دن نوکری کرتا ہے پھر بھی اتنا نہیں بچا کر کہیں
سیر سپاٹا کر کے دل بہلائیں۔ ایسی خوبصورتی کس کام کی؟
ریکھا یہ سب کچھ سنتے ہوئے بھی اخبار کے ورق الٹتی رہی۔
آخر بہو کو کیا حق ہے کہ وہ ساس اور جیٹھ کی باتوں میں دخل اندازی
کرے۔
مگر اس کے دل میں ایک ایسی جلن پیدا ہوگئی کہ وہ وہاں بیٹھی نہ
رہ سکی اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

(۵)

اشٹمی کا دن تھا۔ گلاب کی ماں کے گھر آس پڑوس کی سبھی
لڑکیاں آکر اکٹھی ہوئی تھیں۔ گلاب کی ماں ان سب کے آگے
سفید چاولوں کے بھات کے اوپر مٹھی بھر بھر چینی ڈالتی جا رہی تھی۔
پھر اس نے تیل میں انگلی ڈبو ڈبو کر سب کے سر پر لگایا۔ ریکھا سے
بولی۔
"ریکھا بٹیا، پانی کے دو چار گلاس تو لانا۔ لڑکیاں اُن دھق
کہیں"
لڑکیاں شبنم کی طرح شفاف ہنسی ہنس رہی تھیں۔ کچھ شرما رہی
تھیں۔ افریقہ میں سفر کے چھ سال گذارنے کے بعد آیا ہوا گلاب
سامنے کرسی پر بیٹھا بڑے چاؤ سے ان گنوار لڑکیوں کو دیکھ
رہا تھا۔
لڑکیوں نے تھالی میں ہاتھ دھو کر اس کے چاروں طرف پانی کے
چھینٹے دے کر جوٹھے پانی کی بوندیں اڑاتے ہوئے کہا۔

ان دے، دھن دے — ڈولیوں میں منڈے
کاکا کھائے سرکلے — بودیجے چھوکرے
او کملی میں سنگھ — کاکا ے آیا لکھ
او کملی میں دھانیاں — جاکر نگیں کنواریاں

"سنتے ہو کیا کہہ رہی ہیں؟ بیوی بھی ملی اور بیٹا بھی ہوا۔ لاکھوں
کما کر لاتے ہو۔ سبھی لڑکیوں کو اکنی اکنی دو۔"
گلاب اکنی دیتے وقت اداس ہو گیا۔ سوچنے لگا۔ بیوی بھی
ملی۔ بیٹا بھی ہوا۔ مگر اس وقت دونوں کہاں ہیں؟ ساڑھے چھ برس
پہلے جب دیوی اس گھر میں آئی تھی تب بھی ماں نے لڑکیوں
کو کھلایا تھا مگر اس وقت انھیں ایک ایک پیسہ دیا تھا۔ پھر
جلدی ہی گلاب ولایت چلا گیا تھا۔ چھ ماہ کے بعد اس کی ماں
نے لکھا تھا۔ "بیٹے تم نے پھوٹی کوڑی بھی نہیں بھیجی ہے یہاں
تمہاری بیوی نے جھگڑا شروع کر دیا ہے۔ آجکل کی لڑکیوں کو ذرا بھر
بھی کم ملتا ہے تو ساس کا سر پھوڑنے آتی ہیں۔ بات یہاں تک
بڑھ گئی کہ ایک دن خود دیوی کا باپ آیا۔ کہنے لگا، میں نے تمھیں
موتیوں سے لدی ہوئی بہو دی، پانچ ہزار نقد دیے پھر بھی تم لوگ
میری بیٹی کو دکھی رکھتے ہو۔ گھر میں نوکروں جیسا کام لیتے ہو۔ گھر میں
نہ پھل آتے ہیں نہ دودھ — میری بیٹی کو اندر ہی اندر ختم کرنے کی
ٹھانی ہے کیا؟" "نکالو میرے پانچ ہزار روپے نہیں تو کورٹ میں
بلواؤں گا۔ تب میں نے غصے میں آکر کہہ دیا تھا ذرا گریبان میں منہ
ڈال کر دیکھو، خونی ہم ہیں یا تم؟ آئے ہیں ہمیں عدالت کی دھمکی
دینے، لے جاؤ اپنی لاڈلی کو۔ ہماری یہاں بھوکوں مر رہی ہے نہ۔
دیکھیں تم کتنے دن اس کا پیٹ بھر سکتے ہو۔ تب دیوی کا باپ
اسے کھینچتا ہوا لے گیا تھا اور دیوی بھی سب کے سامنے جوتے
کی ایڑی سے ٹپ ٹپ کرتی ہوئی جنگ میں جیتے ہوئے سپاہی کی
طرح چلی گئی تھی۔"
تین مہینے کے بعد ماں نے پھر لکھا تھا۔ بیٹے، مبارک ہو۔
تمہیں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ دیوی اپنے میکے میں ہے۔ اپنے پوتے

کو آنکھوں سے نہ دیکھ سکی مگر میری برسوں کی آرزو پوری ہوئی کہ میں اب دادی بنی ہوں۔"

اُس وقت افریقہ کے جنگلوں میں بھرتی کرنے کے لئے گلاب نے کپڑے کی گٹھڑی اپنے کندھے پر اٹھا رکھی تھی مگر خط پڑھنے کے بعد وہ بہت دیر تک آرام کرسی پر لیٹا رہا۔

وہ ایک سہانے تصور میں کھو سا گیا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گھوم گیا۔ اپنے دھوپ سے کمہلائے ہوئے بدن کو دو نرم ہاتھوں کے چھونے کے احساس نے اُس کے دل میں گدگدی پیدا کر دی تھی۔ آج بھی لڑکیوں کا گایا ہوا 'بیوی تجھے چھوکرے' مصرع سُن کر اس کے دل میں یاد کی ایک میٹھی سی ٹیس اُبھر آئی۔

رات کو بستر پر سوتے وقت گلاب نے ماں سے پوچھا۔

"ماں، کیا دیوی اب ہمیشہ کے لئے میکے میں رہے گی؟"

ماں کے چوٹ سی لگی۔ بولی۔

"بیٹے، چندن کی شادی پر اُسے ہاتھ جوڑ کر لوا لائی تھی۔ اگر اتنے دن میکے میں نہ رہتی تو گھر کا بھی کچھ نام ہوتا اور چندن کو بھی جہیز سے لدی ہوئی بہو ملتی۔

بھگوان کرے، ایسی بیوی کسی کو نہ ملے، اُسے اپنے پتا کی دولت پر اتنا غرور ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔"

"میں بھی پورے تیس ہزار لایا ہوں، جب نیا مکان بنے گا تو دیکھنا کیسے آکر پاؤں چومتی ہے۔"

ریکھا اُس وقت دودھ کا پیالا لے کر پتی کے پاس جا رہی تھی۔ اُس کے دل میں دیوی کے خلاف بڑی نفرت تھی۔ شوہر کو ساری کہانی سُناتے ہوئے بولی۔

"دیوی اتنی نیچ کیسے ہے؟ جب پتی غریب تھا تو میکے چلی گئی اور اب وہ کما کر لایا ہے تو اس کے پیروں پڑے گی۔ دولتمند گھروں کی لڑکیاں کیا اتنی گری ہوئی ہوتی ہیں؟"

چندن بولا "عورت کو صدیوں سے اپنا پیٹ پالنے کے لئے مرد کا محتاج بننا پڑا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی فطرت ایسی ہو گئی ہے۔"

ریکھا اپنے متعلق سوچتی ہوئی بولی "مگر سب عورتیں تو ایسی نہیں ہوتیں۔ جن میں سمجھ بوجھ ہے وہ یقیناً ایسی نہیں ہوتیں۔"

ریکھا جیٹھ اور شوہر کی باتوں کے متعلق سوچتی ہوئی سو گئی جب سویرے اُٹھی تو اُسے شور و غل سُنائی دیا۔ اُس نے سوچا شاید گلاب اور نیا فرنیچر خریدنے کے لئے ماں بیٹے میں بات چیت ہو رہی ہو گی کیونکہ پچھلے تین دن سے گھر میں یہی ہو رہا تھا۔ مگر اب تو ایک عورت کی آواز سُنائی پڑ رہی تھی۔ اُس نے باہر آکر دیکھا تو سامنے دیوی چارپائی پر بیٹھی ہوئی زور زور سے تُو تُو، میں میں کر رہی تھی۔

ساس بولیں "اُس وقت تو آپ بھاگ گئی تھیں جیسے پڑی ہوئی روٹی کھانے جا رہی ہو۔ چندن کی شادی پر بُلا لائی تو تین دن بھی پیر نہیں ٹکے۔ سمجھتی تھی غریب ہیں سو بدنامی کروا تی پھرو گی سالے آؤ نہ اپنے باپ کو جو تمہیں لینے آئے تھے۔ آئیں تو ذرا اُس سے بھی سمجھ لوں۔"

دیوی روتی سی آواز میں بولی "وہ تو بھرے بازار میں بکتے ہیں کہ اب تیرا شوہر کما کر لایا ہے جا کر اُسی کے پاس رہو میرے پاس اب تمہارے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے شہر بھر میں بدنامی ہو رہی ہے کہ شادی شدہ بیٹی کو گھر میں بٹھا لیا ہے۔"

"اب ہو رہی ہے بدنامی؟" ساس اِن الفاظ کو زور سے دُہراتی ہوئی بولیں "تو پہلے کیا رعب سے پیٹ آیا تھا؟ اوکھلی میں سر دیا جاتا ہے تو موسل سے نہیں ڈرا جاتا۔ کرو نہ اب بدنامی کا سامنا۔"

ریکھا نے دیکھا جیٹھ اپنی بیوی کے پیچھے کھڑے ہو کر ماں کو خاموش رہنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ وہ سوچنے لگی آخر شوہر بیوی کی برائیوں پر پردہ نہ ڈالے گا تو اور کون ڈالے گا؟

اتنے میں گلاب کی ماں بولی "اگر رہنا ہے تو اپنی تیس ماری کو چھوڑنا ہو گا۔ شام کو جا کر میکے سے کپڑے وغیرہ لے آنا۔"

دیوی گھر میں آکر رہنے لگی تو ایک مہینے کے اندر ہی اُس کے ٹھاٹھ بدل گئے۔ اب وہ بن ٹھن کر رہنے لگی۔ بنا بلائے میکے سے آنے کی بات وہ بھول چکی تھی اور شک تھا کہ گلاب کی ماں پر طعنوں کی بوچھاڑ کرتی تھی۔ گلاب کی ماں دیسے تو غرّاتی رہتی تھی کہ گلاب کا دبدبہ اور بے رُخی دیکھ کر ایک نامعلوم خوف سے کانپ اُٹھتی تھی وہ دیکھ رہی تھی کہ گوپ اور شیام کو آدھی پیالی دودھ بھی نہیں مل پاتا جبکہ چھوٹے سندر کو دیوی لبالب پیالا پلاتی

...تھی۔ ایک دن دیوی کو جواب دینے کے لئے اس نے منہ کھولا ہی تھا
دیوی بول اٹھی
"مرنا کہ میرا پتی کما کر لایا ہے ورنہ کیا یہاں سب دودھ
پیتے تھے؟"
دیکھا جب دیوی کے اس طرح کے زہریلے جملے سنتی تھی تو سوچتی
تھی کیا یہ بھی عورت کا ایک روپ ہے؟
آہستہ آہستہ معاملہ بڑھتا گیا۔ گلاب دن بھر گھر میں بیٹھے بیٹھے تنگ
آجاتا تھا اگر ایسے میں دیوی آکر کچھ کہہ دیتی تو غصے میں اپنے ضمیر کو قابو میں
رکھنا اس کے لئے ناممکن ہو جاتا۔
ایک دن دیوی سسکتے ہوئے پتی سے کہنے لگی "آپ اب سے
...ں کبھی بھی مطمئن نہیں کر سکتے۔ یہاں کبھی بھی مصالحہ نہیں ہے نہ
کبھی کمی نہیں ہے اور آج پاپڑ نہیں ہیں۔" پھر ایک ٹھنڈی سانس
بھر کر بولی "دو پاپڑ پڑے تھے سندر نے، گوپ نے سینک کر
دیئے اب گوپ اور شیام بھی ضد کر رہے ہیں کہ ہمیں بھی پاپڑ چاہئیں"
گلاب کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس نے بنا سوچے سمجھے
گوپ اور شیام کو ایک ایک تھپڑ دے مارا۔
ماں بولی: "ہائے رام رے"
گلاب کا سر چکرا گیا۔ چڑ کر بولا "بڑھیا۔ تم نے ہائے رام کیوں کہا؟"
"بیٹا، ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ سندر بڑی خوشی سے کھائے
میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں مگر گوپ اور شیام بھی تو کسی اور کی کوکھ
سے پیدا ہوئے ہیں۔ اتنا سا سندر دو پاپڑ کھائے اور یہ دونوں
دیکھتے رہیں کیوں؟" ماں اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولیں۔
"میں نہیں کہتی تھی کہ یہ میرے سندر کو کبھی دیکھ نہ سکے گی؟" دیوی
کی طرح خوفناک شکل بناتے ہوئے دیوی بولی۔
"کل کی چھوکری، تو نے ہی تو سارا گھر بگاڑ رکھا ہے نہیں تو
چھوٹے بھائیوں پر ہاتھ چلانے کی گلاب کو کیا مجال تھی؟ دن بھر پتی
کے کان بھرتی رہتی ہے۔" گلاب کی ماں کے صبر کا پیالہ چھلک گیا۔
مگر گلاب پر اسکا الٹا اثر ہوا۔ بولا "تمہارا مطلب ہے کہ میں
بیوی کے کہے پر چلتا ہوں؟ اسی کے اشاروں پر ناچتا ہوں؟"
"اور نہیں تو کیا۔ ماں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں ورنہ میرے
بچوں پر کیوں ہاتھ اٹھاتے۔ کیا میرے بچے ادھر ادھر سے آئے ہیں؟

"میرے بچے!" گلاب کا دل گیا ہتھوڑوں کی چوٹ سے کراہ اٹھا۔
میں کیا سیر ہوں؟ ـــ پھر وہ خاموش ہو کر دوسرے کمرے میں
چلا گیا۔
دوپہر کو کھانا بھی نہ پکا۔ ہمیشہ کی طرح آج وہ تاش بھی نہیں کھیلے
جب چندن لوٹا ... اس نے ساری کہانی تفصیل سے سنا دی۔ چندن
نے بھابی کے برتاؤ پر بے چینی ظاہر کرنے اور کچھ ماں کو صبر کا
دینے کے خیال سے کہا۔
"ہاں، ضرورت سے زیادہ دولت آجانے پر انسان کبھی کبھی
اپنے ہوش گنوا بیٹھتا ہے۔"
چندن نے یہ الفاظ آہستہ سے کہے تھے مگر نجانے کس طرح اسکی
بھنک گلاب کے کانوں میں پڑ گئی وہ اپنے کمرے سے ہی چیخ اٹھا
"اگر میرے ہوش ٹھکانے پر ہوتے تو اپنے پسینے کی کمائی یوں
تم لوگوں پر کیوں لٹاتا؟ جب سے آیا ہوں، چھ سو روپے ہوا ہو گئے"
چندن نے کہا "خواہ مخواہ جھگڑا بڑھے گا۔" اس نے بولا "ہو سکتا
ہے ماں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی ہو مگر تمہیں بھی اپنے پر قابو
رکھنا چاہیئے تھا۔"
گلاب چپ رہنے والا نہیں تھا۔ بولا "جی ہاں، ابھی تک
تو کچھ نہیں ہوا مگر جب الگ مکان لیکر رہنے لگیں گے تو یہ تہذیب
یافتہ نوجوان نجانے کیا کیا کہے گا۔ میں نے دیوی کی باتوں پر یقین
نہیں کیا تھا مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ اسکا کہنا لفظ بہ لفظ صحیح
تھا میری دولت دیکھ کر تمہارے کلیجے پر سانپ لوٹ رہا ہے۔
ہمت ہے تو کما کر دکھاؤ۔ دوسروں کو دیکھ کر کیوں جلتے ہو؟"
اب ماں نے بھی منہ کھولا۔ بڑا شور مچ گیا۔ گلاب سب کو جو
منہ میں آیا، سناتا رہا آخر میں تھوکتے ہوئے بولا "کنگال تھے
کنگال ہی رہو گے۔ ابتک اپنا پیسہ دیتا رہا مگر تم نے قدر نہ کی۔
اب خود ہی تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔"
دوسرے دن جب گلاب، سندر اور دیوی سچ مچ ہی ہوٹل
میں جانے کی تیاری کرنے لگے تو گلاب کی ماں آٹھ آٹھ آنسو رونے
لگیں۔ وہ سارا دن سسکتی رہیں "ساری عمر غریبی میں گزاری۔ پھٹے
پرانے چیتھڑوں میں ڈھکے رہے۔ پیٹ پر پٹیاں باندھ کر گزارہ
کرتے رہے اب جا کر بڑی مشکل سے بیٹے کی کمائی سے کچھ سکھ ملنے

لگا تھا تو ایشور سے یہ بھی نہ دیکھا گیا۔

"بھگوان سے نہیں دیکھا گیا یا اس کنگال چندن سے جو چلا ہے مذاق اُڑانے کہ زیادہ دولت ہاتھ آنے کی وجہ سے میں اپنے ہوش کھو بیٹھا ہوں؟"

ماں بولی: "اسی نے تو ستیاناس کیا ہے اگر یہ بھی جا کر کہیں سے کما کر لاتا تو یہ نوبت کیوں آتی؟"

ریکھا نے پہلے ساس کی طرف دیکھا پھر جیٹھ کی طرف گھورتی ہوئی چوکے میں چلی گئی۔

"یہ اُس کی شوہمتی تو ایسے گھورتی ہے جیسے میں نے اُس کے پیکے کی جائیداد چھین لی ہے۔"

ریکھا نے جلتے جاتے سب سُن لیا وہ سوچنے لگی جھگڑا کہاں سے شروع ہوا کہاں جا پہنچا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ چندن بھی تمام باتیں سُن رہا ہے مگر تعجب کی بات دیکھو کر اُس نے چوں تک نہیں کی۔ شوہر کے بس استقلال کو وہ دل ہی دل میں نمسکار کر کے رہ گئی۔

جو ہونا تھا وہی ہوا۔ گلاب رائے نے کولابا میں فلیٹ لے لیا۔ دو چھوٹے بھائیوں کے ہمراہ ماں بھی اُنکے ساتھ جانے والی تھی۔ ریکھا کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اُس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے بڑی مدت سے روتی رہی ہو۔

جب دیواروں سے تصویریں اُتاری جا رہی تھیں تو وہ اس بات کی یاد دلا رہی تھیں کہ دو دنوں کے بعد یہ گھر سنسان کھنڈر سا ہو جائے گا۔ اتنا دکھ ہوتے ہوئے بھی ریکھا بڑی احتیاط سے رو رہی تھی کہیں دیوی اُس کے آنسو نہ دیکھ لے۔ اُس کے سامنے رونا اُسے پسند نہیں تھا۔ برتن بانٹے گئے۔ اپنے حصے میں رکھے ہوئے دو چار چھوٹے موٹے برتنوں کو دیکھ کر ریکھا کا دل ٹوٹ گیا۔ دیوار سے گھڑی اُتارتے ہوئے کھڑکیوں سے ریشمی پردے کھولتے ہوئے دیوی ریکھا کی طرف دیکھ کر ساس بولی: "یہ سب سُندر کے دادا لائے تھے۔"

ریکھا کا اس طرف کوئی دھیان نہ تھا وہ تو جدائی کی آگ میں تڑپ رہی تھی۔ اچھے تھے یا بُرے تھے اپنے ہی تو تھے۔

ساس کے کپڑے ٹرنک میں رکھتے ہوئے ریکھا بولی: "ماں جی بھول مت جانا ہر روز آتی رہنا، اکیلا گھر تو مجھے کاٹ کھائے گا۔"

دیوی جو جلدی جلدی اپنے کپڑے بنڈل میں باندھ رہی تھی بولی "ہم تو جیسے گھر میں بیکار ہیں جو ہر روز آتے رہیں گے اور تمہیں چھپر کھٹ پر بٹھائیں گے؟" ریگستان کی گرم لُو کی مانند ایک ایک لفظ جلانے والا تھا۔ ریکھا اور ساس ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی خاموش ہو گئیں۔

دیوی پھر بولی: "ماں جی، اس سے کہو دو خوش قسمت ہے۔ کیلی تم رہو گی ہم کیسے یہاں آ کر جھگڑیں گی؟"

ریکھا نے چاہا کہ وہ بھی کہہ دے "دیوی، بغیر آگ کے جل بھن کر تیل کوئلہ کیوں بنی جا رہی ہو؟ گھر جانے ہوئے کو کیا کہے، وہ خاموش رہی آج دیوی کا پلڑا بھاری تھا ریکھا کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔

جدا ہوتے وقت گلاب کی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا جھرنا بہہ نکلا۔ ریکھا سے گلے ملتے بولیں۔

"تم جیسی کومل کلی کو چھوڑ کر جانے کو تو جی نہیں کرتا مگر کیا کروں کہیں گلاب بُرا نہ مان لے۔ ساری زندگی تو پریشانیوں میں گنوا دی اب باقی گھڑیاں تو کچھ آرام کروں؟"

شیام نئے مکان کے جانے کی خوشی میں اُچھل کود رہا تھا۔ ہاں گوپ کچھ اُداس تھا۔ دونوں کا ماتھا چومتے وقت بھی ریکھا رو دی وہ دونوں چلے گئے۔ دیوی تو اپنے چپل پھٹ پھٹاتی ہوئی رعب جما رہی تھی۔ سارے گھر سے اچھی اچھی چیزیں چھٹنے سے ہی اُسے کہاں فرصت تھی اسی مستی میں "اچار رکھا" کہہ کر مصالحے کی شیشیاں بالٹی میں ڈال کر چلتی بنی۔

چھوٹا سُندر بولا: "ریکھا کاکی تا... تا...."

ریکھا نے جب اس چھوٹے شیطان کا مُنہ چوما تب گویا کسی ندی کا باندھ ٹوٹ گیا ہو گھائل سپاہی کی طرح وہ اوندھے مُنہ بستر پر جا گری اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تکیہ گیلا ہو گیا مگر دکھ کم نہ ہوا۔

(۶)

رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ چندن ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ باہر ہوا گھوم گھوم کر پتیوں سے ٹکراتی ہوئی بوندوں کو اپنی گود میں لئے بہی جا رہی تھی۔ ریکھا اپنے گرم بدن پر ہوا کے ٹھنڈے احساس کی وجہ سے اور بے چینی سے سوچنے لگی ایسی سونی اور بھیانک راتوں کا خاتمہ کب ہوگا؟

مگر پھر؟ ایکا ایک اس خیال پر وہ کانپ اٹھی۔
نہیں، نہیں وہ ایسا کبھی نہ ہونے دے گی! یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ بے جان پتھر کی طرح بے حس، آج کل سارا دن کام کی چکی میں پستے رہنا... رکیھا تو سمندر کی طرح خاموش رہتی ہے مگر وہ سمندر ہی کیا جس میں کبھی [illegible] نہ آئے، طوفان نہ آئے؟

رات کی تاریکی اور بھی گہری ہوتی گئی۔ رکیھا نے جمائی لی تو چھاتی کے دائیں طرف ہلکا سا درد ہونے لگا۔ وجہ معلوم کرنے کے لئے اُس نے اپنے دل کو ٹٹولا تو دل نے صفائی میں ایک عجیب تصویر پیش کی۔

صبح جب وہ اپنے لمبے، گھنے اور کالے بالوں کو سنوارتی ہوئی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تو اُس کے دل میں ایک خواہش جاگ اُٹھی تھی، جب سے اُس نے جوانی میں قدم رکھا تھا تب سے وہ چاہتی آ رہی تھی کہ اپنے بالوں میں خوشبودار تیل لگائے تاکہ جب محبوب نزدیک آئے تو پیار سے اُنھیں چومے اور اپنے ہاتھوں سے اُنھیں سہلائے اور تب تک سہلائے جب تک اُس کے جسم کی رگ رگ میں خوشی سرایت نہ کر جائے۔

مگر چندن کو فرصت کہاں؟

وہ آئینے کے سامنے کھڑی بالوں کو سنوارتی رہی جب بالوں میں ربن سے پھول بنا چکی تو اُس نے ایک چھوٹی سی ڈبیا اُٹھا کر اپنی مانگ میں سیندور لگایا اُس وقت اُس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی مسکراہٹ کھل اُٹھی اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی پھر یکایک وہ اداس ہو گئی۔ آئینے سے ہٹ کر اُس نے ربن کے پھول اُتار کر پھینک دئے۔

اُسی وقت کواڑ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ چندن خالی ہاتھ ہلاتے ہوئے دھیمی چال چلتا ہوا اندر آیا۔ رکیھا اُس کے لئے کھانا پروسنے کے لئے چوکے میں جانے لگی تو چندن نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "ٹھہرو۔"

رکیھا شوہر کی طرف بغیر دیکھے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ آج وہ اتنی غمگین تھی کہ اُسے اس بات کا پتہ ہی نہ چلا کہ کتنی دیر سے چندن اُسکا چہرہ دیکھتا رہا ہے۔ روشنی میں رکیھا کے بال اتنے خوبصورت لگ رہے تھے کہ چندن کے دل میں ایک بار اپنی بیوی کے لئے پیار کی لہر اُٹھی مگر اُسے دوسری طرف دیکھتے پاکر وہ ٹھنڈی سانس لیکر بولا "اچھا، جاؤ کھانا لے آؤ۔"

کھانا کھانے کے بعد رکیھا تو پھر کر بستر پر لیٹ گئی۔ چندن تھوڑی دیر تو کمرے میں ٹہلتا رہا پھر بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ پڑوس کی گھڑی نے گیارہ بجائے۔

رکیھا کو نیند تو ابھی نہیں آئی تھی مگر جب چندن نے پوچھا سو گئی کیا؟ تو جواب نہ دیا، چپ چاپ پڑی رہی۔ مگر یہ بچاؤ بہت دیر تک نہ سکا۔ جب چندن نے اُس کے بدن پر ہاتھ رکھا تو اُس نے چپکے سے ہٹا دیا۔ چندن نے ایک گنہگار کی مانند یہ جرم قبول کر لیا پھر خود ہی پشیمان ہوتے ہوئے بولا "آج مجھے بہت دیر ہو گئی۔" رکیھا خاموش رہی۔

"آج ایک مزدور کی بیوی مر گئی تھی اُس کے اگنی سنسکار کے لئے جانا پڑا۔ اس لئے دیر ہو گئی" چندن نے یہ الفاظ بالکل آہستہ سے کہے اور اُس کی آنکھوں کے آگے ناگو مزدور کا اُداس چہرہ سینما کی تصویر کی طرح اُبھر آیا۔ ناگو اپنی بیوی کی ارتھی کو اس طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اُس کے سارے دُکھ اس ارتھی کے ساتھ جا رہے ہیں۔

چندن کا دل بے چین ہو اُٹھا۔

اُس نے رکیھا کو کھینچ کر اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔ پہلے تو رکیھا بے جان مورتی کی طرح خاموش پڑی رہی مگر تھوڑی کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ سسکنے لگی۔ چندن رکیھا کے اس برتاؤ سے حیران رہ گیا دھیمی آواز میں اُس نے پوچھا۔ تم روتی کیوں ہو؟

رکیھا اور بھی زور سے رونے لگی۔ پہلے تو وہ خود بھی نہ سمجھ سکی کہ وہ کیوں رو رہی ہے کس لئے رو رہی ہے مگر آہستہ آہستہ اس کی دھڑکنیں اُسے کہنے لگیں۔ کاش چندن کی کاغذوں پر چلنے والی انگلیاں کبھی اُس کے بکھرے بالوں کو بھی سہلائیں۔ وہ اُس کے خوبصورت چہرے کو اپنی چھاتی سے لگا کر کہتا رکیھا رانی، تم کتنی سندر ہو! تمھارا حُسن مجھے چکور کی طرح کھینچ لیتا ہے۔ مگر رکیھا اپنی زبان سے یہ سب کچھ کیسے کہے؟ یہ باتیں بھی کیا شوہروں کو سمجھانی پڑتی ہیں؟—

چندن جھنجھلا کر بولا "آج تمھیں بتلانا ہی پڑے گا کہ تمھیں کیا چاہیے؟"

"کچھ نہیں" رکیھا نے جواب دیا۔

"کیا تم نہیں سمجھتیں کہ تمھارے رونے سے مجھے کتنی تکلیف پہنچتی ہے؟"

رکیھا کا دل آج اتنا دکھی تھا کہ اُس پر اس ہمدردی کا بھی کچھ اثر

نہ ہوا الٹا اُسے مذاق سمجھنے لگی۔ اپنے گرشوہر کی آغوش سے چھڑا کر ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

رات کا گھرا اندھیرا دیکھ کر اُسکا دکھ اور بڑھ گیا۔ اُس کے دل میں ایک لہری اُٹھی، کاش چندن باہر آکر اُسے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اندر لے جاتا۔

مگر چندن باہر نہیں آیا۔

وہ پتھر کی طرح خاموش کھڑی رہی۔ بدن کا ایک ایک حصہ درد سے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ بیہوش ہونے سے پہلے وہ غسل خانے تک جا پہنچی۔ اُس تنگ کوٹھڑی میں داخل ہوتے وقت اُسکا دل چیخ اُٹھا۔ یہ کس جرم کی سزا مل رہی ہے مجھے ؟ ہاں تم ہی بتاؤ کہ تم نے مجھے پھولوں کی طرح کیوں پالا ؟ مجھے کلیوں کی کومل پنکھڑیوں جیسا دل کیوں دیا ؟ کیا اس لیے کہ کانٹے اُسے چیر ڈالیں۔ دل پھٹا جا رہا ہے مگر خون کی ایک بوند بھی نہیں گرتی کہ دُنیا اُس کے دُکھ کا اندازہ کر سکے۔ ماں، تم ہی نے تو ایک دن کہا تھا، ریکھا میرے ایک سہانے خواب کی تعبیر ہے، میں نے جس خوبصورتی کا تصور کیا تھا وہ ریکھا کے انگ انگ میں سمائی ہوئی ہے ماں، آکر دیکھو کہ کس طرح تمہارا خواب ٹوٹ رہا ہے۔

آسمان میں بجلی چمک اُٹھی۔

غسل خانے کے کواڑ کانپ اُٹھے۔ ریکھا کی سسکیاں سو گئیں گویا وہ چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ انسان کی شکل کی بجائے کچھ الفاظ ہوا سے ٹکراتے ہوئے اندر آ پہنچے۔ تم روتی کیوں ہو ؟ تمہیں کیا چاہیئے ؟ مجھے محبت چاہیئے۔ ایسا پیار جس میں میں اور تم دونوں ایک ہو جائیں اور سب کچھ بھول جائیں بھول جائیں کہ اس دُنیا کا بھی کوئی وجود ہے ہمارے بدن پر خوبصورت، خوشبو سے پُر کپڑے ہوں چاروں طرف ماحول خوشی سے چہک رہا ہو۔ دنیا کی سماجی اور سیاسی سب تحریکوں سے دُور — تمہاری زندگی میرے لئے اور میری زندگی تمہارے لئے ہو۔

ہوا کے جھونکے کواڑوں سے ٹکراتے رہے۔

کافی وقت گزر جانے کے بعد بھی ریکھا کو لوٹتے نہ دیکھ کر ایک نامعلوم خوف سے چندن کا دل کانپ اُٹھا۔ اتنی رات گئے وہ کہاں گئی ہوگی ؟ آسمان گھنگھور گھٹاؤں سے گھرا ہوا تھا۔ جی لرزا دینے والی ٹھنڈی ہوا غمگین ماحول کو اور بھی ٹھنڈا بنا رہی تھی۔ چندن جھنجھلا کر باہر نکل آیا۔ — پانی برسنا شروع ہو گیا۔

چندن کے سامنے ایک سال پہلے کی ریکھا کا کومل ڈالی کا سا بدن ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھدکتے ہوئے گھوم رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے اُڑتی ہوئی چادروں کو ٹھیک کرتے ہوئے، کمرے میں جاکر میلے کپڑوں کی پوٹلی کو رکھتے ہوئے، بچوں کے کپڑے سیتے ہوئے، اس کے ہونٹوں پر ناچتے ہوئے فلمی گیتوں کے مصرعے گویا اب بھی چندن کے آس پاس گونج رہے تھے۔

اپنے خیالوں میں مگن وہ جیسے ہی آگے بڑھا، ریکھا کی سسکیوں کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی گویا سخت گرمی سے تھکے ہوئے ... کو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا مل گیا ہو۔

چندن نے کواڑ کھول کر ریکھا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اُنکے سہارے اُٹھا کر بستر پر جا لٹایا۔ بہت دیر کے بعد ریکھا کے آنسو تھمے چندن نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

”تم روتی کیوں ہو ریکھا، تمہیں کیا چاہیئے ؟ اور اُس نے ریکھا کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

”کچھ بھی نہیں“ ریکھا نے اپنا سر شوہر کی گود میں چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

”اب اس کچھ نہیں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا“ تھوڑی دیر کے بعد چندن بولا۔

”تمہیں یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، اچھے کپڑے، اچھا کھانا سبھی کچھ تو ہے“

”میں نے شادی صرف کھانے اور کپڑوں کے لئے نہیں کی۔ یہ تو مجھے میکے میں بھی مل رہے تھے“

ریکھا نے ہمت کر کے جواب دیا جیسے وہ آج کوئی فیصلہ کر کے ہی رہے گی۔

”تو پھر تم ہی بتاؤ کہ تم نے شادی کیوں کی تھی ؟“

ریکھا پتی کی طرف گھورتی ہوئی بولی ”بیاہ کا مطلب ہے سُکھ اور سُکھ اور سُکھ وہاں ہے جہاں پیار ہے“

چندن نے کہا ”تم کیسے سمجھتی کہ میں تمہیں پیار نہیں کرتا ؟ ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ میرا پیار صرف تم تک محدود نہیں ہے میرے پیار کا دائرہ وسیع ہے جس میں لاکھوں عورتیں بوڑھے اور بچے آجاتے ہیں جو سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظام کی چکی میں پس رہے

تب میں بس ظلم کرتا نے کے ذریعے ہوں اور میں نے اس انقلاب میں تبدیلی لانے کی ملامیں خود کو پھینک دیا ہے صرف تمہاری محبت کے لئے میں اپنے آدرشوں کی قربانی نہیں دے سکتا رکھا جب تک محبت اور فرض کے درمیان ٹکر نہیں ہوتی تب تک میں دونوں کو نبھاتا رہوں گا محبت اور فرض ایک دوسرے کے راستے میں رکاوٹ بن کر نہیں آئیں تبھی ٹھیک ہے کیونکہ ٹکر ہو جانے پر ایک کو چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔

رکھا چونک اُٹھی اور شوہر کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ چندن کو محسوس ہوا گویا وہ آنکھوں نگاہوں سے پوچھ رہی ہو، پھر میں کہاں جاؤں گی؟

چندن نے نرم لہجے میں کہا "کیوں نہ تم بھی شخصی محبت کو چھوڑ کر دیش کے بھوکے ننگے اور مظلوم عوام کو اپنا سمجھ کر اُنکی خدمت میں لگ جاؤ؟"

"ہم عورتیں کیا کر سکتی ہیں؟ رکھا ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ہماری منزل شادی ہے۔ میں نے سمجھا تھا اس منزل پر پہنچ کر میری زندگی چمک اُٹھے گی مگر میرے ہاتھ میں صرف نا اُمیدی ہی آئی"

"مگر شادی کا مقصد صرف نفسانی محبت ہی تو نہیں ہے۔ شادی تو اس لیئے کی جاتی ہے تاکہ مرد عورت ایک دوسرے کے ساتھی بن کر انسان کی زندگی کو اور زیادہ خوشحال بنانے کی کوشش کریں اور اس راستے پر گامزن ہونے کے لیئے شادی ایک ذریعہ ہے"

"یہ مسئلے تو آپ ہی سب کچھ ہیں۔ شادی شدہ عورت کے لیئے اُسکا مرد ہی سب کچھ ہوتا ہے میں تو بس اتنا ہی جانتا ہوں"

"تم ایسی ہی باتیں اس لیئے کرتی ہو کیونکہ تمہارے دِل میں بغیر مشقت کی اور عیش و عشرت کی زندگی بنانے کی خواہش ہے۔ یہ خواہش ہی تمہیں بے حرکت بنائے ہوئے ہے ورنہ تم اپنی ترقی کا بوجھ مجھ پر نہ چھوڑتیں یہ صحیح ہے کہ آجکل ہمارے سماج میں ابھی مدہتہ خیال کی بہتات ہے مگر اس خود غرضی کے تنگ ماحول سے باہر نکل کر عورتوں کو اپنی آزاد ہستی کا پھیلاؤ کرنا چاہیئے انہیں اپنے علم کے دائرے کو وسیع کرنا چاہیئے انھیں آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہیئے کہ دُنیا کن انقلابات سے گذر رہی ہے اور اُنھیں اُس میں کس طرح کا حصہ لینا ہے"

"آپ کی طرح اخباروں اور کتابوں کو گلے لگا کر دُنیا کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اپنے گھر والوں کی خبر تک نہ لی جائے؟"

"رکھا، کیا تم مجھے اتنا لاپرواہ سمجھتی ہو؟ جو کتابوں کو پیار کرتا ہے کیا وہ انسانوں کو پیار نہیں کرسکتا۔ میری محبت کی وسعت نے کائنات کے ذرے ذرے کو اپنے میں سمایا ہے"

"جس کی محبت خود مجھے ہی مطمئن نہیں کر پائی، اُس میں وسعت کہاں سے آسکے گی؟"

"میری رکھا رانی، میں تمھیں اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا ہوں مگر اب کرنے میں کام کا وقت جا رہا ہے اور یوں مجھے اپنے فرض سے منہ موڑنے کی ذمہ داری تم پر ہوگی"

"اچھا اب میں کبھی کچھ نہیں کہوں گی، کبھی کچھ نہیں مانگوں گی"

"بحث کے دوران کچھ مسائل کو نہ سمجھ پانے پر خود کو چھیڑنے کی کوشش کرتی ہو رکھا؟ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں، قصور تو ہمارے سماج کا ہے جو۔۔۔"

"اچھا جو جی میں آئے وہی سمجھ لیجئے" رکھا زور سے بولی۔

چندن کو ایسا لگا گویا بڑی محنت کے بعد جس کشتی کو کنارے لانے کی اُس نے کوشش کی تھی، تند دار لہروں نے اُسے اس کے ہاتھوں سے چھڑا کر ٹھیک منجدھار میں پہنچا دیا ہے، وہ مجبور، بجھی کی طرح اپنی بیوی کی طرف دیکھتا رہا جس کی آنکھیں آنسو پی پی کر پھول گئی تھیں۔

آخر کار دونوں کو نیند آگئی۔

(۷)

ساس کے الگ ہو جانے کے بعد رکھا بالکل اُداس رہنے لگی۔ چندن کی تنخواہ کے ایک سو پچیس روپوں میں سے چالیس روپے کرایہ دینا مشکل ہو گیا۔ خرچ بڑھ جانے اور تنہائی نے اُس کی رہی سہی خوشی بھی چھین لی۔

کبھی کبھار کوئی پڑوسن آجاتی تھی۔ رآدھا سے اُسکا خاص لگاؤ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی چندن کے دوست بھی آتے۔ بھی جی کہہ کر بلایا کرتے تھے مگر رکھا کو وہ کسی الگ راستے کے راہی معلوم ہوتے تھے۔ ایک ہیرا تھا جو اُسے بھابھی کہہ کر پکارا کرتا تھا اور اپنے دیور ہونے کا

حق جتا تھا۔ ریکھا اُس سے چھوٹا موٹا کام بھی کروا لیتی تھی۔ سکول
کی نوکری سے چھٹی ہونے کے بعد ہیرے کا کافی وقت بچ رہتا تھا
جب ریکھا بیمار پڑی تو ہیرے نے ہی اُس کی دیکھ بھال کی تھی۔

ایک دن دوپہر کا وقت ڈھل چکا تھا اور کوئی چار بجے کو ہونگے
ناٹونگا کے علاقے کا ماحول خاموش تھا۔ کچھ بچوں کے گلی ڈنڈا
کھیلنے کی آواز آرہی تھی ورنہ ہر طرف سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ اسی
وقت تیز قدم اُٹھاتا ہوا ہیرا آ پہنچا۔

ریکھا بولی: "اچھا ہوا جو تم آ گئے۔ میرا دل آج بڑا اُداس ہے۔"
ہیرے نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "بھابی آج کیا یہ اُداسی
تو تمھارے پیچھے پرچھائیں کی طرح ہر وقت لگی رہتی ہے شاید تمھارے
دل میں کوئی بات ہے جسے تم دبائے رہتی ہو۔"

"تم ایسا کیوں سمجھتے ہو؟" ریکھا حیران سی ہو گئی۔

"سچ سچ بتا دوں؟"

"نہیں نہیں جھوٹ موٹ بتاؤ۔" ریکھا ہنسنے لگی۔

"ایک دن صبح سویرے جب میں تمھاری دوا لیکر آیا تھا تب
تمھیں کافی تیز بخار چڑھ رہا تھا تم نے مجھے چندن سمجھ کر اپنے
دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔ ٹوٹے پھوٹے جملوں میں تم نے کہا تھا "تم
دیوتا ہو۔ مجھے ایک چھوٹی سی کومل ہستی چاہیئے . . . . . ایک بچہ
چاہیئے . . . وغیرہ۔

ریکھا کی نگاہیں جھک گئیں۔

"ایک بات پوچھوں بھابی؟ سچ سچ بتاؤ گی نہ؟"

"پوچھو" ریکھا بولی: "جب اِتنا کچھ جان لیا ہے تو بات چھپانے
سے کیا فائدہ؟"

"بیمار ہونے سے پیشتر کیا تمھارے اور چندن کے بیچ کوئی جھگڑا
ہوا تھا؟"

ریکھا کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے وہ آہستہ
آہستہ بولنے لگی: "گھر میں اکیلے بیٹھے بیٹھے گھڑیاں لمبی ہو جاتی ہیں۔
خصوصاً شام کے چھ بجے کے بعد جب دوسرے گھر جگمگا اُٹھتے ہیں
تب تمھارا ساتھی مزدور یونین کے دفتر میں جا کر غریبوں کے دُکھ درد
سُنتا ہے۔ انھیں درخواستیں لکھ کر دیتا ہے . . . مگر اُس وقت
گھر مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اگر ایک چھوٹا سا بچہ ہی میرے سامنے
ہوتا تو میں اُسے گلے سے لگا کر ساری دنیا کو بھول جاتی۔ کہو، سچ کہتے
ہیں کہ کسی کو جنم دے کر کیا اُسے بھکاری بنانا ہے؟ وغیرہ۔ دل ہی دل
میں کڑھتی رہتی ہوں۔ دل پوچھتا ہے میری کوئی خواہش پوری
ہو نہیں پاتی، خواہش اُس کے دل میں پیدا ہی کیوں ہوتی ہے؟
اس سوال نے مجھے اتنا بے چین کر دیا تھا کہ دل کرتا تھا دوسرے
کمرے میں جا کر خوب چیخ چیخ کر روؤں تاکہ میرے دل کی آگ ٹھنڈی
ہو۔ ـــــ میں تمام رات آنسو بہاتی رہی یہاں تک کہ میرے
سینے میں درد ہونے لگا۔ اُس کے بعد میں بے ہوش ہو گئی جب
میرے ہوش ٹھکانے نہیں رہے ہوں گے تبھی بڑبڑا رہی ہوں گی
اور تم نے سُن لیا ہوگا . . ."

ہیرا خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔

"مگر اس میں چندن نے تو کوئی غلطی نہیں کی بھابی!"

ریکھا نے گھبرا کر آنکھیں اوپر اُٹھائیں: "تم بھی ایسا کہتے ہو؟
کیا غریبوں کے ہاں بچے نہیں ہوتے؟ یا صرف امیروں کے پاس ہوتے ہیں؟"

"دیکھو بھابی، سوال صرف بچے ہونے کا نہیں ہے اُنکی پرورش کا
بھی ہے یہ سوال جس تنگی اور بھیانک شکل میں متوسط طبقے کے سامنے
آتا ہے اتنا غریبوں اور امیروں کے سامنے نہیں آتا۔ دولتمند اپنے بچوں
کی پرورش اچھی طرح کر سکتے ہیں اُنکے ہاں بچے ہونا کوئی فکر کی بات
نہیں ہے۔ غریبوں کی زندگی ہی نامرادیوں کی گندی نالیوں میں پلتی
ہے۔ اونچے رہن سہن کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اُنکے بچے
ہانگ مونگ کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔ اُنکے سامنے تعلیم کا کوئی مسئلہ ہی
نہیں اُٹھتا۔ اَن پڑھ ہوتے ہوئے سات آٹھ برس کی عمر میں ہی
کمانا شروع کر دیتے ہیں مگر تم متوسط طبقے کی عورت ہونے کے
ناتے اپنے بچے کی خوراک اور تعلیم، کپڑوں وغیرہ میں ذرہ بھر کی
کمی بھی برداشت نہیں کر سکو گی۔ تمھیں پندرہ بیس برس تک بچے کو
پالنا ہوگا تب کہیں جا کر وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگا۔ چندن، جس نے
ایک عظیم کام کا بیڑا اُٹھایا ہے، اُسے اِتنی فرصت کہاں کہ وہ
اِس سے زیادہ کما سکے؟"

"ٹھیک ہے۔ وہ تو اپنے عظیم فرائض کی سرانجام دہی میں
مصروف رہتے ہیں اور اِس چار دیواری کے اندر میرا دم گھٹنے
لگتا ہے۔"

ریکھا یہاں بھی ایک تم ہی نہیں تم جیسی جتنی عورتیں ہیں ان کی پوری زندگیاں رسوئی گھروں میں بیت جاتی ہیں مگر وہ اس چار دیواری سے ایسی چمٹی رہتی ہیں جیسے کہ یہی اُن کی دولت ہے۔"

"تم تو عجیب باتیں کرتے ہو تیرتھ، یہ چار دیواری ہی تو ہمیں اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے، ورنہ اس کے باہر پاؤں رکھتے نہیں کہ دنیا والے طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگ جاتی ہیں۔ ویسے ہی ہمیں وہ ٹکے سیر سمجھتے ہیں، ہمیں سمجھتے انکی نگاہیں ہمارے وجود کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"مگر میں کہتا ہوں، تم جن لوگوں کی چہک مہک دیکھتی ہو وہ بھی اکثر تم جیسے ہی ہیں فرض اور رشتے داروں کے بوجھ کے نیچے وہ اتنے دبے ہوئے ہیں کہ اُن کی ترقی کا راستہ ہی مسدود ہو گیا ہے اگر وہ بھی حقیقت کو سمجھ کر چلنے کی کوشش کریں تو سماج کا کافی دکھ گھٹ سکتا ہے۔ ایسے کتنے گھر ہیں جہاں کی عورتیں اور لڑکیاں اپنا سارا وقت بناؤ سنگار اور سیر سپاٹے میں گزار دیتی ہیں پھر بھی گھر کی بگڑی ہوئی مالی حالت کو سدھارنے کے لئے آگے ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ پھر بھی کسی فن میں مہارت حاصل کر کے اس کا انسانی زندگی بھلائی کے لئے استعمال کرنے کی اُن میں لگن نہیں۔ آج وہ وقت آ گیا ہے جب عورتوں کو بیدار ہو کر اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر مرد کو مکمل ساتھی ثابت کرنا چاہیئے۔

"ہمارے سماج میں عورت تب اپنے پیروں پر کھڑی ہوتی ہے جب اس کا مرد کمانے سے معذور ہوتا ہے عورت کا اصل کام تو تخلیق کرنا ہے۔"

"اگر اس فرض کو نبھانے کے لئے اُسے بھی کمانا پڑے تو اس میں بُرا ہی کیا ہے؟"

"میں جا کر کماؤں؟" "بس، بس تم نجانے اور کیا کیا کہو گے۔ کہاں ہمارا خاندان اور کہاں عورت کی کمائی! میں اپنے سُکھ کے لئے خاندان کی لٹیا نہیں ڈبو سکتی۔"

"مگر اب تو زمانہ ایسا ہے کہ اگر انسان اپنے اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزارنا چاہے، کالے بازار اور بے ایمانی سے دور رہنا چاہے تو وہ اپنی ضروریات کے مطابق ہرگز کما نہیں سکیگا۔"

ریکھا نے گہری سانس لی اور بولی "ٹھیک ہے۔ جو ہے وہ اچھا ہی ہے جہاں اور ساری تکلیفیں برداشت کر رہی ہوں ایک یہ بھی سہی۔"

تیرتھ خاموش رہا۔ اور پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا "اوہ بہت دیر ہو گئی اور جلدی سے میز سے تو مزی کتاب اُٹھا کر تیزی سے باہر ہو گیا

ریکھا سوچنے لگی۔ آخر یہ انسان کونسی شے ہے پرزے ہیں جو وقت بے وقت چلائے رہتے ہیں۔ اِدھر میں ہوں کہ کسی اچھائی کے سہارے باتیں کرتے ہوئے بنا لئے چلے اپنی زندگی بسر کرتے کو تیار ہیں۔

سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔

ریکھا دیکھ رہی تھی کہ سامنے والے گھروں میں سے —

— لوگ کمانے کے خالی ٹفن اور تھیلیاں ہاتھوں میں لئے مسکراتے چلے آ رہے ہیں۔ ہوا کا ایک جھونکا ناریل کے پیڑوں سے گزرتا ہوا ریکھا کے کانوں تک آ پہنچا۔ اور کہتا گیا "ریکھا! اتنے لوگ تمہارے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں پھر بھی تم اپنے کو اکیلا محسوس کرتی ہو؟"

(۸)

دوسرے دن ریکھا باہر آ کر ڈیوڑھی میں بیٹھ گئی اتنے میں گوپی ترکاری والی کی پوٹلی سامنے والی ڈیوڑھی پر رکھ کر سستانے لگی۔ ریکھا کو سامنے بیٹھا دیکھ کر ستانا بھول کر بھاگنے سی لگی لیکن ریکھا نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

گوپی اور ترکاری کی تھیلی؟ ریکھا کے لئے یہ ایک عجیب بات تھی۔ گوپی اُس کی دور کی رشتے دار تھی۔ حیدر آباد میں اُن کا اپنا ایک اچھا خاصا مکان تھا جس کے کرائے سے ہی گھر کا خرچ چلتا تھا۔ ویسے تو ریکھا اُسے کبھی بازار میں دیکھتی تھی تو اُس سے آنکھ بچا کر نکل جاتی تھی مگر آج اُس کے دل میں بھلائے کیوں انسان سے ایک قسم کا لگاؤ سا جاگ اُٹھا تھا۔ جو دن اُس نے بستر پر سو کر بتائے تھے اُن دنوں میں اس کی یہ خواہش بھڑک اُٹھی تھی۔ اس کا دل اتنا آرام پانے کے بعد نوزائیدہ بچے کے جسم کی طرح کومل ہو گیا تھا۔

ریکھا کے دل میں اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کا سوال اُٹھنا اب ناممکن تھا۔ اس نے پورے زور سے آواز دی "گوپی۔"

گوپی رک گئی مگر اس نے ریکھا کی طرف نہ دیکھ کر پہلے ترکاری کی پوٹلی کو دیکھا پھر سر اٹھا کر بولی "ریکھا بہن کیوں ٹھیک تو ہو نا؟"

"آج تو ٹھیک ہوں مگر پڑوس میں رہ کر بھی تم نے یہ خبر نہ لی کہ میں کتنے دن بیمار رہی۔"

ریکھا نے دیکھا گوپی جھنجھلا رہی تھی۔ وہ جلدی میں ہوں کہہ کر چلتی بنی۔ ریکھا سوچنے لگی۔ گوپی مارکیٹ میں اتنی ترکاریاں خریدنے

رست نہ شرمائی۔ مگر مجھے دیکھتے ہی شرم میں ڈوب گئی۔ ہم متوسط طبقے کی عورتیں بھی کتنی عجیب ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنی اصلی حالت دکھاتے ہوئے بھی ڈرتی ہیں۔ گوپی تو پاکستان بننے کے بعد ہی اس قطار میں آگئی تھی۔ اُس کا شوہر جو وہاں بیکار رہ کر اپنی موروثی دولت کو عیش عشرت میں لٹایا کرتا تھا۔ یہاں مجبور ہو کر سندھ ورتی ہو کر کام کر رہا تھا۔ تین بچوں کی ماں گوپی اس تیلی کی طرح، فکر کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھی۔

ریکھا کے دماغ میں پاس پڑوس کی کتنی ہی عورتیں گھومنے لگیں۔ بہت سے کی باتوں نے اسے متوسط طبقے کی عورتوں کی حالت پر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سوچنے لگی۔ متوسط طبقے کی عورتیں کتنی دکھی ہیں۔ ہزاروں قسم کی پریشانیاں انہیں گھیرے رہتی ہیں۔ بہت مشکل سے اپنا گذارہ کر پاتی ہیں۔ بازار لین دین سے انہیں کبھی چھٹکارا نہیں ملتا اور ہمیشہ گھر سے گھرا۔ پالی میں کٹوتی کرنے کو سوچتی رہتی ہیں۔ پڑوسن رادھا کو ہی دیکھو۔ بیچاری کٹوتی کے وقت سوچتی ہے: بچوں کو کم دوں؟ پھر سوچتی ہے نہیں، ابھی تو مستقبل کے سہارے ہیں۔ انہیں کیسے کمزور رکھا جائے؟ شوہر کی آدھی پیالی دودھ بھی کم کرنے کو تیار نہیں۔ آخر وہی تو کولھو کے بیل کی طرح کما کر لاتے ہیں۔ گھر میں ساس ہے نند ہے، ان کی کٹوتی کرنا اسے مناسب لگتا ہے مگر اس سے پہلے وہ اپنی تھالی پر اپنی ہی کا شوخ نگاہیں ڈال کر کانپ اٹھتی ہے۔ سب سے زیادہ کام کرنے والی سب سے زیادہ فکر میں گھلنے والی عورت سب سے پہلے اپنی ہی تھالی میں کٹوتی کرنا شروع کر دیتی ہے۔ آدھا پھل، کم دودھ کی اور پھر اچار پاپڑ.....

ہر روز نئی کٹوتی ہونے پر پرانی کٹوتی کا دائرہ شوہر، ساس، نند اور بچوں تک وسیع ہوتا جاتا ہے۔ تب بھی آسانی سے گھر کا خرچ پورا نہیں ہو پاتا۔

گھر میں کنواری لڑکی بیل کی طرح بڑھتی جاتی ہے۔ متوسط طبقے کی بیچاری عورت، گھر کی تمام پریشانیوں میں لپٹنے والی رات کو پتی کی باہوں میں تھوڑی دیر کے لئے سہارا ڈھونڈتی ہے۔ مگر وہ دس بارہ گھنٹے کام کر کے لوٹتا ہے۔ اسے بھی تو آرام چاہئے۔ یہ سوچ کر شوہر کا جسم دبانے لگتی ہے۔ اس کا دل کتنی کہانیاں سنانا چاہتا ہے مگر جھجک کے مارے شوہر کے آگے یہ کہانیاں منہ سے نکل نہیں پاتیں۔ اُس کا جسم ایک انوکھی آگ سے دہک اٹھتا ہے اور وہ ایک مجبور سانس بھر کر رہ جاتی ہے۔ اُس کی پیاسی روح صبح کے کھلنے تک شوہر کے چہرے کو دیکھتی رہتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد پتی کا ہاتھ اس کے سر پر ہوتا ہے گویا وہ دلاسہ دیتے ہوئے کہتا ہے "دیوی، تم واقعی ایک ... سب بوجھ کے نیچے دبی جا رہی ہو، تمہارے ہونٹ پیلے پڑ رہے ہیں"

اور بال سفید ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا۔ کتنی کمائی کر سکتا ہوں؟ میں بھی تو خون پسینہ ایک کر کے چین کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں مگر..... اچھا اب کام پر جانے کے لئے دیر ہو رہی ہے۔" اور وہ کوٹ پہن کر نااُمید نگاہوں سے لوٹ آتی ہے۔

ریکھا کو محسوس ہوا جیسے ویسی ہی نااُمیدی اُس کی آنکھوں میں گھر کئے بیٹھی ہے۔ پڑوس میں سبھی گھروں کی روشنیاں جل چکی تھیں سب سہاگنیں اپنے شوہروں کے لئے کھانا پروس رہی تھیں مگر چندن...

ریکھا کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دل کی گہرائی سے ایک چیخ سی نکل پڑی۔ وہ اپنے اندھیرے گھر میں داخل ہوئی۔ اُس تاریکی میں اُسے گوپی کا سایہ گھومتا ہوا دکھائی دیا۔ ریکھا کچھ دیر کے لئے ہنس پڑی۔ عورتوں کا من بھی عجیب ہوتا ہے! دوسروں کا دکھ دیکھتے ہی اپنا دکھ بھول جاتی ہیں۔ اُسے دو چار دن پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ زندگی میں پہلی بار چندن نے دھمکی دیتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔ اگر گھر کی سبزی ترکاری اور اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں وہ خود اپنے ہاتھ سے نہیں لائی تو وہ روٹی نہیں کھائیگا۔

اُس روز تو وہ غصے میں لال ہو کر بولی تھی "کسی کو اس آدمی کی ہوا نہ لگے۔ کتنے ذلیل ہو کر بیوی سے ترکاری لانے کو کہتے ہو۔۔۔ اس سے تو موت بھلی ہے۔"

مگر جب چندن سچ مچ ہی بنا کھائے جانے لگا تو وہ سارا غصہ آنسوؤں سے بہاتی ہوئی باہر نکل پڑی تھی۔ اُس کے تعجب کی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا اُس سے کم عمر والی دو لڑکیاں پنساری سے مول بھاؤ کر رہی تھیں۔ آگے جا کر اُسے رادھا ملی۔ ریکھا نے جھٹ سے سوال کیا۔

"تمہارے شوہر کہاں ہیں جو تم خود ترکاری لینے آئی ہو؟"

رادھا نے عام لہجے میں جواب دیا "مرد بیچارے سارا دن تو کام کرتے رہتے ہیں وہاں سے لوٹتے ہی اِدھر ساگ سبزی لینے آئیں یہ اُن کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ لوکل گاڑیوں میں بیٹھ بیٹھ کر اُن کی ہڈیاں دکھنے لگتی ہیں۔ ہم کیا چارپائیاں توڑنے کے لئے ہی پیدا ہوتی ہیں؟"

اُس وقت ریکھا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُس نے سوچا۔ وہ بحث کرتی ہے جا کر کہے گی، واہ رے بہنی! یہاں تو گھر کی گاڑی کھینچنے کے لئے بھی دو بیل چاہئیں۔

ابھی یہ الفاظ اس کے دماغ میں آئے ہی تھے کہ چندن بس سٹاپ کی طرف دوڑتا دکھائی پڑا۔ وہ دھیرے دھیرے گھر لوٹ آئی مگر بازار کی چہل پہل، آدمیوں اور موٹروں کی تیز دھوپ، دوڑ دوڑ کر بسوں کو پکڑنے کے تواتر اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے گھر کی دیواروں کے اندر آ کے زندگی بے موج ہوا کی طرح گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔

آج بھی اندھیری کوٹھری میں جاتے وقت اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اچانک گوپ اندر چلا آیا اور بولا "ریکھا بھابی یہ لو میرے پیسے، اب میں تمہارے پاس ہی رہوں گا، چاہے مر ہی کیوں نہ جاؤں مگر گلاب دادا کے ساتھ کبھی نہیں رہوں گا۔"

ریکھا نے جلدی سے بتی جلائی اور گوپ کا سر چوم کر اسے گلے لگایا۔ بولی۔

"بہت دنوں کے بعد آئے ہو گوپو۔"

وہ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اسے دیکھ کر اس کے دل کی کلی کِھل اٹھی۔ گوپ کا دل بہت ہی بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ کسی نے بچے کا دل دکھایا ہے۔

"پہلے یہ تو بتاؤ، تمہارا چہرہ روہانسا کیوں ہو رہا ہے؟"

گوپ نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ وہ ریکھا کے گلے میں بانہیں ڈال کر سسکنے لگا۔ کچھ دیر تک دونوں روتے رہے۔ جب گوپ کچھ چپ ہوا تو بولا۔

"بھابی، میں جیسے ہی شیام کو پکڑنے کے لئے دوڑنے لگا، شیشے کی میز سے ٹکرا گیا۔ میز گر پڑی۔ یہ دیکھو میری ٹانگ میں زخم ہو گیا ہے۔ ماں تو دیکھتے ہی ہوش گنوا بیٹھی۔ وہ دوڑتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی کہ کرسی سے ٹکرا گئی۔ کرسی جا کر شوکیس کو لگی اور اس کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ بڑی بھابی جھکڑ سے آندھی کی طرح دوڑتی دوڑتی آئی اور شوکیس دیکھ کر بولی "جنگلیوں کو لا کر محلوں میں بٹھایا ہے! اندھی، ذرا آنکھیں پھاڑ کر تو چلا کر۔ تم سب جانور ہو جانور!" ماں نے چوں تک نہ کی۔ اپنے پھٹے ہوئے دوپٹے سے کپڑا پھاڑ کر میرے پاؤں پر باندھنے لگی مگر بڑی بھابی کا کلیجہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ ہمیں کوستی رہی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے بھی کہہ دیا —— مجھے کیا معلوم کہ یہ شیشہ اتنا کچا ہو گا۔ آئی ہے سٹھائی چانٹا مارنے؛ بولی کلے کے بچے، زیادہ چیں چیں کی تو دانت توڑ دوں گی۔ اس گھر میں تیری ایک بھی نہ چلے گی۔ اس پر میں نے کہا کوئی تیرے باپ کا گھر ہے؟ جس پر اس نے جھٹ سے ایک تھپڑ دے مارا۔ اُدھر ماں بھی مجھے ڈانٹتی رہی۔ پروگریس بُک پر دستخط کروانے کے لئے بھی ماں نے گلاب کے باپ کے پاس جانے کے لئے کہا ... اب میں اس گھر میں کبھی پاؤں بھی نہ رکھوں گا۔

بڑی بھابی، گلاب دادا اور رشنا۔ جو چاہیں کھائیں مگر ہمیں مانگنے کا بھی حق نہیں۔ ہمیں ایسی گھٹیا نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے ہم بھکاری ہوں۔ ہم جنگلی ہوں چاہے جو کچھ بھی ہوں ان کا کیا؟"

ریکھا اب ہنس پڑی۔ "تم جنگلی کاہے کو ہو، جنگلی تو وہ ہیں جو تمہیں جنگلی کہتے ہیں۔"

گوپ کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ وہ کہنے لگا۔

"وہ جنگلی نہیں تو اور کیا ہیں۔ سارے دن دولت پکارتے رہتے ہیں اگر کوئی امیر آدمی گھر میں آتا ہے تو اس کی جوتیاں چاٹنے لگتے ہیں اور جب وہ باہر نکلتا ہے تو اس کی برائی کرنے لگ جاتے ہیں۔ دادا کے دوست کیا ہیں پورے گپی ہیں۔ کرائے کا مکان ہے لیکن کہیں گے ہماری بلڈنگ ہے۔ کسی سے ایک ہزار چھینیں گے تو بتائیں گے دس ہزار۔ دوسرا کہے گا، فلاں کو دیا تو بتایا کہ اب کورٹ میں نکلتا ہو گا۔ سارا دن لوگوں کو ٹھگتے رہتے ہیں۔ بڑی بھابی تو ایسی ہیں جو ہمیں دیکھ کر جل اٹھتی ہیں۔ ہمارے پیٹ سے نکال کر جانور کو دیتے خوش ہوتی ہے ایک دن بلی کے دودھ کی لٹیا گر گئی تو اس نے ماں کا دودھ بلی کو دے دیا۔ ماں تو صبر کے گھونٹ پی گئی مگر میں دودھ پیتا بچہ تھوڑے ہی ہوں۔ اس دن سب مجھے اتنا دکھ ہوا کہ میں نے دودھ پیا ہی نہیں۔ بھابی، بڑی بھابی جو ہمارے ساتھ اتنا برا برتاؤ کرتی ہیں

تو کیا اُسے اس کا اچھا پھل ملے گا؟ گلاب دادا

دوسروں کے گھر جاکر جوا کھیلتے رہتے ہیں اور بڑی بھابھی جل بھن کر رہ جاتی ہیں۔ ایک دن کافی رات گئے میں جاگ رہا تھا کہ دادا شراب پی کر آئے بڑی بھابھی نے شور مچایا تو دادا گنگناتے ہوئے بولے "سشیلا تو مجھ سے نہیں لڑتی۔ چمپا تو تم سے بھی خوبصورت ہے اور سشیلا تو جیتی جاگتی شراب ہے" اُس دن بڑی بھابھی اتنا روئی کہ ہچکیوں کے مارے گھر کانپ رہا تھا۔ صبح کو اُٹھی تو پھوڑے کی طرح کرتی پھری۔

"اچھا، اچھا دوسری باتیں پھر بتانا۔ اُٹھو کپڑے بدل لو میں کھانا بناتی ہوں۔"

آج ریکھا کو محسوس ہوا کہ گھر کی دیواریں بھی باتیں کرنے لگی ہیں۔

(۹)

گوپ اب چندن کے گھر میں رہنے لگا۔ چندن نے دو تین روز تک تو کوئی اعتراض نہیں کیا اور جب ریکھا نے تمام باتیں بتاتے ہوئے یہ کہا کہ گوپ بھی آپ کے ساتھ رہ کر آپ جیسا بننا چاہتا ہے تو وہ بہت ہی خوش ہو گیا تھا لیکن تیسرے دن رات کو کام سے لوٹتے ہی چندن نے اپنی جیب سے ایک خط نکال کر ریکھا کو دیا اور کہا۔ اب گوپ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔

ریکھا نے خط پڑھا تو اپنے کو روک نہ سکی اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہ نکلی وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور خط کو ہاتھوں میں مسل دیا۔ خط میں گلاب رائے نے ویسے تو بہت سی انٹ شنٹ باتیں لکھی تھیں مگر ساتھ میں یہ بھی لکھا تھا کہ گوپ چونکہ دو سال کے بعد کمانے لگ جائیگا اس لئے اب تم لوگ اُسے ہم سے چھین کر لے گئے ہو۔ یہ بات دونوں کی برداشت سے باہر تھی۔ خصوصاً ریکھا کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کسی طرح من کو تھام کر وہ لیٹ گئی۔

دوسرے دن بڑی منت کر کے گوپ کو گھر لوٹ جانے کے لئے راضی کر سکی اور اس شرط پر کہ وہ بھی اُسی کے ساتھ جائیگی۔

ریکھا کے گلاب رائے کے گھر پاؤں رکھتے ہی دیوی بولی "اچھا ہوا جو گوپ ہم سے جھگڑا کر کے گیا تمہیں دیکھنے کا موقع تو ملا۔ ہاں آپ لوگ ٹھہرے بڑے آدمی ہمارے گھر بھلا کیوں آنے لگے!"

ریکھا تو نظریں زمین پر گاڑ کر دیکھ کر لیٹے میں پسینہ بہا رہی تھی۔ جٹھانی کے روز روپ اشک سے رنگے چہرے کے مقابلے میں اُس نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ سسکتی ہوئی بولی "ماتا جی اور چھوٹا کہاں ہیں؟"

"کیوں ری، ماں جی سے ہی خاص کام ہے کیا؟ اگر گوپ کے متعلق کچھ کہنا ہو تو مجھ سے کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ اس بارے میں ماں جی کر ہی کیا سکتی ہیں؟"

معلوم نہیں، ماتا جی کہاں سے آ رہی تھیں۔ وہ دودھ کا پیالہ دیوی کے سامنے رکھ کر سندر کو گود سے اُتار کر بولیں "اس نے تو خون کر رکھا ہے کہتا ہے دودھ نہیں چاہئے پیوں گا۔"

ریکھا نے چھوٹے کو گود میں لے لیا اور دودھ کا پیالہ لے کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ نیچے ایک چھوٹا پارک نظر آ رہا تھا۔ ریکھا بولی "منو تو میرے ہاتھ کا دودھ پی لے تو نیچے پارک میں چل کر جھولا جھولیں گے، آسمان تک پہنچ جائیں گے پھر وہاں سے تارے نوچ لائیں گے"

اور چھوٹا دودھ پینے لگا اُدھر دیوی گوپ کو کھری کھوٹی سنانے لگی۔

"میرے پاس کیا قارون کا خزانہ رکھا ہے جو دونوں بھائی اگر میرے سر پہ بیٹھے ہو اور ایک بھائی کا خون چوسنے پہ تلے ہو؟ اب کہتا ہے کہ چندن بھیا اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے۔ وہ بھلا اسے کو رکھیں گے؟ کچھ دن رکھ کر دیکھتا تو اچھی طرح آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔"

"بیٹی، تم کیوں اس طرح بولنے لگی ہو۔ ممکن ہے ہمارے نصیب سے ہی گلاب کے پاس اتنی دولت آئی ہو۔ پالنا تو بھگوان کا کام ہے۔"

"ماں جی، تم تو صرف باتیں بنانا جانتی ہو۔ دیکھتی نہیں ہو کہ کیسے مکان گروی رکھ کر آپ لوگوں کو پال رہے ہیں اور کیسے سٹا کھیل رہے ہیں۔"

"ہمارا پیٹ بھی کیا کھاتا ہے یہی دو چار چپاتیاں۔ پھر ہمارے لئے ہی کیوں سٹا کھیلنے لگا۔ جو شراب پیتے ہونگے، کھانے پہننے میں عیاشی کرتے ہونگے۔ اُنہیں کے لئے ہی سٹا کھیلتا ہوگا۔" کہتے کہتے ساس نے ریکھا کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا کہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

دیوی، میرا راجو رانی کا ہاتھ پکڑ کر بولی "ریکھا تم نے، کیسے طعنے سنے ہیں۔ ہم لوگوں کو کھاتے پیتے دیکھتی ہے تو جل جاتی ہے۔ یہ اتنا قرضہ چڑھ چکا مگر ابھی تک اس کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔"

ریکھا کچھ نہیں بولی۔ ساس کے پیچھے چل دی۔ دیوی جل بھن کر اور آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"میں کچھ ہوں۔ گوپ کو طالب سے جانتی ہوں گا۔ تب اس زبان ساڑکو یہاں ایک گھونٹ بھی میں رہنے دوں گی۔"

گوپ غصے سے بڑی بھابی کی طرف دیکھنے لگا۔ تکیہ اُسے بچے کی بیاس کے کرکے ساتھ جانتی ساس نے بھی اس طرح ریکھا کا ہاتھ پکڑ لیجیئے۔ دو بیہتر دیکھنے نے کرتا ہتا اور بولی۔

"مشتق ہو، کیا کہتی ہے۔ ایسی بھولنے سے گلاب کنوارا ہی بیٹھا رہتا تو اچھا تھا۔ گلاب کہتا ہے کہ اگلے مہینے میں موٹر ہوگا اور ناس رانی صاحبہ کے باپ کا ہر بعذ ہو یا ادھل رہا ہے۔"

ریکھا کو ساس اور بہو کے درمیان اتنی تلخی تاگوار گذری۔ ملتے ہیں گلاب بھی ہاں کے کمرے آ بیٹھا۔ ٹھٹھا مار کر گوپ سے بولا۔ "مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ چندن تمھیں تین دن بھی اپنے پاس نہیں رکھیگا۔"

اس طعنے پر ریکھا چونک اُٹھی۔ دیوی بھی اپنے شوہر کے پیچھے مڑی ہوکر نکیلے آواز میں بولی "ایک بار جو تھوک زمین پر پھینک دی گئی ہے اُسے چاٹنا نہیں ہوگا۔ ہمیں کوئی پرواہ نہیں اگر گوپ جاکر کماتے اور نہیں کھلاتے۔"

ریکھا گوپی کے اس تیر کو بڑی مشکل سے برداشت کرتے ہوئے بولی۔

"ابھی تو اس کے کمانے کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ اس وقت تو اس کی تعلیم کے لئے روپوں کی ضرورت ہے۔"

"واہ بڑے چالاک ہو تم لوگ جو گوپ کی کمائی کے لئے تو تیار بیٹھے ہو لیکن ایک دو جب اس کی تعلیم کے لئے پیسہ خرچ کرنے کے لئے سانپ سونگھ جاتا ہے جیسے ایک ہی بھائی نے سب کو پالنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔"

گلاب رائے بھی خاموش نہ رہ سکے بولے۔

"اچھا اچھا اس کی ساری کمائی تم لے لینا۔ دو سال کے اندر اندر میٹرک کر کے نوکری کرے گا پھر کام پر لگ جائے گا۔ ہاں اور چھوٹے بھیتا کو کچھ دینے کی فکر تمہیں نہیں کرنی ہوگی۔"

ریکھا سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ سب کچھ وہ کیسے برداشت کرتی جا رہی ہے۔ گوپ تو اس کے سامنے گھر کا ایک لڑکا تھا کمانے نہ کمانے کی ترازو میں اُس کی قیمت کیوں لگائی جا رہی ہے؟ آخر جھنجھلا کر بولی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گوپ کی آپ لوگوں کو بہت بے فکر ہے تو پھر آپ اُسے اپنے پاس ہی کیوں نہیں رکھ لیتے؟"

"نہ بابا۔" دیوی دونوں ہاتھ زور سے ہلا کر بولی۔ "ہمیں تو اپنی فکر ہی کافی ہے۔ اب اور مصیبت کون مول لے؟ کبھی سوٹ نہیں ہے تو کبھی بوٹ نہیں ہے۔ کبھی سکول کی فیس چاہیئے۔ ہر وقت کسی نہ کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے۔"

"اچھا اچھا۔ مت رکھنا۔ تیرے پاس رہتا بھی کون ہے۔ جہاں اتنے لوگ فٹ پاتھ پر سوتے ہیں۔ وہاں ایک میں بھی گذر کر لوں گا" گوپ بولا۔

"اچھا یہ بات ہے؟ تین دن ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی تمہارا غرور نہیں ٹوٹا؟ اب فٹ پاتھ کی بھی ٹھوکریں کھا کر دیکھ۔ تیرے جیسے بھائی کے بدلے اگر کسی جانور کو پالا جائے تو کہیں بہتر ہے۔" گلاب غصے میں کانپتا ہوا بولا۔

اب ماں بھی اُبل پڑیں: "بیٹا گلاب، ذرا زمین کی طرف دیکھ کر چلو کیا معلوم ہمارے ہی نصیب سے تمہیں اتنی دولت ملی ہو۔ میرا کوئی اور ٹھکانہ ہوتا تو اسی وقت بچوں کو گود میں چھپا کر چلی جاتی۔"

ریکھا جانتی تھی کہ روز کی اس کھینچا تانی سے کیا نتیجے نکلتے ہیں۔ اس لئے اُس نے گوپ کو وہاں چھوڑنا پسند نہیں کیا وہ اُسے لیکر گھر چلی آئی۔

گوپ بولا۔ "دیکھا بھابھی، کیسے ہیں یہ لوگ! تھوڑا سا روپیہ اکٹھا کر لیا ہے تو چاہتے ہیں ہم لوگ ان کے سامنے ناک رگڑ کر چلیں اپنے اوپر تو قرضہ لیکر بھی روپیہ لٹاتے ہیں لیکن ہم ٹھہرے بیگانے پھر بھلا ہماری تعلیم کے لئے وہ کیوں خرچ کرنے لگے؟"

ریکھا دل ہی دل میں ہنس دی۔ وہ سوچنے لگی، کوئی بچے سے پیار سے باتیں کرے تو کتنی سیانی باتیں کرتا ہے وہ مگر ان دو برس کے اندر بیٹھ کی نیت کتنی خراب ہوگئی ہے۔ اُس کی حالت تو اُس پیڑ کی مانند ہوتی جا رہی ہے جس کی جڑیں تو کیڑے کھا گئے ہوں۔ مگر اُوپر سے سوکھے تیوں والی ڈالیاں سر اُونچا کر کے آسمان کو چھونا چاہتی ہوں۔

گوپ کے آجانے سے ریکھا کی تنہائی کافی دور ہوگئی۔ وہ جب اُس کے ساتھ بیٹھ کر سکول کی باتیں کرتا تو ریکھا کو بھی اپنے طالب علمی کے زمانے کی یاد آجاتی تھی اور وہ اپنی اُس چھوٹی سی مگر بڑی لطیف زندگی کے متعلق سوچتے سوچتے کھو سی جاتی تھی مگر اس تفریح کے ساتھ ساتھ گھر کے

اخراجات کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک دن وہ گوتپ کا پھٹا پاجامہ سی رہی تھی اتنے میں گوتپ سکول سے لوٹ آیا اور اپنا جوتا ہاتھ میں اٹھا کر بولا بھابی دیکھو یہ یہاں سے پھٹ گیا ہے۔

ریکھا نے دیکھا جوتے کا تلا گل گیا تھا اور اس تانبے کے پیسے کے برابر سوراخ ہو گیا تھا۔ گوتپ تھیلا رکھکر چارپائی پر لیٹ گیا۔

"کیوں، آنند جی بے جی بھوگ لگانے کی جگہ کٹیا پر براجمان ہو رہے ہیں؟"

ریکھا نے چڑانے کی غرض سے کہا۔

گوتپ نیچے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "بھابی، مجھے نئی چھتری لیکر دو۔ بس چھتری کا ہینڈل ٹوٹ گیا ہے لڑکے مجھے بوڑھا بوڑھا کہکر پکارتے ہیں۔ اور گوتپ کی آنکھیں بھر آئیں۔

ریکھا کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس نے اٹھ کر گوتپ کو چوم لیا اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ گوتپ کو دلاسہ دینے کے خیال سے بولی۔

دسویں جماعت میں پڑھتے ہو پھر بھی کبھی کبھی بچے بن جاتے ہو۔ آخر اس میں رونے کی کیا بات ہے؟"

وہ گوتپ کے لئے تھالی میں کھانا لیکر آئی تو اسے ہیرے سے کہے ہوئے اپنے الفاظ یاد آ گئے "نوکری کرکے خاندان کی لٹیا تھوڑے ہی ڈبوؤنگی" وہ سوچنے لگی، اب تو خاندان کی لٹیا خود بخود ہی ڈوب رہی ہے۔ خاندان کے ہونہار اور لائق بچے کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔

دوسرے دن گوتپ کو سکول روانہ کرکے وہ پھر خیالات کے سمندر میں ڈوب گئی اتنے میں ڈاکئے نے آکر ایک خط دیا جسے پڑھکر اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ پتھر کا بت بنی بیٹھی رہی جب ہوا کے جھونکے سے خط اڑنے لگا تب کہیں ہوش میں آئی خط کو مٹھی میں اور بڑبڑاتی رہی۔ شیلو تم اب کیا کرو گی؟ بیچاری اپنے بچوں کو تڑپتے کیسے دیکھ سکیگی؟ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں صرف شیلو ہی کیا جسے دیکھو، وہ اس قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہے سب روپیوں کا راگ الاپ رہے ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ ہر ایک اپنی سطح سے گرتا جا رہا ہے۔۔۔

اگرچہ اس کی پیٹھ کواڑ کی طرف تھی پھر بھی کسی کے آنے کی آہٹ سن کر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی بولی "گوتپ، پانی کا گلاس تو دینا۔"

مگر جب چندن نے آکر اسے پانی کا گلاس دیا تو اس کی آنسو بھری اور متعجب آنکھیں چندن کے چہرے پر جاکر اٹک گئیں۔ چندن نے دیکھا ریکھا کی آنکھیں کرب و درد سے پھٹ رہی تھیں چندن دل ہی دل میں ہنس دیا۔

یہ بدنصیب لڑکی کبھی دکھ کا دامن چھوڑیگی بھی یا زندگی بھر آنسو بہاتی رہیگی۔

اتنے میں ہیرا بھی آ پہنچا اور بولا۔

"چندن، کل والی میٹنگ کس جگہ پر ہوگی؟ کوشاری تو اپنے گاؤں چلا گیا ہے۔ اس کا مکان پانچ ہفتوں تک بند رہیگا۔"

"اب تو میرے ہاں کافی جگہ ہے۔"

تیز ہوا کی وجہ سے کھڑکیوں کے کواڑ کھٹکھٹا رہے تھے اور آسمان پر بادل چھاتے جا رہے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر میں بارش ہوگی۔ اس لئے چندن نے ہیرے کو ٹھہرا لیا۔

"چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو دامن سے پونچھتے ہوئے ریکھا بولی۔

"دنیا میں یہ سب کیا ہوتا جا رہا ہے ہیرا؟ دو ایک رشتے داروں کے علاوہ باقی سب چوپٹ ہوتے جا رہے ہیں آخر ایسی ہوا چلنے کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی؟"

ہیرے نے دیکھا، ریکھا کی سوالیہ نگاہیں جواب سننے کے لئے بیتاب تھیں۔ چندن چپ کھڑا تھا۔ ہیرے کی نگاہوں نے گویا اشارے سے چندن کو کہہ دیا ہو کہ ریکھا اور تمہارے درمیان جو دیوار حائل ہے آج اسے گرانے کا موقع ملا ہے۔

چندن نے نچلا ہونٹ کاٹ کے اور مسکرا کر منہ پھیر لیا گویا ہیرے کی بات کا جواب اس نے دیدیا ہو "جب وہ سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

ہیرے نے کہا بھابی تمہارے گھر میں تو گنگا بہہ رہی ہے، ایسے سوالات کا جواب میری نسبت چندن بہت اچھی طرح سے دے سکے گا۔"

یہ کہکر وہ اٹھ کھڑا ہوا مگر کواڑ تک پہنچنے سے پہلے اس نے ریکھا کو

"دلچسپ ناولوں سے کبھی فرصت ملے تب نا! ان کے پاس میرے لئے فرصت کہاں
ہے۔ انہیں کیا کہا جائے، شاید بھگوان کو بھی میری جان لینے کی فرصت نہیں۔
بہرحال، بہت دنوں سے سوچ رہی تھی کہ تمہارا ساتھ دیکھا جائے۔ سپنوں کی دنیا کی لڑکی کو کھانے
کے لئے اسی طرح دیو کی ضرورت ہے۔"

باہر سے ایک دھندلا سا دھبہ سا آسمان کی تاریکی کو دھندلا رہا تھا۔ منٹ بھر
کی خاموشی رہی۔ کمرہ پھر روشنی سے جگمگا اٹھا۔ چندن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ
دوڑ گئی۔ بولا۔

"سنا تم نے، آج تمہارے چندن کو راستے میں الجھی ہوئی اپنی ریکھا
کو منزل تک پہنچانے کی فرصت مل گئی ہے۔"

ریکھا چندن کے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی جیسے اسے یقین بھی
نہیں ہو رہا تھا کہ کالی کالی گھٹاؤں میں بھی آفتاب چمک سکتا ہے۔ پھر مسکراکر
کن انکھیوں سے چندن کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ ساحل کا سورج گھٹاؤں میں چھپ جائے
اور راستے پر چلنے والے مسافر کا ہاتھ چھوڑ کر اسے وہیں بھٹکنے کے لئے
چھوڑ دے۔"

"راستہ دکھانے والے کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ اندھیرے میں
بھی مسافر کو راہ دکھا سکے۔ بشرطیکہ مسافر خود اپنا دامن نہ کھینچ لے۔ اچھا
یہ تو بتاؤ، آج دنیا کے حالات سمجھنے کی فرصت تمہیں کہاں سے ملی؟"

ریکھا نے فوراً شیلو بہن والا خط چندن کے ہاتھ میں تھما دیا۔ شیل نے
لکھا تھا۔

"بہن! عجیب حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میرے شوہر نے
دو ہزار روپے لگا کر ریشم کے کپڑے کی کشتی لی۔ لکڑی کی بنی ہوئی چھوٹی
سی دکان۔ حیدرآباد میں جو دکان پانچ ہزار میں بیچ آئے تھے اس کی
یاد آتے ہی منہ کو کلیجہ آجاتا ہے۔ مہینے دو مہینے کام چلا مگر اس سے آگے
بچوں کی پرورش کہاں سے ہوتی! میں نے اپنے زیور گروی رکھ کر کچھ ادھر
ادھر سے کر کے دو ہزار روپے اکٹھے کر کے دئے تاکہ وہ دکان کے لئے
ضروری مال لا سکیں۔ تین روز کے بعد جا کر دیکھا، بکس کا تالا ٹوٹا ہوا ہے
دونوں کواڑ کھلے ہوئے ہیں اور سارا سامان غائب!"

"پھر کیا بتاؤں بہن، وہ کپڑے کا ٹھیلہ چلانے لگے۔ جو حیدرآباد
میں دکان پر بیٹھے بیٹھے مال کا آرڈر دیتے تھے وہ ٹھیلہ کیا چلاتے!
ٹھیلہ چلانے سے ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ اجمیر
کی کڑی دھوپ میں بھٹکتے بھٹکتے ان کی گوری جلد سیاہ پڑ گئی ہے۔
چار پانچ دن ہوئے، میں ان کے تھکے ماندے جسم کو دبا رہی تھی
تو وہ بولے۔

"آج کندھوں میں بہت درد ہے۔"

میں نے کہا: "شاید ٹھیلہ چلانے سے ہوا ہو۔"

وہ بولے: "پگلی، ٹھیلہ کہاں سے آیا؟ کبھی کبھی کپڑے کی گٹھڑی
بنا کر پھیری کرتا ہوں!"

یہ سن کر میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ وہ پھر بولے۔

"ابھی کیا ہوا ہے، ایسا برا وقت آئیلا ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ
بھی ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ہم جیسے ان پڑھوں کے لئے تو مل میں
کام کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔ وہ بھی جب میاں بیوی دونوں مل
کر کام کریں گے۔ تب جا کر گذارہ ہوگا۔ نہیں تو تم نے جو یہ چھوٹے چھوٹے
بچے ننھے جانے ہیں سب بھوکوں مر جائیں گے۔"

بہن کیا بتلاؤں، نہ جانے ان کی طبیعت میں اتنا چڑچڑاپن کہاں
سے آگیا ہے جو ذرا ذرا سی بات پر بھی کھانے کو دوڑتے ہیں۔ اتنے
دنوں تک میں نے تمہیں اپنے دکھوں کی کہانی نہیں سنائی مگر آج میرا صبر
اپنی حدود پار کر گیا ہے۔ روز روز کر دل پھٹا جا رہا ہے۔ تم ہی بتلاؤ کیا کچھ
ہی میرے دل کے ٹکڑوں کی طرح میرے بچے ہو کر گلیوں کی خاک چھانتے
پھریں گے اور ہم میاں بیوی اندھے بیلوں کی طرح مل میں کام کریں گے۔
بچوں کے پاس جوتے نہیں، کپڑے نہیں۔ وہ پڑھنے نہیں جا سکتے
دن بدن حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ چار دن سے اناج کے
ڈبے خالی پڑے ہیں۔ میری دیورانیوں کی حالت ہم سے بھی بدتر
ہے۔ بتاؤں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔

تمہاری دکھیاری بہن
شیل۔

چندن کے لئے ایسی داستانیں سننا کوئی نئی بات نہیں تھی وہ مسکرا
کر بولا۔

"تب تمہیں شیل دیدی نے ہی دنیا کی یاد دلائی ہے؟"

ریکھا اٹھ کھڑی ہوئی "بس، بس، مجھے اور کچھ نہیں سننا!"

چندن کچھ دیر کے لئے گمبھیر ہو گیا۔ پھر مسکرا کر بولا "اچھا۔"

ریکھا دوسرے کمرے میں چلی گئی اور چندن کتابوں کی الماری کی

طرف بڑھ گیا۔ ساری رات زبردست طوفان جاری رہا۔ رہ رہ کر بارش کی زوردار لہر آتی تھی اور پھر ایک سناٹا چھا جاتا تھا دیواروں سے ٹپکتی ہوئی بارش کی بوندیں پانی کے گڑھوں میں گر رہی تھیں تمام رات ریکھا سسکتی رہی۔ کبھی آنکھ لگ جاتی تھی تو وہ انوکھے خواب دیکھنے لگ جاتی کبھی وہ بڑے بڑے پہاڑ دیکھتی تو کبھی آگ کی چنگاریاں کبھی دیکھتی کہ بارش کی بوندوں کو طوفان تیز رفتار میں اڑائے جا رہا ہے پھر جیسے ہی اُس کی آنکھ کھلتی کھڑکیوں کی آواز سے اُس کا دل کانپ اُٹھتا تھا۔ اس کا دل بار بار اُس سے پوچھتا جو باتیں چندن سمجھ سکتا ہے، ہیرا سمجھ سکتا ہے اور گلیوں میں پھیری کرنے والا شیل کا بچہ سمجھ سکتا ہے وہ میری سمجھ میں کیوں نہیں آتیں؟ آنکھ لگنے پر شیلوتی کو کہتے سنتی۔ حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں... چار دن سے اناج کے ڈبے خالی پڑے ہیں...

صبح کو جب اُس کی آنکھ کھلی تو سامنے گوپ کی ٹوٹی ہوئی چھتری دکھائی دے رہی تھی۔

آج وہ روزانہ کے کاموں سے فارغ ہو کر چندن کی کتابوں کو دیکھنے لگی۔ اتنے دن وہ جن کتابوں کو کوڑا سمجھتی رہی تھی آج ان کو بڑے چاؤ سے پڑھنے لگی۔

چندن نہا دھو کر کمرے میں آیا۔ اُس کے بالوں میں سے پانی کی بوندیں گر رہی تھیں انکو پونچھتے ہوئے بولا "کتابوں کی پوجا ہو رہی ہے یا اُنکا مطالعہ"؟

ریکھا ہاتھ والی کتاب الماری میں رکھکر اپنے آنچل سے الماری کی دھول اُڑاتی ہوئی چلی گئی۔ چندن اس کو ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر اپنے بالوں کو پونچھنے لگا۔ مل میں جانے سے پہلے وہ ریکھا سے بولا "آج چار بجے میرے دوست آئیں گے۔"

"مجھے معلوم ہے، مگر ہونگے کتنے؟ اُن کے لئے....

ریکھا کے باپ بھی کبھی کبھی ایسا ہی کہتے تھے تو ریکھا کی ماں گھر میں سارا دن مصروف رہتی تھی۔ ریکھا دیکھتی تھی کہ محفل میں کس طرح گوشت کباب، برانڈی سوڈا اور سگریٹوں کا دور چلتا تھا۔

چندن بولا "زیادہ دکھاوا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بارہ چودہ کپ چائے بنا دو گی تو بس کام چل جائیگا۔"

"میں ان کی خاطر تواضع بہت اچھی طرح کرونگی آپ بے فکر رہیں۔ مہمان روز روز تھوڑے ہی آتے ہیں۔"

میں نے کہا نہیں کہ خواہ مخواہ کے دکھاوے کی بالکل ضرورت نہیں تم عورتیں کبھی اپنے اصل حالات کے مطابق چل ہی نہیں سکتیں۔

ریکھا چڑ گئی۔

اتنے میں گوپ سکول کی کتابیں اُٹھائے منہ پھلا کر اس کے سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ بھابی اور بھائی کی طرف دیکھتا ہوا بولا "مجھے چار کاپیاں چاہیں۔ میں نے پتنگیں بنا کر بیچیں تو دو کاپیوں کے دام نکل آئے باقی دو کاپیوں کے لئے پیسے چاہئیں۔"

ریکھا نے اُسے پیسے دے تو دئے مگر گھر کے خرچ کے لئے بقیہ پیسے دیکھکر اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالنا ہی ہوگا ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں اس گھر کا بربادی کے گڑھے میں گرنا یقینی ہو جائے گا۔"

(۱۱)

دوسرے دن سکول میں ہیرے کے لئے وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ وہ بے چین ہو ہو اُٹھتا۔ رہ رہ کر ریکھا کی مایوس نگاہیں اُس سے پوچھ رہی تھیں، دُنیا میں یہ کیا ہو رہا ہے؟ ایک دو کو چھوڑ کر سبھی رشتے دار کیوں گرتے جا رہے ہیں؟"

چھٹی کی گھنٹی بجنے پر وہ گھر نہ جا کر ریکھا کے پاس پہنچا۔ بولا "کس کی چٹھی تھی بھابی؟"

"شیلوتی کی۔ مگر صرف شیل وتی ہی تو نہیں ہے میں تو دیکھ رہی ہوں۔ کئی کماتے پیتے گھر بھی چوپٹ ہوئے جا رہے ہیں اُس دن میری پھوپھی کی دیورانی آئی تھی۔ جبل پور سے لوٹ رہی تھی اُس نے بتایا کہ وہاں بھی لوگوں کا ایسا ہی بُرا حال ہو رہا ہے کچھ لوگوں کے لاڈلے بوجھ ڈھو رہے ہیں تو کچھ کے مٹھائیاں بیچ رہے ہیں اور کوئی قلی بن گئے ہیں۔ کم و بیش بمبئی کے حالات بھی یہی ہیں۔ یہاں بھی اچھے اچھے گھرانوں کی عورتیں پاپڑ اور بڑیاں بیچ رہی ہیں۔ نچلے درجے کے لڑکے غبارے اور مٹھائیاں بیچتے پھرتے ہیں۔

"ریکھا بھابی" ہیرا اچھی طرح آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس زمانے میں پیسہ ہی پیسے کو پیدا کرتا ہے۔ امیروں کی دولت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور غریبوں کے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں وہ اپنی محنت بیچ کر روکھی سوکھی کھا رہے ہیں۔ سب سے بُرا حال

متوسط طبقہ کا ہے جن کی رہی سہی پونجی بھی ختم ہوتی جارہی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ طبقہ بھی آخر نچلے طبقے میں مل جائے گا۔"

زیکھا نے جھجکتے ہوئے ہیرے سے پوچھا "تو اس کا مطلب ہے ہیرے بھیا تم کہتے ہو کہ ہمیں مل میں ہی کام کرنا پڑے گا۔"

"ہاں! محنت اور مزدوری ہی نچلے طبقے کو زندہ رکھتی ہے ورنہ وہ کبھی بسکے نہ رہیں۔"

زیکھا نے جلدی سے سانس لیتے ہوئے کہا "بس بس۔ اور زیادہ کڑوی باتیں مت کرو۔"

ہیرا اسے گہری ہوئی دیکھ کر چپ ہوگیا اور دل ہی دل میں بولا بیچاری اڈیا سے پہلی ہوئی کونپل ڈالی! پھر زیکھا سے مخاطب ہو کر بولا "جس حقیقت نے انسان کی زندگی کو زہر بنا کر دیا ہے اس کو سنے میں بھی تم گھبراتی ہو؟"

زیکھا آنسوؤں سے تر آنکھوں سے ہیرے کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ ہیرے نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"صرف ہم سندھی ہی نہیں، مرہٹوں، بنگالیوں اور گجراتیوں سبھی کی یہی حالت ہے۔ جن کے پاس پونجی ہے اور پیداوار کے ذرائع یعنی کھیت کارخانے خریدنے کی طاقت ہے ان کی دولت دن دوگنی رات چوگنی بڑھتی جاتی ہے اور جن کے پاس اتنی دولت نہیں وہ چاہے کتنی بھی کوشش کریں، کتنا ہی امیروں جیسا دکھاوا کریں مگر بڑھتی ہوئی بیکاری اور مہنگائی سے انکی اقتصادی حالت ڈانواڈول ہو جاتی ہے۔"

"مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"پیداوار کے طریقے ہی ایسے ہیں۔ جو چیز کارخانے میں انسان کی اجتماعی محنت سے پیدا ہوتی ہے اس کی بکری ہونے پر وصول شدہ نفع سب میں ٹھیک ڈھنگ سے تقسیم ہونے کے بجائے ایک دو یا کچھ ہی اشخاص کی جیبوں میں چلا جاتا ہے وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ کس طرح محنت کشوں کو تھوڑی سے تھوڑی اجرت دیکر ان سے زیادہ کام لیا جائے اور پیدا شدہ اشیاء مہنگی بیچی جائیں انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ لوگ بیکار بھوکے اور ننگے رہتے ہیں تم جانتی ہو کہ امریکہ کے دولتمند ہر سال اناج کی کافی مقدار عوام میں تقسیم کرنے کی بجائے سمندر میں ڈبو دیا جاتا دنیا بہتر سمجھتے ہیں۔ اس وقت وہ جنگ کا بھوت دکھا کر دنیا میں حالات کا ماحول پیدا کر رہے ہیں اور اس بہانے سے اشیائے صرف کی بجائے جنگی ہتھیار اور اسلحہ جات بنا رہے ہیں۔"

زیکھا مایوس ہوگئی۔ وہ بولی "ایسی سازشوں کا کبھی خاتمہ بھی ہوگا یا ایک دن یہ دنیا جہنم کے گڑھے میں جا گرے گی؟"

ہیرے نے کہا "انسان کی روح مردہ نہیں ہے۔ وہ تھوڑے وقت کے لئے مظالم برداشت کر سکتا ہے مگر ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں رہے گا۔ بھوک وہ آگ ہے۔ جو انسان کو کبھی خاموش نہیں رہنے دیگی آج غلام اور طاقتور محنت کش طبقہ جاگ اٹھا ہے اور وہ ایک ایسی آگ جلا رہا ہے جس کے شعلوں میں یہ گلا سڑا نظام جل بھن کر بھسم ہو جائے گا۔"

زیکھا کو ہیرے کی باتوں میں ایک روشن دنیا کی جھلک دکھائی دی تھی وہ بہت دیر تک خاموش رہی۔ ہیرا اب کافی دیر ہو چکی ہے کہہ کر چلا گیا۔

شام کے چار بجے کا وقت تھا۔ چندن کے سارے دوست ٹھیک وقت پر آپہنچے۔ زیکھا نے سوچا وقت کے اتنے پابند شاید کبھی کچھ رہتے ہوں۔ مگر پاس سے کوئی مرہٹہ لگ رہا تھا کوئی گجراتی اور کوئی مدراسی۔ وہ بہتیرا سوچنے کے بعد بھی سمجھ نہ سکی کہ آخر ایسی کونسی بات ہے جو ان مختلف فرقوں کے لوگوں کو ایک جگہ پر منظم کر رہی ہے؟

زیکھا جب چائے کی پیالیاں لیکر کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے ایک کو کہتے سنا۔ "سوائے کچھ کلرکوں کے سبھی محنت کش ہڑتال میں حصہ لیں گے چونکہ ہم سب اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہیں اس لئے اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد ہی ہمیں منظم کرتی ہے۔"

دوسری بار جب وہ اندر گئی تو کوئی کہہ رہا تھا "پچھلے سال مل کو اتنا فائدہ ہوا پھر بھی ہمیں بونس نہیں ملا۔ سارا منافع شیئر ہولڈروں میں بٹ گیا۔ مل کے ڈائرکٹر، منیجر اور افسر بڑی بڑی تنخواہیں لیکر چین کی بنسری بجاتے رہے مگر ہمیں پیٹ بھرنے تک کو مناسب تنخواہ نہیں ملتی، ہمیں ہڑتال کرنی چاہیئے۔"

تیسری بار کوئی کہہ رہا تھا "ہمارے لئے ہڑتال کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔ ہڑتال کے بغیر مالک ہماری مانگیں کبھی قبول نہیں کریں گے ہڑتال ہی ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے وہ ڈرتے ہیں کیونکہ ہڑتال ہونے کی حالت میں ان کا منافع رک جاتا ہے ہم محنت کشوں کی

حالت ویسے ہی کونسی اچھی ہے جو بعد میں خراب ہو جائے گی ؟"

ریکھا جب باہر نکلی تو اس کے دل میں سوال اُٹھا۔ وہ نڈر اور بہادر یہی لوگ تو ہیں جو اس نظام کو ختم کریں گے۔

(۱۴)

ساون کی بارش اپنے پورے جوبن پر تھی۔

ریکھا گاڑی سے اُترنے کے بعد تانگا سٹیشن کے شیڈ میں کھڑی ہو کر بارش کی طرف اور اُداس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ بارش کی بوندیں لہروں کی شکل میں زمین پر گر کر اپنا وجود کھو دیتی تھیں کچھ بوندیں پانی کے بلبلے بناتی تھیں جو فوراً ہی پانی میں مل جاتے تھے۔

بارش کی تیزی کے ساتھ ریکھا اپنے چھوٹے سے گھر اور دنیا کے اہم حصے کے متعلق جس میں اُس کے گھر جیسے کئی گھر شامل تھے سوچ رہی تھی۔ ریکھا کو ایک چھتری کی ضرورت تھی جس سے وہ بارش سے اپنا بچاؤ کرتی ہوئی گھر تک پہنچ سکے۔ اُس کے گھر کو ریکھا کی ملازمت کی ضرورت تھی۔ ایسے ہزاروں گھروں کی بیشمار ضروریات تھیں۔ ریکھا کو محسوس ہوا اس کے ساتھ دنیا کے بہت سارے انسان اپنی ضروریات زندگی پوری نہ کر پانے کی وجہ سے بارش کی بوندوں کی اِن لہروں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

آخر بارش تھم گئی اور ریکھا نے گھر کی راہ لی۔ اُس کے پاؤں ایڑی تک پانی میں چل رہے تھے مگر وہ اپنے خیالات میں محو تھی آج اُس کے دل میں بڑی وسعت آگئی تھی وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اُسے اپنے پر تعجب ہوا کہ کس طرح وہ آج ایک افسر کو کھری کھری سُنا کر اپنی نوکری کو ٹھکرا کر چلی آئی ؟ اس بات کا اُسے کوئی رنج نہیں تھا کہ اُسے ملازمت نہیں ملی۔

اُس کا دل پتھریلی سڑک پر بہتے ہوئے تیز پانی کی مانند تکلیفوں سے آزاد ہو کر تصوّر کے سمندر میں بہا جا رہا تھا۔

رات کو چندن کے لئے کھانا پروستے وقت بولی "آج میں نوکری تلاش کرنے گئی تھی۔"

"تم ؟"

"ہاں میں۔"

"پھر کیا ہوا ؟"

"میرے سامنے ایک افسر انگریزی میں ایک مرہٹے سے کہہ رہا تھا"

سندھیوں کے آنے سے یہاں کے مقامی باشندوں میں بیکاری اور بڑھ گئی ہے ان سے کوئی پوچھے کہ انہیں پاکستان چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی ؟ سب کہتے ہیں ہم پاکستان میں ایسے تھے ویسے تھے۔ ہماری وہاں اتنی دوکانیں تھیں، اتنی زمین تھی میں پوچھتا ہوں کہ ان بزدلوں ڈرپوکوں کو یہاں رہنے دیکر مقامی باشندوں کو بیکار کر دینے سے سرکار کو کیا ملا ہے ؟"

چندن کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ اُس کی باتوں کو غور سے سُن رہا تھا۔

ریکھا بات کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"میں سمجھ گئی کہ اشارہ کس کی طرف ہے لہٰذا میں نے بھی کہہ دیا کہ بھائی شہیدوں کے خون سے ہندوستانی تواریخ کے ورق رنگے ہوئے ہیں ہم اگر انگی درگت دیکھ کر وہاں بیٹھے رہتے تو ہم بھی اپنی جان بچا کر یہاں نہ آسکتے ہمارا خیال ہے کہ اگر آپ بھی ہماری جگہ ہوتے تو ڈرپوکوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوتے۔ اور یہاں ہندوستان کی بیروزگاری کے اسباب ہم سندھی ہرگز نہیں ہیں۔"

اتنا کہکر چندن کا فیصلہ سُننے کے لئے ریکھا خاموش ہو گئی۔

چندن اطمینان سے کھاتا رہا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد آنگن میں اُگی ہوئی گھاس پر منہ صاف کرتے ہوئے بولا "پھر کیا کہا افسر نے ؟"

"بولا لڑکی ! تم یہاں نوکری تلاش کرنے آئی ہو یا لیکچر دینے۔"

چندن پھر چپ ہو گیا۔

ہاں ریکھا چپ نہ رہ سکی۔ مگر یہاں کے لوگ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں ؟

ہم نے ان کا بگاڑا ہی کیا ہے ؟ سندھی بھی تو محنت کر کے کھاتے ہیں ؟"

چندن نے جواب دیا " اُن کا کچھ نہ کچھ تو ضرور بگڑا ہے سندھیوں کے آنے سے بیوپار میں نوکریوں میں اور مارکیٹ میں بلکہ جہاں بھی اُنہوں نے ہاتھ ڈالا ہے۔ مقامی لوگوں کی منافع خوری میں کمی واقع ہوئی ہے۔"

"مگر اس میں ہمارا کیا قصور ؟ ہمیں بھی تو جینا ہے ؟"

"ریکھا، ہمارا ڈھانچہ ہی ذاتی مفادات پر بنا ہوا ہے۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ کسی کی روٹی چھن جائے چاہے کوئی گر پڑے

ہر ایک اپنا کاروبار آگے کو بڑھانے کی کوشش کرے گا۔ خود غرضی نے انسانیت اور بھائی چارے کے جذبے پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ ہم تو سنتے آئے ہیں مگر یہاں کے رہنے والے بھی آپس میں رہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں ایک طرف ہزاروں گجراتی سیٹھ اور کنٹریکٹر وغیرہ محلوں میں رہتے ہیں۔ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسری طرف انہیں کے بھائی فٹ پاتھ پر دن کاٹ رہے ہیں۔ اُن کی زندگی غلاظتوں سے بھی گئی گذری ہے۔ اس طرح تم دیکھو گی کہ حقیقی طور پر یہ فرق امیروں اور غریبوں کے درمیان ہے۔ لہٰذا ہم سندھیوں کو یہاں کے غریب لوگوں سے مل کر امیروں سے ٹکر لینی ہوگی۔ جب تک ایسا انتظام نہیں ہوتا کہ سرکار ہر ایک شہری کو اناج کپڑے اور مکان دینے کی ضمانت دے تب تک یہ حالات اور نفرت کی یہ دیواریں قائم رہیں گی۔"

چندن نے دیکھا۔ ریکھا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ شاید اُس کا دھیان اس طرف نہ ہو۔ یہ خیال کر کے وہ بات بدلنے کے لئے بولا "اندھیری میں ایک سندھی نے بنیان اور سویٹر بنانے کی فیکٹری کھولی ہے۔ پچیس تاریخ تک درخواستیں طلب کی ہیں۔ تم بھی ایک بھیج دو نہ۔"

ریکھا پر بجلی سی گر پڑی۔ اُس نے ہاتھ کا کورتھالی میں رکھ دیا "میں نے کیا بنیان اور سویٹر بنانے کے لئے ہی میٹرک پاس کیا تھا؟ یہ کیسی زندگی ہے؟

میں کام کرنا چاہتی ہوں تو کوئی اچھا کام بھی نہیں ملتا۔ میں فیکٹری میں جا کر کیسے بنیان اور سویٹر بناؤں گی؟"

گوپ بستر بچھاتے ہوئے کہنے لگا "بھابھی، اگر کل بھی آج جیسی بارش ہوئی تو میں سکول نہیں جا سکوں گا۔ چھتری تو پہلے ہی پھٹی تھی اُس پر آج کے طوفان نے تو اس کا کچومر ہی نکال دیا ہے اور پھر میری کل سکول جانے کے لئے قمیض بھی نہیں ہے۔"

ریکھا کو محسوس ہوا۔ جیسے وہ ایک نادان سی بچی ہے جسے ماں نے کان پکڑ کر چانٹا رسید کر دیا ہو۔ اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر ڈالا کہ وہ کوئی بھی نوکری کرے گی مگر گوپ کو ضرور پڑھائے گی۔

پچیس تاریخ میں ابھی دس دن باقی تھے۔ اتنے دن ریکھا بیکار نہ بیٹھی۔ نوکری کے لئے دفتروں کی خاک چھانتی رہی۔ مگر کہیں نوکری ہو تو ریکھا کو ملے۔ ملازمت کی جگہ ہر روز اُسے بیکاروں کے جھنڈ کے جھنڈ دکھائی دیتے۔ دل میں ان مجبور انسانوں کے لئے ہمدردی رکھتے ہوئے وہ سوچنے لگی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیکار پھر رہے ہیں اگر ان کی قوت کا بھی استعمال کیا جاتا تو ملک کتنا ترقی کر جاتا؟ گاڑی جب تیز رفتار سے چلتی تھی تو دونوں طرف چھوٹے چھوٹے گھر اور پھوس کی جھونپڑیاں دیکھ کر اُس کی نس نس پوچھ اٹھتی کیا۔ ان سب کو مرین ڈرائیو اور چرچ گیٹ کے رہائشی مکانوں میں بدلا نہیں جا سکتا؟

مہالکشمی کے پاس چھوٹے چھوٹے مکان بارش کے پانی کے نیچے ڈوب گئے تھے۔ اخبارات میں اُن کی تصویریں دیکھ کر ریکھا ایک دن وہاں اُتر پڑی۔ وہاں کا منظر دیکھ ریکھا کے ہوش اُڑ گئے۔ پیڑوں کے نیچے دھوپ میں کھلے کھلے انسانوں کے خاندان اپنی ڈوبتی ہوئی جھونپڑیوں کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کھانا پکا رہے تھے۔ ریکھا کی رگ رگ کانپ اُٹھی۔ اُس نے سوچا اگر اس ملک پہ حکومت کرنے والے خود بھگوان بھی ہوتے تو وہ بھی مجرم سمجھے جاتے۔ مگر اس سرکار کے خلاف لوگ بغاوت تک نہیں کرتے اندھوں اور بہروں کی طرح ہم یہ بدانتظامی اور مظالم چپ چاپ دیکھتے اور برداشت کرتے رہتے ہیں۔

وہ رات کو چندن سے کہنے لگی "آج جو کچھ دیکھ کر آئی ہوں اُس نے میرے دل کو سخت چوٹ پہنچائی ہے۔ جب انسان تڑپ تڑپ کر اپنے آشیانوں کو ڈوبتے ہوئے دیکھتے ہیں تب ان امیروں اور وزیروں کی سمجھ اپنے فرائض سے آنکھیں بند کر کے کہاں چرنے چلی جاتی ہے کیا؟"

"اور جس کی انسانیت جاگ اُٹھتی ہے وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنے کو نبرد آزما کر لیتا ہے پھر اُسے اس کا خیال ہی نہیں رہتا کہ اُسے دوسروں کی زندگی سے کیا لینا دینا۔ ہر ایک اپنے اعمال کا بھی بھوگے۔"

یہ سوچ کر کہ آخری الفاظ ایک دن اُسی نے چندن سے کہے تھے وہ شرما گئی۔

چندن ریکھا کے جذباتی چہرے کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔"

ابھی کیا دیکھا ہے۔ بیچارے محنت کشوں کی زندگی کو قریب سے دیکھو گی تو تمہیں رونا آجائے گا۔

دوسرے دن ہیرا آیا تو ریکھا اُس سے بھی یہی باتیں کرنے لگی۔

"ہیرا! غریبی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ سائنس نے جو اتنی ترقی کی ہے۔ وہ کیا صرف امیروں کے لئے جن کے پاس عیش و آرام کے سب ذرائع موجود ہیں۔ غریبوں کے لئے نہ رہنے کا ٹھکانہ ہے نہ کھانے کا۔ بستی کی جھونپڑیاں بھی گندی گلیوں میں پہلے میں اُن کی عادتوں کو بُرا بھلا کہتی تھی مگر اب دیکھتی ہوں کہ یہ عادتیں بھی حالات کی پیداوار ہیں۔"

چندن بولا "ہیرا اب تمہاری بھابی آہستہ آہستہ سچائی کو پرکھنے اور سمجھنے لگ گئی ہے۔"

"مگر جیسے جیسے سچائی کھل کر میرے سامنے آتی جاتی ہے میں اور بھی اُداس ہوتی جاتی ہوں۔ زندگی کی ندی کو پہاڑوں کے آنچل سے کل کل کرتے بہتے زمین کو سرسبز اور شاداب بناتے ہوئے سمندر میں جا کر ملنے کی بجائے اُسے چھوٹی چھوٹی نالیوں اور مرگھٹ میں سڑتے دیکھ کر میرا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔"

"ریکھا، سچائی کے راستے پر چلنے والا ہر ایک مسافر پہلے دُکھ کی آگ میں جلتا ہے لیکن اُسے چین تبھی نصیب ہوتا ہے جب وہ زندگی کے دریا کو میدانوں کی طرف موڑنے کے لئے خود کام کرنے لگتا ہے"

ریکھا نے ان الفاظ میں اتنی سچائی دیکھی کہ بہت دیر تک چندن کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ چندن کے یہ الفاظ صرف الفاظ نہ تھے بلکہ ان کے پیچھے ایک اٹل سچائی چھپی ہوئی تھی۔ ریکھا نے اُسے کبھی ایک منٹ بھی بیکار ضائع کرتے نہیں دیکھا تھا۔

ریکھا نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ مجھے کیا معلوم کہ زندگی کی جن گھڑیوں کو میں اپنے ذاتی مفاد کے لئے حاصل کرنے کیلئے ارادے کر رہی تھی ان کا استعمال سماج کی بھلائی اور عوام کے سُکھ چین کے لئے ہو رہا ہے۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ ریکھا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کی چارپائی کے پاس اُس پر جھکا ہوا ہے۔ اُس کی گرم سانس اُس کے چہرے کو چھو رہی ہے وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھی۔ بتی جلائی تو دیکھا چندن اپنی چارپائی پر سویا ہوا تھا وہ اُس کے قریب گئی اور پھر بتی بجھا کر لیٹ گئی۔

وہ کافی دیر تک سوچتی رہی۔ وہ چاہے کتنا بھی چھپائے مگر اُس کا چہرہ پسینے کی بوندوں سے چمک رہا تھا۔ . . . اب وہ یقیناً اُسے بہت چاہنے لگے ہیں۔ پھر یکایک اُسے خیال آیا۔ ابھی دونوں کے درمیان یہ دیوار کھڑی ہے جس کی اینٹ اینٹ پر لکھا ہے 'یہ کیسے ہوگا! یہ کیسے ہوگا؟

(۱۳)

چندن جس مل میں کام کرتا تھا اُس میں ہڑتال شروع ہو گئی تھی اور ہڑتال کو پورے سولہ دن ہو گئے تھے۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی ہڑتال اکیس تاریخ کو شروع ہوئی تھی مہینے کے سات دن اور بیت گئے مگر تنخواہ نہیں ملی۔ پارٹی وعدہ اور دیوی وغیرہ منگوانا بند ہو گیا۔ اب اناج گھی اور قلم سلیٹ کی بھی تنگی ہونے لگی۔

ریکھا نے جھنجھلا کر شوہر سے کہا "اتنی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد بھی کوئی نتیجہ نکلا یا نہیں؟"

چندن نے تیوری چڑھا کر کہا "تکلیف؟ تکلیف کا تو تمہیں ابھی علم ہی نہیں تکلیفیں تو حقیقی معنوں میں ہمارے مل کے مزدور اُٹھا رہے ہیں ہم کلرکوں کو تو صرف تکلیف کی ہوا سی لگی ہے آج ہمارا جلسہ ہونیوالا ہے چل کر دیکھو نا کہ مزدوروں کی بستی کی کیا حالت ہے؟"

ریکھا شام کو وہاں گئی۔ بستی کو دیکھ کر وہ سُن ہو گئی۔ مرجھائے چہروں والی عورتیں، کمر خمیدہ مرد، کالے کلوٹے اور ننگے ادھ ننگے بچے، اُداس اور مایوس چہرے، دُبلے پتلے اور ڈھانچے سے ڈھانچے یہ سب دیکھ کر ریکھا کا دل کانپ اُٹھا۔

بستی کی ٹیٹوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا جنگل تھا اور اس کے پیچھے میدان۔ وہاں ہزاروں مرد اور عورتیں جمع ہوئے تھے۔ شروع میں ایک لڑکی نے گیت گایا پھر کئی لوگوں نے تقریریں کیں۔

ریکھا جلسے سے لوٹی تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان پر چھائی ہوئی بچی کھچی گھٹائیں بھی دور ہو گئی ہوں۔ دن کی صاف اور نرمل روشنی کو پا کر گلیاں اور کھڑکیاں . . . . سبھی روشن ہو اُٹھی ہوں۔

ایک پتلی اور لمبی عورت نے کہا تھا۔ "ہمیں یہ تکالیف صبر سے برداشت کرنی چاہئیں۔ چونکہ ہم سب سچائی کے لئے لڑ رہے ہیں۔

...مانگتے باقی ماندہ نہیں ملتی۔ ہماری سچائی سورج کی طرح روشن ہے۔ یہ لڑائی ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی اور سب فرقوں کے لوگ مل کر لڑ رہے ہیں۔ مزدور، کسان، دھوبی، موچی، جولاہے، ڈرائیور اور سپاہی سب ہماری فوج کے سپاہی ہیں۔ ہم غریب ہیں مگر ہمیں کسی سے بھیک نہیں چاہیئے۔ ہم کتے نہیں ہیں جنہیں ٹکڑا دے کر مطمئن کیا جا سکے۔ ہم اپنی محنت کا جائز حق مانگتے ہیں۔ ہم دو ہاتھوں سے کام کرتے ہیں اسی لئے کہ ایک ہاتھ کی محنت سے اپنے پیٹ کا گذارہ کریں اور دوسرے ہاتھ کا پھل حاصل کر کے ہمارے بچے بوڑھے سب چین کی زندگی بسر کریں مگر حالت یہ ہے کہ ہم کو روکھا سوکھا ٹکڑا کھانے کو نہیں ملتا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟"

ریکھا نے اچھی طرح دیکھا تھا اُس عورت کی پیشانی چمک رہی تھی۔ بھوک اُسے جلا نہیں پائی تھی بلکہ اُلٹے وہ خود جل کر اپنا شعلہ اس عورت کے چہرے پر پھیلا رہی تھی۔ جلسے والے گیت کے مصرعے بھی اُسے خوب یاد تھے۔

آج چاروں اور ہی ہڑتال ہے۔
دُکھوں کی دھرتی پر کُل بھونچال ہے۔
لڑ رہا مزدور بازی ہاتھ ہے
زندگی دھرتی نہیں وشواس ہے

دوسرے دن جلسے سے واپس آتے وقت چندن کو بہت دیر ہو گئی۔ چندن کپڑے بدل کر بیٹھا تو ریکھا اس کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہو کر دوپٹے کا دامن انگلی میں لپیٹتے ہوئے بولی۔ "ایک خوشخبری سناؤں؟"

"سناؤ کونسی خوشخبری ہے جس سے تم اتنی خوش ہو رہی ہو!" اُس نے ریکھا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر چپ رہی اُسے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے کہ وہ اپنے دل کی بات ظاہر کر سکے مگر چندن کو اپنی طرف دیکھتے رہنے کی وجہ سے اُسے بولنا ہی پڑا۔

"مجھے اُس اندھیری والی فیکٹری میں نوّے روپے ماہوار کی نوکری مل گئی ہے۔"

چندن نے جلدی اُٹھ کر ریکھا کی ٹھوڑی اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا "سچ؟"

ریکھا نے آنکھیں اُوپر اُٹھا کر جواب دیا "ہاں سچ!"

چندن کو خوش دیکھ کر اُس کا دل باغ باغ ہو اُٹھا۔ وہ دوسرے کمرے میں بھاگ گئی اور بار بار اپنی ٹھوڑی زور زور سے پونچھنے لگی۔

دوسرے دن وہ فیکٹری سے لوٹی تو چندن کو آنگن میں چکر لگاتے دیکھا۔ ریکھا جان بوجھ کر اس کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے سیدھے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور کتاب اور چند اِسی قسم کے سوال کو حل کرنے میں مصروف تھے۔ وہ آرام کرسی پر لیٹ گئی جب ہیرا فارغ ہو گیا تھا تو ریکھا بولی۔

"ہیرا میں کل سے نوکری کرنے لگ گئی ہوں۔"

اس کے ہونٹوں پر فخر کی جھلک دیکھ کر ہیرے کو لگا جیسے پودے کو اتنے دن پانی دے کر سینچا رہا ہے وہ آج پھولوں سے لہلہا رہا ہے۔

ریکھا بولی "مگر عورت نوکری کرے تو اس میں مرد کے لئے فخر کی کونسی بات ہے؟"

"کیوں نہیں؟ ایک عورت اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے؟ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ جب تک عورت کو اقتصادی آزادی نہیں ملتی تب تک وہ پوری طرح سے ترقی نہیں کر سکتی اور جب تک ترقی کی طرف نہیں بڑھتی تب تک وہ زندگی کا پھل پا ہی نہیں سکتی۔"

ریکھا تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں ڈوب گئی پھر اُلجھن کی طرح بولی۔

"ایسے جواب میرے دماغ میں کیوں نہیں آتے؟"

ہیرا ہنس پڑا اور بولا "ہر نئے راستے کے مسافر کو مشق کرنی پڑتی ہے تم جس نئی راہ پر گامزن ہو اس کے لئے بھی کافی مشق کی ضرورت ہے۔"

اتنے میں رادھا آ پہنچی کہنے لگی "ریکھا بیٹھی ہو؟ تین بار تمہارے لئے پوچھ گئی ہوں تمہارے بغیر تو پڑوس سونا ہو جاتا ہے مگر یہ تو بتلاؤ جس مل میں تمہارے پتی کام کرتے ہیں اس میں ہڑتال ختم ہو گئی یا نہیں؟"

ریکھا نے کرسی پر لیٹے جواب دیا "آج تو اخبار میں پڑھا تھا کہ کئی اور کئی ملوں کے مزدوروں نے بھی ہمدردی کے طور پر ایک دن کی ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

رادھا آنکھیں پھاڑ کر بولی "اتنی ملیں بند رہیں گی تو کیا کپڑا مہنگا نہ

ہو گیا ؟

اِس سے تو ملک کا کافی نقصان ہو گا۔ مزدوروں کو صرف اپنی تنخواہ بھتّے کی لگی ہوئی ہے۔ اِنہیں اپنے ملک کا بھی تو کچھ خیال کرنا چاہیے۔"

ریکھا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"دیدی، اب تو تم بڑی دیش بھگت بن گئی ہو مگر ذرا اس بات کا جواب تو دو کہ کیا صرف مزدوروں نے ہی حب الوطنی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے ؟ کیا سرکار اور سرمایہ دار جاہل اور عقل کے دیوالیے ہیں۔ جو انہیں دیش کی آمدنی کا خیال نہیں رہتا اتنی ملیں بند رہنے کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے اُس کو برداشت کرنے کے لئے وہ تیار ہیں مگر خون پسینہ ایک کرنے والے مزدوروں کو پیٹ بھرنے تک کی تنخواہ بھی نہیں دے سکتے ؟"

رادھا لاجواب ہو گئی مگر یوں ہار ماننے کے لئے وہ تیار نہ تھی۔ بولی "ریکھا، جس آدمی کو خدا جس طبقہ میں پیدا کرتا ہے اُسے اُس میں ہی صبر کر کے رہنا چاہیئے۔"

ایسی باتوں کے سلسلے میں پہلے ریکھا چپ ہو جاتی تھی مگر اب اِس کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا اُس کا شعور اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ہر انسان کی اُمیدیں اور خواہشات اس کے جسم کا ایک حصّہ بن گئی تھیں۔ بولی۔

"دیدی ہم کتنے گر گئے ہیں ! دوسروں میں اور اپنے میں کتنا فرق سمجھتے ہیں ؟

کیا غریبوں اور مزدوروں میں ہماری جیسی جان نہیں ہمیں خدا کو اپنا باپ کہتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی جبکہ ہم ایک دوسرے کو بھائی بھائی بھی نہیں سمجھتے۔ ہم مزدوروں کے دُکھوں کو جانوروں کی مانند دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ کیا یہ انسانیت کے نام پر کلنک نہیں ؟ کہتے کہتے ریکھا کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

رادھا نے کہا "بہو، تمہاری ایسی باتوں نے تو موہ لیا ہے۔ چاہتی ہوں جو وقت مندر میں جا کر کاٹتی ہوں وہ تمہارے پاس بیٹھ کر گذاروں۔"

چندن نے یہ ساری باتیں سُن لی تھیں وہ دل ہی دل میں بولا "جب پھول میں خوبصورتی اور خوشبو دونوں آ جاتی ہیں تو کتنا پیارا لگتا ہے !" اور وہ لمبی سانس لیکر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

ہیرا، رادھا اور ریکھا کو وہیں چھوڑ کر چندن کے پاس جا پہنچا۔ "کیوں جی ! آج آسمان میں اتنی دلچسپی کیسی ؟ خیر تو ہے ؟"

چندن ...... بانہہ سے پکڑ کر اُس کو اندر لے گیا کافی دیر تک دونوں باتوں میں مشغول رہے۔ ریکھا وہاں آئی تو بولی۔

"ہم نے پڑوس میں گیت سکھانے کی ایک کلاس شروع کی ہے میرا خیال ہے وہاں وہی گیت سکھائے جائیں جن میں نئے خیالات اور نئی اُمنگیں ہوں جو عام گیتوں کی طرح سُلا نہ دیں بلکہ بیداری کے جذبات پیدا کریں۔"

چندن نے جواب دیا تمہارے جیسے ہی باہمت اور مشتاق لوگوں کی ایک سوسائٹی ہے جس کا نام انڈین پیپلز تھیٹرس ایسوسی ایشن ہے۔ وہ بمبئی میں ہی کام کرتی ہے۔ اُن کے گیتوں، ڈراموں اور ناچ میں فن کے ذریعے انسان ذات کی خدمت کرنے کا پیغام ہوتا ہے۔ کل چلوگی ؟"

ہیرا سوچتا رہ گیا۔ "یہ چار دیواری سے باہر نکلی بلا تو خوب نکلی۔"

(۱۴)

"ریکھا بہن ! اُٹھ کر بتی تو جلاؤ۔ ایسے اندھیرے میں ہی کتاب منہ پر رکھے بیٹھی ہو ؟"

ریکھا نے اُٹھ کر روشنی کی اور کہا: "دیدی، آج تو مجھے بتی کی روشنی بھی دُھندلی معلوم ہو رہی ہے۔"

رادھا وہیں آنچل گلے میں ڈال کر سندھیا کرنے لگ گئی۔ ریکھا منڈلاتے ہوئے پتنگوں کو دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے صبح والا واقعہ ناچ رہا تھا۔ وہ نوکری پر جانے والی ہی تھی۔ بدنال

ہوئے ہیں۔ اُس وقت اُس نے محسوس کیا تھا کسی کی دو آنکھیں اُس کے گورے گورے ہاتھوں کو دیکھ رہی ہیں۔ اُن نگاہوں نے جیسے اسکو کوئی بھولی ہوئی بات یاد دلادی۔

اُس نے آنکھیں اوپر اٹھائی تھیں کہ کسی نے باہر سے پکارا "مسٹر چندن!"

دو سپاہی اندر داخل ہوئے: "مسٹر چندن، شروان جی مل کا مزدور یونین کے اسسٹنٹ سیکرٹری، آپ کو قانون کے خلاف ہڑتال کروانے اور مزدوروں کو بھڑکانے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔"

پاس پڑوس کے سبھی لوگ آ جمع ہوئے۔ ریکھا کچھ گھبرائی مگر چندن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ سپاہیوں نے گھر کی تلاشی لی۔ الماری سے کتابیں نکال کر کمرے میں ڈھیر لگا دیا۔

گوپ نے بھرائی ہوئی آواز میں ریکھا سے کہا: "بھابھی، جن کتابوں کو بھیا جان کی طرح سنبھال کر رکھتے ہیں ان کو انھوں نے کتنی حیوانیت کے ساتھ پھینک دیا ہے!"

رادھا سیدھے سپاہیوں کے سامنے جا کر کہنے لگی: "تم لوگ ان کو کیوں پکڑتے ہو یہ ایماندار آدمی ہیں یہ کسی کی ہرگز تنگ نہیں کر سکتے۔"

چندن نے جاتے وقت ایک ایسی پیار بھری نگاہ سے ریکھا کی طرف دیکھا تھا جیسے وہ ابتک آنکھوں میں سمائے پتی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رادھا نے سندھیا ختم کر کے کہا۔

"تم کیوں فکر کرتی ہو۔ تمہارا شوہر تو اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہوئے جیل گیا ہے کوئی چوری تھوڑی ہی کی ہے آجکل تو چھوٹے چھوٹے بچے بھی جو چنے اور مٹھائیاں بیچتے ہیں، دو دو دن جیل میں رہ کر آتے ہیں دیکھنا بیراسنھیا کا مالک کس طرح دو دو ٹکا دے دے کر ہاں ہاں کرتا ہے۔"

ریکھا نے کہا: "دیدی، تم تو جیسے میری بہن شیلا تی ہو، مجھے اُنکے جیل جانے کی بالکل ہی فکر نہیں مگر نجانے کیوں اُنکے بغیر یہ گھر سونا سونا لگ رہا ہے۔ ابھی گیا اندر آتے جھجک رہی ہے۔"

"کبھی اکیلے نہیں رہی ہو، اس لئے آج میں تمہارے ہاں آکر سوؤنگی۔" رادھا دلاسہ دیتے ہوئے باہر نکلی ہی تھی کہ گلاب اپنے بیوی اور ماں کے ساتھ آپہنچا۔

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ وہ دوسروں کے لئے مرنا چھوڑ دے۔ آجکل چور ہی دنیا کے مالک بنے بیٹھے ہیں اگر ہمیں بھی شکم سے جینا ہے تو چوری بننا پڑے گا۔ مگر وہ تو مجھے ہی قصوروار کہتا تھا۔ اُسے اپنا خیال نہیں تو نہ سہی مگر اپنی روپ راتی کا تو کچھ خیال کرنا چاہیئے تھا۔" یہ کہہ کر گلاب راسے نے ترچھی نگاہوں سے ریکھا کی طرف دیکھا۔

ریکھا کا دل نفرت سے بھر اٹھا۔ دیوی تو اپنی چیکنی ساڑھی کو ہی ٹھیک کرنے میں مصروف تھی۔ ماں نے کہا۔

"بیچارہ جیل میں کیسے رہے گا۔" پھر دامن میں گانٹھ باندھ کر بولی: "گورو مہاراج! میرے بچے کے بندھن کاٹ دو، پرساد چڑھاؤں گی! سچ کہتے ہیں ماں بچے کو تو جنم دیتی ہے مگر اس کے ساتھ کی ساتھی نہیں۔" گلاب سے بولیں: "اب کسی نہ کسی طرح میرے چندن کو آزاد کرواؤ۔"

ریکھا درمیان میں ہی بولی: "ماں جی! وہ بہت دن تو جیل میں نہیں رہیں گے۔ دوسری ملوں نے بھی ہمدردی دکھانے کے لئے ہڑتال کر دی ہے مزدوروں کے اتحاد کے آگے مالکوں کو جھکنا ہی پڑے گا۔"

جب سب چلے گئے تو گوپ بولا: "بھابھی، دکھ تو انھیں ذرا بھی نہیں ہوا سب صرف دکھاوا ہی کر رہے تھے۔"

ریکھا نے گوپ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تم نہیں چاہتے کہ تمہارے پاس بھی خوبصورت کپڑے ہوں؟"

گوپ نے جواب دیا: "بڑھیا کپڑے کون نہیں چاہتا مگر ایسے بھی ہزاروں لوگ ہیں جو مجھ سے بھی برے کپڑے پہنتے ہیں، تو کیا کپڑوں کے لالچ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں؟"

ریکھا کو اپنی طرف التجا بھری نگاہ سے دیکھتے پاکر وہ پھر بولا۔ "بھابھی، تم کیا مجھے دسویں جماعت کا بچہ ہی سمجھتی ہو؟ تمہارے لئے تو شاید میں کبھی بھی بڑا نہیں ہو پاؤں گا جو اچھے برے میں تمیز کر سکوں۔"

ریکھا اچھل پڑی۔ بولی: "بڑے کیوں نہیں ہو گے؟ میری آشاؤں اور اُمیدوں کے چراغ تو تم ہی ہو۔" پھر خوش ہو کر اپنے کام

میں لگ گئی۔

رات کو ریکھا کتاب لیکر آرام کرسی پر لیٹ گئی اور سوچنے لگی اُنکے جیل جانے کے تھوڑے دن پہلے میری زندگی میں ایک عجیب دلکشی پیدا ہونے لگی تھی۔ کئی بار انھوں نے بڑی پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ ایک بار نگاہ ملتے ہی گویا اُس کی آنکھیں بے چین ہوکر پوچھ رہی تھیں کہ اب بھی ہم اتنے دور دور کیوں ؟ لیکن میرا دل یکایک بول اُٹھا تھا، بس اتنے میں ہی سویر ہو گئی ؟

وہ جلدی ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے اپنے سر کو اتنے زور سے جھنجھوڑا کہ اگر اُس پر روئی کے ذرے بھی ہوتے تو گر پڑتے پھر کتاب پڑھنے لگی۔

رادھا نے کہا "آج تو تمہاری آنکھ بھی نہیں لگ رہی۔ شاید شوہر سے کبھی الگ نہیں رہی مگر یونہی ساری رات جاگتی رہوگی؟"

"اور دیدی، تم بھی تو میرے پاس سوؤگی تب تو تمھیں نیند نہیں آسکےگی" ریکھا ہنس پڑی۔

"نا۔ نا، میں نے تو سر تکیے پر رکھا نہیں کہ نیند آئی نہیں۔ ہاں انھیں ذرا دیر سے نیند آتی ہے"... کہتے کہتے رادھا سو گئی۔ ریکھا نے اپنا منہ کتاب کی طرف پھیر لیا۔

(۱۵)

انگیٹھی سے لال انگاروں کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ چندن کھانے کے انتظار میں انگیٹھی سے ہاتھ سینک رہا تھا۔ ابھی سردیوں کا موسم شروع تو نہیں ہوا تھا مگر بارش کے آخری دنوں کے بعد جاڑا ہونے لگا تھا۔ چندن پورے ہفتے کے بعد جیل سے رہا ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کیونکہ ہڑتال کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی تھی مزدوروں کی بڑی بڑی مانگیں، مثلاً تنخواہ، بونس اور بھتے وغیرہ میں بڑھوتی قبول کرلی گئی تھی۔

ریکھا نے کھانے کی تھالی سامنے آکر رکھی تو چندن کو جیل کی موٹی روٹیاں یاد آگئیں۔ ساتھ ہی اُس کال کوٹھڑی کی یاد بھی جاگ اُٹھی۔ اُن یادوں کے اُفق پر لمبی لمبی اُنگلیوں والی وشنیو بھی اُبھری تھی۔ چندن نے پوچھا تھا تم کون ہو؟ اور اُس نے آسمان کے نیلے پردے پر لکھا تھا۔ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی ایک عورت! رات کے وقت وہ حسینہ اپنی کومل کر جھکائے کتابوں پر پلکیں نچا رہی تھی۔ چندن نے پوچھا، تم کون ہو؟ اُس نے رات کے سیاہ دامن پر لکھا، علم اور روشنی کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی ہوئی عورت!

پربھات کی سُنہری کرنیں جب جیل کی کھڑکیوں سے اندر آئیں تو چندن کی روپ رانی نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اُٹھا کر اپنے نرم بھرے نین دکھائے تھے، چندن نے پھر پوچھا، تم کون؟ اُس نے شفق کے گلابی گالوں پر لکھا، اپنی زندگی کی قندیل سے اپنی قوم میں بیداری لانے والی عورت! اور تب چندن نے اُس چندر مکھی کے سامنے کو چوم کر قسم کھائی تھی کہ آزاد ہو کر اُسے باہوں میں لے کر کہے گا "اب دور نہیں رہ سکیں گے میری رانی"

ریکھا پانی کا گلاس لیکر کھڑی ہوئی تھی بولی "یہ کیا ابھی تک ویسے ہی بیٹھے ہو؟"

چندن اپنی خوابوں کی ریکھا کو سامنے دیکھ کر ہنس پڑا اور پھر سر جھکا کر کھانا کھانے لگا۔

ریکھا بھی اپنے کو روک نہ سکی۔ ساڑھی کے چھور سے ہونٹوں پر ناچتی ہوئی مُسکراہٹ کو چھپاتی ہوئی چوکے میں چلی گئی۔ چندن بھی کھانا ختم کرکے تھالی اُٹھا کر چوکے میں پہنچ گیا۔ گوپ اور ریکھا کو باتیں کرتے دیکھکر وہ رُک سا گیا۔ ریکھا توے پر سے روٹی اُتارنے میں لگی ہوئی تھی اور گوپ کہہ رہا تھا "بھابھی تم نے جو یہاں سنگیت کی کلاس کھولی ہے اور اس میں جو گیت سکھاتے ہیں وہ لوگوں کو بہت پسند آئے ہیں۔ پڑوس کے سبھی گھروں میں وہ گیت گونج رہے ہیں۔ ہم ایک چھوٹی سی تقریب کرنا چاہتے ہیں تم ایسے ہی کچھ نئے گیت مجھے سکھا دوگی؟

"کیوں نہیں" ریکھا نے جواب دیا۔

چندن نے سب کچھ سُنا۔ دل ہی دل میں بولا عورت ہر راہ پر دیر سے آتی ہے مگر جب آتی ہے تو بہت تیز رفتار سے چلتی ہے وہ چوکے میں تھالی رکھ کر بولا "آج میں جلدی سوؤں گا، اس لیے میرے لئے دودھ جلدی ہی میز پر رکھ دینا"

ریکھا بولی "اچھا"

"تم کتنے بجے سوؤگی؟"

"میں تو آج بارہ بجے سے پہلے نہ سو سکوں گی۔"

"کیوں؟"

"کل ہم عورتوں کی سوسائٹی میں نئے سماج میں عورتوں کا مقام، پر بحث ہونے والی ہے۔ کچھ تیاری کرنی ہے۔"

چندن جا کر اپنی میز پر اخباروں کو دیکھنے لگا۔ ریکھا بھی فارغ ہو کر چارپائی پر جا بیٹھی۔

ٹھیک دس کے گھڑیال نے دس بجائے تو چندن بھی اٹھ کر اپنی چارپائی پر جا لیٹا۔ ریکھا بھابی لیکر جھٹ کھڑی ہوئی۔ گروپ کا کانٹا ٹھیک کر کے اس نے چندن کے لیے دودھ لا کر میز پر رکھ دیا۔ روشنی میں ریکھا کی نیند بھری آنکھوں کو چندن بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ دیکھا کو محسوس ہوا، اس کی خوبصورتی کو آنکھوں میں پی جانے والی نگاہ اس کے چہرے پر جمی ہوئی ہے۔ اسے اپنے پاؤں لڑکھڑاتے ہوئے جان پڑے۔

تبھی کواڑ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ دونوں چونک اٹھے۔ "اس وقت کون ہوگا؟" ریکھا نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"کون؟"

باہر کئی آدمیوں کی آہٹ سنائی دی مگر ایک ہلکی سی آواز آئی۔

"بھابی، میں ہوں۔"

ریکھا اچھل پڑی۔ کواڑ کھول کر اس نے شسندر کو چھاتی سے لگا لیا۔ گلاب کی ماں چیختی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ "بیٹے! ستیاناس ہو گیا! دیکھو تو سہی، بھیا کا کیا حال ہو گیا ہے۔ ریکھا بیٹیا، گلاب کے لیے بستر تو بچھا دو۔ تمھیں کیا بتاؤں بٹیا، میرا تو کلیجہ پھٹا جا رہا ہے گیا ہے۔"

ماں کو ہانپتے دیکھ کر چندن پانی کا گلاس بھر لایا۔ اس کے لئے جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ ادھر ریکھا کے تو جیسے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ مشکل سے ایک چارپائی پر بستر بچھا کر وہ ساس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ گلاب دیوی کا سہارا لیکر آہستہ آہستہ بستر کی طرف بڑھنے لگا۔

ریکھا جیٹھ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ایسا تندرست گلاب اتنا کمزور کیسے ہو گیا کہ بغیر دوسرے کے سہارے کے بستر تک جا نہیں سکتا۔ اس کے پیلے پیلے ہاتھ اور دھوپ میں جھلسا ہوا چہرہ دیکھ کر ریکھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں خاموشی چھائی۔ گلاب راسے بستر بیٹھ کر سسکتے ہوئے کہنے لگا۔

"چندن، کل ہی ضبطی کا آرڈر نکلے گا۔ میرے گولابے والے مکان کا سارا سامان کورٹ میں پہنچ جائے گا۔ پھر نیلام"۔۔۔۔۔ زیادہ نہ بول سکا۔ پھر پانی کے لئے اشارہ کر کے لیٹ گیا۔

دیوی بھی آنسو بہاتی ہوئی بولی "دادا، ایک ہی چوٹ میں بھکاری بن گئے۔"

ماں آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "چندن، ریشم کے اتار چڑھاؤ میں میرا گلاب پس گیا ہے۔ بھگوان اس کی عمر دراز کرے۔ ایسی حالت میں تمھارے یہاں نہ لاتی تو کہاں جاتی؟ پانچ روز بیچارہ دھوپ کرتا رہا ہے، آج شام تک سیٹھ ساہوکاروں کی خاک چھانتا رہا۔ مگر جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آ کر اوندھے منہ بستر پر گر پڑا۔ اب تو بار بار پانی مانگتا رہتا ہے۔"

اس کے بعد کافی دیر تک خاموشی رہی۔ گلاب کو سویا ہوا جان کر ماں نے کہا۔

"جاؤ، تم سب جا کر آرام کرو۔ میں جاگتی ہوں۔"

آدھی رات کو جب چندن کی آنکھ کھلی تو ماں کواڑ کھٹکھٹا کر پکار رہی تھی۔

"چندن بیٹا، جلدی اٹھو۔ یہاں آؤ۔ میرا تو کلیجہ بیٹھا جا رہا ہے۔"

چندن بھائی کے پاس آ بیٹھا۔ دیوی اور گلاب دونوں بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ گلاب کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں جھلک رہی تھیں گویا سخت جانفشانی کا کوئی کام کیا ہے۔ اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ بھائی کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر گلاب بولا۔

"چندن، میں نے ایسا بھیانک خواب زندگی بھر نہیں دیکھا۔"

ماں بیچ میں ہی بولی۔ "ارے، یہ تو ایسا چلایا کہ میری جان ہی نکل گئی۔"

"چندن، گویا سمندر تھا جس کا نہ ادر تھا نہ چھور۔ تیس تیس فٹ کی مچھلیاں تھیں انکے علاوہ چھوٹی مچھلیاں تو بے شمار کیا دیکھتا ہوں۔ میں درمیانے قد کی مچھلی بن گیا تھا اور پانی پیتا جا رہا تھا۔

اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بھی نگلتا جا رہا تھا جو میرے پیٹ کے اندر تڑپ تڑپ کر خاموش ہوتی جا رہی تھیں۔ میری خواہش یہ تھی کہ میں بڑی سے بڑی مچھلی بن جاؤں اس لئے مجھے اور کچھ سوجھتا ہی نہ تھا اچانک ایک بڑی مچھلی میری طرف بڑھی۔ میں بچا چھڑا آ رہا مگر وہ برابر میرے پیچھے بھاگتی رہی۔ پھر تو کئی مچھلیوں کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ جان بچانے کے لیئے میں نے سمندر کا کونا کونا چھان مارا زوردار گرج کی آوازیں ہوتی رہیں اور لہریں تیزی سے آسمان کی طرف اٹھ کر پھر دھڑام سے پانی میں جاتی تھیں۔ مگر وہ برابر میرا پیچھا کیئے رہیں۔ کبھی کبھی تو وہ ایک ہی چھلانگ میں میرے قریب پہنچ جاتیں۔ بہت دیر تک یہ مقابلہ جاری رہا۔ آخر کار ایک بڑی سی مچھلی میرے آدھے حصے کو نگل گئی۔ میں خوب چلایا۔ چھوٹی مچھلیوں کی قہقہے گونجنے لگے اور میں گرم لوہے کی مانند غصے میں پاگل ہوا تھا۔ بڑی مچھلی کے دیکھتے ہوئے پیٹ میں جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا میری رگ رگ کانپ اٹھی۔ موت سامنے تھی اور میں تڑپ رہا تھا کہ میری نیند کھل گئی۔"

ریکھا تولیہ لے آئی۔ چندن نے بھائی کا پسینہ پونچھ کر اسے بستر پر لٹا دیا اور بولا" بھیا، سرمایہ داری نظام کے یہی رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ چھوٹے بیوپاری اپنی حفاظت کے لیئے کتنی بھی کوشش کریں مگر انھیں بڑے لیڈروں کے پیٹ میں جانا ہی پڑتا ہے اسی لیئے میں نے تم سے کہا تھا کہ چھوٹے بیوپاریوں کو بھی اس سماج کو بدلنے کے لیئے مزدوروں، کلرکوں اور کسانوں کا ساتھ دینا چاہیئے گلاب ہتچ کیے کر دیتا، مار دگی اپنے سامیواد کو۔ آج اسے چندن کے الفاظ میں آنکھوں دیکھی حقیقت کی جھلک ملی تھی۔ ٹھنڈی سانس لیکر بولا" آگ لگے ایسے سرمایہ داری نظام کو!

ساری زندگی داؤ پر لگا کر جس سیڑھی پر چڑھ رہا تھا وہ ایسی گری کہ میرے ہاتھ پاؤں ہی توڑ دیئے" اور وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

سحر کی کرنوں نے بتی کی روشنی کو مدھم کر دیا۔

چندن نے کہا" بھیا صبح ضرور آئے گی جیسے جیسے یہ امیر اور غریب کا فاصلہ بڑھتا جائے گا یعنی دولتمند تھوڑے اور غریب بہت ہوتے جائیں گے ویسے ویسے ان حالات کا خاتمہ ہوتا جائے گا۔ اسکی کھوکھلی دیواریں ضرور گر پڑینگی اور اس کی جگہ ایک ایسا سماج تعمیر ہوگا جس میں ہر ایک انسان اپنی محنت کے عوض سکھ چین کی زندگی بسر کرے گا اسکا مستقبل مکمل طور پر درخشاں ہوگا"

گلاب رائے ناریل کے پیڑوں کے پیچھے طلوع آفتاب کو دیکھ رہا تھا۔ بولا" تمہارا ایسا سماج بھگوان کرے جلدی ہی قایم ہو"

کچھ دیر کے بعد گلاب رائے پھر بستر پر لیٹ گیا اور چندن نے رضائی آہستہ آہستہ اس کے کندھے تک سرکا دی۔

" یکایک گلاب نے پکارا" دیوی"

دیوی نے شوہر کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا" جی!"

گلاب نے اسے ہاتھ سے کھینچ، بستر پر بٹھا اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔ ریکھا اور چندن اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کواڑ بند کر کے چندن چارپائی پر جا بیٹھا۔ ریکھا زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کسی سوچ میں غرق تھی۔ چندن نے پکارا" ادھر آکر بیٹھو"

ریکھا گویا کسی جادو کے بل پر کھنچ کر چندن کے بستر پر جا بیٹھی مگر ابھی تک وہ کسی گہری سوچ میں محو تھی۔ چندن نے پوچھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

ریکھا نے سر اٹھا کر لمبی سانس لیتے ہوئے کہا" سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ میں اور گلاب دادا میں اتنا فرق کیوں ہے؟"

ریکھا، یہ ہمارے خاندان کی ایک دکھ بھری کہانی ہے۔ سنو گی تو تمہیں بھی دکھ ہوگا۔

" انسان صرف خوشی کی کہانیاں سننے کے لیئے پیدا نہیں ہوا"

چندن اداس ہو گیا۔ زمین کی طرف ایک ٹک دیکھتے ہوئے بولا۔

برسوں پہلے کی کہانی ہے۔ اس وقت ہم بے حد غریب تھے۔ ماں بیچاری ہر دو دو برس کے بعد گھر کے آدمیوں میں اضافہ کرتی جاتی تھیں اور پتا جی لقوے کی بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کمانے سے معذور تھے۔ جب میں اور گلاب دنیا کو سمجھنے کے قابل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ہماری چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو بھی ٹھکرا دیا جاتا تھا۔ جب ہمارے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کھلونوں کے لئے اوپر اٹھتے تھے تو ماں بیچاری اپنے دامن میں بندھے پیسوں کو دیکھ کر رو دیتی تھیں۔ ہم پاس پڑوس کے بچوں سے کھلونے چھینتے تھے تو خوب لڑائی ہوتی تھی۔ پورا کھانا نہ ملنے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے منہ سے روٹی چھینتے تھے اور آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے تھے اگر ایک

تنگی، وہ کپڑوں سے لیکر اسکول کی کتابوں تک کے لئے ہمیں لڑنا پڑتا تھا اور یہ چھینا جھپٹی ہماری نس نس میں سما گئی۔ اسکول کے زمانے میں اس مقابلے نے مختلف شکل اختیار کرلی۔ میں ہمیشہ سب سے اوّل آنے کے لئے کوشش کرتا تھا اور گلاب جو مجھ سے زیادہ طاقتور تھا لڑاکے لڑکوں کا سردار بن گیا۔ اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا جس سے ہمارا رہا سہا بچپن جاتا رہا؟"

چندن کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ پرانی باتوں کو یاد کرکے اسکا دل دکھ درد کی گھٹاؤں میں گھر گیا تھا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ایک دن ہمارے گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہ بچا۔ ماں نے چاول اُدھار لاکر بھات پکایا۔ گلاب دوسرے دن چوکے میں کھانے کے لئے گیا تو اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ وہ مجھ سے جھگڑنے لگا کہ میں نے رات کا بچا ہوا بھات کیوں کھایا۔ ہم دونوں کتوں کی طرح لڑے۔ گلاب کی قمیص پھٹ گئی۔ وہی قمیص تھی جسے پہن کر وہ سکول جاتا تھا۔ غصے میں آپے سے باہر ہوگیا اور سیاہی ناخنوں والی انگلیوں کو گول بنا کر مجھ پر جھپٹا۔ گہرا دھبا پڑا آنکھوں کے نیچے کا یہ نشان یاد کے طور پر رہ گیا ہے۔"

رکمیا نے جھک کر دیکھا، چندن کی آنکھ کے نیچے گہرے زخم کا نشان اب تک دکھائی دے رہا تھا۔

چندن بولا: "ہم دونوں ایک دوسرے کو نوچنے کی کوشش کر رہے تھے حالانکہ بھوک ہمیں پہلے ہی نوچ چکی تھی۔ چارپائی کے پاس ماں کا جسم تھوڑا سا ہلا اور میں اپنا زخم بھول گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو ماں کے سر سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ ہمیں پتہ ہی نہ لگا تھا کہ کب ماں ہمیں چھڑاتے چھڑاتے ہماری چوٹ کا شکار ہوکر گر پڑی تھی۔ اس رات ماں کافی دیر تک بیہوش رہی۔ ہم دونوں بھی روتے رہے۔ علیحدگی میں روئے، ماں سے چپک کر روئے اور آخرکار دونوں گلے مل کر روئے۔ گلاب نے کہا "ماں اچھی ہوگئی تو میں تم سے کبھی نہیں لڑوں گا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ہم غریب ہیں اس لئے تو لڑتے ہیں۔"

وہ بولا: "اس کے بعد میں چوری کروں گا۔ ڈاکہ ڈالونگا، غریب ہرگز نہ رہونگا۔" اس نے پڑوس کے ایک ساہوکار نے بکری کے لئے ہاتھ پاؤں جوڑے جس نے اسے ملک سے باہر اپنی دکان پہ بھیج دیا۔ وہاں اس کے مقابلے کا میدان اور بھی وسیع ہوگیا۔ وہ انسانوں سے ہی نہیں بلکہ روپے اور چاندی سونے جیسی مادی چیزوں سے ٹکر لینے لگا۔"

ماں کے تندرست ہوجانے کے بعد جب کبھی میں اپنا زخم دیکھتا تھا تو مجھے اس بربریت نما وقت کی یاد آجاتی تھی۔ میں اپنے دل سے پوچھتا تھا، جو بھوک انسان کو جانور بنا دیتی ہے اسکا وجود اس دنیا سے کیوں نہیں مٹ جاتا؟ میری دوستی بھی ایسے لڑکوں سے ہونے لگی جن کے گھر میں بھوک تھی، جو پھٹے پرانے کپڑے پہن کر سکول آتے تھے مگر ذہنی طور پر ہوشیار تھے۔ ان کے دلوں میں بھی شاید میرا سوال ہی اٹھتا تھا۔ ہم جب کالج میں گئے تو خوب کتابیں پڑھنے اور بحث مباحثے کرنے لگے۔ ہم نے فیس کم کروانے کے لئے ہڑتالیں کیں۔ اس وقت کانگریس برطانوی سامراج سے ٹکر لے رہی تھی اس لئے اسکا ہندوستانی عوام پر کافی گہرا اثر تھا۔ ہم نے گاندھی واد کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور انگریزوں کے خلاف عمل میں جیل ہو آئے۔ رکمیا ہم نے سوچا تھا کہ آزادی کے بعد ہماری حالت سدھر جائیگی مگر ہم نے اپنے سنہرے خوابوں کو مٹی میں ملتے دیکھا۔ ہماری زندگی کچل دی گئی۔ روشنی سے جگمگاتے مکانوں کے بدلے کال کوٹھری نما بیرکوں میں رہنا پڑا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تعلیم حاصل کرنے کے بجائے اپنا پیٹ پالنے کی خاطر کھٹی میٹھی گولیاں بیچنے پر مجبور ہوئے۔ ہزاروں نوجوانوں کی خوش حال زندگی کی آرزوئیں بیکاری اور بیروزگاری کی چکی میں پسنے لگیں۔ ہزاروں مائیں اپنی مامتا کو دبا کر آسمان کی طرف دیکھتی رہیں کہ وہ سنہری صبح کب آئے گی جب کوئی میٹھی اور توتلی زبان انکو نیند سے جگائے گی اور دو چھوٹے چھوٹے نرم ہاتھ انکی پیاسی چھاتی کو ڈھونڈھیں گے۔ بوڑھی ماؤں کے لال کمزور ہوتے گئے۔ ان کی جوان لڑکیاں ہاتھوں میں مہندی لگانے سے محروم ہوکر سر پر گاگر یا اٹھا کمپوں کے نلوں پر قطاریں باندھنے لگیں۔ اچھے گھرانوں کے بوڑھے مرد

پلیٹ فارموں پر بستر اٹھانے کا کام کرنے لگے، خوانچے لے کر گلیوں میں پھرنے لگے اس طرح زندگی گھسٹتی اور پستی رہی تا وقتیکہ چین کے عوامی انقلاب نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ ہماری ٹولی کے ہر نوجوان نے قسم کھائی کہ اپنی زندگی انسان ذات کی خدمت کے لئے وقف کر دیں گے جب تک بھوک اور بیکاری دور نہیں ہوتی، جب تک جہالت اور بیماریوں سے چھٹکارا نہیں ملتا، یہ آزادی کس کام کی؟ اُن دنوں گلاب کا ایک خط آیا تھا۔ پڑھو گی؟"

چندن پیٹی میں ایک پرانی فائل ڈھونڈنے لگا۔ ریکھا نے سوچا میں کیسی بیوقوف تھی! جس کی زندگی چین سے بالکل ہی محروم رہتی آئی ہے اُس سے آرام حاصل کرنے کی خواہش کر رہی تھی۔

چندن نے خط لا کر ریکھا کے ہاتھ میں دیا۔ خط کے آخری حصے میں لکھا تھا:۔

چندن، تمہیں سمجھانے کے لئے ایک بار پھر لکھنا پڑتا ہے کہ تم جس راہ پر چل رہے ہو اُس سے گھر کی تباہی ہونا لازمی امر ہے کئی بار لکھ چکا ہوں کہ تم بھی میری تقلید کرو تو گھر کو سونے سے بھر دو۔ بھلے مانس! اس دنیا میں غریب کو کوئی نہیں پوچھتا، سب پیسوں کے ہی دوست ہیں۔ تم یہاں افریقہ آ جاؤ تو دونوں کما کر گھر کا نام روشن کریں گے۔ یہاں افریقہ میں تو چاندی ہی چاندی ہے۔

بیچارے دیہاتی پانچ گز مانگتے ہیں تو میں چار گز دیتا ہوں کیونکہ وہ نرے بدھو ہیں۔ افریقہ تو جاہلوں کا ملک ہے۔ ہاں بیماریاں بہت ہیں مگر دو تین روپے ہر ماہ دوائیوں پر خرچ کر کے چین سے رہا جا سکتا ہے۔ بڑے بیوپاری تو ہوتے ہیں ہر وقت دوسروں کو ہڑپ کرنے کی سوچتے رہتے ہیں۔ لاکھوں کماتے ہیں پھر بھی پیٹ بھرے بیل کی طرح لاتیں مارتے رہتے ہیں۔ مگر میرا نام بھی گلاب ہے۔ دیکھنا پانچ چھ سال کے اندر کتنا کچھ کماتا ہوں۔ اگر اب بھی تم اخباروں، کتابوں، جاہلوں اور بحث مباحثوں میں اپنا وقت ضائع کرتے رہو گے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ میں چوٹی پر کھڑا ہوں گا اور تم بھکاری کے سے پھٹے پرانے کپڑوں میں کمزور اور اُداس آنکھیں لئے دوسروں کی طرف تاکتے رہ جاؤ گے۔"

خط پڑھ کر ریکھا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے گہری سانس کے ساتھ اُس کے منہ سے نکلا، "بھلا برا مشافرا!"

چندن نے پوچھا "تمہیں گلاب پر رحم آتا ہے نہ؟"

"نہیں، مجھے اپنے سماج پر رحم آتا ہے جس نے ترقی کے راستے اتنے تنگ کر دیئے ہیں اور لوگوں کا مستقبل اتنا غیر محفوظ کر دیا ہے کہ کوئی بھی امن و چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔"

"جو سماج رحم کے قابل ہے۔۔۔"

"اُسے بدلنا ہی پڑے گا!" ریکھا نے چندن کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

چندن نے ریکھا کا گلابی ہاتھ اُٹھا کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ ریکھا سوچتی رہ گئی۔ جو سوال برسوں تک میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا، اُس کا جواب تو ماضی کے اوراق میں چھپا ہوا تھا۔

چندن نے اُسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ریکھا اُس کی گود میں منہ چھپاتی ہوئی بولی "میں نے تو سمجھا تھا، آپ کے پاس دل ہی نہیں ہے۔۔۔"

چندن ریکھا کا چہرہ اپنے ہتھیلیوں پر ٹکائے مسکراتا رہا۔ ریکھا شرماتی ہوئی بولی — "مگر اب۔۔۔"

چندن نے پوچھا "مگر اب۔۔۔"

"مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے پاس بھی دل ہے۔ ایک خوبصورت اور جیتا جاگتا دل!"

رجنی پنیکر

رجنی پنیکر نے لاہور کے ایک خوشحال پنجابی گھرانے میں جنم لیا۔ اس گھرانے کے افراد تعلیمی میدان میں بڑا نام پیدا کر چکے ہیں۔ علم و دانش کا بے پناہ سرمایہ رجنی کو ورثہ میں ملا۔ انھوں نے ہندی اور انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ آپ کا بچپن لاہور ہی میں گذرا۔ جو ایک مدت سے پنجاب میں علم و ادب کا گہوارہ چلا آ رہا تھا۔ بٹوارے کے بعد آپ پنجاب سرکار کی طرف سے شائع کئے جانے والے ہندی کے رسالہ "پردیپ" کی مدیرہ رہیں اور ۱۹۵۰ء میں آپ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئیں۔ اس وقت آپ پروگرام ایگزیکیٹو ہیں۔ رجنی پنیکر کا رجحان ابتداء ہی سے علم و ادب کی طرف تھا لہٰذا انھیں ملازمت بھی اُن کی مرضی کے مطابق ملی۔

رجنی پنیکر نے اپنی مستقل مزاجی سے یہ ثابت کیا ہے کہ ریڈیو کے ماحول میں تخلیقی قوتیں سلب نہیں ہوتیں۔ اُردو کے بیشتر ادیبوں نے ریڈیو کی ملازمت کی۔ اور آخر کار انھوں نے اُسے ترک کر دیا چونکہ اُن کا خیال تھا کہ ریڈیو کا ماحول اعلیٰ ادب پیدا کرنے کے لئے سازگار نہیں ہے مگر رجنی پنیکر نے اس خیال کو سراسر غلط ثابت کر دیا ہے۔ آپ نے ریڈیو کے ماحول میں رہتے ہوئے پانچ اچھے ناول لکھے ہیں۔ جو ہندی میں "ٹھوکر" "پانی کی دیوار" "موم کے موتی" "پیاسے بادل" اور "کالی لڑکی" کے نام سے چھپ کر بے حد مقبول ہوئے۔ ناول "پیاسے بادل" پر آپ کو یو۔پی سرکار سے انعام بھی مل چکا ہے۔ آپ کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "سگریٹ کے ٹکڑے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کہانیوں میں انھوں نے ہیئت اور موضوع کے دلاویز تجربے کئے ہیں۔ اُن کا ایک ناول "جاڑے کی دھوپ" زیر طبع ہے۔

رجنی پنیکر اونچے درمیانہ طبقہ کی عکاسی میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ اونچا درمیانہ طبقہ یوں بھی ہمارے سماج کا ایک پُر لطف حصہ ہے۔ جو اونچے طبقہ میں شامل ہونے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ نقالی اور تصنع جس کی فطرت ثانی بن چکا ہے۔ اونچے طبقے میں جانے کی دوڑ دھوپ میں درمیانہ طبقہ جو قلابازیاں لگا رہا ہے وہ ناول کا نہایت ہی حسین موضوع بن سکتی ہیں۔ رجنی پنیکر چونکہ خود درمیانہ طبقے سے ہیں اس لئے وہ اس طبقہ کی رگ رگ سے آگاہ ہیں۔ اُن کا مشاہدہ نہایت پختہ ہے۔ وہ تمام اقتصادی، سیاسی اور سماجی حقائق سے واقف ہیں۔ اس لئے ان کا مزاح ایک تیز مہک اور اُن کی طنز ایک تیز نشتر ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں ایک منظم پلاٹ کی قائل نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کے تمام ناول دلچسپ ہیں۔ اور اُن میں لطف و مسرت کا عنصر بہت غالب ہے۔

رجنی پنیکر کا ناول "کالی لڑکی" کا موضوع بھی اچھوتا ہے۔ یہ ایک غم زدہ کالی لڑکی کی داستان ہے۔ جو ہمارے آج کے سماج میں اپنا مقام ڈھونڈتی ہے۔

رجنی پانیکر

پرکاش سنگا پنج

رجنی پنیکر

پرکاش لنگانج

کالی لڑکی

میں اپنی آنکھوں کے آنسو خشک کر چکی ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی میں صرف ایک بار ہی میری آنکھیں اشکبار ہوئی ہیں۔ جب کبھی ایسے موقعے آتے جب کبھی آنسو بہانے کی خواہش بھی اٹھتی میں آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دل کی گہرائیوں میں چھپا کر رکھتی۔ آنکھوں سے خاموش آنسو جو گرتے ان میں زندگی بھر کا سرخ خون ہوتا۔ سیاہ جلد کے نیچے بھی خون تو لال ہی رہتا ہے نہ۔

اپنا افسانہ سنا کر میں آپ کی ہمدردی جگانا نہیں چاہتی۔ ہمدردی اور رحم کے الفاظ سے مجھے سخت نفرت ہے۔ اس دنیا میں کسی کے دل میں کسی کے لئے حقیقی معنے میں ہمدردی ہو سکتی ہے؟ مجھے تو وہ صرف ایک دکھاوا جان پڑتی ہے۔۔۔ میں اپنی صفائی بھی پیش نہیں کرنا چاہتی۔ انسانی جسم کے رنگ پر اس کے اعمال کی پاکیزگی منحصر نہیں۔ اس پر غور کرنے کی فرصت کسے ہے۔

میں پیدائشی کالی ہوں۔ ماں کا رنگ گورا، پتا کا گندمی، بہن گوری لیکن میں کالی۔ میری بہن عمر میں مجھ سے چھ سال بڑی ہے۔ وہ میرے ساتھ کبھی کھیل میں شریک نہیں ہوتی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ جو آواز میرے کانوں نے سنی وہ یہ تھی کہ میں کالی ہوں۔ سب مجھے کالی کالی کہہ کر پکارتے تھے۔ ہمارے گھر میں ایک خادمہ تھی جسے میری پیدائش سے پیشتر ہی رکھا گیا تھا۔ ان کو مکمل یقین اور امید تھی کہ لڑکا پیدا ہوگا۔ اور لڑکے کی پرورش میں امداد کرنے کے لئے ہی انہوں نے یہ خادمہ رکھی تھی۔ لیکن لڑکے کے بجائے لڑکی پاکر اور وہ بھی کالی ان پر بجلی گری ہوگی۔ اس میں کسی کو شک و شبہ نہیں ہونا چاہئے۔

بچپن کے تمام واقعات تو میری یادداشت سے دور چلے گئے ہیں۔ اور میں اس تلخ زندگی کو یاد بھی نہیں کرنا چاہتی۔ چند دھندلی سی یادیں باقی ہیں۔ ایک بات جو بچپن سے ہی مجھے اسی کی طرح گاتی رہتی ہے، اور وہ ہے میری جلد کا سیاہ رنگ۔ آپ فرمائیں گے ہندوستان جیسے ملک کی نصف آبادی سیاہ فام ہے۔ یہ تو بحث کی بات ہے۔ درمیانی درجے کے گھرانے میں جس میں سبھی گورے ہوں، ایک لڑکی کا کالی ہونا گویا اس کی بدنصیبی کی پختہ دلیل ہے۔ اس کے تاریک مستقبل کا روشن نشان ہے۔ ممکن ہے میری ماں میرا رنگ دیکھ کر سکتے میں آگئی ہوں گی۔ انہوں نے بدنصیبی کے اس سایے کو ختم کرنے کے لئے میرا نام رانی رکھ دیا اور جب میں راجہ رانیوں کے فسانے سننے اور سمجھنے کے لائق ہوئی تو مجھے یہ بات بار بار چبھتی کیا کبھی رانی کالی بھی ہوتی ہے؟ رانی کو تو پریوں کی طرح گوری چٹی اور خوبصورت ہونا چاہیے۔ میرا نام رانی کیوں رکھا گیا؟

بڑی ہونے پر مجھے ایک سکول میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں جماعت میں ایک شرارتی لڑکا مجھے دیکھ کر بولا "یہ تو الٹا ہے۔ تمہارا نام رانی نہیں، کوئل ہونا چاہئے تھا۔" میرے معصوم اور نازک دل پر اس کے الفاظ چابک کی طرح لگے۔ لیکن اس کی اس بات پر میں کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ میرا بچپن ایک بار گویا سنجیدگی میں تبدیل ہو گیا۔ سکول میں میرا یہ روز اول ہی تھا۔ میرے دل میں ماں کے لئے سخت نفرت جاگ اٹھی۔ اس وقت تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ صرف غصہ ہے لیکن درحقیقت وہ نفرت اور حقارت تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میری ماں نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے۔ اپنی خادمہ چاندنی پر بھی مجھے غصہ آیا۔۔۔ چاندنی جب کبھی مجھے اپنی گود میں لیتی تو میرے معمولی بالوں کو سہلاتے ہوئے میری پیشانی چوم کر کہتی "رانی بیٹا کسی دن راجہ کی رانی بنے گی۔ سان پر جذبات اور گہری گہری آنکھوں میں کون اپنا نصیب تلاش کرنا چاہے گا۔"

اس وقت تو اس کی یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ کچھ عمر بڑھنے پر

[illegible]

ہاں تو میں دن کمل بابو دیدی کو دیکھنے آئے۔ مجھے اپنے کمرے سے باہر آنے کی سخت ممانعت کر دی گئی۔ ماں نہیں چاہتی تھیں کہ میرے سامنے کو کوئی کمل بابو دیکھ پائیں۔ انہیں شک تھا کہ کہیں کالی سیاہ کو دیکھ کر وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ دیدی ماں کی لڑکی نہیں کسی کی مانگی ہوئی لڑکی ہے جو انہیں دکھائی گئی ہے۔

ماں کی سخت ہدایت اور بندشوں کے باوجود بھی میں نے کمل بابو کو ایک نظر دیکھ ہی لیا۔ مجھے کوئی خصوصیت اُن میں نظر نہ آئی۔ گندمی رنگ، درمیانی قد، بالکل معمولی۔ ان نے دیدی کے لئے یہ معمولی سا دولہا کیوں تجویز کیا ہے؟ انہیں کمل کیوں پسند ہے؟ ان میں کیا خوبی ہے؟ بے شمار سوالات یک بارگی میرے ذہن میں جاگ اٹھے۔ جب کمل بابو دیدی کو پسند کر کے رخصت ہو گئے تب میں نے موقع پا کر چاندی سے دریافت کیا چاندی ماں کو دیدی کے لئے یہ معمولی سا دولہا کس طرح پسند آ گیا؟

چاندی نے جواب دیا۔ تم ابھی نادان ہو رانی بیٹا! کمل بابو کے پاس دولت ہے، وہ کا دیری بیٹیا کو چاندی میں تول سکتے ہیں، سونے سے لاد سکتے ہیں۔

ان کے پاس اس قدر دولت کہاں سے آئی؟ میں نے حیرت سے سوال کیا۔

کالے بازار سے بیٹیا!

غصے سے میرا چہرہ تمتما اٹھا۔ گو میں میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ لیکن مجھے کالے بازار کے معنی معلوم نہ تھے۔ میرا دل چیخ اٹھا۔ لیکن حسب معمول یہ چیخیں بھی خاموش تھیں۔ چاندی کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ اپنی بات کا اثر جو میرے چہرے پر نمایاں ہوا تھا دیکھ پاتی۔ وہ مختصر سا جواب دیکر اپنے کاموں میں مشغول ہو گئی۔

وہ رات میری زندگی کی ایک پرسوز رات تھی۔ باہر آسمان کی گود میں چاند ستاروں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ مارچ کا مہینہ تھا ہلکی ہلکی سردی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں اپنے پلنگ پر بیٹھی خود کو لعنت ملامت کرتی رہی میں اس قدر بدصورت کیوں ہوں کہ مجھے اپنے ہونے والے جیجا کے سامنے بھی نہیں جانے دیا گیا۔ آخر وہ کیا کرتے؟ مجھے کھا جاتے؟ دیدی کو کس طرح کا نظر انداز کر دیتے؟ میں کالی ہوں، میرا سایہ بھی دیدی پر نہیں پڑنا چاہئے۔ لیکن اس طرح دیدی کا سفید رنگ سیاہ کس طرح ہو جائے گا۔

لیکن میرا درد سمجھنے والا تھا۔ وہ کون جس نے کبھی چوٹ ہی نہ کھائی ہو، وہ دوسرے کا درد کس طرح جان سکتا ہے۔

کمل بابو! اسی نام سے انھیں ہمارے گھر میں پکارا جاتا تھا۔ ان کی روانگی کے بعد ماں اور دیدی کافی رات گزرے تک بات چیت میں مشغول رہیں۔ دیدی اور میں ایک ہی کمرے میں سویا کرتی تھیں۔ ساڑھے گیارہ بجے تک دیدی کمرے میں نہیں آئیں تو میں نے روشنی گل کر دی۔ ماں بیٹی میں ہم جولیوں جیسا تعلق تھا۔ ماں دیدی سے صرف چودہ سال بڑی تھیں اور مجھ سے اکیس سال۔

میں بے چینی سے دیدی کا انتظار کرتی رہی۔

شادی دیدی کی ہو رہی تھی۔ لیکن دھڑکنیں میری تیز ہو رہی تھیں۔ بارہ بجے کے قریب دیدی جب کمرے میں داخل ہوئیں تو میں نے ایکدم سوال کیا۔ دیدی تمہیں اپنے ہونے والے شوہر پسند ہیں؟

نہ معلوم دیدی اور ماں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔ وہ فوراً بولیں اتنی گوری ہونے پر تو کمل بابو جیسا شوہر ملا ہے، اگر تمہاری جیسی ہوتی تو نہ جانے کیا ہوتا؟

دیدی کی اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے بے تکلفی سے پھر سوال کیا۔ بتاؤ نہ دیدی! تمہیں پسند ہے؟

پسند کیوں نہیں رانی! تم تو چھوٹے موٹے کی رانی ہو اور میں در حقیقت رانی بننے جا رہی ہوں۔ جانتی ہو دہلی میں ان کا بڑا کاروبار ہے۔ لاکھوں کا لین دین ہے۔ چار مکان ہیں، دو کاریں ہیں اور اب میرے لئے ایک نئی کار خرید رہے ہیں۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پھر سوال کیا ـــــ دیدی، دیدی کے لئے دوپٹے کی موٹریں بھی دوکھی جاتی ہیں کیا ؟

ہاں ـــــ اس کا سونا اور روپیہ بھی دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے میں اس شادی پہ غور کرنے لگی جو دولت دیکھ کر کی جا رہی تھی دیدی کے ہر ایک جملے سے ماں کے اثرات کی بو آ رہی تھی ـــ ویسے بھی ماں اور دیدی ہم خیال تھیں۔ دیدی کی ان باتوں میں میں کچھ بھی نہ قریب سے تھانے میں تیں کا گھنٹہ بجا بس اس کی آخری گونج ہی میں سن سکی اور پھر نیند نے مجھے اپنے آغوش میں چھپا لیا۔

دیدی کی شادی ہو گئی رخصتی کے وقت وہ اس قدر زار و قطار روئیں کہ پتا جی کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔ میں نے پتا جی کو اپنی زندگی میں صرف دو مرتبہ روتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک دفعہ تو دیدی کی رخصتی کے وقت اور دوسری دفعہ . . . . . پھر بتاؤں گی۔

ماں کی نظر میں میں کسی مشورہ کے قابل نہ تھی۔ دیدی کیلئے کپڑے اور زیورات بنوائے گئے۔ اس وقت بھی انہوں نے میرے شوق کی قطعی ضرورت محسوس نہ کی جس کا رنگ سیاہ ہو وہ بھلا کیا جانے کہ کسی ساڑی کے ساتھ کون سا ہار خوشنما دکھائی دے گا ـــ ماں کھلے ہاتھوں خرچ کر رہی تھیں۔ بوا نے ٹوکتے ہوئے کہا ـــ رانی کی شادی بھی تو کرنی ہے۔ اسے کس طرح کرو گی ؟ . . . کیا اس کی شادی میں خرچہ نہ کرو گی جو اسی شادی میں تمام رقم اٹھائے دے رہی ہو ؟ ماں نے نہایت افسردگی سے جواب دیا ـــ پتہ نہیں بھگوان کو کیا منظور ہے ـــ کوئی اسے اپنائے تو سمجھو رحم

واہ بھابی ! واہ ـــ رانی کنواری ہی رہے گی ؟ ہماری سبنا (بوا کی نند) تو رانی کی بہ نسبت کہیں زیادہ سانولی ہے۔ پھر رانی کے نقوش تو نہایت دلکش اور خوبصورت ہیں۔ آنکھیں بھی بیحد خوبصورت ہیں۔

لیکن اسکے بعد ماں نے جو کچھ کہا اس نے میری روح کو ہلا دیا کیا کوئی ماں اپنی اولاد کے لئے اس طرح کے الفاظ استعمال کر سکتی ہے ؟ میری پیدائش کے وقت کیا ماں نے تکلیف محسوس نہ کی تھی ؟ ـــ ـــ میں نے تو سنا تھا کہ ماں کو اپنے سبھی بچوں سے یکساں محبت ہوتی ہے۔ ان کے درمیان فرق تو صرف پیار کی نظر دیکھا کرتی ہے ـــ

ماں نے کہا ـــ تم تو بھولی ہو بوا جی تم نے رانی کو کبھی غور کر کے دیکھا ہی نہیں ہے۔ جب کبھی دیکھا ہے محض سرسری نظر سے۔ بغور دیکھتے ہوئے میں خوف زدہ ہو اٹھتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ نہ جانے کس دیوی یا دیوتا کی بددعا سے یہ لڑکی میری کوکھ سے پیدا ہوئی ـــ

بوا کی آنکھیں غم سے اشک بہانے لگیں ـــ رجنی دیدی سے بھی لکھنے پڑھنے میں تیز ہے۔ پڑھ لکھ کر کچھ بن ہی جائے گی۔ تم اسے لیڈی ڈاکٹر بناؤ ـــ ڈاکٹری پڑھاؤ۔

اس پر ماں نے کہا ـــ نہیں جی جی ! اول تو ہماری حیثیت اس قابل نہیں کہ ڈاکٹری پڑھا سکیں ـــ دوسرے۔ ڈاکٹر بن کر جب یہ اپنے کالے ہاتھوں سے بچے پیدا کرائے گی تو وہ بھی کالے ہو جائیں گے ـــ

ماں کی اس بات کا بوا نے کیا جواب دیا سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ سارا کمرہ چھت پر گھومتا ہوا محسوس ہوا گیا۔ میرے دل کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اُف کیا ایک ماں اپنی بیٹی کے لئے اسقدر سخت اور بے رحم الفاظ استعمال کر سکتی ہے ؟ یہ میرے یقین اور تخیل سے پرے کی بات تھی یہ حقیقت ہے کہ ماں کی الفت اور ممتا مجھے نصیب نہیں ہوئی لیکن ماں کی ممتا اور محبت کیسی ہوتی ہے یہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ ماں کے دل میں دیدی کے لئے بے پناہ محبت تھی میں نے کئی مرتبہ ماں کو دیدی کی طرف ممتا بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے دیکھا تھا۔ دیدی کی ناراضگی اور غصہ پہ وہ کیا کیا نہیں کرتی تھیں ؟ ایک مرتبہ شہر میں نمائش ہو رہی تھی ـــ دیدی نے اس میں ساٹھ روپیہ کی ایک ساڑھی دیکھی تو ان کا دل مچل اٹھا ـــ ساٹھ روپیہ کی ساڑی ماں کے پاس اتنے روپیہ نہیں تھے کہ وہ اسی وقت ساڑی دلوا دیتیں۔ پتا جی ایک معمولی بینک کے منیجر تھے۔ صرف چار سو روپیہ تنخواہ ـــ اس سے گھر کا خرچہ، ہماری تعلیم رشتہ داروں کی شادیاں وغیرہ سبھی کچھ تو کرنا ہوتا تھا۔ ساٹھ روپیہ کی ساڑی دیدی کے لئے اسی وقت کس طرح دلوا سکتی تھیں۔ گھر واپس جا کر دیدی نے کھانا نہیں کھایا ـــ ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے نہیں بلکہ دراصل محبت کی وجہ سے ماں سے بھی کھانا نہیں کھایا گیا کافی رونا دھونا ہوا ـــ اس رات ماں دیدی کے ساتھ سوئیں۔

اور سدا سہرے دن سہانی خوشی گئی —
اماں کی ماں نے میرے لئے باپنی املاک کے لئے لیے الفاظ
استعمال کئے تھے۔ میرا دل تڑپ اٹھا۔ پتا جی ماں کے نیچے جلوائی کی
ان کہانی میں جس میں انسے مٹھائی کھنے کے لئے گئی کھول سکھا
رہیں۔ وہ جلن شاید اس جلن سے کہیں کم ہوگی جو دل کو اس
طرح تڑپا رہی ہے —

لیکن میں ویسا نہ کرسکی۔ نصیب کا بدا ابھی بہت کچھ
مجھ دکھنا باقی تھا۔ جب جب میں ماں کی ممتا کی کمی محسوس
کرکے غم زدہ ہو جاتی تو مجھے پتا جی کا خیال آجاتا کتنے رحم دل ہیں
وہ؟ دیدی کے لئے گھڑی لائے تو میرے لئے بھی۔ ماں نے کہا۔
کملا دیدی کی تو شادی ہے، رانی کے لئے یہ فضول خرچ کرنے کی کیا
ضرورت تھی؟

پتا جی نے خاموشی سے جواب دیا۔ اپنی مسکراہٹ میں اول
آئی ہے —— اُسے کالج جانا ہوگا۔ کالج میں گھڑی کی ضرورت
تو پڑتی ہی ہے۔

ماں خاموش رہیں —— اس بات کا کوئی جواب انہوں نے
نہیں دیا۔ مجھے پتا جی سے یہ تحفہ پاکر بے حد خوشی ہوئی۔ شروع
سے ہی گھر بھر کی بے رخی اور لاپروائی نے میرا دل نہایت
نازک اور پژمردہ بنا دیا تھا —— چاندی کے اسرار پر ماں نے
مجھے ہلکے رنگ کی دو ریشمی ساڑیاں دیدی کی شادی پر پہننے
کے لئے دی تھیں لیکن میں نے اُنہیں نہیں پہنا —— اس
بھیڑ بھاڑ میں کسے فرصت تھی کہ میرے لباس کی طرف توجہ دیتا۔
کیسے غرض پڑی تھی کہ غور کرتا کہ میں نے کیا پہنا ہے کیا نہیں ——

جب دیدی کچھ دن سسرال میں رہ کر واپس گھر آئیں تو
میں نے وہ ساڑیاں پہنیں تاکہ کمل بابو یہ نہ سمجھ سکیں کہ میرے
پاس اچھے کپڑے نہیں ہیں۔ اُس واقعہ کی یاد آتے ہی میرا دل
آج بھی درد سے پیچ کھا اٹھتا ہے —

کمل بابو کو ہمارے گھر میں کسی راجہ مہاراجہ سے کم عزت
نہیں دی جا رہی تھی۔ سب کے ساتھ دلچسپی سے گفتگو کرتے
دیکھ میرے دل میں بھی خواہش ہوئی کہ میرے اکلوتے جیجا جی

میرے ساتھ بھی اسی طرح پیش آئیں۔ شادی کے موقعے پر جب
اُن سے میرا تعارف کرایا گیا تو انہوں نے ایک مرتبہ میری طرف
اپنی نگاہیں اٹھائیں اور پھر میرے قریب کھڑی ہوئی سندری شرما
کو دیکھنے لگے۔ سندری کا جیسا نام تھا ویسی ہی وہ خود بھی —— وہ اپنی
خوبصورتی کی اہمیت بھی جانتی تھی۔ اس نے کمل بابو کی نگاہوں کا
جواب آنکھوں میں مسکراہٹ بھرتے ہوئے دیا —— اسی لئے
جب کمل بابو دیدی کو پہنچانے کے لئے آئے تو ان کی نگاہیں
سندری کی متلاشی تھیں۔ دیدی، ماں یا مجھ سے اُنہوں نے
کچھ بھی دریافت نہ کیا —— لیکن چاندی نے اپنے موٹے موٹے
سنہروں کو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے بتایا رانی جیجا!
جانتی ہو جانی بابو سندری بی بی کو پوچھ رہے تھے؟
تو تم نے انہیں بتایا کیوں نہیں کہ سندری پڑھنے کے لئے دہلی
چلی گئی ہے۔

ہوں مجھے کیا ضرورت تھی —— چاندی ہنس کر بولی اور
ایک طرف چلی گئی۔

سسرال میں صرف ایک ہفتے کے قیام کے بعد دیدی کو دیکھ
میرے لئے نہ جانے کیوں بے حد محبت امڈ پڑی تھی۔ جیسے مجھ کو کوئی
خاموش چشمہ ایک بارگی پھوٹ پڑا ہو۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے لپٹ
گئیں اور بولیں —— رانی! تیری بہت یاد آتی تھی۔ تیری خاموشی،
کبھی کبھی کہیں ہوئی تیری شرارت بھری باتیں اور کہنے کے بعد تیری آنکھوں
میں امڈ آنے والے آنسو، تیری سبھی باتیں مجھے یاد آتی تھیں۔
دیدی کئی گھنٹے مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ انہوں نے اپنی
سسرال کی باتیں سنائیں۔ بتایا کہ ان کی ساس کمل بابو کے بڑے
بھائی کے ساتھ رہتی ہے۔ کیونکہ کمل بابو کی عادتیں انہیں پسند
نہیں۔ وہ پرانے خیالات کی ہیں۔ اُنہیں گلیوں میں گھومنا پسند
ہے۔ بیٹے کی شراب نوشی سے انہیں سخت نفرت ہے۔ کمل بابو کے
شراب پینے کی بابت ہمیں دیدی کی شادی سے پیشتر معلوم ہوگیا تھا
—— ماں نے یہ کہہ کر درگزر کر دیا تھا کہ سبھی بڑے آدمی پیتے ہیں۔
کمل بابو بھی پیتے ہیں تو کیا غضب ہوگیا؟ دیدی نے یہ بھی بتایا کہ
کمل بابو شکار کا بھی شوق ہے —— اور وہ ایک ہوشیار شکاری
ہیں۔ ان کے مکان میں جگہ جگہ شیر کی کھالیں اور ہرن کے سینگ

لگے ہوئے ہیں ۔۔

دیدی کا رنگ تو پہلے ہی گورا تھا۔ اب ایسا دکھائی دیا گویا کسی نے اُن پر چندن پوت دیا ہو۔ باتیں وقت وہ مجسم مسرت نظر آ رہی تھیں۔ بے ساختہ ہنسی اور قہقہے ان کی عادت میں شامل تھے۔ اب ان کی آنکھوں میں گویا شمعیں روشن ہوگئی ہوں۔ ہونٹوں پر ایک دلکش اور مستقل تبسم تھا۔ آ چسپیدہ ہوگیا تھا۔ دیدی کے گھنگرالے بالوں میں گویا ستارے ٹانک دے گئے تھے۔ میں اپنی بہن کی خوبصورتی سے کافی حد تک متاثر ہو گئی تھی۔۔

ہمارے گھر کی چھوٹی سی دنیا میں دیدی اور کمل بابو کی آمد نے رونقیں جگا دیں۔ گھر کی اوپری منزل میں دو کمرے تھے اور نیچے تین۔ اوپر کے ایک کمرے میں میں اور دیدی رہتے تھے۔ دوسرے میں کچھ اسباب پڑا رہتا تھا۔ برسات میں ماں اور پتا جی وہاں سوتے تھے۔ نیچے والے کمروں میں ایک گول کمرہ تھا۔ دوسرے کمرے میں ماں اور پتا جی رہتے تھے۔ تیسرا کمرہ آنے جانے والے مہمانوں کے لئے تھا۔ اس کمرے میں گھر کا اسباب بھی رکھا رہتا تھا۔ شادی کے بعد جب دیدی کمل بابو کے ساتھ آئیں تو ماں نے ان کے رہنے کا انتظام میرے کمرے میں کیا۔ اور مجھے اپنے کمرے کے ساتھ لگی ہوئی برساتی میں پہنچا دیا گیا۔ اوپر نیچے آتے جاتے کمل بابو سے سامنا ہو جاتا۔ وہ دیکھتے ہی دوسری طرف منہ کو پھیر لیتے۔ دل ہی دل میں مجھے ان پر بہت غصہ آتا اور کچھ نہیں تو کم سے کم تہذیب کے لحاظ سے تو انہیں مجھ سے بات چیت کرنی چاہئے۔ یوں منہ پھیر لینے سے آخر فائدہ بھی کیا؟ شاید اس طرح کے سلوک سے وہ میرے لئے اپنے دل کی نفرت اور حقارت ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ نہ جانے خود کو کیا تصور کرتے ہیں؟

جو چہل مذاق کمل بابو کی اپنی سالیوں کے ساتھ ہونی چاہئے تھیں وہ ماں سے ہوتیں۔ ہماری ماں دیکھنے میں نہایت خوبصورت تھیں۔ گورا چٹا رنگ، چھریرہ جسم، چست گٹھن، لمبے بال جن کی نمائش کر وہ پینتیس ۳۵ سال کی عمر میں بھی نہ بھولتی تھیں۔ ماں نے پتا جی کے ساتھ رہ کر انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔۔ وہ ہماری طرح با آسانی انگریزی میں گفتگو کرتی تھیں۔ کمل بابو ان کے داماد تھے۔ لیکن ماں ان کے ساتھ نہایت بے تکلفی سے پیش آتیں۔۔ ماں، دیدی اور کمل بابو، کبھی کبھی چاندنی بھی گھنٹوں تاش کھیلتے۔ دیدی کی زبردست خواہش ہوتی کہ میں بھی شرکت کروں۔ لیکن میں کبھی تاش کھیلی ہی نہ تھی۔ نہ مجھے کھیل سے واقفیت تھی اور نہ دلچسپی ہی۔۔

ماں جس طرح کمل بابو کی آرتی اتارتیں مجھے نہایت ناگوار گزرتا۔۔ داماد سب کے ہوتے ہیں۔ سندری کی بھی دو بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ اس کے بہنوئی بھی سسرال آتے جاتے ہیں۔ سندری کے چھوٹے بہنوئی تو نہایت عاشق مزاج اور خوش اخلاق ہیں۔ سبھی لوگوں کو ان سے مل کر خوشی ہوتی ہے اور وہ بھی ہر ایک کے ساتھ نہایت ادب، محبت، تہذیب اور نرمی سے پیش آتے ہیں۔ ان کی ساس بھی ان کی خاطر تواضع کرتی ہے۔ لیکن ہماری ماں کی طرح نہیں۔۔

کمل بابو کی بات ہی دیگر تھی۔ وہ گھر کے پہلے داماد تو تھے ہی۔ ساتھ ہی گھر میں کوئی لڑکا نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیٹے کی کمی بھی پوری کرتے تھے۔۔

پتا جی کی زبردست خواہش تھی کہ میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کروں۔ لیکن ماں رضامند نہ تھیں اور میں بھی اپنی طرف سے کوئی زور نہ دیتی تھی۔ کیونکہ رہ رہ کر مجھے ماں کے اس جملہ کا خیال آجاتا۔۔ "یہ ڈاکٹر بن کر کیا کرے گی۔ جو بچے اس کے ہاتھ سے پیدا ہوں گے وہ بھی سب کالے ہو جائیں گے"۔ میرا دل غصہ اور نفرت سے بھر جاتا۔۔ میں نے تاریخ، موسیقی اور ہندی میں انٹر پاس کیا۔ بی۔ اے۔ میں ہندی اور موسیقی لی اور ایم۔ اے۔ میں صرف ہندی۔۔

طالب علمی کے زمانے کے تلخ واقعات مجھے بھی اسی طرح عزیز لگتے ہیں جیسے اوروں کو ہوتے ہیں۔۔ اس دور میں ماں کا طرزِ عمل میرے ساتھ کیسا رہا۔ یہ ایک دو جملوں میں تحریر کر کے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ ماں کا تعلق تو بیٹی کے ساتھ زندگی کے ہر لمحہ میں ہوتا ہے۔ اور زندگی کے ہر لمحہ کے ساتھ، ہر اہم واقعہ کے ساتھ اس کی کوئی نہ کوئی یاد وابستہ ہوتی ہے۔ جیسے جیسے میں اپنی زندگی کی داستان بیان کرتی جاؤں گی، ماں خود بخود میرے ساتھ ساتھ آتی رہیں گی۔۔

کمل بابو نے میرے کالج میں داخل ہونے سے پیشتر ہی ظاہر کر دیا تھا کہ اُن کی قطعی دلچسپی مجھ میں نہیں ہے۔ کہنے کو تو میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ میری بھی کوئی دلچسپی ان میں نہ تھی ۔۔ لیکن یہ غلط بیانی ہوگی۔ کمل بابو میں دلچسپی کو میرے فسانے کا خاص اہم جزو ہے۔ اگر اُسے باہر کر دوں تو باقی جو کچھ رہ جائیگا وہ فضول اور بدنما نظر آئے گا۔

اس دن بی۔ اے۔ کا نتیجہ شائع ہو گیا تھا۔ ہر امتحان میں فرسٹ ڈویژن پاس ہونا تو میرا ایک دستور سا بن گیا تھا۔ اس مرتبہ بھی میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی اور کالج میں اول آئی۔ گھر پر مبارکباد دینے والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میری ہم جولیوں کے علاوہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسر بھی آئے۔ جن میں عورت اور مرد، دونوں ہی شامل تھے۔ میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتی، پھر سر جھکا لیتی۔ ہر مرتبہ اول آنے کی وجہ سے مجھے اس اداکاری کی اچھی خاصی مشق ہو گئی تھی۔ ماں بھی آج کے دن مجھ سے نفرت نہ کر پائیں۔ آنے والوں سے میری تعریفیں بیان کرتیں۔ ایک ہی جملہ انہیں ہر مرتبہ بار بار دہرانا پڑتا۔۔ ہاں کو بھگوان نے ذہن دیتے وقت کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اس جملے میں میرے کالے پن کا کہیں ذکر نہ ہوتا۔۔ میں ان کے اس احسان کے بوجھ سے دب جاتی۔ یہی ایک دو دن ایسے آتے تھے جب میری قدر ہوتی تھی۔ میرے ستار کا گرد و غبار صاف کیا جاتا اور اُسے گول کمرے میں رکھ دیا جاتا۔ چاندی کے کپ بھی گول کمرے میں آراستہ کر دیئے جاتے۔۔ آنے جانے والوں کے روبرو ہر چیز کی تاریخ دہرائی جاتی۔۔

بی۔ اے۔ کا نتیجہ میرے لئے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ ایک دو لڑکوں کو چھوڑ کر اور کوئی بھی ہمارے خاندان میں بی۔ اے۔ پاس نہ تھا۔ پتا جی البتہ ضرور بی۔ اے۔ تھے، لیکن وہ سیکنڈ ڈویژن میں بھی پاس نہیں ہوئے تھے۔ دیدی بھی بی۔ اے۔ پاس نہ کر سکی تھیں۔ اُن دنوں وہ ہمارے پاس ہی تھیں۔ کیونکہ منا پیدا ہونے والا تھا۔ اور نتیجے والے دن وہ پندرہ دن کا ہو چکا تھا۔ دیدی کی شادی شدہ زندگی میں منا پہلی اولاد ماں کا اپنا کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس لئے منا کی پیدائش کمل بابو اور دیدی کے لئے ہی نہیں ماں کے لئے بھی ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔ منا کی پیدائش کے بعد سے وہ روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھیں۔ ابھی تک دیدی کی شادی کا قرضہ بالکل نہ اترا تھا کہ ماں نے حلوائی، کپڑے والے اور سنار کا قرضہ اور چڑھا لیا۔

کادیری کو دینے کے لئے ہار اور ایک جوڑی کنگن بنے۔ منی کے ہاتھوں کے کڑے اور بٹن بنوائے گئے۔ یہ سب فضول خرچی دیکھ کر میں بے حد پریشان تھی کہ آخر پتا جی کس طرح روپیہ مہیا کریں گے اور اس قرض سے نجات پا سکیں گے؟

ماں کو برادری میں اپنی شان قائم رکھنی تھی۔ کمل بابو کی ماں کئی مرتبہ کہہ چکی تھیں کہ کمل بابو نے محض خوبصورتی کے چکر میں آکر اپنے سے کم حیثیت والوں کے ساتھ رشتہ کر لیا۔ انہیں کادیری کی فیشن پرستی بھی آنکھ نہ بھاتی تھی۔ کادیری کو ماں سے تعلیم ملی تھی کہ گھر میں خواہ دھن دولت نہ ہو لیکن گھر کی عورت کے پاس بیش قیمتی پوشاکیں اور زیورات ہونا ضروری ہیں۔ ماں اوسط درجے کے گھرانے کی لڑکی تھیں اور شادی بھی ویسے ہی خاندان میں ہوئی تھی۔ انہیں یہی تعلیم ملی تھی کہ خاوند اس بی بی کے زیر رہتا ہے جو خرچیلی ہوتی ہے۔ ماں کا کہنا تھا کہ ہر شوہر کی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ اسکی بی بی خرچیلی ہو۔ ان کا خرچہ کرائے اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو خاوند بھی اس کی عزت نہیں کرتا۔ ماں کا خیال تھا کہ ایسی صورت میں خاوند موقع ملنے پر دوسرے مردوں کی بیویوں کے نہیں تو دوسری عورتوں کی ناز برداری کرنے لگتے ہیں۔ ماں کی دی ہوئی تعلیم پر بھلا دیدی کیوں نہ عمل کرتیں۔ دو چار مہینے سسرال میں رہنے کے بعد جب وہ واپس آتیں تو ہر مرتبہ نئی ساڑیاں، نئے زیورات، نئی سینڈلیں اور چپلیں لے کر آتیں۔ پرانی ساڑیاں مجھے دے ڈالتیں۔ میری موج ہو گئی تھی۔ جب سے دیدی کی شادی ہوئی تھی، میرے پاس بے شمار کپڑے ہو گئے تھے۔ پرانی ساڑیوں کے علاوہ نئی ساڑیاں اور کتابیں بھی دیتی رہتیں۔۔ ان کتابوں میں زیادہ تر ناول ہوتے ہندی اور انگریزی کے۔ دیدی کی رائے میں ناول کے علاوہ کوئی دوسری کتاب پڑھنے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ اکثر جاسوسی اور سستی محبت کے ناول ہوتے۔۔ جن میں مسوری کی کسی حسین کا حال بیان کیا جاتا یا بے تکی داستانیں ہوتیں۔

ایسی داستانِ عشق جنھیں پڑھ کر ابکائی آ جائے۔ دیدی یہ کتابیں بھے دیتیں تو میں انکار کسطرح کر سکتی تھی۔ چپ چاپ انھیں اپنے پاس رکھ لیتی اور وقت ملتے ہی ان کا مطالعہ کرتی ــــ

میں اپنے بی۔ اے۔ کے نتیجے والے دن کا ذکر کر رہی تھی۔ پتا جی دراصل بے حد خوش تھے۔ کسی بھی طرح اپنی خوشی پوشیدہ رکھ پاتے میں کامیاب نہ ہو پا رہے تھے۔ اس دن وہ اپنے دفتر بھی نہیں گئے۔

ماں نے کہا۔۔ آج بینک نہیں جاؤ گے ؟

نہیں، روزانہ تو ہماری بیٹی فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے۔ پاس نہیں کرے گی لوگ آئیں گے۔ مبارک باد دینگے۔ کوئی تو ان سے بات چیت کرنے والا ہونا چاہیے ــ

ماں نے کہا۔ کمل بابو جو ہیں۔ وہ بات چیت کر لیں گے تم بینک جانا چاہو تو چلے جاؤ۔"

میں نے خشمگیں نظروں سے کمل بابو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے لاپرواہی سے کہا۔ پتا جی درست فرماتے ہیں۔ میں کسی سے بھی گفتگو نہ کر پاؤنگا۔ اور پھر امتحان میں پاس کوئی ہوا ہے۔ فرسٹ کلاس کسی کا آیا ہے اور خوش کوئی ہو رہا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا ــ

کمل بابو کے اس کورے جواب کو سن کر ماں تو مسکرا دیں ــ گویا داماد نے کوئی بہت بڑی بات کہہ دی ہو۔ کادیری حیرت سے اُنکا منہ دیکھنے لگی۔ پھر زرا سا مسکرا دی۔ مجھے معلوم نہ تھا تمہاری نظروں میں تعلیم اتنی اہمیت رکھتی ؟ تم نے رانی کو مبارک باد دی ؟

کمل بابو کی طرف دیکھنے کی ہمت تو مجھے ہوئی نہیں۔ لیکن ان کی آواز سے میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ پر ہنس رہے ہیں ــ

کادیری میری کامیابی پر بہت خوش تھی۔ اس نے پتا جی سے کہا ــ پتا جی ! رانی کو ایم۔ اے۔ تو دہلی سے کرنا چاہیئے "

نہیں بیٹی ! تم دہلی چلی جاتی ہو تو گھر سُونا سُونا نظر آتا ہے۔ رانی بھی چلی گئی تو گھر قطعی ویران ہو جائے گا ــ

منا کو آپ لوگ اپنے پاس رکھ لیجئے۔ کادیری سے اس کی پرورش نہ ہو سکے گی "کمل بابو نے کہا ــ

بیٹا ! تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں جانتی ہوں کہ کادیری کی پرورش بڑے ناز نخرے سے ہوئی ہے۔ بچے کی ـــــ دو سال بڑے مشکل ہوتے ہیں۔ انھیں سالوں میں بچے کی پرورش پر خاص توجہ

دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر ہمارے بھی تو کوئی ذکا نہیں منا ہمارا بیٹا ہی تو ہے۔ کیوں جی ؟

بیٹے کے نام سے پتا جی کے چہرے پر ایک عجیب مسرت چھا گئی۔ شاید وہ دل میں کسی ایسی خواہش کو پرورش دے رہے تھے کہ کوئی بیٹا ہو تو وہ لے کر دیں ــ

مجھ سے نہ رہا گیا میں نے فوراً کہا۔ دیدی سے تو پوچھ لیجئے ماں بولیں کہو منا کا دیدی ؟

مجھے سخت تعجب ہوا جب دیدی نے کمل بابو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو ان کی مرضی۔ جو آپ لوگوں کی مرضی، میری بھی وہی ہے۔ میں آپ لوگوں سے باہر نہیں ہوں ــ

دیدی ! تم منا کو یہاں چھوڑ جاؤ گی ؟

ہاں، تم میرے ساتھ چلو گی۔ اور منا یہاں ماں کے پاس رہیگا۔

مجھے دہلی جانا چاہیے یا نہیں، اس پر ماں نے ابھی کوئی رائے ظاہر نہ کی۔ ماں کی یہ خاموشی مجھے کھٹکی کہ شاید ماں مجھے کسی نہ کسی بہانے سے ٹالنا چاہتی ہیں۔ ایم۔ اے۔ کرنے کے لئے اگر دیدی کے پاس جاؤنگی تو دلی میں کہیں نہ کہیں نوکری بھی تلاش کر لونگی ماں کی شاید یہی خواہش تھی ــ

اس دن میرے پاس ہونے کی خوشی کو بھول کر ماں اور پتا جی منا کو قانوناً گود دینے کی تحریر میں مشغول ہو گئے۔ میں نے ایک مرتبہ منا کی دادی کا ذکر کیا تو ماں نے فوراً کہا ــ منا پندرہ دن کا ہو گیا۔ دادی کے دل میں ایک دفعہ یہاں آکر پوتے کو دیکھنے کا بھی خیال نہیں آیا۔ کچھ دینا لینا تو دور رہا ــ

کمل بابو نے ماں کی بات کی تائید کی۔ ایک باپ اپنے بیٹے کو بغیر کسی پس و پیش کسی دوسرے کو اس طرح دے سکتا ہے میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی ــــ

کمل بابو ہماری مالی حالت سے بخوبی واقف تھے۔ پھر ان کی اس دلچسپی کی وجہ کیا تھی ؟ میں سمجھ نہ پائی ــ

پتا جی بھی بیٹا گود لینے کی خوشی میں کچہری سے دستاویز وغیرہ لے آئے اور منا کو گود لے لیا گیا۔ کمل بابو نے لکھا پڑھی کر دی۔ دیدی نے بھی دستخط کر دئے۔ ساتھ ہی پتا جی اور ماں نے بھی ــ

اس شام چار سال کے بعد پھر ہمارا گھر انگریزی باجوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ چار سال پیشتر دیدی کی شادی پر بھی ایسا ہی باجا بجا تھا ــــ

گھومتا رہتا؟ یہی کیا زندگی ہے کہ بس گھومتے رہو اور اسی کا نام ہے۔ مجھے
نگینہ کے گھر کے۔۔ شاید یہ انسانوں کی تمام دنیا ہوتی ہے۔ جہاں
دو سچے پیار ہی سب کو اپنا بنا لیتے ہیں ۔۔۔
کا دیدی کا مدعا اور ویریندر گھنٹوں گفتگو کرتے تھے۔ چھوٹی
چھوٹی گھر بار کی باتیں ہوتی رہتیں۔ کیونکہ دیدی فن، ادب، سیاست اور
مذہب پر گفتگو کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ وہ تو صرف زیورات، ساڑیوں
اور بالوں پر ہی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتی تھیں۔ فیشن طبیعت پر منحصر ہے
اور طبیعت خاتون پر دیدی کی ۔۔۔ ماں کو سب چیزیں اچھی تھیں۔ اور سسرال
میں آکر کل یا پرسوں کی شروعات میں سارے بازار میں جو بھی چیز سب سے زیادہ
قیمتی ہوتی خریدنا گویا ان کا فرض تھا۔ یہ فرض دہلی آکر اور بھی مضبوط
اور ضروری ہو گیا تھا۔ کناٹ پلیس کی بڑی بڑی کپڑا فروشوں کی دکانوں
پر جو بھی نیا کپڑا آتا وہی دیدی خریدتی تھیں۔ خواہ وہ ان پر خوبصورت
لگے یا نہ لگے۔۔۔

میری موجودگی میں ویریندر میری بھی خوب بڑھا چڑھا کر تعریف
کیا کرتا۔ دیدی نے شاید اس سے کہہ رکھا تھا کہ وہ مجھے بے پناہ محبت
کرتی ہیں۔ گھر بھر میں ہی ان کی عزیز ترین ہوں۔۔۔ میرے بغیر رہ
نہیں سکتیں اور اسی لئے مجھے لکھنؤ سے دہلی لے آئی ہیں۔ دیدی نے شاید
یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ میرے دہلی آنے پر ماں باپ نے سخت مخالفت کی
تھی لیکن دیدی نے کسی بھی طرح ان کی مخالفت منظور نہ کی تھی۔۔ ممکن
ہے دیدی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہاں گھی کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔
لیکن غور کیجئے آج کل چراغ کہاں جلائے جاتے ہیں۔ آج کل تو بجلی کے
ہزار کینڈل پاور کے ٹیوب روشن ہوتے ہیں۔۔ ہاں تو ایسی ہی کچھ باتیں گفتگو
ویریندر سے دیدی نے کہہ رکھی تھیں۔ کیونکہ ایک دن دوران
ویریندر نے مجھ سے کہا تھا "رانی! تمہیں بھابی اسقدر محبت
کرتی ہیں کہ ہماری سسرال میں بھی تمہارے بغیر نہ رہ سکیں۔۔۔ آج
کل جگ میں اسقدر محبت کرنے والی بہن خوش قسمتی سے ہی ملتی ہے۔"
"جی ہاں" میں نے مختصر سا جواب دیا اور میری آنکھوں کے
آگے بچپن کے تمام واقعات ایک ایک کر کے رقصاں ہو اٹھے۔۔۔
میں بخوبی جانتی تھی کہ دیدی نے میرے ساتھ کس قدر با محبت اور ہمدردی
کا سلوک کیا تھا۔۔۔ آہ! میں جانے کتنی مرتبہ میری آنکھیں اشکبار
ہو اٹھی تھیں۔۔۔

اس وقت تک میری زندگی میں آنے والا صرف ایک ایسا شخص تھا
جس نے پوشیدہ یا ظاہر۔۔ کبھی مجھے حقارت سے نہیں دیکھا۔ بولو
میرا وہ ایک لیمپ پوسٹ کی طرح ہمیشہ میرا رہنما تھا۔ مجھے اس
بات کا علم تھا اور آج بھی ہے کہ میں کالی ہوں۔ لیکن میں نے کبھی بھی ان
اشتہاری دواؤں کو استعمال نہیں کیا جو کالے رنگ کو گورا بنا دیتی ہیں۔
نہ میں نے وہ وعدہ اور اشتہار کا اسی ہی لگایا تھا۔۔۔ جسے استعمال کرنے
کے لئے میری ماں بار بار اصرار کرتی تھیں۔۔۔
چھایا کا ذکر اس لئے بھی ضروری ہے کہ کسی بالوٹے اسے اپنا دکھ
سکھ اور خیر خواہی سمجھ کر دیدی اور مجھے اس بار پہلی مرتبہ مسوری لے گیا تھا
۔۔ پہنچ کر اس نے ہماری سرپرستی کی۔ ہمیں مکان وغیرہ تلاش کرنے
میں بھی مدد دی تھی۔۔۔ جو لیست دیکھ کر وہ ہمارے ساتھ ہی رہنے لگا تھا
میں مسوری پہلے بھی کئی مرتبہ گئی تھی۔ جبکہ پتا جی اور ماں جاتے
تھے۔۔ اس مرتبہ دیدی کے ساتھ جانا کچھ اور ہی اہمیت رکھتا تھا۔۔۔
اس مرتبہ خاص بات یہ تھی کہ پہلے کی بہ نسبت میرا نظریہ قطعی تبدیل ہو گیا
تھا۔ میرے دل میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی خواہش پیدا ہو اٹھی تھی۔
میں نے طے کر لیا تھا کہ میں اس مرتبہ صرف دیدی کی دیکھ بھال اختیار
داسی میں ہی اپنا وقت ضائع نہ کروں گی۔ اور وہی ہوا بھی۔۔۔ میری
خوش قسمتی سے ماں نے چاندی کو مسوری بھیج دیا تھا۔۔۔ چاندی اس
مرتبہ آئی تو پھر ماں کے پاس واپس ہی نہیں گئی۔۔۔ آج اس واقعہ کو
قریب آٹھ سال ہو چکے ہیں، چاندی میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔۔۔ اب وہ کافی
بوڑھی ہو گئی ہے۔۔۔ لیکن اب بھی گھر کا تمام کام کر لیتی ہے۔۔۔ چاندی کے مسوری
آجانے سے جو تھوڑا بہت کام میں کر لیتی تھی وہ بھی بند ہو گیا۔۔۔ وہ صبح سویرے
پانچ بجے ہی چائے بنا کر دے دیتی، پھر ہمارے غسل کے لئے پانی گرم کرتی۔۔۔
ویریندر کو تو نو بجے سو کر اٹھنے کی عادت تھی۔۔۔ وہ رات بھر گھومتا رہتا یا
ڈھلتی رات تک تاش کھیلتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی دیدی بھی تاش کھیلتیں چاندی کا
ساتھ دیتی۔۔۔ اس وقت مجھے بے حد ہنسی آتی جب وہ ہل چاندی فلش، اور بریج
کھیلتی۔۔۔ ان کھیلوں نے البتہ انگریزی کے چند الفاظ بھی اس نے سیکھ لئے
تھے۔۔۔ کھیل میں جیت ہو رہی ہے یا ہار، اسے بھی وہ بخوبی سمجھتی تھی۔ میں دل
ہی دل میں خیال کرتی۔۔۔ "ہمارا گھر بھی کسی غیر ملکی گھر سے کم نہیں، ہم بھی خادمہ
کو ساتھ بیٹھا کر تاش کھیلتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ کھانا ٹیبل میز پر بیٹھ کر وہ ہمارے
ساتھ نہیں کھاتی۔۔۔

میں نے محسوس کیا گویا مسوری آکر ڈیڈی اپنی پریشانیوں سے نجات پا چکی ہیں — وہ ایک آزادی محسوس کرنے لگی تھیں — ہم نے جو مکان کرایے پر لیا وہ لائبریری کے بائیں طرف گزرنے والی چھوٹی سی سڑک پر تھا — اس لئے مال روڈ ہمارے مکان سے زیادہ فاصلے پر نہ تھی — لائبریری ٹاور بھی قریب ہی تھا — بڑے بڑے ہوٹل بھی قریب تھے — ڈیڈی خرچیلی تو شروع سے ہی تھیں — اب کل پاپو کا اثاثہ اثارنے سے انھیں روکنے والا کون تھا — ہماری سماجی زندگی میں سرگرمی آگئی تھی — آئے دن یا تو ہم کسی کے یہاں کھانے پر مدعو ہوتے یا کوئی ہمارے یہاں — ان میں سے بعض ایسی تقریبات ہوتیں جن سے نہ میزبان کو مسرت حاصل ہوتی اور نہ مہمان کو — زیادہ تر لوگ اس لئے نہیں آتے تھے کہ انہیں پارٹی ——— میں دلچسپی ہوتی تھی بلکہ صرف اس لئے کہ ان کے ملازمین کو اس دن آرام مل جاتا تھا — بلانے والے بھی صرف پارٹی میں اسلئے بلاتے تھے کہ وہ اپنے مہمانوں کے گھر پہلے جا چکے ہوتے تھے — بدلے میں پارٹی دینا تو درمیانی، اونچے اور مالدار طبقے کا اصول ہے ایسی پارٹیوں میں عورتیں سج دھج کر گڑیا سی بن کر آجاتی ہیں اور کرسیوں پر خاموش بیٹھ جاتی ہیں کبھی آپس میں ایک آدھ بات کر لی تو غنیمت، ورنہ اکثر خاموش ہی رہتی ہیں — ہاں ایک دوسرے کے زیورات اور لباس خوب غور سے دیکھتی ہیں — انھیں دیکھ کر دوسری عورت کے شوہر کی مالی حالت اور سماجی رتبہ کا بھی اندازہ کر لیتی ہیں —

ایسی پارٹیوں میں گفتگو کے موضوع بھی اکثر ایسے ہی ہوتے جن پر نہ کسی قسم کی بحث ہو سکے اور نہ فساد تو خیر بدتہذیبی کی آخری حد ہے — اس طبقے کے شخص اگر قتل ہو کر زندہ ہو جائیں تو اپنے قاتل کو بھی مسکرا کر جی کہہ کر پکاریں گے — دل میں خواہ کچھ بھی ہو لیکن زبان شیریں ہونا ضروری ہے — آدمی تو پھر بھی شراب پی کر کچھ بات چیت کرنا شروع کر دیتے ہیں — لیکن عورتیں بت بن کر بیٹھی رہتی ہیں —

اس طرح کی پارٹیوں میں شامل ہو کر میں نے محسوس کیا کہ ماں خواہ مخواہ فکر کرتی ہیں کسی بھی لڑکی کے لئے کالی ہونا گناہ نہیں ہے — شریمتی کھاست گیر، شریمتی گھوش اور شریمتی مینن تو مجھ سے بھی کہیں زیادہ کالی ہیں — انھیں دیکھ کر میرے دل کو تسکین ملتی ہے — اور میں محسوس کرتی ہوں کہ میں کسی سے کسی بھی صورت میں کم نہیں ہوں — گفتگو کا سلیقہ مجھے ان سے زیادہ آتا ہے — میں دنیاوی واقعات سے واقف ہوں — مردوں سے بھی ہم کلام ہو سکتی ہوں — کئی مرتبہ ان کے ساتھ خوب بات چیت کرتی بھی تھی — میں جانتی تھی کہ مردوں کو کن کن موضوعات پر گفتگو کرنی پسند ہے — میں ان مضامین کا مطالعہ کرتی — جن طبقوں میں میں ڈیڈی کے ساتھ ملتی جلتی تھی — ان طبقوں کی عورتیں اخبار گھر میں منگاتی ضرور ہیں — لیکن اس میں صرف سینما کے اشتہارات یا بڑی بڑی دکانوں کے اشتہارات ہی دیکھتی ہیں — انہیں سیاسی اور دنیاوی واقعات میں دلچسپی اسی وقت ہوتی ہے جب ان کے شوہر کا اس واقعہ سے قریب یا دور کا تعلق ہوتا ہے — میں ان اخبارات کو شروع سے لیکر آخیر تک خوب غور سے مطالعہ کرتی تھی — اور شائع شدہ واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرتی تھی —

ان پارٹیوں کی بات چند جملے کہے بغیر ادھوری ہی نہیں رہتی — اس طبقے کے لوگ دوسروں کو اس وقت مدعو کرتے ہیں جب ان کا کوئی ذاتی فائدہ اور مطلب ہوتا ہے — اسکی تہ میں پوشیدہ مطلب افسر کو دعوت دینا ہے — اس کی بیوی افسر کی خوشامد کرتی ہے — مرد افسر کی بیوی کے حسن و شباب کی تعریف کرتا ہے — بغیر کسی واقفیت افسر کی بیوی کے والدین کی تعریفیں کرتا ہے — یا پھر دلی میونسپل بورڈ کے کسی سپرنٹنڈنٹ یا مرکزی سرکار کے کسی وزیر یا ڈپٹی منسٹر کو دی جاتی ہے — جس سے وہ کسی دن کام آسکے — کام اس سے نکلے یا نہ نکلے لیکن اسکے کام آنے کی امید تو ہوتی ہی ہے —

جس سے کوئی اس قسم کی امید نہ ہو یا محض دوستانہ تعلقات ہی ہوں اسے اس طبقے کو لوگ بہت کم دعوت دیتے ہیں — ہاں اگر ان کا کوئی دوست سماج میں غیر معمولی رتبہ رکھتا ہو یا مالدار ہو یا اسکے ذریعہ اپنا نہیں تو کسی رشتہ دار کا بھی کام نکلتا ہو تو اس رشتہ دار کو اپنا احسان سے دبانے کیلئے بھی یہ لوگ اس امیر دوست کو دعوت دیتے ہیں — زندگی کی اس دوڑ میں یہ سب اوہ با خوشی کرتے ہیں اور اسکے لئے انھیں روپیہ پھونکنا ناجائز محسوس نہیں ہوتا ہے —

یہاں مسوری میں پتہ چلا کہ ایک دسا گھرانہ ایک کنور صاحب کی خاطر خوشامد میں گزشتہ چھ سالوں سے لگا ہوا ہے — گھر کے لڑکے کی عمر صرف نو سال کی تھی — ان کا خیال تھا اور اب تک بھی ہے کہ جس وقت ان کا لڑکا بیس سال کا ہو گا، کنور صاحب اس وقت تک منسٹر کے عہدے پر پہنچ جائینگے ورنہ اسوقت یکایک اپنی دلچسپی ظاہر کر کے انھیں اپنانا مشکل ہو جائیگا اسلئے سالوں پیشتر ہی خاطر خوشامد شروع کر دی گئی — مکمل طور پر تو مجھے معلوم نہیں لیکن شاید اب بھی وہ کنور صاحب کی خاطر خوشامد میں اسی طرح سے لگے ہوئے ہیں —

پر اپیگنڈا کرنے والا دوست نہایت شوخ اور باتونی نظر آرہا تھا۔۔۔ میں نے بیرا سے بل منگوایا تو وہ ان دونوں کا بل بھی لے آیا۔۔۔ میں نے ایک مرتبہ ان دونوں کی طرف دیکھا کہ کیا وہ اس قدر بے تکلف بھی ہو سکتے ہیں؟ تو دی نمائش کا اشتہار دیا اور اب اپنی کافی کا بل بھی آگے بڑھا دیا۔۔۔ وہ شخص جس نے مجھے اشتہار دیا تھا اس کا نام جیتن تھا۔ یہ اس نے بعد میں مجھے بتایا۔۔۔

جیتن نے آگے بڑھ کر ذرا مسکراتے ہوئے کہا۔ "ارے، نمائش کا ٹکٹ بھی تو ایک روپیہ ہے معاف نہ کیجئے گا۔۔۔ یہ بل چکا دیجئے۔ صرف دو آنے ہی ہیں۔۔۔ آپ کو چائے کی بچت ہو گئی۔"

میں حیران رہ گئی۔۔۔ کیسا شخص ہے یہ قطعی ناواقف اور وہ بھی ایک عورت سے ایسی بات کرتا ہے۔۔۔ دل میں ایک آیا کہ اشتہار اس کے منہ پر دے ماروں اور اپنا بل ادا کر اپنی راہ لوں۔۔۔ لیکن نہ جانے وہ کیوں کسی ایڈونچر کا متلاشی تھا، میں نے ان کا بل بھی ادا کر دیا۔۔۔

نمائش زیادہ دور نہ تھی۔۔۔ جس ریسٹوران میں ہم لوگ بیٹھے تھے اس سے صرف فرلانگ دو فرلانگ تھی۔۔۔ صوبر نے میرے ساتھ قطعی گفتگو نہ کی۔۔۔ وہ اپنا دبلا پتلا جسم لے کر آگے آگے چلنے لگا۔ اب تک وہ اس طرح خاموش تھا گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کی خاموشی اور سنجیدگی پر مجھے غصہ آرہا تھا۔۔۔ نمائش کے باہر کے دروازے پر ایک سوٹیڈ بوٹیڈ شخص ٹکٹ فروخت کر رہا تھا۔۔۔ مجھے جیتن اور سمبر کے ساتھ آتے دیکھ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ہلکا سا غرور محسوس کیا۔۔۔ میری خودداری کچھ نرم ہو گئی۔۔۔ دل نے کہا۔ چلو یہاں تو کم از کم مجھ سے بے رخی اور نفرت، حقارت کرنے والا تو کوئی نہیں ہے۔۔۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ گھر پر میرے ساتھ کس قدر لاپرواہی کا سلوک ہوتا ہے۔۔۔

نمائش ہال میں جا کر دیکھا تو دو غیر ملکی مرد اور عورت گھوم پھر کر نمائش دیکھ رہے تھے۔۔۔ ہندوستانی اس جگہ ہمارے سوائے اور کوئی نہ تھا۔ مجھے سخت غصہ آیا کہ اس طرح کی فنی نمائشوں کو لوگ اہمیت کیوں نہیں دیتے؟ کہیں کوئی سنیما ہو تو ہزاروں کی بھیڑ جمع ہو جائیگی۔۔۔

نمائش میں داخل ہوتے ہی سمبر کی سنجیدگی اور خاموشی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ وہ نہایت جوش و خروش اور خوشی سے مجھے ان تصویروں کی اہمیت سمجھانے لگا۔ وہ تصویریں نہ تو فوٹو تھے اور نہ کارٹون، جیومیٹری کی متوازی بے جوڑ لکیروں میں تقریباً سبھی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے سنا اور دیکھا تھا کہ اکثر موجودہ مصور پرانی قدیم قوموں کے قدیمی فن کو اپناتے ہیں یا خود محسوس کرتے ہیں۔۔۔ اور تیز کاٹتی لکیروں سے کاغذ پر جو کچھ نقش کرتے ہیں اس میں جذبات سے کہیں زیادہ اہمیت شکل اور صورت کو دیتے ہیں۔۔۔ کیونکہ ان کا مقصد ذہن میں نہیں آتا ہے۔ سمبر سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ کیونکہ دست مصور چیزوں کو ان کا خول میں کو بد نظر کر ان لکیروں یا زاویوں کو منتخب کر لیتا ہے جو اس چیز کی خصوصیت کو پیش کر سکے۔ پھر چیزوں کے نقوش اور شکل کی بجائے وہ لکیروں اور زاویوں کا ہی استعمال کرتا ہے۔"

پورے کمرے بھر میں صرف ایک ماں اور بچے کی تصویر کو چھوڑ کر اور کوئی بھی دوسری ایسی تصویر نہ تھی جسے سمجھا جا سکے۔۔۔ میں نے سوچا کون اس گورکھ دھندے کو دیکھنے آئے اور اپنا وقت فضول برباد کرے۔۔۔

سمبر کو امید تھی کہ میں تعریف میں چند الفاظ کہوں گی۔۔۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ بہت بدحت ہو گیا۔۔۔ ہر تصویر پر قیمتیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ کسی کی قیمت پانچ سو تھی، کسی کی دو سو۔۔۔ ان بے تکی تصویروں میں سے ایک خرید لینے سے کیا ہوگا؟ کچھ خاص نہیں۔۔۔ شاید ان لوگوں کا چند دنوں کا کھانے کا خرچہ بن جائیگا۔

میں نے سمبر دت کی طرف دیکھا۔ وہ میرے چہرے پر ہونے والی تبدیلیوں کو نہایت باریکی سے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر وہ آہستہ سے پوچھا۔ "آپ گل بابو کی بیٹی کی بہن ہیں نہ؟"

مجھے گویا کسی نے آسمان سے لا کر زمین پر پٹک دیا ہو۔۔۔ یہاں بھی دیکھ کر میرا وجود گویا کچھ ہے ہی نہیں۔۔۔ اور اگر کچھ ہے بھی تو گل بابو کی وجہ سے میں اپنی ذہنی الجھنوں میں اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ اس کے سوال کا جواب دینا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔۔۔ لیکن جواب تو آخر دینا ہی تھا۔۔۔

"جی ہاں"

"تو ایک تصویر خرید لیجئے نہ" جیتن نے اپنا مشورہ پیش کیا۔۔۔

میرے پاس اتنی رقم کہاں تھی۔۔۔ میں نے محسوس کیا گویا یہ دونوں مل کر میرا مذاق بنا رہے تھے۔ میرے دل میں نشتر چبھو رہے تھے۔۔۔

میری سماجی کمزوری آج مجسم ہو کر مجھ پر ہنس رہی تھی۔۔۔ مجھے چوٹ لگی تھی۔۔۔ اپنی حیثیت سے اونچی سوسائٹی میں رہنے کی وجہ سے میں چھوئی موئی کی طرح مرجھائی جا رہی تھی۔۔۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت تک میں زندگی کی حقیقی اہمیتوں سے قطعی ناواقف تھی۔ ظاہرہ عزت اور پیسہ ہی میری نظر میں بہت بڑی قیمت رکھتی تھیں۔۔۔

حقیقت تو یہ ہے کہ وہ لمحات میری زندگی سب سے زیادہ قیمتی لمحات تھے۔

نہ جانے کیا کیا [illegible] میں سو نہ سکی۔ مجھے منا سے بڑی محبت ہو گئی تھی [illegible] بیٹا یہ سب میری [illegible] ختم ہو رہا ہے۔ مجھے دکھائی دیتا [illegible] باتیں نہیں کرتے۔ سارا استقلال ختم ہو جاتا ہے کسی کے سامنے کچھ ظاہر کر سکیں گے؟ میری [illegible] زندگی بھی جو کی زندگی ہو گی۔ [illegible] کوئی تجویز نہ تھی۔ [illegible] ہو جائیں گی۔ میری فکر [illegible] منا کے گود سے [illegible] میں خود کو یتیم اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔

رات کو جب میں اپنے کمرے میں سونے کے لئے گئی تو چاندنی وقت نکال کر میرے پاس آ بیٹھی۔

بی بی بیٹا! تم بی۔ اے، پاس ہو گئی ہو۔ اب تم کو کیا فکر ہے۔ جب مرضی ہو نوکری کر سکتی ہو۔ یہ منا کو گود لیں یا کسی کو [illegible]

تمہیں معلوم ہے چاندنی! امی مجھے دلی کیوں بھیج رہی ہیں؟

نہیں بیٹا! میں نے تو صرف یہ سنا ہے کہ تمہیں دلی بھیج رہی ہیں۔ کالی [illegible] بیٹا بیٹی ہے کہہ رہی تھیں کہ دہلی میں تمہارے لئے کوئی لڑکا ضرور مل جائیگا۔ وہاں تم ایم۔ اے، کی تعلیم بھی حاصل کر لو گی اور شادی کا انتظام بھی با سانی ہو جائیگا۔

چاندنی کے یہ الفاظ مجھے بے حد ناگوار گزرے۔ دل نے چاہا کہ اُسے انکار کر دوں کہ مجھے دہلی نہیں جانا ہے۔ لیکن میں بستر سے اٹھ نہ سکی۔ بس یوں ہی لیٹی رہی۔

نصیب میں جو کچھ لکھا تھا وہ تو ہونا ہی تھا اسے کون درگزر کر سکتا تھا۔ بیس سال کی عمر ہو چکی تھی اور اب تک ایک ہموار سطح پر آہستہ آہستہ ایک ہی چال سے گزر رہی تھی۔ مگر کبھی کبھی چھوٹے موٹے طوفان آ جایا کرتے تھے۔ لیکن اکثر ان کا تعلق میرے ذاتی جذبات اور خیالات سے ہوتا تھا۔ پھر بھی ان معمولی طوفانوں سے بھی میں بے حد پریشان ہو جاتی تھی۔

یکایک مجھے یاد آیا کہ میری سہیلی سندری شرما بھی دلی میں ہے۔ اپنی بڑی بہن کے پاس رہ کر پڑھ رہی ہے۔ اس کی یاد آتے ہی مجھے اس طرح تسلی ہو گئی جس طرح سوکھے کھیت کے مالک کسان کو بادلوں سے بھرے آسمان کو دیکھ کر ہوتی ہے۔

کافی رات گئے تک میں انہیں خیالات میں ڈوبی رہی۔ جب ہم اپنی حسب معمول زندگی تبدیل کرنے کو تیار رہتے ہیں تو امیدوں کی بہ نسبت حال کہیں زیادہ پر وسعت اور نازک ہو جاتا ہے۔ لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں کہ وہ کیسا ہوگا۔ موجودہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں لیکن ہم مستقبل کو ہمیشہ پرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور پُر درد ماضی کے لئے بھی ہمارے دل میں محبت جاگ اٹھتی ہے۔

مجھے اپنے مستقبل پر ناامید نظریہ سے غور کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ میں ہر وقت محسوس کرتی کہ گویا تعلیم کے علاوہ میری زندگی میں اور کسی چیز کی گنجائش نہیں۔

انہیں خیالات میں کھوئے کھوئے یکایک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ممی سے کہہ کر چاندنی کو اپنے ساتھ لے چلوں۔ منا کے لئے ممی کوئی دوسری تعلیم یافتہ آیا رکھ لیں گی۔

دوسرے روز کافی بحث مباحثے کے بعد طے ہوا کہ کم از کم دو مہینے ممی لکھنؤ میں رہیں گی اور منا کو دودھ پلائیں گی۔ یہ فیصلہ کمل بابو کے مشورے کے خلاف ماں اور ممی نے کیا۔

جب میں دہلی پہنچی تب کاویری اور کمل بابو کا باہمی تعلق کافی بڑھ چکا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک ناول میں پڑھا تھا کہ جب مرد عورت پر فتح حاصل کر لیتا ہے اور جب عورت اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر کے اُس کی بن جاتی ہے تو مرد کو ایک عجیب دلفریب تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ مرد کو عورت کی شکل میں ایک ایسا آئینہ مل جاتا ہے جس میں وہ اپنے جذبات اور خیالات کے عکس دیکھ پاتا ہے۔ عورت ایک ایسی مشین ہے جس میں مرد کی آواز کی گونج بھری ہوئی ہے جس قدر مرد اپنی آواز صرف کرتا ہے، جس قدر آواز بلند ہوتی ہے اُسی کے مطابق عورت کی طرف سے اُسکی گونج سن پاتا ہے۔

شادی شدہ زندگی کے ابتدائی دور میں مرد عورت کو دیوی کہہ کر پکارتا ہے تو عورت بھی اُسے دیوتا کہہ کر ہی پکارتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی پرستش کرتے ہیں۔ اور جب وہ دور گزر جاتا ہے تو مرد محسوس کرنے لگتا ہے کہ عورت اب صرف ایک ہم سفر بن کر رہ گئی ہے اس کے بعد ایک ایسا دور بھی آتا ہے جب وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ عورت نے اس کی سب سے زیادہ بیش بہا چیز چھین لی ہے۔ اس کی آزادی چھین لی ہے اور وہ عورت کی غلامی میں گرفتار ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسی صورت میں وہ صرف دو کام کرتا ہے۔ یا تو عورت کو فریب دیتا ہے یا ہر وقت

چہرے پر ایک چمک اور کشش پیدا ہو گئی تھی۔ لکھنؤ کے مقابلہ میں دہلی کی میری زندگی پرسکون اور بھرپور مسرت تھی۔

سندری کیساتھ جب میں اونچی بلڈنگ میں حسینے ٹوٹی کورٹ۔ پہنچی تو شام کے چھ بج چکے تھے۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ کالج کی ڈیبیٹنگ کلب کی میں سیکریٹری رہ چکی تھی۔ کئی مرتبہ پانچ پانچ سو آدمیوں کے بیچ تقریر کر چکی تھی۔ وہاں سب حاضرین میری تعلیم اور ذہانت کا امتحان لیتے تھے۔ وہاں میرے رنگ روپ اور میرے لباس میں دلچسپی ظاہر نہ کی جاتی تھی۔ یہاں کی بابت میں سندری سے بہت کچھ سن چکی تھی۔

فلیٹ کو بعض "سرکاری اعلیٰ افسروں اور بہت کچھ سفارشیوں کے رہنے کا ایک بورڈنگ ہاؤس جیسا تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں سندری مجھے لے گئی۔ برامدے سے ہی بہت سی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ زوردار بحث چل رہی تھی مجھے اطمینان ہوا چلو اچھا ہے لوگوں کو مجھ میں دلچسپی ظاہر کرنے کا وقت تو نہ ملے گا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی کمرے میں تیزی سے چلتی ہوئی بحث جہاں تھی وہیں رک گئی۔ ایک بارگی دل تیزی سے دھڑکا۔ پھر بھی میں نے ہمت سے کام لیا۔ سندری کے تعارف کرانے پر میں نے ہاتھ جوڑ کر سب کو نمستے کی۔ میں ہاتھ جوڑتی لیکن وہاں بیٹھے ہوئے لوگ اپنا ہاتھ بڑھا دیتے ہاتھ ملانے کے لئے۔ مجبوراً مجھے بھی ہاتھ ملانا پڑا۔

ایک کونے میں ایک شخص کھادی کا کرتا اور پاجامہ پہنے بیٹھا تھا۔ وہ دوسروں سے علاحدہ بیٹھا آہستہ آہستہ پان چبا رہا تھا۔ صرف اس نے ہاتھ نہیں ملایا جیوں ہی میں نے ہاتھ جوڑے اس نے بھی جواب میں نمستے کی۔

یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ زیادہ تر لڑکوں نے کھادی کی قمیض اور [illegible] کی پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ ان کا برتاؤ۔ طور طریقہ۔ انداز گفتگو سب کچھ ماڈرن تھا۔ سب نے مسکرا کر اور پُرخلوص جملوں سے میرا خیر مقدم کیا۔ اس سے مجھے ہمت ملی کہ کسی نے میرا مذاق نہیں اڑایا۔ کسی نے یہ نہیں کہا تھا ہائے رام! اسقدر کالی! اسکی شادی کسطرح ہو گی؟ لیکن ادیبوں کے اس اجلاس کا کیا تھا؟ چند اشخاص جام شراب لئے بیٹھے تھے۔ ایک دو لڑکیاں بھی شراب پی رہی تھیں۔ اور کچھ کافی پی رہی تھیں ہر شخص کا حلیہ قابل دید تھا۔ کسی کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ تو کسی کی مونچھیں بے ترتیب تھیں۔

بال تو تقریباً سبھی کے بکھرے ہوئے تھے۔ کئی ادیبوں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے کالے یا براؤن رنگ کے چمڑے کے بیگ تھے۔ جو کاغذوں سے بھرے ہوئے تھے۔ شاید یہ تھیلے یہ بیگ اس لئے رکھتے تھے کہ دیکھنے والے دیکھ لیں کہ وہ کتنا کام کرتے ہیں۔ کتنا پڑھتے لکھتے ہیں۔

پندرہ سولہ سال سے لیکر چالیس سال تک کی عورتیں موجود تھیں۔ تقریباً سبھی اپنے کانوں میں نقلی سونے کی بالیاں پہنے تھیں۔ ان کی ساڑیاں بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ ان کے پیروں کی چپلیں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کسی کے بال بے [illegible] کندھے پر جھول رہے تھے۔ تو کسی کے اتنے چھوٹے تھے کہ یہ شناخت کرنا مشکل تھا کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بوسیدہ لباس اور بے ترتیب بال رکھنا یہ سب جان بوجھ کر کیا جاتا ہے۔ چند لڑکیاں لڑکوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھیں۔ ایک لڑکی سگار پی رہی تھی۔ سگریٹ پیتے ہوئے تو میں بہت سی لڑکیوں کو دیکھ چکی تھی۔ لیکن سگار پیتے ہوئے آج پہلی مرتبہ ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ لڑکی دبلی پتلی اور مریل سی نظر آ رہی تھی۔ سندری نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ وہ ایک نوجوان کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں سے اٹھ کر میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے۔ نہایت گندی جنسی ہنسی ہنستی ہوئی پینٹ سے رنگے ہونٹوں کو ذرا سا خم دے کر اس نے گہرے لال رنگ سے رنگے ناخنوں والا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سندری کے منہ کے قریب منہ لا کر اس نے آہستہ سے کہا۔ سندری! یہ نئی رنگ روٹ کہاں سے پکڑ لائی ہو؟

سندری نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے سب کو خاموش کرتے ہوئے کہا۔

"ان کی تعریف تو سن لیجئے اسطرح زور، زور سے کیا بول رہی ہو"

سندری کا اتنا کہنا تھا کہ کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔

"یہ سانولی ہیں۔ انٹیلیکچول ہیں، لکھنے کی شوقین ہیں۔ کمل بابو کی سالی ہیں؟"

"کون؟ وہ رئیس کمل؟" ایک لڑکا بولا۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے کئی دن سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس کے گال پچکے ہوئے تھے۔ اور اسکی آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ لگا تھا جسکی ایک کمانی ٹوٹ کر گر چکی تھی۔

"جی ہاں" سندری نے جواب دیا

وہ لڑکی جس سے میرا تعارف سندری نے کرایا تھا آگے بڑھ کر بولی۔ "سانولی! میں پریا ہوں فیشن کارنر میں ڈیزائنر کا کام کرتی ہوں"

پریا کی انگلیاں نکوٹین سے زرد پڑی ہوئی تھیں۔ [illegible]

کی ابھری ہوئی نسیں صاف چمک رہی تھیں — ناخون اسقدر بڑھے ہوئے تھے کہ ڈر لگا کہ کہیں میرے ہاتھ میں چبھ نہ جائیں — اور وہی ہوا — اپنے ہاتھ اس زور سے ملایا کہ میری ہتھیلی میں اس کے ناخون چبھ گئے اور شاید اس کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں —

سندری نے میرے تعارف میں کمل بابو کا نام کچھ اس انداز سے شامل کیا کہ سبھی لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے —

پریما نے آہستہ سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا "کیا پیوگی ؟

میرے بجائے سندری نے جواب دیا "کافی "

"آہ ! امیر آدمی کافی پیتے ہیں کہیں ؟" پریما نے چوٹ کی

" نہیں یہ ذرا پرانے خیالات کی ہیں — پھر پہلی ہی مرتبہ باہر آئی ہیں — اسے تو آج کافی ہی دو "

وہ لڑکی میرے لئے کافی لے آئی — اس کے چہرے سے کچھ ایسے جذبات نمایاں ہو رہے تھے گویا میں قطعی انجان اور پچھڑی ہوئی ہوں — کافی دیتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی —— "تمہارے جی جا جی بڑے دل والے ہیں — میں بھی کچھ دن ان کے ساتھ رہ چکی ہوں — انھوں نے مجھے ریس ہوٹل میں رکھا تھا پھر میرے جھگڑوں میں ختم ہو گئے — آج کل میں ایک مسعود کے ساتھ ہوں — وہ میرا میری آمدنی پر بھی ہاتھ صاف کر دیتا ہے —"

کمل بابو اس پریما کے ساتھ ہوٹل میں رہتے تھے ؟ چھی ! چھی !! یہ لڑکی تو نہایت ذلیل نظر آتی ہے — میرا جسم ضرور سیاہ ہے — لیکن میں اسقدر گری گذری تو نہیں ہوں — بھگوان جانے وہ اس کے ساتھ کس طرح رہے ہونگے ؟

پریما اپنی کرسی کو اور بھی قریب کھسکاتے ہوئے بولی —— "جانتی ہو ؟ رانی آج کل کمل بابو سندری کے ساتھ رہتے ہیں —"

گویا میں آسمان سے زمین پر آ گری — وہ بغیر میری طرف دیکھے سگار کے دھوئیں کے مرغولے بناتی ہوئی — اور آہستہ سے ہنس پڑتے ہوئے بولی —— "لیکن وہ سندری کو ریس ہوٹل میں نہیں رکھتے — بھلا ہی وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے "

میں نے کسی طرح ہمت کر کے پوچھا "کہاں رہتی ہے یہ"

"یہ تین اور لڑکیوں کے ساتھ رہتی ہے انہوں نے کناٹ پلیس کے قریب ہی ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے — کمل بابو اس کا کرایہ ادا کرتے ہیں — اس کمرے کا کرایہ ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ ہے "

"سندری کی بہن تو ہیں رہتی ہے نہ ؟"

"ہاں لیکن اس نے دو سال ہوئے بہن کے ساتھ رہنا چھوڑ دیا ہے — اور پھر بہن کا کام تو اسے دلی میں لانا تھا — اب اسے آئے ہوئے چار سال سے زیادہ ہو گئے لیکن ابھی تک یہ اپنا سلسلہ تلاش نہیں کر سکی — یہ اس کی اپنی کمزوری ہے — بہن کی نہیں "

"سلسلہ" اور "کمزوری" کے لفظوں نے میرے دل پر ایک عجیب و غریب اثر ڈالا — مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے منہ کا ذائقہ کافی سے بھی زیادہ کڑوا ہو گیا ہے — میرے دماغ میں سب سے پہلا سوال اٹھا کہ کیا دیدی کو اس واقعہ کا علم ہے ؟ کیا انھیں معلوم ہے کہ اسکے شوہر کسی نہ کسی لڑکی کو ضرور رکھتے ہیں ؟ کیا یہاں یہی فیشن ہے کہ امیر آدمی اپنی بیوی کے علاوہ ایک نہ ایک دوسری لڑکی کو بھی رکھیں کیا یہ سب کرنا تہذیب میں شامل ہے ؟ میرے ذہن میں ایک ہاگی کی ایک سوالات اٹھ کھڑے ہوئے —

پریما کا سلسلہ گفتگو ابھی اور جاری رہتا کہ ڈاکٹر اندر دھنش آ گئے — سب کے سب مرد اور عورتیں ان کی پیشوائی میں کھڑے ہو گئے — ڈاکٹر اندر دھنش بھی قریب پینتالیس سال یا اس سے کچھ زیادہ عمر کے ہونگے — وہ بھی کھادی کا کرتا اور دھوتی پہنے ہوئے تھے ہیکمونبرکا نی موٹے شیشوں کا چشما لگا ہوا تھا — بال کھچڑی ہو گئے تھے — ان کے ہونٹوں پر ایک پُر معنی مسکراہٹ کھیل رہی تھی — جو ان کی شرافت میں شک پیدا ہونے کی گنجائش نہ ہونے دیتی تھی — بلکہ دیکھنے والے کے اس خیال کو اور بھی مضبوط بنا دیتی تھی — پریما نے میرا تعارف ان سے کرایا — اور گویا میرے قریب بیٹھنا ان کا مکمل حق ہو وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئے — بات چیت کرنے لگے — میری تعلیم کی بابت دریافت کیا — مجھے کلام پڑھنے کے لئے اصرار کیا۔

دوران گفتگو انھوں نے کہا —— "یہ ہندوستان ہے ورنہ مجھ جیسے ادیب اور مصنف کو کسی چیز کی کمی ہو سکتی تھی ! میں نے چھ ناول لکھے — میرا سب سے پہلا ناول "کسوٹی" کئی ہزار کی تعداد میں بک چکا ہے "پریم کی بھگتان" کی تو امید ہے فلم بھی بن جائے "

میں نے ڈاکٹر اندر دھنش کی دو تین کتابیں پڑھی تھیں — مجھے ان کی ٹیکنک بے حد پسند تھی — میرا خیال تھا کہ وہ نہایت مستقل مزاج

اور سنجیدہ مصنف ہوں گے۔ وہ دکھاوٹ اور بناوٹ کو ناپسند کرتے ہوں گے۔ لیکن یہاں حالات ہی مختلف تھے۔ وہ ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ میرے یہ ظاہر کرنے پر کہ میں نے ان کی دو ایک کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ کافی خوشی سے بولے "کل تم میرے گھر پر آؤ۔ میں تمھیں اپنی کتابوں کا مکمل مجموعہ دوں گا۔ پڑھ کر تم تنقید کرو۔ تمھاری جیسی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ادب کی دنیا میں آنا چاہئے۔ مجھے یہ جان کر از حد خوشی ہوئی کہ تم کتنی اچھی ہو۔"

میں نے پوچھی پوچھی نظروں سے دیکھا۔ کمرے میں بیٹھے مرد اور عورتیں میری طرف معنی خیز نظروں سے تک رہے ہیں۔ اس روز میٹنگ کے بعد جب میں سندری کے ساتھ گھر واپس آئی تو راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ جب ڈاکٹر انند رومیش کو ادب سے کوئی آمدنی نہیں ہوئی تو انھوں نے ہومیوپیتھی کی ڈگری لے لی۔ لیکن کبھی پریکٹس نہیں کی۔ اب ملک کی زبان ہندی ہو جانے سے وہ کافی مشہور ہو گئے ہیں۔ ان کی جو کتابیں ان کے گودام میں پڑی ہوئی تھیں، وہ آج اچھے اچھے گھروں کی الماریوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ سرکار کی طرف سے ان کو انعامات بھی مل چکے ہیں۔ سندری نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی انعامات دینے کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی میں ہوتے ہیں۔

اسی میٹنگ میں ڈاکٹر انند رومیش کے ذریعہ ایک ریزولیوشن رکھا گیا کہ مقامی ادیبوں کی طرف سے ایک ادبی رسالہ شائع کیا جائے جس کی ایڈیٹنگ ڈاکٹر انند رومیش کریں اور ان کی امداد کے لئے دو تین نوجوان مقرر کئے جائیں۔ اس رسالے کے سرپرست کمل بابو ہوں گے۔ معاونوں سے روپیہ اکٹھا کرنے کا کام میں اور سندری کریں گے۔

مجھے یہ جان کر سخت تعجب ہوا کہ یہاں پر ہر شخص کمل بابو اور سندری کے باہمی تعلقات کو بخوبی جانتا ہے۔ پھر بھی کوئی انھیں ناجائز نہیں مانتا اور اس سلسلے میں انھوں نے اس طرح بات چیت کی گویا ان تعلقات کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو۔

میرا یہ خیال کہ ادیبوں کی میٹنگ میں کچھ ادبی تذکرہ و تبصرہ ہوگا قطعی غلط نکلا۔ وہاں جو لوگ اکٹھے ہوئے تھے وہ ادب کے نام پر دوسرے لوگوں کو فریب دے کر روپیہ لوٹتے تھے۔ اور مل کر شراب پی جاتے تھے۔ جو عورتیں تھیں ان میں سے کچھ تو دوکانوں پر سیلز گرل کا کام کرتی تھیں اور دو ماسٹرنیاں تھیں۔ ان میں سے صرف ایک تھوڑی سی تک بندی کر لیتی تھی۔ سندری نے بتایا کہ اس لڑکی کے لئے ایک نیا شاعر لکھ دیتا ہے اور وہ اس لڑکی کے نام سے شائع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ لڑکی ہے۔

ڈاکٹر انند رومیش نے بھی کہا تھا کہ انھیں شاعروں سے سخت نفرت ہے۔ کیونکہ صرف ایک دو کو چھوڑ کر باقی ہوتے کچھ اور ہیں، خود کو کچھ اور ظاہر کرتی ہیں اور خطرناک طریقے سے نازک مزاج ہوتی ہیں۔

اس دن محفل سے واپس آتے آتے نو بج چکے تھے۔ دیدی اپنی ساس کے ساتھ سینما گئی ہوئی تھیں۔ اکیلے کمل بابو چپ چاپ کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے اور سندری کو آتے دیکھ کر وہ بڑی حیرت سے دیکھتے رہے۔ پھر مسکرا کر بولے "آئیے، آپ لوگ بھی کھانا کھا لیجئے۔"

کمل بابو سے میں گزشتہ چھ سال سے واقف تھی۔ آج وہ مجھے پہلی مرتبہ اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دے رہے تھے۔ اور وہ بھی تنہائی میں نہیں سندری کی موجودگی میں۔ کچھ دیر پہلے ہی میں سندری اور ان کے متعلق سن کر آ رہی تھی میرے دل نے گوارہ نہیں کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھا لوں۔

میں نے آہستہ سے سندری سے کہا۔ "تم کھانا کھا لو۔ مجھے بھوک نہیں ہے اور جی بھی نہیں چاہتا۔"

سندری کمل بابو کے پاس ہی اسی میز پر بیٹھ گئی۔ میں نے چھپ کر دیکھا چند لمحوں میں وہ گھل مل کر باتیں کرنے لگے تھے۔ انھیں اس طرح بات چیت کرتے ہوئے دیکھ کر افسوس اور درد سے میری آنکھوں سے آنسو چھلک اٹھے۔

میں کافی دیر تک روتی رہی۔ دس بجے کے قریب جب دیدی واپس آئیں تو سندری اور کمل بابو وہاں سے جا چکے تھے۔

میں اس رات دیدی سے کچھ نہ کہہ سکی۔ کھانا بھی نہ کھا سکی۔ مجھے گویا کوئی ایک دم بچپن سے کھینچ کر جوانی میں لے آیا تھا۔ دیدی نے کمل بابو کے متعلق کچھ بھی دریافت نہ کیا۔ صرف نوکر سے اتنا ہی پوچھا صاحب نے کھانا کھا لیا؟

ملازم کے ہاں کہنے پر وہ خود بھی کھانا کھانے بیٹھ گئیں۔ ملازم نے دیدی سے کہا کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ لیکن دیدی نے نہ کھانے کی وجہ دریافت کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ نہ انھیں یہ خیال ہوا کہ کہیں میری طبیعت تو خراب نہیں۔ اس بے رخی نے میری دیوانگی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ میرے دل نے مجھے لعنت ملامت کرتے ہوئے کہا۔ "کب تک دوسروں کے سہارے پڑی رہو گی؟ اٹھو اور اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤ۔"

وہ رات میری زندگی کی ایک اہم رات تھی۔ میری لپک کرنے میں بڑی

سمجھتی تھیں۔ وہ اپنے خاوند کے سلوک سے خوش تھیں یا عادی ہو چکی تھیں اور خاوند ستدری کے ساتھ نہ جانے کہاں قیام فرماتے۔ کئی بار میرے لئے محسوس ہوا کہ کمل بابو اور سندری کا تعلق بی بی پر اتنا ظلم نہیں ہے جیسا اس پر ستان لیفٹ امداد کا ہے نازک جذبات کے پھولوں میں تو تی رہی ہیں۔ وہ ان کے پیچھے کے نیچے وہ بکلیں بچھاتی رہی ہیں۔ ساس کے لئے نفرت اور حقارت سے بھلا رہی ہیں۔

بستر پر پڑے پڑے میرے دل و دماغ کی تاریکی گویا روشنی میں تبدیل ہو اٹھی۔ روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔

اور بیٹے کر کے کچھ ہوتے ہی ماں کو ایک خط لکھ کر بتا دی کہ انکے عزیز ترین دعا اور کیا کیا گل کھلا رہے ہیں۔ میں سو گئی۔

غم کی تپش انسان کو کندن بنا دیتی ہے" ایسا عوام کا خیال ہے۔ بوریج معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ غلط بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ غم برداشت کرتے کرتے انسان زندگی سے مجبور ہو اٹھتا ہے۔ اس کی زندگی چڑچڑی بن جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی وہ نہایت گئی گزری حرکات پر اُتر آتا ہے۔ رنج و غم نہیں، خوشی انسان کو خوشحالی میں انسان اپنے دل سے دوسروں کے لئے دشمنی اور کدورت کے جذبات دھو ڈالتا ہے۔ ڈیڈی کی دیدی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں غمگین رہتی میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اکثر انھیں جھجک محسوس ہوتی۔ اپنے غم سے غم زدہ ہو کر انھوں نے سگریٹ پینا شروع کر دی تھیں۔ ابھی تک وہ اپنی ساس سے چوری چوری سگریٹ پیتی تھیں لیکن کمل بابو کو علم تھا۔ انھوں نے دیکھتے ہوئے بھی منع نہیں کیا۔ نہ انھوں نے یہ دریافت کیا کہ سگریٹ کیوں اور کیسے پینا شروع کیا؟ میں سمجھ گئی تھی کہ سندری نے سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوا اٹھتا کہ کیوں نہ دیدی پر ظاہر کر دوں کہ یہ گوری سی سندری دل کی بے حد کالی ہے۔ کئی مرتبہ میں نے ارادہ کیا لیکن نہ جانے کیوں ہر مرتبہ تہذیب نے میری زبان بند کر دی۔

کوشش کر کے بھی میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اور اپنی کتابوں سے کچھ وہ سب کچھ بھول جانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن ہزار چاہنے اور کوشش کرنے پر بھی میں تعلیم میں اپنی تمام طاقت صرف نہ کر پا رہی تھی۔ کچھ مصلحت کے بہانے سندری کی آمد و رفت ہمارے گھر میں ہوتی تھی لیکن وہ کبھی کمل بابو سے بات چیت نہیں کرتی تھی۔

سندری اور میرے کچھ بنگلی بابو نے پانچ ہزار روپیہ ڈاکٹر وشی کو رسالہ نکالنے کے لئے دے دئے تھے۔ میں خود تو کمل بابو سے صاف صاف کچھ کہہ نہ سکی تھی۔ ہاں سندری کی کلا (؟) لیکر ہو آ مجھے بات چیت ہوئی۔ اور روپیہ سندری نے ہی منگائے تھے۔ رسالے کا پہلا نمبر ابھی شائع نہیں ہوا تھا۔

جب کبھی سندری مجھ سے ملنے آتی ان ادیبوں کی سرگرمیاں اور نئی نئی خبریں بیان کرتی۔ اس کے بیانات ان میں میری دلچسپی بڑھا رہے تھے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کی باتیں آتی رہتیں تھیں۔ میرا دل بھی تعلیم کو الوداع کہہ کر ادیبوں کی دنیا میں کود پڑنا چاہتا تھا۔ اس دنیا میں جہاں سب کچھ عجیب و غریب ہے۔ اپنے گھر والوں کی طرف سے بھی میرا دل رنجیدہ رہنے لگا تھا۔ پتا جی کے خطوط روز بروز مختصر ہوتے جا رہے تھے۔ اس ڈھلتی عمر میں انکے بیٹا پانے کی تمنا بر آئی تھی نا۔ اب انکے پاس اتنا وقت کہاں تھا وہ مجھے جیسے پیار بھرے خطوط لکھ پاتے۔ انھوں نے ایک خط میں بھی امتحان کے بعد لکھنؤ آنے کے لئے نہیں لکھا۔ ہمارا کنبہ صرف ہم دو بہنوں تک ہی محدود تھا۔ پھر بھی بیٹے کو پا کر ماں باپ کا رُخ قطعی تبدیل ہو گیا تھا۔ گویا انکا لی لڑکی کو گھر سے الوداع کہہ کر وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے تھے۔

کمل کم پتا جی سے مجھے ایسے سلوک کی اُمید نہ تھی۔ وہ بھی میرے لئے بالکل ماں جیسے بن گئے تھے۔ میں محسوس کرنے لگی تھی کہ ساری دنیا میرے لئے غیر بن گئی ہے۔ جنھوں نے پیدا کیا جب وہی بیگانہ رہے تو اور کون اپنا ہو سکے گا۔

شادی سے پیشتر دیدی کو ماں باپ کی تمام محبت ملی تھی۔ پانچ سال تک کمل بابو نے بھی دیدی کو نہایت محبت اور عزت کے ساتھ رکھا تھا۔ اب دوسرا بچہ پیدا ہونے کا وقت دن بدن قریب آتا جا رہا تھا۔ کمل بابو سارا سارا دن اور ساری ساری رات گھر سے غیر حاضر رہتے تھے۔ اور جب واپس آتے تو بھی دیدی سے ہی کا حال چال معلوم کرنے کی فرصت محسوس نہ کرتے تھے۔ نہ جانے کیوں میں دیدی کے غم سے زیادہ اہمیت اپنے غم کو دیتی تھی۔ یہ کمزوری آج بھی مجھ میں اسی مقدار میں ہے جتنی پہلے تھی۔ میری کا بچپن کا برتاؤ آج بھی کھلتا ہے۔

ادیبوں کی اس بیٹھک میں شامل ہونے کے بعد سے میں اپنی ذاتی شخصیت کو قطعی جداگانہ تصور کرنے لگی تھی — جو گھر میں وہ عزت نہیں مل پا رہی تھی جو کہ مجھے ملنی چاہئے تھی — اکثر ہر نوجوان لڑکی کی زندگی میں اس طرح کے لمحات آتے ہیں، جب وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کی زندگی رائیگاں جا رہی ہے۔ اسے جس قدر عزت غیروں سے ملتی ہے اتنی اپنوں سے نہیں — میرے دل میں ابھی تک کوئی بات صاف نہیں تھی — آئندہ زندگی میں مجھے کیا کرنا ہے — میں ابھی تک طے نہ کر پائی تھی — انسانی منصوبے تبدیل بھی ہوتے اور ہوتے ہیں لیکن ہوتا کچھ اور ہے — پہلے سے طے کر لینے سے بھی کیا ہوتا ؟ پتا جی جو اپنے لئے قطعی غیر بن بیٹھے تھے — ویدی کے خیالات خود اعتقاد و محدود تھے کہ کچھ کہنا مناسب نظر نہ آتا تھا — تعلیم کسی طرح پوری کر کے ڈگری لے ہوئے امتحان دیا — امتحان سے پیشتر میری ذہنی پریشانیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ ساری رات آنکھوں میں گزر جاتی —

ویدی کو دیکھنے ایک ڈاکٹرنی روز آتی تھی وہی میرا بھی جائزہ لیا کرتی۔ ڈاکٹرنی نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ مسوری چلے جائیں — وہاں بھی پیدا ہو نہیں بھی انسانی بیگی دہلی میں گرمی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی — سگریٹ پینے کی وجہ سے انھیں ویسے گرمی محسوس ہوتی تھی — ڈاکٹرنی کا کہنا تھا کہ میں بھی ویدی کے ہمراہ مسوری چلی جاؤں تو میری دماغی اور جسمانی تھکان دور ہو جائیگی — ویدی کو ڈاکٹرنی کے اس مشورے سے اتفاق ہو گیا تھا — کمل بابو کی بے رخی سے وہ تنگ آ چکی تھیں۔ گو انھوں نے اس بے رخی کو ظاہر میں کبھی منظور نہ کیا تھا — مجھے سنانے کے لئے وہ نوکروں اور آیا سے بلند آواز میں کہا کرتیں — جے سنگھ تمہارے مالک کا کاروبار آجکل کچھ زیادہ بڑھ گیا ہے — انھوں نے ایک دوکان اور خرید لی ہے جس کی وجہ سے ان کی مصروفیت اور بھی بڑھ گئی ہے — جے سنگھ گونگا تھا یعنی ذکر تمہارے کمل بابو کے رہنے سے بخوبی واقف تھا — ویدی کی بات سن کر اس کے ہونٹوں پر ایک پر معنی مسکراہٹ کھل جاتی — جیسے معنی مسرت میں چھپی تھی — حالانکہ ویدی کا خیال تھا کہ میں کمل بابو کے کارناموں سے قطعی ناواقف ہوں —

لیڈی ڈاکٹر کے مشورے کو کمل بابو تک پہنچانے کیلئے ہم دونوں بہنوں کو آدھی رات تک جاگنا پڑا — کمل بابو تو خود ہی جلد از جلد دہلی سے دور کر دینا چاہتے تھے — لیکن کسی وجہ سے وہ ایسا کرنے سے مجبور رہے

لیڈی ڈاکٹر کی تجویز کی شکل میں کمل بابو کو منہ مانگی مراد مل گئی — انھوں نے ویدی کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ مسوری میں رہنے کے لئے ایک بنگلہ کا بندوبست کر دیں گے — ان کی سامنے بھی یہی تھی کہ ہم دونوں بہنوں کو اپنی صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے جلد از جلد مسوری چلا جانا چاہئے — کمل بابو نے یہ دریافت کرنا ضروری نہ سمجھا کہ لیڈی ڈاکٹر کی تجویز میں کہیں کوئی خطرہ تو نہیں ؟ ویدی کے جسم میں خون کی تو کمی نہیں ہو گئی ؟؟

اگر دنیا کی تمام اور آسائشوں کا ذکر کر دوں تو دولت ویدی ہو کے کے گھر بجز بڑی اور با آسانی مل رہے تھے۔ جو نہ بیٹا کہ گھر میں کبھی نصیب نہیں ہوئے تھے — مجھے بھی میں اس فرق کو بھلا نہیں پاتی تھی کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میری وقعت ان نوکروں سے زیادہ نہ تھی جو آکر بابا ویدی کے گھر میں آتے اور مہینوں پڑے رہتے تھے ان کی خاطر بھی خوب اچھی طرح ہوتی — ملازم بھی ان کا خاص خیال رکھتے تھے — کمل بابو کے ایک دوست تھے کیپٹن ویریندر وہ شاید کبھی کالج میں ہاکی ٹیم کے کیپٹن رہ چکے تھے — فوجی ملازمت تو انھوں نے ایک منٹ بھی نہ کی تھی — کالج کے وقت سے ہی انھیں کیپٹن کہہ کر پکارا جاتا تھا — دوسروں کی رقم پر ان کی زندگی بسر ہوتی تھی — کلکتہ سے دہلی آتے تو کمل بابو سے پیشگی سفر خرچ منگا لیتے تھے — ان کی صحت کافی خوب تھی — گھر کے مالک کو وہ ہمیشہ خوش رکھتے تھے — خوشامد کر کے یا وہسکی کے شطرنج کی بازی ہار کر، اور اپنے ہم وطنوں کا اظہار کر کے یا گھر کے مالک کے لئے چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیزیں خریدنے میں امداد دے کر — کسی نہ کسی طرح وہ گھر کے مالک اور مالکن کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے —

بدچلن اور بد اخلاق انسانوں کا کوئی خاص درجہ نہیں ہوتا — وہ بھی شریف انسانوں کی طرح، فنکاروں کی طرح اپنی ذاتی خصوصیتوں کی بنیاد پر دنیا میں کھڑے ہونیکا دعوے کرتے ہیں —

ویریندر ویدی کے گھر آ کر مہینوں رہتا — وہ کمل بابو کے ساتھ پڑھا کرتا تھا — ہاکی کی ٹیم میں بھی وہ دونوں ساتھ ساتھ تھے اسی رشتہ کو لیکر اب بھی دہلی آ دھمکتا تھا — اور مہینوں رہتا — وہ بخوبی جانتا تھا کہ ویدی کس بات سے خوش ہونگی — کمل بابو جب گھر پر نہ ہوتے تو وہ ویدی کے حسن کی تعریفیں کیا کرتا — کمل بابو کے ساتھ طرح طرح کے سگریٹوں کی تعریف اور طرح طرح مزیدار الفاظ میں بیان کرتا — میں حیران تھی کہ اتنی بڑی عمر کا شخص اس طرح بہکی بہکی باتیں کس طرح کہہ جاتا ہے ؟ اس وقت کمل بابو کی عمر قریب پینتالیس سال کی تھی — ویریندر کی عمر بھی اس سے کم نہ تھی — بے حد زیادہ شراب پینے، کبھی فاقہ کشی اور کبھی لذیذ کھانے نے اس کے جسم اور عمر کو بگاڑ ڈالا تھا — میں اکثر غور کیا کرتی کہ بغیر مقصد کی زندگی لیکر ویریندر کب تک اس طرح

سندری اسکا بھی خوب جانتی تھی۔ فرمایا — آپ تکلیف نہ کیجئے۔ یہ شاید کوٹھی میں سامان رکھ کر آئی ہیں — ابھی چائے لے آئیں گی۔ ورنہ ان کی نگرانی نہ ہمیا کی گر اسے کیا کرنا ہے —

منشی صاحب نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا۔ شاید وہ میرا جائزہ لے رہے تھے —

× × ×

چاندی کو اور مجھے منشی صاحب کے گھر میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ منشی صاحب دلی چلے گئے —

میں جس دن چاندی کے ساتھ سامان لیئے دیدی کے گھر گئی تو وہ لیٹہ کمرے میں بیٹھی بڑبڑا رہی تھیں اور ایک مرتبہ بھی مجھے ملنے کے لئے اپنے کمرے سے باہر نہ آئیں۔ پورا سامان جب گاڑی میں رکھ دیا تو میں نے سوچا ایک دفعہ دیدی سے کہہ آؤں کہ ہم لوگ جا رہے ہیں — گو چاندی مجھے روکتی ہی رہی۔ لیکن پھر بھی میں دیدی کے کمرے میں چلی گئی۔

دیدی ہم لوگ جا رہے ہیں —"

لیکن بجائے کچھ کہنے کے وہ دیوار کی طرف دیکھتی رہی — شاید انہیں یہ ہرگز یقین نہ تھا کہ ہم کہیں جا بھی سکتے ہیں

بلنٹ لاج میں مجھے سندری کے کمرے کی بغل والا کمرہ ملا۔ کمرہ اچھا اور کھلا ہوا تھا۔ چار پائی بچھ جانے پر بھی میدان بنا رہنے کی جگہ رہ جاتی تھی — میں نے اپنے دو بکسوں کو ملا کر بیٹھنے کی جگہ بنالی — ان لوگوں سے فرنیچر مانگنا تو برا معلوم دیتا تھا۔

مالکن سے میرا تعارف کرا دیا گیا۔ سلوچنا دیوی کی عمر تیس سال سے زیادہ ہی ہوگی — وہ گورے رنگ اور چھوٹے قد کی خوبصورت، دنیاداری میں ہوشیار خاتون تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ شہریان کی طرح شرتی ہی کر جھوٹ بول کر انہیں سیدھا نہیں بنایا جا سکتا — ان سے دو دن بات چیت کرنے کے بعد میں نے طے کر لیا کہ میں اپنا کھانا چاندی کے علاوہ خود ہی بناؤں گی گو گھر ہی کا ڈنگی۔ گو انہوں نے کھانے کی بابت مجھ سے کسی قسم کی بات چیت نہیں کی تھی — اور کھانا کھانے کے وقت یا ناشتے کے وقت وہ مجھے بلا بھیجتی تھیں — میں جب کھانے کی میز پر پہنچتی تو نہایت ——— سے پیش آتیں ——— حسب معمول مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر رہتی۔ لیکن اوپر والا ہونٹ کبھی کبھی کا سی طرح دبا لیتی تھی جس سے صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ اپنے دل کے کسی گوشے میں کوئی کر رہی ہیں — میری ہرگز خواہش نہ تھی کہ میں انکی نظروں میں اور بھی اضافہ کروں سندری ان کے بچوں کو پڑھاتی تھی۔ انکی ملازم تھی — اسے کھانا دینا مناسب اور لازم تھا۔ لیکن مجھے دینا قطعی ضروری نہ تھا — تین چار دن میں ہی مجھے

جائے گا گھر کی مالی حالت اتنی بہتر نہیں ہے جتنی وہ لوگ ظاہر کرتے ہیں۔ بے اس بات کی خوشی تھی کہ سندری کو ان کے گھر میں کسی طرح کام مل گیا ورنہ ان لوگوں کی حیثیت گورنیس رکھنے کے قابل نہ تھی۔ اپنی پرانی شان و شوکت پر جو کہ قلعی کھنڈر بن چکی تھی اب وہ نئے محل تعمیر کئے جا رہے تھے جنہیں کھڑا کرنا ان کی طاقت اور ہمت سے باہر تھا۔

اوّل تو سوری میں دودھ اچھا ملتا ہی نہیں ہے اور منشی صاحب کے گھر جو دودھ آتا اس میں اور بھی پانی ملا دیا جاتا۔ گھر ہی میں سلوچنا دیوی کی پرانی ساڑیوں پر نئے رنگ کرائے گئے تھے — ان کے زیورات کی حالت بھی بہتر نہ تھی۔ کسی زیور میں نگ نہ تھے اور کوئی سخت گھسا ہوا تھا کہ دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے وہ دس سال سے استعمال کر رہی ہیں —

دودھ میں پانی ملایا جاتا ہے نوکروں کو پیٹ بھر کھانا بھی نہیں ملتا — یہ سب چاندی نے مجھے بتایا — چاندی نے یہ بھی بتایا کہ ملازموں کو جو چائے دی جاتی ہے اس میں دودھ نام کے لئے بھی نہیں ہوتا ہے۔ سلوچنا دیوی کے چار بچے تھے۔ جن میں بڑا لڑکا سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا۔ جو کبھی گاہ بگاہ گھر آتا تھا۔ پچھلی تینوں ہی لڑکیاں تھیں جن کے لئے سندری کو رکھا گیا تھا —

سلوچنا دیوی میرے آنے کے پہلے دن سے ہی مجھے پر شکوک نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ ان کے لئے میں انھیں قصوروار نہیں سمجھتی۔ آخر وہ بیچاری کہاں سے لا لا کر روپیہ خرچ کریں — گھر میں کمانے والے صرف ان کے پتی تھے — مجلا دیور وکالت پاس کر کے ڈرامہ کے پیچھے دیوانہ تھا — میں نے سنا تھا کہ وہ دلی میں ایک ڈرامے کا ڈائرکشن کرا یا تھا۔ جسے عوام نے پسند بھی کیا تھا۔ اس کے ٹکٹ خوب فروخت ہوتے تھے۔ جو روپیہ ملا اس سے وہ اور اس کے ساتھی ایک ہفتہ بمبئی کی سیر کر آئے تھے۔ فلموں میں کیا کچھ ہوتا ہے یہی دیکھنے گئے تھے۔ اب وہ ان گرمیوں میں کالیداس کا امیر ڈرامہ شکنتلا پیش کرنا چاہتا تھا جس میں شکنتلا کے کردار کے لئے مجھے پیشکش دینا تھا —

گھر میں دو نندیں بھی تھیں — ایک تو سلوچنا دیوی کی لڑکی ہوگی۔ اس نے میٹرک کے بعد آگے پڑھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ابھی تک اسکی شادی بھی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اسکے لائق کوئی دولہا مل ہی نہیں سکتا تھا — سارے دن وہ اپنے باپ کی دولت کی تعریف کرتی رہتی اور سلوچنا دیوی کے ہر کام میں خامیاں تلاش کرتی رہتی —

سنتھا دیدی ہر وقت اسطرح بنی ہوئی رہتی گویا ابھی کسی تقریب کے لئے تیار ہوکر آئی ہو — تین چار دن رہنے کے بعد مجھے اس بات کا بھی پتہ چل گیا سولو چنا دیدی کو ایک بار کے استعمال شدہ کپڑے بھی پہنتے پڑتے ہیں سنتھا کی چھوٹی بہن 'بیس بائیس سال لڑکی' ہیں' اسی نام سے اسے پکارا جاتا تھا۔ سکول میں پاس سے کبھی تعلیم نہ پائی تھی۔ نہ کوئی امتحان ہی پاس کیا تھا — لیکن ہندی، انگریزی اور فرنچ کا کام چلا جاتی تھی۔ جس کا استعمال کیا جاتا ہے آج تک نہیں جان سکی —

وہ سگریٹ پیتی، گھڑ سواری کرتی۔ بھائی کی بچیوں کے بال کھینچتی اور انکے ساتھ کھیل کر ادھر ادھر گھومتی رہتی تھی — نہ تو اسے کوئی گھر والا ہی ایسا کرنے سے روکتا تھا اور نہ وہ خود ہی خیال کرتی تھی کہ ایسا کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ شاید اسی لئے کہ بڑی ہونے پر بھی ابھی تک شادی نہ ہوئی تھی —

گھر کے مالک یعنی سولو چنا دیدی کے پتی اپنی چھٹیاں ختم کرکے دہلی واپس چلے گئے — گھر میں رہتے ہوئے بھی انکی آواز کم ہی سنائی دیتی تھی — کسی کو برا بھلا وہ کہتے نہیں سکتے تھے پھر بھی سارے گھر پر ایک خوف طاری رہتا اور سبھی انکی عزت کرتے تھے۔

سنتھا بھی بڑے بھائی سے ڈرتی تھی جس وقت وہ گھر میں ہوتے انکی زبان خاموش رہتی تھی — بھابھی کو ڈانٹنا اور پتا کی امیری کے گیت گانا کم ہو جاتا — سولو چنا دیدی سنتھا سے ایک بات میں مار کھا جاتی تھیں کہ وہ اتنی تعلیم یافتہ نہیں تھیں جتنی سنتھا تھی۔ گھر کی عورتوں میں سے سنتھا کے علاوہ کسی نے بھی سکول کی شکل نہ دیکھی تھی۔ ملازمین جب سولو چنا دیوی سے پوچھتے کہ کھانے کیلئے کیا کیا بنےگا؟ تو وہ یہی کہہ دیتیں کہ سنتھا سے ہی پوچھ لیا جائے۔ سنتھا جب میٹرک میں پڑھتی تھی جب بڑے بھائی کی شادی ہوئی تھی — اس واقعے کو پندرہ سال گزر چکے تھے۔ پھر بھی سنتھا کو سولو چنا دیوی اچھی طرح جان نہیں پائی تھیں۔ کیونکہ نند نے یہ طے کر رکھا تھا کہ وہ بھابی کے ہر کام میں ٹانگ اڑاتے ہوئے کھانے کی چیزوں میں ضرور ہی خامیاں نکالےگی — بھابی اگر بڑے گھر کی بیٹی ہیں تو کیا؟ انہیں اتنی آزادی دی جائے کہ وہ اپنی نند کی رائے اور اجازت کے بغیر اپنی مرضی سے کچھ کرلیں؟ سنتھا کی ماں اگر زندہ ہوتیں تو شاید ان کی حکومت بھی اسقدر سخت نہ ہوتی۔ سنتھا کا کہنا تھا کہ بڑے گھر کی بیٹی کو حکومت کرنے کا طریقہ جاننا نہایت ضروری ہے۔ پھر سسرال میں نہیں تو کم از کم پتا کے گھر میں تو عورت کی حکومت ہونی لازمی ہے —

گھر کے مالک دہلی چلے گئے تو میں نے سوچا کہ اب کمل بابو کو خط لکھنا چاہیئے ہوسکتا ہے کہ وہ ان لیں۔ تو ایسی صورت میں میری حالت کیا ہوگی؟ مجھے کم از کم اپنی صفائی تو دے دینی چاہیئے —

محض اسی خیال سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ میں ان کمل بابو کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی جو مجھ سے سخت نفرت کرتے تھے میرے جسم سے نفرت کرتے تھے، جنہیں میرے رنگ سے نفرت تھی — جنہیں میرے ساتھ بات کرنا بھی ناگوار تھا — انہیں کمل بابو کو میں خط لکھتی لیکن ان کے خط کا جواب تو دینا ضروری تھا — ان کا شکریہ بھی تو ادا کرنا تھا

میں نے ہمت کرکے خط لکھنے کی کوشش کی تو سندری تینوں بچیوں کو میرے پاس چھوڑ گئی۔ وہ کہیں گھومنے جانا چاہتی تھی — میں جانتی تھی کہ وہ گھومنا کسی اور کے ساتھ نہیں صرف ہیرا بابو کے ساتھ ہی ہوسکتا ہے —

اس وقت بھی میں خط نہ لکھ سکی — بچیوں کے ساتھ کھیلنا پڑا، پھر انہیں ناشتہ کرا کر بچے میں ادھر ادھر گھمانے لگی — کئی بار خیال آیا کہ آخر انہیں خط کس القاب کیساتھ شروع کیا جائے؟ جی جا جی کے نام سے تو میں نے انہیں کبھی پکارا ہی نہیں، اور پکارنے کا موقعہ بھی کبھی نہیں آیا تھا — اب اس نام سے پکارنا تو مشکل ہوگا — مجھے مسہری میں بیٹھے بیٹھے ہی اس بات پر شرم محسوس ہو رہی تھی —

خط لکھنے بیٹھی تو بنگلے کے اندر سے سولو چنا دیوی کا پیغام آگیا کہ میں بچیوں کو کہانی سنا دوں۔ بچیاں مجھے یاد کر رہی تھیں۔ سندری شیلا کو ادھر ادھر کی باتیں کر کے ہی بہلا دیتی تھی ——— خاص دلچسپی سے بچیوں کیطرف کبھی توجہ نہیں کی۔ میری معمولی دلچسپی اور توجہ سے وہ کافی متاثر ہو چکی تھیں اور بار بار مجھے یاد کر رہی تھیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی سدھو کو دیکھتے ہی مجھے منا کی یاد آجاتی — وہ بھی دو سال کا ہو چکا تھا — وہ بھی اسی طرح تتلا تتلا کر میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہوگا جو ماں کے کانوں میں امرت برساتی ہوں گی —

کھانا کھانے کے بعد جیسے ہی میں نے خط لکھنے کا ارادہ کیا کہ سولو چنا دیوی میرے پاس آبیٹھیں لگتا تھا پتی کو دلی گئے ہوئے ابھی صرف دو ہی دن گزرے تھے شاید وہ تنہائی سے تنگ آکر میرے پاس چلی آئی تھیں۔ وہ غم زدہ تھیں سو تو میں اس گھر میں آتے ہی جان گئی تھی — اپنی زبان سے تو کبھی انہوں نے کچھ بھی ظاہر نہیں کیا تھا — لیکن غم کے ماروں کی ایک اپنی خاص اور خاموش زبان ہوتی ہے — خاموش رہتے ہوئے بھی ایک کو دوسرے کے رنج و غم اور درد کا

اس ہو جاتا ہے ۔ سلوچنا دیوی کے آنے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ کسی خاص مطلب سے آئی ہیں۔

ماتی جی! تم اتنے بڑے گھر کی بیٹی ہو پھر بھی تم نے میری بیٹی کو جس قدر محبت دی ہے، میں تو اسے دیکھ کر حیران ہو گئی ہوں" انھوں نے کہا۔

لیکن یکایک کسی خاموش رنج و غم سے انکی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے دل پر غم کا بہت بڑا بوجھ ہے، جسے ہٹانے میں ممکن ہے میری مدد سے کچھ ہو سکے۔ اور اس سے بہتر بات بھی میں اس وقت کیا کر سکتی تھی۔ مجھے ان سے پتی سے پناہ دی تھی۔ اپنی سگی بہن نے زبردست بارش میں گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ نہ جانے اسے دولت کا اتنا نشہ کیوں تھا۔ شاید ان بھی لوگوں کو ہوتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دولت کو دیکھا ہو۔

سلوچنا دیوی کافی رات گئے تک مجھ سے بات چیت کرتی رہیں۔ جب وہ اٹھ کر گئیں تو رات کے دو بج چکے تھے۔ سندری ابھی تک واپس نہ آئی تھی۔

جیسا کہ میرا اندازہ تھا سلوچنا دیوی اپنی نندوں سے بہت دکھی تھیں۔ سندا کی حکومت بہت سخت تھی۔ انکی ساس کا انتقال ہوئے چار سال گزر چکے تھے۔ انکی زندگی میں بھی سندا کی ہی علمداری تھی۔ سلوچنا دیوی کو شادی کے دو سال بعد ہی بچے پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اور وہ انکی پرورش میں مصروف ہو گئی تھیں۔

گھر میں جیسا بھی سلوک انکے ساتھ ہو گیا وہ چپ چاپ برداشت کرتی گئیں اگر جب بھی اپنے پتی یا گھر میں کسی دوسرے سے انھوں نے ان زیادتیوں کا ذکر تک نہ کیا۔ گھر کے مالک کے خیال میں انکی بہن دیوی کا اوتار تھی ۔ اس میں کوئی دوسری ہونا مشکل تھی۔ سلوچنا دیوی اپنے بچوں کو ساتھ لیکر اپنے میکے چلی جاتیں لیکن ادھر ماں کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے وہ اب میکے نہ جا پاتی تھیں۔ بھابھیوں کے سر پر جا کر وہ مہینوں کس طرح پڑی رہ سکتی تھیں ۔ سندا کا ہاتھ اپنے اوپر خرچ کرنے میں بہت کھلا ہوا تھا۔ اور یہاں بابو کو بھی دونوں ہاتھوں روپیہ دیتی رہتی تھی۔

یہ ابھی چھوٹی ہی تھی۔ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی۔ لازم تھا کہ اس کی ہر خواہش کو پورا کیا جائے۔ سلوچنا دیوی اگر کبھی بھول کر بھی یہ مشورہ دیتیں کہ سندا ذرا کم خرچ کیا کرو تو وہ ناراض ہو کر کہہ دیتی ۔ بھابھی اتم جو کبھی اپنے گھر دیکھ کر آئی ہو ۔ وہ یہاں پر بھی کرنا چاہتی ہو؟ یہ تو ہمارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں ۔ پھر کب خرچ کریں گے؟

سلوچنا دیوی نے تمام بندشیں خود پر ہی لگا رکھی تھیں ۔ وہ اچھا کھانا

کا گلا گھونٹ دیتی ۔ جہاں تک ممکن ہوتا کوئی خاص خرچ نہ کرتیں ۔

یوں تو سلوچنا دیوی کو زندگی میں کوئی بھی کمی نہ تھی [illegible] نہایت شریف اعتدال پسند تھے۔ لیکن انھیں یہ ترقی پسند نہ تھی جس کا انھیں افسوس رہتا تھا۔ سنتا نے اپنی بھابھی کو اپنے گھر کے ماحول میں ڈھالنے کی از حد کوشش کی مگر جس میں اسے کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔ لیکن موجودہ سوسائٹی کا پڑھا ہوا رنگ ویسا ہی تھا جس طرح چاندی کے زیورات پر سونے کا پانی چڑھا دیا جائے اور چند مہینے کے استعمال کے بعد چاندی پھر اپنی اصلی شکل میں دکھائی دینے لگے ہو ان کے ہر کام سے صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ یہ سب بناوٹ ہے۔ اور اس میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔ وہ سگریٹ بھی پیتیں تو اس کے ہاتھ اس طرح لرزتے جس طرح سندری ادیب کے ۔ وہ ہر وقت اپنے چہرے پر مسکان بنائے رکھنے کی جو کوشش کرتی رہتیں اس کا بھی کھوکھلا پن دوسرے شخص پر ظاہر ہو جاتا۔ کیونکہ اس مسکراہٹ میں بناوٹ بہت زیادہ ہوتی ۔ میں سوچنے لگی کہ کیا امیر گھرانوں کا یہی حال ہے۔ ہمارے والدین معمولی حیثیت کے ہیں لیکن خوشحال ہیں انھیں اس دکھاوے کی کوئی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی ۔ اور اسی لئے وہ دوسروں کی بہ نسبت خوش ہیں۔ میرے خیال میں تو انسان کا سکون یہ موجودہ ترقی پسندی چھین لیتی ہے۔ دکھاوا دیکھیں اپنی حیثیت کے گھرانوں میں اپنی عزت اور اپنا مقام بنائے رکھنے کیلئے انھیں بہت کچھ کرنا پڑتا ہے ۔ شاید گھرانے جیسی حالت اور بھی دوسرے گھرانوں کی ہو گی جہاں فرورتوں کے بڑھنے کی گنجائش تو کھلی ہوتی ہے لیکن آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں بڑھتا گھر کا کوئی بھی شخص آمدنی بڑھانے میں کوئی مدد نہیں دیتا۔ سبھی اپنے شوق پورے کرنا چاہتے ہیں اور جب شوق پورا نہیں ہوتا تو گھر والوں کو بھلا برا کہنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور حقارت دیتا ہے۔

بیسویں صدی سائنس کا دور ہے انسان کے عیش و آرام کیلئے سائنس نے سب کچھ سہولتیں دے رکھی ہیں لیکن انسان نے اپنی ضروریات میں اس قدر اضافہ خود ہی کیا ہے کہ اس میں سائنس کا کوئی ہاتھ ہے یہ میں سمجھ نہیں پاتی۔ کافی دیر تک میں سوچتی رہی لیکن کسی بھی طرح سائنس کو قصوروار ثابت نہ کر سکی۔ ہم لوگوں نے غیر ملکی تہذیب کو اپنایا لیکن اس تہذیب سے وابستہ باریکیوں کو اور دوسری خوبیوں کو ہم نہیں اپنا سکے۔

سنتا ساڑیاں خوب خریدتی تھیں خواہ وہ انھیں پہن سکتی خواہ نہیں لیکن وہ ساڑیاں الماریوں کی رونق میں ہی اضافہ کرتی تھیں۔ سنتا سگریٹ پیتی تھیں دو کانوں سے بال سنوروا تی ۔ ہر دوسرے مہینے انکے بالوں کی آرائش بدلتی

پاپینگ سے پہلے کا سہارا تھا۔ اپنے ہاتھ سے وہ اتنا بھی کام نہ کر سکتی تھیں کیونکہ کمر کے بیچ سے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ غیر ملکی عورتیں اگر اپنے بالوں کی آرائش پر بھی خرچ کرتی ہیں تو وہ بہت ہی کم ہوتا ہے کہ وہ ایسی کرتی ہیں کہ وہ اپنے ساتھ کسے لے جاتی ہیں۔

میں انہیں خیالات میں کافی رات تک الجھا رہا۔ جب سوئی تو شاید دن نکلنے والا تھا۔

× ×

سلوچنا دیوی کے مشوروں اور اپنی پریشانیوں سے چھٹکارا پاکر میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی بابو کو خط لکھنا شروع کیا۔ کافی دیر تک میں سوچتی رہی کہ خط شروع کس طرح کروں۔ کس القاب کے ساتھ شروع کروں۔ جب سے ڈیڈی کی شادی ہوئی تھی میں نے ان سے کبھی بات بھی نہ کی تھی۔ یہ خط لکھنا بھی میرے لئے ایک مصیبت بنا ہوا تھا۔ اس خط میں میں نے جو کچھ لکھا تھا مجھے آج بھی یاد ہے۔

کملا جی

آپ کا خط مل گیا تھا۔ اُسکے لئے شکریہ۔ آپ نے اس تصویر کی قیمت ادا کرکے دراصل مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ آپ اگر اس کی قیمت نہ ادا کرتے تو مجھے بہت سے آدمیوں کے روبرو ذلیل اور شرمسار ہونا پڑتا۔ ڈیڈی نے ممکن ہے اُسکے بعد کا حال تو آپ کو تحریر کیا ہوگا۔ لیکن میں نہیں جانتی کہ اس نے کس صورت میں میرا جرم پیش کیا ہوگا۔

آپ کا خط دیکھتے ہی وہ تلملا گئی تھی۔ انہیں شبہ ہو گیا تھا کہ میرا آپ سے کچھ ناجائز تعلق ہے اور ڈیڈی کو غلط فہمی کے لئے اسکی موجودگی میں گفتگو نہیں کرتے تھے۔

اس روز زبردست بارش ہو رہی تھی۔ چاندنی نے میری طرف داری کی تو ڈیڈی اس سے بھی خفا ہو گئیں۔ اور اسے ایک طمانچہ مارا — ہم لوگوں کو انھوں نے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اب اس کے بعد ہماری غیرت گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ ہم اس گھر میں رہتیں۔

میں درحقیقت آپ لوگوں کی بے حد احسان مند ہوں، ڈیڈی کی بھی احسان مند ہوں۔ اگر اس دن غصے میں آکر گھر سے باہر نہ کرتیں تو میری حالت ابھی تک ویسی ہی بنی رہتی، بلا وجہ دوسروں پر بار بنی رہتی۔ ابھی تک تو مجھے کوئی نوکری ملی نہیں ہے لیکن میری کوشش جاری ہے۔ سنگیت سکھانے کا کام شاید مل جائے۔

میں فی الحال بالنٹ لاج میں ایک انڈین فیملی کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ جہاں میری سہیلی سندری گورنس کا کام کرتی ہے۔ میرے آجانے سے سندری کو بھی سہولیت ہو گئی ہے۔ وہ بچے میرے پاس چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ قطعی درست ہے۔ اس کا ہر لفظ سچ ہے۔ اس میں حقیقت کے سوائے اور کچھ نہیں۔ میں آپ لوگوں کے احسانوں کو بھول نہیں سکتی۔ پتا جی اور ماں کو میں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ انھوں نے بھی تو قریب چھ مہینے سے مجھے کوئی خط نہیں لکھا۔ آپ مناسب سمجھیں تو انہیں خط میں تحریر کر کے یا ملاقات ہونے پر سمجھا دیجئے۔

رانی

یہ خط میں نے کئی مرتبہ پڑھا۔ میں نہیں سمجھتی ہوں کہ بہتر کچھ لکھ سکتی اور نہ شروع میں ہی کوئی القاب لکھ سکی۔ خط لکھ کر میں ڈاکخانے میں ڈالنے کیلئے گئی۔ لفافہ گرانے میں تقریباً ایک ہفتہ کے دس بارہ دن گزر چکے تھے۔ لیکن اس دوران میں میں گھر سے باہر نہ نکلی تھی۔ سنگیت کے بار بار اصرار کرنے پر بھی میں گھر سے نہیں گئی۔ وہ خط کے لفافے میں نے خط لکھ کر بکس میں ڈال دیا۔ ان کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ گویا ایک بہت بڑا بار جو میرے سر پہ تھا میں نے اُسے اُتار کر پھینک دیا ہے۔

میں اپنی دلی حالت پر خود ہی پریشان تھی۔ مجھے اس بات کا افسوس تو بہت زیادہ نہ تھا کہ میرا اپنے گھر سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ میں نے جس جگہ کی تجھ سے نکلا تھا حیرت کی بات تھی۔ ڈاکخانے سے گھر لوٹتے وقت مگر مجھے تعجب تھا تو صرف اس بات کا کہ کیا دوسری اور مائیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں؟ کیا انہیں بھی اپنی اولاد سے محبت نہیں ہوتی؟ ڈیڈی نے اپنا پیدا کیا ہوا بچہ کس طرح بیچ کر ماں کو دے دیا تھا۔ میں بے جان، خاموش اور کھوئی کھوئی سی کسی طرح بالنٹ لاج پہنچی۔

سلوچنا دیوی میرا بھی سے انتظار کر رہی تھیں۔ میرے گھر پہنچتے ہی انھوں نے پوچھا کہ میں نے سندری کو کہیں دیکھا ہے؟ میرے انکار نے ان کی فکر اور پریشانی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ وہ خوف سے لرز اٹھیں۔ پریم بابو کے ساتھ اُسکا اُٹھنا بیٹھنا تیزی سے بڑھ رہا تھا شاید ان کے ساتھ چلی گئی ہے۔ لیکن میں نے دل کی بات دل ہی میں رکھی۔

سلوچنا دیوی کسی کتاب کی طرح میرا مطالعہ کر رہی تھیں۔

"سندری اور پریم بابو کہیں بھی تو جا سکتے ہیں۔ کیوں؟"

میں نے جھجک اور شرم سے پانی پانی ہوا کسی طرح میں نے جواب دیا۔ "ہاں"

"جب سے وہ (سلوچنا دیوی کی کرتی) ہوتی گھر میں ان دونوں کے باہمی تعلقات تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ مجھے اکثر شک ہوتا تھا کہ ایکدن ایسا ضرور ہوگا۔ ساقی بہن اور آپ کی سہیلی ہیں۔ یہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

لیکن مجھے اس وقت کچھ سوچا ہی نہیں حالانکہ میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی سہیلی کے ذکر کو چھوڑ کر میں نے فوراً ۔۔۔ "کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔"

سلوچنا دیوی نے بغور میری طرف دیکھا اور پھر بولیں "آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں۔ مجھے اسقدر حقیر نہ سمجھئے۔ آپکی سہیلی چلی گئی ہیں تو اسکے یہ معنی نہیں کہ بچیوں کی دیکھ بھال آپ کریں۔ یہ تو میں بھی کر لوں گی۔"

اسوقت نہ جانے تمام دنیا کی نرمی میری زبان پر کہاں سے آگئی تھی میں نے پرخلوص انداز میں کہا "نہیں جی جی! آپ مجھے غلط نہ سمجھئے۔ میرا کچھ چھوٹا نہیں بنا رہی ہے میں تو محض انسانیت کے ناطے کہہ رہی ہوں کہ میں بھی بچیوں کی دیکھ بھال میں آپکا ہاتھ بٹا سکتی ہوں۔"

سلوچنا دیوی نے اتنی محبت اور ہمدردی سے پُر الفاظ شاید پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ ان کا دل بھر آیا۔

اس دن سے بچیوں کی دیکھ بھال میں کرنے لگی۔ سندری کا کوئی خط نہیں آیا۔ اسکے کمرے میں سوائے اُس فرنیچر کے جو سلوچنا دیوی کا دیا ہوا تھا سندری کا کوئی سامان نہ تھا۔ وہ نہ جانے کب اپنے کپڑوں کا سوٹ کیس لے گئی تھی یہاں تک کہ تیل صابن تک بھی وہاں نہ تھا۔

میں نے زندگی میں کبھی خیال بھی نہ کیا تھا کہ مجھے کسی کی بچیوں کی دیکھ بھال کرنی پڑیگی۔ چاندنی ان کاموں میں ماہر تھی۔ وہ بچیوں کو غسل کراتی ان کے بال سنوارتی اور گھمانے لے جاتی۔ میں اپنا کھانا پکاتی، کمرہ صاف کرتی اور بچیوں کو سنگیت سکھاتی۔

سنتا دیوی کبھی کبھی بیچ بیچ کر کھڑکی کے آگے ۔۔۔ کھڑی رہتیں۔ ہاتھ میں کوئی اردو کتاب غیر ملکی رسالہ ہوتا یا کسی غریب رشتہ دار کا خط رہتا جو اس نے کچھ روپیہ مانگنے کیلئے لکھا ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ سنتا کسی بھی خاص موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے سب کچھ کر گزرتی ہے۔ اُسے مستقبل اور انجام کا خیال ہی نہیں رہتا۔ نہ فکر ہی رہتی ہے۔ اُسکا خیال تھا کہ دنیا میں ایسا کچھ باقی نہیں ہے جو اُسے سیکھنا ہے دنیا کی تمام خوبیاں اور قابلیت اُس میں موجود ہے۔ میں سوچتی کہ اگر کبھی یہ قانون کے ہاتھ پڑ گئی تو ۔۔۔ ؟ اور تبھی اسے جائز اور ناجائز کا احساس ہوگا۔ ورنہ شاید نہیں۔

جس دن سے سندری اور پران بابو گئے سنتا اور سلوچنا سندری کو قصوروار کہتی رہتیں۔ سنتا کا کہنا تھا کہ وہ اسکے بھائی کو بہکا کر بھگا لے گئی۔ سندری وہ بھی سانولی تھی۔ یہ لڑکیاں دوسرے گھر میں ملازمت کرنے جنگلی میں انکی ذات ہے۔ اسکے علاوہ اور کیا امید کی جا سکتی ہے۔

یہ چوٹ مجھ پر کیا تی۔ سنتا کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا کہ امیر عورتوں کی زندگی کسقدر بیکار ہے۔ نہ کوئی کام نہ دھندا۔ سارے دن بن ٹھن کے بیٹھنا۔ اور دنیا کو حقارت کی نظر سے دیکھتا۔ ہفتہ میں تین چار دن سینما دیکھنا۔ جس سے چند لمحات کے لئے جذبات جاگ اٹھیں۔ سنتا کو بھی کام دیری کی طرح پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کبھی کبھی کسی لائبریری سے کوئی ناول لے آتی یا خرید لیتی تو اسمیں سوائے معشوق کے اور کچھ نہ ہوتا۔ جن ناولوں کی ہیروئن چھوٹی موٹی کی طرح بات بات پر بیہوش ہو جاتیں۔ جن میں ہیرو کے ایک اشارے پر گھوڑے دوڑتے۔ ہیروئن کو ہمیشہ دل کی بیماری لگی رہتی وہ اشکباری کرتی اور اپنے کی قسم اور سارے وعدوں کو یاد کر کرکے انہیں دہرائیں دیتی رہتی۔ اور پھر عین موقعے پر ایک راجکمار شہسوار ہوتا اور اس سے شادی کر لیتا۔

یہاں شادی کا لفظ آتے ہی اکثر میرے تخیلات کی روانی ٹھہر جاتی۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میری شادی نہیں ہوگی۔ مجھ سے کون شادی کریگا؟ میں اسقدر کالی جو ہوں۔ میری شادی کیلئے ماں کو ازحد کوشش کرنی پڑیگی۔ جسے وہ ہرگز گوارہ نہ کرینگی۔ ممکن ہے مجھے اسی جگہ سلوچنا دیوی کی بچیوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے اپنی زندگی گزارنی پڑے گی۔

میں نے اپنے مستقبل پر کبھی غور نہیں کیا۔ کیونکہ مجھے اپنا موجودہ غم ہی پہاڑ جیسا نظر آتا تھا۔ اسلئے میں ہمیشہ اپنے حال کو ہی اہمیت دیتی تھی۔ کبھی میری زندگی میں بھی بہاریں آسکتی ہیں اسکا مجھے گمان بھی نہ تھا میری زندگی کی حدود اسقدر محدود تھی کہ اسوقت میرے ذہن میں یہ خیال ہرگز نہ آتا تھا کہ ہر انسان کی زندگی اسی طرح محدود ہوتی ہے۔

ہر بیگاہ گھر میں اخروٹ کے درختوں کو دیکھتی۔ انہیں پھل لگ رہے تھے، چھوٹے چھوٹے اور ہرے ہرے۔ میں سوچتی ان اخروٹ کے درختوں کی زندگی میری زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ جنکے نام پر کم از کم اس گھر کا نام بالنٹ لاج ہے اور جنکے پھلوں کو سنتا کے طرح طرح کے کریم سے چھات کئے ہوئے خوبصورت ہاتھوں کی نرمی وگرمی نصیب ہے۔ میں بدنصیب کچھ بھی تو نہیں کرپاتی ہوں۔ میرا سوائی کام بھی چاندنی ہی کرتی ہے۔

اور اسی وقت ۔۔۔ ؟ میری خاموش زندگی میں یکایک طوفان

بھی انتظار میں نے سب کچھ تبدیل کر دیا ——

صبح کے دس، ساڑھے دس بجے کا وقت ہوگا۔ آفتاب ابھی دھند لکوں میں چھپا ہوا تھا، پھر بھی اس کی سرخی جھلک رہی تھی — ٹھیک اسی طرح، جس طرح کوئی کی دوکان میں سنتروں کی ٹوکری رکھی ہو —گھر سے تیار ہو کر میں نوکری کی تلاش میں باہر جانے کو ہی تھی کہ میں نے کمل بابو کو بالکنی تک کی سیڑھیاں چڑھ کر آتے ہوئے دیکھا — دل دھک سے رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا گویا میرے کانوں میں کوئی انجن چل رہا ہو — میرے پاؤں کانپ اٹھے — مجھے قطعی امید نہ تھی کہ کمل بابو خود یہاں چلے آئیں گے۔ خط لکھے بھی صرف چار پانچ دن ہی گزرے تھے — میرے پیروں نے آگے بڑھنے سے جواب دے دیا تھا — انھیں جا کر اپنے کمرے تک لے آنے کی طاقت بھی میرے پیروں میں باقی نہ تھی —

یکایک مجھے خیال آیا کہ یہ سندری سے ملنے آئے ہوں گے۔ انھوں نے اس پر کافی روپیہ خرچ کیا تھا — ٹھاکر اندر درشن والی رقم بھی ممکن ہے سندری اٹھا لائی ہو۔ اس نے شاید پیران بابو کو دے دی ہو — اب کون اسکا ذمہ دار ہوگا؟ بہت سے خیالات ایک ساتھ میرے ذہن میں جاگ اٹھے —

کمل بابو — ہاں، وہی میری طرح بغور دیکھ رہے تھے — ہماری جان پہچان کے اس طویل عرصے میں یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ وہ مجھے اتنے قریب سے اور اس طرح دیکھ رہے تھے — مجھے آج بھی بخوبی یاد ہے کہ میں نے خود کو سہارا دینے کیلئے برآمدے کی جھکی ہوئی چھت کا کھمبا پکڑ لیا تھا

اس سے پیشتر میں نے بھی کمل بابو کو اچھی طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب بھی دیکھا تھا، چوری چوری، چھپ چھپ کر دیکھا تھا۔ اس دن پہلی مرتبہ میں نے دیکھا کہ کمل بابو کی آنکھیں ایک ایسے جذبہ سے دوسرے کو دیکھتی ہیں گویا کہہ رہی ہوں۔ "ہم بھی دیکھ لیں کہ تم کیا ہو؟ کون ہو؟"

کمل بابو کے جسم کا رنگ گندمی، چہرے پر نہایت لاپرواہی سی، اور اس لاپرواہ انداز کو ظاہر کرتے ہوئے ماتھے پر گر کر آتے ہوئے بال اور بھی گہرا بنا جاتے —

وہ میرے قریب آگئے تو ایک لمحہ کیلئے میری آنکھیں بند سی ہو گئیں تھیں۔ پھر میں نے بہت ہمت کر کے اپنی آنکھیں کسی طرح کھولیں۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہے تھے — مجھ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی — ویسی کی ویسی ہی تھی — میرا جسم سمٹ سکڑ کر بالکل چھوٹا سا ہو جانا چاہتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اسمیں سما جاؤں —

رانی! کمل بابو نے محبت آمیز آواز میں پکارا —— رانی! تم اپنی بہن کے سلوک کا بدلا کہیں مجھ سے تو نہیں لے رہی ہو؟

ان کے سوال کا جواب دینے کی طاقت مجھ میں نہ تھی — مجھے تو یہ سب ایک خواب جیسا نظر آ رہا تھا ——

"کیا کہیں بیٹھا دو گی نہیں؟"

"جی —— آئیے — یہ ہے میرا کمرہ"

کمل بابو نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے چاروں طرف دیکھا —

"یہ ستار باہر رکھا ہے؟"

"جی میں یہاں بچیوں کو سکھاتی ہوں —— سندری چلی گئی ہے — مجھے اکیلے یہاں بھی کرنی پڑتی ہے"

"میں جانتا ہوں سندری یہاں سے چلی گئی ہے — میں نے اسے بمبئی کے ہوائی اڈے پر دیکھا تھا۔ ٹھاکر صاحب کا چھوٹا بھائی بھی ساتھ تھا۔ شاید دونوں ولایت جا رہے ہیں —"

کافی دیر تک ہم خاموش رہے — میں نے محسوس کیا گویا دنیا کی ہر چیز کی رفتار رک گئی ہے — سب کچھ بے جان ہو گیا تھا — کیونکہ اس وقت میرے دل کی رفتار بے حد تیز ہو گئی تھی خون کی روانی اسقدر آہستہ معلوم ہوتی تھی گویا رک گئی ہو — کافی دیر تک میں خاموشی کے عالم میں ڈوبی رہی —

"تو آپ جانتے ہیں کہ سندری یہاں نہیں ہے؟"

"ہاں تمہارا خط مجھے بعد میں ملا تھا —— میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہیں سندری کو دیکھا۔ واپس دلی آنے پر تمہارا خط ملا"

میں نے نگاہیں اٹھا کر کمل بابو کی طرف غور سے دیکھا — کون جانے پھر کبھی — نہیں دیکھنے کا موقعہ ملے یا نہ ملے —

"رانی! اس دفعہ تمہارے امتحان کا نتیجہ اچھا نہیں رہا؟"

"نکل گیا؟"

"ہاں —— تم اخبار نہیں پڑھتیں؟"

"صرف تین چار دن سے نہیں پڑھا —— کیا ہو، فیل ہو گئی؟"

کمل بابو نے قہقہہ لگایا — میں نے محسوس کیا گویا میرے دل کی افسردگی اس قہقہہ میں ڈھلتی جا رہی تھی —

"تم اتنی خوش نصیب نہیں ہو کہ فیل ہو جاؤ — پاس ہو گئی ہو — لیکن اس مرتبہ فرسٹ ڈویژن میں نہیں، صرف پاس ہوئی تھی —"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ چلو بلا ٹلی۔ اس روز پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ لوگ پکوانوں کے بجائے سگریٹ، روٹی کھا کر اس ذائقہ دار کیوں کہتے ہیں یہ "کب نکلا نتیجہ؟"

"تمہیں دیدی بوجھ سمجھتی ہیں کیونکہ وہ کافی بوڑھی ہیں کافی دیری بھی دیں یہ نتیجہ دیکھ کر دونوں کو اس دن سخت افسوس ہوا۔"

اب ہنسنے کی میری باری تھی۔ میں خود پر قابو نہ پا سکی اور بے ساختہ ہنسی پڑی۔

"تم! ــــ تم، بہت آزاد ہوتی جا رہی ہو رانی!

"کیوں؟"

"بھئی ادھر ماں کے افسوس کا تم پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا؟"

"خیر، دیدی وہاں کیسے گئیں؟"

"تمہیں گھر سے علاحدہ کر کے وہ دھیریندر کے ساتھ تنہا کس طرح رہ سکتی تھی حالت سے مجبور ہو کر اسے دو رات اکیلا رہنا پڑا۔ لیکن اس کے لئے اسے قصوروار تو نہیں کیا جا سکتا۔"

رہ رہ کر خیال آتا کہ میں دریافت کروں کہ دیدی نے میری بابت کیا کیا کہا۔ لیکن میری حالت تو اس بھوکے انسان کی طرح ہو رہی تھی جسے بھر پیٹ کھانا مل جائے۔ گھر چھوڑ دینے سے میری اہمیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کمل بابو دلی سے ملنے آئے تھے ــــ

"کہاں ٹھہرے ہیں آپ؟"

"ہوٹل میں۔"

"کب آئے تھے؟"

"آج صبح۔"

"یعنی آپ کو مسوری آئے ہوئے صرف ایک ہی گھنٹہ ہوا ہے؟"

"جی ہاں آپ کا حساب درست ہے۔"

"چائے، ناشتہ ــ ــ؟"

"دوسروں کے گھر کا کھلاؤ گی؟"

نہیں، میرے کھانے پینے کا انتظام علاحدہ ہے۔ اس ساتھ والی کوٹھی میں۔ ذرا کا چولہا جلا کر ابھی بنائے دیتی ہوں۔"

کمل بابو نے مسکرا کر کہا ــ" میں نے تمہیں پڑھتے ہوئے تو دیکھا ہے لیکن کھانا پکاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔"

جی میں تو آیا کہ کہہ دوں کہ آپ نے مجھے پڑھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے مجھے آج سے پیشتر کبھی دیکھا ہی نہیں۔ یہ تو صرف میری دل لگی کیلئے آپ کہہ رہے ہیں۔ لیکن میں کچھ بھی کہہ نہ سکی ــــ

"چائے کا پانی تو رکھ آؤں؟"

"نہیں پھر کسی ہوٹل میں چائے پی لوں گا۔"

"تھوڑی سی یہاں پی لیجئے۔ تھکے ہوں گے۔"

"نہیں۔"

آپ پہلے بھی اسی طرح انکار کیا کرتے تھے، لیکن وہ ماتا جی کہاں تھیں جو انکی طبیعت چاہتی ہے وہی کرتی ہیں۔

"لیکن تمہیں گھر لے جاؤں گا۔"

"آپ گھر سے زیادہ اہمیت ہوٹل کو کیوں دیتے ہیں؟"

"یہ گھر تمہارا کہاں ہے؟"

"میں کام کرتی ہوں۔ رہتی ہوں۔ مفت تو رہتی نہیں۔"

"کام کرنے کی تنخواہ بھی کچھ ملتی ہے؟"

"نہیں۔"

"صرف رہنے کو جگہ؟"

"جی!"

"بہت سستی آیا ہے۔"

"میں آیا تو نہیں ہوں۔"

"پھر کیا ہو؟"

"صرف ساتھی۔"

"میں تو اسے آیا ہونا ہی سمجھتا ہوں۔"

شاید غصے سے میرا چہرا سرخ ہو گیا۔

"میں تمہیں ناراض کرنے کیلئے یہ سب کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"... میں چائے کا پانی رکھ آؤں"

اگر تم نے اپنا خیال ابھی تک تبدیل نہ کیا ہو تو رکھ آؤ۔"

میں چائے کا پانی رکھنے گئی تو میں نے دیکھا ہیٹر پر پانی پہلے سے ہی رکھا ہوا تھا۔ میں اپنا ناشتہ بنانے کے لئے پانی رکھ گئی تھی۔ میں نے جھٹ پٹ چائے بنائی، کچھ مٹھائی اور بسکٹ رکھے۔ انھیں ٹرے میں سجا کر کمرے میں واپس آئی تو دیکھا، سنتا دیوی وہاں رونق افروز ہیں۔ آج وہ پہلی مرتبہ میرے کمرے میں تشریف لائی تھیں۔ شاید کمل بابو کی آمد انکے لئے کافی اہمیت رکھتی تھی۔

کافی عمر تک بغیر شادی شدہ لڑکیوں کے ذہنی حالات اور سوچنے کا رخ کچھ عجیب ہو جاتا ہے۔ انکے احساسات بھی عجیب و غریب ہو جاتے ہیں ان کی زندگی میں صرف مرد ہی ایک آورش بن جاتا ہے۔ اس سے گفتگو کرنا جس طرح ممکن ہو

لگا تھا۔ بیٹا! ایسی لڑکیوں کی زندگی کے غرور ہی بڑے بن جاتے ہیں۔

پڑی جلدی چائے بنا لائی رانی؟ کمل بابو نے مسکرا کر کہا۔ یہ شکایت تھی یا تعریف تھی۔ ان کے انداز سے میں نے محسوس کیا سنتدا نے کمل بابو کو شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ گڑیا کی طرح سجی ہوئی تھی۔

"بھابی سے کہہ دیتیں رانی! وہ اندازے سے چائے بنوا کر بھجوا دیتیں"

"ایک ہی بات ہے۔۔۔ آپ کا تعارف کراؤں؟"

"کمل بابو نے فوراً جواب دیا۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے واقف ہو چکے ہیں"

"سنتدا جی! آپ کے لئے ایک پیالہ چائے لاؤں؟"

"نہیں، میں ابھی ابھی ناشتہ کر کے آ رہی ہوں"

"رانی! میں یہی بتا رہا تھا کہ ان کے بھائی پران بابو سے میری بمبئی میں ملاقات ہوئی۔ سندری کیساتھ ولایت جا رہے تھے"

کمل بابو مجھے پیشتر ہی بتا چکے تھے۔ لیکن دوسری مرتبہ پھر اُسی بات کا ذکر کر کے وہ شاید سنتدا کے غرور پر چوٹ کرنا چاہتے تھے۔

کمل بابو کی عادت میں یہ تبدیلی ایک اہم تبدیلی تھی۔ ماں سے لیکر اور دوسری کوئی بھی عورت ان کی زندگی میں آتے ہوئے نہیں دیکھی گئی جس سے انھوں نے اس طرح گفتگو کی ہو۔ شہرت میں ہی بے رغبتی اور لاپروائی ظاہر کرنا اور بات ہے، لیکن دوران گفتگو اس طرح کچھ کہنا دیگر بات ہے پھر سنتدا دیوی اس سلوک کے قابل نہ تھیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے انکے چہرے کی طرف دیکھا۔ سنتدا کی زبان سے جواب میں ایک بھی لفظ نہیں نکلا۔ بولے تو کیا بولے؟ یوں تو انھوں نے سنتدا سے جو کچھ کہا تھا کوئی خاص بات نہ تھی۔ وہ خود ایسی تھی کہ اس سے بھی زیادہ . . . . کہا جا سکتا تھا۔ لیکن مجھے کمل بابو پر تعجب ہو رہا تھا۔ جس وقت سندری کو خود لئے گھومتے تھے تو کوئی بات نہ تھی، اور آج جب وہ کسی دوسرے کیساتھ چلی گئی ہے ایکدم اسکے متعلق باتیں چلانے لگے ہیں۔ شاید سبھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر کوئی نہیں دیکھتا کہ خود کیا ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ دوسروں کی خامیاں تلاش کر کے انھیں ظاہر کرنے میں ایسے شخصوں کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔

اسکے بعد مجھے خاموش ہو جانا پڑا، کیونکہ سنتدا کی تقریر شروع ہو گئی تھی۔ وہ اپنی گھڑسواری کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ مسوری میں گرمیاں گزارنے والے راجہ، رانیوں کی داستانیں سناتی رہی۔ جن میں سے کچھ سے وہ خود واقف تھی اور کچھ کلاس نے اِدھر اُدھر سے صرف نام ہی سن رکھا تھا۔ کمل بابو اُس کی باتوں پر ہنسے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس سے مذاق بھی کرتے جاتے تھے۔ وہ مذاق کر رہے ہیں مجھے معلوم تھا۔

سنتدا شاید ساری دوپہر بات کرتی رہتی۔ لیکن اسی دوران سلوچنا دیوی کا بھائی آ گیا۔ وہ تجارت کرتا تھا۔ سلوچنا دیوی اسے اپنے گھر آنے پر کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھیں کیونکہ انھیں سنتدا اور اپنے بھائی کے باہمی تعلقات قطعی ناپسند تھے۔

سنتدا نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہی کمل بابو سے معافی مانگ کر باہر چلی گئی۔

"اب کہو رانی! واپس کب چلو گی؟"

"میں کبھی نہیں!"

"تم اتنی نادان نہیں ہو"

"مجھے آپ کیساتھ جانا ہوگا؟"

"ہاں، میں تمھیں ہی لینے آیا ہوں۔"

میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسکا کیا جواب دوں۔

"بولو رانی جواب دو؟"

"میں اب وہاں جا کر کیا کروں گی؟"

"جو پہلے کرتی تھیں"

"پہلے تو میں پڑھتی تھی۔ لیکن اب تو پڑھائی ختم ہو گئی"

"تو کیا ہوا؟ آیا گیری کرنے کیلئے تم نے ایم۔ اے۔ پاس کیا ہے؟"

جب دوسری مرتبہ بھی انھوں نے ایک ہی بات کو دہرایا تو میں خود پر قابو نہ پا سکی۔ جب کادمبری نے گھر سے نکال دیا تھا تو میں کہاں جاتی۔۔۔ بتایئے؟

کمل بابو پھر ہنسنے لگے "کادمبری تمھاری بہن ہے، اگر میں ایسی حرکت کرتا تو دنیا مجھے جینے نہ دیتی۔ . . . ہاں تو رانی! اُسے کس بات کا شک تھا؟"

میں اُن کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی، شرم و حیا نے میری زبان بند کر دی۔ اُنکی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی مجھ میں ہمت باقی نہ تھی۔

"رانی!"

"جی!"

"مجھے معاف کر دو"

"اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟"

"میرا قصور تمھارے نہ ماننے سے ہرگز کم نہیں ہو سکتا۔ میرے قصور کو یا تو تم محسوس نہیں کرتیں یا تم اسقدر باتہذیب اور رحمدل ہو کہ مجھ پر میرا جرم ظاہر نہیں کرنا چاہتیں

"میں بھی نہیں"

"مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو، پھر بھی . . ."

"لیکن دنیاوی تجربات تو میری بہ نسبت آپ کے کہیں زیادہ ہیں۔"

"تمہاری خاموشی میرے جرم کی سنگینی کم نہیں کر سکتی . . . میں اس کا کفارہ ادا کروں گا۔ تم سامان باندھ لو اور تیار ہو جاؤ۔ ہم لوگ ڈھائی بجے چل دینگے۔"

"لیکن . . . لیکن . . ."

"میں کوئی مخالفت نہیں چاہتا۔"

"لیکن میں جاؤں گی کہاں؟"

"گھر۔"

"نہیں وہ میری کا گھر ہے، اب میں جس گھر سے نکل آئی ہوں اس گھر میں نہیں جاؤنگی"

"لیکن جب تک تمہارے پاس کوئی ڈھنگ کا کام نہ ہو۔ تم یہاں بھی تو نہیں رہ سکتی ہو۔"

وہی کل بابو جو میری طرف نگاہیں اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ کتنی ہمدردی اور دلچسپی ظاہر کر رہے تھے۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں جنم سے لیکر اس وقت تک دنیا کی نظروں میں حقیر ہی رہی تھی۔ مجھے کسی کی محبت حاصل نہ ہوئی تھی۔ سب کے سلوک سے بڑھ کر صرف پتا جی مجھے پیار کرتے تھے اور اب مجھ پر حاکمانہ محبت کی جا رہی تھی۔ میرا پیاسا دل اس قدر پر جذبات ہو اٹھا کہ رو رو کر بھر اٹھا۔ میں دیوار پر بیٹھی ہوئی تھی پیچھے کی طرف کھسک کر میں نے اپنی پیٹھ دیوار سے لگالی۔

وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ دیکھے جا رہے تھے۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں لیکن انکی نظریں میرے جسم کی باہری سطح کو پار کرتی ہوئی دل کی گہرائیوں تک پہنچ رہی تھیں۔

"رانی میں نے سب کچھ سوچ سمجھنے کے بعد طے کر لیا ہے کہ تم میرے ساتھ چلوگی، میں تمہارے رہنے کیلئے کوئی مکان ٹھیک کر دونگا اور نوکری کا بھی انتظام کر دونگا۔"

"سچ؟"

"ہاں رانی! میری معمولی غلطی نے تمہیں گھر سے علاحدہ کرا دیا۔"

"اس میں آپکا قصور ہی کیا ہے؟"

"مجھے اس خط میں یہ نہ لکھنا چاہیے تھا کہ تمہیں کاویری سے پیسے مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"میں نے دیدی سے کبھی پیسے مانگے ہی نہیں۔ وہ تو خود ہی دے دیا کرتی تھیں کبھی مانگنے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی"

"اوہ! میں تو بھول ہی گیا؟ جبکہ تم اپنا خرچ کسطرح چلا رہی ہو!"

میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ چاندنی بچاری نے اپنے ہاتھوں سے کرشمے کر کے دکھائے تھے نہ صرف چند روپئے تھے۔ یہ اتنا بڑا صدمہ تھا کہ مجھے اسکا ذکر کرنا بھی تکلیف دہ محسوس ہوا۔

کل بابو نے میرے سامنے سو روپیہ کے نوٹ رکھتے ہوئے کہا "کسی کا بل وغیرہ ہو تو ادا کر دینا۔ تیار رہنا میں ٹھیک ڈھائی بجے لینے آؤں گا۔"

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ چلے گئے۔

× × ×

کل بابو کیساتھ مسوری سے آنیکے بعد دہلی کی دو سال کی زندگی ایک کڑوی سی رہی۔ کوئی اچھی نوکری مجھے نہیں ملی اور نہ کوئی رہنے کے لائق اچھا مکان ہی ملا۔ کل بابو کو بھی دہلی آکر محسوس ہوا کہ نوکری دلوانا اتنا آسان نہیں، جتنا کہ وہ مسوری میں سمجھ رہے تھے۔ ۱۹۵۲ میں دہلی میں لڑکیوں کو بھی نوکری ملنی اتنی ہی مشکل تھی جتنی شاید ۱۹۳۱ میں لڑکوں کو۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ معمولی سی نوکری کیلئے بیسیوں ڈگری والیوں کی عرضیاں آتیں۔ اور لڑکیوں کی عرضیوں کے ساتھ میری عرضی بھی ردی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی کیونکہ میرے پاس کوئی سفارش نہیں تھی۔

میں دو تین مہینے کل بابو کے ایک دوست کے گھر رہی۔ لیکن اس گھر کی ایک بزرگ عورت کو میرا اپنی بہن کا گھر چھوڑ کر دوسروں کے گھر رہنا ناگوار گزرا۔ اسکا خیال تھا کہ میرے آزاد خیال گھر کی دوسری لڑکیوں کو بگاڑ رہے ہیں۔ جو پہلے ہی گھر والوں کے ہاتھوں سے نکل رہی تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان لڑکیوں نے کبھی اچھی طرح گفتگو بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ایک غیر شادی شدہ، ایم اے پاس اور نوجوان لڑکی گھر چھوڑ کر اپنی مرضی کے مطابق چلے جہاں گھومتی رہے تو ایسی صورت میں اگر لوگ اس پر انگلیاں اٹھائیں تو انکا قصور ہی کیا؟

وہ گھر چھوڑنے کے بعد میں ایک ہوسٹل میں رہنے لگی۔ وہاں چاندنی کو اپنے ساتھ رکھنا مشکل تھا۔ اسلئے مجھے اسے بھی چھوڑ دینا پڑا۔ یوں تو ہوسٹل میں ہر طرح کا آرام تھا۔ علاوہ کرہ تو نہیں ۔ ایک دوسری لڑکی کیساتھ رہنا پڑتا تھا کسی بات کی کمی نہ تھی۔ ماہانہ جمع کرو، کیونکہ مہنگائی بڑھتے ہوئے بلوں کی تعداد کم کرو . . . صرف آنے جانے پر بندش تھی۔ ہوسٹل صرف اسلئے میرے لئے موزوں نہ تھا کیونکہ مجھے سنگیت سکھانے کے لئے سیکھنے والوں کی سہولتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ مجھے سنگیت سکھانے کیلئے ایک دو ٹیوشن مل جاتے تھے۔ لیکن نوکری ملنی ممکن نہ تھی۔ کیونکہ ایم اے میں میری ڈویژن اچھی نہیں آئی تھی۔ آخر ہوسٹل کو بھی خیرآباد کہہ دینا پڑا۔

میں نے اخبار کے ایک دفتر میں نوکری کی۔ وہ بڑی بھاگ دوڑ کا کام تھا اس لئے مجھ سے ہو نہ سکا۔ اور وہ نوکری چھوڑ دینی پڑی۔ پہلے ہی میں نے دنیا کی نفرت

اسقدر بے معاشرت کی تنگی میں آرام کی زندگی گزارنے کی عادی ہو چکی تھی۔ آج بھی بے نیکاری کو نہیں جھٹک سکی ہو سکا۔ مجھے اب محسوس ہوا کہ محنت کی کمائی کی اہمیت کیا ہے —

پہلے تو ایک ادھ لڑکی کو دوسرا سامنے آجاتا۔ کبھی کبھی میں محسوس کرتی کہ میں تھک گئی ہوں۔ کیوں نہ ماں کے پاس چلی جاؤں؟ آخر ان پر میرا بھی تو کوئی حق ہے۔ ویسا پیسوں سے بہت کچھ خرچ کیا ہے۔ جب تک مجھے نوکری نہیں ملتی تب تک مجھے بھی ان کی امداد کی ضرورت تھی —

ایک دن ماں سے ملاقات کرنے گئی۔ اس دن میں نہایت تکلیف میں تھی۔ میں جس مکان میں رہتی تھی اسکا کئی مہینے کا کرایہ میں ادا نہیں کر سکی تھی۔ مکان مالک نے دھمکی دی تھی کہ میں دوسرا مکان تلاش کر لوں۔ انھیں کوئی ایسا کرایہ دار مل رہا تھا جو تین سو کرایہ پیشگی دینے کو تیار تھا۔ اور میں پچھلے تین مہینوں کا بھی کرایہ ادا نہ کر سکی تھی۔ میرے پاس کوئی زیور بھی نہیں بچا تھا کہ اسے ہی فروخت کر ڈالتی —

میں طے ہی دل میں فیصلہ کر کے گئی تھی کہ ماں سے کچھ روپیہ مانگونگی —

ماں نے مجھے دیکھا تو انکی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ میں نے ہمت کر کے انکی خیریت دریافت کی تو وہ بولیں "تو باہر سے کمائی نہیں تیرا دل بھی کالا ہے۔ رقم لوٹنے کیلئے کوئی اور نہیں ملا سوا اپنے بہنوئی کے"

ماں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں کمل بابو کو برباد کرنا بند کر دوں اور ان کے پیسے کا لالچ اپنے دل سے دور کر دوں —

ماں اسقدر بے رحمی سے پیش آئی تھیں کہ میں ان سے کچھ نہ کہہ سکی میں نے منانے ہونے کی کوشش کی تو انھوں نے ڈانٹ دیا — "تو موئی ہے یا ڈائن؟ کیوں اس بیچارے کو نظر لگاتی ہے"

میں ماں کو قصور وار نہیں کہہ کر حقیقت ہی بیان کر رہی ہوں بیسویں صدی میں پڑھی لکھی ماں ایسی بھی ہو سکتی ہے، ممکن ہے آپ کو یقین نہ ہوگا۔ بھوک سے بیزار ماں نے اپنے پیٹ سے اپنے بچوں کو چپٹا ڈالا ہو میں کود پڑی ہو — یا جائداد کے سوال پر ماں بیٹی میں جھگڑا ہو گیا ہو — ایسا تو میں نے سنا تھا۔ اکثر اخباروں میں بھی ایسے واقعات پڑھے تھے۔ لیکن بیٹی کا رنگ کالا ہونے کی وجہ سے بیسویں صدی کی ماں درمیانی طبقہ کی ایک ماں اسے صرف تعلیم یافتہ بنا کر اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیگی، معمولی بہانے پر گھر سے علاحدہ دیگی —

ماں کے سلوک سے صاف ظاہر تھا کہ مجھے ان سے قطعی تعلق نہ رکھنا چاہیے۔ ان کی خواہش بھی وہی تھی جو کادمبری کی تھی —

میرا دل پاش پاش ہو گیا۔ اکیس سال کی عمر میں میں گھر والوں کے ہونے کے باوجود یتیم تھی، بے گھر تھی، بے سہارا تھی —

ایک دفعہ بھی ماں نے یہ دریافت کرنیکی ضرورت محسوس نہ کی کہ میں کیسے جیتی ہوں، میرا گزر کس طرح ہوتا ہے، مجھکو نوکری ملی یا نہیں؟ ماں کو بھلا کیا غرض ہے میری بابت کچھ دریافت کرنیکے بعد میرا بار ان پر آ پڑیگا —

کادمبری نے مجھے ماں کے پاس بیٹھے دیکھا تو منہ پھیر لیا۔ اسکا خیال تھا کہ میں نے کمل بابو کو اس سے چھین لیا ہے —

شاید تب مجھے اپنی اصلی حالت کا احساس ہوا کہ میں اس دنیا میں قطعی تنہا ہوں، میرا کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ گھر والے میرے سایہ سے بھی دور بھاگتے ہیں۔

اسکے بعد میں نہ تو ماں سے ملنے گئی اور نہ کادمبری کے دوسرے لڑکے کی پیدائش کے وقت ماں نے مجھے بلایا — پتا جی کا خیال آتے ہی دل کی عجیب حالت ہوا تھا۔ لیکن وہ بھی نہ مجھے کبھی خط لکھتے تھے نہ دہلی آنے پر مجھ سے کبھی ملتے تھے۔ ماں اور کادمبری نے میری طرف سے انکے خیالات قطعی تبدیل کر دئے تھے۔

میں نے کتابوں میں پڑھا تھا — ماں، پتاجی اور دوسرے آدمیوں کو بھی کہتے سنا تھا کہ اکثر ولایت میں ایسا ہوتا ہے کہ بچوں کو تعلیم دلانے کے بعد والدین علاحدہ کر دیتے ہیں — اور والدین سے علاحدہ ہونیکے بعد بچوں کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق چلے جہاں رہیں، ملازمت کریں۔ اگر بیسویں صدی نصف گزر جانے کے بعد ہندوستانی والدین بھی ایسا ہی کریں تو ناجائز نہیں ہے۔ ماں کی بے مروتی، نفرت اور حقارت نے جہاں میرا دل پاش پاش کر دیا تھا وہاں مجھے ایسی [illegible] بخشی تھی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکوں۔ ہو سکتا ہے کہ اور لڑکیوں کی بھی حالت میری جیسی ہی ہوگی۔ لیکن میں ان کی بابت بخوبی نہیں جانتی —

آہستہ آہستہ میں نے بھلا دیا کہ والدین پر میرا بھی کچھ حق ہے۔ اگر ہم دوسروں سے کسی طرح کی کوئی امید نہ رکھیں تو ہمیں کسی طرح کا کوئی دکھ نہ ہو۔ کیونکہ اس میں ناامیدی کی گنجائش نہیں ہوتی —

کبھی کبھی میری بوا کے خط آتے تھے۔ لیکن ان کی ہمدردی سے دل کچھ اٹھتا تھا۔ ان کی اس ہمدردی اور رحم کو حاصل کر کے میں خود کو حقیر تر نہیں پا سکتی۔ وہ لکھتیں — "رانی بیٹیا! تمام دنیا ایک طرف اور تو میرے لئے ایک طرف۔ بیٹیا! میرا گھر تمہارا گھر ہے۔ جس وقت مرضی ہو آسکتی ہو — میں تمہاری آمد کی منتظر ہوں۔ تمہارے آجانے سے گھر کی رونق دوبارہ ہو جائیگی۔ گوری بیاہی گئی تو شروع سے ہی ایسے ہی آثار نظر آتے تھے۔ اس نے کبھی بھی تمھیں اپنی بیٹی کی طرح محبت نہ کی۔ گوری اپنا گھر گھاٹ چھوڑ کر دہلی اپنی بیٹی کے پاس جا بیٹھی ہے۔ بھلا ایسا بھی کوئی کرتا ہے؟ وغیرہ، وغیرہ — ہر خط میں ایسا ہی کچھ تحریر ہوتا تھا —

مجھے ماں کے دہلی آجانے پر قطعی تعجب نہیں ہوا۔ ماں کی بڑی بیٹی خوبصورت ہے۔

شادی کے بازار میں اسکی اچھی قیمت ملی ہے۔ وہ اگر اپنے ایک منزلہ مکان اور لکھنؤ جیسے معمولی شہر کو چھوڑ کر دہلی آگئی ہیں تو اسمیں کسی کو حیران ہونے کی قطعی گنجائش نہیں۔ دہلی میں میں نے دیکھا ہے کہ جن عورتوں کی لڑکیاں خوبصورت ہیں، اور اگر حسین نہ بھی ہو کر صرف چست اور جوان ہی ہیں کیونکہ کام اتنے سے ہی چل جاتا ہے— ایسی لڑکیوں کی والدائیں اپنی بیٹیوں کی عمر اور شکل و صورت کا پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہیں۔

ایک شریمتی حکومت سنگھ تھیں۔ ان کی لڑکی دیکھنے میں گوری اور کالی کالی بڑی آنکھوں والی ہے۔ چھوٹی لڑکی کے ناک نقش بھی اچھے ہیں۔ بڑی لڑکی کے شوہر وہ بجلی واقعہ میں سامنے اپریل میں وہ کہیں نہ کہیں بڑی لڑکی کی سگائی کرنے لگتی ہیں تاکہ اس سال کے مئی اور جون کے مہینے اُن کے گھر والوں کے کسی پہاڑ پر گزر جائیں۔ شادی کا وعدہ وہ ستمبر کے مہینے کا کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے ہونے والے داماد کو لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی ہونے والی بیوی کے خاندان بھر کو پہاڑ پر لے جاتے۔ ستمبر آتے آتے وہ اپنی بیٹی کو کچھ اس قسم کی پٹی پڑھاتی ہیں کہ منگنی ٹوٹ جاتی ہے۔ شادی رک جاتی ہے اور شریمتی حکومت سنگھ کسی دوسرے بزنس کی تلاش میں لگ جاتی ہیں۔ سلسلہ پھر شروع ہوجاتا ہے۔ شریمتی حکومت سنگھ ہی کیوں اور بھی نہ جانے کتنی ہی ایسی ہیں جو مستقل طور پر کچھ ایسا ہی کرتی ہیں۔ ہاں ہر ایک کا طریقہ جداگانہ ہوتا ہے۔ جو لڑکی کی ذاتی قابلیت حسن و شباب اور ماں کی ہوشیاری پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ خوب تعلیم یافتہ ہو۔ ہاں روزمرہ کام آنے والی انگریزی کی جانکاری ہی کافی ہوتی ہے تاکہ اس سے انھیں اچھے عہدے پر ملازم لڑکا تلاش کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔

اور آج جب میں اس زندگی کو بہت پیچھے چھوڑ چکی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ میری ماں نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا اگر وہ اپنے داماد کے گھر آکر رہنے لگی ہیں۔ معمولی جیسی معمولی تنخواہ پانے والا اگر انھیں چالیس سال کی عمر میں لکھنؤ جیسے معمولی شہر میں باندھ کر نہ رہ سکا تو اس غریب کا کیا قصور؟ زندگی کے پچیس سال انھوں نے ایسے شوہر کے ساتھ گزارے تھے اور اب اُن کی ویران زندگی میں کچھ بہار آگئی تھی تو دوسروں پر ناگوار گزرنے کی کیا وجہ ہے؟ اور پھر زمانے —— کے ساتھ ساتھ اگر انھوں نے خود کو تبدیل کر لیا تو ناجائز نہیں۔

جب کبھی کمل بابو سے ملاقات ہوتی تو وہ کہتے "رانی! تم اسقدر سنجیدہ اور خاموش کیوں ہو؟ تمہاری ماں جب ہنستی ہیں تو میں انکی عمر بھول جاتا ہوں اور انکی اس ہنسی میں کھو جاتا ہوں جو ایک پندرہ سالہ لڑکی کی ہنسی جیسی دلکش اور شیریں ہوتی ہے۔ وہ اسی طرح کھل کھلا کر ہنستی ہیں جیسے ایک معصوم بچی"

شاید ہر عورت دل سے جوان رہتی ہے اور موقع پاکر اس کی جوانی اندر کی قید سے بے قابو ہوکر آزاد ہوجاتی ہے۔

ہندوستان سے باہر کے ممالک کی عورتیں عمر ڈھل جانے پر بھی بناؤ سنگھار کرتی ہیں اور ہندوستانی عورتوں کی بابت عام روایت ہے کہ وہ جب نانی دادی بننے لگتی ہے تو خود بخود ضعیف ہوجاتی ہے۔ لیکن ہماری ماں اسکے برخلاف جب نانی کہلانے لگی تھیں تو بجائے بڑھاپا آنے کے انکی کھوئی ہوئی جوانی لوٹ آئی تھی۔ اُن کا لباس، رہن سہن اور انکی طبیعت سب کچھ تبدیل ہوگیا تھا

گزشتہ دو سالوں نے میری عمر میں صرف دو سال ہی نہیں جوڑے بلکہ بے شمار تبدیلیاں دی تھیں۔ اکیلی لڑکی ایک خادمہ کے ساتھ رہے خواہ وہ کالی ہی کیوں نہ ہو، مرد کی نگاہوں سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔ اور لوگوں کو مکان کی تکلیف ہوسکتی ہے لیکن مجھے کمل بابو کی مہربانی سے کہیں نہ کہیں مکان مل ہی جاتا تھا۔ مہینے کے تین مقام تبدیل کرنیکے بعد میں کمل بابو کے ایک دوست کے مکان میں جا کر رہنے لگی تھی۔ یہ دوست پارلیامینٹ کے ممبر تھے۔ یہ کمل بابو کے کس قسم کے دوست تھے، میں اسکی تفصیل میں اس وقت نہ جاؤنگی۔ وہ کمل بابو کی قانونی اور غیر قانونی حرکات میں کہاں تک ساتھ دیتے تھے یہ بھی اس وقت بیان نہ کرسکونگی وہ راجیہ سبھا کے ممبر تھے۔ انکا مستقبل آئندہ چھ سالوں کیلئے محفوظ تھا۔ اسلئے جب تک میں کوئی ناجائز کام نہ کروں میرے رہنے کا انتظام مستقل تھا۔ پھر یہاں جو سب سے بڑی سہولیت تھی وہ یہ تھی کہ مکان کا کرایہ مجھے نہیں دینا ہوتا تھا۔ کمل بابو اسکا کرایہ بھیا جی کو کس صورت میں ادا کرتے تھے مجھے اسکا کچھ علم نہیں۔ اور نہ مجھے اسکی بابت معلوم کرنیکی ضرورت ہی تھی۔ کمل بابو بھی انھیں بھیا جی کہتے تھے۔ انکے ساتھ کام کرنے والے بھی انھیں اسی نام سے پکارتے تھے۔ بھیا جی کے مکان نارتھ ایونیو میں آکر میری زندگی کے طوفانوں میں کچھ خاموشی آگئی

× ×

بھیا جی کے مکان میں رہتے ہوئے تقریباً چار مہینے گزر گئے تھے کمل بابو مسوری سے واپس آنیکے بعد بھی پندرہ دنوں کے بعد آکر مل جاتے تھے— کبھی کبھی ہفتے میں دو تین مرتبہ بھی ملاقات ہوجاتی تھی۔ یہ ملاقاتیں ان کی سہولیتوں اور گھریلو حالات پر منحصر تھیں۔ میرا اصرار تو ہمیشہ خاموش ہی ہوتا تھا۔ میں نے اپنی زبان سے کبھی نہیں کہا کہ آپ آئیے یا آپ کو فرصت نہیں— کبھی کبھی میرے چہرے کی طرف دیکھنے کے بعد کہہ دیتے "اچھا رانی! میں کل بھی آؤنگا" اور ان کے یہ الفاظ سن کر دل مسرت سے جھوم اٹھتا۔ اپنے گھر والوں میں مصروف کمل بابو ہی تھے۔ جن سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ میری آمد و رفت بھی کہیں نہ تھی۔

"میں بہت زیادہ دکھی ہوں رانی!"

"کیوں؟"

"کلموری مجھے بہت پریشان کرتی ہے۔ گھر میں گھستے ہی کھانے کو دوڑتی ہے۔"

"کیوں؟"

"اسکا خیال ہے کہ میرا تمہارے ساتھ ناجائز تعلق ہے۔ اور میں اپنی تمام آمدنی تم پر صرف کر رہا ہوں۔"

میں یہ بات سنکر سہم گئی۔ لیکن میری تھرتھراہٹ ان آنکھوں سے چھپ نہ سکی۔

"کیوں، ایسی ڈر گئیں؟"

"نہیں تو —— میرا تو خیال ہے کہ اس میں رونے کی تو کوئی وجہ نہیں۔"

"جب رنج و غم برداشت کی حد سے پرے ہو جاتا ہے۔ اس وقت انسان کے پاس رونے کے سوائے کوئی چارہ نہیں ہوتا۔"

"لیکن اب میں آپ کو —— ہرگز نہ رونے دوں گی۔"

"کیا تم میری قسمت تبدیل کر دو گی رانی؟"

"ہاں۔"

"سچ؟"

"یقین کیجئے۔"

"رانی ——!" ان کا جسم تھرتھرا اٹھا۔ اور انھوں نے آہستہ سے اپنا سر میرے کندھے پر ڈال دیا۔ میں آہستہ آہستہ انکا سر سہلانے لگی۔

"رانی ——! کتنی ممتا ہے تمہارے دل میں۔"

میں ان کی اس بات کا کیا جواب دیتی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

"تم دونوں بہنوں میں کتنا فرق ہے۔"

"ہاں کا دیدی میری بہ نسبت بہت خوبصورت ہے۔ دراصل رانی تو اسی کا نام ہونا چاہیے تھا۔"

"نہیں، تم واقعی رانی ہو۔ ممتا کی رانی، پیار کی رانی۔ وہ —— سنگ مرمر کی طرح گوری چٹی ہے۔ اس گورے جسم میں دل نہیں ہے۔ اور اگر دل ہے بھی تو اس میں دھڑکن نہیں، احساس نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس نے تمہیں گھر سے بے گھر کیا۔ اور اس کے باوجود بھی تم سوال کرتی ہو کیوں؟ دن رات مجھے بھلا برا کہتی رہتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر ماں بیٹی مجھ پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔

"اُف، آپ نے پہلے کبھی کیوں نہیں بتایا؟"

"میرا خیال تھا کہ یہ سب بتانے سے تم نہیں [illegible] دل میں اپنے لئے ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتے [illegible] جب درد حد سے سوا ہو جاتا تھا تو شراب پی کر [illegible] جاتا تھا۔ لیکن تمہارے [illegible] تمہارے پاس آکر مجھے سکون ملتا ہے۔ لیکن تم خود ہی [illegible] اور بالفرض یہ سراسر زیادتی ہوگی۔ اور میری خودغرضی بھی۔"

"آپ نے ایسا سوچ کر اچھا نہیں کیا۔ [illegible]"

"نہیں رانی! میں تم سے بخوبی واقف ہوں اور اسی لئے تم پر [illegible] نہیں چاہتا تھا کہ ظاہر ہو جانے پر تمہارے غم میں اور بھی اضافہ ہو جائیگا۔"

"تو کیا ہوا، آپ کا جی تو ہلکا ہو جاتا۔"

"نہیں رانی! میں تمہیں کسی طرح کا آرام نہیں پہنچا سکا ہوں۔ یہاں تک کہ میں تمہیں کسی طرح کا آرام پہنچانے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ ایسی صورت میں تمہیں پریشان کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔"

"اگر آپ خود ہی اپنے حقوق سے ناواقف رہیں اور انھیں نہ سمجھیں تو میرا کیا قصور؟"

"رانی!"

"جی؟"

"جانتی ہو تم بہت بڑی بات کہہ رہی ہو۔"

"بخوبی جانتی ہوں۔ دل کی لگی صرف اپنوں پر ہی ظاہر کی جا سکتی ہے۔ بیگانوں سے نہ تو کچھ کہا جا سکتا ہے اور نہ انھیں دوسروں کے دکھ درد سننے کی فرصت ہی ہوتی ہے۔"

ہم اپنی باتوں میں اس قدر مشغول تھے کہ ہمیں چاندی کی آمد کی قطعی خبر نہ ہوئی کہ وہ ہمارے کمرے میں کس وقت آئی۔

"میں کافی کیلئے پانی رکھ آؤں۔"

میں جانتی تھی کہ کافی پینے سے شراب کا نشہ ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی وقت چاندی نے کہا —— "پانی میں رکھ چکی ہوں بیٹیا! تم ذرا ڈھنگ سے بیٹھو۔"

اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ جس طرح ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ غلط تھا۔ کمل بابو کا نشہ کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ انھوں نے میرے کندھے سے اپنا سر اٹھا لیا۔ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

کمرے کی خاموش فضا میں چاندی کے الفاظ گونج رہے تھے۔

چاندی نے کچھ مٹھائی اور نمکین لاکر چھوٹی میز پر رکھ دیا۔ پھر کافی کے پیالے سامنے رکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی —— "جائی بابو! رانی بیٹیا بڑی بھولی ہے۔"

کمل بابو نے ہنستے ہوئے کہا —— "ہاں چاندی! رانی کی آنکھیں بھی بہت بھولی ہیں۔"

کل نے کہا "ساقی! خیال کر کہ ہم دونوں میں کتنا فرق ہے؟" لیکن یہ بات تسلیم کرنا بھی مشکل نظر آتا تھا۔ وہ جیسے بھی ہوں پھر بھی میرے دل میں ان کے لئے عقیدت اور محبت تھی۔

اپنے دل سے بحث کرتے ہوئے میں نے کہا "تو نے آج سے پیشتر کسی مرد کو دیکھا ہی نہیں اسی لئے تو اس طرح کہہ رہا ہے۔ اگر کوئی دوسرا مرد دیکھا ہو تو ممکن ہے کل بابو تجھے پسند نہ آتے" میں خود بخود اپنے دل کو برا بھلا کہتی رہی۔

زندگی کی پھوٹی پھوٹی ڈالیں انگڑائی لیکر جاگ اٹھیں۔۔۔ دھیرندر کو دیکھا تھا اور قریب سے دیکھا۔۔۔ ڈاکٹر اندر روشن کو بخوبی پہچانا تھا۔ سمردت ستور کو بھی دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ اور ان کے علاوہ کل بابو کے دوست راکیش، ستیش وغیرہ کو بھی دیکھا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے دل کی گہرائی کو چھو نہ سکا تھا اور نہ میرا دل ہی ان کے قریب پہنچ سکا تھا۔ کل بابو نے گویا میرے جذبات کو پر لگا دیئے تھے۔ دل کی خاموش گہرائیاں کسی انجان نغمے سے گونج اٹھی تھیں۔ جن آنکھوں میں ناامیدیوں کی چاندنی رات بکھری رہتی تھی ان میں سہانے حسین اور مدہوش خواب جھوم اٹھے تھے۔ میری نگاہوں میں کل بابو کی پہلی ملاقات سے لیکر آج تک کی دھندلی یادیں تازہ ہو کر رقصاں ہو اٹھی تھیں۔

۔۔۔ دیدی کے ساتھ جب شادی کے بعد پہلی مرتبہ لکھنؤ آئے تھے تو سندری کو پوچھا تھا۔ اور انکی اس بے رخی نے میرا دل پاش پاش کر دیا تھا۔۔۔

۔۔ بی اے کا نتیجہ نکلنے پر مجھے مبارک باد بھی نہ دی تھی۔ اور انکی خاموشی نے میری خوشی کو آدھا کر دیا تھا۔۔

میرے دہلی آ جانے پر مجھے وہ سندری کیلئے دلوانے تھے۔ انکی بے رخی کی وجہ سے میں اپنی تعلیم بھی ٹھیک طرح سے پوری نہ کر سکی تھی۔ اور ہمیشہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کے بجائے اس مرتبہ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ کل بابو کہتے تھے کہ انھوں نے زبردست گناہ کیا ہے۔ شاید یہی مطلب۔ لیکن میں نادان تھی۔ شروع سے ہی انکی بے رخی کے باوجود بھی انکی پرستش کرتی آ رہی تھی۔ جس کا احساس مجھے نہ تھا۔

دل نے کہا "یہ سب گذشتہ دو سالوں کی ملاقاتوں کا انجام ہے"

تین دن تک میری حالت دیوانہ وار رہی۔ چاندی چچی پوچھ کر تھک گئی کہ آخر مجھے ہو کیا گیا ہے؟ لیکن میں اسے بتاتی بھی کیا؟ اور اگر کچھ بتاتی بھی تو اسے سنکر چاندی کیا خیال کرتی۔

اف! کیا کل بابو کو محبت کرنا گناہ ہے؟ وہ بھی تو مجھے چاہتے ہیں۔ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ لہذا اگر میرے لئے ان کے دل میں محبت نہیں بھی ہے تو صحیح ہی کیا ہے میں تو انھیں چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی محبت سے واسطہ ہے۔۔۔ لیکن وہ آئے کیوں نہیں؟

ذرا سی آہٹ سنائی دیتی تو دل کہتا "شاید وہ آ رہے ہیں" لیکن کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جب ان کا سایہ بھی نظر نہ آتا تو دل ناامیدیوں سے کراہ اٹھتا۔

پورے تین دن بعد میں بجلی کی طرح جلتی رہی۔ ہاں تیسرے دن ... آخر وہ آئے۔ میں بیٹھی ہوئی تھی اٹھنے کی کوشش کی لیکن نہ اٹھ سکی نہ چل سکی۔

وہ مجھے کھڑکی پاس سے بغور دیکھ رہے تھے۔

میں نے چھپی چھپی نظروں سے انکی طرف دیکھا۔ وہ کس قدر پریشان اور مضمحل نظر آ رہے تھے۔

میرے دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ کسی طرح تو میں نے ہمت کر کے سوال کیا "بہت متفکر نظر آ رہے ہیں آپ؟"

انھوں نے مسکرا کر جواب دیا "میرا تو خیال تھا کہ تم گذشتہ تین دن تک نہ آنے کی وجہ دریافت کرو گی"

انھوں نے ذرا سا [illegible] میری طرف [illegible] "تم اتنی شرمیلی کیوں ہو رہی؟"

ان کے اس عجیب و غریب سوال کا جواب میں نہ دے سکی۔

انھوں نے اپنے ہاتھوں سے میرا چہرا اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "اچھا یہ بتاؤ کیا ان گذشتہ تین دنوں میں تم نے مجھے کبھی یاد کیا تھا؟"

میں کسی طرح سر ہلا کر صرف 'ہاں' کہہ سکی۔

"تم ان دنوں سکول بھی نہیں گئیں۔ میں نے پرسوں بھی فون کیا تھا اسکول کو"

"دل نہیں چاہتا جانے کو"

"کیوں؟"

"میں کیا جانوں"

"کیا کرتی رہیں؟"

"بیٹھی رہی ... لیٹی رہی ... خیالوں میں ڈوبی رہی"

"بس؟"

"جی!"

"یاد تو نہیں کیا؟"

خاموش ہونٹوں پر مسکراہٹ مچل اٹھی۔ وہ کس چالاکی سے میرے دل کا راز جان لینا چاہتے تھے۔

"رانی! جانتی ہو میں شرابی ہوں؟"

"جی ہاں"

"بہت برا ہوں"

"میں کس طرح بتا سکتی ہوں؟ مگر نہیں، میں سمجھتی ہوں آپ تمام دنیا سے اچھے ہیں۔"

"سب سے؟ شاید اس لیے کہ کسی لڑکی نے بھی میرے تعلقات دیکھے ہیں؟"

"میں جانتی ہوں۔"

"پھر۔۔۔ سمجھ گئی۔۔۔؟"

"میں کچھ نہیں سمجھ سکی۔" انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں راحت محسوس کر رہی تھی۔

"رانی!"

میری سانس گھٹ رہی تھی۔ کوشش کرنے پر بھی زبان ساتھ نہ دے رہی تھی۔

"رانی! میں تمھارے ان پاکیزہ جذبات کے قطعی قابل نہیں ہوں جانتی ہو میں نے تمھاری ماں کے خوابیدہ جذبات میں طوفان جگا دیے ہیں۔ گو عمر میں وہ مجھ سے بڑی ہیں لیکن بنیادی رشتے کی نظر سے وہ میری ماں کے برابر ہیں۔ میں نے انھیں پیسے والوں کی دنیا کا کھلونا سمجھا اور وہ موجودہ سوسائٹی کے رنگ میں اس قدر رنگی جا چکی ہیں کہ اپنی بیٹی کے ساتھ غیر ملک جا رہی ہیں۔ میں دونوں لڑکوں کا دیرینہ احسان کیسے بھولوں؟ جہاز میں سیٹیں بک کرا کر آ رہا ہوں۔"

"آپ بھی۔۔۔؟"

انھوں نے بات کاٹتے ہوئے کہا "نہیں رانی! میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں نے گزشتہ اڑتالیس گھنٹوں میں بہت کچھ سوچا ہے۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں ان کے ساتھ نہ جا سکوں گا۔"

"آپ صرف میرے لیے ہی یہاں رک رہے ہیں؟"

"کیا تمھیں یہ وجہ معقول نظر آ رہی ہے؟"

میں جواب نہ دے سکی۔ وہ خود ہی کہتے چلے گئے "آج تک کسی نے بھی میری ذات سے محبت نہیں کی۔ سب کی محبت میری دولت سے تھی۔ رانی! میں جانتا ہوں تم کس طرح اپنا خرچ چلاتی رہی ہو۔ تم نے کبھی مجھ سے پیسے کا سوال نہیں کیا۔ میں تمھاری روزمرہ کی زندگی میں تیزی سے ہوتی ہوئی تبدیلیوں کو غور سے دیکھتا رہا ہوں۔ آج سے چھ مہینے پیشتر جب تم دونوں کے لیے کھانا بھی نہیں جٹا پاتی تھیں تو میرے بار بار دریافت کرنے پر تم نے کہا تھا چاندی اب کافی بوڑھی ہو گئی ہے۔ اب میں اُسے اور زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ وہ اکثر تب کھانا بنا لیتی ہے۔ ہم دونوں وقت اُسی سے گزارا کر لیتی ہیں۔ میں نے راشن بھجوایا تو تم نے دوسرے مہینے ہی راشن والے کو منع کر دیا کہ ابھی تو پچھلے مہینے کا راشن ہی رکھا ہوا ہے۔ یاد ہے جب سردیوں میں تم بیمار تھیں اور تمھاری دوا چاندی خیراتی اسپتال سے لایا کرتی تھیں۔ تمھاری بیماری کے ایک ہفتے بعد مجھے خیراتی اسپتال سے دوا لاتی ہوئی چاندی مل گئی۔ میں اسے موٹر میں اپنے ساتھ لیکر ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اگر وقت پر تمھارا علاج نہ ہوتا تو تمھیں ڈبل نمونیا ہو جاتا۔۔۔ اور اُس دن میں نے تمھارے روحانی جلال اور طاقت کو سمجھا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ تمھاری ماں اور بہن کی طرح تمھیں روپیہ کی طاقت سے فتح نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ باتیں کر رہے تھے اور اُن کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

"وہ کب جا رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک مہینے بعد۔"

"کیا ماں بھی جا رہی ہیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"انکا خیال ہے کہ پتا جی خود اُن سے ملاقات کرنے دہلی آئیں گے۔"

"پتا جی کو لکھ دیا ہے؟"

"نہیں جب تک سیٹیں بک نہ ہو جائیں لکھنا بیکار تھا۔"

"ماں ایسی صورت میں باہر جا کر کیا کریں گی؟"

"اپنے داماد کے پیسے کو پر لگائیں گی۔"

"تین چار آدمیوں کے جانے میں خرچ تو کافی ہوگا؟"

"ہاں! تم یوں فکر کرتی ہو۔ کسی طرح پورا ہو ہی جائیگا۔ میری بھی خواہش ہے وہ دور ہو جائیں۔ مجھے بھی کچھ راحت مل جائیگی۔"

چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اُنھوں نے سوال کیا "رانی! تم اِن تین دنوں میں کچھ تبدیل ہو گئی ہو۔"

"نہیں تو۔"

"تمھاری گفتگو میں اب وہ آزادانہ رنگ نہیں ہے۔"

میں کس طرح کہتی کہ آپ کی محبت نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے۔ میری زندگی بدل گئی ہے۔

"تم ماں سے ملنے نہ جاؤ گی؟"

"کیا وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟"

"نہیں۔"

"میرے خیال میں تو اُنھیں میری صورت سے بھی نفرت ہے۔ چاندی کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے میری پیدائش کے بعد مجھے اپنا دودھ بھی نہیں پلایا۔ کیونکہ میں کالی تھی۔ اور اُنھوں نے میری پیدائش کے بعد مجھے چاندی کے حوالے کر دیا تھا۔"

"بہت اچھا ہوا رانی! ورنہ تمھارے خون میں بھی وہی عادتیں پرورش پاتیں

شری پات شیورا یا چوگلے

شری پات شیورا یا چوگلے ۸ مئی ۱۹۰۸ء میں اچل کرنجی ستی کولہاپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم سیتا گاؤں، پونا اور بمبئی میں ہوئی تھی۔ ایک سال تک انھوں نے ایڈنبرا میں رہ کر بھی مطالعہ کیا تھا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۱ء تک وہ مختلف تعلیمی اداروں کے صدر رہے اور اب کستور با ٹیچرز کالج سانگلی کے پرنسپل ہیں۔

اُن کی واحد تصنیف "بالکاچی ابا" (زمیندار کی بیٹی) مراٹھی زبان میں بہت مشہور ہے۔ اور جس طرح اُردو میں پطرس بہت ہی قلیل ادبی سرمایہ کے باوجود مقبول اور مشہور ہوئے اسی طرح چوگلے بھی صرف اسی ناول کی بدولت مراٹھی ادیبوں کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔

اس ناول میں انھوں نے دیہی ماحول کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کی غلاظت، جہالت، اُن کا بھولا پن اور سادگی کی عکاسی میں انھیں پوری کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

اس ناول کا ہیرو دیال ایک اچھوت خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن اپنی محنت و جانفشانی کی بدولت وہ مناسب تعلیم حاصل کر کے گاؤں کے اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنایا جاتا ہے اور وہاں اپنے فرائض جس خوبی سے انجام دیتا ہے اسی کا حصہ ہے۔ ہیروئن کنول جو ایک زمیندار کی بیٹی ہے اور مذہب کے لحاظ سے جینی ہے اپنی تمام تنگ نظری ترک کر کے زندگی کا صحیح نصب العین طے کرتی ہے۔ اور اپنی تعلیم اور تجربہ سے گاؤں کے ان پڑھ لوگوں کی اصلاح کرنے کا بیڑہ اٹھاتی ہے۔ اور اپنی تمام زندگی اسی خدمت کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ یہ ہے ناول کا روشن پہلو لیکن گاؤں میں برائیاں بھی ہوتی ہیں۔ بھولے اور سیدھے دیہاتیوں کو لوٹنے کھسوٹنے والا گروہ پنڈت اور اس کے ساتھی بھی اس ناول کے کردار ہیں جنھوں نے اپنی ذلیل حرکتوں سے گاؤں کی فضا کو مکدر کر دیا ہے۔ لیکن مصنف نے ان متضاد کرداروں کو پیش کر کے اُن کی کشمکش دکھا کر باطل پر حق کی فتح دکھائی ہے۔

یہ ناول مراٹھی ادب کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

شری پات شیورایا چوگلے

مترجم:۔ نور نبی عباسی

زمیندار کی بیٹی

پوں... پوں... پوں

دور سے موٹر کی آواز آئی۔ اسے سنتے ہی مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ سبھی جانب سے لوگ فرطِ خوشی سے چلا پڑے "آ گئے۔ آ گئے!"

ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے۔ سامنے کی قطاروں میں بیٹھے ہوئے بچے اٹھ پڑے۔ ایک طرف بیٹھی ہوئی خواتین بھی اپنے ننھے منے بچوں کو سنبھالتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ سب کی نظریں دور سے آتی ہوئی موٹر پر جم گئیں۔ اسی وقت ایک شخص نے باآوازِ بلند ایک نعرہ لگایا اور سب لوگوں نے اس کا ساتھ دیا۔

"جٹا شنکر مہاراج کی......"

"جے!"

"جٹا شنکر مہاراج کی......"

"جے!"

"جٹا شنکر مہاراج کی......"

"جے!"

مگر لوگوں کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ موٹر جب قریب آئی تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ مہرشی جٹا شنکر کی موٹر نہیں ہے۔ بلکہ سانگلی جانے والا مال کا ایک ٹرک ہے۔ تب تو سبھی ہنس پڑے اور پھر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے لگے۔ کسی قدر خاموشی ہونے کے بعد بچوں کے کھیل کود اور موسیقی کا پروگرام دوبارہ شروع ہو گیا۔ جس سے کہ مہرشی جٹا شنکر کے آنے تک جلسہ میں مجمع لوگوں کی تفریح ہوتی رہے۔

عوام اپنی تفریح میں محو تھے۔ مہرشی ابھی تک تشریف نہیں لائے ہیں۔ تب تک چلئے میں اپنے قصبہ سے آپ کو متعارف کروا دوں۔

یہ دھرم پور ہے، میرا گاؤں ہے۔ پارس کے چھونے سے تو صرف لوہا ہی سونا ہوتا ہے، مگر لفظ "میرا" جس چیز کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے وہ سونے سے بھی زیادہ خوبصورت اور قیمتی دکھائی دینے لگتی ہے۔

لوگ جس بچہ کو کالا کلوٹا اور گندہ سمجھنے لگتے ہیں وہی بچہ اپنی ماں کو پھول ایسا خوبصورت نظر آتا ہے اور وہ اُسے "میرا بیٹا" کہہ کر بڑے پیار سے خوب چومتی رہتی ہے۔ اس کے بچہ کو دیکھ کر دوسرے لوگ نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں مگر لفظ "میرا" کی وجہ سے وہ ماں ان بوسوں میں بھی لطف محسوس کرتی ہے۔

میری بھی یہی کیفیت ہے۔ دھرم پور کے لئے میرے دل میں عزت ہے۔ محبت ہے اور اس پر ناز بھی۔ یہ ایک نہایت قدیم مقام ہے اور اس کے پیچھے ایک ہزار سال کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ یہاں کی صاف فضا، ہاضم پانی اور دلکش قدرتی مناظر کی خوبصورتی کو دیکھ کر کولہاپور کے شلاہار خاندان کے ایک جینی راجہ کی رانی نے اس جگہ ایک چھوٹا سا گاؤں بسانے کی ضد کی تھی اور اپنی محبوب رانی کی ضد پوری کرنے کیلئے اس راجہ نے نویں عیسوی صدی میں یہ دھرم پور گاؤں بسایا تھا۔ رانی نہایت مذہبی تھی۔ اس کے روزمرہ کے پوجا پاٹھ کے لئے راجہ نے ایک عالیشان جین مندر بھی بنوا دیا جو آج تک اس میدان کے قریب واقع ہے جہاں جلسہ منعقد ہونے والا ہے۔ اس جین مندر میں کانڈی زبان میں لکھے ہوئے جو متعدد شلالیکھ ہیں وہ آج بھی اس تاریخ کی شہادت دے رہے ہیں۔ جین مندر کے گنبد دیکھئے گویا وہ اس کا ہاتھ ہے جسے وہ فلک کی جانب اٹھا کر اس تاریخ کی شہادت دیتے ہوئے کہہ رہا ہے۔ "میں نے متعدد انقلابات دیکھے ہیں۔ کئی انسانی پیڑھیاں آئیں اور چلی گئیں۔ سب کا انجام موت ہوتا ہے"

دھرم پور میں جینیوں کی ہی آبادی زیادہ ہے اور اس قدیم جینی مندر کے آس پاس ہی ان کے مکانات واقع ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں جینیوں کا خاص پیشہ کاشتکاری ہے۔ زمانہ قدیم سے یہ لوگ دھرتی ماتا کی خدمت بڑے خلوص اور ایمانداری سے کرتے آ رہے ہیں۔ اور یہاں بھی ان پر ہمیشہ لکشمی دیوی مہربان رہی ہے۔ آپ ان محنتی کسانوں کو

صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دیکھیں گے۔ صبح تیوہار ہو، چھٹی ہو ـــــ کچھ بھی ہو کسانوں کی یہ خدمت بند نہیں ہوتی۔ اس خدمت میں کوئی کمی نہ ہو اس لئے بعض لوگوں نے تو اپنے رہنے کے مکان بھی کھیتوں اور باغیچوں میں ہی بنا لئے ہیں۔ یہ کالی ماتا جب تک نہ یہ نہیں دیکھ لیتی کہ اس کے بیٹے اس کی خدمت انجام دیتے ہیں اپنے خون کا پسینہ کر ڈالا ہے، تب تک وہ خوش نہیں ہوتی اور نہ ہی موتی کے مانند اناج کے دانے دیتی ہے۔ میرے گاؤں کے تمام کسان اپنی کالی ماں کی خدمت میں اپنے خون کا پسینہ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ان سے خوش رہتی ہے، اور انھیں پیار کرتی ہے۔ یہاں کے جینیوں کے بارے میں ایک مثل مشہور ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کھیتی جینی ہی کرتے ہیں اور پھر سونے سے اپنی تجوری بھرتے ہیں۔ اور یہ مثل بالکل سچ ہے۔

مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ محنتی اور دبنگ ہیں۔ صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہو کر گھر کی صفائی کرنا، دریا سے پانی لانا، دودھ دہنا، گایوں کی خدمت کرنا، کھانا پکانا، کھیتوں پر کھانا پہونچانا، دریا پر کپڑے دھونا، بعض اوقات کھیتوں پر کام کرنے بھی جانا ـــ فصلوں کو پانی دینا، بازار ہاٹ کرنا، شام کے وقت جین مندر میں جاکر "بھران"، سننا اور بچوں کو سنبھالنا وغیرہ متعدد کام وہ کس طرح کر لیتی ہیں یہ دیکھی جائیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کے ان سب کاموں میں تنظیم، صفائی اور خلوص خصوصاً پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سانگلی کے بازار میں دھرم پور کی چیزوں کو ـــ خصوصیت سے مکھن کو دو پیسے زائد میں خریدا جاتا ہے۔

جینی بیواؤں کے کام تو بالخصوص قابلِ ذکر ہیں ـــ گھر گرہستی کو کفایت شعاری سے چلانے میں یہ مہارت رکھتی ہیں۔ یہ اپنے کسی عزیز کے ہاں رہتی ہیں اور ان کی ازدواجی کاموں میں سرگرمی سے امداد کرتی ہیں۔ ان کے جسم پر ایک صاف سفید کپڑا ہوتا ہے اور ہاتھ میں چاندی کے کنگن ہوتے ہیں۔ اس قسم کا جذبۂ ایثار رکھ کر خدمت کرنا انہیں کا حق ہے۔ جینیوں کی اصل تہذیب اپنی خواتین کی وجہ سے جن میں ایثار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، قائم ہے، پوجا پاٹھ۔ الپواس برت، بھران کی سماعت اور مختلف مذہبی رسومات وغیرہ اگر کوئی سچے دل اور خلوص سے ادا کرتا ہے تو وہ جینی بیوائیں ہی ہیں۔ مختصر یہ کہ ان سب باتوں کا مقصد ہوتا ہے ـــ ایثار، خدمت اور عبادت۔

ایشور نے دھرم پور کو جو ایک خاص عطیہ دیا ہے وہ ہے دریائے کرشنا۔ ہندوستان میں متعدد مرتبہ متعدد مقامات پر قحط پڑا۔ کئی مرتبہ پلیگ اور ہیضہ جیسے موذی امراض خوفناک طریقہ پر جانی بربادی کے باعث بنے۔ لیکن میرا دھرم پور ان سب غیبی تباہیوں سے آج تک بالکل اچھوتا رہا ہے۔ حالات جس طرح بدلتے گئے اس کے مطابق ہی یہاں کے جینی کسانوں نے دریائے کرشنا کے ساحل پر جگہ جگہ انجن اور پمپ لگا کر اپنی فصلوں کی آب پاشی کا بندوبست کر لیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر وہ اپنی زمین سے زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے میں معروف ہو گئے ہیں۔ اناج کے علاوہ وہ بڑھیا سے بڑھیا گڑ، ہلدی، مرچ اور تمباکو بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان کا سارا مال سانگلی کے بازار میں پہونچتا ہے اور اس پر گاہک ٹوٹ پڑتے ہیں۔

کیا گرمی، کیا برسات، کیا خزاں اور کیا سردی سبھی موسموں میں دھرم پور کے قرب وجوار کے علاقہ میں ہمیشہ ہریالی چھائی رہتی ہے۔ دور سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بڑے بڑے آم کے درختوں اور اونچے اونچے ناریل کے پیڑوں نے اس گاؤں پر ہری مخمل کا خوبصورت شامیانہ تان دیا ہے۔ اس گھنی ہریالی میں سے اوپر اٹھتی ہوئی یہاں کے قدیم جین مندر کی محراب بہت دور سے نظر آنے لگتی ہے۔ گاؤں کے مغرب میں بہنے والا دریائے کرشنا، اس کا خوبصورت اور شاندار پانی اور اس پانی میں متواتر اپنے قدم دھوتا ہوا لمبا چوڑا اور مرد عورتوں نیز بچوں سے بھرا پورا گھاٹ دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور اسے ایک ناقابلِ بیان اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ اس قسم کا سکون و اطمینان مہابلیشور اور شملہ ایسے ٹھنڈی آب و ہوا والے مقامات پر بھی میسر نہ ہوگا۔

تیرنے کے لئے پانی اور کشتیاں لڑنے کے لئے ریتیلا کنارہ دیکھ یہاں کے باشندوں کو کھلاڑی بنا دیا ہے۔ ملک میں ایسا کوئی بھی تیرنے کا مقابلہ یا کشتیوں کے دنگل نہیں ہوتے جس میں دھرم پور کے نوجوان جوش و خروش سے حصہ نہ لیتے ہوں۔ اگر میں کہہ دوں کہ ۱۹۴۲ء کے انقلاب میں حصہ لینے والے زیادہ سے زیادہ انقلابی ہیرو یہیں کے تھے تو میں سمجھتی ہوں اپنے گاؤں کے نوجوانوں کی بہادری کی مزید تعریف کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

دھرم پور کے خاص رہنما ـــ نہیں کہنا چاہیے دیوتا یہاں کے زمیندار شری سیوک رام جی ہیں جنہیں لوگ محبت اور عزت سے داداجی

کہتے ہیں۔ دادا جی کی عمر تریسٹھ برس کی ہو چکی ہے۔ مگر اس عمر میں بھی وہ ایک پچیس سال کے نوجوان کی طرح کام کرتے ہیں۔ ان کا گورا رنگ، شاندار چہرہ، سیدھی ناک اور گٹھا ہوا بدن دیکھ کر نوجوان بھی ان پر رشک کرسکتے ہیں۔ دادا جی کی پوشاک بالکل معمولی ہوتی ہے —— سر پر سفید پگڑی، بند کالر کا لمبا کوٹ، اس کے نیچے جنیؤ سے لٹکنے والا تلیوں کا گچھا، سفید اور صاف دھوتی، پیروں میں بوٹ، کندھے پر دوپٹہ اور ہاتھ میں ایک سونٹا۔ اس طرح کی پوشاک میں سفید مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور کاندھے پر پڑے ہوئے دوپٹے کو سنبھالتے ہوئے جب وہ پنچایت گھر کی جانب جاتے ہیں تو راستہ میں آنے جانے والی لڑکیاں وہ جب تک نکل جائیں، تب تک ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں اور آنے جانے والے مرد اپنی جگہ پر ایک لحظہ کے لئے رک کر انہیں ادب کے ساتھ سلام کرتے ہیں۔ بازار کے چورا ہے پر مچی ہوئی دھوم ایک دم خاموش ہو جاتی ہے اور پنچایت گھر میں بیٹھے ہوئے سب لوگ کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے ہیں۔ دادا جی کا سلوک بہت سخت اور صاف ہوتا ہے۔ وہ کسی کا ایک پیسہ بھی نہیں چھوتے۔ خوش نصیبی سے انہیں اپنی جائداد سے بیس ہزار روپے سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ وہ کسی کا ایک پیسہ بھی نہیں چھوتے۔ انہیں کوئی لت نہیں ہے۔ وہ مذہبی رسوم کے پابند ہیں۔ روز صبح سویرے غسل کرنے کے بعد وہ پہلے جینی مندر میں درشن کے لئے جاتے ہیں، اور پھر اپنے دوسرے کام شروع کرتے ہیں۔ سرکاری حکام بھی انکی تعظیم کرتے ہیں اور دادا جی کہتے ہیں۔ دھرم پور میں سرکار کے کام کے لئے معمولی سپاہی سے لے کر صوبے کے بڑے سے بڑے افسر دورہ پر آیا کرتے ہیں۔ دادا جی ان سب کی حسب مراتب خاطر مدارات کرتے ہیں۔ سرکاری کام کو انصاف کے ساتھ کرنے میں وہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ ان کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ رشوت تو وہ کبھی لیتے نہیں ہیں اور نہ کوئی انہیں کچھ لالچ دینے کی جرأت کرسکتا ہے۔ گاؤں کے گوپال ایسے چوٹی کے بدمعاش کو اور اس کے ساتھی شنکر، بابو، گنپت، بھیکو، بلا، ملا اور کلا وغیرہ غنڈوں کو ناکوں چنے چبا کر ہمیشہ کے لئے خاموش بٹھا دینا صرف دادا جی ہی کا حق تھا۔

ان کا عام طور پر طریقہ اور سلوک بھی محبت اور سخاوت سے پُر ہے۔ غریبوں کا دکھ دور کرنے میں وہ ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ کسی کی بیماری کے لئے، کسی کو شادی کے لئے، کسی کو تعلیم کے لئے آج تک نہ جانے کتنے غرباء کو ان کی امداد حاصل ہوئی ہے۔ ایسے کاموں میں وہ ذات پات اور مذہب کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ صرف انسانیت کو دیکھتے ہیں۔ لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق کام کرنے کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انہیں صحیح راہ دکھلانے میں دادا جی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

گاؤں میں جا بجا آپ جو اکھاڑے دیکھ رہے ہیں ان کی تعمیر میں دادا جی کا ہی ہاتھ رہا ہے۔ یہ انہیں کی ترغیب کا نتیجہ ہے کہ گاؤں کے کاشتکاروں نے اپنی فصل کی سینچائی کے لئے دریائے کرشنا کے پانی کا استعمال کیا ہے۔ گاؤں میں تیل کی گھانیاں اور دال کی ملوں کے قیام کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔ مختصر یہ کہ اپنے گاؤں کی سماجی، مذہبی، صنعتی اور اقتصادی ترقی کے لئے وہ دن رات کوشاں رہتے ہیں۔ ۱۹۴۲ء کے انقلاب میں سرکار اور عوام دونوں کو دادا جی کس طرح مطمئن رکھ سکے یہ وہی جانیں۔

دادا جی کا حافظہ نہایت قوی ہے —— گاؤں میں کن کن لوگوں کے ہاں کون کون مہمان آتے ہیں، کس کی بیٹی کہاں بیاہی ہے کس کی لڑکی کس لڑکے سے بیاہ کر اپنے گاؤں میں آئی ہے وغیرہ کسی قسم کی معلومات ہر وقت انہیں رہتی ہے۔ لوگوں کے گھریلو جھگڑوں کا وہ چند منٹوں میں ہی فیصلہ کردیتے ہیں اور دونوں فریقین کو خوش کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے آس پاس ہر وقت لوگوں کا جمگھٹا سا رہتا ہے۔

جینی سماج میں دادا جی کا بڑا اثر ہے۔ اس سماج کے لئے انہوں نے اپنی نجی جائداد میں سے پچاس ہزار سے بھی زیادہ روپے خرچ کر ڈالے ہیں۔ گاؤں کے جینی ان کی بے حد تکریم کرتے ہیں۔ دیگر ذاتوں کے لوگ بھی ان کی بات کو سو فیصدی صحیح جانتے ہیں۔ کوئی بھی لیڈر، انقلابی یا محب وطن بغیر ان کے مشورے کے کسی بھی کام کو شروع نہیں کرتا۔

انہیں دادا جی زمیندار کی میں بیٹی ہوں۔ میرے بعد ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس لئے میں ان کی اکلوتی اور بڑی لاڈلی بیٹی ہو گئی ہوں۔ ارے مگر یہ کیا؟ میں نے تو درمیان میں ہی اپنی کہانی شروع کر دی۔

میری ماں کا نام رتنا دیوی ہے۔ وہ میرے والد کے مقصد، مزاج اور طور طریقوں سے بالکل ہم آہنگ ہو کر سب کچھ کرتی ہیں۔ مرد چاہے نہ مانے مگر یہ بالکل سچ ہے کہ اس کی خواہش، اس کے کارنامے اور اس کا رعب اس کی بیوی پر ہی منحصر ہے۔ بیوی شوہر کی امنگوں کا سرچشمہ ہے۔ والد کے سبھی مقدس کاموں میں میری ماں نے صلاح دی ہے۔ ان کی

جو صنہ افزائی کی ہے اور ان کا ہاتھ بٹایا ہے۔

گاؤں کے سبھی لوگ میری ماں کو ماتا جی کہتے ہیں ـــــ گورا رنگ، اکہرا سڈول جسم، پیشانی پر کم کم کی بندی، گلے میں موتیوں کا ہار، ہاتھ میں سونے کے کنگن اور قیمتی، خوبصورت، ریشمی ساڑی میں ملبوس، ہاتھ میں چاندی کا برتن لے کر جب وہ مندر میں جاتی ہیں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکشمی دیوی خود ہی دیو لوک سے اتر کر ہمارے گاؤں میں نازل ہو گئی ہیں۔ اسے دیکھ کر گنہگاروں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور شرم سے ان کا سر جھک جاتا ہے۔

میری ماں نیک دل اور مذہب کی پابند ہے۔ گذشتہ بیس تیس برسوں میں یہاں کے قدیم جین مندر میں متعدد جشن کرائے ہیں۔ مہاویر جینتی اور دیگر تیوہاروں کے موقع پر جشن جتنے ٹھاٹھ باٹ سے ہمارے گاؤں میں ہوئے ہیں ویسے دوسری جگہ شاید ہی کہیں ہوتے ہوں۔ جین مندر میں اگر کبھی کسی چیز کی کمی ہوتی ہے اور پجاری اگر اس طرف میری ماں کو متوجہ کر دیتا ہے تو دوسرے ہی روز کمی پوری ہو جاتی ہے۔ جین مندر میں دگمبر منی، مجرد، کتھا واچک، بھجن منڈلی وغیرہ کوئی نہ کوئی ہمیشہ آتے رہتے ہیں اور میری ماں ان سب کے ٹھہرنے، کھانے اور دوسرے پروگراموں کا موزوں و مناسب انتظام کرتی ہیں اور ان کے رخصت ہوتے وقت انہیں مناسب رخصتی تحفے بھی دیتی ہیں۔ جب تک منی کا کھانا نہیں ہو جاتا تب تک وہ خود پانی بھی نہیں پیتیں۔ سخت سے سخت برت اور اپواس کرنا کوئی میری ماں سے سیکھ لے۔ ایشور، دھرم شاستر وغیرہ میں جتنا ایمان میری ماں رکھتی ہیں اتنا شاید ہی کوئی رکھ سکتا ہو۔ آگرہ، گرنار، شکھر جی وغیرہ ہندوستان کے مقدس مقامات کی اس نے زیارت کی ہے۔

میری ماں ایسی اناج کی خیرات دینے والی شاید ہی کہیں ہوں۔ بھادوں مہینہ کی پونم کو ہر سال جین مندر سے پالکی نکلا کرتی ہے۔ اس جلوس میں جینیوں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سبھی ذاتوں کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ کوئی ڈھائی تین سو آدمیوں کا مجمع ہوتا ہے جس میں ہریجن بھی شامل رہتے ہیں۔ جلوس میں شامل سبھی لوگوں کو ماں گھر لے آتی ہیں اور انہیں مٹھائی کھلاتی ہیں۔ جب کوئی ہریجن بیمار پڑ جاتا ہے تو اس کے گھر والے اچار مانگنے ماں کے پاس آتے ہیں۔ تب انہیں اچار تو ملتا ہی ہے، ساتھ میں دو روٹیاں بھی مل جاتی ہیں۔ دسہرے کے دن شمالی ہندوستان میں شام کو نیل کنٹھ کی زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ درخت

کی پوجا کرتے ہیں اور اس کی پتیاں لا کر بڑی عزت کے ساتھ ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔ یہ پتیاں سونا کہلاتی ہیں۔ ہر سال دسہرے کے روز گاؤں کے سب لوگ ماں کو سونے کا پتا دینے کے لئے گھر آتے ہیں۔ جن میں ہریجن بھی ہوتے ہیں۔ ماں ان سب کے ہاتھوں سے وہ پتا بڑے پیار سے قبول کرتی ہیں اور سب کو مٹھائی کھلاتی ہیں۔ کتنے ہی لوگوں کو تو اس روز وہ اپنے ہاں سے بغیر کھانا کھلائے جانے ہی نہیں دیتیں۔ اس طرح ہمارے گھر کو دھرم پور کا سدا درت ہی سمجھیے۔

میری ماں بڑی رکھ رکھاؤ والی ہیں۔ سویرے بہت جلدی اٹھ جاتی ہیں اور رات کو قریب گیارہ بجے سوتی ہیں۔ صبح سے لے کر شام تک وہ کام میں لگی رہتی ہیں۔ گھر کے سب کاموں پر اور نوکر نوکرانیوں پر ان کی سخت نگرانی رہتی ہے۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں پھر بھی سب کا حساب وہ رکھتی ہیں۔ زمین سے کتنی پیداوار ہوئی اور کتنا خرچ ہوا یہ دیکھ کر ہی ان کے کام کاج ہوا کرتے ہیں۔

ان کے سارے کاروبار نقد ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی بھی کبھی ہمارے گھر اپنا قرض وصول کرنے آیا ہو یہ کسی نے نہیں دیکھا۔ قرض لینا تو وہ جانتی ہی نہیں ہیں۔ کسی ملازم یا ملازمہ سے غلطی ہو جانے پر اسے معاف نہیں کرتیں۔ پھر بھی انہوں نے کبھی کسی کے سامنے اپنی امیری کی شیخی نہیں بگھاری۔ غریبوں کی وہ ماں ہیں۔ ان کے لئے سایہ ہیں۔

میرے بعد ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میں ہی ان کی پہلی اور آخری اولاد ہوں۔ پھر بھی اس کی وجہ سے وہ کبھی مغموم نہیں ہوئیں۔ نہ ہی انہوں نے کبھی شکایت کی۔ بچہ حاصل کرنے کے لئے بیتاب دوسری عورتیں جس طرح نجومیوں، ویدوں اور سادھوؤں وغیرہ کے پیچھے چکر کاٹا کرتی ہیں اس طرح میری ماں نے کبھی نہیں کیا۔ وہ اپنی ہمسایوں سے اس سلسلہ میں اپنا جو خیال ظاہر کرتی تھیں اسے میں نے کئی مرتبہ سنا ہے۔ وہ کہتیں "ہماری پڑھی لکھی منی ہی ہمیں بیٹے کی طرح عزیز ہے۔ کسی غریب کو گھر داماد بنا کر لے آئیں گے تو بیٹے کی کمی دور ہو جائے گی۔"

میں منی ہوں۔ مجھے گاؤں کے لوگ منی کہتے ہیں۔ جس طرح میری ماں سارے گاؤں کی ماتا جی ہیں اسی طرح میں گاؤں بھر کی منی ہوں۔ میرا اصل نام کنول ہے، مگر وہ صرف لکھنے کے لئے ہی ہے۔ جب میں چھوٹی تھی تب ایک روز میں نے بھولے پن سے اپنی ماں سے پوچھا تھا ـــــ

"ماں۔ تم نے میرا نام کنول کیوں رکھا؟"

تب انہوں نے ہنس کر کہا تھا ـــــ

"اس لئے کہ جس طرح پانی میں رہتے ہوئے بھی کنول پانی سے بے نیاز رہتا ہے اسی طرح تو بھی ہے۔"

"اس کا کیا مطلب ہو تا ہے ماں؟" میں نے دوبارہ استفسار کیا۔

ماں نے جواب دیا ـــ "دنیا میں رہتے ہوئے بھی تجھے ایثار کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے۔"

"تمہیں یہ نام کیسے سوجھا؟" میں نے پوچھا۔

"پرانوں میں میں نے سنا تھا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"اور کیا میرا نام کنول رکھنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ میں کنول کی مانند حسین ہوں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

انہوں نے ہنس کر کہا ـــ "تو تو کنول کی طرح خوبصورت ہے اسی لئے تیرا نام کنول رکھا ہے۔"

تیئیس سال پہلے میرا جنم ہوا تھا۔ یہاں کے جین مندر کے مغرب میں راستہ کے اس پار جو بڑا مکان ہے، وہ ہمارا ہے۔ میں اس مکان میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ ماں اور باپ کی شادی کے نویں سال بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ ان کی پہلی اولاد ہونے کے باعث میری پیدائش کی خوشی میں ـــ میرے لڑکی ہونے کے باوجود خوشیاں اسی دھوم دھام سے منائی گئیں جس طرح لڑکے کی پیدائش پر منائی جاتی ہیں۔ لوگ مجھ سے بڑی امید کے ساتھ ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ جیسے لڈو میری پیدائش کے وقت کھانے کو ملے تھے ویسے تو اب تیری شادی کے موقع پر ہی ملیں گے۔

ایسا بھی نہیں کہ میں آہو چشم ہوں، اور نہ میری آنکھوں میں شراب کی مستی ہے۔ میرا چہرہ کنول سا بھی نہیں۔ اور نہ میرے چہرے کو چاند سے ہی تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ اہلیہ، دروپدی، تارہ اور مندودری جیسی عورتوں کے جو "پرانوں" میں مشہور ہیں مانند میں خوبصورت نہیں ہوں۔ سنسکرت یا پراکرت زبانوں کے ادب میں شاعروں نے خوبصورت عورت کا جو بیان کیا ہے اس کا مجھ پر اطلاق نہیں ہوتا۔ میں تو صرف اپنی ماں کا عکس ہوں ـــ اندر اور باہر سے بالکل ماں کی طرح۔ میری ماں نے اپنی خوبصورتی، عادات اور جذبات مجھے عطا کئے ہیں۔ ماں کی نرمی اور والد کی سختی کا امتزاج مجھے وراثت میں ملا ہے۔ ہمارے خاندان کی نرم دلی، ایثار، محنت، باقاعدگی اور حلیمی وغیرہ اوصاف مجھ میں آ گئے ہیں۔ میں ایک معزز خاندان کے زمیندار کی بیٹی ہوں۔

میرا بچپن لاڈ پیار میں گذرا۔ دولو اور اس کی بیوی بانیجا یہ دونوں ملازم میری دیکھ ریکھ کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ مجھے دودھ پلانے کے لئے ایک گائے خریدی گئی۔ والد صاحب نے میری پرورش میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ وہ میرے کپڑوں پر توجہ دیتے تھے، میرے کھلونوں میں دلچسپی لیتے تھے اور میں کیا کھاتی پیتی تھی اس کا وہ ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اگر مجھے ذرا کھانسی ہو جاتی یا کچھ سردی ہو جاتی یا جسم میں کچھ حرارت معلوم ہوتی تو سانگلی کا مشہور ڈاکٹر فوراً بلوایا جاتا تھا جب والد صاحب کسی کام کے سلسلے میں سانگلی، پونہ یا بمبئی جاتے تو میرے لئے ضروری چیزوں کی ایک فہرست تیار کر لیتے اور واپسی پر ان چیزوں کو اپنے ساتھ لانا کبھی نہ بھولتے تھے۔

بچپن سے ہی میں اپنی ماں کے ساتھ روزانہ بلاناغہ جین مندر جایا کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے میرے دل پر مذہبی رسومات کا جو اثر پڑا وہ اب تک قائم ہے۔ بچپن میں لاعلمی کے باعث میں اپنی ماں کی نقل کیا کرتی تھی۔ بھگوان کے قدموں میں ماں سرنگوں ہوتی تو میں بھی سرنگوں ہو جاتی تھی۔ آنکھیں موند کر ماں جپ کرتی تو میں بھی اس کے قریب بیٹھ کر اپنی آنکھیں موند لیتی تھی۔ مندر میں درشن کے لئے آنے والے دوسرے لوگ میری بھگتی کو دیکھ کر ہنس پڑتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ بیٹی اپنے ماں باپ کے بالکل موافق ہے۔

جب میں چھ سال کی ہوئی تو پڑھنے کے لئے اسکول جانے لگی۔ مدرسہ کے ابتدائی دنوں کی یاد میرے دل و دماغ پر آج تک قائم ہے۔ پہلے روز جب میں اسکول گئی تو میرے ساتھ مجھے اسکول پہونچانے کے لئے دولو بھی گیا تھا اور بانیجا بھی گئی تھی۔ مگر اسکول میں داخل ہونے وقت میں نے خوف سے رونا شروع کر دیا جو لوٹ کر گھر آنے پر ہی بند ہوا۔ اس کے بعد والد صاحب نے مجھے گھر پر ہی پڑھانا شروع کیا۔ دیش پانڈے نام کے ایک ماسٹر صاحب مجھے گھر آ کر پڑھانے لگے۔ دیش پانڈے ماسٹر بہت خوش مزاج شخص تھے۔ وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ انہوں نے میرے دل میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا جو آگے چل کر اس قدر بڑھا کہ بعض اوقات تو اسکول چھوڑ کر مجھے گھر آنے کی خواہش ہی نہ ہوتی تھی۔ دیش پانڈے ماسٹر فن تعلیم میں ماہر تھے۔ وہ دقیق سے دقیق مضمون کو اتنی اچھی طرح سمجھاتے تھے کہ طلبا کو اسے سمجھنے میں زیادہ وقت نہ لگتا تھا اور وہ اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے تھے۔ یہ خوبی بہت کم استادوں میں پائی جاتی ہے۔

میں خوب دل لگا کر مطالعہ کرنے لگی۔ جماعت میں میرا پہلا نمبر آنے لگا۔ گو وہ مدرسہ لڑکوں کا تھا پھر بھی وہاں کے سکریٹری کا کام میرے سپرد تھا۔ اس لئے پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر درسی کاموں میں بھی میں تیزی سے ترقی کرنے لگی۔ اسکول میں کسی مہمان کا استقبال کرنا ہو، کوئی جلسہ منعقد کرنا ہو یا کوئی جشن منانا ہو تو ان سب کا انتظام مجھے ہی کرنا پڑتا تھا۔ بارہ برس کی عمر میں میں نے مراٹھی کی ساتویں جماعت پاس کرلی۔ میں سارے سینٹر میں اول آئی تھی۔ مجھے اکیاسی فیصدی نمبر ملے تھے۔

اس غیر معمولی کامیابی کے باعث ہمارے خاندان کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ والد صاحب کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے بینڈ بجواتے ہوئے تمام گاؤں میں مٹھائی تقسیم کرائی۔ اسکول کی جانب سے میرے اعزاز کے لئے سارا گاؤں امڈ پڑا تھا۔ اس موقع پر کئی لوگوں نے مجھے انعامات دیئے اور تحائف بھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سمجھ رہے تھے کہ میری شادی ہو رہی ہے۔

ماں نے جین مندر میں پانچ روز تک پوجا کرائی۔ چھٹے روز گاؤں کے تقریباً دو سو معزز حضرات نے ہمارے گھر کھانا کھایا۔

مراٹھی اسکول کے ہیڈ ماسٹر شری دلیپ پانڈے نے، جین مندر کے پجاری نے اور گاؤں کے چند ممتاز شخصوں نے مل کر میری والدہ اور والد صاحب سے مجھے آگے پڑھانے کی درخواست کی۔ وہ کہنے لگے ”منی کو پڑھنے کے لئے سانگلی کے ونیتا آشرم میں بھیج دیجئے۔“ آگے پڑھنے کے لئے میں بھی بیتاب تھی لیکن میرے والدین مجھے آنکھوں سے دور نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ ان کے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ مگر بعد میں انہوں نے مجھے آگے پڑھانے کا فیصلہ کرلیا۔

دھرم پور سے سانگلی صرف دس میل دور ہے۔ میری ماں والد صاحب کے ساتھ سانگلی جا کر وہاں کے ونیتا آشرم کا انتظام وغیرہ دیکھ آئی تھیں۔ اور دونوں نے اسے پسند کیا تھا۔ میری آئندہ تعلیم سانگلی میں شروع ہوگئی۔ جس روز میں دھرم پور سے پہلی مرتبہ رخصت ہوئی تھی اس روز میری ماں کو، میرے والد کو اور مجھے بھی جو ملال ہوا تھا وہ ناگفتہ بہ ہے۔

میری زندگی کے آئندہ دس گیارہ برس بڑی سرعت سے گذر گئے۔ میں تعلیم یافتہ ہوگئی۔ بالغ ہوگئی۔ میٹرک کے امتحان میں میں اوّل نمبر پاس ہوئی۔ کالج کے ہر امتحان میں میں فرسٹ کلاس فرسٹ تھی۔ بی۔ اے ہوئی اور پھر ایم۔ اے کی ڈگری بھی حاصل کرلی۔

ہر امتحان ختم ہونے کے بعد میں دھرم پور آجایا کرتی تھی۔ نتیجہ گاؤں میں ہی آجاتا تھا۔ اور ہر نتیجہ کے وقت گاؤں کے لوگ میرے اعزاز میں ایک بہت بڑی تقریب کیا کرتے تھے جن سے ان کی خوشی اور خوشی ظاہر ہوتا تھا۔ سانگلی میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے میں صرف لمبی چھٹیوں میں ہی دھرم پور آیا کرتی تھی۔ درمیان میں میرے والدین سانگلی آکر مجھ سے مل آیا کرتے تھے۔

میں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے میں اردو، ماگدھی اور مراٹھی مضامین لئے تھے۔ دلیپ پانڈے ماسٹر کی وجہ سے مجھے مراٹھی سے محبت تھی جب میں مراٹھی مدرسہ میں تعلیم پاتی تھی تب میں نے مدرسہ کی لائبریری کی، اور دلیپ پانڈے ماسٹر صاحب کے گھر کی ساری کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ میری ماں کی سنگت کی بدولت جین مذہب، جین فلسفہ اور جینی ادب سے مجھے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی مراٹھی اسکول میں پڑھتے ہوئے ہی میں نے متعدد مذہبی کتب کا مطالعہ کرلیا تھا۔ ان کے علاوہ جین مذہب کی چھوٹی بڑی کئی کتابیں میں نے پڑھ ڈالی تھیں۔ میرا یہ شوق رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور میں نے ایم۔ اے کا امتحان دیا۔

بچپن سے ہی مجھے چونکہ شہرت اور وقار حاصل ہوگیا تھا اس لئے میرے مزاج میں کسی قدر سنجیدگی پیدا ہو رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اپنا وقار قائم رکھنا چاہتی تھی اور اس کے علاوہ میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے کہ وہ لوگ جو میری عزت کرتے ہیں مایوس ہو جائیں، یا میرے متعلق وہ کوئی غلط رائے قائم کرلیں، چنانچہ اس سلسلہ میں میں بہت محتاط رہتی آئی ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ والد صاحب کئی مرتبہ مجھے کہا کرتے تھے — ”منی تو حسب منشا جتنا چاہے پڑھ، کچھ بھی کر، کہیں بھی رہ مگر کبھی کوئی ایسا کام نہ کر جس سے تیرے خاندان، ذات اور مذہب پر داغ نہ لگے —“ تعطیلات میں جب میں گھر جاتی تو میری ماں بڑی سخت نظر سے دیکھتی رہتیں کہ کالج کی ہوا کے باعث میری چال میں، گفتگو میں، طور طریقہ اور عادات میں کہیں کوئی نامناسب بات تو نہیں آگئی ہے۔ مگر مجھ میں کوئی بات انہیں نہ ملی جس پر کہ وہ نکتہ چینی کر سکیں۔

جب میں ہائی اسکول اور کالج میں تھی تو بعض لڑکے مجھے اپنی بہنٹ کہا کرتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ انہوں نے مجھے اس خطاب سے کیوں سرفراز کیا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی نظر میں میں اپنی بہنٹ کی طرح قبیل

اور وقت بے باتیں سکھا دیتی تھی۔ کالج کی میری سہیلیاں مجھے "ستی ساوتری" اور دقیانوسی کہا کرتی تھیں۔ پھر بھی میں نے کسی کی پندار پروا کئے بغیر اپنی حدود سے باہر نہ گئی۔ اصلاح کے نام پر وہ جو چھچھورا پن کیا کرتی تھیں، وہ مجھے بالکل ناپسند تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ میں اسناد و بہات عام طور کی فقیر رہی تھی۔ پرانی بات اگر حقیقتاً بری اور معیوب ہو گئی ہے تو اسے ترک کرنے کے لئے میں ہر وقت تیار رہتی تھی۔ مگر میرا یہ عقیدہ تھا کہ اس کی جگہ جو نئی بات لائی جائے وہ موزوں و مناسب ہونی چاہئے۔

جینی سماج میں اتنی پڑھی لکھی میں ہی پہلی لڑکی ہوں۔ دھرم پور کی میری عمر کی کئی جینی لڑکیاں آٹھ چار پانچ بچوں کی ماں بن چکی ہیں۔ اور یہ محض اتفاق ہے کہ میں ابھی تک ان بیاہی ہوں۔

ویسے دیکھا جائے تو میرے والدین نے میری شادی کرنے کا کئی مرتبہ ارادہ کیا تھا۔ جب بھی کسی اچھے معزز گھرانے کا کوئی لڑکا مل جاتا تو میری ماں تو بس یہی چاہتی تھیں کہ میری شادی کر دیں۔ مگر میں نے انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ میں نے ایک مرتبہ جین مندر میں قسم کھائی ہے کہ جب تک میری تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی میں شادی نہیں کروں گی۔

"آخر اتنا پڑھ کر تو کرے گی کیا؟" یہ سوال صرف میری ماں یا والد ہی نہیں بلکہ گاؤں کے کئی لوگ مجھ سے کیا کرتے تھے اور میں انہیں یہ جواب دیا کرتی تھی ــــ

"ابھی پڑھائی تو مکمل ہو جانے دیجئے۔ پھر آگے کیا کرنا ہے اس بات پر بھی غور کر لوں گی۔" در اصل آئندہ کیا کرنا ہے، یہ میں خود طے نہیں کر پائی تھی، چنانچہ انہیں کیا جواب دیتی۔

لیکن ایم۔ اے پاس ہو جانے کے بعد دھرم پور کے عوام نے میرے اعزاز میں جو تقریب کی تھی اس میں تقریر کرتے وقت میں نے اپنا مقصد واضح الفاظ میں رکھ دیا۔ میں نے کہا ــــ

"میں نے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ میں اس لئے بھی نہیں پڑھی ہوں کہ اپنی گرہستی کے جنجال میں پوری طرح پھنس کر جو کچھ میں نے پڑھا ہے اسے بھلا دوں۔ میں لوگوں کو یہ دکھا دینا چاہتی ہوں کہ اگر موقع دیا جائے تو گاؤں کے لڑکے لڑکیاں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ فہم و فراست کا ٹھیکہ صرف شہر والوں کو ہی ہمیشہ کیلئے نہیں دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ دھرم پور میں ایک ہائی اسکول کھولوں اور اس ہائی اسکول میں میں خود تعلیم دوں۔ آپ لوگ آج تک میری جو عزت افزائی کرتے آ رہے ہیں اس کے صلے میں میں آپ کے لڑکے لڑکیوں کی حتی الوسع خدمت کروں گی۔ زندگی عیاشی کے لئے نہیں دیش و قوم پر قربان کرنے کے لئے ہے......"

اس کے بعد میں تارہ پور کے مہرشی جٹا شنکر کے پاس گئی جو ایک عظیم و مشہور شخصیت ہیں۔ گاؤں کے بعض معزز لوگ اور میرے والد صاحب بھی میرے ساتھ تھے۔ والد صاحب میرے اس خیال سے متفق تھے۔ ہم لوگوں کی درخواست پر دھرم پور میں ہائی اسکول قائم کرنے کے لئے مہرشی آج یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ جین مندر کے سامنے کھلی جگہ پر جو عظیم خیمہ لگا ہوا ہے وہ انہیں کا انتظار کر رہا ہے۔

قارئین! میں نے دھرم پور سے آپ کا کافی تعارف کرا دیا ہے۔ آپ یہاں کے خاص مقامات اور شخصیتوں سے واقف ہو گئے ہیں۔ پلیٹ فارم پر تشریف فرما میرے والد صاحب کو جنہیں سب لوگ دادا جی کہتے ہیں اور خواتین میں بیٹھی ہوئی میری ماں اور سب کی ماتا جی کو آپ پہچان لیں گے نا؟

ہاں، پر ادھر دیکھئے۔ مہرشی جٹا شنکر کی موٹر آ گئی ہے۔

"مہرشی جٹا شنکر کی......"

"جے!"

"مہرشی جٹا شنکر کی......"

"جے!"

۲

ہندوستان کی جنگ آزادی میں بلند ہونے والے نعروں کی طرح ساری فضا میں گونج پیدا کر کے جلسہ میں جمع لوگوں نے سارے دھرم پور کو ہلا دیا۔ مہرشی جٹا شنکر موٹر سے نیچے اترے۔ میں نے انہیں مجمع سے لا کر پلیٹ فارم پر بٹھا دیا۔ لوگ انہیں سلام کر رہے تھے۔ ان کے اسٹیج پر بیٹھتے ہی تالیوں کی زبردست گڑگڑاہٹ سے ساری فضا گونج اٹھی۔ لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ مہرشی جٹا شنکر کی شخصیت بہت عظیم ہے۔ ان کا شاندار جسم، سفید داڑھی، بڑی بڑی آنکھیں، لمبے بال، بلند اور صاف آواز نیز ان کا سفید کرتا اور دھوتی دیکھ کر عوام فوراً ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

پہلے مدرسہ کے بچے بچیوں نے دعا کی اور پھر استقبالیہ نغمہ ہوا۔ آج کے جلسہ کی صدارت کے لئے موزوں شخص گاؤں بھر میں دادا جی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ دادا جی سے درخواست کی گئی تھی مگر جلسہ میں ایک عظیم شخصیت

کے موجود ہونے کے باعث وہ کچھ جھجکے اور انہوں نے صدارت کی کرسی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے میں نے مہرشی کو پہلے سے ہی لے جا کر صدر کی کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ ان کی بائیں جانب ایک گورے رنگ کا کھدر میں ملبوس نوجوان بیٹھا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھی تھی۔ داہنی طرف دادا جی بیٹھے تھے۔ میں مہرشی کو سامعین سے متعارف کرانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ تالیاں بجیں۔ میں نے تقریر شروع کی ــــ

"مہرشی جٹا شنکر، مکرمی دادا جی، بہنو اور بھائیو!

مراٹھی زبان میں ایک ضرب المثل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عظیم انسانوں کی آمد سے اتنی خوشی ہوتی ہے جتنی کہ دیوالی دسہرے پر ہوتی ہے مگر میں کہوں گی کہ بڑے لوگوں کی آمد سے ہمارا نصیب جاگ جاتا ہے، یعنی جن لوگوں کے گھر میں سادھو سنت آتے ہیں ان کا نصیب جاگ جاتا ہے۔

آج ہمارے لئے بڑا مبارک دن ہے کہ مہرشی جٹا شنکر نے اپنی آمد مبارک سے ہمارے گاؤں کی سرزمین کو شرف بخشا ہے۔ قبل اس کے کہ میں یہ بتاؤں کہ مہرشی یہاں کیوں تشریف لائے ہیں۔ میں یہ بتلا دینا چاہتی ہوں کہ وہ کون ہیں۔ ہم سب نے ان کا نام سنا ہے، اخباروں میں ان کی تصاویر دیکھی ہیں اور ان کے کارناموں کے متعلق پڑھا اور سُنا ہے۔

مہرشی جٹا شنکر ایک معمولی کسان خاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔ آپ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ آپ نے کسی یونیورسٹی کی کوئی ڈگری حاصل نہیں کی ہے، مگر آپ نے اپنی کاوشوں سے کئی نوجوانوں کو سند یافتہ بنا دیا ہے۔ سمندر کو متھکر دیوتاؤں نے صرف چودہ جواہرات ہی نکال کر دنیاوی راحت میں اضافہ کیا تھا۔ لیکن آپ نے عوام کے بحر بیکراں کو متھکر اس میں سے متعدد ہیرے نکالے ہیں، جو آج بھی ان کے عوامی تعلیمی ادارہ میں اور دوسرے مقاموں پر جلوہ گر ہیں۔

مہرشی نے اپنی زندگی میں صرف دو مرتبہ ملازمت کی۔ چند دنوں تک آپ تحریک آزادی میں بھی حصہ لیتے رہے۔ مگر آپ کو اس سے پورا اطمینان نہ ہوا۔ اس کے ذریعہ وہ عوام الناس کی جس طرح خدمت کرنا چاہتے تھے نہ کر سکے۔ ان کو یقین کامل ہو گیا کہ تمام اصولوں کی جڑ تعلیم ہے۔ لہٰذا جب تک اس ضمن میں مناسب کام نہ کیا جائے گا تب تک ملک کی صحیح معنوں میں ترقی نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ وہ اس جڑ کو مضبوط کرنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ یہ کام معمولی نہ تھا کیونکہ ان کے پاس کوئی ذرائع نہ تھے۔ نہ سرمایہ تھا، نہ کچھ خاص قابلیت تھی اور نہ ہی ان کا کوئی پیرو تھا۔ تاہم انہیں اپنے جذبۂ ایثار، خلوص، لگن، خود کفالت اور سخت محنت پر پورا اعتماد تھا اور آپ نے اپنی انہیں خوبیوں کی بدولت مخالف حالات سے استقلال کے ساتھ مقابلہ کرکے ایک بہترین تعلیمی ادارہ قائم کر دیا۔ آپ کے اس ادارے کا نام ہے "عوامی تعلیمی ادارہ"۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام کئی پرائمری اسکول، ہائی اسکول اور مختلف قسم کے دیگر اسکول چل رہے ہیں۔ اور ان میں پچاس ہزار طلباء تعلیم پا رہے ہیں۔

آپ کے ادارہ میں ذات، مذہب اونچ نیچ کا کوئی لحاظ نہیں۔ وہاں امیر، غریب، ہندو، مسلمان، ہریجن وغیرہ سب ایک ہیں۔ ان کی تعلیم کا اصول ہے ــــ سب یہاں آؤ، کام کرو، خود کفیل بنو، کاہلی کو چھوڑو، تعلیم یافتہ بنو، انسانیت کو نہ چھوڑو۔ جب پوری طرح سے تعلیم حاصل کر لو تو یہاں سے جاؤ اور دوسروں کو تعلیم دو۔ مہاتما گاندھی سے لے کر تقریباً سبھی ذاتوں اور نظریہ کے لوگوں نے آپ کے اس تعلیمی ادارے کی جی کھول کر تعریف کی ہے۔ جینی انہیں مہاویر کا اوتار مانتے ہیں۔ "لنگایت" انہیں ہیرو سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کیلئے آپ پیر ہیں اور دوسرے لوگ آپ کو بدھ، عیسیٰ مسیح اور بھگوان کرشن کی طرح انسانیت کا پرستار سمجھتے ہیں۔

آپ نے ہر ممکن کوشش کرکے علم کا دریا عام عوام میں بہایا ہے اور اس کی نہریں اور دھارے وادیوں، جنگلوں اور گاؤں تک پہنچا دیئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ علم کے اس دریا کا ایک دھارا یہاں بھی بہے اسلئے ہماری درخواست پر آپ آج یہاں تشریف لائے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ کے ادارے کی ایک شاخ ہمارے گاؤں میں بھی قائم کر دی جائے۔ ہم لوگ آپ کی ہر طرح سے امداد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ میں خود اس اسکول میں بغیر معاوضہ کے پڑھانے کے لئے تیار ہوں۔ حضرات! تعلیم ہی ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان کو انسانیت نصیب ہوتی ہے۔ یہ تعلیم بہت گراں ہو گئی ہے۔ جہالت، غربت اور روزافزوں گرانی کے باعث معاشرہ کی نچلی تہہ تک یہ پہنچتی ہی نہیں ہے۔ آج ہم آزاد ہیں مگر عدم تعلیم کے سبب ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ آزادی کیا چیز ہے اور اس کی کیا قیمت ہے۔

حضرات! آپ سب لوگوں کی طرف سے میں مہرشی سے ایک مرتبہ پھر یہ گذارش کرتی ہوں کہ وہ اپنے ادارے کے زیر اہتمام ہمارے دھرم پور میں

ایک ہائی اسکول جلد از جلد قائم کرکے ہمیں ممنون فرمائیں۔ آپ لوگ مہر شمی کے تقریر اور ان کے ہمت افزا الفاظ سننے کے لئے بیتاب ہو رہے ہیں۔ لہٰذا میں مہر شمی سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ ہم لوگوں کو اپنی تقریر سے محظوظ فرمائیں۔"

اتنا کہہ کر میں اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ میرے بیٹھتے ہی تالیوں کی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ غالباً وہ ایک دوسرے سے اپنے گاؤں کی قابلِ فخر چیزیں بیان کر رہے تھے۔ کہ ان کے گاؤں کے جلسے میں تقریر کرنے والے صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی ہیں۔ مگر مہر شمی جٹا شنکر کے کھڑے ہوتے ہی یہ سرگوشیاں بند ہو گئیں۔ تقریر سے پہلے اس عظیم الشان ہستی کو دیکھ کر سامعین نے تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ اور پھر خاموش ہو کر یکسوئی سے اُن کی تقریر سننے لگے۔ مہر شمی نے کہا۔

"دھرم پور کے معوشن دادا جی، ان کی صاحبزادی، بہنو اور بھائیو! میں آپ کے پاس ووٹ کی بھیک مانگنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ میں سیاسیات میں حصہ لینے والا محب وطن نہیں ہوں۔ میں کوئی سرکاری افسر بھی نہیں کہ آپ کے پاس زیادہ اناج پیدا کرنے کا یا زیادہ لیوی (ٹیکس) دینے کا کوئی حکم یا پیغام لے کر نہیں آیا ہوں —— میں یہاں حاضر ہوا ہوں صرف آپ کی خدمت کرنے کے لئے۔ میں تو عوام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔

دادا جی میرے بہت پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ جب جب مجھے جیسی کھانا کھانے کی خواہش پیدا ہوئی ہے تب تب میں دادا جی کے گھر آیا ہوں۔ ان کی اہلیہ رتنا دیوی سے میں بخوبی واقف ہوں۔ دادا جی کی اکلوتی تعلیم یافتہ بیٹی مجھے بچپن سے پہچانتی ہے۔ بچپن میں وہ میری داڑھی دیکھ کر ڈرتی تھی۔ لیکن آج صرف مجھے ہی نہیں بلکہ گاؤں کے کسی بھی مرد سے نہ ڈر کر اس نے آپ لوگوں سے مجھے متعارف کرا دیا ہے۔ اس نے اپنی تقریر میں مجھ سے یہ گذارش کی ہے کہ میں اپنے ادارے کے زیرِ اہتمام دھرم پور میں ایک ہائی اسکول قائم کر دوں۔ قبل اس کے کہ میں اپنی تقریر شروع کروں میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ جہاں آپ جیسے جوشیلے اور سچے کارکن موجود ہوں وہاں ایک کیا میں دس ہائی اسکول کھول دوں گا۔

حضرات! ہمارے گاؤں گاؤں ہی رہے اور شہروں نے سرعت سے ترقی کر لی۔ شہر بجلی کی روشنی سے جگمگانے لگے، مگر دیہات میں تاریکی ہی رہی۔ شہر کے لوگوں نے کارخانے کھول دیئے اور گاؤں کے لوگ مزدور ہی بنے رہے۔ شہر کے لوگ وکیل، ڈاکٹر اور تاجر بنے اور ان کے مؤکل، مریض اور گاہک ہونا گاؤں والوں کی قسمت میں بدا ہے۔ شہریوں نے تعلیم حاصل کی تو دیہاتی بے پڑھے ہی رہے۔ اس لئے شہریوں نے گاؤں والوں کی جہالت سے فائدہ اٹھایا اور وہ رئیس ہو گئے۔ جبکہ گاؤں کے لوگ غربت کے غار میں ہی دبے رہے۔ گاؤں کے کسان سال بھر سخت مشقت کرنے کے باوجود بھوکے رہتے ہیں۔ یہ حالت ہو گئی ہے۔ جب تک ہماری جہالت دور نہیں ہوتی تب تک ملک کی ترقی ممکن نہیں۔ اس لئے میرے خیال سے ملک کے سامنے آج پہلا اور اہم سوال تعلیم کا ہے۔ ہمارے ملک میں نوے فیصدی لوگ جاہل ہیں۔ ان سب کو تعلیم دینا حکومت کا اور عوام کا اولین فرض ہے۔ سوراج کا آفتاب طلوع ہو گیا ہے۔ لیکن ہمارا یہ اندھا سماج اس کی روشنی کو کیسے دیکھ سکتا ہے۔

مہاتما گاندھی کہتے ہیں گاؤں میں چلو۔ میں کہتا ہوں گاؤں میں ہی رہو۔ گاؤں کے لوگوں کو گاؤں میں ہی پڑھنا چاہیئے۔ گاؤں میں ہی صنعت و حرفت کو فروغ دینا چاہیئے اور وہیں رہنا چاہیئے۔ اگر گاؤں کے دانشور —— باہر شہر میں چلے جائیں تو گاؤں کی نشو و نما کیسے ہو گی۔ شہر میں ہونے والے سدھار گاؤں تک کیسے پہنچیں گے۔ شہر میں ہونے والی اصلاحات کسی قانون کے ذریعہ گاؤں میں نہیں لائی جا سکتیں۔ نہ سرکار ہی یہ کام کر سکتی ہے۔ یہ مسئلہ گاؤں والوں کا ہے اور انہیں ہی اسے حل کرنا پڑے گا۔ دادا جی زمیندار نے اپنے گاؤں میں اکھاڑے کھولے ہیں۔ تیل کی گھانیاں قائم کی ہیں۔ دال کی ملیں کھولی ہیں۔ زراعت کو فروغ دیا ہے اور آج یہاں ایک ہائی اسکول کھولنے کے لئے ہم سب جمع ہوئے ہیں۔ اس اسکول کو میں یہاں کے نہایت مقبول رہنما دادا جی کا ہی نام دینے والا ہوں۔ دھرم پور کا ہائی اسکول دادا جی ہائی اسکول کہلائے گا۔

صاحبان! ایسے ہائی اسکول گاؤں گاؤں میں قائم ہونے چاہئیں۔ وہ گاؤں کے لوگوں کے لئے ہی اور گاؤں کے لوگوں کے ذریعہ چلائے جانے چاہئیں۔ ان مدرسوں کے ذریعہ گاؤں کی مذہبی، صنعتی اور سماجی باتوں کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ زندگی اور تعلیم کو ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اس کام کے لئے گاؤں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جوش و خروش اور جذبۂ ایثار کے ساتھ کمربستہ رہنا چاہیئے تبھی ہمارے ملک کا نصیب جاگ سکتا ہے ورنہ نہیں۔

ہمارا ادارہ گذشتہ پچیس تیس برس سے عوام کو تعلیم دینے کا کام

کر رہا ہے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ اور گاؤں میں رہنے والے کسی بھی ذات کے لڑکے لڑکیاں بھی اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ کامیاب طلبا کی فہرست میں انہیں رول نمبر بھی مل سکتا ہے۔ ہمارے ادارہ کے کئی طلبا آج انگلستان اور امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہمارے ادارہ کی کئی شاخوں میں آج پچاس ہزار طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔ اور ہمارا سالانہ بجٹ پندرہ لاکھ روپے ہے۔ ویسے ہمیں سرکار سے کچھ امداد مل جاتی ہے۔ لیکن ہمارا سارا دارومدار خاص طور پر خود کفالت پر ہے۔

میرے نزدیک بیٹھا ہوا نوجوان میرا ایک محبوب طالب علم ہے اس کا نام ہے اندرجیت دیال، یہ ہریجن ہے۔ بچپن سے ہی اس نے ہمارے اسکول میں تعلیم پائی ہے اور ہمارے ہی اسکول سے وہ بی۔اے، بی۔ٹی ہوا ہے۔ اس نے ہمارے ادارہ میں چار پانچ سال تک ہیڈ ماسٹر کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ ایک سال تک آپکے دھرم پور ہائی اسکول کے یہی ہیڈ ماسٹر رہیں گے اور آپکی منی دیوی ان کی معاون رہیں گی۔ ایک سال کے بعد دیال جی مزید تعلیم کے لئے ولایت روانہ ہو جائیں گے تب منی دیوی ہی آپکے اسکول کی ہیڈ مسٹریس بن جائیں گی۔

حضرات! آپ لوگوں نے مجھے اپنی خدمت کا جو موقع دیا ہے اس کے لئے میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ آج سے ایک مہینے کے اندر یعنی مارچ کے مہینے سے آپکے ہائی اسکول کا کام شروع ہو جائے گا۔ ہائی اسکول آپکا ہے، آپ ہی اس کے مالک ہوں گے۔ آپ ہی کے لڑکے اس میں پڑھیں گے۔ آپ کو اپنے لڑکے لڑکیوں کو اسکول میں بھیجنا ہوگا۔ اسکول کا سارا خرچ بھی آپ ہی کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس گاؤں میں جینیوں کی تعداد زیادہ ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ بہت امیر ہیں۔ انہیں اپنی اولاد کے لئے دولت جمع کرنے کی بڑی خواہش ہوتی ہے، مگر انہیں خیال کرنا چاہئے کہ اولاد کے لئے دولت جمع کرنے کے بجائے اُسے ان کی تعلیم پر خرچ کر کے انہیں زیادہ دولت کمانے کے قابل بنانا کہیں بہتر ہے۔ اس لئے تعلیم ایسے مقدس اور نیک کام کے لئے انہیں نہایت فیاضی کے ساتھ مالی امداد دینی چاہئے۔ مجھے پورا امید ہے کہ دھرم پور کے جینی اور دوسرے معزز حضرات اس وقت اپنی تھیلی کا منہ پورا کھول دیں گے۔ آپ لوگوں کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کر کے میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔"

مہرشی جٹاشنکر کی زوردار تقریر سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ ان کی تقریر کے درمیان میں سامعین نے کئی مرتبہ تالیاں بجائی تھیں۔ کبھی مرتبہ وہ ہنستے تھے اور کئی مرتبہ سنجیدہ بھی ہو جاتے تھے۔ تقریر ختم ہونے کے بعد چندہ دینے والوں کی فہرست تیار ہونے لگی۔ اور کئی لوگ اپنے اپنے چندے کی رقوم لکھانے لگے ---- کسی نے ہزار، کسی نے پانچ سو، کسی نے سو، کسی نے پچاس۔ اس طرح سب نے اپنی اپنی رقمیں لکھوا دیں اور چندے کی امداد تھوڑی دیر میں چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ آخر میں والد صاحب نے مہرشی جٹاشنکر کا شکریہ ادا کیا اور اپنی طرف سے دادا جی ہائی اسکول کے لئے دس ہزار نقد اور اپنا ایک بڑا مکان وقف کرنے کا اعلان کیا۔ اس طرح جلسہ کی کارروائی ختم ہوئی۔ لوگ ہائی اسکول کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ مہرشی، میں، والد صاحب اور دیال موٹر سے ہمارے گھر آئے۔

مہرشی کو ایک ضروری کام کے لئے فوراً تارہ پور واپس جانا تھا۔ چنانچہ جب میری کملا نے ان سے کھانے کے لئے درخواست کی تو انہوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا --- "اب تو ہم اپنا اسکول یہیں یہاں کھول رہے ہیں۔ اس لئے میں تو اب ہر روز ہی یہاں کھانا کھایا کروں گا۔ صرف آج کیلئے معاف کر دیجئے۔"

میں، مہرشی، دیال، والد صاحب اور گاؤں کے چند معزز لوگ ہمارے گھر میں میرے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ دوکو چائے لے آیا۔ ہائیجانے میز پر ناشتہ پہلے سے ہی سجا کر قاعدے سے رکھ دیا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اس کی ٹریننگ دے رکھی تھی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے مہرشی نے کہا ---

"دیال، تمہارا اسسٹنٹ تم سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں" دیال نے کہا۔

نہایت سادگی کے ساتھ دیال شیلف پر رکھے ہوئے اخباروں کے ان شماروں کو دیکھنے لگا جن میں میرے مضامین شائع ہوئے تھے انہوں نے الماریوں کے شیشے میں سے میری کتابوں کے ذخیرہ پر نظر ڈالی۔ پھر مہرشی سے کہا --- "گرو جی، ہمارے اسکول کی لائبریری تو پہلے سے ہی تیار ہے۔"

"آپ کے اسکول کے لئے والد صاحب نے دس ہزار روپے دیئے، ایک مکان دیا، گاؤں والوں نے چالیس ہزار روپے دیئے اور میں نے بغیر معاوضہ کے کام کرنا منظور کر لیا اور اس کے اوپر آپ کی نظر میری لائبریری پر بھی ہے۔ میں اسے نہیں دوں گی۔ وہ تو عورت کی دولت ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔

اس کے بعد مہر شی نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اب آپ ہمیں رخصت کیجئے۔ تین چار روز کے بعد دیال یہاں رہنے کے لئے آجائیں گے۔ تب تک آپ اسکول کی عمارت کی مرمت کرا دیجئے گا۔ رقم جمع کرا دیجئے۔ اسکول کے لئے ضروری فرنیچر خرید لیجئے اور ان سے کام شروع کرا دیجئے۔"

سب لوگوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چلو دیال"، مہر شی نے کہا۔

مہر شی اور دیال موٹر میں بیٹھے۔ ہم لوگ انہیں رخصت کرنے کے لئے گھر کے باہر کھڑی ہوئی ان کی موٹر تک گئے۔ موٹر کے ارد گرد لوگوں کی کافی بھیڑ لگ گئی تھی۔ ہم سب نے مہر شی کو سلام کیا اور مہر شی نے اس کا جواب دیا۔

میں نے دیال کی طرف دیکھا اور انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں دل ہی دل میں ہنس پڑے۔ موٹر اسٹارٹ ہو گئی، ہم لوگ واپس آگئے۔

رات کے نو بجے تھے۔ باہر سفید چاندنی چھٹک رہی تھی — میں دوسری منزل پر اپنے مطالعہ کے کمرے میں آئی اور بیٹھ کر اخباروں کے لئے آج کے جلسے کی رپورٹ لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ کھڑکی سے میں نے یونہی باہر جھانک کر دیکھا اور گیلری میں چلی گئی۔

باہر بڑا خوبصورت منظر دکھائی دے رہا تھا۔ دور تک پھیلا ہوا پہاڑ، درخت اور مکانات چاندنی میں ڈوبے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہوا اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ مغرب میں دریائے کرشنا کا ساحل درختوں سے ڈھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ مشرق کی جانب ہری فصلیں ہوا سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ ادھر میرے دل میں تھوڑی دیر پہلے سنی ہوئی مہر شی کی تقریر بڑی تیزی سے ہلچل مچا رہی تھی۔ گاؤں کی یہ خوبصورتی آج تک مجھے اتنی دلکش کبھی نہ معلوم ہوئی تھی۔ میں اس گاؤں میں چھوٹی سے بڑی ہوئی، سانگلی میں پڑھی اور کئی مرتبہ اس گاؤں میں آئی۔ مگر بہت زیادہ پہچان ہونے کی وجہ سے مجھے گاؤں کا یہ حسن کبھی نظر نہ آیا۔ اس کی قیمت کا میں اندازہ نہ لگا سکی۔ کیونکہ اس سے پہلے مہر شی ایسے کسی عظیم شخص نے میرے کان میں یہ بات کبھی کہدی تھی کہ شہر کی نسبت گاؤں قدرتی طور پر زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ اور انہیں ہر طرح سے خوبصورت بنانا چاہیے۔"

بہت دیر تک گیلری میں کھڑی ہوئی میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ خیالات کا تسلسل برابر جاری تھا۔ اسی وقت صحن میں ایک کتا رونے لگا۔ دو لو نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ میں کمرہ میں آئی اور رپورٹ لکھنے لگی۔ لیکن رہ رہ کر ایک خیال میرے دل میں جھانک جھانک رہا تھا کہ قدرتی مناظر کی خوبصورتی کو دیکھنا چھوڑ کر کتا رو کیوں رہا تھا؟

آدھی رات گذر جانے کے بعد میں اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ میرے دل میں یکے بعد دیگرے خیالات ابھرنے لگے — کبھی اپنے بارے میں خیالات اٹھتے، کبھی دیال کے بارے میں اور کبھی مہر شی کے متعلق۔ اس وقت میرا دل خیالات کی لہروں میں غوطے لگا رہا تھا۔ بادِ نسیم چلی، اور میری آنکھ کب لگ گئی اس کا مجھے پتہ تک نہ چلا۔

دن پر دن بیتتے جا رہے تھے۔ اسکول کا کام سرعت سے آگے بڑھ رہا تھا۔ والد صاحب نے مزدور لگا کر اسکول کی عمارت کی مرمت، صفائی اور روغن و سفیدی وغیرہ کا کام شروع کر دیا تھا۔ سانگلی جا کر مدرسہ کے لئے ضروری فرنیچر کا وہ آرڈر بھی دے آئے تھے۔ معمولی طور پر سو لڑکوں کے بیٹھنے کا بندوبست تو ہو گیا تھا۔ میں، والد صاحب اور گاؤں کے دو معزز صاحبان لوگوں سے چندہ وصول کرنے لگے۔

چار روز کے بعد اندرجیت دیال ایک صندوق میں اپنا سامان لے کر پہنچے۔ اس وقت والد صاحب گھر میں بیٹھے ہوئے گاؤں کے چند لوگوں کے جھگڑے فیصل کر رہے تھے۔ میں اٹاری پر اپنے کمرہ میں تھی۔ والد صاحب نے اندرجیت کا خیر مقدم کیا، اور مجھے آواز دی — "ممتی، ممتی!" میں نیچے آئی اور دیکھا تو دیال سامنے کھڑے ہیں۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا کر ہاتھ جوڑے۔

میں نے ان سے کہا — "آئیے اوپر میرے کمرہ میں چلئے۔"

انہوں نے کہا — "نہیں، ابھی اسکول میں ہی رہوں گا۔"

میں نے اور والد صاحب نے اصرار کیا کہ وہ ہمارے گھر پر ہی قیام کریں، مگر وہ نہ مانے۔ آخر کار دو لو انہیں اسکول لے گیا۔ تین چار روز تک ہم اپنے گھر سے ہی انہیں کھانا بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنا کھانا خود تیار کرنے لگے۔ ہمارے گھر کھانا کھانے کے لئے وہ کبھی نہ آئے۔ ہمارے گھر کبھی نہ آیا کرتے تھے۔ بعض اوقات میں ہی اسکول میں ان کے پاس چلی جایا کرتی تھی۔ انہوں نے ایک کمرہ میں اپنا آفس سجا لیا تھا اور

دوسرے کمرہ میں اپنے رہنے، سونے اور کھانا پکانے کا انتظام کر لیا تھا۔

ہم دونوں کبھی کبھی چندہ وصول کرنے ساتھ ساتھ جاتے۔ لوگوں کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی۔ ویسے بظاہر تو وہ لوگ اس کے متعلق کچھ نہ کہتے تھے مگر ان کے چہرے کے تاثرات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہم دونوں کو اس طرح ساتھ ساتھ رہتے ہوئے دیکھ کر خوش نہ تھے۔ جب ہم لوگ چندہ مانگتے تو بعض لوگ طرح طرح کے عذر پیش کرتے۔ کچھ لوگ آج دیں گے، کل دیں گے، کہہ کر ٹال دیتے۔ اور بعض لوگوں سے ملاقات ہی نہ ہو پاتی۔ کچھ لوگ آدھی ہی رقم دیتے اور باقی پھر دینے کا وعدہ کر دیتے۔ بعض لوگ ایسے بھی ملتے جو جاتے ہی پوری رقم دے دیتے تھے۔ اس سے مجھے اور دیال کو پورا تجربہ ہو گیا کہ سماجی کام میں کتنی محنت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسکول میں کبھی کبھی گاؤں کے لوگ بھی جا کر بیٹھ جاتے اور اس کے بارے میں کئی قسم کے استفسارات کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ وہاں بیٹھے بیٹھے پان اور تمباکو کھایا کرتے اور بیڑی پیا کرتے تھے۔ بعض لوگ محض گپ لڑانے کے لئے ہی آ جاتے تھے۔ گاؤں کے لڑکے اور لڑکیاں مجھے اور دیال کو گھیر لیتے اور کہتے ــــ "ہم بھی تمہارے اسکول میں پڑھنے کیلئے آئیں گے۔"

دیال کا روزانہ کا پروگرام گھڑی کی طرح وقت پر ہوا کرتا تھا۔ پو پھٹتے ہی وہ جاگ جاتے۔ دریا پر جا کر نہاتے اور اس کے بعد اپنا کھانا تیار کرتے اور اس کے بعد اسکول کا کام کرتے تھے۔ کتابیں اور اخبارات پڑھتے رہتے تھے۔ اور جب شام ہوتی تو گاؤں کے باہر ٹہلنے نکل جاتے۔ واپسی پر جین مندر میں جاتے اور دور کھڑے ہو کر درشن کرتے تھے۔ ان کی زبان بہت شیریں تھی جو دوسروں کو قابو میں کرنے کا کام کرتی تھی۔ سب سے ان کا سلوک محبت اور احترام کا تھا۔ اس لئے ذات کے اچھوت ہونے کے باوجود لوگوں کے خیالات ان کے لئے اچھے ہوتے گئے۔ ماسٹر بھلا ہے، کوئی ذات ہو ہمیں اس سے کیا سروکار، ہم تو اتنا چاہتے ہیں کہ وہ لڑکوں کو اچھی طرح پڑھاتا رہے۔ اس طرح لوگ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے۔

ایک روز میں اسکول گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ڈاکیا آ کر اسکول کی ڈاک دے گیا تھا۔ اور دیال اسے دیکھ رہے تھے انہوں نے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا جو کہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کے اندر سے خط نکالا اور پڑھنے لگی۔ وہ خط مندرجہ ذیل تھا ــــ

تارہ پور

۱۰ فروری ۱۹۴۸ء

پیارے دیال، دعائیں

دھرم پور سے واپس آتے وقت موٹر میں میں نے تمہیں اپنے کام اور ذمہ داری کا صحیح نقشہ بتا دیا تھا۔ پونہ سے یہاں واپس آنے پر مجھے معلوم ہوا کہ دھرم پور پہنچ گئے ہو۔ یہ مناسب ہی ہوا۔ جاتے وقت میں تمہیں کچھ اور بھی باتیں بتانا چاہتا تھا۔ ویسے تو تم خود ہی عقلمند اور سمجھدار ہو۔ پھر بھی میں نے خیال کیا کہ ایک خط لکھ ہی دوں اور تمہیں صورت حال سے آگاہ کر دوں تاکہ تم اپنا کام زیادہ کامیابی کے ساتھ انجام دے سکو۔ میری خواہش ہے کہ تم اس خط پر ٹھنڈے دل سے غور و خوض کرو اور اس کے مطابق عمل کرو۔

دھرم پور کے جلسہ میں تم خود بھی موجود تھے اور تم نے وہاں کے لوگوں کے جوش و خروش کو دیکھا تھا، پھر بھی تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ بھلے کے ساتھ برا بھی پیدا ہوتا رہتا ہے۔ نیک اور بد کی جنگ شروع ہوتی ہے اور جو زبر ہوتا ہے اسی کی فتح ہوا کرتی ہے۔ ہم نے اسکول قائم کر دیا ہے لیکن ہم اگر اپنے فرض اور ذمہ داری سے ذرا بھی ہٹے تو آئندہ کیا نتیجہ برآمد ہوگا اس کے متعلق آج ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لوگوں کو شک کے لئے ذرا بھی موقع نہ ملنا چاہئے۔ گاؤں کے لوگ پتھر کو دیوتا کہیں گے اور اس کی پرستش کریں گے۔ مگر جب ایک بار اس کے اوپر سے ان کا ایمان اٹھ جاتا ہے تو وہ اس دیوتا کو بھی پتھر سمجھ کر توڑ ڈالتے ہیں۔

دیال تم پر مجھے پورا اعتماد ہے اور اسی لئے دھرم پور کے نئے اسکول کا کام چلانے کے لئے میں نے تمہیں منتخب کیا ہے۔ تم سے میں بڑی توقعات وابستہ کئے ہوئے ہوں۔ میں اس غم میں گھلتا رہتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے بلکہ میری تو شب و روز یہی دعا ہے کہ تمہاری دن بدن ترقی ہو۔

دھرم پور میں سناتنی جینیوں کی کثیر تعداد ہے۔ ان جیسے پاک صاف لوگ تمہیں دوسری ذاتوں میں کم ملیں گے۔ تم یہ نہ بھولنا کہ ہریجن ہو، اچھوت ہو۔ ہم مساوات کا خواہ کتنا ہی پروپیگنڈہ کیوں نہ کریں پھر بھی جاہل ہونے کی وجہ سے گاؤں والے اس جذبہ کو جلد نہیں سمجھ پاتے اور نہ ہی اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اصلاح کا کام چیونٹی کی چال

کی رفتار نہایت سست رفتاری سے ہوا کرتا ہے۔ بلا وجہ تم کہیں نہ جایا کرو، تمہارے جانے سے اگر کسی کے جذبات برہم ہوگئے ہیں تو تم اس کے گھر ہرگز نہ جایا کرو۔ صورت حال دیکھ کر کام کرنا سیکھو۔

تم نے جین مذہب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ روز جین مندر میں جاکر درشن کر لیا کرو۔ جینیوں کے تیوہار پر انہیں چھوئے بغیر ان کے سامنے جین مذہب کے اوصاف بیان کرکے انہیں اپنے مذہب سے واقفیت کرایا کرو۔ بعد ازاں وہ تمہارا احترام کرنے لگیں گے اور پھر تمہیں جین سمجھنے لگیں گے۔

ایک اور اہم بات تمہیں تحریر کر دینا چاہتا ہوں ——— تم غیر شادی شدہ ہو۔ تمہاری معاون کنول بھی کنواری ہے۔ چنانچہ تمہیں ہمیشہ محتاط رہنا ہوگا۔ تاکہ تم پر کوئی کسی قسم کا شک نہ کرے۔ تم چاہو تو یہ خط کنول کو بھی دکھا سکتے ہو۔ جس کنول تمہاری مددگار رہے پھر بھی کسی طرح سے تکلیف نہ دینا۔ وہ ایک ہونہار لڑکی ہے۔ معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور تم سے زیادہ پڑھی لکھی ہے یہ نہ بھولنا۔ اس کی رائے کے مطابق سب کام کرتے رہو۔

دادا جی کے بارے میں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ ان سے بھی بعض اوقات مل کر صلاح مشورہ لے لیا کرو۔ علیمی اور اخلاق سے پیش آیا کرو۔ تم عقلمند اور سمجھدار ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ وہی کروگے جو مناسب ہوگا۔ پھر بھی میں نے تمہیں یہ خط لکھ دیا ہے تاکہ نئے کام کے جوش میں تم اپنے فرض کو نہ بھول جاؤ۔ دادا جی کو میرا سلام اور کنول کو دعا۔ امید ہے کہ تم ہمیشہ خط لکھ کر اسکول کی ترقی کی خبر دیتے رہا کروگے۔

تمہارا

جٹا شنکر

خط پڑھ کر میں نے دیال کو واپس دیدیا۔ وہ دوسرے خط پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "مہرشی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے۔"

ایک ہفتہ کے اندر ہی اسکول کا فرنیچر آگیا ——— بنچ، کرسیاں، سیاہ تختے، میزیں وغیرہ۔ سامان دو کمروں میں قاعدے سے رکھ دیا گیا۔ فی الحال دو جماعتوں کا ہی بندوبست کیا گیا تھا۔ کتابوں سے بھری ہوئی میری کچھ الماریاں بھی اسکول کی لائبریری کے لئے ایک کمرہ میں باقاعدہ رکھ دی گئی تھیں۔ سائنس پڑھانے کے لئے ضروری ساز و سامان بھی منگوا لیا گیا تھا۔ اب تک آٹھویں جماعت کے لئے سو طلباء کے نام درج ہو چکے تھے۔ پہلے تو ایک ہی جماعت رکھنے کا خیال تھا مگر طلباء کی تعداد بڑھ جانے کے سبب سے اس کے دو سیکشن کرنے پڑ گئے۔ پرائمری اسکول کے چند اساتذہ نے ہائی اسکول کی جماعت میں کچھ بعض مضامین پڑھانے کا بیڑہ اٹھا لیا۔

درمیان میں ایک روز میں نے دیال کو اپنے گھر چائے پر مدعو کیا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ ان کے انکار کا مطلب میں سمجھ گئی۔ اور میں نے انہیں راضی کرنے کی بڑی کوشش کی، مگر اس میں مجھے کامیابی نہ ہوئی۔

اب تک چندے کی نصف سے زیادہ رقم وصول ہو چکی تھی۔ والد صاحب نے فرنیچر اور سائنس کے آلات وغیرہ دے کر اپنے چندے کے دس ہزار پورے کر دیئے تھے۔

ماں اور دھرم پور کی دوسری جین خواتین کو یہ بات ہرگز پسند نہ تھی کہ ان کے ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر ایک اچھوت ہو۔ مگر اس امید پر کہ ایک برس بعد اس کا تبادلہ ہو جائے گا اور اس کی جگہ دوسرا کوئی اچھی ذات کا آدمی آجائے گا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کوئی خاص تنقید نہیں کی۔

اسکول کا کام شروع ہونے کے لئے صرف تین روز باقی رہ گئے تھے۔ میں اسکول گئی تھی۔ دیال اسکول کا ٹائم ٹیبل بنانے میں مصروف تھے۔ جب وہ مکمل ہو گیا تو اسے میری طرف بڑھا کر انہوں نے مجھ سے کہا۔
"دیکھیے تو آپ کو یہ پسند ہے یا نہیں؟"
"جو ہیڈ ماسٹر کو پسند ہے وہ نائب مدرس کو بھی پسند ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد لائبریری سے دو کتابیں لے کر میں گھر جانے کے لئے آفس سے باہر نکل رہی تھی کہ دو کو ڈاکخانہ سے گھر کی ڈاک لے کر وہاں آگیا۔ اسکول کی ڈاک میں نے دیال کو دیدی اور اپنی ڈاک دیکھنے لگی ——— دو خطوط تو میری سہیلیوں کے تھے جنہوں نے اخباروں میں دھرم پور کے جلسہ کی رپورٹ پڑھ کر مجھے مبارکباد دی تھی۔ تین خط ایڈیٹروں کے تھے جنہوں نے اپنے اخباروں کے لئے مضامین بھیجنے کی درخواست کی تھی۔ دو ہفتہ وار اخبار تھے اور تین ماہنامے تھے۔ ان کے ساتھ دو لفافے اور تھے۔ پتہ نہ چلا کہ وہ کس نے بھیجے تھے۔ میں نے انہیں

کھول کر دیکھا تو کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ مگر وہاں پاس ہی کئی بیٹھے تھے اسلئے منہ کچھ نہ بولی اور میں نے اپنے چہرے پر خوف کے کوئی بھی تاثرات پیدا نہیں ہونے دیئے۔ میں فوراً گھر کی جانب چل پڑی ——— جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی میں گھر پہنچی۔ اپنے کمرے میں جا کر میں نے ساری ڈاک میز پر پٹخ دی اور دھم سے چارپائی پر پڑ گئی۔

٣

اس روز رات کو مجھے اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ درمیان میں کئی مرتبہ جاگ کر میں گھڑی کی طرف دیکھتی تھی۔ نیم بیداری اور متعدد خیالات کے باعث میرا سر چکرا رہا تھا۔ کئی مرتبہ معمولی بات جو ہمارے روزمرہ کے مطلب کی ہوتی ہے ہمیں خاص اہم نہیں معلوم ہوتی مگر جب اس کی کمی ہو جاتی ہے تو وہ ہمیں بہت کھٹکنے لگتی ہے اور ہم اس کی اہمیت کو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ اس روز نیند کے متعلق میرا کچھ یہی حال تھا۔ چنانچہ میں نے نیند کی اہمیت کو منظور کر لیا۔ مریض کے لئے جس طرح دوا ہوتی ہے اسی طرح ہر جاندار کے لئے نیند ایک ایسی ہی قدرتی دوا یا معجون ہے۔

سویرا ہوا۔ مرغے نے بانگ دی۔ چکیاں پیسنے والی عورتوں کے سریلے گیت کان میں پڑنے لگے۔ گاؤں کے مویشی دریا اور کھیتوں کی جانب روانہ ہونے لگے۔ ان کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی میٹھی آواز سنائی دینے لگی۔ دریائے کرشنا میں نہانے والی اور پانی بھرنے والی لڑکیوں کی باتیں سنائی پڑنے لگیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ شروع ہو گئی۔ غرضیکہ حضرت شمس نے سب کو بیدار کر دیا اور کہا۔ اٹھو، ہماری فکر کرو، لگو اپنے کام میں۔

میری آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ میں نے منہ دھویا۔ اسٹو پر خود چائے تیار کر کے پی لی۔ قریب ہی میز پر پڑے ہوئے گمنام خطوں پر دوبارہ میری نظر پڑی۔ کل سے میں نے انہیں کئی مرتبہ پڑھا تھا۔ پھر بھی میں نے انہیں ایک مرتبہ اور پڑھا۔ دونوں خطوں کا مضمون ایک ہی تھا کہ ہمارے گاؤں سے اس چمار کو جلد بھگا دو۔ اگر تم یہ نہ کرو گی تو ہم وہی سمجھیں گے جو عموماً ہمیں سمجھنا چاہیئے۔ ساتھ ہی یہ بھی دھمکی دی گئی تھی کہ ہم ایک دن تمہارے اسکول کو......

تو تعت کیوں کروں؟ آگے کے الفاظ تھے۔ آگ لگا دیں گے۔ یہ خطوط کسی ایسے آدمی نے لکھے ہوں گے جسے دوسروں کے بنتے ہوئے کام کو بگاڑنے میں لطف آتا ہو گا۔ ان کے ساتھی بھی ضرور ہوں گے۔ کل سے میرے دل میں اسی قسم کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی اوپر سے خاموش نظر آنے والے سمندر میں آگ چھپی ہوتی ہے۔ یہ جملہ بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جلسہ میں بیٹھ کر بلند آواز سے نعرے لگا کر اور دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا کر ہمارے مقدس کام کی تعریف کرنے والے لوگوں سے ایسے خطوط مجھے کبھی وصول نہ ہوتے۔

ایک مرتبہ میرا جی چاہا کہ یہ خطوط والد صاحب کو دکھا دوں، مگر فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ والد صاحب جیسے صاف دل شخص کو دنیا کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھنا میں سکھا دوں۔ یہ مناسب نہیں۔ ان کے جوش کو ختم کرنا مجھے کچھ مناسب معلوم نہ ہوا۔ لہٰذا میں نے یہ طے کیا کہ شنکر جی نے جس طرح زہر خود ہی پی لیا تھا میں بھی اسی طرح یہ زہر پی کر ہضم کر لوں گی۔

دیال سے تو اس خط کے بارے میں ایک لفظ کہنا بھی مناسب نہ ہو گا۔ بعض معمولی باتیں ناقابلِ توجہ ہوتی ہیں۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ذکر کئے بغیر ہی انہیں ختم کر دینا پڑتا ہے۔ لہٰذا میں نے بھی ان خطوط کے متعلق یہی فیصلہ کیا۔ لیکن مجھے یہ خیال بار بار پریشان کر دیتا تھا۔ کہ زہر کی ایک بوند اور آگ کی ایک چنگاری بھی بہت بڑی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ ایک طرح سے میری سادہ لوح زندگی کا پہلا موڑ تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ایسے ہی کئی موڑ میری زندگی میں آئیں گے اور مجھے ان کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

میرا خیال تھا کہ ان خطوط کو ضائع کر دوں پھر میں نے سوچا کہ انہیں کسی محفوظ جگہ کیوں نہ رکھ دوں۔ اگر ہم اپنی آنکھیں بند کر لیں تو دنیا تھوڑی اپنی آنکھیں موند لے گی۔ تو کیا پھر ہمیں بھی اپنی آنکھیں کھول کر چلنا چاہیئے۔ بالآخر میں نے ان خطوط کو ایک مضبوط صندوق میں رکھ کر اس میں ایک ڈبل تالا ڈال دیا اور تہیہ کر لیا کہ اب نہ کبھی ان خطوں کو نکالوں گی، نہ پڑھوں گی اور نہ کسی کو دکھاؤں گی۔ مگر ہاں خطوط کو تالے میں بند کرنے سے پہلے میں نے کئی مرتبہ انہیں پڑھ لیا۔

اطلاع گذشتہ کے مطابق ہمارا اسکول یکم مارچ کو شروع ہو گیا تھا۔ آٹھویں جماعت کے دو سیکشن تھے۔ دونوں درجوں کو میں اور دیال ساڑھے گیارہ بجے سے لے کر شام کے ساڑھے چار بجے تک باری باری سے پڑھاتے تھے۔ درمیانی وقفہ کو چھوڑ کر مجھے یا دیال کو ان اوقات میں آرام بالکل نہ ملتا تھا۔

[illegible] سے پڑھا سکتے تھے اس لئے بچوں کا بہت [illegible]

[illegible] اسکول میں صرف نصاب پر ہی توجہ نہیں دی جاتی تھی بلکہ [illegible] [illegible] تھا کہ طلبا کی ہر طرح سے ترقی ہو۔ یہاں غریب ہمارے گاؤں کے بچے ہی نہیں پڑھتے تھے بلکہ دوسرے گاؤں سے آکر بھی چند لڑکے [illegible]۔ ایسے لڑکوں کے لئے اسکول کی عمارت کے ایک حصہ میں بورڈنگ ہاؤس بنا دیا گیا تھا۔ جہاں ان کے رہائش اور کھانے پینے کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ اسکول میں پڑھائی مختلف موضوعات پر دلچسپ اور مفید تقریروں کے علاوہ کبھی جلسے، کبھی تفریح کی دوسری تقریبات، کبھی پکنک اور کبھی کبھی جشن وغیرہ بھی منائے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ طلباء کو کبھی اسکول سے اکتاہٹ نہ ہوتی تھی۔

اسکول میں سب سے زیادہ کام کرنے کے باعث دیال کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اہمیت حاصل ہو گئی۔

دیال ہر مذہب کا احترام کرتے تھے اور جب بھی کوئی تیوہار ہوتا تو وہ اس تیوہار کی اہمیت پر تقریر کرنے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اور ان کی تقریر سن کر سبھی سامعین متاثر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ مہاویر جینتی کے موقع پر انہوں نے جو تقریر کی تو اس جلسہ کے مقرر خاص نے ان کا شکریہ ادا کرتے وقت یہاں تک کہہ ڈالا کہ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ جین مذہب کے متعلق ایسی تفصیلی، مناسب اور خوبصورت معلومات دینے والے آپ کے مقرر سچے جینی ہیں اور محض جینی کہلانے والے جینی ——— ہم لوگ اچھوت ہیں۔

در اصل دیال ہر لحاظ سے ایک عام جینی سے ہزار گنا بڑھ کر جینی تھے۔ مگر وہ جینی خاندان میں پیدا نہ ہوئے تھے۔ اور اس میں اس کا کیا قصور تھا۔

اور اگر ان کا جینی خاندان سے تعلق ہوتا تو . . . . .

تو کیا؟ میری ماں کی ہوس پوری ہو جاتی۔ انہیں حسب منشا ایک گھر جمائی مل جاتا۔ کون سی کمی ہے دیال میں؟ وہ خوبصورت ہے، جوان ہے اور ذہین ہے۔ موجودہ پڑھے لکھے لوگوں کی مانند وہ صرف ہی تعلیم یافتہ نہیں بلکہ ان کا دل تعلیم یافتہ اور مہذب ہو گیا ہے۔ بس وہ بیچارہ غیر جین خاندان میں ہوئے ہیں یہی ان کا عیب ہے۔

یہ خیال آتے ہی میرے سنہرے سپنے ٹوٹ جاتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرا دل پر لگا کر جانے کتنی بلندی پر اڑتا رہتا۔ میں ان سے شادی کر لیتی۔ وہ گھر داماد ہو جاتے۔ والد صاحب بڑی خوشی سے انہیں دھرم پور کی زمینداری سونپ دیتے۔ ان کے ساتھ رہ کر مجھے کس قدر لطف آتا۔ میری آئندہ پشت کس قدر ذہین، خوبصورت اور مہذب ہوتی۔ مگر راون سیتا کو اغوا کرتے وقت جس طرح جٹایو کے پر توڑ کر سیتا کو لے کر بھاگ گیا تھا اسی طرح پر کٹے جٹایو کی مانند لاچار ہو کر تخیل کی پرواز سے میں نیچے گر پڑتی اور میرے خیالات و احساسات جانے کہاں غائب ہو گئے۔

وقت پرواز کر رہا تھا اسکول کا کام باقاعدگی سے ہو رہا تھا گاؤں والوں نے اسکول کی اہمیت قبول کر کے اپنے اپنے چندے کی بقیہ رقمیں ادا کر دی تھیں۔

دیال ہمارے گھر بہت کم آیا کرتے تھے اور جب آتے تو والد صاحب سے مل کر چلے جاتے۔ میرے پاس آنے سے وہ گریز کرتے۔ میں بھی اسکول کے وقت پر اسکول جاتی اور چھٹی ہوتے ہی گھر واپس آجاتی وقفہ کے دوران یونہی کسی اخبار کی خبروں یا رسالے کے مضمونوں پر معمولی سی گفتگو ہو جایا کرتی تھی۔ بعض اوقات اخباروں میں میرے مضمونوں، نظموں یا افسانوں پر دیال اپنی رائے ظاہر کیا کرتے تھے۔ کبھی میں ان سے اتفاق کرتی اور کبھی ان کی مخالفت کرتی تھی لیکن بلاشبہ مجھے ان کی قابلیت کی داد دینا پڑتی تھی۔ جب وہ میری کسی تصنیف کی تعریف کرتے تو مجھے بڑا اطمینان ہوتا تھا۔

ایک دن اسکول کی چھٹی ہو جانے پر ہم سب لڑکوں کو لے کر دریا پر گئے تھے۔ لڑکے کھیل کود کے پروگرام میں مصروف تھے اور ہم دونوں گفتگو میں مصروف تھے۔ ہماری گپیں ہواؤں کی طرح تھیں جن میں جس طرف جو جا ہیں بھر دیتے ہیں اسی طرح جب گپیں ایک بار شروع ہو جاتی ہیں تو پھر یہ خیال نہیں رہتا کہ ان میں کون کون سے موضوعات شامل ہوں گے اور وہ کس طرف بہائے جائیں گے۔ ہماری باتیں جاری تھیں کہ لڑکوں کے کھیل ختم ہو گئے اور وہ اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے۔ ناظرین بھی منتشر ہو گئے، مگر ہم دونوں ساحل کی ریت پر اپنی گفتگو میں محو بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک عرصے تک ساتھ رہنے اور وقتاً فوقتاً تبادلۂ خیالات کی بدولت ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ دونوں کا مذاق ایک تھا اور مزاج میں بھی یکسانیت۔ دیال سے باتیں کرنے کے لئے میں قبل از وقت ہی اسکول پہنچ جایا کرتی تھی مگر ایک بات یہاں بتلا دینا

[illegible] سب [illegible] کیا یہ سب ایکی اسے [illegible] ہی ۱ یہ سب تو نیند [illegible] تھا میری [illegible] [illegible]

[illegible] کچھ آئے یہ کیسے ہیں۔ [illegible] کر لوں تو کیا ہوگا؟ لوگ کیا کریں گے، کیا [illegible] صاحب چاہیں گا کیا اثر پڑے گا؟ اس سے [illegible] ۔ اسی قسم کے خیالات میں محو میں سو گئی۔

سویرے میری جب آنکھ کھلی تو دیکھتی کیا ہوں کہ بابا جی صبح کی [illegible] ۔ رات کو میں نے جو ایک حسین خواب دیکھا تھا اس کا کیا انجام ہوا؟ یہ میں جان بھی نہ سکی تھی کہ بابا جی نے مجھے اٹھا دیا اور میں انہی ہیبت نظروں سے دیکھ کر یہی سوچتی رہ گئی کہ آخر میں خواب کی دنیا سے اس حقیقت کی دنیا میں کیوں آ گئی۔ کاش میں اسی میں گم ہو جاتی ......

۴

ہمارے سماج میں جو تنوع نظر آتا ہے، جس قدر مختلف و متضاد کردار ہمیں یہاں دکھائی دیتے ہیں اس کا صحیح علم مجھے ان خبروں سے ہو گیا تھا جو بابا جی نے مجھ تک پہنچائی تھیں۔ مجھے پورا پورا احساس تھا کہ اس دنیا میں تصنع، بناوٹ، فریب اور ڈھونگ اپنی پوری خوفناکی کے ساتھ موجود ہیں۔ ہمارے یہاں کے وہ ڈھونگی لوگ جو لمبے لمبے تلک لگاتے ہیں، جسم پر خاک ملتے ہیں اور لمبے لمبے بال رکھتے ہیں وہ اپنے بھائیوں کا گلا بڑی آسانی اور مہارت کے ساتھ کاٹ دیتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے۔ بعض اوقات یہ لوگ تہذیب اور کلچر کا غول پہنے کھلے بندوں گھومتے ہیں اور کبھی ٹھگ، چور اور لٹیروں کی شکل میں سماج کو دھوکہ دیتے ہیں، اسے لوٹتے ہیں۔ اپنی خامیاں انہیں نہیں دکھائی دیتیں، دوسروں میں کیڑے نکالتے ہیں انہیں لطف آتا ہے۔ اگر دوسروں کی بھلائی ہو تو ان کے کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے اور اگر کسی کا نقصان ہو جائے تو یہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ ہر گاؤں میں کچھ خنشے ہوتے ہی ہیں۔ چنانچہ جب مجھے معلوم ہوا کہ دھرم پور میں بھی ایسے کچھ لوگ ہیں تو مجھے پہلا تعجب نہ ہوا۔ مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ دھرم پور میں اس ذہنیت کے لوگ محدودے چند ہی نہیں بلکہ ان مفید پوش شیطانوں کا ایک باقاعدہ گروہ ہے جس میں متعدد لوگ ہیں جو ہمیشہ کوئی نہ کوئی سازش کرتے رہتے ہیں۔ طرح طرح کے گناہ کرنے کے باوجود وہ بھگا بھگت بنے رہتے ہیں۔

ہمارے گاؤں کا پٹواری گوپال راؤ کلکرنی اس گروہ کا لیڈر تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچاس سال کی تھی۔ وہ سانولے رنگ کا دبلا پتلا شخص تھا جسے کوئی معمولی سا کٹا آدمی ایک طمانچہ مار کر زمین سنگھا سکتا تھا۔ مگر اس کا دماغ بہت تیز تھا۔ ہر قسم کے دھوکے فریب میں وہ ماہر تھا۔ اُسے گاؤں کے لوگ پنت کہا کرتے تھے۔ پنت ہر فن مولا تھا۔ دنیا کا کوئی عیب ایسا نہ تھا جو اس میں نہ ہوتا۔ وہ گانجا پیتا تھا، شراب پیتا تھا، جوا کھیلتا تھا اور رنڈی باز بھی تھا اور موقع آنے پر وہ خون کرنے میں بھی نہ چوکتا تھا۔

گاؤں میں کہیں معمولی جھگڑا ہو، کوئی مارپیٹ ہو جائے یا کوئی مقدمہ ہو تو پنت کسی نہ کسی فریق کی طرفداری ضرور کرتا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ جس کام کو وہ ہاتھ میں لیتا تھا پھر وہ خواہ سچا ہو یا جھوٹا، کسی نہ کسی طرح اسے پورا کرتا اور اس میں کامیابی بھی حاصل کر لیتا تھا۔ اس لئے اسے اپنی طرف کرنے اور اس کی امداد حاصل کرنے کے لئے لوگوں میں اکثر کشمکش رہتی تھی۔

اس نے سینکڑوں گھروں میں نراجم کے بیج بوئے تھے، مقدمہ بازی کرائی تھی۔ کئی لوگوں کو اس نے فقیر بنا دیا تھا اور کئی گداگروں کو اس نے اتنی دولت دلوا دی تھی کہ وہ انہیں کئی پشتوں کے لئے کافی تھی۔ انہیں ذلیل حرکات سے اس نے بھی کافی پیسہ کمایا تھا مگر وہ اس کے پاس بچا نہ تھا۔ کیونکہ ایک تو اس میں بری عادتیں بے شمار تھیں۔ دوسرے وہ خرچیلا بھی بہت تھا۔ اس کی ذہانت، بری عادت اور خرچیلے پن کے باعث اسے کئی ساتھی مل گئے تھے اور اس طرح اس کا ایک اچھا خاصا گروہ بن گیا تھا۔

جب پنت کبھی کسی میلے، سنیما یا ڈرامہ وغیرہ دیکھنے جاتا تو اس کے ساتھ اس کے گروہ کے پندرہ بیس شخص ضرور رہا کرتے تھے اور ان سب کے کھانے پینے، آنے جانے وغیرہ کا پورا خرچ وہ خود ہی برداشت کرتا تھا۔ پھر ایسے موقع پر اگر اس کے پچاس روپے بھی خرچ ہو جاتے تو وہ اس کی

چندہ وصول کرتا تھا۔

اس گروہ میں گاؤں کے کئی لوگ شامل تھے اور مذہب و ملت کا فرق ختم کر کے وہ سب متحد ہو کر اپنا کام کیا کرتے تھے۔ گروہ کے لوگوں کا پورا نام نہیں لیا جاتا تھا۔ گروہ کے اندر وہ اپنی عرفیت سے ہی پکارے جاتے تھے۔ مثلاً حسینیا حسینی خان کے لئے، شنکریا شنکر لال کے لئے اور بابیا بابو لال کے لئے وغیرہ۔ اس گروہ میں ہزمتیا، گھیو، ببھکیا، باھیا، ملیا، کلیا وغیرہ نام کے جلاہے، مسلمان، دھوبی، درزی، بڑھئی، سنار، سیٹھی، چمار وغیرہ کئی ذاتوں اور مذہب اور پیشے کے لوگ شامل تھے۔

پنت کے مشیر خاص اور اصل میں اس کی قوت بلیا، ملیا اور کلیا تھے۔ وہ بڑے لحیم شحیم اور طاقت ور تھے اور پنت نے بڑی چالاکی سے انہیں اپنی خدمت میں رکھ لیا تھا۔

ان کا خاص کام چوری اور لوٹ مار تھا۔ یہ چوری کر کے زیورات لاتے اور پنت کے حوالے کر دیتے تھے، پھر پنت انہیں گھیو سنار سے راتوں رات گلوا کر سکھو سیٹھ کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔ اس میں ان تینوں کا آدھا حصہ ہوتا تھا۔ کچھ حصہ گھیو کو مل جاتا تھا، کچھ سکھو کو اور بیشتر حصہ پنت خود ہڑپ کر جاتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ حصہ سب کو دے دیتا تھا اس لئے کسی کو کوئی شکایت نہ ہوتی تھی۔ اس گروہ کے ممبروں کے پاس پستول، بلم، تلواریں وغیرہ سبھی ہتھیار موجود تھے۔ دن کے وقت تو ان ہتھیاروں کو کوئی نہ دیکھتا تھا لیکن رات کو نہ جانے کیسے نکل آتے تھے۔

سنہ ۴۲ء کے انقلاب میں بلیا، ملیا اور کلیا کو سنہری موقع مل گیا تھا۔ وہ وقت تھا جب انہیں اپنے جوہر دکھلانے تھے۔ انہوں نے کئی ڈاک خانے، ریلوے اسٹیشن اور سرکاری عمارتیں ایک رات میں ہی پھونک دی تھیں۔ ریل کے پل مسمار کر دیئے تھے۔ بنکوں پر ڈاکے ڈالے تھے۔ ریل گاڑیاں الٹ دی تھیں۔ جو شجاعت کبھی شیواجی کے پیروؤں نے بھی نہ دکھائی، وہ ان تینوں نے دن دہاڑے، رات میں اور پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دکھائی تھی۔ لوٹ مار تو بے شمار کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ یہ تینوں تین بورے نوٹ بھر کر لے آئے تھے۔

ان کاموں میں انہیں پنت کا پورا تعاون حاصل تھا۔ پنت نے یہ سب ذلیل کام کئے تھے اور اسے ان پر کبھی افسوس نہ ہوا تھا۔ کسی کو اس سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ سب اپنے اپنے حصوں سے مطمئن تھے۔ پنت نے اس کا انتظام پہلے سے ہی سوچ سمجھ کر کر دیا تھا تاکہ شکایت کا کسی کو موقع نہ ملے۔ سب خوش رہیں۔ اور کوئی مخبری نہ کر جائے۔

سنہ ۴۲ء کے انقلاب میں جو لوٹ مار ہوئی تھی اس میں پنت نے اگرچہ کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ لیکن ہر کام اسی کی رائے سے ہوا کرتا تھا۔ ہر کام وہ انہیں بتایا کرتا تھا۔ اس گروہ کے کئی لوگوں کو جنگ آزادی میں جوش آیا تھا اور اس جوش سے مغلوب ہو کر انہوں نے بڑے جوش و ولولے سے اس جنگ میں پورا تعاون کیا تھا۔ مگر یہ چار پانچ بڑے بھولے لوگ کیسے جان سکتے تھے کہ اس خدمت ملک کے پس پردہ ان کی کتنی خوفناک خود غرضی اور ظلم پرستی چھپی ہوئی تھی۔

دھرم پور میں کئی انقلابی روپوش ہو کر آ گئے تھے اور پنت نے ان کی ہر طرح سے مدد کی تھی۔ اس لئے متعدد انقلابی پنت اور اس کے گروہ کے لوگوں سے بہت خوش ہوئے تھے۔

پنت اس گاؤں کا پٹواری تھا۔ اس لئے اس نے گاؤں کے سرکاری ملازموں سے کہہ کر کئی مرتبہ ان انقلابیوں کا تحفظ کیا تھا۔

داداجی دھرم پور کے سب لوگوں کو نہایت نیک اور مخلص سمجھتے تھے۔ گہرائی میں جا کر لوگوں کے خلاف کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اسلئے پنت جو کچھ کہتا تھا داداجی اس کی حمایت کرتے تھے اور اسی لئے اگر کسی قسم کی تفتیش کے موقع پر کوئی سرکاری افسر کبھی آتا بھی تو وہ معمولی جانچ پڑتال کر کے اور کسی بھی گاؤں والے کو پریشان کئے بغیر اپنے ہیڈ کوارٹر کو واپس چلا جایا کرتا تھا۔

سنہ ۴۷ء کے انقلاب کے بعد اور آزادی مل جانے پر دھرم پور میں انقلابیوں کا استقبال کرنے کے لئے ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا اس میں تقریر کرتے ہوئے کئی انقلابیوں نے پنت اور اس کے ساتھیوں کی بہت تعریف کی تھی۔

مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد جنوبی ہند میں جو بلوے اور فساد ہوئے تھے ان سے دھرم پور بالکل پاک تھا کیونکہ پنت کے حکم کے بغیر آگے کون بڑھتا؟ پنت نے اس وقت کوئی دلچسپی نہ لی تھی کیونکہ اپنے ہی ذات والوں کے خلاف وہ کیسے کھڑے ہو جاتے؟

شراب بندی قانون کے بعد بلیا، ملیا اور کلیا نے دھرم پور کے جنگلوں، پہاڑوں اور ترائیوں میں شراب کشید کرنے کی کئی بھٹیاں کھول کر کافی روپیہ کمایا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس قسم کے بھی کاموں میں انہیں پنت کا تعاون ضرور مل جاتا تھا۔ دھرم پور کے

[illegible] جنگل میں چنت اور اس کے گروہ کے جسم کا راج تھا
[illegible] گاؤں کے لوگ بھی اپنی قسمت آزمانے آجایا کرتے تھے۔
[illegible] بیلیا، ملیا اور کلیا سنعتی اور لٹھارے لیس
[illegible] نہیں تھے۔ ان لیڈروں کو ہار جیت کچھ
[illegible] پھر سرداروں کو چنت مٹھی بھر کر پیسے ضرور
[illegible]

گاؤں کے مشرق [illegible] ایک چھوٹی پہاڑی پر ہنومان جی کا مندر ہے
جس کے سامنے بہت جگہ خالی پڑی ہے۔ جنگل کے درمیان واقع ہونے
کی وجہ سے اس طرف لوگوں کی زیادہ آمد و رفت نہیں ہوتی تھی۔ اسی
مندر میں چنت اور اس کے ساتھی کبھی کبھی تفریح کے لئے رقص و موسیقی
کے پروگرام کیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں ایک بار فرش پر نوٹوں کو بچھا کر
ان لوگوں نے اس پر ایک طوائف کا ننگا ناچ کرایا تھا۔

چنت اپنے بدمعاش ساتھیوں کے درمیان اسی طرح رہتا تھا
جس طرح پانی میں کنول رہتا ہے۔ قرب و جوار کے علاقے میں بیلیا اور
اس کے ساتھیوں نے نقب لگا کر کئی چوریاں کی تھیں۔ ہنومیا درزی
نے اپنی پہلی بیوی کو پاگل قرار دے کر چھوڑ دیا اور بڑے ٹھاٹ باٹ
سے دوسری شادی کرلی تھی۔ باتویا جانے کہاں سے ایک نوجوان مرہٹی
لڑکی بھگا لایا اور اس سے شادی کرلی۔ اس میں چنت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔
گمبھو نے چنت کے مشورہ سے ایک بیوہ سنارن کی گود میں زبردستی اپنا بچہ
دیدیا اور اس کی ساری جائداد ہڑپ کرلی۔ چنت کے اشارہ پر بیلیا نے
ایک مارواڑی کا قتل کر ڈالا تھا اور بعد میں اس کی صلاح سے اس مارواڑی
کی لاش کھیت میں پڑے ہوئے گھاس کے ڈھیر کے اندر رکھ کر راتوں رات
پھونک دی تھی۔ ملیا چمار نے ایک ساہوکار کی ناک ہی کاٹ ڈالی تھی۔
چنت کے کہنے سے کلیا نے اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس طرح سینکڑوں
بے گناہ لوگوں کے خون ان بدمعاشوں کی گردن پر تھے۔

بظاہر چنت بڑا سیدھا اور معصوم دکھائی دیتا تھا۔ کھادی بھی
پہنتا تھا، مگر اندر سے وہ کیا تھا اس کا شاید اسے بھی علم نہ تھا۔ اس کے
تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ تینوں لڑکیوں کی اس نے شادی بڑے ٹھاٹھ
باٹھ سے کی تھی۔ دو تو صاحب اولاد بھی ہو گئی تھیں۔ دونوں لڑکے
سانگلی کے کالج میں تعلیم پا رہے تھے۔ اس کی بیوی بڑی سیدھی سادی
عورت تھی۔ دونوں اپنے کردار کے لحاظ سے بالکل مختلف اور متضاد تھے۔

گھر میں اس کا بڑا رعب تھا۔ کسی کو چوں چرا کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اس کی داشتہ کا نام چندرا تھا۔ وہ دھرم پور کے ایک غریب
مالی کے خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ تھی بہت خوبصورت۔ رنگ گورا اور
جسم متناسب تھا۔ بچپن ہی میں گاؤں کے ایک مالی لڑکے سے اس کی شادی
ہو گئی تھی۔ لڑکی بھولی بھالی تھی مگر اس کی ساس اور سسر نے اسے
بہت تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے اس نوجوان لڑکی کے سر پر ترکاری
کی ٹوکری رکھ کر گاؤں میں بکوانا شروع کر دیا۔ وہ بیچاری بکری کی طرح تھک
جاتی تھی۔ اس کا شوہر اپنے ماں باپ کی خدمت میں رہتا تھا۔ اس لئے یہ
دیکھنے کے باوجود کہ اس کی بیوی کو پریشان کیا جا رہا ہے وہ کبھی بھی اس
کی طرف داری نہیں کیا کرتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اسے ضرورت پڑنے
پر مار پیٹ کیا کرتا تھا۔ اس کے ساس سسر ہمیشہ اس کے پیچھے پڑے رہتے
تھے کہ میکے جا کر روپے اور کپڑے لائے۔ اور اگر وہ اس میں ناکام رہتی
تو وہ اسے اور پریشان کرنے لگتے تھے۔

بیچارے ماں باپ کہاں تک دیتے رہتے؟ کوئی سیٹھ ساہوکار تو
تھے نہیں۔ مزدور تھے۔ انہیں تو دو وقت روٹی بھی میسر نہ تھی۔ پھر بھی
بیٹی کی تکلیف دیکھ کر انہوں نے دو ایک بار قرض لے کر اس کی ساس
سسرے کو خوش کرنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ چندرا کی تکالیف میں
کسی قسم کی کمی نہ ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد چندرا کے والدین انتقال کر گئے۔ اس کے ساس اور
سسرے بھی مر گئے۔ لیکن شوہر شرابی ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اس کے مصائب
میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہوتا گیا۔ وہ سبزی بیچ کر اپنی روزی چلاتی
تھی اور ان سب کے باوجود وہ پاکدامن بنی رہی۔ گاؤں اور گرد و نواح
کے منچلے لوگوں نے اسے خراب کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ان کے چنگل میں نہ
پھنسی۔ گاہک عموماً اس کی سبزی نہ دیکھ کر اس کی صورت دیکھ کر سبزی
خریدا کرتے تھے۔

چنت کے گھر بھی وہی سبزی دینے آیا کرتی تھی۔ چنت کی نظر بد اس پر
پڑی اور اس نے اپنی شیریں زبان اور عیاری سے چندرا کو اپنے دام
فریب میں پھنسا لیا اور اس طرح کہ وہ اس سے کبھی نہ نکل سکی۔

چنت سے چندرا کے تعلقات بڑھتے گئے اور نتیجتاً چنت کی ہی
ہو رہی۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ چنت نے اسے تکلیف دینے والے شوہر
کو اسی کے ہاتھوں مروا ڈالا۔

[illegible] طرح چھپانا شروع کر دیا ہے ۔ میں اب [illegible] کام [illegible] کو میں نے اپنے صندوق میں محفوظ [illegible] ہیں ۔

[illegible] قبل ماں نے مجھے جو لمبا سا [illegible] ۔ اس وقت دوپہر کو ماں اپنی بیٹھک میں آرام کر رہی تھیں ۔ [illegible] دور ہی ایک طرف بابا بیٹھی تھی اور دوسری طرف [illegible] کو صاف کر رہی تھیں ۔ اسکول کی [illegible] سے میں بھی گھر پر ہی تھی ۔ چونکہ میں کچھ تکان محسوس کر رہی تھی [illegible] اٹھ کر نیچے آ گئی ۔ میں چاہتی تھی کہ ماں کے پاس بیٹھوں کہ اتنے میں ماں نے کہا ۔

" [illegible] آؤ ۔"

" [illegible] " یہ کہہ کر میں ان کے پاس بیٹھ گئی ۔ ماں نے کہا ۔

" اب میں تجھے کیا کہوں ؟ جب تو چھوٹی تھی تب میں نے تجھے بہت سی باتیں [illegible] ۔ لڑکیوں کو کس طرح رہنا چاہئے اور کس قسم کا سلوک کرنا چاہئے یہ سب باتیں میں نے تجھے اس وقت بتلائی تھیں اور اب تو بڑی ہو گئی ہے ، تعلیم یافتہ ہو گئی ہے ۔ ساری باتیں اب تجھے اپنے آپ سمجھ میں آ جائیں گی ۔"

میں نے درمیان میں ٹوک کر کہا ۔ " ہاں ماں ، یہ تو سچی بات ۔"

ماں نے جواب دیا ۔ " تو تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ لوگ تیرے بارے میں کیا کیا باتیں کر رہے ہیں ۔ اسی لئے میں کہتی ہوں کہ تو وہاں ماسٹر سے زیادہ قریب نہ رہ سکے ۔ اس کے ساتھ تنہا گھومنے نہ جایا کر ۔"

" اس سب کا کیا مطلب ہے ماں ؟ کیا میں اسکول نہ جایا کروں ؟ ایک ہی مدرسہ کے استاد اگر آپس میں گفتگو نہ کریں گے تو وہاں کا کام کس طرح چلے گا ؟ اسکول کے اوقات کے علاوہ کیا میں وہاں کے پاس جاتی ہوں ؟ کب اس کے ساتھ گھومنے جاتی ہوں ؟ لوگوں کو بدنام کرنے میں کیا لگتا ہے [illegible] سکتے ہیں ۔ یہاں [illegible] بڑی ہو گئی ۔ دوسرے [illegible] میں نے تعلیم حاصل کی ۔ کیا ابھی تک تمہیں میرا سلوک نامناسب معلوم ہوا تھا ؟ آج ..... "

درمیان [illegible] کر ماں نے کہا ۔ " یہ بات نہیں ہے [illegible] جانتی ہوں ۔ مگر لوگوں کو باتیں کرنے سے بھی [illegible] ؟ "

" لوگوں کی تو یہ عادت ہے ۔ وہ ہمیشہ بدنام ہی کریں گے ۔ میں اسکول جاؤں گی تو بھی اور گھر پر رہوں گی تب بھی ۔ پربھا دیوی اور اس کے بیٹی کا قصہ تم نے نہیں سنا کیا ؟ " میں نے ذرا چڑھ کر کہا ۔

" اس طرح چڑھو نہیں بیٹی ۔ ابھی تیری شادی ہونی ہے ۔ کنواری لڑکیوں کو بدنامی سے بچنا چاہئے ۔ جب تیرے ہاتھ پیلے ہو جائیں گے تو پھر تجھے بدنام کرنے کی کوئی جرأت نہ کرے گا ۔ ابھی تو نازک وقت ہے ۔ اگر لوگوں کی باتوں کی طرف توجہ نہ دے گی تو کام نہیں چلے گا ۔ نہیں تو تیری شادی ... "

" نہیں ہوگی ۔ یہی نا ؟ کوئی حرج نہیں ۔ میں پجارن ہو کر کسی مندر میں بیٹھ جاؤں گی ۔ " میں نے ماں کا فقرہ پورا کیا ۔

" اسے مذاق نہ سمجھو بیٹی ۔ " ماں نے بلند آواز میں کہا ۔

" خیر ، نہ سہی تو بتلائیے کیا کروں ؟ " میں نے دریافت کیا ۔

" وہی جو میں کہہ رہی ہوں ۔ " انہوں نے جواب دیا ۔

" مجھے یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ میں اپنی ذمہ داری کو خوب جانتی ہوں ۔ آج تک میں جس طرح رہتی آئی ہوں اسی طرح اب بھی اپنا کام کئے جاؤں گی ۔ لوگ اگر کچھ بکتے ہیں تو بکنے دیجئے انہیں ۔ ان کی زبان پکڑنے سے تو رہی ۔ سیتا ایسی پاکدامن کو بھی جب لوگوں نے بدنام کرنے سے نہ چھوڑا ۔ لوگ کچھ بھی کہتے رہیں تمہیں مجھ پر تو اطمینان ہے نا ؟ "

" یہ بات نہیں منی تمہارے والد صاحب کا خیال ہے کہ آئندہ جیسا کہ میں تمہاری شادی کر دی جائے ۔ وہ تمہارے لئے موزوں شوہر کی تلاش کر رہے ہیں ۔ ممکن ہے وہ اس سلسلہ میں تم سے بھی گفتگو کریں اور تمہارا مشورہ لیں ۔ اسلئے کہتی ہوں کہ کچھ احتیاط رکھو ۔ "

" ٹھیک ہے ۔ میں تو بہت احتیاط برتتی ہوں ۔ " میں نے انہیں یقین دلایا ۔

اسی وقت والد صاحب باہر سے آئے ۔ اپنے کمرے میں جا کر انہوں نے کپڑے اتارے اور ماں کے کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گئے پھر انہوں نے فرمایا ۔

" کیوں منی ، آج کیا باتیں ہو رہی ہیں ماں بیٹی میں ؟ "

" اب منی کے بیاہ کے علاوہ کیا باتیں ہوں گی ؟ " ماں نے جواب دیا ۔

" یہی تو معلوم کر رہا تھا ۔ " والد صاحب نے کہا ۔

" کیوں ، مل رہا ہے کیا کوئی موزوں بر ؟ " ماں نے استفسار کیا ۔

" کیوں نہیں ؟ بیٹوں کی کیا کمی ہے ؟ " والد صاحب نے جواب دیا ۔

" آئندہ بیساکھ میں اس کے ہاتھ پیلے کر ہی دینے چاہئیں ۔ " ماں بولیں ۔

"میرا بھی یہی خیال ہے" والد صاحب نے اتفاق کیا۔

"تم کیا کہتی ہو؟" ماں نے مجھے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی۔ میری شادی ہوگی، میں سسرال جاؤں گی تو......" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں، ہم گھر داماد ہی کی تلاش میں ہیں۔ کیوں ہے نہ یہی بات؟" ماں نے والد صاحب کی رائے طلب کی۔

"ہاں ہاں" والد صاحب نے گردن ہلا کر ہنستے ہوئے کہا۔

ماں اور والد صاحب کو ہنستا ہوا چھوڑ کر میں بھاگ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

میں نے کمرہ میں اپنے پلنگ پر لیٹ کر کتاب پڑھنے کی کوشش کی، مگر میرا دل اس میں نہ لگا۔ میں تو اپنے ہونے والے شوہر کی تصویر بنانے میں محو ہو گئی۔ شادی، برات، خاوند، سسرال وغیرہ متعدد مناظر میرے سامنے فلم کی مانند آجا رہے تھے۔

بائیجا نے آج جو باتیں مجھے بتائیں ان کو سن کر میری سمجھ میں آگیا کہ ماں اور والد صاحب میری شادی کی اس قدر کیوں جلدی کر رہے ہیں۔ پنت اور اس کے گروہ پر مجھے بہت غصہ آیا لیکن میں کر ہی کیا سکتی تھی۔

تقریباً آٹھ دن کے بعد پنت، بھیکم سیٹھ اور گنپت راؤ ستار دادا جی سے ملنے آئے۔ دوسری باتوں کے ساتھ پنت نے کہا "دادا جی منی کی شادی اس سال کر دیجیے۔"

"ہاں کرنا ہے تو پنت، مگر کوئی موزوں دولہا تو ملے" والد صاحب نے کہا۔

"دولہوں کی کیا کمی؟" پنت گنپت راؤ کی طرف دیکھ کر بولا۔

"پر تلاش کرنا پڑے گا" گنپت راؤ نے کہا۔

"دو جوان معلم ایک ہی اسکول میں ہیں، کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" سیٹھ نے اپنے شبہ کا اظہار کیا۔

"اس روز ہم نے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی کہ کہیں کی کسی شہزادی نے اپنے موٹر ڈرائیور سے ہی شادی کر لی ہے۔ کیوں پنت تمہیں یاد ہے نا؟" گنپت راؤ نے پنت سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہاں" پنت نے جواب دیا۔

"ہماری منی اتنی بیوقوف نہیں ہے۔ دونوں تعلیم یافتہ ہیں" والد صاحب نے کہا۔

"ایسا نہ کہیے دادا جی۔ عورت کے کردار اور [illegible] بھگوان کو بھی نہیں پتا" پنت نے کہا۔

"اور پھر آج کل لوگ بھی......" گنپت راؤ نے [illegible]۔

"بدنام کرتے ہیں" سیٹھ نے لقمہ دیا۔

"دادا جی ہم لوگوں کے گاؤں کے آپ زمیندار ہیں، [illegible] ہیں۔ ہمیں آپ پر بڑا ناز ہے۔ ہم جب ایسی باتیں سنتے ہیں تو......"

"اس لئے ہماری التجا ہے کہ منی بیٹی کی شادی جتنی جلدی ہو سکے کر ڈالیے" سیٹھ جی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس سال جیسا کہ ہی کر ڈالیں گے" والد صاحب نے وعدہ کیا۔

"خوب شان و شوکت کے ساتھ ہونا چاہیے دادا جی" ستار بولا۔

"پانچ گاؤں کے لوگوں کو لڈو کھلانا چاہیے سرکار" سیٹھ جی بولے۔

"ابھی کئی سال سے اس گھر میں کوئی تقریب ہی نہیں ہوئی ہے۔ اب موقع آیا ہے" پنت بولا۔

"ہاں ہاں سب ہو جائے گا۔ کیا میں تنہا یہ سب کچھ کر سکوں گا۔ تم سب لوگ مدد کرو گے تو یہ سب کام ٹھاٹ باٹھ سے ہو جائے گا۔ تمہاری مدد اشد ضروری ہے" والد صاحب نے کہا۔

"بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے دادا جی؟ ہم کیا کبھی آپ کے حکم کی عدولی کر سکتے ہیں" پنت نے کہا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مگر پہلے سے ہی کہہ دینا بہتر ہے۔"

پھر ادھر ادھر کی کچھ بات چیت کے بعد چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ لوگ رخصت ہوئے۔

یہ سب باتیں بائیجا نے اپنی زبان میں مجھ سے اختصار کے ساتھ کہی تھیں۔ ماں کے آواز دینے پر وہ کسی کام کے لئے نیچے اتر گئی۔

آج اتوار تھا اور اسکول کی چھٹی تھی۔ چھٹی کے دن میرے سب کام بڑی کاہلی سے ہوا کرتے تھے۔ اور اس روز مجھے اس کا پورا احساس ہو گیا کہ خواب کی دنیا کی نسبت بائیجا کی بتائی ہوئی حقیقت کی دنیا کتنی خوفناک ہے۔

اس روز ماں نے میرے لئے شری کھنڈ اور پوریاں پکائی تھیں۔ انہیں کھا کر میں حسب معمول سونے کے لئے لیٹی لیکن آج مجھے نیند نہ آئی۔

پڑھنے میں بھی دل نہیں لگا۔ قریب تین چار بجے میرا جی متلایا اور مجھے قے ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹھنڈ کے ساتھ بخار آ گیا۔

گھر میں دوڑ دھوپ شروع ہو گئی۔ دیال کے پاس مہر شی جٹا شنکر کا ایک خط آیا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ وہ محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر صاحب کو نیا اسکول دکھانے کے لئے کل ان کے ساتھ دھرم پور پہنچ رہے ہیں۔ یہی اطلاع دینے وہ فوراً ہمارے گھر آئے تھے۔ مگر ہمارے گھر آ کر انہوں نے دیکھا کہ سب طرف دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ انہیں دیکھ کر گھبرا کر والد صاحب نے کہا ــــــ

"ماسٹر صاحب! سانگلی جا کر ڈاکٹر سیٹھی کو فوراً لے آئیے۔ ممتی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ حسین کی کار لے جائیے اور ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر جلد واپس آئیے۔ خرچ کیلئے یہ روپے رکھ لیجئے!" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر دیال کو دیئے۔

جس کام کے لئے دیال آئے تھے اسے کسی کو بتائے بغیر ہی وہ کار لیکر ڈاکٹر کو بلانے کے لئے سانگلی کے لئے روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کسی مریض کو دیکھنے باہر گئے ہوئے تھے۔ اس لئے انہیں دھرم پور پہنچنے میں بہت دیر لگی۔

میرا بخار بڑھ رہا تھا۔ آس پڑوس کے لوگ خیریت معلوم کرنے اور میری عیادت کے لئے آنے لگے تھے۔ ماں اور والد صاحب کی ہمت ٹوٹ رہی تھی۔ سب کی آنکھیں ڈاکٹر ــــ کا انتظار کر رہی تھیں۔ پنت اور اس کی چنڈال چوکڑی کے ارکین کو بھی میری علالت کا پتہ چلا اور انہوں نے میری قے اور بیماری کا کچھ اور ہی مطلب .....

۵

دوسرے روز محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کو ساتھ لے کر مہر شی جٹا شنکر دھرم پور تشریف لائے۔ اسکول کی تنظیم اور وہاں کی صفائی دیکھ کر اور طلباء سے کئے گئے سوالوں کے اطمینان بخش جوابات پاکر وہ بڑے متاثر ہوئے۔ لڑکوں نے تاریخ، جغرافیہ اور سائنس کے کمروں میں جو چیزیں جمع کر رکھی تھیں اور اسکول کے سامنے جو باغیچہ لگایا تھا اس میں پیدا ہونے والی مختلف قسم کی سبزیاں دیکھ کر بھی وہ بڑے خوش ہوئے۔

پچھلے دن دیال کو رات بھر سونے کا موقع نہ ملا تھا۔ سانگلی سے ڈاکٹر لے کر وہ ایک بجے رات کو واپس آئے تھے۔ اس کے بعد وہ سوئے ہی نہیں ــــ ڈائرکٹر صاحب کے استقبال کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ راتوں رات انہوں نے لڑکوں کی مدد سے جھنڈیوں سے اسکول کی ساری عمارت سجا دی تھی۔ گاؤں کی چند ممتاز ہستیوں کو بھی اس موقع پر مدعو کیا تھا جو ڈائرکٹر صاحب کے معائنے کے وقت اسکول میں موجود تھے ــــ معائنہ ہو جانے کے بعد ڈائرکٹر صاحب نے مدعوعاجان اور لڑکوں کے سامنے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں تھوڑے سے عرصہ میں اسکول نے جو ترقی کی تھی اس پر انہوں نے اطمینان ظاہر کیا اور دونوں معلموں نیز گاؤں کے ان لوگوں کا جنہیں اسکول سے دلچسپی تھی بڑے فخر کے ساتھ ذکر کیا، اور یہ امید ظاہر کی کہ دوسرے گاؤں والے بھی اگر دھرم پور کی تقلید کریں تو ہندوستان کی قسمت جلد جاگ جائے۔

میری طبیعت ناساز ہونے کے باعث میں اس روز اسکول نہ جا سکی تھی۔ مگر والد صاحب کا یہ معمول تھا کہ گاؤں میں آنے والے سرکاری افسر کو اپنے ہاں چائے پر ضرور مدعو کیا کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ڈائرکٹر صاحب کو بھی اپنے ہاں چائے پر بلایا تھا۔ طبیعت علیل ہونے کے باوجود میں ان سے اپنے گھر ملی تھی۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور انہوں نے میری تعریف کی جس سے میری بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔

اپریل کا نصف مہینہ گذر گیا۔ اسکول کا کام باقاعدگی سے جاری تھا۔ میرا اور دیال کا قرب بڑھتا جا رہا تھا۔ دونوں میں ایک دوسرے کے لئے عزت اور ہمدردی کا جذبہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اب تو ایک دوسرے کے بغیر بمشکل دل لگتا تھا۔ دن میں ہم دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اسی لئے پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ دن کب ختم ہو گیا۔ مگر چھٹی کے دن چونکہ ایک دوسرے سے ملاقات ناممکن تھی اس لئے وہ دن بڑی مشکل سے کٹتا تھا۔

ادھر گھر میں شادی کی فضا تیار ہو رہی تھی۔ والدین اور پنت سبھی میرے لئے موزوں شوہر تلاش کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں والد صاحب پنت سے ہی مدد لیتے تھے۔ جہاں کہیں کسی لڑکے کو دیکھنے بھی وہی جایا کرتا تھا۔ والد صاحب کی بیٹھک میں آجکل گفتگو کا موضوع میری شادی ہی ہوتا تھا۔ ماں کے پاس کبھی پڑوس کی عورتیں آتیں تو اسی پر بات چیت کرتیں۔

اب مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ ہمارے سماج کے رسم و رواج کے تحت مجھے اس لڑکے کو اپنا شوہر بنا لینا پڑے گا جس کو میرے والدین نے میرے لئے پسند کر لیا ہے۔ اور میرے ہونے والے شوہر محترم اگر میرے مزاج کے

مطابق ہوئے تو ٹھیک ہے ورنہ۔ کہتے ہیں کہ لکشمی[1] اور سرسوتی[2] کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکیں، کیا اس کا اطلاق مجھ پر بھی ہوگا؟ اگر میری سسرال کے لوگ جاہل ہوئے تو؟ اسی قسم کے خیالات میرے دماغ کو دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے۔

مجھے دیکھنے کے لئے سب سے پہلے جو صاحب تشریف لائے تھے وہ نوجوان تھے اور پولیس ٹریننگ اسکول سے پچھلے سال ہی پاس کرکے نکلے تھے۔ وہ کسی تحصیل میں حال ہی میں تھانیدار کے عہدے پر مقرر ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ پانچ چھ مرد اور چار پانچ عورتیں تھیں۔ رواج کے مطابق وہ مجھے دیکھنے کے لئے والد صاحب کے کمرے میں بیٹھے۔ میرے بیٹھنے کے لئے ایک پیڑھی رکھدی گئی تھی۔ چنانچہ میں جاکر اس پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ گو میں ایک جاہل لڑکی کی طرح گردن نیچی کرکے نہیں بیٹھی تھی پھر بھی اس خیال سے کہ سب لوگ میری طرف دیکھ رہے ہیں میں کچھ شرما ضرور گئی تھی۔

ان مہمانوں میں ایک بزرگ بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے کئی سوالات کیئے اور میں نے ان کے اطمینان بخش جوابات دیدئے۔ آج تک میں نے متعدد امتحانات دیئے تھے۔ میرے ممتحن مجھ سے کہیں زیادہ قابل ہوا کرتے تھے مگر آج......

اس کے بعد لڑکے والوں میں سے ایک عورت نے ناریل، کیلے اور مصری سے میری گود بھری اور میں سب کو سلام کرکے اندر چلی گئی۔ گھر میں لڑکے کی طرف سے آئی ہوئی جو عورتیں بیٹھی تھیں انہوں نے بھی مجھ سے طرح طرح کے استفسارات کرکے مجھے پریشان کیا، مگر میں لاچار تھی۔ ایک نے پوچھا ـــــ

"کیا تو کھانا پکا سکتی ہے؟"

"ہاں۔"

"بیٹی تجھے ماہواری کتنے سال سے ہو رہی ہے؟"

"یہی کوئی آٹھ دس سال سے۔"

"تب تو تیری عمر کوئی پچیس سال کی ہوگی؟"

"ہاں۔"

قصہ مختصر یہ کہ اس لڑکے کے ساتھ شادی نہ ہو سکی۔ اول تو والد صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ان کا داماد تھانیدار ہو۔ کیونکہ آج تک تھانیداروں کا ان کا جو تجربہ تھا وہ کچھ اچھا نہ تھا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ اچھے خیالات نہ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اکثر تھانیدار شرابی، بدکار اور رشوت خور ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس لڑکے کے بارے میں کافی تحقیقات بھی کی تھیں۔ انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ محض نام کا ہی جینی ہے۔ کھانے پینے میں بھی وہ کوئی پرہیز نہ کرتا تھا۔ اور......

جب والد صاحب نے ہی اس بر کو پسند نہیں کیا تو پھر دوسروں کی رائے کا سوال ہی نہیں اٹھا۔

اس روز میں نے دیال کو ایک خط لکھ کر مطلع کر دیا تھا کہ آج مجھے اسکول پہنچنے میں تاخیر ہو جائے گی۔ خوب ڈٹ کر چائے اور ناشتہ کھا کر مہمان لوگ "سوچیں گے" یہ کہہ کر چلے گئے اور میں ان کی واپسی کے فوراً بعد ہی اسکول چلی گئی۔ دیال کو ان کی آمد کی اطلاع تھی۔

"کیوں طے ہوا؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی دلی دور ہے۔" میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

"یہ ہمارے یہاں شادی کا کیسا غلط قاعدہ ہے۔ کیا تم اس کو پسند کرتی ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"پسند نہ بھی ہو تو بھی چارہ کار ہی کیا ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"کیوں نہ اس غلط رسم کو توڑا جائے؟" دیال نے کہا۔

"باتیں کرنا بہت آسان ہے، مگر اس خیال کو عملی جامہ پہنانا اتنا ہی مشکل۔" میں نے کہا۔

"جب تم جیسی تعلیم یافتہ لڑکیاں بھی یہی کہنے لگیں تب تو کسی رسم کو توڑا یا بدلا نہیں جا سکتا۔ اور نہ ہی کوئی اصلاح ممکن ہو سکتی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"جب تک ہمارے سماج کی اصلاح نہیں کی جاتی تب تک شادی کی رسوم میں بھی کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"سارے سماج کو تو سدھارنے میں کئی برس لگ جائیں گے تو کیا تب تک.....؟"

"اور اگر اس میں تبدیلی کر دی گئی تو.....؟" دیال کا یہ فقرہ بھی میں نے ہی مکمل کیا۔

"تو پھر تکلیف، رنج و غم۔"

"تمہارا مطلب ہے زندگی ان رسومات کے بغیر بے کیف و ناخوشگوار رہے گی؟"

---

[1] دولت کی دیوی۔ [2] علم کی دیوی۔

اپریل کا مہینہ ختم ہو گیا۔ مئی کا مہینہ شروع ہوا تو گرمیوں کی تعطیلات ہو گئیں۔ دو ماہ کی چھٹی میں مہرشی نے دیال کو تارہ پور بلا لیا۔ اس لئے اسکول بند کر کے وہ مجھ سے اور والد صاحب سے رخصت لینے کے لئے ہمارے گھر آئے۔ والد صاحب اپنی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ میں اپنے کمرہ میں تھی۔ ان کے آنے کے بعد والد صاحب نے مجھے بھی آواز دی ــــــ "منی!"

میں نیچے آ گئی۔ دیال نے والد صاحب کے قدم چھوئے اور چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار کر کے مجھ سے اور ان سے رخصت چاہی۔ میں نے بابو جی کو چائے لانے کے لئے کہا۔ دیال نے چائے پی۔ اسی اثنا میں وہ اندر جا کر ماں کے بھی قدم چھو آئے۔ تمام چھٹیاں وہ تارہ پور میں ہی گذارنے والے تھے۔

جب وہ جانے لگے تو والد صاحب نے کہا۔

"ماسٹر صاحب، ان چھٹیوں میں آپکی اسسٹنٹ کی شادی کر رہا ہوں۔ اگر طے ہو جائے تو ضرور تشریف لایئے گا۔ بھولئے گا نہیں۔"

"ضرور حاضر ہوں گا۔" دیال نے وعدہ کیا اور نظر کر کے میری طرف ایک نظر دیکھا، اور چل دیئے۔ لیکن .....

مجھے محسوس ہوا گویا میرا دل ٹوٹا جا رہا ہے۔ میں اپنے کمرہ میں واپس آ گئی۔ اور شیشے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میرا دل مجھ سے دریافت کر رہا تھا "کیوں اتنی ملول ہے تو؟ کیا اس لئے کہ لوگوں نے ایک افواہ اڑا دی۔ دیال سے تو محبت کرتی ہے؟ لیکن وہ خواہ کتنا ہی خوبصورت، ذہین اور قابل ہو مگر ہے تو اچھوت۔ اور تو جینی ہے۔ کیا تو اس سے شادی کرنے کی جرأت کرے گی؟ یہ تیرا ڈھونگ ہے۔ بیچارہ دیال! اس کو ابھی تیرے دل کا اندازہ نہیں ہے۔ اس کے سر پر مہرشی، داداجی، اس کی ذات اور سماج میں ہونے والی بدنامی کی تلوار لٹک رہی ہے۔ وہ غریب بے دست و پا ہے۔ وہ ایسا کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔ تجھے اپنے راستہ پر چلنا ہوگا۔ اور اس کو اپنے۔ یہی تمہاری آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد اگر تم ایک دوسرے سے ملے تو ....."

میری آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ بیساکھ کا مہینہ آ گیا تھا۔ اور اسی مہینے میں میری شادی کرنے کا والد صاحب تہیہ کر چکے تھے۔ لڑکے والوں کی یورش دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔

فصل کے کٹ جانے کے بعد بوائی ہونے تک کاشتکار خالی رہتے ہیں۔ یہ وقت وہ کہیں جمع ہو کر گپ بازی میں گذار دیتے ہیں۔ کہیں آس پاس کے دیہات میں بھی اگر کسی کے ہاں شادی بیاہ ہو تو وہ ضرور شریک ہوتے ہیں۔

ہمارے گھر میں مہمانوں کی یہ آمد و رفت دیکھ کر کئی گاؤں والے اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر ہمارے گھر آ جاتے اور چائے پانی کر کے اپنا دن خوشی خوشی بسر کر لیتے تھے۔

لڑکے والوں کی آمد ہمارے ہاں کا معمول سا بن گیا تھا۔ وہ مجھ سے طرح طرح کے مناسب و نامناسب سوالات کرتے اور مجھے مجبوراً انہیں جواب دینے پڑتے۔ پھر وہ سب چائے پانی اڑا کر "جمیں گے" کہہ کر یہ جا وہ جا۔ کوئی جا کر جواب بھیج دیتا۔ والد صاحب استفسارات کرتے اور ....

آخر راز ہی کیا ہے بتا کی دیتی ہوں

تعطیلات کے بعد ایک وکیل صاحب پہلے بر کی حیثیت سے آئے۔ وہ بھی نوجوان تھے۔ حال ہی میں بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہوئے تھے۔ ابھی تک وکالت شروع نہیں کی تھی۔ دنیا کا کچھ خاص تجربہ بھی نہ تھا۔ خود کو بہت ذہین اور چالاک جانتے تھے۔ رنگ سانولا تھا اور دنیا کو کج نگاہی سے دیکھنے کے قائل تھے۔ مجھ سے شادی کرنے کی ان کی شرائط مختصراً یہ تھیں۔

فی الحال شادی طے کر دے۔ یہ اگر بیرسٹری پڑھنے ولایت جائے تو اس کا تمام صرفہ بھی برداشت کرے۔ وکالت پاس کرنے کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو شادی کر دی جائے۔

والد صاحب نے یہ شرائط اسلئے نامنظور نہیں کیں کہ انہیں بیرسٹری کے لئے روپیہ خرچ کرنا پڑتا بلکہ اس لئے کہ اس کا مطالبہ عام رواج کے مطابق نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ لڑکا کالا سا اور بد دماغ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے پسند نہ کیا۔

ان وکیل صاحب کے بعد جو حضرت تشریف لائے وہ ڈاکٹر تھے۔ مگر والد صاحب کو ان کا خاندان پسند نہ تھا۔ لہٰذا وہ بھی چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب میں نقص یہ تھا کہ ان کے باپ نے انٹر کاسٹ میرج کی تھی۔ یعنی باپ جینی تھا اور ماں مراٹھن۔

چوتھے صاحب جو آئے وہ ایک پروفیسر تھے۔ بظاہر وہ ٹھیک تھے اور ممکن تھا والد صاحب کو پسند بھی ہوتے مگر وہ عمر میں مجھ سے دو چار برس چھوٹے تھے۔ ویسے تھے ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ان کے والد کسی پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنے لڑکے کی پڑھائی بہت کمسنی میں ہی شروع کر دی تھی اور دن رات پڑھائی میں مشغول رہنے کے باعث ان کی صحت کی طرف بالکل توجہ نہ دی گئی تھی۔ اس لئے وہ دکھائی

دینے میں بالکل مختلف تھے۔ دُبلے پتلے اور ناٹے۔ مجھ سے بھی قد میں کچھ نیچے ہی تھے، اسلئے وہ بھی ناپسند ہو گئے۔

بالآخر والد صاحب کو ایک بر پسند آیا۔

یہ ایک بڑے کاشتکار کا گھرانا تھا۔ گھر میں بہت بڑی زمین تھی ــــ بھینسیں اور بیل اس قدر کثیر تعداد میں تھے کہ ان کے لئے جگہ کم پڑ جاتی تھی۔ گھر میں اتنے آدمی اور نوکر چاکر تھے کہ انہیں روز کھانے کا انتظام کرنے میں گھر کی عورتیں رو دیتی تھیں۔ پیسے نہ ہونے کے باعث کپڑے دھونے تک سبھی کام گھر کی عورتیں ہی کرتی تھیں۔

گھر کے لوگ صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کرتے اور خوب اناج پیدا کرتے تھے۔ بہت محنتی، جاہل اور مذہبی تھے۔ گھر کے چھوٹے بچوں نے اسکول جانا شروع کیا تھا لیکن ان کے والدین چار جماعتوں سے آگے نہ بڑھ سکے تھے۔

بر کی عمر تیس برس کی تھی۔ میٹرک تک تعلیم پائی تھی۔ گھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے سارا کاروبار وہی سنبھالتے تھے۔ ماں باپ، چچا چچی تمام لوگ ان کی ہدایات پر عمل کرتے تھے۔ حالانکہ کاشت وغیرہ میں وہ کوئی حصہ نہ لیتے تھے۔ لیکن گھر کے کاروبار کے منیجر ہونے کی حیثیت سے دیگر کئی کام انہیں کو کرنے پڑتے تھے۔

سر پر صافہ، جسم پر گرم کوٹ، ریشمی کرتا، سفید دھوتی اور اچھا سا خوبصورت چپل یہی ان کی پوشاک تھی۔ رنگے ہوئے دانتوں اور ہونٹوں کو دیکھ کر کوئی بھی بتا سکتا تھا کہ پان کھانے کی ان کو عادت ہے۔ ان کی کوٹ کی جیب بھی پھولی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ غالباً اس میں گلوریوں سے بھری ہوئی چاندی کی ڈبیا رکھی رہتی ہوگی۔

رنگ تو ان کا ٹھیک تھا، ناک، آنکھوں، چہرے اور جسم کی بناوٹ میں کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ تعلیم کے سلسلہ میں وہ چار پانچ برس کسی شہر میں رہ آئے تھے اس لئے خاص تعلیم نہ ہونے پر بھی شہری طور طریقوں اور وہاں کی رفتار سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں کمہار، دھوبی، بڑھئی، لوہار اور چمار وغیرہ کئی پیشے اور ذاتوں کے لوگ تھے جو انہیں کو زیب دیتے تھے۔

وہ بھی اپنے چند عزیزوں کے ہمراہ مجھے دیکھنے کے لئے آئے تھے چنانچہ اس بہانے ڈرامے میں مجھے ایک مرتبہ پھر حصہ لینا پڑا۔ چائے ناشتہ وغیرہ کے بعد مہمان رخصت ہو گئے۔

بعد ازاں پتا اور گاؤں کے چند معزز لوگ بر کے گاؤں گئے اور ان کا کاروبار دیکھ آئے۔ اسی طرح بر کے کچھ رشتہ دار بھی ہمارے گھر آئے اور ہماری زمینداری، مکان، آمدنی وغیرہ دیکھ گئے۔ والد صاحب نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ لڑکے کو گھر جوائی بنائیں گے۔ گھر جوائی ہونے کی حیثیت سے ساری زمینداری اور آمدنی لڑکے کے ہاتھ میں ہوگی۔ انہوں نے پر ان لوگوں نے مجھے پسند کر لیا تھا اور جہیز میں والد صاحب سے صرف دس ہزار کا مطالبہ کیا تھا۔ غرض یہ کہ ان کی نظر ہماری زمینداری اور جہیز پر تھی۔ ایسی صورت میں اگر کوئی کالی اور بدشکل لڑکی بھی ہوتی تو وہ بھی انہیں پسند آ جاتی۔

ہماری طرف والوں نے لڑکے کی عمر اور اس کی آمدنی دیکھ کر اُسے پسند کیا تھا۔ لڑکا زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ لیکن انہوں نے سوچا اس میں حرج بھی کیا ہے۔ لڑکی ایم۔ اے بھی ہو تو اس سے کیا بنتا بگڑتا ہے؟ آخر وہ ہے تو لڑکی ہی۔ کافی عمر ہونے کے بعد اسے کوئی ملازمت تھوڑی کرنی ہے۔ میں اسی قسم کی باتیں کر کے انہوں نے اس لڑکے سے میری شادی کی بات پکی کر لی۔

ایک روز دوپہر کو ماں اور والد صاحب ایک کمرہ میں بیٹھے ہوئے یونہی باتیں کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ باتیں میری شادی سے متعلق ہی تھیں۔ اب وہ مجھ سے بھی رائے لینا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مجھے بلا لیا۔

"منی!"

"آئی پتا جی!" یہ کہہ کر میں ان کے کمرے میں گئی اور انہیں کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا کر رہی تھی؟"

"کچھ نہیں۔ ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا خوب سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ تو جانتی ہے کہ تیرے لئے کئی بر آئے اور چلے گئے۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص تھا یہ بھی تجھے معلوم ہے۔ آج کل اچھے لڑکے ملنا بہت مشکل ہے۔ دانت ہیں تو چنے نہیں ہیں۔ اور چنے ہیں تو دانت نہیں ہیں بس یہی عالم ہے۔ اگر ہم آنے والے لڑکوں میں سے کسی کو بھی پسند نہ کریں تو لوگ اس کا کچھ اور ہی مطلب لگا لیں گے اور پھر آگے بر ملنا دوبھر ہو جائے گا۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس کے بعد بہتر بر کا نہ ملے۔ دراصل شادی میں عزت لڑکے والوں کی ہوتی ہے، لڑکی والوں کی نہیں۔ اس لئے آخر میں ہم نے سب کچھ سوچ بچار کر تیرے لئے جو بر پسند کیا ہے۔ وہ تجھے بھی پسند ہے نا؟ اس میں تو شک نہیں کہ تو اس سے زیادہ پڑھی لکھی ہے لیکن

اس کا رنگ تو کالا ہے۔ اگر کم پڑھا لکھا ہے تو کیا حرج ہے؟ کمائی میں وہ اچھے پڑھے لکھوں سے بھی لاکھ درجہ بہتر ہے۔ ہاں تو بتا اس لڑکے سے شادی کرنے کی تیری منشا ہے یا نہیں؟" والد صاحب نے پوچھا۔

"وہ تو بچی عمر والی تھوڑی ہی کرے گی؟ ہم لوگ اس کے دشمن تو نہیں ہیں۔ ہمیں جو پسند ہوگا وہی اس کو بھی پسند ہوگا۔ کیوں صحیح ہے نہ منتی؟" ماں نے کہا۔

"جی ہاں بجا ہے" میں نے جواب دیا۔

اس وقت کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے مجھے اثبات میں جواب دینا پڑا۔ میں نے اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کو دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے والدین کے لئے ایک بوجھ بنتی جا رہی ہوں۔ مجھے گاؤں والے بدنام کر رہے تھے۔ تعلیم یافتہ لڑکوں کے اناپ شناپ مطالبات دیال اور میرے درمیان رخنہ اڑانے والے ذات پات کے خیالات وغیرہ پر غور کرکے میں نے ہاں کہہ دینا ہی مناسب سمجھا۔ میں بھی تیار تھی کہ جو کچھ ہو دیکھا جائے گا۔ میری رائے معلوم کرکے میرے والدین بہت خوش ہوئے۔

چند روز بعد لڑکے والے کچھ لوگ شادی سے متعلق باتیں طے کرنے کے لئے ہمارے گھر آئے۔ پتا جی نے ان کے سب مطالبات منظور کر لئے۔ ان کے مطالبات کے مطابق برات لانے کے لئے سو بیل گاڑیاں، دس موٹریں اور دولہا راجہ کے لئے ایک اسپیشل ٹورنگ کار کا بندوبست کرنا تھا۔ میرٹھ سے اسپیشل بینڈ اور گوالیار سے ہاتھی بلانا تھا۔ شادی کا یہ سارا صرفہ دادا جی کو ہی کرنا تھا۔ اوپر سے دس ہزار روپے نقد جہیز میں دینا اور "کنیا دان" کرنا تھا۔ میرے آرام کے لئے دادا جی نے یہ سب قربانیاں دینا قبول کر لیا تھا۔ مئی کی پچیس تاریخ شادی کے لئے متعین ہو گئی۔ لیکن...

کیا میں شادماں تھی کہ میری شادی ہو رہی ہے؟ میں، میرا حسن، میری تعلیم اور میری آزادی کو کیا اس رسمی شادی میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل ہو رہی تھی؟ کیا میری تمنائیں اور میرے ارمان نہیں کچلے جا رہے تھے؟ مگر میں کرتی کیا؟ میری آئندہ زندگی میں مجھ پر کون کون سی مصیبتیں آنے والی ہیں۔ کن کن الجھنوں کا مجھے مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ سب اندیشے مجھے پریشان کئے دے رہے تھے۔

اسکول کی چھٹیاں ہو جانے کے بعد تقریباً دس دن تک میں گھر سے باہر بھی نہ نکل پائی تھی۔ میری شادی کی خبر سارے گاؤں میں بجلی کی طرح پھیل گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر راہ چلنے والی عورتیں آپس میں کانا پھوسی کرنے لگتی تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے چندا مالن کو دیکھا۔ میں نے سوچا اب وہ کیا افواہیں اڑاتی ہوگی۔ یہی کہتی ہوگی ـــــ لے ہو گئی شادی، اچھا ہوا اودھم اس چپر سے......

شادی کی خبر سب کے لئے باعث خوشی ثابت ہوئی۔ سبھی اس خیال سے مسرور تھے کہ میری شادی سے ان کے کھانے پینے کا موقع مل جائے گا۔

دعوت نامے چھپ چکے تھے۔ ایک دعوت نامہ اور اس کے ساتھ ایک طویل خط میں نے دیال کو بھی بھیج دیا۔ خط میں میں نے اپنے ہونے والے شوہر اور سسرال کے بارے میں سب کچھ سچ سچ لکھ دیا۔ مگر ساتھ ہی ان کے بارے میں اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ بس ان سے شادی میں شریک ہونے کی درخواست کی تھی۔ تین روز بعد ان کا جواب موصول ہوا۔

خط میں انہوں نے دعوت کے شکریہ کے بعد لکھا تھا کہ میں ولایت جانے کی تیاری میں ہوں۔ شادی میں شریک نہ ہونے کی معذرت چاہتا ہوں اور شادی کے مبارک موقع پر ایک چاندی کی ڈبیا انہوں نے تحفتاً ارسال کی تھی۔ خط پڑھ کر ان کے دستخط دیکھے تو میری نظر کے سامنے دیال کا مسکراتا ہوا چہرہ آ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا......

میری آنکھوں سے آنسو اس خط پر گر پڑے اور ان کے دستخط کچھ پھیل گئے۔

شادی کی تیاریاں بڑے زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ دادا جی نے سارے گاؤں کو شادی میں مدعو کیا تھا۔ گاؤں کے تمام مندروں میں پوجا ہو رہی تھی۔ سارے مندر، مکان اور دکانیں سجائی گئی تھیں۔ گاؤں میں ہر طرف صفائی ہوئی تھی۔ لوگ خوش تھے اور سارا گاؤں خوشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

آج برات آنے والی تھی، اس لئے گاؤں کے مرد عورتیں اور بچے صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس گاؤں کی سرحد پر برات کے خیر مقدم کے لئے شام سے ہی جمع ہونے لگے تھے۔

رات کے آٹھ بجے بیچاپیٹ کے چوکیدار نے سائکل سے آکر خبر دی کہ برات آ رہی ہے اور بیل گاڑیاں گاؤں کے بہت قریب آ گئی ہیں۔

دیکھتے دیکھتے رات کے دس بج گئے۔ برات کا ابھی تک پتہ نہ تھا۔ دادا جی نے ایک آدمی کو پھر سائکل پر دوڑایا۔ وہ آدھے گھنٹے میں واپس آیا اور اس نے کہا ـــــ "برات آ گئی"۔

بیل گاڑیوں میں جو براتی آئے تھے ان کی تعداد تقریباً آٹھ سو ہوگی۔

گیارہ بجے کے قریب موٹریں بھی آگئیں ان میں بھی کوئی تین سو سے کم آدمی نہ ہوں گے۔ اور ابھی تو دولہا کی ٹورنگ کار پیچھے ہی تھی۔ لڑکے والوں میں سے چند ذمہ دار اشخاص نے رات جلتے دیکھ کر دادا جی کو پیغام بھجوایا کہ وہ بڑھیں۔ دولہا کی کار بھی آتی ہی ہو گی۔ یہ پیغام سن کر دادا جی گاؤں کے بڑے بڑے لوگوں کو لے کر برات کے استقبال کے لئے گاؤں کی سرحد کی جانب چل پڑے۔

آگے آگے میرٹھ کا مشہور بینڈ بج رہا تھا۔ شہنائیوں کے سُر درمیان میں سنائی دے رہے تھے۔ ہر طرف آتشبازی چھوٹ رہی تھی۔ دولہا کو لانے کے لئے جلوس کے درمیان میں سجا ہوا ہاتھی چل رہا تھا۔ تین سو گیسوں کی روشنی چاندنی کی مانند پھیل گئی تھی۔

ابھی تک دولہا کا پتہ نہ تھا آئے ہوئے براتی اور لڑکے والے اپنی اپنی جگہ ٹھہرے رہے۔ دولہا کے آنے کے پہلے دوسرے لوگ گاؤں میں کیسے جا سکتے تھے اور اس طرح ٹھہرتے بھی کب تک۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔

بالآخر بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد والد صاحب نے کچھ لوگوں کو تبر کو لانے کے لئے اس کے گاؤں کی جانب موٹر میں روانہ کیا۔ رات کا ایک بجا چاہتا تھا اور دولہا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کی تلاش میں گئی ہوئی موٹر بھی واپس نہ آئی تھی۔ لوگ اکتا گئے۔ آخر کار لوگ تھک ہار کر گھروں کو واپس جانے لگے اور دولہا کو قصور وار ٹھہرا کر کہتے گئے ـــــ عجیب آدمی ہے، وقت کا اسے کوئی خیال ہی نہیں کوئی کہہ رہا تھا ـــــ کیا دولہا رام شادی سے پہلے ہی روٹھ گئے!

اور ادھر اس قسم کی غیر متوقع تاخیر کی وجہ سے والد صاحب کی طبیعت مکدر سی ہو رہی تھی۔ براتی بار بار یہی کہہ کر دلاسا دیتے کہ بس اب کار آتی ہی ہو گی۔ لڑکی والوں نے براتیوں سے کہا۔

"دولہا کو پیچھے چھوڑ کر آپ لوگ کیسے بڑھ آئے؟"

دو بج گئے۔ سب پریشان تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اس طرح کب تک جاگتے رہیں گے۔ اور یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دولہا کی تلاش میں بھیجی گئی موٹر واپس آگئی۔ اس میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے بڑی افسردگی سے لکنت بھرے لہجے میں کہا ـــــ "ٹورنگ کار راستہ میں الٹ گئی۔ بہت بڑا حادثہ ہوا ہے۔ دولہا کو میرٹھ کے ہسپتال میں لے گئے ہیں۔"

ہو چکا۔ سب کے چہرے مرجھا گئے۔ آئے ہوئے براتی انہیں موٹروں اور بیل گاڑیوں میں مغموم و ملول چہرے لئے ہوئے اپنے گاؤں کی جانب لوٹ گئے۔ دادا جی پر بجلی گر پڑی۔ شادی میں ایسے ناگہاں حادثہ کی خبر سن کر وہ دھم سے نیچے بیٹھ گئے۔ ماں نے سر پیٹ لیا۔ اور میں جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ اٹاری پر کھڑی ہوئی اپنے ہونے والے شوہر کو چپ چپ کر دیکھنا چاہتی تھی، یہ خبر سن کر بیہوش ہو گئی۔

٦

انسان کی فطرت ہے کہ وہ نیکی کی نسبت بدی کی طرف جلد رجوع کرتا ہے۔ اچھی باتیں اتنی سرعت سے لوگوں تک نہیں پہنچتیں جتنی کہ بری افواہیں۔ میری شادی کے رکنے، برات کے واپس چلے جانے اور دولہا کے حادثہ کے شکار ہونے کی خبر آگ کی طرح ایک لحظہ میں سب طرف پھیل گئی۔ قرب و جوار کے گاؤں میں بھی اس کی شہرت ہو گئی۔ اخبار والوں نے بھی اس خبر کو عجیب عجیب عنوانوں اور سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔

دادا جی نے آج تک عوام کی جو خدمت کی تھی، جو نام اور شہرت انہیں ملی تھی وہ سب ذرا سی دیر میں دھول میں مل گئی۔ ان کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید خودکشی کر لیتا لیکن وہ ایسے کمزور دل کے نہ تھے۔ اس حادثہ سے وہ ذرا نہ گھبرائے اور اس خبر کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے ایک اسپیشل کار میں گاؤں کے دو اشخاص کو لے کر تبر کو دیکھنے میرٹھ کو روانہ ہو گئے۔ ہمارے گھر جو مہمان آئے تھے اور بینڈ، ہاتھی وغیرہ کو رکنے کا حکم انہوں نے دیدیا تھا۔ چنانچہ سب ٹھہرے رہے۔

پہلے تو وہ میرٹھ کے ہسپتال میں پہنچے۔ وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس دن کے حادثہ کا کوئی بھی کیس ہسپتال میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اب وہ تاڑ گئے کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ حادثہ کی بات بالکل جھوٹی اور گھڑی ہوئی ہے۔ لڑکے والوں نے یا لڑکے نے خود ہی یہ دھوکا دیا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ ذرا ہراساں نہ ہوئے اور انہوں نے اپنی کار تبر کے گاؤں کی طرف بڑھا دی۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ بے خوف و خطر تبر کے مکان کے اندر چلے گئے اس طرح جیسے کوئی خاص بات ہوئی ہی نہیں۔

ہونے والا داماد اندر ایک کمرے میں دری پر تکیئے سے ٹیک کر بیٹھا تھا۔ سامنے ایک بڑا سا ایش ٹرے رکھا تھا جس میں بیڑیوں اور ماچس کی تیلیوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ دوسری طرف ایک پاندان رکھا تھا۔ اس کے ارد گرد اس کے دوست احباب بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ براتی بھی جو ابھی آئے

تھے وہیں بیٹھے تھے۔ دولہا سب کو تسلی دے رہے تھے اور صورت حال سمجھا رہے تھے۔ بعض لوگ باتیں کرتے ہوئے اور باتیں سنتے ہوئے بیڑیوں کے کش کھینچ رہے تھے۔ کوئی پان، تمباکو کھاکر باہر صحن میں پیک تھوک

دادا جی کو دیکھتے ہی سب کو سانپ سونگھ گیا۔ انہوں نے بَر کو اور موجودہ حضرات کو سلام کیا اور بَر کے قریب جاکر اپنی برابری والے لوگوں کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے دولہا سے مخاطب ہوکر کہا۔

"آپ آئے کیوں نہیں؟"

ہونے والے داماد نے ہنس کر کہا۔

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھر سے کچھ دیر سے روانہ ہوا تھا۔ آپ کے گاؤں کے نزدیک ہم لوگ پہنچا ہی چاہتے تھے کہ اچانک میرے دل میں زبردست تکلیف ہوئی۔ ایسی کہ میں کچھ بول بھی نہ سکا۔ وہ تو یہ کہئے کہ خوش قسمتی سے میرے چند احباب ساتھ تھے ورنہ شاید وہیں ختم ہو جاتا کیونکہ بیہوش ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں وہ لوگ مجھے میرٹھ کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ وہاں مجھے دس انجکشن دیئے گئے تب جاکر کہیں میری جان بچی۔ ہم لوگ ابھی بیس منٹ پہلے ہی یہاں پہنچے ہیں۔ میرے دوستوں نے آپ کو خبر تو پہنچا دی تھی نہ؟"

"اچھا اب تو آپ کی طبیعت ٹھیک معلوم ہو رہی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ ہمارا سب انتظام تیار ہے۔ آپ ابھی چلیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" دادا جی نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"ڈاکٹر نے مجھے مکمل آرام کرنے کے لئے کہا ہے۔" بَر نے عذر پیش کیا۔

"ہم آپ کو پھول کی طرح لے چلیں گے۔ تب تو کوئی حرج نہیں۔" دادا جی نے پھر درخواست کی۔

"جی نہیں، اب میں نہیں جاؤں گا۔" داماد کے لہجے میں یقین تھا۔

اس کے بعد والد صاحب نے بَر کے اور دیگر اعزا سے استدعا کی کہ اس خوشگوار موقع کو اس طرح ناشگفتہ اور بدمزہ نہ کریں۔ اور ان سے دولہا کو منانے کی التجا کی مگر سب بیکار رہا۔ سب نے لڑکے کی طرف انگلی اٹھا دی۔

اس کے پہلے والد صاحب نے زندگی میں کبھی کسی کے آگے سر نہ جھکایا تھا۔ مگر اس وقت وہ بالکل نڈھال ہو گئے تھے۔ بیٹی کی شادی کا نازک معاملہ تھا۔ بیچارے کرتے بھی کیا۔ انہوں نے کہا۔

"مگر اس صورت پر نہیں تو اگلے کسی موقع پر سہی۔" وہ اس سوال کے ذریعے وہ لڑکے والوں کے دل کی تھاہ لینا چاہتے تھے۔ مگر انہوں نے یہ تجویز بھی رد کر دی۔ بَر نے بھی کہا ـــــ "اب تو ہمیں معاف ہی کر دیجئے دادا جی، ہم مجبور ہیں۔"

دوسروں نے بھی اسی بے رخی سے جواب دیئے۔ دادا جی عجیب کشمکش و پیچ میں تھے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ ایک مرتبہ شادی طے ہو جانے کے بعد اس کے منقطع ہو جانے کا سبب کیا ہے۔ کوئی کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ بالآخر انہوں نے ایک ترکیب سوچی۔

بَر کے ایک دوست کو انہوں نے آہستہ سے اپنے پاس بلایا۔ "بے بھیا" دادا نے مخاطب کیا اور اس سے سچی سچی باتیں نکلوائیں۔ دوست نے کہا۔

"لڑکے کے دل میں نہ کوئی درد ہوا نہ ہم کسی ڈاکٹر کے ہاں گئے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ کی بدنامی سے بچنے کے لئے ہم نے یہ خبر اڑا دی تھی۔ اصلیت تو یہ ہے کہ ہم لوگ کار سے آپ کے گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ آپ کے گاؤں سے دو میل دور ایک بس اسٹاپ ہے۔ وہاں ہم نے اپنی کار تھوڑی دیر کے لئے روک لی اور ہوٹل میں چائے پینے چلے گئے۔ ہوٹل ایک عورت کا ہے۔ ہم لوگ چائے اور کچھ کھانے کی چیزوں کا آرڈر دے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت کے پاس ایک نوجوان بیوہ بیٹھی تھی۔ وہ دونوں آپس میں ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ ان کی آپس میں بہت بے تکلفی معلوم ہو رہی تھی۔ ہم چائے پینے لگے۔ اسی وقت بیوہ بولی ـــــ "شادی کیلئے جا رہے ہیں آپ لوگ؟"

"ہاں!" ہم میں سے ایک نے کہا۔

"مہمان ہیں آپ؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"نہیں ہم لوگ براتی ہیں۔ یہ دولہا ہیں" میں نے بَر کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"اوہ! یہ بات ہے!" اس نے قدرے حیران ہوکر کہا۔

"ہمیں ذرا دیر ہو گئی ہے، دوسرے لوگ آگے چلے گئے ہیں" ہم میں سے کسی اور نے کہا۔

"کیا آپ کو کوئی اچھی لڑکی نہیں ملی؟ معاف کیجئے گا آپ لوگ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں اس لئے دریافت کر رہی ہوں" اس بیوہ نے کہا۔

"یعنی تمہارا مطلب کیا ہے؟" ہم میں سے ایک نے پوچھا اور ہم سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"اب کہنے سے کیا فائدہ آپ کی شادی پہلے ہو چکی ہے۔ جاؤ اور شادی کر لو۔ اب بھلا اس میں مجھے سے حاصل بھی کیا؟" اس نے کہا۔

"نہیں نہیں، جو سچ بات ہے اُسے تو کہہ ڈالو۔ ابھی تو بھانڈا پھوٹا ہے۔" میں نے کہا۔

"اجی بابو صاحب، کیا دادا جی کبھی انہیں دس ہزار روپے جہیز میں دیتے۔ مگر کیا کریں بیچارے۔ بیٹی پھنس گئی تھی اسکول کے اچھوت ماسٹر سے۔ اور....." اس نے اپنی زبان چبالی۔

"سچ کہتی ہو؟" دولہا نے تعجب سے پوچھا۔

"میرے سر کی قسم! بالکل سچ ہے۔ جھوٹ بولنے سے مجھے کیا فائدہ؟" اس نے اپنے سر کو ہاتھ لگا کر کہا۔

بس ہو گیا۔ دولہا بدک گیا اور انہوں نے موٹر اپنے گھر کی طرف لوٹا دی۔ ہم نے اسے منانے کی بہت کوشش کی مگر اس نے ایک نہ مانی۔ بڑا ہیکڑ باز ہے۔ اب وہ آپ کی بیٹی سے ہرگز شادی نہ کرے گا۔ چنانچہ میرا تو یہی خیال ہے کہ اب اس مسئلہ کو مزید طول دیئے بغیر آپ خاموشی سے واپس چلے جائیے۔ اس سے کوئی توقع رکھنا بے سود ہے۔"

یہ سب قصہ سُنا کر وہ دوست پھر اپنے ساتھیوں میں جا کر بیٹھ گیا۔ دادا جی نے ایک لمبی آہ سرد بھری۔ آخر میں ایک مرتبہ پھر انہوں نے انہیں راضی کرنے کی ناکام کوشش کی اور موٹر وصرم پور کو روانہ ہو گئی۔

اس خبر کو سُن کر پتا جی کو بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ ان کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ کے ایک بزرگ نے مشورہ دیا کہ دوسرا بر فوراً تلاش کر کے شادی کر دی جائے۔ لیکن وہ اس کے لئے رضامند نہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ دوسرا اچھا بر فوراً ملنا بہت محال ہے بلکہ ملنا ناممکن ہے۔ کسی سے بھی اس کی شادی کر دینے کی بجائے وہ مجھے لڑکا سمجھ کر گھر میں ہی رکھنا بہتر سمجھتے تھے۔ آخر میرے لئے اس کے علاوہ ہے ہی کون؟ دوسرے یہ کہ اتنی عجلت کرنے سے لوگوں کو بیکار کا شبہ ہو جائے گا۔

گھر آ کر جیسے ہی جو جیسے ہوا تھا ادا کر کے چلتا کر دیا۔ ہاتھی اور بینڈ والے سب چلے گئے۔ بیاہ کے گاؤں کی دعوت کے لئے جو لڈو تیار ہوئے تھے وہ غریب غربا کو تقسیم کر دیئے گئے۔

شادی کا یہ گرینڈ ریہرسل ہو گیا۔

"اچھا ہی ہوا، دولہا دل کا مریض ہے۔ اس لئے وہ واپس چلا گیا۔ قسمت اچھی ہے ہماری ورنہ شادی کے بعد اگر یہ راز فاش ہوتا تو ہم کیا کر سکتے تھے؟ مجبوراً جو کچھ کیا ٹھیک ہی کیا۔" پتا جی نے سب سے یہی کہنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ تو اس کو مان لیتے تھے لیکن کچھ ذلیل لوگ اسے بھی دادا جی کی چالبازی سمجھتے تھے۔ شادی کے اس طرح ٹوٹ جانے سے پتا جی کا کافی صرفہ ہوا۔ صرف جہیز کی رقم ہاتھ سے نہ نکلی تھی۔ مگر انہوں نے کسی سے اس بات کی شکایت نہ کی تھی۔ انہیں تو صرف یہی ایک فکر کھا رہی تھی کہ وہ جھوٹی افواہ اُڑنے والی۔ رنگیلی جوان بیوہ کون ہوگی؟ اگر کھلے طور پر اس کی جانچ کرتے ہیں تو بھی آفت اور نہیں کرتے تو بھی مشکل۔ بس اسی پس و پیش میں وہ پڑے ہوئے تھے۔

مجھ سے اور ماں سے بھی والد صاحب نے یہی کہا تھا جو وہ اور لوگوں سے کہہ رہے تھے: "ہماری تو تقدیر اچھی تھی جو ہماری ستی بچ گئی۔ ورنہ اگر اس دل کے مریض کے پلّے بندھ گئی ہوتی تو؟ اس کی زندگی کا کیا اعتبار؟" اس طرح وہ اپنی عزت بچانے کی خاطر سب طرف پروپیگنڈہ تو کر رہے تھے، مگر دل ہی دل میں وہ گھلتے جا رہے تھے۔ میں اور ماں دونوں متوشش تھے۔ تمام گھر میں افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ تینوں پیٹ بھر کر کھاتا کھا نہ کھاتے تھے۔ میں کسی مزدوری کام سے نیچے آ جایا کرتی تھی۔ ورنہ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی پڑی رہتی تھی۔ بائیجا، دولو اور ہماری ہمسایہ آکر میرے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتیں اور دادا جی کو بھی دم دلاسا دیتی تھیں۔

چار پانچ روز کے بعد ایک دن پتا جی اور ماں دونوں میرے کمرے میں آئے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے شادی کے منقطع ہو جانے کا اصل سبب مجھے بتا دیا۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔

میں نے درمیان ہی میں انکی بات کاٹ کر کہا۔

"وہ رنگیلی، نوجوان بیوہ ہمارے گاؤں کی چندرا مالن ہی ہوگی۔ پتا جی اس گاؤں میں دیوی دیوتاؤں کا سا لباس پہن کر دیو لوگ اور چڑیلیں بستی ہیں۔ جانتے ہیں آپ؟"

"تو مجھے سکھا رہی ہے۔ میں نے اس گاؤں کی زمینداری میں ہی اپنے بال سفید کئے ہیں۔" دادا جی نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر آپ نے ان بدمعاشوں کو کیوں چھوٹ دے رکھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ اس جھگڑے میں پڑ کر کہیں گاؤں میں پھوٹ نہ ہو جائے۔ میں نے ابھی تک اس طرف توجہ نہیں دی۔" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن آپ کی یہ بے توجہی آپ ہی کے لئے نقصان کا باعث بن

پوچھو" میں نے کہا۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ ہونے دو میرا نقصان۔ ایک بار تیری شادی کر دوں پھر دیکھتا ہوں ان لوگوں کو۔" انہوں نے کچھ چڑھ کر کہا، ان کے لہجے میں تلخی تھی۔

"میری شادی! اب تک جو کچھ ہوا ہے اس پر میں نے سنجیدگی سے غور کیا ہے پتا جی۔ آپ بھی اپنے سماج سے اب اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔ خود کو محفوظ سمجھنے والے کتنے جاہل اور گنوار ہوتے ہیں۔ اور دولت کے بل پر ناچنے والے گنوار کتنے بیوقوف ہوتے ہیں۔ گاؤں کی ایک طوائف کی بات پر یقین کر کے سچ اور جھوٹ میں تمیز کئے بغیر وہ لڑکا شادی کے لئے آتا ہوا بھی واپس چلا گیا۔ کیا معنی ہیں اس بات کے؟ میں تو اسی لئے اس شادی ہی سے بیاہ جانے کو راضی ہو گئی تھی کہ آپ دونوں کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ اور اب جبکہ یہ معاملہ ختم ہو گیا ہے تو میرے خیال میں تو بہت عمدہ ہوا۔ اس سے میری زندگی میں آنے والے مصائب ٹل گئے۔ نہ معلوم میرے ساتھ سسرال میں کیا سلوک ہوتا۔ میری ہر بات معیوب سمجھی جاتی اور میری ہر نقل و حرکت پر وہ لوگ اعتراض کیا کرتے۔ اب تو آپ میری شادی کا خیال ہی ترک کر دیجئے۔ میں خود اپنا بیاہ رچا لوں گی، ورنہ کنواری ہی رہوں گی۔ جو چاہا تو بیچاری ہو جاؤں گی، ورنہ تا زیست استانی بنی رہوں گی۔

"پتا جی آپ کے قدموں کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میرا اور دیال کا تعلق بالکل پاک صاف ہے۔ گاؤں کی چنڈال چوکڑی نے یہ ہنگامہ کھڑا کر کے میری زندگی سے کھلواڑ کی ہے۔ وہ ذلیل لوگ کیا جانیں کہ یہ آپکے لئے کس قدر مہلک ثابت ہوا ہے۔ ہجوم کا دل ہلکا ہوتا ہے۔ وہ تو جو کچھ سنتا ہے اسے فوراً قبول کر لیتا ہے۔ اس میں نیک و بد کی تمیز کرنے کا مادہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے یہ واقعہ رونما ہوا ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ اب آپ اس معاملہ کو مزید الجھانے کی کوشش نہ کریں۔" میرے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ میری پلکیں بھیگ گئی تھیں اور آواز درمیان میں بھرا جاتی تھی۔

"کیوں اتنی تعلیم دی تھی کو ہم نے؟ اگر بچپن ہی میں اس کی شادی کر دیتے تو بہتر تھا۔" ماں نے والد صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ تو ممتا رکھا سے پوچھو۔" انہوں نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ "آپ سچ کہتی ہیں ماں۔ ہمارے سماج میں لڑکے جتنے تعلیم یافتہ ہونے چاہئیں اتنے ابھی تک نہیں ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر لڑکیاں زیادہ پڑھ لیں گی تو یہی حشر ہوگا۔"

"خیر جب تک تیری شادی نہ ہو جائے تب تک تو اگر اسکول میں نہ جائے تو کیا حرج ہے۔" والد صاحب نے مجھے مشورہ دیا۔

"کیا حرج ہے؟ لوگوں کا شبہ اور بڑھے گا۔ وہ کہیں گے کہ ہم جو کہتے تھے وہ سچ ہے۔ اس کے علاوہ میں نے عام جلسہ میں استانی کا کام کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اب اس کا کیا ہوگا؟ مہرشی جٹا شنکر کا ہم پر سے اعتبار اٹھ جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو سچ کہتی ہے تو۔" پتا جی بولے۔

اسی وقت دیوار پر ٹنگے ٹائم پیس نے گر گر ٹن کر کے رات کے دو بجائے۔

"چلو اب سو جائیں۔ رات بہت جا چکی ہے۔" ماں نے کہا۔

"ہاں ہو تو گئی۔" یہ کہتے ہوئے پتا جی بھی اٹھے۔

ان کے چلے جانے کے بعد میں نے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی، مگر نیند نہ آئی۔ اب تک جو واقعات ہو چکے تھے سب کے سب فلم کی طرح میرے دماغ میں آنے لگے۔ آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں اگر شادی کروں گی تو دیال ہی سے کروں گی۔ اس فیصلہ میں دیال سے محبت کے ساتھ ہی گاؤں والوں سے انتقام کا جذبہ بھی مضمر تھا۔ سماج اور گاؤں والوں نے میرا اب تک جو نقصان کیا تھا اس سے زیادہ وہ اب کیا کر سکتے تھے۔ انہوں نے کسی طرح میرا اور دیال کا رشتہ بھی جوڑ ہی دیا تھا۔ پھر اب کس بات کا ڈر تھا۔ مگر کیا دیال یہ اقدام کر سکیں گے؟

ہاں میں یہی کروں گی۔ وہ تعلیم کے لئے ولایت جا ہی رہے ہیں۔ ان کے وہاں پہنچنے پر میں بھی کسی مضمون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت چلی جاؤں گی۔ وہاں ہم دونوں ساتھ رہیں گے اور کورس پورا ہونے پر شادی کر لیں گے۔ اگر جی چاہا تو ہندوستان واپس آئیں گے ورنہ وہیں رہنے لگیں گے۔ وہاں ہمارے تعلقات پر نکتہ چینی کرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔

لیکن ابھی دیال سے اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں کہنا چاہئے۔ ولایت پہنچ کر اگر یہ باتیں ہوں تو اچھا ہے۔ اگر کسی وجہ سے میں وہاں نہ جا سکی تو اس کے بارے میں بعد میں غور کر لیا جائے گا۔ مگر میرے لئے ولایت جانا ناممکن کیوں ہے؟ صرف ایک ہی تو بات ہے کہ ماں باپ میری جدائی برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اور اگر میری شادی ہو جاتی تو کیا مجھے سسرال نہ جانا پڑتا؟ بس یہی بات ہے جس سے وہ دونوں راضی کئے جا سکتے ہیں۔

اور اسی قسم کے خیالات میں الجھی ہوئی میں صبح کے وقت نہ جانے کب سو گئی۔

جولائی کا مہینہ آ گیا۔ اسکول کے کھلنے کے پہلے ہی دیال دھرم پور آ گئے۔ میری شادی کے ٹوٹنے کی خبر وہ اخباروں میں پڑھ ہی چکے تھے۔ اس لئے دھرم پور آتے ہی انہوں نے مجھے تسلی و تشفی دی۔ ہمارے اسکول کا کام باقاعدگی سے شروع ہو گیا۔ اب میں حسب معمول اسکول جانے لگی تھی۔

ایک دن میں نے ان سے کہا۔

"میں بھی انگلستان جا رہی ہوں"

"سچ؟"

"ہاں"

"تو میرے ساتھ ہی چلو نہ"

"نہیں۔ یہ ممکن نہیں۔ آپ وہاں پہنچ جایئے اور وہاں سے کسی کورس کے بارے میں تفصیل سے مجھے لکھیئے، تب میں آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے، یہی سہی" دیال نے کہا۔

"گذرے ہوئے واقعات کو بھلا دینے کی مجھے ایک نئی ترکیب سجھائی دے رہی ہے۔ آپ کو پسند ہے یہ خیال؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں خیال تو ٹھیک ہے" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن ایک بات ہے۔ جس طرح آپ کی بدولت میری شادی ٹوٹ گئی اسی طرح آپ کی وجہ سے کہیں میرا ولایت جانا نہ رک جائے۔" میں نے کہا

"کیا کہا؟ میری وجہ سے تمہاری شادی ٹوٹ گئی" دیال نے حیرت سے پوچھا۔

"لوگوں نے ہم دونوں کا رشتہ جوڑ دیا" میں نے کہا۔

"وہ لوگ کتنے ذلیل ہیں۔ انہیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ تم کس قدر پاکیزہ جذبات کے ساتھ اسکول میں کام کرتی ہو۔ اچھا تو میں ہی ولایت چلا جاتا ہوں تاکہ ان کا منہ بند ہو جائے۔ دراصل وقت یہ ہے کہ ابھی تک پورے خرچ کا بندوبست نہیں ہو سکا۔ اور جب تک وہ نہیں ہو جاتا مجھے یہیں رکنا پڑے گا۔ تمہارا باہر جانے کا خیال بہت مستحسن ہے اور مجھے بے حد پسند ہے۔ میں وہاں پہنچتے ہی تمہارے لئے جو مناسب مضمون ہوگا اس کے کورس وغیرہ میں تمہیں ارسال کر دوں گا۔" دیال نے بے چارگی سے کہا۔

"دیکھوں آپ کیا کرتے ہیں؟" میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور

ہم اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

چھٹی کا گھنٹہ بجا۔ دن بھر لڑکوں کو پڑھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مگر اپنا کام مکمل کر کے جب استاد گھر کو واپس ہوتے ہیں تو کچھ ہلکا پن محسوس کرتے ہیں۔ میں بھی اسی خیال میں منہمک چلی جا رہی تھی کہ ایک لڑکے نے آ کر کہا۔

"آپ کو سر بلا رہے ہیں" اور میں اس کے ساتھ چلی۔

دیال [illegible] پڑھا کر ابھی لوٹے تھے۔ میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کہیئے کیا حکم ہے؟"

"حکم نہیں ایک گذارش ہے منی جی" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن اس سے پہلے ایک درخواست میری ہے" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"آئندہ سے آپ مجھے منی نہ کہا کریں۔ میرا نام کملی ہے۔ مجھے اسی نام سے پکارا کیجیئے"

"کیوں؟"

"بس میری مرضی یوں"

"بہت بہتر" اور یہ کہہ کر وہ ہنس دیئے۔

"آپ نے مجھے بلایا کیوں تھا؟"

"ہاں تم کو بلایا کیوں تھا میں نے؟" پھر سر کھجا کر وہ یاد کرنے لگے۔

اسی وقت ڈاکخانہ سے تار لے کر چپراسی آیا۔ "تار ہے صاحب" اس نے کہا۔

"کس کا تار؟" دیال نے پوچھا۔

"آپ کا" اس نے جواب دیا۔

دیال نے دستخط کئے اور تار وصول کیا۔

"کیا کوئی خاص بات ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہم چلے انگلینڈ دسہرے پر۔ جہاز میں سیٹ مل گئی ہے۔ تلامہ شی جا[illegible] کا ہے۔ اب ضروری کپڑے بنوانے اور کچھ سامان وغیرہ خریدنے کے لئے مجھے ایک مرتبہ بمبئی جانا پڑے گا۔" انہوں نے کہا۔

"مبارک ہو"

"شکریہ"

اسی وقت ایک رکشا دھڑدھڑاتا ہوا وہاں آگیا۔ اس نے دیال کو اشارے سے بلایا اور اس سے کچھ کہا۔ ”میں وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔
”تو میں چلتا ہوں۔“ میں نے اس سے رخصت لینا چاہی۔
”جائیے، کل ذرا جلدی آ جائیے گا۔“
”بہت بہتر۔ آپ انگلستان جانے کے خواب دیکھیے۔“ یہ اور میں وہاں سے چل دیا۔ دور جاکر میں نے مڑکر دیکھا تو دیال کی نگاہیں میری طرف لگی ہوئی تھیں۔

۷

بدمعاشوں اور مفسدوں کی اصلاح غیر ممکن ہے۔ ان کی اصلاح کرنے کی اگر کوشش کی جائے تو انسان خود بیوقوف بن سکتا ہے۔ یا اس کا نتیجہ خلاف امید برعکس بھی نکل سکتا ہے اور وہی لوگ ناقابل اصلاح بھی بن سکتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں پنت اور اس کا گروہ کچھ ایسے ہی رہ رہا تھا۔ انہوں نے جو کچھ اس عرصہ میں کیا تھا اسے دہرانا بیکار ہے۔ مگر ان کی بد اعمالیوں کو روکنے یا ان کا مقابلہ کرنے کی کوئی ہمت نہ کرتا تھا۔ دادا جی نے بھی کسی نہ کسی وجہ سے اس کی طرف سے بے توجہی برتی تھی۔ مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ اس گروہ نے میری شادی کا رشتہ منقطع کرا دیا ہے تو اس طرف انہوں نے رجوع کیا۔ بظاہر تو ان کے پنت کی طرف سے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن درپردہ وہ اس سے انتقام لینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اور کسی موزوں گھڑی کے منتظر تھے۔ جب دل میں انتقام کی آگ کا دھواں اٹھنا شروع ہو جاتا ہے تو پھر وہ بیتاب ہو کر قبل از وقت ہی اپنا وجود ظاہر کر دیتی ہے۔ والد صاحب کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے۔

والد صاحب نے گاؤں کے کچھ لوگوں کے سامنے واضح طور پر یہ الزام لگایا کہ میری شادی میں رخنہ چندرا نے ہی ڈالا ہے۔ اور صرف الزام لگا کر ہی وہ خاموش نہیں ہو گئے بلکہ انہوں نے کچھ بھلا برا بھی پنت اور اس کے گروہ والوں کو کہا۔ اس کی خبر پنت اور چندرا کو لگی۔ پھر کیا کہنا تھا۔ والد صاحب نے ناگ اور ناگن کے بل میں صرف ہاتھ ہی ڈالا تھا کہ اس سانپ کی جوڑی نے ہمیشہ کے لئے انہیں اپنا دشمن بنا لیا۔

آج تک دادا جی نے پنت کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی تھی۔ اور ادھر پنت بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ دادا جی اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہیں اور وہ انہیں حسب منشا نچا سکتا ہے۔ چونکہ اب تک اسے اپنے ہر ناپاک ارادہ میں کامیابی حاصل ہوئی تھی اس لئے اس پر کچھ نشہ سا چڑھ گیا تھا۔ حال ہی کے دو ایک معاملات میں پنت کی جھوٹی رپورٹ پر دادا جی نے اپنے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اسے مجبوراً سچی رپورٹ لکھنا پڑی تھی۔ نتیجہ کے طور پر اس نے جو رشوت لی تھی اس کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ اور جن لوگوں نے اسے رشوت دی تھی وہ کھلم کھلا اسے گالیاں دینے لگے۔

ایک بات اور ہو گئی تھی۔ پنت اور اس کے گروہ کی کرتوتوں کا علم جب دیال کو ہوا تو انہوں نے فرصت کے وقت گاؤں کے لوگوں میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگوں کو مناسب صلاح دیتے۔ ان کے باہمی جھگڑے نپٹاتے اور کچہری میں جانے والے معاملوں کا آپس میں سمجھوتہ کرا دیتے تھے۔ ان کے فیصلے سے دونوں فریقین مطمئن ہو جاتے تھے۔ اس طرح دیال کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی، اور پنت کی آمدنی گھٹتی جا رہی تھی لہذا پنت دیال سے حسد رکھنے لگا تھا۔

ستمبر کا مہینہ تھا۔ گاؤں میں ہر سو تاریکی تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دھرم پور گاؤں کالی کملی اوڑھ کر گہری نیند سو رہا ہے۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے درخت بھی ساکت تھے۔ کتوں کا بھونکنا بند تھا۔ رات کے کیڑوں کی ”کر کر“ آواز آ رہی تھی۔ اور کہیں کسی درخت پر الّو چلّا رہا تھا۔ گاؤں میں صرف گشت والے گھوم رہے تھے اور گاؤں کے باہر......

تین میل دور جنگل میں ایک پہاڑی پر ہنومان جی کے پرانے مندر میں بڑی چہل پہل تھی۔ پنت اور اس کے گروہ کے لوگ حسب معمول وہاں جمع تھے۔ آج OK گانے کا پروگرام نہ تھا۔ درمیان میں قالین پر پنت بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں اس کی داشتہ چندرا جو زرق برق ساڑی اور سونے کے زیورات سے آراستہ تھی، بیٹھی ہوئی تھی۔ ارد گرد اس کے گروہ کے لوگ بیٹھے تھے۔ آج ان کا کھانا پنت کی طرف سے تھا۔ خود چندرا نے سارا انتظام کیا تھا۔ کھانا ابھی ابھی ختم ہوا تھا اس لئے لوگ پان تمباکو کھاتے ہوئے بیڑی اور سگریٹ کے کش کھینچ رہے تھے۔ ہنسی مذاق اور گپوں کا بازار گرم تھا۔ بعض لوگوں نے تاش کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ کل ملا کر کوئی تیس آدمی تھے۔

"چندرا آج میٹھا تو ہو گیا۔ اب ایک دن نمکین بھی ہو جائے" ملیا نے کہا۔

"وہ بھی ہو سکتا ہے، لیکن ....." چندرا نے کہا۔

"ہمارے ہوتے ہوئے تمہارے لیکن کا مطلب؟" ملیا نے سوال کیا۔

"راشننگ کا زمانہ ہے نہ؟ کہیں پتہ لگ گیا تو؟" چندرا نے جواب دیا۔

"بس اتنی سی بات؟ کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ ہمارے کس کام کا پتہ لگا ہے آج تک؟" کلیا نے کہا۔

"مگر اب حالات بدل گئے ہیں، اس لئے ......" پنت نے کہا۔

"آپ بھی ایسی باتیں کرنے لگے جناب؟ اس طرح مایوس ہونے کی وجہ؟" شنکریہ نے پوچھا۔

"آخر ایسی کون سی صورت پیدا ہو گئی ہے اب کچھ بتاؤ بھی تو؟" گپیوسنار نے پنت سے پوچھا۔

"وہی اب میں کہہ رہا ہوں" پنت نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر کہئے؟" ہنومنت درزی نے بے چین ہو کر کہا۔

"اچھا تو سب کو خاموش کر دو اور سنو" پنت نے کہا۔

"بھائیو سنو! پنت کچھ کہہ رہے ہیں۔ چپ ہو جاؤ، سنو سنو" کلیا چلایا۔

سب لوگ اٹھ کر قاعدے سے بیٹھ گئے۔ شور و غل بند ہو گیا۔ پنت کی تقریر سننے کے لئے سب لوگ اشتیاق سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ادھ جلی بیڑی اور سگریٹ کے ٹوٹے لوگوں نے باہر پھینک دیئے۔ بعض لوگوں نے پان بھی تھوک دیئے۔ سب لوگ پنت اور چندرا کو گھیر کر ایک غول میں بیٹھ گئے۔

"ہاں کہئے، اب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" چندرا نے پنت سے کہا۔

پنت کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات نمودار ہوئے اور اس نے کہا ——

"بھائیو! ہم لوگ اپنی دنیاوی تکالیف کو فراموش کرنے کے لئے اٹھتے بیٹھتے اور اپنا دل بہلاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے دوسروں کا کلیجہ کیوں جلتا ہے؟ گذشتہ کئی برس ہم نے بڑے اطمینان اور خوشی سے بسر کئے ہیں۔ مگر اس سال سے گاؤں کی فضا کچھ مکدر ہو گئی ہے۔ جب سے اپنا اسکول کھلا ہے اور وہ دیال ماسٹر آیا ہے تب سے اس نے رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے۔ ماسٹری کرنا چھوڑ کر وہ گاؤں کے معاملوں میں بھی مخل ہونے لگا ہے۔ وہ مجھے اور تم سب لوگوں کو بدنام کرتا پھرتا ہے۔ یہ تو تم سب لوگوں کو معلوم ہے کہ اس کے زمیندار کا بیٹی سے ناجائز تعلقات ہیں۔ تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ اس چھوکری کی برات گاؤں میں آکر واپس ہو گئی تھی۔ اگر ایسی گندی باتیں ہم اپنے گاؤں میں ہونے دیں گے تو ہمارے لئے بہت شرم کی بات ہے۔ داداجی زمیندار جیسا بدمعاش ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اس کا اپنا لونڈا یا کچھ کوئی اور نہیں اور اوپر سے کہتا پھرتا ہے کہ چندرا نے اس کی بیٹی کی شادی توڑ دی۔ گویا ہماری چندرا کو دنیا کا کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔

آج تک میں نے اس کا ساتھ دیا۔ میری بدولت ہی وہ زمینداری بھی کر سکا، اگر میں اس کا ساتھ نہ دیتا تو وہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ مگر آج وہ ان تمام احسانوں کو فراموش کر رہا ہے۔ وہ بوڑھا شیطان بھی میرے خلاف ہو گیا ہے۔ میری بات چھوڑو، وہ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا، مگر تم لوگ ذرا ہوشیار ہو جاؤ۔ اس کی بیٹی کی شادی کا رشتہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ سارے گاؤں پر خار کھائے بیٹھا ہے۔ لیکن کیا اس کی یہ بوکھلاہٹ نامناسب نہیں ہے؟ اگر اس کا سکہ کھوٹا ہے تو گاؤں والوں کا اس میں کیا قصور؟ اس کے لئے میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔ سنو اور بتاؤ تمہیں پسند ہے یا نہیں؟"

"بتلایئے بتلایئے وہ کون سی ترکیب ہے؟" سب لوگ ایکدم چلا پڑے۔

"دیال ماسٹر کو گاؤں سے نکال دینا چاہئے" پنت نے آنکھوں سے انگارے برساتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، ضرور نکال دینا چاہئے" سب نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔

"بیلیا، ملیا، کلیا!" پنت نے بآواز بلند ان تینوں کو للکارا۔

"جی" تینوں نے ایک ساتھ کہا۔

"تمہیں کو یہ کام کرنا پڑے گا" اس نے "تمہیں" پر زور دیا۔

"کل ہی نکالے دیتے ہیں یہ کون بڑی بات ہے" کلیا نے کہا۔

"کیا کروگے تم ؟" پنت نے کڑک کر کہا۔

"اسے اٹھا کر گاؤں کے باہر لے جائیں گے۔ مار مار کر اس کا کچومر نکال دیں گے اور کہیں گے کہ گاؤں سے چپ چاپ بھاگ جا ورنہ تیری خیر نہیں۔ اگر زیادہ گڑبڑ کرے گا تو وہیں ختم کر دیں گے۔" کلیا نے کہا۔

پنت نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا ـــــ "نہیں، یہ کافی نہیں۔ کل رات اسکول میں آگ لگا دو۔ اس سے دو کام ہو جائیں گے۔ ایک تو زمیندار کی کوٹھی جل کر خاک ہو جائے گی۔ اور دوسرے اسکول بند ہو جائے گا۔ اور پھر ماسٹر خود ہی چلا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ کل رات ہی اسکول میں آگ لگا دیں گے۔ صبح آپ کو اس جگہ راکھ کا ڈھیر ملے گا۔" کلیا نے کہا۔

"ہاں پر ایک بات کا خیال رکھنا ـــــ تم میں سے کئی کے لڑکے رات کو اسکول میں پڑھنے جاتے ہیں اور وہیں سوتے ہیں۔ کسی بہانے انہیں کل رات کو اسکول میں نہ جانے دینا۔ اور اگر جائیں تو بھی کم از کم انہیں وہاں سونے نہ دینا۔" پنت نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ لڑکوں سے اس کے متعلق کچھ بھی نہ کہا جائے تو بہتر ہے۔ اگر ہم نے لڑکوں کو پہلے سے ہی متنبہ کر دیا، تو ہماری سازش کا بھانڈا پھوٹ سکتا ہے۔ لڑکوں کو وہاں حسب معمول جانے دیا جائے، مگر آگ لگانے سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ سب لڑکے باہر نکل آئے ہیں یا نہیں۔ اور جب وہ سب کے سب باہر نکل آئیں تب آگ لگا دی جائے۔" گروہ کے ایک ممبر نے صلاح دی۔

"ہاں ہاں ایسا بھی کر سکتے ہو۔ کچھ بھی کرو، یہ کام ہونا چاہیے۔" چندرا نے کہا۔

"اب رات بہت ہو گئی ہے۔ تمہیں کام بتلا دیا گیا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کام بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے نیز خفیہ طور پر کیا جائے۔ سب کام اس خوبصورتی سے ہو کہ اسکول میں کب آگ لگی؟ کس نے لگائی؟ کس طرح لگائی؟ اس کا کسی کو سراغ نہ ملے۔ اگر ذرا بھی پتہ چل گیا تو آفت آ جائے گی۔ سمجھے؟" پنت نے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ اور سب لوگ اپنے اپنے ہتھیار لے کر اٹھ گئے اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

پنت نے چندرا کی طرف اور چندرا نے پنت کی طرف اطمینان کی نظروں سے دیکھا۔

دوسرے دن سورج نکلا۔ اسکول حسب معمول کھلا اور بند ہوا۔

انگلینڈ کی تاریخ میں پارلیمنٹ اڑا دینے کی ایک سازش مشہور ہے۔ ایک گروہ نے یہ سازش کی تھی اور اسے صیغۂ راز میں رکھنے کی ہر ممکن کوشش بھی کی تھی۔ لیکن اس گروہ کے ایک شخص نے اپنے ایک عزیز کو خط لکھ کر یہ اطلاع دی تھی کہ فلاں دن تم پارلیمنٹ میں حاضر نہ ہونا۔ اور اسی بے احتیاطی سے اس سازش کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ سچ ہے محبت پاگل ہوتی ہے۔

پنت کے گروہ کے ان لوگوں نے جن کے لڑکے اسکول میں رات کو پڑھنے اور سونے آیا کرتے تھے، اپنے لڑکوں کو مختلف طریقوں سے آنے والی مصیبت سے آگاہ کر دیا تھا۔ بعض لوگوں نے تو اپنے لڑکوں کو اس رات اسکول میں سونے سے منع کر دیا تھا۔ چند لوگوں نے کسی نہ کسی بہانے اپنے لڑکوں کو اسکول نہ بھیجنے کا ہی انتظام کر لیا تھا۔ کسی نے یہ کہہ کر اپنے بچوں کو چیتاونی دی تھی کہ دیکھو سنبھل کر رہنا آج رات تمہارے اسکول میں کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے۔

ان اطلاعات کا مطلب لڑکے نہ سمجھ پائے تھے۔ کیونکہ وہ انہیں یونہی رواروی میں دی گئی تھیں۔ اس کے باوجود چند لڑکے گھر والوں کی آنکھ بچا کر رات کو ہمیشہ کی طرح پڑھنے اور سونے چلے آئے تھے۔ بعض لڑکوں نے اپنے گھر والوں کی مخالفت کی تھی اور ان کی چیتاونی پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ پھر بھی روز کی بہ نسبت آج لڑکوں کی تعداد کم تھی۔

روزانہ کی بہ نسبت لڑکوں کی تعداد کم دیکھ کر دیال نے یونہی دریافت کیا۔

"کیوں بھئی آج لڑکے بہت غیر حاضر ہیں۔ کیا بات ہے؟ کیا گاؤں میں کوئی سینما یا سرکس آیا ہے؟"

"نہیں سر۔ بلکہ ...." ایک لڑکے نے کہا۔

"بلکہ کیا؟" دیال نے پوچھا۔

"آج کچھ ...." لڑکا کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟ کیا بات ہے؟" دیال نے چڑھ کر پوچھا۔

"آج کچھ ہنگامہ ہونے والا ہے سر۔" لڑکے نے کہا۔

"کہاں؟" دیال نے پوچھا۔

"یہیں ہمارے اسکول میں سر" جواب ملا۔

"کیوں جی یہ کیا کہہ رہا ہے" دیال نے سب لڑکوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں سر" سب نے ایکدم کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہاں کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے؟" دیال نے سب لڑکوں سے دریافت کیا۔

"ہمارے گھر والوں نے ہمیں اطلاع دی ہے" مدھوکر ستار نے کہا۔

"سچ سچ؟"

"جی ہاں سر" ہر لڑکے نے جواب دیا۔

پہلے تو دیال سمجھ ہی نہ سکے کہ ان کے خلاف کون سی سازش کی گئی ہے۔ مگر وہ پسنت اور اس کے گروہ کی کرتوتوں سے بخوبی واقف تھے۔ اور انہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ کس وقت کیا کر بیٹھیں گے اس کا پتہ نہیں۔ اس لئے انہیں آنے والی مصیبت کا کچھ اندازہ ہو گیا۔ پھر بھی وہ ذرا نہ گھبرائے اور انہوں نے سب طلباء سے کہا ــــ

"تم لوگ بکواس کر رہے ہو۔ کیا تم اسے ممکن سمجھتے ہو؟ پڑھو اور بے خوف سو جاؤ" دیال کا حکم سن کر لڑکے اپنی کتابوں میں منہ چھپا کر آپس میں کچھ سرگوشیاں کرتے رہے۔ دیال بھی اپنے کمرہ میں جا کر انہیں خیالات میں منہمک ہو گئے۔

لڑکے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہو یا جھوٹ لیکن مجھے اس کے لئے محتاط رہنا چاہیئے۔ جاہل لوگوں کا کیا بھروسہ؟ آج جس کے نام کے نعرے لگا رہے ہیں اسی کا کل قتل کرنے سے نہیں چوکتے۔ مہاتما گاندھی جیسے قابل پرستش ہستی کا بھی انہوں نے خون کر دیا تھا....

دیال اٹھے انہوں نے دو خط جلدی جلدی لکھے۔ پھر دو لڑکوں کو بلایا اور انہیں خط دیکر کہا ــــ "بالکل خفیہ طریقے سے بھیج کے جاؤ۔ دیکھو کسی کو پتہ نہ چلے" لڑکے خط لے کر دوڑتے چلے گئے۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب میں گاؤں کے متعدد غنڈوں نے بڑا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ اس وقت گاؤں کے تحفظ کے لئے دھرم پور کے چند نوجوانوں نے رضاکار پارٹی قائم کی تھی۔ اس پارٹی کے لیڈر دیال کے گہرے دوست تھے۔ اور انہیں بہت چاہتے تھے۔ لڑکوں کے ہاتھ دیال نے انہیں لوگوں کو رقعے بھیجے تھے۔ انہوں نے اس میں انہیں اسکول پر آنے والی مصیبت سے آگاہ کیا تھا۔ اور ان سے امداد طلب کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد لڑکے ان خطوں کو لیکر دوڑتے ہوئے واپس آئے۔ ان لوگوں نے دیال کو صرف مدد دینے کا ہی وعدہ نہیں کیا بلکہ رات بھر اسکول کی نگرانی کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا۔

دس بجے حسب معمول دعا ہوئی اور دیال نے سب لڑکوں کو سونے کا حکم دیا اور خود بھی اپنے بستر پر آکر لیٹ گئے۔

ان کے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے ـــ میں اچھوت ہوں کیا اسی لئے لوگ میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن میری تقریروں میں تو آج تک کسی نے گڑبڑ نہیں کی۔ پھر کیا گنول سے میرا رشتہ جوڑ کر لوگ مجھ سے انتقام لے رہے ہیں؟ مگر گاؤں کے کچھ لوگ جانتے ہیں کہ اس معاملہ میں میں کتنا محتاط ہوں۔ کہیں پسنت بعد اس کی تو کوئی ناپاک ارادہ نہیں؟ لیکن میں نے اس کی کھلم کھلا کبھی مخالفت نہیں کی۔ پھر، وہ ابھی ہی تو مجھے بھگانے کے فراق میں نہیں ہیں۔ لیکن ان جیسا نیک آدمی ایسا تو نہیں کر سکتا۔ خیر مجھے جرأت سے کام لینا چاہیئے اور جو کچھ ہو اس کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیئے۔

نیم بیداری کے عالم میں وہ انہیں متفرق باتوں پر غور کر رہے تھے کہ کسی نے باہر سے آواز دی ــــ

"ماسٹر صاحب! او دیال ماسٹر صاحب"

دیال نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ماسٹر! دیال ماسٹر!" یہ چلاتے ہوئے کسی شخص نے دروازے کی کنڈی کو زور زور سے بجانا شروع کیا۔ آنکھوں کی کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے دیال نے پوچھا ــــ

"کون ہے؟"

"میں ہوں، ہنومنت راؤ دیوان جی"

"کہیئے ہنومنت راؤ جی اتنی رات گئے کیسے؟" دیال نے بڑی نرمی سے دریافت کیا۔

"پہلے دروازہ تو کھولئے، پھر بتاتا ہوں" اس نے جواب دیا۔

"کئی دروازوں میں تالے پڑے ہیں۔ آپ بتلائیے تو سہی آخر چاہتے کیا ہیں؟"

"وہ بچارا نامعلوم گھر سے روٹھ کر چلا آیا ہے۔ اس نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہو۔ اسے پیچھے لے آئیے۔" ہنومنت نے اصرار کیا۔

"بہت اچھا ذرا ٹھہریئے۔" دیال نے کہا۔

دیال نے نام دیو کو جگایا اور اس سے معلوم کیا۔ "کیا تو روٹھ کر گھر سے آیا ہے؟"

"نہیں سر۔"

"تیرے چاچا جی تو کہہ رہے ہیں۔" دیال نے ڈانٹا۔

"کہاں ہیں چاچا جی؟" نام دیو نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"نیچے کھڑے ہیں۔"

"آپ کی قسم سر میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ روٹھا ہوا نہیں ہوں۔" نام دیو نے کہا۔

"نہیں مجھے یقین نہیں، تو جھوٹ بول رہا ہے۔ چل، نیچے اپنے باپ کے پاس۔"

"چلئے سر ابھی آپ کو یقین آجائے گا۔" نام دیو نے نڈر ہو کر کہا۔

دیال اور نام دیو نیچے گئے۔ دیال نے دروازہ کھولا اور ہاتھ سے لالٹین کو سامنے بڑھا کر ہنومنت سے مخاطب ہوئے ——— "آپکا نامو تو کہہ رہا ہے کہ وہ کھانا کھا کر آیا ہے۔"

ہنومنت نے نام دیو کا کان پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا گھر لے گیا۔ تھوڑی دور جانے پر اس نے اس سے کہا ——— "ابے گدھے میں نے تجھ سے کیا کہا تھا؟ کیوں آیا تھا یہاں مرنے؟"

دیال کے کانوں نے یہ الفاظ سنے اور ان کا دماغ روشن ہو گیا۔ ہنومنت جھوٹ بولا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا لڑکا کسی طرح اسکول میں نہ رہے۔ خیر۔ انہوں نے کواڑ بند کئے اور اس واقعہ پر غور کرتے ہوئے لیٹ گئے۔ اسی وقت نیند میں ایک لڑکا چیخ اٹھا۔

"سر دروازہ نہ کھولئے۔ ٹھہریئے، ٹھہریئے۔"

وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ دیال نے اسے تھپک کر سلا دیا۔

دیال کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ وہ کروٹیں بدل رہے تھے کہ رات کے دو بج گئے اور..... اسکول کے سامنے انہیں کچھ شور و غوغا سنائی دیا۔

"ماسٹر دروازہ کھولو۔"

دیال نے اٹاری کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ باہر گھنا اندھیرا ہونے کی وجہ سے دس پندرہ مشعلیں صاف دکھائی دے رہی تھیں ——— ان مشعلوں کی روشنی میں بھالے، تلواریں، پستول اور بندوق وغیرہ ہتھیار چمک رہے تھے۔ ان ہتھیاروں سے لیس کوئی دس پندرہ آدمی کالے نقاب اوڑھ کر اسکول کے صدر دروازہ کو جھڑ جھڑا رہے تھے۔ اب دیال کو آنے والی مصیبت کا علم ہو گیا۔ انہوں نے آہستہ سے کچھ لڑکوں کو جگایا اور انہیں عقبی دروازے سے رضاکاروں کو بلانے کیلئے بھیج دیا۔

دروازے پر زور زور سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ دیال نے سوچا اب ڈرنے سے کام نہ چلے گا۔ اس مصیبت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ دیال نے لالٹین روشن کی اور سب لڑکوں کو بیدار کر دیا۔ لڑکے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ دیال نے ان سے کہا ———

"چلو جلدی کرو ورنہ جل مروگے۔" سب لڑکے دروازے کے پاس آئے۔ دیال نے کواڑ کھول دیئے اور وہاں کھڑے ہو گئے۔ دیال نے لڑکوں کے درمیان کھڑے ہو کر کہا ——— "ڈاکوؤ! ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ لوگ کون ہیں؟ کوئی بھی ہوں مگر ایک بات یقینی ہے کہ یہ تمہارے اسکول میں آگ لگانا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ تم پڑھ لکھ کر قابل بنو۔" پھر انہوں نے نقاب پوشوں سے خطاب کیا ———

"بھائیو! ان معصوم بچوں نے آپ کا کون سا نقصان کیا ہے۔ اسکے قصور کی آپ لوگ مجھے سزا دیجئے، اور اگر آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہو تو میں ہر قسم کی سزا کے لئے تیار ہوں، مگر اس اسکول کو۔ لڑکوں کے اس مدرسہ کو نہ جلایئے۔"

"سب لڑکے باہر آ گئے؟" نقاب پوشوں میں سے ایک نے گرج کر کہا۔

"نہیں ابھی سب باہر نہیں آئے ہیں۔ ابھی بھی کچھ بچے اندر سوئے ہوئے ہیں۔" دیال نے کہا۔

"ابے او ماسٹر کے بچے! نکال انہیں باہر۔ کھڑا کھڑا کیا دیکھ رہا ہے؟" ان میں سے کسی نے کہا۔

لڑکے گھبرا گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ دیال اسکول کے اندر گئے اور یہ دیکھ کر کہ کوئی وہاں سوتا ہوا تو نہیں رہ گیا ہے۔ نیچے آ گئے۔

"چل دور ہو یہاں سے، سنبھال اپنے لونڈوں کو۔" یہ کہہ کر نقاب پوش اپنی اپنی مشعلیں لے کر اسکول کی جانب بڑھنے لگے۔ اسی

وقت سیٹیوں کی آوازیں آئیں اور ٹارچ کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ رضاکاروں کا ایک گروہ دوڑتا ہوا مدد کے لئے آرہا تھا اور ادھر لڑکوں نے نقاب پوشوں پر پتھراؤ شروع کر دیا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر حملہ آوروں نے انہیں پولیس کی ٹولی سمجھا اور وہ ڈر کر اپنی اپنی مشعل وہیں پھینک کر اندھیرے میں بھاگ گئے۔

دیال نے رضاکاروں کی بر وقت آمد کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا۔
اسکول کی عمارت بچ گئی۔

پنتے اور اس کے گروہ کے ناپاک ارادے خاک میں مل گئے۔

۸

جب خوشی اور غم کا احساس بیک وقت ہونے لگتا ہے تو دل کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو جاتی ہے۔ ٹھیک یہی عالم دیال کا بھی تھا۔ گزشتہ واقعات کو یاد کر کے وہ بے حد مغموم و ملول ہو جاتے تھے اور جب ولایت جانے کا خیال آتا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ ایک روز اسکول میں چھٹیاں ہوگئیں تو ہنستے ہی انہوں نے مجھ سے کہا۔

"تمہارے گاؤں سے تو اب میرا دل بالکل اکتا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی یہاں سے جا بھی سکوں گا یا نہیں؟"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"لوگ سب کچھ کر چکے۔ اب کرنے کے لئے باقی کیا رہ گیا ہے؟" انہوں نے کہا۔

"بس؟ آپ اتنے سے ہی گھبرا گئے؟ زندگی میں خوشی و غم تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ جہاز پر قدم رکھتے ہی آپ یہ سب بھول جائیں گے۔" میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم کہتی تو سچ ہو۔ میں ولایت جا رہا ہوں۔ پھر بھلا وہاں سے واپسی کی کیا امید؟"

"جی ہاں کیوں نہ ہو؟ آپ مرد جو ٹھہرے، جو چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن میں؟" میں نے کہا۔

"تمہیں کس بات کی تکلیف ہے؟"

"لوگ پرائے دکھ کو ہمیشہ ایسا ہی سمجھا کرتے ہیں۔ خود کو نہیں دیکھتے؟ لوگوں نے اسکول کے بارے میں تھوڑی سی گڑبڑ کر دی اور اتنے ہی آپ اس قدر بے چین ہو گئے کہ اتنے جلدی گاؤں چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن ذرا میری طرف تو دیکھئے کہ میرے ہاتھ پیلے ہونے سے پہلے ہی گاؤں والوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کس قدر کوفت ہوئی ہوگی مجھے! کیا آپ میری تکلیف کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ بتائیے کہاں جاؤں میں، کیا کروں؟ ایسی صورت میں گاؤں میں ہی پڑے رہنے کے علاوہ میرے پاس چارہ کار ہی کیا ہے؟" میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"تم بھی تو انگلینڈ آرہی ہو نہ؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ تو تبھی ممکن ہے جب آپ وہاں سے مجھے کورس بھیجیں گے، اور دادا جی مجھے ولایت جانے کی اجازت دے دیں گے۔" یہ کہہ کر میں رک گئی۔

"تم ضرور آؤ گی۔" انہوں نے کہا۔

"آپ تو تعلیم ختم کرنے کے بعد وہاں سے واپس نہیں آئیں گے لیکن میں کیا واپس آجاؤں گی؟" میں نے سوال کیا۔

"تم بھی وہیں رہ جانا، تمہیں روکتا کون ہے؟" انہوں نے جواب دیا۔

"اچھا اچھا سوچ نہ کہا، بس اور......" میں نے کہا۔

کسی کام سے دیال وہاں سے چلے گئے اور میں بھی اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

اسکول کی چھٹی ہونے کے بعد میں گھر واپس آئی۔ ماں جلد ہی جین مندر سے واپس آئی تھیں انہوں نے مجھے بلا کر کہا ــــ "منی تو آجکل جین مندر میں نہیں جاتی کیا بات ہے؟"

"کس طرح جاؤں، اسکول میں پڑھانے کے بعد اس قابل ہی نہیں رہتی کہ کہیں جاؤں۔" میں نے جواب دیا۔

"ایک روز کی چھٹی لے کر ہی آجا۔" انہوں نے کہا۔

"بہت اچھا، کل آؤں گی۔" زیادہ بحث سے بہتر میں نے ان سے وعدہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

رات کو اپنے کمرے میں میں لڑکوں کی کاپیاں جانچ رہی تھی۔ ماں جلدی سو گئی تھیں۔ تقریباً دس بجے مجھے پتا جی نے بلایا۔ میں ان کے کمرے میں گئی۔ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ آج کوئی خاص بات ہوگی۔ انہوں نے کہنا شروع کیا ــــ

"کیا تو جانتی ہے کہ تیرے پیروں تلے کیا جل رہا ہے؟ لوگ تیرے بارے میں کیا باتیں کرتے ہیں؟"

میرے متعلق کچھ ان کو علم ہو سکتا ہے، اسکول اور گھر کے علاوہ میں گاؤں میں جاتی ہی کہاں ہوں؟" میں نے جواب دیا۔

"[illegible] تو لوگ کچھ کہیں گے۔"

"اگر لوگ میرے متعلق غلط باتیں کرتے پھرتے ہیں تو میں اس کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟" میں نے سوال کیا۔

"اب اسکول جانا بند کر دے۔" دادا جی نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے گستاخی سے کہا۔

"اس لئے کہ میں نے سنا ہے کہ تو وہاں ایک اچھوت کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر کے ہمارے خاندان کے منہ پر کالک پوتنا چاہتی ہے۔"

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟"

"کہتا کون؟ لوگ کہہ رہے ہیں۔ کیا وہ سب جھوٹ بولتے ہیں؟" انہوں نے ڈانٹ کر کہا۔

"آپ جانتے ہیں کہ لوگوں نے ہی میری شادی کا رشتہ توڑا اور آج جب وہ میرے متعلق یہ افواہ اڑا رہے ہیں تو آپ نے اس پر یقین کر لیا؟" میں نے کہا۔

"ہاں سب جھوٹے ہیں، ایک تو ہی سچائی کی دیوی ہے اس دنیا میں۔"

"اگر مجھے وہاں سے شادی کرنا ہوتی تو جس سے آپ نے میرا رشتہ طے کیا تھا اس سے شادی کرنے کے لئے میں کیوں تیار ہو جاتی۔ مگر میں نے آپ سے کبھی اس کے بارے میں کچھ کہا؟"

"وہاں ہی کی وجہ سے تیرا وہ رشتہ منقطع ہوا۔ اسی کی وجہ سے اسکول میں آگ لگنے کی سازش ہوئی۔ لیکن اب وہ بھی یہاں سے جانے کیلئے تیار نہیں۔ آخر کیوں رکا ہوا ہے وہ؟"

"وہ جلد ہی جا رہے ہیں۔ اگر فوراً چلے جاتے تب بھی لوگوں کا شبہ قائم رہتا۔ دوسرے ہریش نے خود انہیں یہاں چند روز ٹھہرنے کے لئے کہا ہے۔" میں نے کہا۔

"زہر کی زیادہ جانچ سے حاصل؟ بہتر تو یہی ہے کہ اسکول جانا فوراً بند کر دے۔" انہوں نے زور دے کر کہا۔

"اگر آپ کا یہی حکم ہے تو میں اسکول نہ جاؤں گی۔ لیکن وہ تو اب جانے والے ہی ہیں۔ اس لئے کچھ عرصہ کے لئے ایسا کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس سے تو لوگوں کو مجھے بدنام کرنے کا اور موقع ملے گا۔"

"کہہ دے اس سے کہ وہ جلد منہ کالا کرے۔" دادا صاحب نے حقارت سے کہا۔

"ٹھیک ہے، تمہیں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ آفت جلد از جلد یہاں سے ٹل جائے اسی لئے اس داڑھی والے کو مجھے پانچ ہزار روپے دینے پڑے۔" انہوں نے خشمناک ہو کر کہا۔

"آپ کو چاہیے تھا کہ نہ دیتے۔"

"تیری خاطر ہی مجھے ایسا کرنا پڑا۔"

"اچھا ہوا۔"

"اچھا ہوا نا؟ کسی سے کہنا مت۔ جا اب جا کر سو جا۔"

میں اٹھی اور جا کر اپنے کمرے میں سو گئی۔

صبح اسکول پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہاں جانے والے ہیں اور ان کی جگہ میں ہیڈ مسٹریس مقرر کر دی گئی ہوں۔ ساتھ ہی میری مدد کے لئے ایک اور خاتون کا تقرر بھی ہو گیا ہے۔

وہاں کے دھرم پور سے چلے جانے کے بعد گاؤں میں فتنہ و فساد کرنے والوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ہمارے اسکول کا کام بھی بڑی باقاعدگی سے چلتا رہا۔ ماں اور دادا جی بھی اب بہت خوش تھے۔

ایک روز شام کو ماں کو کچھ حرارت سی ہو گئی۔ ہم سمجھے کہ یہ سب تھکاوٹ اور اُپواس (روزہ) رکھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ لیکن وہ تو تین چار روز تک باقی رہا۔ پہلے تو ان کا علاج گاؤں کے وید نے کیا۔ لیکن جب اس سے ماں کو کوئی افاقہ نہ ہوا تو دادا جی نے سانگلی سے ڈاکٹر بلایا۔

ڈاکٹر روزانہ سانگلی سے دھرم پور آتا تھا اور ماں کو انجکشن اور دوا دے کر واپس ہو جاتا تھا۔

پندرہ روز گذر گئے مگر ماں کا بخار نہ اترا۔ آج سولھویں رات تھی۔ باہر اندھیری رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ایسے سکوت کے وقت کہیں سے الّو کے بولنے کی آواز آئی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ماں نے بڑے نحیف لہجے میں کہا ــــــ "منی تو الّو کی آواز سے ڈرتی ہے۔"

"نہیں تو ماں۔" میں نے جواب دیا۔

ماں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر آنکھوں میں آنسو لا کر کہا ــــــ

"منّی بٹیا! اب میرے دن پورے ہو گئے ہیں۔ میں نے حتی الوسع اپنے خاندان کی خدمت کی۔ اور میں ایشور کی کرپا سے آج تک سکھی رہی۔ اب مجھے فکر ہے تو صرف تیری۔ اگر میری زندگی میں ہی تیرے ہاتھ رنگ جاتے تو......" اور پھر انہیں ہچکیاں آنے لگیں۔ اور انہیں ہچکیوں کے درمیان انہوں نے نقاہت بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

"انہیں تو بُلا....."

میں نے گھبرا کر والد صاحب کو جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے اور ماں کے بستر کے پاس آئے تو ماں.....

ماں ہمیں چھوڑ کر ملک عدم کو جا چکی تھیں۔

زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی کی جدائی کا غم سہنا پڑا۔ ماں اس دنیا سے کیا گئیں میرے اوپر پہاڑ ٹوٹ پڑا اور میں دن رات حزن و ملال میں کاٹتی رہی۔

اسی دوران میں ایک اور اہم واقعہ رونما ہوا جس سے کہ دھرم پور کے لوگ میری ماں کی موت کو بھول گئے۔ وہ تھا بھی اسی قدر اہم۔ وہ تھا ـــــــ

پنت کا قتل۔

۹

پنت کے قتل کی خبر پاتے ہی گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ ہنومان جی کے مندر پہ لوگوں کا جم غفیر اُمڈ پڑا۔ واردات کے مقام پہ ہر آدمی پہنچنا چاہتا تھا۔ مندر کے اندرونی حصہ میں پنت کی لاش پڑی تھی جس کے ہاتھ پیر کٹے ہوئے تھے اور دھڑ سر سے غائب تھا۔ چاروں طرف خون ہی خون تھا۔ اور اس کا کٹا ہوا سر مندر کے دروازہ پہ لٹکا دیا گیا تھا۔ وہ منظر بہت ہی بھیانک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔

خون کس نے کیا؟ کیوں کیا؟ ان سوالوں کے جوابات لوگ اپنی اپنی عقل کے مطابق خود دے رہے تھے۔ بعض لوگوں کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ کئی خون اور چوریاں ہضم کرنے والے شخص کا یہ انجام کیسے ہوا۔ پنت نے جن لوگوں کی مدد کی تھی، خواہ وہ کسی طرح کی کیوں نہ ہو، وہ اس کے اس دردناک قتل پہ افسوس ظاہر کر رہے تھے۔ اور جن لوگوں کو اس نے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی یا پہنچایا تھا وہ اسکی موت پر شادماں تھے اور کہہ رہے تھے ـــــــ "ایسے شخصوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔"

سارا گاؤں وہاں ٹوٹ پڑا تھا۔ لیکن تعجب کی بات تو یہ تھی کہ پنت کے گروہ کا ایک بھی رکن وہاں موجود نہ تھا۔ گویا اپنی عدم موجودگی سے لوگوں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ ان کا پنت کے قتل سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور نہ ہی وہ اس حادثہ سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس خوفناک حادثہ کے رونما ہونے کے پہلے ہی چندرا کسی دوسرے گاؤں میں چلی گئی تھی۔

دادا جی نے اس قتل کی رپورٹ فوراً پولیس کو دیدی۔ اور خبر پاتے ہی تھانیدار اور پولیس کے چند سپاہی موٹر سے دھرم پور آ گئے۔ انہوں نے اپنی تحقیقات شروع کر دیں۔ پنت کی بیوی کا بیان ہوا۔ وہ بیچاری پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے منہ سے ٹھیک طرح الفاظ بھی ادا نہ ہو پاتے تھے۔ تین روز تک تفتیش ہوتی رہی۔ اور آخر کار پولیس نے محض شبہ پر پنت کے تمام ساتھیوں کو حراست میں لے لیا۔ تیس مجرموں پر خون اور چوری کے الزامات لگا کر پولیس نے انہیں مجسٹریٹ کے سامنے عدالت میں پیش کیا اور پھر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا۔

پولیس نے گنپت سنار کو سرکاری گواہ بنا لیا اور اس نے عدالت کے سامنے جو بیان دیا اس میں پنت اور اس کے گروہ کی ساری پول کھل گئی۔ بیان مندرجہ ذیل تھا ـــــــ

"ہمارا گروہ گذشتہ تیس سال سے دھرم پور میں کام کر رہا ہے۔ مجرم ۱ سے لے کر مجرم ۳۰ تک سب لوگ ہمارے گروہ کے اراکین تھے۔ پنت اس گروہ کا لیڈر تھا۔ اس کی بات پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ کسی کو اسکی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس نے سیکڑوں چوریاں اور متعدد خون ہضم کر لئے تھے۔ کئی مرتبہ موٹی موٹی رشوتیں لی تھیں۔ بلیا، ملیا اور کلیا نے کئی جگہ ڈاکے ڈالے ہیں اور لوٹ مار کی ہے۔ لوٹ مار میں جو زیورات حاصل ہوتے تھے وہ گلانے کے لئے مجھے دیئے جاتے تھے۔ اور اس کام کیلئے مجھے مناسب معاوضہ دیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی لوٹ کا حصہ بھی ملتا تھا۔ گلا ہوا سونا، چاندی بھیکو بنیا بیوپار کرتا تھا۔ چونکہ لوٹ میں سب کو مناسب حصہ مل جایا کرتا تھا اس لئے کسی کو کوئی شکایت پنت سے نہ تھی اور ہم سب لوگ ایک کنبہ کی طرح رہتے تھے۔

چندرا مالن ایک عرصے سے پنت کی داشتہ ہے۔ ادھر چند دنوں سے پنت اور چندرا میں من مٹاؤ ہو گیا تھا۔ بلیا، ملیا اور کلیا کو پنت نے

دھرم پور کے اسکول کو جلانے کا حکم دیا تھا۔ مگر وہ اس کام میں ناکام رہے۔ چنانچہ پنت ان پر بہت بگڑا اور اس نے ان کو بہت مغلظات گالیاں دیں۔ ایک چوری کے معاملے میں بھی یلیا، ملیا اور کلیا کو پنت نے بہت پریشان کیا اور ان کا سارا حصہ وہ خود ہی ہڑپ کر گیا۔ لہٰذا یہ تینوں اس پر ناراض ہوئے اور انہوں نے اس سے انتقام لینے کی ٹھانی — وہ موقع کے منتظر تھے۔ چندرا مالن کو اب بوڑھے پنت سے تسلی نہ ہوتی تھی۔ اس لئے وہ اپنا تعلق یلیا، ملیا اور کلیا سے قائم کر چکی تھی اور وہ اس طرح کہ ان تینوں میں سے کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا تعلق دوسرے سے ہے۔ پنت کے قتل کی سازش کا منصوبہ تیار کرنے والی بھی یہی مالن تھی کیونکہ وہ ان تینوں کے ساتھ نڈر ہو کر اپنا تعلق قائم رکھنا چاہتی تھی۔ دادا جی ایلینداری کی بیٹی کی شادی کا رشتہ بھی پنت نے توڑا تھا۔ یہ بات اس نے ہمارے گروہ میں کئی مرتبہ کہی تھی اور نہایت فخریہ انداز میں۔

پنت کے قتل کی سازش بنا کر چندرا دوسرے گاؤں کو چلی گئی تھی۔

جس روز قتل ہوا اس روز ہم سب حسب معمول ہنومان جی کے مندر میں جمع ہوئے تھے۔ جب پنت بلاتا تھا تو ہم اسی طرح مندر میں جمع ہوا کرتے تھے۔ ہر ماہ کم از کم ایک مرتبہ یہ پروگرام ضرور ہوتا تھا۔

اس روز پنت نشے میں مست تھا اور اس نے ہم سب کو اور خصوصاً یلیا، ملیا اور کلیا کو اس بری طرح آڑے ہاتھوں لیا، ایسی گندی گندی گالیاں سنائیں کہ وہ آگ بگولا ہو گئے اور ان کی قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے۔ انہوں نے ہم سب کے سامنے ہی پنت کو پکڑ لیا اور بڑی بے دردی سے اس کا قتل کر دیا۔ ہم سب خوفزدہ ہو کر اپنی اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔"

اور بھی کئی لوگوں کی شہادتیں ہوئیں۔ بہت سے ثبوت پیش کئے گئے۔ اور آخر میں فیصلہ سنا دیا گیا۔ یلیا، ملیا اور کلیا اور چندرا کو پھانسی کی سزائیں ہوئیں۔ دوسروں کو بھی لمبی لمبی سزائیں ہوئیں۔ اور اس طرح گاؤں میں غلاظت پھیلانے والا یہ گروہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور گاؤں پاک ہو گیا۔

پنت کے قتل کے بعد وہ ساری باتیں جن کے بارے میں لوگ تاریکی میں تھے یا غلط فہمی میں مبتلا تھے واضح طور پر سامنے آ گئیں — دیال جا چکا تھا اس لئے دادا جی بھی اب خوش تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ایک دن ہمت کر کے ان کے پاس پہنچ ہی گئی۔

"پتا جی، ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"پوچھو"

"آپ اجازت دیں گے؟"

"اگر اجازت دینے کے قابل بات ہوگی تو ضرور دوں گا۔"

"ویسے اجازت کے قابل تو نہیں ہے۔"

"ایسی کون سی بات ہے؟ آخر سنوں تو۔" ان کا اشتیاق بڑھ گیا۔

"بات یہ ....." میں کہتے کہتے رک گئی۔

"کہو تو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں انگلینڈ جانا چاہتی ہوں۔"

"کس لئے؟"

"اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے۔"

"تو جتنا پڑھ چکی ہے، وہی بہت کافی ہے۔ جیسی سماج میں تیرے برابر پڑھی لکھی لڑکیاں کہاں ہیں؟ اب اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تجھے کیا کرنا ہے؟ کہیں ملازمت نوکری نہیں ہے تجھے۔ تیری ماں کہتی تھی کہ جتنا تو پڑھ چکی ہے وہ بہت ہے اور مجھے بھی اب محسوس ہو رہا ہے کہ اگر میں پہلے ہی تیری شادی کر دیتا تو بہتر ہوتا۔ ایک تو اب تیری عمر کافی ہو چکی ہے دوسرے ایک بار تیری برات گھر آ کر واپس جا چکی ہے۔ اس لئے اب تیری شادی بہت مشکل ہو گئی ہے۔ تاہم میں کوشاں ہوں۔ شادی کے بعد دولہا دلہن دونوں اگر انگلینڈ چلے جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا، میں بڑی خوشی سے اجازت دے دوں گا۔ ہمارے سماج کی حالت تجھ پر عیاں ہے۔ جہاں لڑکے نہیں پڑھ سکتے وہاں لڑکیاں کیا پڑھیں گی۔ کوئی ایک آدھ اگر اتفاق سے پڑھ گئی تو لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر حال ہی میں تیری ماں کا انتقال ہوا ہے۔ تو بھی اگر ولایت چلی جائے گی تو میرا کیا ہوگا؟ میں تنہا کیسے جیوں گا۔ پھر غیر ملک میں تجھے وہ کھانا کھانا پڑے گا جو ہمارے مذہب کی رو سے ممنوع ہے۔ کیا تو وہاں جا کر اپنے مذہب اور ذات کو ترک کر دینا چاہتی ہے؟ دیال بھی انگلینڈ میں ہی ہے۔ تو خواہ کتنے ہی پاک ارادہ سے وہاں جائے لیکن لوگ کیا سمجھیں گے؟ اس لئے میری رائے تو یہ ہے کہ اس غلط خیال کو اپنے ذہن سے نکال دے۔"

"پتا جی فضول شک میں پڑنے سے کیا فائدہ؟ مجھے آپ اجازت

"دیکھئے میں ایک سال میں تعلیم پا کر واپس آجاؤں گی۔"

"تو یہاں جو چاہے کر سکتی ہے۔ اگر چاہے تو ایک اسکول اور قائم کر لے۔ میں روپیہ دوں گا، اس کے تمام اخراجات برداشت کروں گا، مگر ولایت جانے کا خیال ترک کر دے۔"

"میں تو جاؤں گی۔ آپ دو چار دن اور غور کر لیجئے۔" یہ کہتی ہوئی میں کمرے سے چل دی۔

پتا جی میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں جلدی جلدی زینے طے کر کے اپنے کمرے میں آئی اور پلنگ پر لیٹ کر کتاب پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے ہی مجھے نیند آگئی۔

دوسرے دن جب صبح میں اٹھی تو دیکھا کہ روزانہ سویرے اٹھ جانے والے پتا جی ابھی تک بستر پر لیٹے ہیں۔ میں ان کے پاس گئی اور پوچھا۔

"پتا جی، آپ ابھی تک سو رہے ہیں؟"

"ہاں، کل رات نیند ہی نہیں آئی۔"

"کیوں؟"

"اسلئے کہ تو ولایت جا رہی ہے۔"

"تو کیا رات بھر آپ میرے متعلق ہی سوچتے رہے تھے؟"

"اور کیا؟"

"تو آخر کیا طے کیا آپ نے؟"

"یہی کہ ولایت جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"یہ فیصلہ کرنے کیلئے آپ رات بھر جاگتے رہے؟"

"ہاں۔"

"اچھا تو اب اٹھئے۔ میں آپکی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی۔"

"میرا جسم کچھ بھاری ہے، شاید بخار بھی ہو۔" والد صاحب نے بمشکل کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

میں نے ان کے جسم کو چھو کر دیکھا۔ انہیں بخار بہت تیز تھا۔ میں نے انہیں بستر پر ہی اٹھا کر بٹھایا اور منہ دھونے کے لئے بائیجا سے گرم پانی لانے کے لئے کہا۔ پتا جی نے منہ دھو کر چائے پی۔

دولو وید کو بلانے کیلئے گیا۔

ڈاکٹر آکر انجکشن دے گئے۔ ڈاکٹر کی آمد کی خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ سارا گاؤں عیادت کو آیا۔ میں اسکول میں ہی تھی کہ ملازم نے آکر خبر دی کہ والد صاحب پر بخار کی شدت کی وجہ سے ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ میں فوراً گھر آئی تو دیکھا کہ وہ بار بار [illegible] کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے ــــ "میں چلا، مجھے تم چھوڑ دو، تم کہیں جاؤ مجھ کو کوئی سروکار نہیں۔"

پڑوس کے دو آدمی جن کو دولو پکڑ لایا تھا، پتا جی کو پکڑے ہوئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے ایک آدمی اسپیشل کار سے سانگلی بھیجا اور خود ان کے پاس بیٹھ گئی۔ پتا جی کی وہی حالت جاری تھی۔ وہ اٹھ کر باہر جانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن میں اور بائیجا انہیں پکڑ کر لٹا دیتی تھیں۔

میں اور بائیجا ساری رات ان کے پاس بیٹھے رہے۔ باہر دولو اور دوسرے ملازم بیٹھے تھے۔ پتا جی کا بڑھتا ہوا بخار اور ان کی بڑبڑاہٹ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا کر رہی تھی۔ بائیجا کے کندھے پر سر رکھ کر میں دو تین بار رو بھی پڑی۔ وہ بیچاری مجھے بار بار دم دلاسا دیتی رہی۔ رات جیسے تیسے گذری۔ دوسرے دن ڈاکٹر پھر آئے اور انجکشن لگا کر چلے گئے۔

شام کو بخار کی شدت قدرے کم ہوئی اور اس سے مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ مگر رات کے بارہ بجے کے بعد بخار پھر تیز ہو گیا۔ اور وہ پہلے کی طرح پھر بڑبڑانے لگے۔ میں یہ خیال کر کے کہ کیا ماں کی طرح پتا جی بھی مجھے تنہا چھوڑ کر چلے جائیں گے رونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اٹھی اور باورچی خانہ میں جا کر تھوڑی راکھ لے آئی۔ پھر برآمدے میں گئی، جہاں ماں کی تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے میں دوزانو ہو لی، اور میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ

"ماں تم تو مجھے چھوڑ کر چلی گئیں لیکن پتا جی کو تو کچھ دن میرے پاس رہنے دو۔ میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں گی۔ جب سے میں نے ان سے ولایت جانے کی بات کہی ہے تبھی سے ان کا یہ حال ہے۔ انہیں جلدی اچھا کر دو۔"

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں نے وہ راکھ لا کر پتا جی کو لگا دی اور دوسرے روز سے وہ اچھے ہونے لگے۔

وقت بڑی سرعت سے گذرتا جا رہا تھا۔ ایک روز میں اتوار کو اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ایک ماہنامہ کے ورق الٹ رہی تھی کہ اچانک میری نظر ایک نظم پر پڑی اور میں اسے پڑھنے لگی۔ نظم پڑھ کر میں بہت متاثر ہوئی۔ یکایک میرے ذہن میں یہ منحوس خیال پیدا ہوا کہ اگر والد

صاحب نے مجھے انگلینڈ جانے کی اجازت نہ دی تو ؟

میں نے وہ رسالہ پرے پھینک دیا اور ٹائمز آف انڈیا کا تازہ پرچہ کھول لیا۔ ابھی سرخیوں پر نظر ڈالی ہی تھی کہ میری نظر ایک خبر پر پڑی اور میں اسے شروع سے آخر تک پڑھ گئی۔ پڑھتے پڑھتے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ پرچہ میرے ہاتھ سے نیچے گر پڑا ہے۔ اس خبر کو میں نے کئی مرتبہ پڑھا اور آخر میں اپنا سر پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خبر تھی ——

ہیون جہاز کا حادثہ

"کل قریب دو بجے رات کو انگلینڈ جانے والا پی۔ او۔ کمپنی کا ہیون نامی جہاز بسکے کی خلیج میں ایک حادثہ کا شکار ہو گیا اور غرقاب ہو گیا۔ بروقت امداد نہ پہنچنے کی وجہ سے جہاز کے سارے مسافر پانی میں ڈوب کر مر گئے ہیں"

اس خبر کے آخر میں مسافروں کی فہرست تھی۔ جس کے آخر میں لکھا تھا۔

اندرجیت دیال۔

۱۰

دیال کے انتقال پر ملال کی خبر پڑھ کر مجھے جو صدمہ ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ میں گھنٹوں تنہائی میں بیٹھی ہوئی روتی رہتی تھی۔ میرے اس غم میں نہ کوئی شریک ہو سکتا تھا اور نہ ہی میں اس کا اظہار کسی دوسرے سے کر کے دل کو ہلکا کر سکتی تھی۔ وہ میرا پوشیدہ غم تھا۔ اندر ہی اندر اسے برداشت کرنا تھا۔

اس دردناک خبر نے مہرشی جتا شنکر کے دل کو بہت بھاری ٹھیس پہنچائی تھی۔ میں نے انہیں خط لکھ کر تسلی دی۔ انہوں نے بھی مجھے ایک خط لکھا اور ہدایت کی کہ جس اسکول کی بنیاد دیال نے رکھی تھی اسے جاری رکھنا اور ترقی دینا ہی دیال کی روح کو ثواب پہنچانا ہے۔

میں اسکول باقاعدگی سے جاتی تھی۔ سارے کام صحیح ہو رہے تھے لیکن میرا دل اداس تھا۔ بظاہر میں ہنسنے کی کوشش کرتی لیکن اندر ایک طرح کی آگ لگی ہوئی تھی۔ دیال کی موت پر اسکول میں ایک تعزیتی جلسہ بھی ہوا اور اس میں جو تجویز پاس کی گئی وہ مہرشی کو بھیج دی گئی اور ایک دن کے لئے اسکول بھی بند رکھا گیا۔

میں کبھی کبھی رات کو جاگ اٹھتی تھی۔ روشنی تیز کر کے گھنٹوں روتی رہتی تھی۔ کئی راتیں تو میں نے اسی طرح آنکھوں میں کاٹ دیں۔ دیال کا چہرہ میں اپنے تصور کے سامنے دیکھ کر جب بہت دیر تک آنسو بہا لیتی تب کہیں میرا دل ہلکا ہوتا تھا۔

آزادی کے بعد مہاجرین کی جو حالت ہوئی تھی ٹھیک ویسی ہی اس وقت میری تھی۔ میرے سارے ارمان معدوم ہو گئے تھے۔ اب تو میری زندگی کا کوئی مقصد باقی نہ رہا تھا۔ دیال نے اپنے آخری خط میں مجھے اپنا دل کھول کر دکھا دیا تھا۔ لیکن وہ خط بھی میں نے پھاڑ دیا تھا۔ مجھے اپنا دل کھول کر دکھانے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اس موقع کے انتظار میں رہی تھی مگر میری مراد بر آنے سے پہلے ہی سارا کھیل ختم ہو گیا۔ ملنے سے پہلے ہی ظالم قسمت نے ہمیں آن دبوچا۔

سماج اور اس کے رسم و رواج ہی کے باعث میری زندگی تباہ ہوئی تھی۔ اس لئے ایک مرتبہ تو میرے جی میں آیا کہ اب اس دنیا کا منہ پھونک دوں۔ لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ گوشہ نشینی اختیار کرنے سے کیا ملے گا۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ خود غرضی چھوڑ کر میں اجتماعی مفاد کو اہمیت دوں اور اسی کے لئے زندگی وقف کر دوں۔

اب میں سوچنے لگی کہ اگر ہمیں موزوں نظام قائم کرنا ہے۔ سماج کو بدلنا ہے تو یہ تبھی ممکن ہے جبکہ ہم بچپن سے ہی بچوں کے دل و دماغ میں صحیح قسم کی باتیں پیدا کریں۔ اونچ نیچ، چھوت اچھوت وغیرہ کا فرق دور کرنے کے لئے بچوں کو مستقبل میں مناسب تعلیم دینی شروع کر دینی چاہیے۔ بچہ اس نازک بیل کی مانند ہوتا ہے جسے ابتدا میں حسب منشا گھمایا جا سکتا ہے۔ بڑا ہو جانے پر اس میں پختگی آ جاتی ہے اور تب اسے ڈھالنے میں دقت ہوتی ہے۔

چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ جس سماج کے رسوم و قیود کی بدولت میری زندگی کا چمن تباہ و برباد ہوا، میرے ارمان معدوم ہوئے، اس سماج کے نظام کو بدلنے کے لئے گوشہ نشینی اختیار کرنے سے زیادہ بہتر اور ضروری کام یہ معلوم ہوتا ہے اور میں وہی کروں گی۔

میرے دل و دماغ کے سامنے دھرم پور کا اسکول تھا۔ جس دیال سے میں خفیہ محبت کرتی تھی اور جو مجھ پر جان چھڑکتے تھے یہ اسکول ان کی یادگار ہے۔ ہم دونوں سماج سے پچاس برس آگے —— بڑھ کر

موجودہ حالات کو بدلنا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے متعدد قیود ہمارے راستے میں روڑہ بن کر سامنے آئے۔ کم از کم آنے والی پشت کو اس زہر سے محفوظ رکھنے کے لئے میں بھی جان سے ان حالات کو بدلنے کی کوشش کروں گی۔ دیال یہ کام میرے سپرد کر گئے ہیں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ بچپن میں مناسب تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے کس طرح بدمعاشوں کے گروہ تیار ہو جاتے ہیں۔ دھرم پور کے بدمعاشوں نے میرے ساتھ کس قدر زیادتی کی ہے۔ لیکن میں نے وسیع النظر بن کر انہیں کے بچوں کو اسکول میں اچھی تعلیم دینے کی کوشش کی ہے۔ جلاہے کا غصہ داڑھی پر اتارنے سے کیا فائدہ؟ ان چھوٹے چھوٹے، معصوم بچوں نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ میں انہیں صحیح تعلیم دے کر اچھے شہری بناؤں گی۔ آگے چل کر جب ان کے باپ سزائیں کاٹ کر واپس آئیں گے تو انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے میرے لئے کیا کیا تھا اور میں نے ان کا بدلہ کس طرح اتارا ہے۔ شاید میرے احسان کے بوجھ سے وہ شرمندہ ہو سکیں۔

میں نے دھرم پور کے مدرسہ کے لئے اپنا تمام وقت دے دیا تھا۔ روز صبح اٹھتے ہی میرا پروگرام گھڑی کی طرح شروع ہو جاتا۔ اب تو روزانہ دو تین لڑکوں کے گھر جا کر میں ان کی جانچ کرنے لگی۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں۔ وہ کب سو کر اٹھتے ہیں، کب اور کس طرح پڑھتے ہیں، نہاتے ہیں، انکے گھر میں کس قسم کی مشکلات درپیش ہیں، رات کو وہ وقت پہ سوتے ہیں یا نہیں۔ انکے والدین یا سرپرستوں کی کون سی بری عادتیں ہیں جو ان کو لگ سکتی ہیں وغیرہ وغیرہ سینکڑوں باتوں کی میں تحقیق کرتی اور بڑی خوش مزاجی اور محبت کے ساتھ انہیں صحیح راستہ دکھاتی تھی۔ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ میری اس قدر بے غرض اور قابلِ قدر محبت دیکھ کر وہ لوگ میری عزت کرنے لگے۔

اسکول کے ہر ایک طالب علم کو میں نے اندر باہر سے بخوبی پہچان لیا تھا۔ عقلمند لڑکوں کو میں زیادہ کام دیتی تھی۔ متوسط قسم کے لڑکوں کی میں حوصلہ افزائی کرتی رہتی اور غبی الذہن لڑکوں پہ کبھی ناراض نہ ہوتی تھی بلکہ اس کے برعکس انہیں پیار محبت سے سب کچھ سمجھایا کرتی تھی۔ ہر لڑکے کا رجحان کس طرف ہے، یہ میں نے ایک رجسٹر میں نوٹ کر لیا تھا اور اسی کے بموجب میں انہیں مختلف قسم کے کئی کام دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے بڑی تیز رفتاری سے ترقی کرنے لگے۔

گاؤں والے بھی اب اسکول کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے اور ہر کام میں ہمیں ان کا تعاون ملنے لگا۔

صوبائی سرکار کے محکمۂ تعلیم نے اسکول کا معائنہ کر کے اسکو منظوری اور مالی امداد دیدی تھی۔ معائنہ کرنے والوں نے اسکول کو مثالی ادارہ کہا تھا اور اپنی رپورٹ میں اس کی بہت تعریف کی تھی۔ اس موقع پر اسکول کے سابق ہیڈ ماسٹر اندرجیت دیال کی تصویر کی نقاب کشائی بھی ہوئی یہ تصویر گاؤں کے ہی ایک معزز شخص نے اسکول کو نذر کی تھی۔

اسی دوران دھرم پور میں ہیضہ کی بیماری پھیل گئی۔ اسوقت میں نے، میری اسسٹنٹ اور اسکول کے طلباء نے گاؤں والوں کی جو خدمت کی وہ بے مثال تھی۔ دو چار کیس ہونے کے بعد ہی ہم لوگوں نے اپنی کوششوں سے اس بیماری کو ہمیشہ کے لئے گاؤں سے ختم کر دیا۔ گاؤں والوں نے ہماری بڑی عزت افزائی کی اور ہمارا شکریہ ادا کیا۔

بونے کے وقت کئی کاشتکار مسلسل بارش ہونے کی وجہ سے مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ بہت سے رقبہ میں بونے کو باقی تھا۔ وقت کم تھا اور ان کے پاس مزدوروں کی کمی تھی۔ اسوقت بھی اسکول کے طلباء نے ان کی مدد کی تھی۔

گاؤں کے اسی قسم کے متعدد کاموں میں مدد کر کے ہم نے مقبولیت حاصل کی۔

سالانہ امتحان ہوا۔ اکثر طالب علم کامیاب ہو کر آگے کی جماعت میں پہنچ گئے۔ محکمۂ تعلیم نے نویں جماعت کھولنے کی اجازت دے دی۔ آٹھویں جماعت میں داخل ہونے کے لئے طالب علموں کی بھیڑ لگ گئی چنانچہ آٹھویں میں دو سیکشن اور نویں میں دو سیکشن کھولنے پڑے۔ اس طرح دو جماعتوں میں پانچ سیکشن ہو گئے اور ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ اب اسکول میں جلد دسویں جماعت کھل جائے گی۔ پانچ سیکشن ہوتے ہی مہرشی نے چار استاد اور مقرر کر کے بھیج دیئے۔

والد صاحب پھر میرے لئے بر تلاش کرنے لگے تھے۔ ایک روز کھانے کے بعد انہوں نے مجھے یہ بتایا تو میں نے ان سے کہہ دیا ـــــ

"پتا جی، اب آپ میری شادی کی فکر نہ کریں۔ اب میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

"کیا مطلب؟ کیا تو عمر بھر کنواری ہی رہے گی؟"

"جی ہاں۔"

"پھر تمہاری جائداد کا کیا ہوگا؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"پتاجی اگر میری شادی ہو جاتی اور میں صاحب اولاد ہوتی تو آپ کی اس جائداد سے ان کو فیض پہنچتا۔ لیکن یہ فیض محدود ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ آپ اس جائداد کے مالک ہیں، مگر در اصل یہ تمام جائداد دھرم پور کے گاؤں والوں کی ہے۔ غریب کسانوں کی سخت محنت و مشقت کی ہی بدولت ہمیں ہر سال لاکھوں کی آمدنی ہوتی ہے۔ ان غریبوں کی حالت ہم پر ظاہر ہی ہے۔ وہ بھوکے ہیں، ننگے ہیں اور بے گھر و بے در ہیں۔ ان کی اولاد کی تعلیم کا کوئی موزوں بندوبست نہیں ہے۔ دھرم پور کے اسکول کو آپ ہی کا نام دیا گیا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ آپ اپنی ساری دولت "عوامی تعلیمی ادارہ" کے لئے وقف کر دیں تاکہ آپ کا نام ہو، شہرت ہو اور آپ کی اس سخاوت سے تمام گاؤں والوں کا بھلا ہو۔ آج کل کا زمانہ یہ نہیں کہ پڑوسی بھوکوں مرے اور ایک شخص پیٹ بھر کر کھائے۔ اگر آج آپ خود ایسا نہیں کریں گے تو کل جب لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے اس نظریہ کو نیست و نابود کر دیں گے۔

گاؤں والوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی غرض سے ہی آپ نے اسکول قائم کیا ہے۔ اس کا نام بھی آپ پر ہی رکھا گیا ہے۔ آپ کی بیٹی ہی اس کو چلاتی ہے۔ اور ادھر آپ کی دولت و جائداد کا کوئی صحیح وارث بھی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں عوام کو ہی اس کا وارث سمجھ کر ان کے مفاد کے لئے اپنی ساری جائداد وقف کر دینے میں کیا حرج ہے؟ آج تک آپ نے نہ جانے کتنے اداروں کو پیسہ دیا ہے۔ آپ ہی کے پیسے کے بل پر متعدد ادارے اب تک زندہ ہیں۔ اس لئے آپکے لئے ایسا کرنا ہی بہتر ہے۔"

پتاجی بڑے سخی تھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ انہیں میری رائے کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ پھر بھی مجھے تسلی دینے کے لئے انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے جو کچھ مناسب معلوم ہوگا کروں گا۔"

میں نے تو اپنی شادی سے انکار کر کے والد صاحب کو ایثار کا راستہ بتایا تھا۔ مگر وہ انہیں اچھا نہیں لگا۔ وہ حسب معمول اپنا کام کاج تو کرتے تھے لیکن ان کا چہرہ افسردہ رہتا تھا۔ اب ان کا رجحان مذہبی چیزوں کی طرف پہلے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اور وہ اکثر کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔

ماں کے انتقال کے بعد سے ان کی صحت بھی گرنے لگی تھی ـــ کبھی کھانسی، کبھی ٹھنڈ، کبھی جسم میں درد تو کبھی ہلکا سا بخار۔ اب انہیں کوئی نہ کوئی شکایت رہتی ہی تھی۔ اور ایک روز......

میں اسکول میں تھی۔ والد صاحب میرے اسکول جانے سے پہلے ہی پنچایت گھر چلے گئے تھے۔ میں آفس میں بیٹھی ہوئی اسکول سے متعلق خط و کتابت کر رہی تھی۔ کسی وقت دولو دوڑتا ہوا آیا اور میرے سامنے کھڑا ہو کر سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ میں اپنے کام میں محو تھی۔ دولو کب آیا، اور وہ کیوں رو رہا تھا؟ یہ میری ذرا سمجھ میں نہ آیا۔ میں ایک دم گھبرا اٹھی اور اسکے چہرے کو دیکھتی رہی۔ وہ کہنے لگا ـــ

"منی بیبی، دادا جی چل بسے...."

مجھے ایکدم دھکا سا لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہونٹ لرزنے لگے سینہ دھڑکنے لگا۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر میں رونے لگی۔

دوسرے استاد بھی وہاں آن پہنچے۔ اسکول کے طلباء نے مجھے گھیر لیا۔ دوسرے استادوں نے بچوں کو چھٹی دیدی۔ ہم سب لوگ پنچایت گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں ایک ہجوم لگا ہوا تھا۔ اس بھیڑ کو چیرتی ہوئی اور آنسو بہاتی ہوئی میں پتاجی کی لاش کے پاس گئی اور اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پنچایت گھر کے سامنے اسکول کے تمام طالب علم جمع ہو گئے۔ والد صاحب کی حرکت قلب رک جانے سے ان کا انتقال ہوا تھا۔

سب طرف بذریعہ تار یہ خبر پہنچا دی گئی۔ ہم پتاجی کی لاش کو اپنے گھر لے آئے۔ گھر کے صحن میں لوگوں کا ہجوم لگ گیا تھا۔ دو تین گھنٹے میں ہی کئی موٹریں مکان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئیں جن میں ہمارے رشتہ دار، ہمدرد اور والد صاحب کے دوست احباب تھے۔ مہرشی جٹا شنکر بھی فوراً کاشی سے آگئے۔

دریائے کرشنا کے ساحل پر ٹھیک اسی جگہ جہاں میری ماں کو جلایا گیا تھا وہیں پتاجی کو بھی جلایا گیا۔ سب لوگ مجھے تسلی و تشفی دینے کی کوشش کر رہے تھے، پھر بھی اس صدمہ سے میں بیمار ہو گئی۔ میرے دوسرے

عزیزوں نے پتاجی کی آخری رسوم ادا کیں۔ میرا بھی علاج شروع ہوا۔ دس پندرہ روز بعد مجھے افاقہ ہونے لگا لیکن پھر بھی دل اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ والد صاحب کا خیال آتے ہی مجھ پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

اب اس دنیا میں میرا کوئی پرسان حال نہ رہا تھا۔ میں یتیم ہو گئی تھی اور اسی کا غم مجھے بار بار ستاتا تھا۔

ایک روز میں نے ان کی تجوری کھولی تو سامنے ہی ایک لمبا سا بند لفافہ دکھائی دیا۔ اس پر بڑے حرفوں میں لکھا تھا ——

میرا وصیت نامہ۔

میں نے وہ لفافہ کھولا اور اندر سے کاغذ نکال کر اسے جلدی جلدی پڑھ ڈالا۔ اس کی کچھ اہم باتیں یہ تھیں ——

میری موت کے بعد میری جائداد کو مندرجہ ذیل طریقے سے وقف کر دیا جائے . . . . .

۱۔ دھرم پور کے اسکول کے سائنسی ساز و سامان کے لئے پانچ ہزار روپے نقد۔

۲۔ دھرم پور میں ایک چھوٹا سا ہسپتال قائم کیا جائے جس میں غریبوں کا علاج مفت ہو۔ دیوی مندر کے پاس واقع مکان میں اس ہسپتال کے لئے وقف کرتا ہوں۔ ہسپتال کے اخراجات کے لئے میری جائداد میں سے پچاس ہزار روپے لئے جائیں۔

۳۔ میری اکلوتی بیٹی کنول کے لئے گاؤں کے نزدیک والے دو کھیت اور ایک باغیچہ اُسے دیدئے جائیں۔ میرے رہنے کا مکان بھی اُسے ہی دیا جائے۔

۴۔ میری بیوی کی بیوہ بہن کے خرچ کے لئے دو ہزار روپے دیئے جائیں

۵۔ سانگلی کے ونتا آشرم کو میری بیوی کے نام پر پانچ ہزار روپے دیئے جائیں۔ ان روپوں کا خرچ کسی طرح بھی ہو مگر اس کے ساتھ میری بیوی کا نام ضرور وابستہ ہونا چاہیئے۔

۶۔ دھرم پور کے قدیم جین مندر کو دو ہزار روپے دیئے جائیں۔

۷۔ گھر کی تمام چیزوں اور زیورات پر میری بیٹی کا حق ہے۔

۸۔ پانچیا اور دولو نے ہمارے خاندان کی خدمت کی ہے چنانچہ —— ہماری زمین میں سے انہیں کاشت کے لئے چار ایکڑ زمین مفت میں دیدی جائے۔

۹۔ دیگر چھوٹے بڑے اداروں کے لئے میری جائداد میں سے دس ہزار روپے علیحدہ رکھ دیئے جائیں۔ کس ادارہ کو کتنی رقم دی جائے اس کا فیصلہ میری بیٹی کنول کرے گی۔

۱۰۔ مہرشی جتا شنکر نے جذبہ ایثار کے ساتھ عوام کی خدمت کی ہے، لہٰذا میری بقیہ تمام جائداد ان کے تعلیمی ادارہ کو دیدی جائے اور اس جائداد کی آمدنی سے دھرم پور کا اسکول چلایا جائے۔ اس اسکول میں کم از کم ایک ہزار طلباء ہوں۔ وہاں کے ہونہار طالب علموں کو اس فنڈ میں سے ان کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفے دیئے جائیں۔ ولایت جانے والے طلباء کو بھی اسی فنڈ میں سے مدد دی جائے۔ وظیفے دیتے وقت طالب علموں کی قابلیت مدنظر ہو۔ ذات پات، مذہب یا خاندان کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے۔

× × ×

والد صاحب کی اس قربانی کو دیکھ کر مجھے ان کی یاد آ گئی اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

میں نے وصیت نامہ کے مطابق کارروائی شروع کر دی۔ جن اشخاص اور اداروں کو جو سو دینا تھا دے دیا اور بقیہ ساری جائداد مہرشی جتا شنکر کو دھرم پور بلا کر ان کے حوالے کر دی۔ اخبارات میں اس کی تفصیل شائع ہوئی اور ان کی خوب تعریف کی گئی۔ مہرشی نے دھرم پور میں ایک جلسہ منعقد کروایا اور اس میں جو تقریر کی اس میں والد صاحب کی سخاوت اور عظمت پر بہت کچھ کہا۔ اسی ضمن میں میری تعریف کر کے انہوں نے میری بھی حوصلہ افزائی کی۔

مہرشی نے مجھ سے رخصت ہوتے ہوئے مجھے اپنی بیٹی کی طرح گلے سے لگایا اور اپنا سارا پیار مجھ پر انڈیل دیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

"بیٹی خدا جو کچھ کرتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ بہتری ہوتی ہے۔ تیری ماں چلی گئی۔ پتاجی بھی چل بسے۔ اب تو یتیم ہو گئی ہے۔ لیکن تو اس قدر سمجھدار ہے کہ تجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا کی یہی ریت ہے۔ تو ان کے غم کو بھول کر اپنا کام مستعدی سے کرتی رہ۔ تیرا مستقبل شاندار ہے"

مجھے پتاجی یاد آ رہے تھے اور میری آنکھیں پُرنم تھیں۔ مہرشی نے مجھے دلاسا دیا اور چلے گئے۔

ہمیشہ کی طرح اسکول کا کام شروع ہو گیا۔ جیسا کہ مہرشی نے اپنی تقریر میں کہا تھا گاؤں کے لوگ مجھے دیوی سمجھنے لگے۔ مردوں کی نسبت عورتیں چند باتیں زیادہ کرتی ہیں چنانچہ ایک روز میں اسکول سے واپس گھر جا رہی تھی کہ راستہ میں ایک عورت دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور کہنے لگی ——

"معاف کیجیے، ذرا ٹھہریے۔"

"کیوں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا آپ تعویذ وغیرہ لکھ سکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں۔"

پھر تو اس نے مجھے روک لیا اور میرے پیروں کے دونوں انگوٹھوں پہ پانی ڈال کر اسے ایک کٹوری میں رکھ لیا۔

"اس کا کیا کروگی؟" میں نے استفسار کیا۔

"میری بہو بڑی تکلیف میں ہے۔ بچہ نہیں ہوتا ہے" اس نے جواب دیا۔

اتفاق دیکھیے کہ اس کی بہو کے بچہ باسانی ہوگیا۔ دوسرے دن سویرے اسی عورت نے مجھے دو پیڑے لاکر دیے، جس سے مجھے اس کا اندازہ ہوا۔

ایک سال میں میرے اوپر کیا گزری اور میری زندگی کہاں سے کہاں پہنچی اس کی ایک دھندلی سی تصویر میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔ عظیم شخصوں کے تجربات بھی بڑے مفید ہوتے ہیں۔

میں عظیم نہیں ہوں۔ میں تو ایک ادنیٰ سی عورت ہوں۔ میں سمجھتی ہوں میرے ان تجربات سے مجھ جیسے چھوٹے کئی لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ ممکن ہے میرا یہ اندازہ غلط بھی ہو مگر کم از کم یہ تو ضرور ماننا پڑے گا کہ آج میری طرح کئی تعلیم یافتہ لڑکوں اور لڑکیوں کو گاؤں میں بس کر تعلیم کے کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔ پہلے پہلے گاؤں کے لوگ دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مذاق بھی اڑاتے ہیں لیکن جب کوئی بات انھیں جنچ جاتی ہے تو وہ ہماری تقلید بھی کرنے لگتے ہیں۔

ہمارا ملک آزاد ہوگیا ہے لیکن جب تک ہندوستان کا بچہ بچہ تعلیم یافتہ اور نیک سیرت نہیں ہو جاتا تب تک ملک کی صحیح معنوں میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ ہم میں سے مٹھی بھر تعلیم یافتہ لوگ یہاں کا نظام باقاعدگی سے چلا لیں گے اور اس سوراج کو قائم رکھ سکیں گے تو یہ آپکا محض خیال خام ہے۔

متفرق قسم کے مذہبوں اور ملتوں کے باعث ہمارے ملک کا جو نقصان ہو سکتا تھا ہو چکا ہے۔ آج ہمیں جو تنازعہ دکھائی دے رہا ہے وہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور مذہب کی بنیاد پر کھڑا ہونے والا نظام لڑکھڑا کر گر جائے گا یہ ایک اٹل حقیقت ہے جس کی شاہد ہماری تاریخ ہے۔

سماجی، مذہبی اور دوسرے رسوم و قیود توڑ کر جب مجھ جیسی لڑکی دیال جیسے نوجوان سے شادی کر سکے گی تبھی ہم کہیں گے کہ سیکولر ریاست قائم ہوگئی ہے۔

وقت کا پلٹتا دھارا دیکھ کر ہر ایک کو پہلے اپنے ملک پر نظر ڈالنی چاہیے اور پھر اپنی غرض۔ قومی مفاد کے آگے ذاتی مفاد کو بہتر سمجھنے سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔

سچا قومی سوراج تبھی وجود میں آئے گا جبکہ جہالت، غریبی اور بیماریوں سے محفوظ ہو کر ہم سب اپنے اور سب کے مفاد کو پہچان سکیں گے۔

آپ کبھی دھرم پور تشریف لائیں تو مجھ سے ضرور ملیے گا۔ میں آپ کا دل سے خیر مقدم کروں گی۔ اپنا اسکول دکھلاؤں گی اور مجھے یقین ہے کہ میرا اسکول دیکھ کر آپ کو انتہائی مسرت ہوگی۔

میں جو کہنا چاہتی تھی کہہ چکی۔ اسے پڑھ کر کچھ ظریف نقاد کہیں گے کہ یہ ناول نہیں سوانح ہے اور کچھ کہیں گے سوانح نہیں ناول ہے۔ اس لئے میں آخر میں ایک مختصر سی کہانی اور سنا دوں۔

ایک جگہ ایک ڈھال لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ایک طرف سونا چڑھا ہوا تھا اور دوسری طرف چاندی۔ دونوں طرف سے دو بہادر آئے اور آپس میں لڑنے لگے ـــ ایک کہتا تھا کہ ڈھال سونے کی ہے اور دوسرا کہتا تھا کہ چاندی کی۔ بہت دیر تک یہ لڑائی ہوتی رہی حتیٰ کہ دونوں نے میان سے تلواریں نکال لیں۔ اور لڑنے لگے۔ اگر کچھ دیر اور لڑتے رہتے تو دونوں کام آجاتے لیکن خوش قسمتی سے ایک تیسرا شخص جو بہت سمجھدار تھا وہاں آن پہنچا۔ اس نے لڑائی کا سبب پوچھا۔ جب اسے سبب معلوم ہوا تو اس نے ڈھال کو دونوں طرف سے گھما کر دکھا دیا۔

اسی لئے کہتی ہوں کہ یہ ناول ہو یا سوانح۔ اس میں زندگی ہے۔ تجربے ہیں۔ میری زندگی میں متعدد واقعات رونما ہوئے ہیں جن کی وجہ سے میرا دل بوجھل ہوگیا ہے اور اسی عالم میں میں نے اپنی زندگی کی یہ تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی ہیں، دل پریشان ہے اور دماغ بالکل مفلوج سا ہوگیا ہے۔ ایسی صورت میں میں نے جو اپنی زندگی کی یہ جھلک پیش کی ہے اس کی وجہ ہے میری زندگی کا ادھورا پن۔ میری طرح دوسروں کی زندگی بھی ادھوری نہ رہ جائے اس کے لئے میں کوشاں ہوں۔ آپ تو مجھ سے ہمدردی ظاہر کریں گے، کہ بس یہی میری تمنا بھی ہے۔

ایلنگو وادیگل

تامل زبان کا یہ رزمیہ آج سے سترہ سو سال پہلے (1700) (تقریباً سنہ ۲۰۰ء میں) لکھا گیا تھا۔ اور اب دنیا کی بہت کم ترقی یافتہ زبانیں ایسی ہوں گی جن میں اس کا ترجمہ نہ ہو چکا ہو۔

رزمیہ کا مصنف ایلنگو وادیگل جنوبی ہند کی حکومت چیرکے بادشاہ شیرالادن کا چھوٹا بھائی تھا چونکہ وہ حکومت کا جائز وارث تھا۔ اس لئے چھوٹے بھائی اس سے حسد کرتے تھے۔ ایلنگو وادیگل کو حکومت اور اس کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی پوری زندگی فنِ موسیقی اور شاعری میں گذری تھی۔ وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور جنگلوں میں رہنے لگا۔ وہیں کچھ ایسے لوگوں نے اسے یہ کہانی سُنائی جنھوں نے اس کہانی کی ہیروئن کناگی کو دیکھا تھا۔ کہتے ہیں ایلنگو وادیگل کناگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے برسوں سفر کرتا رہا۔

یہ ناولٹ ایک عظیم ترین کارنامہ ہے جس پر ان سترہ سو سالوں نے اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑا۔ آج بھی اس میں تازگی ہے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ یہ ناول اتنی مدت پہلے لکھا گیا تھا۔ ناول پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اتنی مدت میں سماجی اور سیاسی شعور کوئی ترقی نہیں کر سکا۔

ایلنگو وادیگل کو انسانی نفسیات پر پورا عبور حاصل ہے۔ اس کے کردار ترقی پسند نظریات رکھتے ہیں۔ زندگی کی اعلیٰ قدروں پر ان کا ایمان ہے لیکن اُن میں تمام انسانی کمزوریاں بھی ہیں۔

تامل میں اس رزمیہ کا نام "سلاپادھی کارم" یعنی "ایک پائل کی خاطر" ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ "کوولن اور کناگی" کے نام سے ہے۔ ایس۔ پی آئیر صاحب نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ انگریزی سے کیا گیا ہے۔ جہاں دیوی اور دیوتاؤں کا بہت ذکر ہے۔ ان حصوں کو دانستہ طور پر چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ وہ نام ہم لوگوں کے لئے غیر مانوس ہیں۔

اس رزمیہ کا ایک اور انگریزی ترجمہ "سلاپادھی کارم" کے نام سے سری رام چندر دکشتر نے کیا ہے۔

ہم نے ایلنگو وادیگل کی تصویر حاصل کرنے کی
پوری کوشش کی۔ مگر بے سود ..... ۲۰۰ء سے
ایک مصنف کی تصویر دستیاب بھی کیسے ہوسکتی ہے
تامل انسائیکلوپیڈیا کا بیان ہے کہ مصنف کی دُنیا
میں کوئی تصویر موجود نہیں ہے۔

ایلنگو وادیل
مترجم خلیق انجم

لاکھ بلائیں ایک نشیمن

اٹھارہ سو سال پہلے چولا کے عظیم اور طاقتور بادشاہ کا دارالخلافہ پوہر تھا جو خود کو سورج دیوتا کی نسل سے بتاتا تھا اسی بادشاہ کے جھنڈے پر خوفناک شیر کی تصویر والا جھنڈا ہوتا تھا۔

پوہر کا یہ خوبصورت شہر دریائے کیوری کے دہانے پر آباد تھا اور اس کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں غرض ہر طرف تجارتی راستے تھے۔ پوری مملکت چولا کے لئے یہ شہر تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس چولا کی چھوٹی سی حکومت نہیں تھی۔ شمال میں تیروپتی کے پہاڑوں سے لیکر جنوب میں دریائے ویگئی تک اور مشرق میں بنگال سے لیکر حکومت چیرا کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔

کاریکال نام کے بادشاہ نے اس شہر کی شہرت اور خوبصورتی کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے عالیشان محلات اور مندر تعمیر کرائے جن کے ساتھ عجیب و غریب باغات بھی تھے۔ دریائے کیوری کی طغیانی کو روکنے کیلئے اس نے ایک بہت بڑا ڈیم بھی بنوایا۔ آبپاشی کے لئے بہت سی نہریں بھی نکلوائیں۔ اس کی تعمیر میں اس کی رعیت کے مزدور بھی تھے اور بارہ ہزار وہ قیدی بھی تھے جو سیلون کی لڑائی میں اس کے ہاتھ آئے تھے۔ ان نہروں کی وجہ سے تنجور جنوب کا سب سے بڑا غلہ برآمد کرنے والا صوبہ اور پوہر سب سے بڑی بندرگاہ بن گئی۔ موتی اور مونگے کی تجارت کیلئے تو یہ شہر پہلے ہی سے مشہور تھا۔

یہی وہ بادشاہ تھا جو کوہ ہمالہ پر گیا تھا اور جہاں اس نے ایک چٹان پر اپنے جھنڈے کا نشان "شیر" کھدوائی تھی۔ اس نے ناگا قبیلے کو شکست دے کر نیگا پٹم کا الحاق اپنے ملک سے کر لیا تھا وینی کی لڑائی میں چیرا کے بادشاہ کو شکست دی تھی اور سیلون پر ایک کامیاب حملہ کیا تھا۔

اندرا کا تہوار تو پہلے ہی منایا جاتا تھا۔ اس نے کچھ اور تہوار منانے شروع کئے جن سے پوہر میں اور بھی زندگی آگئی۔ پوہر شہر تین میل چوڑا تھا اور دو بڑے حصوں میں تقسیم تھا ایک تو مارو ور پکم ..... جو ساحل سے ملا ہوا تھا۔ جہاں غیر ملکیوں کے عالیشان مکانات، گودام اور ایسے بازار تھے جن میں ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔ یہاں بہت دُور دُور کے ممالک کے ملاح دکھائی دیتے تھے۔ اس بازار میں سلک، مونگے، موتی، سونا، جواہرات، صندل، وغیرہ بھرا پڑا تھا۔ اور گندم کی خرید و فروخت الگ تھی جو اٹھارہ قسم کا تھا۔

دھوبی، بڑھئی، لوہار، کمہار، جوہری، شراب فروش، مچھلی والے، موچی، درزی، موسیقار، نمک فروش، گوشت، تیل، پیتل، اور کپڑا بیچنے سب کے بازار الگ الگ تھے۔ اور خوانچہ فروش، پھول، خوشبوئیں، وغیرہ بیچتے ہوئے اِدھر اُدھر پھرتے رہتے تھے۔

شہر کا دوسرا حصہ پٹینا پاکم تھا ایک کھلے میدان نے اسے دوسرے سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ اس میدان میں روز ایک بازار لگتا تھا پٹینا پاکم میں بادشاہ کا محل تھا اسی حصے میں تجارت کرنے والے شہزادے اپنے عالیشان محلوں میں رہتے تھے۔ برہمن، کھتری، جیوتشی، وید جواہرات کا کام کرنے والے، مشہور درباری اور رقص کرنے والے وغیرہ بھی یہیں رہتے تھے۔

شہر کے وسط میں بڑے چوراہے پر وکین کا مندر تھا جس کے متعلق لوگوں کا عقیدہ تھا کہ وہ رات کو دھاڑتا ہے جو آواز مندر سے دس میل دور تک سنی جا سکتی ہے۔ اور اپنے رستے سے تمام چوروں، اچکوں اور بدمعاشوں کو باندھ لیتا ہے۔

کھلے بازار میں سامان کا ڈھیر پڑا رہتا تھا۔ بس ہر چیز پر اس کا وزن اور مالک کا نام لکھا رہتا تھا۔ اس قیمتی سامان کیلئے کوئی چوکیدار تھا نہ کوئی تالا ..... لوگوں کا خیال تھا کہ اگر کوئی چور وہاں سے کوئی سامان اٹھاتا تو وکین اسے اپنی طاقت سے رات بھر وہیں گھماتا رہتا۔ یہاں تک کہ صبح ہو جاتی اور بادشاہ کے آدمی چور کو گرفتار کر کے جان سے

مار دیتے۔ شہر میں اور بھی مندر تھے۔ ان میں سے ایک وشنو کا مندر تھا۔ جس میں وشنو لکشمی کے سانپ پر ایک خاص رومانی انداز سے سو رہے تھے۔ باقی مندر شیو جی، اندرا اور نتیج کی دیوی کورادی کے نام سے تھے۔

اس شہر میں ایک بہت مشہور تجارت کرنے والا شہزادہ مینا کن رہتا تھا۔ اس کے تمام جہاز اور سامان فروخت سمندر میں تھے۔ اسے حکومت کی طرف سے بے انتہا نوازشیں ملی ہوئی تھیں۔

میناکن اور اس کی بیوی اندل عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ مدتوں سے انہیں صرف ایک بچے کی آرزو تھی۔ انکی دیوی کی بے انتہا پوجا اور بہت کچھ نذر پیش کرنے کے بعد ان کے ہاں ایک خوبصورت لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام کناکی رکھا گیا۔ وہ چودہ سال ہی کی تھی کہ ہر شخص کے ہونٹوں پر اس کا نام رہنے لگا۔

کناکی اس قدر خوبصورت اور حسین دوشیزہ تھی کہ تمام دنیا کے لوگ اسے لکشمی دیوی کہا کرتے۔

پوہر شہر میں ایک اور دولت مند تاجر ماساتوان رہتا تھا۔ جس کے کاروباری قافلے ہر طرف جایا کرتے تھے۔ آبپاشی کی نہریں بننے سے پہلے ایک دفعہ زبردست قحط پڑا تھا۔ اور ہزاروں غریب بھوکے مرنے لگے تھے۔ مگر ماساتوان نے ان غریب لوگوں کی مدد کی اور انہیں موت کے چنگل سے آزاد کیا۔ اسی لئے بادشاہ کی نظر میں اس کی بڑی عزت تھی۔ اور دربار کے شرفاء میں اس کا شمار ہونے لگا تھا۔ اس کا ایک حسین لڑکا کوولن تھا۔ جو ابھی سولہ سال کا ہی تھا۔ شہر کے لوگ اس خوبصورت نوجوان کو شیو کا لڑکا کہا کرتے تھے۔

عام طور پر لوگوں کی یہ پیشین گوئی تھی کہ کناکی اور کوولن کی شادی ہو جائے گی۔ ایک دن کوولن کے ایک دوست نے کناکی کے حسن کی داستان سنائی اور بتایا کہ صرف یہی ایک ایسی لڑکی ہے جو اس کیلئے مناسب ہے۔ اور اسی طرح کناکی کی سہیلی نے کوولن کی خوبصورتی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ پوہر میں صرف یہی وہ لڑکا ہے جس سے وہ شادی کر سکتی ہے۔

فطری طور پر دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا ایک دن دونوں ایک تہوار منانے میں شریک تھے۔ کہ دونوں نے چند لمحوں کیلئے ایک دوسرے کو دیکھا اور کیوپڈ نے فوراً دونوں کو شکار کر لیا

دونوں مجبور تھے اور اپنے والدین سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔

کناکی کا چودھواں سال پورا ہونے والا تھا۔ اب اس کی شادی لازمی کرنی تھی۔ اس کی ماں اندل بہت پریشان تھی۔ وہ اپنی پریشانی کو سینے ہی میں چھپائے رہتی۔ اور کبھی شوہر سے نہ کہتی جیسے کناکی کی شادی کی قطعی پرواہ نہ تھی۔

اندل کے شوہر نے ایک دن پوچھا

"اتنی پریشان کیوں نظر آتی ہو؟"

"لیکن میرے خوشی سے ناچنے گانے کی بھی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

شوہر کو غصہ آ گیا۔

"کیا تم میں عقل نہیں ہے؟ دیوتاؤں نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا پھر بھی تم ناشکر گزار ہو۔"

نوکروں کے سامنے اپنی بے عزتی دیکھ کر اندل غصہ میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میناکن رات کا کھانا کھا کر اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بہت دیر تک اندل کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آئی۔ آخر اس نے ملازم کو بھیج کر بلایا۔ حقیقت یہ تھی کہ میناکن بھی اپنی لڑکی کی شادی کیلئے کافی پریشان تھا۔ اور اسی سلسلہ میں اپنی بیوی سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

"آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے" اندل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ادھر آؤ۔ یہاں بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری مشورہ کرنا ہے۔"

"بقول آپ کے مجھ میں تو عقل ہی نہیں ہے پھر مجھ سے مشورہ کرنے سے کیا فائدہ؟"

"ارے غصہ مت ہو۔ میں نے تو یونہی مذاق میں کہہ دیا تھا۔ دیکھو بات یہ ہے میں کناکی کی شادی کے سلسلے میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کناکی کی شادی" اندل نے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہی تو مسئلہ ہے جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔"

"ارے بیوقوف" میناکن نے کہا۔ "تو پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ تمہارے خیال سے کیا میں پریشان نہیں ہوں۔"

"آج شام ہی کو ماساتوان مجھے ملا تھا۔ گفتگو کے دوران میں

اس نے اشارتاً یہ بات کہی تھی کہ وہ اپنے لڑکے کی شادی ہماری لڑکی سے کرنا چاہتا ہے۔ مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دیتا بھی کیسے؟ تم سے مشورہ تو کیا نہیں تھا۔ اس کا لڑکا کوولن معقول لڑکا ہے اور میرے خیال سے تو بہت اچھا جوڑا رہے گا۔"

"واقعی بہت ہی خوب رہے گا یہ رشتہ فوراً طے کر دیجئے"۔ ہنس نے بڑی بے قراری سے کہا۔ بس وقت مت ضائع کیجئے یہ رشتہ تو ایسا ہے کہ مجھ سے مشورہ کئے بغیر ہی آپ کو جواب دے دینا چاہیئے تھا۔"

"نہیں نہیں میں تم سے پوچھے بغیر کیسے حامی بھر لیتا؟ اور ہاں اپنی طرف سے اس لڑکے میں خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے — ٹھیک ہے کوولن بہت اچھا داماد رہے گا۔ لیکن ہماری لڑکی یقیناً اس سے اچھی بہو رہے گی۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے لیکن کل جب آپ مسادھون سے ملیں تو یہ رشتہ طے ہی کر دیں۔"

"بالکل ایسا ہی ہو۔"

اور پھر رات بھر یہ لوگ اپنی اکلوتی اور چہیتی لڑکی کے مستقبل کے پروگرام بناتے رہے۔ صبح سے تھوڑی دیر پہلے وہ دونوں سو گئے۔ دوسرے روز ضیاگن نے مسادھون کو بلایا اور شادی کی تجویز پیش کر دی۔

مسادھون تو اس پیشکش سے اچھل پڑا۔ مگر اس نے تجویز پیش کی کہ پہلے لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں تو اچھا ہے۔ تاکہ ان دونوں کی مرضی پہ رشتہ طے کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کی مرضی نہ ہو تو خیر۔ کم سے کم اعتراض بھی تو نہ ہو۔"

"تم جانتے ہو مسادھون نے کہا۔ ان معاملات میں ان دونوں کا مشورہ لینا بھی ضروری ہے۔ مجھے تو لڑکے کے باپ کی حیثیت سے کوئی اعتراض نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ ان دونوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

کوولن اور کناکی کو بلایا گیا۔ وہ دونوں عجیب کشمکش میں تھے اگرچہ انھوں نے والدین کو نہیں بتایا تھا لیکن وہ تو بہت پہلے یہ رشتہ طے کر چکے تھے۔ اس وقت ان میں کسی کو بھی یہ علم نہ تھا کہ اب ان کا رشتہ کس کے ساتھ طے ہونے والا ہے۔ لیکن جب انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو ان کی خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ دونوں کی نگاہوں سے چھلکتی ہوئی خوشی سے مسادھون اور ضیاگن کو بالکل حیرت بھی ہوئی ان کا خیال تھا کہ یہ رشتہ تھا ہی اتنا مناسب۔ غرض رشتہ طے ہو گیا اور بہت ہی تھوڑی مدت بعد شادی قرار پائی۔

خوبصورت خواتین ہاتھیوں پر سوار ہو کر شہر کے تمام معززین کو مدعو کرنے گئیں

دولہا اور دلہن کا بہت شاندار جلوس نکالا گیا۔ جلوس میں موسیقی کا پورا انتظام تھا۔ ہر لوگ سفید ریشمیں چھتریاں لگائے ہوئے تھے۔ یہ پرشکوہ جلوس شہر کی تمام بڑی سڑکوں سے گذرا۔

شام کے وقت یہ سب لوگ ایک میدان میں گئے جو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ جیسے جگ کے شامیانے میں ہیرے اور جواہرات آویزاں تھے۔ شامیانے کے کھمبے خوبصورت پھول کے ہاروں اور قیمتی جواہرات سے سجے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پریوں کے دیس میں آ گئے ہوں۔

کچھ دیر کے بعد ان دونوں کو سپتاپتی کیلئے منڈپ میں لیا گیا دولہا نے بادشاہ اور تمام معزز شہریوں کے سامنے دلہن کو ہار پہنایا۔ اس ہار کو عام طور پر "تالی" کہا جاتا ہے۔ کچھ حسین دوشیزاؤں نے رومانی گیت گانے شروع کئے اور کچھ صندل، پان، عنبر اور پھول تقسیم کر رہی تھیں۔

نوجوان لڑکیاں تھالیوں میں چراغ جلائے دولہا دلہن کے گرد گھوم رہی تھیں۔ وہ خدا سے دعا مانگ رہی تھیں۔ اے خدا اس جوڑے کو ہمیشہ ہمیشہ سلامت رکھیو۔ یہ دونوں ہمیشہ خوش و خرم زندگی گذاریں۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔

ان تمام رسوم کی ادائیگی کے بعد دولہا دلہن کو حجلۂ عروسی میں میں بھیجا گیا۔ جسے آج غیر معمولی طور پر سجایا گیا تھا۔

حجلۂ عروسی میں کوولن اور کناکی ایک بڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کوولن یاسمین کے پھولوں کا ایک ہار پہنے ہوئے تھا اور کناکی کزوتی کے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ کوولن نے اپنے گلے سے ہار اتار کر کناکی کو پہنا دیا۔ وہ ایک گیت گنگنا رہا تھا۔

میرے محبوب آ! کہ چاند چمک رہا ہے۔
مجھ سے عشق پیچاں کی بیل کی طرح چمٹ جا۔ تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے میں سما جائیں۔
مجھے زیادہ پریشان نہ کر ــــ
کوولن نے کناکی کو اپنے آغوش میں بھینچ لیا۔
کناکی بھی جذبات سے مغلوب ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی گیت تھا۔

"میں بہت پہلے تم سے ملی تھی
اور میں ہمیشہ سے تمہاری محبت میں غرق رہی ہوں
میرا دل درد و غم میں ڈوبا ہوا تھا
اور زندگی جہنم تھی
مگر اب جبکہ تم میرے پاس ہو، مجھے اپنی آغوش میں لئے ہوئے
میرے تمام خوف دور ہو چکے ہیں۔
میری پریشانیاں ختم ہو چکی ہیں
تم سدا میرے دل میں رہے ہو
میرے سینے میں رہے ہو
خدا کرے ہم کبھی جدا نہ ہوں!"

۔آمین!۔ کوولن نے کہا مجھے بھینچ لو۔ میں تمہارے بوسوں کیلئے اتنا بے قرار ہوں جیسے کوئی بدمست شرابی شراب کا متمنی ہوتا ہے۔ کتنے شیریں ہیں یہ بوسے جیسے محبت کے پیالے میں شہد اور دودھ ملا دیا ہو۔

اف کتنی حسین ہے یہ دنیا..... کیا محبوب کی آغوش سے زیادہ وشنو کی جنت ہو سکتی ہے۔ دنیا بھر کی خوشی تم میں سما کر رہ گئی ہے۔ میں تم سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کیا محبت کا دیوتا کاما اپنی رتی سے جدا ہو سکتا ہے۔

پھر دونوں بستر پر دراز ہو گئے۔ کوولن نے کناکی کے شانوں پر صندل سے محبت کی دیوی کی تصویر بنائی۔

میری زندگی.... کوولن نے اسے بری طرح بھینچتے ہوئے کہا۔ تمام دیوی اور دیوتاؤں نے تم کو حسین بننے میں مدد دی ہے ــ تمہاری موجودگی سے تو مور شرما جائے۔ سفید خوبصورت بطخ تمہارے حسن سے نادم ہو جائے گی۔ کس قدر میٹھی ہے تمہاری آواز۔ کوئل تمہارے سامنے کوا معلوم ہوتی ہے۔

تمہارے اس تابناک حسن کو کسی زیور کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں خوشبو کی ضرورت ہی کیا ہے تم میں سے تو خود خوشبو پھوٹتی ہو۔ یہ ہیرے اور جواہرات تمہارے حسن میں کیا اضافہ کر سکتے ہیں تم پاروتی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو۔ لکشمی دیوی بھی تمہارے آگے کچھ نہیں ہے۔ کناکی مجھے اپنے نرم و نازک بازوؤں کی گرفت میں لے لو۔

کناکی نے اپنی باہیں اس کے گرد حائل کر دیں ــ یہ دونوں ایک دوسرے میں اس طرح کھوئے کہ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کا بھی انہیں خیال نہیں رہا۔

دوسرا باب

کناکی اور کوولن مسادھون کے گھر میں انتہائی خوشی اور مسرت کے دن گذار رہے تھے۔ کوولن کی ماں نے اس نئے جوڑے کی رہائش کا انتظام ایک علیحدہ محل میں کر دیا تھا۔ جسے بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ بہت سے نوکر اور خادم ہر وقت ان کی خدمت میں رہتے۔ تاکہ کناکی اور اپنے عزیز، رشتہ دار، اور مہمانوں کی تواضع اچھی طرح کر سکتی۔

کوولن کی ماں بہت سمجھدار عورت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نیا شادی شدہ جوڑا الگ ہی رہے تو اچھا ہے تاکہ ان کے بڑے مداخلت نہ کر سکیں۔

وقت تیزی سے بھاگتا رہا اسی طرح مسرتوں اور خوشیوں میں تین سال بیت گئے۔ اس عرصے میں وہ محبت کے دیوتا کاما اور رتی دیوی کی طرح ایک دوسرے کی محبت میں غرق رہے۔ کناکی نے اس سلیقہ سے گھر کا کاروبار سنبھالا کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ بحیثیت بیوی، میزبان اور غریب پرور کے وہ تمام شہر میں مشہور ہو گئی۔

کوولن کو بھی شہرت حاصل ہو رہی تھی۔ وہ عوام میں دلچسپی لیتا تھا۔ فنکاروں کا ایک بہت بڑا سرپرست تھا۔ خاص طور پر اسے موسیقی اور رقص میں بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ خود بھی وینا اور بنسری کا بہت بڑا ماہر تھا۔ بلکہ موسیقی کا ایک ماہر نقاد بھی تھا۔ رقص میں بھی اسے کچھ کم مہارت نہیں تھی۔ شہر میں کہیں بھی محفل رقص و سرود ہو۔ وہ ضرور اس محفل میں شریک ہوتا۔

اس زمانے میں چترا پتی نامی ایک حسینہ اپنے گانوں اور رقص کی

وجہ سے پورے شہر میں بہت مشہور تھی۔ جس محفل میں وہ ہوتی شائقین کا بے پناہ ہجوم ہوتا۔ حد تو یہ ہے کہ بادشاہ اور شہزادے بھی اس کے شائقین میں سے تھے۔

چترا پتی کی ایک بہت خوبصورت لڑکی مادھوی تھی۔ جسے رقص و سرود پر غیر معمولی مہارت تھی۔ اس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جنت میں رہنے والی اروسی تھی۔ جسے اگستیا نے بد دعا دی تھی کہ وہ زمین پر رقاصہ بن کر جائے۔ ہوا یہ تھا کہ اندر کی محفل میں اروسی اور نرادا اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اگستیا نے دیکھا کہ نرادا ٹھیک سے نہیں بجا رہے اور اندرا کے لڑکے جینیتا کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ نرادا کی وجہ سے اروسی کا رقص بھی خراب ہو گیا۔

یہی وہ اروسی ہے جو پوہر میں مادھوی کے نام سے پیدا ہوئی۔ وہ سولہ سال کی ہوئی تو اس فن میں کوئی اس کا مقابل نہیں رہا۔ وہ جب سات سال کی تھی تو اس کی ماں نے اس میں تمام صلاحیتیں دیکھ لی تھیں۔ اسے لئے شہر کے سب سے بڑے استاد کو اس کی تعلیم پر مامور کیا تھا۔

اور چودہ سال کی عمر تک وہ اس فن کی ماہر ہو چکی تھی۔

خوبصورتی، رقص اور سرود میں تمام مملکت میں کوئی اس کا ہم پلہ نہیں تھا۔ اسے دیسی اور مارگی دونوں طرح کے ناچ پر پورا عبور حاصل تھا۔ بلکہ وہ فن رقص پر پوری طرح حاوی تھی۔

کوولن جب چترا پتی کے گھر ناچ اور گانے کے لئے جاتے تو مادھوی سے گانا ضرور سنتا اور اس کا رقص بھی دیکھتا۔ مادھوی نے اسے اچھا خاصا متاثر کر رکھا تھا۔ وہ سوچتا کاش کناکی کو بھی اس کی طرح رقص و سرود پر مہارت حاصل ہوتی۔ اسے اپنے ملک پر غصہ آتا جہاں ایسے فنوں کو گھر کی بہو بیٹیوں کے لئے مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر کناکی مادھوی کی طرح ناچنا گانا جانتی تو اس کی دلکشی میں کتنا اضافہ ہو جاتا۔ ابتدا میں تو وہ مادھوی سے صرف ایک فنکار کی حیثیت سے ملتا تھا اس کے جذبات اس قدر معصوم تھے کہ ایک دن وہ مادھوی کو اپنے گھر لے آیا تاکہ کناکی کو اس کا فن دکھا سکے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ حسن میں بھی مادھوی، کناکی سے کسی طرح کم نہ تھی اور فن کار کی حیثیت سے تو خیر وہ بے مثال تھی ہی۔

مادھوی نے جب پہلی بار کوولن کو دیکھا تھا تو نجانے اس پر کیا جادو سا ہو گیا تھا اور تب سے وہ کوولن کو حاصل کرنے کی لگاتار کوشش کرتی رہی اور آج تو خلاف معمول اس کی ہر حرکت پر کوولن اسے ایک عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔

کناکی نے سب کچھ غور سے دیکھا اور اسے پہلی بار خطرہ محسوس ہوا۔ لیکن فوراً کناکی نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کوولن کو کناکی کے فن سے محبت ہے اور بس۔ اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔ جب کسی اور نے کوولن پر شک نہیں کیا تو پھر میں کیوں کروں۔

مادھوی رقص کر رہی تھی۔ مگر یہ رقص کناکی کے لئے ایک ذہنی کرب بن کر رہ گیا۔ رقص ختم ہونے پر اس نے ایک سرد آہ لی جیسے مصیبت سے نجات مل گئی ہو۔

کوولن نے چترا پتی اور مادھوی کو بہت قیمتی جواہرات کے نیکلس تحفتاً دئے اور وہ دونوں اپنے گھر واپس چلی گئیں۔

رات کو جب وہ دونوں تنہا رہ گئے تو کناکی نے کوولن کو پان بنا کر دیا۔ لیکن کوولن نے بہت لاپرواہی سے پان لیا۔ جیسے وہ کہیں اور کھویا ہوا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ" کناکی نے پوچھا۔

"اوہ! کچھ بھی تو نہیں" اس نے جواب دیا اور بڑی گرمجوشی سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"ہمارے خواب بہت جلد پورے ہو جائیں گے" کناکی نے کہا۔

"خواب... کیسے خواب" کوولن نے پوچھا۔

کناکی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"میں بھی کتنا بیوقوف ہوں" کوولن نے کہا۔ "خدارا مت رو۔ تمہارا مطلب ایک خوبصورت بچے ہی سے تھا نا! کتنی پرانی بات ہے"

"مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو" کناکی نے کہا۔

زندگی میں آتے ہوئے اس نئے طوفان پر قابو پانے کی کناکی پوری کوشش کر رہی تھی۔

"میرا اس دنیا میں سوائے آپ کے کوئی نہیں ہے" کناکی نے

کہا۔ میرا سب کچھ آپ ہی ہیں۔ میرے باپ، ماں، بھائی، شوہر
غرض ہر چیز آپ ہی ہیں۔

کوولن نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اور اس کا چہرہ اپنے چہرے
سے قریب کر لیا۔ وہ کناگی کی معصوم اور محبت سے لبریز آنکھوں کو غور
سے دیکھ رہا تھا۔ کناگی کے ہونٹوں پر خشک آنسوؤں کے نشان تھے۔
جن پر کوولن نے اپنے ہونٹ رکھ دئے۔

تم رو رہی ہو۔ مگر کیوں؟

میں خوشی میں رو رہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔

نہیں ان آنسوؤں میں نمک بہت زیادہ ہے۔ میں جانتا ہوں
میری جان مجھے معاف کر دو۔ واقعی آج شام کے رقص نے بہت
زیادہ متاثر کر رکھا تھا۔ اور اسی لئے میں تھوڑی بہت سرد مہری سے
پیش آیا تھا۔ مگر اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مجھے رقص اور سرود سے
کتنی محبت ہے تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ کاش میرے دل میں
یہ محبت نہ ہوتی۔

مگر اس محبت میں خرابی کیا ہے۔ کناگی نے کہا۔ مجھے کوئی حسد
نہیں ہے۔ آپ مادھوی کے ناچ اور گانے سے جتنا بھی چاہیں لطف
اندوز ہو سکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میری تمنا صرف یہ ہے کہ
آپ خوش رہیں۔

میری زندگی۔ کوولن نے کہا تم کس قدر نیک اور شریف ہو۔ میں
کوشش کروں گا۔ کہ خود کو تمہاری محبت کے قابل بنا سکوں۔ اس نے
ایک بار پھر کناگی کو سینے سے لگا لیا۔ کناگی کے پیروں میں پڑی ہوئی
پائل ایک دوسرے سے ٹکرا کر بج اٹھیں۔

کتنی خوبصورت ہیں تمہاری پائل۔ ان کی قیمت کا تو اندازہ بھی
نہیں لگایا جا سکتا۔

یہ پائل مجھے ماتا جی نے دئے تھے۔ کناگی نے کہا وہ کہتی تھیں کہ
انھیں کسی بادشاہ نے تحفہ میں دئے تھے۔ ان پائلوں میں ایسے جواہرا
لگے ہوئے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں۔ ماتا جی کہتی تھیں کہ دنیا میں
ان پائلوں کی کوئی مثال نہیں کوئی ایسے پائل بنا ہی نہ سکا۔

کیا وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ تم جیسی خوبصورت اور حسین کناگی دنیا
میں صرف ایک ہے۔ کوولن نے اسے ایک طویل بوسا دیتے ہوئے
کہا۔

لیکن ذہنی اعتبار سے وہ اب مادھوی کے گھر میں تھا۔
کئی ماہ تک وہ چترا پتی کے گھر نہ گیا۔ بلکہ اس راستے سے بھی
نہ گزرتا جہاں وہ رہتی تھی۔ کناگی سے اس کے تعلقات ہمیشہ کی طرح
خوشگوار تھے۔

دن تیزی سے گذرتے رہے۔ کناگی تو اس خطرے کو بھول
بھی گئی جو مادھوی کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

سادھون اور اس کی بیوی دن بھر اپنے بچوں کے ساتھ بیتتے
وہ اس نوجوان جوڑے کو ظاہرا ان محبت تکتے رہتے تھے۔

وہ بے صبری سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے۔ جب خدا
ان کو پوتا یا پوتی دے گا۔ جنھیں وہ اپنے گھر لے جا سکیں گے تاکہ انھیں
بے کاری سے نجات مل جائے۔

تیسرا باب

ابھی چھ ماہ بھی نہ بیتے تھے کہ ان کی زندگی میں ایک خوفناک
طوفان آ گیا۔

اندرا کا تہوار آ رہا تھا۔ مادھوی پہلی بار اس تہوار میں
ایک رقاصہ کی حیثیت سے حصہ لے رہی تھی۔ رقص کے اس مظاہرے
کے بعد اسے ایک باقاعدہ پیشہ ور رقاصہ کی زندگی شروع کرنی
تھی۔ کسی بڑے آدمی کا انتخاب کرنا تھا۔ جو اس کی سرپرستی کر سکے۔

تمام شہر کے لوگ بے چینی سے اس تہوار کا انتظار کر رہے
تھے۔ جوان، بوڑھے، عورتیں غرض ہر ایک کے منہ پر مادھوی کا نام
تھا۔

اس محفل میں بادشاہ کو بھی آنا تھا۔ اسی لئے کوولن کو سرکاری
طور پر حکم دیا گیا کہ وہ شرکت کرے۔ اس کے سب دوست پہلے ہی
جا رہے۔ لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شریک نہ ہوگا۔ اسے
ڈر تھا کہ مادھوی کی محبت کی آگ پھر سے نہ سلگ اٹھے۔ لیکن اب
تو وہ مجبور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اگر نہ گیا تو لوگ نہ جانے کیا کیا
کہیں گے۔ کچھ یہ بھی تھا کہ مادھوی کی دلکش آواز اور خوبصورت
رقص اس کا دامن دل کھینچے جا رہا تھا۔

کناگی بھی اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکی وہ تو دل اور
جان سے چاہتی تھی کہ اب کوولن اس محفل میں شریک ہو تا کہ کچھ لطف

بنا سکے۔ کنا کی کا خیال تھا کہ اب کودلن کے دل میں مصادوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پچھلے چھ ماہ میں کودلن کے رویے نے اس کے دل سے تمام خوف دور کر دیئے تھے۔

کنا کی اپنے معصوم انداز میں سوچتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کودلن کا یہ پیار، یہ خلوص کبھی بھی ایک رقاصہ کیلئے نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاید کنا کی نے خوبصورت آم نہیں دیکھے جو باہر سے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اندر سے خراب ہوتے ہیں۔ کچھ یہ بات بھی تھی کہ کودلن نے کبھی اسے بتایا ہی نہیں تھا کہ اس تمام عرصے میں اس کے دل میں مادھوی کی محبت کی چنگاری سلگتی رہی ہے۔

جوں جوں تہوار قریب آ رہا تھا کودلن کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ تہوار کا دن قریب آتا گیا اور اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔

وہ باغ میں ٹہل رہا تھا۔ اس نئی الجھن کا کوئی حل اسے نظر نہیں آ رہا تھا یا خدا! میں بھی کتنا بدنصیب انسان ہوں۔ میرے قدموں میں جنت ہے۔ کنا کی جیسی محبت کرنے والی عورت جنت سے کم نہیں ہے۔ مگر میں مادھوی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ آخر رقص و سرود میں کیا ہے جو آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ اس کے فرض کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ مادھوی کے اس رقص کو نہ دیکھوں۔ مگر حالات بھی کتنے ناسازگار ہیں۔ خود میری پیاری کنا کی چاہتی ہے کہ میں اس محفل میں شریک ہوں۔

میری وجہ سے کنا کی کی آنکھوں میں آنسو آئیں۔ اے خدا اس سے پہلے مجھے موت دے دے۔ مگر کیا کروں۔ جب میں مادھوی کا رقص دیکھتا ہوں مجھے خود پر قابو نہیں رہتا۔ میں اس کا غلام ہوں۔ مگر اے خدا میں کیا کروں۔ میری حالت اس شرابی کی سی ہے جو ہوش میں ہونے پر شراب کو برا بھلا کہتا ہے۔ لیکن شراب اس کے قریب آتی ہے تو وہ خود کو روک نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ مادھوی کی ایک ہی مسکراہٹ مجھے تباہ کر دے گی۔ میں خود کو بالکل بھول جاؤں گا۔

رقص کے دوران میں اس کے ہاتھ پاؤں کی جنبشیں مجھے لوٹ لیں گی۔ اے خدا کیا کروں۔

وہ یونہی باغ میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی جسے ایک سپاہی جان سے مار رہا تھا۔ اس پر الزام یہ تھا کہ اس نے جھوٹی گواہی دی تھی۔ اس کی بیوی قریب ہی کھڑی دھاڑیں مار کر رو رہی تھی اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ بھی تھا۔

اسے اسے مت مارو۔ اس کے بعد میرے اس بچے کی پرورش کون کرے گا۔ عورت آہ و زاری کرتی رہی۔

یہ دردناک منظر دیکھ کر کودلن اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔ ٹھیک ہے۔ اس نے سوچا میری پریشانی کا حل نکل آیا۔

اسے مت ماریئے۔ اس نے افسر سے کہا۔ میں خود کو اس کی جگہ پیش کرتا ہوں۔ کودلن نے آگے بڑھ کر سپاہیوں کے افسر سے کہا۔

کچھ دماغ خراب ہے تمہارا۔ افسر نے حیرت سے کودلن کی طرف دیکھا۔

مگر جب افسر نے کودلن کو غور سے دیکھا تو اس کا قیمتی لباس اور چہرہ دیکھ کر اسے یہ تو یقین ہو گیا کہ کوئی شریف آدمی ہے۔ اس نے مؤدبانہ سلام کیا۔ معاف کیجئے۔ جناب میں نے گستاخی کی۔ دراصل میں نے آج سے پہلے کبھی ایسی پیشکش نہیں سنی تھی۔

کوئی بات نہیں کودلن نے کہا۔ مگر منظور ہے آپ کو۔

ہرگز نہیں جناب۔ افسر نے جواب دیا۔ کیا میں اپنے ملک کے ایک نیک شہری کو قتل کر سکتا ہوں۔ اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے بدلے میں جو بادشاہ کے دربار میں جھوٹ بولتا ہے۔ اور پھر کیا آپ کا خیال ہے کہ میں پاگل ہوں۔ میں نے بیس سال تک بادشاہ کی وفاداری سے خدمت کی ہے۔ آپ کی پیشکش کا شکریہ۔

اسے جان سے مار دو اس نے سپاہیوں کو حکم دیا

ایک درد انگیز آواز بلند ہوئی اور سپاہیوں نے اپنا کام کر دیا! مرنے والے کی بیوی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ کودلن اسے ہوش میں لایا۔ کودلن نے اسے سو اشرفیوں کی ایک تھیلی دی تاکہ وہ آرام سے زندگی گزار سکے۔ اور اس کا پتہ لکھ لیا تاکہ ایک ہزار اشرفیاں اور بھیج سکے۔

غریب عورت اس فیاضی کو دیکھ کر پھر رونے لگی۔

آپ نے میرے بچے کو بھوک کے مرنے سے بچا لیا۔ عورت نے بری طرح روتے ہوئے کہا۔ خدا آپ کو اس کی جزا میں ایک خوبصورت

بچہ دے۔

افسر خاموش کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔

جناب مجھے کوئی انعام نہیں۔ افسر نے کہا۔ میں نے بھی تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔

نہیں آج میں کچھ نہیں دے سکتا۔ کوولن نے کہا
میرا بھی ایک بچہ ہے جناب۔ اور غریب آدمی ہوں مانکھے کہا
اچھا اپنے بچے کیلئے یہ لے جاؤ اور اس نے دس اشرفیاں دے دیں۔

افسر کو کوولن کی اس فیاضی پر خوشی ہوئی اور حیرت بھی۔
دنیا واقعی اتنی بری نہیں ہے جتنی میں اب تک سمجھتا آیا تھا۔ آپ یقیناً ان لوگوں میں سے ایک ہیں جو جسمانی طور پر جنت میں جائیں گے۔ خدا کرے لوگ ہزاروں سال تک آپ کو یاد رکھیں۔

اندرا کا تہوار بڑی دھوم سے شروع ہوا۔ تماشائیوں سے سڑکیں بھری ہوئی تھیں۔ اور لوگوں کا سب سے بڑا ہجوم تو اس ہال کے قریب تھا جس میں مادھوی کا رقص ہونے والا تھا۔ سٹیج بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ اس کے دو دروازے تھے۔ پلیٹ فارم بہت بڑا تھا۔ جو شیشے کی طرح چمکتے ہوئے لکڑی کے تختوں سے بنایا گیا تھا۔ اور سٹیج پر عبادت اور روحانی فیض کیلئے تصویریں رکھی تھیں شمعیں اس طرح رکھی گئی تھیں کہ کھمبوں کا سایہ نہیں پڑ رہا تھا۔ اور سلک کے شاندار شامیانے پر خوبصورت تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

بادشاہ کا جلوس بہت ہی پرشکوہ تھا۔ بادشاہ اور اس کے وزیر رتھ پر سوار تھے۔ ہاتھیوں پر سوار موسیقار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ یہ رتھ اور ہاتھی پورے شہر کا چکر لگا کر اس ہال میں آئے۔

تمام موسیقار ساز لیکر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ آج مادھوی نے بہت خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے جسم پر سجے ہوئے جواہرات چمک رہے تھے۔ وہ ہال میں داخل ہوئی اور رسم کے مطابق ایک کھمبے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس کی ماں چترا پتی اور باقی دوسرے کھمبے کے پاس کھڑے ہو گئے۔

دستور کے مطابق پہلے دعائیں مانگی گئیں کہ خدا لوگوں کو نیکی دے اور برائیوں سے بچائے۔ دعا کے بعد تمام ساز ایک ساتھ بجائے گئے۔ تمام سازوں کی دھن میں بلا کی ہم آہنگی تھی۔

مادھوی نے پہلے دیسی رقص پیش کیا۔ اور اس رقص کیلئے ایک گانا گایا گیا۔ اس کے بعد دوسرا رقص شروع ہوا۔ جو سنسکرت کا کلاسکی رقص تھا۔

وہ اتنی تیزی سے رقص کر رہی تھی جیسے مشتری پیچان کی بیل میں زندگی آگئی ہو۔ آج اس کا فن اپنے عروج پر تھا۔ بادشاہ اس رقص سے بہت خوش ہوا۔ اس نے مادھوی کے گلے میں سبز نگینوں کا ہار ڈالا۔ جس کا رواج تھا۔ اور ایک ہزار آٹھ اشرفیاں دیں۔ اس کے بعد بادشاہ اپنے محل کو واپس چلا گیا۔

مادھوی ماں کے ساتھ اپنے گھر واپس چلی گئی۔

گھر پہنچ کر اس نے گلے کا ہار اتارا، اور اپنی ملازمہ چیلم کو دیدیا۔ یہ رسم تھی کہ بادشاہ کا دیا ہوا ہار نیلام کیا جاتا اور جو کوئی اسے خرید لیتا وہ رقاصہ کا عاشق قرار پاتا۔

مادھوی کے گھر کے باہر شہر کے تمام سوداگر، زمیندار اور شرفاء کھڑے تھے۔

چیلم وہ ہار لیکر آئی اور بلند آواز سے کہا۔
یہ ہار ایک ہزار آٹھ اشرفیوں میں برائے فروخت ہے جو کوئی یہ ہار خریدے گا وہ خوبصورت مادھوی کا عاشق ہوگا۔

مادھوی کو امید تھی کہ کوولن یہ ہار خریدے گا۔ بلکہ چترا پتی کا تو خیال تھا کہ کوولن یہ ہار خریدنے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دیگا۔

کوولن نے جب سے مادھوی کا رقص دیکھا تھا۔ اس کی حالت خراب تھی محبت کے جن جذبات پر اب تک اس نے قابو پاتے رکھا تھا۔ آج انہیں جذبات نے اسے اپنے قابو میں لے لیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گیا۔ سوائے مادھوی کے اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ مادھوی کے عاشق ہونے کی سعادت وہی حاصل کرے گا۔ چاہے نتائج کچھ بھی ہوں۔ جونہی اس نے چیلم کی آواز سنی۔ اس نے آگے بڑھ کر ہار لے لیا۔ چیلم کوولن کو مادھوی کے شبستان میں لے گئی۔

مادھوی اپنے بستر پر نیم دراز تھی جس پر پھول بچھے ہوئے تھے وہ بہت ہی باریک ریشم کے کپڑے پہنے ہوئے تھی جس سے اس کا خوبصورت جسم جھلک رہا تھا۔ کوولن کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں خوشی سے چمک گئیں۔ پورے شہر کا مشہور اور خوبصورت نوجوان کوولن آج اس

سے محبت مانگنے آیا تھا۔ وہ کوولن کو دیکھ کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔ کوولن نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیا۔ اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ کوولن اس وقت خود کو جنت میں محسوس کر رہا تھا۔ تب ماد ھوی نے اسے سب کچھ بھلا دیا۔ وہ اپنا گھر اور اپنی وفادار بیوی تک کو فراموش کر بیٹھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ہمیشہ ماد ھوی کا ساتھ دے گا۔

دوسرے دن صبح وہ اپنے گھر واپس نہیں گیا بلکہ اس نے اپنے ایک خالی مکان میں رہائش کا انتظام کر لیا۔

مادھوی اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ سوتے، جاگتے، کھاتے، پیتے ہر وقت اس کا تصور رہتا۔ بیوی، کاروبار اور والدین وغیرہ کو بالکل بھول گیا۔

دن بھر وہ تھا اور مادھوی . . . .

چوتھا باب

کوولن اور مادھوی کو ساتھ رہتے ہوئے تین ماہ گذر چکے تھے۔ اور اب تو ان کی خوشی کی انتہا ہی نہیں تھی کہ مادھوی بہت جلد ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ لیکن چترا پتی کو اس بچے کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مادھوی ابھی بہت کم عمر ہے اور بچے کی پیدائش کے بعد اس کی خوبصورتی کم ہو جائے گی۔ وہ پھر ایسا رقص بھی نہ کر سکے گی۔ بچہ ماں کی خوبصورتی اور جوانی کی جڑوں کے لئے کلہاڑا ہوتا ہے۔

لیکن پھر کیا کیا جائے؟ مادھوی کی ملازمہ وسنت مالا نے پوچھا۔ اگر بچے کی پیدائش کے وقت ہم مدھادی کی ہر ممکن حفاظت کریں تو اس کی صحت پر کم سے کم اثر ہوگا۔

یہی میرا خیال ہے۔ چترا پتی نے کہا۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں میرا ذاتی تجربہ ہے۔ جب مدھادی پیدا ہوئی تھی تو میرے ساتھ بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ مادھوی کی پیدائش کے بعد میرے رقص میں پہلی سی بات نہ رہی۔

لیکن اس سلسلے میں کوسیکر کا خیال بھی بڑا عجیب ہے وسنت مالا نے کہا وہ کہہ رہے تھے کہ سب بڑی جسمانی، تہذیبی، ادبی، اور فنی بد اخلاقی ہے کہ ہم زندگی کی شمع آنے والی نسلوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہ تو یہی کہہ رہے تھے کہ دنیا کے اور سب نظریات محض بکواس ہیں۔

ممکن ہے یہ ٹھیک ہو۔ اور کوسیکر کا یہ نظریہ تو اس لئے ہے کہ وہ خود میری فنی صلاحیتوں کا گلا گھونٹنے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی وجہ سے میں ایک ماہر رقاصہ نہ رہ سکی۔ کتنی مضحکہ خیز ہیں یہ باتیں۔ انسان اپنی ناکامیوں کو چھپانے کیلئے مختلف نظریات کے شیش محل میں پناہ لے لیتا ہے۔ چترا پتی بولے ہی جا رہی تھی۔ مگر وہ آدمی سمجھدار ہے اس سے پوچھیں گے کہ اس وقت مادھوی کی تیمارداری کس طرح کی جائے۔ اور اسے کیا خوراک دی جائے۔

اسی لمحے کوسیکر گھر میں داخل ہوا۔ وہ پینتالیس سال کا ایک برہمن تھا۔ چہرے سے مہذب انسان معلوم ہوتا تھا۔ بال سفید ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے جسم اور لباس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی صحت کا ہر ممکن خیال رکھتا ہے۔ اس وقت وہ پان کھا رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹ سرخ ہو رہے تھے۔

ارے آپ نے خود ہی پان کھا لیا۔ یہ بھی انتظار نہ کیا کہ چترا پتی آپ کو پان بنا کر دیں وسنت مالا نے کوسیکر سے کہا۔

لیکن دوسرے پان سے بھی مجھے انکار نہیں کوسیکر نے جواب دیا۔ ہاں مادھوی کا کیا حال ہے۔

اف یہ مرد کیسے ظالم ہوتے ہیں چترا پتی نے تنک کر کہا۔ آپ میری صحت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتے۔ یہ تو پرانی ریت ہے۔ جب ہم عورتیں ایک خاص عمر کو پہنچ جاتی ہیں تو مرد ہمارے لئے پریشان ہونا چھوڑ دیتے ہیں۔

نہیں بھئی۔ تمہارا خیال غلط ہے۔ تم اچھی خاصی بیٹھی ہو۔ پھر میں کیا پوچھوں۔ مادھوی اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔

کیا صرف شکل سے سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کتنی الجھنیں ہیں جنہوں نے میری زندگی تباہ کر دی ہے چترا پتی نے کہا۔

تمہارا خیال ہے۔ آدمی کی ذہنی پریشانیاں صرف چہرے سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ آدمی کا چہرہ دل و دماغ کا آئینہ ہے کوسیکر نے جواب دیا۔

ٹھیک ہے۔ لیکن کچھ ایسی بھی پریشانیاں ہوتی ہیں جو مگر مچھ کی

طرح ہمیشہ پانی کی اندرونی سطح پر رہتی ہیں جنہیں پانی سے باہر آنے کا کبھی موقع نہیں ملتا۔ وسنت مالا ان دونوں کے بیچ میں بول پڑی۔

میں پچھلے بیس سال سے چترا پتی کے ساتھ ہوں۔ اس لئے پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ انھیں ایسی کوئی پریشانی نہیں ہے کوسیکر نے جواب دیا۔

یہ تو خیر مجھے معلوم تھا کہ ایسی باتیں کریں گے۔ چترا پتی نے وسنت مالا سے کہا۔ مگر مجھے تم سے ایک بہت اہم مشورہ لینا ہے۔ چترا پتی کوسیکر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ تم جانتے ہو مادھوی ماں بننے والی ہے۔

میرا بھی یہی خیال تھا۔ پچھلی دفعہ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو اس کی صورت ہی بدلی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب وہ ماں بننے والی ہو۔

بس آپ تو بہت بڑے وید ہیں چترا پتی نے کہا۔

تم یقین کرو کہ میں سمجھ گیا تھا۔ کوسیکر نے کہا دیکھو تم جانتی نہیں۔ ایسے موقع پر عورت میں بہت سی جسمانی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔

ہم نہیں جانتے۔ آپ کے اس خیال کا کوئی جواب نہیں ہے۔

حضور ہم لوگ براہ راست ان تجربوں سے گذرتے ہیں۔ ہماری معلومات تجربہ کی بنا پر ہوتی ہے۔ آپ کی طرح نہیں کہ کرم خوردہ کاغذوں پر لکھے ہوئے پچھلی نسلوں کے تجربات پڑھ لئے اور وید بن بیٹھے۔

تم بھی مذاق کر رہی ہو مریض اپنے مرض کو وید سے بہتر نہیں جانتا۔ اگر تمہارا خیال ٹھیک ہوتا تو پھر وید کی ضرورت نہ رہتی ہر مریض اپنا علاج آپ کر لیتا۔

تو کیا ماں بننے کی تیاری کرنا کوئی مرض ہے۔ چترا پتی نے کہا۔

نہیں میں نے کب کہا کہ یہ کوئی مرض ہے۔ میں نے تو صرف ایک مثال دی تھی۔ ورنہ یہ دنیا کی سب سے زیادہ صحت مند چیز ہے۔ اگر مادھوی ایسے وقت میں کھانے اور پینے کی پابندی کرے تو خطرہ ہو۔

یہی تو میرا بھی مطلب ہے۔ ذرا یہ بتاؤ کہ اسے کھانے کو کیا دیا جائے۔ جس سے اس کی صحت برقرار رہے اور بچے کی پیدائش سے اس پر کوئی اثر نہ پڑے۔

اس وقت اسے اپنا ذہن تمام اُلجھنوں سے دُور رکھنا چاہیئے اور اس سے کہنا کہ روز دو گلاس دودھ اور چار گلاس تازہ پانی پیئے

اتنا پانی کیوں؟ وسنت مالا نے پوچھا۔

اپنے لئے اور اس بچے کے لئے۔ اس نے جواب دیا۔

بچے کیلئے۔ ابھی تو وہ دو ماہ کا بھی نہیں ہے۔

ہاں! لیکن اتنی مدت میں بچہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ کوسیکر نے ہاتھ کا انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ پیر بھی بن جاتے ہیں۔ بلکہ ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں بھی بن جاتی ہیں۔

کیا مطلب؟ اس انکشاف نے دونوں عورتوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

ہاں جناب ابھی تو وہ باتیں ہیں۔ جو آپ عورتیں نہیں جانتیں۔ حالانکہ آپ سب ماں بنتی ہیں۔ کوسیکر نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن اتنا چھوٹا بچہ غذا کیسے کھا سکتا ہے۔ وسنت مالا کی حیرت ابھی تک دور نہیں ہوئی تھی۔

خدا نے ایسے ذرائع پیدا کر دئے ہیں کہ بچہ خود غذا لیتا رہتا ہے تم نے وہ نال تو دیکھی ہوگی جو ماں اور بچے کو ایک کر دیتی ہے۔ بس اسی نال سے بچے کو بہترین غذا اور ہوا ملتی رہتی ہے۔ کوسیکر نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

کتنی عجیب بات ہے؟

اس سے زیادہ عجیب بات تو یہ ہے کہ چھ ماہ سے پہلے بچے میں حرکت کرنے کی بھی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اور پھر بھی غذا لیتا رہتا ہے۔ پانی، کھانا اور ہوا سب کچھ اسے ملتا رہتا ہے۔

کیا ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ بچے کی جنس کیا ہے وسنت مالا نے پوچھا۔

ہاں معلوم کر سکتے ہیں۔ کوسیکر نے کہا۔ لیکن بچے کی پیدائش کے بعد سب زور سے ہنس پڑے۔

لیکن کچھ جیوتشی تو بالکل ٹھیک پیشین گوئی کرتے ہیں۔ وسنت مالا نے پوچھا۔ انھیں کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔

یہ تو ایک طرح کا جوا ہے۔ بالکل ایک کاروبار ہے جس میں پچاس فیصدی نفع کی امید ہوتی ہے اور پچاس فیصدی نقصان کی۔

کیا مطلب یہ نفع نقصان کیا ہے۔ وسنت مالا نے پوچھا۔

ایک دفعہ ایک جیوتشی صاحب قبلہ نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک صاحب کے ہاں لڑکا ہوگا۔ اور واقعی لڑکا ہوا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی میں ان کے پاس گیا۔ بڑی منت اور سماجت سے انہوں نے راز بتایا اور راز صرف یہ تھا کہ وہ ایک پرچے پر لڑکی لکھ دیتے اور دوسرے پر لڑکا دونوں کو بند کر کے ایک اٹھا لیتے اور پیشین گوئی فرما دیتے۔ مگر میری

کچھ میرا یہ بات نہ آئی۔ اس لئے میں نے کبھی اس پر عمل نہیں کیا۔

اچھا ایک بات اور بتایئے۔ وسنت مالا نے پوچھا ہم نے سنا ہے قوتِ ارادی سے بچّے کی جنس بدلی جاسکتی ہے کیا یہ ممکن ہے؟

ہاں ممکن ہے؟ مگر صرف دیوتاؤں کیلئے! انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

اچھا مادھوی کے ہاں لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ چترا پتی نے پوچھا۔

میرا خیال ہے لڑکی ہوگی۔ کوسیکر نے کہا۔ کیونکہ مادھوی زیادہ طاقتور ہے۔

طاقت کا کیا تعلق؟

جنسی اعتبار سے جو بھی طاقتور ہو بچّہ اس کی جنس پر ہوگا۔

تو اس کا مطلب ہے کہ چترا پتی آپ سے زیادہ طاقتور ہیں۔ کیونکہ آپ کے ہاں بھی تو لڑکی ہوئی تھی۔

بالکل اس میں کیا شک ہے۔ اگر میں طاقتور ہوتا تو دوسری شادی کرکے باقاعدہ گھریلو زندگی نہ گذارتا۔ کوسیکر نے کہا۔

آپ کا شکریہ! مجھے زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔ چترا پتی نے کہا۔

اب ہم دونوں اس عمر سے گذر چکے ہیں جب اپنی تعریف سے ہمیں شرم آتی تھی۔ اب تو ہم سچی بات کہہ سکتے ہیں۔

اچھا اور بتاؤ مادھوی کو کیا غذا دی جائے چترا پتی نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

اس کو جتنے پھل اور ترکاری دے سکتی ہو دو۔ شراب اور گوشت بالکل مت دینا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے یہی ہدایات تم نے مجھے بھی دی تھیں۔ چترا پتی نے کہا۔

اور ہماری ہدایات پر عمل کرکے تم کتنے خوبصورت بچّے کی ماں بنیں۔

لیکن میں ماں بننے کے بعد پہلی سی فنکار تو نہ رہی۔

تمہارا خیال غلط ہے۔ تمہارے فن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تم بہت عرصے تک پورے شہر کی واحد رقاصہ رہی ہو۔ کسی نے بھی کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ لیکن جب مادھوی نے اپنے فن کا چراغ جلایا تو تمہارا چراغ مدھم پڑ گیا۔ تمہیں مادھوی کے فن سے نقصان پہونچا ہے۔ اس کی پیدائش سے نہیں۔۔۔۔

اچھا مادھوی کیلئے کوئی اور ہدایات۔ چترا پتی نے پھر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

کچھ ماہ کے بعد مادھوی کو اپنے کمرے میں سلانا۔ اس کے بعد کوولن کو صرف باتیں کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

یہ بڑا مشکل کام ہے۔ خیر کچھ کروں گی۔ مگر جناب یہ بالکل نئی ہدایت ہے میری دفعہ آپ نے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ چترا پتی نے مسکرا کر کہا۔

ہاں بڑی عجیب بات ہے لیکن اگر وید خود کوئی دوا استعمال نہ کریں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ دوا خراب ہے۔

ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ کچھ اور؟ چترا پتی نے پوچھا۔

اب کچھ بات صرف تم سے کہنے کی ہے ذرا ادھر آؤ۔ اور کوسیکر چترا پتی کو ایک طرف لے گیا۔

دیکھو ایک بات کا خیال رکھنا۔ کوولن کو مجبور کرکے بچّے اور اس کی ماں کے اخراجات کیلئے کچھ جائداد ان کے نام کرالینا تاکہ یہ دونوں آرام سے زندگی گذار سکیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ بچّہ ہونے کے بعد مرد کی توجہ اور اس کی محبت ختم ہوجاتی ہے۔ اور وہ دوسری خوبصورت عورت کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ کوسیکر نے کہا۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے تھوڑا بہت تو کرلیا ہے۔ لیکن باقی انتظام بھی کرا لوں گی۔ مگر ایک بات تو بتاؤ۔ تم کو ولی سے کیوں خائف ہو مادھوی کی پیدائش کے بعد تم نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔

ہاں میں نے ایسی حرکت نہیں کی۔ معلوم ہے کیوں؟ میرے پاس اتنی دولت نہیں تھی جتنی کوولن کے پاس ہے۔ اور پھر کسی عورت نے ہمیں حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جبکہ کوولن اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہے۔

تمہارا اپنے بارے میں اندازہ غلط ہے۔ تم بہت زیادہ قیمتی چیز ہو۔ چترا پتی نے کہا۔

آج میں زندگی میں پہلی بار اپنے بارے میں یہ الفاظ سن رہا ہوں۔ دونوں پھر وہیں آ گئے جہاں وسنت مالا بیٹھی ہوئی تھی۔

اچھا ایک بات اور بتایئے۔ بچّہ کو جسمانی طور پر اپنے والدین سے کیا ملتا ہے۔ میرا مطلب ہے وہ ماں سے کیا لیتا ہے اور باپ سے

کیا؟ وسنت مالا نے پوچھا۔

گوشت، خون اور جسم کی کھال بچے کو ماں سے ملتی ہے۔ ہڈیاں۔ ان کا مغز اور طاقت باپ سے۔ کوسیکر نے کہا۔

لیکن دوران حمل میں عورتوں کو طرح طرح کی خواہش ہوتی ہے۔ ان کی کیا وجہ ہے؟ وسنت مالا نے پوچھا۔

ہاں ایسے موقع پر عورتوں کی خاص عادتیں اور خواہشیں ابھر آتی ہیں۔ بعض عورتیں کچے چاول کھانا پسند کرتی ہیں۔ بعض عورتیں ایسے پھل مانگتی ہیں جن کا فراہم کرنا مشکل ہو۔ بعض عورتیں چاہتی ہیں کہ ان کے شوہر ہر وقت ان کے پاس ہی بیٹھے رہیں۔ عقلمندی یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عورت کی خواہش پوری کر دینی چاہیئے کیونکہ عورت اور بچے کی ناامیدی نقصان دہ ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مادھوی آگئی۔

کیا باتیں ہو رہی ہیں مادھوی نے پوچھا۔

ارے کیا تم ہماری باتیں سُن رہی تھیں۔ کوسیکر نے پوچھا۔

میں نے آپ لوگوں کی تمام باتیں سُنی ہیں۔ البتہ وہ باتیں نہیں سُن سکی جو آپ نے ماتا جی کو الگ لے جا کر کی ہیں۔

چلو اچھا ہوا تم نے خود سب کچھ سُن لیا۔ میری آدھی مشکل تو حل ہو گئی۔ چترا پتی نے کہا

لیکن ایک بات بتائیے کیا بچہ صرف انگوٹھے کے برابر ہے اور ابھی حرکت بھی نہیں کر سکتا مادھوی نے کوسیکر سے پوچھا۔

بالکل۔ کوسیکر نے جواب دیا۔

بڑی عجیب بات ہے۔ مادھوی نے کہا۔

تم کو کیا بڑے بڑے عالموں کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی۔ جبھی تو ان کا خیال ہے کہ ہم دیوتا انگوٹھے برابر ہے اور ہمارے جسم میں حرکت نہیں کرتا۔ کوسیکر نے کہا۔

اچھا! وہ جو تم ایک بھجن سناتے ہو۔ اس کا یہ مطلب ہے۔ چترا پتی نے کہا۔

اور کیا؟ کوسیکر نے کہا۔

میں اب جا رہا ہوں مجھے ایک ضروری کام ہے۔ دیکھو مادھوی میں نے جتنی ہدایات دی ہیں ان پر عمل کرنا۔ ہماری زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب ہمیں آنے والی نسل پر ہماری خواہش قربان کرنی پڑتی ہیں۔

اور کوسیکر چلا گیا۔

مادھوی نے تمام باتیں کوولن سے کہہ دیں۔ خاص طور پر اس نے بچے کے انگوٹھے کے برابر ہونے پر زور دیا۔ اور کوولن کو بتایا کہ بچے کو غذا۔ اور ہوا کس طرح ملتی ہے۔ کوولن کو خود ان باتوں میں بڑی دلچسپی تھی۔

کنا کی کے ساتھ اتنے عرصے رہنے کے بعد اسے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ آج باپ بننے کے خیال سے اس کو خود پر فخر ہو رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کوسیکر کی تمام ہدایات پر عمل کریگا جب تک وہ باتیں کرتے رہے ان کا موضوع اکثر بچہ ہی تھا۔

چھ ماہ بعد بچہ ماں کے پیٹ میں حرکت کرنے لگا مادھوی نے کوولن کو بچے کے دل کی دھڑکنیں سنائیں۔ جو اس وقت اس کے جسم کا ایک حصہ تھا۔ اور کوولن کو بچے میں اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ ہر وقت اس بچے کو حرکت کرتے ہوئے محسوس کرتا رہتا تھا۔

یہ دنیا کتنی پر اسرار ہے۔ کوولن نے کہا۔ دیکھو یہ بچہ کس طرح حرکت کر رہا ہے۔

مادھوی دن رات بچے کی ان حرکتوں کے بارے میں باتیں کرتی رہتی۔

جوں جوں دن گذر رہے تھے۔ کوولن کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ بچہ جلد از جلد اس دنیا میں آ جائے۔

اسی دوران میں اس نے اپنی آدھی سے زیادہ جائداد مادھوی اور بچے کے نام کر دی تھی۔ گھر کا کوئی بھی ایسا فرد نہیں تھا جسے اس نے بیش بہا تحفے نہ دیے ہوں۔ مندروں میں بارہا اس نے دعائیں مانگیں کہ مادھوی محفوظ رہے۔ اس نے غریبوں اور ضرورت مندوں کو بے انتہا خیرات دی۔ کوسیکر کی کوئی ہدایت ایسی نہ تھی جس پر اس نے سختی سے عمل نہ کیا ہو۔ بلکہ اس سختی سے تو مادھوی بھی اکتا گئی تھی۔

کوولن اپنی خواہشات سے زیادہ مادھوی اور بچے کا خیال تھا۔

آخر وہ وقت آگیا جس کا کوولن صاحب کو بے انتہا انتظار تھا شہر کی ماہر نرسوں کو بلایا گیا۔ تمام گھر عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ کوولن دن بھر کمرے کے باہر بیٹھا رہتا۔ ممکن ہے کس چیز کی ضرورت

پڑے۔ بیچارے کو پورے دو دن بے حس و حرکت کرے کے باہر پڑا رہنا پڑا۔

اچانک بچے کے رونے کی آواز آئی اور وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ نرسوں نے بچے کو نہلایا اور بچہ پہلے سے بھی زیادہ رونے لگا۔ نہلانے کے بعد بچے کو ایک خوبصورت کپڑے میں لپیٹ کر باپ کو دکھایا گیا۔ کتنا خوبصورت تھا بچہ! تمام نرسیں بچے کو پیار کر رہی تھیں۔ ماں اور باپ تو خوشی سے دیوانے ہوتے جا رہے تھے۔

اس نو وارد کی خوشی میں باپ نے برہمنوں رشتہ داروں اور غریبوں کو کھانے پینے کا بے انتہا سامان اور بے شمار سونا تقسیم کیا

اس خوبصورت لڑکی کا نام کیا رکھا جائے۔ کودلن نے مینی میکھلائی تجویز کیا۔ اس نام کے پیچھے ایک کہانی تھی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا تھا کہ کودلن کے آبا و اجداد میں سے ایک صاحب پانی کے جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ اچانک جہاز ٹوٹ گیا۔ دو دن تک وہ پانی پر ایک تختے کے سہارے تیرتے رہے۔ آخر مینی میکھلائی دیوی کی مدد سے وہ ساحل پر پہنچے۔ اس وقت بھی کودلن کا خیال تھا کہ مینی میکھلائی دیوی نے اس کی مدد کی ہے۔ اور دو دن کے بعد اس ننھی سی بچی کو مصیبت سے نجات دلائی۔

چھ دن گذر گئے۔ اور کودلن دنیا کی ہر شے سے بے خبر مینی میکھلائی میں کھویا رہا۔ مگر ساتویں دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ بچے کے سینے پر ایک سرخ رنگ کا داغ دکھائی دیا۔ جو پہلے نہیں تھا۔ کودلن اور سادھوی بڑی بے قراری سے بچے کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

رات اندھیری تھی۔ کودلن کو محسوس ہوا جیسے کوئی اس سے مخاطب ہے۔

میں مینی میکھلائی دیوی ہوں۔ تم نے اس بچے کا نام میرے نام پر رکھا ہے۔ اس لئے اسے میری طرح نیک اور مقدس ہونا چاہیئے۔ اسے کناکی کے پاس لے جاؤ۔ اگر بچے کو اپنی گود میں لیکر پیار کریگی تو بچہ ہر خطرے سے دور ہو جائے گا۔ ورنہ۔ . . . . . .

آواز بند ہو گئی۔

ورنہ۔ ورنہ کیا ہوگا۔ کودلن کا ذہنی توازن خراب ہوتا جا رہا تھا۔

کیا کودلن اس بچے کو گود میں لے لیگی۔ اپنی دشمن کے بچے کو۔

مگر وہ ایک نیک اور شریف عورت ہے۔ کودلن کو خیال آیا۔ اس نے فوراً ایک آدمی کو کناکی کے پاس بھیجا۔ تاکہ وہ کناکی کو سب کچھ بتا دے۔

کناکی خاموش کھڑی سب کچھ سنتی رہی۔ اس کی خادماؤں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ہرگز ایسا نہ کرے۔ آخر ہے تو اس کی دشمن کا بچہ . . . . اور اگر بچہ کو گود میں لے بھی تو اس شرط پر کہ کودلن مادھوی کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر گھر واپس آجائے گا۔

کناکی سب کچھ سنتی رہی۔

کیا تم لوگ مجھے اتنا ذلیل سمجھتی ہو کہ میں ایک بچے کی جان بچانے کیلئے اس قسم کی شرائط پیش کروں گی۔ اگر میرے شوہر کو واپس آنا ہے تو وہ اپنی مرضی سے آجائیں گے۔ جاؤ بچے کو لے آؤ۔ وہ آدھا میرا ہے۔ میرے آقا میرے مالک کا خون اس کی رگوں میں ہے۔

مجھے اس بچے سے محبت ہے۔ کاش میرے آقا مجھے اجازت دے دیں کہ میں اس بچے کو اپنے پاس رکھ لوں۔ یہ بچہ میرے لئے دنیا کا سب سے اچھا تحفہ ہے۔

کودلن نے بچہ بھیج دیا۔

کناکی اس کی خوبصورتی دیکھ کر متحیر ہو گئی۔ اس نے بچہ کو بڑی محبت سے اپنی گود میں لے لیا اور اس کے پھول جیسے رخساروں کو بوسہ دیا۔

بچہ کناکی کی گود میں ہمک رہا تھا۔

دیکھو۔ کیسا خوش ہے یہ بچہ۔ تم کیسے کہتی ہو کہ یہ میرا بچہ نہیں ہے؟ اس کے خد و خال تو دیکھو۔ بالکل میرے آقا جیسے

واقعی بچہ تو بہت خوبصورت ہے۔ ایک خادمہ نے کہا۔

مگر خدا جانتا ہے کہ اس بچہ کا مستقبل کیا ہوگا؟

میں جانتی ہوں کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ یہ بچہ دنیا والوں کیلئے ایک نعمت ہوگا۔ اس کی پاکیزگی اور تقدس دنیا کے لئے روشنی بن جائے گا۔

کناکی کی باتوں نے سب کو حیران کر رکھا تھا۔

بچہ واپس کر دیا گیا۔ چلتے ہوئے کناکی نے کودلن کو یہ پیغام بھی بھیج دیا۔ اگر ممکن ہو تو اس بچے کو دن میں ایک دفعہ ضرور بھیج دیا کرو۔

مینی میکھلائی اسی دن تندرست ہوگئی۔ جب مادھوی اور چترا پتی نے پوری داستان سُنی تو انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اب بچے کو کبھی کناکی کے پاس نہیں بھیجا جائے گا۔

ان کا خیال تھا کہ اگر بچے کی پرورش کناکی کے گھر میں ہوئی تو ان کا بڑا سخت نقصان ہوگا۔ اس بچے کو ان کے فن کا وارث ہونا ہے ایک ماہر رقاصہ بننا ہے۔ اسے بڑا ہوکر شہزادوں کے دل پر فتح پانی ہے۔ اگر کناکی کا اس پر اثر ہوگیا تو یہ بھی ایک ایسا خوبصورت پھول بن کر رہ جائے گی۔ جو گھروں میں کھلتے ہیں۔ اور دنیا کو اپنی خوبصورتی دکھلائے بغیر مرجھا جاتے ہیں۔

کناکی نے ایک دو دفعہ بچے کو منگایا بھی۔ مگر ان لوگوں نے صفائی سے انکار کردیا۔

کناکی اس انکار سے اداس ہوگئی۔ مگر اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی۔ آخر میرا اپنا بچہ تو ہے نہیں۔ میرا اس پر حق بھی کیا ہے۔ میں ہی بدنصیب ہوں۔ ورنہ خدا ان تین سالوں میں مجھے بھی ایک خوبصورت بچہ دے سکتا تھا۔ اب میری زندگی اس پودے کی طرح ہے جو ایک اجاڑ اور ویران گھر میں ہو جس کے مقدر میں سوائے تنہائی کے کچھ نہ ہو۔ انسان کا دل بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ اسے اپنی ذہنی اور حد تو یہ ہے روحانی تسکین کیلئے بھی دنیا کے دوسرے لوگوں اور چیزوں کا محتاج ہونا پڑتا ہے کتنی پُراسرار ہے یہ دنیا؟ میں نے ہی سب کچھ کیا ہے۔ میری ہی وجہ سے مادھوی اور کوولن میں یہ تعلقات پیدا ہوئے اور میں ان دونوں کے تعلقات کے غم میں سلگتی رہی۔ اور آج مجھے ہی ان دونوں کے بچے کو دیکھنے کی اتنی تمنا ہے۔ کاش یہ میرا اپنا بچہ ہوتا۔

قسمت کے مذاق بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ مادھوی نے مجھ سے میرے آقا کو چھین لیا۔ اور اب میرے آقا کے بچے کو بھی دیکھنے نہیں دیتی۔ اے خدا اس بچے پر اپنا کرم کیجیو۔ اسے ایک شمع بنائیو کہ اس کی روشنی تمام دنیا میں اُجالا ہوجائے۔

پانچواں باب

کناکی کی زندگی آلام و مصائب کی نذر ہوگئی۔ اس کا غم اور مالی مشکلات بڑھتی گئیں۔ کوولن ہی تو اس کا سب کچھ تھا۔ اس کا شوہر۔ اس کا آقا۔ اس کا مالک۔ اس کا تو سب کچھ کوولن ہی تھا۔ اب اس کی زندگی میں تھا ہی کیا؟

کوولن۔ مادھوی اور بچے میں اس طرح گم ہوا کہ اسے دنیا کی پرواہ نہ رہی۔ اسے بھول کر بھی کن کی کا خیال نہ آیا۔ اس نے مینی میکھلائی کو بلایا تھا۔ مگر اتنے عرصہ بیت چکا تھا۔ انہوں نے کبھی بچے کو نہ بھیجا۔ البتہ کوولن روپے منگانے کیلئے اکثر آدمی بھیجتا رہا۔

کناکی غم میں سلگتی رہی۔ اس کے پھول جیسے رخساروں میں خون کا نام بھی نہ رہا۔ اب اس کے چہرے پر کبھی مسرت کی لہریں نہ دوڑتیں اس کی زندگی کو خزاں نے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ وہ بہاروں کا منہ دیکھنے کو ترس رہی تھی۔

اکثر مہمان آتے۔ مگر نہ جانے اسے کیا ہوگیا کہ وہ ان کی تواضع نہ کر پاتی۔ کرتی بھی کیسے؟ قسمت نے زندگی کی تمام خوشیاں اس سے چھین لی تھیں۔

ایک دن وہ بہت اداس تھی۔

جانے مجھے کیا ہوگیا ہے۔ یہ محبت اور ناامیدیاں مجھے ختم کردیں گی۔ اس نے اپنی خادمہ سے کہا۔

مالکہ اس غم نے آپ کی کمر دوہری کردی ہے۔ ملازمہ نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا کیا کروں۔ اس غم پر قابو پانے کی پوری کوشش کرتی ہوں۔ مگر جتنا ضبط کرتی ہوں اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے۔ خدا مجھ پر رحم کرے۔ میں بے بس ہوں۔ تم سے اپنا غم نہیں چھپا سکتی۔ لیکن میں ان مصیبتوں کا ذکر اپنے آقا سے نہیں کرسکتی۔ ایک وفا شعار بیوی کبھی بھی اپنے شوہر سے اس کی بے اعتنائی کی شکایت نہیں کرسکتی۔ میں تو یہ تصور بھی نہیں کرسکتی کہ اپنی مصیبتوں کا ذکر والدین سے بھی کروں۔ اور فائدہ بھی کیا۔ ہم اپنے مصائب کی وجہ سے دوسروں کو کیوں پریشان کریں۔

کناکی نے ہمیشہ صبر و استقلال سے کام لیا۔ اس نے کوولن کو کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن اس کی خادمہ کو اپنی مالکہ کی یہ حالت دیکھ کر اتنی جرأت ہوگئی تھی کہ وہ کبھی کبھی کوولن کو برا بھلا کہہ دیتی۔

ایسی عقل، ایسے فن، دولت اور خوبصورتی سے کیا فائدہ! جب انسان اپنے ان عزیزوں کو بھول جائے جو اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہوں۔ جو ہر حالت میں اس کے لئے دست بدعا ہوں

کیا یہ غلط ہے کہ یہ دولت شیر کی خوبصورت کھال اور دانتوں کی طرح نہیں ہے۔ جو آپ جیسی معصوم کو موت کا شکار کردیتی ہیں۔

آج خادمہ کو دلن پر بہت غصہ آرہا تھا۔

اچھا خاموش رہو۔ کناکی نے کہا۔ انھیں کچھ مت کہو۔ میں ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی۔

لیکن میری مالکہ آپ برباد ہوئی جارہی ہیں صرف ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے۔ خادمہ نے کہا۔

نہیں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں ہی بدنصیب ہوں۔ میں نے یقیناً پچھلے جنم میں کچھ ایسے ہی گناہ کئے تھے۔ جن کی مجھے سزا مل رہی ہے۔ اور جن کی وجہ سے مجھے دنیا کی تمام خوشیوں سے محروم کردیا گیا ہے۔ کناکی نے کہا۔ پھر میں اپنی بدنصیبی کیلئے اپنے آقا کو کیوں الزام دوں۔ میرے دل میں ان کی محبت بدستور ہے۔ اس میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ بلکہ یہ بڑھتی ہی جارہی ہے۔ وہ اگر مادھوی سے محبت کرتے ہیں تو کیا ہوا۔ کنول کا پھول کیچڑ میں ہو یا صاف اور شفاف پانی پر...... اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

میں نے آپ کو اکثر ان کے لئے پریشان تو دیکھا ہے۔ اگر آپ کو کسی بات کا خیال نہیں ہے تو پھر کیوں اتنی اداس رہتی ہیں۔ خادمہ نے پوچھا۔

میں کیوں پریشان ہوتی ہوں۔ صرف اس لئے کہ وہ ایک ایسی عورت سے محبت کرتے ہیں جو صرف ان کی دولت سے محبت کرتی ہے۔ اسے ان کی محبت۔ ان کی انسانی خوبیوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ جس دن بھی ان کے پاس دولت ختم ہو جائے گی۔ اس کی محبت بھی ختم ہو جائے گی۔

ہمارے آقا اس بازاری عورت پر کتنی دولت تباہ کر رہے ہیں۔ خادمہ نے کہا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ اتنی دولت اور محبت ملنے کے باوجود ایسی عورتیں محبت کے سچے جذبات سے محروم رہتی ہیں۔

یہ تو عام بات ہے۔ مقناطیس صرف لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ سونے اور دوسری قیمتی دھاتوں کو نہیں۔ ایک رقاصہ کیلئے دولت سب کچھ ہے وہ انسان کی ذاتی خوبیوں سے کیا دلچسپی رکھ سکتی ہے۔ محبت، نیکی اور انسان کی اعلیٰ صلاحیتیں اس کے لئے بے معنی چیزیں ہیں۔

آپ بالکل بجا فرمارہی ہیں۔ خادمہ نے کہا۔ مگر آپ یہ سب باتیں ہمارے آقا کو کیوں نہیں لکھتیں

وہ تو خود ہی اس حقیقت کو سمجھ لیں گے۔ وہ اس ہاتھی کی طرح جال میں گرفتار ہیں جو اپنی گرفتاری کو بھول کر گنے کھانے میں مشغول ہو گیا ہو۔ وقت گزرنے دو۔ ہر چیز کے لئے وقت مقرر ہے۔

لیکن کون جانے یہ سب کتنے عرصے میں ہو۔ خادمہ نے کہا

میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یہ سب ختم بھی ہوگا یا نہیں۔ میری زندگی میں اس جال سے چھٹکارا پا بھی سکیں گے۔ سب قسمت کا کھیل ہے۔

میری مالکہ۔ ایک اور خادمہ بولی جو اب تک خاموشی سے سب گفتگو سن رہی تھی۔ مجھے یقین ہے یہ ڈرامہ چند سالوں میں ختم ہو جائے گا۔ جس طرح یہ دولت لٹائی جارہی ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔

کچھ بھی ہو۔ مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ خدا میرے آقا کو ہر مصیبت سے بچائے رکھے۔ کناکی نے کہا۔

آپ نے مندر بھی تو جانا چھوڑ دیا ہے۔ آپ کی سہیلیاں آتی ہیں۔ مگر آپ پہلے کی طرح ان کی تواضع ہی نہیں کرتیں۔ آپ مصیبت میں زندگی گزار رہی ہیں۔ اور اس مصیبت کے دینے والے کو دعا دے رہی ہیں۔ میں تو کچھ سمجھ نہیں سکی۔ ایک خادمہ نے کہا۔

یہ تو بالکل سمجھنے والی بات ہے۔ اگر عورت میں ایک اچھی بیوی کی خوبیاں نہیں ہیں تو وہ عورت کچھ بھی نہیں ہے۔ عورت کیلئے اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کردار کے اعتبار سے پاکدامن ہو۔ تم نے تو سنا ہوگا۔ جو عورت دیوتاؤں کے بجائے اپنے شوہر کی پوجا کرتی ہے۔ اسے فطرت پر قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ بادلوں پر اپنا حکم چلا سکتی ہے۔

اگر یہ ٹھیک ہے تو مجھے امید ہے کہ ایک دن آپ ہمارے آقا کو واپس بلانے پر بھی قدرت حاصل کرلیں گی۔

مجھے بھی یہی امید ہے کناکی نے کہا۔

کتنا اچھا وقت ہوگا وہ جب آپ دونوں ایک بار پھر ملیں گے۔ ایک خادمہ نے کہا۔

اس میں کیا شک ہے۔ کل ساری رات میں ان کے آغوش میں رہی بلکہ کم بخت صبح ہو گئی۔ اور سپنا ٹوٹ گیا۔ لیکن مجھے تو

سپنا ہی یاد کر کے کتنی مسرت ہوتی ہے۔

اس سے زیادہ دنیا میں کون بد نصیب ہوگا۔ جو محبت کیلئے ترستا ہو۔ اور اس سے زیادہ کون غریب ہوگا۔ جس کے ہاتھوں سے اُمّید کا دامن بھی چھٹ گیا ہو۔ اسی لئے میں اس اُمید میں زندہ ہوں کہ ایک دن وہ ضرور واپس آئیں گے۔ اس وقت ان کا دل ٹوٹا ہوا ہوگا۔ انہیں پھر تسلّی کون دے گا۔ صرف اسی امید پر زندہ ہوں۔ ورنہ میں کبھی کی موت کی آغوش میں پناہ لے لیتی۔

سب خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد کنا کی نے ہلکے سُروں میں ایک گیت چھیڑ دیا

صرف وہ ہی میرا محبوب ہے
میں ہمیشہ اس سے محبت کرتی رہی ہوں۔
اسکے ساتھ زندگی کتنی خوبصورت تھی۔
کاش وہ واپس آ جائے
اور اپنے ساتھ میری خوشیاں بھی لے آئے۔
جو وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

پھر پریشان مت ہوئیے آپ کو اُمید تو ہے کہ وہ واپس آئیں گے۔ ایک خادمہ نے کہا

صرف اپنے آقا ہی کا غم نہیں ہے مجھے یہ بھی افسوس ہے کہ میرے آقا نے مجھے اپنی کوئی نشانی نہیں دی۔ کاش میں ان کے بچّے کی ماں ہوتی۔ اس بچّے کو دیکھ کر کتنا سکون ملتا مجھے۔ . . . اس تاریک زندگی کو کچھ تو روشنی مل جاتی۔ بچہ دنیا کی سب بڑی نعمت ہے۔ عالم کہا کرتے ہیں۔ جس عورت کی گود میں لڑکا ہو۔ اس کا رتبہ کسی دیوی سے کم نہیں ہوتا۔

ایک باعزّت گھرانا خدا کی دین ہے لیکن اس گھر میں ایک خوبصورت بچّہ اس گھر کا تاج ہے۔

بچّہ ہماری سب سے بڑی دولت ہے۔ بچّے کو گود میں لیکر کیسا روحانی سکون ملتا ہے۔ بنسری کی آواز کتنی دلکش ہوتی ہے مگر بچہ کی آواز اس سے بھی زیادہ شیریں ہوتی ہے۔

مگر میں کیسی بد نصیب ہوں۔ مجھے خدا نے کوئی بچہ نہیں دیا۔ ان کے بچّے کو صرف ایک نظر دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ان کی تصویر دیکھ رہی ہوں ـــ اب زندگی میں سوائے ان کی محبت اور کچھ نہیں ہے۔

میں تو آپ سے صرف یہ کہوں گی۔ ایسے ظالم سے محبت کرنا بے کار ہے۔ ایک خادمہ نے کہا۔

ایسا مت کہو۔ زندگی محبت کا دوسرا نام ہے۔ محبت کے بغیر انسان گوشت اور ہڈیوں کا ایک ڈھیر ہے جسے خدا کا ایک تھیلی سے بھر دیا گیا ہو۔ جو لوگ محبت نہیں کرتے وہ اس دنیا میں صرف اپنے لئے رہتے ہیں۔ اور جو لوگ محبت کرتے ہیں ان کا سب کچھ دوسروں کے لئے ہوتا ہے ـــ یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ انسان صرف ایسے لوگوں سے محبت کرے جو محبت کا جواب دیتے ہیں۔ اس طرح محبت جیسی نایاب شے ایک معمولی سی چیز بن کر رہ جائے گی۔ جو بازاروں میں کوڑیوں کے دام بکتی ہے۔

جس نے اپنے دل سے محبت نکال پھینکی۔ اسے زندگی میں کبھی سکون نہیں مل سکتا۔ وہ کبھی بھی خوشی حاصل نہیں کر سکتا۔

مہینے گذرتے رہے۔ کوولن کے بھیجے ہوئے آدمی پہلے سے بھی زیادہ آنے لگے۔ روپیہ اور بھی تیزی سے خرچ کیا جانے لگا۔

کنا کی تھوڑا تھوڑا کر کے ساری دولت دیتی رہی۔ کوولن کی اپنی پوری دولت ختم ہو گئی۔ لیکن کنا کی نے روپیہ دینا بند نہ کیا۔ اسے بھی تو اپنے میکے سے بہت کچھ ملا تھا۔ اس نے وہ روپیہ بھی دینا شروع کر دیا۔ اس نے ایک ایک کر کے تمام قیمتی جواہرات بیچنے شروع کر دیئے۔

مینی میکھلائی کی پیدائش کو تین سال بیت چکے تھے۔ کنا کی کے پاس روپیہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ کفایت کے خیال سے اس نے خادماؤں کو الگ کر دیا۔ خادمائیں اس کی خدمت مُفت کرنے کیلئے تیار تھیں مگر وہ نہ مانی۔

تم لوگ میری وجہ سے کیوں تکلیف اٹھاؤ۔ جاؤ خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔

نہیں یہ تکلیف نہیں ہے۔ ایک خادمہ نے کہا۔ ہماری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ آپ کی خدمت کریں۔ ہم نے آپ کے ہاں رہ کر بہت کچھ حاصل کیا۔ بہت دولت حاصل کی ہے اور اب اگر بغیر مزدوری کے تھوڑا سا کام کر دیں گے تو کیا حرج ہے۔ کنا کی اس پیشکش پر قطعی راضی نہ ہوئی۔ اور ان کو بھیج دیا۔

انہوں نے چلتے ہوئے کناگی سے درخواست کی کہ دن میں ایک دفعہ تو انھیں آنے کی اجازت دیجائے۔ مگر کناگی نے صفائی سے انکار کردیا۔

میں اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔

میں جانتی ہوں تم لوگ مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہو۔ میری مصیبت دیکھ کر تمہیں تکلیف ہوگی۔ اور میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ کناگی نے کہا۔ اس لئے جب تک تم لوگ یہ نہ سن لو کہ میرے آقا واپس آگئے ہیں ہرگز نہ آنا۔

خادماؤں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر اب وہ جانے پر مجبور تھیں۔

اب کناگی بالکل تنہا رہتی تھی۔ اس کے جسم پر پرانی اور پھٹی ہوئی ساڑی ہوتی۔ زیورات میں سوائے چوڑیوں اور پائل کے سب کچھ بک چکا تھا۔ وہ خود سارے گھر کا کام کرتی خود ہی کھانا پکاتی۔

اتنے سادہ کپڑے اور اتنا معمولی کھانا صرف اس لئے کھاتی کہ وہ اپنے آقا کا انتظار کر رہی تھی۔ اب بھی وہ کوولن کی مالی ضروریات پوری کرتی رہتی۔

دس سال اور بیت گئے۔ اداس بغم زدہ۔ یہ دس سال صدیوں سے کم نہیں تھے۔ مگر کوولن اب بھی واپس نہ آیا۔

کچھ دن سے وہ سُن رہی تھی کہ چترا پتی اور اس کی خادمائیں کوولن کی بے عزتی کرتی ہیں۔ مگر وہ بے چاری کرتی بھی کیا۔ صرف خدا سے دعا کرسکتی تھی کہ اس کے شوہر کی عزت برقرار رہے۔

کوولن شاید اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب خود مادھوی بھی اس کی بے عزتی کرے۔ اتنے طویل عرصے تک وہ اپنے شوہر کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر اب نہ جانے اسے کیا ہوگیا تھا اس کی امید کا چراغ ٹمٹمانے لگا تھا۔ اسے یقین سا ہو رہا تھا جیسے اب کوولن کبھی واپس نہ آئے گا۔

چھٹا باب

مادھوی کے ساتھ ابتدائی سالوں میں تو کوولن مادھوی کو بیش قیمت تحائف دیتا رہا اور ان تحائف کا سلسلہ کبھی نہ ختم ہونے والا تھا۔ بیش قیمت ریشمی ساڑھیاں۔ موتی جواہرات اس کے لئے تلاش کرکے لائے جاتے۔ طرح طرح کی شربتیں اور پھل اس کے لئے فراہم کئے جاتے۔ جبکہ بیچاری مصیبت کی ماری کناگی تنہا مصیبت میں گرفتار زندگی کے خارزاروں سے گذر رہی تھی۔ کناگی کی زندگی کا مقصد صرف اپنے شوہر کے لئے خدا سے دعائیں مانگنا تھا۔

دس سال بعد کوولن کو تحائف کا یہ سلسلہ ذرا ہلکا کرنا پڑا۔ لیکن جب بھی ایسا ہوتا کہ وہ مادھوی کے ہاں خالی ہاتھ جاتا تو وہ چترا پتی کو گھر کے باہر دیکھتا۔ جو اسے باہر ہی سے بتاتی کہ مادھوی کو کل کے رقص کیلئے کن کن ساڑھیوں اور جواہرات کی ضرورت ہے وہ بے چارہ اپنے گھر واپس جاتا اسی گھر میں جہاں دس سال سے تنہا رہ رہا تھا۔ اور کسی نہ کسی طرح ان چیزوں کا انتظام کرکے لاتا۔

تم نے ان چیزوں کی فرمائش کل کیوں نہیں کی۔ کوولن مادھوی سے پوچھتا۔

میں کیسے فرمائش کرتی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ محبت اور کاروبار کو دو مختلف چیزیں سمجھتی ہوں۔

کوولن خوشی سے جھوم اٹھتا۔ پھر مادھوی اسے اپنے سینے سے لگالیتی۔ میرے آقا۔ میرے شوہر۔۔۔۔ پھر کچھ دیر رُک کر وہ کہتی۔ مگر دنیا میں صرف کناگی کو یہ الفاظ کہنے کا حق ہے۔ مجھے یہ حق نہیں ہے۔

پاگل مت بنو۔ تم میری سب کچھ ہو۔ کناگی تو صرف بھولا ہوا افسانہ ہے۔

مگر اب تو کوولن کی آمدنی کے تمام ذرائع ختم ہوچکے تھے اس کی تمام جمع کی ہوئی دولت ختم ہوچکی تھی۔ اور اب دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ایک پیسہ بھی قرض دے سکتا۔ اس لئے تحفے دینے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

وہ کچھ دن سے محسوس کر رہا تھا کہ اب چترا پتی اور خادمہ اس کی پہلی سی عزت نہیں کرتیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو اسے بے عزت کر دیتی تھیں۔ اور اب تو وہ مادھوی کے چہرے پر اسی قسم کے اثرات دیکھ رہا تھا۔

چترا پتی کچھ دن سے مادھوی کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ

کوولن سے نجات پالے جو ایک مصیبت بن گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب کسی اور دولت مند سوداگر کی باری تھی۔

موتی کا خوبصورت ہار صرف خوبصورت گردنوں کیلئے ہوتا ہے۔ یہی حال نقاصہ کا ہے۔ اس کی زندگی فقیروں کے لئے نہیں دولت مندوں کے لئے ہوتی ہے۔ چترا پتی نے کہا۔

ماں۔ دیکھو تو اس نے ہمیں کیا کیا دیا ہے۔ ہمارے پاس جتنی بھی دولت ہے اسی کی دی ہوئی ہے۔ اس نے تمام جائیداد ہمارے نام کر دی ہے۔ ہمارے پاس اُس سے پہلے تھا کیا۔ اور اس سب سے بڑھکر تو یہ بات ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اور مینی میکھلائی بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس لئے میں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔

تم سمجھتی ہو کہ وہ تمہارے ساتھ ایمانداری سے پیش آرہا ہے۔ چترا پتی نے کہا۔ میں نے سُنا ہے اس نے بہت سی دولت اپنے دوستوں اور خود کنا کی سے بھی چھپا رکھی ہے۔ وہ اتنا سیدھا نہیں ہے جتنا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس سب کے علاوہ وہ سختی سے مخالفت کر رہا ہے کہ ہم مینی میکھلائی کو اپنے آبائی پیشہ پر نہ لگائیں۔ ذرا سوچو تو اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو کیا ہوگا؟۔

چترا پتی اور مادھوی کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں رہیگا۔ شاہی نقاصہ کے خاندان کا نام و نشان تک مٹ جائیگا۔

ماں کچھ بھی ہو۔ میں کوولن کی جُدائی برداشت نہیں کر سکتی میں اس غم سے مر جاؤں گی۔

تم نہیں مروگی۔۔ میری بیٹی۔ کناکی تو گھر کی شریف بہو ہے۔ وہ تک نہ مری۔۔۔۔ ایک ہفتہ اس کے بغیر رہ کر تو دیکھو۔ مجھے یقین ہے کہ تم پھر زندگی بھر کے لئے اس سے نجات پالوگی۔

اچھا اگر فرض کرو ایک ہفتہ بعد تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی کیا مجھے اس کے ساتھ زندگی بھر رہنے کی اجازت ہوگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس طرح ماں کے دباؤ سے نجات مل جائے گی۔ اور وہ اس ایک ہفتہ میں خود اپنی محبت کا بھی امتحان کر سکے گی۔ ایک دفعہ کوولن سو رہا تھا۔ وہ خواب میں بڑبڑا رہا تھا۔

کتنی خوبصورت ہے میری بیوی۔ چاند کی طرح۔ مگر میں اسے چھوڑ کر تمہارے پاس آگیا ہوں۔

کوولن کے یہ الفاظ مادھوی کو یاد آ رہے تھے۔

چترا پتی مادھوی کو یہی مشورہ دیتی رہی کہ وہ اپنے کسی اور عاشق کی تلاش کرے۔

قطعی نہیں۔۔۔۔ اتنا تو ظلم نہ کرو۔ اگر جانور کا ساتھی مرتا ہے تو دوسرے کو ساتھی بنانے میں وہ بھی کچھ دیر لگاتے ہیں۔ رقاصہ ایسا نہیں کر سکتی۔ چترا پتی نے کہا۔

اس کا مطلب ہے ہم لوگ کتنے ذلیل ہوگئے ہیں۔ مادھوی نے غصّہ سے کہا۔

ایسی باتیں مینی میکھلائی بہت کرتی ہے۔ چترا پتی نے کہا۔

اس میں کیا بات ہے۔ وہ میری ہی تو لڑکی ہے۔

تمہارا کوولن سے کوئی محبت کا رشتہ نہیں ہے۔ کوئی دوسرا آدمی بھی اس ہار کو خرید سکتا تھا۔ آج کوولن کی جگہ وہ آدمی ہوتا۔

نہیں مجھے ہار بیچتے وقت پورا یقین تھا کہ کوولن ہر قیمت پر ہار خریدے گا۔ اور ایسے بھی ایک شخص کو اس لئے تو معاف کیا جا سکتا ہے کہ اس نے سورج نکلنے سے پہلے چراغ جلایا لیکن اگر کوئی سورج نکلنے کے بعد چراغ جلائے تو کیا اسے معاف کیا جا سکتا ہے؟۔

ہمیں اس معاملے میں بحث نہیں کرنی چاہیئے چترا پتی نے کہا۔ یہ تو صرف ایک ہفتہ کا وقفہ ہے۔ ایک مناسب عاشق کی تلاش کیلئے کافی عرصہ چاہیئے۔ اور کھیتی کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ کھیت کو بالکل صاف کر دیا جائے۔ یہ فیصلہ بعد میں ہوگا کہ کس چیز کی کھیتی کی جائے۔ تو اب تم اندرا کے تہوار کے آخری دن سے کوولن سے نجات پالو۔

لیکن ماں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ میں اس سے کس طرح کہوں گی کہ چونکہ تم غریب ہوگئے یا تمہارے پاس چھپی ہوئی دولت ہے۔ اس لئے میں تم سے نہیں مل سکتی۔

مجھ پر اس کے دیئے ہوئے تحائف کا کتنا بڑا احسان ہے۔ ذرا سوچو۔۔۔۔ میں کیسے کہہ سکتی ہوں۔

اس سے چھٹکارا پانا تو بہت آسان کام ہے۔ چترا پتی نے کہا۔ میں جانتی ہوں وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کا خیال ہے

نہ اس کی ذات سے نہیں اس کی دولت سے محبت کرتی ہو۔
لیکن میں اس کی دولت سے نہیں اس کی ذات سے محبت کرتی ہوں۔ مادھوی نے کہا۔

آخر اس میں خوبی کیا ہے۔ چترا پتی نے پوچھا۔ یہ وہی شخص ہے نا جس نے تمہاری خاطر اپنی تجارت پر لات مار دی جس نے اپنی وفادار اور نیک بیوی کو ٹھکرا دیا۔ اور سب محض تمہاری وجہ سے۔

ہاں.. مادھوری نے کہا۔ مگر یہ سب کچھ تو میری وجہ سے ہوا ہے۔ اس سب کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔

اگر خود کوولن میں خرابی نہ ہوتی تو تم جیسی دس اور خوبصورت عورتیں بھی زور لگا لیتیں۔ تب بھی اس کے پاؤں کو جنبش نہ ہوتی۔ دیکھو منیا کن اور مسادھوں جیسے لوگ مضبوط کردار کے ہوتے ہیں۔ میں نے ان دونوں کو آزمایا ہے۔ تم خود بھی انھیں آزما سکتی ہو۔ اگر پتھر ایک جھٹکے میں لوٹ جائے تو پتھر کا قصور ہے آدمی کا نہیں۔

خیر چھوڑو اس ذکر کو! میں ایک ہفتہ کیلئے کوولن کو چھوڑ دوں گی۔ کم سے کم وہ کنا کی کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی تو کر سکے گا۔ اپنی تجارت کو پھر شروع کر سکے گا اب وہ خاص ترکیب بتایئے۔ جس سے میں علیحدگی حاصل کروں۔

یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ جب تم کوولن کے ساتھ باہر جاؤگی تو چلیم ایک گیت گائے گی۔ (وہی گیت رقاصہ اور اس کا مفلس عاشق) وہی گیت ہے نا۔

جاؤ میرے پیارے مفلس عاشق خدا حافظ!
شاید تم ہم لوگوں کو اچھی طرح نہیں جانتے
ہم رقص کرنے والے لوگ ہیں۔
ہمارا دل ہمیشہ بکا ہوا رہتا ہے۔
اور جانتے ہو اس کا خریدار کون ہوتا ہے؟
جس کے پاس زیادہ سے زیادہ پیسہ ہو۔

یہ گیت سُن کر مجھے یقین ہے کہ کوولن ایک لمحہ کو بھی یہاں ٹھہرنا گوارا نہیں کرے گا۔

"ہاں آپ کو غلط فہمی ہے" مادھوی نے کہا۔ وہ کمبخت میری خاطر اپنی بے عزتی بھی گوارا کر لے گا"

"ہرگز نہیں" یہاں ایک سیکنڈ کو نہیں ٹھہرے گا وہ تو یہاں سے اُس کتے کی طرح بھاگے گا جس کے پیچھے کوئی آدمی ہتھ لے کر دوڑ رہا ہو"

"اچھا وقت آنے پر ہم خود ہی سب کچھ دیکھ لیں گے" مادھوی نے کہا۔

اچھا اگر وہ نہ جائے تو تم ایک کام اور کرنا۔ اس کے سامنے وہ گیت گانا جو ایک محبوبہ سمندر کے کنارے اپنے غیر ملکی عاشق کی یاد میں گاتی ہے۔ جو ایک چاندنی رات میں تنہا اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ مگر ایک بات کا تمہیں وعدہ کرنا پڑیگا کہ تم یہ گانا بالکل اس انداز میں گاؤگی کہ تصنع اور بناوٹ کا نام بھی نہ ہو۔ اور جیسے واقعی تم اپنے کھوئے ہوئے عاشق کی یاد میں تڑپ رہی ہو"

"خیر ٹھیک ہے۔ مت گھبراؤ میں یہ ایکٹنگ بڑی مہارت سے کروں گی۔ اور مجھے امید ہے ایک ہفتہ کی جدائی میں کوولن مر تو نہیں جائے گا"

اندرا کے تہوار کا آخری دن تھا۔ تمام شہر کی سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ لوگ اپنے قیمتی ترین لباس پہنے ہوئے تھے۔ ناچتے گاتے سڑکوں سے گذر رہے تھے۔

آج صبح ہی جب کوولن کی آنکھ کھلی۔ تو آج پہلی بار اسے سخت ذہنی تکلیف ہو رہی تھی۔ آج اس کی زندگی کا پہلا دن تھا جبکہ وہ مادھوی کو تحفہ پیش کرنے کے قابل نہیں تھا۔ حالانکہ آج کا دن تو تحفہ دینے ہی کا تھا۔ لیکن وہ اپنی محبت کو کیا کرتا۔ اسے یقین تھا کہ مادھوی بھی اس سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ صرف اسی خیال سے اسے کچھ سکون ہو گیا۔ دوپہر کو وہ حسب معمول مادھوی کے گھر گیا تاکہ اس کے ساتھ سمندر کے ساحل پر جا سکے جہاں آج سارا شہر غسل کرنے کیلئے جمع ہوتا ہے وہ ابھی گھر میں بھی گھسنے نہ پایا تھا کہ چلیم نے اسے روک لیا۔

"کہیئے آج مادھوی کے لئے کیا تحفہ لائے ہیں؟" کوولن کی سمجھ میں کوئی جواب نہ آیا۔ اور اس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ وہ ابھی آگے بڑھا ہی تھا کہ چترا پتی کی آواز نے اس کے رہے سہے ہوش و حواس بھی گم کر دیئے۔ "آج کا دن تو تحفے دینے کا ہے اور آج تم اس لئے آئے ہو کہ شہر کی سب سے حسین عورت کو اپنے ساتھ

ملک کے سب سے بڑے میلے میں لے جاؤ گے۔ آج وہ اس میلے میں کیا پرانے کپڑوں سے جائے گی: کودلن کی سمجھ میں کوئی جواب نہ آیا۔ اگر مادھوی کا خیال نہ ہوتا تو وہ یقیناً اتنی بے عزتی برداشت نہ کر سکتا۔ وہ گردن جھکائے ہوئے مادھوی کے کمرے میں چلا گیا اسے حیرت ہوئی کہ مادھوی نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے تھے۔

"مجھے معاف کر دو مادھوی میں آج تمہارے لئے ساڑھی نہیں لا سکا"

"کوئی بات نہیں" مادھوی نے آج غیر معمولی طور پر سرد مہری سے جواب دیا۔

"آپ دوسرے کمرے میں میرا انتظار کیجئے میں ذرا کپڑے بدل لوں" مادھوی کے کمرے میں خوبصورت ساڑھیاں اور بیش بہا زیورات بکھرے پڑے تھے لیکن یہ سب چیزیں وہ تھیں جو دوسرے لوگوں نے اسے دی تھیں۔ کودلن نے اسے لاکھوں روپوں کے تحفے دیئے تھے۔ لیکن یہاں ان میں سے ایک بھی نہیں تھا۔ یہ آج پہلا اتفاق تھا کہ کودلن سے دوسرے کمرے میں بیٹھنے کیلئے کہا گیا تھا۔ ورنہ ہمیشہ مادھوی اس کی موجودگی ہی میں لباس تبدیل کرتی تھی۔ یہ سب کچھ چتراپتی کے حکم سے ہوا تھا۔ اور کودلن کو اس کا علم بھی نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے۔ کس کے حکم سے ہو رہا ہے۔ وہ برابر کمرے میں منہ لٹکائے مادھوی کا انتظار کر رہا تھا۔ آج اسے شدت سے اپنی بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسکا ذہن پچھلے دس سال کی زندگی کے اوراق الٹ رہا تھا کتنے عجیب تھے وہ دن۔ اسے وہ لمحات یاد آ رہے تھے جب مادھوی اس کے سینہ سے لگ کر کہا کرتی تھی "میرے آقا دنیا میں میرے لئے تمہیں سب کچھ ہو"

آج کودلن پہلی بار یہ سوچنے پر مجبور ہوا تھا کہ شاعر ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ دولت مند لوگ ہی شریف تعلیم یافتہ نیک پارسا، مہذب اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ ہر چیز کا انحصار دولت پر ہے۔

"میں کتنا بے وقوف رہا ہوں اس زندگی میں میں نے کبھی اس حقیقت کو نہیں سمجھا" وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چیلم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے مجروح جذبات پر ایک اور ٹھیس لگائی

"آج آپ کا میلے کا لباس کہاں ہے شاید آپ وہ قیمتی جواہرات پہنانا بھی بھول گئے۔ اس لباس میں میری ملکہ آپ کے ساتھ کیسے جا سکیں گی؟" اب انتہا ہو چکی تھی لیکن کودلن اس بے عزتی کو برداشت کرنے پر بھی مجبور تھا۔

"مادھوی کو اس کا کوئی خیال نہیں وہ میرے کپڑوں سے نہیں میری ذات سے محبت کرتی ہے"

چیلم زور سے ہنس پڑی۔

داشتی! اس نے کودلن کے دل میں سلگتی ہوئی آگ کو اور ہوا دیدی۔ اسی لمحہ چتراپتی بھی کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ انتظار کرتے ہوئے تھک گئے ہوں گے۔ کوئی گانا ہی سناؤ انہیں" چتراپتی نے کہا۔

چیلم نے پروگرام کے مطابق وہ گانا سنایا۔ اس گیت کے پردے میں جو کچھ مفلس عاشق سے کہا گیا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ کودلن کے دل پر تیر کی طرح لگ رہا تھا۔ چتراپتی اور چیلم دونوں محسوس کر رہے تھے کہ کودلن اس ذہنی تکلیف سے تلملا رہا ہے۔ چیلم زور سے ہنسی۔ "کیا پرانا گیت مزیدار نہیں ہے؟"

"ہاں مزیدار بھی ہے اور حقیقت بھی ہے" ابھی یہ باتیں ہی ہو رہی تھیں کہ مادھوی کمرے میں داخل ہوئی اور وہ دونوں چلی گئیں۔

ساتواں باب

مادھوی بہت ہی حسین لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے اپنے لمبے لمبے ریشمی بالوں کو بڑی خوبصورتی سے سجایا تھا۔ بیش قیمت ساڑھی اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ اس کی خوبصورت گردن میں ایک موتیوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ ناک میں جگمگاتے ہوئے ہیرے کی تھنتھی۔ ہاتھوں میں سونے کی خوبصورت چوڑیاں — انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں تھیں۔ کانوں میں ہیرے کی بالیاں تھیں۔ کمر کے گرد موتیوں اور سونے کی پیٹی تھی، اور پیروں میں سونے کی پائل تھی۔ کودلن نے مادھوی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اس کی پیش کی ہوئی ایک چیز بھی اس نے نہیں پہنی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ جان بوجھ کر

دوسروں کی دکھا ہوئی چیزیں بہنہ گئی ہیں۔ شرم اور روحانی کرب کی وجہ سے اس نے گردن جھکالی۔ چلئے مادھوی نے کہا میں نے ساحل پر ایک جگہ ریزرو کرائی ہے۔ ہم لوگ رات کافی دیر تک وہیں رہیں گے۔

کوولن اپنے خچر پہ بیٹھ گیا مادھوی اور وسنت مالا رتھ پر سوار ہوگئیں۔ رتھ تیزی سے ساحل کی طرف دوڑ رہا تھا اور کوولن پیچھے پیچھے اپنا خچر دوڑا رہا تھا۔ وہ شہر کے بڑے بازاروں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور آخر وہ اس مقام پر پہنچ گئے۔ جہاں دریائے کیوری سمندر سے ملتا تھا۔ جو لوگ اس جگہ پر نہاتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اپنے محبوب سے ایک دوسرے کو جدا نہ ہوسکے۔ کوولن آج اس جگہ پر نہانا چاہتا تھا تاکہ وہ مادھوی سے کبھی جدا نہ ہوسکے۔ لیکن مادھوی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اتنے ہجوم میں نہانا کچھ اچھا نہیں لگتا اور وہ کوولن کو اس جگہ پہ لے گئی جو پہلے ہی سے ریزرو کرا رکھی تھی۔ وہاں پہنچ کر جب وہ لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تو مادھوی نے کوولن کو بانسری دیتے ہوئے کہا تو ایک گیت سناؤ۔

کوولن نے بانسری لے لی اور ایک انتہائی درد بھرا گیت چھیڑ دیا۔ وہ گیت دریائے کیوری کی شان میں گایا گیا تھا۔ کچھ اس قسم کا تھا۔

"اے دریائے کیوری تجھ پر خدا کی سلامتی ہو۔ تو ہمارے ملک اور بادشاہ کی عزت ہے۔ تو ایک وفادار بیوی ہے جس کی محبت میں کبھی فرق نہیں آتا۔ تو کسانوں کے گیت سنتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ تو ہر سال اس تہوار کے موقع پر ہزاروں لوگوں سے اپنی تعریف سنتا ہے۔"

گیت ختم کرنے کے بعد کوولن نے مادھوی سے گیت سنانے کو کہا۔ مادھوی نے گیت شروع کیا۔

"اے سمندروں کے خدا ہم ان عاشقوں کے دلوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ جو دور دراز جگہوں سے سفر کرکے اس ساحل پر آتے ہیں جن کے ہاتھ میں تحفے ہوتے ہیں۔ اور جو یہاں ریت کے گھروندے بناتے ہیں۔ لیکن ہمیں غصہ آتا ہے اور ہم اپنے پاؤں سے ان کو توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ تو وہ لوگ ان ہار کے پھولوں کو سینہ سے لگا لیتے ہیں۔ وہ ہمارا تعاقب کرتے ہیں ان کا خیال ہوتا ہے کہ ان کی بیماری کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے ہم آغوش ہوں۔ وہ ہم سے کہتے ہیں کہ یہ درد تمہارا دیا ہوا ہے اس کا علاج تم ہی کرو۔ اے سمندر کے خدا ہم کیا کریں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ساحل کی یہ پر لطف فضائیں اس پر چمکتا ہوا ریت۔ سمندر کی تیز موجیں آسمان پر چمکتا ہوا چاند اور دل کو لبھانے والی مست ہوائیں ان سب چیزوں نے ان کے خلاف سازش کی ہے۔ ان کو بیمار ڈالا ہے وہ ہم سے التجا کرتے ہیں اپنی ان خوبصورت آنکھوں سے ہم پر ظلم نہ کرو۔ اور اس کا علاج کرو۔"

گیت ختم ہوگیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اور مادھوی نے پھر ایک گیت اور چھیڑ دیا۔

"اے سمندر کے دیوتا لوگ ہمارے پاس موتی لیکر آتے ہیں اور معاوضہ میں ہمارے گلابی ہونٹ مانگتے ہیں۔ وہ ہم سے شادی کا وعدہ کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں کھوٹے سونے کی بالیاں دیتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے شراب مہیا کرتے ہیں۔ ان کی باتیں شراب سے کہیں زیادہ نشہ آور ہوتی ہیں۔ اور جب وہ ہمارے جسم کو حاصل کر لیتے ہیں تو پھر کبھی واپس نہ آنے کیلئے چلے جاتے ہیں۔ میرا عاشق جو ایک دفعہ مجھے اس ساحل پر ملا تھا مجھے ہنستا چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اے دیوتا وہ مجھے بھول گیا ہے۔ لیکن میں اسے کیسے بھولوں۔ اے درخت کے پتو تمہیں یاد ہوگا۔ تمہارے ہی سایہ میں تو ہم دونوں ملے تھے۔ تمہیں ہماری جدائی کا کوئی افسوس نہیں۔ تمہارے چہرے پہ تو آج بھی وہی خوشی ہے۔ تم تو آج بھی خوشی سے جھوم رہے ہو۔ اف سمندر کی لہرو تم مرے درد کو کیا سمجھو گی۔ تم نے تو اپنے سینے سے اس کی کشتی کے نشان بھی مٹا دئے۔ اے پانی میں تیرتی ہوئی بطخو تم ہی جا کر میرے عاشق کو سمجھاؤ۔ رات کی تاریکی ہر طرف بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ لو سورج بھی ڈوب گیا۔ چاند آہستہ آہستہ آسمان پر ابھر رہا ہے چاند کی یہ روشنی مجھے دیوانہ کر دے گی۔ پرندوں نے بھی تو چہچہانا بند کر دیا۔ یہ کیا ہوا سمندر کی لہرو تم کیوں خاموش ہوگئیں۔ تم سب نے میرا ساتھ کیوں چھوڑ دیا۔ یہی تو وہ چاند رات ہے جس میں میرا عاشق مجھ سے۔

جدا ہوا تھا۔ اور پھر وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس نے ہمیشہ میرے ساتھ رہنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اے سمندر کے دیوتا اس کے جھوٹے وعدے کو معاف کر دے۔ اس کے دل میں میری یاد پھر پیدا کر دے تاکہ پھر وہ مجھ تک آ سکے۔"

کوولن خاموشی سے بیٹھا اس کا گانا سنتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا میں نے تو ایسا گیت نہیں گایا تھا جس میں کچھ معنی چھپے ہوئے ہوں۔ لیکن یہ لالچی عورت میرے سامنے ہی کسی اور کے گیت گا رہی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ مجھے چھوڑ کر پھر اُسے حاصل کر لے میں اب سمجھا کہ میرے خلاف اس سازش میں چترا پتی اور چیلیم ہی نہیں بلکہ خود مادھوی بھی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی بہت عزت باقی ہے۔ بہتر ہے کہ اس کے ختم ہونے سے پہلے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں۔ اس نے مادھوی کے شانوں پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ رات کافی ہو چکی ہے۔ اب گھر چلنا چاہیئے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ مادھوی بدستور بیٹھی رہی۔ وہ تیزی سے اپنی گھوڑا گاڑی پر چڑھا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد مادھوی خاموش اور افسردہ رتھ میں آکر بیٹھ گئی اور پچھلے دس برس میں یہ پہلا دن تھا جب کہ وہ اپنے عاشق کے بغیر تہوار سے لوٹ رہی تھی۔

آٹھواں باب

کوولن شہر کی طرف تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ آج کے واقعہ نے اس کے ذہنی توازن کو کھو دیا تھا۔ اس کا دل ڈوب سا رہا تھا۔ آج وہ اپنی زندگی سے عاجز تھا۔ آج پہلی بار اسے حماقتوں پر افسوس ہو رہا تھا۔ کاش ایک رقاصہ کی خاطر وہ اپنی نیک اور وفادار بیوی کو نہ چھوڑتا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد جب وہ ایک مندر کے قریب سے گزرا تو خود بخود رُک گیا وہ گھوڑے سے اترا اور مندر میں داخل ہو گیا۔ اس نے شیو جی کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک بھجن شروع کیا۔

"اُف میں کتنا بدنصیب ہوں۔
کیا میری قسمت میں صرف سرد آہیں ہیں۔
میں دعا نہیں جانتا۔ مجھے کوئی بھجن نہیں آتا۔
شیو جی! میں بچوں کی طرح تمہارے پاس آیا ہوں۔
جو اپنی ماں کی آغوش میں سکون حاصل کرنے آتا ہے۔
مجھے عہد گذشتہ پر افسوس ہے۔
مجھے بُرا مت سمجھو۔ میں اپنے کئے پر پشیمان ہوں۔
میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔
یہ سب قسمت کی باتیں ہیں۔
میں اس دنیا میں لذت کا شکار ہو گیا تھا۔
دیوتاؤں کے دیوتا مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔
مجھے بچا لو۔ میں ان طوفانوں میں بری طرح گھرا ہوا ہوں۔
میں ڈوب جاؤں گا۔ مجھے بچا لو۔

بھجن کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل ہلکا ہو گیا ہو۔ اسے واقعی بچے کی طرح سکون مل گیا۔ جیسے ہچکیاں لیتا ہوا بچہ اپنی ماں کی آغوش میں آ گیا ہو۔ پوجا کے بعد وہ مندر کے صحن میں بیٹھ گیا۔ جہاں کچھ لوگ بھجن گا رہے تھے۔

ایک پنڈت جھوم جھوم کے گا رہا تھا۔
جو عورت اپنا جسم فروخت کرتی ہو۔ اسے سینے سے لگانا ایسا ہے جیسے کسی مردہ لاش کو سینے سے لگا لیا ہو۔

کتنی سچی بات ہے۔ کوولن کی ہچکیاں زیادہ ہو گئیں۔

جو عورت اپنی حفاظت کرتی ہے اور جو اپنے شوہر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اور جو اپنے وعدہ کی پکی ہوتی ہے۔ جو کسی دوسرے کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ حقیقت میں وہی بیوی کہلانے کی مستحق ہے۔

ٹھیک ہے۔ کنا کی واقعی ایسی ہی عورت ہے۔ کوولن بڑبڑایا۔

ایک ہی وقت میں دو عالموں سے تعلق رکھنا۔ شراب اور گناہوں میں ڈوبنا یہ سب خدا کی لعنت ہے۔

اف میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ یا خدا مجھے معاف کر دے کوولن نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

مٹی کے برتن میں سادہ پانی اس شراب سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ جو انسان نے خود کمائی ہو۔

کوولن کی پھر ہچکیاں بندھ گئیں۔

میرے مقدّر میں یہی بدنصیب تھا۔ میں نے بھی تو اپنی تجارت
پھیلا کر بہت دولت اکٹھا کی ہے۔

پنڈت یہی سوچتے جا رہا تھا۔

اگر آدمی غریب ہو تو دنیا میں کوئی اس کا نہیں۔ اگر وہ
دولت مند ہو تو دنیا کا ہر آدمی اس کا ہے۔

میری تقدیر میں بھی یہی بربادی لکھی تھی۔ کودلن اس طرح
بڑبڑایا کہ پنڈت نے بھی اس کے الفاظ سُن لئے۔

قسمت کو بُرا بھلا کہنا اپنی ناکامیوں کو چھپانا ہے۔ انسان
خود ناکام ہوتا ہے۔ خود محنت سے جی چراتا ہے اور تقدیر کو
بُرا کہتا ہے۔ پنڈت کہہ رہا تھا۔

کودلن نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی ناکامی دور کر کے رہے گا۔
وہ اپنی بدقسمتی ختم کر دے گا۔ وہ محنت کرے گا۔

جس انسان کی بیوی نیک ہو۔ اسے اور کیا چاہیئے۔ اور
جس کی بیوی بدچلن ہو اس کے پاس دنیا میں کیا ہے۔

میری بیوی نیک ہے۔ پھر مجھے اور کیا چاہیئے؟ لیکن کیا
کنتکا مجھے معاف کر دے گی۔ میں کس طرح اس سے معافی مانگوں گا
معافی مانگنا کوئی مشکل کام نہیں۔ کوئی بڑی بات نہیں۔ اور پھر
ان لوگوں سے جنہوں نے خواب میں بھی کسی کو معاف کرنے سے انکار
نہ کیا ہو۔

کودلن خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ اور مندر کے باہر آ گیا اس
نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کنتکا کے پاس جا کر معافی مانگے گا۔

وہ سیدھا اپنے گھر گیا۔ جہاں وہ برسوں سے تنہا رہتا
تھا۔ وہاں وسنت مالا کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک یاسمین کے
پھولوں کا ہار تھا۔ جس پر لال رنگ کی لاکھ سے کچھ لکھا ہوا تھا۔
غالباً یہ مادھوی کا پیغام تھا جو اس نے کودلن کے نام بھیجا تھا۔
پیغام کی عبارت یہ تھی:۔

"موسم بہار دو محبت بھرے دلوں کو یکجا کرتا ہے اور یہی
موسم بہار انہیں جدا بھی کر دیتا ہے۔ پھر اگر ایک محبت بھرا دل کوئی
غلطی کر بیٹھے۔ تو کیا اس کی سزا یہی ہے کہ دوسرا انسان غصّہ میں
ناراض ہو کر چلا جائے۔ چاند کی حسین کرنیں ہی اس درد بھرے
دل کو سزا دینے کیلئے کیا کم ہیں۔"

وسنت مالا ہار سامنے لئے ہوئے کھڑی تھی اور کودلن وہ
پیغام پڑھ رہا تھا۔

"مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ لے جاؤ میرے سامنے
سے یہ ہار۔ مادھوی سے کہہ دینا تم ایک حسین رقاصہ ہو۔ تم اپنی
آنکھوں میں دوسروں کیلئے جھوٹی محبت پیدا کر سکتی ہو۔ تمہاری
آنکھیں ہر انسان کو دھوکا دے سکتی ہیں۔ تمہاری دلفریب مسکراہٹ
پتھر کا جگر چیر سکتی ہے۔ پھر تمہیں میری کیا ضرورت ہے؟"

وسنت مالا خاموشی سے واپس چلی گئی۔ اور اس نے کودلن
کے تمام الفاظ مادھوی کے سامنے دہرا دیئے۔

"تو کیا وہ نہیں آئے؟" مادھوی نے حیرت سے پوچھا۔
"خیر کوئی بات نہیں! محبت میں ایسی لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔
اگر وہ آج رات نہیں آئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کل ضرور آ جائیں گے
تم جاؤ آرام کرو۔" اور اس نے وسنت مالا کو بھیج دیا۔

وسنت مالا کے جانے کے بعد وہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس
کا دل غم سے بوجھل تھا۔ اس کے بستر پر بچھے ہوئے پھولوں کا حسن
اور ان کی خوشبو آج اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ ساری رات وہ
سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ مگر نیند تو جیسے اس سے کوسوں
دور بھاگ گئی تھی۔

اسی شام دیونندی نامی ایک عورت کنتکا سے ملنے آئی۔
دیونندی شہر کے باہر ایک مندر کی پجارن تھی۔ اس کی زندگی بھی
بڑی عجیب تھی۔ ایک برہمن عورت مالتی تھی جس کا بچہ پیدا ہوتے
ہی مر گیا تھا۔ اور وہ سوکن کے لڑکے کو اپنے بچے کی طرح پالتی رہی۔
ایک دن وہ اپنی چھاتی سے بچے کو دودھ پلا رہی تھی کہ بچے کو ہچکی
لگی اور وہ مر گیا۔ مالتی خوف سے لرزنے لگی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ
لوگ اس پر الزام لگائیں گے۔ کہ اس نے اپنی سوکن کے بچے کو
لاپرواہی کی وجہ سے مارا ہے۔ مالتی اس بچے کو سینہ سے لگائے
شہر کے ایک مندر میں گئی دیوتاؤں کے قدموں پر سر رکھا ان کے
آگے روئی گڑگڑائی۔ مگر کوئی بھی دیوتا اس مردہ بچے میں جان
نہ ڈال سکا۔ پھر وہ تنگ آ کر شہر کے باہر اس مندر میں آ گئی جہاں
ایک خوبصورت عورت ظاہر ہوئی۔ جسے اس نے آج سے پہلے
کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"لاؤ بچہ مجھے دو۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ خدا تم پر ضرور کرم کرے گا۔" وہ عورت بچے کو مرگھٹ پر لے گئی۔ مالتی اسکے پیچھے پیچھے گئی اور عورت نے اس بچے کا کریا کرم کردیا۔ مالتی کی دلدوز چیخوں سے فضا گونجنے لگی۔

"مت رو! بس مت رو!! دیکھو تمہیں اپنا زندہ بچہ مل جائے گا۔"

وہ عورت غائب ہوگئی۔ اور اس نے اس بچہ کا روپ بدل لیا۔ مالتی نے خوشی سے دیوانہ وار ہوکر بچہ کو گود میں لیا اور اس کی ماں کو واپس کردیا۔ یہ بچہ بڑا ہوا تو اس کی شادی دیوندی سے کردی گئی۔ وہ کچھ دن تو دیوندی کے ساتھ رہا لیکن ایک دن اس نے دیوندی کو اپنا راز بتایا اور غائب ہوگیا۔ اور اس سے کہا کہ تم شہر سے باہر اس مندر میں پوجا کرنا اور لوگوں سے کہدینا کہ تمہارا شوہر بنارس یاترا کیلئے گیا ہے۔

یہ تھی وہ دیوندی جو آج کناکی سے ملنے آئی تھی۔ وہ کناکی سے ہمیشہ متاثر رہی تھی۔ اسے کناکی کی اس بدنصیبی پر بے انتہا افسوس تھا۔ اس دن اس نے پوجا کی اور اس کے بعد دعا کی اے خدا اس کے شوہر کو واپس کردے۔

"لیکن اگر وہ واپس آ بھی گئے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں گی۔ میرا دل میرا ساتھ نہیں دے رہا۔" کناکی نے کہا۔

"میں نے کل بڑا عجیب خواب دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اور کوولن ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی شہر میں گئے ہیں۔ نجانے کیا ہوا کچھ لوگوں نے کوولن پر کسی جرم کا الزام لگایا اور اسے پکڑ لیا۔ میں اس ظلم سے تڑپ اٹھی اور بادشاہ کے سامنے پہنچ گئی۔ اور پھر وہ تمام شہری اور بادشاہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔"

"میری پیاری" دیوندی نے کہا "ابھی تک تمہارے شوہر نے تمہیں بالکل نہیں چھوڑا ہے۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔ یہ سب تمہارے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا ہے۔ اگر تم دریائے کیوری اور سمندر کے سنگم پر غسل کرلو تو تمہارا شوہر واپس آجائے گا۔"

"نہیں نہیں! یہ کوئی مناسب بات نہیں ہے۔ میرا دیوتا صرف میرا شوہر ہے۔ میں کسی اور کے آگے دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا پسند نہیں کرتی۔ میں نہیں چاہتی کہ میں ایک ایسے انعام کے لئے کسی کا احسان اٹھاؤں۔" کناکی نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد دیوندی واپس چلی گئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کناکی اندر گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کوولن اور اس خواب کو یاد کرکے پریشان ہو رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کناکی نے دروازہ کھولا۔ کوولن سامنے کھڑا تھا۔ کناکی اس کے قدموں میں گرگئی۔ اس کے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ کوولن کا دل بھی ڈوبا جا رہا تھا۔ وہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ کناکی ان برے حالوں میں ہوگی۔ اس نے کناکی کی دونوں باہیں پکڑیں اور اسے اپنے سینہ سے لگالیا۔

"تم نے ہر جھوٹی بات کو سچا کرکے دکھا دیا اور مجھ کمبخت نے اپنے باپ دادا کی تمام دولت لٹادی اور خود تمہاری بھی۔ اب میرے پاس سوائے بے عزتی کے اور ہے کیا؟" کوولن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔" کناکی نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیجئے یہ بیش قیمت پائل حاضر ہیں انہیں بیچ دیجئے۔ آپ کے پاس اتنی دولت ضرور ہو جائے گی کہ لوگ آپ کی عزت کرنے لگیں۔"

کوولن نے اپنا چہرہ کناکی کے کندھوں پر رکھ دیا اور بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔ "میری جان میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں مادھوی کو چھوڑ چکا ہوں۔ میں اپنے ماضی سے دامن چھڑا کر آیا ہوں۔ میری کناکی مجھے معاف کردو۔ میں تمہاری آغوش میں پناہ لینے آیا ہوں۔ تم دھرتی ماتا ہو۔ جو ہر ایک کو معاف کردیتی ہے۔ تم اس نیک اور شریف درخت کی طرح ہو جو اس انسان کو سایہ دیتا ہے جو اس کی جڑیں کاٹتا ہے۔"

بہت دیر تک وہ دونوں اسی طرح ایک دوسرے سے چمٹے کھڑے رہے۔ اور روتے رہے۔

"دروازہ کھلا ہے بند کردوں" کوولن نے پوچھا۔

"نہیں نہیں آج تمام دنیا کو دیکھ لینے دو کہ ہم ایک بار پھر مل گئے ہیں۔ اب ہم دونوں ایک ساتھ مل کر پھر زندگی کی اسی شاہراہ پر چلیں گے جہاں سے ہم جدا ہوئے تھے۔"

"میں اس شہر میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ ایسے شہر میں جہاں

یہ جلیہ عزتی کی گئی ہے۔ جہاں مجھے یہ محسوس کرایا گیا ہے کہ میں ایک مفلس اور لاچار آدمی ہوں۔ میں یہاں سے بہت دور بلا جانا چاہتا ہوں۔ میں ماددرا شہر جانا چاہتا ہوں جہاں کسی شخص کو نہیں معلوم کہ مجھے اس طرح سے بے عزت کیا گیا ہے۔ میں وہاں پھر تجارت شروع کروں گا اور جب تک معقول دولت نہ کما لوں گا واپس نہ آؤں گا لیکن سوال یہ ہے کہ سرمایہ کہاں سے لاؤں۔ خیر تم فکر مت کرو۔ کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائے گا۔"

" آپ سرمایہ کیلئے کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ میں نے کہا نا آپ میرے پائل بیچ دیجئے آپ کو بہت معقول رقم مل جائے گی۔"

کودلن نے کہا نہیں میں تجارت کیلئے تمہارے آخری جواہرات بیچنا نہیں چاہتا۔ میں کچھ اور بندوبست کر لوں گا۔

"کیا آپ کوئی اور انتظام کر لیں گے؟ کیا آپ صرف اس لئے واپس آئے ہیں کہ مجھ پر طنز کریں میری بے بسی کا مذاق اڑائیں کیا آج دنیا میں کوئی چیز ایسی بھی ہو سکتی ہے جو میری نہ ہو آپ کی ہو۔ یا آپ کی ہو میری نہ ہو۔" اور کناکی پھر رونے لگی۔

" تمہیں خدا کی قسم ہے مت رو کناکی۔ جو کچھ تم چاہتی ہو میں وہی کروں گا۔" کودلن نے اس کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

" لیکن مجھے ماددرا جانے کی اجازت دے دو میں ایک سال میں لوٹ آؤں گا۔"

" میں آپ کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی۔ میں بھی آپکے ساتھ چلوں گی۔ لیکن میری پیاری تم اتنی زیادہ چلنے کی عادی بھی تو نہیں ہو۔ سفر طویل ہے۔ اور پھر راستے میں پہاڑ دریا اور جنگل بھی ہیں۔ اور ان سب سے بڑھکر جنگلی جانور اور وحشی انسان بھی ہیں۔"

" یہ خطرات میرے لئے کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ میں ضرور چلوں گی۔" کناکی نے کہا۔

" اچھا تو پھر آج رات ہی ہم لوگ چلے جائیں گے۔ یعنی چاند نکلنے کے بعد اور سورج ڈوبنے سے پہلے تاکہ کسی کو بھی اس بات کا علم نہ ہو۔"

نواں باب

رات کی تاریکی میں کودلن اور کناکی شہر سے نکل گئے۔ وہ شہر کی تمام سڑکوں سے گذرتے ہوئے جا رہے تھے۔ جنگل دریا پار کرتے ہوئے وہ آگے بڑھتے رہے۔ آخر وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہوئے جہاں ایک جینی پجاری رہتا تھا اور جس کا نام کاوندی تھا۔ "اب ماددرا کتنی دور رہ گیا" کناکی نے پوچھا کیونکہ وہ پیدل چلنے کی بالکل عادی نہیں تھی۔ اس لئے وہ بری طرح تھک گئی تھی۔

" بس تھوڑی ہی دور رہ گیا ہے ہاں کوئی ستر اسی میل ہوگا۔" دونوں پجاری کے پاس گئے اور اسے نمستے کیا۔ پجاری نے ان دونوں کو غور سے دیکھا۔

" تم لوگ کسی شریف خاندان سے معلوم ہوتے ہو اور شاید تمہیں اتنا زیادہ چلنے کی عادت بھی نہیں ہے۔ پھر تم اتنا لمبا سفر کیوں طے کر رہے ہو؟"

" ہم لوگ ماددرا جانا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہاں اپنی قسمت آزما سکیں۔"

" لیکن اس خوبصورت لڑکی کے نازک پاؤں راستہ کے مصائب اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔ مگر میرے ان الفاظ کا تم پر اثر کیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری بات نہیں مانو گے۔ میں تو خود کافی عرصہ سے ماددرا جانا چاہتا تھا۔ چلو اچھا ہوا تم لوگوں کا ساتھ ہو جائے گا۔" پجاری نے کہا۔

" بڑی خوشی سے مجھے بھی اس لڑکی کی پریشانی سے تھوڑی بہت نجات مل جائے گی۔" کودلن نے جواب دیا۔

" ہمیں جانا کس راستے سے چاہیئے۔" کاوندی نے کہا۔

" اگر ہم ایک سایہ دار راستہ انتخاب کرتے ہیں تو جنگلی جانوروں کا خوف ہے اور دوسرا راستہ اس قابل نہیں ہے کہ یہ نازک سی لڑکی اسے آسانی سے طے کر سکے۔ راستہ میں طرح طرح کے جانور ملیں گے۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ خدا ہمارا محافظ ہے۔" کاوندی نے اپنا کاسہ اٹھایا گلے میں جھولا ڈالا اور ہاتھ میں مورچھل لیکر تیار ہو گیا۔ اور وہ تینوں روانہ ہو گئے۔

تینوں دریائے کیوری کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ وہ مختلف گاؤں سے گذرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ دن میں تین میل سے زیادہ سفر نہیں کرسکتے تھے۔ کئی دن لگاتار سفر کرتے رہنے کے بعد وہ سری رنگم پہنچ گئے۔ جہاں دریائے کیوری شہر میں چھپ جاتا ہے۔ تینوں ایک جین مندر میں گئے۔ جہاں بڑے پجاری نے ان کا استقبال کیا۔ کاوندی اور اس کے ساتھی پجاری کے قدموں میں گر گئے۔ اے خدا تو ہمارے گناہوں کو معاف کردے کاوندی نے دعا مانگی۔

"تم تینوں کہاں جا رہے ہو؟" اس پجاری نے پوچھا۔ وہ ایک پہنچا ہوا پجاری تھا۔ جو ہر انسان کے ماضی اور مستقبل سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مادورا میں کونسی مصیبت کودلن اور کنا کی کا انتظار کر رہی ہے۔ مگر اس کے لئے خوشی اور غم کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس لئے اس نے انہیں کوئی بات نہیں بتائی۔ صرف اتنا کہا۔ آدمی کو اپنے کئے کا پھل بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں دوسرے لوگوں کی نصیحتیں اور کوششیں بے سود ہوتی ہیں۔ زندگی تیز اور تند طوفانوں میں ایک شمع کی طرح ہے جو آسانی سے بجھ سکتی ہے۔ کوشش کرو کہ خدا تک پہنچ سکو۔ بس یہی میری نصیحت ہے۔ کاوندی اور اس کے ساتھی ایک کشتی میں سوار ہو کر دریائے کیوری کے پار چلے گئے۔ اور پھر وہ درانم شہر میں داخل ہو گئے۔

"کیا آپ جانتے ہیں کہ اس شہر کا نام درانم کیوں رکھا گیا؟" کاوندی نے پوچھا۔

"نہیں" کودلن نے جواب دیا۔ "بتلایئے یہ نام کیوں رکھا گیا۔ کودلن نے کہا۔

"بڑی عجیب کہانی ہے" پجاری نے کہنا شروع کیا۔

"ایک دفعہ ایک ظالم پرند نے یہاں ایک ہاتھی کو مار دیا تھا۔ دراصل پہلے یہ شہر ایک جنگل تھا۔ جہاں ایک بڑے درخت پر دو پرندے رہتے تھے۔ ان میں سے مادہ نے انڈے دئے ہی تھے کہ اتفاق سے دوسرے دن ایک ہاتھی اس درخت کے نیچے سے گذرا۔ اور جلتی ہوئی دھوپ سے پناہ لینے کے لئے اس درخت کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ اتفاق سے ہاتھی نے اس شاخ کو اپنی سونڈ میں لیکر توڑ دیا جس پر پرندے کا گھونسلہ تھا انڈے زمین پر گر کر چور چور ہو گئے۔ مادہ کو بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا جن میں ایک شہد کی مکھی اور ایک مینڈک تھا۔ ان سب نے ہاتھی کو قتل کرنے کا پروگرام بنالیا۔ ان میں ایک ہد ہد بھی تھا۔ ایک دن موقع دیکھ کر تینوں نے ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ شہد کی مکھی نے ہاتھی کی ایک آنکھ پر کاٹا پھر دوسری پر۔ ہاتھی بڑی طرح سے تڑپ رہا تھا۔ ہد ہد نے ہاتھی کی ایک ایک کر کے دونوں آنکھیں نکال لیں۔ ہاتھی بڑی طرح سے بھاگ رہا تھا کہ ایک چٹان پر مینڈک چیخا۔ ہاتھی سمجھا کہ کوئی تالاب ہے وہ تیزی سے آگے بڑھا اور کافی بلندی سے زمین پر آ رہا۔ جب سے اس جگہ کو درانم کہتے ہیں۔ اور اسی لئے چولا بادشاہ نے اس جگہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔

دسواں باب

کاوندی ایک درخت کے نیچے بیٹھا پوجا کر رہا تھا۔ اپنا پورا دن وہاں گذارنے کے بعد وہ کودلن اور کنا کی کے ساتھ مادورا کے لئے روانہ ہو گیا۔ سورج نکلنے کے بعد وہ مانا پٹم پہنچ گئے۔ جہاں ان کی ملاقات ایک برہمن سے ہوئی۔

"یہاں سے پانڈیا شہر کتنی دور ہے؟" کاوندی نے سوال کیا۔ ابھی برہمن جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ کودلن نے پوچھا کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ اور یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"میں بہت سے مقامات کی یاترا کیلئے گھر سے نکلا ہوں۔ فی الحال میں مادورا سے آرہا ہوں"

کودلن نے اس سے مادورا پوچھا۔

"میرا خیال ہے سب سے اچھا راستہ کھیتوں اور جنگلوں سے ہوتا ہوا جاتا ہے۔ بہتر ہے آپ اسی راستہ سے چلے جائیے۔

کاوندی اور اس کے ساتھی پھر سفر کو روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے کاوندی اور کنا کی بری طرح تھک گئے انھیں اس وقت پیاس بھی لگ رہی تھی۔ اس لئے وہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ کودلن قریب ہی ایک نہر پر گیا اس نے خود پانی پیا اور ان دونوں کیلئے پانی لیکر واپس ہوا۔ ابھی تھوڑی دور ہی

چلا تھا کہ وسنت مالا اچانک اس کے سامنے آ گئی اور اس کے قدموں میں گر گئی۔ راستے میں ایک برہمن کو دلن کو بتا دیا تھا کہ دل کو تمہارے عزیز اور رشتہ داروں کا بھیس بدل کر تمہیں ستانے آئیں گی۔ مگر ہوشیار رہنا۔ اس لئے کو دلن خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وسنت مالا بری طرح سے رو رہی تھی۔

"کو دلن خدا کیلئے واپس چلو۔ مادھوی کا بہت برا حال ہے۔ وہ تمہارے غم میں پاگل ہو جائے گی۔ کو دلن خدا کیلئے مان جاؤ۔ مادھوی بے ہوش پڑی ہے۔"

"پہلے اس نے مجھے ذلیل کیا اور جب میں وہاں سے چلا آیا تو وہ میرے لئے آنسو بہا رہی ہے۔" مگر اسے پھر برہمن کی نصیحتوں کا خیال آگیا۔ اور اس نے کچھ دعائیں پڑھیں۔ اور اچانک جنگل کی دیوی۔ اپنا بھیس بدل کر اصلی روپ میں آگئی۔ اور کو دلن سے معافی مانگی۔ اس نے کو دلن سے وعدہ کیا کہ وہ اس واقعے کے بارے میں کنا کی اور کاوندی سے کچھ نہیں کہے گا۔ اتنا کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔ کو دلن پانی لیکر کنا کی اور کاوندی کے پاس لوٹ آیا۔ قریب ہی کالی مائی کا مندر تھا۔ انہوں نے سوچا کہ سفر کی تھکان اتارنے کیلئے تھوڑی دیر اس مندر میں آرام کر لیں۔

جوں ہی تاریکی ہوئی مندر میں ایک لڑکی نے کالی مائی کا روپ بھر کر رقص شروع کیا۔ وہ شیر کی کھال پہنے ہوئے تھی اور اس کے سر پر بارہ سنگھے کا سر رکھا ہوا تھا۔ اور گلے میں شیر کے دانتوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ وہ رقص کر رہی تھی اور لوگ مندر میں داخل ہو رہے تھے۔ یہی وہ مندر تھا جہاں وہ ہر سال کسی نہ کسی آدمی کو اپنی جان کی قربانی دینی پڑتی تھی۔ غرض آدھی رات تک وہ رقص ختم ہوا اور کو دلن نے کاوندی سے کہا اگر ہم اس وقت اپنا سفر شروع کر دیں تو صبح کو سورج کی گرمی سے بچ جائیں گے۔ اور وہ تینوں پھر سفر کو روانہ ہو گئے۔

وہ برابر سفر کرتے جا رہے تھے۔ اب تو مادورا بہت قریب رہ گیا تھا۔ آخر وہ ایک گاؤں میں پہنچے جہاں برہمن بستے تھے۔ تینوں ایک برہمن کے ہاں ٹھہر گئے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد کو دلن گاؤں میں ٹہلنے نکل گیا۔ وہ ابھی کچھ دور ہی گیا تھا کہ اس کی نظر کوسیکر پر پڑی۔

"ارے تم کہاں؟" کو دلن نے حیرت سے پوچھا۔

"آپکو تلاش کرتے کرتے یہاں تک پہنچا ہوں۔" کوسیکر نے جواب دیا۔ اتنے طویل سفر کی وجہ سے بُری طرح تھکا ہوا تھا۔

"مگر مجھے تلاش کرنے کی اب کیا ضرورت ہے؟"

"مجھے مادھوی نے بھیجا ہے۔ آپ کے والدین کی بہت بُری حالت ہے۔ آپ کے سب رشتہ دار پریشان ہیں۔" کوسیکر نے کہا۔

"ہوں"... کوسیکر نے غور سے اس کی بات سنتے ہوئے کہا۔ "آپ کے والد نے ہر طرف آدمی بھیج رکھے ہیں تاکہ وہ آپ کو تلاش کر کے لائیں۔

آپ کی لڑکی مینی میکلائی کی بھی بہت بری حالت ہے اس نے آپ کو یہ پیغام بھیجا ہے ــــــ! خدا کیلئے واپس آجایئے میں دیوتا کی طرح آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اگر میری ماں نے کوئی غلطی کی تھی تو اس کی سزا مجھے کیوں دی جا رہی ہے آپ مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے۔ خدا کیلئے واپس آجایئے۔ اب ہم سب اکٹھے رہیں گے۔ ہم کنا کی کے ساتھ رہنے کو تیار ہیں۔"

کو دلن خاموش کھڑا یہ پیغام سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"مینی میکلائی خیریت سے تو ہے۔" کو دلن نے پوچھا۔

"ہاں خیریت سے ہے۔ مگر آپ کے چلے آنے سے اس معصوم کا دل ٹوٹ گیا ہے۔" کوسیکر نے جواب دیا۔ "اور مادھوری کی حالت تو بہت خراب ہے۔ میں نے زندگی بھر کوئی ایسی عورت نہیں دیکھی۔ جس نے شوہر کی جدائی میں اپنی حالت ایسی کر لی ہو۔ لیجئے یہ مادھوی کا خط ہے۔" کوسیکر نے ایک خط دیتے ہوئے کہا۔

مادھوی کے ساتھ گزری ہوئی زندگی کا ایک ایک لمحہ کو دلن کو یاد آ رہا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے خط کھولا۔

"میری زندگی کے مالک۔ مجھے اپنے قدموں میں رہنے کی تو جگہ دے دو۔ خدا را وہ باتیں بھول جاؤ جو میں نے صرف مذاق میں کہی تھیں۔ اور جن باتوں نے تم کو مجبور کر دیا تھا کہ تم مجھے اپنے والدین اور اس شہر کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ تم جنگلوں میں مارے مارے

پھر رہے ہو۔ اپنے ساتھ کنکا جیسی شریف اور نیک عورت کو بھی مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے لئے واپس آجاؤ۔

تمہاری بدنصیب

مادھوی

کوولن نے پورا خط پڑھا۔ وہ واقعی غلطی پر نہیں تھی یہ خط لے جاؤ۔ اور میرے والدین کو دے دینا۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ مادھوی بے قصور ہے۔ میں کسی قیمت پر واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے مادورا میں رہ کر تجارت کرنی ہے۔ مادھوی اور منی میکھلائی سے صرف اتنا کہہ دینا کہ میں چاہتا ہوں میری لڑکی ایک شریف عورت بنے رقاصہ نہیں۔ اچھا اب تم جاؤ۔

کوسیکر نے بہت اصرار کیا۔ مگر کوولن نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔ آخر مجبور ہو کر کوسیکر واپس چلا گیا۔

کوولن کنا کی کے پاس آیا۔ اور وہ تینوں پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔

ان کے کانوں میں انتہائی شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ بڑے بڑے نقارے بجائے جا رہے تھے۔ شیوجی کے مندر میں بھجن گائے جا رہے تھے۔ شاہی اصطبل سے ہاتھیوں کے چنگھاڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ پیدل سپاہیوں کے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ دریائے دیگی اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

تینوں دریا پر کھڑے ہو گئے۔ ہاتھی، شیر اور گھوڑے کی شکل کی کشتیاں مسافروں کو دریا پار کرا رہی تھیں۔ یہ تینوں بھی ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا کے پار چلے گئے۔

آخر وہ مادورا پہنچ گئے۔

آپ کنا کی کے ساتھ رہیں۔ میں رہنے کیلئے کسی جگہ کا انتظام کرتا ہوں کوولن نے کاوندی سے کہا۔

کوولن صدر دروازے سے شہر میں داخل ہو گیا۔ جس پر سپاہی تلواریں لئے حفاظت کیلئے کھڑے تھے۔ وہ کئی گھنٹے تک شہر میں گھومتا رہا مگر ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ آخر شام ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک باغ میں شہر کی خوبصورت رقاصائیں اپنے دولت مند عاشقوں کے ساتھ آ رہی ہیں۔ چونکہ باغ میں ہر طرف حسین مناظر تھے اس لئے کوولن کو یہ منظر دیکھنے میں آسانی ہوئی۔ اس نے بہت سی لڑکیوں کو اپنے عاشقوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا۔

بازاروں میں بہت بھیڑ تھی۔ دوکانوں پر ستار، موتی، ہیرے جواہرات اور اسی قسم کی چیزیں بھری پڑی ہوئی تھیں۔ سناروں اور ساہوکاروں کا اپنا الگ بازار تھا۔

کوولن واپس آ گیا۔ اس نے شہر میں جو کچھ دیکھا تھا سب کچھ کنا کی اور کاوندی کو بتایا۔

اتفاق سے اسی وقت ایک برہمن سامنے سے گزرا۔ وہ کوولن کو پہچان گیا۔

میں مختلف مقامات کی سیر کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ برہمن نے کہا۔ اور آپ کو تو میں بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ آپ جیسے مشہور تاجر کو کون نہیں جانتا۔ مجھے وہ واقعہ بھی معلوم ہے جب آپ نے اپنی لڑکی کا نام منی میکھلائی رکھا تھا۔ اور ایک دن جب آپ نے اس ضعیف برہمن کو مست ہاتھی کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ تو میں وہاں موجود تھا۔ مجھے وہ واقعہ بھی یاد ہے جب ایک برہمن نے ایک بچے کو جان سے مار دیا تھا۔ اور پھر شرم کے مارے اپنی بیوی کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ تو آپ اس برہمن کو واپس لائے تھے۔ اور اسے بہت سا انعام و اکرام بھی دیا تھا۔ حضور آپ جیسے شریف انسان دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب جھوٹی گواہی دینے پر ایک برہمن کو قتل کیا جانا تھا۔ تو آپ نے خود کو اس کی جگہ پیش کیا تھا۔ اور بعد میں اس کی بیوی کو بہت سی دولت دی تھی۔ خدا آپ کو محفوظ رکھے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کو اپنے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا ملنے والی ہے۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو کوولن نے کہا۔ میں نے بھی خواب میں دیکھا ہے کہ ایک نیچی ذات کے آدمی نے بادشاہ کے حکم سے مجھے لمبے لمبے سینگوں والے بھینسے پر بٹھا دیا ہے۔

میں بھینسے پر بیٹھا ہوا ہوں اور کنکا کی بُری طرح رو رہی ہے۔ نہ جانے کیا ہوا۔ کہ جن لوگوں نے مجھے سزا دی تھی وہ سب کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔

آپ لوگ بہتر ہے شہر میں رہیں۔ یہاں صرف پجاری رہتے ہیں۔

ممکن ہے یہ پائل اس کے پاؤں کی زینت بنا ہو۔ اس جواب کے بعد بادشاہ ملکہ کے کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ ساہوکار بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے جھک کر سلام کیا۔

حضور میں نے چور پکڑ لیا ہے۔ ساہوکار نے کہا۔

کیسے پکڑا؟ بادشاہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

حضور وہ پائل لیکر میرے پاس آیا تھا۔ اور آدھی قیمت پر اسے فروخت کرنا چاہتا تھا۔

وہ ہے کہاں؟

میرے گھر میں بیٹھا ہے۔ پائل بھی اس کے پاس ہے۔

بادشاہ پائل کے ملنے سے بہت خوش تھا۔ وہ ملکہ کو خوش کرنے کیلئے چور کو فوراً سزا دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ملک کا یہ قانون بھول گیا۔ کہ باقاعدہ مقدمہ چلائے کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ اس نے فوراً تین سپاہیوں کو بلایا۔

ساہوکار کے ساتھ جاؤ۔ اگر تم ملکہ کی پائل چور کے قبضے میں دیکھو تو اسے فوراً جان سے مار دینا۔ اور وہ پائل لے آنا۔ بادشاہ نے کہا۔ اور تم ملکہ کی پائل پہچانتے ہو نا!

جی حضور ہم پہچانتے ہیں۔ سپاہیوں نے جواب دیا۔

ساہوکار اور سپاہی محل سے روانہ ہو گئے۔

گھر پہنچکر ساہوکار نے کوولن سے کہا۔ یہ سپاہی بادشاہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ انہیں پائل دکھا دو۔

سپاہیوں نے پائل دیکھی۔ وہ پہچان گئے۔ یہ تو واقعی ملکہ کی پائل تھی۔

وہ سپاہی غور سے کوولن کو دیکھ رہے تھے۔

مگر یہ شخص چور نہیں معلوم ہوتا۔ ایک سپاہی نے ساہوکار کے کان میں کہا۔

تم لوگ بے وقوف ہو۔ تم چور کے بارے میں جانتے کیا ہو۔ ساہوکار نے جواب دیا۔ تم کو یقین ہے کہ یہ پائل ملکہ کی ہے؟

ہاں پائل تو ملکہ کی ہے۔ سپاہیوں نے جواب دیا۔

تمہیں وہ چور یاد ہے جو سیٹھ کا بھیس بدل کر آیا تھا۔ اصالت کو ہیروں کا ہار چرا کر لے گیا تھا۔ کیا تمہارا مطلب ہے وہ چور شکل سے بھی چور معلوم ہوتا؟ اس لئے پر تمہیں کوئی باقاعدہ کتاب پڑھنی چاہیئے۔ جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ اگر [illegible] ہو گیا تو غائب ہو جائے گا۔

ایک سپاہی آگے بڑھا۔ تلوار سے اس نے کوولن کی گردن پر وار کیا۔ کوولن زمین پر گر گیا۔ اور اس کی گردن سے خون پھوٹ نکلا۔

سپاہی پائل لیکر واپس چلے گئے۔

بادشاہ نے پائل دیکھی۔ پائل واقعی ملکہ کی تھی۔ وہ پائل لیکر ملکہ کے پاس گیا۔ ملکہ پائل دیکھ کر خوش ہو گئی۔

تم اس کے گم ہونے کا مجھے الزام دے رہی تھیں۔ بادشاہ نے کہا۔ کچھ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ اور پھر بادشاہ ملکہ کے کمرے سے باہر آ گیا۔

بارھواں باب

کوولن کو گئے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ کناکی سخت پریشان ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیا ہو گیا۔ میرا دل خوف سے لرز رہا ہے۔ میرے آقا ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے۔ انہیں کیا ہوا!

مادری مندر سے واپس آئی۔ تو وہ کناکی کے پاس خاموش کھڑی ہو گئی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

اوہ۔ کناکی۔ وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ خدا کیلئے بتاؤ تو۔ میں تو اپنے آقا کیلئے پریشان بیٹھی ہوں۔ کیا ان کے بارے میں کوئی خبر دینا چاہتی ہو۔ کیا ہوا؟!

کوولن کو بادشاہ کے سپاہیوں نے جان سے مار دیا۔ مادری نے بمشکل تمام الفاظ ادا کئے۔

مگر کیوں؟

اس پر الزام تھا کہ اس نے ملکہ کی پائل چرائی ہے۔

یہ ظلم ہے۔ یہ نا انصافی ہے۔ کناکی غصہ سے سرخ ہو گئی۔

اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہاں ہو میرے آقا تمہارا ... وہ سسکتی ہوئی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

تھوڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا۔ تو غصے سے چلانے لگی۔ کیا کہا تھا۔

کیا میں شہر کی ہو اس لئے بیوہ ہوں گی کہ میرا شوہر بادشاہ کی ناانصافی کا شکار ہو گیا ہے؟

دلہن کی بیوہ وقت دیر ہو کیا میں نے اتنا طویل سفر صرف اس لئے کیا تھا کہ یہاں آ کر بادشاہ کی ناانصافی کی شکار ہو کر بیوہ ہو جاؤں؟

اسے سمجھا کر یہ بتایا گیا میرے آقا معصوم نہیں تھے؟ کیا انہوں نے چوری کی تھی؟

میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس پورے شہر میں آگ لگ جائے گی۔

کناکی نے اپنی دوسری پائل اٹھائی۔ محلے کی دوسری عورتیں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔

شریف مردو اور عورتو! واقعی تم قابل داد ہو جو ایسے ظالم بادشاہ کے ملک میں رہتے ہو۔ بادشاہ میرے پائل کی قیمت ادا نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس نے بہانہ بنا کر میرے آقا کو قتل کرا دیا تاکہ وہ پائل حاصل کر سکے۔

اگر میں نیک عورت ہوں تو تم لوگ دیکھنا کہ میرے آقا مرنے کے بعد بھی بولیں گے۔

کناکی مادری کے ساتھ شہر چلی گئی۔ مادری اسے سنار کے گھر لے گئی۔ جہاں کوولن کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

کناکی نے کوولن کو دیکھا۔ مگر کوولن اس کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ شہر میں سناٹا تھا۔ اس لئے کناکی کے رونے کی آواز پر تمام شہر جمع ہو گیا تھا۔ آج صبح ہی تو کناکی کوولن کی آغوش میں تھی۔ اور آج ہی شام کو اس کی لاش خاک و خون میں لتھڑی پڑی تھی۔

کناکی کوولن سے چمٹ گئی۔ اس نے اپنے آنسوؤں سے خون کے دھبے دھوئے۔

کیا تمہارا خوبصورت جسم اس طرح خاک اور خون میں لتھڑنے کیلئے تھا۔ میرے آقا۔ کچھ تو بولو۔ کیا اس شہر میں ایک بھی آدمی سچا ہی انصاف نہیں۔ کیا کوئی عورت اس ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتی۔ کیا اس شہر میں کوئی خدا نہیں ہے۔ جو مظلوموں کو بادشاہ کی تیز تلواروں سے بچا سکے۔ میرے آقا صرف ایک دفعہ تو بول دو۔ صرف ایک دفعہ۔۔

کوولن کو ہوش آگیا۔ میری محبوبہ کا چاند سا چہرہ میری نظروں سے غائب ہو رہا ہے۔ کوولن نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ کناکی نے کوولن کے پاؤں پکڑ لئے۔

میری پیاری تم کہیں مت جانا۔ بس یہیں رہنا۔ کوولن نے پھر آہستگی سے کہا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

کیا میرے آقا واقعی بولے تھے۔ یا مجھے دھوکا ہوا تھا۔ کناکی نے سوچا۔

اے خدا میں کہاں جاؤں؟ کس سے فریاد کروں؟ اچھا پہلے بادشاہ کے پاس جاتی ہوں۔ اسے بتاتی ہوں کہ وہ کس قدر ظالم ہے میرے آقا کی لاش تنہا نہیں جلے گی اس کے ساتھ اس شہر کو بھی جلنا پڑے گا۔

کناکی کو وہ خواب یاد آ رہا تھا۔ جو اس نے دیونندی کو سنایا تھا۔ کتنا سچا تھا وہ خواب۔ کناکی وہاں سے کھڑی ہو گئی اور بادشاہ کے محل کی طرف چلی گئی۔

تھوڑی دیر پہلے ملکہ نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا وہ بادشاہ کے پاس بھاگی ہوئی آئی اور اسے پورا خواب سنایا۔

میں نے خواب دیکھا ہے۔ آپ کا تاج گر گیا ہے۔ کوئی فریادی محل کے باہر لٹکے ہوئے گھنٹے کو برابر بجائے جا رہا ہے۔ شاید آپ سے کوئی بے انصافی ہو گئی ہے۔ ملکہ نے کہا۔

خدا جانتا ہے کیا ہونے والا ہے۔

ٹھیک ایسا ہی خواب آپ کے آبا و اجداد نے بھی دیکھا تھا جب آپ کے خاندان کے ایک بزرگ "اگر" سمندر پر اپنا نیزہ پھینکا تھا۔ اور سمندر کے دیوتا نے غصے میں ان کا پورا ملک نگل لیا تھا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ محل کا ایک سپاہی آیا۔

حضور ایک عورت آئی ہے۔ سپاہی نے کہا

کون ہے وہ عورت؟ بادشاہ نے پوچھا۔

حضور شکل سے تو وہ کوئی دیوی معلوم ہوتی ہے۔

وہ عورت کیا چاہتی ہے؟

وہ غصہ میں سرخ ہے۔ کالی ماتا کی طرح غضب ناک سے
آپ سے ملنا چاہتی ہے۔
بھیج دو اندر۔ بادشاہ نے کہا
سپاہی کنا کی کو بادشاہ کے سامنے لے آئے۔
تم کیوں رو رہی ہو؟ کیا ہوا تمہیں؟ بادشاہ نے پوچھا۔
میں پوہر کے شہر سے آئی ہوں۔ جہاں کے بادشاہ نے ایک فاختہ کی جان بچانے کیلئے باز کو اپنے جسم کا گوشت کھلایا تھا۔ اور جہاں کے ایک بادشاہ نے اپنے عزیز بیٹے کی جان کی پرواہ نہ کی اور اسے اپنی رتھ کے پہیوں سے کچلتا ہوا چلا گیا۔ تاکہ اس گائے تک انصاف پہنچ سکے جو محل کے دروازے پر لٹکا ہوا انصاف کا گھنٹہ بجا رہی تھی۔
میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ بادشاہ نے کہا۔
اس شہر سے کووالن نامی ایک سوداگر یہاں آیا تھا۔ اور آپ کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ ایک پائل بیچنا چاہتا تھا۔
میں اسی بدنصیب کی بیوی کناکی ہوں۔
نیک خاتون میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ چور کو موت کی سزا کے علاوہ اور کیا سزا دی جا سکتی ہے۔ بادشاہ نے کہا۔
ایک بے گناہ کو قتل کرنا انصاف نہیں ہے۔ آپ نے اسے قتل کرایا ہے۔ انصاف نہیں کیا۔
تم اس کی بیوی ہو۔ اس لئے یہی کہو گی کہ وہ بے گناہ تھا لیکن وہ چوری کے مال کے ساتھ پکڑا گیا۔
کون سا چوری کا مال اس کے پاس تھا؟۔
ملکہ کی پائل۔
پائل کا چور وہ نہیں تھا آپ ہیں۔ آپ بادشاہ ہیں۔ اس لئے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اگر ملکہ کی پائل کھو گئی تو اس میں بڑا ہونے کی کیا بات ہے۔ اور پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس پائل کے لئے ایک بے گناہ کو قتل کر دیا جائے۔ کیا آپ کو ایسی بے انصافی کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔
بکواس بند کرو۔ تمہارے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے
بادشاہ نے غصہ سے کہا۔
اس لئے کہ یہ سب سچ ہے اور میرے پاس ان سب باتوں کا ثبوت موجود ہے۔
ثابت کرو کہ جو کچھ کہہ رہی ہو ٹھیک ہے۔ وہ دھاڑ بادشاہ غصے سے لرز رہا تھا۔ لو یہ ہے وہ پائل جو تمہارے شوہر کے پاس سے نکلی ہے۔ بادشاہ نے پائل کناکی کو دے دی۔
کناکی نے پائل غور سے دیکھی۔ یہ اس کی اپنی ہی پائل تھی
آپ بتا سکتے ہیں کہ ملکہ کی پائل میں کیا بھرا ہوا تھا؟ کناکی نے پوچھا۔
اس میں سچے موتی تھے۔ بادشاہ نے کہا۔
اور میرے پائل میں جواہرات تھے۔ دیکھئے اس کے اندر کیا ہے اور کناکی نے پائل زور سے زمین پر دے ماری۔ پائل کے ٹکڑے ہو گئے۔ خوبصورت اور چمکدار جواہرات فرش پر بکھر گئے۔
اُف یہ کیا ہوا؟ میں کیسا بادشاہ ہوں۔ ایک بدمعاش ساہوکار کی باتوں میں آ کر میں نے اتنا بڑا گناہ کر دیا۔
میں نے ایک بے گناہ کو جان سے مروا دیا۔ چور میں ہوں۔ میں انصاف نہیں کر سکا۔
اے خدا میں نے جو کچھ کیا جلدی میں کیا۔
میں نے ایک بے گناہ کو جان سے مار دیا۔
مجھے معاف کر دیجئو اے خدا۔
مجھے معاف کر دیجئو۔
بادشاہ نے خنجر نکالا۔ اور اپنے سینے پر مار لیا۔
بادشاہ کی لاش تڑپ رہی تھی۔ ملکہ بادشاہ سے لپٹی ہوئی تھی۔ میرے آقا میں اس دنیا میں رہ کر کیا کروں گی۔ میرے آقا میں آ رہی ہوں۔
ملکہ۔ کناکی نے کہا۔ میں بدنصیب قسمت کی شکار ہوں۔ میں ایک جاہل عورت ہوں۔ لیکن صرف اتنا جانتی ہوں کہ اگر کوئی انسان کسی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو اسے اس کی سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ اور اگر عورت نیک ہو تو عام زندگی میں خواہ کتنی ہی لاچار اور مجبور ہو مگر اسے پوری فطرت پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ میں آج اس قوت کو ثابت کر کے دکھا دوں گی۔ میں آج تمام دنیا کو ایک سبق دوں گی تم دیکھو گی کہ یہ پورا شہر آگ کے شعلوں کی نذر ہو جائیگا۔

۵۰ کا بہترین ادب
جسے سردار جعفری اور پرکاش پنڈت نے مرتب کیا
احتشام حسین
ممتاز حسین
سلامت اللہ
محمد حسن
کرشن چندر
عصمت چغتائی
کنہیا لال کپور
خواجہ احمد عباس
سردار جعفری
فراق
مجروح
محمود جالندھری
قیمت پانچ روپے آٹھ آنے
۵۱ کا بہترین ادب
ترتیب دینے والے
سردار جعفری، ممتاز حسین، جگن ناتھ آزاد، پرکاش پنڈت
فیض احمد فیض
راجندر سنگھ بیدی
احمد ندیم
قاسمی
آل احمد سرور
مجاز
جوش
قیمت
پانچ روپے آٹھ آنے

پنا لال پٹیل

ہندوستانی زبانوں کے ناولوں میں گجراتی کے ناول دیہاتی سماج کی اچھی تصویر پیش کرتے ہیں۔ "جیون کا داؤ" گجراتی زبان کا ایک نمائندہ ناول ہے جس کے مصنف پنا لال پٹیل دیہاتی زندگی کی مرقع کشی اور منظر نگاری میں اپنا الگ مقام رکھتے ہیں۔ زیر نظر ناول میں کئی وصف ہیں۔ اس میں گاؤں کی روح بول رہی ہے۔ گاؤں کی مزدوریں، جھگڑے قصے، ناول مسائل، معمولات، پنچایت اور بہار وغیرہ کی تصویریں دیکھ کر قاری اسی ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ پٹیل نے اس بھرپور ناول میں قصے کی ترتیب کا اتنا لحاظ رکھا ہے کہ اس کا قلم بھٹکتا نہیں، صرف ایک جملے سے قصے کے گرد پورا ناول چکر کاٹتا ہے لیکن ہر سطر پر کہانی میں اضافہ ہوتا ہے اور آخری باب تک پہنچتے پہنچتے بھی SUSPENSE باقی رہتا ہے۔

اس ناول کا ہیرو دراصل منو معاملہ ہے۔ اس کا بھرپور نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ جس میں مصنف نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی بھی شخص کے اندر کا "انسان" مرتا نہیں، سو جاتا ہے اور جب وہ جاگ اٹھتا ہے تو انسان اپنے عیب کا خود ہی احتساب بھی کر سکتا ہے۔ اور خود ہی کفارہ بھی ادا کر سکتا ہے!

تاثیر اور تاثر کے اعتبار سے بھی یہ ایک اچھا ناول ہے۔ اس میں ابتدا کا وہ تمام حصہ جو جھکو کے حبس کے نیچے جا کر بیٹھنے سے لے کر موت آ جانے میں اس کی مایوسی کے لمحے بھرپور ہیں بڑے دلنشین تاثر پیش کرتا ہے۔ مثلاً جھکو اپنے گاؤں سے چلتے ہوئے اُن درختوں کی طرف نظر ڈالتا ہے جہاں کھیلتے کودتے پلے ہیں جہاں وہ بچپن میں کھیلا ہے اور جن کے سائے میں اس کا بچپن گزرا ہے۔ انھیں دیکھ کر اُسے احساس ہونے لگتا ہے کہ اب وہ کبھی ان درختوں کو نہ دیکھ سکے گا۔ اس کی حسرت بھری آنکھیں ان درختوں سے کہہ رہی ہیں کہ "میری ماں اگر ادھر سے ڈھونڈتی ہوئی آئے تو تم انھیں بتا دینا کہ ہم نے جھکو کو دیکھا تھا اور وہ اس طرف گیا ہے!" ایسی جذبات نگاری نے ناول میں بڑے خوش نما اور دیرپا رنگ بھر دیئے ہیں!

یہ ناول ہندی کے واسطے سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ہندی کے مترجم نے اس کی زبان صاف نہیں رکھی۔ اسے ترجمے نے کہیں کہیں سنوار دیا ہے لیکن مکالموں میں زیادہ تر آسان ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر بھی یہ ناول چونکہ ہمارے دیہاتی ماحول کا ترجمان ہے اور جانے پہچانے کرداروں کی نمائندگی کرتا ہے اس لئے پڑھنے والوں کو اصل ہی معلوم ہوگا۔ اور اس سے بڑی حد تک یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گجراتی زبان میں ناول نے کہاں تک ترقی کی ہے۔

اس کا مصنف پنا لال پٹیل خود دیہاتی زندگی میں پلا بڑھا اور کھیلا کودا ہے۔ وہ دیہاتی زندگی کے حسن کا پوری طرح سے رمز شناس ہے اور اسے پیش کرنے میں بھی فنکارانہ مہارت رکھتا ہے۔ قصے میں شروع سے آخر تک ربط و تسلسل موجود ہے۔ لیکن جزئیات نگاری میں پٹیل کا قلم تو بڑے حسن و اعتدال سے چلتا ہے۔ اس کے پیش کئے ہوئے کردار اور ان کا ماحول مؤثر ہو اُٹھتا ہے۔

حسن نثار احمد فاروقی

کاہے کو بیاہی بدیس....

جاڑے کے دن تھے۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے ہوں گے
سردی اتنی شدید تھی کہ سب اپنے اپنے گھروں میں دبک چکے
تھے۔ منسے لالا کے پاس لڑکی چولہے کے سامنے بیٹھے
ہاتھ تاپ رہے تھے۔ کھیتوں کے رکھوالے بھی پیال کے گٹھر
بچھا کے سو گئے تھے۔ گاؤں کی عورتوں کے گھر کا کام پورا نہیں ہوئے
تھے کسی کسی گھر سے آٹا پیسنے کی آواز گھرر گھرر آ رہی
ہے۔ دن بھر کے تھکے ماندے بچے ماں کی گود کے بجائے اس کی
ساڑی میں لپٹ کر گود میں سمٹ کر سو گئے ہیں۔

گاؤں بھر میں دیر سے بیدار کرنے والے منسو دادا کھیا بھی بیدار کر کے
اٹھے ہیں۔ اپنے ہاتھ کو رگڑتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھے
اور اپنی گھر والی سے، جو کام کر رہی تھی، پوچھا۔
"کہاں گیا کلوا..... میرا حقہ بھر......"
"یہاں کلوا کہاں ہے۔ وہ تو بیاہ کر کے کھیت پر چلا گیا۔ یہ کہہ گیا
ہے کہ حقے میں پانی ڈال دیا ہے تمباکو رکھ دیا ہے بس آگ رکھنے
کی کسر ہے یہ ذرا سا کام خود کر لو!"

چلم حقہ مختصر کرنے کے لیے، خواہ گھر والی کی روزانہ ایک
ہی مطلب کی بات سننے سے بچنے کے لیے، چوپال کی طرف چلے
گئے اور وہاں سلگتے ہوئے الاؤ کی آگ سے چلم بھرنے چلے آئے
پلنگ پہ دراز ہو کر نیچہ منہ میں لگانے والے ہی تھے کہ چوپال کی
دیوار پر کسی کے آنے کی آہٹ دیکھ کر ہانک لگائی۔

"کون ہے رے؟"

"میں ہوں موتیاں، منسو کاکا، تم سے ایک کام ہے اگر گھر
تک چلو تو اچھا ہو۔"

اتنی سردی میں وہ اسے دنیا کا کیا کام ہے۔ یہ سوچ کر منسو دادا
نے حقے کے دو تین کش لگائے اور موتی کی طرف دیکھنے لگے
جو الاؤ کے پاس بیٹھا سردی کم کر رہا تھا

"کاکا۔ بتا مزدوری کا کام ہے؟ ذرا گاؤں تک جلدی چلے آؤ۔" منسو
کو خاموش دیکھ کر اس نے کہا "شاید اسے وہ بھاگ کر بتا کر
میں ابھی آیا!" "لیکن کام کیا ہے کچھ معلوم بھی تو ہو؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موتی کسی کشمکش میں ہے۔ اس نے
منسو دادا کے آگے جھک کر آہستہ سے کہا۔ "تم تو چلو کاکا۔
مجھے خود اچھی طرح علم نہیں۔ نہ جانے میری ان کہار سے
کیا جھگڑائی ہے؟"

منسو دادا نے اپنا سر اٹھایا جو پتلی سی گردن پر جیسے لٹکا ہوا تھا، وہ
آہستہ سے کچھ کھینچ کر بولا۔ "اے سالے۔"

"اچھا تو میں ابھی آیا۔" پھر وہ پلنگ پہ ہی بیٹھ گیا اور حقہ
پیتا رہا۔

موتی نے جانے سے پہلے پھر کہا "تم گھر جا کر بیٹھو میں
ابھی گیا اور ابھی آیا" وہ قدم بڑھا تھا کہ پھر پلٹ
"اس نے کہا تھا کہ کاکا سو بھی رہے ہوں تو جگا کر بھیج دینا۔"

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔" حقے کے دو چار کش جلدی
جلدی کھینچ کر حقہ دیوار سے لگا کر رکھتے ہوئے منسو دادا نے کہا
"نہ جانے اس وقت کیا کام پڑ گیا ہے.... ہونہہ!"

"ایک بار تم گھر تو چلو پھر......" کہتا ہوا موتی چلا گیا۔

منسو دادا کا دبلا پتلا مگر مضبوط جسم بڑھاپے کے باوجود اس وقت
پھرتیلا ہو گیا اس نے سرہانے رکھا ہوا انگرکھا پہنا لنگوٹی سے
اتار کر صافہ لپیٹا اور کرتی بھی پہن لی۔ پھر ایک ہاتھ میں لکڑی
اور دوسرے میں حقہ لے کر باہر آیا۔ چوپال سے اتر رہے تھے کہ کوئی
بات یاد آئی اور گھر میں گھستے ہوئے بولے

مہمان گئیں — یہ گاؤں ہیں جا رہا ہوں ذرا باہر کا خیال رکھنا۔ آگ نہ آئے۔" یہ کہہ کر مڑے۔ گھر والی نے کوئی سوال کیا لیکن اس وقت منورما نے قصداً اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ حقے کی گڑگڑاہٹ جاری تھی اور منورما چلے جا رہے تھے۔ کچھ دور چل کر پھر مڑ گئے اور گلیا پار کرکے ایک چھور پر آئے۔ وہاں ایک دروازے کی کنڈی کھول کر لی کے بعد دبے پاؤں صحن پار کرتے ہوئے اندر آ گئے۔ آہستہ سے کن سوئیاں لیں کہ کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ دو چار اُٹھے سے لفظ اُن کے کان میں پڑے۔

"مہمان جانا ہو چلی جائے۔۔۔۔ نکال دے گھر سے۔۔۔" یہ الفاظ سن کر منورما کے چہرے کا رنگ کھل گیا گویا اُن کا جو قیاس تھا وہ ٹھیک ہی نکلا!

"مجھے اس کا اندازہ بھی کیا ہوا ہے!" اگر شاباشی کے لئے اپنی ہی پیٹھ ٹھونکی جا سکتی تو منورما اس وقت یہ بھی کر گزرتا۔ سامنے گاؤں والی فتنہ بازی سے پہلا نمبر [illegible] ہی میں ہمہ ملنے والے ایک سوال کا جواب بھی خوب ہی دے دیا۔ "ارے ہاں یہ بھی ہو جائے گا۔ کوئی بڑھیا مل جائے گا ایک بار اس پھندے میں سے تو چھوٹنے دے" یہ سوچتے سوچتے منورما کھنکارا اور گلا صاف صاف کرتے ہوتے لپیے کو ایسا جیسے بجلی کا ترنگ۔

"ارے بھئی کوئی ہے گھر میں؟"

"کون؟ منورما کا —!" آواز کے ساتھ ہی بوڑھا جوان چوپال کے کنارے تک آ گیا۔

ذرا سا ٹھہرنے میں ہی منورما نے لالٹین کی دھیمی روشنی سے یہ تاڑ لیا کہ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی بھیکو کی ماں سہمی ہوئی ہو رہی ہے اور اس سے ذرا فاصلے پر جو بھیکو کی گھر والی بیٹھی تھی اسے دیکھ کر بھی بھانپ گئے۔

منورما لالٹین کی طرف منہ کر کے پلنگ پر پیر لٹکائے ہوئے بیٹھ گئے۔ پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے تمباکو کے ڈبے میں سے تھوڑا سا لے کر ہتھیلی پر ملتے ہوئے کہا۔

"آؤ۔ ہاں۔ تمباکو بھون لوں؟" منورما نے کہا۔

"اے تمباکو گیا بھاڑ میں!" اور یہ تینوں سہم گئے۔ منورما نے دھیمے مگر گمبھیر آواز میں کہا "تم نے آخر ٹھانی کیا ہے مجھے تو بتاؤ؟"

معذوں ماں بیٹے بہو جھک ہو کر ایک دوسرے کی صورت تکنے لگے اور بھیکو کی بیوی نے اپنا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔

منورما نے پھر حقے کے دو تین کش لگا کر [illegible] پوچھا

"تم نے وہ کہاوت سنی ہے؟ تیلی کا بیل نے خصم کیا پھر بھی رکھا سوکھا کا پھر چھوڑ دیا۔ برا یہ اس سے زیادہ بڑھ گیا۔ بس یہ سمجھ لو ایسا ہی ہے۔" پھر ایک تم نے اشارہ کرنے کے بعد سب کو خاموش دیکھ کر بولے "تم سمجھتے ہو کسی کو خبر ہی نہ ہوگی مگر تمہارا وہ دشمن گھر بیٹھے کی سازش کر رہا ہے بچو۔"

بھیکو کی ماں گھبرا کر بولی "لیکن اب ہم کیا کریں؟ اس بدنصیب نے یہ ٹکڑ [illegible] کام کر دیا تو اب اس کا علاج کیا ہو [illegible] پیٹ جاننے والے سے یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ تو گھر سے۔"

بھیکو نے منہ کو بات میں لقمہ دیا "ہم چاہ پھوٹے ہیں۔ آ گئی بیٹھی بیٹھی روٹی۔ اسی طرح تو روز نئے سر چڑھایا تھا ہمیں۔ غلط کہا ہی کیا تھا کہ بھاڑ میں جائیں ایسے پیسے۔ نہ لیں تو کیا ہے۔ لیکن اس موٹی کا پیتا۔۔۔۔"

منورما نے بات کاٹی "بھیکو سن۔ اگر اب بھی میرا کہنا مانے تو اسے گھر سے نکال دے ورنہ ابھی تو دشمن سوتیاں آتا ہوگا اور گھر ہی اس کے ہاتھ لگ گئی۔ تو صبح ہونے تک خدا جانے اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا، پھر اس کا شوہر اس تک میں ہے کہ تیرے پیٹ جھٹکا کر ناک کاٹ لیں، مجھ سے ہی کی ماں کے تو دونوں ہاتھوں میں لڈو ہیں۔ اُدھر داماد کی اور مجھ سے پھر ملے گی۔" ذرا کھنکھار کر کہنے لگے "تمہارا تو اس میں گیا ہی کیا ہے؟ تمہارے سگے سمدھی کا بیاہ برادری کا معاملہ کچھ نہیں۔ مگر مجھے یہ فکر ہے کہ گاؤں میں ناک کٹ جائے گی۔ اگر تمہارا ہاتھ لگ گیا، تمہاری برادری تمہارا حقہ پانی بند کر دے گی! بس تمہاری گت بنے گی یہی سوال الٹا ہے کہ تم نے اسے گھر میں رکھا تو کس کے حکم سے؟"

"برادری تو سب سے پہلے پوچھے گی" بھیکو کہتے کہتے [illegible] لیکن "ساتھ اس کی کوئی سبیل بتاؤ؟" پھر غصے میں غصے سے دانت پیس کر آہستہ سے بولا۔ "اس جنم کی بیری پہ ایسا غصہ آ رہا ہے جی چاہتا ہے اپنے ہاتھوں ناک کاٹ لوں اس کی۔۔۔۔"

"بس اب خاموش ہو جا۔ نہ ہاتھوں پہ حرکت نہ کر۔" منورما نے اسے خاموش کرتے ہوئے کہا۔ موقع کے لحاظ سے [illegible] اور [illegible] بھی کر دیا کچھ دیر بعد میاں [illegible] سب سے [illegible] ہے۔ تینوں جا اس

رہا کرتے تھے تو اس میں تعجب کی بات ذرا بھی نہ تھی۔ بچپن جس کی دوستی بھی کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ ابا کو بڈھی کہہ سکے۔

ابا نے بیچ بچاؤ کیا مگر منگو کسمسا کر ذرا سرکایا۔ پھر وہ سنبھل کے بیٹھ گئی۔

"یہ سب فرصت میں یاد کرنا۔ لیکن اس وقت جو کام آپڑا ہے اس کے لیے کچھ کرو نا؟"

"کیا ہے کیا؟ کچھ کہو گی بھی یا بس یوں ہی؟" یہ کہہ کر منوروا نے حقہ سنبھالا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے دیرا چیل کی طرف دیکھا۔ دیرا نے آہستہ سے کہا "وہ بچاری بڑھی کی بہن جھمکو ہے نا؟ وہ بچاری پہلے . . . !"

"ہاں، ہاں۔ اس حرام زادی نے سارے گاؤں کی کریا خراب کر دی۔ لیکن اب کیا گل کھلایا ہے اس نے؟"

منوروا نے ایسے پوچھا گویا اسے کچھ خبر نہیں۔

اس کے بعد دیرا نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ابا کو کسی نے یہ خبر دی کہ ایک عورت کو بھیرو کے باڑے میں ڈھکتے ہوئے دیکھا گیا اور یہ یقین ہے کہ وہ عورت جھمکو کے سوا دوسری کوئی نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد ابا نے اس شبہے کو ثابت کرنے کے لیے یہ بھی کہا کہ جھمکو کا اقرار کرنے والے پٹواری کا حقہ پانی برادری نے بند کر دیا ہے اور اس کے گھر والے اسے گاؤں سے نکال رہے ہیں۔ پھر بھی گی۔

"مجھے تو یقین ہے منوروا — کہ اس بامن نے رانڈ کو نکال ہی دیا ہے۔ اور دانت کچکچا کر بولی "کب میرے ہاتھ لگے اور میں اس بھیریا کا تماشا دیکھوں!"

ابھی تو بیٹیا صاحب بڑا دُم چھلا سا بنائے پھرتے ہیں اس سے کچھ بولتی نہیں۔ لیکن ایک بار یہ جھمکو میرے ہتھے چڑھ جائے پھر دیکھو . . ."

منوروا نے ابا کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا "اگر یہ بات ہے تو چلو بھیریا کے گھر کی تلاشی لے لیں . . .

ابا کا کلیجا یہ سن کر ذرا ٹھنڈا ہوا وہ بولی "اسی لیے تو تمہیں بلایا تھا!

منوروا ایک دم کھڑا ہو گیا اور بولا "اچھی بات ہے۔ اٹھ دیرا۔

موتی تو بھی چل —" اور پھر ابا سے پوچھا "اس سے پہلے تو کسی سے یہ بات نہیں کی ہے؟"

"میں بات کہاں کی؟ میں نے تو موتیا کو بھی نہیں بتایا تھا جب اسے تمہیں بلانے کے لیے بھیجا تھا ورنہ کہہ دیتی کہ ایسا واقعہ ہو گیا ہے!"

"بس ٹھیک ہے۔ مگر ایسا نہ ہو کسی نے رسی کا سانپ بنا دیا ہو؟"

"نہیں ایسا نہیں۔ جس نے مجھ سے کہا تھا وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔" ابا نے کہا۔

"کون ہے وہ؟" منوروا نے قریب آکر پوچھا اور جب ابا نے آہستہ سے نام بتایا تو منوروا نے کہا "ہو سکتا ہے وہ اندھیرے میں اچھی طرح نہ پہچان سکا ہو۔"

"ارے پہچانتا کیسا۔ میں تو تمہارے روبرو کہلوا دیتی مگر اب وہ کھیت پر رکھوالی کے لیے جا چکا ہوگا۔"

"اگر وہی تھی۔ تو سمجھ لو کہ آج بندھ گیا۔" کہتے ہوئے منوروا آگے بڑھے تو ان کے قدم اتنی تیزی سے اٹھ رہے تھے کہ ابا کو یقین ہو گیا "اب تو بندھ گئی رانڈ!" اور اب تو یہ انتظار تھا کہ کب وہ نکلے اور بڑھیوں کی پنچایت بیٹھ کر برادری سے خارج کرے۔ پھر دل ہی دل میں اسے وہ جھگڑے والا دن بھی یاد آیا جب جھمکو کا شوہر اسے مارتا تھا تب وہ بچ کے بھاگ آئی تھی۔ ایسا دو تین مرتبہ ہو چکا تھا۔ لوگوں میں چہ می گوئیاں ہونے لگی تھیں کہ جھمکو ضرور دوسرا شوہر کرے گی۔ ابا کو بھی اس کا یقین آ گیا تھا۔ جھمکو کی سسرال میں بس اس کا پیہر تھا۔ وہاں بھی روز روز کے جھگڑے سے تنگ آئے ہوئے بیٹھے بوڑھوں کی زبان سے ایک دو بار آڑتی سی سُنی تھی کہ یکم بخت۔ رانڈ کہیں کالا منہ ہی کرے تو اچھا ہو۔

یہ سارا قضیہ اپنے بیٹے موتی کے لیے مفید ہو گا یہ احساس کرتے ہی ابا نے چپ چاپ بھیرو سے بات شروع کر دی تھی۔ بھیرو نے سخت الفاظ میں جواب دے دیا اور یہ طعنہ

"کون؟ جھمکو!"

"ملیاں کا کا — !" آواز اگرچہ بہت دھیمی اور سہمی سی تھی لیکن اس میں سکون کی آمیزش بھی تھی۔

"چل اُٹھ۔ اس باڑی کے کنارے کنارے آگے چل — میں تیرے پیچھے پیچھے آ رہا ہوں۔"

"کہاں چلو گے منوروا؟"

"کہاں؟ — جو سطے میں — پہاڑوں کی طرف۔ ٹھوکری نے کام سونپا اس لئے کرنا ہی پڑے گا! جوانی کے جوش میں اندھی ہو کر میں باتی اور اب سب کو دکھ میں مبتلا کر رکھا ہے" پھر کمبل کو ٹھیک سے اوڑھتے ہوئے بولے "دل تو یہ کہتا تھا آج تجھے مرنے ہی دوں۔ خیر چل آگے آگے —"

جھمکو آگے آگے اوٹ میں چلنے لگی۔ بیس پچیس قدم کا فاصلہ چھوڑ کر منوروا بھی پیچھے پیچھے ہو لئے۔

ہلکی لیکن بہت خنک ہوا چل رہی تھی جس کا خاموش بہاؤ جذبات کو ابھار رہا تھا۔ چاروں طرف کٹی ہوئی فصلیں یوں گویا سردی سے کانپ رہی تھیں۔ جھولدار کھیت کی رکھوالی کے لئے جاگ رہے تھے۔ وہ کپکپاتے ہاتھوں سے لکڑیاں لیکر الاؤ میں ڈال رہے تھے اور ہاتھ سینک رہے تھے۔ کسی کسی کھلیان سے دانت بجنے کی اور سردی میں "ای۔ای۔ای" کرنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ جنگل بالکل سنسان پڑا تھا۔ کسی جانور یا پرندے کی آہٹ بھی نہیں تھی۔ کبھی لمحہ بھر کے لئے گہرا سناٹا ہو جاتا، اور پھر اس سناٹے سے ایسی آوازیں، دھیمے دھیمے سُروں میں پھوٹتی تھیں جیسے کوئی خاموشی کا دریا بغیر رُکے مسلسل بہہ رہا ہو۔ رات کی گھنگھور سیاہی میں ستارے بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مبہوت ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی ستارا ٹوٹتا تو ایسا نظر آتا گویا ابر ظلمت ظلمات کو توڑنے کی سعی کر رہا ہو لیکن بالآخر تاریکی کے بھیانک ہاتھ اسے مسل دیتے تھے!

ایک کے بعد دوسرے کھیت کو پار کرتے ہوئے جھمکو چل رہی تھی، ناگاہ ایک آواز گونجی۔

"اے — کھڑی رہ!"

جھمکو وہیں ٹھٹک گئی اور سہمی ہوئی نگاہوں سے پیچھے دیکھا۔ تھوڑی ہی دور پر منوروا پیچھے جھکنے کے بعد پھر چلتے آ رہے تھے۔ رکھوالے نے دوسری ہانک لگائی۔

"ٹھہرو۔ تم یہاں کہاں سے آئی ہے؟" منوروا نے کچھ ہمت سے کام لیا لیکن جھمکو ڈر گئی۔ "اب کیا ہوگا؟"

منوروا نے جھمکو کے قریب آکر ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

"ارے تو چلتی رہ۔ گھبرا نہیں، وہ تو تجھے گلہری سمجھ رہا ہے۔ تیز تیز قدم اٹھا"

جھمکو کے پیروں میں پھرتی آ گئی منوروا کی ہدایت کے مطابق وہ کھیت کے کنارے چلنے لگی کبھی کبھی اس کی ساڑی کانٹوں میں اُلجھ جاتی تھی لیکن وہ ساڑی پھٹنے کی پروا نہ کرکے اسے تیزی سے کھینچ کر پھر آگے بڑھ جاتی تھی۔

کھیت ختم ہو گئے۔ ندی آ گئی۔ جھمکو کنارے پر کھڑی ہو گئی۔ منوروا نے کہا: "کھڑی رہ۔ میں ذرا ..." آگے آکر کچھ دور تک پہلے کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے ندی کا جائزہ لیتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پانی پینے کے لئے آنے والے بھیڑیوں کی جگہ ہے۔ پھر دونوں ڈھلان پر اترنے لگے منوروا نے کہا۔

"اب ساتھ ساتھ چل۔ کوئی ڈر کی بات نہیں۔"

جھمکو کو ڈر لگا۔ وہ بولی "کاکا اگر کوئی جانور پانی پینے کے لئے ....."

"تو میرے ساتھ ساتھ چل — میں ہوں تو گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

اگر اس وقت منوروا اور جھمکو میں سے کوئی بھی ذرا سا غور کرتا تو وہ سمجھ سکتا تھا کہ انسان اگر کسی چیز سے ڈر سکتا ہے یا اگر انسان کو کوئی چیز ڈرا سکتی ہے تو وہ انسان ہی ہے!

ندی کا چڑھاؤ چڑھنے کے بعد وہ گھور جنگل میں گھس چکے تھے مگر ان کی رفتار بتا رہی تھی کہ وہ گویا گھاٹی پھلانگ کر کسی گاؤں کے قریب آ چکے ہیں۔ آدھ گھنٹے کے بعد دور سے الاؤ کی لپٹیں نظر آنے لگیں اب منوروا نے قفلِ سکوت توڑا۔

"چھوری۔ تجھے دو چار دن یہاں جادو کے مندر میں

بہو بیٹیاں ہیں۔ جب گاؤں میں بات آئی گئی ہو جائے گی تو میں اسے
یہاں سے لے جاؤں گا!"

جھنکو نے سنورو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں — کاکا؟"

"کہیں بھی تجھے ٹھکانے تو لگانا ہی پڑے گا۔ جب شادی ہو گئی ہے تو ٹھنڈا ابھی ہے۔"

بیچاری جھنکو خاموش ہو گئی۔

ذرا دیر رک کر پھر سنورو نے کہا: "لیکن دیکھ یہاں تجھے بہت ہی سنبھل کر رہنا پڑے گا۔ اگر ذرا سی بھی لغزش ہوئی تو پھر میں ذمہ دار نہیں۔ تو جانے اور تیرا وہ قصائی گھر والا!"

پھر سنورو نے گول مول لفظوں میں یہ بھی جتا دیا۔ "دو چار دن میں ہی جھنکو کے گھر کا ٹھکانا ہو جائے گا۔" جھنکو نے بھی یہ سمجھ لیا سنور کاکا کسی اچھے گھر میں اس کا ٹھکانا کر دیں گے۔

اس پار سے سنورو کے پاس کوئی فقیر بیٹھا الاؤ سے تپیا کے لیے بیٹھا تھا۔ سنورو نے آہستے سے جھنکو سے: "تو ذرا یہاں بابا کے پاس بیٹھ۔ میں ذرا بابا کو باتوں میں لگا کر راضی کروں۔"

سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے سنور کاکا نے—

"کون ہے؟" تقریباً ۵۰ برس کے ایک سادھو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اور دھونی کی روشنی ہی میں آنکھیں گڑا کر دیکھ تو پہچان لیا۔ "سنور کھیا! تم اس وقت کیسے؟" پھر ادھر ادھر دیکھ کر "کیا اکیلے ہے؟" سنور کھیا دھونی کے پاس بیٹھ گئے اور ہاتھ لمبا کر کے تاپتے ہوئے بولے۔

"تمھارے پاس آکر جھوٹ نہیں بولوں گا مہاراج — لیکن" یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔

"یہاں آیا ہے تو بات بھی بتانی ہی پڑے گی۔" مہاراج ہنسے، بغل میں پڑا ہوا تمباکو کا بٹوا دیتے ہوئے بولے۔

"لے ذرا سلفہ بھر، کچھ گرمی آئے گی، پھر سب بات کہہ دینا۔" سنوروا نے چلم بھر کر پہلے مہاراج کو دی پھر خود پینے لگے۔ دھوئیں کے بادلوں میں چھپی ہوئی نظروں سے مہاراج کی طرف دیکھا۔ عمر تو مہاراج کی سنوروا کے برابر ہی ہوگی لیکن سفید داڑھی اور جٹاؤں سے تقریباً ڈیوڑھی نظر آتی تھی۔ ان کی گہری اور چمکتی ہوئی آنکھیں دھونی کی طرف لگی تھیں اس لیے سنوروا زیادہ دیر نہ دیکھ سکے۔ یوں تو انھوں نے مہاراج کو کئی بار دیکھا تھا باتیں بھی خوب کی تھیں مہاراج بھی جب کبھی سنوروا کے گاؤں میں آتے تو سنوروا سے ضرور مل کر جاتے تھے۔ اتنی شناسائی ہونے پر بھی سنوروا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی نظریں آج مہاراج سے کیوں نہیں مل رہی ہیں۔

سنوروا نے پھر آنکھیں اٹھائیں۔ مہاراج نے پوچھا "کیوں، آگ کیسی بھڑ گئی؟" اور پھر چلم ملک کو پکڑاتے ہوئے کہنے لگے "اب بتاؤ کیا بات ہے؟" اور پھر ایک ہنسی ان کے ہونٹوں پر کھل گئی جس میں یقین بھرا ہوا تھا۔

سنوروا کھسک کر ذرا قریب آ گئے۔ "بات یہ ہے مہاراج ..." کہہ کر بات چھیڑ دی پھر یہ بتایا کہ کیسے کبھی سرکاری کام کے سلسلے میں جو پٹواری گاؤں میں آتا تھا کس طرح اس سے جھنکو کی آشنائی ہوئی اور پھر وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر اس کے ساتھ بھاگ گئی۔ ان واقعات کا ذکر کر کے جھنکو کے شوہر کی بے رحمی اور قصائی پن کا قصہ بھی سنایا پھر یہ بھی کہا جھنکو کی ماں اور اس کے بھائی نے اسے میرے سپرد کر کے کسی ٹھکانے لگانے کی التجا کی ہے اور دوسری طرف تو تین گاؤں کی پنچایت بڑھئیوں کی برادری سب کے سب اس پر ہنگامہ کر رہے ہیں۔

"آپ کہتے ہیں مہاراج کہ کھیا کیسے آیا؟ اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟ اگر کچہری میں جاتا ہوں تو عدالت پھر اسی قصائی کو دے دے گی اور بالفرض اس کا شوہر وہ اپنے گھر رکھنے پر راضی ہو گیا تو کیا وہ اسے جینے دے گا؟ یہ کسی بڑھئی کے گھر میں بیٹھی ہوتی تو بات اتنی نہ بڑھتی۔ لیکن یہ، پتا ہے کتنی بڑی پنچ برادری ہو رہی ہے زبردستی جات!"

مہاراج بھی اداس دکھائی دیتے تھے بولے "یہ ذات پات کے جھگڑے بڑے ہیں۔" پھر کھیا کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگے "اب وہ لڑکی ہے کہاں؟"

"یہیں ہے مہاراج!" کہتے ہوئے سنوروا چلے اور لڑکی کو بلا لائے۔

"ارے رے، تم نے بیچاری کو ایسی سردی میں ٹھہرا رکھا تھا؟ بیٹھ جا بیٹا۔ آ ادھر آکر ہاتھ تاپ لے۔"

جھکو دھوتی سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ جاراج برابر اس سے قریب آنے لگا، تو اُسے کچھ کہتے سے گرو وہیں بیٹھی رہی۔ جاراج نے پیار بھری مگر ترش آواز میں کہا۔ "اری بدبخت، سردی میں ٹھٹھر کے کیوں مر رہی ہے؟" اور پھر خلا میں دیکھتے رہے۔

جھکو کی آنکھوں میں شاید آنسو تو ختم ہو چکے تھے لیکن آنسوؤں کی دھار کے نشان اور سُرخی اس کے چہرے پر صاف آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جاراج نے پوچھا۔

"ہاں تو پھر اس کا کرنا کیا ہے؟ اسے یہاں کیوں لائے کھیا؟"

"میں تو آپ کے حوالے کرنے آیا۔ اب آپ جانیں اور یہ جانے۔"

جاراج کچھ ہنسے۔ "تمھارے ہوش ٹھکانے ہیں نا؟ میں اس کا کیا کروں!"

"اور کیا کرتے۔ اسے جہاں مناسب سمجھیں ٹھکانے لگا دیں۔ مجھے تو اس سے زیادہ فکر گاؤں کے کنوئیں کی ہے۔"

"گاؤں کے کنوئیں کا ہے؟" "پہلے اسے اِدھر لانے ہو گیا؟ مگر کل کلاں کو گاؤں کے لوگوں کو پتہ لگ گیا کہ تمھیں یہاں آؤ گے اور اس پر اُسے منڈیر کو پھونک ڈالو گے! یہی سوچا۔"

اور پھر بڑے گمبھیر لہجے میں بولے: "کیا اسے اتنی دور بھی چین نہیں لینے دو گے؟"

"تو پھر اس کا کیا کیا جائے جاراج؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو کھیا؟" پھر کچھ سوچ کر بولے: "اس بے چاری کو کوئی اچھا سا ٹھکانا دیکھ کر لگا دو۔ کسی بھی ذات کا اچھا آدمی مل جائے۔ تم تو ضلع بھر کے ایک ایک گھر سے واقف ہو۔"

"یہی تو مصیبت ہے جاراج۔ اگر ضلع میں کوئی مل جاتا تو اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مگر ایک تو خوف سرکار کا۔ پھر آپس میں کھٹ پٹ ہوتی ہے، پرائی برادری کو گھر میں بٹھانے کے لیے کون تیار ہو گا۔"

"یہ تو اب تم جانو کھیا۔" اور جھکو کی طرف ایک نظر ڈال کر پھر بڑبڑانے سے لگے: "ہمارے پاس یہ علت کہاں سے آ گئی؟"

کھیا بولے: "ٹھکانا تو میں لگا دوں گا جاراج۔ ہماری طرف کے ایک سیٹھ احمد آباد میں رہتے ہیں۔ اُن کے ہاں ہمارے علاقے کا ایک پٹیل کال کے دانے سے رہتا ہے اسکا نام چھنیا ہے۔ اس نے وہیں شادی کر لی تھی جس سے ایک لڑکا ہوا۔ وہ پٹیل تو اب مر چکا ہے مگر اس کا لڑکا دیکھنے میں بھی خوبصورت ہے اور عمر کا بھی پختہ ہے۔ کچھ دن پہلے وہ سیٹھ ہمارے ہاں آئے تھے تو ذکر کرتے تھے کہ اس لڑکے کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈو، انھیں ذات پات کی فکر نہیں۔ لیکن جاراج۔۔۔"

"تو پھر اُسے کر کیوں نہیں دیتے؟" جاراج نے پوچھا۔

"لیکن وہ بھی وقت میسر ہو گا جاراج۔ آج کل تو میں گاؤں سے باہر نکل نہیں سکتا۔ لوگوں کو وہم نہ ہوتا ہو گا تو بھی ہو جائے گا۔ دو چار دن کے بعد، کچھ دن گئے بات ذرا آئی گئی ہو جائے گی۔"

آخرکار منوردا چار پانچ دن کے لیے جھکو کی دیکھ بھال کا فریضہ جاراج کے سپرد کر کے کھڑے ہو گئے۔ ابھی چبوترے سے اُترے ہی تھے کہ کچھ یاد آیا اور جاراج کے پاس آ کر بولے۔ "لیکن جاراج، اس بات کا پتا کسی کو نہ چلے مائی باپ! اگر وہ چار سال کے بعد بھی سرکار کو معلوم ہو گیا کہ جھکو فلانے ٹھکانے پر ہے تو دیکھنے والے کی آفت تو آئے گی ہی، مجھے بھی تارے نظر آ جائیں گے۔ مجھے تو صرف اتنا ڈر ہے کہ کہیں نیکی کر کے دھکے نہ کھانے پڑیں!"

جاراج کچھ ہنسے اور بولے: "بھروسا نہیں تھا تو اسے یہاں لائے کیوں؟" اور پھر کہنے لگے۔

"تم اپنی زبان قبضے میں رکھو تو بہت ہے۔" اتنے میں جاراج کی نظر جھکو کے پھٹے کپڑوں پر پڑی، دیکھ کر بولے "بیچاری کے کپڑے بھی کیسے پھٹے ہوئے ہیں!"

"وہ تو میں لیتا آؤں گا اس کی ماں سے۔ جب آؤں گا!" منوردا نے جھکو کو تسلی دی اور ہوشیاری کے ساتھ رہنے کا مشورہ دے کر چل دیئے۔

چبوترے کی سیڑھیوں سے اُترتے وقت محسوس ہو رہا تھا جیسے آس پاس بسنے والے لوگوں کے گھروں سے جو مرغوں کی بانگ آ رہی ہے وہ منوردا کے قلب کی دھڑکی صدا ہے، کُکڑوں۔ کوں!

خانہ تلاشی لے کر واپس آنے کے بعد موتی نے اپنی ماں سے کہا۔ "کچھ نہیں۔ کمودا بہاڑ نکلا چوہا! ماں تو نے جو کچھ کہا تھا سب جھوٹ تھا۔"

"ارے ہاں چاچا! افضل نے تمھاری آنکھوں میں دھول جھونک دی" اسما نے کہا۔

"تو بھی کیا بات کرتی ہے۔ منورہ! اگر افضل کرن ٹھگ سکتا ہے دادا کو گاؤں کے چودھری سے لے کر اس کے بیٹے تک کو الو کر دکھایا، پچھلے دروازے پر شور مچا کر کیا تھا۔ اور جو بچاری کی عزت خراب کی، اس کی ماں کو جو گھر کے کونے میں بیٹھی تھی ڈانٹ پھٹکار دیا۔ لیکن، وہ گھر میں ہوتی تو لیتی!"

"تو سچ کہہ رہا ہے؟" ماں کو کچھ کچھ اطمینان ہوا۔

لیکن موتی نے کچھ چڑ کر کہا۔ "ارے کیا سچ کہتا ہے؟ منورہ کا تو اسے بڑا بیٹھے بٹھائے نکالا تیری ماں تو دشمنی میں اندھی ہو رہی ہے لیکن تو بھی بالکل بے وقوف ہے۔ دیا کا کاسہ کہنے لگا، زندگی میں آج پہلی بار آنکھ نیچی کر کے ڈانٹ رہا ہوں، یہ تو میری بھی چپ اور تیری بھی چپ۔ والی بات ہے۔ لیکن اگر ذرا بھی بات اڑ گئی اور راجا کو معلوم ہو گئی تو ہم دونوں پھنس جائیں گے کسی کے گھر کی خواہ مخواہ تلاشی لینا مذاق نہیں ہے" کہتے ہوئے موتی کھٹیا پر لیٹ گیا اور بولا "ابھی تو کل صبح وہ تجھ سے لڑنے کے لیے آنے والے ہیں" اس آخری جملے سے اسما کے چہرے پر طمانیت و سکون کے جذبات نمایاں ہو گئے۔

اور صبح ہوتے ہی منورہ اپنے چچا آدھمکے۔ اسما کو ڈانٹا دیتے ہوئے بولے، "دیکھو اب اس جھگڑے کو کبھی مت پوچھنا کہ تو نے پہلے دیکھا تھا یا نہیں یہ تو ہمیں خود ہی سوچنا چاہیے کہ شاید اسے باس نے گھر سے نکال ہی دیا ہو گا، تب بھی کوئی اپنے گاؤں میں کیا منہ دکھانے آئے گا۔؟" اور اٹھتے اٹھتے کہا: "میں نے اس بچے کو دبا دیا ہے نہیں تو سرکار میں رپورٹ کر دیتا تو نکالی بکری، گھس گیا اونٹ، والی بات ہو جاتی۔ اس لیے یاد رکھو اب کسی کی بات پر کان نہ دھرنا آج کل تو اپنی آنکھوں دیکھی بات بھی جھوٹ ثابت ہو جاتی ہے" اور جاتے جاتے یہ بھی کہہ چلے کہ "یہ تو میں نے تمھاری صورت دیکھ کر کہہ دیا، ابھی کیا ہے ابھی تو لوگوں کی افواہیں سنتی جاؤ۔ کوئی کہے گا کھلیان میں دیکھا تھا کوئی یہ جھوٹ چھوڑے گا کہ ندی کے کنارے دیکھا تھا۔ تم کس کس کا کہا سچ جانو گی۔"؟

اسما نے بھی تسلیم کر لیا کہ منورہ کی بات بالکل صحیح ہے، اس کے بعد اس نے بات کرنے والے کو اس سوال پر "کہیں اسما جانی کل کی بات کا کچھ پتا لگایا نہیں؟"

"نہ تو کوئی بات کہی اور نہ اسے جھوٹ بولنے کا الزام دیا، غصے ہی؟"

"مرنے دے بہنا، بھاگ ہی آئے گی تو چھپے گی کہاں؟ اور نہ آئے گی تو ہمیں کیا مطلب۔ جو گئی سو گئی!" اور کچھ دنوں کے بعد جب وہ اپنے میکے گئی تو اس وقت بھی لوگوں نے کہا۔

"بہن سنا ہے کہ اس نے انکار تو کر دیا! لیکن پتا نہیں کہاں گئی، کیا تماشے گاؤں میں آ گئے ہیں؟" ان خبروں کا یا سوالوں کا جواب بھی سوائے اس کے کچھ نہیں دیا کہ —

"ایک بار بتا دینے کے بعد پھر اس کی بات کرنے سے کیا فائدہ" چونکہ گاؤں میں بھی کچھ کچھ بات پھیل گئی تھی کسی کھیت کے رکھوالے نے کہا کہ میں نے رات کو ایک عورت کو کسی شخص کے ساتھ اُتر کی طرف جاتے دیکھا تھا اور دوسرے نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی لیکن پھر دن بھر گھٹ گھٹ، بات کا یہ نتیجہ نکل آیا۔

"کچھ نہیں بہن، نہ تو اسما کو کچھ جانتی ہیں اور نہ منورہ کا کا نے ہی پھر کے گھر کی تلاشی لی ہے یہ تو سب افواہیں ہیں یہی غنیمت تھا کہ بات اڑانے والے کا نام نہیں لیا تھا ورنہ اس بچارے کی کھال بچپن کی بات یاد دلا کر کہتی" وہ بچارا تو بچپن سے ہی جھوٹا پیدا ہوا ہے!"

چوتھے دن تو گاؤں میں ایسا لگتا تھا جیسے جھکو کے آنے کی کوئی افواہ اڑی ہی نہیں تھی۔

اگرچہ اس حادثے کو دوسرے سینکڑوں حادثات کی طرح لوگ بھول گئے لیکن ایک شخص اس کو نہ بھول سکا اور غالباً اپنی زندگی بھر بھولے گا بھی نہیں، اور وہ تھی جھکو کی ماں!

یا تو اس نے جھکو کو نو مہینے تک پیٹ میں رکھا تھا یا آج اتنی بڑی دنیا میں جھکو کے لیے کوئی جگہ نہیں! اگر ماں کا بس چلتا تو پھر وہ جھکو کو اپنے پیٹ میں چھپا لیتی۔ لیکن اب ان سب باتوں سے کیا فائدہ؟ — جھکو کی ماں کے منہ میں ایک لقمہ نہیں چلتا تھا لیکن لڑکے اور بہو کے ڈر سے زہر مار کر لیتی تھی اور وہی لوگوں کے سامنے بناوٹی ہنسی ہنسنا بھی پڑتا تھا۔ اس نے اس عالم میں دو دن تو گزار دیے لیکن تیسرا دن کاٹنا دوبھر ہو گیا، سارے دن وہ منورہ کی اور ان کے گھر والوں کی چوکسی کرتی رہی کہ کب منورہ بھائی اکیلے ہوں اور وہ اس سے جھکو کی خیر پوچھے۔

آخر دوپہر کے بعد ایک موقع مل گیا۔ جمنا نے اچھی طرح دیکھا تھا کہ سویرے ہی ڈھور نکلنے سے پہلے منورما کا لڑکا کلو کھیت پر چلا گیا تھا اور ابھی ابھی دوپہر کا کھانا لے کر اُن کی گھروالی بھی نکل گئی تھی۔

جمنا مٹھے کی ہانڈی لے کر باہر نکل گئی۔ راستے میں ایک دو گھروں کے پیچھے چکر لگا کر وہ سیدھی منورما کی چوپال میں آ گئی۔ اور اس طرح چاروں طرف دیکھا جیسے کہ چوری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے پھر ایک ٹوٹی ہوئی رسّی کو کریدنے کے بہانے منورما کے پاس آ گئی۔

منورما نے اس کی طرف دیکھا۔ جمنا دوپٹے سے منہ چھپائے دیکھتی رہی۔ کیا بولیں یا کیا پوچھیں۔

یہ طے کرنے سے پہلے ہی منورما بول پڑے۔

"تم مٹھا لینے آئی ہو جمنا بھابی! لیکن یہاں کوئی ہے نہیں، تھوڑی دیر بعد آنا تو......"

جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی جمنا نے ایک دم پوچھا۔

"ایں، منورما لالا وہ بھاگوں جلی کہاں ہے؟ اس کا کوئی ٹھور ٹھکانا....؟"

منورما نے قدرے جھلاہٹ سے کہا۔

"بھاڑ میں پڑی ہے اور کہاں....؟" پھر آنکھیں نکال کر بولے "مہربانی کر کے تم گھر چلی جاؤ، کسی کو شک نہ ہوتا ہو تو بھی...."

نہایت کوشش کرنے پر بھی جمنا اپنے آنسو نہ پی سکی اور اس کی آنکھوں سے آنسو اس طرح بہہ نکلے جیسے یہ کسی دوسرے کی آنکھوں سے نکل رہے ہوں۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولی۔

"اتنا تو بتلا دو منورما لالا، وہ زندہ ہے یا...." اور باقی الفاظ سسکیوں میں کھو گئے۔ منورما کے چہرے پر جذبات کی پرچھائیاں اس وقت دیکھنے کے لائق تھیں، وہ کراہتے ہوئے بولے۔

"یہ تو ناداں کی دوستی جی کا جنجال ہو گیا۔" اور کواڑ کھول کر اندر جانے لگے۔

جمنا نے مٹھا لینے کے بہانے رسوئی گھر میں جاتے ہوئے منورما سے پھر پوچھا۔

"ایں، منورما لالا...... وہ ہے تو...... زندہ یا...... نا؟"

منورما جھلا اٹھے "ایک بار کہہ تو دیا کہ مر گئی۔" پھر بڑے تیکھے لہجے میں چمک کر بولے۔

"اس کلموہی کی خبر پوچھتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟ تمہاری زبان کیسے کھل جاتی ہے" اور رسوئی گھر میں جاتے ہوئے بولے "اللہ میری اس بیٹی کو کبھی ساتھ گھونٹ دیا ہوتا!"

پھر مٹھا لے کر باہر نکلے۔ اس کی ہانڈی میں مٹھا ڈالتے ہوئے جمنا کی طرف دیکھے بغیر، جو آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی اور سسکیاں بھر رہی تھی، نرمی سے کہا۔

"ابھی تم جاؤ۔ پوچھنا ہی ہے تو دو دن بعد آنا۔" پھر ایسے کہنے لگے جیسے خود بخود بات کر رہے ہیں "ہماری عقل سالی کیا ماری گئی جو اس جھگڑے میں کود پڑا۔"

"لیکن مجھے اس کی کوئی خبر......"

منورما آپے سے باہر ہو گئے "کہہ تو دیا ابھی فضیحتہ کیا چاہتی ہے، اب تو کرے گی!" پھر کچھ منت سماجت کے انداز میں بولے "مہربانی کر کے تم چلی جاؤ۔" اور برتن رکھنے کے لئے اندر جاتے ہوئے "لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ باپ جیسا بیٹا اور ماں جیسی بیٹی ــ مجھے تو یہ حیرت ہے کہ اُسے لڑکی کہنے کے لئے اس کی زبان کیسے کھلتی ہے۔"

جمنا نے بڑی مشکل سے سسکیوں پر قابو پایا۔ پھر بولی "چاہے جو کچھ ہو.... پھر بھی تو بیٹی.... پیٹ میں رکھا ہے.... کیسے بھول جاؤں؟"

"اس کی جگہ اگر پتھر رکھا ہوتا تو اچھا تھا کم سے کم ہمارے تمہارے کپڑے دھونے کے کام ہی آ جاتا۔" پھر کواڑ بند کرنے کے لئے اٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

"اچھا اب چل دو۔ کواڑ لگانے دو۔ کوئی سن لے گا تو بھی...."

جمنا نے مٹھے کی ہانڈی اٹھاتے ہوئے پھر ہمت کر کے کہا

"اتنا تو بتا دو منورما لالا، ہے تو یہیں آس پاس نا؟"

"جہنم میں گئی منورما لالا" یہ کہہ کر کواڑ لگائے بغیر ہی چوپال میں پڑی ہوئی کھاٹ پر بیٹھنے کے لئے مڑے۔ "ایسے ہی لاڈ چاؤ سے تو لڑکی کو خراب کر دیا۔ اب کچھ کمی رہ گئی ہو تو زیادہ چاؤ چوچلے کر کے غریب بچارے کے پوتوں کو بھی بگاڑ دو۔ تو کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔!" پھر رسّی بٹنے کا شغل کرنے لگے۔ باہر نکلنے لگی تو جمنا کے کانوں میں آواز آئی۔ "اتنا فضیحتہ ہونے پر بھی ماں کو شرم نہیں آتی۔ پھر لڑکی کا تو کہنا ہی کیا" دوسرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سنائی نہ دیئے پھر بھی جمنا سمجھ گئی کچھ بھی کرو "آخر ذات کے کمین ہو....."

جمنا کا یہ حال تھا کہ جی کی ماں کوٹھی میں منہ دے کر روئے وہ کتنی ہی بھولی اور بدکار سہی "ماں جیسی بیٹی" والے طعنے پر تو بھڑک ہی اٹھتی لیکن اس وقت وہ مجبور تھی چوپال سے اترتے وقت اس نے

جمنا کے آنسو سوکھ گئے تھے تعارف بھی ساکت ہو گئی تھی۔ وہ بولی "کیسا
بہت ستاتا ہے بیٹا۔ جمنا آگئی تو نیند۔ تب تجھے کیا؟ بھلے بھاگ
لے کسی شیطان کے ہاتھ بیچ دیا....."

بچہ ایک دم اس طرح ہوا جیسے وہ تنگ آ گیا ہو۔ "ماں جیسی میرے
بچپن سے گھر میں بیٹھنا ہے تو جینے دے...."

"بیر بیٹا۔ جدھر بھی سنبلو چلوں چلو۔" ماں کی آواز میں تلخی اور
غصہ شامل تھا یا کچھ بے نیازی بھی شامل ہوگئی "بیر بیٹا۔ شکر ہے بیر۔
اب بھی اگر کوئی الجھن ہو تو میں بھی تمہارا راستہ الگ ڈھونڈ لوں گی۔
پھر....."

"ماں..... تجھے کس نے جلایا ہے۔ تیرے پیر پڑتا ہوں
تو اٹھ جا۔ یہاں سے۔ میں کل پوچھ آؤں گا لیکن اس وقت چلی جا۔
ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں...
کس نے میرے بچے....."

"کل کیوں پرسوں جانا؟" طنز، نگاہوں سے دیکھتے ہوئے
جمنا نے کہا۔ "تو تو ضرور پوچھنے جائے گا! تیری شکل ہی کہہ رہی ہے۔"
پھر کھڑے ہو کر کہنے لگی "میں خود ہی جاتی ہوں، دیکھوں آج وہ کیسے
جواب نہیں دیتا۔"

ماں کے الفاظ سے زیادہ اس کی صورت دیکھ کر بچہ گھبرا گیا۔ وہ
کھڑا ہو کر بولا۔

"تو فکر کیوں کرتی ہے ماں؟ میں ضرور پوچھ آؤں گا!"

ماں کچھ رک کر بولی "پھر کب؟ جب وہ کہیں ٹھکانے لگ جائے گی تب؟"
یہ کہکر چلنے لگی۔ بچے نے سامنے آکر راستہ روک لیا۔ "یہ کوئی پوچھنے کا طریقہ ہے
ماں؟" اس نے دیکھا کہ ماں نے اس کے احتجاج کا مطلق اثر نہیں لیا اور چلنے
لگی۔ بچے نے کہا "سچ کہتا ہوں ماں کہ میں گھر میں آگ لگا کر نکل جاؤں گا۔ مجھے
زیادہ تنگ نہ کر بھی!"

اس وقت دوسرے گھر کے کواڑ کھلنے کی آواز آئی۔ شاید بیچر کی گھروالی یہ
سب سن رہی ہوگی وہ ان دونوں کے سامنے آکر بولی "کیوں اپنے ہاتھوں اپنا
مذاق اڑواتے ہو؟" اور ساس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی بولی "بیٹیا نے تو
نصیحت کرا لی ہے تم اور ڈھول پیٹنے چلیں! اوہو! ہو۔ بیٹیا کے بغیر تو جیسے سورج
ہی نہیں نکلے گا! ...چلو، سو جاؤ۔"

چپ چاپ.....!" اور گھر کے کواڑ بند کر دیئے۔ بچہ ماں ماں پکارتے ،

سے لگی بچی کی بہو نے اسے اچھی طرح پیٹ کر کھاٹ پر لٹا دی ہوگی۔
ساس کو ستانے کے لئے یہ بھی کہا "لاڈ کرنے والے اور بھولے
تنا کو پھر پروڈ کرو دیکھو گی ۔۔ ہاں!"

لیکن اس وقت جمنا کا دھیان بہو کی باتوں میں یا بچے کے رونے
میں نہیں تھا۔ وہ تو دنیا کے کسی نامعلوم گوشے میں اپنی آنسو بہاتی ہوئی
بٹیا کا تصور کر رہی تھی آنکھوں سے بہتی ہوئی آنسوؤں کی دھار کا بھی
شاید دھیان نہ ہوگا۔ اس کے دل میں یہ کوئی خیال آتا کہ جیسے
ہوا سے گھسیٹ جا کر اس کے دل میں لوگوں کی پرواہ کے بغیر
روکے جواب دینے والے شور کو وہ کوئی کاٹتی ہے۔

× × × × × × ×

کہہ بولی اور جمنا مکھیا کے گھر بھی پہنچی، لیکن وہ گھر نہیں تھے۔ ان کی گھروالی
نے کہا "جمنا بھابی وہ تو کل شام سے تحصیل گئے ہیں۔" جمنا کے قدم
جیسے وہیں گڑ گئے ہوں۔ اس کے بدن سے جیسے جان نکلے گی ہو اس
نے پوچھا۔

"واپس کب آئیں گے؟"

مکھیا کی گھروالی نے پان کی ڈبیہ جمنا کے سامنے رکھتے ہوئے
جواب دیا۔ "کچھ خبر نہیں بھابی۔ کہتے تھے کہ شاید دیوان صاحب
کے پاس بھی جانا پڑے۔ ... کا مقدمہ ... جھگڑا پڑا ہوا ہے
۔۔۔ تم بیٹھو تو سہی!"

"نہیں اب تو جاؤں گی۔" جمنا مشکل سے کہہ پائی لیکن چلتے چلتے پھر
پوچھا۔

"کب تک لوٹیں گے؟"

"کیا بتاؤں بھابی۔ شاید دو دن میں آجائیں۔ اور نہ آئے تو پانچ دن
نہ آئے۔ سرکاری کام کا کوئی ٹھکانا تھوڑا ہی ہوتا ہے!"

جاتے ہوئے بھی جمنا نے پوچھا۔ "اکیلے ہی گئے ہیں یا گاؤں کا کوئی دوسرا
آدمی بھی ساتھ تھا؟"

"کیا کہتی ہو۔" مکھیا کی گھروالی نے ڈبیہ سے پان نکال کر منہ میں رکھتے
ہوئے کہا "کل ہی چوپال میں گاؤں کے آٹھ دس آدمی جمع تھے۔ اس وقت
انھوں نے جتیرا کہا کہ ۔۔۔ ارے بھیا ایک آدھ تو ساتھ چلو، لیکن
سب ہی چپ سادھ گئے ۔۔۔ دیور بھائی سے تو بہت کچھ کہا۔ لیکن
وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ کون اپنے گھر بار چھوڑ کر جانے کو

ایک لمبی سانس بھر کر خون کا سا گھونٹ پی لیا۔ آنکھیں پونچھ کر چہرے پر مصنوعی ہنسی بکھیر لی اور سر جھکا کر آہستہ سے گلیارے سے گزر گئی۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا تو پھر آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور مٹکے کی ہانڈی رکھتے رکھتے دل بھر آیا۔ وہ چکی کے پاس بیٹھ گئی اور سسک سسک کر رونے لگی۔ ایک ہی خیال ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ میں چوٹ لگا رہا تھا اور رہٹ کی طرح دل چھید رہا تھا۔ حرام زادے نے لڑکی کو نہ جانے کہاں غائب کر دیا۔ کسی کے ہاتھ بیچ دیا ہوگا...."

اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا اس لئے جی بھر کر روئی۔ رونے سے نمٹی تو ڈھور باندھے، بھوسے ڈرے سے تھوڑا سا کھانا احتیاط سے نکالا اور سوکھا سا منہ لے کر الاؤ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ جب ضبط نہ ہوا تو بیچو سے بولی:

"بیٹیا تو سوڑ کا کا سے پوچھ تو دیکھ..."

"کیا پوچھوں"؟ بیچو نے لیے رنگ کے انداز میں کہا جیسے وہ خود سمجھ رہا ہے کہ میرا یہ سوال فضول ہے۔

جمنا نے سوچ سوچ کر کہا۔ "یہی کہ وہ بھاگوں جلی سہے کہاں؟ زندہ ہے یا ---؟"

"مر گئی ہوگی تو کیا بگڑ جائے گا۔" پھر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

ماں نے پوری طاقت سے سانس کھینچ کر کہا "مر گئی ہوتی تو رونا ہی کس بات کا تھا!

پر تو ذرا پوچھ کے تو دیکھ"

"یہ آخر تو کیا سوچ کر کہہ رہی ہے ماں؟" پھر آنکھیں جھپکا کے بولا "میں کیا منہ لے کر پوچھنے جاؤں"!

ماں بڑے غمگین اور مایوسانہ لہجے میں بولی "ہائے رام۔ تو ایسی بات کیوں کہتا ہے۔

بیچو رہا --- ذرا سوچ تو سہی کیسی بھی ہو آخر ہے تو تیری سگی بہن۔ جب تو بچہ...."

بیچو بگڑ گیا "بہن؟ کیسی بہن؟ جب تھی، تب تھی، اب اس سے میرا کوئی رشتہ ناتا نہیں کان کھول کے سن لے۔"

ماں ناک صاف کرتی ہوئی بولی "ہماری کیا رشتہ ناتا۔ ناتا نہیں رکھتا مت رکھ مگر اتنا تو پوچھ سکے...." وہ رونے لگی۔

بیچو کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا "تجھے غرض ہو تو پوچھ آ --- بڑا بہن نے نیک کام کیا ہے جو میں پوچھنے جاؤں گا!" پھر ماں کی طرف ہاتھ اٹھا کر نفرت آمیز لہجے میں کہا: "تجھے ذرا سی بھی غیرت ہو تو اب کبھی اس کا نام بھی زبان پر نہ لانا!"

"کیوں نہیں لاؤں۔ ضرور لاؤں گی۔ آخر وہ میری بیٹی ہے اور میں اس کی...."

بیچو کی رگ رگ میں جیسے زہر گھول دیا گیا ہو۔ وہ دانت پیس کر بولا "غصہ تو اتنا آتا ہے کہ ماں بیٹی دونوں کو.... لیکن کیا کروں۔ سہم کے رہ جاتا ہوں۔"

"تیرے بھاؤں تو وہ مر گئی۔ لیکن نہ جانے بیچاری کہاں.... کس کے پاس...."

ماں کی ان باتوں سے بیچو پیچ و تاب کھا رہا تھا غصے سے اس کا بدن کانپنے لگا۔ دانت پیس کر بولا۔ "سامنے سے چلی جا کہیں جا کر گرو بھر جس سے تجھے چین تو آ جائے۔"

کچھ توقف کر کے بولا "کیا پوچھتا تو نے ہی اسے بگاڑ رکھا۔ میں ہمیشہ کہتا تھا کہ اس رنڈی کو دے بیس یہ دو تین روز میں چلی جائے۔ لیکن تو مانے تب نا؟ میں جانتا تھا کہ اس نے منہ پر کلنک لگوا کے چھوڑنا!"

پھر سانس لینے کے لئے رکا اور ماں کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔

"تجھے تو یہاں گھر میں بیٹھنا ہوتا ہے اس لئے اپنی بٹیا کو سر پر چڑھا لے گئی میں تو پانچ پنچوں میں جا کر بیٹھتا ہوں جو بات ہوتی ہے۔ مجھے ہی جھلنا ہے کہ لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اور کیا کیا انگلیاں اٹھتی ہیں۔ مجھ میں جواب دینے کی ہمت نہیں تو انگلیاں آپ ہی اٹھیں گی۔

کون سا ہے وہ دھنے کو دھویا سا جا کا بیٹا....؟"

"سب ہمارے ہیں! لیکن اس سے مجھ کیا؟" پھر تن کر بولا "تجھے خبر ہے؟ اب تک پنچوں میں بیچو کی چلتی تھی سب اس کی بات مانتے تھے ذرا سی بات ہو تو بیچو سے پوچھنے آتے تھے لیکن...." دانت پیس پیس کر وہ آگ اگلنے لگا "لیکن تیری لاڈلی نے جو کچھ کیا سو کیا۔ اس نے مجھے منہ دکھانے قابل نہیں رکھا۔ تو بیٹا بیٹیا کیا کرتی ہو؟

اس نے تو میری سات سات پیڑھی کی کمائی...." اور غصے میں بات لٹکا کے ہاتھ کیا کرنا۔

...." پھر کچھ ٹھنڈا ہو کر آپ ہی بولا "ہونہہ --- اگر میں اس بہن کی خبر لینے جاؤں تو لعنت ہے۔

مجھ پر ---!"

نہ کرتے لیکن کسی خیال میں ضرور کھو جاتے۔

تھوڑی دیر بعد مہاراج پھر بولے "بڑی سیدھی لڑکی ہے"
اتنا کہہ کر منورما کی دی ہوئی چلم منہ سے لگالی اور جیسے کوئی انجن
آرام سے کھڑا ہوا تھوڑا تھوڑا دھواں نکالتا رہتا ہے اس طرح
وہ چلم پیتے رہے۔ پھر منورما سے یہ تذکرہ چھیڑا کہ وہ کب اور کہاں جانے
والے ہیں۔ انھوں نے جھنکو کے لئے کچھ ہدایتیں اور مشورے دیئے
جھنکو نے دو چار دن کے قیام میں ہی مہاراج کے دل میں گھر کر لیا
تھا اور مہاراج کو بھی اپنی بیٹی کی طرح بلکہ اس سے بھی شاید کچھ زیادہ
اس کی فکر رہنے لگی تھی۔

جھنکو کی بے سہارا زندگی دیکھ کر اُن کا اور بھگوان کا ناتا کچھ ڈھیلا
پڑنے لگا تھا دنیا کی ہر شئے اور بدی کا تعلق براہ راست بھگوان سے
سمجھنے والے مہاراج کو بھگوان کی بے رحمی نظر آئی تھی اور وہ دل
ہی دل میں سارا غصہ سماج پر اتارتے تھے۔ آخر میں وہ بھگوان سے
بھی بیزار نظر آنے لگے۔ "سمجھ میں نہیں آتا بھگوان! یہ سماج کتنا بڑا
شیطان ہے، انسان اس سے ڈرتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے اپنے
بچوں کو تباہ کر دیتے ہیں، مگر کیا تو بھی اس سے ڈرتا ہے؟" ایسے ایسے
کتنے ہی خیال اُن کے دل میں آتے تھے۔

مہاراج نے کملیا کو چلم دیتے ہوئے کہا "تم سو جاؤ کملیا۔ میں
مرغے کی پہلی بانگ پر ہی جگا دوں گا۔" اور پھر خود بھی لیٹ گئے۔ آنکھیں
تو بند کر لیں مگر دل ان کا بے چین تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اتنے برسوں کے
بعد بھی ان کا دل کوئی سکون کا گوشہ تلاش کر رہا ہو، کسی گرم آغوش کی
تمنا یا زندگی کا کیف برساتی ہوئی کسی کی آنکھوں کو یاد کر رہا ہو۔

کمبل اوڑھے مہادیو کی بغل میں پڑی تھی۔ اُسے خود بھی شاید یہ
خبر نہ ہو گی کہ وہ جاگ رہی ہے یا سو رہی ہے، لیکن بیقراری جاگ رہی
تھی۔ "اب مرغا بولے گا، اب اُٹھ کر چلنا پڑے گا۔" جھنکو ایک دم
چونک کر اُٹھ بیٹھی اور دوبارہ آواز سننے کے لئے کان لگا کر بیٹھی رہی
جب کوئی آواز نہیں آئی تو اضطراب کچھ کم ہوا۔

پھر — جیسے دور سے آتے ہوئے کسی شخص کی راہ دیکھ رہی ہو۔
مرغے کی آواز پر کان لگے ہوئے تھے۔ "وہ بولا — !"

اور پھر تو سچ مچ مرغے کی بانگ سنائی دینے لگی، پہلی، دوسری
پھر تیسری — اس نے آوازیں گن بھی لیں — اگرچہ جھنکو کچھ بولی
نہیں لیکن تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے
سینے سے کچھ کہہ رہی ہو،

"ہٹ حرامزادے — بولا، تو خیر گزری، تھوڑی دیر بعد بولتا
تھا نا،" مرغے کی آواز نے، جو آرتی کے بلیے کی طرح معلوم
ہوتی تھی، جھنکو کو مایوس اور بے طاقت کر دیا۔

مہاراج سے پہلے ہی منورما کی آنکھ کھل گئی اور جلدی سے
جھنکو کو بھی جگا دیا۔ باہر نکلتے ہوئے بولے "ذرا جلدی کر، منہ دھونا
ہو تو دھو کر تیار ہو جا۔"

بس جلدی چل — کپڑے نہ بدلے ہوں تو کوئی بات نہیں۔ لائے
ہیں تو پرانے ہی چلیں گے۔ اور پھر جہاں سوتے تھے وہاں سے
کپڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی اٹھا کر دیتے ہوئے بولے "لے باندھ
لینا۔ چل، جلدی کر۔ ذرا ٹھہر، میں دیا جلا لوں"

دھونی میں سے ایک سلگتی ہوئی لکڑی اٹھا کر دیا جلایا اور جھنکو کو
دے دیا۔

مہاراج بھی جاگ کر تخت پر بیٹھ گئے تھے۔ منورما کی بھری ہوئی
چلم کا دم لگاتے ہوئے دروازے میں کھڑی جھنکو کی طرف دیکھ کر بولے

"ارے، تو نے کپڑے نہیں بدلے؟ ایسے کپڑے پہن کر راستے
میں کیسے جائے گی! جا بدل لے۔"

منورما کچھ بولنا ہی چاہتے تھے کہ جھنکو کو اندر جاتے دیکھ کر خاموش
ہو گئے۔ کچھ دیر بعد جھنکو کپڑے بدل کر آ پہنچی۔

منورما کی نظر اس پر پڑی، مگر ایسے ہو گئے گویا کچھ بھی نہیں
اور لکڑی سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ بولے "اب چلوں مہاراج!"

دنیا میں ایسی بھی محبت ہوتی ہے جسے نہ وقت کی ضرورت
ہوتی ہے نہ آبیاری کی۔ اور نہ کوئی دوسری پروان چڑھانے والی
چیز درکار ہوتی ہے۔ انھیں زمین کی زرخیزی اور آب و ہوا کی
بھی پروا نہیں ہوتی وہ تو جب اور جہاں چاہیں پھوٹ نکلتے ہیں
اور لمحہ بھر میں اچھا خاصا تناور درخت بن جاتے ہیں۔ جھنکو کے
معاملے میں مہاراج کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ دنیا کی مایا سے
بے تعلق رہنے کے لئے جنگل میں قیام کرنے والے اس ویراگی کے
دل میں مایا کا بیج پھوٹتے ہی وہ وارفتہ ہو گئے اُنھوں نے آنسو
بہاتی ہوئی جھنکو کو سینے سے لگایا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے

سنا تھا جہاں ... ان آنکھوں سے وہ جلتا آنسوؤں کو اپنے سر پہ جگہ
سے ہوئے جھمکو سسکیاں بھرنے لگی۔ ظاہر میں یہ منظر ایسا لگ
رہا تھا جیسے ... باپ مانے والے باپ کو رخصت کر رہی ہو، لیکن
... طور پر بہت فرق تھا۔ جھمکو نے اپنے بزرگوں سے اپنی
سہیلیوں سے اور دوسری چیزوں سے دوبارہ ملنے کی اُمید بھی تھی
امکان بھی تھا اور اس لئے کچھ اطمینان بھی ہوگا لیکن جھمکو کے لئے
تو ان چیزوں کا بھی نہیں تھا۔ گاؤں کی سہیلیوں نے تو ایک طرح اُسے
رخصت ہی دیا تھا اور آئندہ اُن سے ملنے یا انہیں دیکھنے کی کوئی اُمید
بھی نہیں تھی۔ جب وہ گھاس لینے آتی تب ان درختوں پر چڑھتی
تھی کھیل کود کرتی تھی، وہ کبھی کبھی یہاں سکھیوں کے ساتھ گاتی بھی
تھی اس جنگل کو اور اس کو لوگوں ... ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہی تھی
اب تو اس علاقے میں آکر جانا کبھی اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس
کے تمام روابط اور تعلقات یہاں سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہے تھے۔

پھر آس پاس پھیلے ہوئے چیڑوں سے مرغوں کی بانگ سنائی
دی کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے منورو نے کہا۔

"مہاراج! اب آشیرواد دو۔ ہم چلیں!"

جھمکو کو چھوڑتے ہوئے مہاراج بولے "میں کیا آشیرواد دوں گھتیا!
یہ جو تیرے آنسو ہیں، یہ آنسو ایسی جگت بہہ رہے ہیں کہ یہ آنسو
ہی اپنی مصیبتوں کو دھو دیں گے" کچھ رُک کر بولے "اور اگر نہ دھو سکے تو..."
آگے نہ بول سکے یا بولنا مناسب نہ سمجھا تو وہ چپ ہو گئے۔

منورو ان باتوں کا مطلب سمجھے بھی یا نہیں یہ تو کون جانے لیکن قدم
اُٹھانے سے پہلے بولے "کہہ دے مہاراج! اور پھر ہاتھ اُٹھا کر "اچھا تو
نارائن مہاراج" کہتے ہوئے چلنے لگے۔

مہاراج جھمکو کو سینے سے لگا کر مشکل سے کہہ سکے۔

"جا بیٹی ۔۔۔ بھگوان پر بھروسہ رکھنا وہی سنبھالے گا۔"

"میری ماں سے ۔۔۔۔"

جھمکو آگے نہ بول سکی اس نے پیٹھ پھیر لی، مہاراج نے کہا "اچھا اچھا
تو جا۔ وہ تو میں اُسے سمجھا دوں گا، سب بات کر دوں گا!" پھر منورو سے کچھ
سفارش کر کے جھمکو کو بھی نصیحت کی۔

"بیٹی پردیس میں جا کر ایسا کچھ نہ کرنا جس سے لوگ تماشا دیکھیں
فکر نہ کرنا منورو کا تیرے باپ جیسا، تیرے ساتھ وہ خود بھی تیرا

ابھی سے تماشا کر دے گی۔ جا بھگوان تیرا بھلا کرے!"

اس کے بعد دیر بھی نہیں ہوئی تھی پھر بھی نہ جانے کیوں منورو کے
دل میں ... ... مہاراج کو پھر سے
پرنام کر کے چلنا شروع کر دیا!

جھمکو پیچھے چلنے لگی۔

جب تک وہ دونوں جھاڑیوں کی اوٹ میں نہ چھپ گئے تب تک
مہاراج کھڑے کھڑے اُن کی طرف دیکھتے رہے پھر ایک لمبی سانس بھر کر
سوچتے رہے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا، قدرت کے ہر معاملے میں کچھ نہ کچھ بھید ہے!"
اُن کے چہرے پر عجیب تاثرات پیدا ہونے لگے۔ جن میں شکوے کے
خطوط بھی شامل تھے۔ اسی لئے تو اس میں اتنا مزہ ہے۔ لیکن
پھر ... سے جھمکو کی یاد آئی اور دل میں اُترتی چلی گئی۔ وہ ٹھنڈی
سانس بھر کر رہ گئے۔

اور جنگل پار کرتے، گھر چھوڑ کے جانے والی جھمکو کی آنکھ
سا ... کچھ حساب ہی نہ تھا۔ پچھلی رات کا چاند جو کچھ ہی دیر پہلے طلوع
ہوا تھا اب اپنی دھندلی روشنی بانٹتی جا رہی ... جھمکو کی بینائی پر بیٹھک
رہا تھا۔ لیکن جھمکو کا راستہ اس کی لمبی پرچھائی سے تاریک ہو گیا تھا۔
چونکہ جھمکو کی زندگی کے جذباتی سفر کا راستہ اس سے زیادہ تاریک تھا
اس لئے وہ اس وقت راستے کی تاریکی پر فکر مند نہیں تھی۔ آنکھوں
سے بہتے ہوئے آنسوؤں کی دھار کا بھی اُسے خیال نہیں تھا۔ صرف
ایک بات کی فکر اور خیال تھا اور وہ یہ کہ ہر ہر قدم وہ اپنے وطن
سے دور ہوتی جا رہی ہے، بے تعلق ہوتی جا رہی ہے!

سکھ دُکھ کے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی زندگی میں جن
باتوں کا اُسے کبھی دھیان بھی نہ آیا تھا ان کی حقیقت اس وقت معلوم
ہو رہی تھی۔ سارا جنگل اس کے درخت، یہ پگڈنڈیاں، یہ سب
کچھ ابھی تک تو اس کے تھے لیکن اب یہ دیکھنے کو بھی نہیں ملیں گے۔
اپنی ماں اور وطن کی محبت کا صحیح اندازہ تو وہی کر سکتا ہے۔ جو کبھی وطن سے
دور رہا ہو۔۔ یا ہمیشہ کے لئے اُسے جدا ہونا پڑ رہا ہو۔ آنسوؤں
سے قیمت ادا کرنے والی جھمکو، اپنے گمبھیر چہرے سے، اور گہری محبت
بھری آنکھوں سے اُن درختوں کو دیکھتی اور نگاہوں کی زبان سے
کہہ رہی تھی ۔۔۔ الوداع کر رہی تھی!

"اگر میری ماں کبھی دن ادھر آئے تو کہہ دینا کہ جھمکو کو ہم نے دیکھا تھا وہ اسی راستے سے گئی ہے"۔ . . .

تقریباً چھ برس فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ دونوں ندی کنارے آرام کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ منوروا نے ماچس جلا کر چلم سلگائی۔ اُن سے ذرا فاصلے پر، ایک پتھر پر پاؤں سمیٹے ہوئے، ایک ہاتھ ٹیکے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں لی ہوئی ٹہنی سے پتھر پر لکیریں کھینچتی ہوئی جھمکو بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر جذبات اُمڈ رہے تھے۔ منوروا چلم کا کش پیتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہے تھے، کچھ دیر بعد بولے:

"دیکھ بٹیا، میں تیرے ساتھ تو آ رہا ہوں، لیکن پردیس میں فضیحت نہ کرانا، اگر ایسی بات ہو تو پہلے سے ہی کہہ دینا، کبھی مجھے نیچی کر کے جوتے کھانے پڑیں!"

"ماں کچھ کہتی تھی منوّا کاکا؟" جھمکو نے سر اٹھائے بغیر ہی پوچھا

"اور تو وہ بے چاری کیا کہتی، کہنے لگی، تم کسی بھی طرح اس کا راستہ نکالو نہیں تو اس کے ساتھ ہماری بھی رسوائی ہوگی، یہ کہہ کر خوب روئی۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ ہمارے گاؤں کا رہنے والا ایک پٹیل تھا، اس کا لڑکا ہے، تو بے چاری خوشی سے پھولی نہ سمائی۔"

"ایک بار مجھ سے . . . ملنے بھی . . . نہ آئی!" کہتے ہی جھمکو کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے۔

"اری پگلی۔ وہ تو آنے کے لئے بلک رہی تھی، مگر آتی کیسے؟ اگر کسی کو شبہ بھی ہو گیا تو تم لوگوں پر آفت آ جائے گی۔" پھر چلم کا دھواں کھینچ کر بولے، "اور ابھی تو یہ نیا نیا قصہ ہے، ابھی تو مل نہیں سکتی، ہاں ایک آدھ برس بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا، تب اگر گھڑے گھڑے آ کر مل جائے گی تو کون جان سکتا ہے؟ ہماری ذات کی موندھی بڑھیا ڈاکوری جانے کے بہانے اپنی بیٹی سے مل ہو آتی ہے!"

پھر چلم اُنڈیل کر بولے "یہ تو میں سب انتظام کر دوں گا۔ چل اُٹھ اب موٹر کا وقت ہو گیا۔" اور وہ دونوں اُٹھ کر چلنے لگے

پھر جھمکو کچھ نہ بولی۔ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو زندگی میں پہلی بار موٹر میں بیٹھنے کی خوشی میں وہ آپے سے باہر ہو جاتی وہ خود ناچنے کودنے لگتی لیکن اس کا دل تو ضرور بلیوں اُچھلتا اور اس کی آنکھوں میں مسرت بہا جاتی۔ منہ سے سرسوتی بہنے لگتی: "اوہو! ہو سکتا ہے کہ ڈرائیور کو اتنا مزہ آتا ہے، جیسے اُڑ کر اُڑ رہے ہوں۔ وہ پہاڑیاں دیکھو، وہ اپنا گاؤں وہ نکل آ رہا ہے، اپنے گاؤں کا پہاڑ کتنا چھوٹا سا لگ رہا ہے" وہ ایسی ویسی تو ہزاروں باتیں کرتی۔ لیکن آہ ―― اس وقت تو وہ کھڑکی سے سر نکال کر ان پہاڑیوں کی چوٹیاں دیکھ رہی تھی وہ گویا سر اٹھا اٹھا کر اسے دیکھ رہے تھے!۔ موٹر کی سمت جل جلنے سے بہ فاصلہ بڑھ جانے سے ―― یہ بات جھمکو نہ سمجھ سکی۔ لیکن اب وہ پہاڑیاں بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ اِدھر اُدھر دیکھتے دیکھتے جھمکو تھک گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے دو چار آنسو گرے جو اُڑتی ہوئی دھول میں مل کر نہ جانے کہاں رہ گئے

x x x x x x

دوپہر ڈھل رہی تھی جب موٹر نے ایک اسٹیشن پر لا کر اُتار دیا۔

"چل اس پیپل کے نیچے" کہتے ہوئے منوروا آگے آگے چلنے۔ دونوں بیٹھ گئے کبھی جھمکو کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے مال گاڑی کے ڈبوں کی طرف جاتی تھی اور کبھی پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے مال پر پڑتی تھی کبھی موٹروں اور بیل گاڑیوں پر جاتی تھی اور کبھی دور دور تک پھیلی ہوئی ریل کی پٹڑیوں پر اس طرح پڑتی تھی جیسے ان کی جڑیں اور کنارے تلاش کر رہی ہو۔ منوروا نے کچھ بیڑیاں اور ماچس خرید کر ایک بیڑی سلگائی اور منہ سے بے چے ہوئے ایک ٹھنڈے نیم کے پیڑ سے ٹیکنے لگے، پھر بولے:۔

"اٹھ بٹیا۔ چل تھوڑا سا کھا لیں!"

"بھوک نہیں ہے کاکا۔ تم کھا لو۔" کہہ کر جھمکو پوٹلی کھولنے لگی۔

"ارے وہ کسا رکھا لڈو میری دھوتی میں بندھا ہوا ہے چل ایک ایک ٹکڑا۔"

"لیکن مجھے بالکل بھوک نہیں ہے کاکا! کھانا ہی ہوتا تو یہ مرچ مسالے کی روٹی بھی موجود ہے۔" اور منوروا کے آگے روٹی کی پوٹلی کھولتے ہوئے بولی۔

"تو کاکا۔ اس میں کوئی چھوت نہیں لگے گی۔ یہ تو دودھ میں آٹا گوندھ کر بنائی ہے"

"اور وہ دودھ میں نہ گوندھا ہو تو بھی یہاں پردیس میں کیا بگڑ جائے گا!

لیکن تو تھوڑا سا لڈو تو کھا ― بے چاری تیری ماں نے کتنے پیار سے . . . ."

"کا کہتے ہو کاکا؟ میری ماں نے رکھا ہے یہ؟ ― تم نے تو مجھے یہ بات بتائی ہی نہیں" جھمکو کا چہرہ لمحہ بھر کے کھل اُٹھا۔

"دیکھنا بٹیا۔ میں ذرا ٹکٹ لے لوں۔" منوروا کی آواز سن کر وہ کچھ چونکی ایک دم چوکنا ہو کر اس نے جلدی سے گٹھری، اور پوٹلی، تھیلا وغیرہ، سامان کو اپنے پاس کھینچ کر رکھ لیا۔ اور پھر اس کی نظر دھول اڑاتی ہوئی موٹر کا پیچھا کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد موٹر ظاہرا آنکھوں سے اوجھل ہو گئی لیکن اس کے دل کی اندرونی آنکھیں اب بھی اسے کسی گاؤں میں سڑک کے کنارے ہوٹل کے پاس ٹھہرتے ہوئے تالاب کے باندھ سے گزرتے ہوئے، ندی کا پل پار کرتے ہوئے، جنگلوں میں گھستے ہوئے، دیکھ رہی تھیں گاؤں کے پاس والا کھنڈا پہاڑ آنے ہی والا تھا کہ اس کا سلسلۂ تصور ٹوٹ گیا۔

"چل آ۔ پوٹلی لے لے۔ اندر جا کر بیٹھیں" کہتے ہوئے منوروا کا ہاتھ جیب کی تہہ تک جا کر ٹکٹوں کو ٹٹولنے لگا۔ جھکو کو آگے بڑھتا دیکھ کر بولے:

"کیوں یہ ٹینا نہیں لینا ہے؟" جھکو نے پلٹ کر ٹینا اٹھا لی۔ پلیٹ فارم پر بیٹھتے ہوئے جھکو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "کیوں کاکا، اب موٹر آدھی دور تو ..."

منوروا کو غصہ آ گیا، "تو بھی سب سے ایک ہی بات کے پیچھے پڑی ہے۔ میری ناک میں دم آ گیا!" پھر ذرا دھیمے لہجے میں بولے:

"مجھے تو ایسا لگتا ہے بٹیا کہ احمد آباد دیکھتے ہی تو کھل ہی جائے گی! وہاں موٹریں ہی موٹریں ہیں۔ چلنے کے لئے راستہ بھی نہیں ملتا۔ میرا خیال ہے تو بھی دیکھ کر پاگل ہو جائے گی!" کہتے ہوئے کچھ مسکرائے۔ لیکن جھکو پر ان باتوں کا ذرا سا اثر بھی نہیں ہوا۔ پھر منوروا بھی کچھ نہ بولے لیکن ان کی طرز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر لمحہ گاڑی آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک آدمی سے پوچھ کر انھوں نے پورے پانچ بجے چلنے کا یقین کر لیا۔ اتنے میں سیٹی سنائی دی اور انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن جھکو پر کیا گزر رہی تھی۔ یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا۔ گاڑی آتے ہی وہ منوروا کے ساتھ ان کی بغل میں بیٹھ گئی۔ انجن کی سیٹی سنتے ہی جھکو نے ایک آہِ سرد کھینچی اور سر نیچے کئے ہوئے ہونٹ چباتی رہی۔ سر پہ ساڑی کا پلو کچھ آگے سرکا لیا!

تقریباً آٹھ برس پہلے منوروا نے دو آنے کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھنے کا شوق پورا کیا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ گاڑی میں کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ جھکو کے پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت پوچھنے لگی۔

"کون گاؤں کی ہو بہن جی؟"

جھکو سے پہلے ہی منوروا بول اٹھے: "ہم تو [illegible] میں رہتے ہیں۔" شاید جھکو کا گھونگھٹ دیکھ کر اس عورت نے پوچھا:

"یہ بائی تمہاری کون ...؟"

"میری بٹیا ہے!" منوروا بیچ میں ہی بول اٹھے۔ لیکن بڑھیا کے ایک دو سوالوں کے بعد ان میں ضبط نہ رہا۔ انھوں نے یہ وار کیا کہ خود ہی بڑھیا سے سوال کرنے لگے۔

لیکن جھکو کا دھیان ان سوالوں کی طرف نہ تھا۔ دو اسٹیشن نکل جانے کے بعد اس نے منوروا سے پوچھا:

"ایں کاکا۔ ابھی کتنی دور ہے؟"

"ابھی تو پندرہ دو ٹیشن (اسٹیشن) ہیں۔ تیسرا ٹیشن احمد آباد کا آئے گا!" کہتے ہوئے منوروا نے آس پاس دیکھ کر چپکے سے جھکو کو سمجھا دیا کہ اگر کوئی کچھ پوچھے تو وہ کیا جواب دے۔ پھر شاید اسے خوش کرنے کے خیال سے بولے۔

"دیکھا، کیسی گاڑی ہے؟ ہوا کی طرح جاتی ہے نا؟"

جھکو نے سر ہلا کر "ہاں" کر دی، اور کوشش کر کے کچھ ہنسی بھی۔ اب منوروا کو بھی کچھ اطمینان ہوا اور بیڑی سلگا کر پینے لگے۔

جھکو کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ہوا سے باتیں کرتی ہوئی گاڑی اسے دھرتی کے کسی دور دراز گوشے میں جا پھینکے گی۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی لیکن اسے سمتوں کا اندازہ ہی نہیں رہا تھا۔ بات عقل میں نہیں آتی تھی پھر بھی وہ کھنڈا پہاڑ دیکھنے کے لئے بار بار آنکھیں پھاڑتی تھی۔ کھڑکی سے سورج ڈوبتا ہوا سورج دکھائی دے رہا تھا پھر بھی وہ اسے پچھم نہیں مان سکتی تھی۔ بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ اگر وہ سورج کو بھی بدلا ہوا مان لے تو اس میں اس کا قصور ہی کیا تھا؟ اگر منوروا پاس نہ بیٹھے ہوتے تو وہ یقیناً سسک سسک کر رونے لگتی۔

دور، بہت دور ملوں کی کالی کالی چمنیاں دکھائی دینے لگیں۔ منوروا نے کہا۔

"وہ دیکھ جھکو۔ احمد آباد دکھائی دے رہا ہے۔ دیکھنا! اب جو آ رہا ہے وہی احمد آباد کا ٹیشن ہے!"

اسٹیشن ہی آگیا۔ اترنے سے پہلے ہی ڈبے میں بتیاں روشن ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر جھکو کو بڑی حیرت ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنے غم میں سکوت میں ڈوب گئی۔

اسٹیشن پر اترتے ہی منوردا نے کہا: "دیکھ جھکو، دیکھا ادھر آ، یہ کیسی بجلی کی بتیاں ہیں، دن سا معلوم ہوتا ہے۔"

لیکن رات کو دن بنا دینے والی بجلی کی بتیاں، طرح طرح کے بھوپو بجا کر دوڑتی ہوئی موٹریں، سائیکلیں، تانگے، بڑے بڑے مکان اور سجی ہوئی دکانیں ان میں کوئی بھی چیز جھکو کے لیے کشش پیدا نہ کر سکی۔ ابھی تک سنا تھا لیکن آج سچ مچ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ زمین پر سچ مچ "کچھ" ہے۔ اُسے اس بات کا بھی احساس نہ ہوا، اس کا اضطراب اور بے کلی بڑھتی ہی گئی!

منوردا، جھکو کو نئی نئی چیزیں دکھا کر خوش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

دھرم شالے میں جا کر اپنا اثاثہ بکھرایا اور اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں اپنا ڈیرہ جما لیا۔ کرائے پر رضائیاں اور گدے بھی لے لیے۔ جب دھرم شالا کا جمعدار منوردا کو بجلی کی بتی وغیرہ کے بارے میں بتا رہا تھا اس وقت جھکو گدے پر پڑی پڑی بے چین ہو رہی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ رونا چاہتی ہے لیکن رو نہیں سکتی۔

کچھ دیر بعد منوردا نے جھکو سے ناشتہ نکالنے کے لیے کہا اور خود جا کر پانی بھر لائے۔ اس کے منہ میں ٹھوکا دیتے ہوئے بولے:

"بیٹی کس لیے ہے، کھانا؟"

"تم کھاؤ کاکا، مجھے کھانا نہیں۔"

منوردا نے آنکھیں نکال کر پوچھا: "کیوں؟"

"بھوک نہ ہو تو کیسے کھاؤں۔" کہتے کہتے جھکو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"لیکن بھوک نہ لگنے کا کارن؟ چل کھانا شروع کر دے،

نہیں تو جانتی ہے۔۔۔"

"لیکن مجھے۔۔۔" جھکو آگے نہ بول سکی۔

اب منوردا کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ دبی آواز میں بولے "رونا دھونا بند کر نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

۔۔۔ ہاں ۔۔۔ یہاں رہیں میری رسوائی کرائے گی؟"

کہتے ہوئے اٹھے اور موری کے پاس جا کر ہاتھ دھو لیے۔ پھر سامنے پڑے ہوئے اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولے

"نہ جانے کہاں سے یہ بے وقوفی سوجھی جو دوسرے کے باپ میں شامل ہوا!"

جھکو "دوسرے کے باپ" کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی اور اسی لیے شاید اس نے رونا دھونا بند کر دیا۔

اس کے بعد کوئی کچھ نہ بولا۔ بتی بجھا کر سو گئے۔ کب سوئے اس کی شاید انہیں بھی خبر نہیں تھی۔ لیکن جب جاگے تو معلوم ہوا کہ سورج کافی چڑھ چکا ہے۔

دھرم شالے کے پچھلے کٹہرے پر جھک کر کھڑی ہوئی جھکو سے منوردا نے آس پاس کے مناظر کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا: "جھکو، وہ تعزیہ جیسا دکھائی دیتا ہے۔ دیکھا؟ نہیں دیکھنا، وہ بیچ میں پہیئے جیسا گول گول۔۔۔"

"ہاں ہاں۔ وہ کیا ہے کاکا؟ بیچ میں تو کچھ بیل بوٹے بنے ہیں" جھکو تعجب سے دیکھنے لگی۔

"ہاں ہاں ری! ۔۔۔ اس کا نام جانتی ہے تو؟۔۔۔"

اور جیسے چھوٹے سے بچے کی طرف دیکھ رہے ہوں اس طرح جھکو کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے:

"وہ گھنٹہ گھر ہے، گھنٹہ گھر!؟۔۔"

"ارے باپ رے۔۔۔۔ اتنا بڑا" اور ایک لمحہ رک کر پوچھا:

"اس کا کاکا، یہ کیوں بنایا ہوگا؟۔۔۔۔"

"کیوں؟۔۔۔ سب کے ٹیم دیکھنے کے لیے!۔۔۔۔ تو جانتی ہے جھکو، شہر کے لوگوں کو اسی سے دن نکل آنے اور ڈوبنے کی خبر ہوتی ہے۔ سمجھی!"

اور پھر منورواآکاش سے باتیں کرتے ہوئے آس پاس کے مکان، دُور دھوئیں چھوڑتی ہوئی ملوں کی چمنیاں۔ ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی موٹریں وغیرہ دکھانے لگے۔ جھمکو طرح طرح کی باتیں پوچھتی تھی۔ منوروا جھمکو کو خوش کرنے کے لئے ابھی نہ جانے کیا کیا بتاتے لیکن یکا یک انہیں کچھ یاد آگیا۔۔۔ جیب سے ایک کاغذ نکالا اور پھر رکھ کر بولے:

"چل تھوڑا سا کھالیں۔"

جھمکو کا ارادہ تو انکار کرنے کا تھا لیکن اس وقت وہ کچھ بول نہ سکی۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے بولی "نہیں۔ بالکل تھوڑا سا کھاؤں گی کاکا!"

اچھا۔ تو چل تو سہی کہتے ہوئے منوروا آگے بڑھے۔ واقعی جھمکو نے بہت تھوڑا سا کھایا۔

لوٹتے وقت منوروا نے طنزاً کہا "پگلی! اس میں تھا ہی کتنا سا کھانا۔ اس میں سے بھی تو نے آدھا ۔۔۔۔ یوں ہی تین پیسے بگاڑے!"

"میں نے کہا تو تھا"

"کہا تھا تیرا سر!" منوروا چپ ہو گئے۔

کمرے میں آنے کے بعد منوروا نے صافہ باندھا۔ کپڑے ٹھیک ٹھاک کئے اور کمری پیچھے ہوتے بولے:

"میں ذرا باہر جاتا ہوں ۔۔ تو یہیں کوٹھری ۔۔۔۔"

"نہیں کاکا ۔۔ میں اکیلی نہیں رہوں گی" جھمکو نے پیار سے بھرے لہجے میں گھبرا کر کہا۔

"میں ابھی واپس آیا ۔۔ تو اتنے سے جا کنڈی لگالے۔ اس بھری بستی میں ڈر کاہے کا!"

اگر منوروا ذرا بھی غور کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ جھمکو کو سارا ڈر تو بھری بستی کا ہی تھا۔ اسے سمجھا بجھا کر وہ باہر نکل گئے۔

دھرم شالا کے دروازے پر آتے ہی جیب میں رکھا ہوا کاغذ دکھا کر لوگوں سے کہنے لگے:

"ذرا دیکھو دوصاب، یہ امر سنگھ کہاں ملے گا؟"

اور جس طرح فٹ بال اِدھر اُدھر ٹکراتی ہوئی آخر کار گول تک جا ہی پہنچتی ہے اسی طرح منوروا بھٹکتے بھٹکاتے آخر ایک مل کے پھاٹک تک پہنچ گئے پہرے والے سے پوچھا:

"اے جمعدار صاحب، امر سنگھ کہاں ملے گا؟"

پہرے والے نے پہلے گاؤں اور برادری کا نام پوچھا پھر کہا "تم ادھر بیٹھو میں ابھی بلاتا ہوں" اور ایک آدمی کے ہاتھ سندیسہ بھیج دیا۔

منوروا نے تقریباً ۴۰ برس کے ایک جوان کو مونچھوں پر تاؤ دیتے اپنی طرف آتے دیکھا تو فوراً پہچان گئے۔ دور سے منوروا کو دیکھتے ہی وہ بولا "ارے! ہو ہو۔ منورا کاکا!"

اور رام رام کرنے کے بعد پوچھا "کیوں کاکا تم یہاں کیسے راستہ بھول گئے؟"

"بھولا نہیں امر بھیا۔ خود چل کر تمہارے پاس آیا ہوں" منوروا ہنسنے لگے۔

"اچھا۔ چلو گھر چلیں" کہتا ہوا امر سنگھ آگے آگے ہو لیا۔ راستے میں اس نے منوروا سے پوچھا "کون کون آیا ہے۔ کیسے ہو۔ کب آئے۔ کہاں ٹھیرے ہو۔" ایسے کتنے ہی سوال پوچھ ڈالے۔

ان میں منوروا نے کچھ کا ٹھیک جواب دیا اور "کون کون آیا ہے" کا جواب ایسا ہی گول مول دے دیا۔

اتنے میں گھر آگیا۔ امر سنگھ ایک مضبوط ہتھوں والی کرسی سرکا کر بولے:

"بیٹھو کاکا ۔۔"

"ارے نہیں بھیا، اپنے رام تو ۔۔۔۔؟"

"ارے ایسی کیا بات کرتے ہو؟ آرام سے بیٹھو!" امر سنگھ نے کہا۔

منوروا کبھی کبھی ہوٹل میں یا کسی اور جگہ کرسی پر بیٹھے تھے۔ لیکن آرام سے نہیں، آج وہ پیر پھیلا کر آرام سے بیٹھے! چائے، ناشتے کا آرڈر بھجوا کر امر سنگھ بھی چپائی پر بیٹھ گیا۔ اپنے گاؤں اور آس پاس کی خیر سلا پوچھ کر بولا:

"کاکی کو بھی لے آنا تھا کاکا!"

"کہاں؟ احمد آباد میں ۔۔؟" اور امر سنگھ کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہاں! ہاں!"

منوروا کھیتی باڑی اور ڈھور ڈنگر کا حال چال سنا رہے تھے کہ اتنے میں چائے وغیرہ آگئی اور دونوں نے نیچے بیٹھ کر چائے پی۔ ناشتہ کیا۔

"جا بے۔ کھانے میں ڈلوا دینا" کہہ کر امر سنگھ نے ہوٹل کے لڑکے کو روانہ کر دیا لیکن ایک دم کچھ یاد آیا اور بولا: "ابے او لونڈے سے۔ دو پان اور دو اچھے کھاجے لے آ۔ پر ٥ پیالے یہیں رکھ جا، دوڑ

"کرآؤ بیٹا!"

[illegible] آیا۔ بہت اصرار اور تکلف کے بعد منورما تھیلے سے آخر سنہرا بیگ نکالا اور سگریٹ بھی سلگایا۔

"ہوں ـــ بیٹا امر سنگھ تمہیں یہ کیوں یاد آگیا؟" امر سنگھ ہنستی ہوئی آنکھوں سے منورما کی طرف دیکھا۔

"بغیر کام کے کون آتا ہے امر بھیا۔" ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولے "لیکن بات ایسا..."

امر سنگھ سمجھ گیا۔ سامنے دیوار پر ایک رضائی ڈال دی۔ دروازے کو کھلا چھوڑ دیا۔ منورما دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سامنے امر سنگھ پالتی مارے اور ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔

اس نے پوچھا! "ہاں تو اب بتاؤ!" منورما کچھ ہچکچا رہے تھے۔ اس نے پھر کہا۔

"تم میری عادت جانتے ہو کاکا۔ چاہے کیسی ہی بات ہو، سر کٹنے کی کیوں نہ ہو، لیکن جیسی سُنی ویسی ہی زمین میں گاڑ دی۔ سگریٹ کا کش لگا کر بولا... "اس بات سے تم بے فکر رہو...."

سگریٹ کے لگاتار تین چار کش لے کر منورما نے بات شروع کی۔

"پارسال تم نے جو بات کی تھی وہ یاد ہے؟"

دکھا کر امر سنگھ کچھ سوچنے لگا تو بولے "یاد نہیں؟ جب مکھا پٹیل کی لڑکی کنوئیں میں گر کر مر گئی تھی اُسی دن تم نے...."

"ارے ـــ ہاں ہاں! ٹھیک ہے، اب یاد آیا...."

"یاد ہے اس دن تم نے اپنے اور آس پاس کے بانسوں کی دوسری باتیں بھی کی تھیں...؟"

"ہاں ہاں، اچھی طرح یاد ہے۔ اس دن پنچایت پوری ہونے کے بعد تم رات کو بیٹھے تھے اور آدھی رات تک ہم باتیں کرتے رہے تھے۔" یہ کہہ کر امر سنگھ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ منورما کو خاموش دیکھ کر پھر بولا "وہ تو سب ٹھیک کاکا، مگر وہ ہے کہاں کی؟"

منورما نے جھمکو کی کہانی شروع سے آخر تک کہہ سنائی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے واقعات کا بھی تذکرہ کیا۔ آخر میں بولے "جس طرح بھی ہو، لیکن مجھے ذرا جلدی چھٹی دے دینا۔ امر بھیا!"

"ارے بھگوان نے چاہا تو کل اسی وقت تک تم فارغ ہو جاؤ گے کاکا!" امر سنگھ کی آنکھیں ہی نہیں سارا جسم چمک اُٹھا تھا۔

"نہیں بس بیٹا۔" اور جیب سے بیڑی نکالتے ہوئے بولے: "کرا تشو اب اپنا کام کرو۔"

"اچھی بات ہے، لیکن ایک بار میں اسے دیکھ تو لوں؟"

کہتے ہوئے امر سنگھ نے شام آئینے میں دیکھ کر صافہ ٹھیک کیا۔ دھوتی کو کھینچ کر نیچے سرکایا۔ کرتہ پہنا اور ہاتھ میں پیسے کی موٹھ وال چمڑے سے منڈھی بید لے کر بولا: "تو چلو!"

کواڑ لگا کر دونوں سڑک پر آگئے۔ بس اسٹینڈ پر کچھ دیر ٹھیرنا پڑا۔ امر سنگھ کے ایک ہاتھ کی انگلیاں مونچھوں سے کھیل رہی تھیں۔ چیتوں کی چالاکی جیسی اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی چمک تھی۔ امر سنگھ نے دور سے بس کو آتے دیکھ لیا اور کنڈکٹر کی آواز "دو آدمی!" سنتے ہی دروازہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ منورما کو چڑھا کر خود اندر گھسا۔ وہ جہاں بیٹھے وہاں دوسرے کھڑے تھے ان میں سے ایک جلیبیاں بیچتے ہوئے بولا۔

"دیکھا، ٹھاکر کا رعب! کہو کیسے ہے کہ راجپوتی راکھ ہو گئی؟"

دوسرے نے منہ چڑھا کر جواب دیا۔ "راجپوتی تو راکھ نہیں ہوئی، لیکن بیچارہ راجپوت رنڈوا ہو گیا ہے!"

چلتی ہوئی بس میں امر سنگھ نے ان دونوں کی طرف تیکھی نظر اور مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ اور وہ کٹ گئے۔

دروازے میں کھٹ کھٹ ہوئی تو جھمکو اُٹھی اور منورما کی آواز پہچان کر دروازہ کھول دیا۔

"ذرا پانی تو بھر لا بیٹیا۔" منورما نے اندر گھستے ہوئے کہا۔

مٹکا لے کر باہر نکلتے ہوئے جھمکو کی نظر امر سنگھ پر پڑی اور اس کا دل کانپ اُٹھا۔ نہ جانے کیوں، گگریا لے کر آتے اور جاتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی۔ لیکن جائے بغیر چارا بھی نہیں تھا!

جھمکو پانی پلا کر دوبارہ ٹیا بھرنے گئی۔ امر سنگھ نے کہا۔

"ہے تو بلبل جیسی، کاکا، ایسی خوبصورتی تو..."

منورما بیچ ہی بول پڑے: "خوبصورت ہے اسی لیے تو...؟"

امر سنگھ نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا: "بھگوان چاہے تو کل ہی تم فارغ ہو جاؤ گے کاکا!"

پھر ذرا سوچ کر بولا: "کیا بتاؤں اگر تم نے مجھے دو چار دن پہلے خبر دی ہوتی..."

"جو ہوا سو ٹھیک ہی ہوا، لیکن تم ذرا جلدی سے طے کرا دو تو اچھا ہے۔"

منوردا سے کہا، ان کا دل ٹھکانے نہیں تھا۔

"اچھا یوں!" کہتے ہوئے امر سنگھ نے چٹکی بجائی۔ سردی کا زمانہ تھا، پھر بھی اُسے دوبارہ پیاس لگی۔ "لا... کہاں گئی، کیا نام ہے اسکا، جھکو، ذرا پانی تو دو"

جھکو کے ہاتھ سے لٹیا لیتے ہوئے امر سنگھ اس کی صورت دیکھتا رہا۔ پانی پینے کے بعد کھنکار کر گلا صاف کیا اور مونچھوں کو بل دیتے ہوئے، کھڑا ہو گیا۔ منوردا اُسے نیچے تک پہنچانے آئے۔ جاتے ہوئے امر سنگھ نے کہا "ہو سکا، تو آج ہی شام کو آؤں گا۔ کاکا!"

"ہو گیا سکا؟ ہو، ہو ہی جانا چاہئے امر بھیا!" کہتے ہوئے منوردا واپس آ گئے۔ آ کر دیکھا تو جھکو گدے پر پڑی تھی۔ منوردا بیٹھ گئے تو بولی:

"کاکا، تم کب چلو گے؟" اور حسرت آمیز نگاہوں سے منوردا کی طرف دیکھنے لگی۔

منوردا بولے "پاگل ہو رہی ہو گئی بٹیا۔ گھر کس کے پاس جانا ہے؟"

جھکو جواب کیا دیتی؟ منوردا کی طرف اسے دیکھنے لگی جیسے آر پار دیکھ رہی ہو۔ اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے!

منوردا ذرا مسکرا کر بولے "گھر رہنے کے قابل رکھا ہوتا تو میرے سر پر یہ آفت ہی کیوں آتی!"

"کچھ بھی ہو — یہاں نہیں رہنا ہے" کہتے کہتے جھکو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ منوردا آپے سے باہر ہو گئے "تو یہاں کیا جھک مارنے آئی تھی؟ کیا مجھے یہاں کا ڈر لگا ہے، کیوں؟"

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد بکھرے ہو کر بولے: "مجھے کیا کرنا ہے! گھر تو جانا ہے تو میں لے چلوں گا لیکن جب آئے ہیں تو ذرا شہر تو دیکھ لیں۔ یا یوں ہی، چلو! چلو!..." اور بیڑی سلگاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

جب شام کو منوردا واپس آئے تو جھکو ساڑی کا کونا منہ میں دابے پلنگ پر پڑی تھی۔ منوردا بولے: "چل، اُٹھ، کچھ کھا پی لے۔"

جھکو کے منہ سے نکلا "مجھے بھوک نہیں لگی" لیکن منوردا کے ڈر سے وہ چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ کھانا کھا کر واپس آتے ہوئے منوردا جھکو کو شہر کی چہل پہل اور رنگینیاں دکھاتے گئے۔

سامنے والے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منوردا نے کہا: "انھیں دیکھا جھکو؟ کیسے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر جا رہے ہیں، دونوں میاں بیوی ہیں! یہاں کسی کو گھر گرہست و گھونگٹ نکالنا نہیں پڑتا۔ سب اپنے [illegible]

"آگ لگے ایسے جیون میں!" جھکو نے منہ بنا کر کہا۔ کمرے میں آنے کے بعد جب منوردا کو خوش خوش دیکھا تو جھکو بولی: "اچھا تو دیکھ لیا کاکا! چلو کل گھر چلیں!" "ابھی کل تو [illegible]"

کچھ دیر بعد جھکو نے پھر پوچھا، "گاڑی تو رات کو بھی جاتی ہوگی؟ کیوں کاکا؟"

منوردا کچھ دیر اس کی طرف گھورتے رہے۔ جھکو نے دیکھا یا نہ دیکھا یہ تو وہی جانتی ہوگی، لیکن ان کی آنکھ میں غصے کی ایک ہلکی سی لہر ضرور آئی تھی جو جلد ہی دور ہو گئی۔ کچھ گمبھیر آواز میں بولے:

"دیکھ جھکو۔ تو بچوں کی طرح نخرے کرتی ہے، یہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ اسی لیے تو میں نے وہیں سب کچھ صاف صاف کہہ دیا تھا نہیں تو..."

جھکو نے بات کاٹ کر پوچھا: "کیوں کاکا، میری ماں کو معلوم ہے کہ میں یہاں آئی ہوں؟"

"اری پگلی۔" منوردا نے ایک لمحہ کے لیے جھکو کی طرف دیکھا اور ہنس کر کہا: "ایک بار کہہ تو دیا، اسی نے تو اس قدر منت کی تھی، نہیں تو مجھے کیا پڑی تھی"

جھکو کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، وہ اپنے دل میں کہنے لگی [illegible]

منوردا اداس ہو کر بولے۔ "اری کم عقل، [illegible] کیسی ماں اور کس کی بیٹی! یہ اپنی خوش نصیبی جان کہ تیری ماں اتنی بھلی نکلی... اور مجھے بھی اس کی بات ماننا پڑی۔" اور پھر منوردا نے خوب نمک مرچ لگا کر ساری باتیں کہہ سنائیں کہ تیری ماں اس رات کو میرے گھر آ کر کس طرح گڑگڑائی، کتنی روتی بلکتی رہی، اور جب میں نے بٹیا کو ٹھکانے لگانے کا وعدہ کر لیا تب اٹھ کر گئی! ساتھ ہی جھکو کو اپنے سسرال اور رشتے ناتے والوں کی مخالفت کا خوف دلا کر [illegible] کی نصیحت کی اور ہمت بندھائی۔ شہر میں جو سکھ ہے اس پر بھی لیکچر دیا۔ نتیجہ مگر وہی ڈھاک کے تین پات!

جھکو بولی: "بھاڑ میں جائیں، نہیں رکھیں گے تو کنواں تو ہے؟ لیکن واپس لوٹ چلو کاکا۔ میں تمہارے پیر پڑتی ہوں!" اور سچ مچ وہ منوردا کے پیروں پر گر پڑی۔ منوردا ایک دم آگ بگولا ہو گئے، "اُٹھ، یہاں سے!" اُن کی آنکھیں غصے سے لال ہو رہی تھیں، "بہت [illegible] سال کمین کی ذات جو ٹھہری! ذرا نرمی سے کہا تو سر پر چڑھی جاتی ہے... یہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا، پھر روتی پھرنا اپنے باپ کو..." اتنے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور منوردا ایک دم چپ ہو گئے۔

"کیوں جھمکو اب کیا ارادہ ہے؟" پوچھتے ہوئے منوردا مسکرائے۔ جھمکو کے گلابی چہرے پر لمحہ بھر کے لیے بے بسی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس وقت رونہ جیسی سکتی تھی نہ رو سکتی تھی۔ منوردا پھر بولے۔

"کنوئیں سے نکل کر کھائی میں پڑی۔ اس سے کیا مل گیا؟" اور غصے کے ساتھ کہا "بہت بن، ماں، بھائی بھاگ کر تھی اب دیکھتا ہوں"

جھمکو کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی اور ساڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھ کر پوٹلی کھولنے لگی۔

"پوٹلی کس لیے کھولتی ہے؟"

"تمہارے کپڑے اور دوسری چیزیں نکال دوں!"

"پھر کہاں جائے گی؟" منوردا نے پوچھا اور تیکھی نظروں سے دیکھتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد کچھ گمبھیر ہو کر کہا: "اری بٹیا، وہ بنواری تجھے کیوں لے گیا تھا؟ اور پھر کیوں بھگا دیا؟"

جھمکو خاموش رہی۔ منوردا پھر بولے "مجھ سے بات تو کر، اس نے تجھے نکال کیوں دیا؟"

"انھوں نے کہاں نکالا؟"

"تو کیا تو اپنے آپ بھاگ آئی؟"

جھمکو روتے ہوئے بولی: "نہیں ان کے گھر والوں نے نکال دیا۔ وہ تو گھر تھے ہی نہیں!" اس نے ہر چند ضبط کیا مگر آنسو نہ ہی تھمے۔

"کہاں گیا تھا وہ؟"

"کوئی بلانے گیا تھا۔۔۔ وہاں سے پھر واپس ہی نہیں آئے۔"

جھمکو آنسو پونچھنے لگی۔

"تجھے بھی ابھی گھر آنے کی سوجھی!"

جھمکو کچھ نہ بولی۔ شاید منوردا بھی اس بات کے جواب کی توقع نہیں رکھتے یا پھر یہ سمجھ لیا ہوگا کہ یہ لڑکی اپنی برادری کی بے رحمانہ سزا سے واقف نہیں تھی۔

"چل اٹھ!" منوردا نے اس انداز سے کہا جیسے وہ اپنے بعض خیالات کا جواب سوچ چکے ہوں:

"تو ایک بار یہاں سے چل تو سہی پھر دیکھا جائے گا!" پھر ذرا توقف کر کے بولے:

"چل، چل، باندھ لے پوٹلی!"

ان کے چہرے پر کسی مستحکم فیصلے کے آثار نمایاں تھے۔

منوردا آگے تھے اور جھمکو ان کے پیچھے چل رہی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا اور یہ دونوں، گاؤں کو بائیں طرف چھوڑ کر آہستہ آہستہ دائیں طرف جا رہے تھے۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد منوردا نے جھمکو کو کچھ سمجھایا۔ اگر کوئی پوچھے کہ کہاں گئی تھی؟ منوردا کہاں چل گئے؟ تو وہ کیا جواب دے یہ سب کچھ سکھلا دیا۔

ذرا دیر کے بعد۔۔۔ شاید اس سوال نے انھیں کریدا ہوگا، اس لیے جھمکو سے رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگے: "کیوں بٹیا اگر میں تجھے موڑ سے اتر کے اکیلا چھوڑ دیتا تو کہاں جاتی؟"

"کون جانے کاکا؟" جھمکو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"پھر بھی؟ اب اگر میں چلا جاؤں تو؟"

جھمکو کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ اس بات سے جھمکو ڈر جائے گی لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ اس نے بڑے مایوس لہجے میں جواب دیا: "مہاراج کے پاس جاؤں گی۔۔۔ دوسرا کون ہے؟"

دو چار لمحے بعد منوردا خود بخود جیسے اپنے ہی سوالوں کا جواب دے رہے ہوں۔ اس طرح بولے:

"مہاراج بیچارے کیا کر سکتے ہیں؟"

ایک دل بے پناہ غم و اندوہ میں اور دوسرا اپنے خیالات کی الجھنوں میں، اس طرح گھومتے تھے کہ آس پاس کی جھاڑیوں میں ہونے والی کھڑکھڑاہٹ،

نام لے کر بھولے سے آواز دی۔ جھکو کھیٹ پڑتی، اس طرح اُتری جیسے آسمان سے بادل اُتر رہا ہو۔ پھر کچھ شکایت بھرے لہجے میں بولی: "آج خیر سے سبھی ہو کا کا ؟"

"لو بولو۔۔۔ اری تیرے لئے تو آج تک ٹھیک رہا تھا۔ اور تو پوچھ" جتنا بیچ سے ہی بول پڑی: کچھ ٹھکانا ہوا!! کون سے گاؤں گئے تھے ؟"

"بیچارا کہاں گیا" ؟ وہ آجائے تو بتلاؤں گا !" پھر جھکو کی طرف دیکھ کر کہنے لگے:۔

"بٹیا تو کس نئے کوٹھے پر چڑھی تھی ؟ خیر اب بہت دنوں چڑھنا نہیں پڑے گا !" پھر آس پاس دیکھنے لگے۔ رجنا شاید بھیر کو ہی بلانے گئی تھی۔ منوردا نے چپکے سے جھکو سے پوچھا:

"اری جھکو ؟ اگر تیرے کپڑے گاؤں میں پہنوا دوں تو ؟"

جھکو نے شاید اسے مذاق سمجھا ہو اس نے منہ پھلا کر نیچے دیکھتے ہوئے کہا:

"ہونہہ ! گاؤں میں کہاں ؟"

"یہاں بھی تو منڈ کے پانچ سات گھر تو ہیں نہیں ؟ جو تو پوچھ رہی ہے !"

جھکو کے چہرے پر جو سرخی دوڑ گئی اُسے تو منوردا اندھیرے کی وجہ سے نہ دیکھ سکے لیکن اس کی آنکھوں کی چمک اُنھیں ضرور نظر آگئی۔ اِن آنکھوں میں جو قلبی طمانیت، شرم و حیا اور حیلے سے پیدا ہونے والی ادا تھی وہ منوردا نے بھانپ لی۔ جھکو کچھ ٹھنک کر بولی:

"جاؤ جاؤ کاکا ! میری ہنسی اُڑاتے ہو ؟" اس کی آواز ذرا رُندھی ہوئی تھی لیکن منوردا کو اس میں بڑا مزا آیا۔ وہ پیٹھ پھیر کر بولے:

"لے تو میں چلا ! مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ ماننا نہ ماننا تیرا کام ہے" اور باہر نکل آئے۔ جھکو نے ایک دم آنکھیں پونچھ لیں اور کھٹیا کے پاس سے اس طرح بار بار گردن اُٹھا اُٹھا کر جھانکنے لگی جیسے آنکھ مچولی کھیل رہی ہو۔ وہ در اصل باہر ہونے والی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد منوردا پھر اندر آئے اور جھکو سے کہنے لگے

"یقین نہیں آتا تو اپنی ماں سے پوچھ لے !"

"اچھی بات ہے" جھکو نے کہتے ہوئے نظریں جھکا لیں اور ساڑی کا پلو چبانے لگی۔ منوردا ہنستے ہوئے باہر نکل گئے۔

× × × × × × ×

اور گاؤں والوں کے حیرت و استعجاب کے درمیان ہی اُسی رات جھکو کا بیاہ ستی سے کرا دیا گیا کسی نے تو جھکو کی تعریف کی جو دولہا اور دلھن دونوں کے باپ بنے پھر رہے تھے اور کوئی یہ کہہ کر ہجو بیان کر رہا تھا کہ "منورکا کا بڑے منطقی آدمی ہیں، ایک بات کے پکے نجانے جھکو کو کہاں سے پکڑ لائے" کھیتی کا زمانہ تو تھا نہیں اس لئے گاؤں کی جوانیاں مستی بھری آوازوں سے اپنے اپنے آنگنوں میں میٹھی شریلے گیت گا رہی تھیں۔ کوئی مبارک باد دینے آتا تھا اور کوئی بجھے دل سے شادی کی مٹھائی لے کر چلا جاتا تھا۔ برادری میں جو چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں وہ کچھ اس قسم کی تھیں: "منوتیاں نے یہ جھگڑا اپنے گھر میں بٹھا کر کچھ اچھا نہیں کیا ! کچی بات ہے تنا تو ساری پنچایت کا ہے" وغیرہ۔

سب سے پیچھے منوردا بھی حقہ گڑگڑاتے ہوئے نکلے اور گھر آ کر کھٹیا پر لیٹ گئے۔ اُن پر پنچایت کی ایسی فکر سوار تھی جیسے وہ گھوڑوں پر چڑھی بھاگی چلی آ رہی ہو۔ اسی کے بارے میں سوچتے سوچتے خراٹے بھرنے لگے لیکن خواب میں بھی بڑھیوں کی پنچایت ہی نظر آ رہی تھی چونکہ عالم بیداری میں تھی وہ ہی خواب میں بھی سوار رہی وہ سوچ رہے تھے کہ کچھ بھی سہی لیکن آخر معاملہ پنچایت کا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پنچایت جھکو کو واپس کرا دے !

× × × ×

صبح ہوئی تو منوردا پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ سب سے پہلا سوال تو اُن کی بیوی نے ہی کیا۔ منوردا نے گھر والی کا منہ دیکھا تو پھول کر کپا ہو گئے۔ اس نے چائے کے لئے دودھ دیتے ہوئے پوچھا: "بتاؤ تو سہی کہ آخر اتنے دن کہاں رہے ؟ اور خالی ہاتھوں کیسے واپس آ گئے، آخر کیا بھید ہے ؟ لوگ تو کہتے ہیں تم جھکو کو کسی مسلمان کے پاس سے چھڑا کر لائے ہو۔ یہ سب گپیں کیا اُڑ رہی ہیں کچھ بولو تو ۔۔۔۔۔"

منوردا انٹ سنٹ ہانکنے لگے: "یہ تو کہوں گا ہی ! ذرا صبر تو کر۔ پہلے گھر کے کام کاج تو نمٹا لے ۔"

گھر والی غصے میں ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی بکنے لگی، "صبر کیا کروں تمہارا سر ؟ محصول کے روپے تھے وہ بھی اُڑا کر آ گئے۔ چار دن

اتنے میں جھکو ارے ۱۲۷ ! گبکر جیسے بیرولاسے پٹ گئی۔"

منورا نے ویرا کے ہاتھ سے حقّہ سنبھال لیا جو باتوں کی دھن میں اُسے پینا ہی بھول گیا تھا۔ اس وقت چوپال میں اتنا سناٹا تھا کہ اگر سوئی گرتی تو اس کی آواز بھی سنائی دے جاتی! ابھی تک لوگوں کے چہروں پر تحیر و تعجب کے آثار تھے۔ ایک نے پوچھا:

"پھر کیا ہوا منور کاکا؟"

منورا دوسرے کو حقّہ تھماتے ہوئے بولے: "پھر کیا بھیا! میاں کو میں ایسا سبق سکھاتا کہ جنم بھر یاد رہے لیکن بیٹا وہاں کھڑا رہتا تب نا! میں جھکو کو گرانے میں لگا رہتے میں دم دبا کر نو دو گیارہ ہو گیا....."

"پہچان تو لیا ہوگا منور بھیا؟" ویرا نے لقمہ دیا۔

"کچھ اندھیرا سا تھا اس لئے اچھی طرح پہچان نہیں سکا لیکن خیال ہے کہ کوئی کے کنسٹرا کسی کا کوئی سپاہی ہوگا۔ اپنے علاقے میں تو ایسا کوئی میں نے دیکھا نہیں!"

بات پوری ہو جانے پر بھی سب کو کچھ ادھوری سی معلوم ہو رہی تھی۔ ایک اور شخص نے پوچھا: "پھر منور کاکا؟"

"پھر کیا بھیا؟ میں تو وہیں کھڑا رہا اور دانت بھینچ بھینچ کر گالیاں دیتا رہا لیکن جب وہ مسلمان آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تب دیکھا کہ جھکو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے!" اپنے چہرے کے جذبات پوری طرح نمایاں کرتے ہوئے منورا نے کہا۔

"جتنا میں اُسے دلاسا دیتا اتنا ہی وہ اور روتی تھی" ویرا کی طرف دیکھ کر کہنے لگے: "میں تجھے کیا بتاؤں ویرا کتنا رو رہی تھی وہ؟ پہلی بار سسرال جانے پر وداع ہوتے وقت جو لڑکی روتی ہے وہ تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں!" پھر بڑے زور سے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے: "میری آنکھیں بھی اس وقت ڈبڈبا آئی تھیں۔ بڑی مشکل سے اُسے چپ کر سکا۔ چپ تو وہ ہو گئی لیکن کہنے لگی: 'چاہے کچھ ہو لیکن گھر نہیں جاؤں گی' میں نے سوچا کہ اگر اکیلا چھوڑ کر چل دوں تو یہ کسی کنوئیں باولی میں گر جائے گی یا پھر جیسا یہ لاتا دلیا ہی کوئی مسلمان اُڑا لے جائے گا" آخر اُسے ڈرا دھمکا کر ساتھ لیا۔" اب منورا بات کو سمیٹتے ہوئے بولے: "ماتاؤں کی اور دھرم کی لاج رہ گئی اگلے جنم میں پاپ کرتے ہوئے بچائی ہوگی اسی کا یہ پھل تھا جو ٹھکانے لگ گئی۔" قصہ ختم کر کے منورا حقّہ پینے لگے۔

ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا: "یہ تو ٹھیک ہے منور کاکا لیکن ان بھولوں کی بات؟ ہے تو یہ اچھا ہی کہ اس کی عزت بچ گئی لیکن پھر بھی وہ آخر ذات تو کینوں کی ٹھہری!"

"ارے بھیا یہ تو میا ہی جانے ہے! اس وقت تک تو اُسے کوئی نہیں چھوڑے گا" اور پھر اٹھتے ہوئے بولے: "اب تو چلیں اور میا ہوں۔"

دیکھتا ہوں کیا ہوتا ہے؟" اور لکڑی کندھے پر ڈال کر دوسرے لوگوں کے ساتھ منورا بھی گھر سے نکل پڑے۔ گھر سے باہر نکلتے ہی خیال آیا کہ جیب میں تمباکو نہیں لیکن واپس لوٹنے کی ہمت نہ کر سکے کیونکہ گھر سے نکلتے وقت بھی بہت جھڑکیاں کھائی تھیں۔ شکر ہے اس نے کچھ نہیں کہا جیسے منورا نے اُس کی آنکھیں دیکھ کر پڑھ لیا تھا جیسے کہہ رہی ہو: "دیکھو اس بڈھے کو رنڈی کا ہاتھ لگا کر کے پانچ پیسہ جیسے رد دینے کا پاس کر آیا اس کی تو بات نہیں کرتا اور ادھر سے مسلمان کی باتیں بنا رہا ہے!"

منورا نے دوپہر کا کھانا کلّو کے ہاتھ منگا کر کھیت پر ہی کھا لیا اور پھر سارا دن اس طرح گزارا کہ ایک گھر سے ویرا کے یہاں اور ویرا کے گھر سے بھولے کے یہاں! آخر کھانا کھانے کے لئے تو گھر آنا ہی پڑتا لیکن اس وقت انھوں نے ایک بہانہ تلاش کر لیا۔ "مجھے کیا پتا کہ سب روپے ختم ہو گئے ہیں! محصول ادا کرنے کا ہے یا اور کچھ؟"

"اگر اس وقت یہ نہ دوں تو کہتا! میری تو جان کھا لی!"

"اس وقت رونا منہ ڈھک کر! مجھے کیا کرنا ہے" گھر والی نے کھاٹ پر گودڑیاں پھینکتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔ منورا نے ذرا ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی:

"اب ذرا کبھی ابھی کا رہی جاتی رہتی ہے اپنا"

جواب تو اس کا منورا اکثر گرم گرم لاتا تھا لیکن وہ چپ ہو رہے اور گھر والی بھی کواڑ لگا کر گھر میں اپنی بھڑاس نکالتی رہی!

× × × × ×

دوسرے دن صبح ڈھوروں کے کھلتے ہی موتی کے آنگن میں برادری کی پنچایت اس طرح جمع ہو گئی جیسے کھونٹوں پہ چڑھ کر آئی ہو۔ تالاب سا دھوروں کی طرح ان کا ایک ہی سوال تھا۔

لگے تو لوگ کیا کہہ رہے ہیں!" اور ایک جملہ تو زور سے ہی بڑبڑا گئے:
"بھیلن رنڈی گر پکا بیٹی، ادھرمن جیسی بات!" اس وقت ان لوگوں کی شکلیں بھی بھیلوں کی سی ہو رہی تھیں۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اُن کی خود اعتمادی نے سہارا دیا اور کہنے لگے: "ارے ان کی تو ہمت ہی کیا ہے!" یہ سوچ کر تن کر بیٹھ گئے۔ اس وقت بلا بھی ذرا کم ہو رہا تھا۔ منوردا نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے، مادھو بڑھسی سے پوچھا: "پھر لے جا کر کیا کروگے مادھو؟"
مادھو بڑھسی کے بدلے اس کا بھتیجا بول اٹھا: "جو کرنا ہوگا سو کریں گے، تمھیں اس سے کیا مطلب؟"

منوردا نے نرمی سے جواب دیا "مطلب ہے بیٹا! تبھی تو پوچھتا ہوں۔ میں اسے شسلان کے ہاتھ سے بچا کر لایا ہوں اس لیے مجھے جاننا تو چاہیے نا؟"

"بس جان لیا۔ اگر میرے سامنے آئے تو یہیں پنچوں کے سامنے رانڈ کی ناک کاٹ لوں!"

دیکھتا ہوں پھر کون آتا ہے سامنے..." کہہ کر سانس لینے کے لیے رُکا۔ اس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے سے کوئی بات کہے منوردا بولے:

"سُن لیا مادھو؟" پھر ذرا رُک کر بولے: "بولو لے جاؤ گے بیٹو کو؟" پھر پنچوں کی طرف غور سے تکنے لگے: "یہ تو تم چار بڑے بوڑھوں کا لحاظ کر رہا ہوں نہیں تو اس کو حوالات میں بند کرا دوں۔ تم سرکاری قاعدے قانون نہیں جانتے!"

"ارے منور بیٹا! تم بھی لڑکوں کی باتوں پر دھیان دیتے ہو۔ نہ تو ہمیں ناک کاٹنا ہے نہ اُسے مارنا ہے۔ ہمارا آدمی ہے اس لیے لینے آئے ہیں، ورنہ دو تو ہم اپنا راستہ لیں"
جھنکو کا پہلا خسر مادھو بولا۔
منوردا نے ہنس کر آہستہ سے کہا: "یہ بات کیسی کہہ رہے ہو مادھو بھیا؟" پھر ذرا رک کر: "تمھیں سے میں پوچھتا ہوں کہ اگر تمھارے گاؤں میں کسی کی عورت اس طرح آئی ہو تو کیا تم اُسے لوٹا دو گے؟..."
"ہاں ہاں ضرور!" مادھو بڑھسی بولا۔
دوسرے پنچوں کی طرف دیکھ کر منوردا بولے: "سُن لیا بھیا؟ کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟ ایمان سے کہنا!"

تین پنچوں میں سے ایک نے کہا: "جو شخص ایسی بات کہہ سکتا ہے، کر تو کوئی نہیں سوچ سکتا..." یہ سنتے ہی مادھو بڑھسی چلا اٹھا: "تو پھر یہاں کیا جھک مارنے آئے ہو؟" پھر انگلی نکال کر تنبیہ کرنے لگا: "پنچایت کرنا ہے تو ڈھنگ سے کرو۔ نہیں تو بہت برا کوئی نہ ہوگا!"

منوردا تعجب سے پنچوں کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ ایک بولا: "دھونس دے کر پنچایت کرانا ہے تو کسی اور کو دیکھو۔ ہم کسی کا دیا ہوا نہیں کھاتے جو تمھاری دھونس میں آ جائیں!"
"اور تم بھی کہاں کے راجا ہو جو ہم دب جائیں۔ پیچھے کی گری تم کیا پنچایت کروگے؟" مادھو نے جواب دیا۔
برادری کا اگوا دھنا اب تک چپ بیٹھا تھا۔ وہ بڈھا بھی اس بار آنکھیں نکال کر دھنا کی طرف دیکھتے ہوئے بول اٹھا:
"تو پھر یہاں کیا جھک مارنے کو بلایا تھا؟"
اگرچہ آپس کی اس جنگ میں منوردا کا تو فائدہ ہی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے جان بوجھ کر لوگوں کو اکسایا ہو لیکن انھوں نے اپنی ہمدردی ظاہر کی:
"ارے بیٹا۔ یہ تو وہ بات ہو گئی کہ سانڈ سانڈ لڑیں اور باڑی کے بیچ اُڑیں! بیچارا موتیاں ناحق مارا جائے گا۔" پھر دھنا سے کہنے لگے "دیہ معاملہ تو دھنا کا ہے۔ پھر بھی میں لڑتے رہنا!"
دھنا نے صاف صاف بات کہہ دی: "دیکھو مادھو! میں تو یہ کہتا ہوں اگر تم اُسے لے جانا ہی چاہتے ہو تو تم جاؤ اور تمھاری پنچایت جانے۔ میں تو اس پاپ میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ہاں اگر کچھ جرمانہ کر کے رفع دفع کرنا ہے تو سب مل کے ابھی طے کر لو۔"
اگرچہ ذرا دیر کے لیے پھر ہنگامہ بڑھ گیا کیوں کہ کچھ لوگوں نے دھنا کی تائید کی اور کچھ نے مخالفت بھی کی، لیکن ان سب کو چپ بیٹھ رہنے والے پانچ پنچوں نے تھوڑی سوچ بچار کے بعد یہ سمجھایا کہ کوئی لال تو نہیں کہ برادری سے نکال دیا جائے پھر اگر پنچوں کی مرضی ہو تو پانچ یا پانسو کا جرمانہ کر کے برادری میں واپس لے لیں گے۔" مادھو بڑھسی نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا: "ہاں ٹھیک ہے! ایک بار تو برادری میں اس کا حقہ پانی بند ہونا ہی چاہیے۔"
ابھی تک منوردا چپ بیٹھے تھے لیکن اب اُن سے نہ رہا گیا

یہ جھگڑا ختم کرو۔"

ایک بولا: "یوں کیسے نمٹ سکتا ہے ابھی تو نہ جانے کیا کیا ہوگا۔"

بہت کچھ رگڑے جھگڑے کے بعد آخر یہ طے پایا کہ موتی پنچایت کے رواج کے مطابق جرمانہ ادا کرے، یعنی دو دعوتیں کھلائے اور تیسری شرط جو جھکو کی سسرال والوں نے پیش کی وہ یہ تھی کہ جھکو دانتوں میں تنکا دبا کر پنچایت کے سامنے کھڑی ہو۔"

منوروا نے ایک مرتبہ تو یہ تسلیم کر لیا لیکن بعد میں برادری کے پانچ اگوؤں کو ایک طرف علیحدہ لے گئے اور کہنے لگے:

ادھو بھیا یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اس میں نہ تو تمہارے خاندان کی عزت بڑھے گی اور نہ پنچوں کی! فقط ایک کہاوت رہ جائے گی۔ ہاں ایک بار ضرور تمہارے نام کا ڈنکا بج جائے گا۔ لیکن اس کا نتیجہ بعد میں تمہارے لڑکے لڑکیوں کو بھگتنا پڑے گا۔ پھر ادھو بڑھئی کو غور سے دیکھتے ہوئے سمجھانے لگے: "بعد میں تمہارے ہی آدمی کہیں گے کہ، دیکھ لیا آس۔ ادھو کا خاندان بڑا بھاری خاندان ہے۔ جھکو کی جو حالت کی تھی ویسی ہی اپنی لڑکیوں کی کرے گا تو؟ اور سچ کہتا ہوں ادھو بھیا! لوگ تو دونوں طرف ڈھنڈورا پیٹتے ہی ہیں!"

دھنا بڑھئی کسی سوچ میں غرق تھا منوروا نے ذرا دم لے کر اس کی طرف دیکھا: "اور دھنا کاکا! اس میں پنچوں کی کچھ عزت نہیں بڑھ جائے گی۔ مجھے کیا؟ میں تو اس لڑکی سے تنکا چھوڑ پیڑ تک اٹھوا دوں! لیکن اس میں ہم سب کی کیا شان ہوگی؟ ہاں اگر کسی مرد سے تنکا دبواؤ تو بات بھی ہے! لیکن ایک عورت سے.... مجھے تو یہ ٹھیک نہیں لگتا!"

منوروا نے اتنا کہہ کر ایک ٹھنڈی سانس لی پھر بولے: "میرے تو بال سفید ہو گئے لیکن ایسی سزا دنیا میں آج تک نہ دیکھی نہ سنی!"

آخر لوگوں نے وہ شرط واپس لے لی۔ لیکن اب ادھو بڑھئی نے ایک شرط اور رکھ دی۔

"لڑکی یعنی اس کے میکے والے بیس برہمنوں کو بھوجن کرائیں!"

اسے سب نے منظور کر لیا۔

منوروا دل ہی دل میں ہنسنے لگے یہ سوچ کر کہ جو [illegible] دن تک ایک برہمن کو بھوجن کرایا تھا اس کا تو یہ نتیجہ [illegible] کے سر پر لشکر چڑھ گیا ہے! اور اب بیس کو....

* * * * *

اگرچہ موتی کا گھر والا کوئی نظر نہیں آیا تھا لیکن اس کے کواڑ تو کھلے تھے گاؤں کے چیلوں نے چوپال میں بیل گاڑی چڑھا دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چورا اور دال بھات تیار ہو گیا۔ بڑھئیوں کی پنچایت اور گاؤں کے دوسرے چیلوں کو کھلانے کے بعد منوروا بھی کھانے بیٹھ گئے۔

شام کو حقّہ ڈکا چلانے کے بعد منوروا نے ان پانچ اگوؤں کو ایک طرف کونے میں لے جا کر رواج کے مطابق دس روپے گن کر دیئے۔ پانچوں کو "سروپا" کے پانچ پانچ الگ دیئے اور مخمل پہ دستخط کرا کر جیب میں رکھ لی۔

ایک دعوت کھا کر اور دوسری بتایا چھوڑ کر شام کو سب نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ کہیں سے بچہ آ پہنچا اور چھ سات کوس کے اپنے گھر لے گیا۔ صرف حقّہ تماکو کے پینے ہی نہیں بلکہ رات بھر بھرنے کے لیے ــــ لیکن ان میں جھکو کی سسرال والا کوئی نہیں تھا۔ جھکو نے ان سے اصرار بھی نہیں کیا تھا اور نہ اصرار کرتا سب ہی [illegible]

شام ہونے پر ابا اور جھکو منوروا کے گھر سے آ گئیں اور موتی بھی کہیں سے آ پہنچا۔ "کھاؤ جلدی! ڈھوروں کی بیرا ہو گئی!" چوپال میں بیٹھے ہوئے منوروا نے کہا۔

ابا نے پہلے تو کھانے سے انکار کیا لیکن منوروا کے میٹھے بول اور جھکو کے محبت بھرے اصرار سے مجبور ہو کر تھوڑی دیر میں کھانے پر آمادہ ہو گئی۔ موتی اور جھکو سے کھانا کھانے کے لیے کہہ کر خود منوروا کے پاس آ بیٹھی۔

منوروا نے پنچایت کی ساری باتوں کا خلاصہ سنا دیا اور ڈھائی سو روپے جو بیٹے کے گھر سے لائے تھے ان کا حساب بھی دے دیا۔ پانچ روپے بچے تھے وہ ابا کو دیتے ہوئے بولے:

"یہ باقی بچے ہیں!"

منوروا نے پوچھا: "اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ پوچھو گاؤں والوں سے!"

"پھر بھی"

"لوگ تو نہ جانے کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فلاں کاکا نے تو آج اپنے دوسرے رشتے سے لڑکے کو بھی ٹھکانے لگوا دیا!" منوروا کو بھی یہ احساس اسی وقت ہوا کہ معاملہ ایک چھوٹا دو کوڑی کا ہو گیا ہے۔

"لوگ بھی بیٹھے کیسی کیسی باتیں بنا لیتے ہیں" یہ کہکر منوروا ہنسنے لگے۔

"بس تم سے اور آتا ہی کیا ہے۔ ہنس ہنس کر ہی تو سب کچھ بگاڑ لیا ہے۔" گھروالی نے کہتے ہوئے منہ بنایا۔

منوروا ذرا سنجیدہ ہو کر بولے: "اچھا، میں تجھ سے اپنے دل کی بات کہوں!" اور ذرا تن کر بیٹھ گئے حقے کو اپنی بغل میں رکھکر کش لگاتے ہوئے بولے: "لڑکے کو تو نہیں لیکن لڑکی کو ٹھکانے لگا دیا ہے، یہ بات سچ ہے!"

"چپ چاپ بیٹھے رہو، کیوں پاپ میں پڑتے ہو۔ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ؟"

یہ کہکر گھروالی نے منوروا کی طرف سے نظریں پھیر لیں اور بولی: "اسی لئے تو..... بھگوان جانے کہاں اتنے دن لگا دیئے۔ لڑکا رنڈوا نہ رہ جائے اسی لئے اُسے گھر واپس لے آئے۔" پھر ایک دم منوروا کی طرف دیکھکر ہاتھ مٹکایا اور بولی: "بال سفید ہو گئے سفید! اب تو بھگوان کو سر پہ رکھکر بولو۔" منوروا چپ چاپ بیٹھے مسکراتے رہے یہ دیکھکر گھروالی کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ بولی: "ایک کا گھر بھر دیا اور دوسرے کو بھکاری بنا دیا۔

—— لاؤ کہاں ہیں وہ روپے جو تم لیتے تھے؟ زیادہ تو گئے بھاڑ میں مگر جو گھر سے لئے تھے وہ تو دو!" اس کے بعد بس گھروالی روپوں اور زیوروں کا رونا ہی روتی رہی۔

"میری بات تو سُن! پہلے تو پوچھا ہوتا کہ کہاں گیا تھا؟ اور کیا کر آیا۔ پھر اگر چاہے تو لڑتی رہنا!" یہ کہکر منوروا نے جیب سے روپوں کی ایک تھیلی نکالی اور اُسے گھروالی کے سامنے رکھکر کہنے لگے: "لے اب تو مانے گی کہ میں نے لڑکے کو کیسا ٹھکانے لگایا ہے!" روپے دیکھتے ہی گھروالی کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ دیکھکر منوروا

اُسے بہلانے لگے "میری جان! یہ کیا کہ اپنی ...

میں تجھے ابھی ہی مثال دوں۔"

جب میرے دادا جیتے تھے تو گھر میں گھی پانی کی طرح بہتا تھا اور بیٹے کے گھر میں پانی جیسی رقم بھی پڑے رہتے تھے لیکن آج تو ہی دیکھ رہی ہے کہ جانے اُن میں سے؟" پھر ذرا رُک کر بولے: "اور کسی کے یہاں ہوگا بھی تو اس میں سے کچھ ساتھ نہیں جائے گا، فقط اپنے کرم دھرم ساتھ جائیں گے!" یہ کہکر منوروا نے زور سے سانس لی اور اس طرح بولنے لگے جیسے خود سے ہی کہہ رہے ہوں: "احمد آباد جاتے ہوئے اس دن رات کو جو بات مہاراج نے کہی تھی وہ سچ ہی تھی..... پھر گھروالی کی طرف دیکھکر ہنسی آتی ہوئی سے راون کی اولاد بچنا چاہیئے! بھگوان ہی..."

"تو کیا تم احمد آباد تک ہو آئے؟" گھروالی نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔

"ہو گیا آیا؟ دو راتوں رہ کر بھی آیا!"

گھروالی نے منوروا کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن وہ غصہ نہ کر سکی۔ پھر اس سے بغیر کہے رہا نہ گیا۔ "جب گئے تھے تو کام اچھا ہی کر آتے یہ کھٹکنی تو یہاں سے نکل جاتی! پھر اگر سادھو بن جاتے تو کون منع کرتا تھا۔" پھر کچھ رُک کر کہنے لگی: "میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ تم سے کچھ نہیں ہوگا!"

منوروا مایوسی کے ساتھ اتنا ہی بولے: "سب کچھ ہو سکتا تھا، لیکن نہیں کیا، یہ بات بھی سچ ہے!" پھر تھوڑی دیر خاموش رہے اور خود بخود کہنے لگے۔

"نہیں، نہیں! اچھا ہی ہوا، بھگوان نے مجھے بچا لیا۔"

گھروالی نے ذرا گھبرا کر پوچھا: "کیوں کیا پولس کو خبر ہو گئی تھی؟"

منوروا نے ہنس کر جواب دیا: "یہ بات ہوتی تب بھی کچھ ایسا بُرا نہ تھا!"

"کچھ سیدھی بات تو کہو!"

"کہوں گا بھی تو کوئی نہیں مانے گا۔ اور تو تو مجھے بالکل پاگل ہی سمجھے گی!" یہ کہکر منوروا خاموش ہو گئے۔ گھروالی کے مسلسل اصرار سے مجبور ہو کر انہوں نے کہنا شروع کیا: "میں تجھے کیا بتلاؤں؟

کے مارے تو دن سے اچھی طرح تمہاکو بھی نہیں پی سکا۔"

"لیکن مجھے خبر کیا تھی! آتے ہی تم نے بات تو بتائی ہوتی!"

گھروالی کھڑی ہوگئی۔ منوروا بولے: "میں نے سوچا کہ سارا کام نمٹا کر ہی کہوں تو اچھا ہے ورنہ ادھر ادھر بات پھیلی تو تیرے نا پڑے گی، مجھے کیا پتا تھا کہ یوں سیدھی طرح مان جائے گی!"

گھروالی نے کٹھیا سے تماکو اتار کر منوروا کو دیتے ہوئے کہا: "میں ایسے کام میں کیا بولتی؟"

پھر نیچے بیٹھ کر بولی: "یہ خبر ہوتی تو جھکو کے کپڑے ملیا کے گھر میں کیوں پہنانا پڑتے؟ کیا اپنا گھر نہیں تھا؟ تمہیں اتنا بھی نہیں سوجھا!"

"لیکن اب کیا، اب تو وقت نکل گیا۔ اچھا دن دیکھ کر جھکو کا نیوتہ کرلے۔ اور بیاہ کرنے کی تجھے خواہش ہو تو بھی منع نہیں کرتا۔ برا کام دوبارہ مت کرو لیکن اچھا کام سو مرتبہ کرو تو کون روک سکتا ہے؟" منوروا سکون کے ساتھ حقہ پینے لگے۔

دیر تک گھروالی سوچتی رہی اور آخر بول اٹھی: تم ہو تو ناتھی کے دو جوڑے ایک وہ کمخواب کا، دوسرا ریشمی رکھے ہیں، اب انھیں کون پہنے گا!...

"کون کیا، جھکو پہنے گی!" پھر ہنس کر کہنے لگے: "اری پگلی اس میں مجھ سے پوچھتا ہی کیا!" پھر کھڑے ہوگئے۔ "چل اٹھ! کھٹیا بچھا دے۔" کہا اور باہر نکلے: "اور تجھے خبر ہے، جھکو تو اپنے بھتیجے، کلوا کے بچے کے، واسطے اچھا سا کھلونا لائی ہے! تو دیکھ کر خوش ہوجائے گی۔" چلتے چلتے کہنے لگے، "کل تو دیکھنا تو سہی!"

"ضرور لائی ہوگی۔ پھوپھی نہ لاتی تو دوسرا کون لانے والا تھا؟" گھروالی بھی یہ کہکر اپنے کاموں میں لگ گئی۔

کام ختم کرکے باہر آئی تو منوروا پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ بڑبڑاتی ہوئی واپس چلی گئی۔ "میں نے ہی احمدآباد بھیج دیا تھا، بھگوان جانے کیا کیا مصیبت اٹھائی ہوگی۔ اتنے دنوں بعد آج ذرا آرام سے نیند آئی ہے!" پھر پانی کا لوٹا بھر کر کھٹیا کے نیچے رکھا، فانوس اچھی طرح اٹھا دی، اور خود بھی سونے کے لئے چلی گئی۔

رات کو خواب میں بھی دیکھا تو جھکو اور ناتھی ساتھ ہی نظر آئیں کبھی کنویں پر پانی بھرتی ہوئی کبھی کنڈے تھاپتی ہوئی۔ نیند پوری ہونے پر کروٹ بدلی تو اب خواب میں بھی جھکو کے مستقبل کا پروگرام بن رہا تھا۔ جھکو کو اچھی طرح کھلا پلا کر کپڑے دیئے۔ سنہری پھولوں والا کمخواب، گلابی ریشمی ساڑی اور اصلی زردی کا دوپٹہ ـــ ناتھی کے جتنے بھی کپڑے تھے وہ سب جھکو کو پہنا کر بیاہ کیا۔ لوگوں نے پوچھا، "کیا ہو رہا ہے آج پھر!" تو اس نے جواب دیا۔ "اس دن تو گھبراہٹ میں جیسا تیسا کر دیا تھا، اصل بیاہ تو آج ہوا ہے!! اب تو ہمیں ہی اس کی ساری رسمیں پوری کرنی ہیں!" اس میں بڑا مزا آ رہا تھا کہ آنکھ کھل گئی!!

خواب یاد کرکے منوروا کی گھروالی خوش ہونے لگی۔ اور خود بخود بولی:

"بڑا ثواب کرنا ہے!!"

باہر نکل کر دیکھا تو صبح ہو چکی تھی، شفق کی اودی کا گہرا رنگ ہلکے گلابی رنگ میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ گھروالی نے دیکھا کہ روز سویرے اٹھ جانے والا منوروا ابھی تک خراٹے لے رہا ہے۔ وہ خود بخود بڑبڑانے لگی۔

"ابھی تک سو رہے ہیں!" یہ کہتی ہوئی وہ چلی ہی تھی کہ سامنے سے کسی آنے والے پر جھکو کا دھوکا ہوا۔ وہ قریب آئی تو اس نے پوچھا "اتنے سویرے کیسے آنا ہوا بٹیا؟"

"میری ساس نے کہلا کر بھیجا ہے کہ منوروا کا اس وقت میکے والوں کے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں، مجھے لینے کے لئے آدمی۔" اور منوروا کو سوتے ہوئے دیکھ کر "تم کہہ دینا کاکی" یہ کہتی ہوئی واپس ہونے لگی۔

یہ آواز سُن کر منورما کی آنکھ کھل گئی۔ اُنھوں نے اُٹھتے ہی جھنکو کو آواز دی لیکن وہ گلیارا پار کر کے نکل چکی تھی۔

گھر والی نے منورما کی طرف دیکھا اور پھر جاتے ہوئے کہنے لگی:

"بالکل پگلی ہے!"

گھر والی کے اس پیار بھرے جملے میں منورما کو کتنا لطف آیا اس کا اندازہ اتنا چہرے سے نہیں ہو سکتا جتنا اُن کا دل دیکھ کر ہوتا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے۔

اور گھر کا کام کرتے ہوئے اُن کی بیوی بھی دل ہی دل میں کئی پروگرام بنا رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔

× × × × × ×

تیسرے ہی دن جھنکو کو کھلا پلا کر، اور نئے کپڑے پہنا کر سسرال بھیج دی گئی۔ لوگ طرح طرح کے سوال پوچھ رہے تھے جن کا ایک ہی جواب منورما کی بیوی سب کو دے رہی تھی: "اس دن تو جلدی جلدی میں رسم پوری کر دی تھی۔ باقی جو کچھ کرنا تھا وہ آج کر رہے ہیں!" اور پھر بھی لوگوں نے یہ تو ضرور کہا کہ: "یہ سب کچھ تو پہلا کو کرنا چاہئے تھا تم کیوں کر رہی ہو" مگر منورما کی گھر والی اس طرح کہتی جیسے وہ ان کے دل کا چور پکڑ رہی ہے: "اب تو جھنکو کی ساری رسمیں یہیں ہی کرنا ہیں بہن!" پھر اس کی آواز بھرانے لگی اور وہ بمشکل پوری بات کر پائی۔

"اس کا بھائی تو اس سے بولتا بھی نہیں!" — جھنکو پھوٹ پھوٹ کر سسکیاں لے رہی تھی۔ اس جملے نے اُسے جھنجھوڑ دیا اور وہ رونے لگی۔ وہ سب لوگوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ منورما جو ترسے بیٹھے حقہ پی رہے تھے اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے۔

ایک عورت نے جھنکو کو دلاسہ دی: "ارے چپ ہو جا بیٹا! وہ بولتا نہیں تو کیا بھائی نہیں رہے گا؟ کل ہی بہن بہن کرتا ہوا آئے گا۔"

جھنکو کے رونے کی آواز گلیارے کے باہر نکڑ والے گھر کے آنگن میں کھڑی ہوئی ایک عورت کے دل میں اترتی جا رہی تھی وہ آنکھیں پونچھتی ہوئی گھر میں چلی گئی!

منورما کی گھر والی نے گلا صاف کر کے اور آنکھیں پونچھتے ہوئے جھنکو کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اسی طرح کچھ دیر کھڑی رہی۔ اس وقت اس نے وہ الفاظ ادا کر دئے جو منورما کے منہ سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

"چپ ہو جا بیٹا، چپ ہو جا! جب تک ہم زندہ ہیں تب تک تجھے کس بات کی فکر ہے؟"

ایک طرف تو عورتوں سے بھرے ہوئے آنگن میں آنسو بہاتی ہوئی جھنکو کو سسرال کے لئے وداع کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف وہ چار مردوں کے جمگھٹ میں خاموش کھڑے ہوئے منورما کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی۔!!

عالمی ادب کے ناولٹ

پرل ایس بک

پرل سیڈنسٹرکر بک بمقام ہلس بورو مغربی ورجینیا میں بتاریخ ۲۶ جون ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئیں۔ والدین عیسائیت کے مبلغ ہونے کی حیثیت سے چین سے دوسرے ممالک کے دورے پر روانہ ہوئے۔ مگر بعد واپس آکر چین میں مستقل بس گئے۔

اس کے اپنے الفاظ میں "اس نے یانگ سی دریا کے قریب ایک پہاڑی پر بنے ہوئے چھوٹے سے بنگلے میں بڑے سکون و اطمینان کی فضا میں اپنا بچپن گزارا۔" انھوں نے انگریزی سے پہلے چینی زبان سیکھی۔ ان کی چینی نرس نے ان پر سب سے زیادہ اپنا اثر چھوڑا۔ اور انھوں نے سب سے پہلے اسی کے ذریعہ وہاں کے عوام کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس کے پاس پرل کے لئے جادو وغیرہ کے قصے کہانیوں کا لامحدود خزانہ اک انتہائی لطیف وخوشی کا ذریعہ تھی۔

پرل پر اپنی ماں کا بہت بڑا اثر پڑا "میری ماں نے مجھے سب کچھ سکھایا۔ خاص طور پر الفاظ اور ان کے معنی کا حسن۔ اس نے بچپن ہی میں مجھے حسن کو پہچاننا اور احساسات و مشاہدات کو قلمبند کرنا سکھا دیا تھا۔" پہلے شنگھائی میں تعلیم حاصل کی اور امریکہ میں اس کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

شمالی چین میں ۵ سال شادی کے بعد گذارے۔ جہاں چینیوں کی قریب ترین دوست بن گئی۔ اور چینی بھی اس کے قریب آگئے۔

۱۹۳۲ء میں مسز پرل نے اپنا شہرۂ آفاق ناول "دی گڈ ارتھ" لکھا۔ جس پر انھیں پلٹزر انعام ملا۔ اس کا ترجمہ دنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔

اس کے بعد ان کے قلم سے بہت سے عظیم ناول نکلے جن میں 'دی مدر'، 'دی پیٹریاٹ'، اور ڈریگن سیڈ بہت مشہور ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں انھیں ادبیات کا نوبل پرائز ملا۔ وہ پہلی امریکن عورت ہیں۔ جنھیں یہ اعزاز ملا۔

ناول نگاری بقول خود ان کے ان کی زندگی کا ایسا مقصد ہے جس کو پورا کئے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتیں۔ اسی لئے ان کے ناول زندگی کے حقائق کی عکاسی کرتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے کرداروں کے ساتھ پورا پورا خلوص برتا ہو۔

پرل ایس بک

م ہ قاسم سدیقی

اور وہ زور زور سے رو رہی تھی۔

"وہ مجھ کو نہیں پال سکتی" اس نے روتے ہوئے کہا تھا "میں ابھی بہت کمسن ہوں" اس نے اپنے ننھے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"تم نے مجھے مار ڈالا" اس نے ڈرامائی انداز میں روتے ہوئے کہا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف نمایاں تھا۔ "خاموش" رونیلڈ نے ایسے لہجے میں کہا کہ خود پتہ نہیں سکا کہ وہ آواز اسی کی تھی یا کسی اور کی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کچھ مٹھیاں باندھ کے کھڑا رہا۔ خاموش خاموش، وہ بڑبڑاتا رہا اور بالآخر اس کے ان غضبناک الفاظ سے خوفزدہ ہو کر گلیڈیز کا رونا رفتہ رفتہ سکون میں بدل گیا۔ "رات کو یہاں آ جانا" رونیلڈ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "میں خود تمہاری دیکھ بھال کروں گا"

لیکن اسی رات اس چھوٹے تنہا آپریٹنگ روم میں جبکہ وہ بیٹھی تھی کسی نے دروازہ کی کنڈی کھول لی۔ اس نے تاریکی کے پردہ کو چھوڑ دیا اور خاموش کھڑا اس شخص کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دروازہ میں ہر رات کو قفل لگا دیا جاتا تھا لیکن اس نے تو اندر سے بھی کنڈی لگا دی تھی۔ پھر اس نے کوارٹر کے تالے میں چابی کے گھمانے کی آواز سنی اور اسے معلوم ہو گیا کہ وہ ڈاکٹر ہیٹنگز ہی ہے کیونکہ اس تالے کی کنجیاں اس کے اور ڈاکٹر ہیٹنگز کے ہی پاس تھیں۔

"مجھے اندر داخل ہونے دو رونیلڈ"۔ اس نے ڈاکٹر ہیٹنگز کو کہتے سنا۔ اس نے فوراً سمجھ لیا کہ چھپانا بے سود ہے۔ کیونکہ جب تک اس بوڑھے کو اندر نہ آنے دیا گیا وہ دروازہ پر ہی کھڑا رہے گا۔ لہٰذا وہ دروازہ پر گیا اور اسے کھول دیا۔

"اندر آئیے" اس نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔ "میں آپ کے کام میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا مگر ایک ضروری کام آ گیا"

"مس ریبل کہاں ہے" ڈاکٹر ہیٹنگز نے کمرہ کے ارد گرد نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ مس ریبل وہاں نرس تھی۔

"وہ مجھے نہ مل سکی"

لیکن بوڑھے کو حقیقت معلوم کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس نے نیچے دراز عورت کی طرف دیکھا جس کا چھوٹا سا چہرہ سفید اور رستا ہوا تھا۔ پھر اس نے ایتھر کی تھیلی جھپٹ لی۔ "تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے" اس نے چیخ کر کہا "تم نرے پاگل ہو"

رونیلڈ نیچے بیٹھ گیا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا وہ جھوٹ بولنے میں کمزور تھا کیونکہ اس نے کبھی جھوٹ بولنا سیکھا ہی نہ

تھا ڈاکٹر ایک لمبے لمبے ڈگ کمرہ میں خاموش ٹہلتا رہا پھر بالآخر بہت جلد ہوش میں آ جائے گی۔ جب تک وہ تم میرے دفتر میں جاؤ"

اس نے پھر گلیڈیز کی جانب نہیں دیکھا اور ڈاکٹر ہیٹنگز کے پیچھے پیچھے دفتر میں چلا گیا۔ بوڑھے آدمی نے بڑی احتیاط سے کواڑ بند کر دئے "بیٹھ جاؤ" اس نے نرمی سے کہا اور خود بھی اپنی بڑی میز کے پیچھے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "آؤ اب کوئی ترکیب سوچیں کہ تم کیا کر سکتے ہو۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ کس کر بھینچ لئے "اگر تمہارے دل کی یہی کیفیت رہی تو وہ تمہیں فوج میں نہیں گھسنے دیں گے"

"فوج کی بھرتی" رونیلڈ بھڑک اٹھا۔ "فوج" اس نے سوچا اگر اس کے دل کی یہ کیفیت نہ ہوتی تو وہ نہ جانے کب سے فوج میں بھرتی ہو چکا ہوتا اور گلیڈیز سے اس کی ملاقات ہی نہ ہوئی ہوتی لیکن یہ کوئی سنگین بات نہ تھی صرف اس کو اپنے میدان میں کام سے باز رکھتی تھی۔ اس نے انھوں نے اس سے کہا تھا کہ تم محاذ پر زیادہ کارگر ثابت ہو گے اور اس نے اپنا سر ہلا دیا تھا اسے اب یقین ہوا کہ اس شکست کے احساس نے اس کی افادیت کو نقصان پہنچایا ہے اور یک بیک یہ بات بھی واضح طور پر اس کے ذہن میں آئی کہ یہی احساس شکست اس کی جذباتی پریشانی کا باعث تھا جس نے چاہے براہ راست نہ سہی بالواسطہ ہی اسے گڑھے میں ڈال دیا اور ساتھ ہی اسے اس حرکت پر ندامت بھی ہوئی کہ اب وہ اپنے ملک کے لئے کسی اور کے لئے یا اپنے ہی لئے کس مصرف کا رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر ہیٹنگز اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے ان کے ہاتھ کوٹ کے پیچھے جالی میں چھپے ہوئے تھے اور وہ انعطار کے پردے کی جانب ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ "یہ تو واضح ہے" انھوں نے کہا "کہ تم اب یہاں نہیں رہ سکتے وہ لڑکی" انھوں نے کچھ نفرت آمیز تاثر سے اپنا منہ بنایا: "وہ تو تم کو تباہ کر ڈالے گی"۔ وہ اچانک گھومے اور انھوں نے لڑکے کی طرف دیکھ کر کہا: "مگر اگر تم اس جھمیلے میں پڑ جاتے تو پہلے سے کہیں ابتر حالت ہو جاتی۔ وہ تمہیں تباہی کی اس منزل پر لے جا کر چھوڑتی جہاں وہ تم کو لے جانا چاہتی تھی۔ اور تم ان لوگوں میں سے ہو جو محض اس سے مطمئن نہ ہوتے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ چیز تمہارے حق میں نہیں ہے۔ کیا تم نے کبھی بلیک میل کا نام سنا؟ اب بوڑھے کی آواز میں قدرے سختی آ گئی تھی "تمہاری زندگی تباہ و برباد ہو جاتی۔ ویسے ابھی ہی تمہارا عہدہ کونسا اونچا ہے" اور اب وہ کچھ نرم ہو گئے "خیر ہم اس کا کچھ انتظام کر دیں گے"

یہ اس زندگی کے عقب کا ایک حصہ تھا۔ انھوں نے کبھی لن تان کو نہیں دیکھا تھا صرف اس کا نام ہی سنا تھا۔ اجاڑ پہاڑیوں میں کہیں چھاپہ ماروں کا سردار رہتا تھا اور چند خفیہ گروہ سے اس نے اپنے علاقے کے دس ہزار کسان سپاہیوں کی رہنمائی کی تھی اور اس میں حکایت اور حقیقت کا امتزاج تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے پاس کچھ بیرونی ملکوں کی اسناد ہیں جن کی رو سے وہ جو زبان چاہے بول سکتا ہے اس کا قد ساڑھے چھ فٹ اور کچھ بولیوں میں ایک روسی بیوی یا ہاتھوں میں دو دو انگوٹھے یہ خصوصیات بھی اسی کی تھیں۔

یہ سب سن کر رونیلڈ نے کہا "دو انگوٹھوں کی بات تو میں نہیں کہہ سکتا ہوں، لیکن چاہے قابل یقین ہو یا نہ ہو یہ حقیقت تھی کہ لن تان نے گذشتہ ماہ میں دشمن کی فوجوں کو کوئی سو میل پیچھے دھکیل دیا تھا۔

میں نے یہ پڑھے ہوئے کہا کہ لن تان نے کسی بھی چینی فوج کے جرنیل سے زیادہ جاپانیوں کو مارا ہے۔" رونیلڈ نے جاری کیا "لیکن میرا خیال ہے کہ میرے اس بیان سے وہ لن تان اور بھی خوف زدہ ہو گی۔"

خرابے کے ڈھیر کے درمیان بنے ہوئے راستہ پر کچھ دور تک وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔

"مجھے افسوس ہے" رونیلڈ نے بالآخر کہا "میں کچھ تو جانتا ہوں کہ آخر بغیر دواؤں کے آپریشن کرنے میں کیا مشکلیں پیش آتی ہیں۔ یہ تو یقین ہے کہ کچھ نہ کچھ اس ضمن میں ضرور ہونا چاہئے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے!"

"چونکہ ہم پر باقاعدگی سے بمباری ہو رہی ہے اس لئے یہ تو ظاہر ہے کہ بہت پر فتح ہماری ہوگی" تیج نے کہا

انھوں نے ایک تباہ شدہ صحن طے کیا اور ایک دروازہ میں سے ہو کر جس میں کواڑ نہیں تھے وہ لوگ سامنے گئے۔ ایک خالی کمرے میں لاں لی ہلکے نیلے رنگ کے سوتی گاؤن میں ملبوس میز پر پیالے اور رکابیاں سجا رہی تھی اس کا سرخ منہ بالکل ٹیڑھا ہو گیا۔

"میں جانتی تھی تم آج یہاں آؤ گے" اس نے رونیلڈ سے کہا۔ "آج صبح ایک بوڑھی عورت دیہات سے جیب میں انڈے رکھ کر لائی تو میں نے سوچا۔ رونیلڈ آنے کے لئے زمین ہموار کر رہا ہے۔ خدا نے تمہیں نصیب بنایا ہے۔ رونیلڈ میں نے بارہا یہ دیکھا ہے۔ جب تم چلے جاتے ہو تو ہفتوں ہم باجرہ اور گوبھی پر گذارتے ہیں اور پھر اچانک کوئی مچھلی پکڑ تا ہے اور تیج کو دے دیتا ہے اور میں خود سے کہتی ہوں۔ آہ اب تو رونیلڈ آنے والے ہوں گے کیونکہ ان کی تقدیر سے خدا نے آج مچھلی بھیجی ہے اور شام ہونے نہیں پائی کہ تم یہاں موجود ہوتے ہو۔

رونیلڈ نے اس کے حسین چہرہ کو جی بھر کے دیکھا اور مسکرا دیا۔ مسکراتے ہوئے لاں لی کی سیاہ آنکھیں مسرور ہو گئیں۔ لیکن تیج نے اس کی گفتگو کی طرف توجہ دئے بغیر رونیلڈ سے سنجیدہ لہجہ میں اپنے اندرونی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اور اسپیشل رسد کے بارے میں جو تم نے بھیجنے کا کہا تھا کے متعلق کسی نے کچھ نہیں دیا۔ کیا وہ مرحلہ میں جن کا ذکر بوڑھے آدمی نے کیا تھا؟"

"وہ دہلی ہوں گے" رونیلڈ نے جواب دیا "بر ماسڑک کے ختم ہونے کے پہلے ہی امریکہ سے آخری جہاز آیا تھا۔"

"جلدی سے ہاتھ منہ دھو لو" لاں لی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "انڈے تیار ہیں۔"

اس نے ایک چھوٹی تانبے کی کیتلی میں سے گرم پانی مٹی کے برتن میں ڈالا اور رونیلڈ کو ایک صاف ستھری تولیہ تھما دی۔ اور اس لمحہ اس کی نظر تیج کے زخمی ہاتھ پر پڑی۔

"تیج" وہ چلائی "یہ تم نے کیا کر لیا؟"

"میں نے اپنے ہاتھ کو کاٹ لیا ہے۔" اس نے لاپرواہی سے کہا۔

"لیکن تب میں نے تو دیکھا نہیں۔"

"میرے خیال سے یہ اس وقت ہوا جب رونیلڈ نے آکر کہا کہ بیہوش کرنے کی دوا نہیں ملی میں کلوروفارم پہنچنے کے لئے بیٹھا تھا۔" اس نے سادگی سے کہا۔

اس نے تیج کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے نہایت نزاکت سے سنبھال کر بیٹھی "لیکن یہ تو بڑا کاری گھاؤ ہے"

اس نے متحیر ہو کر کہا "یہ بہت گہرا زخم ہے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ وہیں رک جاتے اور اپنا ہاتھ کسی چیز میں ڈبو لیتے"

"میں ایک سیکنڈ بھی نہیں رک سکتا تھا" اس نے جواب دیا "مجھے اس شخص کو زندہ رکھنا تھا" ان دونوں میں ایک دوسرے کے لئے جو گہری محبت تھی اسے دیکھ کر رونیلڈ کو رشک ہوا۔ تیج نے موضوع بدلنے کا فیصلہ کیا مگر اس کی آنکھیں جو لاں لی کو گھور رہی تھیں۔ محبت سے بھری ہوئی تھیں۔ اور لاں لی اپنی آنکھیں اوپر کئے ہوئے پرشوق انداز میں تیج کو دیکھ رہی تھی۔

رونیلڈ نے یہ سب کچھ سوچ کر آہ بھری اور ملکت افسوس ملا کر کہا "مجھے افسوس ہے۔" اس نے کہا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

یکایک لال ل اور یچ کے چلے جانے کے بعد سے کچھ تھکان محسوس ہوئی گزشتہ سات تین دن اور راتیں اس کو ٹرک چلاتے گذر چکی تھیں۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالے اور آہستہ آہستہ کھلی سڑک پر نکل گیا۔ وہاں اس کا ٹرک سڑک پر تھا جو پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھدی معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے انجن کھٹکھٹایا اور پیک کر اٹھ بیٹھا۔ ٹرک اس قدر ناقص تھا کہ انجن اسٹارٹ ہو کر ٹرک چلنے لگتی تھی اور اسے بار بار نیچے دوڑ کر اس کو کھڑا کرنا پڑتا تھا۔

اس سنسان سڑک پر وہ ٹرک کو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ چلاتا ہوا ایک چھوٹی سی جھونپڑی کی طرف لے گیا جو چند سڑکوں کے بعد کچھ فاصلے پر واقع تھی یہاں وہ اور رفائی اپنی پٹریوں کے درمیان قیام کرتے تھے مگر اسے اب یہ علم نہ تھا کہ وہ جھونپڑی موجود بھی ہے یا نہیں اس نے بریک دبائے اور ٹرک چوں چوں کی آواز کے ساتھ رک گیا۔ اس نے سیمنٹ کے ستون پر سے کو جو دروازے پر پڑا ہوا تھا اٹھایا اور اندر داخل ہو گیا یہ کمرہ خالی تھا وہاں صرف ایک بستر میز اور دو اسٹول پڑے ہوئے تھے فائی جو اس کا معاون تھا چٹائی پر گڑمڑی بنا ہوا پڑا خراٹے لے رہا تھا وہ شاید کچھ دیر پہلے ہی وہاں آیا تھا۔ مگر اس کی ٹرک کا کہیں پتہ نہ تھا رونیلڈ کے داخلہ پر فائی چونک اٹھا وہ جمائی لے کر اٹھ بیٹھا۔

"تمہارا ٹرک کہاں ہے" رونیلڈ نے پوچھا

"پچھلے قصبہ میں چھوڑ آیا ہوں جب ہم اس سے گذرے تو اس کو دے آیا تھا وہ دو دن کے بعد دے گا" فائی نے جواب دیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے خواب آلود تھیں۔ "میں نے پیدل کھیتوں کو پار کیا اور ایک گھنٹہ ہوا یہاں پہنچا ہوں۔"

فائی پھر اپنی چٹائی پر لیٹ گیا اور رونیلڈ نے اپنے جوتے کھینچ کھولے اور دو اسٹول کے درمیان کمبل ڈال کر لیٹ رہا اس کا تمام بدن درد کر رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف کی خشک ہواؤں نے اس کے لئے شراب کا کام کیا یہاں تک کہ وہ بیمار نظر آنے لگا۔ آج رات اس کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھی۔ اس لئے کہ وہ اپنے مشن میں ناکام ہو چکا تھا۔

اسے فائی نے جگا دیا جس نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اس نے

جواب دیا۔ وہ اپنے داہنے ہاتھ کو ذرا آہستگی سے سنبھالتے ہوئے اُٹھا۔

"مجھے اب جانا ہے" اس نے کہا۔ "سات آدمیوں کا آج رات آپریشن کرنا ہے"

"اور تمہارا ہاتھ" رونیلڈ نے دریافت کیا۔

"اس کا چنداں خیال نہ کرو" یچ نے جواب دیا

لال ل میز سے رکابیاں اٹھانے کے لئے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ایک تانبے کی کیتلی کے گرم پانی سے انہیں دھویا۔ اور مٹی کے چولہے کے کنارے سوکھنے رکھ دیا۔

جب یچ کمرے سے باہر گیا تو وہ بھی اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کے ساتھ صحن تک گئی۔ صحن اب زخمی سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سب کے سب ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور انہیں اس طرح گھورتے دیکھ کر وہ ایک سمجھدار چینی بیوی کی طرح اپنے شوہر کے احترام کے لئے اس کے پیچھے چلنے لگی۔ رونیلڈ نے جو یچ کی دوسری جانب چل رہا تھا اس کی طرف دیکھا اور اس نے شرارتاً ہاتھ ہلا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ یچ گھوم کر فوراً اسے رخصتی سلام کر کے مسکرایا اور لال ل کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا آپریشن کے کمرے کے دروازے پر رونیلڈ نے دیکھا کہ یچ نے جونہی اپنا کام شروع کیا اس کے چہرے پر وہی پہلی کشیدگی سی آگئی اور رونیلڈ نے ایک لمحے کے لئے جائزہ لیا کہ کیا میں نے وہ سب کام خلوص سے انجام دیا جو کہ میں بوڑھے کے ساتھ دے سکتا تھا۔

لیکن تو جیسے سخت بوڑھے کو چپ کرانا کس کے بس کی بات تھی جب اس نے اس سے کہا تھا کہ سینکڑوں سپاہی بغیر کھور د خادم کے آپریشن کروانے پر مجبور ہیں تو وہ سپہ سالار بجائے متاثر ہونے کے خلا میں دیکھتا رہا اور اپنے چاندی کے خلال سے دانت کریدنے لگا۔ کسی کے مصائب کی اسے قطعی پروا نہ تھی۔ خصوصاً نوجوان لوگوں سے اس کو کسی قسم کا لگاؤ نہیں تھا کیونکہ وہ ان سب کو نہیں تو ان میں سے اکثر کو سرکش سمجھتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ پہاڑی اس وقت جاپانیوں سے جنگ کر رہے تھے لیکن وہ یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد یہی لوگ مجھ جیسے سپہ سالاروں سے جنگ کریں گے اس لئے ان میں سے جتنے بھی آج لڑتے لڑتے کام آجائیں تو کل اس کے حق میں اچھا ہی ہو گا۔

"میرے پاس بحث کے لئے زیادہ وقت نہیں ہے" اس نے بلند آواز میں دانت چوستے ہوئے کہا تھا۔ "مجھے اور بھی بہت سے اہم کام انجام دینے ہیں"

کی دنیا سے دور بس آچکا تھا۔ جس میں اس نے لاں لی کو تنہا اور ولاس ٹکٹے آسے پایا تھا۔ اس نے زور دے کر کہا لیکن میں جاؤں گا۔ میں جاؤں گا اور جتنی جلدی ہو سکے گا آنے کی کوشش کروں گا۔

اس نے مڑ کر دیکھا اور رک رک کر کہا اگر ایسا ہے تو تم رک جاؤ اور اسے زندہ رکھنے میں میری مدد کرو۔

وہ کمرہ سے تیزی سے نکل گئی۔ اس کے قدم تیزی سے تیج کے کمرہ کی طرف بڑھنے لگے وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتا رہا

لاں لی تیج پر جھکی ہوئی اس کا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کیٹرا خاموشی سے اپنا بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

جب رونیلڈ داخل ہوا تو لاں لی اس سے مخاطب ہوئی! تم ڈاکٹر ہو گیا تم اسے راز رکھ سکتے ہو کیا دنیا بھر کے لالچ تمھیں ثابت قدم رکھ سکیں گے لیکن یہ لیتے کہتے اس کی آواز تیز ہو گئی۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتے، تمھیں اس کی امداد کرنی چاہیئے۔

رونیلڈ اسے گھورتا رہا۔

تم اس کے بچانے کے لئے کوئی تدبیر کیوں نہیں کرتے، اس نے پھر دہرایا۔ تم دواؤں کے علاوہ بھی سب کچھ کر سکتے ہو تم ڈاکٹر ہو۔

کچھ سیکنڈ وہ اسے گھورتے رہے جیسے اسے سب کچھ پتہ چل گیا ہو سب کچھ۔ جیسے وہ اس بات سے آگاہ ہو چکا ہو اسے خود اعتمادی حاصل ہو گئی۔ وہ اتنے دنوں میں پہلی مرتبہ اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکی ہے۔

میں انتہائی کوشش کروں گا اس نے خاموشی سے کہا اور اپنا کوٹ اتارنے لگا۔

جتنا پانی تم کیتلی میں گرم کر سکتی ہو کرو۔ جلدی جلدی گرم پٹیاں مجھے دیتی رہو۔ اور کسی کو مدد کرنے کے لئے پکار لو۔ اس نے لاں لی سے کہا۔

وہ چپکے سے کمرہ سے نکل گئی اور تیز قدموں سے تیج کے کمرہ میں پہنچی۔ تیج کا بازو چھوا۔ اس کا بازو پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا اور پورا بازو خون سے تر تھا اس نے دھیرے سے پٹیاں کھولنی شروع کیں لیکن جیسے ہی اس نے شانے کی پٹی کھولی تیج بیہوشی میں چلایا۔

کمرے کے کونے میں کیٹرے نے زور سے آہ کھینچی اور رونیلڈ آواز سن کر چونکا۔ جیسے اسے بڈھے کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔ پھر اس نے اپنے مریض کو دیکھنا شروع کیا۔ اسے اس کو دیکھتے ہوئے ایک قسم کی تکلیف سی محسوس ہوئی اس نے ایک عرصہ سے کسی مریض کو نہیں چھوا تھا۔ مگر وہ اپنے کام کا ماہر تھا اس نے بڑی مہارت اور خود اعتمادی کے ساتھ کام کو شروع کیا۔ بازو اب ننگا تھا مگر اسے اس تکلیف کا احساس تھا جس سے تیج گذر رہا تھا۔ تیج ابھی تک بیہوش تھا اور اس کی بیہوشی تکلیف کی حد تک بڑھ چکی تھی۔

رونیلڈ نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ لاں لی اور ملازم گرم پانی کا پتیلا لا رہے تھے اس نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

یہ خوش قسمتی سے مل گیا وہ لوگ کھانا پکا رہے تھے میں نے ان سے مانگ لیا۔ یہ پٹیاں ہیں انھیں تم گرم کر دیتی رہو گی پانی خوب کھول رہا ہے۔

اس نے جلدی جلدی پٹی پھاڑی اور جیسے ہی اس کی نظر تیج کے بازو پر پڑی بے اختیار اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ مگر اس نے آنسوؤں کو بہنے نہ دیا۔

آؤ جلدی کرو، رونیلڈ جلدی' وہ چلائی۔

اس وقت صبح صادق کا وقت تھا جب وہ اپنے کام سے نپٹے۔ خالی ہو بھر کر گرم پانی کی بالٹیاں لاتا رہا اور پتیلے کو بھرتا رہا۔ لاں لی اور رونیلڈ کے ہاتھ برابر کام کرتے رہے۔ مگر تیج کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ لب دم ہو چکی ہے لیکن انھوں نے اپنا کام جاری رکھا

چار بجے کے قریب تیج نے آنکھیں کھولیں اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ رونیلڈ تم اپنا وقت بے کار کر رہے ہو اب دیر ہو چکی ہے۔

ایسی بات نہ کہو دوست تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔

لاں لی یہ کام کرے گی رونیلڈ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم دواؤں کا استعمال کرو گے۔ تیج آہستہ سے بولا مگر یکایک وہ اٹھ بیٹھا اور رونیلڈ چلانے لگا۔ میں کہتا ہوں دشمن یہاں بیٹھنا چاہتے ہیں تم آگے بڑھو۔ یہاں ہزاروں آدمی زخمی پڑے ہیں مجھے چھوڑ دو۔ ایک کے مرنے سے کام بند نہیں ہو سکتا۔

لاں لی خوف سے کانپنے لگی۔ تیج میرے تیج۔

فرش پر سے کیٹرا بولا۔ خدا رحم کرے۔ تمھیں جانا ہی پڑے گا رونیلڈ۔

تیج نے بڑی مشکل سے کہا سب کچھ تم پر ہی منحصر ہے۔

رونیلڈ بستر سے اٹھ گیا اور کہنے لگا اچھا تیج میں جاتا ہوں۔

تم وعدہ کرو۔ تیج نے کہا۔ اس کی آنکھیں اس سے التجا کر رہی تھیں۔

میں وعدہ کرتا ہوں رونیلڈ نے آہستہ سے کہا اور کمرہ سے باہر چلا گیا۔

پچھلے چوک کے بیاں کا پاس ہو رو پے تھا۔

یہ پیش لیا او وکروں روڈنیلڈ نے پوچھا اور جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ انھوں نے سر کے اشارے سے منع کر دیا۔ ہم سب جاتی ہیں اس نے کہا اور جدھرست آہستہ سے ادھر روانہ ہو گئے۔

دو روز کے بعد فالی اور روڈنیلڈ پیکنگ کے ترب و جوار میں تھے۔ وہ بس میں سوار ہو گئے۔ جس کی رفتار بہت سست تھی کیونکہ تین روز کی لگاتار بارش سے سڑک پر کیچڑ ہی کیچڑ بھر رہا تھا بس بھری ہوئی تھی اور ہر مسافر کچھ نہ کچھ کھا رہا تھا۔ ان کی باتوں اور ہنسی سے بس میں شور برپا تھا۔

روڈنیلڈ کے پاس اپنے سامان کا ایک بنڈل تھا اس میں لباس تھا جو کے کپڑے بالکل ویسے ہی تھے جیسے وہ پہنے ہوئے تھا تاکہ اگر اس کی تلاشی ہو تو وہ پکڑا نہ جا سکے فالی اس سے زیادہ چالاک تھا کیونکہ وہ تنگ کے بکس میں سے بہت سے فاسفورس رکھ لایا تھا ان میں ایک چیڑے کا بٹوا بھی تھا جس میں کچھ سکے تھے۔ اس کا برتن تھا ایک صاف تھا ہر چیز دشمن کو سستی سمجھ کر رکھی گئی تھی۔ لیکن اس نے جوتے کے بائیں تلے میں ایک ہزار پونڈ کے امریکن کرنسی کے نوٹ تھے تاکہ وہ اس سے دوائیں خرید سکے۔ امریکن روپیہ چین میں کم تھا لیکن انھوں نے کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کر لیا تھا۔ وہ ایک پیر پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیر دکھنے لگے تھے کیونکہ وہ میلوں پیدل چل کر یہاں پہنچے تھے۔ اس کے جوتے پھٹ چکے تھے۔ بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور شہر کا دروازہ ان کے سامنے تھا

نیچے اتر جاؤ ڈرائیور نے چلا کر کہا وہ ایک نوجوان فوجی تھا جس کا بایاں ہاتھ بیکار ہو چکا تھا وہ اتر پڑے جاپانی سپاہی انھیں گھور رہے تھے

روڈنیلڈ نے کہا ہم لائن کے درمیان میں رہیں گے تاکہ سپاہی جلدی جلدی دیکھ کر چھوڑ دیں وہ اس کام سے اس وقت تک تھک چکے ہیں گے اور جلد سے جلد چھٹکارا پانا چاہیں گے۔ تم بہت زیادہ چالاک ہو فالی نے کہا

یہ پیکنگ تھا اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا بہت کچھ پڑھا تھا اور اب وہ خود اس کے دروازے پر موجود تھا آسمان گہرا نیلا تھا لیکن دروازہ کا رنگ آسمان سے زیادہ گہرا تھا دروازہ پر چاروں طرف بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ آدمی اس دروازہ سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے وہ ایک مفتوحہ شہر کے شہری تھے۔ وہ سب یہاں ایک کھیل کھیل رہے تھے سب اپنے اپنے حصہ کا کام تیزی سے کر رہے تھے اور وہ بھی ایک پرزہ تھا وہ بھی اپنے حصہ کا کام کر رہا تھا وہ اپنی آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کو چھپانے کے لئے بھورے رنگ کا سورج نکلنے لگے وہ اپنے جیب سے ہی فالی کی طرف سے ... نظر آنے لگے وہ محافظ کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں لباس کا بنڈل تھا اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اس کے دل میں ایک شبہ جاگزین ہوا کیا وہ کچھ پرسش کریں گے

فالی اس وقت بالکل اس کے پیچھے تھا وہ بہت دور کھڑا پایا گیا تھا مگر بات گیا میں دیکھ لیا۔ ہاتھ کہاں تھا روپیہ چلا گیا اس نے اپنی کمر پر جو پیٹی بندی تھی اس کو جھاڑ ڈالا اور اس کو تلاش کرنے لگا جیسے اس میں سے کچھ نکل آئے گا اور ایک لمحہ کی دیر کئے ہوئے وہ اس کسان پر گرے۔ پھر ایک اس کے پیچھے تھا اور اس پر برس پڑا۔ میرا روپیہ دو۔ تم نے یہاں جو میرا مال لے لیا ہے دو۔

گارڈ فالی پر جھپٹے اور اس سے پوچھا۔ بلا وجہ چیخا تھا کہ وہ ڈھیر ہو گیا۔ اس کسان نے اس کے خلاف احتجاج شروع کر دیا تھا کہ اس کے پاس سوائے خود اپنے ڈالروں کے کچھ نہیں ہے

سات! ہوں میں جانتا ہوں جب تم چلے تھے تو تمہارے پاس صرف دو تھے دو روپیہ سے پاس پانچ تھے۔ یہ میرے ہیں اس جھگڑے میں ان محافظوں نے جلدی جلدی آدمیوں کو جانے کے لئے راستہ دے دیا۔ اور وہ سات ڈالر فالی اور اس کسان کے درمیان بانٹ دے گئے اور اس کے بعد ہر ایک سے ایک ڈالر اپنے انعام کے طور پر وصول کیا۔ اس درمیان میں سب دروازہ سے گذر چکے تھے وہ ان محافظوں سے بہت دور نکل آئے کسان ابھی تک فالی سے ناراض تھا وہ فالی سے انصاف کی بھیک مانگنے ہی والا تھا جب فالی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ روپے نکال کر اس بھوکے جانے آدمی کے حوالے کر دئے۔

کسان حیران تھا وہ ایک لمحہ تک کبھی روپیہ کو اور کبھی اس آدمی کو دیکھ رہا تھا جس نے اتنے لڑ کر اس سے روپیہ وصول کیا تھا اور پھر آسانی سے اسے واپس کر رہا۔

اس میں بھی ایک بات تھی فالی نے اسے مطمئن کرنا چاہا اور اس نے جلدی سے روپیہ اس کی جیب میں رکھ دیا کہ کہیں کوئی اور نہ دیکھ لے

روڈنیلڈ آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور دل ہی دل میں اسے اس ترکیب پر ہنسی آ رہی تھی۔ اس نے مڑ کر فالی سے کہا ہمیں کسی ہوٹل میں چلنا چاہئے تم میرے نوکر کی حیثیت سے میرے ساتھ رہو گے اور میری دیکھ بھال کرو

میں بیرا ہوں، اپنے بارہ میں سوچتا ہے۔ میں تمھارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔

ہمیں کہیں اور دیکھنا چاہیئے رونیلڈ نے کہا۔ اور وہ اس دوکان سے دوسری دکان کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور پھر دوسری سے تیسری اور چوتھی گھومتے رہے لیکن کہیں بھی انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ انھیں ہر جگہ ایک ہی جواب ملا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے جواب کے ساتھ ساتھ انکی صورتیں بھی ایک ہی جیسی ہو گئی ہیں۔ وہ سب چھوٹے اور کم ہمت تھے۔ پانچ جگہ جانے کے بعد رونیلڈ نے بےچینی کا اظہار کیا اور فالی سے کہنے لگا اب ہم ہرگز کسی دوکان میں نہیں جائیں گے جب وہاں کے آدمی کی شکل ان سے بدلی ہوئی نظر نہ آئے۔ یہ سب بزدل ہیں انھیں صرف اپنی زندگی سے پیار ہے

ہوں، تو یہ شیطان درحقیقت کام کر چلے ہیں۔ اچھا ہم کھانا کھالیں اور پھر دیکھیں گے۔ فالی نے سادگی سے کہا۔ میں ایک ریستوران کو جانتا ہوں، جس کا مالک مسلمان ہے اس کے یہاں بہترین گوشت ملتا ہے۔

وہ ایک خالی ریستوران کی طرف بڑھا اور جاتے ہی چلایا۔ ایک بوڑھا آدمی آگے بڑھا اور فالی کو گھورنے لگا۔

تم جانتے ہو میں نے کتنی مرتبہ یہاں کھانا کھایا ہے بڑے میاں مگر ان دنوں میں تم پہلے سے بھی زیادہ موٹے تھے۔ جاؤ یہاں کا بہترین گوشت لے آؤ۔

گوشت نہیں ہے اس نے روہانسا ہو کر کہا۔ ہمارے پاس تھوڑا سا کھانا ہے۔ وہ افسردہ ہوا کھڑا رہا۔ وہاں ایک چھوٹے لڑکے کے علاوہ اس کی مدد کے لئے کوئی بھی نہ تھا۔ تم کسی بھی مسلمان ہوٹل میں اس کے علاوہ کچھ حاصل نہ کرسکو گے۔ بوڑھے نے کہا بزدلوں نے ہر چیز اپنے لئے چھین لی ہے۔

فالی رونیلڈ کی طرف مڑ گیا۔ اب ہمیں یقین ہے شہر ہمارے ہاتھ سے گیا۔ پیکنگ میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ یہ شہر وہی ہے یہاں کی جگہ وہی ہے مگر نہ وہ باتیں ہیں سب چیزیں بدل گئیں۔ سب چیزیں بدل گئیں۔

خدا کے لئے خاموش رہو میں تمھارے ہاتھ جوڑتا ہوں بوڑھا گڑگڑانے لگا۔ کیوں میری مٹی خراب کرتے ہو۔

ہم وہی کھائیں گے جو تمھارے پاس ہے رونیلڈ بول اٹھا۔

خاموشی سے انھوں نے تھوڑا سا کھانا کھایا۔

اگلی صبح سڑکوں پر ہر طرف خاموشی تھی۔ سوائے دو چار عورتوں کے جو گھر کو صاف کر رہی تھیں یا کچھ چائے کے لئے گرم پانی لا رہی تھیں جب وہ رونیلڈ اور فالی کے پاس سے گذرے تو انھوں نے ان کو گھورا۔

ہمیں دیر نہ کرنی چاہیئے فالی نے کہا۔ یہ شیطان اس سے زیادہ چالاک ہیں جیسا دکھائی دیتے ہیں۔ آج جب میں منہ دھونے اٹھا تو ان میں سے ایک میرے پاس آکر میرے بارے میں سوال کرنے لگا کہاں سے آئے ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو۔

ہم سلک کی دکان پر کیوں نہ چلیں۔ تم جانتے ہی ہو کہ میں ایک انگلستانی سلک کا سوداگر ہوں۔ اگر جاسوسوں نے دیکھا بھی تو کچھ خیال نہ کریں گے

تم ضرورت سے زیادہ چالاک ہو' فالی نے کہا۔

ہو سکتا ہے اچھا تم مجھے سلک کی دکان پر لے جاؤ۔

فالی چپ چاپ چلنے لگا۔ دوپہر آدھے دن تک وہ سلک کی ایک دکان سے دوسری دکان دیکھتے ہوئے پھرے۔ انھیں یہ دیکھنا تھا کہ کوئی ان کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ اس طرح دن گذر گیا اور رونیلڈ پریشان ہو گیا کہ کیا ترکیب کی جائے آخر کار وہ سلک کی آخری دکان پر گئے۔

اچانک کسی نے اس کا بازو زور سے پکڑ لیا اس نے دیکھا ایک بوڑھا آدمی جو کافی لمبا تھا۔ اس کا کالا چغہ پکڑے کھڑا تھا۔ یہ وہی دکاندار تھا جس سے یہ ابھی دو منٹ پہلے بات کر کے آئے تھے اس کی بات پوری طرح سنی بھی نہ تھی کیونکہ اس کی دوکان تو بہت بڑی تھی مگر لٹی لٹی سی تھی اور وہ خود بھی تھکا ہوا سا ایک کونے میں بیٹھا تھا

اب کیا ہے رونیلڈ نے سوال کیا۔

میرے پاس سلک کا ایک نوجوان ٹکڑا ہے جو تمھیں نہیں دکھایا تھا بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔ میرا سب سے بہترین سلک ہے اسے میں نے ہی نکالا تھا۔

شکریہ مجھے نہیں چاہیئے رونیلڈ نے جواب دیا۔

مگر اس بوڑھے نے اس کے کوٹ کو زور سے پکڑ کر کھینچا اور زور سے کہا۔ آؤ میں نے اسے چھپا کر رکھا ہے یہ جنگ سے پہلے کا ہے میں نے سوچا تھا کہ کسی شیطان کو اسے نہیں دوں گا میں تمھیں سستا دے دوں گا۔ تاکہ وہ شہر سے باہر چلا جائے۔

وہ اتنی جلدی مچائے ہوئے تھا کہ رونیلڈ ایک لمحہ کے لئے جھجکا مگر فالی نے کہا کہ یہ بوڑھا آدمی ہے چلو اس پر یہ احسان کر دو۔ فالی کے اس طرح کے جواب نے رونیلڈ کے دماغ میں فوراً ایک نئی چیز پیدا کر دی وہ بوڑھے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دکان پر کوئی نہیں تھا مگر پھر بھی بوڑھا

کو اپنے ساتھ لیتے جاتا۔

رونیلڈ اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔

ایک عورت کنگ نے دوبارہ کہا۔ وہ جوان ہے وہ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ ان درندوں کے ہاتھوں مر گیا تھا جب یہ شہر میں داخل ہوئے تھے لیکن اس کی لڑکی میرے ساتھ ہے وہ اس وقت سے میرے گھر میں چھپی ہوئی ہے۔

لیکن کیا یہ کام آسانی سے ہو سکے گا۔ اسے اس میں شک تھا۔ کیا وہ اسے محفوظ لے جا سکتا ہے۔

وہ ایک چینی کے مقابلہ میں تمہارے پاس زیادہ محفوظ رہے گی۔ کنگ نے سوچ سوچ کر کہا میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں اس کا بھیس بدل دوں گا۔ تم آسانی سے اسے اپنا رشتہ دار بنا سکو گے میں تمہارے ساتھ اسے ایک ہندوستانی بنا دوں گا۔

رونیلڈ نے دیکھا کہ بڈھا اس کی آنکھوں کو گھور رہا ہے اس نے فوراً کہا تم جانتے ہو کہ میں ہندوستانی نہیں ہوں۔

میں تمہیں ہندوستانی سمجھ سکتا ہوں کنگ نے ملیت کا اظہار کیا وہ ایک لمحہ رکا اور اس کے بعد کہنے لگا کیا تم میرے گھر آنا پسند کرو گے میں کسی کو ڈرائیور کو بلانے بھیجتا ہوں۔

اس کا گھر اس کی دکان کے بالکل پیچھے تھا۔ الماری کے درمیان سے گھر کے لئے راستہ تھا۔ کنگ نے دروازہ کھولا اور وہ صحن میں پہنچ گئے۔ ایک جوان آدمی کرسی پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ کنگ نے فخر سے کہا دونگ اٹھو یہ ایک ہمارا دوست ہے۔

ایک نوجوان آدمی اس کے سامنے تھا وہ اٹھا اور اس نے اپنا سر جھکا کر سلام کیا۔ سگریٹ ابھی تک اس کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔ یہ سگریٹ جاپانی تھا۔ وہ غور سے رونیلڈ کو دیکھنے لگا جیسے وہ اس کی آنکھوں سے کچھ پڑھنا چاہتا ہے۔ رونیلڈ نے سر کے اشارہ سے سلام کا جواب دیا آؤ یہاں انتظار کرو کنگ نے کہا۔

رونیلڈ نے اس کا ساتھ دیا اور وہ جوان آدمی پھر کرسی میں دھنس گیا۔ رونیلڈ اس کے نئے جوتے اور قیمتی لباس کو دیکھ کر حیران تھا کہ یہ اس بوڑھے کا بیٹا کس طرح ہے جس کا گون پھٹا ہوا ہے۔ وہ اندر تک بڑھ گئے۔ نوجوان ان کے ساتھ نہ تھا۔

یہاں بیٹھئے مہربان کنگ نے کہا اور خود میز کی طرف بڑھ گیا معاف کیجئے میں ایک آدمی کو ڈاکٹر بلانے کے لئے بھیجوں۔ اس نے پتیلی کی کیتلی ابھی تک گرم تھی۔ برتن لینے کے لئے دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا۔ رونیلڈ کمرے میں بالکل تنہا رہ گیا۔ اس نے کمرہ کا جائزہ لیا یہ ایک معمولی کمرہ تھا یہاں کسی زمانہ میں خوبصورت رہا ہوگا کمرے میں بہت سی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ بڑھیا بید کی تھیں جن کا بید اب پرانا ہو چکا تھا۔ کچھ معمولی لکڑی کی تھیں۔ تمام کرسیوں اور کمرہ کی اور چیزوں پر دھول بھی دھول جمی ہوئی تھی۔

ہر طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا آگے کیا ہوتا ہے وہ خطرہ کو بہت جلدی سونگھ لیا کرتا تھا۔ تاں ابھی تک دروازہ کی پہرہ داری کر رہا تھا۔ اس نے بیچینی سے ٹہلنا شروع کر دیا۔ پھر کھڑکی کے باہر دیکھا نوجوان ابھی تک ویسے ہی کرسی پر لیٹا تھا وہ ویسے ہی کھڑا رہا سگریٹ کے دو چار کش مارے اور پھینک دیا۔

رونیلڈ نے پیروں کی چاپ سنی اور دروازہ کی طرف مڑا۔ دروازہ پر پڑا ہوا پردہ ہٹا اور ایک عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ یہ عورت اسے غور سے دیکھنے لگی

اس نے بھی اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ عورت دیکھنے میں چینی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ لباس ضرور پہنے ہوئے تھی۔ اس کی صاف شفاف آنکھوں نے نیلے سنہرے بالوں نے اسے بہت متاثر کیا۔

میں کہتا ہوں مجھے معاف کر دیجئے اس نے ہکلاتے ہوئے کہا مجھے اس کی امید نہ تھی لیکن اس نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دروازہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اچانک اسے چہرہ پر ناگواری کے آثار نظر آئے اس نے بڑھ کر باہر کی طرف جھانکا کہ اس نے کھڑکی میں سے کیا دیکھا۔

نوجوان نے اسے دیکھا اور وہ وہاں پہنچ گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ نوجوان داخل ہو اس نے دروازہ کا پردہ گرا دیا اور رونیلڈ اس کے تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سن رہا تھا۔

کون تھا اس نے پوچھا۔

کون؟ چینی نے سوال کیا۔

وہ سفید عورت' رونیلڈ نے زور دے کر کہا۔

نوجوان نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ کیا؟ سفید عورت اگھر میں

"تمہاری ماں میرا انتظار کر رہی ہے" اس نے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا تو اچانک خوف کا احساس شدید ہو گیا۔ وہ اب وہ لڑکی نہیں تھا جس کا ساتھ وہ پکڑ کر بڑی ہوئی تھی۔ وہ ایک اجنبی تھا جنگ نے اسے بدل دیا تھا مگر جنگ نے تو ہر چیز بدل دی تھی۔ وہ بڑا پر امن شہر جہاں وہ خوش خوش اپنے اب کے ساتھ رہتی تھی اب اس کے مرنے کے بعد اس کے لئے عجیب بن گیا تھا اور روفانگ اس کا دشمن تھا۔

اس پر خوف چھانے لگا اور کتاب بیج پر آگرا وہ آنکھ بند کر کے کمرے سے نکل کر تنگ راہداری پر دوڑنے لگی۔ مگر اینٹ کی لاعین ٹم اور سرنگیں وہ پھسل اور دو مضبوط بازوؤں میں خود کو محسوس کیا۔ پھر اس نے بہتری پکڑی کہ اس سیاہ فام چہرہ دیکھا۔

"اوہ" وہ چیخ پڑی اور خود کو چھڑا لیا۔ روفنگ جس نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو گیا

"ا" مسٹر کنگ نے تیزی سے اندر جاتے ہوئے کہا۔ تم یہاں ہو میں تلاش کرتے کرتے آ ہی رہا تھا۔ یہ ہیں مسٹر۔۔۔۔ مسٹر۔۔۔۔"

"سنگھ" رونالڈ نے آہستہ سے کہا

"یہ ہے وہ لڑکی" کنگ نے جلدی سے کہا "ایرا" یہ میری کہانی طرح ریشم کے تاجر ہیں جلد ہی شمال کی طرف سفر کریں گے۔ میری بچی! میری خواہش ہے کہ اب میں تمہیں یہاں سے بھیج دوں۔ کہیں دشمنوں کو تمہاری خبر نہ ہو جائے یاد رکھو کہ جاپانیوں اور امریکنوں میں جنگ ہو رہی ہے اور تم امریکی ہو۔ میں مجبور ہوں جیسا کہ ہم سب مجبور ہیں۔ اگر انھوں نے تمہیں ڈھونڈ نکالا تو کیا میں تمہیں بچا سکوں گا؟ نہیں۔ اور یہ بھی کیسے یقین کر لوں کہ کوئی لاپروا نوکر یا مہمان تمہیں دیکھ کر نہ کہے کہ تم یہاں ہو۔ امریکہ کے اعلان جنگ سے پیشتر ہی مجھے اندیشہ تھا اور اب تو ہر ساعت خطرناک ہے۔ یہ شیطان تمام امریکنوں کی تلاش میں ہیں"

کیا امریکنوں نے لڑائی کا اعلان کر دیا ہے۔ ایرا نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ اس نے اس ویرانی میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہ سنا تھا۔ نہ کسی نے کچھ بتایا اور نہ یہاں اخبار پڑھنے کو مل سکا۔

یقیناً تمہیں تو معلوم ہو گا روفنگ کہ یہ تو لڑائی چھڑ چکی ہے۔ اس نے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں سی گہری تشویش پائی کہ یہ اب جاتی ہے۔ اگر اسے جواب دینا نہیں ہے تو نہ دے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" اس نے سنجیدگی سے کہا "یہ اب جب تک لڑائی ہو رہی ہے یہاں رہ کر تم سب کو خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ اگر تم مجھے کہیں اپنے ساتھ لے جائیں تو میں چلی جاؤں گی۔ میرے خیال میں میں اپنے آپ کو چھپا لوں گی۔ اور یقین ہے کہ میں نہیں سکتی یہ بالکل ٹھیک ہے۔"

وہ چینی میں گفتگو کر رہے تھے لیکن اب رونیلڈ نے انگریزی میں کہا میں تمہیں خطرہ سے نکالنے کے لئے جو کچھ بھی کر سکوں گا بڑی خوشی سے کروں گا: اچانک اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی بات کے ایک تکلیف دہ خاموشی چھائی رہی۔ جب روفنگ سے دور گیا "معاف کیجئے گا۔ ابا جان ضعیف کنگ کے سامنے وہ جھک کر ادب سے جھکا اور بغیر کچھ کہے وہ راہداری سے گزر گیا اور اس کے ساتھ وہ تمام باتیں اور الجھنیں جن سے وہ پریشان تھے۔

ایرا ہیجانی انداز میں رونیلڈ کی طرف مڑی اور کہا: "تم مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ میں جانا چاہتی ہوں" اس نے انگریزی میں کہا تاکہ کنگ کی سمجھ میں نہ آسکے۔ وہ ان کا منہ تکنے لگا۔

"میں انگریز ہوں" رونیلڈ نے اچانک کہا اور وہ تحیر ہو گئی "میں شمالی مغربی علاقوں کے لئے دوائیں لینے آیا ہوں۔ ہسپتال میں میرا ایک ہندوستانی دوست سرجن ہے اور اس نے مجھے یہ لباس دے تاکہ میں محفوظ رہوں میرا خیال ہے یہ بہتر ہے اگر تم تمام باتیں سمجھ لو۔

بیج کے تذکرے نے اسے لاس لی کی یاد دلادی۔ اس نے اسے ذہن سے نکال دیا تھا جب اسے اپنے مرتے ہوئے شوہر کے پاس چھوڑا تھا کیونکہ اس کے خیال سے اسے شرم آئی تھی۔ اب ایرا کو دیکھ کر اس نے محسوس کیا کہ اب وہ لاس لی کے بارے میں صحیح طور پر سوچ سکے گا۔ اس واقعہ سے اسے جرأت اور تسکین ہو رہی تھی۔ اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے دوست کی بیوی تمہارا استقبال کرے گی۔ میرا مطلب ہے تم صرف مردوں کے ساتھ نہیں رہو گی۔"

"اوہ" اس نے ایک طویل سانس لی "ضرور! تم کنگ سے کہو اب زیادہ دیر نہیں ہونی چاہئیے۔ اگر یہاں لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا"

"اپنے والد کی طرح" اس نے جلدی سے کہا۔ وہ کنگ کی طرف مڑی اور نرم چینی زبان میں جو کچھ رونیلڈ نے کہا تھا کہہ دیا۔

کنگ نے حیرت سے منہ پھاڑے ہوئے سنا "ال یا" رونیلڈ کی طرف تکتے ہوئے اس کے منہ سے نکل پڑا۔ "انگریز؟" میں خود ڈاکٹر کو لانے جا رہا ہوں

[illegible] پڑتی. مگر اس کے علاوہ وہ اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔
مجھے مرہم کی تیاری۔ اب کوئی اس کے علاوہ چارہ نہیں کہ میں اس کی
آنکھیں بند کر دوں۔ اس نے باندی کو حکم دیا اور پھر کہا ہے کہ تم
تمہیں اپنی آنکھیں بالکل کھلی ضرورت پڑے تو تیز گرم پانی سے [illegible]
[illegible] بھول نہ جانا۔

میں اسے یاد رکھوں گی ایرا نے جواب دیا۔

جب باندی جانے لگی تو اس نے جاتے جاتے رونگ کو آہستہ سے بلا کر
مخاطب کیا۔ وہ تھوڑی دیر رکا اس کے بعد لپکے سے باہر جانے لگا
پہلے کہاں جا رہے ہو کنگ نے اسے پکارا۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت
ہوگی۔

میں ایک منٹ میں آتا ہوں رونگ نے جاتے جاتے دروازہ
سے جواب دیا۔

رونیلڈ نے یہ سب دیکھا اور وہ اپنی جگہ پریشان نظر آنے لگا اگر
[illegible]نگ فوراً نہیں آتا تو انہیں فوراً یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیئے۔ اس نے
[illegible]ت سے لمحات اسی بے چینی میں گزار دیے لیکن پھر اس نے دیکھا کہ
[illegible]ننگ داخل ہو رہا ہے۔ کم از کم ان لمحات میں تو اس نے دھوکا نہیں
[illegible]۔ مگر اس سے کچھ بعید نہیں تھا مگر وہ اس وقت تک کچھ کر بھی نہیں
[illegible]تے تھے۔ جب تک ایرا تیار نہ ہو جاتی۔

باندی مرہم لے کر داخل ہوئی اور اس نے اسے مسز کنگ کو دے
[illegible]۔ اس نے رونگ کو وہ سب کچھ بتا رہا تھا جو اس نے قالی کو کہتے ہوئے
[illegible]تھا۔

رونگ نے سب کچھ سن لیا مگر کوئی جواب نہ دیا اسے باندی پر پورا
[illegible]را اعتماد تھا مگر اس نے اس وقت اپنی اپنے خاندان کی اور باپ کی حفاظت
خیال سے کچھ نہیں کہا وہ نہیں چاہتا تھا کہ دشمن یہاں آئے۔ اور رہا ایرا
سوال تو وہ اسے یہاں روکنا چاہتا تھا۔ وہ اسے ضرور روکے گا اور دشمن
[illegible]کے بارے میں کچھ نہ جان سکے گا۔ اس نے گردن ہلائی اور فوراً کمرہ کے
[illegible]اندر داخل ہو گیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن اس کا دماغ برابر مصروف رہا
اسی وقت مسز کنگ نے مرہم کو لگانا شروع کیا اس نے کنگ
[illegible]ے ایک برش کو میز پر سے اٹھایا اور ایرا کے ہونٹوں پر پھیرنے لگی ایرا
نے آنکھیں بند کر لیں

اب میں بالکل اندھی ہوں اور یقیناً میں کچھ خوفزدہ بھی ہوں۔ اس
نے آہستہ سے کہا۔

خوفزدہ ہونے کی بات نہیں رونیلڈ نے جواب دیا [illegible]
وہاں آئینہ کے سامنے برش پھیرتے ہوئے دیکھ رہا تھا [illegible]
لیں ہیں۔ اس نے قینچی سے تھوڑی پلکیں کتر دیں۔ اب [illegible]
ہوتی ہو خوش قسمتی سے تمہاری ناک بھی لمبی نہیں ہے۔ [illegible]
لگ رہا ہے۔ اے اجنبی اللہ ہی تمہاری مدد کرے گا۔ رونیلڈ نے کہا
اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک کرسی پر بٹھایا اور [illegible]
اس کے ہاتھ کی گرمی کا احساس ہوا۔

تمہارا ہاتھ کتنا ٹھنڈا ہے۔ اس نے رونیلڈ سے تعجب سے کہا
میں ان آدمیوں میں سے ہوں جن کے ہاتھ ہمیشہ ٹھنڈے رہتے ہیں
اس نے ذوق و شوق سے کہا۔ اس نے پھر ایک مرتبہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں
لے لیا۔

مسز کنگ نے اسے غور سے کہا اور پھر آہستہ سے کہا کہ اگر راستے
میں کوئی وقت آئے تو وہ اپنے آپ کو میاں بیوی بھی بنا سکتے ہیں۔
یقیناً بوڑھے نے کہا اب انہیں ہر کوئی چینی ہی کہہ سکتا ہے۔ تم اپنے
آپ کو یہاں چینی ہی ظاہر کرنا۔

کنگ نے رونیلڈ کو ہدایت کی تاکہ لوگ تمہیں اجنبی نہ کہہ سکیں۔
رونیلڈ کہنے سے پہلے کچھ جھجکا اور پھر اس نے ایرا سے پوچھا اسے
تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے اس نے بغیر کسی تکلف کے کہا
مگر وہ رونگ کی طرف سے بہت خوفزدہ تھی۔ اب رخصت کا وقت آ
گیا تھا۔ بوڑھے کنگ نے اپنی واسکٹ کی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا نقشہ
نکالا اور اسے کھولتے ہوئے رونیلڈ کو سمجھانے لگا۔

آج تم صرف میرے خاندانی گاؤں تک پہنچ سکتے ہو۔ وہاں دو
بھائی ہیں جب تم وہاں پہنچو گے تو صبح ہو چکی ہوگی میرے سب سے بڑے
بھائی تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے اور وہ تمہارا استقبال کریں گے۔
تم وہاں رات تک آرام سے سو سکو گے۔ باہر مت نکلنا۔ اندھیرا ہونے
تک اندر رہنا۔ میرا بھائی تمہیں آگے راستہ دکھائے گا۔ اس سے کچھ نہ
کہنا تمہاری سمجھ میں بات بھی آ گئی یا نہیں۔

ٹھیک ہے رونیلڈ نے کہا۔

میں یہ سب اس لیے کہا کہ جب ہم گھر سے باہر قدم رکھیں گے تو پھر ہم

کرچکا ہے۔ اس کے لئے آزادی اور خوشی کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے ہیں۔ وہ ایرا کے سامنے اپنے کو آزاد سمجھتا تھا۔ وہ اس کے لئے سب کچھ تھی۔ وہ اسے اپنے آپ سے زیادہ چاہتا تھا۔ وہ ایک نشان تھی آزادی کا۔ آزاد دنیا کا جہاں خوشیاں ہیں۔ آزادی ہے۔ بہاریں ہیں۔ روپیہ ہے۔ اس دنیا کا جس سے اُسے حسد تھا۔ اس لئے کہ اس دنیا میں روپیہ تھا۔ تسکین تھی۔ جس نے زندگی کو راحت بخشی تھی۔ یہاں غریبی اور بھوک سے طے چکی تھی۔ اس نے کبھی سفید فام کو بھیک مانگتے نہ دیکھا تھا اور نہ کبھی کوئی غریب نظر آیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سب سفید فام امیر ہوتے ہیں۔ آزاد ہوتے ہیں اور یہ ایرا اسی دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی آرزوئیں بھی دم توڑ رہی تھیں۔

وہ کمرے سے نکل کر جہاں گاسیا تھا اس کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ وہ ایک سڑک پر مڑ گیا۔ اب اس کے سامنے صرف ایک راستہ باقی تھا اور وہ سامنے گاؤں کا تھا۔ لیکن وہ اسے اکیلا انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اسے اس لئے سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ یہ تو طے تھا کہ اسے ہر حالت میں انھیں روکنا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس غیر ملکی اور اس کے نوکر کو کسی طرح جاپانیوں کے حوالے کردے۔ ایرا کو وہ کسی نہ کسی طرح واپس لے ہی لے گا۔ وہ شمال کی طرف مڑ کر وہ جون ملسائین کے گھر کی طرف دوڑنے لگا تاکہ جاپانی افسر جو جون کے گھر آرام کر رہا ہے، اس سے کچھ مدد حاصل کرسکے۔

گاڑی آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ پہیوں کی گھڑ گھڑ کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اب کافی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ فالی باہر بیٹھا ہوا تھا اور ایرا اور رونیلڈ اندر۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ ایک مرتبہ جب گاڑی کا پہیہ گڈھے میں گرا تو ایرا اچھل پڑی۔ رونیلڈ نے اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر گرنے سے بچا لیا۔

ارے معاف کرنا۔ اس نے آہستہ سے کہا مگر رونیلڈ نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا اور کہنے لگا کہ کتنا بُرا ہے کہ میں یہاں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں اور تم بالکل معذور ہو۔

ہاں اس نے مجھے بالکل معذور بنا دیا ہے۔

وہ خاموشی سے بیٹھے رہے مگر رونیلڈ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ اس کو اپنی زندگی سے زیادہ چاہنے لگا۔ اس کا اندازہ اسے اب ہوا۔ اب اس لمحہ جب وہ اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکتا تھا اور ان میں بات چیت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ تو صرف یہ ہاتھ ہی ان دونوں کے پیغام کا واحد ذریعہ تھا اور ایسے میں وہ صرف اس کے ہی متعلق سوچتا رہا۔ اس کی آواز، اس کے بال، اس کی چال ڈھال، چلنے کا انداز، سر جھکانے کی ادا، اس کے ہونٹوں کا تراش اور چہرہ وہ معصوم آنکھیں جو بہت سادگی اور نرمی کے ساتھ جھک جاتی تھیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ وہ اس وقت اس سے لالی اور رنج کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے بہت بات بتانا چاہتا تھا کہ کس طرح اس نے نا امیدی کے ساتھ انگلینڈ چھوڑا اور کس طرح اس نے زندگی کو کام کا ساتھی بنایا۔ وہ اسے لی تانا اور دشمن کے بارے میں بھی بتانا چاہتا تھا جو جنوب کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مگر وہ یہ سب نہیں کرسکتا تھا کیونکہ یہ سب خطرناک تھا۔ چین کی گاڑی میں انگریزی میں بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس نے صرف اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے رکھا۔

ایرا کا دماغ بالکل صاف تھا اسے یہ ضبط وہ تو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ شروع ہی سے رونیلڈ پر اعتبار کرتی تھی۔ رونیلڈ کے ساتھ نے اس کے اندر ایک اور عزم کی بنیاد رکھ دی تھی۔ جب ایرا خفیف سی بھی تھک گئی تو اس نے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ لیا۔ اور سونے کی کوشش شروع کردی۔ گھنٹے منٹوں میں گذر گئے۔ یہاں تک کہ گاڑی ایک گاؤں میں داخل ہوئی۔

گاڑی بان نے انکی طرف مخاطب ہو کر بتایا کہ نوجاپانیوں کا گاؤں آگیا۔ فالی فوراً کود پڑا۔ رونیلڈ نے ایرا کو جگایا اور اسے اتارنے میں مدد دینے لگا۔ وہ گاؤں کے لوگوں میں گھرے ہوئے تھے۔ انھیں پہلے ہی گاڑی کے پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اور وہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

رونیلڈ جلدی سے ایرا سے مخاطب ہوا۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ابھی اور اسی وقت۔ میں تم سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں۔ چاہے تم مجھے پاگل سمجھو مگر کیا کروں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔ میں تو اسی وقت تم سے محبت کرنے لگا تھا جب میں نے تمھیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

گاؤں والے ان کی بات نہ سمجھ سکے مگر فالی بہت زور سے ہنس پڑا اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتی ایک بوڑھا آدمی نیلا کوٹ پہنے ہوئے آگے بڑھا اور انھیں راستہ بتانے لگا۔ آپ اس طرف چلیں گے اور میری بیوی عورت کو لے جائے گی۔

میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اسے یاد رکھنا ابھی مجھے تم سے اور بہت کچھ کہنا ہے۔ رونیلڈ نے جلدی جلدی کہا۔

اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے ہلے مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ایک

سکو جتنی کہ انگریزی۔

بھائیو اور بہنو! تم اپنے اس بھائی کی کسی بات کا یقین مت کرو۔ اگر یہ اپنے ساتھ دشمن کے آدمیوں کو لایا ہے تو یہ غدار ہے۔ اس نے غداری کی ہے۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ اس کے بعد اس نے رونیلڈ سے انگریزی میں کہا تم مجھے واپس جانے کے لئے مت کہو میں اس شخص سے نفرت کرتی ہوں۔

اس کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ وہ اجنبی روفنگ کے اوپر جھپٹ پڑا اور اس کو زمین پر دے پٹخا۔

نالی یہ دیکھ کر چیخا۔ فورا ہم سب کو مل کر ان دشمنوں کو بھگا دینا چاہئے نالی کے ساتھ وہ تمام سپاہیوں پر جھپٹ پڑے۔ مگر وہ کیسے ان سپاہیوں سے لڑیں گے جو مسلح ہیں مگر اسی وقت دوسرے لوگ لاٹھیاں اور دوسری چیزیں لے کر آگئے اور ان لڑنے والوں کی مدد کرنے لگے۔

مجھے بھی دیکھنا چاہئیے ایرا نے سوچا۔ بہن ذرا گرم پانی لا دو۔ اس نے پاس کھڑی ہوئی ایک بوڑھی عورت سے کہا

بوڑھی عورت اسے باورچی خانہ میں لے گئی۔ ایرا نے گرم پانی سے اپنی آنکھیں دھولیں شروع کیں۔ گرم پانی نے اس مرہم کو پگھلا دیا۔ اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ مگر وہ کچھ نہ دیکھ سکی سوائے اس کے کہ آدمی ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ دو مرتبہ اس نے سنگین آدمی کے سینے کے پار ہوتی دیکھی۔ اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں اس کی آنکھیں رونیلڈ کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ اسے نہ دیکھ سکی وہ اسے تلاش کرتی رہی۔ آخر کار اس نے اسے پا لیا وہ ان لڑتے ہوئے آدمیوں کے درمیان روفنگ کا گلا پکڑے ہوئے اسے گھسیٹ رہا تھا۔

وہ اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا۔ کیا تم اپنے باپ کی اولاد نہیں ہو۔ وہ اس پر چلایا۔ میں تمہیں مار ڈالتا۔ مگر تمہارے باپ کی وجہ سے چھوڑے دیتا ہوں۔

گاؤں کے لوگوں نے یہ الفاظ سنے اور وہ اس کی تعریف کرنے لگے۔ باپ کی شرافت نے بیٹے کی جان بچالی۔ وہ کہنے لگے۔ اور پھر سپاہیوں کی طرف بڑھنے لگے۔

سپاہیوں کو ان کے افسر نے روفنگ کے ہر حکم کو ماننے کا حکم دے دیا تھا۔ اور وہ اب تک اس کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اب گولی چلانے کا حکم دے گا مگر روفنگ کس طرح یہ حکم دے سکتا تھا۔ اسکے خاندان کے دو آدمی خاک و خون میں لتھڑے ہوئے فرش پر پڑے ہوئے تھے اور اس چیز نے اسے بہت خوفزدہ کر دیا تھا اسے اپنے باپ کا خیال آیا۔ وہ کس طرح اب گھر جائے گا اور اس کے چچا ان کا قتل کا الزام کس کے سر ہوگا۔ یہ صرف کافی نہیں تھا جب اس نے دائیں طرف دیکھا تو ایرا کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا وہ کچھ نہیں بولی اور وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ نہ کہہ سکے گی کیونکہ وہ اس سے سخت نفرت کرتی ہے۔ اس نے فورا اپنے آپ کو ان لوگوں سے نکال لیا اور سپاہیوں کو واپس چلنے کا حکم دیا۔ سپاہی فورا اس کا حکم مانتے ہوئے اپنی کاروں کی طرف بڑھ گئے اور وہ بغیر اپنے باپ کی طرف دیکھے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ سب اسے گھورتے رہے۔ گاؤں والے ایرا رونیلڈ اور نالی۔ سب نے دیکھا کہ سپاہیوں نے بڑھ کر اس کے لئے دروازہ کھول دیا اور وہ ان کے درمیان بیٹھ گیا۔ کار جلدی اور کچھ ہی دیر میں سب کچھ ختم ہو چکا تھا وہ سب جانتے تھے کہ اب وہ کبھی دکھائی نہ دے گا۔

گھر میں رونے کی آواز آرہی تھی۔ ماں اپنے بیٹے کے جسم کو لئے اس سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ مگر ان کا باپ گھر کے اندر نہ گیا اس نے رونیلڈ سے کہا کہ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ مجھے صرف اپنے بیٹے کی طرف سے معافی مانگنی ہے۔ تم مجھے معاف کر دو۔ اب تم چلے جاؤ میرا بھائی تمہیں بحر تک لے جائے گا اور تمہیں پہاڑیوں کے پاس پہنچا دے گا۔ وہ سب جانتے ہیں

رونیلڈ بہت غمگین تھا۔ اس نے کہا میں کیا کہہ سکتا ہوں ہماری وجہ سے ہی تمہارے بیٹے کی جان گئی۔

نہیں یہ بات نہیں۔ یہ وقت کی بات ہے وقت انسان کا صحیح ممتحن ہے کچھ امتحان میں پورے اترتے ہیں اور کچھ نا کامیاب۔ میرا بیٹا اس میں ناکامیاب ہو گیا۔ وہ غدار نکل گیا اور اب اس کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں۔ بوڑھے نے بڑے وقار سے کہا۔

اس نے نوکرانی کو کچھ پکانے کے لئے پکارا مگر وہ پھر بھی گھر کے اندر نہ گیا اور اس وقت تک جب تک کہ یہ لوگ تیار ہو کر ایک دوسرے سے رخصت ہو کر روانہ ہو گئے وہ وہیں رہا اور ان کے جانے کے بعد وہ بہت آہستہ آہستہ اپنے بیٹے کی لاش دیکھنے کے لئے چلا۔

رونیلڈ اور ایرا نے گاڑی میں اپنی جگہ لے لی اور سفر شروع ہو گیا اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

کیا تم بالکل ٹھیک ہو۔ اس نے اس سے پوچھا۔

بچنے کے لئے چار ہی ہیں اور یہ سب دشمن کا گھیرا ہے۔ اگر ہماری آوازیں انھوں نے سن لیں تو ہم جیتی ہوئی بازی ہار جائیں گے۔

میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم ایک لفظ بھی نہ بولیں گے۔

انھوں نے ان بے شمار گٹھڑیوں کو اس طرح لگایا کہ ان کے درمیان ایک خلا بن گیا۔ اور اس میں رونیلڈ اور ایرا داخل ہو گئے۔ اس کے بعد ان گاڑی والوں نے اس خلا کو پھر چاروں طرف سے ڈھک دیا۔

ایرا جب سرگوشی کی کہ اگر تمہیں کچھ کہنا ہو تو کہہ دو اس لئے کہ اب ہم کئی گھنٹے تک کوئی بات نہ کر سکیں گے

اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ... مجھے جو کچھ کہنا ہے گھر پہنچ کر کہوں گا۔

جب سفر ختم ہو جائے تب کہنا۔ ایرا نے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا۔ گاڑی پھر چل پڑی۔ دو میل سے کم فاصلہ ہوا تھا جب وہ دشمن کے سامنے ہو لئے۔

اس نے اپنے بازو پھیلا دیے اور ایرا کو ہاتھ پر اٹھا لیا۔ اس نے اس کے رخساروں کو آہستہ سے چوما اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ رونیلڈ کو وقت کا پتہ بھی نہ چلا گھنٹے منٹوں میں گذرتے معلوم ہوئے اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ ابھی چلا تھا۔ اس نے مختلف آوازیں سنیں جو ادھر ادھر شور مچا رہی تھیں۔ اسے نے اسے اپنے سے اور قریب کر لیا وہ لوگ گٹھڑیوں کو ٹٹول رہے تھے ایک مرتبہ تو ایک سنگین رونیلڈ کے کندھے کو چھوتی ہوئی گذری وہ سانس روکے پڑے رہے۔

آوازیں برابر آتی رہیں۔ بہت دیر کے بعد گاڑی پھر چلنے لگی۔

وہ دونوں پتھر کی مورتیوں کی طرح خاموش پڑے ہوئے گاڑی کے گھسٹنے کی آواز سنتے رہے۔ موت اور زندگی میں ایک قدم سے بھی کم کا فاصلہ تھا اور وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے حصے میں کونسا قدم آتا ہے۔ موت اور زندگی ان دو الفاظ نے اسے پیج کی یاد دلا دی۔ اسے بھی وہ اسی حالت میں چھوڑ آیا تھا۔ اس کے سامنے بھی موت اور زندگی میں فاصلہ نہ تھا۔ ایک مرتبہ پیج نے اس سے کہا بھی تھا کہ موت اور زندگی ہم سے اتنی قریب ہیں کہ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کب کونسی راہ ہمیں مل جائے۔ یہ جسے ہم زندگی کہتے ہیں یہی ایک دن موت میں بدل جائے گی۔ کیونکہ حقیقی زندگی تو موت کے بعد ہی ملتی ہے۔

میں نہیں سمجھا۔ رونیلڈ نے اس سے کہا تھا۔ مگر پیج کہتا رہا تھا جب بچہ

ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو وہ موت کے منہ میں ہوتا ہے مگر وہ اس کے خلاف لڑتا ہے اور پیدا ہو جاتا ہے تب ہی موت زندگی میں بدل جاتی ہے

آخر کار گاڑی رک گئی اور چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں وہ سنتے تھے۔ یہ آوازیں خوش و خرم لوگوں کی تھیں۔ انھوں نے خان کی آواز سنی جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

نکل آؤ۔ باہر نکل آؤ۔

لوگوں نے جلدی جلدی گٹھڑیاں ہٹائیں اور سورج کی کرنیں ان کے منہ پر پڑنے لگیں۔ انھوں نے سب سے پہلے خان کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھا نکل آؤ اور زمین پر آ جاؤ۔

اس سے پہلے کہ وہ اترا ایک تیز آواز اس کے پیچھے سے آئی۔ سینڈ کوئی جلدی کرو ہم نے بازی جیت لی ہے۔ یہ وہی کھڑا تھا رونیلڈ نے دیکھا اس کا بنا نا ٹرک وہیں کھڑا ہے۔ جہاں وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔

جلدی کرو جلدی کرو۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں گاڑیاں سب پہ جاری کیں۔

وہ کود پڑا اور اس نے اپنا ہاتھ ایرا کی طرف بڑھا دیا۔ آؤ ٹرک کے اندر آ جاؤ۔

اس نے اسے سیٹ پر بیٹھنے میں مدد دی۔ اس کے بیٹھتے ہی ٹرک چل پڑا چودہ گھنٹے کے مستقل سفر کے بعد وہ ہسپتال کے سامنے تھے۔ اس درمیان میں وہ ایک جگہ چائے پینے کو ضرور رکے تھے ورنہ چلتے رہے تھے اس کے دماغ میں ہزاروں سوال آ رہے تھے اس نے خان سے کہا کہ وہ کبڑے سے پوچھے کہ لڑائی کا کیا حال ہے۔

جنوب میں یہ اور تیز ہو گئی ہے۔

اس کے بعد اس نے ہسپتال کے متعلق معلوم کیا تو اسے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ہیگارڈ ان کے آنے کے اگلے روز مر گیا تھا مگر اس کی بیوی ہسپتال چلاتی ہے اور وہ اس کی منتظر ہے۔ اس کے بعد اسے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

ہسپتال کے سامنے وہ ٹرک سے کود پڑا۔ اس نے بڑھ کر ایرا کو اتارا اور وہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے صحن کی طرف بڑھا۔

آؤ لان لی سے ملو۔ اس نے کہا۔

اس نے لان لی کو آپریشن روم میں پایا۔ وہ پیج کی جگہ کھڑی پہلی پیج کا چوغہ پہنے ہوئے اس کا کام انجام دے رہی تھی وہ ایک سپاہی کے زخم

جان اسٹین بیک

جان اسٹین بیک کی عمر اس وقت پچاس کے لگ بھگ ہے۔ اُس نے اپنے شباب کے ایام کیلیفورنیا میں گذارے۔ اُسے کیلیفورنیا کی فضا اتنی عزیز ہے کہ وہ دور دراز ملکوں میں برسوں رہ کر بھی کیلیفورنیا لوٹ آتا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران وہ برطانیہ میں رہا۔ چند برس ہوئے اُس نے روس کا دورہ کیا۔ اس کا ذہنی جھکاؤ سوشلزم کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ناولوں کے لئے نچلے طبقے کے کردار چنتا ہے۔ سماج کی خرابیوں کو اجاگر کرنے میں اُس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ انسان کی کوتاہیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے قلم سے چنگاریاں چھوٹنے لگتی ہیں

جان اسٹین بیک ایک ہنگامہ پسند مزاج رکھتا ہے۔ اپنی اسی ہنگامہ پروری کی بدولت اس نے اپنی زندگی کے لئے کئی راستے تراشے اور وہ کہیں بھی جم کر نہ بیٹھ سکا۔ اُس نے بڑی تیز رفتاری سے ایک کام کے بعد دوسرا کام اپنایا۔ سب سے پہلے اس نے ایک گوالے کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر وہ ایک بڑھئی کا شاگرد رہا۔ اس کام سے وہ جلد اُکتا گیا۔ اور ایک مصور کا شاگرد بن گیا۔ اس کی چنچل طبیعت نے اسے بھی گوارا نہ کیا۔ وہ ایک ادویات فروش کے یہاں ملازم ہو گیا پھر مزدوری کرنے لگا۔ طبیعت یہاں بھی گھبرا گئی اور وہ تنہا بیٹھنے لگا۔ آخرکار اُسے ایک جاگیر کا نگراں بنا دیا جہاں سال میں آٹھ مہینے برف پڑتی تھی یہیں اُس نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔

اس نے اب تک ایک درجن ناول اور سینکڑوں کہانیاں لکھی ہیں۔ اس کے بیشتر ناول فلمائے جا چکے ہیں۔ اس کی طرزِ تحریر اتنی شگفتہ اور رنگین ہے کہ ایک معمولی واقعہ بھی قاری کو انتہائی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ مکالمہ نویسی میں اس کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جان اسٹین بیک معمولی انسانوں کے معمولی جذبات کا عکاس ہے مگر وہ اپنے مشاہدے اور زندگی کے بھرپور تجربے سے اُن میں اتنی گہرائی اور گیرائی پیدا کر دیتا ہے۔ کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

جان اسٹین بیک کا یہ ناولٹ اس کے تمام فنی محاسن کا حامل ہے۔ یہ ایک بستی کی کہانی نہیں ہے بلکہ انسان کی پوری دنیا کی کہانی ہے۔ اس کے تمام کردار مثالی کردار ہیں۔ جو انسانی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

جان اسٹین بیک

لطیف اعظمی

جان سٹین بیک　　　　مترجم عبداللطیف اعظمی

یہ گلیاں یہ کوچے

لی چانگ کی پرچون کی دوکان اگرچہ بہت زیادہ صاف ستھری نہیں تھی، مگر سامان کے لحاظ سے عجیب وغریب تھی۔ دوکان بہت مختصر تھی، مگر اس کے باوجود ضرورت کی چھوٹی بڑی ہر چیز مل سکتی تھی مثلاً مختلف قسم اور سائز کے لباس، کھانے کی تازہ اور ڈبے کی چیزیں، شراب، تمباکو، مچھلی کے شکار کا سامان، کل پرزے، جوتے، رسے، کڑھائیاں، غرض اس قصبے کی روزمرہ کی بیشتر چیزیں مل جاتی تھیں۔

یہ دوکان صبح سویرے کھلتی اور رات گئے بند ہوتی۔ لی چانگ لالچی نہیں تھا، لیکن اگر کوئی روپیہ قرض کرے تو وہ اسے منع بھی نہ کرتا۔ اسے اپنی برادری میں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ کنری رو میں شاید ہی کوئی شخص ہو جو لی چانگ کا مقروض نہ ہو۔ اس کا اصول تھا کہ جب کسی کا بقایا بہت بڑھ جاتا تو اس کے پیچھے دوڑنے کے بجائے، ادھار دینا بند کر دیتا۔ اس کے اسی معقول رویے کی بنا پر عام طور پر لوگ بقایا ادا کر دیتے یا کم سے کم ادا کرنے کی کوشش کرتے۔

لی کا چہرہ آفتابی تھا اور خوش اخلاقی میں اپنی آپ مثال تھا، وہ انگریزی بہت اچھی بولتا تھا اور بولنے کا انداز اور لہجہ بہت ہی شاندار تھا۔ کیلیفورنیا میں جب زبانوں کے مسئلے پر جنگ چھڑی تو لی کی گرفتاری پر انعام مقرر تھا۔ مگر یہ چھپ کر سان فرانسسکو چلا گیا اور جب تک یہ ہنگامہ ختم نہ ہوا وہ ایک ہسپتال میں مقیم رہا۔ فرار کے وقت وہ اپنے روپے ساتھ لے جا سکا یا نہیں، اس کے متعلق کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ شاید وہ نہ لے جا سکا یا شاید اس کا کل سرمایہ ناقابل وصول بلوں کی صورت میں تھا بہرحال یہ واقعہ تھا کہ وہ اچھی زندگی بسر کرتا تھا اور اڑوس پڑوس کے لوگ اس کی بیحد عزت کرتے تھے۔ وہ اپنے گاہکوں پر پورا بھروسہ کرتا تھا۔ اس کا یہ اعتماد اس وقت تک قائم رہتا، جب تک یہ نہ ثابت ہو جائے کہ مزید اعتماد کرنا حماقت ہے۔ کبھی کبھی وہ کاروبار میں غلطیاں بھی کر گزرتا، مگر ایسی صورت میں بھی وہ فائدے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر لیتا، کچھ اور نہیں تو نیک خواہی کی شکل میں۔ کچھ اسی قسم کا معاملہ فلیپ ہاؤس اتنے کے محل کا تھا۔ دوسرے لوگ چاہے اس کو خسارہ کا سودا سمجھیں، مگر لی چانگ ایسا نہیں سمجھتا۔

لی چانگ اپنی دوکان میں سگار کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے بائیں جانب کیش رجسٹر رکھا رہتا اور داہنے جانب قیمت کا حساب کرنے کے لیے، گنتی گننے کا فریم تھا۔ شیشے کے کیس میں سگار، سگریٹ اور مختلف قسم کی دوائیں تھیں اور اس کی پشت پر دیوار سے لگا ہوا ریک تھا۔ جس میں چند نامزد قسم کی شرابیں تھیں۔ لی چانگ شراب کے گاہکوں کے معاملے میں قطعاً مداخلت نہ کرتا۔ سوائے اس کے کہ ساخت کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہو۔ سگار کیس کا شیشہ لی چانگ کی ڈیسک کا کام دیتا۔ اس کے موٹے ہاتھ ہمیشہ شیشے پر پڑے رہتے اور انگلیاں ہمیشہ حرکت میں رہتیں۔ اس کے بائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی تھی، جس سے وہ شیشے کو بیچ بیچ کھٹکھٹایا کرتا۔ نصف شیشے کی عینک استعمال کرتا اور چونکہ ہر چیز کو اس کے اندر سے دیکھنے کا عادی تھا، اس لیے جب کبھی دور کی چیز دیکھنی ہوتی تو گردن کو پیچھے جھکانا پڑتا۔ اس کی براؤن آنکھوں سے، جو ہر وقت دوکان کا جائزہ لیتی رہتی تھیں، محبت اور دوستی کا اظہار ہوتا تھا اور اس کے چمکیلے دانت ہر گاہک کو دیکھ کر نکل پڑتے۔

ایک شام کو وہ پیروں کو ٹھنڈ سے بچانے کے لئے اخباروں کی گڈی پر پیر رکھ کر کھڑا تھا تو اسی حالت میں مذاق ہی مذاق میں ایک بہت بڑا سودا ہو گیا۔ لی چانگ کی دوکان سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک عمارت تھی، جو ایک طویل عرصے تک مچھلیوں کے چارے کے گودام کے لئے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ یہ ایک پریشان حال شخص ہوریس ابی ویلے کی ملکیت تھی۔ ہوریس کے دو بیویاں تھیں اور چھ بچے تھے۔ تمرفی تا کافی ہرجے کی بنا پر اس پر قرض برابر چڑھتا رہا، یہاں تک کہ مانٹیرے میں سب سے زیادہ وہی مقروض تھا۔ اس شام کو لی چانگ کی دوکان پر وہی ہوریس آیا۔

تھا۔ اس کی حساس، اور نازک طبیعت نے لی کے چہرے کی روشنی کو فوراً محسوس کرلیا۔ اس نے کہا: "غالباً میں آپ کا بہت مقروض ہو گیا ہوں۔" لی کے لئے یہ سوال خلاف توقع تھا۔ حسب عادت اسکے دانت نکل پڑے، مگر اس نے اثبات میں صرف گردن ہلانے پر اکتفا کی اور اگلی بات کا انتظار کرنے لگا۔ ہورسیں نے زبان سے اپنے لب تر کئے، پھر کہا: "میں نہیں چاہتا کہ میری اولاد اس کی وجہ سے کسی مصیبت میں پڑے۔ تم میرے مکان سے واقف ہو، جو مچھلیوں کے چارہ کا گودام ہے۔ اگر میں یہ مکان تم کو دیدوں تو کیا میرا حساب بے باق ہو جائے گا؟" لی چانگ ذرا آگے جھکا اور عینک کے نصف شیشوں میں سے ہورسیں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس اثناء میں اس کا ذہن بہی کھاتے کی ورق گردانی میں مشغول ہو گیا اور اس کا داہنا ہاتھ قیمت جوڑنے والے فریم پر حرکت کرنے لگا۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے جواب دیا: "ہاں حساب صاف ہو جائے گا۔" "اچھا حساب تیار کرلو۔ میں اس مکان کا بیع نامہ لکھے دیتا ہوں۔" ہورسیں نے بعجلت جواب دیا۔ "حساب کتاب کی ضرورت نہیں۔ میں بے باقی کا پرچہ لکھ دیتا ہوں۔" اس طرح مختصر سے وقفے میں یہ سودا ہو گیا۔ لی چانگ فوراً شراب کے پیگ میں غرق ہو گیا۔ اور ہورسیں سیدھا گھر واپس آیا اور آتے ہی خودکشی کرلی۔ لی چانگ کو اس پر افسوس ہوا، اس کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری اپنے سر لی اور اس مصیبت زدہ خاندان کو کھانے پینے کے سامان کی ایک ٹوکری بھیج دی۔

لی چانگ اب ہورسیں کے گھر کا مالک تھا۔ اس عمارت کی چھت اور فرش بہت عمدہ تھے۔ اس میں دو کھڑکیاں تھیں اور ایک دروازہ۔ اس نے سب سے پہلے اس کو گودام بنانے کو سوچا، مگر فوراً اس خیال کی تردید کردی۔ کیونکہ دوکان سے یہ عمارت فاصلے پر تھی اور کوئی شخص بھی کھڑکیوں سے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی سونے کی انگوٹھی سے کھٹ کھٹا تا رہا اور ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں مشغول رہا۔ اسی حالت میں ہیک اندر داخل ہوا۔ ہیک عمر میں بڑا تھا، اس علاقے کا لیڈر تھا، تجربہ کار اور بھروسہ کا مشیر تھا اور ایک حد تک ایک چھوٹے سے گروہ کا سرغنہ تھا جس کے افراد مختلف خاندان کے تھے۔ جن کے پاس روپے نہ تھے اور جن کی زندگی کا مقصد عیش و عشرت اور آسودہ خاطری کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ ایسے لوگ زیادہ تر عیش و عشرت کی خاطر اپنے کو تباہی کے گڑھے میں ڈالدیتے ہیں، مگر ہیک اور اس کے ساتھی ان سے مختلف تھے۔ وہ عیش کی سرحدیں اچانک اور بہت خاموشی کے ساتھ داخل ہو جاتے اور بڑی خوش اسلوبی سے

اپنا مقصد پورا کرلیتے۔ ہیک اور ہیزل نوجوان اور طاقتور تھے، ہارکیو والیڈا میں ایک شراب خانے میں آب دار خانے تھے اور جونس جو دیکھنا تو قوت سائنس کے ایک تجربہ گاہ کے لئے مینڈک اور چوہے جمع کیا کرتے۔ یہ سب کے سب فی الحال لی چانگ کے قریب ہی زنگ آلود بڑے بڑے پائپ میں رہتے تھے۔ جب موسم خراب ہوتا تو ان پائپ میں رہتے اور جب موسم اچھا ہوتا، تو سرو کے ان درختوں کے پیچھے رہتے جو نسبتاً اونچائی پر تھے اور جن کی شاخیں کچھ اس طرح جھک کر آپس میں مل گئی تھیں کہ ان سے ایک منڈپ کی سی شکل بن گئی تھی۔ جہاں سے ایک شخص بہت آسانی سے کینری روڈ کے، وجز راد، اس کے گرد ونواح کو دیکھ سکتا تھا۔

لی چانگ کے چہرے پر ہیک کی آمد سے ذرا سختی پیدا ہوئی اور بے اطمینانی کے لئے اس کے ساتھی ایڈی، ہیزل، ہیوز اور جونس تو نہیں ہیں، اس نے اسٹور پر ایک نظر ڈالی۔ ہیک نے آتے کے ساتھ ہی اپنا مدعا بیان کیا۔ "لی! میں نے اور ایڈی اور دوسرے ساتھیوں کو معلوم ہوا ہے کہ ریلوے کا مکان تم نے خرید لیا ہے؟" لی چانگ نے اثبات میں سر ہلایا اور مزید استفسار کا منتظر رہا: "میں اور میرے دوست چاہتے ہیں کہ تم ہمیں وہاں رہنے کی اجازت دیدو، ہم اس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔" اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی: "ہم کسی کو اندر گھسنے نہ دیں گے، نہ کسی چیز کا نقصان ہونے دیں گے۔ تم سوچ سکتے ہو کہ لونڈے کتنے شریر ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ کھڑکیاں توڑ دیں۔" ہیک نے مشورہ دیا: "اگر کوئی شخص اس پر نگاہ نہ رکھے گا تو ہو سکتا ہے کہ کوئی آگ لگا دے۔"

لی کی آنکھیں ہیک کے چہرے پر جم کر رہ گئیں اور وہ خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔ اور اس کے خیالات گہرے ہوتے گئے، اس کی انگلیوں کی کھٹ کھٹاہٹ کمزور پڑتی گئی۔ ہیک کی آنکھوں میں خلوص، محبت اور انسانی دوستی جھلک رہی تھی، مگر لی چانگ شک اور شبہے کی بھول بھلیوں میں سرگرداں تھا اور اس کی یہ خیالی دنیا آہستہ آہستہ حقیقت بنتی گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس نے ہیک کی درخواست کو ٹھکرا دیا ہے اور کھڑکیوں کے شیشے چور چور ہو گئے ہیں۔ ہیک نے مکان کی حفاظت کی دوبارہ پیشکش کی ہے اور اس مرتبہ بھی انکار کر دینے پر لی نے مکان سے دھواں نکلتے دیکھا، جسے ہیک اور اس کے ساتھیوں نے بجھایا۔ لی کی انگلیاں رک گئیں اور اس نے اپنے کو شکست خوردہ محسوس کیا۔ بالآخر لی نے جواب دیا: "تم چاہو تو مکان کو کرایہ پر لے سکتے ہو۔" ہیک کی خوشی سے باچھیں

کوٹھیں۔ اس نے پوچھا "کتنے میں؟" "پانچ ڈالر فی ہفتہ" لی نے جواب دیا "بہت اچھا، میں ساتھیوں سے مشورہ کروں گا۔" اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا: "کیا چار ڈالر فی ہفتہ نہیں ہو سکتا؟" "پانچ ڈالر" لی نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔ "بہت اچھا، دیکھو میرے ساتھی کیا کہتے ہیں۔" جیک کا جواب تھا۔

اس کے بعد معاملہ طے پا گیا۔ ہر دو پارٹیاں اس پر خوش تھیں ــ دوسروں کی نگاہ میں چاہے اس سودے میں لی چانگ کا نقصان ہی نقصان تھا، مگر خود اس کا خیال اس سے مختلف تھا۔ کیونکہ کھڑکیاں محفوظ تھیں اور آگ کے شعلے کبھی نہیں بھڑکتے۔ اگرچہ مکان کا کرایہ کبھی وصول نہیں ہوا، مگر کرایہ داروں کو جب بھی پیسے ملتے ــــ اور اکثر ملا کرتے ــــ تو وہ صرف لی چانگ کی دوکان ہی پر خرچ ہوتے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ لی چانگ کو ایک منتشر مگر سرگرم گروہ مل گیا تھا جو اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔ اگر کوئی شرابی کبھی دوکان میں دنگا فساد کر بیٹھتا یا نیو مانیٹری کے سپاہی قرضہ کر بیٹھتے تو لی چانگ کی صرف ایک آواز پر اس کے کرایہ دار اس کی مدد کو آ پہنچتے۔ علاوہ ازیں لی چانگ کی اب ہر چیز محفوظ تھی۔ اس کی وجہ سے اس کو جتنا فائدہ پہنچتا تھا، وہ مکان کے کرایے سے کہیں زیادہ تھا۔

بہرحال، جیک اور اس کے ساتھی اس مکان میں منتقل ہو گئے اور مچھلیوں کا چارہ وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد سے اس مکان کا نام "فلاپ ہاؤس گرل محل" مشہور ہو گیا۔ اس کے رہنے والوں کی پچھلی زندگی ہر قسم کے فرنیچر سے بے نیاز تھی۔ مگر موجودہ حالات میں فرنیچر کا اضافہ، جو جدید تہذیب و تمدن کی نشانی ہے، ناگزیر تھا۔ چنانچہ میز، کرسی اور چارپائی سے ان خانہ بدوشوں کی زندگی روشناس ہوئی اور فلاپ ہاؤس گرل محل میں ہر طرف چہل پہل نظر آنے لگی۔ اس کے مکین دروازے کے سامنے بیٹھ کر زندگی کا نظارہ کرتے، رات میں سائنس کے تجربہ گاہ کے گانوں سے محظوظ ہوتے اور جب ڈاک لی چانگ کی دوکان پر شراب پینے جاتا تو ان کی آنکھیں اس کا تعاقب کئے بنا نہ رہتیں۔ ایسے موقع پر میک کہا کرتا: "ڈاک بہت اچھا آدمی ہے۔ ہمیں اس کے لئے کچھ کرنا چاہیے۔"

لی چانگ کی دوکان کھلے میدان کے دائیں جانب تھی (جسے لوگ کھلا میدان کیوں کہتے تھے، حالانکہ اس پر پرانی بھٹیوں، زنگ آلود پائپ، بیکار شہتیر اور ٹین کے بڑے بڑے ڈبوں کے ڈھیر کے ڈھیر تھے) اس خالی میدان کی پشت پر ریلوے لائن اور فلاپ ہاؤس گرل محل تھا اور میدان کے بائیں کنارے پر ڈورا فلڈ کا شاندار قحبہ خانہ تھا، جو صفائی ستھرائی اور ایمانداری کے لحاظ سے اچھی شہرت کا حامل تھا۔ جو بھی وہاں جاتا سکون اور اطمینان قلب محسوس کرتا۔ کوئی سستے قسم کا قحبہ خانہ نہیں تھا، جہاں چند منچلے وقتی تفریح کے لئے آ جاتے تھے۔ اس کا معیار بڑا اونچا تھا اور اس کے رہنے والے اچھے کردار کے حامل تھے اور ڈورا جیسی شخصیت اس کی انتظام و انصرام کی ذمہ دار تھی، جس نے سالہا سال کی محنت، مصلحت بینی، حقیقت پسندی اور ایمانداری سے یہ خاص شہرت اور نیک نامی حاصل کی تھی، جس کی ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ بڑی قدر کرتا تھا، مگر اس کے ساتھ ایک طبقہ ایسا بھی تھا، جو انہیں خوبیوں کی بنا پر اس سے نفرت کرتا تھا۔

ڈورا بڑی عظیم اور شاندار عورت تھی، اس کے بال شوخ سنہرے رنگ کے تھے اور اسے شام کا لباس گہرے ہرے رنگ کا بہت مرغوب تھا۔ اس کے یہاں مول بھاؤ نہیں ہوتا تھا، اس کے یہاں شور مچانے والوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی، شور اور بیہودہ گوئی کو ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی لڑکیوں میں بعض کافی بوڑھی ہو چکی تھیں، مگر ڈورا کی شرافت نے ان کو الگ کرنا پسند نہیں کیا۔ وہ خود کہا کرتی تھی کہ ان میں سے بعض لڑکیاں ایسی ہیں کہ مہینے میں تین گاہک بھی حاصل نہیں کر سکتیں، مگر وہ روزانہ پابندی سے تین مرتبہ کھاتی ہیں۔ ڈورا نے اپنی اس جگہ کا نام بیئر فلیگ ریسٹورانٹ رکھا تھا۔ اس میں بارہ لڑکیاں رہا کرتی تھیں۔ ایک یونانی باورچی اور ایک چوکیدار بھی تھا، جو چوکیداری کے علاوہ بعض نازک اور خطرناک امور بھی انجام دیا کرتا۔ اگر کوئی لڑائی کر بیٹھے تو اس کی گوشمالی کرتا، مست شرابیوں کو باہر نکالتا، ہسٹریا کے مریضوں کو ہوش میں لاتا، درد سر کا علاج کرتا اور شراب خانے کی نگرانی کرتا۔ یہ تمام ذمہ داریاں اسی کو انجام دینی پڑتیں۔ اس سے پہلے جو شخص اس جگہ کام کرتا تھا، وہ ذرا غیر متوازن قسم کا تھا اور اس کا خاتمہ ایسے حالات میں ہوا تھا کہ ڈورا کی شخصیت داغدار ہو سکتی تھی، مگر الفریڈ نے آتے ہی صورت حالات پر پوری طرح قابو حاصل کر لیا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ کس قسم کے لوگوں کو وہاں آنا چاہیے اور کس قسم کے لوگوں کو نہیں۔ نیز وہ مانیٹری کے باشندوں کی

گھریلو زندگی سے پوری طرح واقف تھا۔

ڈورا کا پیشہ ایسا نازک تھا کہ اسے بڑی احتیاط کرنی پڑتی۔ خلاف قانون ہونے کی بنا پر دوسروں کے مقابلے میں ان کی ذمہ داریاں دہری تھیں۔ کوئی خرابی بدمست ہو کر ہنگامہ نہ کرے، دنگا فساد نہ ہو، بدتمیزی نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے اسے خرچ بھی کافی کرنا پڑتا۔ ہر شخص کی نگاہ اس پر رہتی۔ اگر پولیس کو اپنی پنشن کے فنڈ کے لئے رقص و سرود کی محفل سجانی ہوتی تو اس کے لئے دوسرے ایک ڈالر چندہ دیتے تو ڈورا کو پچاس ڈالر دینے پڑتے۔ چیمبر آف کامرس کو اپنے لان کو بہتر بنانے کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی تو عام تاجر اگر پانچ ڈالر دیتے تو ڈورا سے سو ڈالر طلب کیا جاتا اور اسے دینا پڑتا۔ غرض کہ ریڈ کراس، کمیونٹی کے مشترک فنڈ، بوائے اسکاؤٹس وغیرہ کے لئے جس قدر عطیے حاصل کئے جاتے ان میں ڈورا کی گناہ کی کمائی کی مقدار سب سے زیادہ ہوتی۔ لیکن سب سے زیادہ ڈورا کو اس وقت خرچ کرنا پڑا جب کنسری رو میں کاروبار مندا پڑ گیا تھا اور ہر طرف بیکاری اور غربت پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت معمول کے چندوں کے ساتھ ساتھ ڈورا نے بھوکے بچوں، بے کار والدین اور پریشان حال عورتوں کی کافی خبرگیری کی اور ان کے کھانے پینے کے بلوں کی کوئی دو سال تک ادائیگی کرتی رہی۔ ڈورا کی لڑکیاں بڑی تربیت یافتہ اور خوش اخلاق تھیں۔ وہ راستہ میں کسی سے بات کرنا پسند نہ کرتیں، چاہے وہی کیوں نہ ہو جس کے ساتھ گذشتہ رات بسر کی گئی ہو۔

موجودہ چوکیدار الفریڈ کے آنے سے قبل بیر فلیگ ریسٹورانٹ میں ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ سابق چوکیدار ولیم تنہائی پسند تھا، دن کے وقت جبکہ اس کی ذمہ داریاں کم ہوتی تھیں، عورتوں کی صحبت سے الگ تھلگ رہتا۔ کھڑکیوں سے ہیک اور اس کے ساتھیوں کو خالی میدان میں نلوں پر بے فکری کے ساتھ گپ کرتے اور شراب پیتے دیکھتا تو ان کی زندگی پہ رشک کرتا۔ بالآخر ایک دن اس سے نہ رہا گیا اور وہ ان کی مجلس میں شریک ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ہر ایک اس طرح خاموش ہو گیا، جس سے اس کے دلی اضطراب اور غصے کا اظہار ہوتا تھا۔ ولیم مایوس ہو کر بیر فلیگ واپس آ گیا۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ گفتگو پھر جاری ہو گئی ہے تو اس کا غم دوچند ہو گیا۔ دوسرے روز ولیم پھر گیا اور اس مرتبہ اس نے وہاں بیٹھ کر شراب بھی پی۔ مگر اس مرتبہ ہیک اور اس کے ساتھیوں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور جب تک وہ موجود رہے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ولیم تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔ بیر فلیگ پہنچا تو اس کو ہیک کی اونچی آواز سنائی دی: "خدا اس کو غارت کرے، مجھے اس دلال سے سخت نفرت ہے۔" گو یہ الزام صحیح نہیں تھا، مگر ولیم کے دل پر سخت چوٹ لگی اور اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اسی وقت بیسٹ بیچ اور سمندر کی طرف چل دیا اور اس خاموش اور پرسکون فضا میں اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ ساحل کا دلکش نظارہ بھی اسے برے اور خطرناک خیالات سے جو اس وقت اس کے ذہن میں ابھر رہے تھے، روک نہ سکا۔ اسے دکھ تھا کہ دنیا میں کوئی نہیں جو اس سے محبت کرے، کسی کو اس کی پرواہ نہیں۔ وہ چوکیدار ہے، مگر دنیا اسے دلال سمجھتی ہے ــــ گندا دلال، دنیا کا ذلیل ترین انسان۔ اس نے اپنے دل سے سوال کیا، کیا اسے شرافت کی اور خوشی کی زندگی بسر کرنے کا حق نہیں ہے۔ ضرور ہے۔ وہ انتہائی غصے کی حالت میں واپس آیا۔ مگر بیر فلیگ پہنچتے ہی اس کا غصہ جاتا رہا۔ اس وقت "موسم خزاں کا ماہ کامل" (ہارویسٹ مون) کی دھن فضا میں مرتعش تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس کی پہلی محبوبہ کو یہ دھن کس قدر پسند تھی۔ اس خیال سے اس کا غم دوچند ہو گیا۔ اس وقت ڈورا اپنی خلوت کی نشست گاہ میں چائے پی رہی تھی۔ اس نے ولیم کا چہرہ دیکھ کر تعجب سے پوچھا: "معاملہ کیا ہے؟ کیا تم بیمار ہو؟" "نہیں،" ولیم نے جواب دیا: "تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے اور جی چاہتا ہے کہ سر ٹکرا کر جان دیدوں۔" ڈورا کو اپنی زندگی میں اس قسم کے احساساتی مریضوں سے کافی سابقہ پڑا تھا۔ وہ ایسوں سے ہمیشہ بچوں کا سا سلوک کرتی اور ان کی باتوں پر کبھی سنجیدگی سے دھیان نہ دیتی۔ "ضرور جان دیدو، مگر خدا کے لئے میرا فرش خراب نہ کرنا،" ڈورا نے جواب دیا۔

ولیم کے دل پر گہرے بادل چھا گئے۔ وہاں سے خاموشی کے ساتھ نکلا اور ایوا فلیمنگ کے دروازے پر دستک دی۔ ایوا کے بال سرخ تھے اور وہ ہر ہفتہ اعتراف گناہ کے لئے چرچ جایا کرتی۔ بڑی مذہبی تھی، مگر شراب کی بڑی دلدادہ تھی اور غیر معمولی بناؤ سنگار سے اپنے حسن رفتہ کی تلافی کی کوشش کیا کرتی۔ وہ ضرورت سے زیادہ بھدی ہو گئی تھی اور ولیم کو معلوم تھا کہ ڈورا بھدی اور بے ڈول جسم کی عورت کو اپنے یہاں ٹھہرنے نہیں دیتی۔ اس وقت ایوا غصہ میں بھری بیٹھی تھی۔ ولیم کو دیکھ کر تیز لہجے میں بولی: "تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟" ولیم کو بھی غصہ آ گیا۔

... پاس پہنچنا چاہتا ہوں" اس نے کوئی جواب [illegible] ... [illegible] ہے ... [illegible] ... [illegible]۔ ... [illegible] ... جب ہم [illegible] ... [illegible] ... بند کر کے چلا گیا [illegible] دستور ... [illegible] ... کوئی پرواہ نہ تھا۔ اس نے [illegible] ... [illegible] ... سکون ملتا تھا۔

یونانی [illegible] ... تھیلیوں میں گوشت کے ٹکڑے ... رہا تھا اور برف کاٹنے کی چھری سے انہیں الٹ پلٹ رہا تھا۔

"ہو دوست! کیا حال ہے؟" ولیم کو دیکھ کر سوال کیا: "کچھ ہمیں معلوم ہے" ولیم نے ... جواب دیا: "میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اپنا گلا کاٹ لوں" یونانی نے چھری چولہے پر رکھ دی اور آستین اوپر چڑھا لیں: "آخر تم کہہ کیا رہے ہو؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔ ولیم نے ہاتھ بڑھا کر چھری اٹھا لی۔ اور یونانی کی سیاہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ یونانی کی آنکھوں سے پریشانی ظاہر تھی۔ ولیم اس کی دلی کیفیت کو تاڑ گیا اور قبل اس کے کہ یونانی اس کے ہاتھ سے چھری چھینے، ولیم کے پیٹ میں پیوست ہو چکی تھی۔ الفریڈ نے ولیم کی طرح ... ہر شخص اس کو پسند کرتا تھا اور یہ ہیک کے ساتھ اکثر پائپ پر بھی بیٹھا کرتا اور کبھی کبھار ... ہاؤس بگرل محل میں بھی جایا کرتا تھا۔

ڈاکٹر گریٹ ہائیڈ پول سے، جو جزیرہ نما کے سرے پر واقع تھا سمندری جانور پکڑا کرتا تھا۔ جگہ اس قدر عجیب و غریب تھی کہ یقین کرنا مشکل تھا۔ جب چاند بھاگ آتا تو گودی میں موجیں اس قدر ستھنا شروع کرتیں کہ ہر طرف کریم رنگ کی جھاگ ہی جھاگ ہوتی۔ اور یہ بیقرار موجیں جب ایک دوسرے سے ٹکراتیں تو ہر طرف سیٹی کی سی آواز بجتی۔ لیکن جب سمندر اتر جاتا تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی اور منظر انتہائی خوبصورت ہو جاتا، سمندر کا پانی اس قدر صاف شفاف ہو جاتا کہ تہہ کی تمام چیزیں دکھلائی دیتیں۔ مچھلیاں چلتی پھرتی اور لڑتی بھڑتی نظر آتیں۔ قسم قسم کے دوسرے جانور چہلیں کرتے اور کلیلیں کرتے دکھائی دیتے۔ غرض یہ منظر عجیب و غریب ہوتا۔

پول پر ڈاکٹر اور ہیزل دونوں ساتھ مل کر شکار کھیلتے۔ ہیزل فلاپ ہاؤس محل میں میک اور اسکے ساتھیوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس کا یہ نام محض اتفاق سے رکھا گیا تھا۔ اس کی پریشان حال ماں کے آٹھ سال میں سات بچے ہوئے، ہیزل آٹھواں تھا۔ جب یہ پیدا ہوا تو اس کی جنس مشتبہ تھی۔ اس کی ماں سات بچوں اور ان کے باپ کو کھو لے جیسے اور اسکے کچھ لینے انتقام کی کافی پریشان اور مشغول ہوا کرتی۔ اسے روپے کمانے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے۔ اس کا شوہر گھر میں بیٹھا صرف مشورے دیا کرتا، کشتی کرتا اور تنقید ہی کیا کرتا۔ ہیزل کی ماں کے ایک پھوپھی تھی، جس کا نام ہیزل تھا اور وہ لائف انشورنس کا کام کرتی تھی۔ آٹھویں بچے کا نام اسی کے نام پر اس وقت ہیزل رکھا گیا تھا جب پتہ نہیں تھا کہ یہ لڑکا ہے۔ بعد میں اس کی ماں نے نام بدلنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ ہیزل بڑا ہوا تو چار سال گرامر اسکول میں گزارے اور چار سال ریفارم اسکول میں۔ مگر ان میں سے کسی سے بھی کچھ حاصل نہ کر سکا۔ ریفارم اسکول میں، نام کے برعکس بد خصائل اور معصیت سکھلائی جاتی ہے، مگر ہیزل نے اس طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ چنانچہ جب ریفارم اسکول سے نکلا تو اتنا ہی معصوم تھا جتنا ضرب، تقسیم کے علم سے محروم۔ ہیزل کو گفتگو سننے کا بہت شوق تھا، مگر الفاظ پر کبھی غور نہ کرتا۔ وہ طرح طرح کے سوالات کیا کرتا، مگر جواب معلوم کرنے کے لئے نہیں، بلکہ محض گفتگو کی خاطر۔ اس کی عمر ۲۶ سال تھی، بال سیاہ تھے، خوش رو، توانا، رضامند اور وفادار تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ڈاکٹر کے ساتھ شکار کھیلنے جایا کرتا، مگر ڈاکٹر کو کسی موقع پر بھی اس سے شکایت کا موقع نہیں ملا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت بہت سخت تھی۔ اور سخت سے سخت پھسلن پر بھی اس کے قدم مضبوطی سے جم جاتے اور ان میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ ہوتی۔ وہ شکار کا انتہائی عاشق تھا۔ ڈاکٹر شکار کے وقت برساتی ٹوپی اور گم بوٹ استعمال کیا کرتا، مگر ہیزل کیلئے ٹینس شو اور معمولی کپڑا ہی کافی تھا۔ ایک دفعہ ڈاکٹر کو تارا مچھلی کے لئے تین سو کا آرڈر ملا تھا اور دونوں تارا مچھلی پکڑنے میں مشغول تھے۔

ہیزل نے ایک عجیب قسم کی ارغوانی مائل تارا مچھلی پکڑی۔ اس کو اپنے بورے میں جو قریب قریب بھر چکا تھا، جلدی سے ڈالتے ہوئے سوال کیا: "میں حیران ہوں کہ آخر اس کو کرتے کیا ہیں؟"

"تم کس چیز کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟" ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"تارا مچھلی" ہیزل نے جواب دیا "تم ان کو بیچ دیتے ہو۔ تم ان کو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں بھیجتے ہو۔ آخر لوگ ان کو کرتے کیا ہیں۔ تم کھاتے تو ہو نہیں؟"

"وہ ان کا مشاہدہ کرتے ہیں" ڈاکٹر نے انتہائی تحمل کے ساتھ جواب دیا۔ اس کو یہ بھی یاد آ گیا کہ اس سے قبل وہ ہیزل کو اسی سوال کا جواب متعدد مرتبہ دے چکا ہے مگر ڈاکٹر میں ایک خوبی تھی کہ اگر کوئی شخص کوئی بات پوچھتا تو کبھی انکار نہ کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ جب کوئی شخص کوئی بات پوچھتا ہے تو وہ اس کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے، خود ڈاکٹر کا اصول یہی تھا کہ وہ اسی وقت کوئی سوال کرتا تھا، جب اس کو سچ مچ کوئی بات معلوم کرنی ہوتی تھی۔ لیکن ہیزل اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ محض گفتگو کی خاطر سوال کرتا اور ایسا طریقہ اختیار کرتا کہ اس کا جواب دوسرے سوال کی بنیاد بن جاتا، تاکہ گفتگو کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو

"مشاہدہ کرنے سے ان کو ملتا ہی کیا ہے؟" ہیزل نے گفتگو جاری رکھی "یہ تو محض تارا مچھلیاں ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ میں تم کو لاکھوں کی تعداد میں پکڑ کر دے سکتا ہوں۔"

"ان میں بہت سی چیزیں سمجھنے کی ہیں اور دلچسپ بھی ہیں" ڈاکٹر نے مداخانہ انداز میں جواب دیا "اس کے علاوہ ان کو مڈل ایسٹ اور نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی بھیجا جاتا ہے۔"

ہیزل نے اپنے معمول کا طریقہ اختیار کیا: "کیا وہاں تارا مچھلی نہیں ہوتی؟"

"وہاں کوئی سمندر نہیں ہے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"اوہ!" ہیزل نے کہا۔ حسب عادت وہ چاہتا نہیں تھا کہ اس طرح گفتگو ختم ہو جائے۔ وہ کوئی سوال کرنے کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر ایک سوال کر بیٹھا۔ ہیزل کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ کیونکہ اس کو جواب دینے کے لئے اپنے دماغ کو کام میں لانا پڑتا اور یہ چیز اس کی طبیعت کے خلاف تھی۔ ہیزل کا دماغ ایک عجائب میوزیم کی طرح تھا، اس میں بہت سی چیزیں تھیں۔ مگر تمام چیزیں غیر مرتب حالت میں تھیں۔ اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ اسے کوئی بات بھولتی نہیں مگر وہ کبھی انہیں ترتیب دینے کی زحمت نہ اٹھاتا۔ اس کے ذہن میں تمام باتیں اور معلومات اس طرح گڈمڈ اور ملی جلی تھیں جس طرح کسی کشتی کی تہہ میں طرح طرح کی مچھلیاں ایک دوسرے کے اوپر رکھ دی جائیں۔

ڈاکٹر نے سوال کیا: "ممل کا کیا حال ہے؟"

ہیزل نے اپنے سیاہ بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "بہت اچھا۔"

کچھ وقفے کے بعد اس نے مزید کہا: "مجھے لگا اب ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی بیوی نے اس کو بہت تنگ کر رکھا ہے۔ اگر جاگتے میں اسے مارا جائے تو اسے کوئی غم نہیں ہوتا۔ مگر اس کی بیوی تو یہ فرض منصبی اس وقت ادا کرتی ہے، جب وہ سو جاتا ہے۔ مجھے کو اس کا یہی ادا پسند نہیں ہے۔ یہ زیادتی اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہے، اس لئے بیچارہ ہمارے یہاں چلا آیا ہے۔"

"تم جانتے ہو" ڈاکٹر نے کہا: "اس کی بیوی کارنٹ اور جیل کی دھمکی دیا کرتی ہے:"

"اونہہ" ہیزل نے کہا "یہ اس وقت کی بات ہے جب نئی جیل کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے کوئی تیس روز پرانے جیل خانہ میں رہا ہوں، اس سے نکلنے کے لئے انتہائی بے چین تھا، مگر نئے جیل میں رہا ہے، آرام دہ چارپائی ہے۔ وہاں افسر اعلیٰ بہت شریف اور نیک ہے، اس لئے ہیزل کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔ اس لئے اب اس کی بیوی جیل بھیجنے کی دھمکی نہیں دیا کرتی اور نہ اس کو سوتے میں مارتی ہے۔ مگر تم کو معلوم ہے کہ مجھے کو یہ مار پیٹ بالکل پسند نہیں ہے لہذا وہ اس سے تنگ آ چکا ہے، اسلئے ہمارے یہاں چلا آیا اور میرا قیاس ہے کہ اب وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔"

ڈاکٹر کھڑا ہو گیا۔ گرے ٹائڈ پول بیریر پر موجیں بڑھنا شروع ہو گئی تھیں اور پھر اکیوں سے سیٹی کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ زمین جوار بھاٹا سے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے برساتی ٹوپی ذرا پیچھے کر لی "یہ تارا مچھلیاں کافی ہو گئی ہیں" ڈاکٹر نے کہا "ہاں سنو ہیزل! تمہاری بیوی کی تہہ میں چھ سات چھوٹے سائز کے سیپ ہیں۔ اگر اتفاق سے ہم پکڑے جائیں اور انسپکٹر ہم سے پوچھے تو تم کہنا کہ انہیں تم نے اپنے پرمٹ پر پکڑا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"بہت اچھا" ہیزل نے کہا۔

"دیکھو!" ڈاکٹر نے نرم لہجہ میں کہا "فرض کرو مجھے سیپ کی ضرورت ہے، تو انسپکٹر سمجھے گا کہ میں اپنا پرمٹ اکثر استعمال کرتا ہوں فرض کرو کہ وہ سوچے کہ میں اس کو کھاتا ہوں۔"

"ٹھیک" ہیزل نے کہا۔

"یہی حال انڈسٹریل الکوہل بورڈ کا ہے۔ یہ ہر شخص پر شبہ کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں الکوہل پیتا ہوں۔ وہ ہر شخص کے بارے

[illegible] مسکراہٹ [illegible] اس کے ہاتھ میں [illegible] کی کیفیت [illegible] ہے۔ [illegible] دانت دکھتا ہے۔ کیوں ڈاکٹر! کیا مسکراہٹ میں زہر بھی ہو سکتا ہے؟"

"مسکراہٹ بھی ویسی ہی چیز ہے جو انسان منہ سے نکالے اس میں زہر ہوتا ہے ۔۔۔ ڈاکٹر نے جواب دیا ۔۔۔ اس نے کسی ڈاکٹر کو بھی دکھایا؟"

"وہ شخص جو بیٹھا تھا، اس کی دیکھ بھال کرتا ہے" جیک نے جواب دیا۔

"اس کے لئے صفائی کو کوئی دوا لینے دو!" ڈاکٹر نے کہا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس کے کہنے کا کوئی اور مقصد ہے، اس لئے منتظر رہا کہ وہ اصل منشا بیان کرے۔ جیک بھی سمجھ گیا کہ وقت آ گیا ہے اسے اپنے مقصد کی طرف آنے کا۔ "ڈاکٹر! اس وقت تم کو کس قسم کے جانوروں کی ضرورت ہے؟" جیک نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "کیوں؟"

"ابھی عرض کرتا ہوں" جیک نے جواب دیا ۔۔۔ "دراصل مجھے اور میرے ساتھیوں کو روپے کی ضرورت ہے ۔۔۔ ایک اچھے کام کے لئے، ایک نیک مقصد کیلئے۔"

"کیا سب نے گرم گرم سوپ کے لئے؟"

جیک کو اپنے مقصد کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے اچھا موقع مل گیا "نہیں، ایسا نہیں ہے" اس نے کہا "بہت اہم مقصد کے لئے۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے سوچا کہ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہم اس کو مہیا کر دیں۔ اس طرح ہم کو کچھ روپے مل جائیں گے اور آپ کو کام ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر نے چند مچھلیاں اور بوری سے نکالیں۔ پھر جیک سے مخاطب ہوا "مجھے کوئی تین چار سو مینڈکوں کی ضرورت ہے۔ میں خود انتظام کر لیتا، مگر مجھے لاجولا جانا ہے۔ کل بہت اچھا جوار بھاٹا آنے کی امید ہے۔ مجھے خاص قسم کے کچھ سیپ کی ضرورت ہے۔"

"کیا مینڈکوں کی وہی قیمت ہے؟" جیک نے سوال کیا "فی مینڈک پانچ سنٹ؟"

"ہاں وہی قیمت ہے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

جیک کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا "ڈاکٹر! تم مینڈکوں کی ذرا بھی فکر نہ کرو" اس نے کہا "تمہیں جس قدر ضرورت ہے ہم مہیا کر دیں گے۔"

"بہت اچھا" ڈاکٹر نے جواب دیا "تم کو جس قدر ملیں گے میں لے لوں گا۔ مگر مجھے تقریباً تین سو کی ضرورت ہے۔"

"پانچ نہیں؟ ڈاکٹر! اگر تم کو سات آٹھ سو کی ضرورت ہو تو وہ بھی ہم پورے کر دیں گے" جیک کے چہرے پر بادل سا آ گیا۔ "ڈاکٹر!" اس نے کہا ۔۔۔ "کیا اتوار تک ان کے لئے تمہاری کار مل سکے گی؟"

"نہیں" ڈاکٹر نے بغیر کسی تکلف کے جواب دیا "تم سے ابھی کہہ چکا ہوں کہ کل صبح جوار بھاٹے سے فائدہ اٹھانے کے لئے مجھے لاجولا جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے" جیک کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی "خیر اس کی فکر نہ کرو ڈاکٹر! شاید لی چانگ کا پرانا ٹرک ہمیں مل جائے" جیک کا چہرہ اور اتر گیا۔ "ڈاکٹر!" اس نے دوسری درخواست کی "اتنے بڑے کاروبار کے لئے کیا تم کچھ پیشگی رقم دے سکو گے، کم از کم پٹرول کے خرچ کے لئے؟ مجھے یقین ہے کہ لی چانگ پٹرول نہیں دے گا۔"

"نہیں" ڈاکٹر نے کہا "اس سے پہلے تم کو رقم دے کر نقصان اٹھا چکا ہوں۔"

"پھر شاید ہم نہ جا سکیں" جیک نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں غم اور درد تھا۔ ڈاکٹر کو واقعی مینڈکوں کی سخت ضرورت تھی۔ اسلئے اسے اپنے رویے میں تبدیلی کرنا پڑی۔

"میں ایک اور ترکیب کر سکتا ہوں۔ میں ایک پرچہ لکھے دیتا ہوں، تم پٹرول اسٹیشن سے دس گیلن میرے حساب میں لے لو۔ کیوں ٹھیک رہے گا؟"

جیک مسکرایا "بہت اچھا" جیک نے رضامندی ظاہر کی۔ "میں اور میرے ساتھی کل صبح سویرے روانہ ہو جائیں گے اور جب تم جنوب سے واپس آؤ گے تو اتنے مینڈک پاؤ گے، جتنے کبھی تم نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھیں گے۔"

ڈاکٹر نے اسی وقت دس گیلن پٹرول کے لئے پرچہ لکھ دیا۔ جیک نے مینڈکوں کا مزید اطمینان دلایا اور پرچہ لے کر واپس لوٹا۔ ڈاکٹر کی آنکھیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں اور وہ کچھ بے چین نظر آ رہا تھا۔

اس لئے کہ جیک اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ سودا کرنے میں شاید کچھ فائدہ ہوا ہو۔ جیک تجربہ کار تھا۔ سیدھا لی چانگ کی دوکان پر گیا۔ لی چانگ حسب معمول سگار کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا۔ جیک داخل ہوا تو اس کی انگلیاں ذرا تیزی سے کھٹکھٹانے لگیں۔ جیک نے بغیر کسی تمہید کے مدعا بیان کیا: "لی! ڈاکٹر کو نیویارک میوزیم سے مینڈکوں کے لئے ایک بہت بڑا آرڈر ملا ہے۔ ڈاکٹر کو جنوب جانا ہے۔ اس لئے ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دوسرے کی مدد کرنی ہی چاہیے، خصوصاً ڈاکٹر جیسے مخلص دوست کی ——— کیوں، ساٹھ ستر ڈالر تو وہ تمہاری دوکان پر خرچ کر دیتا ہوگا؟" لی چانگ بدستور خاموش رہا۔ جیک نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "کیا تم وادی کا رمیل تک جانے کے لئے، ڈاکٹر کی خاطر اپنا ٹرک دے سکو گے؟"

لی چانگ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں فتحمندی تھی: "ٹرک ٹھیک نہیں ہے" اس نے کہا "ٹرک خراب ہو گیا ہے۔" اس جواب نے جیک کو چکرا دیا، مگر جلد ہی اپنے پر قابو پا لیا: سگار کاؤنٹر پر پٹرول کا پرچہ رکھ کر اس سے مخاطب ہوا: "دیکھو، ڈاکٹر کو مینڈکوں کی سخت ضرورت ہے۔ ان کو حاصل کرنے کے لئے اس نے پٹرول کیلئے یہ پرچہ لکھا ہے۔ مجھے ڈاکٹر کا نقصان کسی حالت میں گوارا نہیں۔ گے بہت اچھا مستری ہے۔ اگر وہ تمہارا ٹرک ٹھیک کر دے تو کیا دے سکو گے؟"

لی نے پیچھے جھک کر اپنی عینک کے نصف شیشوں سے اسکو غور سے دیکھنے لگا۔ ٹرک واقعی خراب تھا اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ گے بہت اچھا مستری تھا: "کب تک واپس آ جاؤ گے؟" لی نے سوال کیا۔

"غالباً دوپہر تک، یا ممکن ہے کہ پورا دن صرف ہو جائے۔" جیک نے اطمینان دلایا: "بس جونہی ضرورت بھر مینڈک مل جائیں گے ہم واپس آ جائیں گے۔"

لی پریشان تھا، مگر انکار کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی اس لئے حامی بھرنی پڑی: "بہت خوب۔" جیک نے خوش ہو کر کہا: "مجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر کو تم پر کس قدر بھروسہ ہے۔ میں ابھی گے کو بھیجتا ہوں۔" وہ واپسی کے لئے مڑا: "ہاں!" اس نے رک کر کہا: "ڈاکٹر تمہیں فی مینڈک پانچ سنٹ ادا کرے گا، ہم کوئی سات آٹھ سو مینڈک حاصل کریں گے، تم جانو کتنا بڑا سودا ہے۔ کچھ ملنے کا خوب چانس ہے، پیسے ملنے پر قیمت ادا کر دوں گا۔"

"نہیں" لی نے صاف انکار کر دیا۔

لی چانگ کا ٹرک فورڈ ماڈل ٹی تھا۔ اس سے پہلے مختلف لوگوں کے پاس اس قدر استعمال ہو چکا تھا کہ اب اسکی قریب قریب عمر ختم ہو چکی تھی۔ لی چانگ کو ایک بل کی ادائیگی کے سلسلے میں ملا تھا۔ اس کو کام میں لانے کے لئے بہت احتیاط اور توجہ کی ضرورت تھی اور چونکہ لی کے یہاں اس قدر توجہ نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے اکثر بیکار پڑا رہتا تھا۔

فلاپ ہاؤس میں کا ہر شخص ٹرک کو ٹھیک کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، کیونکہ ہر شخص عملاً مستری تھا، مگر گے ان سب میں ماہر تھا۔ یہ سب صبح سویرے لی چانگ کے ٹرک کو درست کرنے میں لگ گئے۔ اس میں کافی وقت لگا۔ مشکلات بھی بہت سی پیش آئیں۔ گے انتھک کوشش سے ٹرک چلنے کے قابل ہو گیا۔ دو قانونی زحمتیں بھی پیش آئیں۔ ٹرک کے لائسنس کی تجدید نہیں کرائی گئی تھی، دوسرے لائٹ کام نہیں کر رہی تھی۔ لائٹ کا مسئلہ تو خیر رات میں پیش آتا، مگر لائسنس کا معاملہ ذرا اہم تھا، اس لئے پیچھے مستقل طور پر کپڑا باندھ دیا گیا اور اس کا ایک حصہ نمبر کی پلیٹ پر اس طرح گرا دیا جس سے پلیٹ ڈھک جائے اور دیکھنے والا یہ سمجھے کہ اتفاقی طور پر پلیٹ چھپ گئی ہے اور سامنے کی پلیٹ پر اس طرح کیچڑ لگا دی گئی کہ نمبر پڑھے ہی نہ جا سکیں۔ اس کے بعد ٹرک وہاں سے روانہ ہوا۔ پٹرول اسٹیشن پر پٹرول کے لئے رکا۔ جیک نے ایڈولیم کو پرچہ دیا اور اس سے کہا: "ڈاکٹر کے پاس پیسے کچھ کم تھے، اس لئے اگر آپ پانچ گیلن ٹرک میں ڈال دیں اور پانچ گیلن کی نقد قیمت مجھے دے دیں تو عنایت ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر اپنے کاروبار کے سلسلے میں جنوب گیا ہے۔ جاتے وقت اس نے یہ بات زبانی کہی تھی۔"

ایڈ بڑی خوش اخلاقی سے مسکرایا: "تمہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر بہت محتاط آدمی ہے۔" اس نے کہا: "اگر کسی گڑبڑ کا ذرا بھی اندیشہ ہو تو

کہیلا

"خود میں بھی یہی سوچتا رہا ہوں" ہیک نے کہا "شادی شدہ کا کوئی اعتبار نہیں۔ چاہے وہ اپنی بیوی سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ کرے، مگر جائے گا اسی کے پاس۔ خود گے کی مثال لے لو۔ اس کی بیوی اکثر گوشمالی کرتی ہے مگر آخر میں گے ہی کو معذرت کرنی پڑتی ہے۔"

اس کے بعد دوسرے موضوع چھڑ گئے۔ ڈاکٹر کی پارٹی کا بھی ذکر کیا اور اس کی تفصیلات پر تبادلۂ خیالات ہونے لگا۔ یہ باتیں جاری تھیں کہ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ ایک لمبا چوڑا آدمی بندوق کاندھے پر ڈالے کھڑا تھا۔ "تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو" اس نے رعب دار آواز میں سوال کیا۔

"کچھ بھی نہیں" ہیک نے مختصر سا جواب دیا۔

"یہ فوجی علاقہ ہے۔ یہاں شکار کھیلنے یا کیمپ لگانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ اچھا بوریہ بستر اٹھاؤ اور یہاں سے فوراً چلدو۔"

ہیک بہت ہی خاکساری کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ "ہمیں اس کا بالکل علم نہیں تھا کیپٹن!" ہیک نے عاجزی سے کہا۔ "بہرحال ہمیں بے حد افسوس ہے۔" کچھ توقف کے بعد اس کے بیج کو غور سے دیکھتے ہوئے ہیک نے کچھ کہنے کی جرأت کی۔ "آپ فوجی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ فوجی آدمی کی سج دھج ایک عام آدمی سے بالکل مختلف ہوتی ہے، میں فوج میں ایک عرصے تک رہا ہوں۔"

"میں اپنی زمین پر آگ جلانے کی اجازت نہیں دے سکتا" اس نے ہیک کی خوشامد سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"ہمیں سخت افسوس ہے" ہیک نے دوبارہ معذرت کی "ہم ابھی صاف کئے دیتے ہیں —— ہم کچھ سائنسداں کے لئے کام کرتے ہیں۔ ہم مینڈک پکڑنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ وہ لوگ کینسر پر ریسرچ کر رہے ہیں اور ہم ان کو مینڈک مہیا کر کے ان کی مدد کرتے ہیں۔"

"وہ مینڈک کیا کریں گے؟" اس نے کچھ دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ ان کو کینسر کا انجکشن دیتے ہیں" ہیک نے سمجھانے کی کوشش کی "اور اس کا ردِ عمل دیکھتے ہیں —— لیکن کیپٹن! اگر آپ نہیں چاہتے کہ ہم یہاں ٹھہریں، تو ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔"

یکایک ہیک نے کتیا کی طرف دیکھا، جو فوجی کے ساتھ تھی اور کچھ ایسے انداز سے گویا ابھی اس پر نگاہ پڑی ہو۔ "خدا کی قسم بہت عمدہ ہے" اس نے بڑے جوش کے ساتھ کہا "یہ تو بالکل نولا کی طرح ہو۔ جس نے پچھلے سال ورجینیا میں انعام حاصل کیا تھا۔ کیا یہ اچھا نسل کی ہے کیپٹن؟"

"ہاں" تھوڑے سے تامل کے بعد وہ جھوٹ بولا "ابھی کچھ ہی، اس کے کاندھے پر ایک زخم ہو گیا ہے۔"

"کیپٹن! ذرا مجھے دیکھنے دو" ہیک نے بڑی مستعدی دکھلائی۔

"اوپر کے حصے میں ہے، جہاں وہ چاٹ نہیں سکتی۔"

"میرے پاس بھی ایک کتیا تھی، اسی قسم کا ایک زخم ہو گیا تھا، وہ مر گئی۔"

"میں ٹنچر آیوڈین لگاتا ہوں۔"

"بیکار ہے، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"کیا آپ کے یہاں ایپسن سالٹ ہے؟"

"کیوں نہیں، ایک بوتل ہے۔"

"آپ ایپسن سالٹ کی گرم پلٹس بنا کر اس پر روزانہ رکھئے۔ مجھے اس کی بڑی فکر ہے کیپٹن! اگر آپ اجازت دیں تو میں خود اس کی دیکھ بھال کروں گا۔"

کیپٹن نے کتیا کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "میرے مکان کے پاس ایک تالاب ہے، اس میں بے شمار مینڈک ہیں۔ رات بھر سونے نہیں دیتے۔ کیوں نہ تم وہاں آجاتے۔ تمہیں مینڈک مل جائیں گے اور مجھے ان سے نجات مل جائے گی۔"

"یہ تو بہت اچھا ہے" ہیک نے کہا "سائنسداں آپ کے بہت ممنون ہوں گے۔ مگر مجھے تو فی الحال پلٹس کی ضرورت ہے" اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر اس نے کہا "تم لوگ آگ بجھادو۔ دیکھنا کوئی چنگاری رہ نہ جائے۔ میں کیپٹن کے ساتھ جاتا ہوں اور کتیا کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ تم لوگ بھی جلد آجاؤ۔"

ہیک اور کیپٹن ایک ساتھ چل دیئے۔

ہیزل نے آگ پر ریت ڈالتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے اگر ہیک چاہتا تو امریکہ کا صدر بن جاتا۔"

"مگر بن جاتا تو کیا کر لیتا" جونس نے سوال کیا۔

"کچھ نہ کچھ تو مزہ آتا ہی۔"

[illegible]

[illegible]؟"

"نہیں ایسا نہیں" ڈاکٹر نے کہا "اس میں جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ
قابل ہوتی ہے۔ اور اس کو دوبارہ حاصل کرنا بڑا صبر آزما کام ہے۔"
"کیا ایسا ہوتا ہے، مجھے نہیں پتہ" ہیزل نے جواب دیا "اچھا خالی
میں نے اور دیکھا ہے۔ اس میں حاصل کیا ہی ہے؟"
ڈاکٹر جواب دینے ہی والا تھا کہ اس کو خیال آگیا کہ ہیزل اپنی عادت
کے مطابق بلاوجہ سوالات کر رہی ہو "چلو چلیں" اس نے کہا۔ اس نے
تماشائیوں کی پوری قطار کا اندازہ لگایا اور یہ سمجھ گیا کہ ہیزل کی [illegible]
یہ سب جیسے [illegible] کافی دلچسپ ہیں۔ ہیزل اس کے پیچھے پیچھے خاموشی
سے چلتا رہا، مگر [illegible] کے۔

"وہ پینٹر کل ہی واپس آگیا ہے" اس نے کہا۔
"ہاں تو؟" ڈاکٹر نے سوال کیا۔
"تم جانتے ہو کہ اس نے تمام تصویریں پھر سے بنائی ہیں۔ اب
کہتا ہے کہ انہیں جوڑ کے کھلکے سے دوبارہ بنائے گا۔"
ڈاکٹر نے تمسخر کے ساتھ پوچھا "کیا وہ اب بھی کشتی بنا رہا ہے؟"
"یقیناً" ہیزل نے جواب دیا "اس نے یکسر بدل دیا ہے
بالکل نئے قسم کی کشتی ہے۔ میرے خیال میں ایک ایک حصہ لیا جائے گا
اور جوڑا جائے گا۔ کیوں ڈاکٹر؟ کیا وہ نمائشی آدمی ہے؟"
ڈاکٹر نے اپنی بھاری بوری اتار کر زمین پر رکھ دی "یہ نمائشی؟"
اس نے سوال کیا "ہاں میرا بھی یہی خیال ہے، مگر اسی قدر نمائشی ہے،
جس قدر ہم سب ہیں، بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا مختلف طریقے
سے اس کا اظہار کرتا ہے۔"
ہیزل کے لئے یہ جواب خلاف توقع تھا۔ اسے غصہ آگیا "لیکن
کشتی ....." اس کی آواز ذرا سخت اور بلند تھی "سات سال سے کشتی
بنا رہا ہے، جب وہ ختم کے قریب ہوتی ہے تو بدل دیتا ہے اور از سر نو
شروع کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ صرف نمود و نمائش کے جذبے کے
تحت ایسا کرتا ہے۔ سات سال ایک کشتی پر!!"
ڈاکٹر زمین پر بیٹھا گم بوٹ نکال رہا تھا "تم سمجھے نہیں" اس نے
بڑی نرمی سے کہا "ہنری کشتیاں پسند کرتا ہے مگر سمندر سے ڈرتا ہے"
"پھر وہ کشتی کیا کرے گا؟" ہیزل نے توضیح چاہی۔

"اسے کشتیاں پسند ہیں" ڈاکٹر نے کہا "لیکن فرض کرو اگر
وہ اپنی کشتی مکمل کرلے تو لوگ اس سے کہیں گے کہ اس کو پانی میں کیوں
نہیں ڈالتے۔ اگر وہ پانی میں ڈالتا ہے تو اس کو پانی میں جانا ہی
پڑے گا اور اسے پانی سے نفرت ہے۔ اس لئے وہ کبھی کشتی کو مکمل
نہیں کرتا۔ بلکہ نہ مکمل ہو اور نہ پانی میں ڈالنے کا امکان پیدا ہو۔"
تھوڑی دیر تک ہیزل نے بحث کی۔ مگر جلد ہی اس نے بند
کر دی اور گفتگو کے لئے کوئی دوسرا موضوع تلاش کرنے لگا۔ "میرا
تو خیال یہی ہے کہ وہ نمائشی آدمی ہے" اس نے ڈاکٹر کی دلیل سے
بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
زمین پر سینکڑوں کی تعداد میں بدبودار کیڑے رینگ رہے
تھے اور ان میں سے زیادہ تر اپنی دم اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ "ذرا ان
بدبودار کیڑوں کو دیکھنا" ہیزل کو ان کیڑوں کی وجہ سے موضوع
بدلنے کا موقع مل گیا۔
"بہت دلچسپ ہیں" ڈاکٹر نے کہا۔
"آخر یہ احمق اپنی دمیں اوپر کیوں اٹھائے رہتے ہیں؟"
ڈاکٹر نے اپنے اونی موزے لپیٹ کر گم بوٹ میں رکھ لئے اور
جیب سے دوسرے خشک موزے اور ہرن کی کھال کے ہلکے جوتے نکال کر
پہنے "یہ عام کیڑے ہیں اور ان کی سب سے عام خصوصیت یہ ہے کہ
ہمیشہ اپنی دم اٹھائے رہتے ہیں۔ مجھے کسی کتاب میں اس کی وجہ لکھی
ہوئی نہیں ملی۔"
ہیزل نے اپنے بھیگے ہوئے ٹینس شو کی نوک سے ایک کیڑے کو
الٹ پلٹ کر دیکھا "تمہارا کیا خیال ہے، ایسا وہ کیوں کرتے ہیں؟"
"میرے خیال میں یہ دعا کرتے ہیں" ڈاکٹر نے جواب دیا۔
"کیا؟" ہیزل کو سخت تعجب ہوا۔
"غیر معمولی بات یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی دم اوپر اٹھائے رہتے ہیں"
ڈاکٹر نے کہا "دراصل حیرت ناک غیر معمولی بات یہ ہے کہ ہم اس کو غیر
معمولی بات سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہماری حیثیت ایک کیڑے سے زیادہ نہیں۔
ہم سے اگر کوئی ناقابل توجیہ اور عجیب و غریب بات کی ہے تو وہ ہمارا
طریقۂ دعا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ وہ دعا کر رہے ہوں۔"
"چلو یہاں سے نکل چلیں" ہیزل نے کہا۔

میک اور اس کے ساتھی فلاپ ہاؤس محل میں منتقل ہوئے، تو ابھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ابتدا میں وہ اس سے زیادہ چاہتے بھی نہیں تھے کہ بارش اور ہوا سے ان کو نجات مل جائے۔ محل میں صرف ایک بڑا سا کمرہ تھا، جس کی دیواریں نقش و نگار سے خالی تھیں اور صرف دو کھڑکیاں تھیں، جن سے مدھم سی روشنی آتی تھی، اس کے علاوہ کمرہ میں کیچل کے چارے کی سخت تکلیف دہ بو پھیلی ہوئی تھی۔ میک اور اس کے ساتھیوں کو ان خرابیوں کا احساس تھا، مگر اس کی اصلاح کے لئے تنظیم کی ضرورت تھی، اور وقت درکار تھا۔ میک نے فی الحال یہ کیا کہ زمین پر چاک سے مستطیل لکیریں کھینچ دیں۔ ہر خانہ سات فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا تھا۔ اس نے ہر خانے میں ایک ایک نام لکھ دیا اور تمام ساتھیوں سے کہہ دیا کہ جس میں جس کا نام ہے، وہ اس کی ملکیت ہے۔ اگر کوئی ساتھی دوسرے کی ملکیت پر قبضہ کرے گا، تو باقاعدہ کارروائی کی جائے گی۔ کمرہ کی بقیہ جگہ مشترک ملکیت ہے۔

اس حالت پر یہ لوگ قانع اور مطمئن تھے۔ دن میں زمین پر بیٹھے تاش کھیلتے، گپیں کرتے اور رات میں ہارڈ بورڈ پر سو رہتے۔ شاید اس زندگی میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی، مگر ایک مرتبہ خلاف معمول بڑی شدید بارش ہوئی اور ایک ماہ سے زیادہ جاری رہی۔ اس کی وجہ سے موجودہ صورت حالات میں تبدیلی ناگزیر ہو گئی۔ اتنے طویل عرصے تک مسلسل زمین پر پڑے رہنے سے یہ لوگ اکتا گئے۔ بے رنگ دیواریں آنکھوں میں کھٹکنے لگیں اور اس مصیبت نے مکان کی حیثیت اور قیمت کو ان کی نگاہوں میں کئی گنا بڑھا دیا۔ لی چانگ نے کبھی مکان کا کرایہ طلب نہیں کیا تھا، اس لئے مالک مکان کے قبضہ کا بھی ان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لئے ان لوگوں کو مکان کی درستگی اور ساز و سامان کی فکر ہوئی۔ ایک روز سہ پہر ہیوگی ایک پرانی چارپائی کہیں سے لایا، جس کے نواڑ جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان کو سی سلا کر سونے کے قابل بنایا۔ رات بھر وہ بڑے آرام سے گہری نیند سویا۔ اس کے دوسرے ساتھی رشک سے اس کو دیکھتے رہے اور رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ دوسرے روز میک کسی لوہے کے بیکار ڈھیر سے زنگ آلود اسپرنگ اٹھا لایا۔ اسطرح فلاپ ہاؤس کے فرنیچر میں ایک اور چیز کا اضافہ ہوا۔ ایک پرانا قالین فرش پر بچھا ہوا تھا، ٹوٹی پھوٹی کچھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ میزیں اور بغیر ڈھکن کی ایک دیواری گھڑی بھی تھی۔ ان کو درست کرایا گیا۔ سفیدی کرائی گئی، جس سے کمرہ نسبتاً روشن ہو گیا۔ دیواروں پر آہستہ آہستہ تصویروں کا اضافہ ہونے لگا، لیکن زیادہ تر کیلنڈروں کی تصویریں تھیں، یہ سستے قسم کی غیر حقیقی تصویریں ہوتی تھیں، جن کے ہاتھ میں کوکاکولا کی بوتلیں ہوتیں۔ ہینری نے ڈک پینٹ کی ہوئی چند تصویروں سے کمرہ کی زینت میں مزید اضافہ کیا۔

آخر میں ایک بہترین اسٹو کا اضافہ ہوا۔ انہیں بہت دنوں سے اسٹو کی مدت سے تلاش تھی اور جب ان کی منشا کے مطابق ملا تھا تو مول بھاؤ میں کافی دن لگ گئے۔ مالک اٹھارہ ڈالر سے کم میں بیچنے کے لئے تیار نہیں تھا اور یہ لوگ اس سینٹ سے زیادہ دینے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ بالآخر بڑی جد و جہد کے بعد یہ سودا طے پایا۔ اسٹو کا وزن کوئی تین سو پونڈ تھا، اس لئے اس کو گھسیٹ کر محل لانے میں پورے تین دن صرف ہوئے، حالانکہ صرف پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ اسٹو بہت شاندار اور خوبصورت تھا۔ فلاپ محل میں اس کے لگ جانے سے چار چاند لگ گئے اور میک اور اس کے ساتھی اب اس محل کو اپنا وطن سمجھنے لگے۔ ایڈی نے دروازے پر چڑھانے کے لئے بیل کا درخت لاکر لگایا۔ ہیزل نے ایک مخصوص قسم کا پھولوں کا درخت کسی طرح حاصل کیا۔ کبھی کبھی صفائی بھی کی جانے لگی۔ یہی لوگ جو کچھ ہی عرصے پہلے بے گھر تھے اب بے گھروں کی ہنسی اڑانے لگے اور فخر و تکبر کے جذبے کو تسکین دینے کے لئے وقتاً فوقتاً مہمان بلانے لگے اور انکو دو چار روز ٹھہرانے میں بڑی مسرت محسوس کرتے۔

ایڈی جو لا ایڈا کے شراب خانے میں قائم مقام بار ٹینڈر تھا، مستقل آب دار جب کبھی بیمار پڑتا یا کسی اور کام سے رخصت پر ہوتا، تو ہمیشہ ایڈی ہی اس کی جگہ پر کام کرتا۔ یہ جب بھی قائم مقامی کرتا تو چند بوتلیں ضرور غائب ہو جاتیں، مگر اس کے باوجود مالک محض اس لئے اس کو پسند کرتا کہ اسے یقین تھا کہ ایڈی مستقل طور پر اس کی ملازمت کو حاصل کرنے کے لئے کبھی کوشش نہیں کرے گا۔ ایڈی شراب ضرور چراتا مگر اتنی ہی کہ ہضم ہو سکے۔ وہ ایک گیلن کا جگ شراب خانے کے کسی کونے میں رکھ دیتا اور گلاسوں میں پینے سے جو شراب بچ رہتی، اس کو اپنے جگ میں ڈال لیتا اور جب کبھی کچھ شرابی کسی بحث میں الجھ پڑتے یا بدمست ہو کر بہک جاتے تو ایسے مواقع پر وہ فائدہ اٹھانے سے کبھی نہ چوکتا۔ کبھی نصف کبھی دو تہائی گلاس، جیسا موقع ہوتا، اپنے جگ میں انڈیل لیتا۔ اس طرح مختلف قسم کی شرابوں کا جو مکسچر تیار ہوتا وہ بڑا پر سرور اور مزیدار ہوتا۔ اس کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ جب کبھی اچھے قسم کی شراب کا

دھاگے بیمار پڑ جائے یا کسی اور وجہ سے چھٹی لے تو تم کسی نہ کسی طرح اس کی جگہ ہفتہ دو ہفتہ کے لئے ضرور پہنچ جاتا۔ اگر ڈاکٹر کو پارٹی دی گئی تو وہسکی ضرور خریدنی پڑے گی ——— ایک گیلن وسکی کتنے میں ملتی ہے ؟ "

" مجھے معلوم نہیں ۔" ہیوی نے جواب دیا " میں نے ایک وقت میں گلاس آدھے گلاس سے زیادہ کبھی نہیں خریدی ۔"

" اگر ڈاکٹر کو پارٹی دی گئی تو پیسوں کی ضرورت پڑے گی " میک نے سب سے اہم معاملہ کی طرف توجہ دلائی ——— " پارٹی بہت عمدہ ہونی چاہئے ——— بہت شاندار.... کسی کو اس کا یوم پیدائش معلوم ہے ؟ "

" پارٹی کے لئے یوم پیدائش کی ضرورت نہیں ۔" جونس نے اپنی رائے ظاہر کی ۔

" ضرورت تو نہیں ہے ، اگر بہتر ہے ۔" میک نے جواب دیا " میرے خیال میں ڈاکٹر کی پارٹی کے لئے بہت کافی روپے کی ضرورت پڑے گی ۔"

ہر ایک ، ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا ۔ ہیوی نے مشورہ دیا " ہیڈی ونڈ دکنری میں کام بندی مکمل ہو گئی ہے ۔"

" نہیں " میک نے فوراً مخالفت کی " لوگوں کی نظر میں ہماری بڑی عزت ہے ۔ اس کو کسی قیمت پر بھی متاثر نہیں کیا جا سکتا ۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے سمانے کے لئے کام سے لگا ہوا ہے ۔ ہم میں سے کسی کو جب بھی کام کی ضرورت ہوتی ہے ، تو فوراً ہی مل جاتا ہے ۔ ہم میں سے کوئی شخص کبھی بیکار نہیں رہا ۔ پھر ہم اپنا وقار خطرے میں کیوں ڈالیں ؟ "

اس خیال کی سب نے بالاتفاق تائید کی " اگر پارٹی کرنی ہے تو کرسمس کے قریب و جوار میں روپے جمع ہو جانے چاہئیں ۔" جونس نے تجویز پیش کی " اس مرتبہ مرغ پکنا چاہئے ۔"

" خدا کی قسم ضرور پکے گا ۔" میک نے یقین دلایا " کارمیل کی وادی میں میں ایک ایسی جگہ سے واقف ہوں ، جہاں مرغ کے جھنڈ کے جھنڈ گرتے ہیں ۔"

" اس وادی سے میں بھی واقف ہوں ۔" ہیوی نے کہا " اس سے میں ڈاکٹر کے لئے کیکڑے ، جھینگے کی مچھلی اور مینڈک پکڑ کر لایا کرتا تھا ۔ وہ مینڈک پانچ سینٹ مجھے ملتے تھے ۔"

" میں بھی جانتا ہوں ۔" گے نے کہا " ایک موقع پر مجھے پانچ سو

مینڈک ۔ کتنے ؟ "

" ڈاکٹر کو اگر مینڈک کی ضرورت ہو تو پھر [illegible] " میک نے کہا " ایک ہفتہ دو کام ۔ دیکھا [illegible] تفریح بھی کر لیں گے ۔ مگر سوچو ، ڈاکٹر کو اس کی ضرورت [illegible] اس کے لئے کو کہاں فروخت کریں گے ——— بس اس کے بعد ایک [illegible] دے دیں گے ۔"

اس فیصلے پر فلاپ ہاؤس محل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی " ۔ " میک نے کہا " ذرا دیکھنا ڈاکٹر کی کار تو نہیں آ رہی ہے " گے نے جھانک کر دیکھا ——— " ابھی تک نہیں " اس نے اطلاع دی ۔

" بس آتی ہی ہو گا " میک نے کہا " مگر ہماری اسکیم مکمل ہو گئی ہے ۔"

ڈاکٹر کی کار جب سائنس کی تجربہ گاہ پر آکر رکی تو میک اور اس کے ساتھی چھپ کر دیکھنے لگے کہ وہ کیا لایا ہے ۔ ڈاکٹر اور ہیزل کاسے اٹھے اور مچھلی کی بوریاں اتار کر تجربہ گاہ میں لے گئے ۔ اس سے فارغ ہو کر ہیزل فلاپ ہاؤس محل واپس آ گیا ۔ اس کے جوتے اور کپڑے پانی میں تر ہو رہے تھے ۔ میک نے پوچھا " ڈاکٹر کا کیا حال ہے ؟ " " بہت اچھا " ہیزل نے جواب دیا " ڈاکٹر کا موڈ کیسا ہے ؟ " میک نے پھر سوال کیا ۔ " یقیناً " ہیزل نے جواب دیا " ہمیں کوئی دو تین سو مچھلیاں ملی ہیں اس وقت اس کا موڈ بہت اچھا ہے ۔"

" کیا یہ بہتر رہے گا کہ ہم سب اکٹھا اس کے پاس چلیں ؟ " میک نے سوال کیا ۔ پھر خود ہی جواب دیا " نہیں ، بہتر ہے میں اکیلا ہی جاؤں گا ۔ ہم سب کے ایک ساتھ جانے میں ممکن ہے وہ گھبرا جائے ۔"

" آخر معاملہ کیا ہے ؟ " ہیزل نے سوال کیا " ہم نے ایک اسکیم تیار کی ہے " میک نے کہا " میں ڈاکٹر کے یہاں جا رہا ہوں ۔ تم یہیں ٹھہرو اور میرا انتظار کرو ، میں ابھی آتا ہوں ۔"

میک تجربہ گاہ میں داخل ہوا تو ڈاکٹر بوریوں سے مچھلیاں نکالنے میں مشغول تھا ۔ میک کو دیکھ کر ذرا گھبرایا ۔ اس لئے کہ میک کے ساتھ کچھ مسائل بھی آ جاتے ہیں " کہو کیا حال ہے ؟ " میک نے بڑے خلوص سے حال دریافت کیا ۔ " ٹھیک ہوں " ڈاکٹر نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی " تم نے یہ دلچسپ خبر بھی سنی کہ کچھ لوگوں نے ہیرلنگ میں ایک بدمست شرابی کی ٹھکائی کر دی ۔ اس کا گھونسا بیرا تھا چہرا

ملنے میں اس کی وجہ سے تلخی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی، مگر آپس کے بیکنگ کیس میں مینڈک بھی بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

یہ اضطراب اور تلخی مبیک اور اس کے ساتھیوں میں زیادہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ نہ تو وہ کاروبار کرتے، نہ اپنی مسرت کو دھکتی ہوئی قیمتوں سے ناپتے تھے۔ نہ بینک بیلنس کی فکر تھی اور نہ خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے۔ اگر وہ کچھ برہم تھے تو اس پر کہ آپ کی وجہ سے وہ کفایت پر مجبور ہو گئے تھے، مگر پھر بھی دو ڈالر کے گوشت اور انڈے ان کے پیٹ میں پڑے رہتے تھے، وسکی اس کے علاوہ تھی۔ اسی طرح تلفتے کے بعد بھی باہر کے دکھ پینے کو مل رہی تھی۔ علاوہ ازیں وہ اپنی کرسیوں پر بیٹھے، اپنے مکان میں رہتے اور بے فکری کے ساتھ ڈارلنگ کو دودھ پیتے دیکھتے، جو ڈبے کا دودھ پینا ابھی سیکھ رہی تھی۔ ڈارلنگ بہت ہی خوش قسمت کتیا تھی۔ مبیک اور اس کے ساتھی اس کو بہترین ٹریننگ دینا چاہتے تھے، مگر چونکہ پانچوں ساتھیوں کے ٹریننگ کے اصولوں میں بنیادی اختلاف تھا، اس لئے ڈارلنگ کو کسی قسم کی ٹریننگ دی ہی نہ جا سکی۔ کبھی کبھی پانچوں ساتھیوں کا اس بات پر اتفاق ہو جاتا کہ موجودہ صورت حال نامناسب ہے اور ڈارلنگ کو ٹریننگ ضرور دی جانی چاہیے، مگر ہر مرتبہ ٹریننگ کے طریقے پر بحث اتنی طویل ہو جاتی کہ ان کی توجہ اصل مسئلے سے ہٹ کر دوسری طرف مرکوز ہو جاتی۔

سہ پہر کو یہ لوگ بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ کھانا ہضم کر رہے تھے۔ سوچ بچار کر رہے تھے اور کبھی کبھار جگ میں سے شراب لے کر پی لیا کرتے اور ہر مرتبہ ایک دوسرے کو یاد دلاتے رہتے کہ یہ ڈاکٹر کے لئے ہے۔ ہمیں خرچ میں پوری احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ یہ بات یہ لوگ ایک منٹ کے لئے بھی نہ بھولتے۔

"تمہارا اندازہ کیا ہے؟ ڈاکٹر کس وقت آئے گا؟" ایڈی نے سوال کیا۔

"عام طور پر آٹھ نو بجے واپس آتا ہے" مبیک نے جواب دیا۔
"اس کو پارٹی کب دی جائے؟ میرے خیال میں آج ہی رات میں دینا مناسب رہے گا"
"یقیناً" سب نے اتفاق کیا۔
"ممکن ہے وہ تھکا ہوا ہو" ہیزل نے مشورہ دیا "بہت لمبا سفر ہے"

"کیا کہہ رہے ہو" جونس نے اپنا تجربہ بتلایا "جتنی تھکن ہو صرف پارٹی دینے سے۔ میں ایک مرتبہ بہت سخت تھک گیا تھا۔ پیر اٹھائے کو بھی سکت نہیں تھی۔ اس کے بعد ایک پارٹی میں شریک ہوا تو تمام تکلن دور ہو گئی اور طبیعت تر و تازہ ہو گئی"

"آؤ ہم پوری سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کریں" مبیک نے تبصرہ کیا "پارٹی دی کہاں جا سکتی ہے یہاں؟"

"ڈاکٹر کو اپنے ریکارڈ بہت پسند ہیں۔ پارٹی کے موقع پر اپنا فونوگرام ضرور بجاتا ہے۔ اس لئے اگر ہم خود اس کے یہاں دیں تو وہ بہت خوش ہوگا"

"تم ٹھیک کہتے ہو" مبیک نے تائید کی "مگر میرے خیال میں اس سے پہلے سے پارٹی کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس کو یکایک معلوم ہوگا تو بڑا لطف آئے گا۔ اس کو شراب چکھنے کے بہانے لائیں"

"سجاوٹ کس قسم کی ہو؟" ہیوئی نے تجویز پیش کی "چوتھی جولائی کی طرح یا ہیلوین کی طرح؟"

مبیک کی آنکھیں خلا میں دیکھ رہی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔
"ہیوئی" اس نے کہا "تم نے بڑے پتے کی بات کہی۔ میں تو کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ خدا کی قسم تم نے بڑی اونچی بات سوچی" اس کی آواز مدھم ہو گئی اور اس کی نگاہیں مستقبل کا جائزہ لینے لگیں "جیسے میں واقعی دیکھ رہا ہوں" اس نے کہا "ڈاکٹر واپس آتا ہے۔ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔ اس کا مکان روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ تجربہ گاہ میں کوئی گھس گیا ہے۔ زینے کے اوپر چڑھتا ہے اور اوپر کے حصے کی سجاوٹ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ وہاں کھانے پینے کی مختلف چیزیں دیکھ کر وہ سمجھ جاتا ہے کہ کسی پارٹی کا انتظام ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے چھپ جاتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ آخر یہ سب کس نے کیا ہے۔ اس وقت ہم یکایک اس کے سامنے آ جاتے ہیں —— کیا اس کا چہرہ دیکھ رہے ہو؟ —— خدا کی قسم، ہیوئی! میں حیران ہوں کہ تمہارے ذہن میں یہ خیال آیا کیونکر؟"

اس غیر معمولی تعریف سے ہیوئی شرما گیا۔ اس نے دراصل کوئی نئی بات نہیں سوچی تھی۔ اس کے ذہن میں سال نو کی پارٹی تھی جو لا آئیڈا میں دی گئی تھی۔ اس لئے اس نے صفائی کے ساتھ کہا "بس یونہی ذہن میں یہ بات آ گئی تھی کہ اس طرح اچھی رہے گی"

"بہرحال بہت اچھا خیال ہے" جیک نے کہا: "ڈاکٹر جب
پارٹی کی تفصیلات بتائی جائیں گی تو اسوقت سب کو بتلاؤں گا کہ یہ
خیال سب سے پہلے کس کے ذہن میں آیا تھا۔"
اس کامیاب پلان کے بعد لطف اٹھانے کے لئے شراب کا
دور چلا۔

ڈی چانگ کا اسٹور اس علاقے کا بہترین اسٹور تھا۔ اس میں
ضرورت کی سبھی چیزیں مل جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ بھی جن کا موسم
نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی شاندار پارٹی کرنی ہو تو ڈی چانگ کی دوکان
ہی سے سامان مل سکتا ہے۔ اس لئے شام ہی سے اس کے یہاں سے
سامان آنا شروع ہو گیا۔ جلد ہی ایک بوری کے سینڈوچ ختم ہو گئے اور
ڈی چانگ کے پیکنگ کیس میں جگہ باقی نہ رہی۔ جو نہی جیک ایک کنٹین وہسکی
ختم ہو چکی تھی اور آس کی دوکان سے خریدی جانے لگی تھی۔

"ڈاکٹر کو وہسکی بہت پسند ہے" جیک نے کہا: "میرا خیال ہے کہ
وہ اس کو وہسکی سے بھی زیادہ پسند کرتا ہے۔"

ڈاکٹر کبھی تجربہ گاہ میں تالا نہیں لگاتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ
اگر کوئی شخص واقعی اندر داخل ہونا چاہے تو قفل اس کو نہیں روک سکتا۔
اس کا یہ بھی ایمان تھا کہ لوگ بنیادی طور پر ایماندار ہیں اور ان کی
بھاری اکثریت چوری پسند نہیں کرتی تھی۔ وہاں صرف کیمیکل کتابیں،
ریکارڈ، سرجری کے اوزار، عینک کے شیشے اور ایسی چیزیں تھیں جن پر
ایک مشاق چور کبھی نگاہ ڈالنا بھی پسند نہ کرے گا۔ اس لئے چوروں، ٹھگوں
اور ڈاکوؤں کے لئے تو یہ نظریہ ٹھیک تھا مگر دوستوں کے لئے یہ قطعی
بے اثر تھا۔ اکثر کتابیں مستعار لی جاتیں اور کبھی واپس نہ کی جاتیں۔ اس
کی غیر حاضری میں لوبیا کا ٹین ہمیشہ غائب ہو جاتا اور اکثر اوقات جب
وہ رات گئے واپس آتا تو اسے اپنے بستر پر کوئی مہمان سوتا ہوا ملتا۔

جیک کے ساتھی آرائش کا سامان سامنے کے کمرہ میں جمع کر رہے
تھے۔ یکایک جیک نے انہیں روک دیا۔ "ڈاکٹر کو سب سے زیادہ کیا
چیز خوش کرے گی۔" اس نے سوال کیا۔
"پارٹی" ہیزل نے جواب دیا۔
"نہیں" جیک نے کہا۔
"آرائش" ہیوئی نے مشورہ دیا۔
"نہیں" جیک نے کہا "میرا خیال ہے سب سے زیادہ مسرت اسکو

نہیں سے ہوگی۔ ممکن ہے اس وقت تک ڈی چانگ اپنی دوکان بند
کر لے۔ ایسی صورت میں وہ کل سے قبل اپنے مینڈکوں کو نہ دیکھ سکے گا۔
لہذا ان کو کسی کمرہ میں حفاظت سے نمایاں جگہ پر رکھو اور ایک کارڈ پر لکھ کر
لگا دو: "ڈاکٹر کا خیر مقدم"

سامان کے لئے ڈی چانگ کے پاس جو وفد گیا تھا، اس کو سخت مخالفت
کا سامنا کرنا پڑا۔ تمام کوششیں اس کے خدشات کو دور کرنے سے قاصر
رہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ تم خود بھی پارٹی میں شریک ہو رہے ہو اگر کوئی شخص
تمہارے سامان کو خرد برد کرنے کی کوشش کرے گا تو تم کو معلوم ہو جائے
گا۔ انہوں نے تحریری ضمانت دی کہ اگر کوئی نقصان ہوگا تو اس کے معاوضے میں
مینڈک ادا کئے جائیں گے۔ بالآخر بڑی مشکلوں سے ڈی چانگ راضی ہو سکے۔

اس کے بعد بڑی تیزی سے تجربہ گاہ کو سجانے کا کام شروع ہوا۔ اسوقت تک
وہسکی ختم ہو چکی تھی اور لوگوں میں پارٹی کا موڈ پیدا ہو گیا تھا۔ بہت سے
راہگیر بھی پارٹی میں شریک ہو گئے۔ سب سے زیادہ رش شراب پر تھا۔
ڈی چانگ صرف تھوڑی دیر کے لئے پارٹی میں شریک ہو سکا۔ وہ
معدے کا پرانا مریض تھا اس لئے جلد ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور
وہ گھر واپس آ گیا۔ تیار شدہ گوشت اور مچھلی کے قتلے تلے گئے اور خوب
لطف لے کر کھائے گئے۔ گراموفون ریکارڈ اور شریک ہونے والوں کا
شور دور دور تک سنائی دیتا تھا۔ اس سے بیر فلیگ کے مالک اس
غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ویسٹرن بائیولاجیکل (تجربہ گاہ) میں
بیر فلیگ کے مقابلے میں دوسرا ریسٹورانٹ کھول دیا گیا ہے۔ اس کی بنا پر
ان میں غصے اور دشمنی کا جذبہ پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ مگر اسوقت
یہ غلط فہمی دور ہو گئی جب طویل خوشی اور مسرت کے بعد جیک کے
سامنے سخت لڑائی ہو گئی، جس میں دو کھڑکیاں بالکل ٹوٹ گئیں اور
شیشے کے مرتبان چکنا چور ہو گئے۔ ہیزل باورچی خانے سے ہو کر غسلخانے
جا رہا تھا۔ اسی ہڑبونگ میں اس سے فرائی پان کو ٹھوکر لگ گئی اور گرم
گرم گھی اس کے اوپر آ گرا اور وہ بری طرح جل گیا۔

ڈیڑھ بجے ایک شخص شراب میں مخمور اندر داخل ہوا اور ڈاکٹر پر
ایک جملہ چست کر دیا۔ اس کے دوستوں کو یہ توہین برداشت نہیں ہوئی۔
جیک نے ایک اوزار اٹھا کر دے مارا۔ وہ مینڈکوں کے پیکنگ کیس
کو گراتا ہوا باہر نکل بھاگا۔ ایک صاحب اسوقت ریکارڈ بدل رہے تھے،
وہ ایسا بوکھلائے کہ ان کے ساتھ گراموفون کا ساؤنڈ بکس نیچے گر گیا

اور بلوری شیشہ پاش پاش ہوگیا۔ ہنگامہ فرو ہوا تو لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے اور اپنے پیچھے ایک لاش چھوڑ گئے۔

صبح کی روشنی تجربہ گاہ میں داخل ہوئی۔ اس کا پھاٹک ٹوٹا ہوا تھا، اس کے فرش پر ٹوٹے ہوئے شیشوں کا ڈھیر تھا۔ فونوگراف کے کچھ ریکارڈ ٹوٹے ہوئے اور کچھ کور کے باہر بکھرے ہوئے تھے، گوشت کے قتلوں کے بچے کھچے حصے پلیٹوں میں پڑے ہوئے تھے اور جما ہوا گھی زمین پر گرا ہوا تھا، کسی نے کتابوں کی الماری پر چڑھنے کی کوشش کی تھی، جس کی وجہ سے بہت سی کتابیں باہر نکل آئی تھیں اور وہ فرش پر خراب و خستہ حالت میں پڑی ہوئی تھیں۔

بینگ کیس کے ٹوٹے ہوئے حصے سے ایک مینڈک باہر نکل کر ٹرانے لگا۔ پھر دوسرا اس کے ساتھ شریک ہوگیا۔ فرحت بخش اور ٹھنڈی ہوا جو دروازے اور ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے آرہی تھی، محسوس کی۔ پھر ان میں سے ایک "ڈاکٹر کا خیر مقدم" پر اچک کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دونوں ڈرتے ڈرتے دروازے کے باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مینڈکوں کا ایک سیلاب آگیا، جو کیبنز کا روکی سڑکوں پر ہر طرف پھیل گیا۔ ایک ٹیکسی کار رات کے آخری حصے میں بیر فلیگ کے ایک گاہک کو لے کر آئی۔ اس سے کئی مینڈک کچل کر شہید ہوگئے۔ لیکن دن نکلنے سے قبل سب کے سب جا چکے تھے۔ کچھ گندے نالوں میں چلے گئے۔ کچھ نے پہاڑی پر چڑھ کر ریذرو اٹر میں پناہ لی، کچھ زمین دوز نالیوں میں جا گھسے اور کچھ کھلے میدان کے گھاس پھونس میں چھپ رہے۔

غرض صبح کی روشنی ایک ایسی تجربہ گاہ میں پھیلی، جو اُجڑ چکا تھا، تباہ ہو چکا تھا۔

تجربہ گاہ کے عقبی کمرے میں سفید چوہے اپنے پنجروں میں دوڑ رہے تھے اور چوں چوں کر رہے تھے — ایک الگ پنجرے کے کونے میں ایک چوہیا اپنے اندھے بچوں کے جھنڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے اندھے اور ننگے بچے اس کا دودھ چوس رہے تھے اور چوہیا خوف سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

سانپوں کے پنجرے میں سانپ اپنے پیچ وخم پر اپنی ٹھوڑیاں رکھے اپنی گرد آلود اور سیاہ آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے تھے۔

اسی وقت ایک موٹر کار کیبنز کا روڈ میں داخل ہوا اور ڈاکٹر اپنی تجربہ گاہ کے آگے آکر رکا۔ تھکن نے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ موٹر کار رکنے پر بھی وہ اپنی نشست پر کچھ دیر تک بیٹھا رہا تاکہ راستے میں سڑک پر اس نے جو جھٹکے کھائے تھے ان کا اثر زائل ہو جائے۔ اس کے بعد بمشکل کر وہ اپنی کار میں سے باہر نکلا۔ اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو سانپ اپنی زبانیں باہر نکال کر آہٹ سننے لگے۔ چوہوں نے پنجروں میں دوڑ لگانی شروع کر دی۔ ڈاکٹر سیڑھیاں چڑھ گیا تو اس نے جھولتے ہوئے دروازہ پر اور ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں کی طرف حیرانگی سے دیکھا۔ اس کی تھکن جیسے کافور ہو گئی۔ وہ تیزی سے تجربہ گاہ میں داخل ہوا۔ اس کے بعد اس نے ہر کمرے کا ایک چکر لگایا۔ اس نے جھک کر گراموفون کا ایک شکستہ ریکارڈ اٹھایا اور تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔

باورچی خانہ میں لڑھکا ہوا گھی فرش پر جم کے سفید ہو گیا تھا۔ برہمی کے عالم میں ڈاکٹر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ وہ اپنے صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ دفعتاً وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے عظیم گراموفون کو چابی دی اور اس پر ایک ریکارڈ رکھ دیا۔ لاؤڈ اسپیکر سے صرف ایک بھنچی ہوئی آواز پیدا ہوئی اس نے اپنا بازو اٹھا کر گراموفون کے چپّے کو بند کر دیا اور دوبارہ صوفہ پر آ بیٹھا۔

سیڑھیوں پر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی آواز پیدا ہوئی اور دوسرے لمحہ دروازے میں سے میک نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ کمرے کے وسط میں گھبرایا ہوا کھڑا تھا "ڈاکٹر" وہ بولا "میں نے اور لڑکوں نے . . . . "

ایک لمحہ کے لئے ڈاکٹر اسے دیکھ نہ پایا۔ پھر وہ لپک کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ میک ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "کیا یہ سب کچھ تم نے کیا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میں کیا کہوں۔ میں نے اور لڑکوں نے . . . "

ڈاکٹر نے اپنی مٹھی باندھ کر میک کے منہ پر زور سے مکّہ مارا۔ اس وقت ڈاکٹر کی آنکھیں ایک درندہ کی طرح شعلہ گوں ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر کے مکّہ کی ضرب کڑی اور مضبوط تھی۔ میک کے ہونٹ پھٹ گئے اور اس کا سامنے کا ایک دانت پیچھے کی طرف مڑ گیا "اٹھو" ڈاکٹر

نے سخت گیر لہجہ میں کہا۔

میک لڑکھڑاتا ہوا اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اسکے بازو اسکے پہلوؤں کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے اس کے ایک اور مکا مارا۔ میک کے ہونٹوں سے خون جاری ہو گیا۔ خون اس کی ٹھوڑی تک بہہ آیا اور میک نے اپنے ہونٹوں سے خون چوسنے کی کوشش کی۔

"دیکھ کیا رہا ہے کتیا کے بچے — لڑتا کیوں نہیں۔" ڈاکٹر نے اس کے ایک اور ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر نے دانت توڑنے کی کھا دسی۔

میک کے سر نے صرف ایک جھٹکا سا کھایا، مگر وہ اپنی جگہ پر جما رہا۔ اس کے دونوں بازو اس کے پہلوؤں کے ساتھ لٹکے رہے اور "مارو ڈاکٹر" وہ بولا "یہ سب میرا قصور ہے۔"

آخر ڈاکٹر نے ہار مان لی اور بولا "کتیا کے غلیظ بچے" اس کے بعد ڈاکٹر اپنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

میک ایک کرسی پر بیٹھ کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ میک کی آنکھوں سے کرب و اضطراب پیدا تھا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی پر بہتا ہوا خون بھی نہیں پونچھا تھا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

آخر کار ڈاکٹر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا "جاؤ اور جاکر اپنا منہ دھوؤ" ڈاکٹر سیڑھیوں سے اتر کر لی چانگ کی دوکان کی طرف چل پڑا۔ اس نے لی چانگ سے بیر کی دو بوتلیں طلب کیں۔ برف کے بکس میں بیر کی بوتلیں نکالتے ہوئے لی چانگ نے ڈاکٹر کی آنکھوں سے آنکھیں نہ ملائیں۔ ڈاکٹر نے رقم لیتے ہوئے اس سے کوئی بات نہ کی۔ ڈاکٹر بیر کی بوتلیں لے کر سڑک پر آ گیا۔

میک غسلخانہ میں اپنا خون آلود منہ دھو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے بیر کی ایک بوتل آہستہ سے کھولی اور ایک گلاس میں انڈیل دی۔ اس نے بیر سے ایک اور گلاس بھرا۔ ڈاکٹر وہ دونوں گلاس اٹھا کر اگلے کمرہ میں آ گیا۔ میک غسلخانے سے اپنا منہ پونچھتا ہوا نکلا۔ ڈاکٹر نے اپنے سر کی جنبش سے بیر کے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ میک نے منہ کھولا اور بیر کا آدھا گلاس حلق میں انڈیل لیا۔ اس نے سرد آہ بھری اور پھر وہ بیر کی طرف گھورنے لگا۔ ڈاکٹر اپنا گلاس ختم کر چکا تھا۔ ڈاکٹر دوسری بوتل بھی لے آیا۔ اور اس نے ایک دفعہ پھر دونوں گلاس بھر دیئے۔ ڈاکٹر صوفے پر بیٹھ گیا اور اس نے پوچھا "یہ کیا ہوا تھا؟"

میک نے فرش کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ کر بیر میں شامل ہو رہا تھا۔ اس نے دوبارہ اپنے ہونٹوں کا خون پونچھا اور بولا "میں اور میرے ساتھی آپ کو ایک دعوت دینا چاہتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ کل رات گھر آ جائیں گے۔"

"اچھا تو یہ بات تھی۔"

"ڈاکٹر یہ ساری عمر کا افسوس تھا۔ یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ میرے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔" میک نے بیر کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "میری ایک بیوی تھی۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں جو کچھ بھی کرتا اس کا الٹا نتیجہ نکلتا۔ وہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ اگر کوئی اچھی بات بھی کرتا تو اس میں کیڑے پڑ جاتے۔ اگر میں اسے کوئی تحفہ دیتا تو کوئی نہ کوئی غلط بات ہو جاتی — وہ بیزار ہو گئی۔ جب میں نے ایک مسخرے کی حیثیت سے اداکاری شروع کی تو اس وقت بھی یہی کچھ ہوا — تب سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ میں نے اسے بھی ترک کر دیا۔ اب میں لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا جیسے وہ ہمہ تن گوش ہو کر میک کی باتیں سن رہا ہوں۔ "میں جانتا ہوں" ڈاکٹر بولا۔

"آہ جب تم نے مجھے پیٹا تو میں خوش تھا" میک نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا شاید اس طرح مجھے سبق مل جائے۔ شاید میں اس بات کو ساری عمر یاد رکھوں لیکن مجھ کمبخت کو کچھ بھی تو یاد نہیں رہے گا۔ میں کبھی کوئی سبق حاصل نہیں کر سکوں گا۔ کل کی بات ہی لو — ہم خوش تھے کہ تمہیں پارٹی دے رہے ہیں اور پارٹی بھی کیا پارٹی تھی —" میک نے فرش پر بکھری ہوئی شکستہ چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "لیکن انجام نہایت برا ہوا۔"

ڈاکٹر نے مزید بیر گلاسوں میں انڈیل دی۔

"ڈاکٹر! میں اور میرے ساتھی سب کچھ صاف کر دیں گے اور جو چیزیں ٹوٹ گئی ہیں ہم ان کے دام بھی ادا کر دیں گے۔ ہمیں چاہے پانچ برس تک کام کیوں نہ کرنا پڑے۔ ہم ان چیزوں کے دام ادا کر کے رہیں گے۔"

ڈاکٹر نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اپنی مونچھوں پر سے بیر کی جھاگ پونچھی۔

"نہیں۔ یہ چیزیں میں خود صاف کروں گا۔"

"ڈاکٹر ہم ان چیزوں کے دام ادا کر دیں گے۔"

"نہیں میک مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ تم دام ادا کرنے کی بات سوچتے رہو گے، پریشان ہوتے رہو گے اور ایک کوڑی ادا نہیں کرو گے۔ یہ شیشہ جو تم نے توڑ دیا ہے، یہ تین سو ڈالر کا تھا۔ تم اس کی قیمت نہیں ادا کر پاؤ گے۔"

"میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر میں کیا کروں؟"

"میرا غصہ ختم ہو چکا ہے" ڈاکٹر نے کہا "اب اس بات کو بھلا دو۔"

میک نے اپنی بیئر ختم کی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا "اچھا تو ڈاکٹر خدا حافظ۔"

"خدا حافظ — ہاں یہ تو کہو۔ تمہاری بیوی کا کیا ہوا؟"
"میں خود نہیں جانتا" میک نے کہا "وہ چلی گئی۔"

میک سیڑھیوں پر نہایت بھدے انداز سے اترا اور فلاپ ہاؤس محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جھاڑو اٹھایا اور دن بھر کوڑا صاف کرتا رہا۔

میک فلاپ ہاؤس محل میں داخل ہوا تو اس کے ہونٹ کٹے ہوئے تھے اور اس کے دانت ٹوٹ رہے تھے۔ تاسف کے طور پر اس نے اپنا منہ صاف نہ کیا۔ وہ سیدھا اپنے پلنگ کی طرف گیا۔ اپنے سر پر کمبل اوڑھ کر بستر پر دراز ہو گیا اور دن بھر نہ اٹھا۔ اس کے منہ کی طرح اس کا دل بھی گھائل تھا۔ اس نے زندگی میں جتنے برے کام کئے تھے ان کو ایک ایک کر کے یاد کیا — وہ بہت اداس تھا۔

ہیوئی اور جونس تھوڑی دیر تک خلا میں جھانکتے رہے اور اس کے بعد وہ بھی ملول و افسردہ باہر نکل گئے اور انہوں نے ہیٹر پانڈو کنری جا کے ملازمت کی درخواست دی جو انہیں مل گئی۔

ہیزل کی طبیعت بہت ہی خراب تھی۔ وہ مونٹیری پہنچا۔ وہاں ایک فوجی سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لیا اور جان بوجھ کر مار کھائی۔ ایسا کرنے سے اس کا جی ہلکا ہو گیا۔ حالانکہ وہ ذرا سی بھی کوشش کرتا تو اس فوجی کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا۔

صرف کتیا ڈارلنگ ہی خوش تھی۔ وہ میک کے پلنگ کے نیچے بیٹھی ہوئی اس کے بوٹ چباتی رہی تھی۔ میک نے تنہائی سے تنگ آ کر پلنگ کے نیچے ہاتھ لٹکا کر دو مرتبہ اسے اپنے ساتھ سلانے کی کوشش کی، مگر کتیا بار بار نیچے اتر جاتی اور بوٹ کو چبانے لگتی۔ میک اور اس کے ساتھی یہ جانتے تھے کہ ان کا ستارہ گردش میں ہے۔ وہ عام طور پر اچھوت ہو گئے تھے۔ ان کے نیک ارادوں کو لوگوں نے بھلا دیا تھا۔ ان کے اس جھگڑے کے متعلق کچھ اور ہی کہانی مشہور ہو گئی تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ انہوں نے روپیہ اور شراب چرائی۔ جبراً ڈاکٹر کی تجربہ گاہ میں داخل ہوئے۔ محض اپنی شیطنت اور کینہ توزی کی وجہ سے انہوں نے ڈاکٹر کے گھر کے شیشے اور کھڑکیاں توڑ دیں — "لا ایڈا" ریسٹوران کے کچھ شرابی ڈاکٹر کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والوں کو کسی طرح پیٹنے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔

لڑائی کے متعلق میک کی سوجھ بوجھ نے ان کو تباہی سے بچا لیا۔ سماج جب کسی فرد کو ٹھکرا دیتا ہے تو اس پر دو طرح کے ردعمل ہوتے ہیں۔ یا تو اس کی جھجک بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ تمام دنیا سے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ برے کام کرتا ہے۔ یا پھر اپنی اصلاح کر کے زیادہ پاکیزہ اور مہربان ہو جاتا ہے۔

میک اور اس کے ساتھی نیک و بد کے ترازو میں کبھی ایک طرف جھک جاتے تھے اور کبھی دوسری طرف — انہی دنوں ڈاکٹر نے ایک بات دریافت کی۔ ۲۸ جولائی کا دن تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ فراسٹ کے ساتھ بیٹھا ہوا بیئر پی رہا تھا۔ گراموفون پہ نئے ریکارڈ بج رہے تھے۔ تجربہ گاہ کے سامنے فلاپ ہاؤس محل تھا۔ اس کے آگے ایک بہت بڑا شہتیر پڑا تھا۔ میک اور اس کے ساتھی اس پر دھوپ میں بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر نے کہا "ذرا ان کی طرف دیکھو۔ میرا خیال ہے تمہارے سچے فلاسفر یہی لوگ ہیں۔ میک اور اس کے ساتھیوں کو دنیا کی ہر ایک بات معلوم ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اس دنیا میں زیادہ اچھی طرح رہیں گے۔ جس وقت لوگ اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہوئے اپنے ٹکڑے اڑا رہے ہوتے ہیں یہ لوگ آرام کرتے ہیں۔ ہمارے تمام کامیاب لوگ بیمار ہیں۔ ان کے معدے خراب ہیں۔ ان کی روحیں متعفن ہیں لیکن میک اور اس کے ساتھی صحت مند اور پاکیزہ ہیں۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔"

رچرڈ فراسٹ نے کہا "مجھے تو وہ دوسروں کی طرح نظر آتے

سنا تو اسے خیال ہوا کہ وہ سب دعوت اڑا رہے ہیں۔ ۹ بجے تک ڈارلنگ نے ایک انڈا کھایا اور دودھ پیا ـــــ دوپہر تک وہ بالکل تندرست ہو گئی۔

کتیا ڈارلنگ کیا ٹھیک ہوئی دوسرے حالات بھی معمول پر آ گئے۔ ڈورا کو بھی یہ پیغام موصول ہوا کہ وہ اپنا ریسٹوران کھول سکتی ہے۔ ڈاکٹر کی تجربہ گاہ میں رات گئے تک گراموفون بجتا رہا۔ اور پھر نہ جانے لی چانگ کو کیا خیال آیا اس نے مینڈکوں کے سلسلے میں میک اور اس کے ساتھیوں کا قرضہ معاف کر دیا اور ان کو ربڑ کے جوتوں کا تحفہ دیا۔ ڈارلنگ کی بیماری نے ان لوگوں پر جو تباہ کن اثر کیا تھا وہ دور ہو چکا تھا۔ جس وقت لی چانگ ربڑ کے جوتے لے کر آیا اس وقت

ڈارلنگ پیزلے کے جوتے سے کھیل رہی تھی اور وہ سب تالیاں بجا رہے تھے۔

میک بھی بیئر فلیگ ریسٹوران میں نہیں گیا تھا۔ ایک روز جب وہ بیئر فلیگ ریسٹوران کے دروازہ پر نمودار ہوا تو سب کو یہ خیال گزرا کہ وہ بیئر پینے آیا ہے۔ مگر وہ الفریڈ کے سامنے جا کر رکا اور اس نے پوچھا "کیا ڈورا اندر ہے؟"

"تمہیں اس سے کیا چاہیے؟" الفریڈ نے پوچھا۔

"میں اس سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔"

"کیا پوچھنے آئے ہو؟"

"تمہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں" میک نے درشت لہجہ میں کہا۔

"بہت اچھا ـــــ ٹھہرو ذرا میں پتہ کر آؤں کہ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے کہ نہیں۔"

ایک لمحے کے بعد وہ میک کو ڈورا کے کمرے میں لے گیا۔ ڈورا اپنی میز کے سامنے حساب کی کتابوں پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے گلابی رنگ کا ایک شاندار لباس پہن رکھا تھا۔ جس وقت میک کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اپنی گھومنے والی کرسی کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ رلیفرڈ دروازے میں کھڑا رہا۔ جب تک رلیفرڈ دروازہ بند کر کے چلا نہیں گیا میک اس وقت تک خاموش کھڑا رہا۔ رلیفرڈ کے جانے کے بعد ڈورا نے میک کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور پھر اس نے پوچھا "میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"مادام آپ شاید وہ قصہ سن چکی ہیں کہ ہم نے چند روز پہلے ڈاکٹر کے مکان میں کیا کچھ کیا تھا۔"

"ہاں سنا تو ہے۔"

"مادام شاید آپ اعتبار نہ کریں۔ ہم ڈاکٹر کو دعوت دینا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر وقت پر گھر نہ آیا اور دعوت کو ہمارے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔"

"ہاں میں نے یہی سنا ہے ـــ خیر ـــ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"بات یہ ہے مادام ـــ میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ آپ سے مشورہ لیا جائے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ ہم ڈاکٹر کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں مشورہ دیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے تاکہ ہم ڈاکٹر کو اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے سکیں۔"

"ہونہہ" ڈورا نے گھومنے والی کرسی پر ایک چکر کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور بولی "تم نے ڈاکٹر کو ایک دعوت دینا چاہی لیکن وہ اس دعوت میں شریک نہ ہو سکا۔ یہی بات ہے نا؟ اب ڈاکٹر کو ایک ایسی دعوت دو جس میں وہ ضرور شریک ہو سکے۔"

"اوہ! میرے خدا" بعد میں میک نے لڑکوں کو بتایا "یہ کتنی سیدھی سادی بات تھی۔ بلا کی ذہین عورت ہے۔ لوگ اسے مادام کہتے ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ـــــ خدا کی قسم کیا عورت ہے۔"

سامنے کا سارا کینری روڈ یہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک بھاری تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ قسمت اور شگون پر یقین نہ رکھنا ایک اچھی بات ہے۔ دراصل ان پر کوئی یقین رکھتا بھی نہیں ہے لیکن ان کے سلسلے میں لاپروائی بھی نہیں کی جا سکتی۔ کینری روڈ دوسرے مقامات کی طرح توہم پرست نہیں ہے اس کے باوجود یہاں کوئی سیڑھی کے نیچے نہیں چلتا۔ اور گھر کے اندر کوئی چھتری نہیں کھولتا۔ ڈاکٹر تو ایک خالص سائنسدان تھا۔ وہ تو توہم کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا، پھر بھی جب کبھی وہ رات کو دیر سے گھر آتا تھا اور اپنی کھڑکی کی چوکھٹ پر سفید پھول پڑے پاتا تھا تو اسے بہت برا وقت دیکھنا پڑتا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کینری روڈ کے بیشتر لوگ توہمات پر

جیسے انھیں پر لگ گئے تھے۔

اب میک کو ضرور اس بات کا یقین تھا کہ فلاپ ہاؤس میں ہی کوئی بھید پوشیدہ ہے۔ اس نے گزشتہ دعوت کے متعلق تمام معاملات کا جائزہ لیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ فلاپ ہاؤس کو کسی پراسرار ہستی نے ڈیرہ جمالیا ہے۔ میک کا یہ بھی خیال تھا کہ جب کوئی مصیبت آجائے تو سوچنا چاہیے تاکہ یہ مصیبت گذر جائے۔ میک کا یہ خیال ضرور تھا لیکن وہ توہم پرست نہیں تھا۔

کینری رو میں پھر سے مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ فلاپ ہاؤس کی کتیا بھی اچھلنے اور کودنے لگی تھی۔ اب وہ گھر کے اندر نہیں سوتی تھی۔ باہر بھی نکل جایا کرتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ڈارلنگ جو کہ میک اچھی کتیا ثابت ہوگی۔

مسرت کی لہر دور دور تک پھیل چکی تھی۔ کتے زور زور سے بھونکتے۔ اسکول جاتی ہوئی لڑکیاں دفعتاً رک جاتیں اور اپنی نگاہیں اوپر اٹھاکر نیچے سرکرتیں۔ میک اور اس کے ساتھیوں میں بھی عجیب سی تبدیلی آگئی تھی۔ جونس کرسی سے اٹھ کر رقص کرنے لگتا تھا اور دوبارہ پھر کرسی پر آکر بیٹھ جاتا تھا۔ ہیزل خواہ مخواہ مسکراتا رہتا تھا۔ ایڈی نہ جانے کس مقصد کے لئے شراب جمع کر رہا تھا۔ اب وہ شراب کے جگ میں بیئر بھی نہیں ملا رہا تھا۔ خالص وسکی جمع کر رہا تھا۔ سیم سوٹے نے گھر میں کچھ پودے لگائے تھے اور وہ ان کی آبپاری کر رہا تھا۔ اس کی بیوی صبح سے شام تک چادر پر کشیدہ کاڑھتی رہتی تھی۔ مسرت کی لہر بیئر فلیگ تک بھی پہنچ چکی تھی۔ کاروبار بہت اچھا تھا۔ فلیسی کے کان کا زخم اچھا ہو گیا تھا اور اب وہ دوبارہ اپنے کام پر جانے والی تھی۔ ایوا فلینیگن ایسٹ سینٹ لوئس سے لوٹ آئی تھی اور وہ وہاں سے واپس آکر بہت خوش تھی۔

ڈاکٹر کو جو پارٹی دی جانے والی تھی اس کی بات چل نکلی تھی۔ میک نے اپنے ساتھیوں سے کہا "پچھلی مرتبہ تو ہم نے زبردستی کی۔ پارٹی اس طرح نہیں دی جاتی۔ دعوت کو پہلے اپنے ذہن پر پوری طرح سوار کرلینا چاہیے۔"

"پھر اب دعوت کب ہو رہی ہے؟" جونس نے بیقرار ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے اس کی کوئی خبر نہیں!" میک نے جواب دیا۔

"کیوں کیا اسے بھی اچانک کوئی دعوت دی جا رہی ہے؟"

"ہاں چونکا دو تو اچھا ہے" میک بولا۔

ڈارلنگ اس وقت ایک گیند سے کھیل رہی تھی۔

"اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ ڈاکٹر کا جنم دن کب ہے تو ہم اس کے جنم دن پر دعوت دیں گے" ہیزل نے کہا۔

حیرت سے میک کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ہیزل نے ایک حقیقت سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ "خدا کی قسم ہیزل۔ تم بات ہمیشہ پتے کی کہتے ہو۔ اب تو ہمیں کوشش کرنی چاہیے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ڈاکٹر کا جنم دن کون سا ہے۔"

"یہ تو بہت ہی آسان بات ہے" ہیوئی نے کہا "ڈاکٹر سے پوچھ کیوں نہ لیا جائے؟"

"پھر تو سارا بھید کھل جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ میں جاؤں اور پتہ چلانے کی کوشش کروں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں" ہیزل بولا۔

"نہیں ـــــ ہم دونوں گئے تو وہ بھانپ جائے گا کہ ہم کس مقصد سے آئے ہیں۔"

"دیکھو۔ یہ بات تو تمہیں میں نے سمجھائی ہے۔"

"میں جانتا ہوں" میک بولا ـــ "اگر دعوت ہوئی تو میں ڈاکٹر کو بتا دوں گا کہ یہ تمہارا خیال تھا۔ لیکن اس کے پاس مجھے اس وقت تنہا ہی جانا چاہیے۔"

"ویسے ڈاکٹر کا حال کیا ہے۔ کیا وہ ہماری طرف دوستانہ رویہ رکھتا ہے؟" ہیزل نے پوچھا۔

"ہاں"

میک نے ڈاکٹر کو تجربہ گاہ کے عقب میں مصروف پایا۔ اس نے ربڑ کا اینگر کھا پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں میں ربڑ کے دستانے تھے۔ وہ ایک مچھلی کی شریانوں میں کسی رنگ دار چیز کا انجکشن لگا رہا تھا۔

ڈاکٹر کے ہاتھ بڑی پھرتی سے کام کر رہے تھے ـــ

"ڈاکٹر۔ کیا اتنے ہی مصروف ہو؟" میک نے پوچھا۔

"ہاں ـــ کہو ڈارلنگ کا کیا حال ہے؟"

"بہت اچھا ہے۔ اگر آپ مدد نہ کرتے تو وہ مر جاتی۔"

ایک لمحے کے لئے ڈاکٹر ٹھٹک گیا کہ میک اس کی خوشامد کر رہا ہے۔ لیکن جلد ہی ڈاکٹر کا وہم دور ہو گیا۔ ڈاکٹر خوشامد کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ میک کو ایک مدت سے جانتا تھا — آج میک کے لہجے میں تشکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ ڈاکٹر کو معلوم تھا کہ میک کو اپنی کتیا کتنی پیاری ہے۔

"کہو فلاپ ہاؤس میں وقت کیسے گزر رہا ہے؟"

"اچھا ہی گزر رہا ہے۔ ہم دو نئی کرسیاں لے آئے ہیں۔ کاش آپ کسی وقت آ کر دیکھتے۔"

"میں ضرور آؤں گا — کیا ایڈی اب بھی شراب کے جگ لے آتا ہے؟"

"ہاں — اب تو وہ شراب میں بیئر بھی نہیں ملاتا۔ اب شراب کا مزہ اچھا ہو گیا ہے۔ بس کا نشہ بھی تیز ہے۔"

میک انتظار کرتا رہا کہ کوئی ایسی بات چھیڑے جس سے اسکو گویا مقصد ہاتھ آ جائے۔

"بہت دنوں سے ہیزل کو نہیں دیکھا — وہ بیمار تو نہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں —" اس کے بعد میک نے اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔ "ہیزل اچھا ہے۔ آج کل ہیزل اور ہیوئی میں ایک ہفتہ سے جنگ ہو رہی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جھگڑا ایک ایسی بات پر ہو رہا ہے جس کے متعلق دونوں کچھ نہیں جانتے۔ میں کوئی دخل نہیں دے رہا ہوں۔ چونکہ اس بات کے متعلق مجھے بھی کچھ علم نہیں ہے۔"

"بات کیا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ ہیزل ان دنوں قسمت کا حال بتانے والے نقشے خرید رہا ہے اور ہیوئی کہتا ہے کہ یہ نقشے بالکل بے معنی اور بیکار ہوتے ہیں۔ ہیوئی کہتا ہے کہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ آدمی کب پیدا ہوا تھا تب تک اس کے متعلق کوئی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ان باتوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر؟"

"میں بھی ہیوئی سے متفق ہوں۔" ڈاکٹر نے سرنج میں لال دوا بھرتے ہوئے کہا۔

"کل رات تو ان میں خوب گرما گرمی ہو گئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کب پیدا ہوا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ ۱۲ اپریل کو ہوا تھا۔ ہیزل وہ نقشہ خرید لایا اور مجھے میری قسمت کا حال بتانے لگا۔ کہیں کہیں تو نقشے میں باتیں بالکل ٹھیک تھیں مگر زیادہ تر باتیں اچھے مستقبل سے متعلق تھیں۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اپنے متعلق اچھی باتوں پر ایمان لے آتا ہے — اس نقشے میں لکھا تھا۔ میں بہادر ہوں۔ چالاک ہوں۔ ہوشیار ہوں۔ ہیزل کہتا تھا کہ اس نقشے کی میرے متعلق ہر بات ٹھیک ہے — ڈاکٹر آپ کا جنم دن کیا ہے؟" میک نے دفعتاً سوال کیا۔

ڈاکٹر میک کو ایک مدت سے جانتا تھا۔ لہٰذا میک کے اس اچانک سوال پر بھی ڈاکٹر نہ چونکا۔ ڈاکٹر کا جنم دن ۱۸ دسمبر کا دن تھا لیکن اس نے بتایا "۲۷ اکتوبر"۔ اور پھر ڈاکٹر نے میک سے کہا: "ہیزل سے پوچھنا میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟"

"میں تو سمجھتا ہوں یہ سب بکواس ہے لیکن ہیزل بضد ہے کہ ان نقشوں کی باتیں سچی ہوتی ہیں۔ بہر حال میں ہیزل سے کہوں گا کہ وہ آپکی قسمت کا حال بتائے۔"

جب میک چلا گیا تو ڈاکٹر سوچتا رہا کہ میک نے یہ کہانی کیوں گھڑی تھی۔ میک نے جان بوجھ کر یہ باتیں چھیڑی تھیں اور ڈاکٹر کو میک کی تکنیک کا علم تھا — وہ اس کے انداز کو خوب سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر دیر تک سوچتا رہا کہ میک کا آخر مقصد کیا تھا۔ بعد میں جب یہ افواہ اڑی کہ وہ لوگ اُسے دعوت دینے والے ہیں تو ڈاکٹر نے اطمینان کا سانس لیا۔

میک اور اس کے ساتھی — ہم اوصاف اور ہم حسن — وہ فلاپ ہاؤس محل میں بیٹھے تھے لیکن وہ تالاب میں پھینکے جانے والے کنکر تھے جن سے تالاب میں لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ کینری رو ہی میں نہیں مونٹریری اور پیسیفک گروو میں بھی حرکت پیدا کر دیتے تھے۔ وہ حرکت اور ہیجان قدرتی کے جنم داتا تھے۔

"اس دفعہ ہمیں یقین کے ساتھ ڈاکٹر کو دعوت میں شامل کرنا ہے۔ ڈاکٹر نہیں آئے گا تو دعوت بھی نہیں دی جائے گی۔" میک نے کہا۔

"مگر یہ پارٹی کہاں دی جائے گی؟" جونس نے پوچھا۔

ہونے والی پارٹی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ میرے متعلق بہت سوچتا ہے۔ دعوت تو ہم ڈاکٹر کو یہاں بھی دے سکتے ہیں لیکن یہاں ڈاکٹر کو ایسا محسوس نہیں ہوگا۔ ایک بات اور، ڈاکٹر کو یہ جگہ بہت پسند ہے۔ اس کے پاس وہاں باجہ بھی ہے۔" میک نے ختم اور پوچھ کر کہا: "مجھے خبر نہیں ہے کہ پچھلی مرتبہ کس نے ڈاکٹر کا گراموفون توڑ دیا تھا۔ اب کے اگر کسی نے گراموفون کو چھیڑا تو میں اس کا جبڑا نکال دوں گا۔"

"میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر کو اس کے مکان پر پارٹی دی جائے۔" جیک بولا۔ لوگوں کو یہ خبر دی گئی تھی کہ ڈاکٹر کو دعوت دی جا رہی ہے مگر وہ جانتے تھے کہ ڈاکٹر کو پارٹی دی جا رہی ہے۔ کسی کو اس پارٹی میں شریک ہونے کا بلاوا نہیں دیا گیا تھا پھر بھی ہر کوئی اس دعوت میں شریک ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔

۲۷ اکتوبر کی تاریخ کے گرد سب نے ایک سرخ حلقہ بنا دیا تھا کہ یہ دن بھول نہ پائے — چونکہ جنم دن کی دعوت تھی اس لئے ہر کوئی تحفہ خریدنے کی فکر میں مبتلا تھا۔

ڈورا کے ریستوران کی لڑکیاں ڈاکٹر سے اپنی بیماریوں کے متعلق مشورہ کرنے آتیں۔ ان کی نگاہ ڈاکٹر کے پلنگ پر پڑتی۔ اس کے بستر پر گھسا ہوا کمبل، لومڑی کا سمور اور ریت پڑی رہتی تھی۔ وہ جب بھی اپنے سفر سے لوٹتا تھا تو یہ چیزیں ساتھ لے آتا تھا۔ اس کے پاس روپیہ ہوتا تھا تو وہ اپنی تجربہ گاہ کا سامان خرید لیتا تھا۔ اسے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اسے کوئی نیا کمبل خریدنا چاہیے۔ ڈورا کے ریستوران کی لڑکیاں ڈاکٹر کے لئے کمبل تیار کر رہی تھیں۔ اس کمبل کے کنارے ریشم کے تھے۔ یہ ریشم شام کے ملبوسات اور زیر جاموں سے حاصل کیا گیا تھا اس لئے یہ کمبل مختلف رنگوں کا مرقع تھا۔

لی چونگ نے آتش بازی اور رنگین قمقمے جمع کئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ان چیزوں سے دعوت کا حسن دوبالا ہو جائے گا۔

سیم ملوے قدیم اشیاء کا شیدائی تھا۔ وہ ان نادر اشیاء کو دیر سے جمع کر رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ایک دن یہ نادر الوجود اشیاء اس کو مالا مال کر دیں گی۔ اس نے پرانی موٹروں کے پرزے بھی جمع کئے تھے۔ وہ بھی ڈاکٹر کو تحفہ دینے کے لئے کئی دن تک سوچتا رہا تھا۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک پرانی موٹر کا پرزہ ڈاکٹر کو بطور تحفہ دیگا۔

میک اور اس کے ساتھی بھی اس مسئلہ پر دماغ سوزی کر رہے تھے۔ آخر کار کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ڈاکٹر کو بلیاں حاصل کرنے میں بہت دقت پیش آتی ہے اس لئے بلیوں ڈاکٹر کو بلیوں کا تحفہ دیا جائے۔ انہوں نے ایک بہت بڑا پنجرہ بنایا اور روز بروز اس پنجرے میں خوبصورت بلیوں کا اضافہ ہونے لگا۔ میک کا خیال تھا کہ ۵۰ بلیاں ڈاکٹر کے لئے ایک نہایت موزوں تحفہ ہوگا — "اب کے کوئی سیاہ وسکی نہیں پی جائے گی۔ سیدھی سادی پارٹی ہوگی۔ البتہ شراب کافی مقدار میں ہوگی۔"

اس پارٹی کی اطلاع ہیزل کو جیل میں بھی پہنچ گئی تھی۔ اس نے وارڈن سے مل کر یہ انتظام کر لیا کہ وہ اس رات کو تاریکی میں نکل جائیگا اور دعوت میں شرکت کے بعد دوبارہ جیل میں آ جائے گا۔ ہنری نے ڈاکٹر کے لئے ایک ریشمی گدی تیار کی تھی۔

ہنری کا دوست ایک نائی تھا جس کا نام ایرک تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو فصل کی کٹائی کی مشین دینے کا فیصلہ کیا۔

دعوت کی افواہ چار سو زور و شور سے پھیل گئی۔ آمد و رفت جاری ہو گئی۔ تحائف پر بحث ہونے لگی۔ اس بات کی احتیاط رکھی گئی کہ ڈاکٹر کو کسی بات کا پتہ نہ چلنے پائے۔

ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ ہر کوئی اس سے بات کرتے ہوئے ہوشیاری سے کام لیتا تھا۔ بہت سے لوگ اس سے سوالات کرتے کہ وہ ۲۷ اکتوبر کو کہیں باہر تو نہیں جائے گا۔ ۲۷ اکتوبر کو اسے کوئی کام تو نہیں ہے — ان سوالات سے ڈاکٹر پریشان ہو گیا۔ میک نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی قسمت کا حال ہیزل سے پوچھ کر آئے گا۔ میک نے نہ صرف اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے متعلق کوئی ذکر تک نہیں چھیڑا تھا۔

ایک دن وہ ہات وے ہاؤس میں بیئر پینے کے لئے رک گیا۔ بیئر کا اسے مزہ آیا تو وہ وہیں بیٹھ کر بیئر پینے لگا۔ دفعتاً اس نے ایک شرابی کو شراب خانہ کے مالک سے کہتے ہوئے سنا "کیا تم دعوت میں شریک ہو گے؟"

"کون سی دعوت؟" شراب خانہ کے مالک نے پوچھا۔

"تم کنری رو کے ڈاکٹر کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔"

"کچھ لوگ اس کے جنم دن پر اُسے دعوت دے رہے ہیں"

"کون دعوت دے رہا ہے؟"

"یہ دعوت سب کی طرف سے ہو گی"

ڈاکٹر نے اس شرابی کی طرف دیکھا۔ وہ اس شرابی کو جانتا نہیں تھا۔ ڈاکٹر کو اس بات پر خوشی ہوئی کہ اُسے دعوت دی جا رہی ہے لیکن جب اُسے گزشتہ دعوت کا خیال آیا تو وہ اُداس ہو گیا۔

دوسرے دن ہی ڈاکٹر نے دعوت کے لئے خود بھی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے گراموفون کے بہترین ریکارڈ صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ جو چیزیں ٹوٹنے والی تھیں انہیں سنبھال کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے مہمان بھوکے ہوں گے۔ وہ شراب جلد پی جائیں گے اور پھر انہیں بھوک ستائے گی۔ لہٰذا ڈاکٹر نے منڈی میں جا کر ۱۵ پونڈ گوشت کا آرڈر دیا۔ وہ شراب بھی لایا۔ اس نے کھانے کے لئے دوسری چیزوں کا انتظام بھی کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ پیسے کی اجتماع میں اسے تکلیف ہو گی۔ بلکہ یہیں روپیہ نہیں ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے کوئی پروا نہ کی۔

کنری رو میں دعوت کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ شراب جمع کی جا رہی تھی۔ تحائف کا انبار لگ رہا تھا۔ شراب خانوں میں مسلسل اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ دعوت کے دن کیسا لباس پہنا جائے۔ ڈورا کے یہاں جو لڑکیاں تھیں وہ شہرہ عورتوں کا لباس پہننے پر بضد تھیں۔ انہوں نے دعوت کے روز اپنے کام کی تقسیم کا پروگرام بھی پہلے بنا لیا تھا ــــــ وہ جو کمبل تیار کر رہی تھیں وہ بھی اب مکمل ہونے والا تھا۔ میک سے جو بلیاں جمع کی تھیں وہ رات کو میاؤں میاؤں کرتی رہتی تھیں اور ڈارلنگ کو ان سے خوف معلوم ہوتا تھا۔

۲۷ اکتوبر کو ڈاکٹر نے جیلی فش کے آخری ڈھیر کو بوتلوں میں بھرنے کا کام ہو چکنے پر ختم کیا۔ جگ کو دھویا، زمبور کو صاف کیا اور ربڑ کے دستانوں کو نکال کر احتیاط سے رکھا اور زینے کے اوپر جا کر چوہوں کو کھلایا اور کچھ بہترین ریکارڈ اور خوردبین پچھلے کمرے میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ ڈاکٹر چاہتا تھا کہ یہ پارٹی جہاں تک ہو سکے تکلیف دہ ... ڈال دی ہو۔ اس لئے تیاری کے وقت تمام احتیاطیں اور پیش بندیاں کر لینا ضروری سمجھتا تھا۔

کافی کے لئے پانی چولہے پر رکھ کر اور گراموفون پر اچھی پسند کا ریکارڈ شروع کر کے غسل کرنے لگا۔ اس نے ان کاموں کی انجام دہی میں انتہائی عجلت اور پھرتی سے کام لیا۔ چنانچہ میوزک ختم ہونے سے قبل اس نے صاف ستھرے کپڑے بدل لئے اور کافی کی ایک پیالی ختم کر لی۔

اس نے کھڑکی سے میدان پر پھر محل پر نظر ڈالی، مگر کوئی شخص آتا ہوا نظر نہیں آیا۔ ڈاکٹر کو معلوم نہیں تھا کہ کون لوگ اور کتنی تعداد میں اس پارٹی میں شریک ہو رہے ہیں۔ دن بھر وہ پارٹی ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے سوچا کہ روزمرہ کے کام کرنے چاہئیں۔

وہ سیدھا لی چانگ کی دوکان پر گیا اور بیئر کے دو کوارٹ خریدے۔ وہاں اس نے دبا ہوا جوش محسوس کیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ لوگ بھی آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر تجربہ گاہ واپس آیا۔ اسے سخت پیاس لگی تھی اس لئے بیئر کا ایک گلاس تو اسی وقت پی گیا، البتہ دوسرا گلاس مزے لے لیکر دیر تک پیتا رہا۔ میدان اور گلی اب بھی لوگوں کی آمد و رفت سے خالی تھے۔

میک اور اس کے ساتھی فلاپ ہاؤس محل میں تھے اور اس کا دروازہ بند تھا، دوپہر کے بعد سے اسٹوپرا پر جلتا رہا اور نہانے کے لئے پانی گرم ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈارلنگ نے بھی غسل کیا اور اپنے گلے میں سرخ رنگ کا نیا فیتہ پہن کر پارٹی کے لئے تیار ہو گئی۔

"ہمیں کس وقت وہاں پہنچنا چاہئے؟" ہیزل نے سوال کیا۔

"میرے خیال میں آٹھ بجے سے پہلے نہیں" میک نے جواب دیا۔ کیوں نہ جب تک اپنے کو گرم کر لیں"

"ڈاکٹر اپنے کو کیسے گرم رکھے گا" ہیوئی نے سوال کیا "کیوں نہ اس کے لئے بھی ایک بوتل خرید لیں"

"نہیں" میک نے کہا "ڈاکٹر ابھی ابھی لی کے یہاں سے بیئر لے گیا ہے"

"کیا اس کو کسی قسم کا شبہ ہے؟" جونس نے سوال کیا۔

"اسے کیونکر ہو گا؟" میک نے سوال کیا۔

کونے کے کٹہرے میں دو بیٹے لڑ پڑے اور ان کی غرّاہٹ سے پورا کٹہرہ گونج اٹھا۔ وہاں کوئی اکیس بلیاں تھیں۔

"اکیس بلیاں وہاں جائیں گی کیسے؟" ہیرلڈ نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "اتنا چیخنے والوں سے لے جانا تو ناممکن ہے۔"

"ہم ایسا نہیں کریں گے" میک نے اطمینان سے کہا۔ "یاد کرو سیلون کے لئے ہم نے کیا ترکیب کی تھی۔ اس وقت ہم ڈاکٹر کو اس کے جلسے میں صرف اطلاع کریں گے اس کے بعد چھپ جائیں گے" میک نے [illegible] ہنری کا ایک جگ کھول کر شراب پی۔ "ذرا گرمی پیدا کریں" اس نے کہا۔

بیئر فلیگ کی لڑکیاں تیاری اور بناؤ سنگار میں مشغول تھیں۔ ڈورا کا لباس دیکھنے کے قابل تھا — بالوں کو اس نے نارنجی رنگ سے رنگا گیا۔ بالوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ گھونگر پیدا کئے گئے۔ شادی کی انگوٹھی پہن لی گئی اور سینے کو الماس کے بروچ سے زینت دی گئی —

دوسری لڑکیاں بھی، جن کو پارٹی میں جانا تھا، تیار ہو چکی تھیں اور وقت کا انتظار کر رہی تھیں۔ چوکیدار منہ لٹکائے بڑبڑا رہا تھا۔ اس لئے کہ اس سے کہہ دیا گیا کہ وہ پارٹی میں نہ جا سکے گا، اسے مکان کی دیکھ بھال کرنا ہے۔

ڈورا نے بڑے آئینے میں اپنے سنگار کا دوبارہ جائزہ لیا اور بالوں کو دوبارہ درست کر کے بار میں آئی۔ الفریڈ چوکیدار اداس اور آزردہ تھا۔ ڈورا نے بے پروائی سے اس پر ایک نگاہ ڈالی "کیا کچھ گڑبڑ کا خطرہ ہے؟"

"جی نہیں" الفریڈ نے جواب دیا "نہیں، سب ٹھیک ہے۔"

ڈورا نے اس کے جملے کو دہرایا "سب ٹھیک ہے۔ واقعی؟ — دیکھو مسٹر! تمہارے سپرد ایک کام کیا گیا ہے۔ تم اس کو کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہے" الفریڈ نے روکھے پن سے جواب دیا۔ بار پر کہنی ٹیک کر اس نے دیوار کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا "تم جاؤ اور لطف اٹھاؤ۔" اس نے کہا "میں یہاں ہر چیز کا خیال رکھوں گا۔ تم کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

ڈورا کا مزاج نرم پڑ گیا "دیکھو" اس نے کہا "ایک مرد کا یہاں ہر وقت ہونا بہت ضروری ہے۔ کوئی شرابی کسی وقت بھی گڑبڑ کر سکتا ہے۔ لڑکیاں اس پر نہیں قابو حاصل کر سکتیں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد تم وہاں آ سکتے ہو اور کھڑکیوں سے تم اس جگہ پر بھی نگاہ رکھ سکتے ہو۔ کہو، کیسا رہے گا؟ اگر کوئی بات ہوئی تو تم وہاں سے دیکھ سکو گے۔"

"بہت اچھا" الفریڈ نے جواب دیا "[illegible]"

اس کی اجازت سے وہ نرم پڑ گیا "بس دو ایک منٹ کے لئے بعد میں آ جاؤں گا۔ گذشتہ رات لوگوں نے شراب پی کر بڑی گڑبڑ کی تھی۔ ڈورا کا کاروبار اب پہلے جیسا بھروسہ نہیں رہا۔ اس دن جب ایک شخص کو زبردستی نکالا گیا اس وقت سے یہ اعصاب بہت کمزور ہو گئے ہیں۔"

"تم کو آرام کی ضرورت ہے" ڈورا نے کہا "مجھے امید ہے کہ میں میک کو تمہاری جگہ کام کرنے پر راضی کر لوں گی۔ اس وقت تم چند ہفتوں کی چھٹی پر جا سکتے ہو۔"

تجربہ گاہ میں ڈاکٹر نے بیئر کے بعد تھوڑی سی وسکی پی، جس سے سرور کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہ خیال دل میں چٹکیاں لے رہا تھا کہ اس کو پارٹی دی جا رہی ہے۔ اس نے اپنا پسندیدہ ریکارڈ بجایا جس سے جذبات ابھر آئے اور طبیعت کچھ غمزدہ سی ہو گئی۔ طبیعت کو بہلانے کے لئے اس نے ایک کتاب اٹھائی، اس کے ایک باب پڑھنے لگا جس نے اس کے ذہن کو ایک اور جگہ پہنچا دیا۔ اس کو پڑھنے کے بعد وسکی کا ایک اور گلاس لیا۔ اس کو لا ہڈا کی گیس کی بتی جھلملاتی ہوئی دکھائی دی اور پھر بیئر فلیگ کے سامنے سڑک پر بتیاں روشن ہو گئیں۔

فلاپ ہاؤس محل کے مکین بڑی بے چینی سے کلاک کی طرف بار بار دیکھتے تھے۔

کینری رو کے ہر شخص کا یہ خیال تھا کہ اس پارٹی میں حسب معمول بڑا شور اور ہنگامہ ہو گا، مگر ان کی توقع اور امید کے خلاف اس کی شروعات اس طرح کی نہیں ہوئی۔ ٹھیک آٹھ بجے میک اور اس کے ساتھی اپنے تحفوں سمیت ویسٹرن بائیولاجیکل پہنچے۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولا اور میک نے ایک مختصر سی تقریر کی — "آج تمہارا یوم پیدائش ہے۔ میں اور میرے ساتھی تمہاری خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ آج کے مبارک موقع پر تحفے کے طور پر پیش کرنے کے لئے ہم نے اکیس بلیاں حاصل کی ہیں۔" وہ رک گیا۔ اس کے ساتھی

خاموشی سے سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔

"اندر آؤ" ــــ ڈاکٹر نے کہا "کیوں ــــ مجھے ــــ مجھے تعجب ہے ــــ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ آج میرا یوم پیدائش ہے۔"

"سب جانتے ہیں۔" ہیری نے کہا "ہم ان کو ساتھ نہیں لائے ہیں۔"

وہ سب کے ساتھ قاعدے کے مطابق کمرہ میں بائیں طرف بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی "اچھا" ڈاکٹر نے کہا۔ "کیوں نہ تھوڑی دیر شراب سے لطف اٹھایا جائے۔"

میک نے کہا ــــ "ہم تھوڑی سی "اسٹورٹ" اپنے ساتھ لائے ہیں" اور اس نے تینوں جگوں کی طرف اشارہ کیا "ایڈی بہت دنوں سے جمع کر رہا تھا۔"

ڈاکٹر نے اپنی شام کی خاموشی اور مزاحمت پر پردہ ڈالا ــــ "نہیں" اس نے انکار کیا "تم لوگوں کو میرے ساتھ پینا ہوگی ــــ اتفاق سے میرے پاس کچھ وسکی ہے۔"

یہ لوگ وسکی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ڈورا اور دوسری لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے گلدستہ پیش کیا۔ ڈاکٹر نے چارپائی پر بچھایا تو بہت خوبصورت تھا۔ انہوں نے بھی شراب میں ساتھ دیا۔

اس کے بعد لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔ ہنری نے پیشکش پیش کیا۔ کوئی تین فٹ چوڑا اور چار فٹ لمبا تھا۔ وہ اپنے آرٹ کے بارے میں تقریر کرنے جا رہا تھا کہ اس درمیان میں باقاعدگی اور ترتیب جاتی رہی۔ مسٹر اور مسز گھے داخل ہوئے۔ لی چانگ نے بھی چند عمدہ چیزیں پیش کیں۔ لا ایڈا کے کچھ ایسے لوگ بھی پارٹی میں شریک ہو گئے، جو نسبتاً اجنبی تھے۔ اور جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا۔ پارٹی کا ضابطہ تیزی سے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ڈورا اس پارٹی میں سب سے شاندار لگتی تھی۔ وہ ایک خاص انداز میں اپنی خوبصورت انگلیوں سے وسکی کا گلاس پکڑے ہوئے تھی اور کن انکھیوں سے وہ لڑکیوں کی بھی نگرانی کرتی رہتی۔ ڈاکٹر نے رقص کے میوزک کا ریکارڈ فونوگراف پر رکھ کر باورچی خانے میں چلا گیا اور گوشت کے قتلے تلنے لگا۔

پہلی لڑائی کچھ زیادہ بری نہیں تھی۔ لا ایڈا کے ایک منچلے نوجوان نے ڈورا کی لڑکیوں سے نامناسب خواہش ظاہر کی۔ میک اور اس کے ساتھیوں کو اس پر غصہ آگیا اور انہوں نے بغیر کسی چیز کو نقصان پہنچائے اس کو معقول سزا دیدی۔

ڈاکٹر باورچی خانے میں تین پتیلیوں میں گوشت کے قتلے تل رہا تھا اور ٹماٹر کاٹ کر ساسگی پر رکھتا جا رہا تھا۔ میک نے فونوگراف کا چارج خود اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ رقص شروع ہو چکا تھا اور لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔ ایڈی نے ٹاپ ڈانس پیش کیا۔ ڈاکٹر نے جب گوشت کے قتلے پیش کئے تو سب کو تعجب ہوا۔ کھانے کی گرانی نے سرور میں کمی پیدا کر دی ــــ وسکی ختم ہو گئی تو ڈاکٹر کیلی فورنیا وائن نکال لایا۔

ڈورا نے ڈاکٹر سے اپنے ایک پسندیدہ میوزک کی فرمائش کی۔ ڈاکٹر نے فوراً تعمیل کی۔ تمام مہمان خاموش ہو گئے، اور پوری محفل پر مکمل سکوت چھا گیا۔ دو نئے اشخاص سیڑھیوں پر ظاہر ہوئے اور چپکے سے محفل میں شریک ہو گئے۔ میوزک ختم ہوا، تو ہر شخص خاموش اور متاثر تھا۔ ڈاکٹر ایک کتاب اٹھا لایا اور صاف اور پر اثر آواز میں پڑھنا شروع کیا:۔

آج بھی

اگر اپنی روح کی گہرائیوں میں مجھے وہ حسینہ نظر آ جاتی ہے۔
اس کا سنہرا رنگ اسی طرح برقرار اور اس کا چہرہ ستارۂ صبح کے مانند
برگشتہ، اس کا تن نازنین محبت کے شعلوں کا گہوارہ۔
اور خنجر عشق سے زخمی
اس کی نوخیز جوانی میری پہلی محبوب
تو میرا دل برف کی سِلوں میں زندہ درگور ہو جاتا ہے۔

آج بھی

اگر میری محبوبہ اپنی کنول جیسی آنکھوں سمیت آ جائے۔
وہ آنکھیں جو جوانی کی محبت کے شیریں بوجھ سے تھکی تھکی ہیں۔
تو میری آغوش بیتاب ایک بار پھر اسے اپنے میں سمو لے۔
اور اس کے دہن شیریں سے میں ایک بار پھر بادہ کشی کروں۔
پرسکون شور میں جیسے مگس آوارہ
رہزن شہد و شکر چوگل نیلوفر کی

کی اطلاع مل گئی تھی انہوں نے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ اب قزاق مکان سے نکل کر سڑک پر آپہنچ گئی اور پھر کھلے میدان میں۔ پھاٹک کا دروازہ ٹوٹ کر اس بار بھی قلابہ پر لٹکا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی قمیض پھٹ گئی تھی اور کندھے پر زخم آجانے سے خون بہہ رہا تھا۔ دشمن نصف میدان تک پسپا کئے جاچکے تھے کہ سائرن سنائی دیا۔ پارٹی کے منتظمین کو بہ مشکل اتنا وقت ملا کہ پولیس کے پہنچنے سے پہلے وہ تجربہ گاہ میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر سکیں اور روشنی بجھا سکیں۔ سپاہی ناکام واپس گئے۔ مگر پارٹی کے لوگ اندھیرے میں بیٹھے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے اور وائن پی رہے تھے۔ اس کے بعد بیر فلیگ کی

باری آئی۔ ایک تازہ دم جماعت نے اپنی پوری قوت سے حملہ کیا۔ پارٹی کے لوگوں کو ان کی امداد کے لئے جانا پڑا۔ سپاہی واپس آئے۔ اندر دیکھا، اپنی زبانوں سے تیخ کی آواز پیدا کی اور اس میں شریک ہو گئے۔ میک اور اس کے ساتھی اسکوئنڈ کار پر بیٹھ کر جمی بروشیا کی دوکان پر گئے اور مزید وائن خرید کر لائے۔ خود جمی بھی ان کے ساتھ واپس آیا۔ پارٹی کا شور کینری رو کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سنائی دیتا تھا۔ سان پیڈرو کشتی کے ملاح بھی پارٹی میں شریک ہوئے، جنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک خاتون نے شور و ہنگامہ سے تنگ آکر کوتوالی کو فون کیا، مگر وہاں کوئی نہیں ملا۔ خود پولیس کو رپٹ لکھانی پڑی کہ اس کی کار چوری ہو گئی، جو بعد میں ساحل پر ملی۔ ڈاکٹر ٹانگ پر ٹانگ رکھے میز پر بیٹھا ہوا تھا اور خوشی سے اپنے گھٹنے پر انگلیاں تھپتھپا رہا تھا۔ میک اور ہیوسن نے زمین پر ہندوستانی کشتی لڑ رہے تھے اور خلیج کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے اندر آرہی تھی۔ اس وقت کسی شخص نے گوٹے کی ۲۵ فٹ لمبی ڈوری میں آگ لگا دی۔

ڈاکٹر بڑی سستی اور بے ڈھنگے پن سے، جس طرح ایک موٹا آدمی تیرنے کے حوض سے نکلتا ہے، اپنے بستر سے نکلا۔ اس نے پہلے ایک آنکھ کھولی۔ کمرے کا بہترین رنگ دیکھ کر پھر بند کر لی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر اس نے آنکھ کھولی۔ اس کی آنکھ گدے سے گذر کر فرش پر پڑی۔ کونے میں پلیٹیں ٹوٹی ہوئی تھیں، میزیں زمین پر الٹی ہوئی تھیں، وائن اور کتابیں زمین پر بکھری پڑی تھیں، باورچی خانے کے دروازے سے گوشت کی پلیٹوں کے انبار اور کمرے میں الٹ پلٹ چیزیں نظر آرہی تھیں۔ سگریٹ کے سیکڑوں ٹکڑے فرش پر مسلے پڑے تھے۔ اس کی نگاہ ایک لمحے کے لئے بیر پیڑوں پر رکی، جو فرش کے ایک طرف کافی تعداد میں پڑے ہوئے تھے۔

اس نے آہستہ سے کروٹ لی اور ایک کہنی پر ٹیک دے کر ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ کینری رو میں ہر طرف خاموشی تھی اور دھوپ کافی پھیل چکی تھی۔ فلاپ ہاؤس کمل کا دروازہ بھڑا ہوا تھا، کھلے میدان میں ایک شخص گہری نیند سو رہا تھا۔ بیر فلیگ کا دروازہ بند تھا۔

ڈاکٹر اٹھا، باورچی خانے میں جا کر گیس کے ہیٹر کو جلایا اور ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ پہاڑی کے اوپر سے گرجا کے گھنٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پانی پکنے لگا تو اٹھ کر غسل کیا اور نیلی پتلون اور فلالین کی قمیض پہنی۔ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ کھولا تو لی چانگ تھا۔ ریفریجریٹر سے بیر لایا اور بغیر طلب کے اس کو پیش کی۔

"اچھا وقت؟" لی نے سوال کیا۔ اس کی بھوری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"اچھا وقت" ڈاکٹر نے جواب دیا اور وہ اپنی ٹھنڈی بیر لے کر تجربہ گاہ میں چلا گیا اور بیر کے ساتھ کھانے کے لئے کچھ سینڈوچ تیار کئے۔ اس وقت گلی میں مکمل سکوت تھا۔ سینڈوچ اور بیئر سے فارغ ہونے کے بعد وہ باورچی خانے میں گیا اور ناندیں گندی پلیٹیں نکالیں اور ان میں گرم پانی ڈال کر صابن کا پاؤڈر ملا دیا۔ تاکہ ان کی چکنائی آسانی سے صاف ہو جائے۔ اس کے بعد جو گلاس ٹوٹنے سے بچ رہے تھے، ان کو جمع کیا اور صابن کے گرم پانی میں ان کو بھی ڈال دیا۔ چولہے پر گوشت کی پلیٹوں کے ڈھیر تھے۔ یہ سب چکنائی کی وجہ سے ایک دوسرے سے چپک گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے ایک میز کا کچھ حصہ صاف کیا اور گلاس دھو کر وہاں رکھتا گیا۔ اس کے بعد پچھلے کمرے کا تالا کھول کر اپنا ایک پسندیدہ ریکارڈ نکال لایا اور اس کو گراموفون پر لگا دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ گلاس بھی دھوتا رہا، مگر بڑی احتیاط کے ساتھ تاکہ میوزک میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے۔ ریکارڈ ختم ہوا تو ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ پونچھے اور

سید شمیرالدین اشرفی
(ناظم شاہراہ)

محمد اسمٰعیل
(ہمارے آرٹسٹ)

دیگر اداروں کی کتب

ادب :-

کتاب	مصنف / ناشر	قیمت
تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	۴/-
تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسن	۳/-
اردو ادب کی تاریخ	نسیم قریشی	۲/۸
آبِ حیات	محمد حسین آزاد	۹/۸
اردو ہندی ہندوستانی	سجاد ظہیر	۰/۱۲/-
مشترکہ زبان	مہاتما گاندھی	۲/-
تاریخ ریختی	دیوان جان صاحب	۳/-
نثر کا بہترین ادب	مکتبہ شاہراہ	۵/۸
نظم	"	۵/۸
منتخب ادب	احتشام حسین	۶/-
تاریخ ادبیات ایران	مترجمہ مبارز الدین رفعت	۲/-
روسی ادب مکمل	پروفیسر محمد مجیب	۸/-
ادب اور انقلاب	ڈاکٹر اختر حسین	۲/۸
ادب اور سماج	احتشام حسین	۲/۱۲
نیرنگ خیال مکمل	محمد حسین آزاد	۱/۸
ایک مشرقی کتب خانہ	مبارز الدین	۳/-
احوالِ غالب	ڈاکٹر مختار الدین احمد	۵/-
نقدِ غالب	"	۴/-
میر تقی میر	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۱۲/-
مطالعہ حالی	شجاعت علی سندیلوی	۳/۸
مطالعہ شبلی	"	۳/۸
ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	۳/۸
ادب کیا ہے	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۲/-
اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر عزیز	۵/۸
بیانِ غالب	باقر	۵/-

کتاب	مصنف / ناشر	قیمت
مقالاتِ نادر یاشمیں	ہندوستانی اکیڈمی	۲/۴
فلسفۂ کلام غالب	شوکت سبزواری	۳/۴
ہمسفر شعرا کے خطوط	ضیاء الاسلام	۲/۸
انشائے داغ	سید علی حسن	۱/۸
شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں	عبداللطیف اعظمی	۳/-
جوہر ہند کے دو ہفتے	جگن ناتھ آزاد	۱/-
آرائشِ محفل	نولکشور پریس	۴/۸
باغ و بہار	میر امن دہلوی	۴/۴
الف لیلہ مکمل	نولکشور پریس	۵/-
داستان امیر حمزہ	"	۸/-
سیر کہسار (مکمل دو حصے)	رتن ناتھ سرشار	۱/-
مثنوی قدیم	شمس اللہ قادری	۲/۸
انوارِ سہیلی		۱/-
گل بکاؤلی		-/۱۲/-
ہندی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن	۵/۸
امیر خسرو	ڈاکٹر وحید مرزا	۵/-
کبیر صاحب	منوہر لال زتشی	۳/-
اقبالِ کامل	عبدالسلام ندوی	۶/۸
بزمِ تیموریہ	سید صباح الدین	۷/-
بزمِ مملوکیہ	"	۵/۸
چند دکنی پہیلیاں	محمد نعیم الرحمن	۱/۸
ایک نادر روزنامچہ	نورالحق ہاشمی	۲/۸
اکبر میری نظر میں	مولانا عبدالماجد دریابادی	۳/-
فلسفۂ اقبال	عبدالقوی دریابادی	۲/۸
ادبی خطوط غالب	مرزا محسن عسکری	۳/۸
معرکۂ چکبست	نولکشور پریس	۳/-
ذوقِ ادب و شعور	احتشام حسین	۳/-

کتاب	مصنف / ناشر	قیمت
شعرائے اردو	احتشام حسین	۴/-
ہماری قومی زبان	سر تیج بہادر سپرو	۱۲/-
ادب الجاہلی	رضا انصاری	۷/-
کلیاتِ شعری مکمل	مرزا نظام شاہ	۴/-
کلیاتِ آفاقی	رئیس احمد جعفری	۳/-
جامع الکلیات مکمل	اختر شیرانی	۴/-
اخوان الصفا	مولوی اکرام علی	۱۲/-
طریقۂ خداوندی		۲/-
گلگشتِ محفل	شیر علی افسوس	۳/۸
کلاسیکی ادب	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۳/۸
اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر	ڈاکٹر عبدالعلیم	۱۰/-
آثارِ ابوالکلام آزاد	قاضی عبدالغفار	۴/-
یادگارِ غالب	مولانا حالی	۴/-
اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین	۱۰/-
شعرالہند مکمل	علامہ شبلی	۳/۸
بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی	۳/-
طرۂ امیر	"	۱/-
عودِ ہندی	غالب	۱/۸
ہماری شاعری	مسعود حسن رضوی	۳/-
ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ	"	۳/-
مکاتیب شبلی مکمل	مولانا شبلی	۲/۴
زبانِ داغ	رفیق مارہروی	۳/۸
ادب کا مقصد	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۲/۸
ذکرِ حافظ	سجاد ظہیر	۲/۴
بزمِ بے تکلف	ڈاکٹر سید عابد حسین	۲/۸
عربی زبان پر فارسی کا اثر	ڈاکٹر عبدالحق	۱۰/-